سید احمد شہید

مجاہد کبیر حضرت سید احمد بریلوی کے مفصل سوانح حیات
اور اُن کی تحریک احیاء دین کی مکمل سرگزشت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

سید احمد شہید

یعنی

مجاہد کبیر حضرت سید احمد بریلوی کے مفصل سوانح حیات
اور اُن کی تحریک احیاء دین کی مکمل سرگزشت

غلام رسول مہر

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز
لاہور ○ حیدر آباد ○ کراچی

جملہ حقوق محفوظ

باہتمام شیخ نیاز احمد پرنٹر
علمی پرنٹنگ پریس، ۱۷۔ ہسپتال روڈ، لاہور
سے چھپوا کر چوک انارکلی، لاہور سے شائع کیا۔

اشاعت سوم : ۱۹۸۱ء
تعداد : ایک ہزار

مقام اشاعت :
شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز
ادبی مارکیٹ۔ چوک انارکلی، لاہور

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۔ (سورہ توبہ)

بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے اُن کی جانیں بھی خرید لیں اور اُن کے مال بھی اور اِس قیمت پر خرید لیں کہ اُن کے لیے بہشت (کی جاودانی زندگی) ہو۔ وہ (کسی دنیوی مقصد کے لیے نہیں، بلکہ) اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پس مارتے بھی ہیں اور مارے بھی جاتے ہیں۔

تکیہ بر حجّت و اعجازِ بیاں نیز کنند　　کارِ حق گاہ بہ شمشیر و سناں نیز کنند
گاہ باشد کہ تہِ خرقہ زرہ مے پوشند　　عاشقاں بندۂ حال اند چناں نیز کنند

(اقبالؒ)

LIBRARY
Lahore Islamic
Book No. 66
91-B ... Garden Town, Lahore

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتساب

بنا کردند خوش رسمے بر خون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اکتوبر ۱۹۳۴ء کی چھٹی یا ساتویں تاریخ تھی، جب میں نے کابل میں مولانا محمد بشیر شہید سے عہد کیا تھا کہ سید احمد بریلویؒ کے سوانح اور مجاہدین کی تاریخ مرتب کر دوں گا۔ میں دو تین دن بعد غزنی اور قندھار ہوتا ہوا لاہور چلا آیا، وہ مزید چند روز کابل میں مقیم رہ کر اپنے مرکز چمرکنڈ تشریف لے گئے اور تقریباً دو ماہ بعد رمضان المبارک کی پہلی رات کو شہادت کا خلعت پہن کر فاطر السمٰوات والارض کی بارگاہ میں پہنچ گئے:

سرم فدائے سوارے کہ گاہِ عرضِ نیاز
عناں کشیدہ رود تا سخن تمام کنم

اگر وہ زندہ ہوتے تو اپنی محنت و کاوش کی اس "بضاعتِ مزجات" کو عقیدت کے سفینے میں لگا کر ان کی خدمت میں پیش کرتا۔ اب اس شہیدِ سعید کی روحِ پاک سے مخاطب ہو کر عرض پرداز ہوں:

نذرِ اشکِ بے قرار از من پذیر
گریۂ بے اختیار از من پذیر

جلد اوّل

فہرست ابواب

دیباچہ ۱۱
کتاب کے مآخذ ۱۹
پہلا باب ـــــــــــــــ اجداد کرام ۳۳
دوسرا باب حضرت سید علم اللہ ۴۰
تیسرا باب علم اللہی خاندان ۵۰
چوتھا باب پیدائش اور عہدِ طفولیت ۶۰
پانچواں باب لکھنؤ اور دہلی کا سفر ۶۷
چھٹا باب دماغی اور روحانی تربیت ۷۴
ساتواں باب نواب امیر خاں کی رفاقت ۸۵
آٹھواں باب عسکری زندگی کے سات برس ۹۵
نواں باب نواب امیر خاں سے علیٰحدگی ۱۰۵
دسواں باب دعوت اصلاح کا آغاز ۱۱۴
گیارھواں باب دوآبے کا دورہ اور مراجعت وطن ۱۲۴
بارھواں باب رائے بریلی کی زندگی ۱۳۳
تیرھواں باب نکاح بیوگان اور واقعہ نصیر آباد ۱۴۴
چودھواں باب تبلیغی دورے ۱۵۴
پندرھواں باب دورۂ لکھنؤ ۱۶۲
سولھواں باب عزم حج ۱۷۵
سترھواں باب سفر حج (از رائے بریلی تا الہ آباد) ۱۸۳
اٹھارھواں باب سفر حج (از الہ آباد تا ہوگلی) ۱۹۴
انیسواں باب 〃 (قیام کلکتہ کے حالات) ۲۰۵

بیسواں باب	سفرِ حج (حج و زیارت اور مراجعت)	۲۱۶
اکیسواں باب	جہاد کے لیے دعوت و تنظیم	۲۳۴
بائیسواں باب	سکھ اور انگریز	۲۳۹
تئیسواں باب	سلطنت یا اعلاءِ کلمۃ الحق؟	۲۵۱
چوبیسواں باب	شبہات و اعتراضات کی حقیقت	۲۵۶
پچیسواں باب	سرحد کو کیوں مرکز بنایا؟	۲۶۴
چھبیسواں باب	سفرِ ہجرت (از رائے بریلی تا اجمیر)	۲۶۷
ستائیسواں باب	" (از اجمیر تا شکارپور)	۲۸۰
اٹھائیسواں باب	" (از شکارپور تا کوئٹہ)	۲۹۸
انتیسواں باب	" (از کوئٹہ تا پشاور)	۳۰۷
تیسواں باب	پنجاب و سرحد کا دورِ مصائب	۳۱۶
اکتیسواں باب	چارسدے میں قیام	۳۲۴
بتیسواں باب	جنگِ اکوڑہ	۳۳۲
تینتیسواں باب	واقعہ حضرو اور جنگِ بازار	۳۴۵
چونتیسواں باب	بیعتِ امامتِ جہاد	۳۵۲
پینتیسواں باب	اجتماعِ جیوشِ اسلامیہ	۳۶۰
چھتیسواں باب	جنگِ شیدو	۳۶۷
سینتیسواں باب	سفرِ چنگلئی	۳۷۸
اڑتیسواں باب	بونیر و سوات کا دورہ	۳۹۲
انتالیسواں باب	دعوتِ جہاد	۴۰۳

جلد دوم

فہرست ابواب

پہلا باب	ہزارے کا محاذ جنگ	۴۱۱
دوسرا باب	شاہ اسماعیل کی تنظیمی سرگرمیاں	۴۱۶
تیسرا باب	ڈمگلہ اور شنکیاری کے معرکے	۴۲۴
چوتھا باب	غازیوں کے قافلے	۴۲۸
پانچواں باب	خہر میں قیام	۴۳۸
چھٹا باب	جنگ اوتمان زئی	۴۴۸
ساتواں باب	بیعت شریعت	۴۵۸
آٹھواں باب	مرکز پنجتار	۴۶۷
نواں باب	خادے خاں کا انحراف	۴۷۸
دسواں باب	تسخیر اٹک کی تجویز	۴۸۳
گیارھواں باب	جنگ پنجتار	۴۹۳
بارھواں باب	تنگی پر شبخون	۵۰۱
تیرھواں باب	جنگ ہنڈ	۵۰۵
چودھواں باب	از ہنڈ تا زیدہ	۵۱۴
پندرھواں باب	جنگ زیدہ	۵۲۱
سولھواں باب	تربیلہ، استھانہ اور امب	۵۳۴
سترھواں باب	پایندہ خاں کی فرمانبرداری اور سرکشی	۵۴۳
اٹھارھواں باب	عشرہ و امب کی جنگیں	۵۵۲
انیسواں باب	جنگ پھولڑہ	۵۶۴
بیسواں باب	امب میں قیام کے حالات	۵۷۵
اکیسواں باب	سکھوں کا پیغام مصالحت	۵۸۹

بائیسواں باب	سمہ میں انتظامِ عشر	۵۹۶
تئیسواں باب	جنگِ مردان	۶۰۴
چوبیسواں باب	سردارانِ پشاور کا نیا فتنہ	۶۰۹
پچیسواں باب	جنگِ مایار (۱)	۶۱۸
چھبیسواں باب	جنگِ مایار (۲)	۶۲۹
ستائیسواں باب	پشاور کی جانب اقدام	۶۴۰
اٹھائیسواں باب	درانیوں سے مصالحت	۶۴۶
انتیسواں باب	پشاور میں مشغولیتیں	۶۵۷
تیسواں باب	خوفناک سازش کا جال	۶۶۷
اکتیسواں باب	مشہد اکبر (۱)	۶۷۸
بتیسواں باب	مشہد اکبر (۲)	۶۸۸
تینتیسواں باب	عزمِ ہجرتِ ثانیہ	۶۹۷
چونتیسواں باب	پنجتار سے راج دواری	۷۰۷
پینتیسواں باب	بالاکوٹ اور سچون	۷۱۸
چھتیسواں باب	جنگِ مظفر آباد	۷۳۰
سینتیسواں باب	رزمگاہ بالاکوٹ کا نقشہ	۷۳۸
اڑتیسواں باب	دفاعی انتظامات	۷۴۷
انتالیسواں باب	زندگی کی آخری رات اور آخری صبح	۷۵۷
چالیسواں باب	آغاز جنگ	۷۶۵
اکتالیسواں باب	شہادت	۷۷۶
بیالیسواں باب	مشہد بالاکوٹ	۷۸۷
تینتالیسواں باب	سید صاحب کا مدفن	۸۰۲
چوالیسواں باب	عقیدۂ غیبوبت	۸۱۰
پینتالیسواں باب	ازواج و اولاد	۸۲۲
چھیالیسواں باب	اخلاق و عادات	۸۲۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکایت از قدِ آں یارِ دل نواز کنیم
بہ ایں فسانہ مگر عمر خود دراز کنیم

مَیں نے اکتوبر ۱۹۳۴ء میں سید صاحب اور جماعت مجاہدین کے احوال و وقائع کی ترتیب کے متعلق مولانا محمد بشیر شہید کے ساتھ وعدہ کیا تھا تو یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ اس وعدے کے ایفاء کی صرف پہلی منزل طے کرنے میں اٹھارہ برس گزر جائیں گے اور یہ مدت اتنی طویل ہے کہ نومولود شیر خوارگی اور طفلی کے مدارج طے کرتا ہُوا ذمہ دارانہ زندگی کے شہرستان میں پہنچ جاتا ہے۔ مَیں نے یہ بارِ گراں اس اعتماد پر بے تکلف اُٹھا لیا تھا کہ وقائع سرحد کے متعلق ضروری معلومات مولانا فراہم کر دیں گے نیز اُن کی وساطت سے مَیں ان مآخذ تک پہنچ سکوں گا، جنھیں عام طور پر دسترس سے باہر سمجھا جاتا تھا، باقی حالات میں خود جمع کر لوں گا۔ میں کابل سے چلا اور غزنی، قندھار، کوئٹہ ہوتا ہُوا لاہور پہنچا۔ مولانا میری روانگی سے دس پندرہ دن بعد چمرکنڈ چلے گئے؛ جو اُن کا مرکز تھا۔ اصل وعدے پر صرف دو ہی ماہ کی مدت گزری تھی کہ دفعتہً اُن کی شہادت کا سانحہ جانگزا پیش آگیا اور وہ روشنی بُجھ گئی، جس کی رہنمائی کے بھروسے پر مَیں اپنے سفینۂ شکستہ کو شب تاریک میں طوفانی سمندر کی موجوں کے حوالے کر دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

پنہاں تھا سخت دام قریب آشیانے کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہُوئے

مولانائے موصوف نے کابل میں تین بند لفافے مجھے دیے تھے، جنھیں یہ سمجھ کر ویسے کا ویسا محفوظ کر لیا تھا کہ جماعت مجاہدین کے حالات کی یہ پہلی قسط ہو گی۔ ان کی شہادت کے بعد لفافوں کو کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ چند کاغذوں پر متفرق نوٹ لکھ رکھے ہیں اور ان میں زیادہ تر یہ ذکر ہے کہ مجاہدین نے مختلف اوقات میں کہاں کہاں مرکز بنائے۔ دو تین صفحوں پر کسی معترض کے اعتراضات کا نامکمل جواب ہے۔ چند اوراق پر ایک مقدمے کی روداد درج ہے۔ بعد میں معلوم ہُوا کہ یہ روداد ۱۹۲۱ء میں سول نے چھاپی

تھی، مولانا نے اس کا اردو ترجمہ کرا لیا تھا۔ ان معلومات کو سامنے رکھ کر ایک صدی کے سرفروشانہ مجاہدات کی کہانی کیونکر تیار ہو سکتی تھی؟ میرے دل پر مایوسی کی تیرگی چھا گئی۔ جن ولولوں کو اڑھائی مہینے تک اپنے لیے خداداد سرمایۂ سعادت سمجھتا رہا تھا، وہ افسردگی کی خاک میں سو گئے۔ چند مہینے میں مولانا کے ساتھ عہد کا نقش بھی صفحۂ قلب سے محو ہو گیا۔

چار پانچ برس گزر گئے اور میں پوری دلجمعی سے اپنے سیاسی مشاغل میں ڈوبا رہا۔ ۱۹۳۹ء کی برسات میں مجھ پر بخار کا حملہ ہوا۔ دو تین روز کے بعد کمر اکڑ کر تختہ بن گئی۔ کئی روز تک یہ حالت رہی کہ دو آدمیوں کی مدد کے بغیر اُٹھنا بیٹھنا بھی محال تھا۔ بیچارگی کے اس دَور میں ایک روز مولانا شہید یاد آ گئے اور مجھے یقین ہو گیا کہ جس تکلیف میں اب مبتلا ہوں، یہ دراصل اس شہید سے نقضِ عہد کے جرم کی سزا ہے۔ لیٹے لیٹے عجز و الحاح سے دعا کی کہ خدایا! اگر مجھ میں اس عہد کو پورا کرنے کی کچھ بھی صلاحیت موجود ہے تو صحت عطا فرما، تھوڑی سی مہلت دے اور اپنے فضل و رحمت سے تکمیلِ کار کے اسباب فراہم کر دے۔ دیر تک حضرت علامہ اقبالؒ کا یہ شعر زبان پر جاری رہا:

حرفِ ناگفتہ مجالِ نفسے مے خواہد
زندہ مارا بہ جہانِ تو سروکار کجاست

سراپا جرم و خطا کی دُعا کیا اور اس کا قبول کیا! خدا کے لطف و کرم سے دوسرے ہی دن صحت ہو گئی۔ بس اس وقت سے میں نے کمرِ ہمت باندھ لی اور فرصت کے بیشتر اوقات اسی کام کے لیے وقف کر دیے۔ اپنے علم کی فرومایگی اور وسائل کی قلت کا پورا اندازہ تھا۔ دل میں فیصلہ کر لیا کہ روزانہ دو نفل پڑھ کر دُعا کرتا رہوں گا کہ یہ کٹھن منزل میرے لیے آسان ہو جائے۔ چودہ برس گزر چکے ہیں، میں سفر میں رہا یا حضر میں، لیکن اس عہد کی پابندی کو خدا نے ہر اختلال سے محفوظ رکھا۔

متعارف معلومات کو نئی عبارت کے آئینے میں سجا کر پیش کر دینا چنداں مشکل نہ تھا۔ سید صاحب کے متعلق دو کتابیں پہلے چھپ چکی تھیں۔ ۱۹۳۹ء میں سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب بھی شائع ہو چکی تھی۔ مجاہدین کی مختلف جنگوں کے حالات متعدد انگریزی کتابوں سے اخذ کیے جا سکتے تھے۔ ان معلومات کو سمیٹ کر دو یا تین جلدیں لکھ دینا غیر معمولی کاوش کا محتاج نہ تھا، لیکن میرے سامنے ابتدا ہی سے اس کام کے سرانجام کا ایک خاص معیار اور ایک خاص پیمانہ تھا۔ اگرچہ اس کی تکمیل بظاہر بہت دشوار نظر آتی تھی، تاہم طبیعت اس معیار کے ترک یا اس کے درجے میں تنزل پر کبھی راضی نہ ہوئی۔ دُنیا کو دعوتِ تماشا دینا اسی صورت میں مناسب ہے کہ انسان کوئی ایسی چیز منظرِ عام پر لا سکے، جس سے نگاہیں عام طور پر آشنا نہ ہوں۔ معلوم

عام وقائع کو نئے اسلوب اور نئے انداز میں دُہرا دینا ہرگز اس امر کا مستحق نہیں کہ اس میں وقت صرف کیا جائے یا اسے قابلِ ذکر کام سمجھا جائے۔

کبرِ نفس سے ہزار بار پناہ مانگتا ہوا صرف تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ خدائے رحیم و کریم کے فضل و رحمت سے مجھے وہ کتابیں ملتی رہیں، جن کے وجود کا بھی ابتدا میں علم نہ تھا اور زیادہ تر گھر بیٹھے بیٹھے ان بیش بہا ذخیروں سے استفادہ کر سکا، جو میرے خواب و خیال میں بھی نہ آئے تھے۔ پھر جو معلومات مہیا ہوئیں، انھیں دلخواہ ترتیب کی توفیق عطا ہوئی۔ بے محل نہ ہوگا اگر بطریقِ سپاس و شکرانہ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل عرض کر دوں:

۱ - سب سے پہلے مجھے "منظورۃ السعداء" کا قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی سے ملا۔ یہ نسخہ سید صاحب کے متعلق مفصّل معلومات کا پہلا خزانہ تھا اور اسی کو سامنے رکھ کر میں نے سیّد شہید کی سیرت کا ابتدائی خاکہ تیار کیا۔

۲ - حُسنِ اتفاق سے صدیقِ مکرم امتیاز علی خاں صاحب عَرشی رام پوری لاہور آئے۔ برادرم مولانا ظفر اقبال ایم۔ اے نے میری مشغولیت کا ذکر اُن سے کیا تو انھوں نے "وقائعِ احمدی" کا نام لیا اور رام پور پہنچ کر یکے بعد دیگرے "وقائع" کی دو جلدیں میرے پاس بھیج دیں۔ یہ جلدیں جنگِ مردان تک کے حالات پر مشتمل تھیں۔

موصوف نے بعد میں میری درخواست پر مومن خاں کے فارسی دیوان سے وہ قطعات و قصائد نقل کر کے بھیجے، جو سید صاحب اور مجاہدین سے متعلق تھے۔

۳ - مولانا ظفر اقبال ہی کی وساطت سے مجھے مکاتیب کا وہ نسخہ مولانا ثناء اللہ مرحوم امرت سری کے کتب خانے سے ملا، جس کے حوالے کتاب میں "مکاتیب شاہ اسماعیل" کے نام سے آئے ہیں۔ اس ناقص نسخے کو مولانا محمد شفیع پرنسپل اورنٹیل کالج کے نسخے سے مکمل کیا۔ اس کتاب کا ایک ناقص لیکن نہایت خوش خط نسخہ مرحوم پروفیسر سراج الدین آذر نے دیا۔

۴ - "وقائع" کے باقی متفرق اجزا مجھے محترم سید ابوالحسن علی نے مرحمت فرمائے، نیز "سیرۃ علمیہ" "تذکرۃ الابرار" "نتائج الحرمین" سید موصوف ہی کی مہربانی سے میں نے دیکھیں۔ سیّد صاحب کے خاندانی حالات کے متعلق مجھے وقتاً فوقتاً استفسارات کی ضرورت پڑتی رہی۔ سید ابوالحسن علی نے ہر موقع پر اپنی معلومات سے مستفید فرمایا۔ متعدد مکاتیب کی نقلیں انھیں سے ملیں۔ "منظورۃ السعداء" کا جو نسخہ پنجاب یونیورسٹی میں ہے، اس کے بعض اجزا غائب تھے۔ یہ اجزا بھی سید ممدوح ہی کی عنایت

سے میں نے دیکھے۔

۵ ـ احوال سرحد کے متعلق زیادہ تر معلومات میں نے بزرگ محترم سید عبدالجبار شاہ صاحب ستھانوی (سابق بادشاہ سوات و سابق وزیر ریاست امب) کی مرتبہ کتابوں سے حاصل کیں، جو ابھی تک شایع نہیں ہوئیں، انہی بزرگ اور ان کے بھتیجے برادرم سید مبارک شاہ مرحوم گندفی کی معیت میں مجھے اکثر مقامات جنگ دیکھنے کا موقع ملا، تین مرتبہ انھیں کے ساتھ میں بالاکوٹ گیا۔ "در مقال" کی نقل بھی سید عبدالجبار شاہ صاحب ہی نے عنایت فرمائی۔

۶ ـ سید صاحب کے مکاتیب کی پہلی جلد اور "الدُّر المنثور" یا "تذکرہ صادقہ" مجاہدین کے مرکز "اسمست" سے میرے پاس آئیں۔

۷ ـ شہزادہ برکت اللہ مدار المہام جماعت مجاہدین کی عنایت سے چملہ، بونیر، سوات اور خدوخیل کے وہ مقامات دیکھے، جن کا ذکر سید صاحب کے تبلیغی دوروں یا جنگوں میں آیا ہے۔ تین دن "اسمست" میں گزارے، جو ۱۹۰۲ء سے مجاہدین کا مرکز چلا آتا ہے۔ بعض پرانی تحریرات بھی دیکھیں، نیز مولانا رحمت اللہ مرحوم امیر جماعت مجاہدین سے امیر عبداللہ مرحوم اور امیر عبدالکریم مرحوم کی بعض جنگوں کے حالات سنے۔

۸ ـ بعض قلمی کتابیں کتب خانہ ٹونک میں تھیں۔ تقسیم ملک کے بعد ٹونک پہنچنا سہل نہیں رہا تھا۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، وزیر تعلیمات ہند نے میری درخواست پر وہ کتابیں ٹونک سے دہلی منگوا لیں اور میں نے دو مرتبہ حضرت مولانا کی خدمت میں پہنچ کر ان سے استفادہ کیا۔ کتاب کی ترتیب کے بارے میں بھی حضرت ممدوح سے نہایت قیمتی مشورے ملے، اگرچہ افسوس ہے کہ ان کی گراں بہا مشغولیتوں کے پیش نظر میں مسودہ انھیں نہ دکھا سکا۔

۹ ـ مولانا سید نور احمد (ابن سید اسحاق، ابن سید اسماعیل برادرزادہ و داماد سید صاحب) نے مجھے "وقائع" کا ایک نہایت عمدہ نسخہ مرحمت فرمایا، جو اگرچہ مکمل نہ تھا، لیکن میرے لیے بہرحال ایک بیش بہا عطیہ تھا۔ نیز علم اللّٰہی خاندان کے مفصل نسب نامے کا ایک فارسی نسخہ اور ایک اردو نسخہ سید نور احمد ہی سے مجھے ملا۔

۱۰ ـ سیّد صاحب کے خاندان کے متعلق کئی ضروری باتیں مجھے سید طلحہ اور سید زبیر سے معلوم ہوئیں، جو اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ نیز "وقائع" کا ایک نامکمل نسخہ انھیں کی مہربانی سے ہاتھ آیا، جس سے سیّد صاحب کے حالات کے متعلق بعض مشکل عقدے حل ہوئے۔

۱۱ ۔ مولانا مسعود عالم صاحب ندوی اور خان محمد اجمل خاں صاحب پرائیویٹ سیکرٹری حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی بعض قیمتی چیزیں ملیں۔ خاں صاحب موصوف کے جدِ امجد خان الہداد خاں خود مجاہدین میں شریک رہے تھے۔

۱۲ ۔ نواب فرید خاں صاحب والیِ امب، جناب عبدالودود میاں گل والیِ سوات (جو اب فرمانروائی سے دست کش ہو چکے ہیں) اور شہزادہ جہاں زیب (حال والیِ سوات) نے اپنے علاقوں کے وہ مقامات دیکھنے میں میری امداد فرمائی جن کا ذکر سید صاحب کے مجاہدات میں آیا ہے۔ والیِ امب سے ان کے خاندان کے متعلق بیشتر معلومات حاصل ہوئیں۔ یہ معلومات سید صاحب کی سیرت کے سلسلے میں ضروری تھیں۔

ان تمام حضرات کا دلی شکریہ مجھ پر واجب ہے اور اس کارِ خیر کے انجام میں ثواب کے بیشتر حصے کے حق دار بھی وہی ہیں۔ ان کے سوا جن حضرات نے میری مدد فرمائی، ان کے نام درج کروں تو ایک دفتر تیار ہو جائے۔ ان سب کا بھی تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔

کتاب کے بارے میں کچھ کہنا میرا منصب نہیں، لیکن یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ ایک شخصیت کی سیرت نہیں بلکہ ایک نہایت اہم دینی تحریک کی مفصل سرگزشت ہے، جو اس عاجز کے محدود علم کے مطابق پاک و ہند کی اسلامی تاریخ میں اپنی نوعیت کی یگانہ تحریک تھی۔ یہ جن حالات میں شروع ہوئی تھی، وہ ہمارے عہد کے حالات سے بہت مشابہ تھے؛ لہٰذا اس سرگزشت میں ہمارے لیے عبرت و موعظت کا زیادہ سے زیادہ سرمایہ موجود تھا۔ اس کے باب میں بیگانوں کی غلط فہمیاں اور مغالطہ انگیزیاں چنداں تعجب انگیز نہ تھیں، لیکن جن یگانوں نے اس پر قلم اٹھایا، وہ بھی اس کی عظمت یا صاحبِ دعوت کی بلند نگہی اور عزیمت کا صحیح اندازہ نہ کرسکے۔ یا تو ٹھوکریں کھا کھا کر اس کی [illegible] سے، یا قلتِ معلومات کی بنا پر تذبذب میں پڑ کر کوئی واضح راہِ فیصلہ پیدا نہ کرسکے۔ میں نے اپنی ناچیز بساط کے مطابق کوشش کی ہے کہ اس تحریکِ احیائے دین کے تمام پہلو روشن و مبرہن ہو کر سامنے آجائیں۔ یہ کہنے کی جسارت تو نہیں کرسکتا کہ جو کچھ چاہتا تھا وہ پورا ہو گیا، لیکن اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا بہ صمیمِ قلب اعتراف کرتا ہوا کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب پڑھ لینے کے بعد سید صاحب اور ان کی تحریک سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو مختلف احوال و وقائع کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کرنے میں ایک حد تک سہولت ہوگی۔ تاریخِ پاک و ہند میں جس عہد کو مسلمانوں کا دورِ زوال کہا جاتا ہے، یہ اسی کا ایک باب ہے، لیکن کیا کوئی حق پسند اور حق شناس انسان اس اعتراف میں تامل کرے گا کہ مسلمانوں کے عہدِ عروج و اقبال کا بھی کوئی حصہ اصولاً اس سے زیادہ شاندار یا زیادہ قابلِ فخر نہیں ہو سکتا؟

حکم و فیصلہ کا انحصار نتائج پر نہیں، بلکہ عزم جہاد، ہمت عمل اور راہ حق میں کمال استقامت پر ہوتا ہے۔ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ کمال عزیمت اور کمال ہمت و استقامت کی ایسی مثالیں ہمارے عہد عروج کی داستانوں میں مل سکتی ہیں، جن میں مقصود نصب العین دین اور صرف دین رہا ہو؟

سید صاحب نے زندگی کی چالیس بہاریں وطن مالوف میں گزاریں۔ حیات مستعار کے باقی اوقات سرحد کے میدانوں اور کوہستانوں میں بسر کیے۔ جن حضرات نے ان کے متعلق کچھ تحریر فرمایا، وہ نہ یہاں کے مفصل حالات سے آگاہ تھے، نہ سرحد کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کا ان کے پاس کوئی ذریعہ تھا، نہ وہ سید صاحب کو ایک مخصوص تحریک کے داعی اور ناظم کی حیثیت میں دیکھ سکے۔ اس وجہ سے کسی واقعے کے پس منظر کا کھوج لگانے کی بھی انھوں نے ضرورت محسوس نہ کی۔ خصوصاً سرحدی جنگوں یا رئیسوں کے حالات پر پہنچ کر تو ان کی کیفیت یہ ہو جاتی رہی گویا چلتے چلتے ایک تنگ و تاریک سرنگ میں داخل ہو گئے، جس کے گرد و پیش کی ہر شے سے وہ کاملاً ناآشنا تھے۔ میں نے اپنے محدود علم کے مطابق ان کوتاہیوں کی تلافی کر کے سید صاحب کے پورے حالات کو روشنی میں لانے اور انھیں حقیقی معنوں میں تاریخی واقعات کا درجہ دینے کی سعی کی ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ میں کس حد تک کامیاب ہوا۔

ابتدا میں خیال تھا کہ سید صاحبؒ اور جماعت مجاہدین کی سرگزشت زیادہ سے زیادہ دو جلدوں میں پوری ہو جائے گی۔ لکھنے بیٹھا تو محض سید صاحبؒ ہی کے احوال و وقائع کم و بیش ایک ہزار صفحات پر پھیل گئے:

ہمیں عشق است بر خود چیدہ چندیں داستاں ورنہ
کسے از معنی یک حرف صد دفتر نمے سازد

میں نے پہلی مرتبہ اس کا مسودہ ۱۹۴۶ء میں مکمل کر لیا تھا۔ پھر اس میں قطع و برید کرتا رہا کہ مطالب کو نقصان پہنچائے بغیر اسے جتنا گھٹایا جا سکتا ہے گھٹا دیا جائے۔ اس موقع پر پورے موضوع کو چار جلدوں میں تقسیم کیا: دو جلدیں سید صاحبؒ کے متعلق جو ملاحظۂ گرامی میں پیش ہیں۔ تیسری جلد اُن مجاہدین کے لیے وقف کی، جو سید صاحبؒ کی زندگی میں یا ان کے ساتھ شہید ہوئے یا واقعۂ بالاکوٹ کے بعد لوٹ آئے پھر مجاہدات میں کوئی حصہ نہ لیا۔ اسی جلد میں جماعتی تنظیم کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ یہ جلد اس وجہ سے بھی ضروری تھی کہ ان مجاہدین کے حالات مرتب ہو جائیں جنھوں نے اپنی جانیں تحریک احیائے دین کے لیے بے دریغ وقف کیں، اس وجہ سے بھی ضروری تھی کہ اس کے بغیر سید صاحب کی شان تربیت اور بے مثال صلاحیت مردم گری کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ پھر ایک ضخیم جلد میں ۱۸۳۱ء سے ۱۹۲۰ء تک جماعت مجاہدین کی سرگزشت

ہوگی۔ ان جہتوں کا اتمام خدا کے ہاتھ ہے۔ میرے پاس پورا سامان موجود ہے۔ کچھ اجزا مرتب بھی کر چکا ہوں، لیکن سید صاحب کی سیرت کو مطبع کے حوالے کیے بغیر دوسری طرف دلجمعی سے متوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔

• سید صاحب کے متعلق اُردو، فارسی، انگریزی اور عربی میں جس مکتوب یا مطبوع ذخیرے کا مجھے علم ہو سکا اور اس تک پہنچنا نصیب ہُوا، وہ میں دیکھ چکا ہوں۔ ایک ایک واقعے کی صحیح کیفیت معلوم کرنے کے لیے میں نے کٹھن وادیاں طے کی ہیں اور نہایت دشوار گزار گھاٹیوں میں مدتوں چکر لگائے ہیں، جہاں قدم قدم پر خستگی و شکستگی کو قبول کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ ایک ایسے کام میں، جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ کرنے والے بھی خیرہ ذوقی کے اس عہد تاریک میں بہت کم اصحاب نظر آتے ہیں، میں نے لیل و نہار حیات کے بہترین اوقات بے تامل صرف کیے۔ نہ ہمت نے ساتھ چھوڑا، نہ صبر کی پیشانی پر کوئی شکن نمودار ہوئی، نہ طلب و جستجو کی آنچ مدھم ہونے پائی، نہ محنت و کاوش کے حوصلوں پر افسردگی چھائی۔ ہزاروں صفحات کی ایک ایک سطر کے پیچ و خم میں میری نظریں بار بار دوڑی ہیں۔ مختلف عقدوں کی کشائش میں میرے دماغ کی صلاحیت غور و فکر برسوں جولانیوں میں سرگرم رہی ہے۔ میں نے سید صاحبؒ کو جیسا کچھ اور جتنا کچھ سمجھا، اس کا نقشہ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں اور ساز وجود اس ترانے کے لیے وقف ہے:

باایں ہمہ بے حاصلی و ہیچ کسی — درماندہ بہ نارسائی و بوالہوسی
دادیم نشاں ز گنج مقصود ترا — گر ما نہ رسیدیم تو شاید برسی

میں اپنے علم و عمل کی بے بضاعتی کے پیش نظر اس اہم کام کی تکمیل کا اہل نہ تھا۔ جو کچھ ہوا یہ محض خدائے لایزال کا فضل تھا۔ ایک قرن کے لیل و نہار ان پاک نفس ہستیوں کے ذکر و فکر میں گزار چکا ہوں، جن کا اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، جاگنا سونا، جینا مرنا صرف خدا کی رضا سے وابستہ رہا۔ شاید مجھ آلودہ داماں اور سراپا جُرم و عصیاں کے لیے یہی مشغولیت وسیلۂ مغفرت بن جائے:

امید ہست کہ بیگانگیٔ عرفی را
بہ دوستی سخن ہائے آشنا بخشند

مسلم ٹاؤن۔ لاہور
۲۲- ستمبر ۱۹۵۲ء

مہر

کتاب کے مآخذ

سید صاحبؒ کی سیرت اور جماعت مجاہدین کے حالات جن کتابوں سے اخذ کیے، ان میں سے چند اہم کتابوں پر مفصل بحث کا ارادہ تھا لیکن اب دیکھتا ہوں کہ کتاب کی ضخامت بہت بڑھ گئی ہے اور مآخذ کے باب میں رشتۂ بیان کو ابتدائی پروگرام کے مطابق کھلنے دیا جائے تو اس کتاب کو دو کے بجائے تین جلدوں میں بانٹنا پڑے گا۔ لہٰذا اس کے سوا چارہ نہیں کہ چند مآخذ کی سرسری کیفیت بیان کر کے باقی کتابوں کے صرف نام درج کر دیے جائیں۔

کتابوں کی جو فہرست درج کر رہا ہوں، اس میں وہ ساری نہیں آئیں، جو میں نے اس سلسلے میں پڑھیں۔ ممکن ہے بعض پہلی نظر میں اصل موضوع سے بے تعلق نظر آئیں، لیکن سفر ہجرت اور بعض دوسرے سفروں کے راستے معلوم کرنے کے لیے مجھے خدا جانے کہاں کہاں دستک دینی پڑی۔ بعض اوقات ایک غیر معروف شخص کے متعلق ضروری حالات معلوم کرنے کے سلسلے میں چار چار سو صفحات کی کتابوں کی ایک ایک سطر چھان گیا۔ فہرست پیش کرنے سے خدانخواستہ یہ مقصود نہیں کہ اپنی مشقت کی اہمیت بڑھاؤں یا اسمائے کتب کی طویل صف بندی سے اپنی کم علمی کو وقیع بناؤں۔ مقصود محض یہ ہے کہ جو اصحاب علم اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں، وہ اگر بطور خود تحقیق کرنا چاہیں تو یہ فہرست اُن کے لیے مفید زادِ راہ کا کام دے سکے۔

۱۔ **"منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء"**: مرتبہ سید جعفر علی نقوی ساکن مجھا امیر ضلع گورکھپور۔ سید جعفر علی نقوی واقعہ بالاکوٹ سے قریباً سوا برس پہلے جہاد کی نیت سے سرحد پہنچے تھے۔ چونکہ اچھے عالم اور مشاق محرر تھے، اس لیے منشی خانے سے وابستہ ہو گئے۔ شاہ اسماعیل کے کاتب خاص تھے۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد وطن لوٹ آئے۔ سنہ ۱۲۱۰ھ (۹۶-۱۷۹۵ء) میں پیدا ہوئے، رمضان المبارک ۱۲۸۸ھ (اواخر نومبر یا اوائل دسمبر ۱۸۷۱ء) میں وفات پائی۔

کتاب کا تاریخی نام "تاریخ احمدیہ" ہے، جس سے تاریخ تالیف ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) نکلتی ہے۔ فاضل مولف نے اس کارِ خیر کی تحریک نواب محمد علی خاں سے منسوب کی ہے، جو نواب وزیر الدولہ کے صاحبزادے تھے اور ۱۸۶۵ء میں فرمانروائے ٹونک بنے۔ میرا خیال ہے کہ نواب وزیر الدولہ نے نواب محمد علی خاں کو یہ سارا کام سونپ دیا تھا۔ سید جعفر علی لکھتے ہیں: "نواب موصوف کو خطرہ لاحق ہوا کہ اگر ثقہ راویوں کی وفات سے پیشتر سید صاحب کے پورے حالات مرتب نہ ہوئے تو ممکن ہے بعد کے لوگ غلط باتیں شامل کر دیں

اس لیے مختلف اصحاب کو جگہ جگہ سے بلا کر صحیح حالات مرتب کر دینے کی تاکید فرمائی۔"

معلوم ہوتا ہے نواب وزیر الدولہ نے سید صاحب کے حالات جاننے والے تمام اصحاب کو اس غرض سے ٹونک بلایا تھا کہ جو کچھ کسی کو یاد ہو وہ روایات کی شکل میں لکھوا دے۔ نواب محمد علی خاں اس کام کے مہتمم تھے۔ سید جعفر علی بھی اسی سلسلے میں بلائے گئے۔ انھوں نے روایتوں میں جو حصّہ لیا ہو، اس کے متعلق علم نہیں، مگر یہ معلوم ہے کہ سید صاحب کے حالات میں ضخیم کتاب بہ زبان فارسی لکھ دی۔

اس کا جو نسخہ میرے مطالعے میں آیا، وہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا ہے اور اس مجموعہ کتب کا ایک بیش قیمت نسخہ ہے، جو حافظ محمود شیرانی مرحوم سے خریدا گیا تھا۔ اس کے صفحات ۱۳۰۷ ہیں، لیکن بعض اجزاء غائب ہیں۔ بعض اوراق کو بیچ میں سے کیڑا کھا گیا۔ غائب اجزا میں سے بعض کی نقلیں سید ابو الحسن علی ندوی نے کہیں سے منگوا لی تھیں، میں بھی ان سے مستفید ہوا۔

ان میں سید صاحب کے ابتدائی حالات "مخزن احمدی" سے لے لیے، جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ نواب امیر خاں کی معیت اور سفر حج کے حالات مختلف لوگوں سے سن کر لکھے۔ سفر ہجرت کے حالات کی جگہ سید حمید الدین کے مکاتیب نقل کر دیے، جن سے بہتر اور مفصل تر حالات کا دوسرا مرقع نہیں مل سکا۔ ابتدائی مجاہدات کے حالات خود اُن مجاہدین سے سُنے، جو اُن میں شریک رہے یا منشی خانے کے کاغذات میں دیکھے۔ رمضان ۱۲۴۴ھ سے سید جعفر علی خود سارے حالات کے ناظر تھے۔

واقعہ بالاکوٹ کے بعد جماعت کے حالات اس وقت تک لکھے ہیں جب تک صاحب تالیف خود سرحد میں رہے۔ پھر چند صفحوں میں میر نثار علی عرف تیتو میاں کے جہاد کا ذکر ہے۔ آخر میں اپنے سفر ہجرت اور سفر مراجعت کی پوری تفصیلات درج کر دی ہیں۔ بہر حال یہ بڑی جامع اور مستند کتاب ہے، اگرچہ "وقائع" جتنی مفصل نہیں۔ سید جعفر علی کے مفصل حالات اس کتاب کے تیسرے حصے میں درج ہوں گے۔

۲۔ "وقائع احمدی": قلمی مآخذ میں سب سے بڑا ذخیرۂ معلومات یہی کتاب ہے۔ اس کا نام بعض اصحاب نے "تاریخ احمدی" لکھا ہے۔ بعض نے "تاریخ کبیر"۔ میری معلومات کے مطابق اس کا نام "وقائع احمدی" ہے۔

اس کے کئی نسخے میری نظر سے گزرے:

۱۔ دو جلدیں امتیاز علی خاں عرشی ناظم کتب خانہ رام پور کی عنایت سے دیکھیں۔ پہلی ۴۹۳ صفحے کی اور دوسری ۴۱۸ صفحے کی۔ ہر صفحے میں پندرہ سطریں اور ہر سطر میں کم از کم پندرہ اور زیادہ سے زیادہ بیس اکیس لفظ۔ پہلی جلد حج کے سلسلے میں سید صاحب کے کلکتہ پہنچنے پر ختم ہو گئی۔

دوسری جلد میں جنگ مردان تک کے حالات تھے۔

ب۔ سید ابوالحسن علی ندوی نے اس کا تیسرا حصہ مرحمت فرمایا۔ ضخامت ۱۱۶۸ صفحات، صفحہ ۲۳ تک فی صفحہ ۱۷ سطریں، بعد میں فی صفحہ ۱۵ سطریں۔ اس میں بالاکوٹ کے بعد تک بھی جماعت کے کچھ حالات تھے اور بیان غیر مختتم تھا۔

ج۔ کچھ مدت بعد سید ابوالحسن علی نے متفرق غیر مرتب اجزا میرے پاس بھیجے۔ انھیں محنت سے مرتب کیا تو دو جلدیں بنیں۔ پہلی جلد میں جنگ مردان سے بالاکوٹ تک کے حالات آ گئے۔ دوسری جلد جماعت کے حالات پر مشتمل تھی، لیکن اس کے صرف ابتدائی اجزا مسلسل تھے۔ پھر جگہ جگہ سے کئی اجزا غائب تھے۔ آخری روایت میں منارہ پر مجاہدین کی یورش کے ابتدائی حالات درج ہیں، باقی اجزا اب تک میسر نہ آ سکے۔

د۔ حضرت مولانا ابوالکلام نے ٹونک سے جو کتابیں منگائی تھیں، ان میں بھی "وقائع" کی ایک ضخیم جلد آ گئی تھی، لیکن وہ ابتدا سے جنگ مردان تک کے حالات پر مشتمل تھی۔

ہ۔ جنگ مردان تک "وقائع" کا ایک نسخہ مجھے سید نور احمد نے مرحمت فرمایا تھا۔

و۔ اسی کتاب کا ایک ناکمل نسخہ مولانا طلحہ کی مہربانی سے ملا۔

سید عبدالجبار شاہ صاحب ستھانوی کا بیان ہے کہ میں طلب علم کے زمانے میں بنارس گیا تھا تو وہاں اس قسم کی ایک ضخیم کتاب جس کی چار جلدیں تھیں، دیکھی تھی۔ سید ابوالحسن علی کو اس کا ایک مکمل نسخہ ٹونک سے مل گیا تھا، لیکن وہ فرماتے تھے کہ آخری حصہ اس کا بھی ناقص معلوم ہوتا ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ جب نواب وزیر الدولہ نے سید صاحب کے نیازمندوں کو جمع کر لیا تو کتاب کی ترتیب کا طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ سب لوگ محلہ قافلہ (جس میں سید صاحب کے اقربا اور مجاہدین آباد تھے) کی مسجد میں بیٹھ جاتے اور جو واقعہ کسی کو یاد ہوتا، بیان کرتا، دوسرے اصحاب سنتے رہتے۔ اگر کسی کو بیان کے کسی حصے سے اختلاف ہوتا تو اس کی تصریح کر دیتا۔ کاتب ہر بیان کو راوی کے الفاظ میں لکھتے جاتے۔ ہر بیان کے ساتھ راوی یا راویوں کے نام درج ہوتے۔ بعض اوقات خود نواب صاحب ان مجالس میں شریک ہو جاتے۔ اس طرح کئی جلدیں مرتب ہو گئیں۔

کتاب کی ترتیب سنہ ۱۲۴۷ھ سے شروع ہوئی تھی اور پہلی جلد سنہ ۱۲۶۷ھ میں مکمل ہوئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ پوری کتاب میں کئی برس لگ گئے۔ اس کے صفحات تین، پونے تین ہزار سے کم نہ ہوں گے، میری نظر سے اس کے قریباً اڑھائی ہزار صفحے گزر چکے ہیں۔

۳۔ **"نورِ احمدی"**: اس کے مولف مولوی نور احمد نگرامی تھے جو جماعتِ مجاہدین میں "مورخِ اسلام" کے لقب سے مشہور تھے۔ سید صاحب کے مخلص مرید تھے، شروع ہی سے آپ کے ساتھ رہے۔ ابتدا ہی میں آپ کے حالات لکھنے کا التزام کر لیا تھا اور جو کچھ لکھا وہ یا تو سید صاحب سے سن کر لکھا یا ان سے تصدیق کرا لینے کے بعد لکھا۔ سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں:

> "ہمہ حکایات ایں کتاب را بہ سماعت شریف حضرت امیر المومنین
> امام المسلمین رسانیدہ غث از ثمین ممتاز ساختہ بودند۔"

تاہم اس کتاب کا محض نام باقی رہ گیا۔ آج تک کہیں سراغ نہ مل سکا۔ کوئی ایسی تحریر بھی مجھے نہیں مل سکی جس سے ظاہر ہو کہ کسی نے اس کتاب کا مسودہ دیکھا تھا، لیکن اس کے لکھے جانے میں شبہہ کی گنجایش نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کا مسودہ مولوی نور احمد کے ساتھ تھا۔ وہ جنگ بالاکوٹ میں شہید ہو گئے۔ یہ کتاب اور سید صاحب کے متعلق دوسری سیکڑوں بیش بہا تحریرات، جنھیں منشی محمدی انصاری نے بڑے اہتمام سے مرتب کرایا تھا اور محفوظ رکھا تھا، بالاکوٹ ہی میں نذرِ آتش ہو گئیں۔

۴۔ **"مخزنِ احمدی"**: یہ کتاب سید صاحب کے بڑے بھانجے سید محمد علی نے مرتب کی تھی اور اس میں سید صاحب کی پیدایش سے شروع کر کے راہِ ہجرت میں قدم رکھنے تک حالات جمع کر دیے تھے۔ سید محمد علی مرحوم سید صاحب سے عمر میں بڑے تھے اور ہجرت سے پیشتر کی زندگی ان کے سامنے گزری تھی، لیکن تفصیلات کے طلب گار کو یہ کتاب دیکھ کر مایوسی ہو گی، اس لیے کہ یہ حالات کا ایک سرسری مرقع ہے۔ ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۵ء) میں یہ مکمل ہوئی۔ حضرت مولف خود فرماتے ہیں:

گر بجوید سالِ تحریرش کسے از ذکر وانش
چشم دارد بر ہزار و دو صد و ہشتاد و ثلث

اس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔ اور حضرات کے پاس بھی اس کی نقلوں کا علم ہوا۔ ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں نواب محمد علی خاں مرحوم نے اسے مطبع مفید عام آگرہ میں چھپوا بھی دیا تھا۔ مطبوعہ نسخہ آجکل بہت کمیاب ہے۔ میرے پاس موجود ہے۔ ضخامت ایک سو بیس صفحے۔ کاغذ اتنا ناقص ہے کہ ورق گردانی میں خاص احتیاط سے بھی کام لیا جائے تو ورق پھٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ تصحیح کا بھی چنداں اہتمام نہ کیا گیا۔

۵۔ **"سیرتِ علمیہ" اور "تذکرۃ الابرار"**: سیرتِ علمیہ سید صاحبؒ کے عمِ محترم سید محمد نعمان نے شاہ علم اللہؒ کے حالات میں لکھی تھی، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ آخر میں ان کے اخلاف و خلفا کے حالات

شامل کر دیے تھے۔ پھر سید محمد نعمان حج کے لیے چلے گئے۔ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ ہوتے ہوئے فلسطین تشریف لے گئے اور وہیں زیارتِ حضرت موسیٰؑ کے پاس فوت ہو گئے، جو قدس شریف کے مشرق میں بحیرۂ لوط سے قریب ہے۔ پھر اسی خاندان کے ایک فرد سید فخر الدین نے سیرت علمیہ کی تبییض کی۔ بعد کے حالات بڑھا کر کتاب کو اپنے عہد تک خاندانی حالات کا ایک جامع مرقع بنا دیا اور اس کا نام "تذکرۃ الابرار" رکھا۔ میں نے اس کا قلمی نسخہ سید ابو الحسن علی کی عنایت سے دیکھا۔

۴ - **مکاتیب :** میرے پاس سید صاحب کے مکاتیب کے پانچ مختلف مجموعے فراہم ہو گئے، تین بڑے اور دو چھوٹے۔ ان کی کیفیت ذیل میں درج ہے :

ا - **مکاتیب سید صاحبؒ :** یہ ۱۷۵ صفحے کی کتاب ہے۔ اس میں بیشتر مکاتیب سید صاحبؒ کے ہیں۔ بعض شاہ اسماعیل کے اور دو مکتوب شاہ عبد العزیز کے ہیں۔ کتاب کے آخر میں مرقوم ہے: "تم المجلد الاول من مکتوبات الشریفہ"۔ اس کی دوسری جلد آج تک نہ مل سکی۔ میں نے کابل میں سنا تھا کہ مولانا منصور الرحمٰن مرحوم کے پاس دونوں جلدیں موجود ہیں۔ میں نے ان سے نقل مانگی تو وہ ٹال گئے، غالباً اس وجہ سے کہ ان مکاتیب میں موجودہ حکمران کے جدِ امجد سردار سلطان محمد خاں اور ان کے بھائیوں کا ذکر کچھ اچھے انداز میں نہیں ہوا۔ مولانا چونکہ اس وقت کابل میں تھے، انھوں نے ان مکاتیب کی نقل دینے کو تقاضائے احتیاط نہ سمجھا کہ ممکن ہے یہ امر بر سرِ کار اصحاب پر گراں گزرے، حالانکہ جس حد تک مجھے علم ہے حکمران خاندان کا ایک فرد بھی ایسا نہیں، جو حق و صداقت کو خونی رشتے کے تابع رکھے اور لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی کا قرآنی اصول ہمارے اور ان کے سامنے ہے۔ معلوم نہیں اب وہ مکاتیب کہاں ہیں۔

ب - **مکتوباتِ شاہ اسماعیل :** یہ مجموعہ ۲ - جمادی الاولیٰ ۱۲۹۶ھ (۲۸ - اپریل ۱۸۷۹ء) کو بھوپال میں مرتب ہوا اور مجھے مولانا ثناء اللہ مرحوم امرتسری سے ملا تھا۔ اس کے ۳۳۹ صفحے ہیں اور مضمون ختم نہیں ہوا۔ اس میں بیشتر مکاتیب وہی ہیں جو نمبر الف میں ہیں۔ نئے مکاتیب بھی ہیں مثلاً ڈمگلہ اور شنکیاری کے معرکوں سے پیشتر شاہ اسماعیل کے مراسلے، شاہ اسحاق اور شاہ یعقوب کے نام سید صاحب اور شاہ اسماعیل کے عربی مکاتیب۔ میں نے اس کتاب کا نام مکتوباتِ شاہ اسماعیل صرف اس وجہ سے لکھا کہ مرتب کرنے والے نے یہی نام تجویز کیا۔ اس کا ایک مکمل نسخہ مولانا محمد شفیع مرحوم، سابق پرنسپل اورنٹیل کالج، صدر شعبہ دائرۂ معارفِ اسلامیہ کے پاس تھا۔ میں نے اسی سے اپنا ناقص نسخہ مکمل کیا۔

ج ۔ محولہ بالا کا ایک نہایت خوش خط نسخہ مجھے پروفیسر سراج الدین آذر نے عنایت فرمایا تھا۔ اس کے اوراق منتشر تھے۔ میں نے بڑی محنت سے اسے مرتب کیا، اس کا خط قابل دید ہے، لیکن غلطیاں بہت زیادہ ہیں اور آخر کے چند اوراق غائب ہیں۔

د ۔ **مجموعہ مکاتیب بریلی:** یہ فل سکیپ سائز کے بتیس صفحوں کا ایک مجموعہ ہے: جو سید ابوالحسن علی نے بریلی سے نقل کرا کے مجھے بھجوایا۔ اس میں زیادہ تر وہ مکاتیب ہیں، جو سید صاحب نے اپنی ازواج اور متعلقین کو تحریر فرمائے۔ اس کا نام میں نے "مجموعہ مکاتیب بریلی" رکھا۔

ھ ۔ **مکاتیب سید حمید الدین:** یہ مکاتیب میں نے منظورۃ السعدا سے نقل کرائے، دو مکتوب بریلی سے نقل ہو کر آئے۔ ایک مکتوب مولانا عبدالحی کا ہے جو انھوں نے سرحد پہنچ کر وہاں کے حالات اور سفر کی تفصیلات کے متعلق تحریر فرمایا۔ سید حمید الدین کے مکاتیب سفرِ ہجرت کے متعلق مستند معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہیں۔ افسوس کہ ان کا پہلا مکتوب کہیں سے نہ مل سکا، ورنہ سفرِ ہجرت کے متعلق کسی دوسرے ماخذ کی احتیاج نہ رہتی۔

و ۔ **کتابُ العبرۃ:** مرتبہ مولانا سید عبدالجبار شاہ صاحب ستھانوی سابق بادشاہ سوات و سابق وزیر اعظم امب۔ سید مرحوم ممدوح خاندان سادات ستھانہ کے ایک جلیل القدر رکن تھے۔ یہ کتاب انھوں نے اپنے خاندان کے حالات میں لکھنی شروع کی تھی اور سلسلہ بیان کا آغاز سید علی ترمذی غوث بونیر سے ہوا ہے، جو سلاطین مغلیہ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ پانی پت کی پہلی جنگ میں شریک رہے۔ پھر امارت کا سرو سامان ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ وقت کے بعض بزرگوں سے کسب فیض کے بعد اپنی پوری زندگی اہل سرحد کی تعلیم و تزکیہ میں گزار دی۔ بونیر آپ کا مرکز تھا۔ وہیں وفات پائی۔ ان کا مزار مرجع عام ہے۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ سید علی ہی کی برکت سے سرحد میں دین کا احیاء ہوا اور آپ کے فیض کی موجیں کابل سے کشمیر تک پورے یاغستانی علاقے میں پھیل گئیں۔ ستھانہ بھی آپ ہی کے اخلاف نے آباد کیا۔ جہاں سے سید اکبر شاہ اٹھے اور وہ سید صاحب کے معتمد علیہ رفیق و مشیر تھے۔ اسی خاندان کے ایک رکن سید عمر شہید تھے، جنھوں نے جماعت مجاہدین کی خاطر انگریزوں سے جنگ کی اور اسی جنگ میں شہید ہوئے۔ اسی خاندان کے جلیل القدر فرزند شہزادہ مبارک شاہ (ابن سید اکبر شاہ) اور شہزادہ محمود شاہ (والد ماجد سید عبدالجبار شاہ) تھے جو امبیلہ کی جنگ میں مجاہدین کے ساتھ ہو کر انگریزوں کے خلاف لڑے۔ اسی خاندان کی ایک شاخ کنڑ (افغانستان) میں جا بسی تھی، جس سے سید جمال الدین افغانی اٹھے۔

سید عبدالجبار شاہ نے کتاب خاندانی حالات میں لکھی تھی، لیکن چونکہ اس خاندان کا تعلق سرحد کے ہر حصے سے تھا، اس لیے مغلوں کے عہد حکومت سے آج تک یہ سرحد کی نہایت مفصل تاریخ بن گئی نیز سادات ستھانہ سید صاحب اور مجاہدین کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے، اس لیے اس موضوع پر بھی خاصی معلومات فراہم ہو گئیں۔ بعض روایتیں ایسی ہیں، جو کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتیں۔ مثلاً بابا بہرام خاں تنولی کی روایات جو سید صاحب کے مجاہدات میں شریک رہے تھے اور بہت لمبی عمر پا کر ۱۹۲۱ء میں فوت ہوئے۔ ان کی صاحبزادی کی شادی سادات ستھانہ کی اس شاخ کے ایک فرد سے ہوئی تھی جو گندف میں مقیم ہو گئی تھی۔ برادرم سید مبارک شاہ گندفی مرحوم (برادر زادہ سید عبدالجبار شاہ) بابا بہرام خاں مرحوم کے نواسے تھے۔ اس گہری رشتہ داری کی وجہ سے سید عبدالجبار شاہ کو تمام حالات سننے کے خاص مواقع حاصل ہوئے۔

کتاب العبرۃ کئی جلدوں میں ہے۔ یہ چھپے گی تو تاریخ و تمدن سرحد کے متعلق مستند معلومات کا ایک سائیکلوپیڈیا ہوگی۔ اس کی تمام جلدیں مہینوں میرے پاس رہیں اور میں نے سرحد کے بارے میں تمام معلومات انھیں سے حاصل کیں۔

۸۔ روزنامچہ میرزا عطا محمد خاں شکارپوری: میرزا عطا محمد خاں کا نانا، قیصر محمد خاں، امیران سندھ کا وکیل تھا اور ایک مرتبہ سید اسماعیل شاہ وزیر سندھ کے ہمراہ فتح خاں بارک زئی کے پاس سفیر بن کر گیا تھا۔ میرزا صاحب موصوف کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ اپنے نانا سے سارے حالات سن کر مرتب کر لیے۔ وہ خود بھی ہرات، کابل، قندھار اور پشاور کے سفر کر چکا تھا۔ ان سفروں میں جو کچھ دیکھا اور سنا، اُسے بھی ضبط تحریر میں لے آیا۔

اس روزنامچے کی چار جلدیں ہیں:

جلد اول	۹۵ صفحات
جلد دوم	۹۵ ″
جلد سوم	۳۴۴ ″
جلد چہارم	۱۵۵ ″

بیان کا آغاز نادر شاہ افشار کے قتل اور احمد شاہ درانی کی تخت نشینی سے ہوتا ہے۔ پھر تیمور شاہ اور زمان شاہ کے حالات اختصاراً بیان کرنے کے بعد پایندہ خاں بارک زئی کے قتل پر پہنچ جاتا ہے جس کے باعث سدوزئیوں اور بارک زئیوں کے درمیان رزم و پیکار کا لامتناہی سلسلہ جاری ہوا اور افغانستان کی مملکت ان خانہ جنگیوں میں تباہ ہوتی رہی!

میرزا عطا محمد خاں کی زندگی میں سید صاحب سندھ کے راستے سرحد گئے اور وہاں مرکز قائم کر کے بحالیِ حکومتِ اسلامیہ کے لیے مجاہدات شروع کیے۔ میرزا نے ان کے حالات تیسری جلد میں لکھے ہیں، جو زیادہ تر سید صاحب کے مکاتیب سے ماخوذ ہیں۔ اس کتاب سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سندھ میں سے کس کس نے اور کس حد تک سید صاحب کی تحریک کا خیر مقدم کیا۔ کون کون ادائے فرض کی طرف متوجہ ہوا اور کس کس سے غفلت سرزد ہوئی۔ سید صاحب کے حالات کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: "زبدۃ السادات عظام، خلاصہ خاندان کرام، رافع رایات اسلام، قامع بنیاد کفر و ظلام پیر احمد شاہ غازی بہ مقتضائے حصول سعادت سرمدی و بہ امید حیات ابدی، برطبق مضمون آیۂ کریمہ: يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ؛ جہاد کے لیے اُٹھے اور سب کو اس کار خیر کی دعوت دی۔

میرزا عطا محمد خاں بھی ان لوگوں میں سے ہے جو زیادہ سے زیادہ عقیدت رکھنے کے باوجود سید صاحب کی شہادت کے قائل تھے اور غیبت کے افسانے کو انھوں نے کبھی قبول نہ کیا۔

یہ روزنامچہ مجھے سید علی محمد راشدی سابق وزیر و سفیر پاکستان اور سید حسام الدین راشدی سے ملا اور مہینوں میرے پاس رہا۔

۹- رسالہ دراحوال مولوی نصیر الدین: مولوی نصیر الدین دہلوی سید صاحبؒ کے خلفائے خاص میں سے تھے۔ واقعۂ بالاکوٹ سے کئی برس بعد مجاہدین کا ایک قافلہ لے کر جہاد کے لیے روانہ ہوئے۔ سندھ و بلوچستان کی سرحد پر کچھ مدت گزاری۔ جب انگریزوں نے شاہ شجاع کو لے کر افغانستان پر حملہ کیا تو مولوی صاحب امیر دوست محمد خاں کی طرف سے غزنی کی حفاظت میں انگریزوں کے خلاف لڑے۔ شیخ ولی محمد پھلتی ہندوستان چلے آئے تو مولوی صاحب نے ستھانہ پہنچ کر مجاہدین کی زمام قیادت سنبھال لی اور وہیں وفات پائی۔ ان کے مفصل حالات کتاب کی چوتھی جلد میں بیان ہوں گے، لیکن اتنا عرض کر دینا چاہیے کہ یہ مولوی نصیر الدین اس نام کے دوسرے صاحب سے مختلف تھے جو عام طور پر "منگلوری" کہلاتے ہیں۔

زیر غور رسالہ مولوی صاحب موصوف کے ایک ارادت مند ابو احمد علی بن احمد نے مرتب فرمایا تھا اس کے مقدمے اور پہلے باب میں سید صاحب کے حالات اختصاراً بیان ہوئے ہیں۔ میں نے اس کا جو نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں دیکھا، وہ ناقص ہے۔ سنا ہے کہ اس کا مکمل نسخہ ٹونک کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس رسالے سے معلوم ہوا کہ سید صاحب کے حالات میں دو کتابیں (تاریخ کبیر اور جامع محیط) آپ کے چھوٹے بھانجے سید عبدالرحمٰن کے زیر اہتمام مرتب ہو چکی تھیں۔ میرے علم کے مطابق "وقائع احمدی" ہی کا دوسرا نام "تاریخ کبیر" تھا۔ "جامع محیط" کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

۱۰۔ **ظفر نامہ رنجیت سنگھ:** اس نام کی دو کتابیں ہیں، ایک منظوم جو کنہیا لال ہندی نے شاہنامے کی بحر میں لکھی تھی۔ اس میں سید صاحب کے حالات بہت کم ہیں۔ دوسری کتاب نثر میں دیوان امرناتھ نے مرتب کی تھی جو ۱۸۳۶ء پر پہنچ کر تحریر ختم ہو گئی۔ اس کا انداز تحریر صاف اور سلجھا ہوا نہیں۔ پروفیسر سیتارام کوہلی نے اسے ایڈٹ کیا اور ۱۹۲۸ء میں پنجاب یونیورسٹی نے اسے چھاپا۔ اس میں سید صاحب کے متعلق بعض نادر معلومات ہیں۔ مثلاً یہ کہ شہادت کے بعد شیر سنگھ نے سید صاحب کی تصویر تیار کرائی تھی، جو لاہور بھیجی گئی۔ دیوان امرناتھ نے بھی وہ تصویر دیکھی تھی۔

۱۱۔ **تواریخ عجیبہ یا سوانح احمدی:** مرتبہ مولوی محمد جعفر تھانیسری۔ اردو زبان میں سید صاحب کے متعلق یہ پہلی کتاب ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن دہلی کے مطبع فاروقی میں چھپا تھا۔ دوسرا ایڈیشن مالک رسالہ "صوفی" (پنڈی بہاؤالدین) نے بلالی سٹیم پریس ساڈھورہ ضلع انبالہ میں چھپوایا۔ تیسرا ایڈیشن اسلامیہ سٹیم پریس لاہور میں طبع ہوا۔ اس کتاب نے سید صاحبؒ کے متعلق دو نہایت افسوسناک غلط بیانیوں کو عام کیا: اوّل یہ کہ سید صاحب انگریزوں سے نہیں لڑنا چاہتے تھے، صرف سکھوں سے لڑائی پر آمادہ ہوئے تھے۔ اس غلط بیانی کو مستند بنانے کے لیے سید صاحب کے مکاتیب کی عبارتوں میں تحریف کی گئی۔ دوسرے مولوی سید جعفر علی نقوی کی کتاب کے ایک فقرے کو متن سے الگ کر کے سید صاحب کی غیبت کے عقیدے کو تقویت پہنچائی گئی، حالانکہ اس فقرے کو مسئلۂ غیبت سے کوئی تعلق نہ تھا اور سید جعفر علی نقوی کی کتاب میں ایک دو نہیں بلکہ بہت سے ثبوت شہادت کے موجود تھے۔ ان امور پر مفصل بحثیں میری کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۲۔ **حیات طیبہ:** مؤلفہ میرزا حیرت دہلوی۔ یہ اصل میں شاہ اسماعیل شہید کی سیرت ہے، جس میں سید صاحب کی جنگوں کے حالات آ گئے ہیں۔ آخر میں سید صاحب کے حالات بھی "اختصاراً" بیان کر دیے ہیں۔ یہ کتاب تاریخ نہیں، بلکہ افسانہ ہے۔ کئی واقعات و حالات بداہتہً ایسے ہیں، جو میرزا صاحب نے خود تیار کر لیے، مثلاً شاہ اسماعیل کے وعظ یا جہاد کی نیت سے ان کی ورزشیں یا پنجاب کا دورہ۔ جن جنگوں میں شاہ اسماعیل سرے سے شریک ہی نہ تھے، میرزا صاحب نے ان میں بھی شاہ صاحب ہی کو مرکزی شخصیت کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سید صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے بڑی کوشش سے نواب امیر خاں کو انگریزوں سے مصالحت پر آمادہ کیا تھا، حالانکہ سید صاحب نے نواب صاحب کا ساتھ صرف اس بنا پر چھوڑا تھا کہ وہ انگریزوں سے مل گئے تھے۔ میرزا صاحب کی رائے شاید یہ ہو کہ رنگ آمیزی سے واقعات زیادہ پُرتاثیر بن جائیں گے، لیکن جو واقعہ اثر پیدا کرنے کے لیے رنگ آمیزی کا محتاج ہو، وہ اس

قابل ہی نہیں ہوتا کہ دواوین تاریخ و سیر میں جگہ پائے۔ بہرحال یہ کتاب سراسر ناقابل اعتماد ہے اور اس کے متفرق واقعات پر میری کتاب میں جا بجا تبصرے ملیں گے۔ مفصل تبصرے کتاب کی تیسری جلد میں بہ سلسلہ حالات شاہ اسماعیل آئیں گے۔

۱۳ - تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار: مصنفہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم۔

نواب مرحوم نے سید صاحب کا ذکر مختلف کتابوں میں کیا ہے۔ زیر غور کتاب میں ان کے حالات مستقل عنوان کے ماتحت لکھے ہیں۔ مرحوم کے والد سید اولاد حسن قنوجی، سید صاحب کے خاص ارادت مند تھے۔ پھر نواب صاحب کا تعلق فرمانروایان ٹونک اور اعزۂ سید صاحبؒ سے بھی برابر قائم رہا، اس لیے انھیں سید صاحب کے خاصے حالات معلوم ہوں گے۔ "تقصار" میں جو کچھ لکھا اگرچہ بہت مختصر ہے، لیکن چند باتیں خاص توجہ کی محتاج ہیں۔ مثلاً:

ا - سید صاحب نے علم باطن میں درجہ کمال حاصل کر لیا تھا اور ہدایت خلق میں آپ اللہ تعالیٰ کا ایک نشان تھے۔

ب - ان کے خلفا کے مواعظ کی برکت سے ہندوستان کی سرزمین شرک و بدعت سے پاک ہو کر کتاب و سنت کے اتباع پر قائم ہو گئی۔

ج - سید صاحب سلوک ظاہر و باطن میں بے مثال تھے۔

د - ان کے غائب ہو جانے کی حکایت محض افترا ہے اور عقل و نقل سے اسے کوئی مناسبت نہیں۔

ہ - ماضی قریب میں کسی ایسے صاحب کمال کا نشان دنیا کے کسی ملک میں نہیں ملتا۔

و - سید صاحب کو شیخ محمد بن عبد الوہاب سے ظاہراً یا باطناً کوئی علاقہ نہ تھا۔

آخر میں لکھا ہے کہ کتاب و سنت میں جہاد کے شروط و قیود ہیں۔ اسی لیے سید صاحب نے ہندوستان میں جہاد نہ کیا اور حکومت برطانیہ کے خلاف محاذ قائم نہ فرمایا۔ بلکہ باہر جا کر سکھوں اور افغانوں کے خلاف لڑے۔ مبادا اس بیان سے غلط فہمی پیدا ہو، اس لیے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ سید صاحب انگریزوں کو مسلمانوں کے لیے سکھوں سے بدرجہا زیادہ خطرناک سمجھتے تھے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ مختلف مصالح کی بنا پر سرحد کو مرکز بنایا اور اس میں سکھ سامنے آ گئے۔ افغانوں کے خلاف لڑائیاں سید صاحبؒ کے مقاصد میں داخل نہ تھیں، نہ سید صاحب انھیں پسند کرتے تھے، لیکن جن افغانوں نے مسلمانوں خلاف سکھوں کا ساتھ دیا اور بار بار کی تفہیم کے باوجود باطل کا راستہ نہ چھوڑا، ان سے مجبوراً لڑنا پڑا۔

۱۴ - ترجمانِ وہابیہ: مصنفہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم۔ یہ رسالہ ۱۸۸۳ء میں مرتب

ہوا۔ جب ہندوستان میں "وہابیت" کو بہت بڑا جرم سمجھا جاتا تھا۔ خود نواب صاحب بھی "وہابیت" اور تبلیغ جہاد کی بناء پر انگریزوں کے معتوب ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا خطاب ضبط ہوا۔ توپوں کی سلامی روک دی گئی اور ریاست بھوپال کے معاملات سے انھیں الگ ہونا پڑا۔

رسالے میں نواب نے اپنی بعض سابقہ کتابوں کے ان حصّوں کا مضمون اردو میں بیان کیا ہے، جن میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کا ذکر تھا۔ اس طرح ثابت کیا ہے کہ وہ "وہابیت" کے الزام سے کاملاً بری ہیں۔ اس کتاب میں بھی سید صاحب اور شاہ اسماعیل کا ذکر ضمناً آیا ہے۔

۱۵- اِسلام کی دسویں کتاب: مصنفہ مولوی رحیم بخش۔ مولوی صاحب مرحوم سید صاحب کے ایک ارادت مند مولوی حیدر علی کے شاگرد تھے۔ جو ملوداں ضلع فیروزپور میں مقیم ہو گئے تھے۔ انھیں کے فرزند اکبر مولانا عبدالرحیم تھے جو ہجرت کر کے سرحد پہنچے تو محمد بشیر نام رکھا۔ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ انھیں سے یہ کتاب منسوب ہے۔

اس کتاب میں سید صاحب کے حالات قریباً سولہ صفحوں میں آئے ہیں، حالانکہ مغل سلاطین کے پورے خاندان کے احوال و سوانح کے لیے اتنے صفحے وقف نہیں ہوئے۔ چونکہ یہ بچوں اور بچیوں کے لیے لکھی گئی تھی، اس لیے زیادہ تحقیق و کاوش سے کام نہیں لیا گیا۔

۱۶- اَرواحِ ثلاثہ: یہ تین کتابوں کا مجموعہ ہے: اوّل "امیر الروایات" جس میں مولوی امیر شاہ خاں سے سُنی ہوئی روایات جمع کر دی گئیں، دوسری "روایات الطیب" جو مولانا محمد طیب دیوبندی کی سنی ہوئی روایات کا مجموعہ ہے، تیسری "اشرف التنبیہ" جس میں مولانا اشرف علی مرحوم نے مختلف روایات کے بعض نکات کی شرح فرما دی۔ تینوں کو یکجا چھاپ کر "ارواح ثلاثہ" نام رکھا۔

اس میں سید صاحب، شاہ اسماعیل اور بعض دوسرے بزرگوں کے متعلق حکایات ہیں۔ لیکن بعض حکایات بداہتہً غلط ہیں۔ مثلاً نمبر ۵، ۵۵، ۹۱، ۱۱۰، ۱۲۱۔ ان پر بحث کا یہ موقع نہیں۔

۱۷- مجمُوعہ تسعہ رسائل: یہ مجموعہ مولانا عبدالرحیم صادق پوری نے چھپوایا تھا جو مجاہدین کی مالی اعانت کے سلسلے میں ماخوذ ہوئے اور اٹھارہ برس انڈیمان میں قید رہے۔ اس میں سات رسالے مولانا ولایت علی مرحوم کے ہیں۔ یعنی رد شرک، عمل بالحدیث، اربعین فی المهدیین (مہدی کی آمد کے متعلق چالیس حدیثیں) دعوت، تیسیر الصلوٰۃ، تبیان الشرک۔ ایک رسالہ بُت شکن مولانا عنایت علی کا ہے اور ایک رسالہ "فیض الفیوض" مولانا فیاض علی کا۔

ان میں سے رسالہ دعوت میں مولانا ولایت علی نے سید صاحب کی غیبت کا عقیدہ پیش کیا ہے۔

اس پر مفصّل بحث کتاب میں ہو چکی ہے اور یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

۱۸۔ **الدر المنثور فی تراجم اہل الصادق فور:** مرتبہ مولانا عبدالرحیم صادق پوری۔ اس کا دوسرا نام "تذکرہ صادقہ" ہے۔ اس کتاب میں صادق پور کے دو بزرگ منزلت خاندانوں کا تذکرہ ہے، جن کے افراد ابتدا ہی سے سید صاحب کے ساتھ وابستہ ہوئے اور جانی و مالی قربانیوں میں سرزمین پاک و ہند کا کوئی دوسرا گھرانا ان کے برابر نہ پہنچ سکا۔ اس میں سرحدی جنگوں کا ذکر بہت مجمل ہے۔ لیکن جماعتِ مجاہدین کے متعلق اس سے بعض قیمتی معلومات حاصل ہوئیں۔

۱۹۔ **وصایا الوزیر علی طریقۃ البشیر والنّذیر:** مرتبہ نواب وزیر الدولہ امیر الملک محمد وزیر خاں بہادر نصرت جنگ والیِ ٹونک۔ یہ کتاب چالیس وصیتوں پر مشتمل ہے۔ بڑے سائز کی دو جلدوں میں چھپی تھی۔ پہلی جلد کے صفحے ۳۶۰ ہیں اور دوسری کے ۲۱۴۔ اس میں جا بجا سید صاحب، شاہ اسماعیل اور جماعت کے دوسرے افراد کے متعلق حکایات ہیں۔

۲۰۔ **تنبیہ الضّالین عن طریق سید المرسلین:** مرتبہ مولانا محمد خان عالم مدراسی۔ میرے پاس اس کا قلمی نسخہ ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ شائع ہوئی یا نہ ہوئی۔ محمد خان عالم مدراس کے بہت بڑے رئیس اور نواب ارکاٹ کے خسر تھے۔ جب سید صاحب نے مولانا محمد علی رام پوری کو حیدر آباد سے بسلسلۂ دعوت مدراس بھیجا تو محمد خان عالم مولانا ہی کے ارشادات کی برکت سے راہِ حق پر قائم ہوئے اور زندگی بھر مدراس میں ہدایت کا منار بنے رہے۔ زیرِ غور کتاب میں انھوں نے اہل بدعت کی تہمت طرازیوں کا جواب دیا ہے۔ اس کتاب سے مولانا محمد علی کی دعوت کے متعلق قیمتی معلومات ملیں۔

۲۱۔ **درِ مقال:** مصنفہ مولوی عبدالحق آروی (بہار)۔ مولوی صاحب مرحوم مہاجر و مجاہد تھے۔ ہندوستان پر انگریز چھا گئے تو مولوی صاحب ترکِ وطن کر کے سندھ پہنچے۔ سندھ بھی انگریزوں کے قبضے میں آ گیا تو سرحد چلے گئے۔ سید اکبر شاہ ستھانوی سوات کے بادشاہ بنے تو انھوں نے مولوی عبدالحق کو دبیرِ اعظم بنا لیا تھا۔ امبیلہ کی جنگ میں بھی مولوی صاحب شریک رہے۔ آخری عمر میں الاڈنڈ ڈھیری (سوات) میں مقیم ہو گئے تھے۔ وہیں وفات پائی۔

"درِ مقال" شاہنامے کی بحر میں ایک طویل مثنوی ہے جس میں جنگ امبیلہ کے حالات بیان کرنے منظور تھے۔ بہت سی دوسری باتیں بھی آ گئیں۔ شعر معمولی ہیں، لیکن مضمون بڑا قیمتی ہے۔ اس کا اصل نسخہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا سید عبدالجبار شاہ ستھانوی کے پاس ہے۔ اس کی ایک نقل سید ممدوح نے مجھے مرحمت فرمائی۔ اس کتاب کے اور کسی نسخے کا مجھے علم نہیں۔

۲۲ - رسالہ: اس کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ مصنّفہ ابو الغضنفر مولوی نجف علی ابن محمد عظیم الدین ابن محمد خبیر الدین۔ مولوی نجف علی صاحب جھجر کے باشندے تھے۔ ٹونک گئے اور وہاں سید صاحبؒ کے حالات سے رئیس کا شغف دیکھا تو عربی زبان میں سید صاحبؒ، شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحی اور شاہ محمد اسحاق کے حالات لکھ دیے۔ میں نے اسے ان کتابوں میں دیکھا جو حضرت مولانا ابو الکلامؒ نے میری درخواست پر عاریۃً ٹونک سے منگائی تھیں۔ اس کے ۱۷۶ صفحے ہیں۔ فی صفحہ ۱۵ سطر اور فی سطر دس یا بارہ الفاظ۔

۲۳ - اخبار جناب سید احمد: اس نام کے دو مجموعے میں نے ان کتابوں میں دیکھے جو حضرت مولانا ابو الکلامؒ نے ٹونک سے منگائی تھیں۔ ایک کا نمبر کتب خانے میں ۲۰۶ ہے، دوسری کا ۲۰۹۔ ان دونوں میں سید صاحب کے مختلف خطوط جمع کر دیے گئے ہیں۔ نمبر ۲۰۶ میں شاہ اسماعیل شہید کے دو قصیدے اور ایک مثنوی بھی ہے۔ قصیدوں میں سے ایک نعت میں ہے، دوسرا سید صاحب کی مدح میں۔ مثنوی کا نام سلکِ نور ہے۔

۲۴ - مثنوی شہر آشوب: مولفہ حکیم عبدالحمید صاحب صادق پوری۔ اس مثنوی میں حکیم صاحب نے اپنے خاندان کی تباہی کا حال لکھا ہے جبکہ ان کے والد مولانا احمد اللہ کو ایک الگ مقدمے میں کالے پانی کی سزا دی گئی۔ ان کے چچا مولانا یحییٰ علی اور مولانا عبدالرحیم کو الگ انبالہ والے مقدمے میں کالے پانی بھیجا گیا اور جائداد ضبط کر لی گئی۔

ان کے علاوہ "نتائج الحرمین"، "ارمغان احباب" اور متعدد دوسری کتابوں کی کیفیت بیان کرنا چاہتا تھا، لیکن خوفِ اطناب قدم قدم پر عنان گیر ہے لہٰذا ان کے صرف درج کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ یہ نام جلد دوم کے آخر میں ملاحظہ فرمائیے۔

پہلا باب

اجدادِ کرام

تا گوہر آدم نسبم باز بہ استند
ز آبائے خود از بشرم اصحاب کرم را

نسب سید صاحب کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

(۱) سید احمد، بن (۲) سید محمد عرفان، بن (۳) سید محمد نور، بن (۴) سید محمد ہدیٰ، بن (۵) سید علم اللہ، بن (۶) سید محمد فُضَیل، بن (۷) سید محمد معظم، بن (۸) قاضی سید احمد، بن (۹) قاضی سید محمود، بن (۱۰) سید علاء الدین، بن (۱۱) سید قطب الدین ثانی، بن (۱۲) سید صدر الدین ثانی، بن (۱۳) سید زین الدین، بن (۱۴) سید احمد، بن (۱۵) سید علی، بن (۱۶) سید قیام الدین، بن (۱۷) سید صدر الدین، بن (۱۸) قاضی سید رکن الدین، بن (۱۹) امیر سید نظام الدین، بن (۲۰) امیر سید قطب الدین محمد الغزنوی الکروی، بن (۲۱) سید رشید الدین، بن (۲۲) سید یوسف، بن (۲۳) سید عیسیٰ، بن (۲۴) سید حسن، بن (۲۵) سید ابو الحسن، بن (۲۶) سید ابو جعفر، بن (۲۷) سید قاسم، بن (۲۸) سید ابو محمد عبد اللہ، بن (۲۹) سید حسن الاعور الجواد، بن (۳۰) سید محمد ثانی، بن (۳۱) سید ابو محمد عبد اللہ الاشتر، بن (۳۲) سید محمد المہدی ذو النفس الزکیہ، بن (۳۳) سید عبد اللہ المحض، بن (۳۴) سید حسن مثنیٰ، بن (۳۵) حضرت امام حسن علیہ السلام ابن (۳۶) امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام۔

امام حسن علیہ السلام کے فرزند سید حسن مثنیٰ کی شادی امام حسین علیہ السلام کی صاحبزادی سیدہ فاطمہ صغریٰ سے ہوئی تھی۔ اس طرح سید عبد اللہ المحض دونوں اماموں کی نجابت کے وارث بنے۔ وہ خود اور ان کی اولاد اس امتیاز کی وجہ سے "الحسنی الحسینی" کہلائی۔

سید محمد المہدی اس سلک نور میں ایسی مقدس ہستیاں بھی ہیں، جن کے حالات روزِ روشن کی طرح زمانے پر آشکارا ہیں۔ مثلاً امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰ اور امام حسن علیہما السلام۔ بعض کے متعلق اس کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ عمر بھر گوشہ نشین رہے، ذکر و فکر میں زندگی گزاری اور مالک حقیقی سے جا ملے۔ جن بزرگواروں کے کارناموں سے تاریخ کے صفحات مزین ہوئے، ان میں سب سے پہلے سید محمد المہدی ذو النفس الزکیہ آتے ہیں۔

اموی خاندان کی حکومت امیر معاویہؓ سے شروع ہو کر مروان ثانی پر ختم ہوئی۔ بیچ میں صرف ایک مرتبہ اس میں خطرناک خلل پیدا ہوا تھا، جب معاویہ ثانی بن یزید کی دست برداری پر حضرت عبداللہؓ ابن زبیرؓ کا سلسلۂ حکومت خاصا مستحکم ہو گیا تھا۔ حضرت ابن زبیرؓ کی شہادت پر بالفعل مقابلہ باقی نہ رہا، لیکن سادات کرام اور علویوں کی جانب سے امویوں کو سخت خطرہ تھا، اس لیے کہ وہ بلندیٔ نسب اور حسن روش و عمل کی وجہ سے مرجعِ عوام تھے۔ عباسی بھی قرابتِ نسب کی بنا پر انھیں کے حامی بنتے۔

بیچ میں عباسیوں نے اپنی حکمرانی کے لیے کوششیں شروع کر دیں اور ان کے داعی مختلف حلقوں میں پھیل گئے۔ ان داعیوں میں سب سے زیادہ شہرت ابو مسلم نے پائی، جس کا مرکزِ دعوت خراسان تھا۔ تاہم عباسیوں کو یقین نہ تھا کہ عام لوگ سادات کو چھوڑ کر خود ان کی حمایت کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ مروان ثانی کے زمانے میں اموی حکومت کا شیرازہ درہم برہم ہونے لگا تو سادات کرام میں سید محمد المہدی طہارتِ نفس اور فضائل و محاسن میں بہت ممتاز تھے۔ ایک موقع پر مختلف اصحاب نے خفیہ خفیہ ان کو بیعت خلافت کے لیے منتخب کیا۔ بیعت کرنے والوں میں ابو جعفر منصور عباسی بھی شامل تھا۔

ابتری زیادہ پھیلی تو اچانک عباسی میدانِ عمل میں آ گئے۔ کوفہ میں ابوالعباس سفّاح عباسی کی بیعت ہوئی۔ پھر جنگ زاب پیش آئی، جس میں مروان ثانی نے شکست کھائی۔ وہ جان بچا کر بھاگا۔ چھپتا چھپاتا کسی محفوظ مقام کی طرف جا رہا تھا کہ ایک جگہ بحالتِ خواب مارا گیا۔ ابوالعباس نے عنانِ خلافت سنبھالی تو تمام سادات اور علویوں کو حسنِ سلوک سے مطمئن رکھنے کی کوشش کی۔ تین چار برس کے بعد وہ فوت ہوا اور اس کا بھائی ابو جعفر منصور خلیفہ بن گیا

محمدؐ المہدی کی شہادت

منصور کے دل سے یہ واقعہ محو نہ ہو سکتا تھا کہ ایک موقع پر خود اس نے سید محمد المہدی کی بیعت کی تھی۔ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر سید موصوف نے علمِ مخالفت بلند کیا تو مقابلہ مشکل ہوگا، لہٰذا اس نے سید محمد المہدی اور ان کے بھائی سید ابراہیم کو بلطائف الحیل اپنے قابو میں لانے کی تدبیریں شروع کر دیں، لیکن یہ دونوں ہاتھ نہ آئے۔ پریشان ہو کر منصور نے ان کے والد ماجد سید عبداللہ المحض اور حسنی خاندان کے تمام دوسرے افراد و متوسلین کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ ان مظلوم اسیروں میں سید عبداللہ کے ماں جائے بھائی محمد بن عمرو بن حضرت عثمانؓ بھی شامل تھے۔ ان کے املاک و اموال ضبط کر لیے گئے۔ پہلے یہ مدینہ منورہ میں قید رہے، پھر انھیں پابجولاں عراق بلا کر ہاشمیہ[1] کے

---

[1] ہاشمیہ عراق میں دریائے فرات کے کنارے انبار کے پاس تھا۔ یہ عباسیوں کا پہلا دارالحکومت تھا۔

مجلس میں ڈال دیا گیا۔ ان پر جو تعدیاں ہوئیں ان کا ذکر پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

سید محمد المہدی نے اپنے بھائی سید ابراہیم کو بصرے بھیج دیا۔ تجویز یہ تھی کہ دونوں بیک وقت دو مختلف حصوں سے منصور کے مقابلے کے لیے اُٹھیں۔ چنانچہ سید محمد نے مدینہ منورہ کو مرکز بنا کر بالاعلان بیعت کا سلسلہ شروع کیا۔ سید ابراہیم نے بصرہ میں رفیقوں کی خاصی بڑی جماعت پیدا کر لی۔ مدینہ منورہ میں امام مالکؒ نے سید محمد کی حمایت میں فتویٰ دیا۔ بصرہ میں امام ابوحنیفہؒ نے سید ابراہیم کی تائید فرمائی اور چار ہزار درم کی رقم بھی اُن کے پاس بھیج دی۔

منصور نے اپنے ایک سپہ سالار عیسیٰ بن موسیٰ کو دس ہزار فوج دے کر مدینہ منورہ بھیجا۔ سید محمد نے شہر میں بیٹھ کر مقابلے کا فیصلہ کیا۔ خندق بھی تیار کر لی۔ مدینہ منورہ کے شمال میں جبل سلع کے قریب مقابلہ ہوا۔ سید محمد بڑی مردانگی سے لڑے۔ اچانک ایک دشمن نے ان کی پشت میں نیزہ مارا۔ وہ جھکے تو دوسرے نے سینے پر نیزے کا وار کیا۔ دو نیزے کھا کر سید ممدوح گر گئے۔ ان کا سر مبارک قلم کر کے منصور کے پاس بھیج دیا گیا۔ میّت کو تین روز تک سولی پر لٹکائے رکھا۔ ان کی بہن زینب نے تیسرے دن اجازت لے کر میّت جنت البقیع میں دفن کی۔ یہ حادثۂ فاجعہ ۱۵- رمضان المبارک ۱۴۵ھ (۲- جنوری ۷۶۲ء) کو عصر اور مغرب کے درمیان پیش آیا[1]

سید ابراہیم

سید ابراہیم بصرہ میں فوج جمع کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے داعی اہواز میں بھی بھیج دیے تھے۔ ذی قعدہ ۱۴۵ھ میں ایک لاکھ آدمی لے کر کوفہ پر بڑھے۔ کوفہ سے سولہ فرسنگ پر ایک مقام "باخمری" تھا۔ یہاں منصور کی فوج سے مقابلہ ہوا۔ ابتدا میں عباسی فوج شکست کھا کر بھاگ نکلی۔ دوبارہ جمع ہو کر مقابلہ کیا۔ اتفاق سے ایک تیر سید ابراہیم کے حلق میں لگا اور وہ شہادت پا گئے۔ ساتھ ہی ان کی فوج بکھر گئی۔ یہ ۲۵- ذی قعدہ ۱۴۵ھ (۱۴- فروری ۷۶۳ء) کا واقعہ ہے۔

منصور نے سید ابراہیم کا سر سید عبداللہ المحض کے پاس جیل خانے میں بھجوا دیا تھا۔ انھوں نے یہ دل گداز و جانکاہ "تحفہ" دیکھ کر پیغام بھیجا کہ ہماری مصیبت کے دن تیرے عروج کے دنوں کی طرح جلد جلد گزر جائیں گے۔ پھر عنقریب ہم سب اس ابدی عادل کے سامنے حاضر ہونے والے ہیں جو ہمارے اور تیرے درمیان انصاف کرے گا۔

سید ابراہیم نے اپنے بھتیجے سید عبداللہ الاشتر (ابن سید محمد المہدی) کو سندھ بھیج دیا تھا، جہاں کا گورنر

کوئی نشان نہیں ملتا۔ شہادت کی جگہ قبہ بن گیا تھا جو ۱۹۲۶ء تک موجود تھا۔

عمر بن حفص سادات کا عقیدت مند تھا۔ جب سید ابراہیم کی شہادت کی خبر سندھ پہنچی تو عمر بن حفص نے سید عبداللہ کو ایک مقامی سردار کے پاس بھیج دیا۔ منصور نے تعاقب نہ چھوڑا اور اس سردار پر چڑھائی کا حکم دے دیا۔ سید عبداللہ ایک روز دس سواروں کے ہمراہ دریا کے کنارے سیر کر رہے تھے۔ اچانک سامنے سے دشمن کی جمعیت آگئی۔ سید نے نہ بھاگنا مناسب سمجھا، نہ قدم پیچھے ہٹایا اور وہیں لڑ کر شہادت پائی۔ ان کی اہلیہ اور بچہ گرفتار ہو کر منصور کے پاس پہنچے۔ اُنھیں مدینہ منورہ بھیج دیا گیا۔

سید عبداللہ المحض اور باقی اسیر قید کی حالت میں واصل بہ حق ہوئے۔

گویا سید احمد بریلوی کے اسلاف کرام میں سے امیر المومنین حضرت علیؓ اور امام حسنؓ کے بعد سیّد عبداللہ المحض، سید محمد المہدی، سید ابراہیم اور سید عبداللہ الاشتر یکے بعد دیگرے خلعت شہادت سے سرفراز ہوئے:

این راہ بہ پائے تن بہ پایاں نہ رسد   تا جاں نہ زند قدم بہ جاناں نہ رسد

سیّد قطب الدین محمد

جس حد تک میں سراغ لگا سکا ہوں، سیّد صاحب کے اجداد کرام میں سے پہلے پہل سید رشید الدین (شجرے میں ۲۱) نے مدینہ منورہ چھوڑا اور بغداد میں مقیم ہوئے۔ معلوم نہ ہو سکا کہ حرم نبوی کا جوار ترک کرنے کی وجہ کیا ہوئی؟ آیا جہاد و غزا کا ارادہ تھا یا کوئی اور خدمت پیشِ نظر تھی؟ قیاس یہ ہے کہ اہل و عیال کے ساتھ آئے ہوں گے، اس لیے کہ مدینہ منورہ واپس جانے کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ انھوں نے بغداد ہی میں وفات پائی اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حظیرے میں دفن ہوئے۔

ان کے فرزند سید قطب الدین محمد بغداد سے مڑ کر غزنی پہنچے۔ معلوم نہیں کتنی مدت وہاں ٹھہرے سنہ ۶۰۷ھ (سنہ ۱۲۱۰ء) میں وہ اقربا و مریدین کی ایک جماعت کے ساتھ ہندوستان چلے آئے۔ قلب ہند میں اسلامی سلطنت قائم ہوئے صرف سترہ اٹھارہ برس گزرے تھے اور سلطان شمس الدین التتمش کی فرماں روائی کا سکہ رواں تھا۔ سلطان نے سید قطب الدین کے اعزاز و اکرام میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، لیکن انھوں نے دہلی میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ پورب کی سمت روانہ ہو گئے۔ نواح کڑا میں ایک بڑا علاقہ فتح کر کے وہیں سکونت اختیار فرمالی۔ خاندانی شجروں میں انھیں "امیر کبیر" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے کڑا میں قیام کے باعث "اکروی" کی نسبت کا اضافہ ہوا۔ سید احمد کے اجداد میں سے یہ پہلے بزرگ ہیں جو ہندوستان آئے اور یہاں توطن اختیار کیا۔

میرا خیال ہے کہ سلطان دہلی نے سید قطب الدین محمد کو کڑا سے بلا کر دہلی میں شیخ الاسلام کا

عہدہ سے دیا تھا۔ تاریخ فیروز شاہی میں مرقوم ہے:

> از سادات کہ بزرگ تریں بزرگانِ امّت
> اند قطب الدین شیخ الاسلام شہر جدّ بزرگوار
> قاضیانِ بدایوں[1]

> سادات میں سے جو امّت کے بزرگوں
> میں بھی بزرگی کا امتیاز رکھتے ہیں، قطب الدین
> ہیں، جنھیں شہر میں شیخ الاسلامی کا منصب حاصل
> اور وہ قاضیانِ بدایوں کے جدّ بزرگوار ہیں۔

آئینہ اودھ میں بحوالہ بحر الانساب مرقوم ہے کہ سید قطب الدین ۵۸۱ھ (۱۱۵۸ء) میں پیدا ہوئے اور ۶۶۷ھ (۱۲۹۷ء) میں وفات پائی۔

سید قطب الدین کے اخلاف

سید موصوف کے تین فرزند تھے: بڑے سیّد نظام الدین: منجھلے سید قوام الدین اور چھوٹے سید تاج الدین۔ ان میں سے سیّد نظام الدین کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ سید قوام الدین کے حالات میں "تذکرۃ الابرار" کا بیان ہے کہ وہ علم و عمل میں ممتاز اور اپنے عہد میں سادات کے سرتاج تھے۔ سلطان شمس الدین التتمش نے اپنی ایک صاحبزادی فتیحہ ان کے نکاح میں دے دی تھی۔ یہ امر بجائے خود اُن سادات کی برتری و بلند پائگی کا ایک روشن ثبوت ہے۔[2]

سید تاج الدین کو "تذکرۃ الابرار" میں "مشہور بہ سراج شہید" لکھا گیا ہے۔ مجھے اس شہرت کی کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔ تاریخ فیروز شاہی کا بیان ہے:

> سید السادات سید تاج الدین، پسر
> شیخ الاسلام سید قطب الدین بودہ است و سیّد
> تاج الدین مذکور پدر سید قطب الدین و جد سید
> عزالدین قاضیانِ بدایوں بودند و سالہا قضائے اودھ
> حوالت او بود۔ سلطان علاؤ الدین او را از اودھ
> معزول کردہ قضائے بدایوں داد و سید تاج الدین
> علیہ الرحمۃ والغفران بزرگوار سیدے بودہ است[3]

> سید تاج الدین، شیخ الاسلام سید قطب الدین
> کے فرزند تھے۔ ان کے بیٹے سید قطب الدین اور
> پوتے سید عزالدین بدایوں میں منصب قضاء پہ
> فائز رہے۔ سید تاج الدین کئی برس تک اودھ میں
> قاضی رہے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے انھیں اودھ
> کی قضا سے ہٹا کر بدایوں کا قاضی مقرر کر دیا۔ مرحوم و
> مغفور بڑے بلند مرتبہ سید تھے۔

سید قطب الدین کے بڑے بیٹے سید نظام الدین کے فرزند سید رکن الدین کے متعلق ضیاء الدین برنی

---

[1] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۱۱۱۔ [2] تذکرۃ الابرار صفحہ ۱۶۱۔ [3] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۳۴۸ و ۳۴۹

نے لکھا ہے:

سید رکن الدین برادرزادہ سید تاج الدین مذکور قاضی کڑا بودہ است و باری تعالیٰ سید رکن الدین را جامع فضائل آفریدہ بود و بہ کشف و کرامات آراستہ . . . روزگار بہ بزرگی و در ترک و تجرید و در اعطا و ایثار گزرانیدہ است و مولف تاریخ فیروز شاہی سعادت ملاقات سید تاج الدین و سید رکن الدین رحمہما اللہ دریافتہ است و شرائط پابوس ایشاں بجا آوردہ و من مثل آں سادات بزرگوار و اوصاف سنیّہ و حشمتے کہ دادۂ خدا ایشاں داشتند کمتر دیدہ[1]۔

سید تاج الدین کے بھتیجے سید رکن الدین کڑا میں قاضی تھے۔ خدا نے آپ کو جامع فضائل پیدا کیا۔ کشف و کرامات سے آراستہ تھے . . . . ان کی عمر ترک و تجرید اور اعطا و ایثار میں بسر ہوئی۔ مولف تاریخ فیروز شاہی نے سید تاج الدین اور سید رکن الدین دونوں کی ملاقات کی سعادت پائی اور ان کی پابوسی کے آداب بجا لایا۔ میں نے ان جیسے بلند مرتبہ سید بہت کم دیکھے اور خدا نے ان جیسے روشن اوصاف یا ان جیسی حشمت بہت کم لوگوں کو عطا کی۔

قاضی سید محمود و قاضی سید احمد

قاضی سید رکن الدین کے بعد چھ پشتوں کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ سید قطب الدین ثانی (شجرے میں ۱۱) کے متعلق صرف یہ معلوم ہو سکا ہے کہ کڑا سے اُٹھ کر جائس میں مقیم ہو گئے تھے۔ وہیں انھوں نے اور ان کی دایہ نے وفات پائی۔ دونوں کی قبریں انصاریوں کے محلّے میں ہیں۔ ان قبروں کے غربی جانب جو مسجد ہے، یہ سید قطب الدین ثانی ہی نے بنوائی تھی۔ ان کے فرزند سید علاؤ الدین کی سکونت جائس ہی میں رہی، لیکن پوتے سید محمود کو نصیر آباد میں قضا کا عہدہ مل گیا تو وہ نصیر آباد میں منتقل ہو گئے۔ وہاں کا محلّہ قضیانہ انھیں کا آباد کیا ہوا ہے۔ ابتدا میں اس کا نام محلّہ قاضی محمود تھا۔ وہ فوت ہوئے تو اُن کے فرزند سید احمد قاضی بنے۔

یہ بڑے غیور و دیندار تھے۔ ایک مرتبہ ایک قریبی رشتہ دار کا مقدمہ اُن کے سامنے پیش ہوا۔ شریعت کے مطابق اس کا فیصلہ فرما دیا، جو رشتہ دار کے خلاف تھا۔ اس کم سواد نے ناکامی کے رنج میں ایسے الفاظ کہہ دیے، جن سے حکم شرعی کے خلاف بیزاری کا پہلو نکلتا تھا۔ قاضی سید احمد نے یہ الفاظ سنتے ہی منصب قضا سے استعفیٰ دے دیا اور نصیر آباد سے اہل و عیال کے ساتھ نکل کر رائے بریلی چلے گئے۔ پھر جیتے جی نصیر آباد میں قدم نہ رکھا۔ فرماتے تھے جس آبادی میں حکم شریعت سے بیزاری کا اظہار کیا گیا ہو، وہاں مومن کے لیے ٹھہرنا زیبا نہیں۔

---

[1] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۳۴۹

قاضی سید احمد کے بعد نصیر آباد میں قضا کا منصب سید فتح عالم بن سید محمد بن سید محمود نے سنبھال لیا۔ خاندان میں غالباً وہی پہلے شخص ہیں، جنھوں نے مغل دربار سے علاقہ خاص پیدا کیا۔ ان کے فرزند ابو محمد، شہزادہ مراد بخش ابن شاہ جہان کے ہاں دیوانی کی خدمت پر مامور تھے۔

سیّد محمد فضیل

قاضی سید احمد نے اپنی زندگی کے دن رائے بریلی میں پورے کیے۔ ان کے فرزند سید محمد معظم پھر اپنے خاندان والوں کے پاس نصیر آباد چلے گئے۔ ان کے دو بیٹے تھے: سید محمد فُضَیل اور سید محمد اسحاق۔ دونوں بڑے عابد و زاہد تھے۔ خصوصاً سید محمد فضیل کو علوم ظاہری و باطنی دونوں میں بلند مرتبہ حاصل تھا۔ اپنے اوقات گراں مایہ کا بیشتر حصہ عزیزوں، ہمسایوں اور ضعیفوں کی خدمت میں بسر کرتے تھے۔ روزانہ ایک ایک دروازے پر جا کر پوچھتے کہ کوئی کام ہو تو بتا دیا جائے۔ یہاں تک کسی کو ایندھن کی ضرورت ہوتی تو بازار سے خرید کر اپنے سر پر اٹھا لاتے۔ ان خدمات سے فراغت پاتے تو طلبہ کو پڑھانے میں مشغول ہو جاتے یا درویشوں اور عقیدت مندوں کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے۔

ایک موقع پر برادری کے آدمیوں نے بعض خاندانی نزاعات کے تصفیے کے لیے اجتماع منعقد کیا۔ سید محمد فُضَیل بھی اس میں شریک تھے۔ مختلف افراد کی تجویزیں سن کر سید موصوف نے کہا: "بھائیو! ہر فیصلہ شریعتِ حقہ کے مطابق ہونا چاہیے اور قانونِ الٰہی کو معیارِ تحکیم بنانا چاہیے۔" بعض اصحاب نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ سید محمد فضیل اسی وقت مجلس سے اٹھ گئے۔ گھر پہنچتے ہی رختِ سفر باندھا اور شام سے پہلے پہلے نصیر آباد سے نکل گئے۔ فرماتے تھے جہاں شریعتِ حقہ کا احترام ملحوظ نہ رہے وہاں مسلمان کے لیے بود و باش حرام ہے۔ ان کے دادا قاضی سید احمد نے تو نصیر آباد چھوڑ کر دس میل پر رائے بریلی میں سکونت اختیار کر لی تھی، سید محمد فضیل ہندوستان چھوڑ کر حجاز چلے گئے۔ ادائے حج کے بعد مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے۔ اواخر ذی حجہ ۱۰۳۲ھ (ستمبر ۱۶۲۳ء) میں وہیں آخری نیند سوئے۔

ان کی شادی قاضی سید فتح عالم کی صاحبزادی صاحب النسا سے ہوئی تھی۔ بڑے فرزند سید داؤد دو تین برس کے ہوں گے، چھوٹے فرزند سید علم اللہ ان کی وفات سے دو مہینے چودہ دن بعد پیدا ہوئے۔ یہی سید علم اللہ سید احمد شہید کے جدِ امجد تھے۔ عہد عالمگیر کے اہلِ حق میں ان کا مثیل و نظیر کوئی نہ تھا۔

دوسرا باب

حضرت سیّد علم اللہ

ابتدائی حالات

شاہ علم اللہ ۱۲- ربیع الاول ۱۰۳۳ھ (۲۴- دسمبر ۱۶۲۳ء) کو نصیر آباد کے محلہ قضیانہ میں بوقت صبح پیدا ہوئے۔ والد ان کی وفات سے پہلے فوت ہو چکے تھے۔ والدہ نے کچھ مدت بعد وفات پائی۔ دیوان سید ابو محمد نے، جو ان کے حقیقی ماموں تھے، انھیں اور ان کے بڑے بھائی سید داؤد کو یگانہ محبت و شفقت سے پالا، یہاں تک کہ ہر معاملے میں انھیں اپنے بچوں پر مقدم رکھتے تھے۔ اس احسان کے اعتراف میں شاہ علم اللہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میری اولاد پر لازم ہے، سید ابو محمد کے ساتھ تعظیم و تکریم اور حسن سلوک کو اپنا شیوۂ خاص بنائیں۔ یہ امر میرے لیے دلی خوشنودی کا باعث ہوگا۔

ایک خاندانی روایت ہے، سید محمد فضیل نے شاہ علم اللہ کی پیدائش سے پہلے خواب دیکھا تھا کہ گھر میں مٹی کے ایک تشت کے نیچے ایک آفتاب چھپا ہوا ہے اور کرنیں پھوٹ پھوٹ کر باہر نکل رہی ہیں آخر آفتاب آہستہ آہستہ تشت سے باہر نکل آیا اور بلند ہوا۔ گھر کے در و دیوار اور اطراف و جوانب اس کی ضیا گستری سے بقعۂ نور بن گئے۔

شاہ علم اللہ پیدا ہوئے تو خواب کی تعبیر یہ سمجھی گئی کہ ان کی برکت سے سنن سنیہ کی تجدید ہوگی۔ بلاشبہ شاہ علم اللہ اتباعِ سنت کا درخشاں سورج تھے، جس کی برکت سے اسلامیت کی روشنی پھیلی، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ بشارت شاہ علم اللہ سے بھی بڑھ کر سید احمد شہید پر چسپاں ہوتی ہے، جن کی سعی و ہمت سے ہندوستان و خراسان میں دینِ حق اور سنن رسول پاک کا احیاء ہوا اور جن کی وجہ سے خاندان علم اللہ کے ایک ایک فرد کے احوال و سوانح کی ہمیں جستجو ہے۔

عہد طفلی کا ایک واقعہ ہے کہ شاہ علم اللہ ہم سن بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ اس اثنا میں شیخ بندگی جعفر امیٹھوی کا گذر ہوا، جو بندگی نظام الدین کے فرزند ارجمند تھے اور اپنے شیخ الشیوخ مخدوم حسام الحق والدین کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے مانک پور جا رہے تھے۔ شیخ کی نظر شاہ علم اللہ پر پڑی تو ٹھہر گئے اور دیر تک انھیں دیکھتے رہے۔ عقیدت مندوں نے اس توجہ کا سبب پوچھا تو شیخ نے فرمایا: "اس بچے کی پیشانی سے تجلی اعظم کے نور کی موجیں اٹھ رہی ہیں۔" امید ہے اس کے فیوض سے ایک جہان منور ہوگا۔

شیخ جعفر بندگی سنہ ۱۰۳۸ھ میں فوت ہوئے لہذا یہ واقعہ اس زمانے کا ہونا چاہیے جب شاہ علم اللہ کی عمر پانچ چھ برس کی تھی۔

ملازمت اور ترک و تجرید

شاہ علم اللہ سن بلوغ کو پہنچے تو ان کی شادی شیخ ہاشم جائسی کی صاحبزادی بی بی صالحہ سے ہوگئی۔ پھر ان کے ماموں سید ابو محمد نے انھیں ملازمت کی غرض سے لاہور بُلوا لیا۔ "تذکرۃ الابرار" کا بیان ہے کہ سید ابو محمد دو تین مرتبہ انھیں دربار شاہی میں لے گئے، لیکن ملازمت کی نوبت نہ آئی۔ بہر نہاب وہیاب میں شاہ علم اللہ کا دل دنیوی عزّ و جاہ کی جانب سے افسردہ ہوتا رہا۔ ایک روز خیال آیا کہ دنیوی سلاطین کی بارگاہوں میں حاجب و دربان مقرر ہیں۔ کبھی بار ملتا ہے، کبھی نہیں ملتا۔ ان سے کنارہ کش ہو کر کیوں نہ اس مالک حقیقی کی چوکھٹ پکڑ لی جائے جس کا دربار ہر وقت ہر شاہ و گدا کے لیے کھلا رہتا ہے۔ اس پر گیرودار اور حاجب و دربان کا کوئی انتظام نہیں اور وہی بندوں کی پہلی اور آخری پناہ گاہ ہے۔

"وقائع احمدی" کی روایت ہے کہ سواروں میں ملازم ہو چکے تھے۔ ایک مرتبہ موکب شاہی موسم سرما میں لاہور پہنچا۔ رات کے وقت شدید بارش ہوگئی۔ بادشاہ نے اپنے ایک معتمد کو بھیجا کہ جا کر دیکھو، کون کون اس وقت پہرے پر موجود ہے۔ معتمد نے جگہ جگہ پھر کر دیکھا صرف ایک مقام پر ایک پہرے دار گھوڑے پر سوار موسلا دھار بارش میں کھڑا تھا۔ نیزہ ہاتھ میں تھا اور قرآن پڑھ رہا تھا۔ نام پوچھا تو بتایا: علم اللہ! دوسرے روز بادشاہ نے علم اللہ کو بلایا اور مستعدی و فرض شناسی پر خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ جب سید موصوف کو معلوم ہوا کہ یہ اظہار خوشنودی موسلا دھار بارش میں پہرے پر حاضر رہنے کا نتیجہ ہے تو معاً خیال آیا کہ دنیوی بادشاہ فرائض منصبی کی بجا آوری پر خوش ہوتا ہے۔ اگر مالک حقیقی کی خدمت گزاری کو شعار خاص بنا لیا جائے تو یہ امر ہزار درجہ بڑھ کر ثواب و انعام کا مستحق ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی ملازمت چھوڑ دی، مال و اسباب لُٹا دیا اور فقیر بن کر بیٹھ گئے۔

ان میں سے کسی روایت کو درست مان لیجیے، اس واقعے میں کوئی شبہ نہیں کہ شاہ علم اللہ نے اوائل شباب

---

[1] یہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ میری تحقیق کے مطابق شاہجہان سردیوں کے موسم میں تین مرتبہ لاہور آیا۔ پہلی مرتبہ رجب ۱۰۴۸ھ (نومبر ۱۶۳۸ء) میں، دوسری مرتبہ شوال ۱۰۴۹ھ (جنوری ۱۶۴۰ء) میں، تیسری مرتبہ رمضان ۱۰۵۰ھ (دسمبر ۱۶۴۰ء) میں۔ اگر "وقائع احمدی" کے بیان کو درست مانا جائے تو یہ واقعہ ۱۰۴۸ھ میں پیش آیا ہوگا، اس لیے کہ شاہ علم اللہ اختیار فقر کے بعد کچھ دیر نفس کشی کی مشق کرتے رہے۔ پھر حضرت آدم بنوری کے پاس پہنچے۔ خرقۂ خلافت لیا۔ وطن گئے اور ۱۰۵۰ھ میں وہ راے بریلی میں آباد ہو گئے۔

ہی میں دنیوی ترفع کے بہترین وسائل سے کنارہ کش ہو کر اپنی زندگی فقر و انزوا کے لیے وقف کر دی تھی۔ دیوان سید ابو محمد بڑے پریشان ہوئے، اس وجہ سے بھی کہ بھانجا بچوں سے بڑھ کر عزیز تھا اور اسے فقیری کے رنگ میں دیکھنا گوارا نہ تھا: اس وجہ سے بھی کہ خود دربار شاہی کے امرا میں شمار ہوتے تھے اور ایک قریبی عزیز کا یوں درویش بن جانا، عام تصور کے مطابق انھیں گوارا نہ ہو سکتا تھا۔ فوراً بھانجے کے پاس پہنچے، سمجھایا، منت سماجت کی: آخر اپنا سر پیٹ لیا اور گریبان پھاڑ ڈالا، لیکن شاہ علم اللہ نے اپنے دل میں قطعی فیصلہ کر کے جو قدم اٹھایا تھا: اُسے واپس لینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ شفیق ماموں سے بادب عرض کیا کہ آپ نے بڑی شفقت فرمائی اور اب میری تغییرِ احوال پر یقیناً آپ کو بڑا رنج ہوگا لیکن میں کیا کروں۔ ہر انسان کے پہلو میں صرف ایک دل ہوتا ہے اور میں اس سے بیک وقت دو متضاد کام نہیں لے سکتا:

از دل بروں کنم غمِ دنیا و آخرت
یا خانہ جائے رخت بود یا سرائے دوست

میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کر چکا ہوں، اسے بدل نہیں سکتا۔ ماموں کے علاوہ دوستوں نے بھی سمجھایا، لیکن شاہ علم اللہ اپنے عزم پر چٹان کی طرح جمے رہے۔

بیعت و خلافت

اختیار فقر کے بعد خاصی مدت تک نفس کشی کی مشق کرتے رہے جو راہ حق میں حصول کمال کی پہلی منزل تھی۔ روزانہ صبح کے وقت باہر نکل جاتے، جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور لشکر میں فروخت کرتے۔ جتنے پیسے ملتے، ان میں سے چند پیسے اپنے کھانے پر صرف کرتے، باقی محتاجوں میں بانٹ دیتے۔ پھر پیرِ طریقت کی تلاش شروع ہوئی۔ لاہور میں ایک درویش کی خانقاہ بن رہی تھی اور اس کے لیے مٹی جمع ہو رہی تھی۔ نیاز کے طور پر چند ٹوکریاں وہاں ڈالیں۔ پھر شیخ آدمؒ بنوری[1]

---

[1] شیخ آدمؒ بنوری حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانیؒ سرہندی کے اکابر خلفا میں تھے۔ رسمی علوم کی تحصیل کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا، لیکن باطنی کمالات نے انھیں کتابی علوم سے بے نیاز کر دیا تھا۔ "تذکرۃ الابرار" میں مرقوم ہے کہ جس زمانے میں شاہ علم اللہ اپنے چیرے بھائی دیوان خواجہ احمد سے پڑھ رہے تھے، گاہے گاہے خواجہ احمد کو شیخ آدمؒ کی بیعت کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ ایک روز خواجہ احمد نے کہا کہ شیخ کو ظاہری علوم سے بہرہ نہیں، میں ان کی بیعت پر کیوں کر راضی ہو جاؤں؟ شاہ علم اللہ بولے: تمھارے جیسے عالم اگر شیخ کے پاس جائیں تو بات نہ کر سکیں۔ امتحاناً خواجہ احمد نے شیخ کے پاس جانا منظور کر لیا اور جاتے ہی علم کلام کا ایک مشکل مسئلہ پوچھا۔ شیخ نے کہا کہ آپ عالم ہیں، میں عامی ہوں، آپ بیان فرمائیں۔ اصرار پر شیخ نے اس انداز میں مسئلے کی توضیح فرمائی کہ خواجہ احمد خود بھی اس سے زیادہ نہیں جانتے تھے۔ دوسرے روز تفسیر کا ایک مشکل مسئلہ پیش کر دیا۔ شیخ نے اسے بھی

(باقی صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

کی خدمت میں پہنچ گئے، چند ہی روز میں طریقت کی منزلیں طے کر لیں اور "ولایت خاصہ واخص وخاص الخاص" کا منصب پایا۔

شیخ نے خلافت دے کر وطن جانے کا حکم دیا اور فرمایا: اس جانب ولایت کے چراغوں میں تمھاری حیثیت شمع کی سی ہوگی بلکہ ستاروں کے درمیان آفتاب کا درجہ پاؤ گے۔

شاہ علم اللہ اپنے والد ماجد کی طرح برادری کے منازعات سے بہت مکدر تھے۔ فیصلہ کیے بیٹھے تھے کہ جاتے ہی بیوی کو ساتھ لیں اور حرمین شریفین چلے جائیں۔ شیخ کو اس ارادہ کا علم ہوا تو فرمایا: بہتر ہے لیکن اہل اللہ میں سے اگر کوئی راستے میں روک لے تو رک جانا اور وہیں اقامت اختیار کر لینا۔

رائے بریلی میں قیام

بہرحال شاہ علم اللہ شیخ سے رخصت ہو کر وطن پہنچے اور باہر ہی سے اہلیہ کو پیغام بھیج دیا کہ میں ترک و تجرید کی راہ اختیار کر چکا ہوں۔ اگر اس مسلک سے بدل وجان اتفاق ہے تو گھر کا سارا مال واسباب محتاجوں میں بانٹ دو۔ سیدہ نے بے تامل یہ حکم پورا کر دیا۔ اقربا نے اپنے اموال واملاک میں سے ایک ایک حصہ نکال کر شاہ علم اللہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ انھوں نے یہ عطیہ بھی مساکین میں تقسیم کر دیا۔ کہتے ہیں کہ چار مرتبہ یہی صورت پیش آئی۔ آخر اقربا نے سمجھ لیا کہ ان کی خدمت میں کوئی چیز پیش کرنا بے سود ہے۔ یہ خود اس سے فائدہ نہ اٹھائیں گے۔

نصیر آباد سے نکلے تو پہلی منزل رائے بریلی میں ہوئی۔ وہاں کچھ دن اپنے خالہ زاد بھائی کے ہاں ٹھہرے رہے، لیکن یہ قیام عارضی تھا۔ اسی مقام پر شاہ عبدالشکور مجذوب جائسی سے ملاقات ہوئی۔ شاہ علم اللہ بہت تڑکے اٹھ کر سئی ندی پر چلے جاتے۔ وہیں تنہائی میں تہجد ادا فرماتے۔ ایک روز شاہ عبدالشکور مل گئے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ علم اللہ ہجرت کے ارادے سے نکلے ہیں تو بہ اصرار روک لیا۔ اس وقت علم اللہ کو اپنے شیخ کا فرمان یاد آیا۔ چنانچہ رائے بریلی میں ٹھہرنے پر راضی ہو گئے۔ یہ مقام اجنبی نہ تھا۔ ان کے جد امجد نے بھی عمر یہاں گزاری تھی، اور عزیز بھی رہتے تھے۔ ایک مقامی زمیندار کو ان کے

(بقیہ صفحہ ۴۲) بے تکلف حل کر دیا۔ تیسرے روز بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ آخر خواجہ احمد نے خود بیعت کے لیے درخواست پیش کر دی۔ شاہ ولی اللہؒ نے بھی انفاس العارفین میں یہ واقعہ لکھا ہے۔ (طبع جدید صفحہ ۱۱)

شیخ آدمؒ کے ساتھ ہر وقت پٹھانوں کی ایک بڑی جماعت رہتی تھی۔ بعض درباریوں نے اس معیت کو سیاسی رنگ دے کر بادشاہ سے حکم لے لیا کہ شیخ حج کو چلے جائیں۔ وہ گوارا کرتے ہوئے حجاز چلے گئے۔ ۱۰۵۲ھ کے حج میں شریک تھے۔ (فروری ۱۶۴۳ء) پھر مدینہ منورہ پہنچے۔ وہاں ۲۳ شوال ۱۰۵۳ھ (۲۴ دسمبر ۱۶۴۳ء) کو فوت ہوئے اور حضرت عثمانؓ کے مقبرے کے قریب انھیں دفن کیا گیا۔

ارادۂ قیام کا علم ہوا تو آبادی سے باہر سئی ندی کے کنارے دس بیگھے زمین بطیب خاطر ہبہ کر دی۔ یہی مقام آگے چل کر دائرہ علم اللہ یا تکیہ علم اللہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی جگہ سید احمد شہید پیدا ہوئے اور اسی جگہ انھوں نے زندگی کے ابتدائی چالیس برس گزارے[1]۔

سفر حج

جس حد تک میں تحقیق کر سکا ہوں، شاہ علم اللہ نے ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ء) میں دائرے کی بنیاد رکھی تھی۔ خاصی دیر گزر جانے کے بعد حج کا ارادہ کیا۔ اس سفر کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ "نتائج الحرمین" کے مصنف نے ۱۰۷۵ھ (۱۶۶۴-۶۵ء) میں انھیں مکہ معظمہ میں دیکھا تھا۔ "تذکرۃ الابرار" میں مرقوم ہے کہ شاہ علم اللہ حج کے لیے گئے تھے تو آپ کے تیسرے فرزند سید ابو حنیفہ بھی ساتھ تھے۔ سید ابو حنیفہ بتیس برس کی عمر پا کر ربیع الاول ۱۰۹۸ھ میں فوت ہوئے۔ اس بناء پر سفر حج ۱۰۶۸-۶۹ھ میں ہونا چاہیے۔ دونوں روایتوں میں توافق کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ شاہ علم اللہ ۱۰۶۴-۶۵ھ میں گئے۔ پھر کئی برس حرمین میں مقیم رہے، ورنہ دونوں میں سے ایک کو غلط مانے بغیر چارہ نہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ بائیس آدمی ساتھ تھے۔ رائے بریلی سے سمندر تک (غالباً بندرگاہ سورت) سارا فاصلہ پیدل اور ننگے پاؤں طے کیا۔ عقیدت مندوں نے سواریاں پیش کیں، علم اللہ نے کوئی سواری قبول نہ فرمائی اور اپنی ضرورت کا سامان (مثلاً بستر، مصلیٰ، وضو کا لوٹا اور قرآن پاک) بھی کسی سے اٹھوانا گوارا نہ کیا۔ ان کی نیکی، للہیت اور بکمال اتباع سنت کو دیکھ کر مالکان جہاز اس درجہ گرویدہ ہو گئے کہ سارے قافلے کو مفت لے جانا چاہا۔ شاہ صاحب نے انکار کر دیا اور بائیس روپے فی کس کے حساب سے پورے قافلے کا کرایہ ادا فرمایا۔ مناسک حج ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ گئے۔ ہندوستان کے سفر میں اس خیال سے جوتا نہ پہنا کہ بیت اللہ کی زیارت کے لیے جا رہے ہیں اور عجز و ادب کے ظاہری تقاضوں کو بھی حتی الامکان کمال پر پہنچانا چاہیے۔ حجاز مقدس پہنچ کر اس وجہ سے جوتا نہ پہنا کہ یہ پاک سرزمین خواجہ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی خرام گاہ رہی ہے اس پر ننگے پاؤں ہی پھرنا مناسب ہے۔ قیام مدینہ کے دوران میں نماز کے بعد جنگل میں چلے جاتے، لکڑیاں کاٹ کر لاتے، انھیں فروخت کر کے جتنے پیسے ملتے، ان سے خرچ چلاتے۔ مشائخ حرمین

---

[1] روایتوں میں ہے کہ شاہ عبد الشکور پہلے ننگے پھرتے رہتے تھے۔ علم اللہ رائے بریلی پہنچے تو شاہ صاحب نے چٹائی لپیٹ کر ستر عورت کا بند و بست کر لیا۔ لوگوں نے اس فجائی تغیر کا سبب پوچھا تو شاہ صاحب نے کہا کہ "مٹی آوت ہے" یعنی آدمی آ رہا ہے۔ شاہ عبد الشکور ہی نے تکیہ کی جگہ تجویز کی اور سید علم اللہ سے مالکان و مسجد کے مقامات متعین فرمائے۔ رائے بریلی کے ایک محلے کا نام لوہاری پور ہے۔ یہیں کے دیندار دولت خاں نے دس بیگھے زمین دی تھی۔ علم اللہ نے چھپر ڈال کر رہنے کی جگہ بنائی اور ایک کچی مسجد تعمیر کرائی۔

نے انھیں "مثیل ابوذر رضؓ" کا لقب دے دیا تھا۔

سنہ ۱۰۸۰ھ میں دوبارہ حج کیا۔ اس مرتبہ حرم پاک کا نقشہ بہ تعیین طول و عرض کاغذ پر کھینچ کر ساتھ لائے اور اسی کے مطابق تکیے میں مسجد بنوائی۔ بہ خیال احترام حرم طول و عرض میں چند انگشت کی کمی کر دی۔ اس کی بنیاد دیں، آب سنہ مزم ذالا۔ سنہ ۱۰۸۳ھ (سنہ ۱۶۷۲ء) میں یہ مکمل ہوئی۔ "قبلۂ ثان" سے تاریخ تکمیل نکلتی ہے۔

فضائل

شاہ علم اللہ کے فضائل و محاسن کا حصر مشکل ہے۔ صاحب "نتائج الحرمین" نے لکھا ہے کہ شریعت و طریقت پر استقامت اور اتباع سنت میں ان جیسے آدمی شاید ہی ہوں۔ اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، کھانے پینے، چلنے پھرنے میں اتباع سنت کے سوا کچھ پیش نظر نہ تھا۔ ہمیشہ عزیمت کی باتوں پر عمل کرتے، رخصتوں سے کبھی فائدہ نہ اٹھاتے۔ اپنے عزیزوں اور ارادت مندوں کو بھی اسی مسلک کی تاکید فرماتے۔ بے حد متواضع اور سادگی پسند تھے (ہر چھوٹے بڑے کو سلام میں سبقت کرتے۔ اس بارے میں بھی مسنون طریقہ کے پابند تھے۔ گردن جھکا کر یا ہاتھ اٹھا کر سلام کرنے کو مکروہ جانتے تھے۔) روئی والا جبہ کبھی نہ پہنا، اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نہیں پہنا تھا۔ خطاب میں سب کا نام بڑی تعظیم سے لیتے۔ یعنی "میاں فلاں"۔ "بی بی فلاں"۔ الحبُّ للہ والبغضُ للہ پر مضبوطی سے کاربند تھے اگر کسی سے کوئی فعل خلاف سنت سرزد ہوتا تو جب تک توبہ نہ کر لیتا، اس سے ملنا چھوڑ دیتے، خواہ وہ کتنا ہی عزیز اور قرابت دار ہوتا۔ اہل بدعت کے سلام کا جواب نہ دیتے اور نہ ان کے ہدایا قبول کرتے۔ گھر کے تمام کاموں میں شریک ہوتے، مثلاً جھاڑو دیتے، پانی پلاتے، کھانا پکانے میں مدد دیتے۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے۔ کبھی کسی کو کسی کام کا حکم نہ دیا۔ جو کام پیش نظر ہوتا، خود شروع کر دیتے۔ عزیز یا ارادت مند خود اس میں شریک ہو جاتے تو انھیں منع نہ کرتے۔ ایک مرتبہ چھپر بنانا منظور تھا۔ خود اس کام کا آغاز کر دیا۔ مسجد کے لیے چونا درکار تھا تو اٹھے اور خود زمین کھود کر روڑی نکالنے لگے۔ بازار سے چیزیں خریدنے جاتے تو ساری چیزیں اپنے سر پر اٹھا کر لاتے۔

کھانا ہمیشہ یکجا پکواتے۔ پھر سارا کھانا گھر والوں، عزیزوں اور ارادت مندوں میں بہ حصّہ مساوی تقسیم فرما دیتے۔ ایک مرتبہ کسی نے چار یا چھ سنگترے نذر کیے۔ شاہ علم اللہ نے ان کا عرق نکلوا کر کھانے میں ڈلوا دیا۔ تاکہ اس حقیر شے کی تقسیم میں بھی مساوات قائم رہے۔ متوسلین میں سے ہمیشہ شیر خوار بچوں کی ماؤں کو خشک رسد دے دیتے تاکہ اپنی ضرورت کے مطابق پکا کر کھا سکیں۔ مقروضوں اور غریبوں سے کبھی ہدیہ نہ لیا۔ جن دولت مند لوگوں کے اقربا غریب تھے، وہ بھی کوئی چیز نذر کے لیے لاتے تو لوٹا دیتے۔ فرماتے قرض سے فراغت اور ذوی الارحام کی پرورش فرائض میں داخل ہے اور انہیں دینا زیادہ سے زیادہ

نفل ہے۔ جو لوگ فرائض میں کوتاہی کرتے ہیں، ان کی نفلی عبادت کیوں کر مقبول ہو سکتی ہے؟

ایک مرتبہ سئی ندی میں طغیانی آئی اور آپ کا مکان پانی میں ڈوب کر ڈھے گیا۔ ایک مخلص ارادت مند نے تعمیر جدید کے لیے پانسو روپے کی رقم بطور ہدیہ پیش کی۔ آپ نے تمام رفیقوں کو جمع کر کے فرمایا کہ اگر اپنے ہاتھ سے مکان بنانے کے لیے تیار ہو جاؤ تو یہ ہدیہ تمھاری عام ضرورتوں پر خرچ ہوگا، ورنہ مزدوروں کو دے دیا جائے گا۔ رفیقوں نے بہ طیب خاطر سارا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ شاہ علم اللہ خود سب کے برابر کام کرتے رہے۔ مٹی کھودتے، کہگل بناتے اور ٹوکریاں اٹھاتے۔

صحیح اسلامی زندگی

اپنے تمام فرزندوں کے نکاح میں تیمن کے طور پر وہی مہر باندھا جو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت تھا۔ اسی طرح اپنی بیٹیوں کے نکاح میں حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے مہر اور جہیز کو معیار بنایا اور نکاح کے بعد انھیں سیدۃ النساؓ کی طرح پیادہ رخصت کیا۔ ایک بیٹی آپ کے عم زاد بھائی سید ہدایت اللہ کے فرزند سید عبدالرحیم سے منسوب تھی۔ وہ نصیر آباد میں رہتے تھے۔ شاہ علم اللہ نے جب بیٹی کے نکاح و رخصت کا فیصلہ کیا تو خود نصیر آباد گئے۔ رشتہ داروں سے ملے۔ پھر سید عبدالرحیم سے کہا، میاں وضو کر کے آئیے تاکہ نکاح کر دیا جائے۔ رشتہ داروں نے اس طریقے سے اختلاف کیا اور کہا کہ نکاح کے لیے باقاعدہ تاریخ مقرر کر کے برادری کو جمع کرنا چاہیے اور جوڑے جامے تیار ہونے چاہئیں۔ شاہ علم اللہ نے چپ نکاح پڑھوایا اور بیٹی کو پیدل رخصت کر دیا۔

سماع و مزامیر کو بہت برا جانتے تھے۔ ایک مرتبہ شیخ پیر محمد سلون والے رائے بریلی آئے۔ ان کی مجلس میں سماع کا سلسلہ اکثر جاری رہتا تھا۔ شاہ علم اللہ سے ملاقات کا وقت مانگا۔ آپ نے کہلا بھیجا کہ آپ باہر سے آئے ہیں اور ملاقات کے لیے مجھے حاضر ہونا چاہیے، لیکن چونکہ آپ کے ہاں سماع و مزامیر کا سلسلہ موجود ہے اس لیے میں معذور ہوں، نہیں آ سکتا۔ ایک مرتبہ ملا جیون امیٹھوی نے سماع کے متعلق مناظرہ چھیڑ دیا۔ شاہ علم اللہ نے اعتراضات کیے تو ملا صاحب کچھ جواب نہ دے سکے۔

پہلے یا دوسرے سفر حج میں ایک مقام پر ٹھہرے اور نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے مسجد میں گئے۔ وہاں ایک پیر چلہ کشی میں مشغول تھا اور دور و نزدیک کے لوگوں میں اس کی خدا رسیدگی کی بہت شہرت تھی۔ شاہ علم اللہ بھی اس سے ملنے کے آرزو مند تھے۔ سمجھتے تھے کہ نماز کے بعد مسجد میں ضرور ملاقات ہو جائے گی، لیکن پیر صاحب جمعہ کی نماز میں شامل نہ ہوئے۔ شاہ علم اللہ بعد نماز اپنی قیام گاہ پر چلے آئے اور اس پیر کے مریدوں سے کہا:

> جو شخص نماز کے لیے باہر نہ نکلا اور اس نے کسی شرعی عذر کے بغیر قطعی فرض

ترک کر دیا، اس کا منہ دیکھنا ہرگز روا نہیں اور اس سے ملاقات سراسر خطا ہے“

محلہ لوہانی پور کا ایک زمیندار پیر خاں شاہ علم اللہ کا خاص عقیدت مند تھا۔ ایک مرتبہ وہ آم بطور نذر لایا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ آپ کا اور آپ کے بھائیوں کا مشترکہ مال ہے۔ اگر آپ اپنا حصّہ تقسیم کرا کے لاتے تو میں اسے ضرور لے لیتا، اب نہیں لے سکتا۔ پیر خاں نے عرض کیا کہ بھائیوں کے حصّے کا میں ذمّہ دار ہوں۔ وہ آم چھوڑ کر تھوڑی دور گیا ہو گا کہ شاہ علم اللہ نے آدمی بھیج کر اسے واپس بلایا اور کہا:

> میں نے جب سے فقر کی راہ اختیار کی ہے۔ بارگاہ باری تعالیٰ میں ہمیشہ دُعا مانگتا رہا ہوں کہ مجھے حرام اور مشتبہ مال سے محفوظ رکھا جائے۔ آپ کا ہدیہ مشتبہ مال ہے، میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔

حافظ محمد حسین مراد آبادی، صاحب انوار العارفین کی روایت ہے کہ حکیم مغیث الدین سہارنپوری نے جن کا ایک پاؤں خشک اور مفلوج تھا، سید احمد شہید کو دعوت طعام دی۔ اس موقع پر سید صاحب نے خود فرمایا، میرے جدِ امجد نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی تھی کہ میری اولاد کو دنیا کا چین نصیب نہ ہو۔ مبادا وہ یادِ خدا سے غافل ہو جائیں۔ میں ایک روز مراقبے میں تھا کہ گھر سے بلاوا آیا۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید روزانہ کے مصارف کے لیے بلایا ہو۔ دل میں خیال گزرا کہ جدِ امجد کی دعا منظور ہو چکی ہے لہٰذا افلاس سے رہائی ممکن نہیں۔ اس حالت میں عبادت کی فرصت بھی میسّر نہیں آ سکتی۔ میں گھر نہ گیا اور جدِ امجد کے مزار پر پہنچ کر مراقبہ کیا۔ جدِ امجد کے جسم کا نصف حصّہ قبر سے باہر نکل آیا۔ قبلہ رو ہو کر ہاتھ اٹھائے اور میرے حق میں دعا کی۔ اس روز سے تنگ دستی ختم ہو گئی[1]

مخزن احمدی کا بیان ہے کہ آپ نے اپنی اولاد کے لیے بارہا فقر و تنگ دستی کی دُعا کی تاکہ وہ لوگ زخارف دنیوی کی محبت میں اُلجھ کر دین و تقویٰ کی راہ نہ بھلا دیں[2]۔ چنانچہ اس مقدس خاندان میں اگر کسی کے ہاں ضرورت کی چیزیں نہ ہوتیں اور فقر و احتیاج کی نوبت آ جاتی تو اس حالت ضیق کی تعبیر کا ایک طریقہ یہ ٹھہر گیا تھا کہ فلاں گھر میں شاہ علم اللہ تشریف فرما ہیں۔

حضرت شیخ میاں میر لاہوری کے ایک خلیفہ شیخ عبد الحمید ابدال تھے۔ ان کے ایک مرید نے شاہ علم اللہ کے متعلق پوچھا تو ابدال صاحب نے فرمایا:

---

[1] انوار العارفین ص۱۹۵۔ [2] مخزن احمدی ص۴۲

اے عزیز! حضرت سید اتباعِ سنّت اور پیروی رسالت میں اس عہد کے یگانہ فرد ہیں۔ اسلاف میں بھی ان جیسے آدمی بہت کم گزرے ہیں۔ ان کو سید ہونے کے باعث فرزندی کا رتبہ حاصل تھا، پھر محبوبیت کا منصب مل گیا۔ یہ بلند درجے بہت کم آدمیوں کو نصیب ہوسے۔

شانِ استغنا

شیخ آدمؒ بنوری سے جن بزرگوں نے فیض حاصل کیا، ان میں شاہ علم اللہ کے علاوہ شیخ محمد سلطان ساکن بلیا اور شیخ عثمان ساکن شاہ جہان پور بھی تھے۔ شیخ عثمان کو شاہنشاہ عالمگیر کے ہاں اعتماد کا خاص درجہ حاصل تھا۔ ایک موقع پر انھوں نے اپنے دونوں رفیقوں کے گزارے کی تنگی کے بارے میں عالمگیر کو رقعہ لکھا۔ بادشاہ نے فوراً شیخ سلطان کی خانقاہ کے لیے روزینہ مقرر کر دیا، لیکن اسے معلوم تھا کہ شاہ علم اللہ روزینہ قبول نہیں کریں گے، اس لیے حکم دے دیا کہ جس مال سے خود میرے لیے کھانے کا انتظام ہوتا ہے، اس میں سے دو سو روپے بطور نذر شاہ صاحب کے ہاں پہنچا دیے جائیں۔ شاہ صاحب کو اگرچہ معلوم تھا کہ نذر وجہ حلال سے آئی ہے اور نذر پیش کرنے والا وہ سلطان ہے، جس سے بڑھ کر صاحب تقویٰ سلطان کم از کم ہندوستان کے تخت پر نہیں بیٹھا، بایں ہمہ نذر لوٹا دی۔ یہ ان کی شانِ استغنا تھی۔

صاحب "نتائج الحرمین" نے لکھا ہے، زیادہ تر مشائخ کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ابتدا میں سخت ریاضتیں کیں، آخر میں فراغت شعار بن گئے۔ شاہ علم اللہ کی حالت یہ تھی کہ ابتدا سے حیاتِ مستعار کے آخری عہد تک فقر کی سختی و تنگی کو راحت جان کر قبول کر لیا۔ یہ سب کچھ سنت کی پیروی میں اختیار فرمایا، اس پر پورے اہتمام سے عمل پیرا رہے اور لذاتِ دنیوی کو اپنے پاس تک نہ آنے دیا۔

صاحب "بحرِ زخّار" فرماتے ہیں کہ طریقِ نبویؐ کی پیروی میں دنیا سے نفرت کے متعلق جو ریاضتیں اور مجاہدے شاہ علم اللہ نے کیے، ان کی مثالیں صحابہ کرامؓ کے بعد اولیا میں بھی بہت کم ملیں گی۔

کمالِ رضا

آپ کے فرزند سید ابو حنیفہ نے بتّیس برس کی عمر پائی۔ وہ خدا پرستی، پابندِ شرع اور دینداری کی وجہ سے آپ کو بیحد محبوب تھے۔ رات کے وقت ان کا انتقال ہوا۔ آپ نے گھر کے تمام لوگوں کو قضا کے سامنے بطیبِ خاطر سر جھکا دینے کی تلقین فرمائی اور رونا تو رہا ایک طرف کسی نے ایسی آہٹ بھی نہ سنی، جس سے اس حادثہ محزنہ کا علم ہوتا۔ صبح ہوئی تو آپ نے اطمینان سے باجماعت نماز

لہ "نتائج الحرمین"۔ دو رفیقوں سے مراد، شیخ سلطان اور سید علم اللہ شاہ ہیں۔

پڑھی۔ پھر اُٹھے اور ایک صاحب سے کہا کہ رات میاں ابو حنیفہ فوت ہو گئے، ان کی تجہیز و تکفین کا انتظام ہونا چاہیے۔

محبوب جگر بند کو آغوشِ لحد میں سلا چکنے کے بعد فرمایا: الحمد للہ، میاں ابو حنیفہ اس دنیا سے دولتِ ایمان کے ساتھ گئے۔

گھر میں ایک ضعیفہ روزانہ چرخا چلایا کرتی تھی۔ سوت کاتنے کے سوا اس کا کوئی کام نہ تھا۔ سید ابو حنیفہ کی وفات کے دن اس نے سوگ میں اپنا کام بند رکھا۔ شاہ علم اللہ گھر گئے تو پوچھا: چرخہ کیوں بند کیا؟ ضعیفہ نے عرض کیا کہ ایسا لائق اور جوان بیٹا دنیا سے اٹھ گیا، کیا ہمیں چرخے کا ہوش رہ سکتا ہے؟ فرمایا: یہ سب قضا و قدر کے حکم ہیں۔ اللہ کے فرمان میں کون دم مار سکتا ہے؟ زندگی بہر حال چند روزہ ہے، ہمیں راضی بہ رضا رہنا چاہیے۔ اپنا کام بند نہ کرو۔

رضا بہ قضا کی ایسی پاکیزہ مثالیں کہاں ملتی ہیں؟

وصال آخری عمر میں غذا بہت کم کر دی تھی، یہاں تک کہ چنے کی دال کا تھوڑا سا پانی اور چند دانے چاول کھا لینے پر اکتفا فرماتے۔ کمال حبِ اتباع میں برابر دعا فرماتے رہتے کہ عمر بھی رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم جتنی ہو۔ ۸۔ ذی الحجہ سنہ ۱۰۹۶ھ (۲۶۔ اکتوبر سنہ ۱۶۸۵ء) کو دوشنبہ کے دن واصل بحق ہوئے۔ باسٹھ برس آٹھ مہینے اور چھبیس دن کی عمر پائی۔ "دوست بفردوس رسید" آپ کی تاریخ وفات ہے۔

عالمگیر کو شاہ علم اللہ سے بڑی عقیدت تھی۔ انھیں دنوں میں خواب دیکھا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی اور ملائکہ کرام حضور صلعم کے جنازۂ مبارک کو آسمان پر لے گئے۔ اس خواب پر عالمگیر سخت پریشان ہوا۔ ملا جیون سے ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ غالباً شاہ علم اللہ فوت ہو گئے۔ چنانچہ خواب کی تاریخ لکھ لی گئی۔ پھر وقائع نویس کی رپورٹ سے تصدیق ہو گئی کہ واقعی سید علم اللہ اسی روز فوت ہوئے۔ بادشاہ نے ملا جیون سے پوچھا کہ آپ نے تعبیر کس دلیل کی بنا پر کی تھی؟ کہا: صرف اس بنا پر کہ کمال اتباعِ سنت کا جیسا نمونہ شاہ علم اللہ تھے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کی وفات کا مطلب یہ تھا کہ سنت کا ایک نہایت پاکیزہ نمونہ دنیا سے اٹھ گیا۔[لہ]

[لہ] درر المعارف (شاہ غلام علی کے ملفوظات)

تیسرا باب

علم اللٰہی خاندان

ایں سلسلہ از طلائے ناب است
ایں خانہ تمام آفتاب است

سید علم اللہ کی اولاد شاہ علم اللہ کی شادی سید ہاشم جائسی کی صاحبزادی بی بی صالحہ سے ہوئی تھی۔ اس بی بی سے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ بیٹیوں میں سے ایک، سیدہ حنیفہ، کی شادی سید عبدالرحیم بن سید ہدایت اللہ بن سید اسحاق برادر سید فضیل) سے ہوئی۔ دوسری، سیدہ علیمہ، سید محمد جعفر بن سید قطب عالم سے بیاہی گئیں۔ بیٹوں میں سے بڑے سید آیت اللہ تھے، دوسرے سید محمد ہدیٰ؛ تیسرے سید ابو حنیفہ اور چوتھے سید محمد۔ پہلے دو کے حالات ہم ذرا تفصیل سے بیان کریں گے۔ ان میں سے ایک ننھیالی رشتے میں سید احمد شہید کے جد امجد تھے اور دوسرے ددھیالی رشتے میں۔ سید ابو حنیفہ، سید علم اللہ کی زندگی ہی میں ۱۰۸۸ھ میں فوت ہوئے۔ سید محمد، دائرے کی سکونت چھوڑ کر شہر رائے بریلی کے اس حصے میں جا بسے تھے، جو قلعے کے نام سے موسوم تھا۔ والدہ کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ وہیں ایک دائرہ بنا لیا تھا اور ایک مسجد تعمیر کر لی تھی۔ ان کی والدہ سیدہ صالحہ اپنے بلند منزلت شوہر سے بارہ برس بعد ۱۱- صفر ۱۱۰۸ھ (۳۰- اگست ۱۶۹۶ء) کو عازم فردوس ہوئیں۔ خود سید محمد نے ۲۴- ربیع الثانی ۱۱۵۵ھ (۱۷- جون ۱۷۴۲ء) کو وفات پائی۔

سید علم اللہ نے ایک وصیت یہ فرمائی تھی کہ میرے بعد کسی فرزند کی دستار بندی نہ کی جائے یعنی کسی کو جانشین نہ بنایا جائے، اس لیے کہ سجادہ آرائی کا جو سلسلہ عام طور پر رائج تھا، اس سے سخت متنفر تھے کہ یہ سلسلہ ان کے خاندان میں جاری نہ ہو۔ چنانچہ اسی پر عمل ہوا۔ اس گھرانے کے کسی فرد نے اپنے حلقے سے باہر جا کر بھی کسب فیض میں کبھی تامل نہ کیا۔ اگر کوئی شخص خود ان سے استفادہ کا خواہاں ہوا تو ان کی آرزو بھی پوری کر دی، لیکن باقاعدہ گدی بنا کر کوئی نہ بیٹھا۔ اسی طرح دنیوی دولت کی طلب میں سرگردانی کو بھی کسی نے شیوہ و شعار نہ بنایا۔ اگر دولت ملی تو اسے غریبوں اور محتاجوں میں بانٹ دینے ہی کو ایک فرد سعادت سمجھتا رہا۔

سید محمد آیت اللہ فرزند اکبر سید آیت اللہ بڑے شجاع اور جوانمرد تھے۔ علوم دینیہ کی تکمیل کے ساتھ ساتھ قرآن پاک حفظ کیا۔ ایک مرتبہ نصیرآباد گئے ہوئے تھے کہ ہلال رمضان طلوع ہوا۔ والد نے پیغام بھیجا کہ رائے بریلی آ جائیں اور نماز تراویح میں قرآن سنائیں۔ نصیرآباد میں اُن کے عم محترم دیوان سید احمد نے اصرار کیا کہ جب تک ہمیں پورا قرآن نہ سناؤ گے، جانے نہ دیں گے۔ سید آیت اللہ نے پہلی رات تراویح کی دو دو رکعتوں میں انتیس پارے ختم کر دیے اور باقی رکعتوں میں تیسواں پارہ تمام کر دیا۔ اس طرح عم محترم کی خواہش پوری کر کے یکم رمضان کو رائے بریلی پہنچ گئے۔

آغاز شباب میں انھیں جہاد و غزا کا بڑا شوق تھا۔ اسی شوق میں چند اقربا کی معیت میں ناظم گورکھ پور کے پاس ملازم ہو گئے تھے۔ ایک دفعہ ایک جاگیردار سرکش ہو گیا اور اس نے گورکھ پور پر دھاوا بول دیا۔ جمعہ کا دن تھا۔ سید آیت اللہ نماز کے لیے مسجد جا رہے تھے کہ ناظم فوج لے کر سرکش کے مقابلے کے لیے نکل پڑا۔ سید آیت اللہ نے فرمایا کہ پہلے جمعہ ادا کر لینا چاہیے، پھر لڑیں گے۔ ناظم بولا کہ جب تک آپ جمعہ سے فارغ ہوں گے، دشمن اپنا کام ختم کر کے چلتا بنے گا۔ آپ پیرزادے ہیں، نماز ادا کریں اور دعا فرمائیں۔ ہم تو سب سے پہلے دشمن کا قلع قمع کریں گے۔

سید صاحب نے یہ سُنا تو کچھ جواب نہ دیا۔ مسجد میں جا کر اطمینان سے جمعہ پڑھا۔ پھر اپنے ساتھیوں کو لے کر لڑائی کے لیے نکلے تو دیکھا کہ ناظم کے آدمی باغیوں کے مقابلے میں شکست کھا کر پسپا ہوتے ہوئے شہر کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ سید آیت اللہ نے انھیں روکا۔ جب دیکھا کہ وہ سب ہمت ہار چکے ہیں تو اپنی جماعت کو ساتھ لیا، تلواریں کھینچ کر بجلی کی طرح دشمن کی صفوں پر جا گرے اور انھیں سراسیمہ وار بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس لڑائی میں آپ کے بہنوئی سید عبدالرحیم اور دو بھائی بھی شریک تھے۔ سید عبدالرحیم نے اسی معرکے میں شہادت پائی۔

آخری عمر میں ملازمت چھوڑ دی تھی۔ ایک مرتبہ بعض خاندانی جھگڑوں کے فیصلے کے لیے آپ کو

لہ سید علم اللہ کے خاندان سے سید عبدالرحیم کا تعلق شجرے سے واضح ہو سکتا ہے۔ یہی سید عبدالرحیم شہید مولانا حکیم سید عبدالحی مرحوم ناظم ندوۃ العلماء کے بزرگوں میں تھے۔ شجرۂ نسب یوں ہے: سید عبدالحی بن سید فخرالدین، بن سید عبدالعلی، بن سید علی محمد، بن سید اکبر شاہ بن سید محمد شاہ، بن سید محمد تقی، بن سید عبدالرحیم۔ مولانا سید عبدالحی کے فرزند اکبر ڈاکٹر سید عبدالعلی مرحوم ناظم ندوۃ العلماء اور دوسرے فرزند مولانا سید ابوالحسن علی مصنف "سیرۃ سید احمد شہید" ہیں۔

عالمگیر کے دربار میں دکن جانا پڑا۔ ایک بھائی، دو صاحبزادے اور خادم ساتھ تھے۔ تمام امور کا فیصلہ کرا کے واپس ہوئے تو راستے میں بیمار پڑ گئے۔ یکایک حالت غیر ہو گئی۔ استحضار کا وقت آیا تو سورۂ زلزال پڑھی اور چادر اوڑھ کر سو گئے۔ سمجھا گیا کہ آپ آرام فرما رہے ہیں۔ ایک امیر، جو شاہ علم اللہ کا ارادت مند تھا، مزاج پرسی کے لیے آیا۔ کیفیت سنی تو بولا کہ وہ ابدی نیند سو گئے۔ کپڑا منہ سے ہٹا کر دیکھا تو واقعی جان بحق ہو چکے تھے۔ یہ ۱۲- رجب ۱۱۱۶ھ (۲۰- اکتوبر ۱۷۰۴ء) کا واقعہ ہے۔ غسل و تکفین کے بعد میت کو تابوت میں ڈال کر بریلی پہنچایا گیا اور وہیں والد بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔

سید محمد احسن اور ان کے بھائی

سید آیت اللہ کی شادی سید قطب عالم کی صاحبزادی سیدہ سلمٰی سے ہوئی تھی۔ پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔ بیٹوں کے نام یہ ہیں: سید محمد حسن، سید محمد ضیا، سید عظیم الدین شہید، سید محمد فیاض، سید محمد صابر۔ بیٹیوں میں سے سیدہ نجیبہ کی شادی سید محمد سعید بن سید فیض اللہ بن سید داؤد (برادر شاہ علم اللہ) سے ہوئی اور دوسری سیدہ صبیحہ، سید آیت اللہ کے بھانجے سید محمد اشرف بن سید محمد جعفر سے بیاہی گئی۔

سید عظیم الدین کو شاہی دربار سے رائے بریلی کی حکومت کا پروانہ بھی مل گیا تھا۔ یہ حکومت پہلے شیرانی افغانوں کے قبضے میں تھی۔ انھوں نے قبضہ چھوڑنے سے انکار کر دیا اور مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس اثنا میں عید آ گئی۔ افغانوں نے باہم ساز باز کر لیا کہ جونہی سید عظیم الدین نماز کے لیے عیدگاہ میں آئیں، اچانک حملہ کر کے انھیں شہید کر ڈالا جائے۔ سید موصوف اس سازش سے بالکل بے خبر تھے۔ وہ چند آدمیوں کے ساتھ عیدگاہ میں پہنچے تو لوگ نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ شیرانیوں نے دفعتہً حملہ کر دیا۔ سید عظیم الدین نے یہ حالت دیکھی تو ساتھیوں سے بہ آواز بلند کہہ دیا کہ جو بچ کر نکل سکے، نکل جائے۔ خود انھیں نکالنے کی کوشش کی گئی تو فرمایا:

ایں مراد از خدائے خواستم - چوں
پیشم آمدہ است روے ازاں نگردانم

میں خدا سے شہادت کا آرزومند تھا۔
اب یہ مراد پوری ہونے کا موقع سامنے
آگیا ہے تو اس سے روگرداں نہیں ہو سکتا۔

غرض وہ خود اور ان کے چند ساتھی لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ یہ خبر دائرے میں پہنچی تو سید محمد ضیا خطبہ پڑھ رہے تھے۔ آپ نے کمال صبر و استقامت سے خطبہ پورا کیا۔ دعا فرمائی۔ پھر سید محمد حسن آدمی لے کر گئے اور شہید بھائی کی میّت اٹھا لائے۔ انھیں دفن کر کے قلعے پر حملہ کیا۔ شیرانیوں نے عاجز آ کر صلح کی درخواست کی۔ سید محمد حسن نے صلح کر لی، لیکن شیرانیوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا۔

سید محمد حسن نے حکومت سنبھال لی۔ دو برس کی کارداری کے بعد ان کی معزولی کا فرمان صادر ہوگیا۔ عالمگیر کا انتقال ہوچکا تھا۔ شاہ عالم بہادر شاہ دکن میں تھا۔ سید محمد حسن نے دکن کا قصد کیا تاکہ بادشاہ سے مل کر اپنی جاگیریں بحال کرائیں۔ برہان پور میں صحیح بخاری کی سند لی اور وہیں فوت ہوئے۔ ان کی شادی سیدہ مہتاب بنت سید عبدالرحیم سے ہوئی تھی۔ دو بیٹے ہوئے: سید محمد جامع اور سید محمد مختار۔ یہ دونوں لاولد رہے۔ بھائیوں میں سے سید عظیم الدین شہید اور سید محمد فیاض کے بھی اولاد نہ تھی۔ صرف سید محمد صابر اور سید محمد ضیا سے خاندان کا سلسلہ چلا۔

سید محمد صابر نے خواجہ معصومؒ سرہندی کے فرزند خواجہ محمد صدیقؒ کی صحبت میں سلوک کی منزلیں طے کی تھیں۔ شوال ۱۱۹۲ھ (اکتوبر ۱۷۷۹ء) میں فوت ہوئے۔ جود و سخا کا بہتا دریا تھے۔ جو کچھ پاس ہوتا ضرورت مندوں کو دے دیتے۔ ایک دفعہ ایک سائل آیا تو بالکل خالی ہاتھ تھے۔ اپنی دستار اتار کر اُسے دے دی کہ بازار میں لے جاؤ اور بیچ کر جو کچھ ملے، اُسے اپنے مصرف میں لاؤ۔

سید محمد ضیا بیس برس تک اصلاح و تزکیہ میں مشغول رہے۔ ۱۲۔ رمضان ۱۱۶۶ھ (۱۳۔ جولائی ۱۷۵۳ء) کو فوت ہوئے۔ ان کے دو بیٹے تھے: سید محمد معین اور سید ابوسعید۔ سید ابوسعید، سید احمد شہید کے حقیقی نانا اور سید محمد معین سید شہید کی بڑی ہمشیر سیدہ نجیبہ کے جد مادری تھے۔

سیّد ابوسعید

سید ابوسعید نے عالم شباب میں اپنے عم مکرم سید محمد صابر سے بیعت کی تھی۔ پھر اپنے والد کے خلیفہ محمد یونس سے آبائے کرام کی نسبت حاصل کی۔ بعد ازاں شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی سے تعلق پیدا کر لیا اور تکمیل سلوک کے بعد خلافت کا منصب پایا۔

شاہ ولی اللہ، شاہ اہل اللہ (برادر شاہ ولی اللہ)، شیخ محمد عاشق پھلتی (ابن خال شاہ ولی اللہ) اور شاہ عبدالعزیز کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ بھی برابر جاری رکھا۔ بعض مکاتیب "کلمات طیّبات" میں چھپ چکے ہیں۔ سید ابوسعید کے موسومہ مکاتیب کا ایک مجموعہ "مکتوب المعارف" کے نام سے سید ابوالقاسم ہسوی نے مرتب کر دیا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے سید ابوسعید کو مختلف خطوں میں جن الفاظ سے مخاطب فرمایا، وہ مکتوب الیہ کی جلالت منصب کا ایک روشن و نتیجہ ہیں۔ مثلاً:

(۱) سیادت و نجابت مآب، حقائق و معارف آگاہ، میر ابوسعید، سلمہ اللہ تعالیٰ۔

(۲) . . . . . خلاصۂ دودمانِ نجابت، میر ابوسعید، سلمہ اللہ تعالیٰ۔

(۳) حقائق و معارف آگاہ، سیادت و نجابت دستگاہ، سلالۃ الاکابر، میر ابوسعید[1]

---

[1] یہ مجموعہ مکاتیب اب "الفرقان" (لکھنؤ) اور "الرحیم" (حیدرآباد سندھ) میں بالاقساط چھپ گیا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ۳۰۔ محرم سنہ ۱۱۷۶ھ (۲۱۔ اگست سنہ ۱۷۶۲ء) کو فوت ہوئے۔ اس وقت خاندان علم اللّٰہی میں سے سید نعمان آپ کے پاس تھے۔ انھوں نے سید ابوسعید کو یہ رنج افزا خبر مندرجہ ذیل الفاظ میں پہنچائی:

> "حضرت صاحب قدس سرہٗ (شاہ صاحب) آپ سے (سید ابوسعید سے) بہت خوشنود تھے اور آپ کے حال پر اُن کی توجہات عالیات بیان میں نہیں آسکتیں۔ اکثر اوقات آپ کے حالات دریافت فرماتے رہتے تھے...... شاید آپ سے آخری ملاقات کی آرزو تھی۔ ایک مرتبہ فرمایا: سید ابوسعید آنے کا ارادہ کیے بیٹھے تھے، جلد پہنچ جائیں تو بہت اچھا ہو۔"

سید ابوسعید بڑے سخی، مہماں نواز اور غریب پرور تھے۔ ایک مرتبہ ایک لاکھ روپیہ کہیں سے آیا۔ جب تک پورے کا پورا مستحقوں میں بانٹ نہ لیا، گھر میں قدم نہ رکھا۔ اطراف مدراس میں ارادت مندوں کا وسیع حلقہ موجود تھا۔ ان کے خلفائے خاص میں سے مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں:

میر عبدالسلام بدخشانی، شیخ محمد مراد، مولانا جمال الدین، مولانا عبداللہ آفندی، حاجی امین الدین کاکوروی اور شاہ عبدالقادر خالص پوری۔

سید ابوسعید ۹۔ رمضان المبارک سنہ ۱۱۹۳ھ (۲۰۔ ستمبر سنہ ۱۷۷۹ء) کو فوت ہوئے۔ ان کے دو بیٹے تھے اور چار بیٹیاں۔ بیٹیوں میں سے ایک کا نام ناجیہ یا عافیہ تھا[1]۔ یہ سید احمد شہید کی والدہ تھیں۔ بیٹوں میں سے سید ابواللیث سید شہید کے حقیقی ماموں تھے۔ حج سے واپسی پر سنہ ۱۸۰۲ء میں کوڑیاں بندر پہنچے تو بیمار ہو کر وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

سید محمد ہدیٰ

سید علم اللہ کے دوسرے فرزند سید محمد ہدیٰ بھی بڑے عالی ہمت اور تقویٰ شعار تھے۔ سخاوت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی کا سوال رد نہ کیا، یہاں تک کہ ایک مرتبہ پاس کچھ نہ تھا تو اہلیہ کا زیور اتروا کر سائل کے حوالے کر دیا۔ ان کے پاس کئی جاگیریں تھیں۔ صرف نصیر آباد کی جاگیر سے اپنے گھر کا خرچ پورا کرتے، باقی جتنی آمدنی تھی، وہ لوگوں کو دے دیتے۔ دو تین گاؤں برادری والوں کے لیے الگ کر رکھے تھے۔ ایک روز کہیں سے بارہ ہزار عالمگیری نیتلا آئے۔ آپ نے ایک ہی مجلس میں سب بانٹ دیے اور خود رات فاقے میں گزاری۔

---

[1] خاندانی روایتوں میں دونوں نام آئے ہیں۔ یقینی طور پر کوئی صاحب نہ بتا سکے کہ کس نام کو ترجیح حاصل ہے۔

اگرچہ امیر اور جاگیردار تھے، لیکن اپنے لیے کوئی پختہ مکان نہ بنوایا۔ اگر اس طرف توجہ دلائی جاتی تو کہتے: چند سانس گزارنے کے لیے چھپر اور اونچی عمارتیں یکساں ہیں۔ چھپروں میں بھی کبھی عمدہ لکڑی استعمال نہ کی۔ شاہ عالم اوّل سے ملنے کے لیے نکلے۔ وہ دکن کی طرف جا رہا تھا۔ برہان پور پہنچے تو وہاں ربیع الاوّل ۱۱۲۰ھ (مئی یا جون ۱۷۰۸ء) میں فوت ہوئے۔ اقربا نے میّت کو بطورِ امانت برہان پور کی خانقاہ نقشبندیہ میں دفن کیا۔ ایک برس کے بعد اسے تابوت میں رکھ کر رائے بریلی لائے۔

آپ کے دو فرزند تھے: بڑے سید محمد نور، چھوٹے سید محمد سنا۔ سید محمد نور زہد و تقویٰ کے پیکر تھے۔ ابتدائی تربیت شاہ علم اللہ کی نگرانی میں ہوئی۔ دادے کو اس پوتے سے بڑی محبت تھی۔ سیّد محمد ہدیٰ اکثر فرمایا کرتے تھے: امید ہے اس بچے کی تربیت سے میری مغفرت ہو گی۔

سید محمد نور جوان ہوئے تو شاہی ملازمت کے لیے دکن گئے۔ شاہ علم اللہ کے ارادت مندوں میں سے ایک امیر نے واسطہ بن کر انھیں شہزادۂ اعظم جاہ کی سرکار میں ملازم کرا دیا اور خاص ان کے لیے دربار کے عام طریق تسلیم و بندگی کی جگہ صرف سلام مسنون کی اجازت حاصل کی۔ چودہ برس کی ملازمت کے بعد ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ ایک وسیع میدان میں نہایت خوب صورت مسجد ہے۔ اس میں نورانی شکل کے ایک بزرگ بیٹھے ہیں۔ سامنے ایک دستار رکھی ہے۔ انھوں نے دستار پھاڑ کر رکھ دی۔ سید محمد نور نے پوچھا یہ کیا ہوا؟ بزرگ نے فرمایا کہ یہ اعظم جاہ کی سلطنت تھی، جس کی دستاویز پارہ پارہ کر دی گئی۔

خواب سے بیدار ہوتے ہی طبیعت ملازمت سے بیزار ہو گئی۔ دو برس کی رخصت لے کر گھر چلے آئے، پھر استعفا دے دیا۔ اپنے جدِ بزرگوار شاہ علم اللہ کی طرح اہلِ بدعت کے ہدایا قبول نہیں کرتے تھے اکلِ حلال کا خاص اہتمام تھا۔ عزیزوں، ہمسایوں اور غریبوں کی خدمت کو ذریعۂ سعادت سمجھتے تھے۔ اوقاتِ گرامی کا بیشتر حصہ انھیں خدمات میں بسر ہوتا تھا۔ ۱۲- جمادی الاخریٰ ۱۱۴۸ھ (۱۹- اکتوبر ۱۷۳۵ء) کو دوشنبہ کے دن نصیر آباد میں وفات پائی اور اپنے نانا سیّد داؤد (برادرِ حقیقی شاہ علم اللہ) کے قریب دفن ہوئے۔

سیّد محمد نور کی اولاد

ان کی دو شادیاں ہوئیں۔ ایک بی بی سے صرف ایک فرزند تھے: سیّد محمد عمران۔ دوسری بی بی سے تین بیٹے تھے۔ سید محمد عثمان، سید محمد نعمان، سیّد محمد عرفان اور دو بیٹیاں: صالحہ اور ناطقہ۔

سید محمد عمران نے چھیاسٹھ برس کی عمر پا کر ۹- شعبان ۱۱۸۵ھ (۱۲- نومبر ۱۷۷۱ء) کو رائے بریلی میں انتقال کیا۔ ان کا صرف ایک فرزند تھا: سید محمد غفران۔ وہ لاولد فوت ہوا۔

سید محمد نعمان کو ذکر و فکر اور سیر و سلوک سے گہری دلچسپی تھی۔ پہلے خیال ہوا کہ والد سے جدّی نسبت

حاصل کریں۔ وہ بیمار ہو گئے تو اس فیض کو صحت پر موقوف رکھا، لیکن اسی مرض میں والد فوت ہو گئے۔ سید محمد نعمان کو اس دولتِ سرمدی سے محروم رہنے کا قلق مدت العمر رہا۔ پھر گھر سے نکل پڑے، دہلی پہنچ کر شاہ ولی اللہ محدث سے کسبِ فیض کیا۔ بعد ازاں حرمین شریفین پہنچ گئے۔

حج کے بعد مدینہ منورہ ہوتے ہوئے بیت المقدس چلے گئے۔ وہاں سے چند میل مشرق میں دریائے اردن کے قریب ایک قبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے منسوب ہے۔ اس کی زیارت کے لیے گئے تو وہیں ذات الجنب کا عارضہ لاحق ہوا۔ ۵۔ جمادی الثانی ۱۱۶۳ھ (۲۰۔ جون ۱۷۵۰ء) کو رہگرائے عالم بقا ہوئے۔ اسی قبے کے پاس انھیں دفن کیا گیا۔ انھوں نے اپنے جد امجد کے حالات میں ایک کتاب "اعلام الھدیٰ" کے نام سے مرتب کی تھی۔ خاندانی حالات کے آخری اضافے کے بعد اس کا نام "تذکرۃ الابرار" رکھا گیا۔

سید محمد عثمان کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ ان کی شادی میر گجراتی کی صاحبزادی سیدہ عالمہ سے ہوئی تھی۔ صرف ایک بیٹا یادگار چھوڑا، سید عبدالسبحان۔ یہ سید عبدالسبحان، سید احمد شہید کے بہنوئی اور سید محمد علی صاحب "مخزنِ احمدی" سید احمد علی شہید پھولڑہ، سید حمید الدین اور سید عبدالرحمٰن کے والد تھے۔ غالباً لکھنؤ میں ملازم ہو گئے تھے۔ وہیں شوال ۱۲۱۲ھ (فروری یا مارچ ۱۷۹۸ء) میں عبدالقادر خاں جائسی کے مکان واقع اسماعیل گنج میں فوت ہوئے اور عبداللہ شاہ کے تکیے میں انھیں دفن کیا گیا۔ تاریخ وفات یہ ہے:

ز رضواں چو جستیم تاریخِ فوت   بہ گفتا کہ خوش آمدی مرحبا

سیّد محمّد عرفان

سید محمد عرفان، سید احمد شہید کے والد ماجد تھے۔ ان کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں کہ متوکل اور پرہیزگار بزرگ تھے اور لکھنؤ میں رہتے تھے۔ شاید ملازمت کا علاقہ تھا۔ ۱۲۱۴ھ (۱۸۰۰ء) میں غالباً بیمار ہو کر لکھنؤ سے رائے بریلی جا رہے تھے۔ وطن کے قریب پہنچ کر راستے ہی میں فوت ہوئے۔ میت رائے بریلی میں دفن کی گئی۔ اس وقت سید احمد شہید تیرہ برس کے تھے۔

سید محمد عرفان کا پہلا نکاح سید محمد معین ابن سید محمد ضیاء ابن سید آیت اللہ کی صاحبزادی سیدہ نقیہ سے ہوا تھا۔ ان سے صرف ایک بیٹی ہوئی: سیدہ نجیبہ، زوجہ سید السبحان۔ یہ بی بی فوت ہو گئیں تو سید محمد عرفان نے مدت تک دوسری شادی نہ کی۔ سیدہ نجیبہ بالغ ہوئیں، بلکہ ان کی شادی بھی ہو گئی تو انھوں نے خود والد کی شادی اپنے نانا کے حقیقی بھائی سید ابو سعید کی صاحبزادی سے کرائی، جن کا نام سیدہ نجیبہ عرف ناجیہ تھا۔ بعض نے عافیہ لکھا ہے، جو صحیح نہیں۔ یہی سیدہ، سید احمد شہید نیز ان کے دو

بھائیوں اور تین حقیقی بہنوں کی والدہ ماجدہ ہیں۔ ان کی وفات ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء) میں ہوئی، جب سید صاحب نواب امیر خاں کے پاس تھے۔

سیّد شہید کے بھائی اور بہنیں

سید شہید کے بڑے بھائی سید ابراہیم نے تحصیل علوم پر زیادہ توجہ نہ کی۔ ملازمت کا خیال آیا تو نواب امیر خاں کی بڑی شہرت تھی۔ راجپوتانہ جا کر نواب ہی کے لشکر میں ملازم ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ ابتدا میں غالباً سپاہی تھے۔ پھر ان کا زہد و تقویٰ دیکھ کر امامت کی خدمت سونپ دی گئی۔ لشکر ہی میں ۴ شوال ۱۲۲۴ھ (۱۲- نومبر ۱۸۱۰ء) کو فوت ہوئے۔ ان کی شادی حقیقی ماموں سید ابو اللیث کی بڑی صاحبزادی سیدہ فاطمہ سے ہوئی تھی۔ اولاد میں ایک بیٹا تھا اور ایک بیٹی۔ بیٹی کا نکاح سید شہید کے چھوٹے بھانجے سید عبدالرحمٰن سے ہوا۔ بیٹے، سید محمد یعقوب کے حالات موقع پر بیان ہوں گے۔

دوسرے بھائی سید اسحاق نے کسب علوم میں درجہ کمال حاصل کیا۔ دہلی پہنچ کر شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے حدیث و تفسیر کی کتابیں پڑھیں۔ کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا اور فن تفسیر سے خاص شغف رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ صرف اس مضمون کی دو سو کتابیں ان کے پاس تھیں۔ فارسی اور عربی میں شعر بھی کہتے تھے مثلاً دو سو شعر کا ایک قصیدہ میراث میں لکھا اور اس کی شرح کی۔ پھر نحوی مسائل نظم کیے۔ فارسی کے ایک قصیدے میں اہلِ بدر کے اسمائے گرامی جمع کر دیے۔ ۴- جمادی الاخریٰ ۱۲۳۴ھ (۲- اپریل ۱۸۱۹ء) کو رائے بریلی میں فوت ہوئے۔ ان کی شادی حقیقی ماموں کی دوسری صاحبزادی سیدہ ولیہ سے ہوئی تھی۔ صرف ایک بیٹا سید اسماعیل یادگار چھوڑا۔ سیدہ ولیہ کا نکاح ثانی سید احمد شہید سے ہوا۔ ان کے مزید حالات آگے چل کر بیان ہوں گے۔

سید شہید کی بہنوں میں سے سیدہ حنیفہ اور سیدہ صاحب النسا کی شادی یکے بعد دیگرے سید معصوم احمد سے ہوئی۔ سیدہ صالحہ سید محمد مصطفیٰ سے بیاہی گئیں۔ یہ تکیے میں رہتی تھیں۔ انھیں سے ملنے کے لیے سید شہید روزانہ تکیہ شاہ علم اللہ سے تکیے جایا کرتے تھے[1]

سید شہید کی والدہ ماجدہ کا سال وفات معلوم ہے، مہینا اور تاریخ معلوم نہیں ہو سکی، اگرچہ میں نے اس کے لیے سعی و تلاش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

---

[1] سید معصوم احمد کا نسب یہ ہے: سید معصوم احمد بن سید محمد واضح بن سید محمد صابر بن سید آیت اللہ بن سید علم اللہ۔ اور سید محمد مصطفیٰ، سید علم اللہ کے چوتھے فرزند سید محمد کی اولاد میں سے تھے۔ سید محمد مصطفیٰ بن سید محمد ثانی بن سید محمد حکم بن سید محمد بن سید علم اللہ۔

سیّد شہید کا بیان

سید شہید نے شاہ بخارا کے نام جو مکتوب بھیجا تھا، اس میں اپنے خاندان کے متعلق تحریر فرمایا تھا:

> یہ خاکسار سادات عظام کے خاندان سے ہے۔ اس مسکین کے اسلاف کرام صدیوں سے بلادِ ہند میں ارشاد و تلقین کی مسندوں پر متمکن رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی عمریں رب العالمین کے احکام کی اطاعت اور حضرت سید المرسلین ؐ کے اوامر کی پیروی میں بسر کر دیں۔ جو لوگ ان سے استفادے کی غرض لے کر آئے، ان کے دامن فیض کی دولت سے بھرے۔ چنانچہ اس ضعیف کے ممتاز بزرگوں میں سے بارگاہِ الٰہی کے مقرب، سید علم اللہ حضرت سید آدم ؒ بنوری کے خلفائے کبار میں سے تھے۔ وہ سنّتِ محمدیہ کے احیاء اور طریقہ محمدیہ کی اشاعت میں اپنے عہد کے تمام بزرگوں سے آگے تھے۔

یہ سخن گستری نہ تھی، بلکہ ایک حقیقت کا اظہار تھا اور ہم سیّد شہید کے اسلاف کرام کی نسبت اجمالاً جو کچھ اوپر لکھ چکے ہیں، وہ اس حقیقت کی شہادت دے رہا ہے۔ صرف شاہ علم اللہ سے سیّد احمد شہید تک چار پشتوں میں بیسیوں افراد ہوئے، جن کے مآثر بہ زبانِ حال اس دعوے کے مصدق ہیں۔ جہاد و غزا، جود و سخا، زہد و تقویٰ، ریاضت و صفا، صبر و توکل، فقر و مسکنت یا دوسرے انسانی فضائل و محاسن کا کونسا گوشہ ہے، جس میں اس خاندانِ عالیہ کے افراد کا جمگھٹا نظر نہیں آتا؟ اخلاص و للہیت کے اسی حلقۂ صافیہ سے سید شہید کا مایہ خمیر اٹھایا گیا تھا اور انھیں مآثر حسنہ کی آغوشِ مقدس میں تربیت پا کر وہ مملکت عزیمت کے یگانہ تاجدار بنے۔

ذاتی شرف اور خاندانی عظمت

محض خاندانی فضائل کی داستان سرائی کسی کے لیے بھی وجہ شرف نہیں ہو سکتی اور اسلاف کرام کی استخواں فروشی سے عظمت و برتری کے بازار میں گرمیِ ہنگامہ پیدا کرنا قطعاً زیبا نہیں۔ اصل شے حسن عمل اور فضیلت کردار ہے۔ سید شہید اس وجہ سے بڑے نہیں بنے تھے کہ ان کے بزرگوں میں سے سیکڑوں افراد نے اپنی زندگیوں کا ایک ایک لمحہ دینِ حق کی خدمت کے لیے وقف رکھا تھا، اس وجہ سے عظمت و برتری کا درجہ حاصل کیا کہ ان کی شانِ اخلاص اور عزیمت عمل کے کرشمے نہ محض ان کے عہد میں بلکہ بیشتر کے اکثر عہود و اعصار میں بھی یگانہ حیثیت رکھتے تھے۔ وہ پورے خاندان کے گل سرسبد تھے۔ درخشاں ستاروں کی انجمن میں مہتاب عالمتاب

تھے۔ حسنِ کرامت کی یہ عزت بہت کم افراد کو ملتی ہے کہ اوّل میراث ہر لحاظ سے قابلِ فخر ہو، پھر وہ اپنے حسنِ عمل سے جلا دے کر اس میراث کو عوام کی ہدایت کا سرچشمۂ نور بنا دے۔ سید صاحب کو خدا نے دونوں نعمتوں سے سرفرازی بخشی۔ خاندان وہ ملا، جس کے افراد پشتوں سے خدا مستی اور اسلام دوستی میں امتیازِ خاص کے مالک تھے۔ پھر ہمت و عزیمت کی وہ دولت عطا ہوئی کہ نہ محض خاندان، بلکہ پوری ملت میں قرون و عہود تک ان کے پائے کا مردِ مجاہد نظر نہیں آتا۔

چوتھا باب

پیدائش اور عہدِ طفولیت

پیدائش سید احمد شہید ۶- صفر ۱۲۰۱ھ (۲۹- نومبر ۱۷۸۶ء) کو پیر کے دن راے بریلی میں پیدا ہوئے۔ "مخزن احمدی" سید صاحب کے ابتدائی حالات کے متعلق مستند ترین ماخذ ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے:

ولادت باسعادت حضرت سید المجاہدین
در شہرِ صفر بعد گزشتن یک ہزار و دو صد سال در سن
اول قرن ثالث عشر از ہجرت خیر البشر نبی الاُمّی
صلی اللہ علیہ وسلم در قصبہ راے بریلی سرکار مانک پور
مضافات صوبہ الہ آباد واقع گردید[1]

ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر بارہ صدیاں
گزر چکی تھیں، تیرھویں صدی کا پہلا سال شروع
ہو چکا تھا۔ اسی سال حضرت سید المجاہدین کی ولادت
باسعادت، صفر کے مہینے میں قصبہ راے بریلی میں
ہوئی، جو سرکار مانک پور اور صوبہ الہ آباد میں شامل تھا۔

---

[1] "مخزن احمدی" مطبوعہ، صفحہ ۱۲- صفر کا مہینا ۳ نومبر ۱۷۸۶ء کو شروع ہو کر ۹- دسمبر ۱۷۸۶ء کو ختم ہوا۔ صاحب "مخزن احمدی" نے معین تاریخ نہیں لکھی، صرف مہینا تحریر فرما دینے پر اکتفا کی۔ اغلب ہے انھیں صحیح تاریخ یاد نہ ہو۔ ۶- صفر کی تاریخ مجھے سید صاحب کے بھتیجے سید محمد یعقوب کی والدہ کے ایک بیان سے معلوم ہوئی۔ وہ فرماتی ہیں:

"سید صاحب جب والدہ کے پیٹ میں تھے تو اس محترمہ نے ایک روز خواب دیکھا کہ میرے خون سے ایک کاغذ لکھا گیا ہے، جو تمام عالم میں اُڑتا پھرتا ہے۔ اس پر مشوش ہوئیں۔ یہ خواب ان کے داماد سید عبدالسبحان نے سُنا تو کہا کہ تشویش کی ضرورت نہیں۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ جو کچھ آپ کے پیٹ میں ہے، وہ دنیا میں بہت نامور ہوگا۔ ایام حمل تکمیل کے قریب پہنچے تو یکا یک حمل کے ظاہری آثار میں کمی آگئی۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ وضع کا زمانہ ابھی دُور ہے۔ تھوڑے دن بعد وہ سو کر اُٹھیں تو پھر پورے آثار نمودار ہو گئے۔ صفر کی چھٹی تاریخ کو سید صاحب پیدا ہوئے۔

اس روایت کے معلوم ہونے کا قصہ بڑا عجیب ہے۔ سید صاحب کے خاندان کے جن افراد سے ملاقات کا شرف مجھے حاصل ہوا، ان میں سے کسی کو بھی صحیح تاریخ کا علم نہ تھا۔ میں نے کتاب کی آخری تبییض شروع کر رکھی تھی کہ ٹونک سے "وقائع احمدی" کا ایک ناقص و نامکمل نسخہ میرے پاس آیا۔ اس کے آغاز میں دو تین ورق لگے ہوئے تھے اور ان پر بعض اہم یتیں

تعلیم

جب عمر چار برس، چار مہینے اور چار دن کی ہوئی تو شرفائے ہند کے معمول کے مطابق آپ کو مکتب میں بٹھایا گیا۔ اگر وہ ۶۔ صفر کو پیدا ہوئے تو سمجھنا چاہیے کہ مکتب میں بیٹھنے کی تاریخ ۱۰۔ جمادی الآخری سنہ ۱۲۰۵ھ (۱۵۔ فروری سنہ ۱۷۹۱ء) ہوگی۔ خاندان کا سب سے بڑا سرمایہ یا علم دین تھا یا ذکر و سلوک، اس لیے یقین ہے کہ تعلیم کے اہتمام میں کوئی دقیقہ سعی فروگزاشت نہ ہوا ہوگا۔ لیکن کوششوں کے باوجود سید صاحب کی طبیعت تحصیل علم کی طرف مائل نہ ہوئی۔ "مخزن احمدی" کا بیان ہے کہ تین برس تک برابر مکتب جاتے رہے، لیکن اس مدت میں قرآن پاک کی چند سورتیں حفظ کر سکے اور مفرد حروف کے سوا کچھ لکھنا نہ آیا۔ آپ کے بڑے بھائی، سید ابراہیم اور سید اسحاق، بار بار لکھنے پڑھنے کی تاکید کرتے رہتے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ والد بزرگوار اس تاکید کو بالکل بے سود سمجھ چکے تھے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: اس کا معاملہ خدا پر چھوڑ دو۔ جو کچھ اس کے لیے مستحسن اور اولیٰ ہوگا، ظہور میں آ جائے گا۔ ظاہراً تاکید مفید نظر نہیں آتی۔[1]

امیت کا افسانہ

یہ بتانا مشکل ہے کہ ابتدا میں سید صاحب کو کیوں تعلیم سے چنداں دلچسپی نہ تھی، لیکن انھیں رسمی علوم سے بیگانۂ محض ظاہر کرنے کی سعی حد درجہ تعجب انگیز ہے۔ یقیناً انھوں نے ظاہری علوم میں درجۂ اختصاص حاصل نہ کیا، تاہم فارسی بخوبی جانتے تھے اور اس میں بے تکلف بات چیت کرتے تھے۔ عربی میں اتنی مہارت پیدا کر لی تھی کہ مشکوٰۃ المصابیح کا مطالعہ بطور خود کر لیتے تھے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ حافظؔ، بیدلؔ اور بعض دوسرے شعرا کے اشعار بھی انھیں یاد تھے۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے بعض شعرا کے دواوین یا منتخب اشعار کے مجموعے ضرور دیکھے ہوں گے۔ "امیر الروایات" میں خان صاحب امیر شاہ خاں نے اپنے استاد میانجی محمدی کی یہ روایت بیان کی ہے کہ میں شاہ محمد اسحاق سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۰) مرقوم تھیں۔ اُن میں سے ایک روایت یہ بھی تھی۔

مؤلف "تواریخ عجیبہ" (معروف بہ سوانح احمدی) نے خدا جانے کس بنا پر لکھ دیا کہ سید صاحب یکم محرم سنہ ۱۲۰۱ھ کو پیدا ہوئے۔ تمام ارادت مندوں نے اسی تاریخ کو درست مان لیا اور تیرھویں صدی کے پہلے دن پیدا ہونے کو بھی سید صاحب کی مجددیت کے دلائل میں سے ایک اہم دلیل بنا لیا گیا، لیکن ظاہر ہے، سید صاحب کی عظمت و فضیلت کی بناء یہ نہیں کہ وہ ایک خاص تاریخ کو پیدا ہوئے، بلکہ اُن کی فضیلت مخصوص و ممتاز کارناموں پر مبنی ہے۔ یکم محرم الحرام سنہ ۱۲۰۱ھ کو خدا جانے اس دنیا میں کتنے بچے پیدا ہوئے، لیکن ان میں سے کتنے ہیں، جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ سید صاحب کی طرح خدمتِ حق میں گزرا؟ عظمت کی بنیاد حسنِ عمل ہے نہ کہ خاص یومِ پیدائش یا تاریخ و وقت پیدائش۔ بہرحال اس میں شبہہ نہیں کہ سید صاحب یکم محرم کو نہیں بلکہ ۶۔ صفر کو پیدا ہوئے۔

[1] مخزن احمدی مطبوعہ ص ۱۲

کافیہ پڑھتا تھا، سید صاحب تشریف لائے تو انھوں نے میزان شروع کی اور اتنی جلدی ترقی کی کہ نصف سے آگے مجھے کافیہ میں پکڑ لیا۔ کافیہ ہی پڑھتے ہوئے انھوں نے شاہ صاحب سے مشکوٰۃ بھی شروع کر دی اور کوئی کتاب شاہ اسماعیل سے بھی پڑھتے تھے[1]۔

مولوی عبدالقیوم کا بیان ہے، اثنائے تحصیل علم میں سید صاحب کی یہ کیفیت ہوئی کہ جب کتاب کو دیکھتے تو حروف ان کی نظروں سے غائب ہو جاتے۔ خیال ہوا کہ شاید کوئی بیماری ہو گئی ہے۔ طبیبوں سے رجوع کیا گیا، مگر یہ کیفیت زائل نہ ہوئی۔ شاہ عبدالعزیز تک یہ بات پہنچی تو انھوں نے فرمایا: جالی وغیرہ باریک چیزوں پر نظر جماؤ اور دیکھو کہ وہ بھی نظروں سے غائب ہوتی ہیں یا نہیں۔ کوئی باریک سے باریک چیز غائب نہ ہوئی تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ پڑھنا چھوڑ دو۔ جب کسی نیاز مند نے اس حکم کا سبب پوچھا تو فرمایا: اگر اور باریک چیزیں غائب نہیں ہوتیں تو معلوم ہوا کہ یہ مرض نہیں۔ ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم ظاہری ان کی قسمت میں نہیں۔ ان کو تعلم سے پڑھنا نہ آئے گا بلکہ علم لدنی حاصل ہوگا[2]۔

مجھے اس روایت کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن معلوم ہے کہ سید صاحب علم سے کورے نہ تھے۔ بے شک انھیں کتابی علوم میں وہ درجہ حاصل نہ ہوا جو مثلاً شاہ عبدالعزیز یا شاہ اسماعیل شہید کا تھا۔ تاہم وہ خاصے پڑھے لکھے تھے۔ شرعی اوامر و نواہی سے بخوبی واقف تھے۔ عربی اور فارسی بے تکلف سمجھتے تھے۔ آیات و احادیث کے معارف بیان فرماتے تھے اور انھیں "امی" ظاہر کرنا سراسر عجائب پسندی کا ایک کرشمہ ہے۔

مردانہ کھیلوں کا شوق

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی خاندانی بزرگوں کی زبان سے بیان فرماتے ہیں:

> آپ کو بچپن سے کھیلوں کا بڑا شوق تھا۔ خصوصاً مردانہ اور سپاہیانہ کھیلوں کا۔ کبڈی بڑے شوق سے کھیلتے۔ اکثر لڑکوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیتے اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے قلعے پر حملہ کرتا[3]۔

"تواریخ عجیبہ" میں ہے:

> بستی کے ہم سن لڑکوں سے ایک "لشکر اسلام" جمع کرتے۔ بہ طور جہاد بہ آواز بلند تکبیر کہتے ہوئے ایک فرضی "لشکر کفار" پر حملے کیا کرتے تھے اور "وہ مارا"، "یہ فتح ہوا"۔ یہی صدائیں "لشکر اسلام" سے بلند ہوتی تھیں[4]۔

---

[1] ارواح ثلاثہ صفحہ ۱۰۹۔ [2] ایضاً ایضاً [3] سیرۃ سید احمد شہید طبع ثانی صفحہ ۴۴۔ [4] تواریخ عجیبہ صفحہ ۴

جذبۂ جہاد

سید صاحب خود فرماتے ہیں کہ عہدِ طفلی ہی سے یہ بات میرے دل میں جم گئی تھی، میں کافروں سے جہاد کروں گا اور اکثر اس کا اظہار ہوتا رہتا۔ تمام اقربا میرے ان الفاظ پر متعجب ہوتے۔ بعض سمجھتے کہ یہ بچپن کی اٹھکیلیاں ہیں، بعض نے بار بار یہی سنا تو خیال ہوا کہ ممکن ہے یہ سچ کہتا ہو۔ صرف والدۂ ماجدہ میرے اس دعوے کو حرفاً حرفاً درست سمجھتی تھیں۔ آخر ایک روز بعض اقربا جمع تھے عام دستور کے مطابق انھوں نے دیوان حافظ سے فال نکالی تو یہ شعر نکلا:

تیغے کہ آسمانش از فیضِ خود دہد آب
تنہا جہاں بگیرد بے منتِ سپاہی

ایک بڑھیا پاس بیٹھی تھی، اس نے شعر کا ترجمہ سنا تو بولی کہ انھیں تو (یعنی سید صاحب کو) واقعی سپاہ کی حاجت نہ ہوگی۔

عجب امر یہ ہے کہ جب سید صاحب ہندوستان سے ہجرت کرکے بعزمِ جہاد سرحد جا رہے تھے تو کابل میں بعض اصحاب کو ان کے رفقا اور اسبابِ حرب و ضرب کی قلت پر سخت تعجب ہوا تھا۔ انھوں نے بھی دیوان حافظ سے فال نکالی تو یہی شعر نکلا۔ اس کا ذکر موقع پر آئے گا۔

ورزشیں

غرض سید صاحب کو ابتدائے عمر میں تعلیم سے کہیں زیادہ سپہ گری و سپہ سالاری اور تہیۂ غزا و جہاد سے دلچسپی تھی۔ اس وجہ سے انھوں نے سخت ورزشیں کر کرکے اپنے جسم کو انتہائی شدائد کا عادی بنا لیا تھا۔ آپ کے بھانجے سید عبدالرحمن کا بیان ہے کہ سورج نکل آنے سے گھنٹوں بعد تک ورزش اور کشتی میں مشغول رہتے۔ میں بچّہ تھا اور ورزش کے دوران میں آپ کے بدن پر مٹی ملا کرتا تھا۔ مجھے اپنے پیروں پر کھڑا کرکے پانسو ڈنڑ پیلتے۔ پھر تھوڑی دیر کے لیے سستاتے۔ بعد ازاں اسی طرح ڈنڑ پیلنے میں مشغول ہو جاتے۔ بیس سیر، تیس سیر اور من بھر کے مگدر بنا رکھے تھے۔ دو دو چار چار گھنٹے برابر انھیں ہلاتے رہتے۔

غیر معمولی قوت

جسم میں قوّت خلقاً بھی غیر معمولی تھی، ورزشوں کی کثرت نے اس میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ یہی زمانہ ہے جس میں سید صاحب نے عام آلات مثلاً تلوار، تیر کمان، بندوق کا استعمال سیکھا اور ان میں بھی غیر معمولی مشق بہم پہنچا لی۔

تکیے کے قریب، سئی ندی کے کنارے معین خاں کا مقبرہ ایک مشہور مقام ہے۔ سید صاحب کے زمانے میں یہ مقام شہ زوروں کی ورزش گاہ تھا۔ مقبرے کے پاس پتھر کا ایک بھاری چراغ دان پڑا تھا، جس کی وضع ایک ستون کی سی تھی۔ لمبائی میں چھ فٹ سے کم نہ ہوگا۔ اسے اٹھانا بھی زور و قوّت کی نمائش کا -

ایک بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ عام طریقہ یہ تھا کہ پہلے اسے کھڑا کر لیا جاتا، پھر پورا زور لگا کر اُٹھایا جاتا۔ عام پہلوان صرف زانو تک اٹھا سکتے، بعض کمر تک لے جاتے۔ سید عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ چاندنی رات میں سید صاحب چند رفیقوں کے ساتھ اُدھر سے گزرے اور چراغ وان کو دیکھ کر فرمایا کہ اسے اُٹھانا چاہیے۔ پھر اپنا کُرتا اُتار کر گدی سی بنائی اور کندھے پر رکھ لی۔ اس کے بعد جھکے، پتھر کو بے تکلف کندھے پر رکھ کر بیس قدم چلے اور اسے زمین پر پھینک دیا۔ جس مقام پر یہ گرا، وہاں ڈیڑھ فٹ گڑھا پڑ گیا۔ دوسرے روز لوگوں نے پتھر کو اصل جگہ سے بیس قدم کے فاصلے پر دیکھا تو حیران رہ گئے اور سمجھے کہ یہ کسی جن یا دیو کا کام ہوگا۔

شناوری

شناوری میں کمال پیدا کر لیا تھا۔ دہلی میں مولوی سلیم اللہ پیراکی کے مشہور اُستاد تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ پانی کے تیز بہاؤ کے خلاف بے تکلّف تیرنے کا وصف میں نے سید صاحب میں دیکھا۔ اپنی عمر مشاقی میں گزار دینے کے باوجود میں اس کمال کو نہ پہنچ سکا۔ دَم اتنا بڑھا لیا کہ غوطہ لگا کر دریا کی تہ میں بیٹھ جاتے اور اتنی دیر تک بیٹھے رہتے کہ نمازی اس اثنا میں دو رکعت نماز ادا کر لے۔

غرض قوت وطاقت اور مشاقی وچابک دستی کے جتنے مردانہ فنون اس زمانے میں رائج تھے، سید صاحب نے ان سب میں اعلیٰ درجہ حاصل کر لیا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ شوقِ جہاد کی وجہ سے ان فنون کی طرف توجہ مبذول ہوئی یا ویسے ہی طبیعت کو کتابوں کے مطالعے کے بجائے ان امور سے زیادہ لگاؤ تھا۔

کلیجی کھانے کا شوق

سید صاحب نے ماکولات وملبوسات میں سے کبھی کسی چیز کی عادت نہ ڈالی۔ جو کچھ مل جاتا کھا لیتے اور جو کچھ میسر آ جاتا پہن لیتے۔ طبیعت میں ایثار کا مادہ اتنا زیادہ تھا کہ دوسروں کو ہمیشہ اپنے اوپر ترجیح دیتے۔ ایسی مثالیں بھی بکثرت ملتی ہیں کہ خود معمولی غذا کھا کر گزارہ کر لیا اور دوسروں کو بہترین چیزیں کھلائیں۔ کبھی آپ فاقہ کرتے اور پوری غذا دوسروں کے حوالہ کر دیتے، لیکن ماکولات میں سے کلیجی آپ کو بہت پسند تھی۔ اسے بڑے شوق سے کھاتے تھے۔

ایک مرتبہ نصیر آباد گئے ہوئے تھے، وہاں اتنی کلیجی کھائی کہ پیٹ میں گرانی محسوس ہونے لگی۔ واپسی کے وقت راستے میں اپنے ساتھی سے گرانی کا ذکر کیا۔ اس نے کہا کوئی چورن کھا لیجیے۔ فرمایا: چورن کی ضرورت نہیں، ابھی اس کا علاج کرتا ہوں۔ چلتے چلتے جب دھانوں کے کھیتوں میں پہنچے تو کُرتا اُتار لیا اور دوڑنے لگے۔ اتنی دور نکل گئے کہ ساتھی کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ پھر راستے سے ہٹ کر ایک درخت کے سایے میں چادر بچھائی اور لیٹ گئے۔ ساتھی آپ کے پاس پہنچا تو فرمایا کہ اب گرانی باقی نہیں

رہی۔ گویا دوا بھی پسند نہ تھی۔ حتی المقدور طبعی علاج ہی کو کافی سمجھتے تھے۔

خدمتِ خلق

صاحب "مخزنِ احمدی" نے لکھا ہے کہ جب سنِ تمیز کو پہنچے تو خدمتِ خلق کو اپنا شعار خاص بنا لیا۔ ضعیفوں، بچوں اور یتیموں کے حال پر بے حد شفقت فرماتے۔ اس میں امیر نیچ یا امیر غریب کی کوئی قید نہ تھی۔ ہر شام اور ہر صبح غریبوں خصوصاً بیوہ عورتوں کے گھروں پر جاتے اور اُن کا حال پوچھتے۔ ایندھن، پانی یا آگ جس چیز کی انھیں ضرورت ہوتی، فوراً لا دیتے۔ اہلِ محلہ اور ہمسائے سب کے سب علم الٰہی خاندان کے مُرید تھے۔ اس وجہ سے سید صاحب کا ذاعیۂ خدمت دیکھ کر بہت پریشان ہوتے۔ بار بار عرض کرتے کہ حضرت! ہم آپ کے آبائے کرام اور خاندانِ عالی شان کے خادم ہیں۔ ہمارا کام خدمت کرنا ہے، نہ کہ خدمت لینا۔ آپ ضعیفوں، مسکینوں اور محتاجوں کی خدمت گزاری کے فضائل اتنے پُرتاثیر انداز میں بیان فرماتے کہ جو سنتا اس پر گریہ طاری ہو جاتا۔

اکثر ایسا ہوتا کہ عزیزوں اور ہمسایوں کے گھروں میں پہنچ کر پانی کے جس برتن کو خالی پاتے اُٹھا کر بھر لاتے۔ کبھی کسی کو ایندھن کی ضرورت پڑتی تو فوراً جنگل میں نکل جاتے، لکڑیاں کاٹتے، پھر اپنی چادر میں باندھ کر حاجت مند کے گھر میں پہنچا دیتے۔ برادری کے لوگ یہ دیکھ کر آپ کو شدت سے ملامت کرتے کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے، لیکن آپ نے کسی روک ٹوک کا کبھی خیال نہ کیا اور اپنے ڈھنگ کے مطابق خدمتِ عوام کا یہ سلسلہ برابر جاری رکھا۔[1]

فرقہ وار کشمکش

ایک مرتبہ رائے بریلی کے بعض ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش پیدا ہو گئی اور اس نے باہم لڑائی کی شکل اختیار کر لی۔ مسلمان مقابلے کے لیے نکلے تو سید صاحب بھی گھر پہنچے، تلوار سنبھالی اور والدۂ ماجدہ سے اجازت کے انتظار میں کھڑے ہو گئے، جو نماز پڑھ رہی تھیں۔ جس خاتون نے سید صاحب کو بچپن میں کھلایا اور پالا پوسا تھا، وہ روک رہی تھیں۔ والدہ نے سلام پھیر کر واقعہ دریافت کیا۔ سب کچھ سن کر کھلائی سے کہا: بوا! بے شک تمھیں احمد سے محبت ہے، مگر میرے برابر نہیں ہو سکتی۔ میرا حق تمھارے حق پر فائق ہے۔ یہ روکنے کا کونسا موقع ہے؟ انھیں جانے دو۔ پھر جگر بند سے مخاطب ہو کر فرمایا: "جلد جاؤ، لیکن دیکھنا، مقابلے میں پیٹھ نہ پھیرنا، ورنہ عمر بھر تمھاری صورت نہ دیکھوں گی۔"[2]

سید صاحب چلے گئے، لیکن لڑائی کی نوبت نہ آئی۔ دونوں فریقوں نے بات چیت ہی سے سائے

---

[1] مخزنِ احمدی ص۲۲ [2] ایک روایت کے مطابق والدہ نے یہ بھی کہا تھا: اگر فریقِ مخالف نکل جانے کے لیے راستہ مانگے اور کہے ہم کو جانے دیجیے تو راستہ دے دینا۔

جھگڑے طے کر لیے۔ کہا جاتا ہے کہ جب فریق مخالف نے کہا ہمیں جانے دو، نہ آپ سے ہمارا کوئی مطلب ہے اور نہ آپ کو ہم سے کوئی جھگڑا ہے تو سید صاحب نے اپنے فریق والوں سے فرمایا کہ انھیں جانے دو۔ اس واقعہ سے سید صاحب کی والدۂ ماجدہ کی طبیعت اور شان تربیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ فضا تھی جس کی آغوش میں پرورش پا کر وہ جوہر قابل زمانے بھر کے لیے نور ہدایت کا سرچشمہ بنا۔

فطری سعادت

مختلف ارادت مندوں نے لکھا ہے کہ سید صاحب اسلام پر مجبول تھے۔ ہمارے عہد میں اسلامیت کا تصور اس قدر بدل چکا ہے کہ شاید ہر شخص اس بیان کی اہمیت کا اندازہ نہ کر سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں فطرت اتنی سعید، پاکیزہ اور مزکّٰی ملی تھی کہ مرضات الٰہی سے خفیف سا اختلاف بھی گوارا نہ تھا اور اتباعِ سنّت کا ذوق طبیعت پر اس قدر غالب تھا، گویا ان کی تمام حرکات و سکنات کی عنان شریعتِ حقہ کے قبضے میں تھی۔ زمانہ طفلی کا بھی کوئی ایک واقعہ ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا قدم کبھی جادۂ حق سے ادھر ادھر پڑا ہو یا انھوں نے عزیمت عمل کے مقابلے میں رخصت کو ترجیح دی ہو۔ یہ فطری سعادت بہت کم خوش نصیبوں کے حصے میں آئی۔ ان خوش نصیبوں میں ایک سید احمد شہید بھی تھے۔

پانچواں باب

لکھنؤ اور دہلی کا سفر

سفر لکھنؤ سید صاحب غالباً سترہ اٹھارہ برس کے تھے جب احباب و اقربا کی ایک جماعت کے ساتھ لکھنؤ گئے۔ یہ جماعت آٹھ افراد پر مشتمل تھی[1]۔ ان میں سے سید صاحب کے بڑے بھانجے سید محمد علی مولف "مخزن احمدی" کے سوا کسی کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ تمام رفیقوں کی غرض یہ تھی کہ روزگار کی کوئی صورت پیدا ہو جائے، لیکن سید صاحب کے سامنے دوسرا ہی مقصد تھا جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہوگا۔

---

[1] "مخزن احمدی" صفحہ ۱۳۔ رائے بریلی سے روانگی کی صحیح تاریخ کسی نے نہیں لکھی اور اس بارے میں قیاس و تخمین کا معاملہ بھی پیچیدہ ہے، مثلاً:

۱۔ مخزن احمدی کے بیان کے مطابق سید صاحب نے سات مہینے مملکت اودھ میں گزارے۔ چار مہینے وہ شہر لکھنؤ میں رہے (صفحہ ۱۴) پھر والی لکھنؤ صید و شکار کے لیے کہسار کی جانب نکل پڑا تو تین مہینے اس کے لشکر کے ساتھ پھرتے رہے (صفحہ ۱۵) بعد ازاں دہلی گئے۔

۲۔ "تواریخ عجیبہ" میں ہے کہ شاہ عبدالعزیز سے بیعت کے وقت سید صاحب پورے بائیس برس کے تھے (صفحہ ۸)، لیکن وہ صفر ۱۲۲۳ھ میں پورے بائیس برس کے ہوئے ۱۲۲۲ھ میں نہیں، جیسا کہ صاحب "تواریخ عجیبہ" نے لکھا ہے۔

۳۔ ان دونوں روایتوں کو درست مانا جائے تو سمجھنا چاہیے کہ سید صاحب ۱۲۲۲ھ میں رائے بریلی سے نکلے۔ سات مہینے لکھنؤ میں گزار کر اسی سال یا ۱۲۲۳ھ کے اوائل میں دہلی پہنچے اور شاہ صاحب سے بیعت کی۔

۴۔ لیکن اس واقعہ کو درست سمجھنا اس وجہ سے مشکل ہے کہ سید صاحب گھر سے چلے تھے تو داڑھی نہیں نکلی تھی۔ جب تعلیم و سلوک سے فارغ ہو کر وطن پہنچے تو داڑھی اتنی لمبی ہو چکی تھی کہ بعض اقربا بھی اول نظر میں انھیں پہچان نہ سکے۔ یہ نہیں مانا جا سکتا کہ اکیس یا بائیس برس تک ان کے داڑھی نہیں نکلی تھی۔

۵۔ مرزا حیرت نے "حیات طیبہ" میں لکھا ہے کہ رائے بریلی سے نکلتے وقت سید صاحب اٹھارہ انیس برس کے ہوں گے (صفحہ ۲۷۳) ربیع الاول ۱۲۲۱ھ (مئی ۱۸۰۶ء) میں دہلی پہنچے اور محرم الحرام ۱۲۲۳ھ (فروری ۱۸۰۸ء) میں تعلیم و سلوک سے فارغ ہو کر وطن واپس گئے (۲۸۵) اس صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ آپ

(ان سب کے پاس صرف ایک گھوڑا تھا۔ اسی پر باری باری ایک ایک دو دو کوس سواری کرتے تھے۔ سید صاحب نے ابتدائے سفر ہی میں اپنی باری رفیقوں کے لیے چھوڑ دی تھی اور رائے بریلی سے لکھنؤ تک انچاس میل کا پورا سفر پیدل طے کیا۔)

ہر شخص کے پاس جو بھی سامان تھا، اسے وہ خود اٹھاتا۔ چونکہ ان میں سے کوئی بھی مشقت کا عادی نہ تھا، اس لیے آدھا رستہ طے کرنے کے بعد سب تکان سے چور ہو گئے اور سامان اٹھوانے کے لیے مزدور کی تلاش شروع کر دی۔ مطلب کا مزدور نہ مل سکا تو سب حیران ہو کر ایک جگہ بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ لکھنؤ پہنچنے کی تدبیر کیا ہو۔ یہ حالت دیکھ کر سید صاحب نے کہا: "بھائیو! میری ایک عرض ہے، قبول فرماؤ تو کہوں؟" سب نے کہا "بسر و چشم"۔ آپ نے ہر ایک سے عہد موکد لیا کہ عرض سن کر اسے ٹھکرایا نہ جائے گا۔ جب اقرار بہمہ وجوہ پختہ ہو گیا تو اپنی چادر زمین پر بچھا دی اور فرمایا کہ مزدور کی تلاش چھوڑ دو، پورا سامان اس چادر میں باندھ کر میرے سر پر رکھ دو میں اسے منزل مقصود پر پہنچا دوں گا۔

کسی کے دل میں وہم بھی نہیں گزرا تھا کہ سید صاحب ایسی درخواست پیش کریں گے۔ لیکن حتمی اور قطعی وعدہ ہو چکا تھا، اس لیے سب نے بادل ناخواستہ سامان آپ کے حوالے کر دیا۔ آپ نے پشتارہ بنا کر پورا سامان اٹھا لیا اور خوشی خوشی چل پڑے۔ صاحب "مخزن احمدی" کے بیان کے مطابق فرماتے جا رہے تھے:

یاران و برادران! ہر چہ کہ احسان امروز	دوستو اور بھائیو! جو احسان آپ نے آج مجھ پہ
بر من کردید بقیۃ العمر از ادائے شکر آں بیروں نخواہم آمد	فرمایا ہے، اس کی شکر گزاری کا حق عمر بھر ادا نہ کر سکوں گا۔

غرض خدمت خلق کا جو جذبہ اوائل شباب میں اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ اقربا کے طعن و ملامت سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۷) سنہ ۱۲۱۷ھ یا سنہ ۱۲۱۸ھ میں رائے بریلی سے نکلے۔

۱۔ "وقائع احمدی" میں بھی وطن سے روانگی کے وقت عمر سترہ اٹھارہ برس ہی کی بتائی گئی ہے۔ (صفحہ ۵)

۲۔ "منظورہ" میں ایک جگہ ہے کہ آپ نے "چند سال" دہلی میں گزارے۔ دوسری جگہ ہے "سہ چہار سال"۔

تمام بیانات کو سامنے رکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ آپ سترہ، اٹھارہ برس کی عمر میں گھر سے روانہ ہوئے۔ سنہ ۱۲۱۸ھ یا سنہ ۱۲۱۹ھ میں سات مہینے اودھ میں گزار کر دہلی پہنچے۔ پہلے تعلیم حاصل کرتے رہے، پھر بیعت کی۔ ۲۷ رمضان سنہ ۱۲۲۲ھ (۲۸۔ نومبر سنہ ۱۸۰۷ء) کو شب قدر کا واقعہ دہلی میں پیش آیا۔ اغلب ہے سنہ ۱۲۲۳ھ کے اوائل میں وطن لوٹے ہوں۔ اس طرح چار یا پانچ برس باہر رہے۔ مخزن صفحہ ۱۴

بھی اس پر کوئی اثر نہ پڑ سکا، وہ سفر لکھنؤ میں بھی برابر نمایاں رہا۔

قیامِ لکھنؤ کے حالات

لکھنؤ پہنچتے ہی سید صاحب کے لیے ایک امیر کے ہاں سے کھانا مقرر ہو گیا، جو آپ کے والد ماجد اور دوسرے اقربا کا نیاز مند تھا۔ اگرچہ اس کا کارخانۂ ملازمت بگڑ چکا تھا اور شاہی دربار میں کسی خدمت کا علاقہ بھی باقی نہ رہا تھا، لیکن مخدوم زادے کی خدمت کو وہ اپنی سعادت سمجھتا تھا۔ سید صاحب کے ساتھیوں کے لیے باوجود سعی و تلاش معاش کی کوئی شکل پیدا نہ ہوئی اور جو زاد گھر سے لے کر چلے تھے، وہ ختم ہو گئی۔ ان میں سے جو کتابت جانتے تھے، وہ روزانہ "کریما" اور "مقیماں" کے ایک دو جزو لکھ کر شام کو بازار میں فروخت کر آتے، جنھیں یہ فن نہیں آتا تھا، وہ بازار سے کپڑا خرید کر ٹوپیاں سیتے یا تھیلیاں بناتے۔ اس طرح جتنے پیسے مل جاتے، ان سے بمشکل دال روٹی کا خرچ پورا ہوتا۔

سید صاحب دونوں وقت اپنا کھانا رفیقوں کے دستر خوان پر رکھ دیتے۔ ہر ممکن کوشش کرتے کہ پُر تکلف کھانا ساتھی کھائیں، خود معمولی خوراک کے چند نوالے کھا کر گزارا کر لیتے۔ اگر رفیقوں کے لیے دال روٹی کا سر و سامان بھی نہ ہوتا تو اپنا پورا کھانا انھیں دے دیتے، خود ناسازیِ طبع کا عذر پیش کر کے فاقہ کر لیتے۔

چار مہینے اسی حالت میں گزر گئے۔ پھر سید صاحب کے میزبان رئیس کو صرف ایک سو سواروں کی بھرتی کا حکم ملا۔

اس زمانے میں بے روزگاری کی یہ کیفیت تھی کہ ایک ہزار سوار ساز و سامان سے لیس ہو کر ملازمت کے لیے حاضر ہو گئے۔ رئیس نے دس آدمیوں کی ہر ٹولی میں سے ایک سوار چن لیا۔ دو اسامیاں سید صاحب کے حوالے کر دیں۔ آپ نے یہ دونوں اسامیاں اپنے رفیقوں میں سے ان لوگوں کے حوالے کر دیں، جن سے برادری یا عزیز داری کا کوئی علاقہ نہ تھا اور اپنے عزیزوں سے فرمایا کہ خدا کے فضل پر بھروسا رکھو آپ لوگوں کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ رئیس سید صاحب کے ایثار سے بے حد متاثر ہوا اور کہا کہ آپ حضرات کی مشغولیت کا بندوبست بھی ضرور کروں گا، بالکل بے فکر رہیں۔

لکھنؤ سے کوچ

اس طرح چار مہینے گزر گئے۔ پھر والیِ لکھنؤ سیر و شکار کے لیے نکل پڑا اور اس رئیس کو

---

[1] "مخزن احمدی" میں ہے کہ اگرچہ نہایت تنگ دست بود، اما محبت سادات نوعے داشت کہ ہمتائے آں دیدہ نہ شد۔ یک بخش برائے حضرت طعام روزمرہ مقرر کردہ بود (صفحہ ۱۳۴)

بھی معیت کا حکم دے دیا جو سید صاحب کا میزبان تھا۔ اس نے سید صاحب اور ان کے عزیزوں کو بھی ساتھ لے لیا کہ ممکن ہے سبیرو شکار ہی میں مزید اسامیاں نکل آئیں۔ اس سفر میں بھی سید صاحب اپنے تمام ساتھیوں کا سامان خود اٹھائے پھرتے رہے۔ تین مہینے انتظار میں گزر گئے، لیکن کسی کے لیے ملازمت کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ صاحبِ "مخزنِ احمدی" کے قول کے مطابق "صحرا پیمائی، فاقہ کشی اور سرما و گرما کی صعوبتوں" کے باوجود مراد پوری نہ ہوئی۔ رئیس مذکور یہی کہتا رہا کہ بس آجکل میں انتظام ہو جائے گا۔

سید صاحب ابتدائے سفر ہی سے اپنے عزیزوں کو بار بار نصیحتیں فرماتے کہ بھائیو! ملازمت کا خیال چھوڑو اور چلو دہلی جا کر سید المحدثین شاہ عبد العزیز سے کسب فیض کریں وہ آج اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا نشان ہیں۔ ہر موقع پر خواجہ حافظ کا یہ شعر پڑھتے:

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار بگزارند و خم طرۂ یارے گیرند

جب کسی رفیق پر ان نصائح کا اثر نہ ہوا تو ایک رات اپنے بھتیجے سید محمد علی کو الگ لے گئے اور فرمایا کہ میں تو کل یا پرسوں دہلی روانہ ہو جاؤں گا، چاہتا ہوں کہ تم بھی ساتھ چلو۔ سید محمد علی نے عرض کیا سامانِ سفر تو رہا ایک طرف، میرے پاس تو تن کے کپڑوں کے سوا پہننے کی بھی کوئی چیز نہیں۔ پھر اس تہی دستی اور بے مائیگی کی حالت میں دہلی کیسے جا سکتا ہوں؟ آپ تحمل و بردباری کے پہاڑ ہیں اور ہر تکلیف کو صابرانہ برداشت کر سکتے ہیں، مجھ ضعیف میں اتنی ہمت و طاقت کہاں ہے؟[1]

قصدِ دہلی

اس واقعہ پر دو تین دن گزر گئے۔ لشکر کوچ میں تھا۔ دوپہر کے وقت منزل ہوئی اور تمام ساتھی ڈیرے پر پہنچے تو دیکھا کہ سید صاحب غائب ہیں۔ شام تک جگہ جگہ تلاش کرتے پھرے، لیکن کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ان دنوں لشکر محمدی کے جنگل میں پھر رہا تھا، جہاں جنگلی جانوروں کی کثرت تھی، خصوصاً شیر، چیتے، بھیڑیے، ریچھ اور ہاتھی بہت زیادہ تھے۔ ہر روز ایک دو لشکری ان کا لقمہ بن جاتے تھے۔ ساتھیوں کو خیال ہی نہیں یقین ہو گیا کہ سید صاحب کو بھی کسی درندے نے پھاڑ کھایا۔ دو دن اور تین راتیں اسی رنج و الم میں گزر گئیں۔ جو شخص کسی سمت سے آتا، اسے سید صاحب کا حلیہ بتا کر پوچھتے کہ کہیں اس وضع کا آدمی تو نہیں دیکھا؟

چوتھے دن ایک آدمی گھنے جنگل کی طرف سے آیا۔ اس نے بتایا کہ میں نے ایسا جوان دیکھا ہے جو راب کا مٹکا اٹھائے لیے جا رہا تھا اور ایک سپاہی اس کے ساتھ تھا۔ وہ جوان ظاہراً مزدور معلوم

---

[1] یہ تمام حالات سید محمد علی کی "مخزنِ احمدی" سے ماخوذ ہیں۔ وہ خود اس سفر میں ساتھ تھے اور جو کچھ لکھا ہے، چشم دید لکھا ہے۔

نہیں ہوتا تھا، اس کے بُشرے سے شرافت و نجابت کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے سپاہی سے بات چیت کی تو اس نے عجیب ماجرا سُنایا۔ کہنے لگا: "جب مجھے مٹکا اٹھانے کے لیے مزدور کی ضرورت پڑی تو ایک نحیف و کمزور آدمی کے سوا کوئی نہ ملا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ مٹکا اٹھا کر تیز چلنا اس کے لیے مشکل ہو گا لیکن اس نے اصرار کیا اور میں نے مزدوری مقرر کر کے اسے ساتھ لے لیا۔ تھوڑی دُور جا کر وہ ہانپنے لگا۔ اس اثنا میں یہ جوان آ گیا۔ مزدور کی حالت زار دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور مجھ سے اس نے کہا کہ بھائی! اس غریب کو جبراً بیگار میں پکڑے پھرتے ہو، خدا سے نہیں ڈرتے! میں نے حقیقت حال بیان کی تو جوان نے مزدور کی طرف توجہ کی۔ اس نے رو کر بیان کیا کہ رات فاقے میں گزری تھی۔ آج مجبور ہو کر یہ بوجھ اُٹھا لیا کہ پیسے ملیں گے تو پیٹ بھر لوں گا۔ اب چلا نہیں جاتا۔ یہ سُن کر جوان نے مجھ سے کہا کہ اس کے پورے پیسے ابھی دے دیجیے آپ کا مٹکا میں اُٹھا کر منزل مقصود پر پہنچا دوں گا۔ چنانچہ مزدور کی مزدوری دلا کر اسے واپس کر دیا اور خود مٹکا اُٹھا کر چل پڑا۔

داستان سُن کر سب کو یقین ہو گیا کہ یہ خود سید صاحب تھے، اس لیے کہ اوّل حلیہ انھیں کا تھا۔ دوم وہی دہلی جانے کا ارادہ کر رہے تھے اور یہ واقعہ دہلی کے راستے کا تھا۔ سوم عام خلق خدا کے ساتھ عموماً اور ضعفا و مساکین کے ساتھ خصوصاً رحم و مروت کا سلوک آپ ہی کا شیوۂ خاص تھا۔

سفر کی کیفیت

جہاں سے سید صاحب نے رفیقوں کو چھوڑا تھا وہاں سے شہر دہلی چودہ منزل پر تھا اور آپ کی جیب میں صرف تین پیسے تھے۔ اپنی ذات کے لیے کسی کے روبرو دست سوال دراز کرنا قطعاً گوارا نہ تھا، لہٰذا پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ اوّل اتنا تیز چلیں گے اور ایک ایک دن میں دو دو یا اس سے بھی زیادہ منزلیں طے کرتے جائیں گے۔ دوسرے چوتھائی راستہ طے کر لینے کے بعد ایک پیسہ کھانے پر صرف کریں گے۔ چنانچہ چوتھی منزل پر پہنچ کر ایک پیسے میں ستو اور تھوڑا گڑ خریدا۔ گھول کر پینا چاہتے تھے کہ کان میں آواز آئی: "چار روز کی بھوک نے ہلاکت کے کنارے پہنچا دیا ہے، مجھے نہ دو گے تو مر جاؤں گا۔" سید صاحب خود یہ حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے: میرے نفس نے چاہا کہ سارے ستو چپ چاپ پی جاؤں، لیکن عشقِ خداوندی نے زور دیا کہ حرص کی آنکھ بند کر۔ چنانچہ گھلے ہوئے ستو اٹھائے اور پورے کے پورے اس درویش کے حوالے کر دیے۔ خود تسبیح و تہلیل اور ذکر الٰہی میں مشغول ہو گئے کہ اس سے بڑھ کر اطمینانِ قلب کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

عام لوگوں کو اس قسم کے حالات سے عموماً سابقہ نہیں پڑتا۔ سید صاحب کو قدرت نے خاص مقصد کے لیے پیدا کیا تھا۔ ان کے گرد و پیش تربیت کے سامان بھی خاص فراہم کر دیے اور صبر و ہمت

کے امتحان و آزمائش کی منزلیں برابر قدم قدم پر پیش آتی رہیں۔ ایسے ہی اصحاب کے لیے قرآن حکیم نے فرمایا ہے: یوثرون علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ۔

مزید راستہ طے کرکے سید صاحب نے پھر ایک پیسے کے ستو اور تھوڑا گڑ لیا۔ رفیقوں سے الگ ہونے کے بعد یہ پہلی چیز تھی، جو اس خدامست کے حلق سے نیچے اُتری۔ مزید دو تین دن سفر میں گزر گئے۔ وہ مشقتوں کے عادی تھے۔ جسم اتنا نرم و نازک نہ تھا کہ سفر کے شدائد یا قلت زاد راہ کی تکالیف برداشت نہ کر سکتا، لیکن ایک ایک دن میں کئی کئی منزلیں طے کی تھیں، اس وجہ سے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ مجبور ہو کر فیصلہ کر لیا کہ ایک دن آرام کر لیں۔ مسجد میں ٹھہر گئے۔ رات بہ آرام گزاری۔ اگلے دن عصر کے وقت ایک نمازی مسجد میں آیا اور انھیں غور سے دیکھنے لگا۔ پھر پوچھا:

بھائی صاحب! کہاں سے آنا ہوا؟

فرمایا: پورب سے۔

پوچھا: پورب کے کون سے شہر سے؟

فرمایا: رائے بریلی سے۔

وہ شخص آپ کے والد کا مُرید تھا۔ رائے بریلی کا نام سنتے ہی پہچان گیا کہ سادات میں سے ہیں۔ اصرار کیا کہ گھر چلیے۔ سید صاحب نے فرمایا: اس شرط پر چل سکتا ہوں کہ عہد کریں، مجھے دہلی جانے سے نہ روکیں گے۔ اس نے جواب دیا کہ نہ محض روکوں گا نہیں بلکہ خود دہلی پہنچا دوں گا، البتہ یہ ضروری ہے کہ آپ چند روز آرام فرمالیں۔

اس نے گھر لے جا کر پاؤں دھوئے۔ حنا اور ببول کی پتیاں رگڑ کر چھالوں پر لیپ کی۔ جب سید صاحب کے پاؤں اچھے ہو گئے تو سواری کا انتظام کر کے انھیں دہلی پہنچایا۔ پھر رائے بریلی جا کر اقربا کو سید صاحب کا پورا حال سُنایا۔

بعض عجیب و غریب روایتیں

مرزا حیرت نے "حیاتِ طیبہ" میں لکھا ہے:

۱۔ سید صاحب لکھنؤ سے دہلی روانہ ہوئے تو آپ کے والد کے دوست نے بہ اصرار ایک گھوڑا اور کچھ زرِ نقد دیا۔ یہ چیزیں آپ نے کان پور میں چار مصیبت زدہ آدمیوں کے حوالے کر دیں، جن میں سے ایک مریض تھا، دوسرا زخمی اور دو بوڑھے تھے۔

۲۔ راستے میں سید صاحب نے ایک ضعیف کو اپنے کندھے پر اٹھا کر اُس کے گھر پہنچایا: جو تیرہ میل کے فاصلے پر تھا۔

۳۔ ایک سرائے کی مہترانی نے سید صاحب کے زخمی پاؤں پر دوا لگائی۱؎۔

ان میں سے کوئی بات بھی غیر اغلب نہیں لیکن اس روایت کی تصدیق کسی ذریعے سے نہ ہو سکی، اور جب یہ ثابت ہے کہ سید صاحب لکھنؤ سے نہیں بلکہ کھیری لکھیم پور کے اطراف سے دہلی گئے تھے تو انھیں کان پور جانے کی کیا ضرورت تھی جو ان کی جائے روانگی سے دور جنوب میں واقع تھا؟ وہ سیدھے مغرب کو جانا چاہتے تھے۔ میرے نزدیک اس روایت کے لیے کوئی بنیاد اساس موجود نہیں۔

اسی طرح "ارواح ثلاثہ" میں ہے کہ سید صاحب پہلے پہل شاہ ولی اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے حالانکہ شاہ ولی اللہ کی وفات اور سید صاحب کی پیدائش میں کم و بیش چوبیس، برس کا فصل ہے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ سید صاحب پہلی مرتبہ صرف چھ روز دہلی میں ٹھہر کر واپس چلے گئے اور چھ مہینے کے بعد دوبارہ آئے۲؎۔ جو مستند روایتیں اوپر بیان ہو چکی ہیں، انھیں سامنے رکھتے ہوئے چھ روز ٹھہر کر واپس جانا اور چھ ماہ بعد دوبارہ آنا بالکل مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ "ارواح ثلاثہ" کی روایات میں ایسی کئی خامیاں ہیں۔

۱؎ حیات طیبہ صفحہ ۲۰۰، ۲۶۹ ۔ ۲؎ ارواح ثلاثہ صفحہ ۹۶ ۔

چھٹا باب

دماغی اور رُوحانی تربیت

شاہ عبدالعزیز سے ملاقات

دہلی پہنچتے ہی سید صاحب شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہُوئے۔ پہلے سے شناسائی نہ تھی اور نہ سید صاحب نے کسی ذریعہ تعارف کا انتظام کیا تھا۔ شاہ صاحب نے معمول کے مطابق مصافحت و معانقت کے بعد پاس بٹھاکر پُوچھا: کہاں سے آئے ہو؟

سید صاحب: رائے بریلی سے۔
شاہ صاحب: کس قوم سے تعلق ہے؟
سید صاحب: وہاں کے سادات میں محسوب ہُوں۔
شاہ صاحب: سید ابوسعید اور سید نعمان کو جانتے ہو؟
سید صاحب: سید ابوسعید میرے حقیقی نانا تھے اور سید نعمان حقیقی چچا۔

یہ سنتے ہی شاہ صاحب نے دوبارہ گرمجوشی سے معانقہ فرمایا اور پوچھا: کس غرض سے اتنے لمبے سفر کی صعوبت گوارا کی؟ سید صاحب نے عرض کیا کہ آپ کی ذات مقدس کو غنیمت سمجھ کر اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی طلب میں پہنچا ہوں۔ شاہ صاحب نے فرمایا: خدا کا فضل شاملِ حال ہے تو اپنی پدری اور مادری وراثت حاصل کر لوگے۔ پدری اور مادری وراثت سے اشارہ دماغی اور روحانی تربیت کے انھیں مدارج عالیہ کی طرف تھا جو سید ابوسعید اور سید نعمان پہلے حاصل کر چکے تھے۔

پھر ایک خادم کو حکم دیا کہ انھیں میرے بھائی مولوی عبدالقادر کے پاس اکبر آبادی مسجد میں پہنچا کر ان سے کہنا کہ اس مہمان عزیز کا مفصل حال میں خود ملاقات کے وقت بیان کروں گا۔ انھیں غنیمت سمجھیں اور خدمت میں حتی الامکان کوتاہی نہ کریں۔

اکبر آبادی مسجد

اکبر آبادی مسجد ہی میں سید صاحب نے تعلیم پائی۔ اسی کے ایک حجرے میں انھوں نے ابتدائی قیام دہلی کی پوری مدت بسر کی۔ اسی کے ایک حجرے میں وہ اس وقت ٹھہرے جب رائے بریلی سے نواب امیر خاں کے پاس راجپوتانہ جاتے ہُوئے دہلی

سے گزرے تھے۔ نواب سے الگ ہونے کے بعد بھی اسی مسجد کے ایک حجرے میں مقیم ہوئے تھے اور جہاد کے لیے تنظیم کی مستقل سکیم مرتب کی تھی۔ یہی مسجد تھی جہاں شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے برسوں درس دیا۔ ان کی وفات پر یہ خدمت شاہ رفیع الدین سے متعلق ہوگئی۔ یقین ہے کہ شاہ صاحبان سے پہلے بھی اس مسجد میں درس جاری ہوگا۔ گویا دہلی میں اس مسجد کی حیثیت ایک بہت بڑے دینی دارالعلوم کی تھی۔ افسوس کہ اب اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ اسلامیت کے جاہ و جلال کی ایمان افروز بہاریں دیکھنے والی کئی مسجدیں اور کئی عمارتیں دہلی میں موجود ہیں، لیکن اکبرآبادی مسجد کو قدرت نے شانِ اسلامیت کے ساتھ ہی سطحِ ارض سے ناپید کر دینا مناسب سمجھا۔ بادِ مخالف کے جس جھکڑ نے اسلامیت کا آخری چراغ گل کیا تھا، اس نے اس مسجد کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

یہ مسجد شاہ جہان بادشاہ کی بیگم اعزاز النساء نے رمضان المبارک سنہ ۱۰۶۱ھ (اگست سنہ ۱۶۵۰ء) میں بنوائی تھی۔ چونکہ بیگم کا خطاب اکبرآبادی محل تھا، اس لیے مسجد کا نام اکبرآبادی مشہور ہوا۔ اس پر ڈیڑھ لاکھ روپے صرف ہوئے تھے اور دو برس میں پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ مسجد کا مسقف حصہ ترسٹھ گز لمبا اور سترہ گز چوڑا تھا۔ اس کے تین گنبد اور سات در تھے۔ مسقف حصے کے سامنے کی طرف دائیں بائیں دو خوبصورت اور بلند مینار تھے۔ ترسٹھ گز لمبا اور ترسٹھ گز چوڑا صحن تھا، جو زمین سے تین گز اونچا تھا اور اس کے گرد تین گز اونچا کٹہرا بنا ہوا تھا۔ صحن سے باہر سامنے کی طرف وضو کے لیے حوض تھا۔ اس کے دونوں جانب سے مسجد میں جانے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ پوری عمارت سنگِ سرخ کی تھی۔ سامنے کی طرف سنگِ مرمر کی خوبصورت بیلیں بنا دی گئی تھیں۔ مسجد کی شمالی، غربی اور جنوبی سمت میں تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر حجروں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ خوب کھلے اور صاف حجرے، ان کے آگے برآمدہ، برآمدے کے آگے تین چار گز چوڑا چبوترہ۔ اس نقشے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسجد خاص طور پر تعلیم کی غرض سے بنی تھی۔ اس کے ساتھ خاصا بڑا وقف تھا، جس سے طلبہ کو وظیفے ملتے تھے اور ان کے کھانے پینے یا دوسرے مصارف کا انتظام ہوتا تھا۔

یہ مسجد فیض بازار میں واقع تھی جو قلعہ سے شروع ہو کر دہلی دروازے تک جاتا تھا۔ اب بازار کا صرف ایک حصہ باقی رہ گیا ہے۔ مسجد کی اصل جگہ وہ تھی جہاں اب ایڈورڈ پارک بنا ہوا ہے۔

شاہی مسجد اور قلعے کے درمیان اب جو وسیع میدان نظر آتا ہے، یہاں غدر سے پہلے گنجان آبادی تھی اور قلعے کے لاہوری دروازے سے شاہی مسجد تک ایک پُر رونق بازار جاتا تھا: جسے اردو بازار کہتے تھے۔ اسی حصے میں خانم کا بازار تھا۔ آبادی کی ابتدا یوں ہوئی کہ جن اُمرا کو قلعے میں نوبت بہ نوبت حاضر رہنا پڑتا

تھا، انھوں نے پاس ہی حویلیاں بنالیں۔ ان کے ساتھ متوسلین کے مکانات تعمیر ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انگریزوں نے یہ ساری آبادی منہدم کرادی۔ مکان اور محلّے بارُود سے اُڑا دیے۔ یہ میدان آس پاس کی سڑکوں سے کئی فٹ بلند ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ منہدم مکانوں کا ملبہ پھیلا کر بچھا دیا گیا تھا۔

جب سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید لکھی تھی تو مسجد موجود تھی، البتہ اس کے ایک مینار کی بُرجی ٹوٹ گئی تھی۔ اب کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ کھدائی کی جائے تو یقین ہے کہ مسجد کی پوری بنیادیں نکل آئیں۔

سلامِ مسنون کا معاملہ

"ارواح ثلاثہ" میں ایک روایت ہے کہ سید صاحب دہلی پہنچے تو خود شاہ عبدالعزیز کے خاندان میں بھی سلام مسنون کا رواج نہ تھا، بلکہ وقت کی عام رسم کے مطابق اس طرح سلام کیا کرتے تھے: عبدالقادر تسلیمات عرض کرتا ہے، رفیع الدین تسلیمات عرض کرتا ہے۔ سید صاحب شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں پہنچے تو "السلام علیکم" کہا۔ شاہ صاحب اتنے خوش ہُوے کہ حکم دے دیا آیندہ سب لوگ اسی طریقے پر سلام کیا کریں[1]۔

"ارواح ثلاثہ" کی ایسی کسی روایت کو اس وقت تک اطمینان قلب سے قبول کر لینا مشکل ہے، جب تک کسی دوسرے ذریعے سے اس کی تصدیق نہ ہو جائے۔ لیکن اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ اس زمانے میں سلام مسنون کا طریقہ بالعموم مٹ چکا تھا اور بعض اُونچے گھرانوں میں تو شرعی سلام کو آداب مجلس کے منافی سمجھا جاتا تھا۔ سید صاحب نے جب نواب امیر خاں سے الگ ہو کر اصلاح و تجدید کی مستقل دعوت کا انتظام کیا تھا اور اس سلسلے میں مظفر نگر، سہارن پور وغیرہ کا دورہ فرمایا تھا تو شمس الدین نام ایک صاحب نے بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ ان کے والد زندہ تھے اور خاصے امیر تھے۔ شمس الدین نے گھر پہنچ کر والد کو آداب و بندگی کے بجائے السلام علیکم کہا تو وہ اتنے ناراض ہُوے کہ کہنے لگے جس شخص نے تمھیں (معاذ اللہ) بے ادبی کا یہ شیوہ سکھایا ہے میں اس سے ضرور سمجھوں گا۔

تحصیلِ علم

بہرحال سید صاحب نے اکبر آبادی مسجد میں سکونت اختیار کی اور شاہ عبدالقادر سے عربی و فارسی کی کتابیں پڑھنے لگے۔ ہم چوتھے باب میں "ارواح ثلاثہ" کے حوالے سے میزان، کافیہ اور مشکوٰۃ پڑھنے کا ذکر کر چکے ہیں۔ اس سے زیادہ تفصیل معلوم نہیں۔ یہ حکایت بھی لکھ چکے ہیں کہ کتاب دیکھتے دیکھتے حروف ان کی نظروں سے غائب ہو جاتے تھے اور اس بنا پر شاہ عبدالعزیز نے کہہ دیا تھا کہ انھیں کتابیں پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ "انوار العارفین" کا بیان ہے کہ چونکہ

---

[1] ارواح ثلاثہ صفحہ ۹۷

از علم صرف و نحو خواندند غلبۂ شوق در تحصیل علم باطن بیشتر بود۔ یعنی صرف و نحو بھی کسی قدر پڑھی تھی، علم باطن حاصل کرنے کا شوق بہت زیادہ تھا۔

بلاشبہ سید صاحب نے خالص درسی نقطۂ نگاہ سے علوم میں وہ ممتاز درجہ حاصل نہ کیا جو مثلاً شاہ اسماعیل یا مولانا عبدالحی حاصل تھا، لیکن وہ عربی و فارسی بولتے بھی تھے اور سمجھتے بھی تھے۔ جنگ بالاکوٹ سے پیشتر سچوں میں ٹھہرے ہوئے تھے تو شاہ اسماعیل سے فرما دیا تھا کہ غازیوں کو روزانہ مشکوٰۃ کا سبق دیا کریں۔ چنانچہ شاہ صاحب روزانہ صبح کی نماز کے بعد اور ظہر و عصر کے درمیان مشکوٰۃ کی ایک فصل پڑھ کر حدیثوں کے مطالب و معانی کی شرح فرماتے۔ مولوی سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں:

امیر المومنین ہم اسرار و نکات از بعض احادیث از زبان فیض ترجمان خود مے فرمودند و مسلمانان ازاں بہرۂ وافی مے اندوختند۔[1]	سید صاحب بھی بعض احادیث کے اسرار و نکات زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرماتے اور مسلمان ان احادیث سے پورا فائدہ اٹھاتے۔

اسی سلسلے میں لکھتے ہیں:

آنجناب کتاب موصوف را در دست گرفتہ در اکثر اوقات شغل بداں مے داشتند۔ احیاناً معنی کدام لغت از ہر کس کہ پیش مے گزشت مے پرسیدند۔[2]	سید صاحب بھی اکثر مشکوٰۃ کا مطالعہ فرماتے رہتے، اگر کسی لفظ کے معنی نہ آتے، تو جو پاس سے گزرتا اس سے پوچھ لیتے۔

جو شخص مشکوٰۃ پڑھ سکتا تھا اور اس کے مطالعہ میں خاصا وقت بسر کرتا تھا، اُسے "اُمّی" ثابت کرنا سراسر تعجب انگیز ہے۔

علم کا صحیح مفہوم

سرحد میں ایک مرتبہ سید صاحب کے ایک عقیدت مند ملا نے عرض کیا تھا کہ اخوند درویزہ نے اپنی کتاب "مخزن" میں مرشد کے لیے عالم ہونا شرط قرار دیا ہے: اس کا مطلب کیا ہے؟ سید صاحب نے فرمایا:

مراد از عالم این نیست کہ صدر او شمس بازغہ خواندہ باشد بلکہ مراد از علم ہمین است کہ مرضیات و نامرضیات حضرت پروردگار تعالیٰ شانہ را بخوبی دانستہ باشد۔ حضرت صدیق اکبر و عمر فاروق رضی اللہ	عالم سے یہ مراد نہیں کہ وہ صدرا اور شمس بازغہ پڑھ چکا ہو۔ یہاں علم سے یہی مراد ہے کہ جانتا ہو، اونچی شان والا پروردگار کن باتوں سے راضی ہوتا ہے اور کن باتوں سے ناراض (یعنی اوامر و نواہی

---

[1] انوار العارفین ص ۵۱۵ - [2] منظورہ ص ۴۹۴

عنہما ہدایہ و شرح وقایہ نہ خواندہ بودند و پیشوا اے صاحب ہدایہ و صاحب شرح وقایہ ہستند کہ مصنفان ایں کتب بلکہ مجتہدان و پیشوایان شاں از کلام پاک آں ہادیانِ دین سند می آرند و آں را محکِ امتحان قرار دادہ سرہ از ناسرہ ممتاز مے سازند[1]

کہ اسے پورا علم ہو! حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے ہدایہ یا شرح وقایہ نہیں پڑھی تھیں لیکن وہ ہدایہ اور شرح وقایہ کے مصنفوں کے پیشوا تھے نہ صرف یہ لوگ بلکہ ان کے پیشوا اور مجتہدین بھی انھیں ہادیان دین کے کلام پاک سے سندیں لاتے ہیں اور اسے کسوٹی قرار دے کر کھرے کو کھوٹے سے الگ کرتے ہیں۔

یقیناً علم اصل میں یہی ہے کہ باری تعالیٰ کے مرضیات و نامرضیات سے انسان بخوبی آگاہ ہو جائے۔ باقی چیزیں علم نہیں بلکہ صرف آرایش علم ہیں:

ایں ہا ہمہ آرایش افسانۂ عشق است

ان معنی میں سید صاحب بالغ نظر عالم تھے، اگرچہ انھوں نے بعض دوسرے مشہور عالموں کی طرح علوم آلیہ کی تحصیل میں عمر کا بڑا حصہ صرف نہ کیا۔ پھر وہ عالم عامل تھے، یعنی مرضیات و نامرضیات کا نہ صرف علم حاصل کیا، بلکہ اس علم کے سانچے میں اپنی پوری زندگی ڈھال لی۔ یہی عملی روح وہ ہر مسلمان میں پیدا کر دینے کے آرزومند تھے۔ اسی مقصد کے لیے جیئے اور اسی مقصد کی راہ میں سعی و جہاد کرتے ہوئے درجۂ شہادت حاصل کیا۔ یہ مقام بلند ہر شخص کے حصے میں نہیں آتا۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

زمانۂ طلب علم کے بعض واقعات

روایت ہے کہ شاہ عبدالعزیز نے تین آدمیوں کو سید صاحب کی خدمت کے لیے مقرر کر دیا تھا: ایک سید شمن علی خان پوری، دوسرے قاری نسیم خان پوری، تیسرے قاری صاحب کے چھوٹے بھائی۔ ان سے کہہ دیا تھا کہ سید صاحب کو جس چیز کی ضرورت پڑے، اس کا انتظام کر دیا کرو اور ایک ٹھلیا اپنے پاس سے دی، جس میں سید صاحب کے لیے دریا سے پانی لایا جاتا تھا۔ قاری نسیم اور ان کے چھوٹے بھائی زہد و تقویٰ میں اتنے بلند پایہ تھے کہ عام لوگ مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کے تقویٰ کو اُن کے تقویٰ سے تشبیہہ دیا کرتے تھے۔

اسی زمانے میں شاہ صاحب کے خاندان میں شادی کی ایک تقریب ہوئی۔ جس مقام پر شامیانہ

---

[1] منظورہ صفحہ ۴۵

تانا جاتا تھا، وہاں نیم کا ایک درخت تھا۔ اس وجہ سے شامیانہ ٹھیک ٹھیک تنتا نہ تھا اور اس میں جھول رہتا تھا۔ سید صاحب نے یہ حالت دیکھی تو خود نیم کے درخت پر چڑھ گئے اور اس زور سے شامیانہ کو کھینچا کہ جھول بالکل نکل گیا۔ غیر معمولی جسمانی قوت کی یہ بھی ایک روشن نمائش تھی۔

یہ بھی لکھا ہے کہ شاہ عبدالقادر نے سید صاحب سے کہہ دیا تھا: شغل و ذکر کے وقت میری سہ دری کے پاس بیٹھا کرو۔ چنانچہ مینہ آتا یا آندھی آتی یا دھوپ، سید صاحب مقررہ جگہ پر بیٹھے رہتے اور جب تک شاہ عبدالقادر کا حکم نہ ہوتا، نہ اُٹھتے[1] بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شغل ذکر اور تعلیم سے فارغ ہو کر جمنا میں شناوری کی مشق بھی فرمایا کرتے تھے۔

سید صاحب کی طبیعت کو غیر مشروع مشاغل سے اس درجہ ناسازگاری تھی کہ ان میں شریک ہونے یا حصہ لینے کا ظاہراً امکان ہی نہ تھا۔ جمنا کے کنارے ہندوؤں کا ایک میلہ لگا کرتا تھا۔ جس میں عورتیں بکثرت جمع ہوتی تھیں۔ بے تکلف رفیقوں نے ایک مرتبہ سید صاحب کو بھی اس میلے میں لے جانا چاہا۔ آپ نے انکار فرما دیا۔ دوست جبراً اٹھا کر لے گئے۔ جب میلے کے قریب پہنچے تو آپ پر سکرات موت کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ رفیق یہ دیکھ کر ڈر گئے اور وہیں سے آپ کو واپس لے آئے۔ "تاریخ عجیبہ" میں ہے کہ رفیق ایک مرتبہ آپ کو ایک مجلس میں لے گئے۔ وہاں اچانک ساز بجنے لگے تو آپ بے ہوش ہو گئے۔

بیعتِ تزکیۂ نفس

سنہ ۱۲۲۲ھ میں سید صاحب نے شاہ عبدالعزیز سے بیعت کی۔ اس وقت ہندوستان میں تصوّف کے تین سلسلے زیادہ رائج تھے یعنی نقشبندیہ، قادریہ اور چشتیہ۔ طالب جس سلسلے میں بیعت کرنا چاہتا تھا، شاہ صاحب اسی سلسلے کا طریقۂ ذکر و شغل سکھاتے تھے۔ سید صاحب نے تینوں سلسلوں میں بیعت کی۔ پہلے دن لطیفہ اوّل یعنی ذکر قلب کی تعلیم ہوئی، دوسرے دن باقی لطائف یعنی لطیفۂ روح، لطیفۂ سر، لطیفۂ خفی، لطیفۂ اخفیٰ اور لطیفۂ نفس کا ذکر سکھایا گیا۔ تیسرے جلسے میں سلطان الاذکار اور چوتھے جلسے میں ذکر نفی و اثبات بتایا گیا۔ پھر شغل برزخ کا حکم ہوا جس میں صورت شیخ کا تصور صوفیہ میں مروج تھا[3]

---

[1] یہ تینوں روایتیں "ارواح ثلاثہ" سے ماخوذ ہیں (صفحہ ۹۶، ۹۷)۔ [2] "مخزن احمدی" میں ہے۔ "در سنہ بست و دوم بعد مئو یک ہزار و دویست و بست و دو سال این سعادت عظمیٰ و عطیہ کبریٰ بحضرت ایشاں دست داد (صفحہ ۱۰۸)۔ [3] لطائف ستہ کی سرسری کیفیت میں نے پیش کر دی ہے۔ سلطان الاذکار کا مطلب یہ ہے کہ سراپا ذکر بن جائے۔ نفی و اثبات شرح کا محتاج نہیں۔ ان تمام امور یا شغل برزخ کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا اس لیے کہ خود اس کوچے سے نابلد ہوں۔ البتہ یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ متن کے تمام مطالب "مخزن احمدی" (صفحہ ۱۰۸، ۱۰۹) اور "وقائع احمدی" (صفحہ ۱۰۲) سے ماخوذ ہیں۔

تصورِ صورتِ شیخ کا حکم سُنا تو سید صاحب نے ادب سے عرض کیا کہ حضرت! اس شغل اور بُت پرستی میں کیا فرق ہُوا؟ مفصّل ارشاد ہو۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے جواب میں خواجہ حافظ کا یہ مشہور شعر پڑھا:

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا

سید صاحب نے دوبارہ عرض کیا کہ میں بہرحال فرماں بردار ہوں، اس لیے کہ کسبِ فیض کی غرض سے آیا ہوں، لیکن تصورِ شیخ تو صریح بُت پرستی معلوم ہوتا ہے۔ اس خدشے کو زائل کرنے کے لیے قرآن و حدیث سے کوئی دلیل پیش فرما دیں، ورنہ اس عاجز کو ایسے شغل سے معاف رکھیں۔ شاہ صاحب نے یہ سنتے ہی سید صاحب کو سینے سے لگا لیا، رخساروں اور پیشانی پر بوسے دیے اور فرمایا: "اے فرزندِ ارجمند! خدا نے تجھے اپنے فضل و رحمت سے تجھے ولایتِ انبیاء عطا فرمائی ہے۔"[1]

ولایتِ انبیا اور ولایتِ اولیاء

سید صاحب نے ولایتِ انبیا اور ولایتِ اولیاء کی تشریح پوچھی تو شاہ صاحب نے فرمایا: جس شخص کو ولایتِ اولیا عطا ہوتی ہے وہ رات دن ریاضت و مجاہدات، صوم و صلوٰۃ اور کثرتِ نوافل میں مشغول رہتا ہے۔ لوگوں کی صحبت پسند نہیں کرتا۔ چاہتا ہے کہ گوشۂ تنہائی میں خدا کی یاد سے لذت اندوز ہوتا رہے۔ اسے فاسقوں اور فاجروں کو وعظ و نصیحت سے کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ صوفیہ کرام کی اصطلاح میں اسے "قربِ بالنوافل" کہتے ہیں۔

ولایتِ انبیا کا درجہ جس خوش نصیب کو مرحمت ہو، اس کے دل میں محبتِ الٰہی اس طرح

---

[1] یہ روایت مخزنِ احمدی، وقائعِ احمدی اور دوسری کتابوں میں اسی طرح درج ہے۔ ممکن ہے اس سے کسی صاحب کو وسوسہ پیدا ہو کہ کیا شاہ عبدالعزیزؒ جیسا یگانۂ عالم دین اس حقیقت سے ناواقف تھا کہ تصورِ صورتِ شیخ کے لیے قرآن و حدیث میں کوئی سند موجود نہیں یا اس تصور کو عام صنم پرستی سے الگ نہیں کیا جا سکتا؟ میں اس بارے میں تحقیقی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خیال یہ ہے کہ صوفیہ نے طالب کی توجہ جمانے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے۔ ان میں سے ایک طریقہ تصورِ صورتِ شیخ کا بھی تھا، جس سے یہ بزرگ کام لیتے رہے۔ سید صاحب کی طبیعت اتنی پاک و منزّہ تھی کہ اسے قبول نہ کر سکی۔ شاہ صاحب چونکہ طبیبِ حاذق تھے، اس لیے سمجھ گئے کہ یہ دوا سید کے مزاج کے لیے سازگار نہ ہوگی، لہٰذا اسے چھوڑ دیا۔ جب یہ مقصود دوسرے طریقوں سے بوجہ احسن حاصل ہو سکتا تھا تو تصورِ شیخ پر اصرار کی ضرورت نہ تھی۔

ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ جس عمل کے لیے کتاب و سنت میں کوئی بنا موجود نہ ہو، وہ ہر مسلمِ اسلام کے نزدیک لازماً ناقابلِ قبول ہونا چاہیے کیونکہ دین کا ماخذ کتاب و سنت ہیں نہ کہ کسی طبقے کا عمل۔

سما جاتی ہے کہ اس کے سوا کسی چیز کے لیے گنجائش باقی نہیں رہتی۔ وہ ہر وقت بندگانِ خدا کو نیکی کی راہ پہ لگانے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ مرضیات باری تعالیٰ کے کسی کام میں دنیا داروں کے طعن و ملامت کی پروا نہیں کرتا۔ وہ توحید کی اشاعت میں بے خوف اور سننِ رسولؐ پاک کے احیاء میں بے باک ہوتا ہے۔ ضرورت پیش آئے تو مخالفوں کے ساتھ مجاہدات میں مال و جان قربان کرتے وقت بھی متامل نہیں ہوتا۔ وہ للّٰہ فی اللّٰہ تمام محفلوں اور مجلسوں میں جاتا ہے۔ سب کو وعظ و نصیحت سناتا ہے۔ اس کا نوحیر ہیں جو تکلیفیں اور اذیتیں پیش آئیں، اُن پر صبر کرتا ہے۔ اسے اصطلاح میں قرب بالفرائض کہتے ہیں[1]۔

بہرحال سید صاحب نے سیر و سلوک کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کرلیں۔ شاہ عبدالعزیز نے خود ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:

ایں سید عالی تبار در علم باطن چناں ذکی الطبع اند کہ بہ اندک اشارہ مقامات عالیہ را فہم نمودہ طے مے کنند۔	یہ سید عالی تبار، علم باطن میں اتنے ذکی ہیں کہ معمولی سے اشارے کی بناء پر مقامات عالیہ کو سمجھ جاتے ہیں اور انھیں طے کرلیتے ہیں۔

شب قدر اور سعادتِ حضوری

اس زمانے میں سید صاحب نے بڑی کٹھن ریاضتیں اور مجاہدے شروع کر دیے تھے۔ نواب وزیر الدولہ مرحوم نے لکھا ہے کہ آغاز سلوک میں سالہا سال تک سید صاحب عشاء و فجر کی نمازیں ایک وضو سے ادا کرتے رہے یعنی دونوں نمازوں کا درمیانی وقت کاملاً عبادت میں بسر فرماتے تھے[2]۔ بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ قیام لیل کے باعث آپ کے پاؤں متورم ہوجاتے تھے۔

رمضان المبارک ۱۲۲۲ھ کی اکیسویں تاریخ کو شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر پوچھا کہ لیلۃ القدر کونسی رات ہوگی؟ رات بھر عبادت گزاری معمول بن گئی تھی، استفسار سے مقصود غالباً یہ تھا کہ اس مبارک شب میں جاگنے کا خاص اہتمام کرلیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا: "فرزند عزیز! شب بیداری کا معمول جاری رکھو۔ یہ بھی واضح رہے کہ محض جاگتے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ پاسبان ساری راتیں آنکھوں میں گزار دیتے ہیں، مگر انھیں فیض آسمانی کی دولت سے کب حصہ ملتا ہے۔ خدائے برتر کا فیض شامل حال ہونا چاہیے۔ نصیبہ یاور ہو تو انسان کو سوتے سے جگا کر دامنِ طلب برکات کے موتیوں سے بھر دیا جاتا ہے۔

---

[1] یہ بیانات "مخزن احمدی" اور "وقائع احمدی" کی تحریرات پر مبنی ہے۔ [2] وصایا نصف اوّل صفحہ ۲۵۹

سید صاحب قیام گاہ پر چلے آئے۔ کئی راتیں بیداری میں گزاریں۔ ۲۷- رمضان المبارک (۲۸- نومبر ۱۸۰۷ء) کو عشا کے بعد بے اختیار نیند آ گئی۔ رات کا ایک حصّہ باقی تھا کہ اچانک کسی نے جگا دیا۔ اُٹھے تو دیکھا دائیں بائیں حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبرؓ تشریف فرما ہیں اور زبانِ مبارک پر یہ کلمات جاری ہیں کہ "احمد! اُٹھ اور غسل کر۔ آج شب قدر ہے، خدا کی یاد میں مشغول ہو اور قاضی الحاجاتؑ کی بارگاہ میں دُعا و مناجات کر!"

آپ اُٹھے۔ کپڑوں سمیت حوض میں غسل کیا۔ پھر کپڑے بدل کر عبادت میں مصروف ہو گئے۔ ساتھ ہی حضوری کی سعادت ختم ہو گئی۔ سید صاحب نے بارہا فرمایا کہ اس رات مجھ پر افضالِ الٰہی کی عجیب بارش ہوئی اور حیرت انگیز وارداتِ رُوح افزا ہوئے۔ بصیرتِ باطنی اس طرح روشن ہو گئی کہ اشجار و احجار بھی بارگاہِ ایزدی میں سربسجود نظر آتے تھے اور اس طریق پر تسبیح و تہلیل کر رہے تھے کہ اسے معرضِ بیان میں لانا مشکل ہے۔ صبح کی اذان تک یہی کیفیت رہی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ عالمِ غیب کا معاملہ تھا یا عالمِ شہادت کا یعنی رویا میں سب کچھ پیش آیا یا عالمِ اجسام میں۔

دوسرے دن نمازِ اشراق کے بعد شاہ صاحب کو ماجرائے شب سُنایا۔ اُنھوں نے جو کچھ فرمایا، اُسے سید محمد علی نے مندرجہ ذیل اشعار میں بیان کیا ہے:

تو بودہ چو سہا ایں زماں چو ماہ شدی　　ہزار شکر کہ بودی گدا و شاہ شدی
کلاہِ گوشۂ خود را بہ آسماں برساں　　کہ ذرہ بودی و خورشیدِ چاشت گاہ شدی
مُرید بودی، اینک مراد یافتہ　　بہ فضلِ ایزدِ متعال شیخِ راہ شدی

بہ خوابِ دولتِ بیدار یافتی بہ کنار
کمینہ بودی و مقبولِ بارگاہ شدیؔ

دہلی سے رائے بریلی

۱۲۲۲ھ کے اواخر یا ۱۲۲۳ھ کے اوائل میں آپ اجازت لے کر وطن گئے۔ کمل کا جُبّہ بنا لیا تھا۔ سر پہ فقیرانہ کلاہ تھی اور ہاتھ میں چمڑے کا آبدان۔ شاہ عبدالعزیز نے وہ خاندانی دلق بھی آپ کے حوالے کر دی تھی جو شاہ صاحب کے جدِ امجد شاہ عبدالرحیم کے زمانے میں راستے بریلی سے دہلی آئی تھی۔ سارا راستہ پیدل طے کیا۔ عصر کے وقت تکیہ علم اللہ کی مسجد میں پہنچے۔ چونکہ وطن سے نکلے ہُوئے چار پانچ برس ہو چکے تھے اور داڑھی مونچھیں خوب نکل آئی تھیں، نیز لباس بالکل

اجنبیوں کا سا تھا اس لیے اوّل نظر میں اقربا بھی پہچان نہ سکے۔

سید عبدالقادر بن سید امان اللہ نصیر آبادی نے (یا سید علم الہدیٰ (بن سید محمد ثابت، بن سید محمد حیا، بن سید سنا، بن محمد ہدیٰ، بن سید علم اللہ) نے بڑی دیر کے بعد پہچانا اور تمام عزیزوں کو خبر دی۔ اس زمانے میں اہل خاندان عموماً آپ کو "میر احمد" یا "میاں صاحب" کہہ کر پکارتے تھے۔ بعض خاندانی وثیقوں پر سید صاحب نے بہ طور گواہ دستخط کیے تھے، ان میں بھی اپنا نام "میر احمد" ہی لکھا۔

والدہ اور اہل خاندان انھیں فقیری کے بھیس میں دیکھ کر سخت متاسف ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب نے ضروریاتِ سفر کے پیشِ نظر یہ لباس پہن لیا تھا، پھر والدہ اور اقربا کے پاسِ خاطر سے اسے ترک کر دیا۔

شادی

دہلی سے سید صاحب رائے بریلی پہنچے تو عمر کے بائیس مرحلے گزر چکے تھے اور تیئیسویں میں قدم پڑ چکا تھا۔ اقربا نے طے کیا کہ ان کا نکاح کر دیا جائے۔ ممکن ہے یہ خیال بھی اس تجویز کا محرک ہوا ہو کہ نکاح کے بعد خانگی ذمہ داریوں کا بوجھ سر پر پڑے گا تو دنیاداری کے لحاظ سے مفید و سود مند کاموں میں لگ جائیں گے۔ نسبت بہت پہلے سے ٹھہر چکی تھی اور لڑکی والے سید صاحب کے ہم خاندان تھے، لیکن جب ان کے درویشانہ مشاغل کو دیکھا تو توقّف میں پڑ گئے۔ آخر مختلف اقربا نے انھیں راضی کیا۔ چنانچہ ۱۲۲۳ھ میں سید صاحب کی شادی نصیر آباد میں ہوئی۔ بی بی کا نام سیدہ زہرہ تھا جو سید علم اللہ شاہ کے حقیقی چچا سید اسحاق کی اولاد میں سے تھیں۔ شجرہ نسب یہ ہے: سیدہ زہرہ، بنت سید محمد روشن، بن سید محمد شافع، بن سید عبدالغفار، بن سید تاج الدین، بن سید محمد اسحاق عم سید علم اللہ (یعنی برادر سید محمد فضیل)، بن سید محمد معظم۔ ۱۲۲۴ھ میں سید صاحب کی بڑی صاحبزادی سیدہ سارہ پیدا ہوئیں۔

عبداللہ پہلوان کا واقعہ

غالباً اسی زمانے میں آپ ایک مرتبہ نصیر آباد گئے تو عبداللہ پہلوان کے ساتھ کشمکش کا واقعہ پیش آیا۔ یہ شخص طاقت اور تنومندی میں دُور دُور مشہور تھا۔ ہر وقت فسق و فجور میں مبتلا رہتا اور سحر و افسوں بھی جانتا تھا۔ سید صاحب جب اس سے ملتے تو فرماتے: بھائی عبداللہ نماز پڑھا کرو اور بُرے کام چھوڑ دو۔ ایک روز محلہ قضیانہ کی مسجد کے پاس ایک تنگ کوچے میں اُس سے ملاقات ہو گئی۔ سید صاحب نے عادت مبارک کے مطابق اُسے نماز اور دوسرے احکام دین پر کاربندی کی تلقین فرمائی۔ اُس نے بگڑ کر مجادلے کا رنگ پیدا کر لیا اور بولا:

نماز سے کیا حاصل ہوگا؟

سید صاحب : ادا نہ کرو گے تو فرشتے قبر میں عذاب دیں گے ۔

پہلوان : فرشتے آئیں گے تو دو چار مکّے رسید کر کے انھیں بھگا دوں گا ۔

سید صاحب نے بڑے تحمّل سے فرمایا : اس قسم کے کلمات تکبّر موجبِ کفر ہیں ۔ فرشتوں کو خدائے برتر نے اتنی قوت عطا کر رکھی ہے کہ سارے انسان مل کر بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے ۔

پہلوان یہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا اور سید صاحب کو مارنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا ۔ آپ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور مسجد کے پشتے کے ساتھ اس زور سے رگڑا کہ بات کرنے کی بھی تواں نہ رہی ۔ دیکھنے والے حیران رہ گئے ۔ اس سے پہلے کسی کو خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا، بیس بائیس برس کا نوجوان، طاقت و قوت کے اس دیو کو یوں مسل کر رکھ دے گا ۔ پہلوان اٹھا تو طاقت کا گھمنڈ کافور ہو چکا تھا ۔ بے توقف سید صاحب کا معتقد بن گیا اور تمام منہیات سے توبہ کر لی ۔

ایک روز کہنے لگا کہ آپ کے لیے شکار لانے کو جی چاہتا ہے ۔ چنانچہ بندوق لے کر جنگل کو چلا گیا ۔ اتفاقیہ سینگڑے میں آگ لگ گئی، بارود بھڑک اٹھی اور عبداللہ جل کر فوت ہوا ۔

ساتواں باب

نوّاب امیر خاں کی رفاقت

مستقلِ مشغولیت کا انتظام سید صاحب دہلی سے رائے بریلی گئے تھے تو عمر کے تئیسویں مرحلے میں تھے۔ یقین ہے اسی زمانے میں سوچنے لگے ہوں گے کہ کونسا مشغلہ اختیار کیا جائے جو مزاج و طبیعت کے عین مطابق ہو اور اس سے پیش نظر مقاصد کی تکمیل کو فائدہ پہنچے۔ غور و فکر کے بعد نواب امیر خاں کی رفاقت کا فیصلہ کیا اور ۱۲۲۶ھ میں دوسری مرتبہ وطن سے نکل پڑے۔

"حیات طیبہ" نے جمادی الاخریٰ ۱۲۲۴ھ کی تاریخ تعین سے پیش کی ہے[۵] مجھے اس کا ماخذ معلوم نہیں، لیکن سید ابو الحسن علی صاحب نے بعض ایسی شہادتیں پیش کی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب ربیع الآخر ۱۲۲۶ھ تک یقیناً رائے بریلی میں تھے۔ مثلاً:

۱۔ سید محمد علی، سید احمد علی اور سید حمید الدین صاحبان نے اپنے والد ماجد سید عبد السبحان کے قرضے کا اقرار نامہ لکھا، جس پر سید صاحب کی گواہی تھی۔ اس اقرار نامے کی تاریخ ۲۰۔ ربیع الاول ۱۲۲۶ھ تھی (۱۴۔ اپریل ۱۸۱۱ء)۔

۲۔ سید قطب الہدیٰ نے اپنی تمام مملوکہ کتابوں کا ہبہ نامہ اپنے بھتیجے سید محمد ظاہر حسن کے نام لکھا۔ اس پر سید صاحب کی بھی مہر ثبت تھی۔ یہ ہبہ نامہ ۲۸۔ ربیع الاول ۱۲۲۶ھ کو لکھا گیا (۲۲۔ اپریل ۱۸۱۱ء)

۳۔ سید قطب الہدیٰ کا انتقال سید صاحب کے سامنے ہوا اور آپ احتضار کے وقت موجود تھے۔ اس واقعے کی تاریخ گلشن محمودی کے مطابق ۱۹۔ ربیع الآخر ۱۲۲۶ھ ہے (۱۳۔ مئی ۱۸۱۱ء)۔

۴۔ "امیر نامہ" کے بیان کے مطابق دھمکود کا محاصرہ ۱۲۲۷ھ میں پیش آیا (۱۸۱۲ء)۔

بہرحال ربیع الآخر ۱۲۲۶ھ تک سید صاحب کا رائے بریلی میں ہونا بالکل واضح ہے اور وسط ہند کا سفر اس کے بعد ہوا۔

نواب کے پاس جانے میں یہ امر بھی محرک ہوا ہوگا کہ سید صاحب کے بڑے بھائی سید ابراہیم

---

[۵] "حیات طیبہ" ص ۲۰۹۔

پہلے نواب کے لشکر میں رہ چکے تھے۔ غالباً سپاہی کی حیثیت میں پہنچے، لیکن زہد و تقویٰ کی بنا پر لشکر میں امامت نماز کی خدمت ان سے متعلق ہو گئی۔ وسط ہند کے کسی مقام پر ۴- شوال ۱۲۲۴ھ (۱۲- نومبر ۱۸۰۹ء) کی رات کو فوت ہوئے۔ جس حد تک میں تحقیق کر سکا ہوں سید صاحب ان کی زندگی میں نواب کے پاس نہیں پہنچے تھے۔

اخفاءِ حال اور مشقِ سپہ گری

لیکن سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ نواب کے پاس جانے کا فیصلہ کیوں کیا؟ کیا محض معیشت کی مجبوری انھیں کھینچ کر لے گئی تھی؟ اب تک سید صاحب کے جو حالات بیان کیے جا چکے ہیں، ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسبابِ معیشت کی ترتیب و فراہمی سے اُن کی طبیعت کو کوئی مناسبت نہ تھی۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری نے لکھا ہے:

> آپ کو واسطے تکمیل اپنے حال کے اس وقت اخفاء منظور تھا اور نیز اس جوہر سپہ گری کی بھی، جو آپ کے اندر ودیعت تھا، مشق کرنی منظور تھی۔[1]

لیکن تکمیلِ حال اور اخفاء کا مدعا وطن یا دہلی میں بوجہ احسن پورا ہو سکتا تھا۔ اس زمانے میں سید صاحب ولی اللّٰہی خاندان کے ہزاروں مریدوں میں سے ایک معمولی اور گمنام مُرید تھے۔ وہ جہاں بھی بیٹھ جاتے تکمیلِ حال و اخفاء کے مقاصد کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ نواب کے لشکر میں پہنچنے کے بعد جو صورتِ حال پیش آئی وہ اخفاء کی مصلحتوں کے سراسر خلاف تھی، جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہو گا۔ جوہرِ سپہ گری یا کسبِ معیشت کے لیے لکھنؤ ان کے وطن سے بہت قریب تھا اور ان کے خاندان کے متعدد اکابر لکھنؤ ہی میں ملازم رہے تھے۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ سپہ گری کی مشق کا وہ پیمانہ سید صاحب کے زمانے میں موجود ہی نہ تھا، جس کے تصوّر میں ہم لوگ آج کل سرمست ہیں۔ عام ہتھیاروں کا استعمال سب لوگ جانتے تھے۔ لڑائیوں کا طریقہ ایسا تھا کہ جوانمردی اور استقامت ہی کو کامیابی کا سب سے بڑا گُر سمجھا جاتا تھا۔ خود نواب امیر خاں نے کونسی عسکری تربیت گاہ میں سپہ گری کے ہُنر سیکھے تھے کہ اس کے لشکر میں شمول جوہرِ سپہ گری کی مشق کے لیے زیادہ موزون نظر آیا؟ جب سید صاحب نے خود مستقل فوجی تنظیم کا بندوبست کیا تھا تو ان کے رفیقوں

---

[1] تواریخ عجیبہ ص۱۱۔ اس کتاب کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے گویا سید صاحب نے رائے بریلی سے نکل کر دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ پھر وہ سکونتِ دہلی کو ترک کر کے نواب کے پاس گئے۔ یہ صحیح نہیں۔ نواب کے پاس جاتے ہوئے سید صاحب یقیناً دہلی سے گزرے، اس لیے کہ عام راستہ یہی تھا۔ دہلی میں ٹھہرے بھی ہوں گے، لیکن وہاں سکونت گزین نہیں ہوئے تھے۔

میں سے کتنے تھے، جن کے لیے سپہ گری کی باقاعدہ مشق کا انتظام کیا گیا تھا؟ شاہ اسماعیل صاحب اسید صاحب کے سپہ سالاروں میں سب سے ممتاز مانے جاتے تھے، انھوں نے کب اور کہاں سپہ گری کی مشق کی تھی؟

آخر میں یہ بھی ظاہر ہے کہ سید صاحب نے سات برس نواب کے لشکر میں گزارے۔ وہ مختلف لڑائیوں میں شریک رہے۔ لیکن جس حد تک میں معلوم کر سکا ہوں نہ اس کے لشکر میں جنگی فنون کی مشق کے لیے کوئی تربیت گاہ موجود تھی اور نہ سید صاحب کو کسی تربیت گاہ میں کم یا زیادہ مدت بسر کرنے کا موقع ملا۔

حقیقی مقصد

مجھے یقین ہے کہ آپ کو وہی جذبۂ خدمتِ دین کشاں کشاں نواب کے لشکر میں لے گیا تھا، جس کی بناء پر انجام کار انھوں نے بطورِ خود فداکاروں کی ایک جماعت تیار کی اور حیاتِ طیبہ کے گراں بہا اوقات جانبازی و جانفشانی میں صرف کر دیے، یعنی وہ اسلامی حکومت کے احیاء کی خاطر جہاد فی سبیل اللہ کا عزم لے کر امیر خاں کے پاس گئے تھے، لیکن حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ امید و آرزو کا یہ چراغ زیادہ دیر تک روشن نہ رہ سکا۔ یہاں تک کہ سید صاحب کو نواب سے الگ ہو کر خالص اسلامی اصول پر ایک جماعت منظم کرنی پڑی۔

خود سید صاحب کا بیان ہے کہ غیبی اشاروں کی بناء پر وہ نواب صاحب کے لشکر میں گئے تھے۔

وقائع میں ہے کہ جب وہ لشکر میں تھے تو ایک روز فرمایا:

> "قصبہ رائے بریلی میں مجھ کو جناب الٰہی سے الہام ہوا کہ یہاں سے نواب نامدار امیر الدولہ بہادر کے لشکر میں جا اور وہاں کی خدمت ہم نے تجھ کو دی۔ وہاں ہم کو تجھ سے کچھ اور کام بھی لینے ہیں۔ یہ مژدۂ غیبی سُن کر میں وہاں سے روانہ ہوا۔ چند روز میں آ کر ملازمت نواب صاحب ممدوح کی حاصل کی۔[1]

"منظورہ" کے الفاظ اس سے بھی واضح تر ہیں:

از زمانیکہ حضرت امیر المومنین	جس زمانے میں حضرت امیر المومنین اقامت
بناء بر الہامیکہ در باب اقامت جہاد مے شد،	جہاد کے متعلق غیبی اشاروں کی بناء پر امیر الدولہ
رہگرائے لشکر ظفر اثر . . . . امیر الدولہ نواب	نواب امیر خاں مرحوم کے لشکر ظفر اثر کی جانب روانہ
امیر خاں بہادر مرحوم شدند[2]	ہوئے۔

"مخزن احمدی" میں ہے کہ سید صاحبؒ "از جانب ایزد متعال مامور و محکوم" ہو کر گئے۔[3]

---

[1] وقائع صفحہ ۲۲۔ [2] منظورہ صفحہ ۲۳۷۔ [3] مخزن احمدی صفحہ ۳۲۔

غرض، نہ تکمیل حال محرک ہوئی، نہ سعی اخفاء۔ نہ سپہ گری کے جوہر کی مشق مطلوب تھی، نہ وجہ معیشت غرض صرف یہ تھی کہ جہاد فی سبیل اللہ کے قیام کی سعی کی جائے اور یہ اقدام غیبی اشاروں کی بنا پر عمل میں آیا تھا۔

ہندوستان کا سیاسی نقشہ

ممکن ہے سوال پیدا ہو کہ اس غرض کے لیے امیر خاں کے لشکر کو منتخب کرنے کی کونسی وجہ تھی؟ اس انتخاب کا اندازہ کرنے کے لیے ہندوستان کے سیاسی حالات کا سرسری نقشہ سامنے رکھ لینا چاہیے۔

اس زمانے میں مغلوں کی قوت مضمحل ہو چکی تھی، جس کی عظمت کا ڈنکا کابل و قندھار سے آسام و اراکان تک اور قرہ قرم سے راس کماری تک اڑھائی سو سال بجتا رہا۔ تمام صوبے ایک ایک کر کے مرکز سے الگ ہو چکے تھے اور مغل بادشاہوں نے ہندوستان کے مختلف ٹکڑوں کو باہم جوڑ جوڑ کر اسے ایک عظیم الشان ملک اور جلیل القدر سلطنت بنانے کا جو کام دو سو برس میں پورا کیا تھا، وہ برباد ہو چکا تھا۔ خانہ جنگی اور بدنظمی کا دور دورہ تھا اور ہر حصے میں نئی نئی قوتیں بروئے کار آ چکی تھیں۔ مسلمانوں کی سیاسی عظمت و برتری کا علم سرنگوں ہو رہا تھا۔ میسور میں حیدر علی نے ایک نئی اور صالح سیاسی قوت کی بنیاد رکھی۔ ٹیپو سلطان نے اس کی رگوں میں دینی حمیت کا گرم خون دوڑایا، لیکن اس قوت کو اپنوں کی بے حمیتی اور کوتاہ اندیشی نے موت کی نیند سلا دیا۔

مغلوں کے دور انحطاط میں مرہٹے ملک کے بڑے حصے پر چھا گئے تھے۔ ایک موقع پر تو مغلوں کا تخت بھی ان کی دسترس میں آ گیا تھا۔ مرہٹوں پر پہلی کاری ضرب؛ احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان میں لگائی، اگرچہ وہ اس کے بعد بھی چالیس پچاس برس تک موجود رہے، لیکن ان کا بکھرا ہوا شیرازہ پھر نہ جم سکا۔ پہلے ٹکڑوں میں بٹے، پھر ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے ختم ہو گئے۔

پنجاب میں رنجیت سنگھ نے بظاہر ایک مستقل حکومت کا ڈول ڈالا تھا، لیکن تاریخ دان اصحاب جانتے ہیں کہ وہ حکومت نہ تھی بلکہ ایک طرح کا عارضی سا فوجی غلبہ تھا جو رنجیت سنگھ کی زندگی تک قائم رہا۔ جب وہ مرا تو جانشینوں نے چار پانچ ہی برس میں اس کا تار و پود ہمیشہ کے لیے بکھیر کر دیا، حالانکہ رنجیت سنگھ نے اس میں حکومت کی سج دھج پیدا کرنے کے لیے چالیس برس صرف کیے تھے۔

سندھ کی حکومت چار امیروں کے ہاتھ میں تھی۔ اودھ میں شجاع الدولہ نے، دکن میں نظام نے، بنگال، بہار اور اڑیسہ میں علی وردی خاں نے اس امید پر خود مختاری کی بساط آراستہ کی تھی کہ اگر پورے ہندوستان کو سنبھالا نہیں جا سکتا تو اپنے اپنے علاقوں ہی کو سنبھال لیں۔ اودھ کی نصف سلطنت سعادت علی خاں نے

حکمرانی کی حرص میں گنوا دی۔ اس کے جانشینوں نے بقیہ نصف کو بھی تیزی سے اس حالت پر پہنچا دیا کہ کلکتہ سے ایک فرمان کا اجرا اُسے ختم کر دینے کے لیے کافی سمجھا گیا۔ دولت نظام بھی داخلی بدنظمیوں اور حاکموں کی مسلسل بے تدبیریوں کی بنا پر تحلیل ہوتے ہوتے آدھی رہ گئی تھی اور جو رہ گئی تھی اس کے اعمال و وظائف کے بارے میں کچھ کہنے سے نہ کہنا ہزار درجہ بہتر ہے۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ کی حکومت کو علی وردی خاں کی وفات کے ایک برس بعد انگریزوں نے شل کر کے رکھ دیا اور وہی علاقے ہندوستان میں انگریزی سلطنت کا سنگ بنیاد بنے۔

انگریز

یہ سب ملکی طاقتیں تھیں، اکثر اسلامی اور بعض غیر اسلامی، لیکن سید صاحب کی ولادت سے کم و بیش تیس برس پیشتر ایک اجنبی قوت نے بھی ہندوستان میں قدم جما لیے تھے۔ یہ انگریز تھے جو تاجروں کے بھیس میں آئے، ملکی حاکموں کی بدعملیوں نے ان میں حکمرانی کے ولولے پیدا کر دیے۔ سب سے پہلے کرناٹک، بنگال، بہار اور اڑیسہ ان کے زیر اثر آئے پھر انھوں نے مرہٹوں اور نظام کو ساتھ ملا کر سلطنت میسور کو ختم کیا۔ اُدھر سے فارغ ہوئے تو مرہٹوں، نظام اور اودھ پر توجہ مبذول کی۔ تھوڑے ہی دنوں میں سب کو امدادی فوجی نظام کی زنجیروں میں جکڑ کر بے دست و پا بنا دیا۔ پھر دہلی پہنچے تو اس تخت گاہ کے مختار کل بن گئے، جو پورے ہندوستان کی اطاعت و انقیاد کا مرجع تھی۔ سید صاحب کے ہوش سنبھالنے سے پہلے یہ سب کچھ پورا ہو چکا تھا۔ یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ اسلامی حکومت کے احیاء کا خواب دیکھنے والے ہر شخص پر واضح ہو گیا تھا، انگریزوں کی قوت سے ٹکرائے اور اسے پاش پاش کیے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔

ملکی کارفرماؤں میں سے اگر کوئی شخص اس جہاد میں رفاقت و اعانت کا حق ادا کر سکتا تھا تو وہ صرف امیر خاں تھا۔ ہمت، شجاعت اور جوانمردی میں اس کی دھاک دور دور تک بیٹھی ہوئی تھی۔ استعداد حرب و ضرب میں بھی اس کا مرتبہ بہت اُونچا تھا۔ جس خصوصیت نے اسے اقران و اماثل میں سب سے بڑھ کر سربلند کر دیا تھا، وہ یہ تھی کہ اس پر انگریزی اثر کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی تھی۔ وہ بالکل آزاد تھا اس لیے اسلام و وطن کی آزادی کی خاطر صلاحیت جہاد میں کوئی اس کا ہمسر نہ تھا۔ نظر بظاہر یہ آخری خصوصیت ہی سید صاحب کے لیے بطور خاص جذب و کشش کا باعث بنی ہو گی۔

نواب امیر خاں

امیر خاں بونیر (سرحد آزاد) کے سالار زئی قبیلے میں سے تھا۔ جو ٹرا (جیم مفتوح واؤ مشدد و مضموم) اس کے آبا کا اصلی وطن تھا۔ اس کا دادا طالع خاں محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آیا تھا۔ روہیل کھنڈ کی لڑائیوں میں شریک رہا اور سنبھل میں توطن اختیار کر لیا۔ دہلی

فوت ہُوا۔ اس کے بیٹے محمد حیات خاں نے بھی آبائی پیشہ اختیار کیا۔ لیکن جب روہیلوں کو شجاع الدولہ اور انگریزوں نے مل کر شکست دی اور حافظ الملک حافظ رحمت خاں شہید ہو گئے تو محمد حیات خاں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

امیر خاں اسی محمد حیات خاں کا بیٹا تھا۔ ۱۱۸۲ھ (۶۹-۱۷۶۸ء) میں پیدا ہُوا۔ لکھنے پڑھنے کا بالکل شوق نہ تھا اور سپہ گری سے خاصی دلبستگی تھی۔ بیس برس کی عمر میں چند رفیقوں کے ساتھ گھر سے نکل پڑا۔ اس زمانے کے رئیسوں اور جاگیرداروں کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی مُہم پیش آتی تو عارضی طور پر فوج بھرتی کر لیتے۔ امیر خاں نے وسطِ ہند، گجرات، دکن وغیرہ کئی مقامات پر عارضی ملازمت کی۔ من چلا آدمی تھا، روپیہ مل جاتا تو ساتھیوں کو نہال کر دیتا۔ نہ ملتا تو پریشانی میں دن گزارتا۔ ایک موقع پر کچھ پاس نہ رہا تو اپنا گھوڑا بیچ کر ساتھیوں کے خورد و نوش کا سامان مہیا کیا۔ رفتہ رفتہ اس کے پاس خاصی جمعیت فراہم ہو گئی۔

ہلکر سے تعلق

اس زمانے میں مرہٹہ سرداروں کے درمیان سخت کشمکش برپا تھی۔ تکوجی ہلکر کا بیٹا جسونت راؤ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا اور اپنی خاندانی میراث حاصل کرنے کے لیے اس نے کوششیں شروع کیں۔ بعض خیر خواہوں نے مشورہ دیا کہ امیر خاں کو ساتھ ملاؤ۔ چنانچہ جسونت راؤ امیر خاں سے ملا۔ دونوں کے درمیان عہد و پیمان ہُوا کہ ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے اور جو کچھ ہاتھ آئے گا نصف نصف بانٹ لیں گے۔ بلکہ کہتے ہیں، دونوں نے پگڑیاں بدل لی تھیں اور اس زمانے میں یہ عہد یگانگی کی نہایت موثر صورت تھی۔ امیر خاں نے تھوڑی سی مدت میں جسونت کے لیے شانِ امارت پیدا کر دی۔

جب مرہٹوں اور انگریزوں کے درمیان لڑائی چھڑی تو جسونت اس سے الگ رہا۔ مرہٹے شکست کھا گئے۔ انگریز جسونت سے بھی معاملہ طے کر لینا چاہتے تھے لیکن اس نے ایسی سخت شرطیں پیش کیں جنھیں انگریز مان نہ سکے۔ اس طرح لڑائی شروع ہو گئی۔ جسونت اور امیر خاں نے مل کر انگریزی فوج پر شدید حملے کیے اور اسے سخت نقصان پہنچایا۔ ان لڑائیوں کے دوران میں دونوں سرداروں کو پہلے پٹیالہ پھر پنجاب آنا پڑا۔ انگریزوں کو اندیشہ پیدا ہُوا کہ کہیں سکھ ان کے ساتھ نہ مل جائیں۔ اس وجہ سے دوبارہ صلح کی گفتگو شروع کی۔ اور جسونت راؤ کو اندور کی ریاست دے کر راضی کرنا چاہا۔ امیر خاں نے اس صلحنامے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا میں کابل جا کر شاہ شجاع کو ساتھ لاؤں گا۔ وہ نہ آئے گا تو اپنے ہم قوموں کا لشکر بھرتی کروں گا اور انگریزوں سے لڑوں گا۔ مشیروں نے یہ سنتے ہی ہلکر سے کہا کہ اگر تو اب پٹھانوں کو

لے آیا تو حکومت اس کے ہاتھ میں ہوگی۔ تمہاری مستقل حیثیت بالکل ختم ہو جائے گی۔ بہتر یہ ہے کہ انگریزوں سے صلح کر لو اور ریاست لے کر آرام سے بیٹھ جاؤ۔

ہلکر اس پر راضی ہو گیا اور اپنے مدت العمر کے حلیف اور دوست سے بدعہدی کی ٹھان لی۔ ایک طرف انگریزوں کے ساتھ تعلق پیدا کر لیا، دوسری طرف امیر خان کے پاس جا کر پگڑی پاؤں پر رکھ دی اور ہاتھ باندھ کر بولا مجھے جو کچھ ملا ہے، صرف آپ کی وجہ سے ملا ہے۔ اب آپ ہی اسے قائم رکھ سکتے ہیں۔ نواب نے ہلکر کا عجز والحاح دیکھ کر مُہر اس کے سامنے پھینک دی کہ جہاں چاہتے ہو اسے لگا کر اپنا مدعا پورا کر لو[1]۔ عہدنامے پر امیر خان کی مُہر کے لیے ہلکر اس وجہ سے مجبور تھا کہ انگریز کہتے تھے جب تک امیر خان کی مُہر نہ ہوگی ہم عہدنامہ نہ کریں گے۔ اس طرح امیر خاں کی جنگی سکیم ختم ہو گئی۔ ہلکر اندور کی ریاست لے کر بیٹھ گیا۔

امیر خان نے اگرچہ ہلکر کے عہدنامے پر مُہر ثبت کر دی تھی، جس پر انگریز مطمئن ہو گئے۔ لیکن اس نے انگریزوں کی ماتحتی قبول نہ کی تھی۔ اور اپنی آزاد حیثیت برقرار رکھی۔ اسی حالت میں وہ راجپوتانہ پہنچ گیا۔

آخری دَور کی سب سے بڑی آزاد قوت

امیر خان کی آزادانہ زندگی کے باقی دس بارہ سال راجپوتانے ہی میں گزرے، جہاں اس وقت تین بڑی ریاستیں تھیں: جے پور، جودھ پور اور اُودے پور۔ چھوٹی ریاستوں کا شمار نہ تھا۔ جے پور، جودھ پور اور اودے پور کے تعلقات بھی سخت بگڑ گئے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اودے پور کے رانا کی بیٹی کشنا کماری حسن و جمال میں شہرۂ آفاق تھی۔ اس کی منگنی پہلے جودھ پور کے راجہ سے ہوئی۔ پھر بعض جھگڑوں کی بنا پر والی اودے پور نے اس نسبت کو توڑ کر کرشنا کماری کا رشتہ مہاراجہ جے پور سے کر دیا۔ اس طرح تینوں ریاستوں میں لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ امیر خان نے ان لڑائیوں میں کبھی ایک ریاست کا ساتھ دیا اور کبھی دوسری کا۔ آخر میں وہ اودے پور کے دربار کی طرف سے تحصیل مال کا ذمہ دار بن گیا۔

غرض امیر خاں آخری دور کے آزاد ہندوستانی امیروں میں سب سے بڑھ کر طاقتور تھا۔ ایک موقع پر اس کے پاس چالیس ہزار جانباز جمع ہو گئے تھے اور ایک سو پندرہ

---

[1] "تواریخ محمدآباد" میں ہے کہ جب ہلکر نے عہدنامہ دکھا کر امیر خاں سے مُہر لگانے کی درخواست کی تو اس نے کہا تم صلح کرو، میں کیوں مُہر کروں؟ کیا کم ہمت ہوں؟ ہلکر نے انگریزوں سے کہہ دیا کہ ہم دونوں میں کوئی مغائرت نہیں۔ میری ہی مُہر عہدنامے کے لیے کافی ہے۔ امیر خاں میرا شریک حال ہے، میرے ساتھ چلے گا (تواریخ محمدآباد صفحہ ۱۳)

توپیں تھیں[1]۔ اتنی عظیم الشان قوت کو انگریز قلب ہند میں آزاد چھوڑنے کے روادار نہ ہو سکتے تھے، لیکن انھیں یہ حوصلہ بھی نہ تھا کہ امیر خان سے کھلے میدان میں ٹکرائیں۔ اس لیے کہ جانتے تھے من چلا آدمی ہے، مقابلے پر ڈٹ جائے گا تو ممکن ہے دوسری ملکی قوتیں بھی، جو بظاہر دب گئی تھیں، ابھر آئیں اور ہمیں بستر بوریا سنبھال کر ہندوستان سے نکل جانا پڑے۔ وہ امیر خان سے ٹکرائے نہیں۔ لیکن جو عناصر اس کے لیے کمک و یاوری کا سرچشمہ بن سکتے تھے، انھیں ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ توڑتے رہے؛ یہاں تک کہ اس کی فوج میں بھی انگریزی ریشہ دوانیاں خاصی پھیل گئیں۔

سیّد صاحب کا نصب العین

نواب میں بعض کمزوریاں بھی تھیں۔ مثلاً یہ کہ جو شخص لجاجت آمیز روش اختیار کرتا، اس کی بات فوراً مان لیتا۔ اگرچہ وہ بہتیری مصلحتوں کے خلاف ہوتی۔ روپیہ ہاتھ آتا تو بے دریغ لٹا دیتا۔ جب فوج کی تنخواہ بڑھ جاتی تو پریشانیاں اٹھاتا۔ ان وجوہ سے اس کی زندگی کے بہترین اوقات فضول مشغولیتوں میں ضائع ہو رہے تھے۔ سید صاحب یہ نصب العین لے کر امیر خان کے پاس گئے تھے کہ اس عظیم الشان آزاد قوت کو صحیح راستے پر لگائیں، اس سے آزادیِ وطن اور احیائے اسلام کا کام لیں۔ ان واقعات پر ڈیڑھ سو سال کے لیل و نہار گزر چکے ہیں اور وقت کا سیل پل کے نیچے سے گزر کر بہت دور جا چکا ہے۔ ہمارے سامنے ان واقعات کو جس رنگ، جس انداز اور جس اسلوب میں پیش کیا گیا، وہ ان لوگوں کا ایجاد کردہ تھا، جو ہماری ہر چیز کی حقیقی قدر و قیمت کو مٹانے اور کم کرنے کے در پے تھے۔ لیکن سید صاحب کی زندگی کے ابتدائی عہد کا ماحول سامنے رکھ کر تمام حقائق کا بالغ نظرانہ جائزہ لیا جائے تو یقین ہے کہ قلب سلیم ہمارے بیان کے ایک ایک حرف کی تصدیق کرے گا۔ سید صاحب کی یہ خوشگوار امید بلاشبہہ پوری نہ ہوئی۔ لیکن ثواب کی بنیاد نتائج پر نہیں، بلکہ حسنِ نیت اور اخلاصِ عمل پر ہے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ ضروری نہیں ہر فرد یا

---

[1] "مخزن احمدی" میں ہے کہ ایک لاکھ سوار، بے شمار پیادے اور صاعقہ بار توپیں اس کے پاس تھیں۔ وہ راجپوتانہ کے غیر مسلم راجاؤں سے بے شمار مال بطور جزیہ و خراج و عشر لیتا تھا۔ اس مال سے علماء، فضلاء، مشائخ اور سادات کی خدمت انجام دیتا تھا (صفحہ ۱۳۱ و ۱۳۲)۔ ایک انگریز مؤرخ نے خود نواب کے بیان کی بنا پر لکھا ہے کہ ۱۸۱۶ء میں اس کے پاس پچاس ہزار سوار، بارہ ہزار پیادے اور بھاری توپ خانہ تھا (تاریخ ہندوستان مصنفہ مل و ولسن جلد ہشتم صفحہ ۹۲۲)۔ ایک اور مصنف نے لکھا ہے: امیر خاں ایک اعلیٰ قائد اور بہادر سپاہی تھا۔ اس کی فوج نہایت اصلح تھی اور ہندوستان کی تمام ریاستی فوجوں میں سے بہترین ساز و سامان والی فوج سمجھی جاتی تھی (لارڈ ہیسٹنگز اور ہندوستانی ریاستیں مصنفہ موہن سنہا مہتہ صفحہ ۱۱۱)۔

جماعت کی ہر سعی ہر حال میں تمنا کے مطابق نتائج پیدا کرے۔ لیکن اس وجہ سے ترک سعی کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

سیّد صاحب مختار تھے یا مامور

ہمارے زمانے میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے یہ دعویٰ فرمایا کہ سید صاحب کو شاہ عبد العزیز نے مکمل پروگرام دے کر امیر خان کے لشکر میں بھیجا تھا۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے انقلابی کام شروع کیا۔

جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اس سے صاف آشکارا ہے کہ سید صاحب نے بہ طور خود یہ فیصلہ فرمایا۔ شاہ عبد العزیز کے امر و حکم کو اس اقدام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انھیں رائے بریلی ہی میں غیبی اشارہ ہوا کہ نواب کے پاس جاؤ۔ چنانچہ وہ نکل پڑے اور دہلی ہوتے ہوئے راجپوتانہ پہنچ گئے۔

"وقائع" میں ایک خط کا حوالہ ہے، جس میں سید صاحب نے نواب سے قطع علائق کا ذکر کرتے ہوئے شاہ عبد العزیز کو لکھا تھا:

> "یہ ننگ اسلاف سراپا انکسار حضرت کی قدم بوسی کو بتقریب حاضر ہوتا ہے۔ یہاں لشکر کا کارخانہ درہم برہم ہو گیا۔ نواب صاحب فرنگی سے مل گئے۔ اب یہاں رہنے کی کوئی صورت نہیں"[1]

اس خط کو مولانا کے دعوے کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے، اس طرح کہ اگر سید صاحب شاہ عبد العزیز کے فرستادہ نہ ہوتے تو ایسا خط کیوں لکھتے؟[2] کوئی نیک کام شروع کرتے وقت کسی مقدس و تجربہ کار بزرگ سے مشورہ کر لینا یا اس کے ایما و اشارہ کے مطابق قدم اٹھانا موجب عیب نہیں، بلکہ سرچشمۂ برکت ہوتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سید صاحب شاہ صاحب کے فرستادہ نہ تھے۔ اس لیے کہ:

۱۔ انھوں نے بطور خود حسب اشارہ ہائے غیبی لشکر میں جانے کا فیصلہ کیا۔

۲۔ محولہ بالا خط میں سید صاحب نے نواب کے لشکر سے بے تعلقی کی محض اطلاع دی ہے۔ اگر وہ شاہ صاحب کے فرستادہ ہوتے تو بہ طور خود لشکر میں رہنے یا نہ رہنے کا فیصلہ نہیں کر سکتے تھے بلکہ شاہ صاحب کو سارے حالات کی اطلاع دے کر اجازت منگاتے۔

۳۔ اگر شاہ صاحب نے سید صاحب کو بھیجا تھا تو کیا وجہ ہے کہ سات برس تک ایک مرتبہ بھی اپنے پاس بلا کر ممکنات عمل کی کیفیت نہ پوچھی یا جو کام سید صاحب کر چکے تھے اس کی تفصیل نہ سنی؟

---

[1] وقائع صفحہ ۱۰۴ - [2] شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک صفحہ ۱۵

اگر نواب انگریزوں سے صلح نہ کرتا تو سید صاحب بدستور وہیں رہتے۔ کیا آمر مامورین سے اسی طرح کام لیا کرتے ہیں؟

جس حد تک میں تحقیق کر سکا ہوں، مولانا عبید اللہ مرحوم کے دعوے کے لیے کوئی بنا موجود نہیں اور مستند روایات اس دعوے کی تردید کر رہی ہیں۔ اس سلسلے میں مزید بحثیں موقع پر آئیں گی۔

کیفیت سفر

جس زمانے میں سید صاحب دہلی سے راجپوتانہ گئے تھے۔ "مخزن احمدی" کے بیان کے مطابق لشکر نواب کے تمام راستے غیر مسلموں کے ہجوم کے باعث مسدود تھے، لیکن سید صاحب:

> متوکلاً و معتصماً بحفظہٖ بفراغ بال فرزند وحیداً شاداں و فرحاں مانند کسے بسیر بوستاں یا خانہ دوستاں سے روبجاز بلدہ شاہ جہان آباد نہضت فرمودہ بعد طے مراحل و منازل کہ ہر مرحلہ ہفت خواں رستم و اسفندیار بود طے فرمودہ، بوجود فیض آمود خود لشکر را منور و مشرف ساختند[1]

متوکلاً اور خدا کی حفاظت پر بھروسا کرتے ہوئے بے فکری کے ساتھ یگانہ و تنہا روانہ ہو گئے۔ اس درجہ شاداں و فرحاں تھے کہ جیسے کوئی شخص سیر باغ کو نکلے یا دوستوں کے گھر جائے۔ دہلی سے چل کر ایسی کڑی منزلیں طے کیں جن میں ہر منزل رستم و اسفندیار کے ہفت خواں جیسی تھی اس طرح لشکر آپ کے لبریز فیض وجود سے منور و مشرف ہوا

---

[1] مخزن [illegible]

آٹھواں باب

عسکری زندگی کا دور

دھمکولہ کا محاصرہ

سید صاحب خود فرماتے ہیں:

> جس وقت میں بیچ لشکر نواب صاحب کے پہنچا اور شرف ملاقات ان کی سے مشرف ہوا، ان روزوں نواب صاحب ساتھ لشکر جرار پیادہ و سوار بے شمار کے شاہ پورے کے علاقے میں قصبہ دھمکولہ کے قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے مستعد جنگ تھے۔ آخر الامر والی قلعہ نے تنگ ہو کر نواب صاحب سے مصالحہ کر لیا اور کچھ نقد زر دے کر رخصت کیا۔[1]

امیر نامہ کے بیان کے مطابق، دھمکولہ ۱۸۱۲ء میں فتح ہوا، یعنی سمجھنا چاہیے کہ اگرچہ سید صاحب ۱۸۱۲ء میں نواب کے پاس پہنچے۔ مگر وہ اس سے پہلے وطن سے نکل چکے تھے۔ ممکن ہے ۱۸۱۱ء کے وسط یا اواخر میں روانہ ہوئے ہوں۔

"وقائع" کا بیان ہے کہ اس زمانے میں سید صاحب کے حالات سے لشکر کے آدمی بالکل ناواقف تھے۔ بعض لوگوں کو صرف اتنا معلوم تھا کہ آپ سید ہیں، آل رسولؐ، نیک اور پرہیزگار ہیں۔ اگرچہ آپ تنہا گئے تھے لیکن ابتداءً لشکر میں تین آدمی آپ کے ساتھی بن گئے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام رحمت اللہ تھا، دوسرے کا قادر بخش، تیسرے کا نام معلوم نہ ہو سکا۔[2]

جے پور کی جنگ

سید صاحب جے پور کی لڑائی میں بھی شریک تھے۔ جس کی سرسری کیفیت یہ ہے کہ والی جے پور کے ذمے نواب امیر خاں کی بھاری رقم تھی۔ اسے ادا کرنے میں پس و پیش ہوتی رہی۔ خود نواب جودھ پور میں تھا۔ اس کے لشکریوں کو مدت تک تنخواہ نہ ملی تو انھوں نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ یہ اطلاع جے پور پہنچی تو وہاں کے سپہ سالار چاند سنگھ نے جو راجا کا قریبی رشتہ دار

---

[1] "وقائع" صفحہ ۱۰۔ دھمکولہ یا دھنکولہ یا دکولہ میری تحقیق کے مطابق بوندی اور کرولی کے درمیان ایک مقام ہے۔ شاہ پورہ بھی اسی حصے کا ایک مشہور قصبہ ہے۔ دھمکولہ بعد میں فتح ہوا۔

[2] وقائع صفحہ ۱۰۔

تھا، نواب کے مقبوضات میں سے مالپورے پر قبضہ کیا۔ ٹونک کو لوٹا اور امیر گڑھ کا محاصرہ کر لیا۔ اسے خیال ہوگا کہ فوج برگشتہ ہے تو نواب کوئی قدم اٹھا نہ سکے گا۔ چاند سنگھ کی اس جسارت نے راجستھان کے مختلف حصّوں میں نواب کے خلاف سرکشی کی آگ بھڑکا دی۔ وہ سرکشوں کی گوشمالی کے لیے جودھ پور سے نکلا تو چاند سنگھ تمام متصرفہ مقامات کو چھوڑ کر تیزی سے جے پور بھاگ گیا۔ نواب نے جے پور کے مختلف مقامات فتح کیے۔ فوج کی تنخواہ کے لیے کچھ روپیہ وصول کیا۔ باقی رقموں کی تحصیل اپنے ایک ماتحت افسر کے ذمے لگا کر وہ شیخاواٹی[1] کی طرف نکل گیا۔

چاند سنگھ نے میدان خالی پایا تو دوبارہ فتنہ انگیزی شروع کر دی۔ جب نواب نے دوبارہ جے پور کا رخ کیا تو چاند سنگھ پھر میدان چھوڑ کر جے پور شہر میں جا بیٹھا۔ ان تمام لڑائیوں میں سید صاحب برابر شریک رہے۔

شہر پر حملہ

تھوڑی دیر گزر گئی تو خود جے پور کے رئیس اور عہدے دار دو فریقوں میں بٹ گئے۔ سابق دیوان چھتر بھوج اور بعض امراء ایک فریق تھے، دیوان مانجی داس پروہت نے اپنا فریق الگ بنا رکھا تھا۔ چھتر بھوج وغیرہ نے نواب امیر خاں سے مدد مانگی۔ نواب فوج لے کر جے پور پہنچ گیا۔ لیکن مانجی داس پروہت نے دفاع کا خوب انتظام کر رکھا تھا۔ اس نے فوج کو تین حصّوں میں بانٹا۔ ایک حصہ اس باغ میں متعین کیا، جو شہر کے مشرق میں تھا۔ دوسرے حصّے کو ایک اور باغ میں ٹھہرایا، جو خود دیوان کے نام سے مانجی کا باغ کہلاتا تھا۔ تیسرے حصّے کو چاند سنگھ کی سپہ سالاری میں باغ بھٹ میں کھڑا کر دیا۔ موتی ڈونگر[2] پر بھاری توپ خانہ نصب کرا دیا۔

نواب نے خود آگے بڑھ کر چاند سنگھ پر حملہ کیا۔ اس کے ایک سالار نے مشرقی باغ والی فوج کو مار بھگایا۔ اس طرح شہر پر حملے کا راستہ صاف ہو گیا، لیکن جونہی نواب کے ایک سالار مہتاب خاں نے قدم آگے بڑھایا، موتی ڈونگر کے قلعے سے توپوں کے گولے برسنے لگے۔ نواب نے فوراً پیغام بھیجا کہ اگر گولہ باری

---

[1] شیخاواٹی سے مراد جے پور کا شمال و مغربی حصہ ہے جہاں بارش کم ہوتی ہے۔ جے پور کے پرانے راجاؤں میں سے ایک اودے کرن تھا۔ اس کے پوتے موکل جی کے اولاد نہ ہوتی تھی۔ شیخ برہان الدین اس زمانے میں ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ ان سے دعا کرائی۔ خدا نے بچہ دیا تو اس کا نام شیخا یا شیخ جی رکھا۔ اس کی اولاد کا علاقہ شیخاواٹی کہلایا۔ اگرچہ یہ لوگ ہندو ہیں، لیکن کلمہ پڑھتے ہیں، جانور مسلمانوں کی طرح ذبح کرتے ہیں، سئور کو حرام سمجھتے ہیں۔ [2] جے پور شہر کے پاس ایک پہاڑی کا نام ہے۔ ڈونگر جے پوری زبان میں پہاڑی کو کہتے ہیں۔

بند نہ ہوئی تو شہر کو چھوڑ کر موتی ڈونگر کا رُخ کروں گا اور ایک آدمی کو بھی زندہ نہ چھوڑوں گا۔ اس انتباہ کے ساتھ ہی موتی ڈونگر کا توپ خانہ خاموش ہو گیا۔

اب نواب نے مانجی کے باغ کا رُخ کر لیا۔ وہاں سے بھی جے پوری فوج شکست کھا کر بھاگی۔ اس طرح بیرونِ شہر کے تمام مورچے ٹوٹ گئے اور دیوان مانجی اس شہر کے دروازے بند کر کے بیٹھ گیا۔

محاصرہ اور صلح

چوبیس روز محاصرہ جاری رہا۔ آخر نواب نے شہر پر گولہ باری کا حکم دے دیا۔ گھبرا کر جے پور کے راجہ جگت[1] سنگھ نے صلح کی درخواست کی۔ نواب کہتا تھا کہ جب تک روپیہ نہ ملے گا بات بھی نہ سنوں گا۔ راجا شاید بحالت مجبوری روپے دے دیتا، لیکن اس کا خزانہ بالکل خالی پڑا تھا۔ آخر اس نے اپنی رانی سے کہا کہ تم کوشش کرو۔ یہ رانی جودھ پور کے راجا مان سنگھ کی بیٹی تھی، جسے امیر خاں نے بھائی بنا رکھا تھا۔ چنانچہ رانی نے نواب کو رقعہ بھیجا کہ "آپ میرے باپ کے بھائی بنے ہوئے ہیں اور میں آپ کو چچا نہیں بلکہ باپ سمجھتی ہوں۔ کیا آپ کو یہ بات اچھی لگتی ہے کہ میرے شہر کا محاصرہ کریں اور اس طرح اپنی بیٹی کی رسوائی کے درپے ہوں؟" یہ رقعہ ملتے ہی نواب نے محاصرہ اٹھانے کا حکم دے دیا اور ایک کوڑی لیے بغیر شہر چھوڑ گیا۔

سوانح نگارانِ سیّد کے بیانات

جے پور کی لڑائی کا یہ نقشہ عام تاریخی بیانات پر مبنی ہے۔ اب وہ تفصیلات بھی سُن لیجیے جو سیّد صاحب کے سوانح نگاروں نے پیش کی ہیں۔ ان کا مفاد یہ ہے:

۱ - اس جنگ میں سید صاحب نواب کے ساتھ تھے۔

۲ - نواب نے اپنے ایک سالار محمد عمر خاں کو اس نالے میں مورچہ بنانے کا حکم دیا، جو موتی ڈونگر کے قریب تھا۔ وہاں مورچا بنانا ہی خطرناک نہ تھا، بلکہ پہنچنا بھی جان جوکھوں کا کام تھا۔ محمد عمر خاں یہ سنتے ہی ششش و پنج میں پڑ گیا۔ سید صاحب نے فوراً نواب سے کہا کہ مجھے محمد عمر خاں کے ساتھ جانے کی اجازت دیجیے۔ نواب نے کہا کہ آپ کو اپنے سے جُدا نہیں کر سکتا[2]۔ سید صاحب نے

---

[1] سب مورخ مانتے ہیں کہ جگت سنگھ سے زیادہ بدمزاج، بدقماش اور بدروش راجا کچھواہہ خاندان میں کوئی نہیں ہوا۔ یہی راجا تھا جس کے پاس اودھ کے معزول فرماں روا وزیر علی خاں نے پناہ لی تھی، لیکن اس نے راجپوتی مہمانداری کے تمام اصول کو بالائے طاق رکھ کر وزیر علی خاں کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انگریزوں سے تو رقم لینے کا فیصلہ ہو ہی چکا تھا، وزیر علی خاں سے بھی جواہرات ہتیا لیے تھے۔

[2] منظورہ کے اصل الفاظ یہ ہیں: "شما را از خود جدا نے کنم" (صفحہ ۲۳۱)۔ "وقائع" میں ہے کہ سید صاحب نے عرض کیا، مجھ کو ارشادِ عالی ہو تو میں ہمراہ عمر خاں کے رہوں۔ حضور والا نے فرمایا کہ ہم تم کو اپنے ساتھ رکھیں گے، یہاں ہرگز نہ چھوڑیں گے (صفحہ ۲۴)۔

یہ سُنا تو محمد عمر خاں سے مخاطب ہُوئے اور فرمایا: "بھائی صاحب! مت ڈرو۔ خدا کو یاد کرو۔ کوئی بے موت نہیں مرتا۔ ان شاء اللہ تمھاری فتح اور کفار کی شکست ہے۔"[1]

۳۔ اس وقت معلوم ہُوا کہ چاند سنگھ تیس ہزار سواروں کے ساتھ مانجی کے باغ کو پشت دیے کھڑا ہے۔ مقابلہ بڑا سخت تھا۔ سید صاحب نے گریہ و زاری کے ساتھ دعا کی۔ پھر نواب سے کہا کہ میں آگے چلتا ہُوں، آپ لشکر کو ہمراہ لیے ہُوئے کچھ فرق سے میرے پیچھے آئیں۔ نواب نے آپ کو روکنا چاہا لیکن آپ حملہ آور فوج کے آگے آگے روانہ ہُوئے۔ چھ سوار آپ کے ساتھ تھے۔ چاند سنگھ پہلے ہٹ کر باغ کے اندر چلا گیا۔ سید صاحب نے خود باغ کے بُرج پر چڑھ کر رومال کے اشارے سے نواب کو دشمن کی پسپائی کی خبر پہنچائی۔ نواب باغ میں پہنچا تو ایک بُرج پر چڑھ کر دُوربین لگائی اور دشمن فوج کی حالت دیکھنے لگا۔ سیّد صاحب باغبان کی جھونپڑی کے پاس سایے میں جا بیٹھے۔ بائیس آدمی آپ کے ساتھ تھے۔ وہاں توپ کے گولے اولوں کی طرح برس رہے تھے۔ اسی جگہ مغرب کا وقت آیا تو سید صاحب نے وضو کر کے بُرج پر نماز ادا کی۔[2]

مادھو راج پوری کا محاصرہ

مادھو راج پوری کا محاصرہ نواب کی آزادانہ زندگی کا آخری واقعہ ہے۔ یہ مقام راجا جگت سنگھ والی جے پور کی رانی (دختر راجا جودھ پور) کی جاگیر میں تھا۔ پاس کے ایک ٹھاکر بھرت سنگھ نے اس پر قبضہ کر لیا۔ پھر وہ نواب کے خسر محمد ایاز خاں کے اہل و عیال کو گرفتار کر کے لے گیا اور انھیں مادھو راج پوری کے قلعے میں بند کر دیا۔ نواب نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن تسخیر قلعہ کی دو کوششیں یکے بعد دیگرے ناکام رہیں۔ ایک مرتبہ یہ فیصلہ کیا کہ قلعے کی دیوار کا کچھ حصہ بارود سے اُڑا دیا جائے۔ دشمن اس طرف متوجہ ہو تو ایک دم ہر سمت سے اس پہ ہلہ بول دیا جائے۔ ابھی بارود اڑی نہ تھی کہ نو وارد پٹھانوں کے دستوں نے حملہ کر دیا۔ وہ غالباً ہندوستانی بولی نہیں سمجھتے تھے اور بارود اڑانے سے پہلے ہی موقع پر پہنچ گئے۔ انھیں سخت نقصان پہنچا۔ دوسری مرتبہ توپیں لگا کر قلعے پر گولے برسائے گئے۔ یورش کا وقت آیا تو ساری فوج کو یورش کی دستک سے آگاہ نہ کیا جا سکا۔ اس وجہ سے یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی۔

محاصرہ ابھی جاری ہی تھا کہ انگریزوں سے صلح ہو گئی۔ جس کی تفصیل آگے چل کر بیان ہو گی۔ غاصب ٹھاکر کے ساتھ گفت و شنید کے بعد محمد ایاز خاں کے اہل و عیال کو رہا کرا لیا گیا۔

---

[1] "وقائع" صفحہ ۱۴۷۔ [2] "وقائع" صفحہ ۲۵، ۲۶

اس محاصرے کے دوران میں ایک روز توپ کا ایک گولہ سید صاحب کے سینے کے محاذ میں اتنا قریب سے گزرا کہ اکثر لوگوں کو یقین ہو گیا، گولہ آپ کو لگا ہے۔ جب آپ کو بالکل محفوظ دیکھا تو سب نے سمجھ لیا کہ آپ کو کوئی عمل یاد ہے، اس وجہ سے گولے یا گولیاں آپ کو کوئی مضرت نہیں پہنچا سکتیں۔ سید صاحب کو یہ خیال معلوم ہوا تو علی الاعلان فرمایا: مجھے کوئی عمل یاد نہیں۔ خدا نے محض اپنی قدرت اور فضل سے مجھے بچا لیا۔

اسی محاصرے میں ایک مرتبہ حملہ ہوا تو ایک گولی آپ کی پنڈلی میں لگی۔ کئی روز کے علاج کے بعد زخم اچھا ہوا۔

متفرق واقعات

لڑائیوں کے علاوہ متفرق واقعات بھی ملتے ہیں: مثلاً:

۱۔ ابتدا میں برابر دو مہینے تک آپ کو بخار آتا رہا۔

۲۔ عام لشکریوں کو یقین ہو گیا تھا کہ آپ جو دعا فرماتے ہیں، وہ منظور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اکثر ضرورت مند مشکل کے وقت میں آپ کے پاس پہنچ کر دعا کے خواستگار ہوتے تھے۔

۳۔ ایک مرتبہ شیر گڑھ (ریاست کوٹہ) سے آتے ہوئے دریائے چنبل پر پہنچے۔ پایاب گھاٹ سے لشکریوں نے گزرنا شروع کیا تو ایک دم سیل آ گیا اور لشکریوں کا اسباب بہنے لگا۔ جو لوگ وسط دریا میں پہنچ چکے تھے، وہ بڑی مشکل سے بیچ کی چٹانوں پر چڑھ کر بچے۔ سید صاحب نے اس موقع پر بھی دعا کی۔ بہتا ہوا مال اسباب خود نکالا۔ تھوڑی دیر میں دریا اُتر گیا تو سب لوگ دوسرے کنارے پر پہنچے۔

۴۔ نواب کے لشکریوں کے پاس پیسے کی کمی نہ تھی، لیکن چونکہ وہ عموماً صحرائی علاقے میں پھرتے رہتے تھے، اس وجہ سے اجناس خوردنی بہت کم ملتی تھیں۔ سید صاحب نے ایسے مواقع پر کئی مرتبہ کشائشِ رزق کے لیے دعائیں کیں۔ بعض مقامات پر پانی نہیں ملتا تھا۔ سید صاحب پہلے بارگاہ باری تعالیٰ میں دعا کرتے، پھر خود کنوئیں کھودنے کے لیے جگہیں تجویز فرماتے۔ ان کنوؤں سے میٹھا پانی نکلتا۔

۵۔ ایک مرتبہ مارواڑ میں چلتے چلتے ایک ایسی بستی میں پہنچے، جہاں موٹھ اور باجرے کی فصل بہت اچھی ہوئی تھی اور دونوں جنسیں ٹکا گٹھڑی کے بھاؤ سے بکتی تھیں۔ سید صاحب نے اپنے ایک ساتھی سید عبدالرزاق نگرامی سے فرمایا کہ آٹھ دس روپے بھنا لو اور جتنا غلہ مل سکے خرید کر رکھ لو۔ وہ بولے کہ ہم کوچ میں ہیں، یہ غلہ اٹھائیں گے کیونکر اور اگر ٹھہرنا پڑا تو رکھیں گے کہاں؟ سید صاحب

نے فرمایا کہ ریت میں گڑھے کھودو، موٹھ اور باجرا الگ الگ گڑھوں میں بھر دو۔ اتفاق سے اس جگہ ایک مہینا ٹھہرنا پڑا۔ راوی کہتا ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں غلہ روپے کا دس سیر بکنے لگا۔ سید صاحب نے اعلان کر دیا کہ لشکر کے غریب لوگ ہمارے ہاں سے غلہ لے کر خرچ کرتے جائیں۔ اس وجہ سے کسی غریب کو تکلیف نہ ہوئی۔

۶ - چونکہ سختی و عسرت کے اوقات میں بھی سید صاحب یا آپ کے ساتھیوں کو کھانے پینے کی تکلیف کبھی نہ ہوئی، اس لیے بعض لوگوں کو گمان تھا کہ یا تو نواب پوشیدہ آپ کو روپے دیتا رہتا ہے یا آپ کے پاس کیمیا کا نسخہ ہے یا دستِ غیب ہے۔[1]

طریق اصلاح و ہدایت

سید صاحب کا اصل وظیفہ یہ تھا کہ خلقِ خدا کو راہِ حق کی دعوت دی جائے اور ان کے عقائد، اخلاق اور اعمال کو اسلامیت کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ راویوں نے بیان کیا ہے کہ آپ کی وجہ سے لشکر کی عام حالت میں زبردست تغیر پیدا ہو گیا۔ فسق و فجور رخصت ہو گیا۔ کتاب و سنت کی پیروی عام ہو گئی۔ آپ اصلاح کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ جو لوگ مختلف ضرورتوں کے لیے دعا کی غرض سے آپ کے پاس آتے تھے، ان سے دینی اور اخلاقی اصلاح کا اقرار لے کر دعا فرماتے تھے۔ اس قسم کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱ - بادل خاں خانزادے کے ڈیرے میں ایک سپاہی کو ناڑو کی بیماری نے سخت پریشان کر رکھا تھا۔ آخر وہ آپ کے پاس پہنچا۔ فرمایا: پہلے برے کاموں سے توبہ کرو اور عہد کرو کہ نماز باقاعدہ پڑھا کرو گے، پھر دعا کروں گا۔ سپاہی نے اقرار کر لیا تو آپ نے دعا فرمائی۔ خدا کے فضل سے اس کی تکلیف تھوڑے ہی دنوں میں جاتی رہی۔[2]

۲ - مدار بخش پنساری لشکر میں گھوڑوں کا مسالا بیچا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے عرض کیا کہ خرچ سے بہت تنگ رہتا ہوں، میرے لیے دعا فرمائیے۔ فرمایا: پہلے اپنا نام بدل کر اللہ بخش رکھو۔ پانچوں وقت نماز پڑھا کرو۔ جھوٹ کبھی نہ بولو۔ جان بوجھ کر کسی سے دغا فریب نہ کرو اور جنس ہمیشہ پوری تولا کرو۔ اس نے یہ ساری باتیں مان لیں تو دعا فرمائی۔ خدا کے فضل سے دو ہی برس میں اس کا کاروبار اتنا بڑھ گیا کہ سات آدمی نوکر رکھ لیے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ کشایش کے بعد اس نے اصرار کیا کہ سید صاحب یا ان کے رفیقوں کے ہاں جو مسالا جاتا ہے، اس کی قیمت نہ دی جائے

---

[1] یہ تمام واقعات "وقائع" کی مختلف روایتوں سے ماخوذ ہیں۔ میں نے صفحات کے حوالے غیر ضروری تکلف سمجھ کر چھوڑ دیے۔ [2] "وقائع" صفحہ

سید صاحب نے انکار فرما دیا اور ساتھیوں کو بھی ہدایت کی کہ ایسی کوئی بات قبول نہ کی جائے۔[۱]

۳ - نواب کے فیل بانوں میں سے شیخ محمد عبدالسمیع اور رمضان خاں نے تنگیٔ روزگار کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا کہ ہاتھیوں کے لیے جو راتب مقرر ہے، اس میں رائی کے برابر بھی خیانت نہ ہونے پائے۔ یہ عہد کر لو تو خدا فضل کرے گا۔ دونوں نے عہد کر لیا اور اسے پورے اہتمام سے نباہا۔ تھوڑے ہی دنوں میں خدا نے انھیں خوش حال بنا دیا۔[۲]

نواب کے ساتھ تعلق

سید صاحب لشکر میں پہنچے تھے تو آپ کو کوئی بھی نہیں جانتا تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی ہی مدت میں آپ بے حد ہر دل عزیز ہو گئے تھے۔ نواب پ کا بہت احترام کرتا تھا تمام اہم معاملات میں مشورے لیتا اور آپ کے مشورے کو کبھی پسِ پشت ڈالتا۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے:

۱ - وہ غالباً ہر روز دربار میں جاتے تھے،[۳] اس وجہ سے سمجھنا چاہیے کہ نواب کے مشیرانِ خاص میں شامل ہو گئے تھے۔

۲ - جے پور کی جنگ کے سلسلے میں بیان ہو چکا ہے کہ نواب اہم موقعوں پر سید صاحب کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ یہ قرب و اعتماد کی ایک موثق دستاویز ہے۔

۳ - نواب سے کوئی خاص بات منوانی ہوتی تھی تو لوگ سید صاحب سے استمداد کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب ایسی جگہ مقیم ہو گیا، جہاں لشکریوں کو خورونوش کی چیزیں حاصل کرنے میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ سید صاحب سے عرض کیا گیا کہ آپ نواب کو کوچ پر راضی کریں۔ آپ نے بے تکلف نواب سے مخلوق کی تکلیف بیان کر کے کوچ کا حکم صادر کرایا۔[۴]

۴ - ایک مرتبہ بوندی کے دو کمان گر سولہ کمانیں، آٹھ لبادے اور بیس ترکش لے کر فروخت کی غرض سے لشکر میں آئے۔ چار آدمی اُن کے ساتھ تھے۔ ہر چند کوشش کی لیکن کوئی چیز بک نہ سکی۔ آخر وہ لوگ سید صاحب کے پاس پہنچے اور عرض کیا کہ ہماری حالت بہت نازک ہو چکی ہے۔ آپ نواب صاحب سے کہہ کر یہ چیزیں بکوا دیں۔ سید صاحب نے اُنھیں تسلی دی اور غالباً نواب سے بھی ذکر کیا۔ اس نے ساری چیزیں ایک ہزار میں خرید لیں اور پانسو روپے کمان گروں کو مدِ خرچ کے لیے دیئے۔[۵]

---

[۱] وقائع صفحہ ۱۴ - [۲] ایضاً صفحہ ۱۳۱ - [۳] مثال کے لیے ملاحظہ ہو وقائع صفحہ ۱۱۰ و ۱۸۰ - [۴] وقائع صفحہ ۲۸ - [۵] وقائع صفحہ ۲۳ و ۲۴

ہ ۔ جب نواب نے انگریزوں سے صلح کر لی تو سید صاحب الگ ہو گئے تھے۔ نواب سے آخری ملاقات صبح کو مسجد میں ہوئی۔ راوی کہتا ہے کہ نماز کے بعد نواب صاحب: "حضرت کا ہاتھ پکڑے میرے ڈیرے میں تشریف لائے۔"

ان شواہد سے صاف ظاہر ہے کہ سید صاحب نواب کے لشکر میں معمولی لشکری یا افسر نہ تھے، بلکہ نواب کے خاص مشیر اور صلاح کار تھے اور نواب انھیں ایک عزیز دوست، حقیقی بہی خواہ اور حد درجہ معتمد علیہ رفیق سمجھتا تھا۔

مالی حالت

معلوم نہ ہو سکا کہ سید صاحب کے لیے نواب کے لشکر میں تنخواہ مقرر تھی تو اس کی مقدار کیا تھی؟ لیکن یقین ہے کہ انھیں وقتاً فوقتاً خاصی بڑی رقمیں ملتی رہتی ہوں گی، اس لیے کہ سید صاحب اچھے سر و سامان کے مالک تھے۔ آپ کے پاس ایک یا زیادہ اونٹ تھے اور خدا بخش آپ کا ساربان تھا۔[2] آپ نے ایک موقع پر سات سو روپے کا گھوڑا مول لینا چاہا۔ مالک ساری رقم نقد مانگتا تھا، سید صاحب چھ مہینے کی مہلت چاہتے تھے اس وجہ سے سودا نہ ہو سکا۔[3] اس سے بیشتر ایک گھوڑا، سمند، سیاہ زانو دو سو روپے کا خرید چکے تھے۔[4] اس کے لیے روزانہ آٹھ سیر دودھ کا راتب مقرر تھا اور میر چاند علی ساکن مال پورہ آپ کا سائیس تھا۔[5]

نواب فتح علی خاں، رستم علی خاں، غلام حیدر خاں اور فقیر محمد خاں[6] آپ کے عزیز دوست تھے۔ اکثر اکھٹے سیر کو نکلتے۔ ایک موقع پر اچانک راگھڑوں کا ایک غول نمودار ہوا، لیکن دور ہی سے بندوقیں سر کرتا ہوا پلٹ گیا، نزدیک نہ آیا۔ فقیر محمد خاں جب شیر گڑھ سے وطن لوٹے تو اپنے ساتھ یتیم چھوکریاں بھی لائے تھے۔ سید صاحب نے بھی دو یتیم چھوکرے ان کے ساتھ کر دیے تھے، جن میں سے ایک کا نام غلام غوث تھا اور دوسرے کا کریم بخش اور کہا تھا کہ انھیں ہمارے بھائی سید اسحاق کے سپرد کر دینا۔[7]

ان تمام بیانات سے ظاہر ہے کہ سید صاحب کی مالی حالت خاصی اچھی ہوگی۔

رفیق

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے ابتدا میں سید صاحب کے تین رفیق تھے۔ جن میں سے صرف دو کے نام معلوم ہو سکے۔ ان کے علاوہ روایتوں میں مندرجہ ذیل اصحاب کے نام بطور رفیق آتے ہیں:

---

[1] وقائع ص۱۳۱ ۔ [2] وقائع صفحہ ۱۳ ۔ [3] وقائع صفحہ ۱۶ ۔ [4] وقائع صفحہ ۱۶ ۔ [5] وقائع صفحہ ۱۶ ۔ [6] وقائع صفحہ ۱۷، غلام حیدر خاں غالباً وہی ہیں جو بعد میں مہاراجا گوالیار کے پاس ملازم ہو گئے تھے۔ ان کے نام سید صاحب کے خطوط بھی موجود ہیں۔ فقیر محمد خاں آفریدی بھی نواب امیر خاں سے الگ ہو کر لکھنؤ کی فوج میں اونچے عہدے پر مامور ہو گئے تھے۔ شاعر بھی تھے، گویا ان کا تخلص تھا۔ جوش ملیح آبادی ان کے پوتے ہیں۔ فقیر محمد خاں زندگی کے آخری سانس تک سید صاحب کے مخلص معتقد رہے۔ [7] وقائع صفحہ ۱۹۔

سید عبدالرزاق نگرامی، شیخ محمد عارف کرنالی، نصرت علی امروہہ والے، قادر بخش دکنی، نواب زادہ عثمان خاں کنج پوری، سید صاحب کے خادم خاص میاں دین محمد۔ یہ چھ آدمی جے پور کی جنگ میں ساتھ تھے جبکہ سید صاحب نے نواب کے لشکر سے آگے بڑھ کر مانجی کے باغ پر حملہ کیا تھا۔ ان کے علاوہ شیخ پیر علی آپ کے ڈیرے میں رہتے تھے۔ چونکہ ان کے پاس بہت بڑی ڈھال تھی، اس لیے وہ عام طور پر "سپر والے" مشہور تھے۔ سید ظہور احمد نگرامی (برادر سید عبدالرزاق) ہدایت علی، برکت علی، حاجی زین العابدین رام پوری، سید اللہ نور شاہ، مولوی محمد حسن اور شیخ محمد ناصر نصیر آبادی کے نام بھی بطور رفقا مختلف روایتوں میں آئے ہیں۔ ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک موقع پر آپ کے پاس کھانا کھانے والے چھتیس آدمی تھے[1] نواب فتح علی خاں، رستم علی خاں، غلام حیدر خاں اور فقیر محمد خاں کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

ریاضتیں

سید صاحب اس زمانے میں بھی بڑی شاقہ ریاضتیں کیا کرتے تھے۔ مولوی محمد حسن کہتے ہیں کہ جہاں لشکر چار پانچ روز کے لیے ٹھہر جاتا، آپ کا معمول تھا لوٹا، مصلیٰ ایک چادر یا کھیس اور چمڑے کی چھ انگل چوڑی پٹی لے کر دور نکل جاتے۔ وضو کرتے اور سب سے الگ تھلگ ہو کر کسی درخت کے نیچے مصلیٰ بچھاتے، پہلے نفل پڑھتے، پھر چمڑے کی پٹی سے زانو باندھ کر اور چادر یا کھیس اوڑھ کر متواتر چار گھڑی مراقب رہتے۔ آخر میں دعا فرماتے۔

ساتھیوں اور عام لشکریوں کی خدمت گزاری کا اہتمام اس زمانے میں بھی بہت زیادہ تھا۔ اپنے کپڑے خود دھوتے، جب دھونے کے لیے جاتے تو ساتھیوں کے کپڑے بھی زبردستی اٹھا لے جاتے اور انھیں دھولاتے۔

لطیفہ

آخر میں ایک لطیفہ بھی سن لیجیے۔ ایک دفعہ لشکر کے ایک پٹھان کا کچھ مال کسی نے چرا لیا۔ اتفاق سے اسی روز سید صاحب، مولوی محمد حسن کے ہمراہ باہر پھر رہے تھے کہ پٹھان سے آپ کی ملاقات ہو گئی۔ وہ آپ کو جانتا نہ تھا۔ خدا جانے کس بنا پر اس کے دل میں وسوسہ پیدا ہو گیا کہ مال سید صاحب نے چرایا ہے۔ چنانچہ وہ آگے بڑھا اور سید صاحب کے ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا: "تم چور ہو۔" سید صاحب نے کمال تحمل سے کام لیتے ہوئے فرمایا: "مجھے اللہ تعالیٰ نے ایسے شنیع فعل سے محفوظ رکھا ہے، بھائی صاحب آپ کو خواہ مخواہ مجھ پر ایسا گمان ہوا ہے۔"

پٹھان نے بدستور اصرار کیا کہ نہیں، میرا مال تمھیں نے چرایا ہے۔ سید صاحب نرم الفاظ میں پٹھان کو

---

[1] وقائع صفحہ ۱۱۳

سمجھاتے رہے، لیکن اس کا شبہ قوی تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے تلوار نکال کر کہا: "میرا مال واپس دے دو ورنہ ابھی تمھارا فیصلہ کرتا ہوں۔" مولوی محمد حسن فوراً لشکر کی طرف دوڑے کہ رفیقوں کو خبر کریں۔ وہاں سے سیّد ظہور احمد، نصرت علی، برکت علی، فقیر محمد خاں وغیرہ تلواریں لے کر آئے۔ پٹھان نے ان لوگوں کو آتے دیکھا تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔ سید صاحب نے فرمایا: "جا، بھائی! کھیت میں چھپ جا۔ میں انھیں واپس لے جاؤں گا تو نکل کر اپنے ڈیرے پر چلے جانا۔ میں نے تمھارا مال نہیں چرایا، تمھیں بے وجہ مجھ پر ایسا گمان تھا۔"

ایک عجیب قصہ

سید محمد علی نے سید صاحب کی زبان سے قیام لشکر کے زمانے کے جو قصے سُنے، اُن میں سے ایک قصہ بڑا دل چسپ ہے۔ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ میرا خیمہ پنڈاروں کے قریب برپا ہُوا۔ لوٹ مار پنڈاروں کا عام مشغلہ تھا۔ ان میں ایک بہت بوڑھا آدمی تھا جس کی کمر کمان کی طرح جھک گئی تھی۔ بوڑھے کے سامنے دوپہر کا کھانا رکھا گیا، جس میں سبزیاں تھیں۔ سبزیاں کھاتے ہی اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا: تمھیں یاد ہے کہ یہ سبزیاں کہاں سے آئیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ دس بارہ کوس پر ایک گاؤں ہے، وہاں سے لاتے ہیں۔ بوڑھا بولا: کھانا کھا کر کمریں باندھ لو، گھوڑوں پر سوار ہو جاؤ۔ دو تین بیل اور کلند وغیرہ ساتھ لے لو، جس زمین کی سبزیاں تھیں، اسے دو تین جگہ سے کھودو۔ وہاں خزانہ دبا ہُوا ہے۔

وہ لوگ گئے اور دوسرے دن یہ منظر دیکھا کہ پنڈاروں کے خیمے کے ارد گرد نفیس چیزوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور عورتیں خوشی سے گا رہی تھیں۔ سید صاحب نے بڈھے سے پوچھا کہ آپ کو دولت کا پتا کیوں کر چلا؟ بولا کہ ہم لوگ سبزیاں یا میوے چکھ کر زمین کے اندرونی حالات کا پتا لگا لیتے ہیں۔ یہ علم ہمیں اُستادوں نے سکھایا ہے[1]۔

---

[1] مخزن احمدی صفحہ ۳۳۔

نواں باب

نواب امیر خاں سے علیحدگی

امیر خاں کی حالت نواب امیر خاں لاریب بڑا بہادر اور جواں مرد تھا لیکن یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ کام کے بہترین مواقع حاصل ہونے کے باوجود اپنی کاردانی اور سپاہ کی کثرت سے کوئی ایسا نتیجہ پیدا نہ کر سکا، جو تاریخ میں اس کے لیے دائمی عزت و عظمت کی یادگار بن سکتا۔ اس کی ساری طاقت اور پورے اوقات صرف معمولی وقتی فوائد کے لیے وقف رہے۔ کبھی ایک رئیس کو دبایا، کبھی دوسرے کو جا دبوچا۔ جس نے پیسے دے کر فوجی مدد مانگی، اس کی اعانت و یاوری کے لیے نکل پڑا۔ پھر کشادہ دلی کا یہ عالم تھا کہ جو روپیہ ہاتھ آتا، بے تکلف خرچ کر ڈالتا۔ بعض اوقات مہینوں تک سپاہ کو تنخواہ نہ ملتی۔ لوگ تنگ آجاتے تو مخالفت کے ہنگامے برپا کر دیتے مجبور ہو کر نواب اُٹھتا اور کسی نئے خزانے کا دروازہ کھولنے کا عزم کر لیتا۔ انگریزوں کا دائرہ اثر آہستہ آہستہ باقاعدگی کے ساتھ پھیل رہا تھا۔ ہندوستانی رئیس یکے بعد دیگرے ان سے مل رہے تھے۔ اہل بصیرت کو صاف نظر آرہا تھا کہ نواب کی سرگرمیوں کے لیے فضا لحظہ بہ لحظہ تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ خود نواب کے اپنے آدمیوں کو بھی احساس ہونے لگا تھا کہ یہ حالات زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے اور بعض کی نگاہیں انگریزوں کی طرف اُٹھنے لگی تھیں۔

جودھ پور کا ایک واقعہ "وقائع" میں ہے کہ جودھ پور کی رانی، ولی عہد اور بعض ٹھاکروں نے خفیہ خفیہ نواب کو بلایا اور کہا کہ راجا مان سنگھ، اندو راج وزیر اور اپنے گرو دیوناتھ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہُوا ہے۔ اس مصیبت سے ہمیں نجات دلائیے۔ نواب نے اپنے بعض آدمیوں کو کہا کہ اندو راج اور دیوناتھ کو قتل کر دو گے تو تین لاکھ روپے انعام دوں گا۔ یہ کام آدمیوں نے پورا کر دیا تو نواب نے ایک لاکھ روپیہ دیا اور کہا کہ باقی دو لاکھ اس وقت دوں گا، جب کہیں سے فتوح حاصل ہوگی:

> انھوں نے کسی طور نہ مانا اور نہایت تنگ کیا کہ ہم تو ابھی لیں گے، اگر نہ دو گے تو ہم، آپ کو پکڑ کر معاً انگریزوں کے سپرد کر دیں گے۔ گرفتار [illegible] دولت بلکہ

کو نہایت ناگوار معلوم ہوئی۔ ان غداروں نابکاروں کو بہت سخت سُست کہا کر بڑے نمک حرام و بے وفا ہو۔ میرے ہی سبب سے تم سب یہ عیش و آرام کر رہے ہو۔ میرے ایسے بدخواہ و ناسپاس ہو کر انگریزوں کو بگڑا دو گے؟ خیر تم سے خدا سمجھے ۔ ان شاء اللہ تعالٰی میری پلاؤ کی رکابی کہیں نہیں گئی، مگر تم کو بھیک مانگے نہیں ملے گی[1]

اس قسم کے واقعات نے بھی نواب کی آنکھ نہ کھولی اور وہ کوتہ اندیشانہ اطوار پر قائم رہا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ سید صاحب نے اُسے اہم قومی اور اسلامی راہ پر لگانے کے لیے کیا کیا کوششیں کیں؛ اس لیے کہ ہمارے سامنے حالات کا تفصیلی نقشہ موجود نہیں۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ سید صاحب کی وجہ سے نواب کے لشکر کی فضا دینی ہو گئی تھی۔ آپ نے نواب کی آزادیٔ عمل کو محفوظ رکھنے میں بھی کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا ہو گا اور جب تک وہ آزاد رہا، اُس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ یقیناً اس لیے نہ چھوڑا کہ اس سے کام لینے کی خوشگوار امید باقی ہوگی؛ لیکن جونہی اس نے انگریزوں سے ربط ضبط پیدا کیا، سید صاحب الگ ہو گئے، اس لیے کہ جس غرض سے انھوں نے نواب کی رفاقت اختیار کی تھی، اُس کے پورا ہونے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔

وسطِ ہند کی حالت

وسطِ ہند میں اس وقت بڑی ابتری پھیلی ہوئی تھی، راستے مخدوش تھے۔ لوگوں کے گھر غیر محفوظ تھے۔ آئے دن دیسی رئیسوں میں لڑائیاں چھڑی رہتی تھیں۔ ان کی وجہ سے عوام کے لیے اطمینان کی زندگی مفقود ہو چکی تھی۔ خصوصاً مرہٹہ سرداروں کی تو یہ حالت تھی کہ وہ لڑائی کے لیے نکلتے تو جس راستے سے گزرتے دیہات کے دیہات ویران کر ڈالتے۔ راجستھان کے تمام فرماں رواؤں کے سلاسل نظم و نسق درہم برہم ہو چکے تھے۔ بدنظمی کا ایک بہت بڑا عنصر پنڈارے[2]

---

[1] وقائع صفحہ ۷۲۔ [2] پنڈارے مرہٹہ گردی کے ابتدائی دور میں پیدا ہوئے۔ ان کی حیثیت بے قاعدہ لشکریوں کی تھی۔ مرہٹوں کی قوت کا آغاز چونکہ لوٹ مار سے ہوا تھا، اس لیے پنڈاروں کو غارت گری میں کمال بہم پہنچانے کا بہت اچھا موقع مل گیا۔ سنہ ۱۷۹۴ء میں پنڈاروں کے دو بڑے سرداروں کو مادھوجی سندھیا نے وادی نربدا میں جاگیریں دے دیں۔ یہ سردار فوت ہو گئے تو ان کے بیٹوں دوست محمد اور واصل محمد نے عنانِ قیادت سنبھالی۔ پھر ایک سردار کریم خاں نام نے بہت قوت جمع کر لی۔ وہ ہلکر سے مل کر کام کرتا رہا اور سنہ ۱۸۰۶ء میں گیارہ پرگنوں کا مالک ہو گیا تھا، جن کی آمدنی پندرہ لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ سندھیا نے اسے نواب کا خطاب دیا۔ وہ عام طور پر سندھیا شاہی کے لقب سے معروف تھا۔ اس نے بھوپال کے بھی کچھ علاقے چھین لیے تھے۔ دولت راؤ سندھیا نے کسی بات پر بگڑ کر اسے قید کر دیا۔ چنانچہ وہ پانچ برس

(باقی صفحہ ۱۰۷ پر)

تھے، جنھوں نے بھاری لشکر جمع کر لیے تھے۔

انگریزوں نے جب ان کے خلاف اقدام کا فیصلہ کیا تو یہ بھی طے کر لیا کہ وسط ہند کی تمام قوتوں کو اپنے ساتھ ملا لیں۔ چنانچہ راجستھان کی ریاستوں میں سب سے پہلے جے پور سے گفت و شنید کا آغاز ہوا۔ یہ گفت و شنید خاصی دیر تک جاری رہی۔ جے پور کے ساتھ معاملہ طے ہوا تو جودھ پور، اودے پور، کوٹہ، بوندی، کشن گڑھ، کرولی وغیرہ تمام ریاستیں یکے بعد دیگرے انگریزوں سے وابستہ ہو گئیں۔ بالآخر سندھیا نے بھی انگریزوں کی اعانت قبول کر لی۔

نواب امیر خاں کی مشکلات

نواب امیر خاں کو ان انگریزی تدبیروں کا علم نہ ہو سکا یا سمجھ لیجیے کہ وہ اپنی بہادری اور جواں مردی کے زعم میں ان کے نتائج کا اندازہ نہ کر سکا اور پوری بے پروائی سے اپنے اوضاع و اطوار پر قائم رہا، یہاں تک کہ ۱۸۱۷ء کے اواخر میں بالکل اکیلا رہ گیا۔ اس اثنا میں انگریزی فوج کی تین شاخوں نے تین مختلف راستوں سے وسط ہند میں پیش قدمی شروع کر دی۔ پیش قدمی کی سکیم عجیب بنائی گئی۔ ایک طرف پنڈاروں، امیر خاں اور سندھیا کے درمیان انگریزی فوج اس طرح بیٹھ گئی کہ تینوں میں باہم گفت و شنید یا میل جول کا کوئی موقع نہ رہا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۶) گوالیار میں اسیر رہا۔ اس زمانے میں چیتو نے بہت رسوخ پیدا کر لیا۔ دوست محمد اور واصل محمد کی پارٹیاں بھی چیتو کے ساتھ مل گئیں۔

کریم خاں نے چھ لاکھ روپے دے کر قید سے مخلصی حاصل کی۔ انگریزوں نے راجستھان کے راجاؤں سے معاہدے کر لینے کے بعد پنڈاروں کے خلاف کارروائی شروع کی۔ ایک ایک کر کے سب سردار حوالگی قبول کرتے گئے۔ نامدار خاں نے ۱۸۱۳ء میں ہتھیار ڈالے۔ کریم خاں اور واصل محمد خاں گورکھ پور اور غازی پور میں جاگیریں لے کر بیٹھ گئے۔ چیتو آخر تک مقابلے پر جما رہا۔ اس کے پاس پندرہ ہزار سوار تھے۔ مردانگی سے لڑا اور شکست کھا کر جنگل میں جا چھپا۔ ۱۸۱۷ء میں اسے شیر نے پھاڑ ڈالا۔ چیتو اصلاً میواتی تھا اور بڑا غیور مسلمان تھا۔ پنڈارے بھی ہندوستان کی آزادی کے بچاؤ کے لیے عظیم الشان خدمات انجام دے سکتے تھے، لیکن امیر خاں کی طرح گرد و پیش کے مخصوص حالات نے انھیں اطمینان و دل جمعی سے مستقل مقصد کے لیے کام کی مہلت نہ دی۔ یہ قوت بھی پنڈارا سرداروں کی کوتہ اندیشی اور آس پاس کے دیسی فرماں رواؤں کی غداری کے باعث ضائع ہو گئی۔ ہندوستانی تاریخ نگاروں کی بے خبری باعث تعجب ہے کہ وہ آج تک اس قوت کی حقیقی حیثیت کا صحیح اندازہ نہ کر سکے۔ اس سے بھی عجیب تر واقعہ یہ ہے کہ نواب امیر خاں کو بھی پنڈاروں ہی کے گروہ میں شامل کرتے رہے، حالانکہ اس مرحوم کو پنڈاروں سے اس کے سوا کوئی تعلق نہ تھا کہ ضرورت کے وقت پنڈارے اس کی پناہ لے لیتے تھے اور وہ پناہ دے دیتا تھا۔

دوسری طرف ایک انگریزی جیش خود امیر خاں کی فوج کے دو حصوں کے درمیان حائل ہو گیا اور ان کے اتصال کا ہر رشتہ کاٹ ڈالا۔ ساتھ ساتھ امیر خاں کے مختلف سرداروں کو لالچ دے کر انگریزوں نے توڑ لیا۔ چنانچہ انگریزی فوج کی پیش قدمی کے ساتھ ہی فیض اللہ بنگش اپنا رسالہ لے کر انگریزوں سے مل گیا۔ سخت اندیشہ پیدا ہو گیا کہ دوسرے سردار امیر خاں کو اچانک گرفتار کر کے انعام کی حرص میں انگریزوں کے حوالے نہ کر دیں۔ یہ حالات بروئے کار آ چکے تو انگریزوں نے امیر خاں سے مصالحت کی بات چیت شروع کی اور دہلی سے مٹکاف صاحب نے منشی نرنجن لال کو عہد نامے کا مسودہ دے کر نواب کے پاس بھیج دیا۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں نواب اس وقت مادھو راج پوری کا محاصرہ کیے بیٹھا تھا۔

عہد نامہ نواب نے مجبور ہو کر اپنے معتمد علیہ سفیر داتا رام کو، جو جے پور میں تھا، لکھا کہ انگریزوں سے گفتگو کر کے صلح نامہ مرتب کر لے۔ چنانچہ جو شرطیں طے ہوئیں ان میں سے قابل ذکر یہ تھیں:

۱۔ ہلکر نے نواب کو جو علاقے دیے تھے وہ سب اس کے قبضے میں رہیں گے۔ انھیں علاقوں کے اشتمال سے ریاست ٹونک صورت پذیر ہوئی۔

۲۔ ساری فوج منتشر کر دی جائے گی اور صرف اتنے آدمی باقی رکھے جائیں گے، جو علاقوں کے انتظام کے لیے ضروری متصور ہوں گے۔ انگریزوں نے ذمہ اٹھایا کہ زیادہ تر منتشر کردہ آدمیوں کو وہ اپنی فوج میں لے لیں گے۔

۳۔ توپ خانہ اور ساز و سامان جنگ انگریز مناسب معاوضے دے کر خرید لیں گے۔ یہ اس وجہ سے بھی ضروری تھا کہ قابلِ ذکر سامانِ حرب نواب کے پاس نہ رہے، اس وجہ سے بھی ضروری تھا کہ نواب کو فوج کی تنخواہ ادا کرنے کے لیے روپے کی ضرورت تھی اور تنخواہ ادا کیے بغیر فوج کو منتشر کرنا مشکل تھا۔

۴۔ نواب کسی علاقے پر حملہ نہ کرے گا بلکہ پنڈاروں کو ختم کرنے میں انگریزوں کو مدد دے گا۔

توپوں اور دوسرے سامان حرب کے لیے انگریزوں نے پانچ لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا اور دو لاکھ فوراً ادا کر دیے۔ چونکہ اس وقت تک یقین نہ تھا کہ نواب تمام شرطیں خوش دلی سے پوری کرے گا، اس لیے مطالبہ کیا گیا کہ ضمانت و کفالت کے طور پر وہ اپنے فرزند اکبر صاحبزادہ محمد وزیر خاں کو دہلی بھیج دے۔ جب معاہدہ مکمل ہو جائے اور انگریز مطمئن ہو جائیں کہ سب شرطیں پوری ہو جائیں گی تو بقیہ تین لاکھ روپیہ ادا کر دیا جائے گا۔

انگریزوں کی عیاری نواب جتنا شجاع تھا، اتنا مدبر نہ تھا۔ وہ چاہتا تو راجپوتانہ میں ٹونک سے

متصل خاصا بڑا علاقہ مانگ سکتا تھا اور حالات ایسے تھے کہ انگریز اُسے زیادہ علاقہ دینے کے لیے بے تکلف تیار ہو سکتے تھے، مگر اس نے یہ عجیب مطالبہ کیا کہ ٹونک کے علاوہ یوپی میں پرگنہ سنبھل دے دیا جائے، جو اس کا آبائی وطن تھا، حالانکہ وہ ذرا بھی غور و فکر سے کام لیتا تو سمجھ جاتا کہ سیکڑوں میل کے فاصلے پر دو منفک علاقوں کو زیر تصرف رکھنا غیر ممکن ہے۔ انگریزوں نے اس وقت صاف جواب نہ دیا۔ جب نواب ہاتھ پاؤں تڑوا کر بیٹھ گیا تو پہلے کہا کہ سنبھل کے بجائے پلول کا علاقہ لے لیا جائے۔ نواب اس پر بھی راضی ہو گیا پھر انگریزوں نے کہا کہ اس کا انتظام انگریزوں کے ہاتھ میں رہے گا، صرف مالیہ نواب کو ملتا رہے گا۔ آخر نواب ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ کا وظیفہ صاحبزادہ محمد وزیر خاں کے نام مقرر کرا کے پلول سے بھی دست بردار ہو گیا۔

۹- نومبر ۱۸۱۷ء کو نواب کے وکیل نے اصل معاہدے پر دستخط کر دیے۔ ۱۵- نومبر کو گورنر جنرل نے اس کی تصدیق کر دی۔ ۹- دسمبر کو نواب نے معاہدہ بعد تصدیق سر ڈیوڈ اکڑلونی کے حوالے کر دیا جسے وقت کی دیسی تاریخوں میں عموماً "لونی اختر" لکھا جاتا ہے اور جو کاملاً ہندوستانی تمدن اختیار کر چکا تھا، یہاں تک کہ شادی بھی ایک ہندوستانی عورت سے کر لی تھی۔

سید صاحب کی طرف سے مخالفت

صلح کی ساری بات چیت پس پردہ ہوئی۔ مادھوراج پوری کا محاصرہ جاری تھا کہ انگریزوں کی طرف سے ایک شتر سوار معاہدے کا آخری مسودہ لے کر نواب کے پاس پہنچا۔ نواب اسے دیکھتے ہی ڈیرے میں چلا گیا۔ اس وقت مشیران خاص کو صورت حالات کا علم ہوا۔ اکثر کی رائے تھی کہ انگریزوں سے مصالحت کر لی جائے۔ سید صاحب نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ نواب کو سمجھایا کہ آپ انگریزوں سے لڑیں۔ خدا آپ کے ساتھ ہے۔ اگر فتح ہوئی فہو المراد، اگر شہید ہوئے تو بھی بہتر ہے۔ مگر انگریزوں سے ملنا اور مصالحت کرنا بہت برا ہے۔ نواب نے عذر پیش کیا کہ لشکر کا سامان درست نہیں۔ لوگ خود غرضی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ان میں باہم اتفاق نہیں۔ اس وقت مصالحت ہی مناسب ہے۔ دس پندرہ لاکھ روپے انگریزوں سے لے کر لشکر کا سامان درست کریں گے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ مصالحت کے بعد آپ سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا[1]

نواب نے مصالحت کی تیاریاں شروع کر دیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ آپ انگریزوں سے ملتے

---

[1] وقائع صفحہ ۳۰۔

ہیں تو میں رخصت ہوتا ہوں۔ نواب نے بہت روکا لیکن سید صاحب چند آدمی ساتھ لے کر اسی وقت لشکر سے نکلے اور جے پور چلے گئے۔ گویا ان کے نزدیک نواب سے تعلق صرف اس وقت تک بجا تھا جب تک وہ آزاد تھا۔ انگریزوں کے زیر اثر آتے ہی اس میں اور دوسرے دیسی رئیسوں مثلاً نظام یا والی اودھ میں اصلاً کوئی فرق نہیں رہا تھا۔ اس سے سورج کی طرح روشن ہے' سید صاحب کے سامنے اصل نصب العین یہ تھا کہ ہندوستان کو انگریزوں کے تصرف سے پاک کریں اور یہاں خالص اسلامی نظام حکومت کی بنیاد رکھیں۔ وہ اسی غرض سے امیر خاں کے پاس پہنچے تھے۔ جب تک نواب آزاد رہا، اس کے ساتھ رہے جب وہ انگریزوں سے مل گیا تو الگ ہو گئے' اس لیے کہ آگ اور پانی یک جا نہیں رہ سکتے تھے۔

آخری کوشش

اس اثنا میں خبر گرم ہوئی کہ ڈیوڈ آکٹرلونی نواب سے ملنے کے لیے آ رہا ہے۔ سید صاحب نے اپنے خادم خاص میاں دین محمد سے کہہ دیا کہ جب نواب انگریزوں کے پاس جائے تو تم ہمارے پاس چلے آنا۔ آکٹرلونی کے پہنچنے سے پہلے سید صاحب اچانک آدھی رات کے وقت لشکر میں پہنچ گئے۔ اسی وقت نواب کو اطلاع ہوئی۔ صبح کی نماز کے لیے وہ مسجد میں گیا۔ بعد نماز سید صاحب کا ہاتھ پکڑ کر باتیں کرتا ہوا باہر نکلا۔ اس موقع پر سید صاحب نے پھر کہا کہ نواب صاحب! میں آخری مرتبہ سمجھانے کے لیے آیا ہوں۔ ابھی کچھ نہیں گیا۔ اختیار باقی ہے:

> اگر میرا کہنا مانو تو ان انگریزوں سے لڑو اور ہرگز نہ ملو۔ بعد ملنے کے آپ سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ یہ کفار بڑے دغاباز و مکار ہیں۔ کچھ آپ کے واسطے جاگیر یا تنخواہ وغیرہ مقرر کر کے کہیں بٹھا دیں گے کہ روٹیاں کھایا کیجیے۔ پھر یہ بات ہاتھ سے جاتی رہے گی۔

نواب نے پھر وہی جواب دیا کہ اس وقت ملنا ہی مناسب ہے۔ میں لڑ کر عہدہ برآ نہ ہو سکوں گا۔ سید صاحب نے کہا کہ خیر، آپ مختار ہیں۔ میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ دین محمد سے کہا کہ میں آگے چلتا ہوں، تم میرے پیچھے چلے آنا۔

جب نواب اور ڈیوڈ آکٹرلونی موضع رانول میں باہم ملاقات کر چکے تو دین محمد نے جے پور پہنچ کر سارے حالات سنائے۔ سید صاحب پھر ایک روز لشکر میں گئے۔ جس کسی سے کچھ لینا دینا تھا، لیا دیا۔ نواب سے بھی ملے۔ راوی کہتا ہے:

> حضور پرنور (نواب) بہت آبدیدہ ہوئے کہ حضرت (سید صاحب) جو کچھ تقدیر میں تھا، وہی ہوا۔ حکم الٰہی سے چارہ نہیں۔ اگر آپ دہلی کو جاتے ہیں تو صاحبزادہ محمد وزیر خاں کے ہمراہ جائیے۔ آپ نے قبول کیا۔[1]

شاہ عبدالعزیز کو خط

کئی دن بعد سید صاحب نے شاہ عبدالعزیز کے نام خط بھیجا، جس کا مضمون یہ تھا:

> یہ خاکسار سراپا انکسار حضرت کی قدم بوسی میں عنقریب حاضر ہوتا ہے۔ یہاں لشکر کا کارخانہ درہم برہم ہو گیا۔ نواب صاحب فرنگی سے مل گئے۔ اب یہاں رہنے کی کوئی صورت نہیں۔[1]

نواب کے پاس اس وقت بھی خاصی فوج تھی۔ "امیر نامہ" کے بیان کے مطابق صرف جمشید خاں شیخاواٹی میں دس بارہ ہزار سوار اور پیادے لیے بیٹھا تھا، لیکن نواب کے عزم و ہمت پر اچانک ایسا ضعف طاری ہوا کہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ ہندوستان میں آزادی کا وہ آخری طاقت ور شہباز تھا، لیکن خود ہی اپنے بازو نچوا کر انگریزوں کے جال میں پھنس گیا۔ محمد عمر خاں، محمد ایاز خاں اور راجا بہادر لال سنگھ کی فوجیں انگریزوں کی طرف منتقل کر دی گئیں۔ جمشید خاں نے مصالحت سے انکار کر دیا۔ کرنل سکنر نے اسے شکست دے کر حوالگی پر مجبور کیا۔

اپنوں کی افسانہ طرازیاں

یہ حقیقی حالات کا نقشہ تھا، لیکن اپنوں نے اس کا حلیہ بگاڑنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری لکھتے ہیں کہ

نواب امیر خاں انگریزوں سے لڑ رہے تھے۔ توپیں اور بندوقیں چل رہی تھیں۔ سید صاحب اپنے خیمے میں تھے۔ آپ نے گھوڑا تیار کرایا اور اس پر سوار ہو کر دونوں لشکروں کو چیرتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے، جہاں انگریز سپہ سالار نے عہد کیا کہ میں ابھی نواب کے مقابلے سے ہٹ جاتا ہوں اور سرکار انگریزی کو اس بات پر مجبور کروں گا کہ وہ نواب سے صلح کر لے۔ اس کے بعد نواب اور انگریزوں میں جنگ نہ ہوئی اور صلح کی بات چیت شروع ہو گئی۔[2]

اس افسانے کے لیے تاریخ و سوانح کے قلمی یا مطبوعہ ذخیروں میں اب تک مجھے سرسری اشارہ تک نہ مل سکا اور نہ عقل سلیم کے نزدیک اس کا کوئی پہلو قابل قبول ہے۔ مرزا حیرت نے اس سے بھی عجیب تر افسانہ تراشا۔ فرماتے ہیں کہ سید صاحب نے:

۱۔ امیر خاں کی ملازمت میں ایک ناموری کا کام یہ کیا کہ انگریزوں اور امیر خاں میں صلح کرا دی۔

۲۔ لارڈ ہیسٹنگز (گورنر جنرل) سید احمد کی بے نظیر کارگزاری سے بہت خوش تھا۔ دونوں لشکر دل

---

[1] وقائع صفحہ ۱۱۲۔ [2] تواریخ عجیبہ ۱۷۹، ۱۸۰۔

کے بیچ میں ایک خیمہ کھڑا کیا گیا اور اس میں تین آدمیوں کا معاہدہ ہُوا: امیر خاں، لارڈ ہسٹنگز اور سید احمد صاحب۔

۳۔ سید احمد صاحب نے امیر خاں کو بڑی مشکل سے شیشے میں اُتارا تھا اور یقین دلایا تھا کہ انگریزوں سے لڑنا بھڑنا اگر تمہارے لیے بُرا نہیں تو تمہاری اولاد کے لیے سمِ قاتل کا اثر رکھتا ہے۔[1]

کیا سید شہید کے عزیز ترین نصب العین کی اس سے بھی بڑی تحریف ہو سکتی ہے جو مرزا حیرت نے کی؟ سیّد صاحب نواب کو انگریزوں کے ساتھ ملنے سے روکتے رہے اور لڑائی کی ترغیب دیتے رہے۔ جب نواب نہ رکا تو صرف اسی بناء پر آپ نے نواب سے تعلق منقطع کر لیا۔ لیکن مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ سید نے صلح کرائی اور بڑی مشکل سے نواب کو شیشے میں اتارا۔ عجیب امر یہ ہے کہ ہسٹنگز سے نواب کی کوئی ملاقات نہ ہُوئی۔ وہ صرف ڈیوڈ آکٹرلونی سے ملا اور سید صاحب اس ملاقات کے وقت لشکر سے کوسوں دُور بیٹھے تھے۔

انگریزی چالیں

انگریزوں نے سید صاحب کے کارناموں کو غلط بیانیوں کے گرد و غبار میں چھپانے کے لیے عجیب و غریب ہتھکنڈے اختیار کیے۔ ایک طرف سید کے ساتھ محبت و ارادت کے دعوے داروں سے یہ پروپیگنڈا کرایا کہ وہ (سید صاحب) انگریزوں کے دوست اور محب تھے۔ اس طرح اس پاک نفس وجود کے داعیۂ جہاد کی آبرو مٹائی۔ پھر دوسرے لوگوں کو اُبھارا کہ وہ سید کی تحریک اصلاح عقائد و اعمال کو بے سروپا مطاعن کا ہدف بنائیں۔ اس طرح اس شہید کے کارنامۂ حیات کو ہر پہلو سے ملیامیٹ کر دینے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ دشمنوں کے ہاتھوں کسی کا سرمشق مظلومیت بننا قطعاً تعجب انگیز نہیں، لیکن سید احمد شہید عالم انسانیت کے ان یگانہ مظلوموں میں سے ہیں، جنھیں دوستوں اور محبوں نے دشمنوں سے بڑھ کر نہیں تو کم از کم ان کے برابر نشانہ بیداد بنانے میں کوئی کوتاہی نہ کی۔

تاریخ مراجعت

اب صرف ایک معاملہ باقی رہ گیا اور وہ یہ کہ سید صاحب کب نواب سے رخصت ہو کر دہلی پہنچے؟ یہ معلوم ہے کہ انگریزوں کے ساتھ معاہدے کی تصدیق کے وقت سید صاحب راجستھان ہی میں تھے اور نواب کی فرمائش پر صاحبزادہ محمد وزیر خاں کے ہمراہ دہلی آئے تھے۔ "منظورہ" میں ہے کہ صاحبزادہ محمد وزیر خاں دہلی پہنچے تھے تو گرمی کا موسم تھا۔ غالب

---

[1] حیات طیبہ صفحہ ۲۹۲۔

ہے وہ مئی یا جون ۱۸۱۸ء میں آئے ہوں (رجب یا شعبان ۱۲۳۳ھ) یہی سید صاحب کی تاریخ مراجعت ہے۔

صاحبزادہ صاحب کو حوض قاضی کے پاس بلند بیگ خاں کی حویلی میں اتارا گیا تھا۔ سید صاحب اجمیری دروازہ کے باہر سرائے میں ٹھہر گئے۔ اگلے روز شاہ عبدالعزیز سے ملنے گئے تو پچیس روپے بطور نذر پیش کیے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ مسجد اکبر آبادی میں اُترو۔ چنانچہ شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحئی، حافظ قطب الدین، شاہ محمد یعقوب، مولوی محمد یوسف پھلتی، مولوی وحید الدین اور کئی اور صاحبوں کو حکم دیا کہ سید صاحب کا سامان سرائے سے اُٹھا کر مسجد اکبر آبادی میں پہنچا دیں۔ سید صاحب مسجد میں پہنچے تو پہلے دو رکعت نماز نفل ادا کی۔ پھر صحن میں آکر بیٹھے اور پانچ حجرے اپنے قیام کے لیے پسند فرمائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے رفیقوں میں اور آدمی بھی ہوں گے۔ آپ کے اُستاد شاہ عبدالقادر کئی برس پہلے واصل بحق ہو چکے تھے اور ان کی جگہ شاہ رفیع الدین مسجد میں درس دیتے تھے۔

دسواں باب

دعوت اصلاح کا آغاز

دہلی میں تشریف آوری

سید صاحب نواب امیر خاں سے الگ ہو کر تیسری مرتبہ دہلی میں وارد ہوئے تو ان کی خداداد صلاحیتیں کمال پر پہنچ چکی تھیں۔ وہ ذکر و سلوک کی ان تمام منزلوں سے گزر چکے تھے، جو اس مشرب کے اکابر کے لیے مخصوص سمجھی جاتی تھیں۔ ان کی ریاضتیں اور مجاہدے اس عہد میں بھی تعجب کی حد تک نادر و یگانہ تھے، جبکہ ان مشاغل کو رواج عام حاصل تھا۔ عمر کے عشرۂ چہارم میں تھے جب انسان کے قویٰ بلوغ کی آخری حد پر پہنچ جاتے ہیں۔ سات آٹھ برس تک اس لشکرگاہ میں ایک ذمہ دار مشیر کے طور پر کام کر چکے تھے، جو اپنے وقت میں سیاسیات ہند کا ایک ممتاز مرکز تھی اور جہاں بیٹھ کر زیادہ سے زیادہ صحیح اندازہ ہو سکتا تھا کہ ملک کے مستقبل کی تقدیر کس نہج و طریق پر جا رہی ہے۔ اسلام و شریعت کی محبت سے ان کے وجود کا رگ و ریشہ خلقاً معمور تھا۔ یہ بھی جان چکے تھے کہ ملک جس خوفناک انقلاب احوال سے دوچار ہے، اگر اس کا رُخ بدلنے میں پوری طاقت و قوت سے کام نہ لیا گیا تو نہ مسلمانوں کی سیاسی برتری کے باقیات سلامت رہ سکیں گے اور نہ احیاء و تجدید دین کے لیے کوئی قابل ذکر کام ہو سکے گا۔ وقت کے بعض عظیم المنزلت افراد سے بھی ان کے گہرے تعلقات پیدا ہو چکے تھے۔

شاہ عبدالعزیز کا خواب

ایک روایت ہے کہ سید صاحب کے پہنچنے سے ایک ہفتہ پہلے شاہ عبدالعزیز نے ایک خواب دیکھا، جس کا مفاد یہ تھا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم دہلی کی جامع مسجد میں تشریف فرما ہیں۔ بے شمار خلقت ہر گوشے سے حضورؐ انور کے دیدار فرحت آثار کے لیے اُمڈی چلی آ رہی ہے۔ حضورؐ نے سب سے پہلے شاہ صاحب کو دست بوسی کی سعادت سے شرف بخشا۔ پھر ایک عصا مرحمت کیا اور فرمایا: تو مسجد کے دروازے پر بیٹھ جا، ہر کسی کا حال ہمیں سُنا۔ جس کے لیے ہمارے ہاں سے حاضری کی اجازت ملے، اُسے اندر آنے دے۔

شاہ عبدالعزیز بیدار ہوئے تو اس خواب کی تعبیر پوچھنے کے لیے شاہ غلام علیؒ کے پاس خانقاہ

میں پہنچے۔ انھوں نے کہا: سبحان اللہ! یوسفِ وقت مجھ سے تعبیر پوچھتا ہے! شاہ صاحب بولے: میں اس خواب کی تعبیر آپ ہی کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ شاہ صاحب کے سخت اصرار پر شاہ غلام علیؒ نے کہا: معلوم ہوتا ہے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض ہدایت کا خاص سلسلہ آپ سے یا آپ کے کسی مرید سے جاری ہوگا۔ شاہ صاحب بولے: میرے خیال میں بھی یہی تعبیر تھی۔ جب سید صاحب دہلی پہنچے تو شاہ صاحب کو یقین ہو گیا کہ جس سلسلہ ہدایت کے اجرا کی بشارت خواب میں دی گئی تھی، وہ خدا چاہے تو سید صاحب ہی کے ذریعے سے جاری ہو۔

آج کل مذاقِ فہم و فکر اس نوع کی بشارتوں کو براذعان قلب قبول کرے یا نہ کرے لیکن اس حقیقت سے کسی کو بھی غالباً اختلاف نہ ہوگا کہ جس سید کو قدرت نے اصلاح و تجدید کی عزیمت مندانہ دعوت کے لیے چنا تھا، اس کی تمام صلاحیتیں بلوغ و پختگی کی آخری حد پر پہنچ چکی تھیں اور آغاز کار میں توقف و انتظار کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی تھی۔

اصلاح و تجدید کی سکیم

سید صاحب کا نصب العین اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مسلمانوں کو حقیقی معنی میں مسلمان بنایا جائے۔ جہاد فی سبیل اللہ کی اس روح کو زندہ کیا جائے جو قرن اوّل کے مسلمانوں کا طغرائے امتیاز تھی[1] اور ہندوستان میں خالص اسلامی حکومت کی بنیادیں استوار کی جائیں، جو آٹھ سو برس تک مسلمانوں کے زیر نگیں رہنے کے بعد تیزی سے اغیار کے قبضے میں جا رہا تھا۔ جب تک نواب امیر خاں آزاد رہا، سید صاحب نے اس کا دامن نہ چھوڑا۔ نواب نے انگریزوں سے معاہدہ کر لیا تو امید کا یہ چراغ بھی گل ہو گیا اور سید صاحب کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ نصب العین کی خاطر تنظیم کا مستقل بندوبست کریں۔ مجھے یقین ہے کہ دہلی پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنے ذہن میں ایک نقشۂ تنظیم بنا چکے تھے، اسے جامۂ عمل پہنانے کی غرض سے وہ دہلی میں ٹھہر گئے اور ایک برس تک وطن کا رُخ نہ کیا۔ اسی سلسلے میں انھوں نے میرٹھ، مظفر نگر، سہارن پور وغیرہ کا دورہ کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے سوچے ہوئے نظام کی کامیابی کے امکانات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر لیں، پھر جہاں جائیں، اسی کے لیے اپنی زندگی کے گرانمایہ اوقات وقف رکھیں۔

وہ نہ کسی خطے کے رئیس تھے نہ ذخائر زر کے مالک تھے۔ نواب امیر خاں نے جن حالات میں کام

---

[1] یہی خصوصیت تھی جس کی طرف حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بحیثیت خلیفۃ الرسولؐ اپنے پہلے خطبے میں ارشاد فرمایا تھا کہ جو قوم خدا کی راہ میں جہاد چھوڑ دیتی ہے، وہ ذلت و خواری میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

شروع کرکے بڑی جمعیت فراہم کرلی تھی، وہ بھی باقی نہیں رہے تھے، اس لیے کہ انگریز ہندوستان کے بڑے حصے پر قابض ہو چکے تھے۔ سید صاحب کے پاس دینی حمیت، جذبۂ احیاء اسلامیت اور روحانی دولت کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہی قدوسی جوہر تھے، جن کے بل پر انھوں نے ارشاد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ ایک طرف مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح پیش نظر رکھی، دوسری طرف ان کے سینوں میں جہاد فی سبیل اللہ کی حرارت پیدا کی۔ مسلمان اگر سچا مسلمان ہو تو ناممکن ہے وہ جہاد فی سبیل اللہ کی حرارت کا بے پناہ آتش کدہ نہ بن جائے، ناممکن ہے اس کے بدن کا ہر قطرۂ خون راہِ خدا میں بہنے کو اپنی سب سے بڑی سعادت نہ سمجھے۔ یہی طریقہ تھا جسے سید صاحب سے چند سال بعد قفقاز کے شہرۂ آفاق مجاہد شیخ شامل نے اختیار کیا اور غازیوں کی ایک ایسی جماعت تیار کرلی جو ربع صدی تک روس کی جابر طاقت سے ٹکراتی رہی۔ یہی طریقہ تھا جسے سید صاحب سے چالیس برس بعد شیخ محمد احمد سوڈانی نے اپنے وطن میں اختیار کیا اور نہایت قلیل مدت میں بے رُوح سوڈانیوں کو منظم کرکے حمیت اسلام اور جوشِ آزادی کی راہ میں ایک بے پناہ قوت بنا دیا۔

آغازِ بیعت

سید صاحب کو دہلی پہنچے ہوئے زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ بیعت طریقت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جہاں تک میں تحقیق کرسکا ہوں، اکابر میں سے سب سے پہلے مولوی محمد یوسف پھلتی نے بیعت کی، جو شاہ ولی اللہ کے برادر اکبر شاہ اہل اللہ کے پوتے تھے اور اس وجہ سے ولی اللّٰہی خاندان میں محسوب تھے۔ بیعت کے وقت سے آخری سانس تک مولوی محمد یوسف، سید صاحب کے خاص رفیق، معتمد علیہ مشیر، خزینہ دار اور داروغہ کل بنے رہے۔ سید صاحب سرحد میں سوات کا دورہ کر رہے تھے جب اس بزرگ ہستی نے انتقال کیا اور "قطب لشکر اسلام" کا لقب پایا۔

مولانا احمد اللہ ناگپوری کا بیان ہے کہ مولانا عبدالحی اور شاہ اسماعیل نے مولوی محمد یوسف سے کہا تھا، پہلے آپ بیعت کریں۔ مراقبہ و توجہ میں جو انوار و برکات حاصل ہوں، ان کی تفصیل ہمیں بتائیں، پھر ہم بیعت کریں گے۔ مولوی صاحب موصوف نے بیعت کے بعد عقیدت و ارادت کو اس بلندی پر پہنچا دیا کہ ان کا رتبہ مولانا عبدالحی اور شاہ اسماعیل سے برابر فائق و برتر رہا۔[1]

مولانا عبدالحی کی بیعت

مولانا عبدالحی کی بیعت کا واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز انھوں نے اسرار صلوۃ اور حضور قلب کے متعلق شاہ عبدالعزیز سے

---

[1] منظورہ صفحہ ۷۵

گفتگو کی۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ تصوف و اخلاق کی کتابوں میں ان امور کی تشریح موجود ہے۔ مثال کے طور پر "احیاء العلوم" کو دیکھ لینا چاہیے، لیکن مرشدِ کامل کے بغیر حصولِ مرام مشکل ہے۔ ساتھ ہی سید صاحب سے رجوع کا مشورہ دیا[1]۔

مولانا عبدالحی نے سید صاحب کے پاس پہنچ کر وہی سوال کیا۔ آپ نے جواب میں پوری کیفیت بتلاتے ہوئے فرمایا:

مولانا صاحب! حصول ایں مقصد بہ گفتگو راست نمی آید۔ ہمیں نماز است کہ در بدو نبوّت سیدالانبیاء را صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت جبرئیل امین بحکم رب العالمین برائے تعلیم آں امامت فرمودہ اند۔ بیا، برخیز و تحریمہ دو رکعت نماز بہ اقتدایم بربند۔ مولانا علیہ الرحمۃ حسب المامور بہ عمل آوردہ تحریمہ دو رکعت نماز بہ اقتدائے آں عالی جناب بربستند۔ دریں مقام اکثر آں عالی مقام (مولانا عبدالحی) بیان مے فرمودند کہ آنچہ درآں دو رکعت یافتہ ام ہیچ گاہ در عمر خود نیافتہ ام۔

مولانا صاحب یہ مقصد گفتگو سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہی نماز ہے جو حضرت جبرئیل امین نے رب العالمین کے حکم سے خود امام بن کر حضرت سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو آغاز نبوت میں پڑھائی تھی۔ اُٹھیے اور دو رکعت نماز میرے پیچھے پڑھیے مولانا نے حسب ارشاد سید صاحب کی اقتداء میں دو رکعت نماز کی نیت باندھ لی۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ان دو رکعتوں میں جو نعمتیں حاصل ہوئیں، وہ عمر بھر مجھے نہ مل سکیں۔

مولانا کرامت علی صاحب جون پوری نے اس بارے میں مولانا عبدالحی کا جو بیان اپنی کتاب "نورٌ علیٰ نور" میں نقل کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا عبدالحی نے سلوک الی اللہ کے لیے شاہ عبدالعزیز سے درخواست کی تو آپ نے شاہ غلام علی کے پاس بھیجا۔ مقصد حاصل نہ ہوا تو فرمایا سید صاحب کے پاس جاؤ۔ چند روز بعد سید صاحب، مولانا عبدالحی اور مولانا شاہ اسماعیل مدرسے میں

---

[1] مخزن احمدی صفحہ ۳۰،۳۰۵۔ "مخزن" میں شاہ عبدالعزیز کی جگہ شاہ عبدالقادر کا نام مرقوم ہے، جسے مصنف یا ناقل کی لغزش قلم سمجھنا چاہیے۔ شاہ عبدالقادر ۲۲۔ جمادی الثانی ۱۲۲۸ھ (۲۲۔ جون ۱۸۱۳ء) کو فوت ہو چکے تھے، جب سید صاحب امیر خاں کے لشکر میں تھے۔ شاہ رفیع الدین نے سید صاحب کے دہلی پہنچنے سے تھوڑی مدت بعد ۵۔ شوال ۱۲۳۳ھ (۸۔ اگست ۱۸۱۸ء) کو بہ عارضہ ہیضہ وبائی انتقال کیا۔ یہ گفتگو یقیناً شاہ عبدالعزیز سے ہوئی۔ یہاں یہ بھی واضح کر دینا چاہیے کر شاہ عبدالعزیز مولانا عبدالحی کے پھوپھا تھے۔ شاہ صاحب ہی نے مولانا کو پڑھایا تھا، پھر اپنی بیٹی سے شادی کر دی تھی۔

سو گئے۔ آدھی رات سے کچھ قبل سید صاحب نے پکارا تو مولانا عبدالحی فرماتے ہیں کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ فرمایا: جائیے اس وقت اللہ کے لیے وضو کیجیے۔ دو تین قدم چلنے کے بعد روک کر بار بار تین مرتبہ فرمایا۔ پھر کہا کہ اللہ کے لیے نماز پڑھیے۔ مولانا کہتے ہیں، مشاہدۂ جلال میں اس طرح غرق ہوا کہ کچھ ہوش باقی نہ رہا۔ روتے روتے آنسوؤں سے داڑھی تر ہو گئی۔ دو رکعت پڑھ چکا تو خیال آیا کہ فاتحہ نہیں پڑھی۔ پھر نیت باندھ لی۔ غرض اس طرح بار بار کسی واجب کے ترک کا خیال آتا تو میں نیت باندھ لیتا۔ کم و بیش سو رکعتیں اسی طرح پڑھیں۔ پھر استغفار پڑھنے لگا۔ صبح کی نماز کے بعد مولانا اسماعیل سے یہ ذکر کیا تو انھوں نے بھی بیعت کر لی۔

شاہ اسماعیل کی بیعت

مولانا عبدالحی بعد نماز سید صاحب سے اجازت لے کر گھر پہنچے اور پوری کیفیت شاہ اسماعیل کو سنائی۔ شاہ صاحب نے یہ سنتے ہی مولانا کو ساتھ لیا اور سید صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ آپ نے شاہ صاحب کو بھی مولانا عبدالحی کی طرح دو رکعت نماز پڑھائی۔ اسی دن سے دونوں نے سید صاحب کا دامن اس مضبوطی سے تھام لیا کہ پھر جیتے جی الگ نہ ہوئے۔ "انوار العارفین" کا بیان ہے کہ شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی اکٹھے امتحان کی غرض سے سید صاحب کے پاس پہنچے تھے اور نماز میں حضورِ قلب کے متعلق سوال کیا تھا۔ سید صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا: آج رات میرے حجرے میں آکر میرے پیچھے دو رکعت نماز ادا کیجیے۔ چنانچہ دو رکعت نماز سید صاحب کے ساتھ پڑھ چکنے کے بعد دو رکعتوں کی نیت باندھ لی۔ سید صاحب کی صحبت اور حقانی توجہ کی برکت سے ساری رات استغراق میں گزار دی۔ بس اس وقت سے ایسے معتقد ہوئے کہ پھر ساتھ نہ چھوڑا۔[1][2]

ان کے بعد شاہ اسحاق، شاہ یعقوب، حکیم مغیث الدین، مولانا وجیہ الدین، حافظ معین الدین اور ان کے فرزندوں نے بیعت کی۔ یہ سب لوگ خصوصاً مولانا عبدالحی، شاہ اسماعیل اور شاہ اسحاق علم و فضل کے ستون مانے جاتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز کے سوا شہرت اور درجے میں کوئی ان سے فائق نہ تھا۔ خود شاہ صاحب موصوف مولانا عبدالحی کو "شیخ الاسلام" اور شاہ اسماعیل کو "حجۃ الاسلام" فرمایا کرتے تھے۔ شاہ اسماعیل بھتیجے اور شاہ اسحاق نواسے تھے۔ اکثر بطور تحدیث نعمت یہ آیت پڑھا کرتے تھے:

---

[1] مخزن احمدی صفحہ [illegible] [2] انوار العارفین صفحہ [illegible]

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَنِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ [1]

ہر تعریف اس خدائے پاک کے لیے ہے جس نے بڑھاپے کے عالم میں مجھے اسماعیل اور اسحاق عطا کیے۔

ایک موقع پر شاہ صاحب نے فرمایا تھا کہ تفسیر قرآن میں عبدالحی میرا نمونہ ہے اور تحریر میں رشید الدین، حدیث میں مرزا حسن علی اور فقہ میں اسحاق۔ شاہ اسماعیل کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: اسماعیل کا علم کسی خاص شعبے میں محدود نہیں۔ جن لوگوں نے میرے عہد شباب کا علم دیکھا ہے، اس کا نمونہ دیکھنا ہو تو اسماعیل کو دیکھ لیں۔

شہرتِ عام

ان اکابر علم کی بیعت نے وقت کے اکثر اصحاب کی توجہ سید صاحب کی طرف پھیر دی۔ دہلی، پھلت، بڑھانہ اور آس پاس کے تمام اقطاع و بلاد کی فضا آپ کی شہرت سے معمور ہو گئی۔ دُور دُور سے لوگ بیعت کے لیے دہلی پہنچنے لگے۔ جہاں جہاں یہ صدا پہنچی کہ شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحی اور شاہ اسحاق نے سید احمد کی بیعت کر لی، وہاں کے لوگوں میں طلب و شوق کی بے تابی پیدا ہو گئی۔ یہی زمانہ ہے جب مختلف مقامات سے دعوت نامے سید صاحب کے پاس پہنچنے لگے کہ سب لوگ حاضر خدمت نہیں ہو سکتے۔ لطفاً خود تشریف لائیے اور فیض توجہ سے مشرف فرمائیے۔ گویا دعوت اصلاح اور تنظیم جہاد کی جو سکیم سید صاحب نے اپنے ذہن میں سوچ رکھی تھی، اس پر عمل کا سازگار وقت آگیا تھا۔ اسی لیے انھوں نے وطن جانا ملتوی کیا اور اصل کام میں لگ گئے، اگرچہ اقربا کی طرف سے تقاضوں پر تقاضے آ رہے تھے کہ جلد وطن پہنچیے۔

مقامِ محبوبیت

شاہ اسماعیل فرماتے ہیں کہ مجھے بیعت کیے ہُوئے تھوڑے ہی دن گزرے تھے۔ ایک روز شاہ عبدالعزیز کی خدمت والا درجت میں حاضر ہُوا۔ انھوں نے پوچھا کہ میاں! سید کے فیض صحبت سے جو نعمتیں حاصل ہوئیں، ان کی کیفیت بیان کرو۔ میں نے عرض کیا کہ سید عالی تبار کے رتبے کا اندازہ میرے لیے مشکل ہے، البتہ اتنا کہہ سکتا ہُوں کہ خدا نے آپ پر خاص احسان فرمایا، جس کا شکر واجب ہے۔ آپ کو دو علم عطا ہُوئے تھے۔ علم ظاہر کے حامل شاہ عبدالقادر تھے، علم باطن کی وراثت سنبھالنے کے لیے خدا نے سید صاحب

---

[1] یہ آیت ابوالانبیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانِ مبارک پر جاری ہوئی تھی، جنھیں خدا نے بڑھاپے میں پہلے حضرت اسماعیلؑ پھر حضرت اسحاقؑ عطا کیے۔

کو کھڑا کر دیا۔ یہ سُن کر شاہ عبدالعزیز نے اپنے بارے میں کلماتِ عجز کہے، پھر فرمایا:

میاں! یہ بات سمجھنے کے لائق ہے۔ بارگاہ احدیت کے محب بہت ہیں، محبوب کمیاب ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ جناب رسالت مآبؐ حبیب رب العالمین تھے۔

فرمایا: مرتبۂ محبوبیت مرتبہ رسالت کی طرح نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا ہو۔

میں نے عرض کیا: مثلاً محبوب سبحانی سید عبدالقادر جیلانی۔

فرمایا: محبوبیت کا مرتبہ سیّد عبدالقادر جیلانی پر بھی ختم نہیں ہُوا۔ محب ہمیشہ بلاد محنت اور رنج و کلفت میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس کے برعکس محبوبوں کو کوئی تکلیف نہیں دیتا بلکہ ان کی راحت و آرام کو دل و جان سے پسند کیا جاتا ہے۔ رب العالمین کے محبّوں کو اکثر سرگردانی و پریشانی لاحق رہتی ہے، لیکن محبوبان بارگاہ اقدس دنیا میں البسۂ فاخرہ، اطعمۂ لذیذہ اور خدم و حشم سے ممتاز رہتے ہیں اور آخرت میں اس سے بھی زیادہ انعام پاتے ہیں۔

شاہ اسماعیل فرماتے ہیں کہ شاہ عبدالعزیز نے سیّد صاحب کا نام تو نہ لیا، لیکن تمام اشارے بداہتہً آپ ہی کی طرف تھے[1]

"توجہ" کی کیفیت

شاہ اسحاق اور شاہ یعقوب کا بیان ہے کہ شاہ عبدالعزیز جب "توجہ" دیا کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا مہین بوندوں کی پھوار پڑ رہی ہے لیکن سید صاحب کی "توجہ" کا انداز لوہاروں کی دھونکنی جیسا تھا۔ مولانا خواجہ احمد نے شاہ یعقوب سے سُنا کہ سید صاحب "توجہ" دیتے تھے تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل سید صاحب کے قلب صافی سے مضامین معرفت سُن رہا ہے[2]

---

[1] منظورہ صفحہ ۷۱۔ [2] منظورہ صفحہ ۱۷۳۔ میں نے توجہ پر واویں اس لیے لگائے کہ مقصود وہ توجہ ہے جو مصطلح تصوف ہے۔ ہمارے عہد میں یہ مشرب و مذاق بڑی حد تک ختم ہو چکا ہے، اس لیے شاید اس بیان سے عام قارئین محظوظ نہ ہو سکیں، لیکن سید صاحب کی سیرت میں اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا اگرچہ نظیری کا مصرعہ بار بار زبان پہ آ رہا ہے: ز شیوہ ہائے سمند رسپند را چہ خبر

غالباً اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ دہلی کے ایک شخص نے جو "صوفی" کے لقب سے مشہور تھا، سید صاحب کی مخالفت میں نمایاں درجہ حاصل کر لیا۔ بعض اصحاب نے اسے بہت سمجھایا لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ ایک روز رواجِ عام کے مطابق خواجہ حافظؒ کے دیوان سے فال نکالی تو یہ شعر نکلا:

کجاست صوفیِ دجال چشم و ملحد شکل   بگو بسوز کہ مہدیِ دین پناہ رسید

یہ شعر دیکھتے ہی "صوفی" اپنی روش پر سخت نادم ہوا اور اسی وقت سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کر لی۔[۱]

ملاے بخارا کی تربیت

انھیں دنوں میں بخارا سے ایک شخص تحصیل فیوض باطنی کی غرض سے شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسے "ملا بخاری" کہتے تھے۔ سید صاحب بھی شاہ صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ اگرچہ ذکر و شغل اور دعوت اصلاح و ارشاد کے لیے وقف تھے، لیکن ظاہری وضع سپاہیوں کی سی تھی۔ یعنی کٹار اور پستول وغیرہ کمر میں لگے رہتے تھے۔ شاہ صاحب نے ملاے بخارا کو سید صاحب کے سپرد کیا۔ ملا معاً بولا: "حضرت! یہ مردِ سپاہی صورت مجھے کیا تعلیم دے گا؟" ساتھ ہی سید صاحب سے سوال کیا: "آپ نے کون کون سی کتاب پڑھی ہے؟" سید صاحب تو چپ رہے، شاہ صاحب بولے: "بھائی ملا! آپ کو اس بات سے کیا مطلب؟ یہ جان لیجیے کہ میرے پاس رہ کر بارہ برس میں جو کچھ حاصل کرو گے، وہ سید کے پاس رہ کر بارہ دن میں مل جائے گا۔"

ملا صاحب چپ چاپ اُٹھے اور سید صاحب کے قریب اکبر آبادی مسجد کے ایک حجرے میں جا ٹھہرے۔ جو مراد لے کر آئے تھے، چند ہی دن میں حاصل ہو گئی۔ سید صاحب نے بعد میں کئی مرتبہ کہا کہ ہم نے ملا جیسا شائق طالبِ خدا نہیں دیکھا۔ ملا بھی کہا کرتا تھا کہ سید جیسا مرشدِ شفیق کہیں نہ پایا۔
ایک روز کا واقعہ ہے کہ مسجد میں بیٹھے بیٹھے ملا کو قے شروع ہو گئی۔ سید صاحب نے فوراً مٹی کا برتن سامنے رکھ دیا۔ برتن بھر گیا تو اپنا دامن پھیلا دیا۔ نہ ملا کی خدمت چھوڑی، نہ مسجد کا فرش خراب ہونے دیا، نہ کسی اور صاحب کو اس خدمت میں شریک کیا۔ بعد تکمیل سلوک ملا نے وطن جانے کی اجازت چاہی تو ساتھ ہی کہا کہ آپ سے مفارقت قطعاً گوارا نہیں، لیکن کیا کروں، بار بار یہی خیال آتا ہے کہ جو نعمت حاصل کر چکا ہوں اس سے اقربا اور اہل وطن کو بھی فائدہ پہنچاؤں۔ سید صاحب نے

---

[۱] "وحید انی نشتر" صفحہ ۶۵

اسے ایک ٹوپی، کرتا اور پاجامہ دیا، نیز برکت کے لیے ایک روپیہ عنایت فرمایا:

مسجد کی چھت کی صفائی

اکبرآبادی مسجد جب سے بنی تھی، اس کی چھت صاف نہیں ہوئی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ چھت سطح زمین سے بہت بلند تھی اور اس کے اوپر چڑھنا سہل نہ تھا۔ سید صاحب نے ایک روز فیصلہ کر لیا کہ یہ کام بھی ہونا چاہیے۔ چنانچہ دو دو تین تین سیڑھیاں رسّوں سے باندھ باندھ کر اوپر پہنچنے کا انتظام کیا۔ سب سے پہلے خود اوپر گئے۔ پھاوڑے سے کوڑا کرکٹ ڈھیریوں کی شکل میں جمع کیا، پھر ٹوکریوں میں بھر بھر کر نیچے ڈالتے رہے اور صبح سے تیسرے پہر تک چھت بالکل صاف کر دی۔

بھائی کی تشریف آوری

سید صاحب دہلی پہنچ کر اصلاح و تنظیم کے کام میں مصروف ہو گئے۔ اقربا وطن میں انتظار کرتے کرتے تھک چکے تو آپ کے بھائی سید اسحاق اس غرض سے دہلی آئے کہ آپ کو ساتھ لے جائیں۔ بچھڑے ہوئے کم و بیش دس برس گزر چکے تھے۔ سید اسحاق کو قطعاً اندازہ نہ تھا کہ اس مدت میں سید صاحب کمال فضائل اور فضائل کمال کے کس بلند درجے پر پہنچ چکے ہیں۔ جب دہلی میں دیکھا کہ خلق خدا بھائی پر والہ و شیفتہ ہے، خصوصاً ولی اللّٰہی خاندان کے اکابر کی عقیدت کے مظاہرے نظر سے گزرے تو حیران رہ گئے۔ سید صاحب بھائی کے آنے سے پیشتر میرٹھ، مظفر نگر، سہارن پور وغیرہ کے دورے کا انتظام کر چکے تھے اور دورہ ختم کیے بغیر وطن جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ جس کام کو وہ اپنی زندگی کا اہم ترین مقصد سمجھ کر شروع کر چکے تھے، وہ پہلے ہی مرحلے میں معلق رہ جائے، اس لیے ساتھ نہ جا سکے لیکن وعدہ فرما لیا کہ دورے کے بعد آ جاؤں گا۔ سید اسحاق نے اپنے ساتھی محسن خاں کو اس خیال سے سید صاحب کے پاس چھوڑا کہ بعد اختتام دورہ انھیں اصرار سے وطن لائے اور خود واپس چلے گئے۔ انھیں یقین تھا کہ بھائی کے ساتھ رفقا کی بڑی جماعت ہو گی اور ان کی مہمان داری کے انتظامات خاص اہتمام کے محتاج تھے۔ سید صاحب نے رخصت کے وقت ساٹھ روپے اور ایک کاٹھیا واڑی بچھیرا بھائی کی نذر کیا[1]

سید اسحاق کا بیان

سید اسحاق دہلی سے لکھنؤ پہنچے تو وہاں خاندان کے کئی افراد بسلسلہ ملازمت موجود تھے۔ انھوں نے سید صاحب کا حال پوچھا۔ سید اسحاق نے فرمایا:

---

[1] وقائع ص ۴۲

آج سید احمد کو وہ رتبہ حاصل ہے کہ میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ اپنی عمر میں نہ میں نے اس رتبے کا آدمی دیکھا ہے اور نہ سنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی عنایت بے غایت سے ایسا علم باطنی عطا فرمایا ہے کہ تمام علماء فضلائے دہلی ان کی طرف رجوع ہیں اور ان کی تقریر کے آگے دم نہیں مار سکتے۔ ہم سے مولویوں کا تو کیا شمار کہ ان کے آگے بولیں اور لب چون و چرا کھولیں[1]

یہ اس بزرگوار کی شہادت تھی، جو اپنے عہد میں بلحاظ علم و فضل علم اللّٰہی خاندان کا ممتاز ترین فرد تھا۔ اقربا نے سمجھا کہ بھائی، بھائی کی ستائش میں سخن طرازی کر رہا ہے۔ سید اسحاق یہ کیفیت چہروں سے بھانپ گئے تو فرمایا:

> "میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں۔ حقیقت یوں ہی ہے، اگرچہ وہ آپ لوگوں کے فہم میں نہ آئے۔ سید احمد آئیں گے اور انھیں دیکھو گے تو جانو گے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ حرف بحرف درست ہے۔

جماعت اور اس کے مصارف

بیعت شروع ہونے کے تھوڑے دن بعد سید صاحب کے پاس مخلصوں کی ایک جماعت فراہم ہو گئی۔ یہ لوگ ہر وقت آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے کھانے پینے اور پہننے کا انتظام آپ نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ یہ اس تنظیم کی ابتدا تھی جس کے لیے آپ اپنی زندگی وقف کر چکے تھے۔

آپ کے خادم خاص میاں دین محمد کہتے ہیں کہ جاڑے کا موسم آیا تو حکم ہوا کہ میرے لیے ایک سفید دگلا، دو سپید دوہریں، دو سرمئی میرزائیاں، ایک لبادہ، دو سرمئی پگڑیاں اور چار جوڑے کپڑے (یعنی کرتے اور پاجامے) بنوا دو۔ جو بیس تیس لوگ ہمارے ساتھ ہیں، ان کے لیے جڑاول تیار کراؤ۔ ان سے دریافت کر دیکھو، جو چاہے، ایک ایک دگلا اور ایک ایک دوہر بنوا لے، جو چاہے ایک ایک میرزائی اور ایک ایک لحاف تیار کرا لے۔ اکثر اصحاب نے دوہریں اور دگلے بنوائے، بعض نے میرزائیاں اور لحاف پسند کیے۔ ان چیزوں کی تیاری پر اسی روپے صرف ہوئے[2]۔

میاں دین محمد اور میاں عبد اللہ اس زمانے میں تمام انتظامات پوشش و خورش کے ذمہ دار تھے۔ روپیہ انھیں کے پاس جمع رہتا تھا۔ بعض اوقات سید صاحب کو قرض لینے کی بھی ضرورت پڑ جاتی تھی۔ مثلاً ایک موقع پر آپ اپنے ایک دوست شاہ میر سے دو سو روپے قرض لائے[3]۔ پھر نذر کے روپے آئے تو رقم واپس کر دی۔

---

[1] وقائع صفحہ ۴۰ - [2] وقائع صفحہ ۴۵ - [3] وقائع صفحہ ۴۴

گیارھواں باب

دوآبے کا دورہ اور مراجعتِ وطن

طلبی کے خطوط

جو لوگ بیعت کر چکے تھے، وہ جہاں جہاں گئے۔ سید صاحب کے لیے محبت و عقیدت کی عام حرارت پیدا ہو گئی۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ سب طالبانِ حق دہلی نہ پہنچ سکتے تھے، اس لیے طلبی کے خطوط آنے لگے۔ یہ خطوط زیادہ تر میرٹھ، مظفر نگر اور سہارن پور سے آئے تھے۔ سید صاحب نے شاہ اسماعیل کی وساطت سے خطوط شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں پہنچائے اور پوچھا کہ کیا حکم ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ ضرور جائیے۔ رخصت کے وقت اپنا خاص لباس عنایت فرمایا، جو سفید رنگ کا تھا۔ صرف دستار سیاہ تھی[1]۔

اس طرح اس علاقے کے دورے کا فیصلہ ہوا، جسے میں نے دوآبہ کہا، اس لیے گنگا اور جمنا کے مابین ہونے کی وجہ سے وہ ہمیشہ دوآبے کے نام سے موسوم رہا۔ دورے میں سید صاحب کے پیشِ نظر دو مقصد رہے: اوّل مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح، دوم اس بات کا اندازہ کہ دعوتِ جہاد کی پذیرائی کے امکانات کا کیا حال ہے۔ اسی پر ان کے پورے نقشۂ عمل کی کامیابی کا انحصار تھا۔

دورے کی عام کیفیت

اس دورے میں کم و بیش چھ مہینے صرف ہوئے[2]۔ جن مقامات پر سید صاحب گئے، ان میں سے معروف یہ ہیں: غازی الدین نگر (غازی آباد)، مراد نگر، میرٹھ، سردھنہ، کاندھلہ، بڑھانہ، پھلت، مظفر نگر، دیوبند، گنگوہ، نانوتہ[3]، تھانہ بھون، رام پور لہاری، سہارنپور[4]، رینیٹھہ، متعدد کم معروف اور چھوٹے چھوٹے مقامات کے نام بھی روایتوں میں آتے ہیں مثلاً: شکارپور، ایسوبی، داتئل، تولی، پاٹلی، ایڑنی، کھروی، بسوالی، چولی، بھوپاڑی، شیخ پورہ، اطیا، سوبری، لاکہ نور، چل کانہ، بھٹر سود۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں جن کے ناموں کی صحت کے بارے میں بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ بعض روایتوں میں نگینہ اور

---

[1] مخزن احمدی صفحہ ۳۹ - [2] وقائع صفحہ ۷۴ - [3] تذکرۃ الرشید صفحہ ۲۷۲ - [4] لونی کی مسجد

شیرکوٹ کے نام سے بھی آئے ہیں۔ مجھے اب تک ان کی صحت میں تامل ہے۔

رفقائے سفر

سید صاحب دہلی سے روانہ ہوئے تھے تو کم و بیش بیس آدمی ساتھ تھے۔ بعض کے نام بھی مذکور ہیں مثلاً: حافظ قطب الدین، شیخ ولی محمد، شیخ صلاح الدین، (تینوں پھلت کے) شادل خاں کنجپوری، حسن شاہ پنجابی، سید ظہور احمد نگرامی، شیخ پیر الہ آبادی، میاں عبداللہ، مولوی محمد حسن، پیر محمد حجام اور محسن خان (دونوں رائے بریلی کے) میاں دین محمد، جو سید صاحب کا خادم خاص تھا، ساتھ نہیں گیا تھا۔ بعد میں اُسے پیغام بھیج کر بلایا گیا تھا۔ مولانا عبدالحی اور شاہ اسماعیل دہلی سے سیدھے بڑھانہ چلے گئے تھے۔ انھیں حکم ہُوا تھا کہ بڑھانہ ہی میں انتظار کریں۔ مولوی محمد یوسف کو بھی غالباً براہ راست پھلت بھیج دیا گیا تھا۔

موسم

دورہ یقیناً سردیوں میں ہُوا۔ میرے اندازے کے مطابق سید صاحب نومبر ۱۸۱۸ء میں دہلی سے نکلے اور مئی میں واپس ہُوئے۔ پھر مئی کے اواخر میں رائے بریلی روانہ ہو گئے۔ دورے کے سلسلے میں جو روایتیں میری نظر سے گزریں، اُن میں سے بعض میں گُڑ بنانے کا ذکر آیا ہے اور گُڑ عموماً سردیوں ہی میں بنایا جاتا ہے۔ "وقائع" کی ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ سید صاحب محرم ۱۲۳۴ھ میں سہارن پور میں تھے۔ نیز پورے دورے کو دورۂ سہارن پور بتایا گیا ہے۔ میں اس کا مطلب یہ سمجھتا ہُوں کہ سید صاحب محرم ۱۲۳۴ھ میں دورہ شروع کر چکے تھے اور خاصی مدت مختلف مقامات میں گزار کر سہارن پور پہنچے۔

مختلف مقامات میں مدت قیام

میری معلومات کے مطابق مختلف مقامات میں قیام کی مدت یہ تھی:

غازی آباد	پانچ دن
میرٹھ	پندرہ دن
بڑھانہ	بارہ دن
پھلت	سترہ دن
دیوبند	دس دن

اکثر مقامات میں ایک ایک دو دو راتیں ٹھہرے۔ سرودھنہ میں تین دن رہے۔ سہارن پور میں بھی خاصی مدت گزاری۔

قابل ذکر واقعات

دورے کے قابل ذکر واقعات کا خلاصہ یہ ہے:

۱ - دہلی سے نکلے اور جمنا کو عبور کر کے ایک منزل راستے میں کی۔ غازی آباد میں قریباً دو سو آدمیوں نے استقبال کیا۔ پہلے دن صرف چار آدمیوں نے بیعت کی: حافظ عبد اللہ امام مسجد، شیخ عبد الرحمٰن، شیخ رمضان اور عبد الشکور خاں۔ پھر طلبگاران فیض کا اتنا ہجوم ہوا کہ سید صاحب کو پانچ روز تک ذرا سی دیر آرام کی مہلت بھی نہ مل سکی۔ ہری رام کشمیری وہاں تحصیلدار تھا۔ وہ بھی عوام کے جوش عقیدت سے اس درجہ متاثر تھا کہ نیاز مندانہ حاضر ہوا، اور شیرینی کے علاوہ کچھ رقم بھی بطور نذر پیش کی۔

۲ - مراد نگر میں مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے صاحبزادے مولوی ابو القاسم تھانیدار تھے۔ وہ برقندازوں سمیت بیعت سے مشرف ہوئے۔

۱ - میرٹھ کے قاضی احمد اللہ (ابن قاضی حیات بخش) پچاس آدمیوں کے ساتھ استقبال کے لیے کئی میل باہر پہنچے ہوئے تھے اور چار روز سے اسی طرح انتظار کر رہے تھے۔ وہاں پہلے سے اکابر نے باری باری دعوتوں کا بندوبست کر رکھا تھا۔ جب معلوم ہوا کہ سید صاحب زیادہ دن نہ ٹھہریں گے تو بیعت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بیعت کرنے والوں میں سے ممتاز اصحاب یہ تھے: داروغہ محمد راحم، منشی محمدی انصاری بردوانی، مولوی محمد بخش (پندرہ متوسلین کے ساتھ)، مولوی خدا بخش، قدن خان، صدر الدین اور ان کے بھائی کریم بخش روٹی والے، محمد تقی قصاب، جو انگریزی فوجوں میں گوشت کا بڑا ٹھیکیدار تھا۔ بعض شیرینی، پارچات اور نقد کے کئی کئی خوان نذر میں پیش کیے۔ سید صاحب میرٹھ سے چلے تو اکثر اصحاب زار زار رو رہے تھے۔ یہ دیکھ آپ بھی آبدیدہ ہو گئے۔

۴ - سردھنہ میں پچیس آدمی پیشوائی کی غرض سے راستے پر کھڑے تھے۔ سید صاحب سرائے میں ٹھہرے۔ سینکڑوں نے بیعت کی۔ ممتاز اصحاب یہ تھے: شیخ بلند بخت دیوبندی، منشی خواجہ محمد، حسن پوری، حافظ امان اللہ، بھتے خاں نصر اللہ، پیر خاں، داراب خاں، ان میں سے بعض نے سید صاحب کے زیر قیادت جہاد میں عظیم الشان کارنامے انجام دیے۔ سپاہیوں نے دعوتِ طعام پر اصرار کیا تو فرمایا: اس شرط پر منظور کرتا ہوں کہ جو کچھ میں کہوں، پکایا جائے۔ انھوں نے مان لیا۔ فرمایا: جو کی روٹی اور ماش کی دال کھاؤں گا۔ ایسی دعوت میں امیر غریب سب شریک ہو سکتے ہیں۔

بڑھانہ اور مہلت طلب فیض کی بے تابیوں کا یہ حال تھا کہ جدھر سے گزر ہوتا، آس پاس

کے دیہات سے لوگ جوق در جوق راستے پر آ بیٹھتے اور انتہائی شوق و الحاح سے عرض کرتے کہ کم از کم ایک وقت کی دعوت قبول فرما لیں۔ سید صاحب دعائے خیر فرماتے اور عذر کر دیتے۔ بعض مقامات پر عذر سے کام نہ چلا اور مجبوراً تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے رکنا پڑا۔ بڑھانہ میں مولانا عبدالحی کے ہاں قیام کیا۔ مولانا شاہ اسماعیل، مولوی محمد یوسف، مولوی وحید الدین، شیخ سعدالدین، شیخ علاؤالدین پہلے سے موجود تھے۔ میانجی نظام الدین چشتی، شیخ محمد حسن اور دوسرے اکابر نے بھی دعوتیں کیں۔ لیکن زیادہ تر مولانا عبدالحی ہی کے ہاں کھانا پکتا رہا۔ وہ ہر روز غایت درجہ تکلف کرتے۔ سید صاحب تکلف سے روکتے تو کہتے: حضرت! آپ کی معمولی سی آسایش کے لیے میرا گھر بھی بک جائے تو اسے سعادت سمجھوں گا۔ ان کے صاحبزادے عبدالقیوم کم سن تھے۔ مولانا نے ان سے بھی تیمن کے طور پر بیعت کرائی۔

پھلت میں سید صاحب شیخ ولی محمد کے مکان پر ٹھہرے۔ یہ مکان شیخ صاحب کے عم حقیقی کمال الدین کا تھا، جن سے شاہ اسماعیل کی ہمشیرہ بی بی رقیہ کا پہلا نکاح ہوا تھا۔ حافظ کمال الدین کے دادا شاہ اسماعیل کے حقیقی نانا تھے۔ جن اصحاب نے دعوتیں کیں، ان میں سے قابل ذکر یہ ہیں: شیخ ولی محمد کے والد شیخ محمد فضیل، شیخ غلام محمد، محمد عارف، حافظ غلام علی؛ حافظ معین الدین، حافظ احمد الدین، عبدالعلی، حافظ محمد عثمان (برادر مولوی محمد یوسف) یہی ایک مقام ہے جہاں کے متعلق روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ سید صاحب روزانہ ورزش کرتے تھے پھر بازوؤں اور شانوں پر مالش کراتے تھے۔ بعض روایتوں میں تیر اندازی کی مشق کا بھی ذکر ہے۔ کیا ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ پھلت پہنچنے تک سید صاحب کو دعوت جہاد کی پذیرائی کے لیے فضا کی سازگاری کا اندازہ ہو چکا تھا، لہٰذا اصلاح عقائد اور تزکیہ باطن کے ساتھ ساتھ استعداد جہاد کا کام بھی شروع کر دیا گیا؟

باقی مقامات

پھلت سے نکلے تو مظفر نگر ہوتے ہوئے دیوبند پہنچے۔ دیوبند ہی سے انبیٹھ گئے۔ ان مقامات میں قاضی نجم الدین نے پندرہ آدمیوں کے ساتھ، میر سید مقبول، مولوی شمس الدین، قاضی عظیم اللہ، شیخ رجب علی، ان کے فرزند منوّر علی، حافظ عبداللہ، ان کے بھائی نظام الدین اور کریم الدین، ان کے والد امام بخش، کرامت حسین، محمد ماہ، شیخ چاند، مولوی فرید الدین، مولوی بشیر اللہ، سید محمد حسین وغیرہ اصحاب نے بیعت کی۔ گنگوہ میں مُلّے کی سرائے میں قیام فرمایا تھا۔[1] نانوتہ میں جامع مسجد میں ٹھہرے تھے۔ ایک ارادت مند کا بیان ہے، میری آنکھوں میں اب تک وہ منظر پھر رہا ہے کہ

---

[1] ارواح ثلاثہ صفحہ ۱۰۹۔ ایک روایت ہے مولانا محمد قاسم کے خسر میاں وجیہ الدین نے بھی سید صاحب کی دعوت کی تھی۔

سید صاحب جامع مسجد کے وسطی در میں کھڑے ہیں۔ اپنی دستار اتار کر ایک سرا اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور باقی دستار کو دونوں جانب سے طالبانِ فیض نے تھام لیا ہے۔ دستار کی شکل کھجور کی سی معلوم ہوتی تھی[1]۔ انبیٹھہ میں میاں صابر بخش سجادہ نشین شاہ ابوالمعالی کے یہاں دعوت ہوئی تھی[2]۔

سہارن پور میں سید صاحب مسجد ابوبنی میں ٹھہرے تھے۔ یہیں شاہ عبدالرحیم ولایتی سے ملاقات ہوئی۔ وہ بڑے پیر مانے جاتے تھے۔ سید صاحب کو دیکھا تو خود بھی بیعت کی اور مریدوں کو بھی بیعت کا حکم دیا۔ فرمایا کرتے تھے: ہمیں نہ نماز پڑھنی آتی تھی، نہ روزہ رکھنا آتا تھا۔ سید صاحب کی برکت سے ہم دونوں کام سیکھ گئے[3]۔ اس مقام پر دوسرے اصحاب کے علاوہ قصاب اور نورباف بہ تعداد کثیر فیض یاب ہوئے۔ مولوی شاہ رمضان رڑکی والے بھی سہارن پور میں بیعت ہوئے تھے۔ وہ بھی مجاہدین کا ایک قافلہ لے کر سرحد پہنچے تھے۔ سہارن پور کے تحصیلدار دھونکل سنگھ نے بھی سید صاحب کی دعوت کی تھی۔ کاندھلہ میں مفتی الٰہی بخش اور ان کے صاحبزادے بیعت ہوئے۔ مولوی محمد زکریا ابن مولوی عبدالخالق ابن مولوی شمس الدینؒ "شریعت کے لٹھ" کے مصنف کی حیثیت میں بہت مشہور ہیں۔ انھوں نے پہلے سید صاحب کی ہجو میں شعر کہے۔ پھر بیعت ہوئے۔ بیعت کرنے والوں میں ایک مولوی محمد حسین بھی تھے جو قاضی علاؤالدین بگھروی کے بھائی تھے اور ایک سو دس سال کی عمر پائی۔

دورے پر تبصرہ

دورے سے مراجعت کے سفر کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ یہ دورہ بظاہر پیروں اور پیرزادوں کا سا تھا یعنی سید صاحب مریدوں کی ایک جماعت کے ساتھ شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ پھرتے رہے۔ ہر مقام پر دعوتیں بھی ہوئیں۔ توبہ و ارشاد کی بیعت بھی لی جاتی تھی۔ عام پیروں کی طرح حلقے بنا کر "توجہ" بھی دی جاتی تھی، لیکن بعض خصوصیات میں یہ دورہ، عام پیرزادوں کے دورے سے بالکل مختلف تھا۔ مثلاً باقاعدہ وعظ کہے جاتے تھے، جن میں بدعات و محدثات کے رد و ازالہ پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ اسلامی احکام کے فضائل ایسے انداز میں سنائے جاتے تھے کہ جو سنتا دل و جان سے انھیں قبول کر لیتا۔ ان رسموں کو پورے اہتمام سے ختم کیا جاتا تھا، جو مدت تک غیر مسلموں کی صحبت میں رہنے کے باعث مسلمانوں میں بھی سرایت کر گئی تھیں۔ غیر اسلامی نام بھی بدل دیے گئے، مثلاً امام بخش کا نام بدل کر امام الدین رکھ دیا گیا۔ خود سید صاحب کی توجہ اس درجہ پُرتاثیر تھی کہ اکثر لوگ ایک ہی مرتبہ آپ کے حلقے میں بیٹھ کر دینی شیفتگی کے پیکر بن گئے۔

---

[1] ارواحِ ثلاثہ [illegible]

غرض سید صاحب کے قدم جہاں جہاں پہنچے، رحمتِ ایزدی کی بارش سے ارواح و قلوب کی بنجر زمینیں شاداب و سیر حاصل بن گئیں۔ مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (شیخ الہند مولانا محمود حسن مرحوم کے والد ماجد) فرماتے تھے کہ سید صاحب جن قصبات میں تشریف لے گئے، وہاں اب تک خیر و برکت ہے۔ گویا وہ ایک نورِ مستطیل تھے کہ جدھر گئے وہ پھیل گیا۔ ایک اور بزرگ مولانا محمد حسین فرماتے ہیں:

> جہاں جہاں حضرت کے قدم گئے وہاں وہاں خیر و برکت کے آثار پائے جاتے ہیں۔

اصل مدعا

اصل مدعا بہرحال یہی تھا کہ اصلاحِ عقائد و اعمال کا پیغام پہنچایا جائے۔ ساتھ ساتھ یہ دیکھا جائے کہ مسلمان اس بڑے کام کے لیے کس حد تک مساعدت پر آمادہ ہیں جو بدءِ شعور سے سید صاحب کے قلب و روح میں ایمان کی طرح متمکن تھا، یعنی اغیار کے تسلط کو ختم کرنے کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کا آغاز اور حکومتِ اسلامیہ کی تاسیس۔ اس نقطۂ نگاہ سے بھی سید صاحب کا دورہ بہ ہمہ وجوہ کامیاب رہا۔ اسی طریقے پر دعوتِ احیاءِ اسلامیت دیتے ہوئے وہ رائے بریلی پہنچے۔ پھر اسی رنگ میں انھوں نے الٰہ آباد، بنارس، کان پور، لکھنؤ وغیرہ کے اطراف میں دورے کیے، یہاں تک کہ فداکارانِ اسلام کی ایک قدوسی جماعت تیار ہو گئی اور مستقلاً جہاد کا آغاز ہو گیا

بعض اصحاب سے معلوم ہوا کہ شاہ عبدالعزیز نے دوآبے کے دورے سے پیشتر جگہ جگہ بھی لکھ دیے تھے اور پیغام بھی بھیج دیے تھے کہ سید صاحب ہمارے آدمی ہیں، ان کی تواضع میں کوتاہی نہ ہو۔ یہ یقیناً درست ہو گا، اس لیے کہ دورہ شاہ عبدالعزیز کے مشورے سے شروع ہوا تھا، لیکن مختلف مقامات پر خدمتِ دین اور شیفتگیِ اسلامیت کا جو جذبۂ صادقہ پیدا ہوا، وہ خدا کے فضل و کرم کے بعد صرف سید صاحب کی روحانی برکات اور والہیتِ احیائے اسلامیت کا کرشمہ تھا۔ شاہ عبدالعزیز کے خطوط و پیغامات مختلف حلقوں میں شناسائی کا ذریعہ ضرور بن سکتے تھے، لیکن دل افروز نتائج و ثمرات صرف سفارشوں سے پیدا نہیں ہوتے۔

قصدِ وطن

دورہ ختم کر کے دہلی پہنچے تو وطن جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اقربا سے بچھڑے ہوئے دس برس گزر چکے تھے اور سید صاحب اپنے بھائی سے وعدہ کر چکے تھے کہ دورے سے واپس ہوتے ہی آ جاؤں گا۔ سید اسحاق عزیز بھائی کے ساتھیوں کے لیے مہمانداری کے انتظامات کر دیے تھے کہ اچانک بیمار ہوئے اور ۷۔ جمادی الاخریٰ ۱۲۳۴ھ (۳۔ اپریل ۱۸۱۹ء) کو رہگرائے عالم بقا ہو گئے۔ اس زمانے میں سید عبدالرحمٰن ہمشیر زادۂ سید صاحب کے سوا اقربا میں سے گھر پر کوئی موجود نہ

---

[1] یہ بیانات مولانا سید عبدالحی بریلوی کی کتاب "ارمغانِ احباب" سے ماخوذ ہیں

تھا۔ سید عبدالرحمٰن ہی نے کفن دفن کا انتظام کیا۔ سید صاحب کو اس لیے فوراً خبر نہ بھیجی گئی کہ سب کو پہلے سے ان کی آمد کا یقین تھا۔

دہلی سے روانگی کی صحیح تاریخ معلوم نہیں، مہینا یقیناً شعبان کا تھا۔[۱] ساتھ کم سے کم پچاس اور زیادہ سے زیادہ بہتر تہتر آدمی ہوں گے۔[۲] دریاے جمنا کو عبور کر کے آگے بڑھے تو پہلے سخت آندھی آئی۔ پھر بارش شروع ہو گئی۔ ہندون ندی پر پہنچے تو اس میں سیل آ گیا۔ رات کی تاریکی میں عبور کو قرین احتیاط نہ سمجھا گیا، اس لیے رات ندی کے کنارے پر گزاری۔ دوسرے دن غازی آباد پہنچ کر مسجد میں اُترے جس کا امام، حافظ عبداللہ، آپ کا مرید تھا۔

سید اسحاق کے انتقال کی خبر

رات کا کھانا ابھی کھایا نہیں تھا کہ راے بریلی سے بھگوان نام ایک قاصد پہنچا۔ اس کے ساتھ ایک خط تھا۔ سید صاحب نے لے کر تھوڑا سا پڑھا۔ پھر لپیٹ کر پیر مبارک علی مصطفیٰ آبادی کو دے دیا اور تاکید فرما دی کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کیا جائے۔ آپ کا چہرہ خط پڑھتے ہی متغیر ہو گیا تھا۔ جب کھانے سے بھی انکار کر دیا تو ارادت مندوں نے وجہ پوچھی۔ اس وقت بتایا کہ بھائی فوت ہو گئے۔ یہ سنتے ہی سب رونے لگے، اس لیے بھی کہ سید اسحاق، سید صاحب کے بھائی تھے، اس لیے بھی کہ بلند پایہ عالم اور نیک کردار بزرگ تھے۔ چونکہ دہلی میں تعلیم پائی تھی، اس لیے شاہ ولی اللہ کے خاندان سے فیض یاب علم ہونے والے اکثر اصحاب کے ساتھ ان کے گہرے تعلقات تھے۔ محسن خاں، جسے سید اسحاق دہلی سے جاتے وقت سید صاحب کے پاس چھوڑ گئے تھے، ڈھاڑیں مار مار کر رویا۔ سید صاحب نے کمال ضبط سے فرمایا: "بھائی صبر کر، اللہ تعالیٰ انھیں بخشے۔" آخر شاہ اسماعیل نے سید صاحب سے عرض کیا کہ جب تک آپ کھانا نہ کھائیں گے، ساتھیوں میں سے بھی کوئی نہ کھائے گا۔ چنانچہ

---

[۱] ایک روایت میں ہے کہ ہفتے کے دن روانہ ہوئے۔ ایک دن پہلے یعنی جمعہ کو شاہ اسماعیل کے ہاں کھانے کی دعوت تھی۔ سید صاحب دہلی سے راے بریلی گئے تو زیادہ تر مقامات میں صرف ایک ایک رات ٹھہرے غالباً رام پور میں زیادہ قیام کیا۔ پورے سفر میں بیس پچیس دن سے زیادہ مدت نہ لگی ہوگی۔ رمضان کے چاند کی رات راے بریلی پہنچ گئے تھے۔ شعبان ۱۲۳۶ھ میں ہفتے کا دن ۴، ۱۱، ۱۸ اور ۲۵ کو تھا: غالباً وہ ۴۔ شعبان (۲۹ مئی ۱۸۲۱ء) کو روانہ ہوئے ہوں۔ میں اسی کو درست سمجھتا ہوں۔ [۲] مخزن احمدی: ہفتاد و دو کس۔ وقائع: کم یا زیادہ پچاس آدمی۔

آدھی رات کے قریب آپ نے چند نوالے کھائے۔[۱]

غازی آباد سے چلے تو ہاپوڑ، گڑھ مکتیشر، امروہہ اور مراد آباد ٹھہرتے ہوئے رام پور پہنچے اور حاجی زین العابدین کے مکان پر ٹھہرے۔ وہاں تین چار دن یا اس سے بھی زیادہ قیام فرمایا۔

طریقۂ محمدیہ

ہندوستان میں اس وقت تصوف کے تین ہی طریقے عام طور پر رائج تھے: قادری، چشتی اور نقشبندی۔ نقشبندی طریقے کا ایک سلسلہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی سے انتساب کے باعث طریقہ مجددیہ کہلاتا تھا۔ سید صاحب ان طریقوں کے علاوہ "طریقہ محمدیہ" میں بھی بیعت لیتے تھے۔ رام پور میں اس طریقے کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

طریقہ محمدیہ یہ ہے کہ زندگی کا ہر کام صرف خدائے رب العالمین کے لیے کیا جائے مثلاً محنت کا مقصد یہ ہو کہ انسان حلال روزی کما کر خود بھی کھائے اور اہل و عیال کو بھی کھلائے۔ استراحتِ شب کا مدعا یہ ہو کہ انسان جوفِ لیل میں اٹھ کر نماز تہجد ادا کرے اور نماز فجر اول وقت پڑھے۔ کھانا اس لیے کھایا جائے کہ جسم میں بقدرِ ضرورت طاقت بحال رہے تاکہ انسان خدا کے احکام مستعدی سے بجا لائے۔ نماز پڑھے، روزے رکھے، حج کے لیے جائے۔ ضرورت پڑے تو جہاد کے لیے تیار ہو۔ غرض چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، کھانے پینے میں مقصود احکام خداوندی کی بجا آوری اور مرضاتِ باری تعالیٰ کی پابندی کے سوا کچھ نہ ہو۔ بہ الفاظِ دیگر ہر فرد آیۂ مبارکہ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ کا عملی نمونہ بن جائے۔

رام پور میں اس مرتبہ جن اکابر نے بیعت کی، ان میں نواب احمد علی والی رام پور بھی تھے۔

سکھوں کے ساتھ جہاد کا معاملہ

بعض سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ رام پور میں افغانوں نے آپ کو مسلمانوں کے ظلم و ستم کی داستانیں سنائی تھیں اور یہ داستانیں سن کر آپ نے سکھوں کے خلاف جہاد کا فیصلہ کر لیا۔ یہ محض سوانح نگاروں کے تخیل کا کرشمہ ہے۔ سید صاحب اس سے بہت پہلے جہاد کا پختہ فیصلہ کر چکے تھے اور اس کی غرض و غایت یہ تھی کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کریں۔ رام پور میں سکھوں کے ظلم کی کہانیاں ضرور سنی ہوں گی؛

---

[۱] میر اخبار میں ہے کہ ابتدا میں قاصد اس لیے نہ بھیجا گیا کہ سب کو آپ کے آنے کا انتظار تھا۔ جب قریباً دو مہینے منتظر رہ گئے تو اطلاع بھیجی گئی اور قاصد غازی آباد میں سید صاحب سے ملا۔

[۲] گڑھ مکتیشر کی مسجد میں اترے تھے۔ امروہہ اور مراد آباد میں سرائے میں ٹھہرے۔ ایک روایت کے مطابق مراد آباد میں ایک مجذوب سے بھی ملے تھے اور ایک دن شکار بھی کھیلا تھا۔

لیکن جہاد کا فیصلہ ان کہانیوں کی سماعت پر مبنی نہ تھا۔ سید صاحب کے نزدیک جہاد کا پہلا ہدف انگریز تھے، جو ہندوستان کے بہت بڑے علاقے پر قابض ہو چکے تھے۔ سکھوں سے بھی جہاد ضروری تھا، لیکن وہ انگریزوں سے پہلے نہیں آتے تھے۔ ان سے آغاز جہاد اس لیے ہوا کہ سید صاحب نے جو مرکز تجویز فرمایا تھا، اس میں سکھ سب سے پیشتر سامنے آ گئے۔ اس مسئلے پر مفصل بحث ان ابواب میں ملے گی، جن میں سید صاحب کا موقف جہاد واضح کیا گیا ہے۔

رائے بریلی میں

رام پور کے بعد ایک مقام راستے میں ہوا۔ پھر سید صاحب بانس بریلی پہنچ کر جامع مسجد میں ٹھہر گئے۔ بریلی کے نواب کو علم ہوا تو وہ بہ اصرار اپنے مکان پر لے گیا اور مع متعلقین بیعت کی۔ دوسرے اصحاب بھی بیعت سے مشرف ہوئے، جن میں سے[1] ایک حسینی مخنث تھا۔ سید صاحب نے اس کا نام ہدایت اللہ رکھا۔ یہ حج و جہاد میں ساتھ رہا۔ اکوڑے کی جنگ میں اس نے چھ سات دشمنوں کو برچھی سے مارا تھا۔ اس کا ایک اور بھائی امامی نام تھا جو نابینا ہو گیا تھا۔ بعد کی منزلوں میں سے شاہ جہان پور میں قیام کا ذکر صاحب انوار العارفین نے مجملاً کیا ہے۔ وہاں اس زمانے میں خلیل شاہ نام ایک بزرگ تھے۔ صاحب انوار العارفین لکھتے ہیں: در آں زمانہ کہ جناب سید احمد از دہلی در شاہ جہان پور تشریف بردند، مولوی اسماعیل و آنجناب (سید صاحب) برائے ملاقاتِ ایشاں (خلیل احمد شاہ) آمدند۔

اس سلسلے میں سید صاحب کی صحبت کے اثرات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں، خاص و عام کے دل میں ایسی ہمت پیدا کر دی کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں سے بھائی نے بھائی کو، بیٹے نے ماں باپ کو، باپ نے بیٹے اور بیٹی کو، شوہر نے بیوی کو چھوڑا اور سب آپ کے ساتھ ہو گئے۔

آگے کے مقامات کا پورا حال معلوم نہ ہو سکا۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ جس شام کو رائے بریلی رمضان المبارک کا ہلال دیکھا گیا۔ اسی شام کو برکات اسلامی کا یہ بدر منیر دس برس کے بعد وطن مالوف کی فضا میں جلوہ افروز ہوا، یعنی شعبان کی انتیسویں تاریخ اور جون ۱۸۱۹ء کی تیئسویں تاریخ کو۔

---

[1] محسن خاں نے اس کا نام رمضانی بتایا ہے۔

بارھواں باب

رائے بریلی میں زندگی

چھبّیس مہینے کی سرگرمیاں رائے بریلی پہنچنے کے بعد سے حج کے لیے روانہ ہونے تک سید صاحب نے دو برس اور دو مہینے (شعبان ۱۲۳۴ھ کی آخری تاریخ سے شوال ۱۲۳۶ھ کی آخری تاریخ تک) اصلاحی اور تبلیغی سرگرمیوں میں گزارے۔ مثلاً:

۱۔ اطراف و جوانب میں دورے کیے۔

۲۔ ملت کے مختلف طبقوں اور افراد کی باہمی کشمکش کو مٹا کر ان کے درمیان محبت و یک جہتی کے تعلقات استوار کیے۔

۳۔ غیر مشروع معاشرتی رسوم اور بدعات و محدثات کو مٹایا۔

۴۔ رفیقوں اور ارادت مندوں کو جہاد کے لیے تیاری پر بہ طور خاص متوجہ کیا۔

۵۔ متفرق اصلاحی اور دینی کاموں کو پایۂ تکمیل پر پہنچایا۔

ان سرگرمیوں میں سے بعض کی تاریخیں معلوم ہیں۔ اکثر کا وقت متعین کرنے کے لیے کوئی قرینہ بھی نہ مل سکا، لیکن یہ یقینی ہے کہ مندرجہ بالا تمام کام اسی چھبّیس مہینے کی مدت میں انجام پائے۔ ہم انھیں مختلف ابواب میں بیان کریں گے۔

عام کیفیت سید صاحب کے ساتھ بہ روایات مختلف پچاس یا بہتر آدمی دہلی سے آئے تھے۔ پندرہ سولہ آدمی گھر کے تھے۔ جن کا نان و نفقہ خود سید صاحب کے ذمے تھا۔ پھر بیعت کے لیے بہ کثرت آدمی آتے رہتے تھے۔ اور روزانہ کھانا کھانے والوں کا اوسط ایک سو سے کم نہ ہوگا۔ عین اسی زمانے میں قحط پڑ گیا اور غلہ بہت گراں ہو گیا[1]۔ سید صاحب نہ کسی ریاست کے مالک

---

[1] "مخزن احمدی" صفحہ ۴۰۔ بعض سوانح نگاروں نے اسے سنہ ۱۸۶۱ بکرمی کا قحط قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ قحط ستر برس پہلے گزر چکا تھا۔ مجھے کسی ایسے قحط کا سراغ نہ مل سکا جو ۱۸۳۷-۳۸ء میں صوبجات متحدہ غرب و شمال کے بڑے حصے میں پھیلا ہو۔ ممکن ہے یہ مقامی قحط ہو۔ سید محمد علی صاحب "مخزن احمدی" نے اسے "بلائے قحط غلائی بہ شدت" سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غلہ روپے کا پانچ سیر ملتا تھا۔ اس مرحوم کو کیا معلوم تھا کہ ایسا زمانہ بھی آئے گا۔ الٰہی ہے جب روپے کا پانچ سیر غلہ انتہائی فراخی کا نرخ بن جائے گا۔

تھے، نہ جاگیردار تھے کہ اتنے آدمیوں کے کھانے کا بوجھ مستقل طور پر برداشت کرسکتے۔ تاہم وہ کبھی دل تنگ نہ ہوئے۔ جو کچھ پکتا، سب کو برابر بٹھا کر کھلا دیتے۔

بعض اوقات عسرت اس حد تک پہنچ جاتی کہ مسجد اور گھر میں چراغ بھی نہ جلتا۔ ارادت مند اس حالت میں بھی بالکل مطمئن رہتے۔ نہ کبھی کسی کے صبر و شکر میں فرق آیا، نہ رضا بالقضاء کے ماتھے پر شکن پڑی۔ نہ لب حرفِ شکایت سے آلودہ ہوا۔ مولوی محمد یوسف صاحب تمام امور کے ناظم تھے۔ انھیں کے پاس روپے رہتے تھے۔ کبھی صرف اتنے ہی پیسے ہوتے کہ تھوڑے سے چنے خریدے جاسکیں۔ انھیں جوش دے کر اور نمک ڈال کر سب کو دو دو گھونٹ پلا دیتے۔

یہ صورت حالات اگرچہ اختیاری نہ تھی، لیکن مجھے یقین ہے کہ جماعتی تربیت کے لیے اس سے گونا ضروری تھا۔ سید صاحب نے جس منزل میں قدم رکھا تھا، وہ کمال عزیمت کی منزل تھی۔ عزیمت کو پختہ و پائیدار بنانے کی شکل یہی ہے کہ انسان تنگیوں، سختیوں اور مشکلوں کا حد درجہ خوگر ہو جائے اور راحت و آسایش سے اس کی طبیعت کو کوئی مناسبت نہ رہے۔ وہ پھولوں کو ٹھکرا دے اور کانٹوں کو پیار کرے، پانی سے دور بھاگے اور آگ سے کھیلے۔ سختیاں اتفاقیہ پیش آگئی تھیں، لیکن سید صاحب اپنی جماعت کی تربیت کے لیے جس ماحول کے طلب گار تھے، وہ یہی تھا اور ہمیں یہ ماننے میں تامل نہ ہونا چاہیے کہ قدرت نے خود بخود اس کا انتظام کر دیا تھا۔

سید محمد علی کا واقعہ

سید محمد علی صاحب "مخزن احمدی" فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ دو دن تک ایک دانہ بھی حلق سے نہ اترا اور بارش کے تواتر کا یہ عالم گویا آسمان کے تمام دریچے کھل گئے تھے۔ دور و نزدیک پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ رات ہوئی تو میں بستر پہ جا پڑا۔ بھوک کی حالت میں نیند کب آسکتی تھی؟ کروٹیں لیتے لیتے رات کا ایک حصہ گزر گیا۔ آخر میں بے قرار ہو کر اٹھا اور مسجد میں پہنچا، جہاں سید صاحب اور ان کے رفیق ذکر و شغل میں مصروف تھے۔ میں نے پوچھا کہ دوستو! کیا حال ہے؟ شاہ اسماعیل بولے: آئیے آپ بھی تجلی بے رنگی کا تماشا دیکھ لیجیے۔ سید صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر پہلو میں بٹھا لیا۔ مجلس کا حال دیکھا تو سب پر سرور و شادمانی طاری تھی۔ ہر فرد زمانے کے غم و اندوہ سے بالکل فارغ البال تھا۔

میں بے اختیار ہو کر رو پڑا۔ سید صاحب کا دامن پکڑ کر عرض کیا کہ گھر میں سب لوگ بھوک سے اس طرح بدحال ہیں کہ بیان نہیں کرسکتا۔ آپ تو صبر و تحمل کا پہاڑ ہیں اور ایسی مشقتیں بے تکلف برداشت کرسکتے ہیں، لیکن ہم لوگوں کی ہمت و طاقت جواب دے رہی ہے۔ خدا کے لیے حق قرابت کو پیش نظر

رکھتے ہوئے دعا فرمائیے کہ بارش تھمے اور ہم بے نصیبوں کی قوت لایموت کا کچھ سرو سامان بنے۔

سید صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا: "بھائیو! اس آشفتہ حال کے لیے دعا کرو" چنانچہ سب دعا میں مشغول ہو گئے۔ ایک گھڑی نہیں گزری تھی کہ بادل چھٹ گئے اور چاند نکل آیا۔ سید صاحب اور ان کے تمام رفیق روتے ہوئے سجدۂ شکر میں گر گئے۔

يَرْزُقُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ

تھوڑی دیر بعد ستی ندی کے پار سے دو آدمیوں کی آواز آئی کہ کشتی بھیجو۔ سید صاحب خود مسجد سے باہر نکلے اور پوچھا: آپ کون لوگ ہیں؟ معلوم ہوا کہ سید صاحب کے ایک مرید، سید یاسین نے، جو توپ خانے میں داروغہ تھا، کچھ روپیہ بطور نذر بھیجا ہے۔ کشتی بھیجی گئی۔ وہ آدمی آئے۔ روپیہ سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے پورا روپیہ سید محمد علی کو دے کر فرمایا کہ کھانے کا انتظام فرمائیے۔ چنانچہ چاول اور دال منگوا کر کھچڑی پکائی گئی اور سب نے کھائی۔ سید صاحب نے فرمایا:

ما تمام عمر بہ رزاقی رزاق مطلق خود نوعے اعتماد و اعتقاد داریم کہ اگر در بیابانی ریگستان سندھ یا بوادی عرب کہ اصلاً و مطلقاً آب و دانہ در آنجا مفقود است با جمیع ساکنان ہفت اقلیم منزل گزینیم، زیادہ از آبادانی دوران و بیرانی باحسن وجوہ رزق موجود و مہیا خواہد گردید[1]

ہمیں اپنے رازق مطلق کی رزق رسانی پر اس درجہ اعتماد و اعتقاد ہے کہ اگر سندھ کے ریگستانوں یا عرب کے بیابانوں میں بھی ہوں، جہاں آب و دانہ کا ملنا ناپید ہے اور ساتوں ولایتوں کے باشندے ہمارے ساتھ ہوں تو ان ویرانوں میں آبادیوں سے بڑھ کر رزق موجود و مہیا ہو جائے گا۔

اسی زمانے میں ایک مرتبہ کوڑا جہان آباد کے نواب نے پانسو روپے کی ہنڈی سید صاحب کی خدمت میں بھیجی۔

فراخی رزق کی دعا

ہم بتا چکے ہیں کہ سید علم اللہ شاہ عموماً دعا کیا کرتے تھے کہ ان کے اخلاف کو زیادہ رزق نہ ملے۔ مقصود یہ تھا کہ وہ لوگ دنیاداری کے مکروہات میں مبتلا ہو کر ذکر خدا سے غافل نہ ہو جائیں۔ خاندان میں تنگی رزق کو سید علم اللہ شاہ ہی دعا کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا۔ ایک

---

[1] یہ "مخزن احمدی" کا بیان ہے۔ وقائع میں بھی یہ واقعہ درج ہے، صرف اتنے اختلاف کے ساتھ کہ شکایت سید محمد علی نے نہیں بلکہ سید عبدالرحمٰن نے کی تھی۔ میرے نزدیک "مخزن احمدی" کی روایت اس بارے میں "وقائع" کی روایت پر مرجح ہے۔

روز خاندان والوں نے سید صاحب سے کہا کہ ہمارے لیے فراخیِ رزق کی دعا کیجیے۔ آپ نے فرمایا کہ ضرور دعا کروں گا، لیکن شرط یہ ہے کہ تمام افراد میرے ساتھ پختہ عہد و پیمان کر لیں کہ وہ اہلِ ہند کی گمراہیوں اور بدعتوں سے ہمیشہ دُور رہیں گے۔ اہلِ خاندان نے یہ عہد کر لیا۔ پھر سید صاحب سید علم اللہ شاہ کے مزار پر جا کر دیر تک مشغولِ دعا رہے۔

سید صاحب عصر کے بعد عموماً باہر نکل جایا کرتے تھے۔ سئی ندی کے کنارے بیٹھ جاتے اور پاؤں ندی کے پانی میں لٹکا لیتے۔ ایک روز ایک شخص ننگی تلوار کھینچے ہوئے آیا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سید صاحب پر قاتلانہ حملے کی نیت سے آیا ہے۔ حاجی نور محمد نے اسے پکڑ لیا اور اس کا گلا اس زور سے دبایا کہ قریب تھا اس کا دم نکل جائے۔ بعض ارادت مند زد و کوب کے ارادے سے اس پر پل پڑے۔ سید صاحب نے سب کو روک دیا۔ چاہا کہ اُسے چھوڑ دیں۔ پھر خیال آیا کہ ممکن ہے حاکم پکڑ کر سزا دے۔ آپ نے حاکم کے پاس پیغام بھیج دیا کہ اگر اس کا ارادہ بُرا بھی تھا تو میں نے اسے معاف کر دیا۔ آپ بھی معاف کر دیں۔ حاکم نے اسے دو روز حوالات میں رکھا، پھر سید صاحب کے پاس بھیج دیا کہ آپ جو سزا چاہیں، دیں۔ سید صاحب نے اس کے لیے باقاعدہ رسد مقرر کر دی۔ چند روز بعد اس نے رخصت چاہی تو اُسے کچھ روپے دیے۔

عبادات

سید عبدالرحمن بیان کرتے ہیں کہ میں اس زمانے میں قرآن حفظ کر رہا تھا۔ حضرت تہجد کے لیے اُٹھتے تو میں بھی اُٹھ کر حفظ میں مشغول ہو جاتا۔ آپ نماز کے بعد دُعا میں مشغول ہو جاتے اور اکثر شوق انگیز شعر پڑھتے۔ زیادہ تر خواجہ حافظ کے شعر ہوتے۔ مرزا بیدل کا یہ شعر بھی بار ہا سُنا:

تو کریم مطلق و من گدا، چہ کنی جز ایں کہ بخوانیم
درِ دیگرے بنما کہ من بکجا روم چو برانیم

صبح کی اذان ہوتی تو مسجد میں تشریف لے جاتے۔ بعد نماز دن چڑھے تک آیات و احادیث کے بارے میں مذاکرات جاری رہتے۔

مراقبہ لوجہ اللہ

ایک روز میں سورۂ روم کا یہ رکوع یاد کر رہا تھا:

ومن اٰیاتہٖ ان خلقکم من تراب ثم اذا انتم بشر تنتشرون ومن اٰیاتہٖ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوآ الیہا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ

اور اسی کے نشانات میں سے ہے کہ اس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر اب تم انسان ہو کر جا بجا پھیل رہے ہو اور اسی کے نشانات میں سے ہے کہ اس نے تمھاری ہی جنس سے عورتیں پیدا کیں

انّ فی ذٰلک لاٰیات لقوم یتفکّرون ومن اٰیاتہٖ خلق السّمٰوٰت والارض واختلاف السنتکم والوانکم انّ فی ذالک لاٰیات للعالمین ومن اٰیاتہٖ منامکم باللّیل والنّہار وابتغائکم من من فضلہٖ ان فی ذالک لاٰیات لقوم یسمعون ومن اٰیاتہٖ یریکم البرق خوفاً وّ طمعاً وّینزّل من السمآء مآءً فیحیی بہ الارض بعد موتہا ان فی ذالک لاٰیات لقوم یعقلون ومن اٰیاتہٖ ان تقوم السمآء والارض بامرہٖ ثم اذا دعاکم دعوۃ من الارض اذآ انتم تخرجون ولہٗ من فی السمٰوٰت والارض کلّ لہٗ قانتون وھو الذی یبدؤا الخلق ثم یعیدہٗ وھو اھون علیہ ولہ المثل الاعلیٰ فی السمٰوٰت والارض وھو العزیز الحکیم

تاکہ ان کی طرف مائل ہو کر آرام حاصل کرو اور تمہارے درمیان مہربانی اور محبت پیدا کر دی۔ جو لوگ غور کرتے ہیں، اُن کے لیے ان باتوں میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔ اور اسی کے نشانات میں سے ہے آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا اہلِ دانش کے لیے ان (باتوں) میں (بہت سی) نشانیاں ہیں اور اسی کے نشانات میں سے ہے تمہارا رات اور دن میں سونا اور اس کے فضل کی تلاش کرنا۔ جو لوگ سنتے ہیں ان کے لیے ان (باتوں) میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔ اور اسی کے نشانات میں سے ہے کہ تم کو خوف اور امید دلانے کے لیے بجلی دکھاتا ہے اور آسمان سے مینہ برساتا ہے۔ پھر زمین کو اس کے مر جانے کے بعد زندہ (شاداب) کر دیتا ہے۔ عقل والوں کے لیے ان باتوں میں (بہت سی) نشانیاں ہیں اور اسی کے نشانات میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔ پھر جب تم کو زمین سے نکلنے کے لیے آواز دے گا تو سب نکل پڑو گے اور آسمانوں اور زمینوں میں سب اسی کے مملوک اور اسی کے فرماں بردار ہیں اور وہی ہے جو خلقت کو پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے۔ پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا اور یہ اس کے لیے بہت آسان ہے آسمانوں اور زمینوں میں اس کی شان نہایت بلند ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

صبح کی نماز کے بعد مجھ سے پوچھا کہ رات کیا پڑھ رہے تھے۔ میں نے رکوع سنایا تو مولانا عبدالحی اور شاہ اسماعیل سے فرمایا "مراقبہ توجہ اللہ" کا مضمون یہی ہے۔

فرائضِ مصالحت

سید صاحب باہم جھگڑوں اور کشمکشوں کو ختم کرانے کی بہت کوششیں فرمایا کرتے تھے۔ محسن خاں کا بیان ہے کہ تکیہ شریفہ سے ایک کوس پر کنواں تھا، جو ٹھنڈا کنواں مشہور تھا۔ ایک روز فرمایا کہ روزہ اسی کنوئیں پر چل کر کھولیں گے۔ چنانچہ افطار کا مختصر سا سامان لے کر وہاں پہنچ گئے۔ اسی وقت خبر ملی کہ شہر میں فلاں فلاں کے درمیان لڑائی ہو گئی ہے اور اندیشہ ہے کہ یہ کہیں زیادہ نہ پھیل جائے۔ سید صاحب نے اسی وقت چار پانچ آدمیوں کو دوڑا دیا کہ جائیے اور لڑنے والوں میں صلح کرا دیجیے۔ اگر وہ باز نہ رہیں تو کہیے کہ ہمیں مار ڈالیے۔ آپ بھائیوں کو تکلیف تو ضرور ہو گی۔ روزے سے ہو۔ گرمی کا موسم ہے۔ پیاس لگے گی، لیکن اس قسم کی مشقتیں برداشت کیے بغیر مراتب کمال پر پہنچنا میسر نہیں آ سکتا۔ چنانچہ سب گئے اور لڑنے والوں میں صلح کرا دی۔ سید صاحب اس پر بہت خوش ہوئے۔

سید صاحب جب تک باہر رہے باغوں میں آپ کا جو حصہ تھا، وہ اقربا کھاتے رہے۔ مدت کے بعد رائے بریلی آئے تو اقربا نے باہم مشورہ کر کے آم کی پوری فصل آپ کے حوالے کر دی۔ آپ نے تمام باغوں میں اپنے چوکیدار مقرر کیے۔ پھل پک گئے تو تڑوا کر سب کے سب عزیزوں میں بانٹ دیئے۔

تعمیرِ مساجد

بعض عزیزوں نے باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ سید اسحاق فرمایا کرتے تھے، خدا وسعت دے گا تو مسجد جیند خاں (واقع لوہانی پور، رائے بریلی) از سرِ نو بنواؤں گا۔ سید صاحب نے اپنے مرحوم بھائی کی خواہش پوری کرنے کے لیے اس کی تعمیر شروع کرا دی۔ بہت سی اینٹیں لوگوں نے بر طور نذر پیش کر دیں۔ کچھ سید صاحب نے خود خرید لیں۔ اسی طرح ایک مسجد محلہ شیخاں میں شروع کرا دی۔ تین مہینے میں دونوں مسجدیں مکمل ہو گئیں تو دونوں میں اپنے خرچ سے امام مقرر کیے۔

"مخزن احمدی" میں ہے:

در تعمیرِ دو عبادت خانہ کہ از خشتِ پختہ	ان دونوں عبادت گاہوں کی تعمیر پکی
و گچ بود آں حضرت اکثر با اکثر رفقاء خود تحمیل خشت	اینٹوں اور چونے سے ہوئی۔ سید صاحب بھی اکثر

---

[1] روایت میں محسن خاں، محمود خاں، ابراہیم خاں، امام خاں اور شیخ لطافت کے نام آئے ہیں۔

وآنہا خود را معاف نمی داشتند۔ ہم چنیں جمالی تیر و شہتیر و تختہ وغیرہ لوازمات تعمیر ہیچگونہ تقصیر نمی کردند۔[1]

اپنے رفیقوں کی طرح اینٹیں، چونا، کڑیاں، شہتیر اور تختے وغیرہ اٹھا کر معماروں کو دیا کرتے تھے۔

رُحَمَاءُ بَیْنَہُمْ

سید صاحب حلم کا پہاڑ تھے۔ قیام بریلی کے زمانے کا ایک واقعہ اس سلسلے میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہے:

پیر داد خاں، لوہانی پور کا ایک پٹھان تھا۔ ایک مرتبہ اس کی گائے سید صاحب کے باڑے میں گھس آئی۔ نگہبانوں نے گائے کو باڑے سے نکال کر دور تک بھگایا اور اتنا بھگایا کہ اس میں چلنے کی سکت نہ رہی۔ پیر داد خاں نے یہ سنا تو جوش میں آگیا۔ اور سید صاحب کے پاس پہنچ کر اس نے درشت لہجے میں شکایت کی۔ آپ کو یہ واقعہ معلوم نہ تھا۔ جب پوری کیفیت سُنی تو فرمایا: نگہبانوں نے بہت بُرا کیا۔ میں انھیں منع کر دوں گا۔ گائے کو نقصان پہنچا تو اس سے بہتر گائے معاوضے میں دے دوں گا۔ بھائی صاحب! خفگی چھوڑ دیجیے۔

اس وقت سید صاحب کے پاس کچھ آدمی بیٹھے تھے۔ ایک نورس آم اور ایک خربوزہ آیا ہُوا تھا۔ آپ نے آم تو ایک اور صاحب کو دے دیا، خربوزہ پیر داد خاں کو دینا چاہا تو اس نے غصّے میں انکار کر دیا۔

سید عبدالرحمٰن، جو اس حکایت کے راوی ہیں، کہتے ہیں کہ میں گھر گیا ہُوا تھا۔ واپس آیا تو دیکھا کہ سید صاحب کے گھوڑوں کے خبرگیر، غلام رسول رو رہے ہیں۔ میں نے پوچھا خاں صاحب! کیا ہُوا؟ انھوں نے سارا قصّہ سنایا اور کہا کہ میں نے بے ادب پیر داد خاں کی سخت گوئی سن نہ سکا اور اسے جھڑک دینا چاہا۔ حضرت نے مجھے جھڑک کر پیچھے ہٹا دیا۔

اقربا کو تفہیم

شیخ امان اللہ جو اندرونِ قلعہ میں رہتے تھے، ایک بزرگ آدمی تھے۔ انھوں نے بھی پیر داد خاں کو سمجھایا، لیکن اس کا جوش فرو نہ ہُوا۔ سید صاحب کے اہلِ خاندان میں سے سید علم الہدیٰ اور سید محی الدین کو اس واقعہ کا علم ہُوا تو انھیں بھی پیر داد خاں کی درشت مزاجی پر بہت غصّہ آیا۔ بولے ہم اس سے سمجھیں گے۔ سید صاحب نے یہ سنا تو فرمایا:

---

[1] مولانا سید ابوالحسن علی نے لکھا ہے، تعمیر کے کاغذات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مسجدیں ۱۲۴۰ھ میں یعنی حج کے بعد ہجرت بغرض جہاد سے پیشتر تعمیر ہوئیں (سیرت سید احمد شہید طبع چہارم صفحہ ۱۸۱ حاشیہ)

چُپ رہیے۔ اسے کچھ نہ کہیے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ جمعہ اور جماعت چھوڑ دے۔ صبر کیجیے۔

سید عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ مجھے بھی جوش آگیا اور جا کر سید صاحب سے عرض کیا کہ وہ مردک بے ادبی کر کے سلامت چلا گیا۔ میں ہوتا تو دیکھتا۔ آپ نے فرمایا: تُو بچہ ہے۔ تجھے کیا معلوم؟ ایسا نہ ہو کہ تیری کسی حرکت کے باعث پیر داد خاں کا جمعہ اور جماعت فوت ہو جائے۔

گھر پہنچ کر معافی مانگی

پھر آپ نے معذرت کے لیے پیر داد خاں کے گھر جانے کا ارادہ کر لیا۔ آپ روزانہ اپنی ہمشیر سے ملنے کے لیے تلعے جایا کرتے تھے۔ کئی لوگ ساتھ ہوتے۔ آپ ہمشیر سے ملنے کے بعد لوہانی پور گئے اور پیر داد خاں کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔ اس نے سید صاحب کو دیکھا تو اندر زنانے میں چلا گیا۔ آپ گھوڑے سے اُتر کر دروازے پر بیٹھ گئے۔ اور فرمایا: خاں صاحب! آج تو خطا معاف کرائے بغیر واپس نہ جاؤں گا۔ اس اثناء میں چند آدمی جمع ہو گئے۔ وہ پیر داد خاں کو ملامت کرتے ہوئے سید صاحب کے پاس لائے۔ آپ نے معانقہ کیا۔ پھر کہا: خاں صاحب! خطا معاف کر دیجیے۔ اگر آپ کی گائے مر جاتی تو اس سے بہتر گائے خدمت میں پیش کرتا۔

پیر داد خاں کا معاملہ تو ختم ہو گیا۔ اس کے بھائی نور داد خاں نے سید صاحب کا حلم وانکسار اور پیر داد خاں کا کبر دیکھا تو اسی وقت بھائی سے علحدگی اختیار کر لی۔ بولا: ایسے فرشتہ سیرت بزرگ کے ساتھ تکبّر غضب الٰہی کا موجب ہے۔ نور داد خاں سید صاحب کا مرید ہو گیا۔ جہاد میں ساتھ رہا۔ بالاکوٹ کے معرکے میں دادِ شجاعت دے کر مرتبۂ شہادت پر فائز ہُوا۔

جہاد کے لیے تیاری

سید صاحب رائے بریلی پہنچے تھے تو آپ کی اور ارادت مندوں کی عام مشغولیتِ ذکر و فکر اور مراقبے کے سوا کچھ نہ تھی اگرچہ وقتاً فوقتاً جہاد کا ذکر بھی آتا رہتا تھا۔ صحیح تاریخ معلوم نہیں، لیکن یہ معلوم ہے کہ رائے بریلی پہنچنے سے کچھ مدت بعد آپ نے حکم دے دیا تھا کہ تمام رفیق اور ارادت مند زیادہ وقت جنگی فنون کی مشق میں صرف کیا کریں۔

معلوم ہوتا ہے کہ رفقا میں سے بعض کو اس حکم پر تعجب ہُوا، اس لیے کہ ذکر و شغل کے عام طریقوں کو جنگی فنون کی مشق سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ چنانچہ مولوی عبدالرحیم کاندھلوی کے ذریعے سے یہ معاملہ سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے فرمایا:

> ان دنوں دوسرا کام اس سے افضل ہمارے درپیش ہے۔ اب اس کی طرف ہمارا دل مشغول ہے، یعنی جہاد فی سبیل اللہ۔ اس کے سامنے حال کی کچھ حقیقت نہیں

ہے۔ اس واسطے کہ وہ کام یعنی علم سلوک اس کے (جہاد کے) تابع ہے۔ اگر کوئی تمام دن روزے رکھے، تمام رات زہد و ریاضت میں بسر کرے یہاں تک کہ نوافل پڑھتے پڑھتے پیروں پر ورم آجائے اور دوسرا شخص جہاد کی نیت سے ایک ساعت دن یا رات کو رنجک اُڑائے تاکہ مقابلۂ کفار میں بندوق لگاتے وقت آنکھ نہ جھپکے تو وہ عابد اس مجاہد کے مرتبے کو ہرگز نہ پہنچے گا۔

مراقبوں کا صحیح وقت

مزید فرمایا:

اور وہ کام (سلوک) اس وقت کا ہے، جب اس کام (جہاد) سے فارغ البال ہو اور اب جو پندرہ سولہ روز سے دوسرے انوار کی ترقی نماز یا مراقبہ میں زیادہ معلوم ہوتی ہے، وہ اسی کاروبار کے طفیل سے ہے۔ کوئی بھائی جہاد کی نیت سے تیر اندازی کرتا ہے، کوئی بندوق لگاتا ہے، کوئی لکڑی گدکا کھیلتا ہے، کوئی ڈنٹر پیلتا ہے۔ اگر ہم اس کی (یعنی سلوک کی) اس وقت تعلیم کریں تو ہمارے یہ بھائی لوگ کام سے جاتے رہیں۔

پھر مولوی محمد یوسف پھلتی سے مخاطب ہوئے:

یوسف جی! آپ اپنے ہی حال کا خیال کریں کہ گردن ڈالے عالم سکوت میں رہتے ہو۔ اسی طرح اور لوگ بھی۔ کوئی کمل اوڑھے مسجد کے کونے میں بیٹھا ہے، کوئی چادر لپیٹے حجرے میں گھسا ہوا ہے، کوئی جنگل میں جاکر مراقبہ کرتا ہے۔ کوئی ندی کے کنارے گڑھا کھود کر بیٹھ جاتا ہے۔ ان صاحبوں سے تو جہاد کا کام ہونا دشوار ہے۔ آپ ہمارے بھائیوں کو سمجھائیں کہ اب اسی کام (استعداد جہاد) میں دل لگائیں۔ ان کے واسطے بہتر یہی ہے۔ حاجی عبدالرحیم صاحب سے بھی مشورہ کر کے جواب دیجیے۔

اسلامیت کا حقیقی وظیفہ

اس ارشاد کا کوئی حصہ تشریح کا محتاج نہیں۔ اسلامیت کا وظیفہ کیا ہے؟ یہ کہ ہر حلقہ بگوش اسلام اپنے خالق و مالک کی راہِ رضا میں قائم و استوار رہے اور اس کے احکام و اوامر کو دنیا میں نافذ کرنے اور نافذ رکھنے کے لیے ہر وقت کوشاں نظر آئے۔ ذکر و سلوک کی غایت اس کے سوا کیا تھی کہ لوگوں کے دلوں میں دینی امور و معاملات کی محبت اس طرح جم جائے، جس طرح نگینہ خاتم میں جم جاتا ہے۔ تاکہ وہ مرضات الٰہی کے تقاضے بہتر و احسن طریق پر پورے کر سکیں۔ عام لوگوں نے سلوک کا مقصد یہ سمجھ رکھا تھا کہ رات دن مراقبے میں بیٹھے بیٹھے انوار باطنی کے

تماشہ دیکھتے رہیں، حالانکہ دین کا نصب العین اعلائے کلمۃ الحق تھا، نہ کہ تماشا گری و تماشا بینی۔ جب اسلامیت کے لیے ہندوستان کی فضا حد درجہ تنگ ہو رہی تھی۔ اس موقع پر اصلی دینی کام یہی تھا کہ اس فضا کو اسلامیت کے لیے زیادہ سے زیادہ کشادہ اور سازگار بنا دیا جاتا۔ یہی غرض مدنظر رکھتے ہوئے سید صاحب نے اپنے ارادت مند کو ذکر و مراقبہ سے ہٹا کر جہاد کی تیاری پر لگا دیا تاکہ عزم راسخ کے ساتھ اس کام کو پورا کر سکیں، جسے پورا کیے بغیر اس سرزمین میں اسلام آزاد نہیں رہ سکتا تھا۔

طبیب حاذق پہلے تنقیہ کرتا ہے، اس کے بعد اصل نسخہ دیتا ہے۔ سید صاحب نے بھی پہلے ارادت مندوں کے دل ذکر و مراقبہ میں استغراق کے ذریعے سے پاک کیے۔ جب اس طرف سے اطمینان ہو گیا تو اصل کام کے سرانجام میں انھیں لگا دیا اور اسے ذکر و فکر، سیر و سلوک اور مراقبہ و توجہ سے بدرجہا افضل قرار دیا۔

باطنی ترقی کا بلند ترین مقام

ایک مرتبہ مولانا شاہ اسماعیل نے پرانے زمانے کے مشاغل کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

> ہم پر بھی ایک زمانہ گزرا ہے کہ ہر ایک اللہ جل جلالہ کے ذکر میں مدہوش تھا، یہاں تک کہ کھانے اور لباس کا بھی کسی کو خیال نہ تھا اور نہ کسی اور شغل میں لذت محسوس ہوتی تھی۔

سید صاحب نے یہ سن کر فرمایا:

> وہ منزل پیچھے رہ گئی۔ اس وقت لطفِ الٰہی نے ہمیں اس جانب متوجہ کر رکھا تھا۔ حالت یہ تھی کہ جو شخص سامنے آ کر بیٹھتا، مراتب باطنی میں "آناً فاناً" ترقی کرتا اور جو کیفیت دوسرے مقامات پر برسوں میں پیدا ہوتی ہے ہمارے حلقے میں گھڑیوں میں پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد بالاتر مرتبے کے لیے ہم پر وعظ و نصیحت کے دروازے کھل گئے۔ سلسلہ تبلیغ بھی اعلیٰ مراتب پر پہنچا اور یہ حقیقت مخالف و موافق پر روشن ہے۔ اب ہمیں کفار کے ساتھ جہاد کا حکم دیا گیا ہے، (جو باطنی ترقی کا) سب سے اونچا پایہ ہے۔ یہ انبیائے اولوالعزم کا طریقہ اور اسوہ ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔[1]

اس طرح سید صاحب نے نواب امیر خاں سے الگ ہونے کے بعد تنظیم کی جو سکیم

---

[1] منظورہ صفحہ ۷۰

سوچی تھی، اسے ترتیب کے ساتھ معرض عمل میں لے آئے۔

"صراطِ مستقیم"

"صراطِ مستقیم" کی تسوید قیام دہلی ہی کے دوران میں شروع ہو گئی تھی، جس کے کچھ اجزا شاہ اسماعیل نے لکھے۔ باقی مولانا عبدالحی نے مرتب کیے۔ سید صاحب مضمون بتا دیتے۔ شاہ صاحب یا مولانا اس مضمون کو اپنے لفظوں میں لکھتے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مطالب میں پانچ پانچ مرتبہ ترمیمیں کرنی پڑیں۔ مولانا یا شاہ صاحب جو کچھ لکھ کر لاتے، سید صاحب اگر اسے درست نہ سمجھتے تو اسقام واضح کر دیتے۔ ان کے ارشادات کی روشنی میں بعض مطالب کئی کئی مرتبہ لکھنے پڑے۔ میرا احساس ہے کہ اس کتاب کی تکمیل رائے بریلی پہنچ کر ہوئی یا کم از کم رد و بدل کا سلسلہ خاصی دیر بعد تک جاری رہا۔

تیرھواں باب

نکاح بیوگاں اور واقعہ نصیر آباد

نکاح بیوگاں

قیام وطن کی اس مہلت میں سید صاحب نے احیاء سنت کے جو ممتاز کارنامے انجام دیے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اپنے گھر سے نکاح بیوگاں کا آغاز کیا۔

مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ میل جول میں جو معیوب اور سراسر غیر شرعی رسمیں اختیار کر لی تھیں، ان میں سے ایک رسم یہ بھی تھی کہ کسی خاتون کا شوہر فوت ہو جاتا تو شدید ضرورت کے باوجود دوسرا نکاح نہ کرتی اور ایسے نکاح کو نجابت و شرافت کے منافی سمجھا جاتا تھا۔ خصوصاً اونچے گھرانوں میں تو اس کا تصور بھی موجب ننگ تھا۔ اکبر و جہانگیر کے زمانے تک مسلمانوں میں یہ بُری رسم نہیں آئی تھی۔ خود اکبر نے بیرم خاں کی بیوہ سلیمہ سلطان بیگم سے نکاح کیا، جو بادشاہ کی عمہ زاد بہن تھی اور سلیمہ سلطان بیگم زندگی کے آخری سانس تک شاہی محل کی ممتاز ترین ہستی سمجھی جاتی رہی۔ جہانگیر نے نور جہاں بیگم سے بہ حالت بیوگی ہی شادی کی تھی اور اس وقت بیگم کی عمر کم و بیش چونتیس برس کی تھی۔ بعد میں حالت بدل گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جو ہندو اسلام کے حلقہ بگوش بنے، وہ اپنی بعض پرانی رسموں پر اہتمام سے قائم رہے اور ان میں سے ایک رسم یہ بھی تھی کہ بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کو بُری نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ ان خاندانوں میں بھی یہ رسم پھیل گئی جو ظہور اسلام کے وقت سے مسلمان چلے آتے تھے۔

سید صاحب کے منجھلے بھائی سید اسحاق کی بیوہ جوان تھی۔ اس کا صرف ایک بچہ تھا سید اسماعیل جس کی عمر بہ مشکل چھ سات برس کی ہو گی۔ سید صاحب نکاح بیوگاں کا اجرا چاہتے تھے۔ احیاء سنت اور تجدید شیوۂ اسلامیت کے سلسلے میں وعظ و تبلیغ سے کہیں بڑھ کر فائدہ عملی اقدام سے پہنچ سکتا تھا۔ اس بناء پر خود اپنی بیوہ بھاوج سے نکاح کے لیے تیار ہو گئے۔

دنیوی رشتے اور علاقہ عبودیت

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز مولانا عبدالحی نے وعظ میں اس آیت کی تفسیر فرمائی:

لا تجد قوماً یؤمنون باللہ و   نہ پاؤ گے تم ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں

بالیوم الاٰخر یوآدّون من حاد اللہ و رسولہ ولو کانوا آباءھم او ابناءھم او اخوانھم او عشیرتھم ۔

اللہ اور یوم آخرت پر کہ وہ محبت کریں اللہ اور اس کے رسول کے مخالفوں سے اگرچہ وہ ان کے باپ ہوں یا بیٹے ہوں یا بھائی ہوں یا کنبے والے ہوں ۔

اس سلسلے میں مولانا نے علم و مشیخت کے تمام ممتاز خاندانوں کے اعمال کو شریعت کی ترازو میں رکھ کر تولنا شروع کیا اور ایک ایک کی کمزوریاں کھول کھول کر بیان کر دیں ۔ یہاں تک کہ شاہ ولی اللہ اور سید علم اللہ کے خانوادوں کی خلاف شرع باتوں کو بھی بے باکانہ واضح فرما دیا ۔ سید صاحب بے تاب ہو کر اپنی جگہ سے اٹھے، دو زانو مولانا کے سامنے بیٹھ گئے اور فرمایا :

> میں خدا کا بندہ اور اس کے رسول پاکؐ کا فرماں بردار ہوں ۔ اس سے پہلے سہارن پور میں بھی میں نے مولانا سے کہا تھا کہ میں خدا اور اس کے رسولؐ برحق کی اطاعت میں عزیزوں، رشتہ داروں اور امیر و غریب کسی کا پاس نہ کروں گا ۔ کسی کی خوشی و ناخوشی کو خاطر میں نہ لاؤں گا ۔ اس وقت مجھے سب سے زیادہ محمد یعقوبؒ (سید صاحب کے برادر اکبر سید ابراہیم کا فرزند) عزیز ہے ۔ دنیا کی چیزوں میں سے وہ جو چاہے لے لے، لیکن اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام بجا لانے میں اس کی رعایت بھی نہ کروں گا ۔ میرے تمام رشتے دار صاف صاف سن لیں کہ جو اللہ اور رسولؐ کی فرمانبرداری میں میرے شریک حال ہوں حکموں کو پورا کرنے اور منع کی ہوئی باتوں سے دور رہنے میں کسی کے طعن و ملامت کا خیال تک دل میں نہ لائیں، وہ میرے عزیز ہیں اور مجھے محبوب ہیں اور جو اس کے لیے تیار نہ ہوں، ان کو میری طرف سے جواب ہے اور مجھے ان سے کوئی واسطہ نہیں ۔ صاف کہتا ہوں جو اللہ کی راہ میں مستعد ہو، وہی میرا ساتھی ہو گا، جسے یہ منظور نہ ہو، وہ مجھ سے الگ ہو جائے [1]

---

[1] سید صاحب کے ارشادات کا جو مکتوب ذخیرہ ہمارے پاس پہنچا ہے، اس میں یہ مضمون کئی مرتبہ آتا ہے ۔ مثلاً جب آپ جہاد کے لیے سرحد پہنچ چکے تھے تو ازواج سندھ میں تھیں ۔ ان کے ساتھ دوسرے متعلقین کے علاوہ سیدہ زہرہ بی بی کی والدہ ماجدہ مادری سیدہ سارہ) بھی تھیں ۔ ایک مرتبہ سید صاحب کو علم ہوا کہ وہ گھر واپس جانا چاہتی ہیں تو بے توقف انھیں کہا کہ ان وساوس کو دل میں جگہ نہ دیجیے اور رضائے باری تعالیٰ کے خلاف ہرگز قدم نہ اٹھائیے ۔ (باقی صفحہ ۱۲۶ پر)

یہ سن کر مولانا عبدالحی بولے: حضرت ہمیں آپ سے ایسی ہی امید تھی اور اسی لیے ہم نے دوسرے مشائخ سے کنارہ کش ہو کر آپ کا دامن ہدایت تھاما۔

ایک خواب

اسی زمانے میں سید صاحب نے ایک خواب دیکھا کہ لکڑیوں کا ایک بھاری گٹھا پڑا ہے اکثر لوگ اسے اٹھانے کا ارادہ کرتے ہیں، لیکن گٹھا اتنا گراں بار ہے کہ اُسے اٹھا نہیں سکتے۔ وہیں آپ کی بھاوج (اہلیہ سید اسحاق) بھی موجود ہیں۔ آپ نے اُن سے بکمال الحاح تملق کہا کہ آؤ ہم تم اس پشتارے کو اُٹھا کر گھر لے چلیں۔ جلانے کے کام آئے گا۔ انھوں نے بھی اسے ہلکا ہی جان کر انکار کیا۔ جب آپ نے نہایت خوشامد سے کئی بار بہ تکرار کہا تو وہ راضی ہوئیں۔ پھر آپ اور وہ دونوں مل کر اُٹھا لے گئے[1]

سید صاحب کا معمول تھا کہ نماز صبح کے بعد مراقبہ کیا کرتے تھے۔ جس رات خواب دیکھا اس کی صبح کو نماز کے بعد شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی کو خواب سنایا اور کہا اس کی تعبیر پر غور کیجیے۔ انھوں نے عرض کیا کہ آپ ہی بیان فرمائیں۔ آپ نے کچھ دیر سکوت فرمایا پھر کہا: خداوند تعالیٰ کے بعض حکم ایسے ہیں کہ لوگ انھیں بجا لانا عار و ننگ جانتے ہیں، خصوصاً ہندوستان کے شرفا و نجبا میں سے جو کوئی ان حکموں کو بجا لاتا ہے، اسے مطعون کرتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک امر بیوہ عورت کے نکاح ثانی کا ہے۔

زندگی دو قسم کی ہے: رُوحانی اور جسمانی۔ دنیاوی طعام جسمانی زندگی میں معاون ہے، رُوحانی طعام حیات روحانی و حیات اخروی کا سبب ہے۔ ایندھن کھانے پکانے کے کام آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس خواب کا تعلق جسمانی اور اہلی زندگی سے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اور میری بھاوج اہلی زندگی کے سلسلے میں بیوہ کے نکاح ثانی کو از سر نو جاری کریں گے اور رواج عام دیں گے۔ میں پہلے اپنے گھر میں سنت کو جاری کروں گا پھر اوروں کو حکم دوں گا تاکہ اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم کی وعید میں داخل نہ ہو جاؤں (یعنی کیا تم دوسرے لوگوں کو نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھلائے بیٹھے ہو؟)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۵) آخر میں فرمایا: بر ضمیر منیر آشکارا ست کہ ایں بندۂ ضعیف را آنچہ علاقہ با خورداں و بزرگاں می باشد، محض بُغض فی اللہ می باشد۔ پس اگر احدے از خورداں و بزرگاں مخالفت خدا را لازم می گیرد، پس علاقہ او اندول اخلاص منزل ہم بیدمی سود (آپ پر واضح ہے کہ مجھے خاندان کے چھوٹوں یا بڑوں سے جو تعلق ہے صرف خدا کے لیے ہے۔ اگر ان میں سے کوئی احکام خدا کے خلاف قدم اٹھائے گا تو میرے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ باقی نہ رہے گی۔

[1] وقائع صفحہ ۱۸۱۔

اقربا کے سامنے وعظ

چنانچہ آپ گھر تشریف لے گئے اور تمام رشتہ دار خواتین کو جمع کر کے وعظ فرمایا۔ اس میں کہا:

> اسلام یہ نہیں کہ انسان زبان سے کہے میں مسلمان ہوں یا گائے کا گوشت کھالے اور ختنہ کرالے یا مسلمانوں کی مروجہ رسموں میں شریک رہے۔ اسلام یہ ہے کہ تمام احکام الٰہی کی تعمیل دل و جان سے کی جائے۔ یہاں تک کہ اگر حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی طرح ذبح فرزند کا بھی اشارہ ہو تو اسے خوشی خوشی بجالائے۔ منہیات شرعی کا خیال بھی دل میں آئے تو چالیس روز تک استغفار کرے۔
>
> انھیں احکام میں سے بیوہ کا نکاح ثانی بھی ہے، خصوصاً وہ بیوہ جو جوان ہو۔ افسوس کہ اس زمانے میں بیوہ کے نکاح ثانی کو شرک اور کفر کے برابر سمجھ لیا گیا ہے۔ اس پر عمل پیرائی کو نہایت درجہ قبیح و شنیع تصور کیا جاتا ہے...... جو بیوہ نکاح کرلے، اُسے بہت نازیبا الفاظ سے مطعون کیا جاتا ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ بات کہاں تک پہنچتی ہے۔ یہ خیال نہیں کیا جاتا کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن، حضرت عائشہ رضؓ کے سوا سب بیوہ تھیں۔

دوسرے روز پھر اسی مضمون کا وعظ فرمایا۔ ساتھ ہی اپنی خالہ صاحبہ سے (جو سیدہ ولیہ[1] بیوہ سید اسحاق کی بیوی تھیں) کہا ہماری بھاوج کو جس طور سے ہو سکے سمجھا کر راضی کیجیے کہ ہم سے نکاح کر لیں۔ یہ امر واسطے حظ نفس کے نہیں چاہتا بلکہ محض ترویج سنت حضرت خیر الانامؐ مطلوب ہے:

> میرے گھر میں حسین و جمیل اور باعفت خاتون موجود ہے۔ میری خواہش صرف یہ ہے کہ اس سنت کا احیا میرے گھر سے ہو۔

نکاح

سیدہ ولیہ ابتدا میں نکاح ثانی پر راضی نہ تھیں۔ سب عزیزوں کے اصرار اور سعی و کوشش کے بعد بہ نیت احیائے سنت راضی ہوئیں[2]۔ لیکن معلوم ہوتا ہے سید صاحب سے اقرار لے لیا تھا کہ کوئی

---

[1] سیدہ ولیہ سید ابواللیث کی صاحبزادی تھیں جو سید صاحب کے حقیقی ماموں تھے۔ ان کی چار بہنیں تھیں (یعنی بنت شاہ ابوسعید جد مادری سید صاحب) خیر النسا اہلیہ سید محمد مقتسم بن سید محمد معین، صالحہ و مریم جو یکے بعد دیگرے سید محمد دلی سے بیاہی گئیں۔ بی بی تاجہ والدہ سید صاحب۔ صالحہ کا انتقال غالباً پہلے ہو چکا تھا۔ سیدہ تاجہ بھی فوت ہو چکی تھیں۔ معلوم نہیں خیر النساء اور مریم میں سے سید صاحب نے کون سی خالہ کے ذمے یہ کام لگایا۔

[2] "وقائع احمدیہ" میں ہے کہ انھیں راضی کرنے میں کئی مہینے لگ گئے۔ (صفحہ ۱۴۹)

اور نکاح ان سے اجازت لیے بغیر نہ کیا جائے گا۔ چنانچہ جب سرحد میں سید صاحب کو نکاح ثالث کی ضرورت پیش آئی تو اسے سیدہ ولیہ سے اجازت پر موقوف رکھا تھا اور جب تک مکتوب کے ذریعے سے اجازت نہ آگئی، نکاح نہ کیا۔

غرض سیدہ ولیہ نکاح پر راضی ہو گئیں۔ ایک روز جانبین کی طرف سے خفیہ ایجاب و قبول ہوا، پھر نکاح کا اعلان کیا گیا۔ سید صاحب اس واقعہ کو زیادہ سے زیادہ مستحسن شکل میں عام لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے اس درجہ مشتاق تھے کہ سیدہ ولیہ سے کہا اپنے نکاح ثانی کی شیرینی اپنے ہاتھ سے تقسیم کیجیے اور سب سے بے تکلف کہیے کہ یہ میرے نکاح ثانی کی شیرینی ہے تاکہ خواتین کے دل سے اس بارے میں تنفر کی کدورت زائل ہو جائے اور وہ یقین کر لیں کہ یہ فعل عین سنت کے مطابق ہے، اس لیے اسے قابل عزت و ستایش سمجھنا چاہیے۔

اعلان عام اور اثرات و نتائج

نکاح کے تمام مراحل طے ہو چکے تو سید صاحب نے دہلی، پھلت، رام پور اور تمام دوسرے مرکزی مقامات پر خط بھجوائے تاکہ لوگوں میں اس فعل حسن کی خوب اشاعت ہو[1]۔ شاہ اسماعیل نے ان خطوط کے مسودے مرتب کیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف مقامات کے شرفا نے بطوع و رغبت بیوہ خواتین کے نکاح کیے۔ اصل مسئلہ صرف ضرورت اور خواہش تک محدود تھا لیکن چونکہ اس کی بندش کو معیار شرافت بنا لیا گیا تھا، اس لیے بعض اولوالعزم اصحاب نے بندش کو محو کرنے اور اصل سنت کو رواج عام دینے کے شوق میں ضرورت کے بغیر بھی بیوہ خواتین کے نکاح کر دیے۔ آخری قسم کی ایک مثال شاہ اسماعیل کی ہمشیر بی بی رقیہ کا نکاح تھا۔

بی بی رقیہ شاہ اسماعیل سے بڑی تھیں۔ ان کی عمر پچاس سے اوپر ہو چکی تھی۔ وہ شیخ ولی محمد پھلتی کے چچا شیخ کمال الدین سے بیاہی گئی تھیں[2] اور غالباً جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ اگرچہ حد یاس کو پہنچ چکی تھیں اور انھیں نکاح کی ضرورت نہیں رہی تھی، لیکن شاہ اسماعیل کو احیاء سنت کے ثواب میں شریک ہونے کا اتنا شوق اور ایسا ولولہ تھا کہ بہن کو راضی کیا اور مولانا عبدالحی سے ان کا نکاح کر دیا[3]۔

---

[1] سید صاحب نے نکاح بیوگان کے متعلق ایک رسالہ بھی لکھوایا تھا جو فارسی زبان میں تھا۔ اس کی ایک نقل میرے پاس موجود ہے۔

[2] بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ بی بی رقیہ کا نکاح شاہ رفیع الدین کے بڑے صاحبزادے مصطفیٰ سے ہوا تھا اور ارواح ثلاثہ میں اس صاحبزادے کا نام عبدالرحمن مرقوم ہے۔ میرے نزدیک صحیح بیان وہی ہے جو متن میں درج ہے۔ شیخ کمال الدین بی بی رقیہ کے حقیقی ماموں کے بیٹے تھے۔

[3] یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ سیدہ ولیہ کے نکاح ثانی پر اس زمانے میں ایک تعریض آمیز نظم بھی لکھی گئی تھی۔ میں اس کے شعر مثالاً بھی یہاں درج نہیں کر سکتا۔

نصیر آباد

نکاحِ ثانی کے علاوہ دوسرا قابلِ ذکر واقعہ نصیر آباد کا ہے، جو غالباً محرم ۱۲۳۵ھ (اکتوبر ۱۸۱۹ء) میں پیش آیا۔ یہ قصبہ قاضی سید محمود کے زمانے سے سید صاحب کے اجداد کا وطن چلا آتا تھا۔ آپ کے بیشتر اقربا وہیں رہتے تھے۔ اہلیہ اولیٰ سیدہ زہرہ بھی نصیر آباد ہی کی تھیں۔ پہلے وہاں کے تمام لوگ سنی تھے، لیکن جب اودھ برہان الملک کی جاگیر میں آیا تو والیِ ملک کے مذہبی عقائد کا اثر آہستہ آہستہ عام لوگوں پر بھی پڑنے لگا۔ ۱۱۶۶ھ میں نصیر آباد میں مولانا سید دلدار علی پیدا ہوئے جو آخری دور کے جلیل القدر مجتہد مانے گئے۔ شیعہ حضرات انھیں عام طور پر "غفران مآب" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔[1] ان کے اثر و رسوخ اور وعظ و تلقین کے سبب سے اکثر گھرانوں نے شیعی عقائد قبول کر لیے۔ سید صاحب کے زمانے میں نصیر آباد کے چار محلوں میں سے تین شیعہ ہو چکے تھے اور صرف ایک محلہ سنیوں کا رہ گیا تھا۔ انتظامی اعتبار سے نصیر آباد سلون کے پرگنے میں شامل تھا اور سلون بادشاہ بیگم کی جاگیر میں تھا، جو بڑی سخت گیر خاتون تھیں۔[2]

شیعہ سنی اختلاف

دین کی حقیقی روح مضمحل ہو جاتی ہے تو لوگوں میں تنگ نظری اور نزاع آمادگی بہت بڑھ جاتی ہے۔ اصول و مبانی میں موافقت پر نظر رکھنے کے بجائے فروع و جزئیات میں اختلاف کو زیادہ اہم بنا لیا جاتا ہے۔ شیعہ اور سنی حضرات کے درمیان بھی غلط تعصبات کی بناء پر اختلاف کی خلیج حائل ہو گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ مولانا سید دلدار علی صاحب کی امداد سے

---

[1] مولانا سید دلدار علی مجتہد ۱۹۔ رجب ۱۲۳۵ھ (۲۔ مئی ۱۸۲۰ء) کو فوت ہوئے۔ قطعہ وفات کا آخری شعر یہ ہے:

سروشِ غیب بہاں وقت ناگہاں فرمود　　ستونِ دیں بہ زمیں اوفتاد واویلا

سید انشا نے انھیں کو ایک موقع پر عروسِ سلطنت کا جھومر کہا تھا۔ ان کے پانچ فرزند تھے: سید محمد، سید علی، سید حسن، سید مہدی اور سید حسین۔ یہ سب وقت کے نامور عالم تھے۔

[2] بادشاہ بیگم سے مراد غازی الدین حیدر شاہ اودھ کی بیگم ہے جو مبشر خاں منجم کی بیٹی تھی۔ مبشر خاں شرف خاں کا فرزند اور خیر اللہ خاں رصد بند محمد شاہی کا شاگرد تھا۔ غازی الدین حیدر شہزادگی میں بیگم کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو گیا۔ سعادت علی خاں نے یہ شادی منظور کر لی۔ بعد میں غازی الدین حیدر، بیگم کی ایک خواص "صبح دولت" پر مائل ہو گیا جس سے نصیر الدین حیدر پیدا ہوا۔ بادشاہ بیگم نے صبح دولت کو مروا دیا۔ وہ بڑی مغلوب الغضب، خود رائے اور خود سر تھی۔ غازی الدین حیدر اس سے بہت خوفزدہ رہتا تھا۔ جب معتمد الدولہ آغا میر کو اقتدار حاصل ہوا تو بیگم نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ اس وجہ سے آغا میر نے اپنی بھلائی اسی میں جانی کہ بادشاہ اور بیگم کے تعلقات زیادہ سے زیادہ بگڑ جائیں۔ میر فضل علی جو بعد میں اعتماد الدولہ کے لقب سے نائب السلطنت بنا، بیگم کا معتمد علیہ کارندہ تھا۔

بھروسے پر نصیر آباد کے شیعہ حضرات نے سنیوں کو تنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور غور و مشورہ کے بعد فیصلہ کیا کہ محرم کی آٹھویں تاریخ کو ایک جلوس نکالا جائے، جس کے شرکاء تبرا کہتے ہوئے سنیوں کے محلّے سے گزریں اگر وہ خاموش رہیں اور مرعوب ہو جائیں تو انھیں مزید دبانے کے لیے دوسرے اقدامات کی تجویزیں سوچی جائیں۔ اگر بگڑیں اور روکنا چاہیں تو انھیں بُری طرح مارا جائے۔ چونکہ مجتہد صاحب کو حکومت میں بے حد اثر و رسوخ حاصل تھا اور وہ شیعہ حضرات کے ہم عقیدہ و ہم وطن تھے۔ اس بناء پر کسی کو خفیف سا اندیشہ بھی نہ تھا کہ سنیوں کی فریاد درخورِ سماعت متصوّر ہو گی۔

سُنیوں کی امداد طلبی

سنیوں کو اپنے شیعہ بھائیوں کی ان سکیموں کا علم ہوا تو انھوں نے دب جانا گوارا نہ کیا۔ چونکہ تعداد میں بہت کم تھے، اس لیے اپنے سنی عزیزوں اور ہمسایوں سے امداد کے طلب گار ہوئے۔ ۶ محرم کو نصیر آباد سے قاصد رائے بریلی پہنچا، جس نے سارے حالات سنائے۔ سید عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ سید صاحب مسجد میں بیٹھے تھے۔ آپ نے مختلف اصحاب سے مشورہ کیا۔ بعض نے کہا کہ اپنے عزیزوں کو ہر ممکن مدد دینی چاہیے۔ بعض نے یہ رائے ظاہر کی کہ اس طرح حکومت وقت سے مقابلے کی صورت پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے، اس لیے مدد سے احتراز کرنا چاہیے۔

سید صاحب نے خود غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا کہ ایک جماعت کو ساتھ لے کر نصیر آباد جائیں اور مصالحت سے اس فتنے کا سدباب کر دیں۔ جو گروہ شرارت سے باز نہ آئے، اسے ہر ممکن سعی سے روکیں اور مظلوم کو ظالم کی دستبرد سے بچائیں۔ چنانچہ سید عبدالرحمٰن کو فوراً نصیر آباد بھیج دیا کہ سُنی بھائیوں اور عزیزوں کو تسلی دیں، ۸ محرم تک ہم بھی پہنچ جائیں گے۔

غرض سید عبدالرحمٰن فوراً چلے گئے۔ ان سے پہلے وہاں کل اٹھائیس سنی مرد تھے ان کو شامل کر کے انتیس مرد ہو گئے۔

سید صاحب کے انتظامات

سید صاحب نے روانگی کی تیاری کی تو اور لوگ خود بخود ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ آپ نے گھر سے روپے منگوا بھیجے، لیکن نقد ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ زہرہ بی بی نے اپنے پاؤں کا زیور اُتار کر دے دیا کہ اسے فروخت کر کے خرچ چلایا جائے۔ سیدہ ولیہ (زوجہ ثانیہ) کو علم ہوا تو فوراً پچیس روپے آپ کے پاس بھجوا دیے اور کہا کہ سیدہ زہرہ کا زیور واپس کر دیا جائے۔

آپ عصر کے وقت دائرے سے روانہ ہوئے۔ مغرب کی نماز جہان آباد کے قبرستان میں ادا کی۔ عشا کی نماز پڑھ کے چلے اور اسی شب کو نصیر آباد پہنچ گئے۔ کچھ آدمی ساتھ تھے رات تالاب کے کنارے

گزاری۔ صبح کی نماز کے بعد شہر میں داخل ہوئے۔ آپ کی ایک ہمشیر کی شادی نصیر آباد میں ہوئی تھی۔ پہلے اس کے مکان پر گئے پھر الضیاء علی کے والدین سے ملے۔ بعد ازاں جامع مسجد جا کر دوگانہ ادا کیا اور وہیں بیٹھ گئے[1]

تمام ہمراہیوں کو تاکید فرما دی تھی کہ کسی پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے اور دائرہ اعتدال سے باہر قدم نہ رکھا جائے۔ مخالفوں میں سے اگر کوئی شخص زیادتی کر بیٹھے تو جواباً بھی مجادلے کی صورت پیدا نہ کی جائے۔ شیعہ حضرات کو پیغام بھیج دیا کہ ہمارے لوگ آپ کی طرف ہرگز نہیں آئیں گے۔ آپ خوشی سے تعزیہ داری کریں۔ کوئی مزاحم نہ ہوگا، مگر سابقہ دستور قائم رکھا جائے۔ یہی امر بنیادِ مصالحت بن سکتا ہے۔ کوئی نئی بات نہ کی جائے۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سنیوں کے محلے میں مورچہ بندی کے انتظامات کر لیے گئے تھے تاکہ اگر ان پر اچانک حملہ ہو جائے تو روک تھام کی جا سکے۔ سید عبدالرحمٰن کو قرابین دے کر ایک مکان پر بٹھا دیا گیا تھا اور حکم تھا کہ خدانخواستہ حملہ ہو تو پہلے قرابین چلائی جائے، پھر بندوقیں استعمال کی جائیں۔

سعیِ مصالحت

جب ذرا اطمینان ہو گیا تو شیعہ حضرات میں سے ایک معتبر و سربرآوردہ بزرگ کے پاس پیغام بھیجا کہ ہم یہاں بطور مہمان آئے ہیں۔ برادر پروری کا تقاضا یہ ہے کہ ہر محلے میں سے ایک ایک بزرگ ملاقات کے لیے تشریف لائیں۔ اگر آپ کو تشریف آوری میں تامل ہو تو ہمیں حاضر خدمت ہونے کی اجازت دی جائے۔ پیغام میں یہ بات بھی واضح فرما دی کہ اگر شیعہ حضرات کے نزدیک حضرات شہدائے کربلا کے ماتم و عزا کا حق اسی طریق ادا ہو سکتا ہے کہ وہ تمام محلوں میں جلوس لے کر پھریں تو اس پر بھی اعتراض نہ ہوگا۔ شوق سے پھریں، لیکن تبرا نہ کہیں۔

شیعہ حضرات سید صاحب کی آمد ہی کے باعث سخت رنجیدہ ہو چکے تھے۔ انھوں نے کہلا بھیجا کہ ہمیں جبراً تعزیہ داری سے روکا جا رہا ہے۔ اب ہم تعزیوں اور علموں کے ساتھ لکھنؤ جائیں گے اور حاکم وقت کے پاس فریاد کریں گے۔

یہ محرم کی آٹھویں تاریخ کے واقعات ہیں۔ چنانچہ شیعہ حضرات تعزیے اور جلوس لے کر لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ دو ہی منزل گئے ہوں گے کہ جائس کے پرچہ نویس نے سارے حالات تفصیل سے لکھ کر غازی الدین حیدر کے پاس بھیج دیے۔ شاہ نے وہ تحریر آغا میر نائب السلطنت کے حوالے کر دی۔

---

[1] "وقائع" میں ہے دیوان جی کی مسجد کے چبوترے پر تشریف فرما ہوئے۔

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، نصیر آباد سلون کے پرگنے میں تھا اور یہ پرگنہ بادشاہ بیگم کی جاگیر تھا۔ بیگم اور آغا میر نائب السلطنت کے درمیان شدید دشمنی تھی۔ نائب السلطنت چاہتا تھا کہ موقع ملے تو بیگم کے منتظموں پر فتنہ و فساد کا الزام عائد کر کے جاگیر ضبط کر لے۔ اسے اپنا مقصد پورا کرنے کا یہ خداداد موقع مل گیا تو فوراً فقیر محمد خاں رسالدار کو بلایا جو سید صاحب کا مخلص مرید تھا اور کہا کہ اپنے اور محمود خاں کے رسالے کا ایک ایک دستہ بے تاخیر نصیر آباد بھیج دو۔ سب کے سر عسکر کو بارہ ہزار روپے دو اور کہو کہ موقع پر پہنچتے ہی اس قضیے کو جلد سے جلد ختم کرا دیا جائے[1]۔ انسداد فساد کے یہ خدا ساز اسباب تھے جو اچانک فراہم ہو گئے۔ اس اثنا میں نصیر آباد کے شیعہ حضرات لکھنؤ پہنچ گئے اور شکایت کی کہ سید احمد نے ہمیں علم اٹھانے سے روک دیا ہے، لیکن چونکہ صحیح حالات پہلے معلوم ہو چکے تھے اور آغا میر بیگم کو شکست دینے پر تلا بیٹھا تھا، اس لیے اس نے شیعوں کی شکایت پر کوئی توجہ نہ کی۔

سیّد دلدار علی کی سعی

ایک روایت ہے کہ مولانا سید دلدار علی مجتہد خود آغا میر کے پاس پہنچے اور اس سے مدد چاہی۔ آغا میر نے کہا:

> حضرت آپ تشریف لے جائیں اور اپنے دولت کدے میں آرام سے بیٹھے رہیں
> فتنے کی جو آگ آپ کی وجہ سے بھڑکی ہے، اس کے شعلے آسمان تک پہنچ رہے ہیں
> اگر اس کے اشتعال سے میں اور میرے آقائے محترم محفوظ رہیں اور ریاست کو کوئی
> گزند نہ پہنچے تو باقی عمر اس نعمت الٰہی کے شکر و سپاس میں بسر کروں گا[2]

آخر سید دلدار علی نے بھی شیعوں کو کہلا بھیجا کہ حالات بگڑ گئے ہیں، جس طور پر بھی ممکن ہو، صلح کر لینی چاہیے۔

اس اثنا میں یہ خبر باہر پہنچی تو ارد گرد کے سنی حضرات جوق در جوق نصیر آباد پہنچنے لگے۔ سید صاحب نے سارے لوگوں کے خورو نوش کا انتظام اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ کم و بیش پانسو آدمی دو وقت کھانا کھاتے تھے۔ آخر آپ کو اعلان کرنا پڑا کہ اب کوئی بھائی آنے کی تکلیف نہ کریں۔

---

[1] بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالدار فقیر محمد خاں کو پہلے ہی تمام واقعات معلوم ہو چکے تھے، اس نے معتمد الدولہ آغا میر سے ذکر کیا۔ آغا میر نے یہ قصہ بادشاہ تک پہنچایا تو بادشاہ نے انسداد فساد کے سارے اختیارات آغا میر کو سونپ دیے۔ اس کے بعد آغا میر نے پانسو سوار نصیر آباد بھیجے۔

[2] "مخزن احمدی" صفحہ ۱۵۔

مصالحت سرکاری رسالہ نصیر آباد پہنچا تو اس کے سر عسکر نے شیعہ اور سنی حضرات میں سے معتبر آدمی بلائے، سارے حالات سنے، پھر دونوں فریقوں کے درمیان ایک معاہدہ کرایا جس کے مطابق طے ہوا کہ دیرینہ دستور و معمول کے خلاف کوئی بات نہ کی جائے۔ آئندہ کوئی گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی نہ کرے، محرم اور چہلم کے موقع پر علی الاعلان تبرا نہ کیا جائے۔

اس معاہدے پر فریقین کے ذمہ دار اصحاب کے علاوہ قاضی اور مفتی نے بھی دستخط کیے۔ اس طرح دونوں فریق مطمئن ہو گئے۔ یہی سید صاحب کا حقیقی مدعا تھا۔ یہی غرض لے کر آپ رائے بریلی سے نصیر آباد پہنچے تھے۔

ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ معتمد الدولہ آغا میر نے دو ہزار روپے سید صاحب کی خدمت میں بطور ہدیہ بھیجے، لیکن آپ نے یہ کہہ کر رقم واپس کر دی کہ اصل کام پر کوئی رقم خرچ نہیں ہوئی۔ سید صاحب ۸۔ محرم سے ۱۲۔ محرم تک نصیر آباد میں رہے۔ اور تیرھویں کو رائے بریلی میں واپس گئے[1]

واقعے کی اہمیّت سید ابوالحسن علی فرماتے ہیں کہ مولانا شاہ اسماعیل کے قول کے مطابق نصیر آباد کا واقعہ جہاد کا مقدمہ تھا۔ جس میں سید صاحب کی قیادت اور اسلامی صلاحیت کے جوہر سب سے پہلی مرتبہ عوام پر آشکارا ہوئے۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ واقعہ حزم و تدبر اور نظم و ضبط کا ایک غیر معمولی مظاہرہ تھا۔ ایک طرف وہ غیر مناسب دباؤ ختم ہو گیا جو ایک فریق فراوانی تعداد کی بناء پر دوسرے فریق کے خلاف عمل میں لانے کے درپے تھا۔ دوسری طرف انتہائی نازک حالات کے باوجود باہم کشمکش کی نوبت نہ آئی۔ سید صاحب کی وجہ سے حالات بگڑنے کے بجائے تدریجاً اصلاح پذیر ہوتے گئے۔

---

[1] بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چہلم کے موقع پر پھر ہنگامے کا اندیشہ پیدا ہو گیا اور سید صاحب کو دوبارہ نصیر آباد جانا پڑا میرے نزدیک یہ صحیح نہیں۔ غالباً بعض راویوں کو محرم اور چہلم کے واقعات میں اشتباہ پیدا ہوا۔

چودھواں باب

تبلیغی دَورے

اصلاح و دعوت

جن مختلف مشغولیتوں کا ذکر ہم گزشتہ دو بابوں میں کر چکے ہیں، ان کے علاوہ سید صاحب نے قیامِ وطن کی اس مہلت میں تبلیغی دَورے بھی کیے، جن کا مقصد یہ تھا کہ عام مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کی جائے اور انھیں جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت دی جائے۔ ان دَوروں کا عام رنگ وہی تھا، جس کا نقشہ آپ کے سامنے میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور وغیرہ کے دورے میں پیش ہو چکا ہے۔ صحیح تاریخیں معلوم نہیں ہو سکیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ مختلف اوقات میں دو مرتبہ سید صاحب کان پور کی طرف تشریف لے گئے۔ ایک مرتبہ الہ آباد، بنارس وغیرہ گئے۔ ایک مرتبہ لکھنؤ پہنچے۔ میں ایک باب میں متفرق مقامات کے حالات بیان کروں گا۔ ایک باب میں صرف لکھنؤ کے سفر کا حال لکھوں گا۔

شوق و طلبِ عام

داعیِ حق کبھی اس بات کا منتظر نہیں رہتا کہ لوگ بلائیں تو انھیں پیغامِ حق سنانے کے لیے باہر نکلے۔ اس کا وظیفۂ حیات یہی ہوتا ہے کہ اپنے اوقات کا ایک ایک لمحہ دعوت و ارشاد میں گزارے جہاں تک پہنچنا اس کے امکان میں ہو، خود پہنچے اور ہر اندھیرے میں دعوت و تلقین کے چراغ جلا کر روشنی کا بندوبست کرے۔ سید صاحب کے دَوروں کے سلسلے میں یہ حقیقت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ ان سے کسبِ فیض کی آرزو حد درجہ عام ہو چکی تھی اور جگہ جگہ سے دعوت نامے پہنچ رہے تھے۔ وہ بھی اس طرح کہ آدمی آتے اور بہ اصرار کہتے کہ ہمارے ہاں چلیے۔ چنانچہ "مخزن احمدی" میں گتنہ، مہروڑہ، اہلاد گنج، الہ آباد وغیرہ کے دعوت ناموں کا ذکر بہ طورِ خاص کیا گیا ہے[1]۔

سید صاحب جب دورے پر نکلتے تو شوق و طلبِ عام کا یہ حال ہوتا کہ ایک میل کا فاصلہ بھی طے نہ کرنے پاتے اور گرد و پیش کے دیہات و مقامات سے سیکڑوں آدمی آ کر روک لیتے پھر عجز و الحاح

---

[1] "مخزن احمدی" صفحہ ۵۱ ۔

سے اپنے ہاں لے جاتے۔ مثلاً جب الہ آباد کی طرف گئے تو اگرچہ یہ مقام رائے بریلی سے صرف چار منزل پر تھا لیکن سید صاحب نے یہ فاصلہ بمشکل ایک مہینے اور چند روز میں طے کیا[1]

سلون

جب الہ آباد و بنارس کے دورے پر نکلے تو "مخزن احمدی" کے بیان کے مطابق ایک سو ستر آدمی ہمراہ تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکثر نیاز مندوں کو ایک لمحے کے لیے بھی مفارقت گوارا نہ تھی۔ پھر جو لوگ بہ اصرار روکتے تھے، یہ جانتے ہوئے روکتے تھے کہ بہت بڑی مہمانداری کا بوجھ اٹھانا ہوگا۔ بایں ہمہ ان کے شوق کا جذبہ قطعاً افسردہ نہ ہوتا تھا۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سید صاحب کے لیے عام لوگوں کے دلوں میں کس قدر والہانہ تڑپ پیدا ہو چکی تھی۔ اس دورے میں پہلا بڑا مقام سلون آیا، جہاں شاہ اشرف[2] کا مزار تھا۔ شاہ کریم عطا[3] اس مسند کے سجادہ نشین تھے۔ غالباً عرس کا موقع تھا اور وہاں بڑے زور کی قوالی ہوتی تھی۔ مُرید کورے گھڑے میں پانی بھر کر سر پر رکھ لیتے اس حالت میں گاتے اور رقص کرتے۔

سید صاحب نے خود شاہ کریم عطا سے ملاقات کی اور کہا کہ آپ درویش ہیں، دین کے ہادی سمجھے جاتے ہیں۔ آپ کی اجازت سے اس قسم کی خلاف شرع حرکتیں ہوتی رہیں تو عام لوگوں کے لیے یہ حجت و دستاویز بن جائیں گی۔ انصاف سے بتائیے کہ کیا ان کے لیے سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی دلیل موجود ہے؟ شاہ کریم عطا صاحب نے جواب دیا کہ اس کا جواب دوسرے موقع پر دیا جائے گا۔

سید صاحب نے بعد میں مولانا عبدالحی کو شاہ کریم عطا کے پاس بھیج دیا۔ مولانا نے چند لمحوں میں شاہ صاحب کو لاجواب کر دیا۔ انھوں نے پھر کہہ دیا کہ مزید گفتگو دوسرے موقع پر ہوگی۔ بعد میں سید صاحب کو پیغام بھیجا کہ صرف آپ سے مل کر بات چیت کی آرزو ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ کسی مرید نے شاہ کریم عطا کو بتا دیا تھا، سید صاحب زیادہ پڑھے لکھے نہیں اور انھیں گفتگو میں شکست دے لینا سہل ہوگا۔

---

[1] مخزن احمدی صفحہ ۵۶ ۔ [2] پیر شاہ اشرف سلونی کا انتقال ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۴ء) میں ہوا۔ یہ اپنے عہد کے بلند رتبہ بزرگ تھے

[3] شاہ کریم عطا نے سید صاحب کی شہادت سے دو برس بعد وفات پائی۔ ان کی تاریخ وفات یہ ہے:

ڈوبا جو وہ نیّر درخشاں کریم
تاریک ہوا جہاں بچشم احباب،
چلّائے نکال حیّ یہ اہل افلاک
"جنید زجائے خویش قطب الاقطاب"

مصرع تاریخ کے عدد ۱۲۶۱ بنتے ہیں، ان میں سے حیّ کے تیرہ عدد نکال دیے جائیں تو ۱۲۴۸ھ تاریخ نکل آتی ہے۔

سید صاحب یہ پیغام پاتے ہی خود گئے۔ چند لمحوں میں شاہ کریم عطا نے تمام خطاؤں کا اعتراف کر لیا اور اس عرس کے سلسلے میں ساری غیر شرعی حرکات بند کر دیں۔

الہ آباد

سلون سے نکل کر سید صاحب خدا جانے کہاں کہاں ٹھہرے۔ ہمیں الہ آباد تک صرف اہلاد گنج، مانک پور اور کڑا کی منزلوں کا علم ہے۔ اہلاد گنج میں وہاں کے حاکم میرزا کاظم بیگ اور بہت سے لوگوں نے بیعت کی۔ راستے میں ایک روز ایک ایسے مقام پر ٹھہرے جو بے چراغ ہو چکا تھا۔ بڑی مشکل سے کھچڑی پکانے کا سامان فراہم ہوا۔ رکابیاں یا سینیاں ساتھ نہ تھیں۔ ایک کوئیں کی پختہ مینڈ کو دھو کر صاف کیا۔ کھچڑی اسی پر ڈال لی اور درویشان باخدا کا وہ قافلہ خوشی خوشی کھا کر ذکر و فکر میں مشغول ہو گیا۔

الہ آباد میں جائے قیام کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شاہ اجملؒ[1] کے دائرے میں ٹھہرے تھے، جس کے متعلق ناسخ نے لکھا تھا:

ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں

بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ قیام دوسری جگہ ہوا تھا، لیکن شاہ اجملؒ سے بھی ملاقات کی تھی اور ان کے ہاں کھانا کھایا تھا۔

شیخ غلام علی

الہ آباد کے زمانۂ قیام میں بے شمار لوگوں نے بیعت کی۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر شیخ غلام علی صاحب ہیں۔ شیخ صاحب وقت کے ممتاز امرا میں شمار ہوتے تھے۔ اودت نرائن مہاراجہ بنارس کی طرف سے عملدار تھے۔ مہرونڈہ اصلی وطن تھا۔ شیخ صاحب ان تمام اخلاقی امراض میں مبتلا تھے جو اس زمانے کے امرا میں عام طور پر پھیلی ہوئی تھیں۔ سید صاحب سے ارادت مندی کا رشتہ استوار ہو گیا تو تمام غیر شرعی اعمال سے بہ اخلاص قلب توبہ کی۔ پھر ان کی پوری زندگی اسلامیت کے سانچے میں ڈھل گئی ان کے پاس بیسیوں سنہری اور روپہلی حقے تھے، وہ سب

---

[1] ابوالفضل کنیت، ناصرالدین محمد اجمل نام، اپنے وقت کے اکابر اہل علم اور بزرگ اولیا میں سے تھے۔ سنہ ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۱ء) میں وفات پائی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی ملاقات کے لیے گئے تو راہ میں طے کر لیا تھا کہ اگر اجمل ایک کو قند کا اور دوسرے کو شکر کا شربت پلائیں گے تو سمجھ لیں گے کہ اہل کشف میں سے ہیں۔ شاہ صاحب نے دونوں مہمانوں کو گلے سے لگایا۔ پھر ملازم سے کہا کہ دو گلاس شربت لاؤ۔ ایک قند کا، دوسرا شکر کا۔ کیا کروں ان کی خواہش یہی ہے۔

تڑواکر دریا میں بہا دیے۔ سید صاحب کے نیازمندوں میں سے انفاق فی سبیل اللہ میں غالباً کوئی بھی شخص شیخ غلام علی کے درجے کو نہ پہنچ سکا۔ ایک راوی کا بیان ہے:

> حضرت کے ایسے مخلص بے ریا اور محب باصفا تھے کہ میں نے آج تک (ان جیسا) نہیں دیکھا[1]

شیخ صاحب نے بیسیوں ہدایا کے علاوہ ایک نہایت قیمتی قالین بھی سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ شیخ صاحب کے پاس خاطر سے ایک مرتبہ اس پر بیٹھے، پھر ساتھیوں میں سے ایک نے عرض کیا کہ میرے پاس لحاف نہیں۔ محترم سید صاحب نے وہی قالین اُٹھا کر اُسے دے دیا۔

بنارس

الہ آباد سے نکلے تو مختلف مقامات پر ٹھہرتے ہوئے بنارس پہنچے[2]۔ وہاں مولوی عبدالقادر امیروں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ سید صاحب کے دوست تھے۔ اس بنا پر ساتھیوں کا خیال تھا کہ غالباً وہیں قیام ہوگا۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ مولوی عبدالقادر چونکہ ہمارے ہم طریق اور ہم مشرب نہیں، اس لیے ان کے پاس ٹھہرنا مناسب نہ ہوگا۔ چنانچہ جماعت نے سہیسر کی مسجد میں قیام کیا۔ خود سید صاحب رفیقوں کی ایک جماعت کے ساتھ پاس کی ایک شاہی مسجد میں مقیم ہو گئے جو مدت سے بے آباد پڑی تھی اور اس میں بہت کوڑا کرکٹ جمع ہو گیا تھا۔ سید صاحب نے اسے صاف کرا کے نئے سرے سے آباد کر دیا[3]۔

بنارس میں سید صاحب قریباً ایک مہینا قیام فرما رہے۔ اس اثنا میں جن مردوں اور عورتوں نے بیعت کی، ان کی تعداد دس پندرہ ہزار سے کم نہ ہوگی۔ بنارس زربفت کا بہت بڑا مرکز تھا اور وہاں مسلمانوں میں سے زیادہ تر نورباف، گندی گر اور دھوبی رہتے تھے۔ مولانا عبدالحی وعظ فرمایا کرتے تھے۔ ان لوگوں کو

---

[1] وقائع صفحہ ۱۴۴۔ [2] سفر بنارس کی ایک روایت میں ہے کہ جاڑے کا موسم تھا اور قطرہ افشانی ہو رہی تھی۔ الہ آباد کے سلسلے میں بھی بیان ہو چکا ہے کہ ساتھیوں میں سے ایک نے عرض کیا، میرے پاس لحاف نہیں، سید صاحب نے شیخ غلام علی کا نذر کردہ قیمتی قالین اُٹھا کر اسے دے دیا۔ میرا خیال ہے کہ ۱۲۳۵ھ کا جاڑا ہوگا جو ربیع الاول، ربیع الثانی اور جمادی الاولیٰ میں تھا یعنی دسمبر ۱۸۱۹ء، جنوری اور فروری ۱۸۲۰ء میں۔ [3] "مخزن" میں ہے: در مسجد سہیسر رحل اقامت انداختند۔ لیکن چونکہ دوسری روایتوں میں پاس کی ایک شاہی مسجد میں قیام کا ذکر بھی آیا ہے، اس لیے میرا خیال ہے کہ دونوں مسجدوں میں ساتھیوں کی جماعت بٹ گئی ہوگی، جو یقیناً بہت بڑی تھی اور ایک مسجد میں سب لوگ نہ رہ سکتے تھے۔

بہت اثر ہوا۔ ان کے پیروں نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ ہر گھر سے چھ مہینے کے بعد مقررہ فتوح مل جاتی پیر صاحب نماز اور روزہ وغیرہ اوامر کی معافی کے پروانے لکھ دیتے۔ سید صاحب کی برکت سے یہ تمام بدعملیاں ختم ہو گئیں اور لوگوں میں دینداری کا عام ذوق پیدا ہو گیا۔ بیعت کرنے والے اکابر میں شاہ عبداللہ شنگرفی اور میرزا کریم اللہ بیگ رئیس بھی تھے۔

وہاں تیموری شہزادے بھی رہتے تھے۔ ان میں سے بعض نے بیعت کی اور قیمتی پارچے بطور نذر سید صاحب کی خدمت میں گزرانے۔ آپ نے مولوی محمد یوسف پھلتی سے فرمایا کہ ان پارچوں کو فروخت کر کے گاڑھے، گزی کے تھان خرید لو اور تمام ساتھیوں میں تقسیم کر دو تاکہ ضرورت کے مطابق کپڑے بنوالیں[1]۔

مخزن احمدی میں بنارس کے انگریز حاکم آگسٹس بروک کی مسلمان بیوی حیات النسا بیگم کی بیعت کا بھی ذکر ہے؛ وقائع میں بہ تصریح مرقوم ہے کہ اس بارے میں سید محمد علی صاحب کو شبہ ہوا۔ اس بی بی کی بیعت کا واقعہ سفر حج میں پیش آیا[2]۔ لہٰذا ہم اسے اسی موقع پر درج کریں گے۔

قیام بنارس کے دوران میں سید صاحب اپنے رفیقوں کو بار بار تاکید فرماتے رہے کہ خوب ذکر کرو۔ یہ شہر کفر و شرک کے ظلمات سے لبریز ہے، اسے ذکر الٰہی کے انوار سے منور کر دو۔

سلطان پور

بنارس سے نکلے تو مختلف مقامات میں ٹھہرتے ہوئے سلطان پور کی طرف تشریف لے گئے۔ وہاں غلام حسین خاں لشکر کے ساتھ مل گیا۔ وہ سرکار لکھنؤ کی طرف سے سلطان پور کا حاکم تھا۔ اس لشکر کے بہت سے آدمی پہلے سے سید صاحب کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے۔ انھوں نے بہ اصرار ٹھہرا لیا اور بہت لوگوں نے بیعت کی۔ دو ہفتے لشکر میں ٹھہر کر آپ حسب معمول جگہ جگہ قیام کرتے ہوئے رائے بریلی پہنچ گئے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس تبلیغی دورے میں کم از کم تین ماہ کی مدت صرف ہوئی ہو گی۔

پہلا دورہ کان پور

کان پور کی سمت میں سید صاحب نے دو مرتبہ دورہ کیا۔ پہلے دورے کے سلسلے میں محض مورائیں میں قیام کے کچھ حالات معلوم ہیں۔ کان پور

---

[1] مولوی مرتضیٰ خاں کا بیان ہے کہ ٹیپو سلطان کے شہزادوں نے بیعت کی تھی (تاریخ عجیبہ صفحہ ۴۴) لیکن مجھے اب تک ٹیپو سلطان کے کسی شہزادے کی اقامت بنارس کا علم نہیں ہو سکا۔ میرا خیال ہے کہ مولوی مرتضیٰ خاں نے تیموری شہزادوں کو ٹیپو سلطان کے شہزادے سمجھ لیا۔ [2] وقائع، صفحہ ۱۱۔

کے متعلق صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ آپ چھاؤنی میں (غالباً سید محمد یاسین کے مکان پر) ٹھہرے تھے ۔ یہاں ایک انگریز کی مسلمان بیوی بڑی دولت مند تھی۔ اس کے اولاد نہ تھی۔ دو لڑکوں اور لڑکیوں کو پال لیا تھا۔ ایک لڑکی کی شادی مرزا عبدالقدوس سے کر دی تھی۔ مرزا صاحب سید صاحب کے گہرے عقیدت مند بن گئے، لیکن آپ نے اس بی بی کی دعوت قبول نہ کی ۔

قیام مورائیں کے دوران میں چار دوست، اللہ بخش خاں، شمشیر خاں، مہربان خاں اور شیخ رمضان آپ کی خدمت میں اکٹھے حاضر ہوئے۔ چاروں بڑے سجیلے اور کڑیل جوان تھے۔ سید صاحب نے انھیں دیکھتے ہی فرمایا: یہ بھائی ہمارے کام کے ہیں، پیرزادوں سے ہم کیا کام لے سکتے ہیں؟[1] ان چاروں نے بیعت کی اور سید صاحب کے ساتھ ہو گئے۔ سفر لکھنؤ میں بھی ہم رکاب[2] تھے۔ حج سے بھی مشرف ہوئے ۔

مہربان خاں سے ایک مرتبہ سید صاحب نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ سے اور کام لے گا اور ان تین بھائیوں سے اور کام لے گا، لیکن چاروں کے کام اس کی رضامندی کے عین مطابق ہوں گے۔ سید صاحب نے جہاد کی نیت سے ہجرت کی تو چاروں ساتھ تھے۔ مہربان خاں سید صاحب کے اہل و عیال کی خدمت پر مقرر ہوئے اور سندھ میں رہے۔ واقعہ بالاکوٹ کے کئی برس بعد سید صاحب کے اہل و عیال ٹونک آ گئے تو مہربان خاں بھی ساتھ تھے۔ سنہ ۱۲۷۴ھ تک زندہ تھے۔ باقی تینوں جواں مرد اس جماعت میں شریک تھے، جس نے اکوڑہ سے جہاد کا آغاز کیا تھا۔ اللہ بخش خاں اس جماعت کے قائد تھے۔ تینوں اس جنگ میں شہید ہوئے ۔

دوسرا دورہ

دوسری مرتبہ سید صاحب نے کان پور کے اطراف کا دورہ اس زمانے میں کیا جب حج کے لیے سفر کا ارادہ فرما چکے تھے اور اعلان عام کر دیا تھا کہ جو چاہے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اگر کسی کے پاس خرچ نہ ہو تو میں ادا کر دوں گا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ کان پور کے انگریز کی مسلمان بی بی نے اپنے داماد مرزا عبدالقدوس کو رائے بریلی بھیج کر سید صاحب کو بلوایا تھا۔

چنانچہ آپ رائے بریلی سے روانہ ہوئے تو پہلے بٹھور نام ایک بستی میں پہنچے جہاں والی لکھنؤ کا ایک جلیش ٹھہرا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے روک لیا۔ پھر مورائیں، رنجیت پور، پڑھا اور بہیر پور

---

[1] "وقائع" صفحہ ۳۱۳ ۔ [2] ایک روایت میں ہے کہ لکھنؤ میں جب معتمد الدولہ آغا میر نائب السلطنت نے دعوت کی تھی تو جن لوگوں کو شاہ اسماعیل نے سید صاحب کے باڈی گارڈ کی حیثیت میں ساتھ لیا تھا، ان میں اللہ بخش بھی تھے ۔

وغیرہ مقامات میں دو دو تین تین دن قیام کا ذکر ملتا ہے، تفصیل کچھ نہیں بتائی گئی۔ اس کے بعد آپ گنگا کو عبور کر کے انگریز کی مسلمان بی بی کے مکان پر اُترے، لیکن اُترتے ہی مرزا عبدالقدوس سے کہہ دیا کہ ہمارے آدمیوں کو کھانا پکانے کی جگہ بتا دی جائے، یعنی آپ اس بی بی کے ہاں سے کھانا کھانے پر راضی نہ ہوئے۔ مرزا عبدالقدوس نے عرض کیا کہ میرا اپنا کاروبار ہے۔ تجارت کرتا ہوں۔ وہی روپیہ آپ کی مہمانداری پر صرف ہوگا۔ اس کی دعوت آپ نے قبول فرمائی۔ لیکن جتنے دن ٹھہرے اکثر دعوتیں ہوتی رہیں اور مرزا عبدالقدوس کے ہاں سے بھی کھانا کھانے کی نوبت بہت کم آئی۔

مسلمان بی بی نے ایک موقع پر چار ہزار روپے آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ آپ نے فرمایا فی الحال حج کے لیے جا رہا ہوں۔ واپس آ کر جب جہاد کو جاؤں گا تو جیسا مناسب ہو گا، کہلا بھیجوں گا۔ پھر بی بی نے ایک مکان نذر کیا جو اُس زمانے میں بھی تیس چالیس ہزار روپے سے کم کی مالیت کا نہ تھا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ میں اس مکان کو کیا کروں گا؟ حج کے لیے جا رہا ہوں اور اپنا مکان بھی چھوڑ جاؤں گا۔ بی بی نے عرض کیا کہ میں تو اب دے چکی، آپ جو چاہیں کریں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ یہی بات ہے تو اسے مرزا عبدالقدوس کو دے دو۔ بی بی بولی کہ میں نے آپ کو دے دیا ہے، آپ جسے چاہیں دے دیں۔ چنانچہ سید صاحب نے وہ مکان مرزا عبدالقدوس کو دے دیا۔

اس زمانے میں کان پور کے دو قصاب بہت دولت مند اور صاحب اثر مانے جاتے تھے، ایک عبداللہ اور دوسرا اس کا بھائی محمد تقی۔ محمد تقی پہلے بیعت کر چکا تھا عبداللہ نے اب بیعت کی۔ ان دونوں کی وجہ سے کانپور کے بہت سے لوگ بیعت ہوئے۔ ان میں محمد بخش رفوگر اور اس کے بھائی حسین بخش کا بھی ذکر آتا ہے۔

مراجعت

کان پور سے سید صاحب منجھاؤں گئے۔ اصل میں قاضی حمایت اللہ نے اپنے بھائی کو بھیج دیا تھا کہ سید صاحب کو ساتھ لائے۔ وہاں مخنثوں کا ایک طائفہ رہتا تھا، جن میں سے بارہ تیرہ برس کا ایک لڑکا قاضی حمایت اللہ کے بھائی سے بہت مانوس تھا۔ اس نے بھی سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی، عبداللہ بسم اللہ نام رکھا گیا۔ جہاد میں ساتھ تھا۔ اکوڑہ اور شیدو کی جنگوں میں شریک ہوا اور بڑی مردانگی سے لڑا۔ جنگ شیدو کے بعد مجاہدین چنگلئی (واقع خدوخیل) میں جا ٹھہرے تھے۔ وہاں بیمار ہو کر واصل بحق ہوا۔

منجھاؤں سے سید صاحب جہان آباد، کھجوہ اور فتح پور ہوتے ہوئے دلمئو پہنچے۔ اس وقت تک مولانا عبدالحئی بھی کشتی کے ذریعے دلمئو پہنچ گئے تھے۔ رات دلمئو میں میاں عبدالصمد کے مکان پر گزاری

دوسرے روز نمازِ ظہر سے قبل رائے بریلی پہنچ گئے۔ [1]

دعوتِ عزیمت

سید صاحب نے ایک ایسے کام کا ارادہ فرمایا تھا جو مقامِ عزیمت میں رسوخ و استحکام کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا تھا اس لیے تمام ارادت مندوں کو عزیمت کی تربیت دینے پر خاص توجہ مبذول تھی۔ غالباً اسی زمانے کا ذکر ہے کہ مولانا سید منظر علی صاحب عظیم آبادی نے بیعت کی اور اپنے ہاں وعظ و تذکیر کے ذریعے سے مسلمانوں کو اتباعِ سنت پر آمادہ کرنے لگے۔ ایک موقع پر تعزیہ داری کو روک رہے تھے۔ خدا جانے کیا واقعات پیش آئے کہ ان پر تعزیہ شکنی کا الزام لگا، مقدمہ قائم ہو گیا اور گرفتار ہوئے۔ ایک دوست شیخ عیدا نے ضمانت دے کر رہا کرایا۔ مولانا رہائی پاتے ہی وطن سے بھاگے اور گورکھ پور پہنچ گئے۔

سید صاحب سے ملنے کے لیے آئے اور آپ نے حالات سنے تو سخت ناراض ہوئے۔ مولانا سمجھے بیٹھے تھے کہ میں نے عشقِ دین میں وطن چھوڑا ہے اس لیے ثواب کا مستحق ہوں۔ سید صاحب نے فرمایا: آپ ثوابِ ہجرت کے امیدوار ہیں؟ حالانکہ آپ کی بیعت بھی ٹوٹ گئی۔ آپ کے جسم کو خفیف سی تکلیف بھی نہیں پہنچی اور دوسرے نیک مسلمانوں کو مصیبت میں الجھا کر نکل آئے۔ دوبارہ بیعت کیجیے اور فوراً واپس جائیے، وہاں جو کچھ پیش آئے، اسے صبر و خوش دلی سے برداشت کیجیے۔

چنانچہ مولوی صاحب واپس گئے۔ حسنِ اتفاق سے ان کے خلاف مقدمہ ثابت نہ ہو سکا اور بری ہو گئے۔

یہی تربیت تھی جس نے تھوڑی ہی مدت میں سید صاحب کے پاس انسانیت کے وہ گرانمایہ گوہر جمع کر دیے جن کی مثالیں اسلامی تاریخ کی اکثر صدیوں میں شاید ہی مل سکیں۔

---

[1] بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گندہ بہار کا موسم تھا۔

پندرھواں باب

دورۂ لکھنؤ

نائب السلطنت اودھ کا دعوت نامہ

اب صرف دورۂ لکھنؤ کی داستان باقی رہ گئی، جس کے متعلق زیادہ روایات ملتی ہیں، اگرچہ وہ غیر مرتب ہیں اور اس غرض سے ضبط تحریر میں نہیں لائی گئی تھیں کہ پچاس سو برس بعد میں آنے والا شائق تحقیق ان سے حالات کا صحیح نقشہ مرتب کر سکے۔

ایک روایت میں ہے کہ الٰہ آباد اور بنارس کے دورے سے سید صاحب لوٹے تو چند روز بعد لکھنؤ کا قصد کر لیا گیا۔ تمام قرائن اسی کے موید ہیں، لیکن یہ جان لینا چاہیے کہ سید صاحب الٰہ آباد و بنارس کے دورے سے بیشتر کان پور کا پہلا سفر کر چکے تھے۔ ان کا دوسرا نکاح بھی ہو چکا تھا اور نصیر آباد کا واقعہ بھی پیش آ چکا تھا جو معتمد الدولہ آغا میر نائب السلطنت اودھ سے سید صاحب کے تعارف کا ذریعہ تھا۔ صرف کان پور کا دوسرا دورہ سفرِ لکھنؤ کے بعد پیش آیا۔[1]

"مخزنِ احمدی میں ہے کہ آغا میر نائب السلطنت نے خود لکھنؤ بلایا تھا۔ دعوت نامہ کا مضمون یہ تھا:

آوازۂ وعظ و تذکیرِ آں روشن ضمیر عالمگیر
گردیدہ اگر بہ قدوم میمنت لزوم خود اہالی لکھنؤ را
عموماً و ایں مشتاق مستمند را خصوصاً بنوازند بعید از
اخوت و مروت و فتوت نخواہد بود۔[2]

آپ کے وعظ و تذکیر کی شہرت زمانے بھر
میں پھیل چکی ہے اگر اہل لکھنؤ کو عموماً اور مجھ مشتاق
و طلبگار زیارت کو خصوصاً تشریف آوری سے
نوازیں تو یہ امر رشتہ برادری، مروت اور عالی حوصلگی
سے بعید نہ ہوگا۔

---

[1] وقائع احمدی سے ظاہر ہوتا ہے کہ سفر لکھنؤ سنہ ۱۲۳۶ھ میں ہوا۔ اس لیے کہ مفتی غلام حضرت کا انتقال اسی سال ہوا:

تاریخ وفات
مردہ مفتی غلام حضرت افسوس — کو بود بہ شہر لکھنؤ حاکم شرع
سالِ تاریخ رحلتِ آں مرحوم — زمرۂ خرد گفت "بود خادم شرع"

سیرت سید احمد شہید طبع چہارم ص ۲۰۳ حاشیہ۔ [2] مخزن ص ۵۲

دعوت نامہ کیوں بھیجا؟

معتمد الدولہ آغا میر کی طرف سے اس قسم کا دعوت نامہ اس زمانے میں بھی تعجب انگیز ہوگا اور آج تو یہ بات کسی واقف حال کے خیال میں بھی نہیں آسکتی کہ آغا میر نے شوق سے سید صاحب کو بلایا ہوگا۔ وہ سید صاحب کا ہم عقیدہ یا ہم مشرب نہ تھا۔ دین، ملک، قوم یا خلق خدا کی خدمت کے لیے اس کے پہلو میں کوئی جگہ نہ تھی۔ میرزا غالب سید صاحب کے اس سفر سے چند سال بعد کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ بھی ٹھہرے تھے۔ اس زمانے میں بھی آغا میر ہی نائب السلطنت تھا۔ میرزا نے اس کے کردار و اخلاق کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دین و ملک و قوم کی خدمت تو رہی ایک طرف وہ شخص دنیا داریوں اور کام جوئیوں میں بھی چنداں عالی ہمت، بلند نظر اور دور اندیش نہ تھا۔ پھر اسے سید صاحب سے کیوں دلبستگی پیدا ہوئی؟ میرا خیال ہے کہ وہ واقعہ نصیر آباد کے سلسلے میں سید صاحب کے عزم و ہمت کا اندازہ کر چکا تھا اور جانتا تھا کہ ان میں قیادت عامہ کے تمام جوہر بوجہ اتم موجود ہیں۔ یہ بھی اُسے معلوم تھا کہ عام لوگ جوش عقیدت میں پروانہ وار سید صاحب پر گر رہے ہیں۔ ایسی شخصیت کے ربط و ضبط سے آغا میر کیوں کر بے نیاز ہو سکتا تھا، جس کے نزدیک اپنی کارفرمائی کی حفاظت ہی زندگی کا پہلا اور آخری نصب العین تھی۔ سید صاحب کے کئی پرانے دوست اور رفیق لکھنؤ کی فوج میں بلند عہدوں پر مامور ہو چکے تھے۔ مثلاً فقیر محمد خاں آفریدی رسالدار اور عبدالباقی خاں قندھاری۔ آغا میر کو ان پر بہت بھروسا تھا۔ ممکن ہے، انھوں نے بھی نائب السلطنت کو سید صاحب کی طرف متوجہ کیا ہو۔

بہرحال دعوت نامہ آیا اور سید صاحب لکھنؤ گئے، لیکن دوران قیام میں حکومت یا آغا میر کی مہمانداری سے قطعاً فائدہ نہ اٹھایا، بلکہ دوستوں اور عقیدت مندوں ہی نے قیام کا انتظام کیا۔ البتہ آغا میر کے ہاں دو دعوتیں ضرور کھائیں۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس نے دعوت نامہ بھیجنے کے بعد مہمانداری کا انتظام خود نہ کیا یا سید صاحب نے مقاصد تبلیغ کے پیش نظر مہمان بننا مناسب نہ سمجھا۔ یہ بھی واضح ہے کہ ملاقات کے بعد آغا میر کا جوش عقیدت بظاہر ٹھنڈا پڑ گیا اس لیے کہ پھر سید صاحب کے سلسلے میں اس کا ذکر نہیں آتا۔ اس پر تعجب نہیں ہو سکتا اس لیے کہ سید صاحب کسی درجے میں بھی آغا میر کے اغراض و حصول کار کے لیے مفید و سود مند نہیں ہو سکتے تھے اور آغا میر کے لیے خلق خدا سے ربط و تعلق صرف ذاتی اغراض ہی کی بنا پر موجود پچی تھا۔

سفر

سید صاحب نے لکھنؤ کا ارادہ فرمایا تو خاصی بڑی جماعت ساتھ ہو گئی، جس کی تعداد اسّی سے پونے دو سو تک بتائی جاتی ہے[1]۔ ان تمام اصحاب کا سامان چھکڑوں پر لاد دیا گیا، لیکن سب

[1] سید عبدالرحمٰن کی روایت ہے کہ کل اسّی آدمی ساتھ تھے۔ "مخزن احمدی" میں ان کی تعداد ایک سو ستر بتائی گئی ہے اور "وقائع" میں پونے دو سو۔ یا تو یہ سمجھنا چاہیے کہ سید عبدالرحمٰن کی روایت میں سے سو کا ہندسہ اتفاقیہ حذف ہو گیا یا یہ ماننا

کے لیے سواری کا انتظام نہ کیا گیا اور نہ ضروری تھا۔ ہاں سید صاحب کے لیے ایک یکہ لے لیا گیا تھا اور غالباً پوری جماعت کے ساتھ ایک دو گھوڑے بھی تھے۔

سید صاحب کے چھوٹے بھانجے سید عبدالرحمٰن بھی ساتھ تھے، جو اس زمانے میں لکھنؤ میں کسی فوجی عہدے پر مامور تھے اور قندھاریوں کی چھاؤنی میں رہتے تھے۔ رائے بریلی سے سید صاحب نکلے تو پہلی منزل حسن گنج میں ہوئی۔ دوسری منزل کا نام نہیں بتایا گیا، لیکن وہ لکھنؤ سے قریب ہوگی۔ دوسری منزل پر عشا ہی کے وقت سید عبدالرحمٰن کو حکم دے دیا گیا کہ:

> کچھ رات رہے سے تم آگے چل کر قندھاریوں کی چھاؤنی میں اپنے مکان کو صاف کروا کر فرش بچھوا رکھو اور کچھ بھونے ہوئے چنے اور نمک مرچ اور کچھ گڑ بھی تیار رکھنا۔[1]

چنانچہ سید عبدالرحمٰن کچھ رات رہے ہی سے روانہ ہو گئے۔ سید صاحب صبح کی نماز کے بعد سوار ہوئے اور پہر دن چڑھے قندھاریوں کی چھاؤنی میں پہنچ گئے۔ سید عبدالرحمٰن کے مکان پر چنے، نمک مرچ، گڑ وغیرہ چیزیں تیار تھیں۔ سب نے تھوڑے تھوڑے چنے چابے پھر پانی پی کر کچھ دیر سو رہے۔ ظہر کی نماز کے بعد ملاقاتیوں کی آمد شروع ہوئی۔ ان میں سے پانچ چھ فوجی سردار بہ طور خاص قابل ذکر ہیں جنھوں نے سترہ اشرفیاں بہ طور نذر پیش کیں۔[2]

بارہ چودہ برس پیشتر سید صاحب لکھنؤ آئے تھے تو بالکل گمنام تھے۔ اب ان کی شہرت عظمت و تقدس سے اونچے اونچے ایوانوں میں گونج پیدا ہو چکی تھی، لیکن سادگی، بے تکلفی اور فروتنی میں قطعاً فرق نہ آیا۔ دیکھیے، لکھنؤ میں ان کے دوست اور نیاز مند بھی موجود تھے۔ نائب السلطنت کی طرف سے دعوت بھی پہنچ چکی تھی، لیکن پہنچے تو نہ کسی کو خبر کی، نہ خود بخود کسی کے ہاں گئے۔ اپنے بھانجے کے مکان پر قیام کیا، چنے چاب کر وقت گزار لیا۔ لوگ خود آ آ کر دعوتوں کا انتظام کرنے لگے تو دعوتیں قبول فرمالیں۔

جائے قیام سید صاحب لکھنؤ میں خاصی مدت تک ٹھہرے رہے۔ میری نظر سے جو روایتیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۳) پڑے گا کہ رائے بریلی سے چلتے وقت کل اسی آدمی ساتھ تھے، بعد میں تعداد بڑھتی گئی۔ ارادت مندوں کا طریقہ یہ تھا کہ بیعت کے بعد کسب فیض کے لیے سید صاحب کے ساتھ ہو جاتے تھے۔ خود سید صاحب اصحاب فراغت کو بہ نظر تربیت روک لیتے تھے۔

[1] "وقائع" صفحہ ۱۸۱۔

[2] ان کے نام یہ ہیں: محمد حسن خاں (پانچ اشرفی)، خلیل اللہ خاں (چار اشرفی)، مصطفیٰ خاں بن حسن خاں (تین اشرفی)، عبدالرحیم خاں (تین اشرفی)، عبدالمعبود خاں (دو اشرفی)

گزری ہیں، ان میں چھ یا سات جمعے وہاں ادا کرنے کا ذکر ہے۔ مولانا عبدالحی ہر جمعہ کے بعد عموماً وعظ فرمایا کرتے تھے۔ جاتے ہی قندھاریوں کی چھاؤنی میں ٹھہرے تھے۔ پھر اسد علی بیگ کمیدان اور میرزا اشرف بیگ رسالدار آپ کو شہر میں لے گئے اور اکبری دروازہ کے پاس میر مسکین کی حویلی میں ٹھہرایا۔ قیامگاہ یقیناً اچھی اور وسیع ہوگی لیکن پاس کی مسجد بہت چھوٹی تھی۔ سید صاحب ایسی جگہ رہنا چاہتے تھے، جہاں قریب وسیع مسجد ہوتا کہ ساتھی بھی باطمینان نماز ادا کر سکیں۔ چنانچہ مختلف روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ اسد علی بیگ کمیدان نے شیخ امام بخش تاجر کی نوتعمیر کوٹھی کا انتظام کر لیا جو دریائے گومتی کے کنارے شاہ پیر محمد کے ٹیلے کی مسجد سے قریب تھی۔ چنانچہ سید صاحب اس میں منتقل ہو گئے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام رفیق کوٹھی میں ٹھہرے تھے لیکن خود سید صاحب شیخ امام بخش کے اس مکان میں قیام فرما تھے، جو یحییٰ گنج میں تھا۔ مولوی خرم علی بلہوری جب لکھنؤ میں سید صاحب سے ملے تو آپ کا ڈیرا فقیر محمد خاں رسالدار کی قیام گاہ (واقع خیالی گنج) کے احاطے میں ایک خیمے میں تھا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ سید صاحب امام علی خاں داروغہ شاہ لکھنؤ کے مکان میں ٹھہرے تھے۔

ان روایتوں میں تناقض نہیں۔ سید صاحب چونکہ ایک عرصے تک لکھنؤ میں قیام فرما رہے، یقین ہے کہ مختلف دوستوں یا ارادت مندوں کے اصرار کے باعث انھیں تھوڑے تھوڑے دن کئی جگہ ٹھہرنا پڑا ہوگا۔ جس راوی نے انھیں جہاں مقیم دیکھا، وہیں کا ذکر کر دیا۔ سمجھنا چاہیے کہ قیام لکھنؤ کے دوران میں سید صاحب ان تمام مقامات پر ٹھہرے ہوں گے، لیکن میرا خیال ہے کہ جماعت کے لوگ شیخ امام بخش تاجر کی کوٹھی ہی میں مقیم رہے اور جمعہ کی نماز برابر شاہ پیر محمد کے ٹیلے کی مسجد میں ہوتی تھی، جس کا نام مسجد عالمگیری تھا۔

دعوتیں

یقین ہے کہ قیام لکھنؤ کے دوران میں سید صاحب روزانہ یا اکثر کسی مرید یا دوست کے ہاں کھانے پر مدعو ہوتے تھے۔ بعض اوقات تمام رفیق ساتھ جاتے تھے، بعض اوقات صرف منتخب اصحاب کو دعوت دی جاتی تھی۔ جب کہیں دعوت نہیں ہوتی تھی تو جماعت میں عام دستور یہ تھا کہ ایک دیگ میں خشکہ پکایا جاتا اور دوسری میں دال۔ لکڑی کا ایک پیالہ بنوا لیا تھا جو پیمانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ہر شخص کو دو دو پیالے خشکہ مل جاتا اور تھوڑی تھوڑی دال دے دی جاتی۔ مساکین و فقرا بھی تقسیم کے وقت آ پہنچتے۔ افراد جماعت کے برابر انھیں بھی کھانا مل جاتا۔ جماعت والوں کی تو طبیعتیں ہی سید صاحب کی تربیت کے سانچے میں ڈھل کر ایسی بن چکی تھیں کہ انھیں جو کچھ مل جاتا خدا کی خاص نعمت سمجھ کر کھاتے اور کچھ نہ ملتا تو اس صورت میں بھی سراپا شکر بنے رہتے لیکن بتایا گیا ہے مساکین کو بھی اس

دعوت شیراز میں اتنا مزا ملتا کہ وہ اونچے گھرانوں کے پُرتکلف کھانوں پر اس خشکے اور دال کو ترجیح دیتے تھے۔

جن اکابر کی دعوتوں کا ذکر روایتوں میں آیا ہے، ان میں سے مولانا عبدالرب[1] فرنگی محلی، مرزا حسن علی[2] محدث، معتمد الدولہ آغا میر نائب السلطنت اودھ، رسالدار فقیر محمد خاں آفریدی، عبدالباقی خاں قندھاری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اصلاحی کام

لیکن ہمیں سب سے بڑھ کر یہ دیکھنا چاہیے کہ اس دورے میں اصلاحی کام کس حد تک انجام پایا؟ مختلف روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کے اوقات گرامی کا بیشتر حصہ اصلاحی کاموں ہی میں صرف ہوتا تھا۔ بعض اوقات کھانا بھی وقت پر نہیں کھا سکتے تھے۔ مولانا عبدالحی عموماً وعظ کہتے رہتے تھے۔ ہر ہفتے جمعہ کی نماز سے، نماز عصر تک وعظ جاری رہتا۔ ہزاروں آدمی اس میں شریک ہوتے۔ کہتے ہیں کہ مولانا نے ان وعظوں میں سورۂ انبیاؑ کی تفسیر مکمل کر دی۔ وہ ایک ایک پیغمبر کا اسوۂ حسنہ پوری تفصیل سے بیان فرماتے۔ ساتھ ساتھ بتاتے جاتے کہ خود ان کے عہد میں لوگوں کے اندر کیا کیا اخلاقی، اعتقادی اور عملی خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ پھر اُن خرابیوں کے ازالے پر توجہ فرماتے جو اہل لکھنؤ میں عام طور پر رائج ہو چکی تھیں۔

---

[1] مولانا عبدالرب، ملّا عبدالعلی بحرالعلوم کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ والد کے ساتھ رام پور اور بہار ہوتے ہوئے پھر مدراس چلے گئے، جہاں بحرالعلوم کو نواب محمد علی خاں والی کرناٹک نے بلا لیا تھا۔ درسی کتابیں والد سے پڑھیں۔ پھر نکاح کے لیے لکھنؤ آئے۔ والد کی وفات پر مولانا عبدالرب اپنے بھتیجے مولانا عبدالواحد (بن عبدالاعلیٰ بن بحرالعلوم) کے ساتھ مدراس گئے۔ اس وقت تک نواب نے ملّا بحرالعلوم کی اسامی ایک اور صاحب کے حوالے کر دی تھی، جسے ملازمت سے ہٹانا منظور نہ تھا لیکن ملّا صاحب کی تنخواہ نصف اس شخص کے نام لکھ دی اور نصف مولانا عبدالرب کے حوالے کر دی۔ مولانا نے اپنے بھتیجے کو مدرس بنا دیا۔ خود دو سو روپے نواب مدراس کی سرکار سے اور پونے دو سو روپے سرکار انگریزی سے وظیفہ قبول کر لیا جو باقاعدہ ہر مہینے ریذیڈنسی کی معرفت انھیں لکھنؤ میں مل جاتا تھا۔ لکھنؤ ہی میں ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں وفات پائی۔

[2] انھیں اس نام کے ایک دوسرے بزرگ سے امتیاز کی خاطر حسن علی صغیر کہتے ہیں۔ یحییٰ گنج میں رہتے تھے۔ میرک جمال الدین لقب تھا۔ بعض انھیں سادات علوی بتاتے ہیں اور بعض مغل۔ حدیث کی سند شاہ عبدالعزیز سے حاصل کی، پھر سیکڑوں آدمیوں کو حدیث پڑھائی۔ اپنی تحقیق سے شافعی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ ۲۶ صفر ۱۲۵۵ھ (۱۱ مئی ۱۸۳۹ء) کو بہ عہد محمد علی شاہ والی اودھ فوت ہوئے۔

ایک جمعہ میں اتنے آدمی آ گئے کہ وسعت کے باوجود مسجد میں ان سب کے لیے نماز ادا کرنا مشکل ہو گیا۔ سید صاحب نے حکم دے دیا کہ صفیں بالکل قریب قریب کھڑی ہو جائیں۔ اور پیچھے والے لوگ آگے والوں کی پیٹھوں پر سجدے کریں، جگہ تنگ ہو تو ایسا کر لینا درست ہے۔ مولانا عبدالحی نے وعظ میں سورۂ انبیا کے پانچویں رکوع کی تفسیر بیان فرمائی:

ولقد آتینا ابراھیم رشدہ من قبل وکنا بہ عالمین۔ اذ قال لابیہ وقومہ ماھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون .... ولوطاً آتیناہ حکماً وعلماً ونجیناہ من القریۃ التی کانت تعمل الخبائث، انھم کانوا قوم سوءٍ فاسقین۔	اور ہم نے ابراہیمؑ کو پہلے سے نیکی کی راہ عطا کی تھی اور ہم اس کے حال سے خبردار تھے جبکہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ کیا ہیں یہ مورتیں جن کے تم مجاور بنے بیٹھے ہو؟ .... اور لوطؑ کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا اور ہم نے اس کو بچا نکالا اس بستی سے جہاں کے لوگ گندے کام کرتے تھے اور وہ لوگ تھے بڑے نافرمان۔

راوی کا بیان ہے کہ اس تفسیر کے سلسلے میں مولانا نے تعزیہ داری، عرس، راگ رنگ، گور پرستی، پیر پرستی، داڑھیاں منڈانا، لبیں بڑھانا، پٹے رکھنا، مسی لگانا، کبوتر اڑانا، مرغ لڑانا، سیٹی بجانا، پتنگ اڑانا اور اس قسم کی تمام باتوں کو سختی سے رد کیا۔ وعظ میں فرنگی محل کے علماء، مولانا سید دلدار علی مجتہد کے شاگرد اور دوسرے عمائد علم موجود تھے۔ سب پر سکتہ طاری تھا۔ اکثر زار زار رو رہے تھے۔

سید صاحب کا ارادہ ابتدا میں غالباً زیادہ دیر ٹھہرنے کا نہ تھا، لیکن جب دیکھا کہ لوگ اصرار کر رہے ہیں اور یہ اندازہ بھی فرما لیا کہ امتداد قیام سے عوام کو بہت فائدہ پہنچے گا تو ابتدائی فیصلے کے خلاف قیام لمبا کر دیا۔

بیعت

اس موقع پر جن اکابر و عمائد نے بیعت کی ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر مندرجہ ذیل اصحاب ہیں: مولانا محمد اشرف[1]، مولوی سید مخدوم، مولوی امام الدین بنگالی، مولوی امام الدین لکھنوی،

---

[1] قاضی نعمت اللہ خوش نویس کے فرزند تھے۔ ان کے بزرگوں میں سے کوئی صاحب لاہور سے لکھنؤ گئے اور وہیں اقامت اختیار کر لی۔ مولانا محمد اشرف نے مولوی نور الحق فرنگی محلی اور سید مخدوم لکھنوی سے علم حاصل کیا۔ تاج اللغات کی ترتیب میں شریک رہے۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۹ء میں بمرض ہیضہ وفات پائی اور اپنی مسجد واقع جھوائی ٹولہ کے حجرے میں دفن ہوئے۔

مولوی عبدالباسط (شاگرد مولانا اشرف)، مولوی سید ابوالحسن نصیرآبادی[1]، مولوی عبداللہ فرنگی محلی، مولوی رحیم اللہ فرنگی محلی، مولوی نجیب اللہ بنگالی، شاہ یقین اللہ لکھنوی، مولوی حافظ عبدالوہاب (فرزند ارجمند شاہ یقین اللہ)

اسی موقع پر مولانا ولایت علی[2] عظیم آبادی نے بیعت کی۔ یہ تعلیم کی غرض سے لکھنؤ آئے ہوئے تھے اور مولانا محمد اشرف کے پاس پڑھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک روز استاد نے شاگرد کو سید صاحب کی کیفیت معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ جب انھوں نے واپس جا کر پورے حالات بیان کیے تو ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ تخلیہ میں ملنے کے لیے وقت مقرر کرایا۔ استاد شاگرد دونوں پہنچے۔ سید صاحب نے دو گھنٹے تک وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین کی تفسیر ایسے پرتاثیر انداز میں بیان فرمائی کہ استاد، شاگرد دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہ نکلا۔ اسی وقت دونوں نے بیعت کر لی۔

مولانا ولایت علی نے تعلیم چھوڑ دی اور سید صاحب کے ساتھ رائے بریلی چلے گئے۔ جماعت کے دوسرے آدمیوں کی طرح ہر کام میں برابر شریک رہتے تھے۔ مثلاً اینٹیں تھاپتے، گارا بناتے، جنگل سے لکڑیاں لاتے، فرصت پاتے تو شاہ اسماعیل صاحب سے پڑھتے۔

دو ہندو بھی سید صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ آپ نے ایک کا نام عبدالہادی اور دوسرے کا عبدالرحمٰن رکھا۔ رحیم بخش خیاط، احسان علی چوبدار اور عبدالستار عطار نے بھی بیعت کی۔ آخر الذکر سفرِ جہاد میں بھی ہمراہ تھا۔ مولوی نور احمد[3] نگرامی نے مینڈو[4] خاں رسالدار کے اہل لشکر کی طرف سے دعوت

---

[1] انھیں دادا ابوالحسن کہتے تھے۔ وہ شاہ مراد اللہ تھانیسری کے خلیفہ تھے جو ایک واسطے سے میرزا مظہر جانجاناںؒ کے خلیفہ تھے، یعنی بواسطہ مولانا نعیم اللہ بہرائچی۔

[2] پٹنہ کے ایک رئیس مولوی فتح علی کے صاحبزادے اور رفیع الدین حسین خاں کے نواسے تھے، جو بہار کے ناظم رہ چکے تھے۔ دنیوی جاہ و حشمت کی فراوانی میں پیدا ہوئے اور اسی حالت میں پرورش پائی، لیکن سید صاحب کے ساتھ تعلق پیدا ہوا تو حالت یکایک بدل گئی۔ پھر زندگی کا ایک ایک لمحہ جہاد فی سبیل اللہ میں صرف کر دیا۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد انھیں نے جہاد کا علم از سرِ نو بلند کیا۔ ان کے مفصل حالات موقع پر بیان ہوں گے۔

[3] مولوی نور احمد نگرامی سید صاحب کے ساتھ جہاد پر گئے۔ بالاکوٹ کی جنگ میں شہید ہوئے۔ انھوں نے سید صاحب کے حالات میں ایک کتاب "نور احمدی" کے نام سے مرتب کی تھی جس کی پوری روایتوں کی تصدیق سید صاحب سے کرا لی تھی۔ یہ کتاب غالباً جنگ کے بعد بالاکوٹ کی آتش زنی میں جل گئی۔

[4] مینڈو خاں، بہلول خاں رئیس دہلی کی اولاد میں سے تھے۔ لکھنؤ پہنچ کر تاجری کی بدولت بڑے صاحبِ ثروت بن گئے۔ پہلے رسالدار رہے، پھر خیرآباد اور بہرائچ کی علاقہ داری ملی۔ عبداللہ بیگ خاں ان کے بھائی تھے۔ مینڈو خاں کا عروج ختم ہوا تو خاندان کے افراد دہلی آ گئے۔ پھر سلطنت آصفیہ میں ملازمت کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس خاندان کے افراد میں سے ہمارے زمانے میں منظور احمد خاں نے بڑا عروج پایا، منظور جنگ کا خطاب ملا اور تعلقدار بن گئے تھے۔ تقسیم کے بعد فوت ہوئے۔

کی، جس میں مینڈو خاں کے بھائی عبداللہ بیگ خاں نے چار سو سواروں کے ساتھ بیعت کی۔ مینڈو خاں نے بھی بیعت کر لی تھی اور اپنے لیے دعا کرائی تھی۔ تفصیل حمزہ خاں کے حالات میں ملے گی۔

فاسقوں کی اصلاح

لکھنؤ میں چوروں اور فاسقوں کا ایک مشہور گروہ تھا۔ جس کے سر عسکر امان اللہ خاں تھے۔ ان کے بھائی سبحان خاں، مرزا ہمایوں بیگ، غلام حیدر خاں، صدو خاں اور غلام رسول خاں وغیرہ اس میں شامل تھے۔ یہ طمطراق کے ساتھ چوریاں کیتے اور جو کچھ ہاتھ آتا اُسے عیش و عشرت میں اُڑاتے۔

ان میں سے غالباً امان اللہ خاں، سبحان خاں اور میرزا ہمایوں بیگ ایک روز شاہ پیر محمد کے ٹیلے کی مسجد میں وعظ سننے کے لیے آ گئے۔ لوگوں کو ان کے جرائم پیشہ ہونے کا حال معلوم تھا۔ سید صاحب کو سب کچھ بتا دیا۔ آپ نے بڑی ہی شفقت سے مصافحہ و معانقہ کیا۔ عزت سے پاس بٹھایا۔ تھوڑی دیر بعد آپ نے پوچھا: آپ بھائی کیا کام کرتے ہیں؟ وہ جھوٹ بولنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ دو ایک مرتبہ سوال کا جواب ٹالا، پھر صاف صاف اپنا پورا حال بتا دیا اور ساتھ ہی عرض کیا کہ ہم اسی وقت آپ کے ہاتھ پر تمام بری باتوں سے توبہ کرتے ہیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ ہم آپ کی شہرت سن کر محض دیکھنے کے لیے آ گئے تھے۔ بیعت کا ارادہ نہ تھا لیکن آپ کے اخلاق عالیہ دیکھ کر آرزو پیدا ہوئی کہ کیوں نہ اپنی عاقبت درست کر لیں۔ سید صاحب نے ان سے بیعت لی، پھر ان کے دوسرے ساتھی بھی آ کر بیعت ہوئے۔

سید صاحب جب رائے بریلی گئے تو امان اللہ خاں اور میرزا ہمایوں بیگ ساتھ ہو گئے۔ دوسرے اصحاب بھی جانا چاہتے تھے، لیکن سید صاحب نے انھیں روک دیا اور فرمایا کہ ابھی اپنے مکان پہ رہو۔ جب ہم جہاد کے لیے نکلیں گے تو ساتھ لے لیں گے۔ اس اثنا میں ان کے لیے فقیر محمد خاں رسالدار کے ہاں سے دس دس روپے ماہوار اس شرط پر مقرر کرا دیے کہ چاہیں تو یہ لوگ گھر پہ رہیں، چاہیں حاضر رہیں۔

چنانچہ ان میں سے امان اللہ خاں، مرزا ہمایوں بیگ اور غلام رسول خاں جہاد میں شریک تھے۔ آخر الذکر نے اکوڑہ کی جنگ میں شہادت پائی۔ امان اللہ خاں جنگ بالاکوٹ کے بعد ٹونک آ گئے تھے۔ میدان بالاکوٹ میں یہ آخری شخص تھے جنھوں نے سید صاحب کو زندہ دیکھا اور آپ کے آخری حالات کے بارے میں جتنی چشم دید روایتیں مہیا ہو سکیں، ان میں سے امان اللہ خاں کی روایت سب سے آخری ہے۔

معتمد الدولہ کی روش بدل گئی

ہم بتا چکے ہیں کہ معتمد الدولہ آغا میر نائب السلطنت اودھ ہی نے

سید صاحب کو دعوت نامہ بھیج کر لکھنؤ بلایا تھا۔ یہاں ہزاروں آدمی آپ کے مُرید بن گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں خاصی تعداد شیعہ حضرات کی تھی۔ اس وجہ سے اکابر کو تشویش لاحق ہُوئی۔ سبحان علی خاں، تاج الدین حسین[1] خاں اور بعض دوسرے حضرات نے سید صاحب کے وجود کو سلطنت اور امن عامہ کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ بتا کر معتمد الدولہ کے پاس شکایت پہنچائی۔ اس نے چوبدار کی معرفت پیغام بھیج دیا کہ شیعہ حضرات کو حلقۂ ارادت میں داخل نہ کیا جائے۔ سید صاحب نے بے توقف جواب دیا کہ میں نصیحت کو روک نہیں سکتا۔ کسی پر جبر نہیں کرتا، جو آئے گا اسے پیغامِ حق سنانے میں کوتاہی نہ کروں گا۔

آغا میر جیسے مختارِ کل کے لیے یہ پیغام بالکل خلافِ امید تھا۔ اس نے پھر کہلا بھیجا کہ اگر آپ کو کوئی صدمہ پہنچا تو مجھے بری الذمہ سمجھیے۔ سید صاحب نے پھر جواب دیا کہ میں عوام کو نام خدا کی تلقین کرتا ہوں، اگر تم لوگوں کا ارادہ فساد کا ہے تو اس کے ذمہ دار تم ٹھہرو گے۔ میں بالکل بے فکر ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ پروردگارِ لایزال کے حکم کے بغیر مجھے کوئی صدمہ نہیں پہنچ سکتا۔

آغا میر نے تیسری مرتبہ فقیر محمد خاں رسالدار کو واسطہ بنایا اور کہا کہ سید صاحب کو سمجھاؤ، ورنہ دو چار توپیں بھیج کر ان کی قیام گاہ کو مسمار کرا دوں گا۔ فقیر محمد خاں یہ پیغام لے کر آئے تو سید صاحب نے فرمایا:

> آپ میرے قدیمی آشنا ہیں اور میرا حال جانتے ہیں۔ یہ بات مجھ سے نہ ہوگی کہ کلمۂ حق سے رُک جاؤں۔ دو چار توپیں تو کیا چیز ہیں، میں تو سو توپوں سے بھی نہیں ڈرتا۔ اگر مالکِ حقیقی میرا مددگار ہے تو مجھے کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔

یہ حالات شاہی ملازموں سے سید صاحب کے مُریدوں کو معلوم ہُوئے تو انھوں نے آپ کی خدمت میں پیغام بھجوایا کہ ہم جاں نثاری کے لیے حاضر ہیں لیکن آپ نے ان سے بھی کہہ دیا کہ بالکل امن چین سے بیٹھے رہو۔ مالکِ حقیقی کی حفاظت میرے لیے کافی ہے۔ فقیر محمد خاں رسالدار سے فرمایا:

> اگر کہا جاتا کہ تم ہماری رعیت ہو، شہر سے چلے جاؤ تو اس میں کچھ عذر و حیلہ نہ ہوتا۔ ہم مان لیتے۔ لیکن یہ کیا بات ہوئی کہ کلمۂ خیر لوگوں کو تعلیم نہ کرو۔ یہ بات اسلام کے خلاف ہے۔ طالبِ خدا سنی ہو یا شیعہ، جو میرے پاس آئے گا، میں اس کو ضرور راہِ حق سکھاؤں گا۔ میرے جو مرید ہیں، وہ بھی بے شک یک سو رہیں اور فساد کے وقت نواب کا ساتھ

---

[1] سبحان علی خاں اور تاج الدین حسین خاں ذات کے کنبوہ تھے کہتے ہیں کہ پہلے سرکار انگریزی میں تحصیل دار تھے سعادت علی خاں نے انھیں اپنے ہاں ملازم رکھا۔ بڑا عروج پایا۔ سبحان علی خاں آغا میر کا نائب بن گیا تھا۔ بعد میں بھی برسرِ عروج رہا۔

دیں۔ مجھے کوئی اندیشہ نہیں۔

یہ عزم راسخ دیکھ کر معتمد الدولہ خود بخود نرم ہو گیا[1]

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دو مرتبہ سید صاحب کو شہید کرنے کا انتظام کیا گیا۔ اس انتظام کا ذمہ دار تاج الدین حسین خاں تھا۔ دونوں مرتبہ سازشیوں کو ناکامی ہوئی۔ جن آدمیوں کو قتل کے لیے بھیجا گیا تھا، وہ سید صاحب کے مُرید ہو گئے۔

معتمد الدّولہ کے ہاں دعوت

اس کے بعد معتمد الدولہ نے اپنے ہاں کھانے پر بلایا۔ سید صاحب اور ساتھیوں کے لیے پالکیاں، گھوڑے اور ہاتھی بھیجے۔ کھانا بہت پر تکلّف تھا۔ اس دعوت میں فقیر محمد خاں رسالدار، مینڈو خاں رسالدار، تاج الدین حسین خاں اور سبحان علی خاں بھی شریک تھے۔ مذہبی گفتگو بھی ہوتی رہی۔ مثلاً سبحان علی خاں نے "والحیاء شعبة من الایمان" والی حدیث کا مطلب پوچھا۔ مولانا عبدالحی نے پوری حدیث پڑھی۔ ایمان کی تمام شاخوں کی کیفیت بتائی۔ پھر بتاتے گئے کہ اصحاب ایمان کے اوصاف و نشانات کیا کیا ہیں، اور ارباب کفر کی کون کون سی علامتیں ہیں۔ اس سلسلے میں ان تمام اعتقادی اور عملی خرابیوں کو بے باکانہ کھول کر بیان کیا، جو اس وقت اہل لکھنؤ میں رائج تھیں اور خود عمائد لکھنؤ بھی ان میں مبتلا تھے۔

سبحان علی خاں نے گفتگو کے دوران میں امیر معاویہؓ کے متعلق سوال کر دیا۔ مولانا شاہ اسماعیل نے اس کے جواب میں ایسی تقریر فرمائی کہ سبحان علی خاں دم بخود ہو کر بیٹھ گیا۔

سبحان علی خاں اور تاج الدین حسین خاں دونوں عقل و دانش اور علم و فضل میں یگانہ مانے جاتے تھے۔ معتمد الدولہ کو ان کی رائے اور خوش تقریری پر بڑا بھروسا تھا، لیکن مولانا عبدالحی اور شاہ اسماعیل کے سامنے دینی یا عقلی علوم میں وہ کیا ٹھہر سکتے تھے۔ معتمد الدولہ اتنا متاثر ہُوا کہ کھانے کے بعد

---

[1] بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ اس کے بعد مشتاق ملاقات ہُوا، لیکن یہ بیان اس وجہ سے قابل قبول نہیں کہ سید محمد علی کی روایت کے مطابق معتمد الدولہ نے خود دعوت بھیج کر سید صاحب کو لکھنؤ بلایا تھا۔ سید محمد علی نے دعوت نامے کا مضمون بھی لکھ دیا۔ جب تک کوئی مثبت قرینہ اس کے خلاف موجود نہ ہو، سید صاحب کے ابتدائی حالات کے بارے سید محمد علی کے بیانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میرا خیال ہے کہ سید صاحب اور ان کے رفیقوں کا وسیع اثر و رسوخ دیکھ کر اور ارکان سلطنت کی طرف سے مسلسل شکایات سُن کر معتمد الدولہ کی روش بدلی۔ پھر جب سید صاحب کے عزم و بے خوفی کا حال معلوم ہُوا تو خاموش ہو گیا اور رفق و مدارات سے سید صاحب کو ہم نوا بنانے کی کوشش کی۔

پانچ ہزار روپے بطور نذر پیش کیے۔ سید صاحب نے ہر چند معذرت کی، لیکن معتمد الدولہ نے قبول نذر پر اتنا اصرار کیا کہ سید صاحب نے فقیر محمد خاں سے کہا کہ آپ لے کر اپنے پاس رکھ لیں۔ یہ وعدہ بھی فرمایا کہ رائے بریلی جانے سے پیشتر ایک مرتبہ پھر ملیں گے۔

رخصتی ملاقات میں سید صاحب نے ایک طرف معتمد الدولہ کو ان باتوں سے روکا جو رعایا پر ظلم کی حیثیت رکھتی تھیں۔ یہ فریضہ تبلیغ حق و توصیۂ خیر کی بجا آوری تھی۔ نیز ایک نہایت عمدہ، بلند اور قد آور گھوڑی معتمد الدولہ کو بطور تحفہ دی جس کے ساتھ بچہ بھی تھا۔ سید صاحب کا دستور تھا کہ وہ ارادت مندوں سے تو ہر قسم کی نذریں بے تکلف لے لیتے تھے، لیکن دوسرے آدمی اگر تحائف دیتے تھے تو یا تو انھیں قبول نہیں کرتے تھے یا بدلے میں کچھ نہ کچھ ضرور دیتے تھے اگرچہ بلحاظ قیمت وہ کم پایہ ہی ہو۔ معتمد الدولہ نے عذر کیا اور کہا آپ تین چار گھوڑے خود میرے اصطبل سے پسند فرما کر لے جائیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ میں اور کچھ نہیں لوں گا اور یہ گھوڑی آپ کو قبول کرنی ہوگی۔

جہاد شانِ ایمان ہے

سید صاحب کا عام انداز اگرچہ وہی تھا، جس پر اس وقت کے پیرزادے عمل پیرا تھے لیکن اول خدمت دین اور اصلاح عقائد و اعمال کے جس جذبۂ صادقہ سے آپ کا سینۂ صافی معمور تھا وہ قرنوں سے کسی مصلح میں نظر نہیں آیا تھا۔ دوسرے سید صاحب ہر وقت تلوار، بندوق یا پستول باندھے رہتے تھے تاکہ مسلمانوں میں جہاد کا جذبہ تازہ ہوتا رہے۔ پیرزادوں کا شیوہ و شعار یہ نہ تھا۔ ایک موقع پر عبدالباقی خاں قندھاری نے، جو سید صاحب کا مخلص معتقد تھا، عرض کیا کہ آپ کی ہر ادا محبوب و دلکش ہے، لیکن ایک بات ناپسند ہے جو آپ کے خاندان والاشان کے شعار سے مطابقت نہیں رکھتی۔ آپ کو وہی زیب دیتا ہے جو آپ کے آبا و اجداد کرتے آئے ہیں۔ سید صاحب نے پوچھا وہ کیا؟ عبدالباقی خاں نے کہا تلوار اور بندوق باندھنا۔ یہ اسباب جہالت ہیں؟

یہ سنتے ہی سید صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا، لیکن ضبط و تحمل سے کام لیتے ہوئے فرمایا:

خاں صاحب! اس وقت آپ کو کیا جواب دوں؟ اگر آپ سوچیں تو یہی کافی ہے کہ یہ وہ اسباب خیر و برکت ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو عنایت فرمائے تاکہ کفار و مشرکین سے جہاد کریں۔ خصوصاً ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اسباب سے کام لے کر تمام اشرار کو زیر کیا اور جہان میں دین حق کو روشنی بخشی۔ اگر یہ اسباب نہ ہوتے تو نہ تم ہوتے، نہ ہم ہوتے۔ بالفرض ہوتے تو خدا جانے کس دین و ملت میں ہوتے۔ آپ نے یہ ایسا کلمہ زبان سے نکالا کہ خدا کے بھی گناہگار ہوئے اور

اپنا بھی نقصان کیا۔

یوں تو سید صاحب کی پوری زندگی سراسر تبلیغ حق اور قیام شریعت کے لیے وقف ہو چکی تھی۔

لیکن اس زمانے میں دو باتوں پر خاص زور دیتے تھے: اوّل یہ کہ عورتیں شرک سے احتراز کریں۔ ظاہر ہے کہ عورتوں کی اصلاح پر پوری امت کی اصلاح کا مدار تھا اس لیے کہ آئندہ نسلیں انھیں کی آغوش میں پرورش پاتی تھیں۔ دوسرے یہ کہ ہر مسلمان جہاد فی سبیل اللہ کی نیت رکھے اور اس مقصد عظیم کو کسی بھی وقت فراموش نہ کرے۔

مُراجعت

سید صاحب کو بادشاہ سے ملنے کا موقع میسر آتا تو اُسے بھی ضرور پیغامِ حق سُناتے لیکن معتمد الدولہ، سبحان علی خاں، تاج الدین حسین خاں وغیرہ ذی رسوخ درباریوں نے ملاقات کی صورت پیدا نہ ہونے دی۔ سید صاحب لکھنؤ سے نکلے تو پہلے دولت گنج میں قیام فرمایا، پھر حسن گنج ٹھہرتے ہوئے رائے بریلی پہنچ گئے۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ معلوم ہوا غازی الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ نے کہیں سے سید صاحب کا ذکر سُن لیا اور ملاقات کا مشتاق بن گیا۔ چنانچہ پھر سید صاحب کی طلبی کے خطوط پہنچے۔ اس مرتبہ آپ خود نہ گئے، مولانا عبدالحی اور شاہ اسماعیل کو بیس پچیس آدمیوں کے ہمراہ بھیج دیا۔ یہ بزرگ قریباً دو ہفتے لکھنؤ میں ٹھہرے رہے۔ انھیں روزانہ ایک رقم مہمان داری کے طور پر مل جاتی تھی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ بادشاہ سے ملاقات کا سلسلہ موخر ہوتا جا رہا ہے تو واپس چلے گئے۔ کہتے ہیں کہ اس مرتبہ بھی تاج الدین حسین خاں اور سبحان علی خاں نے مختلف تدبیروں سے ملاقات کو مشکل بنا دیا تھا۔ یہ "وقائع" کا بیان ہے۔ "مخزن احمدی" اس بارے میں بالکل خاموش ہے۔

تعمیرِ مکان

لکھنؤ سے واپسی کے بعد ارادت مندوں اور ملاقات کے شائقوں کی اس درجہ کثرت ہو گئی کہ ایک مرتبہ سید صاحب مہمان خواتین کی زیادتی کے باعث کئی روز تک اپنے گھر بھی نہ جا سکے۔ اس بنا پر مہمانوں کے لیے ایک جداگانہ مکان بنانے کی ضرورت پیش آئی۔ ایک روز بیلچے اور کلند لے کر خود ایک گڑھے میں اُتر گئے، جس میں پانی تھا اور اینٹیں تھاپنے لگے۔ یہ دیکھتے ہی ارادت مند اس کام میں لگ گئے اور پندرہ بیس روز میں پچاس ہزار اینٹیں تیار ہو گئیں۔ دو مہینے میں نیا مکان بن گیا جو بالکل کچا تھا۔ سید صاحب اپنے اہل و عیال کو اس نئے مکان میں لے آئے۔ جدی مکان مہمان عورتوں کے لیے وقف فرما دیا۔ مہمان مرد عموماً مسجد یا آس پاس کے حجروں میں ٹھہرتے تھے۔

مولانا ولایت علی تعلیم چھوڑ کر لکھنؤ سے سید صاحب کے ساتھ رائے بریلی پہنچ گئے تھے۔ وہ بھی

تعمیرِ مکان میں عام ارادت مندوں کے برابر کام کرتے رہے۔ انھیں دنوں میں ان کے والد نے ایک آدمی کو ان کی تلاش میں رائے بریلی بھیجا۔ وہ اپنے ساتھ روپے اور کپڑے بھی لایا۔ مولانا ایک موٹا سیاہ تہ بند پہنے ہوئے گارے میں لت پت تھے۔ آدمی انھیں پہچان نہ سکا۔ جب لوگوں کے بتانے سے اس نے پہچانا تو مولانا کی حالت دیکھ کر زار زار رونے لگا۔ نقود و ملبوسات دے کر بولا کہ انھیں اپنے استعمال میں لائیے۔ مولانا سیدھے سید صاحب کی خدمت میں پہنچے، تمام چیزیں آپ کے سامنے رکھ دیں اور چپ چاپ واپس چلے آئے۔

آدمی نے عظیم آباد واپس جا کر ساری کیفیت مولانا کے والد مولوی فتح علی کو سنائی تو وہ اپنے فرزند اصغر فرحت حسین کو لے کر خود رائے بریلی آئے اور سید صاحب کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔

سید صاحب کے فیض صحبت کا ایک کرشمہ یہ بھی تھا کہ امیر گھرانوں کے نونہالوں کے دل میں خدمت دین کی سچی تڑپ پیدا ہو گئی۔ وہ دنیوی راحت و آسائش کی ہر متاع کو بے دریغ ٹھکرا کر محنت و مشقت و زحمت کشی و جاں فشانی کو عین راحت سمجھنے لگے۔ یہ اس پاک نفس سید کی تربیت تھی جس کی بدولت اکثر نیاز مند منزل عزیمت پر پہنچے۔ عزیمت کو مدارِ کار بنائے بغیر اس میدان میں اترنا بالکل خارج از بحث تھا، جس کی دعوت کا پرچم سید صاحب نے بلند کیا تھا۔ نظیری نے کیا خوب کہا ہے:

جائے کہ عاشقان اند، اختر بہ عکس گردد
دل در بلا سعید است، سر در خطر مبارک

سولھواں باب

عزمِ حج

غیر متوقع فیصلہ

سید صاحب نے نواب امیر خاں سے الگ ہو کر جہاد کے لیے جس مستقل تنظیم کا فیصلہ کیا تھا، وہ اس حد تک پوری ہو چکی تھی کہ آپ ہندوستان سے ہجرت کر کے ایک آزاد مقام پر جا بیٹھتے۔ اس طرح اصل کام بھی شروع کر دیتے اور تنظیم کو بھی ساتھ ساتھ پورے اہتمام سے چلاتے جاتے۔ چنانچہ لکھنؤ سے مراجعت کے تھوڑی دیر بعد آپ نے اپنے رفقائے خاص یعنی شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحی اور بعض دوسرے اصحاب کو رائے بریلی سے رخصت فرما دیا تھا کہ اپنے خانگی معاملات کے انتظامات سے پوری فراغت حاصل کر لیں تاکہ اطمینان و دلجمعی سے جہاد میں مشغول ہو سکیں۔ پھر اہل و عیال یا جائدادوں کی کوئی اُلجھن ان کی یکسوئی میں خلل انداز نہ ہو سکے۔ راہِ ہجرت میں قدم اٹھانے کا قطعی فیصلہ ہو چکا تھا، صرف اس امر کا انتظار تھا کہ جن اصحاب کو ساتھ جانا ہے وہ فارغ ہو کر پہنچ جائیں۔ اس اثنا میں اچانک آپ نے حج کا ارادہ فرما لیا۔

روایت ہے کہ ایک روز بعد نماز اشراق آپ مسجد تکیہ کی چھت پر چلے گئے۔ وہاں سے آواز دی کہ جتنے بھائی[1] موجود ہوں، سب چھت پر آ جائیں۔ ارادت مندوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ آگے پیچھے چھت پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سید صاحب مسجد کی منڈیر پر، جو گھٹنوں سے ذرا اونچی تھی، دونوں ہاتھ ٹیکے کھڑے ہیں اور سئی ندی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ پھر ارادت مندوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ ہم حج کو چلیں گے۔ اس پر سب کو تعجب ہوا۔ بعض نے عرض کیا کہ آپ نے تو ہجرت کا ارادہ کر رکھا تھا۔ فرمایا: اب مرضی الٰہی یہی ہے کہ پہلے حج کیا جائے۔

---

[1] سید صاحب ارادت مندوں کو عموماً "بھائی" کہہ کر مخاطب فرمایا کرتے تھے۔ گویا حق دوست اصحاب کی جو جماعت انھوں نے تیار کی تھی، وہ سراسر اخوت و برادری پر قائم تھی ان کے درمیان ایک ہی رشتہ تھا اور وہ اسلام کا رشتہ تھا، جس نے خاندان، نسل یا دنیوی وسائل کے تمام امتیازات مٹا دیے تھے۔ مختلف افراد کو مخاطب فرماتے تو "بھائی" کے ساتھ ان لوگوں کے مخصوص القاب شامل کر لیتے۔ مثلاً "خان بھائی" یا "شیخ بھائی"۔

جو اصحاب اس موقع پر موجود تھے، ان کی تعداد معلوم نہیں۔ صرف مندرجہ ذیل کے نام روایت میں آئے ہیں: مولوی عبدالرحیم کاندھلوی، مولوی پیر محمد بانس بریلی کے، مولوی محمد قاسم پانی پتی، مولوی عبداللہ الہ آبادی اور میاں دین محمد جو سید صاحب کے خادم خاص تھے۔

ارادہ کیوں بدلا؟

سوال یہ ہے کہ یکایک ارادہ کیوں بدلا؟ کیوں ضروری سمجھا کہ آغاز جہاد سے پہلے حج کر لیں؟ کیا جذبۂ ادائے فرض اس سلسلے میں محرک بنا تھا؟ یہ جذبہ بجائے خود کتنا ہی قابل قدر ہو، لیکن جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں، سید صاحب کے مالی وسائل "من استطاع الیہ سبیلاً" کے مطابق نہ تھے اور آپ نے حج کے لیے صلائے عام کی جو صدا لگا دی تھی، اُسے تو اس شرط سے قطعاً کوئی مناسبت نہ تھی۔ پھر وہ کس وجہ سے یکایک اس طرف متوجہ ہو گئے؟

میرے نزدیک اس فیصلے کی وجہ یہ تھی کہ علمائے ہند کے ایک گروہ نے بحری سفر میں اندیشۂ ہلاکت کو پیش نظر رکھتے ہوئے فریضۂ حج کے اسقاط کا فتویٰ دے دیا تھا۔ سید صاحب لکھنؤ میں تھے، جب اس قسم کا فتویٰ ان کے سامنے پیش ہوا تھا۔ شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی نے سختی سے اسے رد کرتے ہوئے فرضیت کا اثبات فرمایا۔ ایک صاحب منشی خیرالدین نے اصل فتویٰ اور اس کا رد شاہ عبدالعزیز کے پاس بھیج کر آخری فیصلہ طلب کیا۔

اسی وقت سے یہ اہم معاملہ سید صاحب کے پیش نظر ہو گا۔ یہ سوچتے رہے ہوں گے کہ اس فتنے کے سدباب کی موثر ترین صورت کیا ہو سکتی ہے؟ نصوص شرعیہ کی بناء پر اس کا رد کیا جا سکتا تھا اور کیا گیا۔ لیکن اتنا ہرگز کافی نہ تھا۔ دینی حمیت کا چراغ بجھ رہا تھا۔ استعداد عمل ضعیف ہو چکی تھی۔ ایسی حالت میں بہانہ جو طبیعتوں کے لیے غلط اور بے سروپا سہارے بھی ادائے فرض سے کنارہ کشی کی بہت بڑی دستاویز بن سکتے تھے۔ غور و فکر کے بعد سید صاحب اس نتیجے پر پہنچے کہ خود حج کریں۔ مسلمانوں کو صلائے عام دے دیں کہ جس کا جی چاہے تیار ہو جائے، خواہ اس کے پاس خرچ ہو یا نہ ہو۔ میں اپنی ذمہ داری پر سب کو حرمین شریفین پہنچاؤں گا اور اللہ کے فضل و کرم سے حج کرا کے لاؤں گا۔

فتوے کا پس منظر

مسلمانوں کے عہد عروج و اقبال میں بھی یہاں سے ہزاروں لوگ حج کے لیے جاتے تھے۔ اُمراء کی یہ حالت تھی کہ جب دربار میں کسی کی ہوا اکھڑتی تو وہ حرمین کا راستہ لے لیتا، جو اس دنیا میں ہر مسلمان کی سب سے بڑی پناہ گاہ ہے۔ اس زمانے میں بحر ہند اور بحیرۂ عرب پر عرب، جہاز رانوں کا قبضہ تھا۔ جب پرتگیز ان سمندروں پر چھا گئے تو حجاج کے لیے خطرات پیدا ہو گئے، اس لیے کہ پرتگیز اپنے وطن میں مدتوں تک مسلمانوں کے خلاف لڑتے رہے تھے اور مسلم دشمنی

ان کی فطرت میں رچی ہوئی تھی۔ مغلوں کے عہد میں انھوں نے اور انگریزوں نے کئی مرتبہ حاجیوں کے جہازوں کو نقصان پہنچایا اور اس وجہ سے عبرت ناک سزائیں پائیں۔ جب مغلوں کی حکومت کمزور ہوگئی تو فرنگی حاجیوں اور چیرہ دستیوں میں بے باک ہو گئے۔ اس وجہ سے بعض مسلمان علماء کو عذر تراشیوں کا موقع مل گیا اور انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ سمندر کے سفر میں بعض وقت جہاز ڈوب بھی جاتے ہیں یا ڈبا دیے جاتے ہیں لہٰذا امن طریق باقی نہ رہا، جو منجملہ شرائط حج ہے۔ جب یہ شرط فوت ہو گئی تو مشروط کی فرضیت بھی اصلی حالت پر قائم نہ رہی۔

عبرت ناک بے عزمی

جب مسلمان خوف غیر اللہ سے کاملاً آزاد تھے اور ان کے عزم وہمت کی شمشیر کے لیے خطرات وہالک سنگ فساں کا کام دیتے تھے تو ان کے سفینے ساتوں سمندروں کے سینوں پر رات دن بے تکلف دوڑتے پھرتے تھے۔ وہی تھے جو ایشیا کا مال یورپ اور یورپ کا مال ایشیا پہنچاتے تھے۔ وہی تھے جنھوں نے ساری دنیا کے لیے بحری تجارت کی راہیں کھولیں۔ وہی تھے جن کی قیادت میں واسکوڈی گاما افریقہ کے ساحل سے ہندوستان پہنچا۔ وہی تھے جو کولمبس کے بیڑے کو یورپ سے امریکہ لے گئے، لیکن جب ان پر زبونی عزم وہمت کی بلا نازل ہوئی تو ان کا سارا زور کاوش احکام شریعت کو ساقط قرار دینے میں صرف ہونے لگا۔

مسلمانوں کے سامنے فرنگی تاجر آٹھ آٹھ دس دس ہزار میل کے چکر لگا کر ہندوستان، جزائر شرق الہند اور چین تک پہنچ گئے تھے، حالانکہ ان لوگوں کے سامنے کوئی دینی غرض اور کوئی مذہبی فرض نہ تھا، محض مال و شہوت کی فراہمی ان کی جاں بازیوں کا مرجع تھی، لیکن مسلمانوں کی یہ حالت ہو گئی کہ اپنے ایک دینی رکن کی بجا آوری میں تین ہزار میل کے بحری سفر کی ہمت سے بھی محروم ہو گئے اور امکانی خطرات کے عذر کی بناء پر حج کی فرضیت کو ختم کر دینا انھیں ایک لمحہ کے لیے بھی نازیبا معلوم نہ ہوا۔

بے شک مشکلات موجود تھیں۔ خطرات میں کلام نہ تھا، لیکن دینی حمیت کا تقاضا یہ تھا کہ عزم وہمت کی بناء پر مشکلات کو دور کیا جاتا اور خطرات کی سنگینی کو توڑا جاتا، نہ یہ کہ مشکلات و خطرات کی وجہ سے اصل فرض کی جڑ پر اسقاط کا کلہاڑا رکھ دیا جاتا۔ بدرجہا زیادہ خطرات کا ہجوم فرنگیوں کی حرص مال و زر کو افسردہ نہ کر سکا، لیکن ان مدعیانِ اسلام کے باب میں کیا عرض کیا جائے، جن کے لیے کمتر خطرات کا وجود ایک عظیم دینی فریضے کی بجا آوری میں عنانگیر ہو گیا، یہاں تک کہ انھیں عدم فرضیت حج کا فتویٰ تیار کرتے ہوئے بھی قطعاً تامل نہ ہوا؟ تنہا اسی واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سید صاحب کے زمانے میں مسلمانوں کا دینی جذبہ کس درجہ پست و افسردہ ہو چکا تھا اور ان کے فکر وہمت کا نزیلہ کس منزل پر پہنچ

گیا تھا۔

شاہ عبدالعزیز کا فیصلہ

لکھنؤ والا فتویٰ اور شاہ اسماعیل و مولانا عبدالحی کا رد جب آخری فیصلے کے لیے شاہ عبدالعزیز کے روبرو پیش ہوا تو انھوں نے جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱ - علوم دینیہ و عقلیہ میں اسماعیل اور عبدالحی کا پایہ مجھ سے کم نہیں۔

۲ - جن لوگوں نے فریضۂ حج کو ساقط قرار دیا، ان کے سامنے فتاویٰ کی دو چار مشہور کتابوں کے سوا کچھ نہیں، حالانکہ ان کتابوں کی سند ہرگز بلند نہیں اور جن معتبر کتابوں پر دین کا مدار ہے ان سے یہ لوگ بہرۂ وافر نہیں رکھتے۔

۳ - ان کے بیان کردہ حالات کی سند درجۂ اعتبار سے ساقط ہے اور ان کے لگائے ہوئے حکموں پر عمل پیرا ہونا سراسر گمراہی کا موجب ہے۔

۴ - جن حضرات نے آج فرضیت حج کے اسقاط کا فتویٰ دے دیا ہے، کون کہ سکتا ہے کہ وہ کل نماز روزے کی معافی کا حکم بھی نہ لکھ دیں گے؟ زکوٰۃ تو ان کے نزدیک بہ درجۂ اولیٰ ساقط ہو گی۔

شاہ صاحب مرحوم نے تفسیر عزیزی میں بھی بہ سلسلہ تشریحات والفلک التی تجری ...... الخ مسئلے کے اس پہلو پر توجہ فرمائی تھی اور لکھا تھا:

ہر چند جہاز را گاہے نوبت بہ تباہی ہم عارض شود اما بیشتر اوقات بہ سلامت می رسد پس باور اخلاف امن طریق نتواں شمرد۔	اگرچہ جہاز بعض اوقات ڈوب بھی جاتا ہے، لیکن چونکہ بالاکثر سلامت منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے، اس لیے گاہ گاہ کی غرقابی کو امن طریق کے خلاف نہیں سمجھا جا سکتا۔

لیکن یہ صرف علمی اور نظری بحثیں تھیں اور اصل فتنے کے انسداد کے لیے ایک زبردست عملی اقدام کی ضرورت تھی۔ یہ اقدام ایک صاحب عزم قائد اور ایک بلند ہمت رہنما کی سبقت بالخیرات کے بغیر پوری نہیں سکتا تھا۔ سید صاحب کو خدا نے اپنے فضل خاص سے یہ اوصاف عطا کیے تھے، لہذا وہ نظر بہ ظاہر فقدان وسائل کے باوجود میدان عمل میں آ گئے۔ ان کے سوا کون ایسے اہم کام کا بیڑا اٹھا سکتا تھا؟

وسائل اور عمل

وسائل خود بخود جمع نہیں ہوتے، انسان اپنے حزم و ہمت سے ان کی فراہمی کا انتظام کرتا ہے۔ مسلمانوں کو جب روم و ایران کی شاہنشاہیوں کے ساتھ بہ یک وقت

جنگیں پیش آگئی تھیں تو اُن کے پاس کون سے وسائل تھے؟ اور جو تھے، ان کی حیثیت روم و ایران کے لامتناہی خزائن کے سامنے کیا تھی؟ لیکن مسلمانوں کے عزم و ہمت کے مقابلے میں ان شاہنشاہیوں کے صدیوں کے اندوختے کچھ کام نہ دے سکے۔ قادسیہ، نہاوند اور یرموک کے معرکوں نے ہمیشہ کے لیے دنیا پر آشکارا کر دیا کہ فوجوں کے جنگل، مال و ثروت کے انبار اور اسلحہ کے لامتناہی ذخائر، انسانی عزم و ہمت کے سامنے ہیچ ہیں۔

روح ایمان کی کارفرمائی کو مادی ساز و سامان کی فراوانی ہرگز نہیں روک سکتی۔

یہ بڑے بڑے سپہ سالار، جنھوں نے کشور کشائی میں عالمگیر شہرت حاصل کی، کیا سارے سامان ماں کے پیٹ سے لے کر آئے تھے؟ بالکل معمولی حالت میں کام شروع کیا۔ اپنے عزم و ہمت اور خداداد صلاحیتوں کی بنا پر اتنے سامان فراہم کر لیے کہ اُن کے نام سُن کر ہر صاحب وسائل پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔

سید صاحب اس حقیقت کو خوب سمجھ چکے تھے۔ انھیں خدا نے ایسی ہمت عطا فرمائی تھی، جسے مشکلات کا کوئی ہجوم شکست نہیں دے سکتا تھا۔ ایسا عزم دیا تھا، جس میں خفیف سی لچک بھی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر وہ ایمان و اخلاص کی سچی روح سے لبریز تھے۔ انھیں مالک الملک کی ذاتِ پاک پر پورا بھروسا تھا، لہٰذا باوجود فقدانِ وسائل فتح بابِ حج کا جھنڈا اُٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے عزم و اخلاص کی برکت سے وسائل خود بخود فراہم ہوتے گئے، جیسا کہ آیندہ ابواب کے ملاحظے سے واضح ہو گا۔ جس دروازے کو بے عزم علما بند کرنے کے درپے تھے، وہ اس طرح کھل گیا کہ پھر کسی کو اسے بند کرنے کے لیے ہاتھ بڑھانے کا حوصلہ نہ ہُوا۔

خطوطِ دعوت

بہرحال سید صاحب چونکہ فتح بابِ حج کی غرض سے اُٹھے تھے، اس لیے یہ فرض ایسے طریقے پر بجا لانے کا فیصلہ کر لیا کہ ہندوستان کے طول و عرض میں اس کی اہمیت کا غلغلہ بلند ہو جائے اور خطراتِ طریق کے عذر تراشیوں کا ہر فتویٔ دجل اس غلغلے کی موجوں میں خس و خاشاک کی طرح بہ جائے۔ چنانچہ آپ نے اپنے تمام ارادت مندوں کو سید زین العابدین (ابن سید احمد علی، خواہر زادۂ سید صاحب) سے خط لکھوائے، جن کا مضمون یہ تھا:

> ہم واسطے ادا و حج کے بیت اللہ جاتے ہیں۔ جن جن صاحبوں کو حج کرنا منظور ہو، انھیں اپنے ہمراہ لائیں، مگر یہ حقیقت ہر ایک پر واضح کر دیں کہ ہمارے پاس نہ کچھ مال ہے، نہ خزانہ۔ محض اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے جاتے ہیں۔ اس کی ذاتِ پاک سے قوی امید

> ہے کہ وہ اپنے فضل سے ہماری مراد پوری کرے گا اور جہاں کہیں راستے میں واسطے حاجت ضروری کے خرچ نہ ہوگا، وہاں ٹھہر کر ہم لوگ محنت مزدوری کریں گے۔ جب بخوبی خرچ جمع ہو جائے گا، تب وہاں سے آگے کو روانہ ہوں گے۔ عورتیں اور ضعیف مرد جو مزدوری کے قابل نہ ہوں گے، ڈیروں کی نگرانی پر رہیں گے اور اس خرچ میں کمانے والے اور ڈیروں پر رہنے والے سب برابر کے شریک ہوں گے۔

جن صاحبوں کو یہ خط بھیجے گئے، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: مولانا عبدالحی (بڑھانہ)، مولانا شاہ اسماعیل (دہلی)، مولوی وحید الدین، ان کے بھائی حافظ قطب الدین اور ان کے والد حافظ معین الدین (پھلت)، مولانا وجیہ الدین، حافظ عبدالرب، حکیم مغیث الدین اور ان کے بھانجے شہاب الدین (سہارن پوری)، ملا دوندے (بھاڈ پور)۔[1]

اقربا کو دعوت

یہ تمام خطوط جان محمد نجلاسر والے کے ہاتھ بھیجے گئے تھے، اس لیے بھی کہ اس زمانے میں ڈاک کا انتظام نہ تھا اور اس لیے بھی کہ قاصد ہر مکتوب الیہ پر سید صاحب کے عزم راسخ کی کیفیت پوری طرح واضح کر دے۔ تھوڑی ہی مدت میں تمام ارادت مندوں کی طرف سے جوابات آگئے۔ ان میں سے ایک جواب یہ تھا:

> بشارت نامہ ہدایت شمامہ آیا۔ نہایت معزز و ممتاز اور خوش دل ہو سرفراز فرمایا۔ کیفیت فیض طویت جو اس میں درج تھی، دریافت ہوئی۔ ان شاء اللہ عنقریب حاضر خدمت سراپا برکت ہوں گے اور موافق ارشاد ہدایت بنیاد حضور پرنور وافر السرور کے جو صاحب عازم بیت اللہ ہوں گے، انھیں ساتھ لائیں گے۔

> باقی جوابات کا مضمون بھی ایسا ہی ہوگا۔

اس اثنا میں سید صاحب نے اپنے اقربا کو بھی دعوت عام دے دی، خواہ وہ تکیے میں رہتے تھے یا قلعے میں، نصیر آباد میں تھے یا جائس میں۔ بلکہ رائے بریلی کے پٹھانوں اور عام مسلمانوں سے بھی کہا کہ جس جس کا جی چاہے تیار ہو جائے، خرچ کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔ زیادہ تر اقربا ابتدا میں متوقف

---

[1] وقائع صفحہ ۲۱۷ - روایت میں ہے کہ جس طرح حکیم مغیث الدین کی ذات بابرکت سے سہارن پور والوں کو ہدایت ہوئی تھی اسی طرح ملا دوندے کے سبب سے اطراف و نواح سہارن پور میں بے شمار لوگ راہ حق پر لگ گئے

تھے۔ وہ کہتے تھے کہ علماء نے تو امن طریق نہ ہونے کے باعث اہل ثروت پر بھی حج فرض ہونے سے اختلاف کیا ہے، آپ کے پاس تو ایک دن کا خرچ بھی موجود نہیں۔ پھر کیوں عزیزوں کو خراب اور پریشان کرنے کے درپے ہیں؟ لیکن سید صاحب سب سے کہتے تھے کہ ساری تنگی رائے بریلی میں ٹھہرے رہنے تک ہے۔ یہاں سے نکلیں گے تو دیکھ لینا خدائے قدیر کس طرح ہر ضرورت کا سامان مہیا کرتا ہے۔ بہرحال میں ہر شخص کو پہلے حرمین بھجواؤں گا اور خود سب کے آخر میں جاؤں گا۔ چند اقربا ابتدا ہی سے تیار تھے:

سید محمد یعقوب (برادرزادۂ سید صاحب) مع والدۂ ماجدہ، سید محمد علی، سید احمد علی، سید حمید الدین اور سید عبدالرحمٰن (خواہرزادگان سید صاحب) مع والدہ و اہل و عیال۔ سید صاحب کی خالہ (سید محمد کی خوش دامن) سید محمد ظاہر، سید محمد عمر نصیر آبادی، اہلیہ محمد قائم جائسی (سید صاحب کے ہم زلف)۔

> ایک روایت میں ہے کہ سید محمد علی ابتدا میں تنہا تیار ہوئے تھے۔ سید صاحب انھیں "ملّا" کہہ کر پکارتے تھے ایک روز پوچھا کہ بال بچوں کو کیوں ساتھ نہیں لیتے؟ سید محمد علی نے عذر پیش کیے تو فرمایا: بھائی! شاید موت کا ڈر ہے۔ بالفرض والتقدیر موت پیش بھی آجائے تو نہیں سنا کہ مرگ انبوہ جشنے دارد؟ معہذا حج وغیرہ کا ثواب ملے گا نیز شرف شہادت، جس کا جویا ہر مسلمان ہے۔
> اس کے بعد سید محمد علی بھی مع اہل و عیال تیار ہو گئے۔

عازمین کی آمد

سید صاحب جس زمانے میں کان پور کے دوسرے دورے سے رائے بریلی واپس جا رہے تھے تو کوڑا میں شیخ ولی محمد اور شیخ عبدالحکیم (باشندگان پھلت) ملے اور بتایا کہ مولانا عبدالحی تیس پینتیس اصحاب کے قافلے کے ساتھ آ رہے ہیں۔ انھیں دو تین روز کے لیے کان پور والوں نے روک لیا۔ دلمئو کے گھاٹ پر عازمین حج کا یہ قافلہ سید صاحب سے آملا۔ رائے بریلی پہنچے تو اقربا کو یقین ہوا کہ حج کا ارادہ پختہ ہے، اس لیے کہ مولانا عبدالحی قافلے کو لے کر پہنچ گئے تھے۔ انھیں دنوں میں مولانا شاہ اسماعیل کا خط ملا کہ حکیم مغیث الدین اور مولوی وجیہ الدین سہارن پوری، مولوی وحید الدین اور حافظ قطب الدین پھلتی وغیرہ عورت و مرد اڑھائی سو کا قافلہ، جس میں خود میں بھی شامل ہوں، گڑھ مکتیشر کے گھاٹ سے کشتیوں پر سوار ہو چکا ہے۔ اس وقت سے سید صاحب نے سفر کا ضروری سامان دلمئو بھیجنا شروع کر دیا، جہاں سے پورے قافلے کو لے کر کشتیوں پر کلکتہ روانہ ہونا تھا۔

اس زمانے میں اکثر لوگ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر بے سروسامانی کا ذکر چھیڑ دیتے تھے۔ آپ نے ایک روز فرمایا: اگر آج والی لکھنؤ اعلان کر دے کہ جس مسلمان کا جی چاہے حج کے لیے تیار ہو جائے، خرچ میں ادا کروں گا تو کیا لوگ اس اعلان پر یقین نہ کریں گے؟ ایک معمولی دنیوی حکمران کے

اعلان پر تو آپ لوگوں کو اتنا بھروسا ہے، جس کے وسائل بہر حال محدود ہیں اور خدائے پاک کے فضل و رحمت پر تکیہ کرنے میں تامل ہے، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ یہ کتنی افسوس ناک بات ہے۔ مَیں اگر عام مسلمانوں کو حج کی دعوت دیتا ہُوں تو اسی رحیم و کریم خدا کی رحمت کے بھروسے پر دیتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس کی رحمت سے یہ کام پورا ہو گا۔

قافلہ

غرض تمام افراد زن و مرد رائے بریلی میں جمع ہو گئے۔ اس کے بعد جو قافلہ تیار ہُوا، جس کی کیفیت یہ تھی:

شاہ اسماعیل اور اصحاب پھلت و سہارن پور	قریباً اڑھائی سو
مولانا عبدالحی کا قافلہ	قریباً چالیس افراد
سیّد صاحب کے اقربا	قریباً چالیس افراد
رائے بریلی، دلمئو، جائس نصیر آباد وغیرہ کے افراد	قریباً ایک سو

اس طرح کم و بیش چار سو افراد کا قافلہ تیار ہو گیا، جو شوال ۱۲۳۶ھ کی آخری تاریخ (۳۰۔ جولائی ۱۸۲۱ء) کو پیر کے دن کامل بے سروسامانی کی حالت میں رائے بریلی سے روانہ ہُوا۔

نہ برگ و ساز کی پروا، نہ انتظارِ رفیق — یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق
اگر خدا پہ بھروسا ہے، ہو یگانہ رواں — خدا سے بڑھ کے نہیں برگ و ساز کی توفیق

سترھواں باب

سفرِ حج

(رائے بریلی سے الہ آباد تک)

روانگی جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے سید صاحب کا قافلۂ حج رائے بریلی سے دلمئو روانہ ہوا جہاں سے کشتیوں پر سوار ہو کر کلکتہ جانا منظور تھا اور پورے قافلے میں کم و بیش چار سو افراد تھے، زیادہ تر مرد، ان سے کم تر عورتیں، ان سے کم بچے۔ عام شہرت ہو چکی تھی کہ سید صاحب بڑے قافلے کے ساتھ حج پر جا رہے ہیں اور جو ساتھ جانا چاہے اس کے خرچ کی ذمہ داری اُٹھا رہے ہیں۔ اس وجہ سے واقعے نے بہت اہمیت اختیار کر لی تھی اور لوگ جوق در جوق دیکھنے کے لیے چلے آ رہے تھے۔ سید صاحب نے تمام انتظامی معاملات مولوی محمد یوسف پھلتی کے سپرد کر رکھے تھے۔ روانگی کے وقت مولوی صاحب کے پاس ایک سو سے کسی قدر زائد روپے تھے۔ سید صاحب نے ان میں سے بیشتر روپے فقرا و مساکین میں بانٹ دیے۔ سئی ندی کو عبور کر کے ایک باغ میں ٹھہرے اور مختلف اصحاب سے رخصتی ملاقات کی۔ ایک میل جا کر پھر ایک باغ میں ٹھہر گئے کہ جو لوگ پیچھے رہ گئے ہوں وہ بھی ساتھ مل جائیں۔ وہاں سے چلنے کا ارادہ فرمایا تو مولوی محمد یوسف کے پاس صرف سات روپے رہ گئے تھے۔ سید صاحب نے وہ بھی ان فقرا کو دلا دیے، جنھیں پہلی تقسیم میں حصہ نہیں ملا تھا، پھر ننگے سر کھڑے ہو کر یوں دعا کی:

> اے کریم کارساز! اتنی مخلوق اس ناچیز کے ہمراہ ہو گئی ہے۔ تو مجھ ناچیز پر اپنا لطف فرما۔ اپنے الطاف و اکرام کی برکت سے ان سب کو بطریق احسن منزل مقصود پر پہنچا۔

اس طرح وہ برگزیدۂ بارگاہ الٰہی بڑی جماعت کو ساتھ لے کر بالکل خالی ہاتھ حج کے لیے نکلا۔ ہزاروں روپے کا خرچ درپیش تھا، مگر اُسے ایک لمحہ کے لیے بھی تشویش نہ تھی۔ خدائے عزوجل کے فضل و رحمت پر اس درجہ پختہ اور غیر متزلزل توکل کی مثالیں ہر دور اور ہر عہد میں نہیں مل سکتیں۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اسبابِ ظاہری کے کامل فقدان سے سفرِ حج شروع کرنے میں یہ مصلحت تھی کہ اس کی فرضیت ساقط کرنے والوں کے اوہام و وساوس کی زیادہ مؤثر تردید ہو جائے۔

قافلے کا نقشہ

سید محمد علی نے "مخزن" میں قافلے کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے کہ لوگوں میں عجیب و غریب باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک کہتا کہ میرے پاس صرف تین منزل کا خرچ ہے، دوسرا کہتا کہ میرے پاس تو اس کا ایک حصہ بھی نہیں۔ خدا جانے مجھ پر کیا گزرے۔ تیسرا کہتا میں تو اس بات پر حیران ہو رہا ہوں کہ جن مساکین کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں، وہ منزل مقصود پہ کیوں کر پہنچیں گے اور انھیں قوتِ لایموت کہاں سے ملے گی؟ سید صاحب کے ایک رفیق خاص نے یہ گفتگو سنی تو کہا: جس کریم مطلق کے خزانۂ غیب سے دنیا بھر کے مہمانوں کو، جو دوست دشمن کے گھر روزانہ اُترتے ہیں، طرح طرح کے کھانے ملتے ہیں، کیا آپ لوگوں کو وہ اپنے انعام واکرام سے محروم رکھے گا؟ حالانکہ آپ اس کے خانۂ فیض کاشانہ کا ارادہ لے کر نکلے ہیں؟

موسم کی یہ کیفیت تھی کہ کبھی بارش شروع ہو جاتی، کبھی تیز دھوپ نکل آتی۔ راستہ کیچڑ سے پٹا ہوا تھا۔ جگہ جگہ نالے بہ رہے تھے۔ رفیقان خاص میں سے کوئی پھسل کر گر پڑتا تو مالک حقیقی کا شکریہ ادا کرتا ہوا اٹھتا اور کہتا: باری تعالیٰ! تیرے احسان کے قربان جاؤں کہ تیری راہ میں گرا۔ اس طرح تیرے فضل لایزال کی برکت سے میری سابقہ ہرزہ گردیوں کی تلافی کا موقع پیدا ہو گیا۔ گویا خواجۂ شیراز کا یہ شعر سب کے جمال حال کا ترجمان تھا:

در بیاباں گر ز شوقِ کعبہ خواہی زد قدم
سرزنش ہا گر کند خارِ مغیلاں غم مخور

سید صاحب کی ہدایات

سید صاحب نے اس سفر کے سلسلے میں اپنے ساتھیوں کو وقتاً فوقتاً جو ہدایات فرمائیں، ان سب کا حصر مشکل ہے۔ لیکن مندرجہ ذیل ہدایات خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

> کسی سے سوال نہ کرو۔ تقویٰ کو شعار بناؤ۔ پختہ ارادہ کر لو کہ مزدوری کریں گے۔ جو کچھ ملے گا، اس میں سے آدھا کھانے کے مصرف میں لائیں گے، آدھا زادِ راہ کے لیے بچائیں گے۔ میں اپنے حج کو ہمراہیوں کے حج پر مقدم نہیں کروں گا۔ اگر زادِ راہ کم ہو گی، تو کلکتہ سے تھوڑے تھوڑے آدمی بھیجتا جاؤں گا۔ جب سارے ساتھی چلے جائیں گے تو خود جاؤں گا، لیکن رب العالمین کی ذاتِ پاک سے امید ہے کہ سب کے لیے سامانِ سفر بخوبی درست ہو جائے گا۔

اہل دلمئو کو پہلے سے علم تھا کہ سید صاحب آنے والے ہیں۔ انھوں نے چند آدمی اس غرض سے

روانے بریلی بھیج دیے کہ آپ کا کوچ ہوتے ہی جلد سے جلد خبر پہنچا دیں تاکہ ضرورت کے مطابق کھانے کا انتظام پہلے سے کر لیا جائے۔ ان آدمیوں نے بتایا کہ قلعہ قیام کے لیے خالی کر رکھا ہے۔ جگہ صاف کر کے فرش بچھا دیا ہے۔ پانی کے گھڑے موجود ہیں۔ مستورات وہاں ٹھہریں گی۔ مردوں کے لیے ٹھہرنے کا الگ انتظام ہے۔ سید صاحب نے اس اہتمام پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا، لیکن تاکید کر دی کہ جب تک ہم دلمئو میں داخل نہ ہو جائیں، کھانا نہ پکایا جائے اور ہمارا یا ساتھیوں کا جتنا اسباب پہنچے، اُس کی پوری حفاظت کی جائے۔

سید صاحب مردوں کے ساتھ پہلے نکلے۔ زنانہ سواریاں ایک دو روز بعد روانہ ہوئیں۔ سید عبدالرحمٰن (خواہر زادۂ سید صاحب) کو ان کی حفاظت اور انتظام سفر کے لیے مقرر کر دیا گیا تھا۔

دلمئو میں قیام

جب دلمئو دو میل کے فاصلے پر رہ گیا تو سید صاحب ایک باغ میں ٹھہر گئے، بستی کے لوگ پیشوائی کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ان میں دو حقیقی بھائی بھی تھے، جن میں اس بنا پر جھگڑا ہو گیا کہ دونوں سید صاحب کی دعوت میں تقدم پر اصرار کر رہے تھے۔ آپ کو معلوم ہوا تو دونوں کو بلا کر فرمایا کہ ہم دونوں کے ہاں باری باری دعوت کھائیں گے۔ پھر چھوٹے بھائی سے کہا کہ یہ آپ کے بڑے بھائی ہیں، ان کا آپ پر حق ہے۔ جو یہ کہتے ہیں، وہی سہی۔ پہلے انھیں دعوت کر لینے دو۔ اس طرح مناقشہ ختم ہو گیا۔

سید صاحب پیر کے دن دلمئو پہنچے تھے۔ متفرق سواریوں اور باربرداریوں کے بائیس روپے واجب الادا تھے۔ اس اثنا میں لوگوں سے نذریں ملتی رہیں۔ آپ نے بائیس روپے وہ ادا کیے، تین روپے بطور انعام دیے۔ دلمئو میں ٹھہر کر پانچ کشتیاں سو روپے فی کشتی کے حساب سے (غالباً بنارس تک) کرایے پر لیں اور سو روپے ان لوگوں کو بطور پیشگی دے دیے۔ بعد نماز جمعہ کشتیوں پر سوار ہوئے۔ گویا چار راتیں دلمئو میں گزاریں۔

چونکہ سب ساتھی کشتیوں پر سوار نہیں ہو سکتے تھے اس لیے سید صاحب نے قوی ساتھیوں کو الگ کر کے حکم دے دیا کہ وہ دریا کے کنارے کنارے پیدل چلیں۔ یہ بھی فیصلہ ہو گیا کہ مولانا شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحی اور مولوی محمد یوسف پھلتی باری باری ان کے ساتھ چلیں گے۔

قیام دلمئو میں ایک مرتبہ بھی کھانا پکانے کی نوبت نہ آئی، اس لیے کہ مقامی لوگ شوق و اصرار سے دعوتیں کرتے رہے۔ روزانہ مولانا عبدالحی وعظ فرماتے تھے، جس میں توحید اور اتباع کتاب و سنّت کے علاوہ حج و عمرہ کے فضائل تفصیل سے بیان کیے جاتے تھے۔

سید صاحب کا وعظ

ایک روز سید صاحب نے فرمایا کہ مولانا کا وعظ آپ لوگوں نے سنا اب

کچھ ہماری باتیں بھی سن لو۔ پھر جو کچھ زبانِ مبارک پر جاری ہوا، یہ تھا (میں نے پوری کوشش کی ہے کہ الفاظ بھی سید صاحب کے محفوظ رکھے جائیں):

بھائیو! اگر آپ اپنا گھر بار چھوڑ کر اس نیت سے حج وغیرہ کے لیے جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو، تو لازم ہے کہ آپس میں ایسا اتفاق اور تعلق رکھیں جیسے ایک ماں باپ کے نیک بخت بیٹے ہوتے ہیں۔ سب بھائی ہر ایک کی راحت کو اپنی راحت اور ہر ایک کے رنج کو اپنا رنج سمجھیں۔ ایک دوسرے کے کاروبار میں بلا انکار حامی و مددگار رہیں۔ ایک دوسرے کی خدمت کو ننگ و عار نہ جانیں بلکہ عزّت و افتخار سمجھیں۔ یہی کام اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے ہیں اور جب ایسے اخلاق آپ میں ہوں گے تو غیر لوگوں کو بھی شوق ہو گا کہ یہ عجیب قسم کے لوگ ہیں، ان میں شامل ہوا چاہیے۔

برہان ربوبیت

اللہ تعالیٰ کے فضل پر کامل بھروسا کریں۔ کسی مخلوق سے کسی چیز کی آرزو ہرگز نہ رکھیں۔ رزاق مطلق اور حاجت روائے برحق وہی پروردگارِ عالم ہے۔ بے حکم اس کے کوئی کسی کو کچھ نہیں دیتا۔ دیکھو تو، جس وقت بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا کون اسے روزی پہنچاتا ہے؟ وہی بچے کو آسانی سے باہر لاتا ہے اور اس سے پہلے ماں کی چھاتیوں میں اس کی روزی تیار رکھتا ہے۔ پھر اسی کی تعلیم سے بچہ دودھ پیتا ہے جتنا چاہتا ہے پی لیتا ہے۔ باقی دودھ مکھی، بال اور گرد و غبار سے بالکل محفوظ ماں کی چھاتیوں میں جمع رہتا ہے کہ بچہ جب چاہے تازہ تازہ پیے۔ یہ اسی پروردگارِ عالم کی روزی رسانی ہے، جو کچھ مدت بعد دودھ چھڑا کر اسے دوسری غذا کی تعلیم فرماتا ہے۔ اسی طور پر پرورش پا کر وہ بچے سے جوان اور جوان سے بوڑھا ہوتا ہے۔ جو روزی کسی کی تقدیر میں لکھی ہے، وہ بہر صورت بے شک و شبہ اسے پہنچے گی۔

قادر برحق کا وعدہ

خود اپنی حالت پر نظر ڈالو۔ ایک معمولی آدمی ہم لوگوں کو کھانے کی دعوت دے جاتا ہے۔ وہ چاہے جھوٹ ہی کہہ جائے لیکن اس پر اعتماد کر کے ہم اپنے گھر کھانا پکانے کی ممانعت کر دیتے ہیں۔ مگر غازی الدین حیدر والی لکھنؤ وعدہ کرے کہ میرا فلاں آدمی بیت اللہ شریف کو جاتا

ہے، اس کے ہمراہ جو شخص جائے گا، اس کے زادِ راہ کا انتظام میرے ذمے ہوگا تو ہزاروں آدمی خوشی بخوشی جانے پر مستعد ہو جائیں گے۔ وعدہ خلافی کا شک و شبہ اپنے دل میں نہ لائیں گے۔ مجھ سے تو شاہنشاہِ عالم، قادرِ برحق، رزّاقِ مطلق نے وعدہ کیا ہے کہ جو لوگ اس سفر میں تیرے ساتھ ہوں گے، ان کے کھانے اور کپڑے کے متعلق تو کچھ اندیشہ نہ کر۔ وہ سب میرے مہمان ہیں اور وہ شاہنشاہ وعدے کا سچا ہے۔ وعدہ خلافی کا خفیف سا بھی احتمال نہیں۔ پھر میں کیوں کر سچ نہ جانوں اور کس بات کا اندیشہ کروں؟ وہ آپ سب بھائیوں کی پرورش کرے گا۔

شرطِ سفر

سو حاصل کلام یہ ہے کہ جن بھائیوں کو یہ سب باتیں منظور ہوں اور میرے کہنے کو سچ جانتے ہوں، وہ تو میرے ساتھ چلیں۔ میں رنج و راحت میں ان کا شریک ہوں اور میری یہ باتیں اپنی عورتوں کو بھی سمجھا کر کہ دیں۔ اگر انھیں یہ منظور نہیں تو ابھی مکان نزدیک ہے۔ وہ تکلیفِ سفر کی موقوف کر لیں۔ سفر میں ہر طرح کی تکلیف اور مصیبت بھی پیش آتی ہے اور راحت بھی ہوتی ہے۔ یہ سب باتیں اس غرض سے کھول کر بیان کر رہا ہوں کہ پھر کوئی بھائی کسی بات کا گلہ شکوہ زبان پر نہ لائے۔

مجھے عنایاتِ الٰہی سے قوی امید ہے کہ اس سفرِ باظفر میں اللہ تعالیٰ میرے ہاتھ سے لاکھوں آدمیوں کو ہدایت نصیب کرے گا۔ ہزاروں لوگ جو شرک و بدعت اور فسق و فجور کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہیں اور شعارِ اسلام سے مطلق ناواقف ہیں وہ پکے موحد اور متقی بن جائیں گے۔

دُعائے فتح بابِ حرمین

میں نے اہلِ ہند کے لیے جنابِ الٰہی میں بہت دُعا کی کہ الٰہی! ہندوستان سے تیرے کعبے کی راہ مسدود ہے۔ ہزاروں مال دار، صاحبِ زکوٰۃ مر گئے، مگر نفس و شیطان کے بہکانے سے اس بنا پر حج سے محروم رہ گئے کہ راستے میں امن نہیں۔ ہزاروں صاحبِ ثروت اب جیتے ہیں اسی وسوسے میں پڑ کر حج کے لیے نہیں جاتے۔ الٰہی! اپنی رحمت سے ایسا راستہ کھول دے کہ جو ارادہ کرے، بے دغدغہ چلا جائے اور اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم نہ رہے۔ میری یہ دُعا اس ذاتِ پاک نے مستجاب فرمائی۔ ارشاد ہُوا:

جب توجہ کرے گا تو یہ راستہ علی العموم کھول دیں گے۔ جو مسلمان بھائی زندہ ہیں، وہ انشاء اللہ بہ چشم خود یہ سب کچھ دیکھ لیں گے"۔

فتح باب ہیچ سلطانوں اور فرماں رواؤں کا کام تھا، جنھیں اسباب و وسائل پر وسیع قدرت حاصل ہوتی ہے، لیکن اس دروازے کو کھولنے اور راستے کی ساری مشکلات کو بے حقیقت ثابت کرنے کا شرف سید صاحب ہی کو ملا جن کے پاس اسلام کی بے میل محبت کے سوا کوئی متاع نہ تھی۔ اسی طرح باب جہاد بھی ارباب سلطنت و حکومت ہی کے ذریعے سے کھل سکتا تھا، جو خیل و خدم اور ثروت و حشم کے مالک ہوتے ہیں، لیکن اس مقدس فریضے کو بھی بارہ صدیوں کے بعد منہاج نبوت پر قائم کرنے کی برتری صرف سید صاحب کو حاصل ہوئی:

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

دھئی دھمدھمہ

۴- ذی قعدہ ۱۲۳۶ھ (۳- اگست ۱۸۲۱ء) کو سید صاحب دلمئو سے روانہ ہوئے[1] اگلا مقام دھئی دھمدھمہ میں تجویز ہوا تھا جہاں کے شیخ مظہر علی صاحب سید صاحب کے مخلص مرید تھے اور دلمئو پہنچ کر دعوت دے گئے تھے۔ مغرب کی نماز کشتیوں میں پڑھی گئی۔ اندھیرا ہو گیا تو دھئی دھمدھمہ کے گھاٹ کا پتا نہ چل سکا اور کشتیاں آگے نکل گئیں۔ دریا چڑھاؤ پر تھا اور پانی کا زور تھا۔ جو لوگ استقبال کی غرض سے کنارے پر کھڑے تھے، انھوں نے آوازیں دیں۔ بڑی مشکل سے کشتیاں روکی گئیں اور خاصے فاصلے پر سے رسوں کے ذریعے سے کھینچ کھینچ کر انھیں کنارے پر لگایا گیا[2]۔ مستورات کشتیوں ہی میں رہیں اور ان کے لیے وہیں کھانا پہنچا دیا گیا۔ سید صاحب کے لیے پینس کا انتظام تھا۔ بستی میں پہنچے اور اگلے روز صبح سے ڈیڑھ پہر تک بیعت کا سلسلہ جاری رہا۔ روانگی کے وقت سید صاحب نے وعظ فرمایا۔ اُس میں کہا:

> بھائیو! حاصل بیعت یہ ہے کہ تم لوگ جو شرک و بدعت کرتے ہو، تعزیے بناتے ہو، نشان کھڑے کرتے ہو، پیروں، شہیدوں کی قبریں پوجتے ہو، ان کی نذر نیاز مانتے ہو،

---

[1] وقائع ایک نسخہ صفحہ ۲۴۷ - ۲۴۹، دوسرا نسخہ صفحہ ۲۳۲ - ۲۳۴ - [2] سید ابوالحسن علی نے تفصیل یوں بتائی ہے کہ پہلی کشتی میں رائے بریلی اور نصیر آباد کی مستورات سوار تھیں، دوسری میں پھلت، دہلی وغیرہ کی۔ تیسری میں لکھنؤ کی، چوتھی میں قافلے کے ضعیف و معذور اشخاص۔ پانچویں میں غالباً سید صاحب اور بعض دوسرے رفقا تھے۔

ان سب کاموں کو چھوڑ دو اور سوائے خدا کے کسی کو اپنے نفع و ضرر کا مالک نہ جانو اور اپنا حاجت روا نہ پہچانو۔ اگر یہ نہ کرو گے تو فقط بیعت کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

ڈگڈگی دھنی دھمدھمہ سے روانہ ہو کر کشتیاں ڈگڈگی کے سامنے پہنچیں تو وہاں کا زمیندار شیخ محمد پناہ کنارے پر منتظر کھڑا تھا اس نے سید صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ کئی روز سے مہمانی کا سامان تیار کر رکھا ہے اور گرد و نواح سے تین سو آدمی بیعت کی غرض سے غریب خانے پر جمع ہیں۔ سید صاحب نے وہاں بھی مقام کیا۔ بیعت کرنے والوں میں محمد پناہ کا لڑکا محمد کفاہ بھی تھا۔ غالباً اسی مقام پر شاہ عطا کریم سلونی نے ایک آدمی کے ہاتھ شیرینی بھیجی تھی۔

صبح کو ڈگڈگی سے روانہ ہوئے۔ شام ہو گئی تو ملاحوں نے ایسی جگہ کشتیاں باندھیں جہاں آس پاس کوئی بستی نظر نہیں آتی تھی۔ دریا کے کنارے کی زمین دور دور تک اس درجہ خراب تھی کہ کھانا پکانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس اثنا میں کالی گھٹا اٹھی، تیز ہوا چلنے لگی اور قطرہ افشانی شروع ہو گئی۔ سب نے سمجھ لیا کہ رات کھائے بغیر گزارنی ہوگی۔ اچانک دور مشعلیں نظر آئیں۔ سمجھا گیا کہ کچھ لوگ کشتیوں کی طرف آ رہے ہیں۔ پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ نیل کے انگریز تاجر نے اپنے مسلمان کارکنوں کے پاس خاطر سے پلاؤ کی دیگیں پکوا کر بھیجی ہیں اور خود گھوڑے پر ساتھ آیا ہے۔

گتنہ وہاں سے آگے بڑھے تو پیر نگر پر، جو مانک پور سے دو کوس ہے، دریا دو دھاروں میں بٹا ہوا تھا۔ بڑا دھارا مانک پور کی طرف گیا تھا اور چھوٹا گتنہ کی طرف۔ سید صاحب گتنہ جانا چاہتے تھے لیکن اس طرف کے دھارے میں چونکہ پانی کم تھا اور رات کو اس میں کشتیاں چلانا مشکل تھا اس لیے ٹھہر گئے۔ کچھ کھانا دعوت کا بچا ہوا تھا، وہ کھایا۔ ایک دیگ ارہر کی کھچڑی کی پکوائی گئی۔ صبح کے وقت چلے تو گتنہ پہنچے اور آصف خاں رسالدار کے مکان پر قیام کیا۔ مستورات کے لیے حسب سابق کشتیوں ہی پر کھانا بھجوا دیا گیا۔ اس جگہ سے قریب ہی موضع گڑھ تھا جہاں کے مولوی یار علی نے فرضیت حج ساقط کر دینے پر قناعت نہیں کی تھی بلکہ سفر حج کی (معاذ اللہ) حرمت کا وعظ کہتا رہتا تھا۔ استدلال یہ تھا کہ سمندر کے سفر میں جہاز ڈوب جاتے ہیں۔ چونکہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو (لا تلقوا بایدیکم۔ الی التہلکہ) اس لیے مولوی یار علی علی الاعلان کہتا رہتا تھا کہ جو لوگ خطرات کے باوجود حج کے لیے جاتے ہیں، وہ قرآن پاک کے اس حکم کی مخالفت کرتے ہیں اور ان کا عمل سراسر غلط ہے۔ شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی چالیس آدمی ساتھ لے کر گڑھ پہنچے۔ شاہ ابراہیم علی کی مسجد میں مولوی یار علی سے گفتگو کی اور بہ دلائل واضح اسے اور دوسرے مسلمانوں کو فرضیت حج

کا معتقد بنایا۔

کیما، اوجھنی اور چیری

گنتہ سے چل کر کشتیاں جہان آباد کے گھاٹ پر رکیں۔ وہاں سے تین کوس پر کیما ایک مقام تھا جہاں کے شیخ حسن علی پہلے سے سید صاحب کے مرید تھے اور آپ کو اپنے گاؤں ساتھ لے جانے کی غرض سے گنتہ پہنچے ہوئے تھے۔ چنانچہ جہان آباد کے گھاٹ پر سید صاحب تین روز رُکے رہے۔ اس اثنا میں مہمانداری کا سارا انتظام شیخ حسن علی نے اپنے ذمے رکھا۔ پھر اپنے چاروں بھائیوں اور مستورات کو لے کر حج کے ارادے سے ساتھ ہو گئے۔

جہان آباد سے آگے ایک مقام اوجھنی میں ہوا۔ وہاں کے زمیندار شیخ لعل محمد نے دعوت کی اور سیکڑوں آدمی مرید ہوئے۔ آگے بڑھے تو راستے میں ایک انگریز کی مسلمان بیوی نے دعوت کی غرض سے روکا۔ سید صاحب نے اس کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر انگریز خود آیا اور عرض کی کہ اس کی دعوت نہ مانیے لیکن میری دعوت قبول کر لینے میں تو تکلف نہ ہونا چاہیے۔ آپ نے انگریز کی دعوت قبول کر لی۔ دوسرے روز بستی کے لوگوں نے دعوت کی۔ وہاں سے چلے تو چار کوس کے فاصلے پر موضع اسرولی کے زمیندار شیخ محمد وزیر نے (جو اوجھنی کے شیخ لعل محمد کا خسر تھا) روک لیا۔ سید صاحب جن لوگوں سے بیعت لیتے تھے، انھیں خود نماز پڑھاتے تھے اور بعض آدمیوں کو دینی تعلیم پر مقرر کر دیتے تھے۔ اسرولی میں بھی یہ انتظامات کیے۔

اسرولی سے چلے تو الہ آباد کے مقابل گنگا سے دوسرے کنارے پر چیری نام ایک موضع میں ٹھہرے۔ وہاں آس پاس سے تین ہزار آدمی بیعت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ رات آپ نے چیری ہی میں گزاری۔ وہیں شیخ غلام علی الہ آبادی کے آدمی استقبال کے لیے پہنچ گئے۔

الہ آباد

اگلے روز الہ آباد پہنچے۔ گھاٹ پر شیخ غلام علی رئیس، محمد تقی، اور ان کے بھائی عبداللہ قصاب، شاہ اجمل کے فرزند شاہ ابوالمعالی، قلعۂ الٰہ آباد کے داروغہ بستی میاں، رنجیت خاں میواتی، مولوی کرامت علی صدر امین، حافظ اکرام الدین دہلوی، حافظ نجابت علی سوداگر، محمد حسین، عبدالقادر، شیخ سارنگ وغیرہ استقبال کے لیے موجود تھے۔ یہ سب سید صاحب کے ارادت مند تھے۔ لیکن شیخ غلام علی نے ہر ایک سے کہہ دیا تھا کہ دورانِ قیام الہ آباد میں کوئی صاحب سید صاحب کو کھلانے کی تکلیف نہ دیں۔ یہ احسان صرف میرے ذمے رہنے دیا جائے۔ ہاں اپنے مکان پر لے جا کر پان کھلائیں، عطر لگائیں، نذریں پیش کریں۔ کھانا نہ کھلائیں۔ چنانچہ سید صاحب جب تک الہ آباد میں ٹھہرے رہے، پورے قافلے کی مہمان داری شیخ غلام علی ہی نے فرمائی اور کس شان واہتمام کے ساتھ؟ آج اس کی تفصیلات

سن کر شاید اکثر لوگ سمجھیں گے کہ خیالی افسانہ بیان ہو رہا ہے، حالانکہ شیخ صاحب نے تواضع و مدارات کا جو نمونہ پیش کیا، اس کی محض سرسری کیفیت ہم تک پہنچ سکی ہے۔

قیام و طعام

شیخ صاحب مہاراجا اودت نرائن والی بنارس کے مختار تھے۔ انھوں نے سید صاحب کو ایک کوٹھی میں ٹھہرایا۔ باقی قافلے کے لیے مہاراجا کی بارہ دری خالی کرائی۔ پورے قافلے کے لیے دونوں وقت کا کھانا، قیام گاہوں پر پہنچ جاتا تھا اور کیسا کھانا؟ ایک ایک وقت میں کئی کئی چیزیں تیار ہو کر آتیں۔ مثلاً قیما، پلاؤ، زردہ، شیرمال، تازہ مٹھائی، خمیری روٹیاں۔ اس وقت تک ساتھیوں کی تعداد ساڑھے سات سو ہو چکی تھی، لیکن شیخ صاحب کے تکلف میں کوئی کمی نہ آئی۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ کم از کم ایک ہزار روپے روزانہ صرف کھانے پر صرف ہوتے تھے اور یہ اس زمانے کا خرچ ہے، جب جنسیں بے حد ارزاں تھیں۔

نذریں

شیخ صاحب دن میں دو مرتبہ سید صاحب سے ملنے کے لیے آتے۔ ایک مرتبہ بعد نماز ظہر، دوسری مرتبہ بعد نماز مغرب۔ دونوں مرتبہ بیش بہا نذریں ساتھ لاتے۔ مثلاً نہایت قیمتی پارچے، عمدہ بندوقیں، پستول اور تلواریں۔ بعض اوقات نقد روپیہ لے آتے۔ واقف کار اصحاب کا اندازہ ہے کہ بارہ پندرہ روز کے قیام میں شیخ صاحب نے اس طریق پر جو نذریں پیش کیں، وہ بہ حیثیت مجموعی بیس ہزار سے کم نہ ہوں گی۔

سید صاحب ہتھیاروں کو دیکھ کر فرماتے کہ شیخ بھائی ہم تو حج کے لیے جا رہے ہیں؛ وہاں ہتھیاروں کا کچھ کام نہیں۔ واپس اگر جہاد کے لیے نکلیں گے تو لے لیں گے۔ شیخ صاحب عرض کرتے: "حضرت! اول تو یہ معلوم نہیں کہ آپ کب اور کس جگہ سے علم جہاد بلند کریں گے۔ دوسرے خدا جانے میں اس وقت تک زندہ رہوں یا نہ رہوں اور یہ آرزو دل میں رہ جائے۔ ابھی لے لیجیے اور جہاں جی چاہے بطور امانت رکھوا دیجیے۔

عازمین حج کی خدمت

اسی دوران میں شیخ صاحب نے ایک بڑا خیمہ اور بارہ چھوٹے خیمے نئے تیار کرا کے پیش کیے کہ سفر میں کام آئیں گے۔ قافلے کے ہر فرد کو ایک ایک جوڑی نئے جوتے، مردوں کو دو دو پاجامے، دو دو انگرکھے، دو دو ٹوپیاں اور ایک ایک چادر، مستورات کو دو دو پاجامے، دو دو کرتے اور دو دو دوپٹے دیے۔ سب کو سر عام ایک ایک روپیہ دیا۔ سید صاحب کے اقربا کی خدمت میں دس دس روپے فی کس پیش کیے۔ علما کی خدمت میں ان کی حیثیت و مرتبہ کے مطابق نذریں گزرانیں۔

سید صاحب کے لیے روزانہ پانسو روپے یا کسی وقت کم یا زیادہ لے کر آتے۔ دونوں وقت کے کھانے کے ساتھ ایک سو چالیس روپے بھجواتے۔ ایک روز سید صاحب کی دونوں بی بیوں کو اسّی اسّی روپے دیے گئے۔ لطف یہ کہ جب نذریں پیش کرتے تو بڑے ہی انکسار سے تہی دستی کا اظہار فرماتے۔

رخصتی نذرانہ رخصت کے وقت سید صاحب کی خدمت میں جو سامان لائے، وہ بیس پچیس کشتیوں میں لگا ہوا تھا۔ اس میں مشروع، کمخواب، پشمینے، نینو، ڈھاکے کی ململ، محمودی، بنارسی اطلس وغیرہ کے تھان بھی تھے اور کشمیری شال بھی۔ ان کے علاوہ ساڑھے چار ہزار روپے نقد تھے۔ دو نہایت خوب صورت مطلّا اور مذہب قرآن مجید نذر کیے، ایک مکہ معظّمہ کے لیے اور دوسرا مدینہ منورہ کے لیے۔ تمام اہلِ قافلہ کے لیے نو نو دس دس ہاتھ لمبے جامہ ہائے احرام تھے، جن میں ایک سو بیس تھان صرف ہوئے۔ دو سو چالیس تھان گاڑھے کے ان کے علاوہ تھے تاکہ متفرق ضروریات میں کام آئیں۔ سید صاحب کی بی بیوں یا اقربا کے لیے جو پارچے تیار کرائے ہوں گے، ان کی کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔

بقیہ نذرانے باقی حضرات نے جو نذرانے پیش کیے ان کی تفصیل معلوم نہیں۔ بے شبہ وہ شیخ غلام علی کے برابر مال و دولت کے مالک نہ تھے لیکن یقین ہے کہ ان کے نذرانے بھی خاصے وقیع ہوں گے۔ بعض روایتوں میں صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ شیخ غلام علی نے چونکہ کھانے کا انتظام اپنے ذمے لے لیا تھا اور سب سے کہہ دیا تھا کہ جو کچھ دینا ہو سید صاحب کی خدمت میں نقد پیش کر دیا جائے[1] اس وجہ سے مولوی کرامت علی صدر امین، شیخ محمد تقی، بستی میاں، رنجیت خاں، ان سب نے دو دو سو روپے نذر گزرانے۔ قلعے کی میگزین کے خلاصیوں نے بھی دو ہی سو روپے دیے[2] غرض یہ سید صاحب کے اخلاص و توکل کی برکت تھی کہ گھر سے خالی ہاتھ نکل پڑے اور الٰہ آباد سے روانگی کے وقت تک تمام اہلِ قافلہ کو ضرورت کی چیزیں مل گئیں۔ نیز سید صاحب کے پاس ہزاروں روپے جمع ہو گئے۔ اس ساری مدت میں کشتیوں کے کرایے یا ایک آدھ وقت کے کھانے کے سوا کچھ بھی خرچ کرنے کی نوبت نہ آئی

---

[1] ایک بیان ہے کہ دو مرتبہ کھانا باہر کھایا۔ ایک مرتبہ شاہ اجمل کے دائرے میں، دوسری مرتبہ قلعے میں بستی میاں کے ہاں (وقائع صفحہ ۲۵۲)۔

[2] وقائع میں ہے کہ مولوی کرامت علی نے سفید پارچے اور پشمینے کے تھان اور چالیس روپے پیش کیے۔ شاہ اجمل کے ہاں سے پچاس روپے اور دو نہایت خوب صورت رضائیاں آئیں۔ قلعے والوں نے چالیس روپے نقد، ایک پستول، ایک کرچ اور ایک ولایتی قالین پیش کیا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ کس بیان کو زیادہ قابلِ اعتماد سمجھا جائے۔

قیام الہ آباد کی عام کیفیت

قیام الہ آباد کی مدت کے بارے میں قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے ایک بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بارہ روز قیام کیا، دوسرے بیان میں بتایا گیا ہے کہ یہ مدت پندرہ روز سے بھی متجاوز تھی اور آپ نے وہاں تین جمعے پڑھے۔ پہلا جمعہ چوک کی مسجد میں ہوا۔ چونکہ جگہ تنگ تھی اور لوگ بکثرت آئے تھے، اس لیے باہر کپڑے بچھا بچھا کر شامل نماز ہوتے رہے۔ سید صاحب کو یہ معلوم ہوا تو فرمایا کہ آئندہ جمعہ شاہی مسجد میں ہوگا، جو قلعے کے سامنے تھی اور مدت سے بے آباد پڑی تھی۔ سید صاحب نے اسے خوب صاف کرایا اور بعد کے دو جمعے اسی مسجد میں ادا کیے بلکہ نماز بھی وہیں پڑھتے تھے۔ مولانا عبدالحی حسب معمول وعظ کہتے تھے[1]

موسم برسات کا تھا۔ دریا خوب زوروں پر تھا۔ نصف شہر میں پانی آگیا تھا۔ بایں ہمہ لوگ بے تکلف بیعت کے لیے حاضر ہوتے رہے۔ جس روز سید صاحب قلعے میں گئے تھے، آپ نے دریا کی بہار بھی دیکھی۔ حد نگاہ تک پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ میگزین میں مختلف قسم کی توپوں اور دیگر اسلحہ کا بھی معائنہ کیا۔

ایک خراب رسم کا ازالہ

مسلمانوں نے ہندوؤں کی صحبت میں کئی بُری رسمیں اختیار کر لی تھیں یا یوں سمجھ لیجیے کہ جو ہندو مسلمان ہوئے، وہ اپنے ہاں کی بعض بُری رسمیں بھی ساتھ لے آئے اور حلقۂ اسلام میں آنے کے بعد بھی انھیں نہ چھوڑا۔ ان میں سے ایک رسم یہ تھی کہ شادی، غمی کی مجلسوں میں دیہاتی لوگ کھانا پتروں پہ کھلاتے۔ شہری لوگ اس غرض کے لیے مٹی کی رکابیاں استعمال کرتے۔ جو کھانا بچتا اُسے بیکار پھینک دیتے۔ ایک راوی کا بیان ہے کہ الہ آباد سے کلکتہ تک یہ رسم عام طور پر رائج تھی۔ سید صاحب کو اس کا علم ہوا تو اسے سختی سے روک دیا۔ فرمایا کھانا نعمتِ الٰہی ہے۔ اسے یوں پھینکنا کمال بے ادبی ہے۔ چنانچہ جہاں جہاں آپ پہنچے، اس کا بھی ازالہ فرما دیا۔

---

[1] وقائع صفحہ ۲۵۲

اٹھارھواں باب

سفرِ حج

الہ آباد سے ہوگلی تک

بنارس سے روانگی

سید صاحب الہ آباد سے روانہ ہُوئے تو تیز مخالف ہوا شروع ہو گئی تھی، اس وجہ سے کشتیوں کی رفتار کم ہو گئی۔ پہلے دن صرف آٹھ کوس کا فاصلہ طے ہُوا اور سرسا نام ایک مقام میں قیام کیا۔ دوسرے روز ہوا کی شدت میں اور اضافہ ہو گیا اور ایک کوس سے زیادہ نہ چل سکے۔ تیسرے دن مرزا پور پہنچے۔ جہاں شیخ عبداللطیف ناگوری اور شیخ شاہ محمد سید صاحب کے ارادت مند تھے دونوں مشہور تاجر تھے۔ شیخ عبداللطیف کے متعلق تو بیان کیا گیا ہے کہ مختلف شہروں میں ان کی ستائیس تجارتی کوٹھیاں تھیں۔

مرزا پور کا پورا گھاٹ مال کی کشتیوں نے روک رکھا تھا اور سید صاحب کی کشتیوں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ دستور یہ تھا کہ معزز و نامور آدمیوں کی کشتیاں آتیں تو مال والے جگہ خالی کر دیتے۔ چنانچہ سید صاحب کے لیے بھی جگہ خالی کرانے کے انتظامات شروع ہُوئے۔ آپ نے اس پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ ہم کسی کو تکلیف دے کر آرام حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ پھر رُوئی سے بھری ہُوئی ایک کشتی کے مالک سے پوچھا کہ کیوں بھائی آپ کو مال اُتارنے میں کتنی دیر لگے گی؟ اس نے کہا کہ مزدوروں کے لیے آدمی بھیج چکا ہُوں، وہ آجائیں تو سامان اُتار کر چلا جاؤں گا۔ سید صاحب نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ بھائیو! ہمّت کرو اور اس کا سامان اُتار دو۔ چنانچہ جوانوں نے تھوڑی ہی دیر میں پُوری روئی بلا اُجرت اتار کر کنارے پر رکھ دی اور کشتیاں ٹھہرانے کی جگہ خالی ہو گئی۔

مرزا پور میں قیام

مرزا پور والے کم سے کم ایک ہفتہ ٹھہرانا چاہتے تھے لیکن قافلے میں ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی، اور دو موتیں ہوئیں: ایک شیخ حسن علی کی لڑکی، دوسرے لکھنؤ کے ایک صاحب محمد ہاشم۔ اس وجہ سے سید صاحب نے تین روز سے زیادہ قیام نہ فرمایا۔ کھانے کا انتظام شیخ شاہ محمد نے اپنے ذمے رکھا۔ صرف ایک وقت کا کھانا سید صاحب نے باہر کھایا۔ وہاں کے سرسری حالات یہ ہیں:

۱ ۔ بہت سے مسلمانوں نے بیعت کی، جن میں ایک طوائف بھی تھی۔ وہ حج کے لیے تیار ہو گئی۔ شاہ اسماعیل نے اپنی بہن رقیہ بی بی سے کہا کہ اسے اپنے پاس بٹھائیں اور دین کی تلقین کریں۔

۲ ۔ وہاں خشت پزوں کی ایک جماعت رہتی تھی۔ وہ لوگ مسلمان تھے لیکن عام مسلمان ان کے ساتھ اچھوتوں کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ انھوں نے عقیدۃً سید صاحب کو کھانے پر بُلایا۔ آپ نے دعوت خوشی سے قبول فرمالی۔ کھانا کھایا۔ انھوں نے نذر پیش کی تو واپس کر دی اور کہا کہ اول تو اس وجہ سے نذر نہیں لے سکتا کہ آپ بھائی غریب ہیں۔ دوسرے اگر میں نے نذر لے لی تو لوگ سمجھیں گے کہ صرف نذر کی خاطر کھانا کھایا اور میں نے دعوت صرف اس لیے قبول کی تھی کہ مسلمانوں کے دل میں آپ کے متعلق جو غلط خیال بیٹھا ہُوا ہے، وہ زائل ہو جائے۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد ہی خشت پزوں کے ساتھ مساوات کا برتاؤ شروع ہُوا۔

۳ ۔ رخصت کے وقت شیخ عبداللطیف نے چار ہزار روپے نقد پیش کیے۔ شیخ شاہ محمد نے چار یا پانچسو روپے، بیس تھان ململ نینو اور مشروع کے اور اٹھارہ تھان گاڑھے کے نذر کیے۔ ایک اور صاحب نے اسّی روپے اور چالیس تھان گاڑھے کے دیے۔ شیخ عبداللطیف والدہ کو ساتھ لے کر حج کے لیے تیار ہو گئے اور اپنے لیے ایک الگ کشتی کرایے پر لے لی۔

چنار گڑھ

مرزا پور سے روانہ ہُوئے تو رات ایک ایسی جگہ ٹھہرنا پڑا، جہاں ہندوؤں کا مندر تھا۔ آس پاس اور کوئی آبادی نہ تھی۔ جن گنے ہُوئے اوقات میں سید صاحب کے قافلے کو خود کھانا پکانا پڑا، ان میں سے ایک وقت یہ بھی تھا۔ دوسرے دن چنار گڑھ پہنچے، جہاں تین روز قیام ہُوا۔ وہاں کم و بیش ایک سو آدمیوں نے بیعت کی اور پانچ دعوتیں ہُوئیں: ایک تمباکو کے تاجر کی طرف سے، دوسری چاولوں کی منڈی کے چودھری کی طرف سے، تیسری شہر کے چودھری کی طرف سے، چوتھی قلعے کے سپاہیوں کی طرف سے اور پانچویں قلعے کے خلاصیوں کی طرف سے۔

چوتھے روز سید صاحب چنار گڑھ سے نکلے اور بنارس پہنچ گئے۔ میرے اندازے کے مطابق پورے سفر میں ایک مہینا اور کچھ دن لگے۔ عید اضحیٰ بنارس میں کی۔ چونکہ برسات کا زور ہو گیا تھا، اس لیے خلافِ ارادہ وہاں بھی کم و بیش ایک مہینا توقف فرمایا۔ میں بتا چکا ہُوں کہ سید صاحب نے اپنے ساتھیوں میں سے مضبوط و توانا آدمیوں کی ایک جماعت کو پیدل چلنے کا حکم دیا تھا۔ شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحی اور مولوی محمد یوسف پھلتی باری باری اس جماعت کی قیادت فرماتے تھے۔ الٰہ آباد سے بنارس تک کے سفر میں شاہ اسماعیل نے فرضِ قیادت ادا کیا۔

بنارس میں قیام

ساتھیوں میں سے ایک جماعت نے کندی گروں کی مسجد میں قیام کیا، ایک جماعت جھیسر کی مسجد میں ٹھہری۔ سید صاحب کے لیے شیولال چوبے کی حویلی خالی کرا رکھی تھی، وہاں قافلے کی مستورات ٹھہریں۔ سید حمید الدین (خواہرزادہ سید صاحب) اپنے تمام اقربا کے ساتھ پاس کی ایک حویلی میں قیام فرما ہوئے، جو چھ روپے کرایے پر لے لی گئی تھی۔ سید صاحب بابو ساون سنگھ کی حویلی میں مقیم ہوئے۔

پہنچنے کے بعد پندرہ روز تک لگاتار بارش ہوتی رہی، لیکن دعوتوں کا سلسلہ اس زمانے میں بھی برابر جاری رہا اور ایک وقت بھی خود کھانا پکانے کی نوبت نہ آئی۔ عید کے موقع پر بہت سے جانور جمع ہو گئے تھے۔ تین روز تک برابر قربانیاں ہوتی رہیں۔ شہر کے خاصے بڑے حصے میں گوشت تقسیم ہوتا تھا۔

قیام بنارس کے دوران میں خلق خدا کی ہدایت و اصلاح کا جو عظیم الشان کام انجام پایا، اس کی تفصیلات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ ہزاروں آدمیوں نے بیعت کی اور ہر شخص کی خواہش پوری کرتے رہے بلکہ بیان کیا جاتا ہے کہ لالٹین لے کر راتوں کو بھی پھرتے تھے۔

تیموری شہزادوں میں سے مرزا بلاقی اور مرزا حاجی خجند ملنے کے لیے حاضر ہوئے۔ مرزا بلاقی کے ہاں سے چار مرتبہ سید صاحب کو کھانے پر بلایا گیا۔ ان کا مکان تیلیا نالے پر تھا۔ مسلمانوں کے بعض گروہوں میں اختلاف چلا آتا تھا۔ سید صاحب نے ان کے درمیان فاصلحوا بین اخویکم کی پیروی میں صلح کرا دی۔ جو مسلمان ہسپتال میں بیمار پڑے تھے، انھوں نے پیغام بھیجا کہ ہم حاضری سے معذور ہیں، ہمیں بھی زیارت سے مشرف فرمایا جائے۔ چنانچہ ایک روز سید صاحب نے ہسپتال جا کر سب کو دیکھا اور ان کی مزاج پرسی کی۔

راج گھاٹ پر تلّو کا نام ایک چمار رہتا تھا، وہ سید صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔ آپ نے الٰہی بخش نام رکھا۔ بعد میں اس نے بڑا عروج پایا، لیکن اس کے مزید حالات اس کتاب کے تیسرے حصے میں بیان ہوں گے۔

اسی زمانے میں حیات النسا بیگم کی طرف سے دعوت آئی، جس کا ذکر سید محمد علی صاحب مولف مخزن احمدی نے پہلے سفر بنارس میں کیا ہے۔ یہ خاتون پہلے ایک انگریز کے گھر میں رہتی تھی۔ بعد میں اس سے قطع کر لیا تھا۔ سید صاحب کی خدمت میں چھ سات ہزار روپے کا مال پیش کیا۔ لیکن آپ نے پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ رو پڑی اور عرض کیا کہ میں تو بری باتوں سے توبہ کر چکی ہوں، کیا میرے

گناہ معاف نہیں ہو سکتے؟ سید صاحب نے فرمایا کہ آپ کے پاس جو مال ہے وہ خبیث ہے۔ میں صرف پاک اور حلال کمائی لے سکتا ہوں۔ بیگم کے مختار حکیم سلامت علی خان سید صاحب کے مرید و معتقد تھے۔ انھوں نے دس ہزار روپے کا انتظام کر کے بیگم کے نام پر تجارت شروع کر دی۔ جس میں بڑا نفع ہوا۔ جب سید صاحب جہاد کے سلسلے میں سرحد تشریف لے گئے تو اس مال طیب میں سے بیگم نے ایک بڑی رقم پیش کی۔ اس کا ذکر موقع پر آئے گا۔

زمانیہ

سید صاحب عید اضحیٰ سے پہلے بنارس پہنچے تھے۔ ۱۰- محرم ۱۲۳۷ھ (۷- اکتوبر ۱۸۲۱ء) کو وہاں سے روانہ ہوئے۔ دلمئو سے جو کشتیاں کرایے پر لی تھیں، وہ بنارس تک تھیں۔ اگلے سفر کے لیے ایک بجرا اور چار کشتیاں پھر کرایے پر لے لیں۔ ۱۰- محرم کو دن رہے زمانیہ پہنچ گئے۔ وہاں دریا کے کنارے بچے کبڈی کھیلنے لگے۔ جوانوں نے بھی سید صاحب سے کبڈی کی اجازت مانگی۔ آپ نے فرمایا کہ ورزش تو بہتر ہے خصوصاً مجاہدین کے لیے اور اس نیت سے کہ دشمن کے مقابلے کے لیے استعداد بڑھ جائے۔

زمانیہ میں سید صاحب دو راتیں ٹھہرے۔ آپ کے دوستوں میں سے ایک صاحب رستم علی خاں تھے۔ وہ اس زمانے میں ٹونک گئے ہوئے تھے۔ ان کا بیٹا آپ کو اپنے گھر لے گیا۔ وہاں کے بہت سے پٹھانوں نے بیعت کی۔

زمانیہ کے لوگوں نے بتایا کہ قریب کے جنگل میں ایک مجذوب رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے پاس جانا چاہے تو پتھر مارتا ہے۔ سید صاحب اپنے بھانجے سید عبدالرحمٰن کو ساتھ لے کر اس سے ملنے کے لیے تشریف لے گئے۔ قیامگاہ کے قریب پہنچے تو سید عبدالرحمٰن کو ٹھہرا دیا اور تنہا مجذوب کے پاس گئے۔ سید عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ مجذوب خوش الحانی سے یہ شعر پڑھ رہا تھا:

تعالی اللہ چہ دولت دارم امشب   کہ آمد ناگہاں دلدارم امشب

پوری غزل اس نے کیف و مستی کے عالم میں پڑھی، پھر خواجہ حافظ کی اور غزلیں سنائیں۔ آخر میں پوچھا: کہاں کہاں جانے کا ارادہ ہے؟ سید صاحب نے بتایا کہ حرمین شریفین۔ مجذوب بولا: کیا بیت المقدس، بغداد اور نجف و کربلا بھی جائیے گا؟ سید صاحب نے فرمایا:

"ایک کار ضروری در پیش ہے۔ بعد ادائے حج اس کی تدبیر کرنی ہے، اس لیے اور کہیں جانے کا ارادہ نہیں۔"

سید صاحب پانچ چھ گھڑی اس کے پاس رہے اور واپسی پر فرمایا کہ مجذوب بہت

اچھا شخص ہے۔

غازی پور۔ چھپرا

تیسرے روز زمانیہ سے روانہ ہو کر غازی پور کے گھاٹ پر ایک مسجد کے پاس کشتیاں ٹھہرائیں اور وہاں کئی مقام کیے۔ غازی پور کے رئیس، شیخ فرزند علی، سید صاحب کے مخلص مرید تھے۔ وہ مستاجری کے کام پر گئے ہوئے تھے۔ ان کے مختار مرزا محی الدین بیگ کشمیری نے مہمانداری کی خدمت انجام دی۔ شاہ منصور عالم، منشی غلام ضامن اور قاضی محمد حسن کے ہاں بھی دعوتیں ہوئیں اور ان تمام حضرات نے مع اہل و عیال بیعت کی۔ ایک پیرزادے نے بھی دعوت کی۔ وہ کئی دیہات کا مستاجر تھا اور بڑے امیروں میں گنا جاتا تھا۔ لیکن بیعت نہ کی اور شادیوں کے بعض مراسم کے جائز و ناجائز ہونے کے متعلق سید صاحب سے گفتگو بھی کی۔

غازی پور سے روانگی عمل میں آئی تو باڑا میں آپ کو ٹھہرا لیا گیا۔ یہ گاؤں شیخ فرزند علی نے نیلام میں لے لیا تھا اور شیخ صاحب کا بیٹا محمد امیر وہیں تھا۔ اس نے نیز اکثر شرفا و غربا نے بیعت کی۔ سید صاحب نے تیغ علی خاں اور سردار خاں کو خلافت نامے دیے۔

باڑا سے چل کر ملیا میں ٹھہرے۔ یہ گاؤں بھی شیخ فرزند علی نے نیلام میں لے لیا تھا۔ بکسر پہنچے تو وہاں کے قاضی نے روک لیا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ اس طرح ہر مقام پر ٹھہرتے رہے تو بیت اللہ شریف پہنچنے میں بڑی دیر لگے گی۔ ہاں بیعت مقصود ہو تو میں تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر جاتا ہوں۔ کشتیوں کو آگے جانے دو۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے بیعت کی۔ جہاں کشتیاں ٹھہری تھیں وہاں قاضی نے ایک دیگ پکوا کر بھجوا دی۔ خود سید صاحب نے بکسر ہی میں کھانا کھایا۔

پھر آپ چھپرہ میں ٹھہرے۔ بہت سے لوگ پیشوائی کے لیے موجود تھے۔ وہاں کے ایک صاحب فرحت علی بڑے دیندار اور پرہیزگار تھے۔ سید صاحب ان کے مکان پر بھی گئے۔ یہاں تین چار طوائفیں چار یا پانچ روپے نذرانے لے کر پہنچیں۔ سید صاحب نے ان کا نذرانہ قبول نہ کیا اور فرمایا کہ اپنے افعالِ بد سے توبہ کرو تو بیعت لے سکتا ہوں۔

داناپور

چھپرہ کے بعد داناپور میں منزل ہوئی۔ وہاں شیخ علی جان بڑے دولت مند آدمی تھے۔ تجارت بھی کرتے تھے اور کشتی بانوں کے چودھری بھی تھے۔ انھوں نے پہلے سے سید صاحب کے استقبال کا سامان کر رکھا تھا۔ ان کی وضع سراسر ہندووانہ تھی۔ نام معلوم کیے بغیر کسی کو پتا نہیں چل سکتا تھا کہ یہ علی جان ہیں۔ وہ سید صاحب کو اپنے مکان پر لے گئے اور عرض کیا کہ کئی پیرزادوں کی خدمت کی مگر حالت نہ بدلی۔ سید صاحب نے فرمایا کہ بسم اللہ کر کے اخلاص سے بیعت کیجیے، حالت

کا بدلنا خدا کے اختیار میں ہے۔ انھوں نے جو ہدایا سید صاحب کی خدمت میں پیش کیے، اُن میں چھ سات کرسیاں بھی تھیں، جن میں سے دو بہت بیش قیمت تھیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ہم مسافر ہیں، کرسیوں کو کہاں اٹھائے پھریں گے؟ اپنے ہی پاس رکھیے۔ جب شیخ صاحب نے بہت اصرار کیا تو ان کے پاس خاطر سے صرف ایک کرسی قبول کر لی۔

اُن کے مکان کے پاس تعزیہ رکھنے کا ایک چبوترہ اور ایک امام باڑہ بھی تھا۔ سید صاحب سے بیعت کے بعد چبوترے کی جگہ مسجد تعمیر کرائی اور امام باڑہ مسافروں کے قیام کے لیے وقف کر دیا۔ سید صاحب جہاد کے لیے تشریف لے گئے تھے تو اطراف بہار کے عقیدت مندوں کی امانتی رقوم شیخ غلام علی جان ہی کے پاس ہی جمع ہوتی تھیں۔ گویا تحریک جہاد کا ایک مالی مرکز شیخ صاحب موصوف بھی تھے۔ ان کے نام سید صاحب کے مکاتیب بھی موجود ہیں۔

شیخ صاحب کے علاوہ دانا پور کے ممتاز اصحاب میں سے صدر الدین قصاب نے بیعت کی۔ یہ شخص عام مسلمانوں خصوصاً مسافروں کی خدمت میں ہر لحظہ سرگرم رہتا تھا۔ سو پچاس آدمی روزانہ اس کے ہاں سے کھانا کھاتے تھے۔ غریب آدمیوں کے بچوں اور بچیوں کے نکاح اپنے خرچ سے کراتا۔ اولاد نہ تھی۔ عبد الرحیم نام ایک یتیم بچے کو متبنّٰی بنا لیا تھا۔ وہ بھی بہت نیک اور دیندار تھا۔ ایک وسیع باغ لگایا جس میں آم، نیبو، نارنگی، جامن کے درخت تھے۔ یہ باغ صرف مسافروں کے آرام و آسایش اور مہمان داری کے لیے وقف تھا۔

دانا پور کی چھاؤنی کے مسلمان بھی سید صاحب کو لے گئے اور سیکڑوں نے بیعت کی۔

پھلواری شریف

سید صاحب کے سفر حج کے متعلق جو مکتوبات کا ذخیرہ میری نظر سے گزر چکا ہے، اس میں ہر قسم کی تفصیلات موجود ہیں۔ لیکن سفر مراجعت کے سوا پھلواری شریف جانے کے بارے میں اشارہ تک موجود نہیں۔ شاہ محمد وارث امام قادری پھلواروی سے معلوم ہوا کہ ان کے خاندانی کاغذات میں بہ تصریح مذکور ہے، سید صاحب پھلواری شریف کی خانقاہ مجیبیہ میں تشریف لائے۔ اس زمانے میں شاہ ابو الحسن فرد سجادہ نشین تھے اور ان کے چھوٹے بھائی شاہ محمد امام کے ذمے واردین و صادرین کی خدمت و نگرانی تھی۔ انھیں علوم عقلیہ و نقلیہ میں درجہ امتیاز حاصل تھا۔ قیام دانا پور کے دوران میں پہلے شاہ اسماعیل چند آدمیوں کے ساتھ آئے اور شاہ ابو الحسن فردؔ نیز بعض دوسرے اکابر علم سے مل کر واپس چلے گئے۔ پھر سید صاحب تشریف لائے۔ معلوم نہیں اور کون کون ساتھ تھے۔ صرف مولانا عبد الحی اور مولوی عبد الحق کے نام کاغذات میں درج ہیں۔ سید صاحب نے کم از کم ایک وقت کا کھانا خانقاہ میں تناول فرمایا۔ کھانا تیار ہو رہا تھا تو بے تکلف باورچی خانے میں پہنچ گئے اور فرمایا کہ اس قدر

تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ شاہ ابوالحسن فرد کے والد ماجد شاہ نعمت اللہ بھی حیات تھے۔ ان سے دیر تک تخلیہ میں ملاقات رہی۔ آخر میں سید صاحب نے فرمایا کہ میں نے سمجھا تھا، یہاں کے بزرگ بھی عام مشائخ جیسے ہوں گے، لیکن انھیں اپنے خیال و گمان سے بالکل الگ پایا۔ الحمد للہ کہ یہ خانقاہ بدعات سے بالکل پاک ہے۔

حیات فرد مشمولۂ دیوان میں بتایا گیا ہے کہ پہلے سید صاحب اور مولانا عبدالحی آئے تھے۔ شاہ نعمت اللہ سے ملاقات کی اور دیر تک تنہائی میں گفتگو کرتے رہے۔ دوسرے دن مولانا شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی آئے۔ شاہ صاحب سے ایک مسئلے کے متعلق مناظرے کی صورت بھی پیدا ہو گئی۔ آخر میں شاہ صاحب نے فرمایا: الحمد للہ میں نے اس خانقاہ کو بہر طور بدعات سے پاک پایا۔ میرا مقصود کسی کا امتحان لینا نہ تھا، محض ملاقات کو آ گیا تھا۔[1]

عظیم آباد دانا پور میں تین چار دن قیام کے بعد چلے تو عظیم آباد میں ٹھہرے۔ لوگ جا بجا گھاٹ دکھاتے گئے کہ جو پسند ہو، وہاں کشتیاں لگائی جائیں۔ عظیم آباد کے اگلے سرے پر ایک گھاٹ پسند فرمایا، یہاں کنارے پر نماز باجماعت کے لیے وسیع اور ہموار میدان موجود تھا۔ اسی جگہ کشتیاں ٹھہرائی گئیں۔[2] سید صاحب کی سواری کے لیے پینس موجود تھا۔ آپ شہر گئے۔ جامع مسجد میں نماز پڑھی، پھر مولانا عبدالحی سے فرمایا کہ آپ وعظ کہیں۔ خود مولوی سید مظہر علی کے ساتھ ان کے مکان پر گئے۔ وہاں مولوی صاحب کے اہل و عیال، اقربا اور اہل محلہ نے بیعت کی۔ وہاں سے اٹھے تو مولوی الٰہی بخش

---

[1] ملاحظہ ہو حیات و فرد مشمولہ دیوان صفحہ ۲۸ و ۲۹) سید ابوالحسن فرد ۱۰۔ رجب ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷ء) کو پیدا ہوئے۔ ۲۴۔ محرم ۱۲۶۵ھ (۲۰۔ دسمبر ۱۸۴۸ء) کو وفات پائی۔ ان کا دیوان صرف ایک مرتبہ چھپا تھا۔ دفتر اول ۲۸۶ صفحے اور دفتر دوم ۲۹۰ صفحے۔ آخر میں حیات فرد شامل تھی جس کے ۱۲۰ صفحات تھے۔ اب یہ مجموعہ بہت کمیاب ہے۔ دیوان میں غزلیات، قصائد، رباعیاں، مناقب، مثنویاں وغیرہ ہیں۔

[2] "حیات بعد الممات" میں ہے کہ عظیم آباد میں سید صاحب کا قافلہ گول گھر کے سامنے ٹھہرا تھا اور لین کے میدان میں جمعہ کی نماز ہوئی تھی۔ مولانا شاہ اسماعیل نے وعظ فرمایا تھا۔ میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی فرماتے تھے کہ "ہم اس وعظ و نماز میں شریک تھے۔ سارا میدان لین کا آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ پہلی ملاقات سید صاحب اور مولانا شہید سے پٹنہ میں ہوئی تھی (صفحہ ۲۰) ارمغان احباب میں مولانا عبدالحی فرماتے ہیں کہ میں نے میاں سید نذیر حسین مرحوم سے پوچھا تو آپ نے فرمایا میں نے پٹنہ میں سید صاحب کو دیکھا تھا۔ میں اس زمانے میں یوسف زلیخا پڑھتا تھا۔ سید صاحب کلکتہ سے آئے تھے گویا میاں صاحب نے سید صاحب کو حج سے واپسی پر دیکھا تھا نہ کہ حج کے لیے جاتے وقت۔

صادق پوری کے مکان پر گئے۔ ان کے دیوان خانے میں بے شمار لوگوں نے بیعت کی۔ ان کے بڑے صاحبزادے کا نام احمد بخش تھا۔ بیعت کے بعد سید صاحب نے فرمایا کہ انھیں احمد اللہ کہا کرو۔ یہی مولانا احمد اللہ تھے، جو آگے چل کر تحریک کا ایک بڑا مرکز بن گئے۔ اسی سلسلے میں گرفتار ہوئے اور انڈیمان میں وفات پائی۔ شام کے وقت سید صاحب کشتیوں پر آ گئے۔ گھاٹ پر بھی مشتاقانِ دید کا تانتا بندھا رہا۔

عظیم آباد میں کم و بیش آٹھ مقام ہوئے۔ وہاں کے ایک امیر لکھی میاں نے بیعت کی۔ مولانا ولایت علی کے والد ماجد مولوی فتح علی اور ان کے تمام اقربا بیعت ہوئے[1] جن میں شاہ محمد حسین محلہ نمو ہیہ والے بھی شامل تھے۔ شاکر جان کشمیری اپنی بی بی، بیٹے اور بیٹی کو لے کر حج کو نکلا تھا۔ عظیم آباد پہنچا تو خرچ ختم ہو گیا۔ سید صاحب نے اسے نیز اس کے بال بچوں کو ساتھ لے لیا۔ ایک ڈومنی بھی اپنے دو لڑکوں اور لڑکی کے ساتھ تائب ہو کر حج کے لیے تیار ہو گئی۔ غرض آٹھ دن میں ہزاروں آدمی بیعت ہوئے۔

اسی مقام پر سید صاحب کو خیال آیا کہ کچھ پالیں تیار کرا لینی چاہئیں، جو کشتیوں پر سائبانوں کا کام دیں اور کہیں ٹھہرنے کی ضرورت پیش آئے تو جھونپڑیاں بنائی جا سکیں۔ چنانچہ شیخ باقر علی بڈھی دھمد ھی والے، رحیم بخش اور میاں عبداللہ نے بازار سے ٹاٹ خریدے جو بہت سستے تھے اور پالیں تیار کرا لیں۔ ایک پال کے لیے ٹاٹ، رسیاں، میخیں، بانس وغیرہ ایک روپے چھ آنے میں آئے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ہر کنبے کے لیے اسی قسم کی پالیں بنوا لی جائیں۔ کھانا پکانے کے لیے توے، لوہے کے چولھے،

---

[1] اس سلسلے میں ایک غلط فہمی کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ مولوی فتح علی صاحب نے اپنے فرزند اکبر مولانا ولایت علی کے متعلق گزارش کی کہ وہ بڑا بد راہ ہے۔ دعا فرمائیے خدا اسے راہ راست پر لائے۔ ایک روایت میں ہے کہ مولانا ولایت علی نے لکھنؤ سے اپنے والد اور دوسرے اقربا کو لکھا تھا کہ سید صاحب سفر حج میں عظیم آباد سے گزر رہے ہیں، ان کی ذات بابرکات سے فائدہ اٹھانا چاہیے، لیکن انھوں نے کچھ پروا نہ کی۔ جب سید صاحب حج سے لوٹے تو مولانا ولایت علی تعلیم سے فارغ ہو کر عظیم آباد آ چکے تھے۔ انھوں نے بھاگل پور میں سید صاحب کا استقبال کیا اور والد کے علاوہ تمام اقربا کو بیعت کرایا۔

میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ مولانا ولایت علی لکھنؤ میں بیعت ہو چکے تھے۔ ان کے والد اور دوسرے اقربا اس وقت بیعت ہوئے، جب سید صاحب حج کے لیے جاتے ہوئے عظیم آباد سے گزرے تھے۔ مولوی الٰہی بخش اور شاہ محمد حسین کو بھی مولانا ولایت علی کے خاندان سے بہت قریبی تعلق تھا۔

پراتیں، گھوڑے وغیرہ بھی خریدے گئے۔

تبت میں تبلیغ کا انتظام

عظیم آباد ہی میں سید صاحب کو تبتیوں کا ایک قافلہ ملا تھا، جسے آپ نے تبت میں تبلیغ کا کام سونپا اور فرمایا کہ صبر اور استقامت کے ساتھ دین حق عام لوگوں تک پہنچاتے رہنا۔ اس راہ میں جتنی تکلیفیں پیش آئیں، انھیں خوشی خوشی برداشت کر لینا۔ خدا کے فضل سے امید ہے کہ نتیجہ بہت اچھا ہوگا۔ چنانچہ یہ لوگ تبت گئے۔ پورے اہتمام سے اپنے کام میں مصروف رہے اور حق پرست مسلمانوں کی بہت بڑی جماعت پیدا کر لی۔ ان لوگوں کے ذریعے سے سید صاحب کی تحریک اصلاح تبت میں شائع ہوئی۔

روایتوں میں ہے کہ یہ لوگ حج کے لیے نکلے تھے اور خرچ نہ ہونے کے باعث عظیم آباد میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ آپ لوگوں پر حج فرض نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ لوٹ جائیں، لیکن یہ بات قیاس میں نہیں آتی، اس لیے کہ سید صاحب تو اکثر اُن آدمیوں کو ساتھ لے جا رہے تھے، جن پر حج فرض نہ تھا، اس لیے کہ وہ سفر کا خرچ ادا کرنے کے قابل نہ تھے، بلکہ خود سید صاحب بھی اسی زمرے میں شامل تھے۔ پھر تبتیوں کو کس طرح روک سکتے تھے؟ میرا خیال ہے کہ وہ حج کے لیے نہیں بلکہ تجارت کے لیے عظیم آباد پہنچے ہوں گے۔ ممکن ہے سید صاحب کے سامنے انھوں نے حج کا ارادہ ظاہر کیا ہو اور آپ نے ان سے تبت کے مفصل حالات سن کر فرمایا ہو کہ واپس جاؤ اور عام لوگوں کو اسلام کے پابند بناؤ۔

بہرحال وہ چھ مرد تھے اور تین عورتیں۔ سید صاحب نے پچیس روپے راستے کے خرچ کے لیے دیے۔ ہر مرد کو ایک ایک کُرتا، ایک ایک عمامہ اور ایک ایک تھان سوسی کا اور ہر عورت کو ایک ایک تھان سفید اور دو دو تھان سوسی کے عنایت فرمائے۔ نیز توحید و سنت کے اثبات اور شرک و بدعت کے رد میں کچھ آیات و احادیث بھی لکھوا کر دے دیں۔

متفرق حالات

قیام عظیم آباد کے مزید حالات یہ ہیں:

۱۔ مولوی الٰہی بخش کے ہاں دعوت ہوئی تو اس میں آٹھ نو سو آدمی شریک تھے۔

۲۔ بعض شیعہ حضرات نے انگریز حاکم کے پاس شکایت کی کہ سید صاحب انگریزوں کے خلاف جہاد کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں اور ہم لوگ از روے خیر خواہی یہ حقیقت آپ تک پہنچاتے ہیں، لیکن حاکم نے اس شکایت کو فرقہ وارانہ رقابت کا نتیجہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

٣ ۔ ایک نواب زادے کا نام قطب الدین تھا۔ وہ بست ہزاری کے لقب سے مشہور تھا۔ اس نے اہل و عیال کے ساتھ بیعت کی اور پانسو روپے، ایک سرخ دوشالہ، ایک کڑھا ہُوا رومال، کئی تھان سفید، کئی تھان گل بدن اور مشروع کے، دو شیشیاں عطر کی، ایک ٹوکرا شیرینی کا، ایک پرانی اور نہایت قیمتی گجراتی تلوار، ایک انگریزی پستول، ایک بندوق، دو کمانیں اور دو ترکش پیش کیے۔

٤ ۔ ایک نواب زادہ سو روپے، سات اشرفیاں، پانچ تھان سفید اور دو بنارسی دوپٹے لایا۔ تیسرے نواب زادے نے پچاس پچاس روپے کے چار توڑے، ایک بنارسی دوپٹہ، ایک تھان کمخواب کا، چار پانچ تھان سفید اور ایک پیش قبض فولادی نذر کے طور پر حاضر کیا۔

٥ ۔ رحیم خاں افغان تاجر چرم نے مع اقربا و اعزہ بیعت کی، جن میں رحیم خاں کا بھتیجا اور داماد امیر خاں بھی شامل تھے، وہ ایک سو یا پچاس روپے کھلے، اور ایک سو روپے ایک رومال میں بندھے ہُوئے نیز سات آٹھ تھان لایا، جن میں سے کچھ سفید تھے، کچھ گل بدن اور مشروع کے تھے۔

٦ ۔ ایک اور تاجر عبدالرحمٰن نے بیعت کی۔ سید صاحب نے فرمایا کہ شریعت کے حکموں پر چلو، مال میں سے باقاعدہ زکوٰۃ دیا کرو، اقربا کے حقوق کا خیال رکھو، محتاج ہمسایوں کی دستگیری کرو، مسکینوں اور مسافروں کی خدمت کو ضروری جانو۔ خدا تمھارے مال میں برکت دے گا۔

اگلی منزلیں

عظیم آباد سے بندر ہوگلی تک کی منزلوں کا سرسری حال یہ ہے:

١ ۔ باڑہ: یہاں ارد گرد کی بستیوں سے بہت سے آدمی آئے ہُوئے تھے جن میں سے خواجہ مولا بخش، خواجہ افضل علی، شیخ سوہن، واجد علی خاں اور اکرام الحق خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سید صاحب نے کنارے پر جاجم بچھوا دی تھی اسی پر بیٹھ کر بیعت لیتے رہے۔ خواجہ مولا بخش یا کسی دوسرے صاحب نے آداب یا بندگی عرض کی۔ سید صاحب نے فرمایا: یہ بُری عادت ہے۔ لڑکا ہو یا بوڑھا، امیر ہو یا غریب سب کو السلام علیکم کہنا چاہیے۔ پھر خواجہ مولا بخش نے بیعت کے لیے خُرمے منگانے چاہے۔ سید صاحب نے فرمایا: بیعت کے واسطے خرموں کی بالکل ضرورت نہیں اور بیعت کیا ہے؟ اپنے اللہ سے عہد کرنا کہ کوئی بُرا کام نہیں کریں گے۔ یہاں ایک صاحب شاہ گھسیٹا مرید ہُوئے، جو بڑے ذی اثر اور بارسوخ تھے۔ سید صاحب نے انھیں کو خلافت نامہ دیا۔ ان کے ہاں کھانا بھی کھایا۔ شاہ صاحب نے دیگوں سے کھانا نکالنے کے لیے لکڑی کی ایک خوب صورت، کشتی بیش کی جو سوا گز لمبی اور

دس گرہ چوڑی تھی۔

۲ ۔ دوسری منزل ایک چھوٹی سی بستی کے پاس ہوئی۔ وہاں غریب لوگوں نے بیعت کی۔[1]

۳ ۔ تیسری منزل مونگیر میں ہوئی۔ وہاں بھی زیادہ تر غریب لوگ بیعت کے لیے آئے۔

۴ ۔ چوتھی منزل بھاگل پور میں ہوئی۔ اس مقام کے قیام کا کچھ حال معلوم نہیں۔

۵ ۔ پانچویں منزل راج محل میں ہوئی، جہاں سے دریا دو شاخوں میں بٹتا ہے۔ ایک بڑی شاخ، جسے گنگا کہتے ہیں، آگے کو نکل جاتی ہے، دوسری شاخ جس کا نام بھاگیرتھی ہے اور جسے ہندو اصل گنگا سمجھتے ہیں مرشد آباد، ہوگلی ہوتی ہوئی کلکتہ کے پاس سے گزرتی ہے۔ راج محل میں سید صاحب نے کئی مقام کیے۔ منشی محمدی انصاری سید صاحب کے ایک مخلص مرید تھے اور آخر میں میر منشی بن گئے تھے۔ ان کا وطن راج محل سے دس بارہ کوس پر تھا۔ وہ سید صاحب کو بہ اصرار اپنے ہاں لے گئے۔ وہاں تمام اقربا نے بیعت کی، جن میں بعض کے نام یہ ہیں: منشی شاہ محمد (والد منشی محمدی)، منشی روف الدین، منشی مخدوم بخش، منشی حسن علی، منشی فضل الرحمٰن، منشی عزیز الرحمٰن۔ اور لوگ بھی فیضیاب ہوئے۔ منشی شاہ محمد حج کے لیے تیار ہو گئے۔

۶ ۔ مرشد آباد: اس جگہ چار پانچ مقام ہوئے۔ زیادہ تر غریبوں نے فیض حاصل کیا۔

مرشد آباد کے بعد کٹوا (ضلع بردوان) میں مقام ہوا، پھر ہوگلی پہنچ گئے۔[2]

---

[1] باڑھ اور مونگیر کے درمیان ایک مقام سورج گڑھ بھی ہے۔ "الحیات بعد الممات" میں ہے کہ سادات سورج گڑھ نے بھی دعوت کی تھی اور سید صاحب کے قافلے کو پندرہ روز ٹھہرایا تھا۔ روایتوں میں سورج گڑھ کے قیام کا ذکر مجھے نہیں ملا۔ ممکن ہے وہاں کے سادات کی دعوت آپ نے منظور فرمائی ہو، لیکن پندرہ روز ٹھہرنا درست معلوم نہیں ہوتا۔

[2] روایتوں میں ہے "کئی روز کے بعد"۔ میرے اندازے کے مطابق دو یا تین دن لگے ہوں گے۔ لیکن کٹوا اور ہوگلی کے درمیان کسی مقام پر ٹھہرنے کا ذکر نہیں آیا۔

اُنیسواں باب

سفرِ حج

(قیام کلکتہ کے حالات)

منشی امین الدین احمد سید صاحب ہوگلی میں ٹھہرے تھے[1]۔ وہاں سے روانہ ہوئے تو تین چار کوس پر ایک مقام تھا، جسے اس زمانے کی عام اصطلاح میں پرمٹ کہتے تھے۔ وہاں کلکتہ جانے والی کشتیوں سے چنگی کا محصول لیا جاتا تھا جب کوئی کشتی قریب پہنچتی تو پرمٹ والے نقارہ بجاتے۔ یہ کشتی کو ٹھہرا لینے کا انتباہ ہوتا۔ سید صاحب کی کشتیاں بھی ٹھہر گئیں۔ آپ نے قاضی احمد اللہ میرٹھی اور قاضی عبدالستار گڑھ مکتیشری کو بھیجا۔ وہ پرمٹ والوں سے محصول کا فیصلہ کرا آئے۔

اسی مقام پر کلکتہ سے ایک تیز رفتار کشتی میں، جسے پینس کہتے تھے، ایک صاحب آئے اور سید صاحب سے ملے۔ نام پوچھا تو بتایا: امین الدین۔ یہ منشی امین الدین احمد تھے، جو بنگال کے اونچے گھرانے کے فرد تھے اور کلکتہ کے ممتاز امیروں میں گنے جاتے تھے۔ انگریزی کمپنی میں انھیں وکالت کا عہدہ حاصل تھا اور کمپنی کے پورے ہندوستانی علاقوں میں سے جتنے مقدمات کلکتہ کی مرکزی حکومت کے پاس پیش ہوتے تھے، سب منشی صاحب ہی کی وساطت سے پیش ہوتے تھے۔ ان کی ماہانہ تنخواہ مقرر تھی لیکن حق وکالت کی رقم اتنی بن جاتی تھی کہ صاحب "مخزن احمدی" کے بیان کے مطابق ہر مہینے کے اختتام پر تیس چالیس ہزار روپے کی تھیلیاں ہاتھی پر لد کر ان کے گھر پہنچتی تھیں۔ بڑے فراخ حوصلہ اور مخیر تھے، کم و بیش چار پانسو طالب علموں کا خرچ اپنے ذمے لے رکھا تھا۔

انھوں نے بہت پہلے سید صاحب کو کلکتہ آنے کی دعوت دی تھی۔ آپ نے جواب میں لکھا کہ ہم ہجرت کر کے جا رہے ہیں، کلکتہ نہیں آ سکتے۔ جو لوگ بیعت کرنا چاہیں، وہ سب ایک جگہ جمع ہو کر اپنے گناہوں سے توبہ کریں اور آیندہ کے لیے شریعت کے پابند ہو جائیں۔ جب سید صاحب نے حج

---

[1] وقائع کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوگلی میں صرف ایک رات ٹھہرے۔ لیکن صاحب "مخزن احمدی" کا بیان ہے کہ تقریباً ایک ہفتہ قیام ہوا اور بہت سے لوگ بیعت ہوئے۔ صبح سے شام تک سید صاحب کے پاس تانتا بندھا رہتا تھا۔

کا ارادہ کیا تو منشی صاحب کو بھی لکھا کہ ہم کلکتہ آتے ہیں۔ موصوف نے شہر کے اندر ایک وسیع کوٹھی صرف سید صاحب کے قیام کے لیے خرید لی، جس میں تین تالاب تھے: ایک پانی پینے کے لیے، دوسرا نہانے کے لیے، تیسرا کپڑے دھونے کے لیے۔ مردوں کے لیے الگ کمرے تھے ان کے علاوہ بہت سے زنانہ مکان تھے۔

قیام کا اقرار

منشی صاحب نے عرض کیا کہ شہر میں مختلف آدمیوں نے آپ کے لیے ٹھہرنے کا انتظام کر رکھا ہے۔ میں سب سے پہلے پہنچا ہوں، لہذا میرے ہاں قیام کا عہد فرمائیں۔ ضرورت کی سب چیزیں اس کوٹھی میں مہیا ہیں۔ کھانے کی بابت یہ عرض ہے کہ اگر کہیں آپ کی دعوت ہو تو اس میں ضرور تشریف لے جائیں۔ دعوت نہ ہو تو پورے قافلے کے لیے دونوں وقت کھانا میرے ہاں سے حاضر ہوگا۔ سید صاحب نے یہ دعوت قبول فرمالی۔

پھر منشی صاحب نے مولانا شاہ اسماعیل کے متعلق پوچھا۔ وہ دوسری کشتی میں تھے۔ مولانا عبدالحی نے آدمی بھیج کر انھیں بلایا۔ سفری کپڑے پہن رکھے تھے، جو میلے ہو گئے تھے۔ کشتی سے اُتر کر مولانا شاہ اسماعیل سید صاحب کے بجرے کی طرف آئے تو اہل قافلہ میں سے کسی نے اشارہ کیا: وہ مولانا آتے ہیں۔ منشی امین الدین احمد نے سمجھا کہ یہ کوئی اور اسماعیل ہوں گے اور کہا کہ میں شاہ اسماعیل کو پوچھتا ہوں، جو شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے ہیں۔ جب انھیں بتایا گیا کہ یہی شاہ اسماعیل ہیں تو ان کی سادگی اور بے تکلفی دیکھ کر منشی صاحب بے اختیار آبدیدہ ہو گئے اور دو چار قدم آگے بڑھ کر ادب سے استقبال کیا۔

منزلِ مقصود

منشی صاحب نے یہ خوشخبری بھی سُنائی کہ جو جگہ ٹھہرنے کے لیے تجویز کی گئی ہے، اس میں میٹھے پانی کی کوئی کمی نہیں۔ سید صاحب نے اس پر عجز و الحاح کے ساتھ بارگاہ باری تعالیٰ میں دعا کی۔ فارغ ہوئے تو فرمایا: میں نے کئی بزرگوں سے سُنا تھا کہ کلکتہ میں میٹھے پانی کی قلت ہے۔ سفر میں کئی مرتبہ خیال آیا کہ مجھے تو لوگ پیر سمجھ کر شاید کہیں نہ کہیں سے میٹھا پانی لا ہی دیں گے، مگر اتنے مسلمان بھائی جو میرے ساتھ ہیں، ان کے لیے کیا انتظام ہوگا؟ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ تشویش بھی جاتی رہی۔

سید صاحب روانہ ہوئے تو شیو رام پور میں ٹھہرے، جہاں آپ کے خلیفہ سید عبداللہ ابن سید بہادر علی رہتے تھے۔ وہاں بھی بہت سے لوگوں نے بعیت کی۔ شیو رام پور سے چلے تو رات کے وقت کلکتہ میں بالو گھاٹ پر پہنچے۔ رات وہیں گزاری۔ صبح کو کشتیوں سے اُترنے کا

بندوبست ہُوا۔[1]

منشی صاحب کا اہتمام مہمانداری

منشی صاحب نے دریا کے کنارے سے بہت بڑی دری بچھوا دی تھی اور ہر قسم کی سواریاں بہ کثرت منگالی تھیں۔ مثلاً پینس، ڈولیاں، بگھیاں، کرانچیاں، ہوادار وغیرہ۔ باربرداری کے لیے چھکڑے موجود تھے۔ مزدور بھی خاصی تعداد میں جمع تھے۔ پہلے مستورات کو پردہ کر کے اتارا گیا اور قیام گاہ پر بھیج دیا۔ پھر مرد سوار ہُوئے۔ سواریاں اتنی زیادہ تھیں کہ بہت سی خالی واپس کرنی پڑیں۔ منشی صاحب سید صاحب کو پینس میں سوار کرا کے پہلے اپنے مکان پر لے گئے، پھر قیام گاہ پر پہنچایا، جہاں تمام کمرے فرش سے آراستہ تھے اور ہر کمرے میں ضرورت کے مطابق پلنگ بچھے ہُوئے تھے۔ متعدد اکابر نے بھی اپنے اپنے ہاں ٹھہرانے کی درخواست کی، لیکن سید صاحب نے فرمایا کہ منشی امین الدین احمد کے ساتھ اقرار ہو چکا ہے، اس لیے معذور ہُوں، البتہ دعوت قبول کر لوں گا۔

تین روز تک منشی صاحب کے ہاں سے نہایت پُرتکلف کھانے آتے رہے۔ مثلاً قورمہ، شیرمال، باقرخانیاں، ماہی پلاؤ، بکرے کا پلاؤ۔ کئی قسم کے مربّے اور اچار، کئی قسم کے میٹھے۔ سید صاحب کے لیے جو کھانا آتا، اس میں اور بھی کئی چیزیں ہوتیں۔ تیسرے روز آپ نے فرمایا کہ ہمارے لیے صرف ایک قسم کا کھانا آئے۔ انواع واقسام کے کھانوں کو اہل قافلہ میں تقسیم کرنا بھی مشکل ہے اور ہم لوگ تکلّفات کو اچھا بھی نہیں سمجھتے۔ منشی صاحب نے سمجھا کہ شاید کھانا اچھا نہیں ہوتا۔ اس لیے تکلّفات میں مزید اہتمام واضافہ کر دیا۔

قافلے کی سادگی اور دیانت

آخر ایک روز سید صاحب نے خود منشی صاحب سے کہا کہ ہم لوگ تو ماش کی کھچڑی کھانے والے ہیں۔ آپ تکلّف کیوں کرتے ہیں؟ بس سادہ غذا بھیج دیا کیجیے۔ منشی صاحب نے عرض کیا:

حضرت! آپ کیا فرماتے ہیں؟ میں کس لائق ہُوں کہ پُرتکلف کھانے بھیجوں؟

---

[1] شیورام پور کو عام طور پر سرام پور کہا جاتا ہے۔ یہاں پادریوں نے بہت بڑا مطبع قائم کر لیا تھا۔ بائبل کا پہلا سلیس اردو ترجمہ اسی جگہ چھپا تھا۔ نیز پادریوں کے عام تبلیغی رسالے یہیں سے چھپ کر شائع ہوتے تھے۔ سید عبداللہ نے بھی یہاں ایک مطبع قائم کیا تھا جس میں شاہ عبدالقادر کا اُردو ترجمہ قرآن اور سیکڑوں دینی کتابیں اہتمام کے ساتھ طبع ہوتی رہیں۔ سید عبداللہ نے سید صاحب کے قافلے کے ساتھ حج کیا تھا۔

> آپ کی خدمت گزاری میں تو جتنا بھی تکلف کیا جائے، تھوڑا ہے۔ میں نے کھانے کھلائے بھی ہیں اور کھلائے بھی ہیں، لیکن آپ جیسے حقانی، ربانی، خدا پرست، بے ریا بزرگ نہ آنکھ سے دیکھے اور نہ کان سے سُنے۔ آپ اس مقدمے کو یونہی رہنے دیں اور جو دال دلیا آتا ہے، اسے قبول فرماتے جائیں!

سید صاحب نے فرمایا:

> خدمت گزاری سے غرض اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف نہ ہونا چاہیے۔ جب کام اسراف اور ریا سے پاک ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لائق ہو۔ مال اسباب اللہ کا ہے ایک روز حساب دینا ہوگا۔ اس کو بے جا برباد نہ کرنا چاہیے کھانے سے مقصود پیٹ بھرنا ہے۔ ایک قسم کا کھانا جب چاہیں بھیج دیا کریں۔

منشی صاحب نے پورا باغ سید صاحب کی نذر کر دیا تھا۔ اس میں نارنگی، چکوترے، سنگترے، کیلے، انجیر، انار، امرود، ناریل، آم وغیرہ کے درخت تھے۔ انگور کی بیلیں بھی تھیں۔ اناس بھی تھے سید صاحب کے رفیقوں کی تقویٰ شعاری کا یہ عالم تھا کہ خود پھل توڑنا تو رہا ایک طرف، جو پھل درختوں سے خود بخود گر جاتے انھیں بھی کوئی نہ اٹھاتا۔ ایسے تمام پھل سید صاحب کے پاس جمع ہوتے۔ آپ پورے قافلے میں تقسیم فرما دیتے۔ قافلے کے بعض افراد کے جوتے ٹوٹ گئے تھے۔ "مخزن احمدی" سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی امین الدین احمد نے پہلے ہی دن ضرورت مندوں کو تین سو روپے کے جوتے اور ایک ہزار سے زیادہ کے کپڑے خرید دیے۔

ہدایتِ خلق

میرے اندازے کے مطابق سید صاحب صفر ۱۲۳۷ھ (نومبر ۱۸۲۱ء) میں کلکتہ پہنچے ہوں گے گویا رائے بریلی سے کلکتہ تک کم و بیش ساڑھے تین یا پونے چار مہینے لگ گئے۔ پھر قریباً تین مہینے کلکتہ میں ٹھہرے رہے۔ اس پوری مدت کا ایک ایک لمحہ ہدایت و ارشاد میں بسر ہوا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کتنے ہزار آدمی بیعت سے مشرف ہوئے اور شریعت کے پابند بنے۔ سیکڑوں گھروں میں بے نکاح بی بیاں تھیں، ان کے نکاح کرا دیے۔ سیکڑوں مرد غیر مختون تھے۔ سید صاحب نے اپنی قیام گاہ میں ایک الگ جگہ مقرر کر کے ان کے لیے ختنوں کا انتظام کیا۔ سید محمد علی نے لکھا ہے:

> ہر خطے اور ہر کشور سے ہزاروں بلکہ بے شمار مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اہل شرک و بدعت اور سرکش و گناہ گار اپنے بُرے اعمال سے توبہ کر کے مخلص مومنوں کے زمرے میں شامل ہو گئے۔

سید صاحب نے کلکتہ پہنچ کر مولانا عبدالحی سے فرمایا تھا کہ اگرچہ ہم حج کی نیت سے آئے ہیں، لیکن خدا کے فضل سے امید ہے، اس شہر میں باب ہدایت اس طرح مفتوح ہوگا کہ دیکھنے والے حیران رہ جائیں گے ۔

یہ پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی اور اس کی تصدیق بعض انگریزوں کے بیانات سے بھی ہوتی ہے ۔ مثلاً پرنسپ لکھتا ہے کہ ۱۸۲۲ء میں سید صاحب کلکتہ آئے اور مسلم آبادی بہت بڑی تعداد میں ان کی پیرو بن گئی[1]

شاہ اسحاق نے بیان فرمایا کہ سید صاحب کلکتہ پہنچے تو بہت سے مسلمانوں نے آپ کی ہدایت سے فائدہ اٹھایا اور آپ کے ارشادات کی برکت سے اس سرزمین میں خاص دینی رونق پیدا ہو گئی[2]

حاجی حمزہ علی خاں کہتے ہیں: آدمیوں کا اتنا ہجوم رہتا تھا کہ سید صاحب کو آرام کے لیے بہت کم وقت ملتا تھا ۔ سب لوگ شیرینی لاتے اور زیادہ تر بتاسے ہوتے ۔ لوگوں کے پاس خاطر سے سید صاحب کم از کم ایک دانہ ضرور چکھتے ۔ اس طرح زبان مبارک پر آبلے پڑ گئے تھے ۔ بیعت کا سلسلہ دو اڑھائی پہر دن چڑھے سے شروع ہو جاتا اور رات تک جاری رہتا ۔ عورتیں بھی بکثرت آتیں اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کمرہ بھر جاتا ۔

بہت سے غیر مسلم سید صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے ۔ کلکتہ اصلاً انگریزی بستی تھی ۔ وہاں کی زندگی انگریزی رنگ میں رنگی جا چکی تھی ۔ عورتیں بے پردہ ہوتیں ۔ شراب بکثرت پی جاتی ۔ سید صاحب کی وجہ سے مسلمانوں میں پردے کا رواج ہوا اور شراب کی دکانیں بے رونق ہو گئیں ۔

جن لوگوں نے سید صاحب کی وجہ سے ہدایت پائی ان میں خود منشی امین الدین احمد کا ذکر بھی ضروری ہے ۔ وہ اگرچہ بڑے مخیر تھے، لیکن دولت و ثروت کی فراوانی سے جو عیوب عام طور پر پیدا ہو جاتے ہیں ان سے پاک نہ تھے ۔ عدالت سے فارغ ہو کر آتے تو سارا وقت عیش و عشرت میں گزارتے ۔ خدا کے فضل سے وہ بھی سید صاحب کی توجہ سے بالکل بدل گئے اور تمام منہیات سے بہ اخلاص توبہ کر لی ۔

ٹیپو سلطان کے شہزادے

ٹیپو سلطان کے خاندان کے افراد کلکتہ ہی میں رہتے تھے ۔ ان میں سے بعض شہزادوں کے عقائد مولوی عبدالرحیم فلسفی کی صحبت میں بگڑ چکے تھے ۔ مولوی عبدالرحیم گورکھپور کے رہنے والے تھے ۔ والد کا نام مصاحب علی تھا ۔ شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر

---

[1] پرنسپ کی کتاب "رنجیت سنگھ" صفحہ ۱۴۶ ۔ [2] رسالہ در احوال مولوی نصیر الدین ۔

اور شاہ رفیع الدین سے تعلیم پائی تھی۔ پھر فلسفہ و منطق میں توغل کے باعث "دہری" مشہور ہو گئے۔ شہزادوں نے محمد قاسم خواجہ سرا کو بھیج کر سید صاحب کو اپنے ہاں بلایا۔ شاہ اسماعیل مولوی عبدالرحیم کو جانتے تھے۔ انھوں نے بات چیت کر کے فلسفی کا ناطقہ بند کر دیا۔ اکثر شہزادوں اور بیگمات[2] نے سید صاحب کی بیعت کر لی اور دعوت بھی کی۔ بڑے[1] شہزادے نے، جسے اپنے علم کا گھمنڈ تھا، بحث ضروری سمجھی۔ سید صاحب کے علاوہ اس مجلس میں مولانا عبدالحی شاہ اسماعیل اور مولوی محمد یوسف بھی شریک تھے۔

شہزادے نے پہلے عربی میں تقریر کی۔ سید صاحب نے فرمایا کہ بھائی مادری زبان میں بات کرو تاکہ سب لوگ آپ کی گفتگو سے فائدہ اٹھائیں۔ پھر وہ فارسی میں بولنے لگا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ عربی اور فارسی تقریروں سے آپ کا مبلغ علم حاضرین پر ظاہر ہو گیا۔ تکلف کی حاجت نہ رہی۔ اب اردو میں فرمائیے پھر اس نے قواعد منطقیہ اور دلائل کلامیہ کی رعایت سے تقریر شروع کی جو واجب الوجود، رسالت اور قرآن کے بارے میں گوناگوں شبہات پر مبنی تھی۔ شاہ اسماعیل فرماتے ہیں: میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ سید صاحب مجھے جواب کا حکم دیں گے، لیکن آپ نے خود تقریر شروع کر دی۔ مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ کمپنی کو آپ نے دیکھا نہیں، تاہم اگر اس کا ملازم پیغام دے کہ کمپنی آپ کو بلاتی ہے تو اجابت حکم لازم ہو گی یا نہیں؟ شہزادے نے اثبات میں جواب دیا۔ اس پر سید صاحب نے فرمایا:

> سبحان اللہ! کمپنی پر دیکھے بغیر اتنا ایمان ہے کہ اپنی بے حرمتی کا بھی خیال نہیں، لیکن قرآن سے انکار ہے، جس کا دعویٰ ہے: لئن اجتمعت الجن والانس ان یاتوا بمثل ھٰذا القراٰن، لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا (اگر تمام جن اور انسان جمع ہو کر اس قرآن کی مثل لانا چاہیں تو کبھی نہ لا سکیں گے، اگرچہ سب ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں) اس نبی اکرم صلعم سے انکار ہے جو روشن معجزات سے مؤید تھا اور ان میں سے ایک معجزہ خود قرآن بھی تھا۔ اب تک ہزاروں شاعر اور نثر نگار پیدا ہوئے جو آپ سے زیادہ سامان والے تھے انھوں نے جزیہ اور قتل گوارا

---

[1] بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ یہ شہزادے دس دس بارہ بارہ برس کے تھے ممکن ہے یہ سلطان شہید کے پوتے ہوں۔ ان کے فرزندوں میں سے کوئی بھی دس یا بارہ برس کا نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے کہ ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو سلطان شہید ہوا اور سید صاحب ۱۸۲۲ء میں کلکتہ پہنچے تھے اگر کوئی شہزادہ سلطان کے سال شہادت میں بھی پیدا ہوا ہو گا تو اس کی عمر تئیس برس سے کم نہ ہو گی۔ [2] مجھے کسی [illegible]

کیا، لیکن ایک چھوٹی سی آیت بھی قرآن جیسی نہ لا سکے۔

یہ تقریر مصطلحات کلام و منطق کی آلائش سے بالکل پاک تھی لیکن سادگی اور دلکشی کی وجہ سے اس نے شہزادے کے پندارِ علم کو چند لمحوں میں ہباءً منثوراً بنا کر رکھ دیا۔ چنانچہ وہ بھی اپنے غلط خیالات سے تائب ہوا۔ سید صاحب کو کھانے پر بلایا اور مع اہل و عیال بیعت کی۔

متفرق واقعات

قیام کلکتہ کے متفرق واقعات یہ ہیں:

۱ ۔ پیگو (برما) سے سید حمزہ سونا فروخت کرنے کے لیے کلکتہ آئے ہوئے تھے۔ وہاں کے لوگوں کی داڑھیاں یا تو ہوتی نہیں یا بہت کم ہوتی ہیں۔ سید حمزہ کے غیر معمولی طور پر لمبی چوڑی داڑھی تھی۔ اس وجہ سے وہ حکام پیگو کے نزدیک بڑے معتبر سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس طرح آپ کی اصلاحی تحریک کی صدا برما پہنچی۔

۲ ۔ بعض حاسدوں نے انگریزوں کے پاس شکایت کی کہ سید احمد پہلے نواب امیر خاں کے لشکر میں نشان بردار تھا۔ نواب کمپنی سے مل گیا تو سید احمد نے پیری مریدی کا ڈول ڈالا اور اب انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہے۔ یہ محض بے علم ہے۔ اس شکایت پر کسی نے توجہ نہ کی۔

۳ ۔ پورنیا کا ایک برہمن لڑکا خواب دیکھ کر سید صاحب کے پاس پہنچا اور مسلمان ہوا۔ حج میں ساتھ رہا۔ جہاد میں بھی ہم رکابی کا آرزومند تھا۔ لیکن سید صاحب کے سفرِ ہجرت سے پیشتر ہی فوت ہو گیا۔

۴ ۔ سلہٹ، چاٹگام اور دوسرے دور افتادہ علاقوں سے بھی لوگ آئے اور سید صاحب کی بیعت سے شرف پا کر صراطِ مستقیم پر قائم ہوئے۔

۵ ۔ مولوی امام الدین بنگالی، سید صاحب کے خاص عقیدت مند تھے۔ جہاد میں ساتھ رہے، حج میں بھی ساتھ تھے۔ وہ سدارام (نواکھالی[1]) کے رہنے والے تھے۔ والدہ سے ملنے کی اجازت لے کر گئے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ والدہ بھی حج کرنا چاہیں تو ساتھ لے آنا۔ وہ تو نہ آئیں، لیکن مولوی امام الدین کے ساتھ تیس چالیس آدمی سید صاحب کی زیارت اور بیعت کی نیت سے آ گئے۔

۶ ۔ ایک پیرزادے نے سید صاحب کو اپنے مکان پر بلایا۔ معلوم ہوا کہ وہ شریعت حقہ کا پابند نہیں

---

[1] ان کے وطن کا نام حاجی پور بتایا گیا ہے۔ یہ سدارام کے آس پاس کوئی گاؤں ہونا چاہیے۔

لیکن سید صاحب اس کے مکان پر گئے۔ باہر کے دروازے سے مکان کے اندر تک اُس نے فرش پر پگڑیاں بچھا رکھی تھیں اور عرض کیا کہ ان پر سے چلیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ پگڑیاں سر پر باندھنے کے لیے ہوتی ہیں، ہم ان پر سے نہیں چلیں گے۔ اس نے خود بیعت کی اور اپنے مریدوں سے کہا کہ جو سید صاحب کی بیعت نہ کرے گا وہ میری مریدی سے بھی خارج ہوگا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ اپنے مریدوں سے آپ خود بیعت لیں۔ اس طرح جو بیعت ہوگی وہ ہماری بیعت سمجھی جائے گی۔

۷ - بغداد کے ایک پیرزادے سید احمد ان دنوں کلکتہ آئے ہوئے تھے۔ انھیں اپنی بڑائی پر بہت فخر تھا۔ چاہتے تھے کہ سید صاحب خود آکر ملیں۔ چنانچہ پیغام بھیجا کہ میں بیمار ہوں اس لیے آ نہیں سکتا اور ملاقات کا آرزومند ہوں۔ سید صاحب گئے۔ بات چیت کے دوران میں اس نے کہا کہ آپ اتنا بڑا قافلہ ساتھ لے کر جا رہے ہیں، اس کا خرچ کون دے گا؟ سید صاحب نے فرمایا: اگر انگریزوں کی حکومت چاہے تو کیا ہزاروں آدمیوں کو لاد کر حجاز یا کسی دوسرے ملک میں نہیں پہنچا سکتی؟ اگر یہ ہو سکتا ہے تو آپ کو شاہنشاہ عالم پناہ، پروردگار کائنات کے متعلق کیوں شبہ ہے، جس کے سامنے انگریز ادنیٰ محتاجوں سے بھی زیادہ محتاج ہیں؟ پھر فرمایا: انشاء اللہ ان سب کو کرایہ دے کر لے جاؤں گا۔

۸ - سید صاحب کے بھانجے سید احمد علی صاحب کے اہل و عیال ساتھ آئے تھے: خود وہ بعض امور کے سرانجام کی غرض سے لکھنؤ میں ٹھہر گئے تھے۔ فارغ ہو کر کلکتہ پہنچے تو وہ پانچ ہزار روپے بھی ساتھ لائے جو سید صاحب نے فقیر محمد خاں رسالدار کے پاس امانت رکھوا دیے تھے۔ ستر روپے میں شاہ عبدالقادر کے ترجمۂ قرآن کا بھی ایک نسخہ ساتھ لائے، جو سید عبداللہ شیعدام پوری کو بغرض طباعت دے دیا گیا۔

جہازوں کا انتظام

سید صاحب گھر سے خالی ہاتھ چلے تھے۔ راستے میں تحائف و ہدایا کی شکل میں جو کچھ ملا، اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کے کل رفقاء چھ سات سو تریپن تھے۔ ان میں سے چھ سو ترانوے کا کرایہ ادا کیا گیا۔ باقی لوگ وقت کے عام طریقے کے مطابق مساکین میں محسوب ہوئے اور اُن کا کرایہ نہ لیا گیا۔ ابتدا میں گیارہ جہازوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پورے ساتھیوں کے لیے صرف دس جہاز کافی ہیں، اس لیے ایک جہاز چھوڑ دیا گیا۔ ابتدا میں فی کس سولہ روپے کرایہ طے ہوا تھا، بعد میں سامان وغیرہ کا کرایہ شامل کر کے بیس روپے فی کس وصول کیے گئے۔ اس طرح

سید صاحب نے تیرہ ہزار آٹھ سو ساٹھ روپے کی رقم محض کرایے میں دی۔

پورا قافلہ دس جماعتوں میں تقسیم کردیا گیا۔ ہر جماعت ایک جہاز پر سوار ہوئی اور تمام جماعتوں کے لیے ایک ایک امیر مقرر ہوگیا۔ ذیل میں جہازوں، امیروں اور ناخداؤں (کپتانوں) کے نام نیز تعداد افراد درج ہے[1]:

نام جہاز	نام امیر جماعت	افراد کی تعداد	ناخدا یا کپتان
دریا بقی	سید صاحب	۱۵۰ (زیادہ تر اقربا)	سید عبدالرحمٰن
فتح الباری	مولوی عبدالحق	۷۰	عبداللہ بلال عرب
عطیۃ الرحمٰن	قاضی احمد اللہ میرٹھی	۶۷	محمد حسین ترک (یہ جنگی جہاز تھا اور اس پر سات توپیں تھیں)
غراب احمدی	مولوی وحید الدین و مولوی مغیث الدین	۵۰	احمد ترک (یہ جنگی جہاز تھا اور اس پر گیارہ توپیں تھیں)
فتح الکریم	میاں دین محمد	۷۶	محمد حسین مستقلی
فیض ربانی	شاہ اسماعیل	۱۷۵	نام معلوم نہ ہو سکا۔
فیض الکریم	قاضی عبدالستار گڑھ مکتیشری،	۵۰	"
عباسی	پیر محمد بانس بریلی کے	۴۰	"
تاج	نادر شاہ ہریانوی	۶۵	"
فتح الرحمٰن	محمد یوسف کشمیری	۵۰	"

مولانا عبدالحی اور مولوی محمد یوسف پھلتی کے نام امیروں میں نہیں آئے۔ یہ دونوں سید صاحب کے ساتھ تھے۔

سامان خورونوش کرایے کے علاوہ خورونوش کا انتظام ضروری تھا۔ چنانچہ چھ سو تین روپے آٹھ آنے کے برتن یعنی دیگیں، دیگچے، دیگچیاں، لگن، کفگیر، چمچے، چولہے وغیرہ

---

[1] یہ نہ سمجھا جائے کہ پورے جہاز سید صاحب نے لے لیے تھے۔ ان جہازوں پر دوسرے مسافر بھی سوار تھے اور سامان بھی تھا۔ بعض میں سامان زیادہ تھا اور مسافر کم۔ راستے میں بھی ان کو جگہ جگہ سے مسافر ملتے گئے ہوں گے۔

خریدے گئے۔ سات ہزار تین سو ستاسی روپے آٹھ آنے کی رقم رسد یعنی چاول، آٹا اور دال کی خرید میں صرف ہوئی۔ عورتوں کے لیے چار جہازوں میں پردہ دار جگہوں کا انتظام کیا گیا۔ اس پر مزید بارہ سو روپے خرچ آئے۔ گویا کل تینتیس ہزار اکاون روپے صرف ہوئے۔ اس پاک نفس سید کی کرامت کا اس سے روشن تر ثبوت کیا ہو سکتا ہے جو خالی ہاتھ گھر سے نکلا تھا اور پورے ملک کے مسلمانوں کو حج کے لیے صلائے عام دیتا آیا تھا؛ یہ صرف کلکتہ سے حجاز تک کا خرچ تھا۔ خود حجاز میں ہزاروں روپے صرف ہوئے۔ پھر پورے قافلے کو اسی اہتمام کے ساتھ واپس لایا اور جب تک لوگ گھروں میں نہ پہنچ گئے، ان کے کھانے پینے کا پورا خرچ سید صاحب کے ذمے رہا۔

علاوہ بریں آپ وقتاً فوقتاً عام غربا کو بھی رقمیں دیتے رہے۔ شیخ عبداللطیف مرزا پوری کا بیان ہے کہ کوئی لڑکے یا لڑکی کی شادی کے لیے امداد کی درخواست کرتا۔ کوئی کہتا کہ قرضدار ہوں، اس مصیبت سے نجات دلائیے، کوئی مسجد یا کنوئیں کے لیے رقم مانگتا۔ ان مدوں میں کم و بیش دس ہزار روپے خرچ ہوئے۔

سید صاحب کی سواری کا جہاز

سید صاحب نے اپنی سواری کے لیے "دریا بقی" تجویز کیا تھا، جو پرانا جہاز تھا۔ اور اس کی رفتار بھی کم تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوگی کہ سید صاحب ساتھیوں کو بہتر جہازوں پر روانہ کرنا چاہتے تھے تاکہ کسی کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہو، اپنے لیے اچھا جہاز رکھ لیا۔ دوسری وجہ یہ ہوگی کہ اس کا ناخدا ہفتہ بھر بعد روانہ ہونا چاہتا تھا اور سید صاحب اپنے اوقات عزیز کا ایک ایک لمحہ خلقِ خدا کی اصلاح میں صرف کرنے کے آرزومند تھے۔

شیخ غلام حسین کلکتہ کا ایک بڑا تاجر فخر التجار کے لقب سے مشہور تھا۔ اس نے ایک روز عرض کیا کہ آپ "عطیۃ الرحمٰن" میں سوار ہوں جو شاہی جہاز ہے۔ اس طرح آپ کی عزت بڑھے گی۔ یہ سن کر سید صاحب کا چہرہ متغیر ہو گیا فرمایا: "یہ کیا بات کہی؟ عزت تو صرف خدا کی طرف سے ہے، بندے کی طرف سے نہیں۔ ہم دنیا کی قدر و منزلت کو سڑے ہوئے مردار کتے سے بھی بدتر جانتے ہیں" یہ سن کر غلام حسین چپ ہو گیا۔

مولانا عبدالحی کے والد مولانا ہبۃ اللہ بھی اس سفر میں شریک تھے۔ وہ کلکتہ میں بیمار پڑ گئے اور وہیں وفات پائی۔

کلکتے کیسے بدلا؟

کلکتہ والوں کے تحائف و ہدایا کے بارے میں جو کچھ معلوم ہو سکا، اس کی سرسری

کیفیت یہ ہے :

١ - منشی امین الدین : پانچ ہزار نقد، تین سو جوڑے جوتے، چار گٹھڑی کپڑے، ایک میں سفید تھان یعنی لٹھا، ململ وغیرہ۔ دوسری میں سوسی اور چھینٹ کے تھان، باقی گٹھڑیوں میں موٹا کپڑا۔ دو نہایت خوب صورت گھڑیاں، پانچ ہزار روپے اس غرض سے پیش کیے کہ ممکن ہے بعض اوقات سید صاحب کے رفقا کو مزاج کے مطابق کھانا نہ ملا ہو اور انھوں نے پیسے خرچ کر کے بازار سے کھایا ہو۔ پانسو احرام دیے۔

٢ - امام بخش سوداگر: تین سو روپے، بیس اشرفیاں، پندرہ تھان سفید اور چھینٹ کے، دو شیشیاں عطر کی جن میں پانچ پانچ تولے عطر تھا، ایک بنگلہ جسے سید صاحب نے بہ اصرار واپس کر دیا۔

٣ - غلام حسین تاجر: چار جہاز پورے نذر کیے اور ان کے ساتھ کھانے پینے کا سامان بھی مہیا کر دیا۔ چونکہ انتظام ہو چکا تھا، اس لیے سید صاحب نے یہ نذر بہ شکریہ واپس کر دی۔ غلام حسین نے اپنے لڑکے کو ساتھ کر دیا۔ یقین ہے بڑی رقم بھی دی ہوگی۔ اس کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ ایک کوٹھی نذر کی، جو سید صاحب نے اسے واپس دے دی۔ مراجعت پر سید صاحب اسی کے ہاں ٹھہرے تھے۔

٤ - شیخ رمضانی، سعدالدین ناخدا، منشی حسن علی اور امام بخش تاجر نے چار سو احرام پیش کیے اور عرض کیا کہ جو احرام پہلے پیش ہو چکے ہیں، عمرہ کے لیے باندھے جائیں، ہمارے احرام حج کے لیے استعمال کیے جائیں۔

٥ - جس پیرزادے نے بیرونی دروازے سے مکان کے اندر تک سید صاحب کے لیے پگڑیاں بچھائی تھیں، اس نے سو روپے پیش کیے۔ اس درجے کی دوسری نذروں کا حساب پیش کرنا مشکل ہے۔

سید صاحب نے سوار ہونے سے پیشتر حکم دے دیا تھا کہ ساتھیوں میں سے جس جس کے پاس ایک جوڑا ہو، اُسے تین جوڑے نئے بنوا دیے جائیں، باقی لوگوں کے لیے کم از کم دو دو نئے جوڑوں کا انتظام کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک سو کے لیے دو دو جوڑے سلوا دیے گئے۔

بیسواں باب

سفرِ حج

حج و زیارت اور مراجعت

روانگی خور و نوش کا سامان ہر جہاز پر بقدرِ ضرورت رکھ دیا گیا۔ سید صاحب کے رفقاء کا جتنا سامان تھا، اس کی پہچان یہ تھی کہ ہر نگ پر ہندسوں میں "۱۲۷" لکھ دیے گئے ("سید احمد" کے اعداد ازروئے ابجد) سارے جہاز یکے بعد دیگرے روانہ ہوئے۔ تمام کی تفصیل معلوم نہیں، اتنا معلوم ہے کہ "فتح الکریم" نے سب سے پہلے لنگر اٹھایا، جس میں امیر قافلہ میاں دین محمد تھے۔ "وقائع احمدی" میں زیادہ تفصیلات اسی جہاز کے متعلق ملتی ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ سفرِ حج کے متعلق زیادہ تر روایات میاں دین محمد کی ہیں اور وہ اپنے ہی جہاز کے حالات بالتفصیل بیان کر سکتے تھے۔ باقی جہازوں کے متعلق سُنی سنائی باتیں بیان کی ہوں گی۔ اس کے بعد "تاج" چلا، پھر "غراب احمدی"۔ بعد ازاں "فیض ربانی" جس کے امیر مولانا شاہ اسماعیل تھے اور رفقاء کی سب سے بڑی جماعت اسی جہاز پر سوار تھی۔ "فیض ربانی" کے بعد "فتح الباری" نے لنگر اٹھایا۔

سید صاحب کا جہاز سب کے بعد روانہ ہوا۔ روانگی کے سرسری حالات یہ ہیں:

۱ ۔ منشی امین الدین احمد نے سید صاحب کو اپنے گھر پر کھانا کھلایا اور آپ ظہر تک وہیں رہے۔ مستورات کو سب سے پہلے جہاز پر پہنچا دیا گیا۔ اکثر رفقاء بھی چلے گئے۔ سید صاحب ظہر کے بعد روانہ ہوئے۔ چلتے وقت آپ نے جو نصیحتیں فرمائیں، ان میں سے ایک یہ تھی: جو شخص کہے کہ سید احمد کی توجہ میں بڑی تاثیر تھی، اسے مفتری سمجھنا۔ یہ بات محض من جانب اللہ ہے۔ رخصت کے وقت اپنی سرمئی دستار منشی صاحب کے سر پر رکھ دی۔ اس وقت منشی صاحب پر بے حد رقت طاری ہوئی۔

۲ ۔ جس بگھی پر آپ روانہ ہوئے، اس میں آپ کے علاوہ سید عبد الرحمٰن، مولانا عبد الحی، شیخ عبد اللہ ابن شیخ غلام حسین تاجر اور منشی امین الدین احمد سوار تھے، سید محمد یعقوب اور مولوی محمد یوسف پھلتی بگھی کے پیچھے کھڑے تھے۔ مسلم و غیر مسلم بکثرت مکانوں کی چھتوں پر بیٹھے روانگی کا نظارہ دیکھ

رہے تھے۔

۳ ۔ قلعے کے میدان میں نماز عصر پڑھائی۔ پھر سب سے مصافحہ کیا۔ بعض مساکین کو ایک ایک روپیہ عنایت فرمایا۔ اس طرح سات سو روپے خرچ ہوئے۔

۴ ۔ چاند پول گھاٹ پر کشتی کھڑی تھی، اس میں سوار ہوئے۔ پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر سب کو بآواز بلند السلام علیکم کہا۔ اکثر لوگ رو رہے تھے۔ ہزاروں دیر تک کشتی کے ساتھ ساتھ کنارے کنارے چلتے رہے۔ مغرب کے وقت ان سب کو رخصت کیا۔

۵ ۔ دستور یہ تھا کہ سمندر میں جزر کے وقت کشتیاں روک دیتے۔ اندھیرا ہوتے ہی جزر شروع ہوا تو سید صاحب اور ان کے رفقاء کی کشتیاں بھی کنارے پر لگ گئیں۔ وہاں اکثر دوستوں اور عزیزوں کے نام خط لکھوائے، جنھیں مولوی نصیر الدین دہلوی اور شیخ محمد ساکن ڈھنی ڈھمڈھنی کے حوالے کیا گیا۔ وہ صرف سید صاحب کو رخصت کرنے کے لیے کلکتہ تک ساتھ آئے تھے، حج کے لیے جانے کا ارادہ نہ تھا۔

جہاز پر انتظامات

صبح کو گیلا کاچھی پہنچے۔ وہاں سے جہاز دو کوس پر تھا۔ جہاز پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ آپ کی انا جمن بوا پر نزع کی حالت طاری ہے۔ آپ گھڑی بھر اس کے پاس بیٹھے رہے۔ وہ فوت ہو گئیں تو سید صاحب نے ناخدا سے اجازت لے کر میت کشتی پر سوار کرا کے کنارے پر پہنچائی اور جمن بوا کو وہاں دفن کیا۔ پھر رات رہے جہاز نے لنگر اٹھایا۔

۱ ۔ جہاز پر معمول یہ تھا کہ روزانہ صبح کی نماز کے بعد دعاے حزب البحر پڑھتے۔ پھر مولوی محمد یوسف پھلتی سے سورۂ زخرف کا پہلا رکوع سنتے۔ بعد ازاں مختلف لوگ مذہبی باتیں پوچھتے۔ ظہر تک آرام فرماتے، بعد بھی نمازوں کے اوقات کے سوا مذہبی مذاکرات کا سلسلہ جاری رہتا۔

۲ ۔ سمندر کے سفر میں چونکہ اکثر ساتھیوں کو دورانِ سر اور قے کا عارضہ شروع ہو گیا تھا، اس لیے سید صاحب نے مولوی عبدالحی سے مسئلہ پوچھ کر جمع بین الصلوتین کا اعلان فرما دیا۔

۳ ۔ بادل خاں پٹھے باز طاقتور جوان تھا۔ اس نے جہاز پر پہنچتے ہی اعلان کر دیا کہ وضو کے لیے سمندر سے پانی نکالنے کی خدمت میرے حوالے کر دی جائے۔ چنانچہ نماز کا وقت قریب آتا تو بادل خاں جہاز کے ایک کنارے پر ڈول لے کر کھڑا ہو جاتا اور جو جو لگن لے کر آتا اُسے بھرتا جاتا ساتھ ساتھ اللہ ہُو، اللہ ہُو کا ذکر جاری رکھتا۔

۴ ۔ شیخ باقر علی ڈھنی ڈھمڈھنی والے نے کھانا پکانے کا کام سنبھال لیا۔ مزید چند اصحاب نے ان کی

اعانت کے لیے تیار ہو گئے۔ سید صاحب کی جماعت کے لیے روزانہ دو دیگوں میں چاول پکتے اور ایک میں دال۔ بعض اصحاب کے لیے حسب ضرورت روٹی پکا دی جاتی۔

ہر جہاز کے تفصیلی حالات ہمیں معلوم بھی نہیں اور معلوم ہوتے تو انھیں درج بھی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن یقین ہے کہ ہر جہاز ایک دوسرے کی خدمت اور دینداری کی ایسی ہی کیفیات سے معمور ہو گا، جس کا سرسری نقشہ ہم سید صاحب والے جہاز کے سلسلے میں اوپر بیان کر چکے ہیں۔

سمندر کا سفر

سیلون کے پاس سے گزر کر راس[1] کماری کا چکر کاٹا۔ یہ مقام اس زمانے میں جہازوں کے لیے بہت خطرناک سمجھا جاتا تھا، اس لیے کہ بڑی تیز ہوائیں چلتی تھیں، آجکل بھی چلتی ہوں گی۔ لیکن اب جہاز رانی کا فن اور جہازوں کی مشینری بہت ترقی کر چکی ہے۔ اس حصے سے بخیر و عافیت گزرنے کے بعد جہاز کے خلاصی بڑی خوشیاں مناتے۔ ڈھول گلے میں ڈال کر ناخدا (کپتان) سے انعام لیتے، پھر مسافروں سے پیسے وصول کرتے۔ راس کماری سے گزر کر سید صاحب کا جہاز پہلے ایلپی[2] میں ٹھہرا۔ پھر کالی کٹ میں۔ کالی کٹ میں سید صاحب کے پہنچنے سے پہلے آپ کی شہرت

---

[1] راس کماری کو روایات میں "قاف قمری" لکھا ہے، جو غالباً کیپ کامورن کی تعریب ہے۔ [2] ایلپی جنوبی و مغربی ہندوستان کی مشہور بندرگاہ ہے جو کوچین کے جنوب میں واقع ہے۔ سید صاحب کے سوانح نگاروں نے اسے "الفی" لکھا ہے۔ ممکن ہے پرانا اسلامی نام یہی ہو، لیکن آج کل اسے ایلپی کہتے ہیں۔ [3] کالی کٹ کو کلی کوٹ لکھا ہے۔ اس سلسلے میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ سید محمد علی مؤلف "مخزن احمدی" نے ان مقامات کے ذکر میں تقدم و تاخر کر دیا ہے، اس وجہ سے ان کا بیان پیچیدہ ہو گیا ہے، لیکن سید صاحب کی جماعت کے عام محرروں کی طرح سید محمد علی نے بھی دقت نظر اور استقصار جزئیات کے کمالات کی نمائش نہایت مستحسن انداز میں کی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ خط استوا سے متصل ہونے کے باعث اس مقام میں سردی بالکل نہیں ہوتی۔ غیر مسلم، عورتیں اور مرد ننگے رہتے ہیں۔ ناکتخدائی کی علامت یہ ہے کہ ہر صبح کو غیر شادی شدہ لڑکیاں اپنے اندام پر پھول رکھ لیتی ہیں۔ بوڑھی عورتیں بعض اوقات کپڑے سے منہ ڈھانپ لیتی ہیں۔ مسلمان ستر و حجاب کی سخت پابندی کرتے ہیں ان کی عورتیں برقعے پہن کر نکلتی ہیں اور پانچوں وقت نماز مردوں کے ساتھ مسجد میں ادا کرتی ہیں۔ عقیدۃً یہ لوگ شافعی ہیں۔ ہاتھی سب کے پاس ہیں اور ہر قسم کے کاموں میں مدد دیتے ہیں۔ مثلاً معماری کا کام کرنے والے کا ہاتھی مالک کو اینٹیں اور گارا سونڈ سے پکڑاتا رہتا ہے۔ مسجدیں پُر رونق ہیں اور جھاڑ فانوس سے آراستہ۔ مسافر اترتے ہی نکاح کر سکتے ہیں۔ نصف مہر پہلے ادا کرنا پڑتا ہے۔ اگر مسافر جاتے وقت اہلیہ کو چھوڑنا چاہے تو باقی نصف مہر اور ایام عدت کا خرچ قاضی کے سامنے ادا کر دیتا ہے۔ اس طرح سیکڑوں بچے پیدا ہوتے ہیں، جنھیں باپ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ اس لیے انھیں مایلا یا بچہ مادر کہتے ہیں۔ میاں دین محمد کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم ناکتخدا عورتیں ننگی رہتی ہیں۔ بیاہی عورتیں لنگوٹی باندھتی ہیں۔ مسلمان عورتیں گھٹنوں تک تہمد اور لمبی آستینوں کی کرتی پہنتی ہیں۔ مچھلی، کیلا اور ناریل بہت ہوتا ہے۔ [illegible]

پہنچ چکی تھی اور لوگ کشتیاں لیے آپ کے منتظر تھے۔ چنانچہ آپ جہاز سے اتر کر کالی کٹ گئے۔ شہر کے وسط میں ایک تالاب تھا۔ اس کے بیچ میں مسجد تھی وہیں آپ نے قیام فرمایا۔

کالی کٹ سے روانہ ہوئے تو جزائر لکادیپ کے مجمع میں سے گزرے۔ امیتنی[1] سے پانی لیا۔ عقیدی[2] کا بھی ذکر آیا ہے۔ پھر جزیرہ سقوطرہ کے پاس سے ہوتے ہوئے عدن پہنچے۔

عدن عرب کی پاک سرزمین کا پہلا خطہ تھا، جہاں سید صاحب نے قدم رکھا، اس لیے اترتے ہی دوگانۂ شکر ادا کیا، پھر شہر میں گئے۔ دنبہ لے کر ذبح کرایا۔ سید عیدروس ان اطراف کے مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ ان کا مقبرہ عدن میں ہے۔ سید صاحب اس مقبرے میں بھی گئے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک رات شہر میں گزاری۔ دوسری روایت میں ہے کہ تین راتیں رہے۔

عدن سے چلے تو باب المندب[3] میں پہنچے۔ یہ مقام بھی جہازوں کے لیے خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ اس جگہ بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ عرب ملتے ہیں۔ عرب اور افریقہ کے خطّے بالکل قریب آ گئے ہیں۔ تنگنائے کے عین بیچ میں ایک پہاڑی جزیرہ (پیرم) ہے اور بڑی احتیاط سے گزرنا پڑتا ہے۔ ذرا جہاز بے قابو ہو تو موجیں اُسے اٹھا کر پہاڑی سے پٹک دیں۔ اس وقت پہر رات باقی تھی۔ جہاز کے خلاصیوں نے سید صاحب کو جگایا کہ اس موقع سے بخیر و عافیت گزرنے کے لیے دعا فرمائیں۔

بحیرۂ قلزم کے سفر کا حال بیان کرتے ہوئے سید زین العابدین بیان کرتے ہیں کہ ایک روز حضرت جہاز کے اگلے حصّے پر جنگلا پکڑے کھڑے تھے۔ بار بار سبحان اللہ و بحمدہٖ اور سبحان اللہ العلی العظیم پڑھ رہے تھے۔ پھر خواجہ حافظ کے دیوان سے بعض شوق انگیز اشعار پڑھنے لگے۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اسی حالت میں خدائے پاک کی عظمت کا بیان شروع کر دیا۔ اور کئی گھڑیاں اسی کیف و ذوق میں بسر فرما دیں۔

مخا میں قیام

عدن کے بعد جہاز یمن کی مشہور بندرگاہ مخا میں ٹھہرا۔ وہاں ایک مہینے کا قیام اس وجہ سے ناگزیر ہو گیا کہ بہت سا سامان اتارنا تھا۔ نیز جہاز کا کپتان اپنے وطن "ظفاد" (حضرموت) جانا چاہتا تھا۔ حج میں چونکہ چار پانچ مہینے باقی تھے۔ اس لیے ایک مہینے کے قیام میں مضائقہ نہ تھا۔ سید صاحب نے ایک حویلی کرایے پر لے لی اور ہمراہیوں کے ساتھ اسی میں رہنے لگے۔ آپ کی جماعت

---

[1] امیتنی کا پورا نام امین دیپ ہے۔ دیپ جزیرے کو کہتے ہیں یہ نام غالباً کسی عرب آبادکار کے نام پر رکھا گیا۔

[2] عقیدی کا انگریزی تلفظ اگاتھی (ACATHE) ہے۔ [3] "وقائع" میں اسے باب سکندر لکھا ہے۔ اور باب المندوب کے نام سے بھی مشہور ہے۔

کے جو جہاز پہلے آ چکے تھے، وہ بھی مخا میں ٹھہرتے ہوئے آگے بڑھے تھے۔

سید صاحب نماز مخا کی جامع مسجد میں ادا کرتے تھے۔ وہاں لوگ عام طور پر حوضوں میں ننگے نہاتے تھے۔ ان کی بے خبری یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ایک روز مولوی امام الدین بنگالی کو تہمد باندھے ہوئے ایک حوض میں نہاتے دیکھا تو انھیں پکڑ کر قاضی صاحب کے پاس لے گئے اور شکایت کی کہ اس شخص نے ہمارا حوض گندا کر دیا ہے۔ سید صاحب نے قاضی کے پاس آدمی بھیجے اور اسے ننگے نہانے کی قباحتوں سے آگاہ کیا۔ اس طرح مولوی امام الدین کو مخمصے سے چھڑایا۔ قاضی نے حکم دے دیا کہ کم از کم ہندوستانی قافلے کے قیام تک کوئی شخص کسی حوض میں ننگا نہ نہائے۔

قیام مخا کے دوران میں معلوم ہوا کہ یمن کے شہرۂ آفاق عالم دین، قاضی محمد بن علی شوکانی نے ایک کتاب میں موضوع حدیثیں جمع کر دی ہیں۔ سید صاحب نے مولانا عبدالحی سے فرمایا کہ یہ کتاب حاصل کرنے کی تدبیر کیجیے۔ مولانا قاضی شہر کے پاس پہنچے۔ مخا میں تو کتاب کا کوئی نسخہ نہ مل سکا، لیکن قاضی نے کہا کہ آپ ایک خط لکھ دیں، میں صنعا بھیج کر کتاب منگا دوں گا۔ چنانچہ مولانا نے مفصل خط عربی میں لکھ کر قاضی کے حوالے کر دیا۔ اس طرح قاضی شوکانی کی کتاب موضوعات سید صاحب کی وساطت سے ہندوستان پہنچی۔

جدہ

مخا سے چلے تو حدیدہ میں ٹھہرے۔ جہاں سید صاحب کے ایک ہندوستانی دوست قیام پذیر تھے۔ انھیں سید صاحب کی تشریف آوری کا علم ہو چکا تھا۔ جہاز پر آ کر ملے۔ آپ کی دعوت بھی کی۔ سید صاحب نے چلتے وقت اس دوست کو ایک ولایتی تلوار، ایک سپر اور ایک دو نالی بندوق عطا فرمائی۔

یلملم کے محاذ میں پہنچے تو پورے قافلے نے غسل کر کے عمرے کا احرام باندھا۔ دو رکعت نماز ادا کر کے سب سے پہلے سید صاحب نے "لبیک" کی صدا بلند کی۔ پھر پورے قافلے کی صدائے لبیک سے جہاز گونج اٹھا۔ سید صاحب دو گھڑی دعا میں مشغول رہے۔

جدہ پہنچے تو جو ہمراہی پہلے پہنچ چکے تھے، ان میں سے اکثر مکہ معظمہ جا چکے تھے۔ کچھ لوگ سید صاحب کے انتظار میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ حیدر آباد دکن کے دو بھائی، محمود نواز خاں اور سلطان حسین خاں بہ سلسلہ تجارت مکہ معظمہ میں مقیم تھے۔ محمود نواز خاں سید صاحب کی شہرت سن کر بغرض زیارت جدہ آ گئے۔ سید صاحب کا خاندانی معلم بھی وہاں پہنچا ہوا تھا۔ اس کے پاس سید ابو اللیث مرحوم (سید صاحب کے ماموں) کا مُہری پروانہ موجود تھا۔

سید صاحب چار دن جدّہ میں ٹھہرے رہے[1]۔ اس اثنا میں اس مقام کی بھی زیارت کی جو مزار حوا کے نام سے مشہور تھا۔ مولانا شاہ اسماعیل کو تصفیۂ محاصل کے لیے چھوڑ دیا اور خود روانہ ہو گئے۔ کلکتہ سے روانگی کے وقت مختلف جماعتوں کے امیروں کو کچھ رقمیں متفرق مصارف کے لیے دے دی گئی تھیں۔ جدّہ میں ان رقموں کا حساب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ دو ہزار ایک سو روپے زائد خرچ ہوئے۔ سید صاحب نے یہ رقم بھی ادا فرما دی۔

مکہ معظّمہ میں داخلہ

جدّہ سے چل کر ایک مقام حدّہ میں کیا۔ پھر حدیبیہ[2] میں ٹھہرے، جہاں بیعت رضوان ہوئی تھی۔ وہاں رفیقوں سمیت دیر تک دعا میں مشغول رہے[3]۔ تیسرے روز چاشت کے وقت مکہ معظمہ میں پہنچ گئے۔

شہر میں داخلے کے دو راستے تھے، ایک اسفل مکہ کی طرف سے اور دوسرا اعلائے مکہ کی طرف سے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن اعلائے مکّہ کی طرف سے شہر میں داخل ہوئے تھے۔ سید صاحب نے بھی تیمن و تبرک کے طور پر یہی راستہ اختیار کیا۔ شعبان ۱۲۳۷ھ کی اٹھائیسویں تاریخ تھی (۲۱۔ مئی ۱۸۲۲ء) دھوپ بہت تیز ہو گئی تھی[4]۔ سید صاحب حجون کی گھاٹی سے گزر کر جنت المعلیٰ میں پہنچے اور ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے مزار پر دیر تک مصروف دعا رہے۔ باب السلام سے حرم پاک میں داخل ہوئے۔ طواف کے بعد مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز ادا کی۔ زمزم پر پانی پیا۔ سعی کے بعد حلق کرایا اور احرام کھولا۔ اس طرح گھر سے نکلنے کے بعد حرم پاک میں پہنچنے تک کل دس مہینے سفر میں بسر ہوئے۔ ایک مہینا بنارس میں ٹھہرے، تین مہینے کلکتہ میں اور ایک مہینہ مکّا میں۔ باقی مقامات پر کہیں پندرہ روز قیام کیا، کہیں آٹھ روز، کہیں دو چار دن اور کہیں صرف ایک رات۔

سید صاحب مکہ معظمہ پہنچے تھے تو روزانہ خرچ کی یہ کیفیت تھی:

آٹا	تیس ریال
متفرق جنسیں	چھ ریال سے گیارہ ریال
لکڑی	تین ریال

---

[1] "مخزن احمدی" میں ہے پانچ دن۔ صفحہ ۹۰۔ [2] یہ مقام جدہ سے مکہ معظمہ جاتے ہوئے حد حرم کے پاس ہے۔ آج کل حدیبیہ کے بجائے شمیسی کی شہرت زیادہ ہے۔ حدیبیہ اس کے قریب ہی تھا۔ [3] مخزن احمدی میں ہے: بمراسم آمرزش جمیع قافلہ بکمال ابتہال و خضوع و خشوع بجناب رب العطایا مسئلت فرمودند۔ [4] مخزن احمدی ص ۹۲

آٹے کا بھاؤ گیارہ کیل فی ریال تھا۔ کیل قریباً پونے دو سیر کا ہوتا ہے۔ گویا چودہ پندرہ من آٹا روزانہ خرچ ہوتا تھا۔ کل خرچ انتالیس ریال روزانہ تھا۔ آخری دور میں گھٹ کر پچیس ریال رہ گیا تھا اس کی ایک وجہ غالباً یہ تھی کہ گوشت کے بجائے زیادہ تر دال پکتی تھی۔ دوسری وجہ یہ ہوگی کہ اداے حج کے بعد اکثر رفقا مختلف جہازوں میں سوار ہو کر واپس آتے رہے۔

قیامگاہ اور عبادات

آپ کے لیے باب عمرہ کے پاس زین العابدین کی حویلی کرایے پر لی گئی تھی۔ رفیقوں کے ٹھہرنے کے لیے دوسرے مکانات کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ پہلے دن شیخ عبداللطیف مرزا پوری نے دعوت کی، جو سید صاحب سے پہلے مکہ معظمہ پہنچ گئے تھے، پھر لنگر جاری ہو گیا۔ شاہ اسماعیل نے جدہ سے چاول، آٹا اور دال وغیرہ چیزیں بھجوا دی تھیں۔ گوشت بازار سے لیتے تھے۔ رمضان میں دونوں وقت گوشت پکتا رہا۔ پھر سید صاحب نے حکم دے دیا کہ روزانہ دال پکا کرے اور آٹھویں دن ایک مرتبہ گوشت پکایا جائے۔

ساری نمازیں حرم میں ادا کرتے تھے۔ نماز تراویح میں چونکہ مختلف حفاظ اپنی اپنی جماعتیں قائم کر لیتے تھے، اس لیے سماع قرآن میں سکون و یکسوئی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ سید صاحب نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جب تک دوسری جماعتیں ہوں، سب بھائی آرام سے بیٹھے قرآن سنتے رہیں۔ جب دوسرے لوگ فارغ ہو جائیں، تو اپنی جماعت کھڑی ہو۔ سید محمد (ابن سید ابواللیث) روزانہ دو پارے قرآن سناتے تھے۔

نماز تراویح کے بعد سید صاحب ایک گدھے پر سوار ہو کر تنعیم چلے جاتے؛ جہاں سے حد حرم بہت قریب ہے۔ وہاں سے عمرہ کا احرام باندھ کر آتے اور طواف کرتے۔ رات زیادہ ہوتی تو سعی و قصر کے بعد احرام کھولتے، پھر سحری کھاتے۔ اگر وقت کم ہوتا تو پہلے سحری کھاتے، پھر سعی و قصر کرتے اور احرام کھولتے۔[1] نماز فجر کے بعد نماز اشراق تک طواف کرتے رہتے، پھر قیام گاہ پر آتے۔

۲۰- رمضان المبارک سے آپ حرم پاک میں معتکف ہو گئے۔ شوال کا چاند نکلنے پر اعتکاف سے باہر آئے۔ عید الفطر کے روز سید صاحب نے شیخ عمر بن عبدالرسول سے ملاقات کی۔ وہ اونچے پایے کے محدث اور بڑے تقویٰ شعار بزرگ تھے۔ سلطان ترکی نے ایک مرتبہ شتر بار دینار اس غرض سے بھیجے کہ میری طرف سے حج کریں۔ آپ نے یہ رقم واپس کر دی اور فرمایا کہ میں سلطان کی طرف سے نیابتہً

---

[1] عام روایتوں میں ہے کہ روزانہ عمرہ ادا کرتے تھے۔ "مخزن احمدی" میں ہے کہ صرف دوشنبہ اور جمعہ کو ادا کرتے تھے۔

حج کر چکا ہوں۔ سید صاحب نے پانچ ریال شیخ عمر کی خدمت میں پیش کیے۔

عید کے دن اکابر میں سے جن اصحاب نے سید صاحب کی بیعت کی، ان کے نام یہ ہیں: شیخ مصطفیٰ امام حنفیہ، خواجہ الماس ہندی اور دوسرے خواجہ سرا شیخ شمس الدین، شیخ حسن آفندی۔

مولانا اسماعیل کی والدہ

قافلے کے لوگ خدا کے فضل سے عموماً ہر آفت سے محفوظ رہے۔ صرف چند موتیں ہوئیں: ایک عنایت علی عظیم آبادی بیمار ہوئے اور سیلون کے قریب فوت ہو گئے۔ دوسرے عبدالغفار خاں بخاری نے وفات پائی۔ یہ دونوں جہاز فتح الکریم پر سوار تھے۔ سید صاحب کی انا جمن بوا دریا بقی پر سوار تھیں اور کلکتہ کے قریب ہی فوت ہوئیں مولانا شاہ اسماعیل کی والدہ حج کے لیے آئی تھیں، وہ مکہ معظمہ پہنچ کر سخت بیمار ہو گئیں اور زندگی کی امید باقی نہ رہی۔ شاہ صاحب کی دلی آرزو تھی کہ والدہ سید صاحب کی بیعت کر لیں، لیکن وہ فرماتیں کہ سید صاحب خود ہمارے خاندان کے مرید ہیں، میں ان کی بیعت نہیں کر سکتی۔ شاہ صاحب دعائیں کرتے رہتے تھے۔ ایک رات مرحومہ نے خواب دیکھا کہ آفتاب سوا نیزے پر آیا ہوا ہے، قیامت کی گرمی ہے، خلقِ خدا تشنگی سے بے تاب ہے۔ اور دور دور تک نہ سایہ ہے، نہ پانی۔ ایک جگہ سایہ نظر آیا بے شمار خلقت اس سایے میں شاداں و فرحاں تھی۔ پوچھا: یہ کون سا گروہ ہے؟ سید محمد علی جنھوں نے اس پورے واقعہ کو نظم کر دیا تھا، فرماتے ہیں:

گفت ایں جملہ گروہ احمدی است — سایۂ شاں ظلِّ فیضِ مہدی است
تو از ایشاں شو کہ تا ذی شاں شوی — دُور کن افکار تا از ایشاں شوی

ادائے حج

۸۔ ذی حجہ کو حسبِ سنت حج کے لیے روانہ ہوئے۔ تمام مشاعرِ حج پر طویل دعائیں کیں۔ منیٰ میں خیمہ وسط مسجد خیف میں نصب کیا۔ غارِ مرسلات اور مسجد کبش میں بھی گئے۔ بیعت عقبہ کے مقام پر رفیقوں نے تبرکاً تجدید بیعت کی۔ سب سے لمبی دعائیں وقوفِ عرفہ کے دن جبل رحمت کے دامن میں کیں۔ ایک دعا یہ تھی کہ قافلے میں سے کوئی شخص "حاجی" کے لقب سے ملقب نہ ہو، اس لیے کہ حج ایک اسلامی فرض ہے، اسے بجا لانے پر امتیازی لقب کیوں اختیار کیا جائے؟

---

[1] مولانا سید ابوالحسن علی فرماتے ہیں: شیخ شمس الدین شطا، احمد پاشا سلطان مصر کے نائب شیخ حسن آفندی (ص ۳۲۳) نیز علمائے مکہ میں سے شیخ عبداللہ سراج، سید محمد مغربی، حافظ بخاری مع قسطلانی، شیخ حمزہ محدث، شیخ احمد بن ادریس، محمد علی ہندی، ملا بخاری، امام شیخ صالح شافعی، حنفی مفتی اور واعظ شیخ علی سے برابر ملاقاتیں رہتی تھیں۔

اس مقام پاک اور یوم پاک کی برکات کے پیش نظر تمام رفقاء نے پھر بیعت کی۔ بعد غروب مزدلفہ میں آئے۔ کثرت ازدحام کے باعث قافلہ بکھر گیا۔ خود سیدہ زہرہ والدہ سائرہ بی بی کی سواری بھی الگ ہو گئی۔ چند رفیق ان کے ساتھ ساتھ رہے۔ رمی جمرات کے بعد قربانی کی۔ ایک سو سے زیادہ بکرے سید صاحب نے صرف اپنے لیے خریدے تھے۔ تین روز منٰی میں مقیم رہے۔ روزانہ قربانیاں کرتے اور بعد نماز عصر طواف کے لیے حرم پاک میں پہنچتے۔

مکہ معظمہ میں مشغولیتیں

غرۂ محرم سے آپ نے محمد سعید عرب کی حویلی کرایے پر لے لی تھی۔ سیکڑوں علماء، صلحا اور اشراف سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں سے ایک صاحب سید محمد نام مغرب اقصٰی کے تھے، جنھیں پوری صحیح بخاری مع شرح قسطلانی حفظ تھی۔ جاویوں اور بلغاریوں نے بھی بیعت کی۔

مولانا عبدالحی نے حرم پاک میں مشکوٰۃ کا اور شاہ اسماعیل نے حجۃ اللہ البالغہ کا درس شروع کر دیا[1] تھا۔ مولانا عبدالحی نے اس اثنا میں سید صاحب کی کتاب "صراطِ مستقیم" کا ترجمہ عربی میں کیا، جس کی نقلیں بعض اصحاب نے لے لیں[2]

۱۲۳۷ھ کے حج میں قاضی شوکانی بھی آئے تھے اور شہر سے باہر ٹھہرے تھے۔ مولانا عبدالحی اور مولانا منصور الرحمٰن (ابو عبداللہ بن شیخ عبداللہ بن نواب جمال الدین انصاری دہلوی) نے قاضی صاحب سے ملاقات کی تو انھوں نے "اتحاف" کا ایک ایک نسخہ دونوں کو "تحفۃً" دیا۔

سید صاحب کی شانِ للّٰہیت

مکہ معظمہ میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ جس سے سید صاحب کی شانِ للّٰہیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ میاں عبداللہ نومسلم دہلوی سید صاحب کے خاص خادموں میں تھے اور کنبے کے افراد کی طرح رہتے تھے۔ ان کا اور اہل و عیال کا پورا خرچ سید صاحب کے ذمے تھا۔ سید صاحب کے گھر میں بچی پیدا ہوئی[3] اہلیہ عبداللہ کی گود میں ایک لڑکا تھا۔ سید صاحب نے اہلیہ عبداللہ سے کہا کہ ہماری بچی کو بھی دودھ پلا دیا کرو۔ اس نے عرض کیا، میرا

---

[1] مولانا سید ابوالحسن علی ایک قلمی یادداشت کی بنا پر فرماتے ہیں کہ درس مدینہ منورہ سے واپسی پر شروع ہوا تھا واللہ اعلم

[2] مولانا سید ابوالحسن علی کے قول کے مطابق یہ ترجمہ شیخ حسن آفندی کی خاطر کیا گیا تھا۔ [3] منظورہ نسخہ ٹونک میں بہ تصریح مذکور ہے: ہم دراں ایام (قیام مکہ معظمہ) جناب ممدوح (سید صاحب) را از بطن مخدومہ مکرمہ حرمہ دخترے تولد شد۔ میرے قیاس کے مطابق یہ بچی سیدہ ولیہ کے بطن سے تھی اور غالباً سفر ہی میں فوت ہو گئی۔ اس کا ذکر کہیں نہیں آیا۔

دودھ اتنا کم ہے کہ خود میرے بچے کو بھی بمشکل کفالیت کرتا ہے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ہم دودھ بڑھانے کی دوائیں کھلائیں گے۔ اس نے پھر عرض کیا کہ میں ساری تدبیریں کر چکی ہوں، دودھ نہیں بڑھا۔ اگر بچی کو پلاؤں گی تو بچے کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ سید صاحب نے فرمایا کہ "فکر نہ کرو اور بچی کو دودھ پلا دیا کرو"۔

میاں دین محمد کہتے ہیں کہ میاں عبداللہ نے اپنی اہلیہ سے یہ بات سنی تو پریشانی کی حالت میں مجھ سے ذکر کیا۔ میں نے کہا کہ بزرگوں کا فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ یاد رکھو، حضرت کبھی پسند نہ کریں گے کہ ان کی بچی سیر ہو اور آپ کا بچہ بھوکا رہے۔

ایک دو روز کے بعد سید صاحب کو احساس ہوا کہ عبادت میں پہلے کی سی لذت و محویت باقی نہیں رہی۔ بڑے پریشان ہوئے۔ آخر یاد آگیا کہ اہلیہ عبداللہ کو بہ اصرار دودھ پلانے پر مجبور کیا۔ آپ نے فوراً چند مستورات کو ساتھ لیا اور اہلیہ عبداللہ کے پاس پہنچے۔ وہ گھبرا گئی۔ آپ نے فرمایا: گھبراؤ نہیں، ہم سے خطا ہوئی اور اب معافی مانگنے آئے ہیں۔ للہ معاف کر دو۔ وہ رونے لگی۔ عورتوں کے سمجھانے پر اس نے کہا: معاف کیا۔ تین بار یہ الفاظ دُہرا چکی تو سید صاحب نے اس کے لیے دعا کی اور اپنی اہلیہ سے کہا کہ ان کی دل جوئی میں کوتاہی نہ ہو۔

پھر آپ شیخ عبداللطیف کی قیامگاہ پر پہنچے، جہاں مولانا عبدالحی، شاہ اسماعیل، حکیم مغیث الدین اور دوسرے اصحاب موجود تھے۔ یہاں عبداللہ کو بلا کر پاس بٹھایا۔ اس کے بعد وعظ فرمایا، جس میں قادر ذوالجلال کی بے نیازی کا ذکر کرتے ہوئے بندوں کی مساوات پر زور دیا۔ آخر ماجرا سنایا اور کہا کہ مجھ سے خطا ہوئی۔ اہلیہ عبداللہ سے معافی لے چکا ہوں، اب آپ سب کے روبرو عبداللہ سے معافی مانگتا ہوں۔ عبداللہ کی زبان شدتِ گریہ سے بند ہو گئی۔ بولا تو یہ کہ میں فرماں بردار ہوں۔ سید صاحب نے فرمایا: آپ میرے بھائی ہیں۔ مجھ سے تقصیر ہوئی، للہ معاف کر دیں۔ اس نے کہا کہ اگر میرے کہنے ہی پر موقوف ہے تو میں نے جان و دل سے معاف کیا۔ اس پر سید صاحب نے میاں عبداللہ کے لیے بھی دعا کی۔

مدینہ منوّرہ کا سفر

اواخر محرم میں مدینہ منورہ کا قصد فرمایا[1]۔ ایک سو بیس اونٹ کرایے پر لیے۔ شغدف اور شبریاں خریدیں۔ تمام اسلحہ مکہ معظمہ میں چھوڑے۔ میدان طوئی

---

[1] بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ اسماعیل اس سفر میں ساتھ نہ جا سکے اور والدہ کی علالت کے باعث مکہ معظمہ میں قیام پر مجبور ہو گئے۔

میں دو روز قافلہ تیار ہوتا رہا۔ اس سفر کے سلسلے میں مندرجہ ذیل منازل کے نام آئے ہیں: وادی فاطمہ بماہ سرف جہاں ام المومنین حضرت میمونہؓ کا مزار تھا (۲) خلیص (۳) ایک بے آب جگہ (۴) دریائے شور کے پاس (۵) وادی صفرا (۶) وادی خیف (۷) ایک منزل جہاں کنوؤں کو خار بندی سے بند کر دیا گیا تھا (۸) ذوالحلیفہ۔ یہ کل آٹھ منزلیں ہوتی ہیں، لیکن جس راستے سے سید صاحب گئے، وہی تھا جسے ترکوں کے آخری زمانے میں "طریق سلطانی" کہتے تھے۔ اس راستے کی منزلیں کم از کم گیارہ تھیں۔ ظاہر ہے کہ بعض کے نام چھوٹ گئے۔ مثلاً وادی فاطمہ اور خلیص کے درمیان ایک مشہور منزل عسفان ہے۔ جس مقام کو ایک بے آب جگہ بتایا گیا ہے، وہ قضیمہ (عام لفظ قدیمہ) یا اس کے آس پاس ہونا چاہیے۔ دریائے شور کے پاس جو مقام بتایا گیا ہے۔ وہ یقیناً رابغ ہے۔ رابغ اور وادی صفرا کے درمیان بھی ایک منزل ہونی چاہیے۔ بعد کے زمانے میں اس کا نام مستورہ تھا۔ وادی صفرا مقام بدر سے ایک منزل جنوب میں ہے۔ ذوالحلیفہ وہی مقام ہے، جسے آج کل آبار علی کہتے ہیں اور یہ مدینہ منورہ سے صرف چھ میل ہے۔

اگرچہ راستہ خاصا خطرناک بتایا جاتا تھا لیکن سید صاحب نے ہتھیار مکہ معظمہ ہی میں چھوڑ دیے تھے[1] اعلان کر دیا تھا کہ ہم ہر تکلیف کو جھیلیں گے اور کسی کے خلاف ہاتھ نہ اٹھائیں گے۔ ایک مقام پر رہزن حملے کے لیے آ گئے۔ سید صاحب نے تمام توانا آدمیوں کو چن کر چار جماعتوں میں بانٹا اور انھیں کو دائیں بائیں، آگے پیچھے کھڑا کر دیا۔ بیچ میں عورتوں، بچوں اور ضعیفوں کو رکھا۔ اس اثنا میں شتربانوں کے سردار نے بات چیت سے رہزنوں کو واپس کر دیا۔ یہ واقعہ ذوالحلیفہ سے پیشتر کی منزل میں پیش آیا[2]

---

[1] "مخزن احمدی" میں ہے کہ عرب میں مشہور ہو چکا تھا، ہندوستان سے ایک سید ساڑھے سات سو کا قافلہ لے کر حج کے لیے آیا ہے اور سب کا خرچ خوراک و پوشاک اس نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ اس کے پاس بہت مال ہے، اس لیے لٹیرے بدوؤں کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ سید صاحب نے یہ جانتے ہوئے فرمایا کہ ہم کوئی سامانِ مدافعت نہ لیں گے۔

[2] "مخزن احمدی" میں ایک اور واقعہ بھی مرقوم ہے کہ جحفہ میں شتربانوں اور اہل قافلہ کے درمیان اتفاقیہ جھگڑا اٹھا! یہاں تک کہ بعض آدمیوں نے ایک دوسرے کے ستے بھی مارے اور باہم گتھم گتھا بھی ہوئے۔ شتربانوں نے قافلے سے الگ ہو کر سنگ باری شروع کر دی۔ عورتیں اور بچے رونے لگے۔ سید صاحب کو یہ حالات معلوم ہوئے تو حزب البحر کا کچھ حصہ پڑھ کر دعا کی اور شتربانوں کے سردار کو بلا کر ہیبت انگیز انداز میں فرمایا کہ سنگ باری بند کراؤ۔ پھر سید صاحب اور شتربانوں کے سردار نے دونوں فریقوں کے زخمیوں سے مصافحہ کرا کے انھیں ٹھنڈا کیا

وادی صفرا میں ایک بدو پستول بیچنے کے لیے آیا۔ سید عبدالرحمن نے کہا کہ ایسے پستولوں کی جوڑی ہو تو خرید لوں۔ بدو دوسرا بھی لے آیا۔ دس ریال میں سودا ہوا۔ مکہ معظمہ واپس آئے تو معلوم ہوا کہ یہ پستول احمد پاشا حاکم حجاز کے ہاں سے چرائے گئے تھے۔ سید صاحب نے پستول حاکم کے حوالے کر دیے۔ اس نے معاوضے میں اسلحہ خانے سے عمدہ پستولوں کی ایک جوڑی بھیج دی۔ وادی صفرا میں حضرت ابو عبیدہؓ بن الحارث بن عبد المطلب کی قبر کی زیارت کی، جہاں سے پانچ میل پر بدر تھا۔ چونکہ شتربانوں میں سے اکثر بدر و صفرا کے باشندے تھے، انھوں نے ایک دن قیام کی درخواست کی اور سید صاحب نے یہ منظور فرمالی۔

مدینہ منورہ میں ایک مہینا

سید صاحب راستے میں سخت بیمار ہو گئے۔ بعض اوقات بیہوش ہو جاتے تھے۔ مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے تندرست ہو گئے۔ ذوالحلیفہ سے چل کر آدھی رات کو مدینہ منورہ میں پہنچے اور مناخہ میں اُترے۔ پھر غسل کیا اور لباس بدلا۔ شہر کا دروازہ کھلا تو اندر گئے۔ باب السلام سے حرم پاک میں داخل ہوئے۔ شافعی امام کے پیچھے نماز صبح پڑھی۔ اشراق تک اوراد و وظائف میں مشغول رہے۔ بعد اشراق روضہ منورہ کی زیارت کی۔

قیام کے لیے سید سمہودی کا مکان لے لیا تھا۔ جو حرم پاک کے پاس، باب جبریل سے بالکل متصل تھا۔ اسی مکان میں حضرت عثمانؓ شہید ہوئے تھے اور یہی مکان بعد میں شیخ الحرم کے لیے مخصوص ہو گیا تھا۔ سید صاحب نے آہستہ آہستہ حرم مدینہ کے تمام آثر کی زیارت کی، مثلاً جنت البقیع، سیدنا حمزہ، جبل احد، مسجد قبلتین، مسجد قبا، بئر خاتم وغیرہ[1]

(اس زمانے میں ارباب حکومت نجدیوں سے بے حد بگڑے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ جنگ کو ختم ہوئے چند ہی سال گزرے تھے۔ اگر کوئی شخص مصلحانہ عقائد کی اشاعت میں ذرا سرگرم معلوم ہوتا اور بدعات و محدثات کے رد میں سختی سے کام لیتا تو اسے "وہابی" سمجھ کر مواخذے کا تختہ مشق بنا لیا جاتا تھا۔ سید صاحب کے ساتھیوں میں مولوی عبدالحق نیوتنوی بہت تیز مزاج تھے۔ وہ بعض مروجہ غیر شرعی مراسم کے رد و ابطال میں ذرا تیزی سے کام لیتے تھے۔ جھٹ شکایت ہوئی کہ یہ "وہابی" ہیں۔ چنانچہ ان پر مقدمہ قائم ہو گیا۔ مولانا عبدالحی نے ضمانت دے کر انھیں چھڑایا اور مقدمے کی جواب دہی کے موقع پر بھی مولانا ہی

---

[1] ان کے علاوہ بھی مدینہ منورہ میں کئی آثار بتائے جاتے ہیں۔ یقین ہے کہ سید صاحب ان تمام مقامات پر پہنچے ہوں۔

نے عدالت سے بات چیت کی۔ اس طرح مولوی عبدالحق رہا ہو گئے۔ مکہ معظمہ تک سید صاحب کے ساتھ رہے۔ پھر صنعا چلے گئے اور قاضی شوکانی سے حدیث کی سند لے کر ہندوستان آئے۔)

بیت المقدس جانے کا ارادہ بھی ہو گیا تھا۔ لیکن ہمراہیوں کا اضطراب دیکھ کر یہ ارادہ ترک کر دیا، اس لیے کہ سب کو ساتھ لے جانا مشکل تھا اور کسی کو پیچھے چھوڑنا بھی گوارا نہ تھا۔ مدینہ منوّرہ میں سردی تیز ہو گئی۔ شیخ عبداللطیف نے کمل خرید کر سید صاحب کے ہمراہیوں کو چغے سلوا دیے۔

مراجعت

اواخر محرم میں مکہ معظمہ سے روانہ ہوئے تھے۔ دس گیارہ دن سفر میں لگے۔ ایک مہینا مدینہ منورہ میں گزار کر ۹ - ربیع الاول ۱۲۳۸ھ کو واپس ہوئے[2]۔ سید زین العابدین (ابن سید احمد علی) بہت بیمار ہو گئے تھے۔ سید عبدالرحمن کو ان کی خبر گیری کے لیے چھوڑ دیا۔ ایک رات ذو الحلیفہ میں گزاری، جہاں سے عمرے کا احرام باندھا۔ اس کے بعد صرف خلیص اور وادی فاطمہ کی منزلوں کا ذکر آتا ہے۔

ہمراہیوں میں سے جن جن کے لیے جہازوں پر جگہیں نکلتی آئیں، انھیں ہندوستان بھیجتے گئے خود پہلے کی طرح حرم پاک میں مشغول عبادت ہو گئے۔

فرماتے ہیں: ایک مرتبہ طواف میں خیال آیا کہ اہل و عیال ساتھ ہیں، اب ہندوستان کیوں واپس جاؤں، جو دارالحرب ہے؟ بہتر ہے حرم پاک ہی میں بیٹھا رہوں۔ لیکن غیب سے اشارہ ہوا کہ تم یہاں بیٹھے رہو گے تو ہم اپنا کام کسی دوسرے سے لیں گے۔ اس پر واپسی کا ارادہ پختہ ہو گیا۔

رمضان شریف حرم ہی میں گزارا۔ ۱۵ - شوال (۲۵ - جون ۱۸۲۳ء) کو مکہ معظمہ سے چلے۔ اس وقت تک صرف اتنے ساتھی رہ گئے تھے، جن کے لیے چار جہاز کرایے پہ لینے پڑے۔ "دریا بقی"۔ "ملک البحر"۔ "عطیۃ الرحمن" اور "تاج"۔ پندرہ روپے فی کس کرایہ ٹھہرا۔ "ملک البحر" کی رفتار سب سے

---

[1] سید عبدالرحمن نے ارادہ کر لیا تھا اور سید صاحب بھی جانے کے خواہاں تھے۔ معیت کے لیے چالیس آدمی بھی چن لیے گئے، لیکن اخوند محمد عظیم نے یہ کہہ کر روک دیا کہ ہم سب تباہ ہو جائیں گے۔

[2] نواب وزیر الدولہ نے "وصایا" میں لکھا ہے کہ سید صاحب مدینہ پہنچے تھے تو حرم کے پاس روضۂ مقدسہ کے سامنے قیام کیا تھا۔ جس روز پہنچے تھے اسی روز رات کو سخت بخار آیا۔ بیدار ہو گئے۔ اپنے مسکن کی کھڑکی میں روضۂ مقدسہ کے سامنے بیٹھ گئے۔ اسی حالت میں زیارت سے مشرف ہوئے اور عرض کیا: حضورؐ کے اُمتیوں میں سے شیخ غلام علی (الہ آبادی) نے ایک قرآن مجید بھیجا تھا کہ روضے پر تلاوت و قرأت میں رہے۔ یہاں میں نے دیکھا کہ بہت سے قرآن موجود ہیں اور کوئی نہیں پڑھتا۔ حضور اجازت مرحمت فرمائیں تو یہ نسخہ حرم پاک کے خدام میں سے التماس کرنے والے کو دے دوں، جو اسے باقاعدہ پڑھتا رہے گا۔ یہ اجازت مل گئی (حصہ اول صفحہ ۲۹-۳۰)

کم تھی۔ سید صاحب نے اسی کو اپنے لیے منتخب کیا۔ ذی قعدہ کے آغاز میں جدّہ سے روانہ ہوئے۔ مخا میں پھر ایک مہینا ٹھہرنا پڑا۔ قربانی کے جانور مخا ہی سے خرید لیے تھے اور عید اضحیٰ جہاز ہی میں ہوئی۔ مخا سے چلے تو بارھویں روز ۲۰۔ ذی حجہ (۱۶۔ اگست ۱۸۲۳ء) کو بمبئی پہنچ گئے۔ مولوی انس صاحب نے استقبال کیا۔ انھیں کی مسجد میں ٹھہرے جو محلہ میمن واڑہ میں تھی۔ اٹھارہ دن قیام رہا۔ روزانہ پُرتکلف دعوتیں ہوتی تھیں۔ پلاؤ میں گھی بہت ڈالتے تھے۔ یہ وقت بھی کلکتہ کی طرح ہدایت و ارشاد میں بسر ہوا۔ بمبئی سے چار آدمی ساتھ ہو گئے جن میں سے ایک مولوی انس کے صاحبزادے تھے۔ وہاں سے چلے اور ساتویں دن الپی وارد ہوئے۔ غرض ۶۔ صفر ۱۲۳۹ھ (۱۲۔ اکتوبر ۱۸۲۳ء) کو کلکتہ پہنچ گئے۔

کلکتہ سے مونگیر

شیخ غلام حسین فخر التجار فوت ہو چکا تھا۔ اس کا فرزند جو حج میں سید صاحب کے ساتھ تھا اور غالباً آپ سے پہلے کلکتہ پہنچ گیا تھا، پنیس پر سوار کر کے لے گیا اور اپنے باغ میں ٹھہرایا۔ لوگ پہلے کی طرح پھر کثرت سے زیارت کے لیے آنے لگے۔ اس مرتبہ بھی کلکتہ میں غالباً خاصی دیر قیام رہا۔ امتدادِ قیام کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ آپ کے ساتھیوں کا جہاز "عطیۃ الرحمٰن" راستہ بھول گیا تھا۔ ایک مہینے تک اس کی کچھ خبر نہ ملی۔ اس اثنا میں سید صاحب دعائیں کرتے اور قنوت پڑھتے رہے۔ جب جہاز کی سلامتی کی خبر پہنچی تو سب کو بڑی خوشی ہوئی۔

کلکتہ سے واپسی کی منزلوں کے مفصّل حالات معلوم نہیں، جو کچھ معلوم ہوا وہ ذیل میں درج ہے:

مرشد آباد کے دیوان غلام مرتضیٰ نے قافلے کو روک لیا اور اصرار کیا کہ میرے وطن (کھنہ) چلیے۔ جس بنگلے میں آپ کو ٹھہرانا منظور تھا اس کی محض درستی اور آرائش پر پانچ ہزار صرف کیے۔ اس کے باہر بڑا بازار لگوایا اور منادی کرا دی کہ سید صاحب کے ہمراہی جو کچھ خریدیں، اس کی قیمت کا حساب رکھا جائے، میں خود پوری رقم ادا کر دوں گا۔ روانگی کے وقت جو تحائف پیش کیے، اُن کے بارے میں علم نہیں۔ صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ ان تحائف میں سات عمدہ طمنچے اور سات دیدبانوں کی ایک نادر رومی بندوق تھی، جو آپ سے یار محمد خاں عمانی نے مانگ لی تھی۔ پورنیا کی رانی نے بھی طلب کیا تھا، لیکن آپ جا نہ سکے۔

مرشد آباد سے چلے تو منشی محمدی انصاری کے وطن بھی گئے۔ منشی صاحب کو گھر ٹھہرنے کا حکم دیا۔ انھوں نے نکاح کیا۔ ایک بچہ پیدا ہوا، جس کا نام محمد یحییٰ رکھا۔ جب معلوم ہوا کہ سید صاحب ہجرت کے لیے تیار ہو گئے ہیں تو سب کچھ چھوڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ پھر جیتے جی ساتھ نہ چھوڑا۔ مونگیر میں نماز جمعہ ادا کی۔ یہ مقام اسلحہ سازی کے لیے مشہور تھا۔ سید صاحب نے بندوقیں اور طمنچے خریدے

عظیم آباد سے الہ آباد

مونگیر سے چلے تو عظیم آباد میں ٹھہرے جہاں سے مولانا ولایت علی، شاہ محمد حسین اور سید کرامت اللہ پیشوائی کے لیے قصبہ باڑھ تک پہنچے ہوئے تھے۔ دس روز وہاں مقام ہوا۔ پھر آپ پھلواری تشریف لے گئے۔[1] عظیم آباد سے چلے تو مولانا ولایت علی اور ان کے بھائی مولوی طالب علی، شاہ محمد حسین، محمد حیات اور سید کرامت اللہ سامان لے کر ساتھ ہو گئے۔ آپ ڈھکیا، داناپور، بھوج پور، بلسار، چھپرا، بکسر ہوتے ہوئے محمود آباد پہنچے۔ پھر یوسف پور جا کر شیخ فرزند علی غازی پوری کو دیکھا، جو بیمار تھے۔ چھ روز وہاں قیام کیا۔ اس اثنا میں جامع مسجد نئے سرے سے آباد ہو گئی۔ داناپور میں شیخ علی جان کے مکان پر ایک شخص بہ ارادۂ قتل آیا تھا، لیکن سامنے آتے ہی سب کچھ بھول گیا اور پاؤں پر گر کر معافی مانگ لی۔

بنارس چند فرلانگ رہ گیا تو تیموری شہزادے استقبال کے لیے پہنچ گئے۔ یہاں ایک مقام پایاب تھا۔ لیکن پانی کا بہاؤ وہاں بہت تیز تھا۔ ہمراہیوں میں سے ایک صاحب وہاں اُتر پڑے، پاؤں نہ جما سکے اور بہ نکلے۔ مختلف لوگ انھیں بچانے کے لیے دوڑے، ان میں سید صاحب بھی تھے۔ سب کے پاؤں اکھڑ گئے صرف سید صاحب اپنی جگہ پر مضبوطی سے کھڑے رہے۔ اس اثنا میں سید عبدالرحمٰن کشتی لے کر پہنچ گئے اور سب کو اس میں سوار کرا کے کنارے لائے۔

بنارس میں اس مرتبہ صرف چند دن قیام رہا۔ مرزا پور میں شیخ عبداللطیف اور دوسرے لوگوں نے دعوتیں کیں۔ وہیں شیخ غلام علی کے فرزند پیشوائی کے لیے پہنچے ہوئے تھے اور شیخ صاحب کے حکم کے مطابق اسی مقام سے پورے قافلے کا خرچ انھوں نے اپنے ذمے لے لیا۔

مرزا پور سے آپ نے تکیے کی مسجد کے راستے اور گھاٹ کے لیے پتھر خریدے۔ نیز غریب ہمسایوں کے لیے بہت سی چکیاں تحفے کے طور پر لے لیں۔ الہ آباد تک قافلے کی ہر ضرورت شیخ غلام علی نے پوری کی۔ ان کے اجارے کے گاؤں دریا کے کنارے کنارے تھے۔ ہر گاؤں سے دال، چاول، گھی، مسالہ اور دوسری چیزیں دریا پر پہنچ جاتی تھیں۔ الہ آباد میں کئی روز مقام رہا۔ اس مرتبہ بھی شیخ صاحب کے ہاں پر تکلف کھانوں کی وہی بہتات تھی، جس کا نقشہ ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔ مرزا پور یا الہ آباد میں سید صاحب نے ایک روز نہایت موثر وعظ فرمایا، جس میں کہا: حج و عمرہ اور زیارت حرمین کی سعادت

---

[1] سیرت سید احمد شہید میں پھلواری کے متعلق وہ حالات بہ سلسلہ مراجعت درج ہوئے ہیں، جنھیں میں پہلے درج کر چکا ہوں۔

نصیب ہوئی۔ اب صرف یہ تمنا ہے کہ جان و مال جہاد فی سبیل اللہ میں صرف کر دوں۔ حاضرین بھی زار زار رو رہے تھے اور خود سید صاحب کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

الہ آباد سے رائے بریلی

الہ آباد سے آپ نے زنانہ سواریوں، بچوں اور ضعیفوں کو کشتیوں میں بٹھا کر دریا کے راستے وطن بھیج دیا۔ خود گھوڑے پر سوار ہو کر رائے بریلی کا راستہ لیا۔ چنانچہ آپ شیخ غلام علی کے وطن مہرونڈا میں ایک رات ٹھہرے۔ ایک منزل اہلاد گنج میں کی۔ مصطفیٰ آباد وغیرہ سے بھی گزرے۔ اس سفر میں طالب علی عظیم آبادی نے گھوڑے کی رکاب تھام رکھی تھی۔ سوءِ اتفاق سے ان کے پاؤں میں لیموں یا کھٹے کا کانٹا چبھ گیا۔ ایک رفیق نے اپنی سواری کا گھوڑا ان کی خدمت میں پیش کیا تاکہ آرام سے منزل کٹ جائے، لیکن وہ بولے کہ کوئی صاحب تختِ رواں بھی دیں تو قبول نہ کروں گا:

بہ راہِ عشق گر در پا خلد خار نباید از رہش پرہیز کردن

کہ از خارش بسے گلہا شگوفد قدم بر خار باید تیز کردن

۷

۲۹۔ شعبان ۱۲۳۹ھ (۲۹۔ اپریل ۱۸۲۴ء) کو سید صاحب وطن پہنچے۔ گویا اس سفر میں دو سال اور دس مہینے صرف ہوئے۔ سید ابو الحسن علی لکھتے ہیں کہ اعزا اور اہل خاندان استقبال کے لیے موجود تھے:

> اکثر عزیزوں نے اہل قافلہ میں سے بہت سے لوگوں کو اس لیے نہ پہچانا کہ چہروں پر تازگی تھی، لباس عمدہ تھا۔ یہاں سے گئے تھے تو بالکل بے سرو سامانی کی حالت میں[1]

زنانہ سواریوں کے لیے وطن سے بہلیاں، میانے اور ڈولیاں بھیج دی گئیں۔ پورے سفرِ حج میں ستر اسی ہزار روپے سے کم رقم صرف نہ ہوئی ہو گی۔ بلکہ مختلف چیزوں کی خرید اور مساکین کی امداد کی رقمیں شامل کی جائیں تو پوری رقم شاید ایک لاکھ تک پہنچ جائے۔ واپس آئے تو مہمانوں کی بہت بڑی جماعت ساتھ تھی۔ عام زائرین کا بھی تانتا بندھا رہتا تھا۔ سید صاحب سب کو کھانا کھلاتے تھے کچھ مدت بعد بیت المال کا جائزہ لیا تو دس ہزار روپے موجود تھے۔

---

[1] سیرت سید احمد شہید طبع سوم صفحہ ۲۸۵

قصیدہ

سید صاحب حج سے واپس آئے تو مولانا سید ابوالحسن نے ایک لمبا قصیدہ[1] آپ کی آپ کی خدمت میں پیش کیا، جس کے اکثر اشعار تواریخ عجیبہ میں نقل ہوئے۔ یہ سید صاحب کے خلفا میں سے تھے اور میوات میں رہتے تھے۔ ذیل میں اس کے منتخب اشعار درج کیے جاتے ہیں:

تشبیب

رہے ہے اس نُور سے پُر گنبد چرخِ اخضر — جس کے لمعان سے ہے کُند فرشتوں کی نظر
نہ اسے روشنیِ شمس و قمر سے نسبت — نہ ملے برق اسے اور نہ کوئی اختر
جلوۂ طور کہوں یا کہ شبِ قدر کا نُور — یا ترقی پہ ہُوئی روشنیِ تازہ سحر

. . . .

کیا عجب ہے کہ اگر ہند کے نظّارے کو — حورِ جنّت سے چلی آئے نکل کر باہر

. . . .

گریز

تھا تردّد سے میں تفتیشِ سبب کے درپے — کس کے انوار سے یارب ہے زمیں رشکِ قمر
یک بیک غیب سے آئی یہ ندائے ہاتف — گوش سے پنبۂ غفلت کو ذرا باہر کر
اب تلک پہنچا نہیں مژدۂ جاں بخش تجھے؟ — جس سے شاداں ہیں ملک، خوش ہے ہر اک جنّ و بشر
آیا ہے قافلہ حج کرکے وہ اس ملک کے بیچ — جس میں ہر اک ہے ولی، عارف نیکو منظر

سید صاحب کے ساتھی

ان کے انوار سے روشن ہے زمیں تا بہ فلک — ان کی ہمّت سے ہُوئی دین کو سو زینت و فر
ہے ہر اک شخص وہاں آمرِ امرِ معروف — قامعِ بدعت و ناہیِ اصولِ منکر!
ماحیِ کفر زِ دل، قاتلِ کفار زِ جاں — قاطعِ رسمِ زبوں، تابعِ حُکمِ داور
ان میں ہر اک ہے فرید اور وحیدِ آواں — حافظ و عالم و عادل، سخی و نیک نظر
ظاہر آراستہ بر ملّتِ بیضائے نبیؐ! — باطن اس طور کا پاکیزہ ہو جیسا گوھر
کدو کاوش نہ کسی میں نہ ریا و کینہ — نہ حسد دل میں، تکبّر نہ کسی کے اندر

---

[1] تواریخ عجیبہ میں اس کے کچھ اشعار چھوڑ دیے گئے تھے۔ مجھے پورا قصیدہ جناب محمد سلیم صاحب پرنسپل شاہ ولی اللہ کالج منصورہ) کی مہربانی سے مل گیا۔

سیّدِ صاحب

کیا کروں قافلہ سالار کا اس کے میں بیاں
جس کے اوصاف ہیں تحریر و بیاں سے باہر
عادل و عالم و عابد، شہِ والا ہمت
اشجع و افصح و ابلغ ، سخی و نیک نظر
عاقل و فاضل و راحم، زکی و عالی طبع
زاہد و متقی و صابر و زیبا منظر
ترک و تجرید و توکل میں فریدِ دوراں
حلم اور خُلق و دیانت میں وحیدِ اکبر
معدنِ لطف و حیا، مجمعِ جود و ہمت
مخزنِ عفّت و الفت، شرفِ نوعِ بشر
بحرِ جُود و کرم و گلشنِ عرفانِ نبیؐ
مشعلِ راہِ طریقت بہ حقیقت رہبر
صدق میں ثانیِ اثنینؓ کی مانند قوی!
جد اور جہد میں اسلام کے ثانیِ عمرؓ
شرم میں حضرت عثمانؓ سا جوں بحرِ حیا
اور صفِ جنگ میں ہم طرزِ علیؓ صفدر
سیدِ صفدر و عالی نسب و زینتِ دیں
زیبِ اسلام و امامِ حق و عاجز پرور
سید احمد و عالی حسب و فخرِ زماں
رہبرِ راہِ شریعت خلفِ پیغمبرؐ
جس طرف دیکھیے تعمیر مساجد ہی گئی
ہے ہر اک شخص کی تحقیقِ مسائل پہ نظر

کارِ اصلاح

آتی ہر سمت سے ہے بانگِ موذن کی صدا
جس کو سُنیے یہی کہتا ہے کہ اللّٰہ اکبر
اس قدر عصر میں تیرے ہوئی افراطِ نماز
لاکھوں تیار ہوئے ملک میں چھوٹے منبر
قطعِ بدعات ہوئی فیض سے تیرے ایسی
ہند سے رسمیں بُری اُٹھ گئیں ساری یکسر
دیکھیے جس کو سو کرتا ہے کلام اللّٰہ یاد
باندھی ہر شخص نے تہذیبِ ہدایت پہ کمر

مولوی عبدالحی اور شاہ اسماعیل

رکنِ دین مولوی عبد الحی و شہ اسماعیل
فیض سے تیرے ہوئے کاملوں کے سر دفتر
تیری صحبت نے ملائک کی کری خاصیت
گو کہ ظاہر میں نظر آتے ہیں ہم شکلِ بشر

سیدِ صاحب

حق میں کفار کے ضیغم کی طرح ہے خونخوار
مومنوں کے لیے شفقت میں پدر سے بہتر
فخرِ ابنائے زماں، قبلۂ اربابِ صفا
کعبۂ اہلِ یقیں دادرسِ ہر مُضطر
ذات سے تیری یتیموں کو بہت تقویت
زنِ بیوہ کے تو حق میں ہے سحابِ مطر
تھا غضب ظلم کہ بیوہ نہ کرے عقدِ نکاح
کھوئی یہ رسمِ زبوں رحمتِ حق ہو تجھ پہ
جس میں راضی ہو خدا ہے وہی ان کو منظور
آبرو کا نہ انھیں خوف نہ کچھ جی کا ڈر

اکیسواں باب

جہاد کے لیے دعوت و تنظیم

دعوتِ عام حرمین شریفین سے مراجعت کے بعد سید صاحب ہمہ تن جہاد کے سر و سامان میں مشغول ہو گئے، جس کے لیے وہ اپنی حیات گراں مایہ وقف فرما چکے تھے۔ اس دَور کی مشغولیتوں کا کوئی مرقع مجھے نہیں مل سکا۔ لیکن یقین ہے کہ ان کے داعی شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ دَورے کرتے رہے ہوں گے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جو غازی ان کی دعوت پر لبیک کہتے ہُوئے سرفروشانہ میدان عمل میں آئے، وہ سیکڑوں مختلف مقامات کے باشندے تھے۔ پھر سید صاحب سرحد چلے گئے تو اس کے بعد بھی جگہ جگہ سے لوگ تیار ہو ہو کر پہنچتے رہے، روپیہ بھی فراہم ہوتا رہا۔ یہ سب کچھ وسیع ترتیبات کے بغیر کیوں کر عمل میں آ سکتا تھا؟

داعیوں کے سرخیل مولانا شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی تھے۔ یقین ہے کہ وہ اصلاح عقائد و اعمال کے لیے وعظ بھی کہتے ہوں گے اور یہ اندازہ بھی کرتے ہوں گے کہ کون کون سی سعید ہستیاں عزم و ہمت سے دین حق کے لیے جان بازی کی بھی تڑپ رکھتی ہیں۔ سیر و گشت کا حال صرف اس واقعے سے منکشف ہو سکتا ہے کہ شاہ اسماعیل کی کتاب "تقویت الایمان" پر کچھ اعتراضات سید عبداللہ بغدادی نے بھی کیے تھے۔ یہ اعتراضات شاہ صاحب تک پہنچے تو انھوں نے سنہ ۱۲۴۰ھ میں ایک جوابی خط بغدادی صاحب کو بھیجا۔ اس وقت شاہ صاحب کان پور میں تھے[1]۔

جہاد کا مفہوم "جہاد" جہد سے ہے جس کے معنی ہیں محنت، مشقت، تعب اور کسی کام کے لیے

---

[1] ملاحظہ ہو مجموعہ تقویت الایمان و تذکیر الاخوان مطبوعہ مطبع احمدی لاہور صفحہ ۱۶۷۔ اس مجموعے میں شاہ صاحب کا عربی مکتوب بھی بنام سید عبداللہ بغدادی موجود ہے جس کے آخری الفاظ یہ ہیں: تم ھذا المکتوب حین کنت نزیلاً فی الکانفور سنۃ الف و مائتین و اربعین، شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی کے دوروں میں صرف تھوڑے دنوں کے لیے توقف ہوا۔ اس لیے کہ ۷۔ شوال سنہ ۱۲۳۶ھ (۵ جون سنہ ۱۸۲۱ء) کو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے وفات پائی اور دونوں صاحبوں کو بہ سلسلۂ تعزیت دہلی میں ٹھہرنا پڑا۔

سخت تکلیف برداشت کر لینے پر ہمہ تن آمادگی۔ اصطلاح شریعت میں جہاد کی تعریف یہ ہے :

استفراغ الوسع فی مدافعة العدو ظاهراً و باطناً۔

دشمن کے حملے کی روک تھام کے لیے اپنی پوری قوت وطاقت کے ساتھ ظاہراً و باطناً بے دریغ سعی کرنا۔

"ظاہراً" یہ کہ دشمن لشکر لے کر چڑھ آئے تو شمشیر بکف ہو کر اس کی مدافعت میں لگ جانا اور اس وقت تک اطمینان کا سانس نہ لینا، جب تک ہر خطرہ اور ہر خرخشہ بالکل محو نہ ہو جائے۔ اس کار حق میں جان بھی دینی پڑے تو اس کے لیے بے پروایانہ تیار رہو جانا۔ باطل کو مٹانے اور حق کو سربلند کرنے میں شب و روز لگے رہنا۔ "باطناً" یہ کہ اپنے نفس کو تمام ابلیسی قوتوں کی فسوں سازیوں اور معصیت و عدوان کی زیاں کاریوں سے بچائے رکھنا۔

اس سے ظاہر ہے کہ راہ حق میں فرد یا جماعت کی طرف سے جو سعی ہوتی ہے، سچائی کی سربلندی کے لیے جو قربانیاں کی جاتی ہیں، صداقت کی خاطر جو صعوبتیں اور اذیتیں صابرانہ برداشت کر لی جاتی ہیں، وہ سب جہاد ہیں۔ ظلمت زار باطل میں جن سرفروشوں نے حق کے نعرے لگائے، قیدیں کاٹیں، جائدادیں ضبط کرائیں، گولیاں کھائیں، پھانسیاں پائیں، گھر بار ترک کیے، عزیزوں اور قریبیوں سے دائمی مفارقت گوارا کی، وہ سب مجاہد تھے۔

سید صاحب کا اختصاص

سید صاحب بدو شعور سے زندگی کے آخری لمحے تک "جہاد فی سبیل اللہ" کے لیے وقف رہے۔ ان کی زبان برابر دین حق کی سربلندی کے لیے متحرک رہی۔ وہ جہاں پہنچے یہی آرزو لے کر پہنچے کہ اسلام صحیح شکل میں پوری عظمت و شان سے جلوہ گر ہو، انھوں نے لاکھوں گمراہوں کو طریق شریعت کے پابند بنایا اور ان کے سینوں میں عشق حق کے چراغ روشن کیے۔ بعض ارکان اسلام میں گوناگوں اوہام و وساوس کی بنا پر جو رخنے پیدا کر دیے گئے تھے، انھیں عزم و ہمت سے بند کیا۔ پھر بلاد اسلام کو اغیار کی دستبرد سے بچانے کے لیے وطن چھوڑا۔ عزیزوں سے دُوری گوارا کی۔ راحت و آسایش کی زندگی کو ٹھکرا کر غربت کی مصیبتیں خوشی خوشی قبول کر لیں۔ زہرہ گداز صعوبتوں اور مشقتوں کے پہاڑ اس بے تکلفی سے اٹھا لیے گویا مقصود حیات یہی تھا۔ آخر اسی راہ میں جان عزیز قربان کر دی۔

وہ ہر مسلمان کے سینے میں دین حق کے لیے ایثار و قربانی کی یہی روح پیدا کر دینا چاہتے تھے۔ ہر کلمہ گو کو حقیقی معنی میں مجاہد فی سبیل اللہ بنا دینے کے آرزومند تھے۔ ان کی آغوش تربیت میں جو جماعت تیار ہوئی اس کی ممتاز ترین خصوصیت یہی تھی کہ ایک ایک فرد زندگی کی ہر شے کو قربان کر دینا اپنی سب سے

بڑی سعادت سمجھتا تھا۔ اور جب کوئی غازی شہادت پاتا تھا تو سب کہتے تھے کہ وہ مراد کو پہنچ گیا۔ اس سرزمین کی پوری اسلامی تاریخ میں شیفتگی حق کی ایسی مثال شاید ہی مل سکے۔ سید صاحب اس باب میں بالکل یگانہ نظر آتے ہیں۔ واللہ یختص برحمتہٖ من یشآء۔

مسلمانوں کی حالت

سید صاحب کی پیدائش سے پہلے ہی اس سرزمین میں مسلمانوں کی سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ مغل حکومت کے کھنڈروں پر جن مسلمانوں نے نئی فرمانروائیوں کی بنیادیں رکھی تھیں، وہ بھی یا تو مٹ چکی تھیں یا ضعف و اضمحلال کے آخری درجے پر پہنچ چکی تھیں۔ غیر مسلموں کے اقتدار کا سیل ہر سمت سے بڑھا چلا آ رہا تھا اور مسلمانوں کی کوئی سلطنت ایسی نہ تھی، جس کی رُوحِ حیات میں بالیدگی کی کوئی جھلک نمایاں ہوتی۔ مسلمان دینِ حق کے صراطِ مستقیم سے بہت دُور جا پڑے تھے۔ عقائد و اعمال کی تمام خرابیاں ان پر مسلط تھیں۔ اُمراء و رُوسا کے پیشِ نظر اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ان کی کامرانیوں اور عیش پسندیوں کے لیے ضروری وسائل فراہم ہوتے جائیں۔ ان مشاغل کے انجام سے وہ بالکل بے پروا تھے۔ عوام میں سے بیشتر کی حالت ایسی تھی، گویا بجلی گری اور وہ ہوش و حواس کھو بیٹھے یا خوفناک زلزلہ آیا اور وہ دہشت کے مارے بُت بن کر رہ گئے۔ جنھیں کچھ احساس تھا اُنھیں تدارک کی کوئی تدبیر نہیں سوجھتی تھی۔ مستقبل کی تاریکی کو تقدیر کا اٹل فیصلہ مان کر اس انتظار میں معطل بیٹھ گئے تھے کہ جو کچھ ہونے والا ہے، وہ اپنے وقت پر ہو کر رہے گا۔ جب سفینہ بھنور میں پہنچ جائے۔ اس کے بادبان پھٹ جائیں، لنگر ٹوٹ جائے، ناخدا ناپید ہو تو اہلِ سفینہ کے لیے بظاہر بچاؤ کی کون سی امید باقی رہ سکتی ہے؟ مسلمانوں پر یاس و نومیدی کی یہی حالت طاری تھی۔

سید صاحب سے پیشتر جتنے مجاہد پیدا ہُوئے، ان میں سے دو نے دورِ زوال کی تاریکی کو روشنی سے بدلنے کی زبردست کوششیں کی تھیں: ایک حیدر علی، دوسرا اس کا فرزند ٹیپو سلطان، لیکن مخالف اسباب اس افراط سے فراہم ہو گئے تھے کہ ان مجاہدوں کی کوششیں کوئی مستقل نتیجہ پیدا نہ کر سکیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہُوا کہ آنے والی نسلوں کے لیے عزم و ہمت اور ایثار و قربانی کی دو شمعیں روشن ہو گئیں۔

تین راستے

یاس و نومیدی کی اس تیرگی میں سید صاحب نے ہوش کی آنکھ کھولی۔ ان کے سامنے عمل کے تین راستے تھے:

۱ ـ حق کو چھوڑ کر باطل سے رشتہ جوڑ لیا جائے۔

۲ ـ حق کو چھوڑا نہ جائے اور اس سلسلے میں جو مصیبتیں پیش آئیں، انھیں صبر و استقامت سے برداشت کر لیا جائے۔

۳ ۔ باطل کا مقابلہ مردانہ وار کرکے ایسی صورت حال پیدا کرنے کی سعی کی جائے کہ حق کے لیے غلبۂ عام کی فضا آراستہ ہو جائے ۔

پہلا راستہ زندگی نہیں موت کا راستہ تھا ۔ دوسرے کا نتیجہ یہ ہو سکتا تھا کہ آہستہ آہستہ سسک سسک کر اور تڑپ تڑپ کر جان دی جائے ۔ صرف تیسرا راستہ غیرت و حمیت اور ہمّت و عزیمت کا راستہ تھا ۔ سید صاحب کو خدا نے غیرت و عزیمت کی دولت بدرجۂ وافر عطا کی تھی ۔ انھوں نے آخری راستے ہی کو اپنے لیے زیبا سمجھا ۔ اسی کو اختیار کیا ۔ یہی ان کے وعظ و تلقین کا محور تھا ۔ اسی کو ان کی دعوت و تبلیغ کا نصب العین سمجھنا چاہیے ۔

رُوحِ دعوت

سید صاحب کے نزدیک مسلمانوں کی تمام مصیبتوں اور زیاں کاریوں کی علت العلل یہ تھی کہ وہ اسلام کے صراطِ مستقیم سے منحرف ہو چکے تھے ۔ ان میں خدا کے دین کی سربلندی کے لیے کوئی تڑپ اور کوئی بے تابی باقی نہ رہی تھی ۔ وہ رُوحِ جہاد سے خالی ہو چکے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ سید صاحب نے سیاسی عظمت و برتری کو اپنا نصب العین نہ بنایا ۔ صرف احیاءِ اسلامیت پر اپنی دعوت کی بنیاد رکھی ۔ وہ مدعیانِ اسلام کو سچے مسلمان بنانا چاہتے تھے اور اُن میں خدمتِ دین اور تکمیل مقاصدِ اسلامیت کی سچی لَو لگانے کے خواہاں تھے ۔ دورِ اوّل میں مسلمانوں کو جو عالمگیر برتری حاصل ہُوئی تھی، وہ صرف خدمتِ دین کا ایک ثمرہ تھی ۔ جن چیزوں کو ہم آج کل اسبابِ قوت سمجھنے کے عادی ہیں، ان میں سے کون سی چیز دورِ اوّل کے مسلمانوں کو حاصل تھی ؟ لیکن اسلامیت کے لیے جذبۂ جہاد نے ان میں استحکام و استقامت کی وہ رُوح پیدا کر دی تھی کہ وقت کی پُر شکوہ سلطنتیں، اسبابِ حرب و ضرب کی ہولناک فراوانیوں کے ساتھ مسلمانوں سے ٹکرائیں اور مٹی کے کھلونوں کی طرح یوں ریزہ ریزہ ہو گئیں کہ زمانے کو اُن کے ٹکڑوں کا سُراغ بھی نہ مل سکا ۔ سید صاحب اسی عہدِ مسعود کی برکات زندہ کرنا چاہتے تھے ۔ احیا و تجدیدِ اسلامیت کا یہ مقامِ رفیع بہت کم خوش نصیبوں کو حاصل ہُوا ۔ اور اس کے لیے بے باکانہ قربانیاں بہت کم نیک بختوں سے بن آئیں :

یہ رتبۂ بلند ملا، جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

راہِ مُراد

سید صاحب اکثر عالمِ شوق میں یہ شعر پڑھا کرتے تھے :

اے آنکہ زنی دم از محبت   از ہستیِ خویشتن بپرہیز
برخیز و بہ تیغِ تیز بنشیں   یا از سرِ راہِ دوست برخیز

ان کا سازِ وجود مدت العمر اسی ترانے کے لیے وقف رہا۔ مسلمان آج جن پست پائیوں اور نگونساریوں پر پریشان ہیں، ان کا سبب بجز اس کے کیا ہے کہ ان میں اسلامیت کا جذبۂ صادقہ اور اس کے لیے پر خلوص جہاد کا ذوق و ولولہ باقی نہیں رہا۔ اگر محض سروں اور جسموں کی گنتی کی جائے تو وہ روئے زمین کی کسی دوسری بھیڑ سے کم نہ ہوں گے۔ جب وہ راہِ خدا کے سچے مجاہد تھے۔ تو زیادہ سے زیادہ چند لاکھ ہونے کے باوجود دنیا کی تمام بڑی بڑی طاقتوں پر بھاری تھے۔ ان کا نام سن کر باطل کے آہنی حصاروں میں زلزلہ پڑ جاتا تھا۔ قوموں کی زندگی کا انحصار نیک ترین نصب العین کے لیے ولولۂ ایثار اور داعیہ قربانی پر ہے۔ خوشا وہ قوم جس کا نصب العین صرف اعلائے حق اور رضائے خدا ہو اور وہ اس کے لیے ہر ایثار و قربانی کے ولولوں سے معمور ہو۔

سید صاحب اسی راستے کے داعی تھے۔ ہر مسلمان میں یہی روح پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے:

گر نثار قدم یارِ گرامی نہ کنم
گوہرِ جاں بچہ کارے دگرم باز آید

حرمین سے واپسی کے بعد ہجرت تک ایک برس اور دس مہینے کی مدت انھوں نے اسی نصب العین کی اشاعت میں گزاری اور اسی کی بنا پر مجاہدین فی سبیل اللہ کی قدوسی جماعت تیار کی۔

بائیسواں باب

سکھ اور انگریز

جہاد کس کے خلاف؟ اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ سید صاحب کس کے خلاف جہاد کی دعوت دے رہے تھے؟ آیا وہ صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے، جیسا کہ سوا سو سال سے سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے اور وہ بھی محض اس بناء پر کہ پنجاب کی سکھ حکومت مسلمانوں پر بے پناہ ظلم کر رہی تھی؟ سید صاحب کا جو دعویٰ ان مکتوبات و اعلانات کے ذریعے سے ہم تک پہنچا ہے، تو وہ یہ ہے:

> ہرگاہ بلاد اسلام در دستِ کفارِ لیام افتد بر جماہیر اہلِ اسلام عموماً و مشاہیر حکام خصوصاً واجب و موکد می گردد کہ سعی و کوشش در مقابلہ و مقاتلہ آنہا بجا آرند تا وقتیکہ بلاد مسلمین را از قبضہ ایشاں برآرند و اِلّا آثم و گنہ گار می شوند و عاصی و ستمگار، از درگاہِ قبول مردود می گردند و از ساحتِ قرب مطرود۔[1]

> جب اسلامی بلاد پر غیر مسلم مسلط ہو جائیں تو عام مسلمانوں پر عموماً اور بڑے بڑے حکمرانوں پر خصوصاً واجب ہو جاتا ہے کہ ان غیر مسلموں کے خلاف مقابلہ و مقاتلہ کی کوششیں اس وقت تک جاری رکھیں جب تک اسلامی بلاد ان کے قبضے سے واپس نہ لے لئے جائیں ورنہ مسلمان گنہ گار ہوں گے، ان کے اعمال بارگاہِ باری تعالیٰ میں مقبول نہ ہوں گے اور وہ خود قربِ حق کی برکتوں سے محروم رہیں گے۔

اگر سید صاحب کے علمِ جہاد کی بناء یہی اصل تھی تو کیا عالمگیر اعظم کی وسیع سلطنت میں سے صرف وہی حصہ مسلمانوں کے قبضے سے نکل کر غیر مسلموں کے قبضے میں گیا تھا، جو دریائے ستلج اور دریائے سندھ کے درمیان تھا اور جس پر رنجیت سنگھ حکمران تھا؟ کیا باقی پورے ملک پر مسلمان بدستور فرمانروا تھے؟ اس کا جواب ہر شخص نفی میں دے گا۔ اس سے بدرجہا بڑے اور اہم تر علاقے پر بلاواسطہ یا بالواسطہ انگریز مسلط

---

[1] مکاتیب شاہ اسمٰعیل صفحہ ۵۵۔ مکتوب بنام شاہ بخارا۔

تھے اور انھوں نے سب کچھ یا تو مسلمانوں سے چھینا تھا یا ان لوگوں سے لیا تھا جو کچھ مدت پیشتر مسلمانوں سے چھین چکے تھے۔ یہ تمام علاقے بے شائبہ ریب "بلادِ اسلام" تھے۔ پھر کتنے تعجب کی بات ہے کہ اس واضح اساسِ عمل کے ہوتے ہوئے سمجھا گیا اور سمجھایا گیا کہ سید صاحب صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے!

سکھ حکومت کی حقیقی حیثیت

سیّد صاحب کے سوانح جن اصحاب نے لکھے، چونکہ ان کی رائے یہ تھی کہ آپ صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے، اس لیے پس منظر کے طور پر ان سوانح نگاروں نے سکھوں کی تعدیاں جزواً جزواً بیان کیں۔ مثلاً یہ کہ اذان بند تھی، ذبیحہ گاؤ ممنوع تھا۔ مساجد کی بے حرمتی ہو رہی تھی۔ جان، مال اور آبرو کی حرمت مٹ چکی تھی۔ سب مقامات پر نہیں تو پنجاب کے بعض مقامات پر یقیناً یہی حالت تھی اور غیر جانبدار مورخوں کی شہادتیں اس صورت حال کی مصدق ہیں۔ میں تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ پنجاب میں رنجیت سنگھ کے ماتحت جو "نظام" قائم ہُوا تھا۔ اسے حقیقۃً حکومت کا نام دیا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک فوجی غلبہ اور ایک عسکری تسلط تھا اور ایسے غلبہ و تسلط میں کبھی کوئی کام قاعدے اور ضابطے کی بنا پر انجام نہیں پاتا۔ حکومت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ حاکم و محکوم کے درمیان کم یا زیادہ ربط و تعلق ہو، جو ایک دوسرے کے لیے ہمدردی یا باہمی حقوق کی پاسداری کا کوئی ثبوت ملتا ہے، بلکہ حاکم و محکوم میں حد درجہ نفرت اور بے اعتمادی موجود تھی۔ حاکموں کو یقین تھا کہ محکوم ہمیں کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھ سکتے۔ اس لیے وہ غصے اور غیظ میں محکوموں کو زیادہ سے زیادہ تنگ کرتے تھے۔ محکوم حاکموں کو اپنے اعمال کی شامت اور کفرانِ نعمت کی سزا سمجھتے تھے۔ نہ حاکموں کے دل و دماغ میں یہ سوچنے کی صلاحیت تھی کہ حلم و بردباری اور لطف و محبت کے ذریعے سے دہکتی ہُوئی آگ کو بھی ٹھنڈا کیا جا سکتا ہے، نہ محکوم اتنے بے حس تھے کہ دن رات آگ کے شعلوں میں زندگیاں بسر کرنے کے باوجود سمجھ لیتے کہ وہ پھولوں سے کھیل رہے ہیں۔

رنجیت سنگھ کی آرزو ممکن ہے یہ ہو کہ اس فوجی غلبے کو ایک باقاعدہ حکومت کی ہیئت مل جائے، لیکن تنہا ایک شخص اس پورے ڈھانچے کی ذہنیت کیوں کر بدل سکتا تھا، جس کا ہر پُرزہ جوشِ انتقام کے سانچے میں ڈھلا تھا؟ پھر رنجیت سنگھ کی آرزو عمر بھر یہ رہی کہ اس کے دائرۂ اقتدار کی حدیں جلد سے جلد دُور دُور تک پھیل جائیں۔ یہ آرزو عسکریت کو بے لگام رکھے بغیر پوری نہیں ہو سکتی تھی۔

غرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ بندہ بیراگی کے ماتحت جن غارت گر اور خونریز جتھوں نے پنجاب کی مختلف آبادیوں پر آفات کے سیل بہا دیے تھے، ان میں رنجیت سنگھ نے اک گونہ تنظیم پیدا کر دی تھی اور ان کے لیے ایک مرکز کا بندوبست ہو گیا تھا۔ لیکن ان جتھوں کے عادات و خصائل نہیں بدلے تھے۔ جبر و تصرف اور تصادم کی انھیں لت پڑ چکی تھی۔ جب باہر کسی ہدف تک نہ پہنچ سکتے تو ایک دوسرے

کا گلا کاٹنے لگے۔ پھر انگریزوں سے ٹکرا گئے اور رنجیت سنگھ نے چالیس برس کی محنت سے جو کچھ بنایا تھا، اُسے چار پانچ برس میں تہس نہس کر کے بیٹھ گئے۔

پنجاب میں سکھوں کی تعدیوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ فی الجملہ درست ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ ظلم نہ ہوتے تو کیا سید صاحب اپنی پیش کردہ اصل کی بناء پر سکھ حکومت سے تعاون کر لیتے جب کہ وہ بلادِ اسلامیہ پر غیر مسلموں کے نفس تسلط کو موجب جہاد مانتے تھے اور اس میں کوتاہی کو اثم و معصیت سے تعبیر کرتے تھے؟ نیز کیا وہ بلادِ اسلامیہ پر انگریزوں کے قبضے کو گوارا کر سکتے تھے؟ ان سوالوں کا جواب غیر مشتبہ طور پر نفی میں ہے۔ پھر یہ خیال کہاں سے پیدا ہوا کہ سید صاحب صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے؟

افسانہ طرازیاں

میں جہاں تک تحقیق کر سکا ہوں، سب سے پہلے سر سید احمد خاں مرحوم نے سید صاحب کے جہاد کا رُخ انگریزوں سے ہٹا کر سکھوں کی طرف پھیرا۔ ولیم ہنٹر کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" چھپی تھی تو سر سید نے اس کی تہمت طرازیوں کے جواب میں ایک سلسلۂ مضامین "پایونیر" میں چھپوا دیا تھا جو بعد میں الگ بھی چھپ گیا تھا۔ ان جوابی مضامین میں یہ بھی کہا گیا کہ سید صاحب صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے اور انگریزوں کے ساتھ جنگ سے اظہار برأت کر دیا تھا[1]۔

سر سید کا یہ بیان بہت کم لوگوں کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری مرحوم نے اسے پھیلا کر پیش کیا۔ فرماتے ہیں کہ جب سید صاحب حج پر جا رہے تھے تو کلکتہ میں ایک روز شاہ اسماعیل نے وعظ کہتے ہوئے جہاد کا ذکر بھی کیا۔ ایک شخص نے بر سرِ مجلس پوچھا کہ سرکار انگریزی کے خلاف جہاد کرنا درست ہے یا نہیں؟ مولانا نے فرمایا:

> ایسی بے ریا اور غیر متعصب سرکار پر کسی طرح بھی جہاد کرنا درست نہیں ہے۔ اس وقت پنجاب کے سکھوں کا ظلم اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ ان پر جہاد کیا جائے[2]

پھر لکھتے ہیں:

> یہ بھی ایک صحیح روایت ہے کہ جب آپ (سید صاحب) سکھوں سے جہاد کرنے کو

---

[1] مجھے اصل رسالہ نہ مل سکا۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا محمد حسین مرحوم بٹالوی نے اپنے رسالے "اشاعت السنۃ النبویہ" میں شائع کر دیا تھا۔ ملاحظہ ہو اشاعت السنۃ جلد ۱۱ نمبر ۴۔

[2] تواریخ عجیبہ صفحہ ۵۷۔ یہ بیان سر سید مرحوم کے بیان کا چربہ ہے۔

تشریف لے جاتے تھے۔ کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ آپ اتنی دُور سکھوں پر جہاد کرنے کیوں جاتے ہو؟ انگریز جو اس ملک پر حاکم ہیں، دینِ اسلام سے کیا منکر نہیں ہیں؟ گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملک ہندوستان لے لو۔ یہاں لاکھوں آدمی آپ کا شریک اور مددگار ہو جائے گا۔ سید صاحب نے جواب دیا کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت نہیں کرنا چاہتے۔ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادرانِ اسلام پر ظلم کرتے اور اذان وغیرہ فرائض مذہبی کے ادا کرنے کے مزاحم ہوتے ہیں۔ اگر سکھ اب یا ہمارے غلبے کے بعد ان حرکات مستوجب جہاد سے باز آجائیں گے تو ہم کو ان سے بھی لڑنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

سرکار انگریزی گو منکرِ اسلام ہے، مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم اور تعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو عبادتِ لازمی سے روکتی ہے۔ ہم ان کے ملک میں علانیہ وعظ کہتے اور ترویج مذہب کرتے ہیں، وہ کبھی مانع اور مزاحم نہیں ہوتی۔ بلکہ ہم پر کوئی زیادتی کرتا ہے تو اس کو سزا دینے کو تیار ہے۔ ہمارا اصل کام اشاعت توحید الٰہی اور احیاء سنن سید المرسلین ہے، سو ہم بلا روک ٹوک اس ملک میں کرتے ہیں۔ پھر ہم سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں[1]

سید صاحب کا عقیدہ کیا تھا؟

مجھے اس "صحیح روایت" کا سراغ اب تک نہ مل سکا اور نہ اس کے فضولیات پر گفتگو کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے مولوی محمد جعفر صاحب مرحوم کے نزدیک معاملے کی شرعی صورت وہی ہو، جو انھوں نے بیان کی اور خود ہمارے زمانے میں اس فکر و عقیدہ کو بعض مدعیانِ تجدید اپنے امتیازی وصف کی حیثیت میں پیش کرتے رہے، لیکن سید صاحب کا عقیدہ یہ نہ تھا جیسا کہ اس باب کے آغاز میں پیش کردہ اقتباس سے ظاہر ہے اور آپ کے متعلق جو مکتوب وغیرہ میری نظر سے گزرا ہے، اس میں مولوی محمد جعفر کے بیان کی تائید کے لیے بعید سا اشارہ بھی موجود نہیں۔ بلاشبہ "اعلاء کلمۂ رب العالمین" اور "احیاء سنت سید المرسلین" سید صاحب کے اہم ترین مقاصد تھے، لیکن ساتھ ساتھ وہ "استخلاص بلاد المسلمین از دست کفرہ متمردہ" کے بھی داعی تھے۔ جس شخص کا نصب العین یہ ہو کہ اسلامی بلاد غیر مسلموں کے تصرف سے

---

[1] مکاتیب شاہ اسماعیل ص۵۳ -

آزاد ہو جائیں، وہ اشاعتِ توحید اور احیاءِ سنن کی آزادی پر اغیار کے تسلط کو کیوں کر قبول کر سکتا ہے جب کہ جانتا ہے جو آزادی اسے ملی ہے، وہ حاکموں کے رحم پر موقوف ہے؟

انگریزوں کے بارے میں سیّد صاحب کی رائے

محض یہی نہیں، سید صاحب کے مکاتیب میں صاف مذکور ہے کہ انگریز ہندوستان کو مسلمانوں کے قبضے سے نکالنے میں سب سے بڑھ کر ذمہ دار تھے۔ شاہ بخارا کے نام جو خط بھیجا تھا، اس میں لکھتے ہیں:

> نصارائے نکوہیدہ خصال و مشرکین بدمآل بر اکثر بلادِ ہندوستان از لب دریائے اباسین تا ساحلِ دریائے شور کہ تخمیناً شش ماہہ راہ باشد، تسلط یافتند و دامِ تشکیک و تزویر بنا بر اخمالِ دینِ ربِ خبیر بر یافتند و تمامی آں اقطار بہ ظلماتِ ظلم و کفر مشحون گردانیدند[1]

نصاریٰ اور مشرکین ہندوستان کے بلاد پر دریائے سندھ سے ساحلِ بحر تک قابض ہو گئے۔ یہ اتنا بڑا ملک ہے کہ انسان پیدل چلے تو ایک سرے سے دوسرے سرے پر پہنچنے میں چھ مہینے لگ جائیں۔ انھوں نے (نصاریٰ اور مشرکین) نے خدا کے دین کو ختم کرنے کے لیے تشکیک و تزویر کا جال پھیلایا ہے اور ان تمام خطوں کو ظلم و کفر کی تیرگی سے بھر دیا ہے۔

مشرکین سے مراد مرہٹے اور سکھ ہو سکتے ہیں، لیکن نصاریٰ سے انگریزوں کے سوا کون مراد ہے؟ سید صاحب مومن تھے اور مومن کی فراست کے لیے خدا کا نور مشعل راہ کا کام دیتا ہے۔ وہ انگریزوں کی تدابیرِ تسلط کا صحیح اندازہ کر چکے تھے اور جانتے تھے کہ کس طرح ہوشیاری اور عیاری سے وہ قدم جما کر اپنے تسلّط کا جال پھیلاتے ہیں۔ شاہ بخارا کو لکھتے ہیں:

> کفارِ فرنگ کہ بر سرِ ہندوستان تسلط یافتہ اند نہایت تجربہ کار و ہوشیار و حیلہ باز و مکار اند۔ اگر بر اہلِ خراسان بیایند بہ سہولت تمام جمیع بلادِ آنہا را بہ دست آرند۔ باز حکومت آنہا بولایت آنجناب (یعنی بخارا) متصل گردد

جو فرنگی ہندوستان پر قابض ہوئے ہیں وہ بے حد تجربہ کار، ہوشیار، حیلہ باز اور مکار ہیں۔ اگر اہلِ خراسان (افغانستان) پر چڑھائی کریں تو سہولت سے ان کے ملک پر قابض ہو جائیں گے پھر ان کی حکومت کی حدیں آپ کی حکومت سے

---

[1] مکاتیب شاہ اسماعیل ص۳۵

و اطراف دار الحرب بہ اطراف دار الاسلام متحد شود[1]

مل جائیں گی - دار الحرب اور دار الاسلام کے اطراف متحد ہو جائیں گے -

سید صاحب نے انگریزوں کے سوا کسی دوسرے غیر مسلم کو اس درجہ خطرناک رنگ میں پیش نہ کیا اور گزشتہ ڈیڑھ سو سال کی تاریخ کے اوراق سید صاحب کے فکر و نظر کی اصابت و محکمیت پر علی الاعلان گواہی دے رہے ہیں - پھر کس بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ سید صاحب صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے یا استخلاص بلاد اسلام کے سلسلے میں سکھوں کو انگریزوں پر ترجیح دے سکتے تھے؟

سید صاحب کے نیاز مندوں کا یقین

سید صاحب کے نیاز مندوں میں سے مجھے ایک بھی نہیں ملا، جس کے نزدیک آپ کا مطمح نظر پورے ہندوستان کا استخلاص نہ تھا - میں صرف تین مثالیں پیش کروں گا:

۱ - ہندوستان میں بعض افراد کو یہ خیال پیدا ہوا کہ سید صاحب کے پاس جمعیت بہت کم ہے - یہ وسوسہ اور بعض دوسرے اعتراضات شاہ اسماعیل کے کانوں تک پہنچے تو آپ نے ایک مفصل مکتوب میں حقیقتِ حال واضح کی - اس میں لکھتے ہیں: "کس شخص نے آپ کو بتایا کہ امام ہمام اسی قلیل جمعیت سے لاہور اور کلکتہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ وہ تو رات دن مسلمانوں کی جمعیت بڑھانے کی کوششیں فرما رہے ہیں"۔ لاہور سکھوں کا مرکز تھا، مگر کلکتہ سے سکھوں کا کوئی تعلق نہ تھا - شاہ صاحب جانتے تھے کہ انگریزوں سے جنگ مسلمہ مقاصد میں داخل ہے -

۲ - سید صاحب کے ایک خلیفہ سید قطب علی نقوی ساکن مجھوا میر (ضلع گورکھپور) تھے - ان کے فرزند سید جعفر علی نقوی سید صاحب کے منشی خانے میں کام کرتے تھے بالاکوٹ کے بعد وطن واپس آئے تو ایک روز سید قطب علی نے اپنے فرزند سے کہا:

> آرزو تھی کہ اللہ تعالیٰ سید صاحب کے ذریعے سے اس سرزمین (ہندوستان) کو کفار نگونسار سے پاک کر دے گا - وہ اب دنیا میں باقی نہ رہے تو مجھے زندگی کی تمنا نہیں رہی[2]-

۳ - شیخ غلام علی الٰہ آبادی سید صاحب کے خاص ارادت مند تھے - سید جعفر علی نقوی جہاد کے لیے

---

[1] مکاتیب شاہ اسماعیل ص۵۵ - [2] منظورۃ السعداء -

جاتے ہوئے شیخ صاحب سے ملے تو انھوں نے فرمایا:

> اب ہماری نظر لشکرِ اسلام (سید صاحب کے لشکر) کی فتح پر جمی ہوئی ہے اور ہماری معاش کی اصلاح بھی اسی پر موقوف ہے[1]

الہ آباد اور مجھوا امیر کے نیازمندوں کی تمنائیں تنہا سکھوں کی شکست سے پوری نہ ہو سکتی تھیں، جن کی حکومت دریائے ستلج پر پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ تمام نیازمندوں کو یقین تھا، سید صاحب پورے ہندوستان کے استخلاص کے لیے کھڑے ہوئے ہیں اور انگریزوں سے جنگ ان کے مقاصد میں داخل ہے۔

مبنی کیا تھا؟

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ سید صاحب کے نزدیک ہندوستان اسلامی حکومت کے زوال کے بعد دار الحرب بن چکا تھا۔ وہ اسے از سرِ نو دار الاسلام بنانا چاہتے تھے۔ نہ انگریزوں کی بے تعصبی یا بے ریائی کو اس سلسلے میں وجہِ استثناء بنا سکتے تھے اور نہ سکھوں کی نادانیوں اور ضبطِ تعصب میں ناکامیوں کو ابھار کر پیش کرنے سے اصل حقیقت پر کوئی اثر پڑ سکتا تھا۔ جس شے کو انگریزوں کی بے تعصبی کہا جاتا ہے، وہ ملک داری کی ایک مناسب تدبیر تھی۔ سکھ تدبیر و تدبر سے ناآشنا تھے، اس لیے اپنا تعصب انتہائی بدوضعی سے نمایاں کرتے رہے۔ انگریز مدبرانہ حکمرانی کے اصول سے آگاہ تھے۔ انھوں نے صرف انھیں امور کو اپنے ڈھنگ پر چلانا کافی سمجھا جو براہ راست حکومت کے استحکام سے تعلق رکھتے تھے۔ باقی امور میں عوام کو آزاد چھوڑ دیا، لیکن یہ آزادی عوام کی قوت و طاقت کا نتیجہ نہ تھی بلکہ انگریزوں کی رضامندی و اجازت پر مبنی تھی۔

پھر سید صاحب اہل و عیال کو ساتھ لے کر وطن سے نکلے تھے، اگرچہ انھیں سندھ میں چھوڑنا پڑا۔ آخری دور میں تاکیداً لکھ دیا کہ اگر ہماری زندگی خدا کی راہ میں ختم ہو جائے تو اہل و عیال کو ہندوستان نہ بھیجا جائے بلکہ حرمین پہنچا دیا جائے۔

بہرحال سید صاحب کا جہاد نہ صرف پنجاب کے لیے تھا، نہ صرف سکھوں کے خلاف تھا، بلکہ پورے ہندوستان کے لیے تھا اور اس میں انگریز بہ طورِ خاص آتے تھے۔ باقی رہا یہ امر کہ جہاد سرحد سے کیوں شروع کیا جس کے ضمن میں سکھ پہلے آ گئے تو اس کے وجوہ و مصالح الگ بیان ہوں گے۔

روشن شہادتیں

پھر سید صاحب کی تحریرات میں ایسی روشن شہادتیں موجود ہیں جنھیں دیکھ لینے

---

[1] منظورۃ السعداء۔

کے بعد اصل نصب العین کے متعلق شبہ کی گنجایش ہی نہیں رہتی۔ مثلاً:

۱ - ایک مکتوب میں فرماتے ہیں کہ دُور کے ملک سے آنے والے بیگانے اور سامان بیچنے والے تاجر مالک سلطنت بن گئے۔ جب ہندوستان کا میدان غیروں اور دشمنوں سے خالی ہو جائے گا تو میں مناصب ریاست و سیاست دوسروں کے حوالے کر کے الگ ہو جاؤں گا۔[1]

۲ - شہزادہ کامران والی ہرات کو قیام جہاد کی تاکید فرماتے ہُوئے لکھتے ہیں کہ میں مجاہدین کو لے کر ہندوستان چلا جاؤں گا۔ میرا اصل مقصود ہندوستان پر جہاد ہے، یہ نہیں کہ خراسان میں توطن اختیار کر لُوں۔[2]

ظاہر ہے کہ سکھ نہ دُور سے آئے تھے نہ انھیں وطنیت کے لحاظ سے بیگانے قرار دیا جا سکتا تھا اور نہ تجارت ان کا پیشہ تھا۔ یہ تینوں خصوصیتیں صرف انگریزوں میں تھیں۔ پھر ہندوستان کو غیروں سے پاک کرنے یا اسے اصل مقصود قرار دینے کا مطلب بجز اس کے کیا تھا کہ سید صاحب انگریزوں کے خلاف جہاد کو بدرجہا زیادہ اہم سمجھتے ہیں، بلکہ ان کا نصب العین ہی یہ تھا۔ سکھوں سے جنگ اس لیے پیش آ گئی کہ سرحد سے جہاد شروع ہُوا تھا وہاں سے انگریزی حکومت کے حدود تک پہنچنا سکھوں سے فیصلہ کیے بغیر ممکن نہ تھا۔ بلا شبہ وہ بھی اسلامی بلاد پر متصرف تھے اور ان سے جنگ ضرور پیش آتی۔

مولوی محمد جعفر کی لغزش

مولوی محمد جعفر تھانیسری سید صاحب کے خاص معتقدین سے وابستہ تھے۔ اس وابستگی کے باعث انھوں نے خوفناک تکلیفیں اٹھائیں، گھر بار لٹایا اور کم و بیش اٹھارہ سال کالے پانیوں میں بسر کیے۔ ان قربانیوں کے سامنے ہر شخص کی گردن احتراماً جھک جانی چاہیے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سید صاحب کے نصب العین کو سمجھنے میں ان سے سخت لغزش سرزد ہُوئی اور حد درجہ افسوس اس بات پر ہے کہ اس غلطی کی توثیق کے لیے انھوں نے سید صاحب کی عبارتوں کو بدلا۔ یہ حقیقت اس باب کے ضمیمے سے واضح ہو گی۔

آخر میں اتنا عرض کر دینا چاہیے کہ جس زمانے میں سید صاحب مصروفِ جہاد تھے، اسی زمانے میں ایک انگریز سیاح، جس کا نام هیین تھا، سرحد، افغانستان اور بلوچستان

---

[1] مکاتیب شاہ اسماعیل ص ۱۷۱ ۔ [2] ایضاً ص ۴۰، ۴۱ یہ بھی عرض کر دوں کہ مکاتیب میں یہ مضمون بارہا مختلف صورتوں میں کیا ہے، میں [illegible] مثالیں چند ہی پیش کر سکتا ہوں۔

کے علاقوں میں پھر رہا تھا، اس نے سید صاحب کا نصب العین یہ بتایا:

"سکھوں کا استیصال اور پنجاب پر قبضہ، پھر ہندوستان اور چین پر تسلط"

گویا اس انگریز سیاح کو سید صاحب کے مقاصد کا اندازہ ان مسلمانوں سے بہتر تھا، جو سید صاحب کے خاص معتقدین میں شمار ہوتے تھے۔

ضمیمہ

میرزا حیرت میرزا حیرت کی کتاب "حیات طیبہ" اصلاً شاہ اسماعیل کے حالات میں ہے۔ آخر میں سید صاحب کے حالات بھی اختصاراً درج کیے ہیں۔ میں اس کتاب کی تاریخی حیثیت کے متعلق الگ ذکر کر چکا ہوں۔ اس میں شاہ اسماعیل کے دورۂ پنجاب کے حالات بڑی تفصیل سے مرقوم ہیں[1]۔ لیکن میں نے جب کبھی انھیں پڑھا، تاریخ سے کہیں زیادہ افسانے کا رنگ ان میں نمایاں نظر آیا۔ یہ دورہ اس زمانے میں ہوا، جب سید صاحب امیر خاں کے لشکر کو چھوڑ کر دہلی نہیں پہنچے تھے۔ جہاں تک میں تحقیق کر سکا ہوں، سید صاحب کے ساتھ وابستگی سے پیشتر شاہ اسماعیل یا مولانا عبدالحی یا کسی دوسرے بزرگ کو تنظیم جہاد یا تحقیق احوال مسلمین کا چنداں خیال ہی نہ تھا۔ میرزا حیرت نے ان تفصیلات پر خاص زور اس لیے دیا کہ سید صاحب کے جہاد کا رخ کاملاً سکھوں کی طرف پلٹ جائے۔ وہ نواب امیر خاں اور انگریزوں کی صلح کو بھی سید صاحب ہی کی وساطت کا کرشمہ سمجھتے تھے۔ مجھے ادب کے ساتھ عرض کرنا چاہیے کہ میرزا حیرت کا مرتبہ دورۂ پنجاب سراسر افسانہ ہے، جو اس لیے تیار کیا گیا کہ سید صاحب کے موقف جہاد میں تحریف کے لیے اچھا سامان فراہم ہو جائے۔

مولوی محمد جعفر مولوی محمد جعفر مرحوم نے "تواریخ عجیبہ" کے آخر میں سید صاحب کے جو منتخب مکاتیب شائع کیے، ان کی عبارتیں بدل دیں۔ یہ حقیقت اصل مکاتیب اور مولوی محمد جعفر کے شائع کردہ مکاتیب کی عبارتیں سامنے رکھ لینے سے واضح ہو سکے گی:

اصل عبارت	تواریخ عجیبہ میں منقولہ عبارت
۱ - نصاریٰ نکوہیدہ خصال و مشرکین بدمآل براکثر بلاد ہندوستان از لب دریائے اباسین تا ساحل دریائے شور کہ تخمیناً شش ماہہ راہ باشد، تسلط یافتند۔ (مکاتیب شاہ اسماعیل ص۳)	۱ - سکھان نکوہیدہ خصال و مشرکین بدمآل براکثر اقطاع غربی ہندوستان از لب دریائے اباسین تا دار السلطنت دہلی، تسلط یافتند[2]
۲ - نہ با کسے از امرائے مسلمین منازعت	۲ - نہ با کسے از امرائے مسلمین ....

---

[1] حیات طیبہ صفحہ ۱۰۷-۱۰۴-۱۳۳۔ [2] تواریخ عجیبہ ۱۸۹، ۱۹۰۔

اصل عبارت	تواریخ عجیبہ میں منقولہ عبارت
داریم و نہ بایکے از رؤسائے مومنین مخالفت، باکفار لیام مقابلہ داریم، نہ با مدعیانِ اسلام بادرازمویاں بلکہ سائر کفر جویاں مقاتلہ خواہیم نہ با کلمہ گویاں و اسلام جویاں؛ چنانچہ ایں معنی معلوم خاص و عام است۔ (〃 〃 صفحہ ۱۹)	نہ باسرکار انگریزی مخاصمت داریم و نہ ہیچ راہ منازعت کہ از رعایائے او ہستیم و بہ حمایتش از مظالم برایا۔ چنانچہ ایں معنی معلوم خاص و عام است۔ ۱؎
۳۔ کفار فرنگ کہ بر ہندوستان تسلط یافتہ اند نہایت تجربہ کار و ہوشیار اند و حیلہ باز و مکار۔ (〃 〃 صفحہ ۵۹)	۳۔ کفار درازمویاں کہ بر ملک پنجاب تسلط یافتہ اند نہایت تجربہ کار و ہوشیار اند و حیلہ باز و مکار۔ ۲؎
۴۔ آیا ایں قوم از جملہ نصاریٰ و یہود یا مجوس و ہنود اند کہ با ملت محمدیہ عداوت می ورزند۔ (〃 〃 صفحہ ۱۶۵)	۴۔ بے شک آں قوم از جملہ مجوس یا سکھ یا بود اند کہ با ملت محمدیہ عداوت دارند۔ ۳؎

اصل و نقل کا فرق

اب آپ دونوں بالمقابل عبارتوں کے خط کشیدہ الفاظ سامنے رکھ کر اصل و نقل کا فرق ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ پہلے اقتباس کے ابتدائی الفاظ میں "نصاریٰ نکوہیدہ خصال" کی جگہ "سکھانِ نکوہیدہ خصال" لکھا گیا۔ پھر "اکثر بلادِ ہندوستان" کی جگہ "اکثر اقطاعِ غربی ہندوستان" بنایا گیا اور آخر میں "از لبِ دریائے اباسین تا ساحلِ دریائے شور" کی جگہ "از لبِ ندیائے اباسین تا دارالسلطنت دہلی" داخل کیا گیا، "شش ماہہ راہ باشد" حذف کر دیا گیا۔ عجیب بات یہ ہے، مولوی صاحب مرحوم کو یہ خیال بھی نہ رہا کہ سکھوں کی سلطنت دہلی تک نہیں جاتی تھی بلکہ اس سے دو سو میل شمال میں دریائے ستلج پر ختم ہو جاتی تھی اور دہلی پر انگریز ۱۸۰۳ء سے قابض چلے آتے تھے۔

۲۔ دوسرے اقتباس میں "نہ باسرکار انگریزی مخاصمت داریم . . . . برایا" والا پورا فقرہ اپنی طرف سے

۱؎ تواریخ عجیبہ صفحہ ۱۷۰۔ ۲؎ ایضاً صفحہ ۱۹۲ ۳؎ ایضاً صفحہ ۲۴

بڑھا دیا گیا اور یہ الفاظ "تواریخ عجیبہ" کے پہلے ایڈیشن اور بعد کے ایڈیشنوں میں جلی لکھوائے گئے۔

۳ - تیسرے اقتباس میں "کفار فرنگ" کی جگہ "کفار دراز مویاں" بنایا گیا۔

۴ - چوتھے اقتباس میں "آیا" کی جگہ "بے شک لکھا اور "نصاریٰ و یہود" کو حذف کر دیا۔

مبادا کسی کو شبہ ہو کہ یہ ترمیمات مکاتیب کے ناقل اول نے کیں، مولوی صاحب ان کے ذمہ دار نہ تھے، میں نے مکاتیب کے چھ قلمی نسخے بہم پہنچائے جو مختلف اوقات میں مکتوب ہوئے۔ ان سب میں اصل عبارت اسی طرح درج پائی، جس طرح میں نے بہ طور متن نقل کی۔ نیز ترمیمات میں صرف "نصاریٰ" اور "کفار فرنگ" کو حذف کرنے کا اہتمام بالکل واضح ہے۔ یہ اُسی شخص کا کام ہو سکتا تھا جو سید صاحب کے جہاد کو ہر طرف سے ہٹا کر صرف سکھوں تک محدود کر دینے کا تہیہ کیے بیٹھا تھا۔

سید صاحب کے متعلق قلمی ذخیروں تک چند افراد کے سوا کسی کو دسترس حاصل نہ تھی۔ "تواریخ عجیبہ" چھپی تو اس میں سید صاحب کے مقاصد جہاد کا حلیہ بالکل بگاڑ کر پیش کیا گیا تھا۔ عام اصحاب نے اسے مستند شے سمجھ کر قبول کر لیا۔ اس طرح اس پاک نفس مجاہد کبیر کے مقاصد ایک نہایت افسوسناک غلط فہمی کا ہدف بنے۔ میں مانتا ہوں کہ جس زمانے میں "تواریخ عجیبہ" لکھی گئی، سید صاحب کی تحریک انگریزوں کے عتاب کا مورد بنی ہوئی تھی، لیکن مولوی محمد جعفر صاحب مکاتیب کو چھوڑ سکتے تھے۔ انھیں تحریف شدہ شکل میں شایع کرنے کی کون سی مجبوری پیش آ گئی تھی؟ اور یہ حرکتیں ان لوگوں سے سرزد ہوئیں جو سید صاحب کے عقیدت مند تھے۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْ قَبْلِنَا۔

تئیسواں باب

سلطنت یا اعلاءِ کلمۂ حق؟

ریاست طلبی کا وسوسہ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ سید صاحب نے جہاد کے لیے مسلمانوں کی تنظیم شروع کی۔ وہ تمام مسلمانوں کو اسلامی جہاد کی روح سے معمور کر دینا چاہتے تھے ان کی آرزو یہ تھی کہ خدا کا کلمہ بلند ہو، سید المرسلین کی سنتیں تازہ ہو جائیں۔ تمام اسلامی بلاد غیروں کے تصرف سے آزادی حاصل کر لیں۔ وہ صرف سکھوں سے نہیں بلکہ ان تمام غیر مسلم قوتوں سے لڑنا چاہتے تھے جو بلادِ اسلامی پر قابض ہو چکی تھیں اور ان کے نزدیک انگریزوں کا خطرہ سب سے بڑا تھا۔ اب غور کرنا چاہیے کہ آیا وہ بلادِ اسلامی کو آزاد کرا کے اپنی حکومت کی طرح ڈالنا چاہتے تھے؟ اپنی فرماں روائی کی مسند آراستہ کرنے کے خواہاں تھے؟

ان سے پہلے جتنے آدمی معمولی حیثیت سے اُٹھ کر لاؤ لشکر کے مالک بنے تھے، وہ ملک یا ریاستیں سنبھال کر بیٹھ گئے تھے۔ ایک قریبی مثال نواب امیر خاں مرحوم کی تھی، جس کے ساتھ سید صاحب سات آٹھ برس گزار چکے تھے۔ اس مرحوم کا قدم بھی طلب جاہ و حشم سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ان مثالوں کی بناء پر مختلف قلوب میں وسوسہ پیدا ہونا بعید از قیاس نہ تھا کہ سید صاحب بھی ملک و ریاست کے طلبگار ہیں۔ اس زمانے میں للہیت اس درجہ کم یاب تھی کہ عام لوگ اس کا صحیح تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، جس طرح ہمارے زمانے میں نہیں کر سکتے۔ فکر و نظر کا پیمانہ ایسا بن گیا تھا کہ کسی شخص کی کوئی سرگرمی اور کوئی جد و جہد ذاتی اغراض کے لوث سے پاک نہیں سمجھی جا سکتی تھی۔ پھر سب لوگ جانتے تھے کہ سید صاحب امیر خاں کے رفیق رہے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ امیر خاں ٹونک کا مالک بن کر بیٹھ گیا۔ اکثر نے یہی سمجھا ہو گا کہ سید صاحب بھی اپنے لیے ایک جداگانہ ریاست پیدا کرنا چاہتے ہیں، اس لیے آپ کو اپنا مطمحِ نظر واضح کرنے کی ضرورت بار بار پیش آتی رہی اور یہ مضمون آپ کے مکاتیب میں بیسیوں مرتبہ دُہرایا گیا ہے۔

صرف اعلاءِ کلمۃ الحق

میں پچھلے باب میں مکاتیب سے ایک اقتباس نقل کر چکا ہوں کہ سید صاحب کی آرزو کلمۂ حق کی سربلندی، سنن سید المرسلین کے احیاء اور استخلاص بلادِ اسلامیہ کے سوا کچھ نہ تھی[1]۔ ایک اور موقع پر فرماتے ہیں کہ اگر اسلامی ملک آزاد ہو جائیں، ریاست و

---

[1] مکاتیب شاہ اسماعیل صفحہ ۵۵۔

سیاست اور قضا و عدالت میں شرعی قوانین کو مدار عمل بنا لیا جائے تو میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔ خود مالک سلطنت بننے کے بجائے مجھے یہ پسند ہے کہ تمام اقطاع میں عادل فرمانرواؤں کی حکمرانی کا سکہ جاری ہو جائے۔

سلطنت ہفت کشور را بر خیال ہم نمی آرم
وقتیکہ نصرت دین و استیصال کفرہ متمردین متحقق گردید
تیر سعی من بہ ہدف مراد رسید۔

میں ہفت اقلیم کی سلطانی کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتا۔ جب نصرت دین کا دَور شروع ہو جائے گا اور سرکشوں کے اقتدار کی جڑ کٹ جائے گی تو میری سعی کا تیر خود بخود نشانہ پر جا بیٹھے گا۔

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ تمام عبادتوں کی بنیاد، تمام طاعتوں کی اصل اور تمام جاودانی سعادتوں[۱] کا مدار یہ ہے کہ خالق برتر کے ساتھ رشتۂ عبودیت استوار ہو جائے۔ استواری کا نشان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت، عزیز داری کے تمام رشتوں پر برتری حاصل کر لے۔ سوال کیا جا سکتا ہے، پتا کیوں کر چلے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت واقعی تمام رشتوں پر برتر ہو گئی ہے؟ فرماتے ہیں، اس محبت کی سب سے بڑی امتحان گاہ میدان جہاد ہے، جہاں کسی بندۂ خدا کے لیے اہل و عیال کے ترک، اخوان و اوطان سے علیحدگی اور جان و مال کی قربانی کیے بغیر پہنچنا ممکن ہی نہیں:۔

پس اقدام در اقامت ذروۂ سنام اسلام (جہاد) اقویٰ علامت غلبہ محبت حضرتِ خالق است بر جمیع مخلوقات لہٰذا در آیہ کریمہ: قل ان کان اٰباؤکم و اخوانکم و عشیرتکم و اموال اقترفتموھا و تجارۃ تخشون کسادھا احب الیکم من اللہ و رسولہ و جہاد را با محبت خدا و رسولؐ در یک سلک منسلک گردانید۔

پس جہاد کے لیے قدم اٹھانا، جسے حدیث میں ذروۂ سنام اسلام کہا گیا ہے، اس بات کی قوی ترین علامت ہے کہ حضرت خالق کی محبت تمام مخلوقات کی محبت پر غالب ہو گئی ہے۔ اسی وجہ سے آیہ کریمہ قل ان کان اٰبائکم . . . الخ میں جہاد کو خدا اور رسولؐ کی محبت کے ساتھ ایک لڑی میں منسلک کیا گیا ہے۔

سید صاحب کی پوری زندگی اسی حقیقت کی زندہ دستاویز ہے کہ ان کے دل میں خالق کی محبت دنیا کے ہر رشتے پر ہمیشہ غالب رہی۔

---

[۱] مکاتیب شاہ اسماعیل صفحہ [illegible] [۲] ایضاً صفحہ [illegible]

طلبِ دنیا سے کامل برأت

سید صاحب نے وقت کے بادشاہوں یا ریاستوں کے مالکوں کو جتنے دعوت نامے بھیجے ان میں صاف صاف لکھ دیا کہ میری آرزو رضائے باری تعالیٰ کے سوا کچھ نہیں۔ نہ کوئی علاقہ لینا چاہتا ہوں، نہ حکومت و جاگیر کا طلب گار ہوں، نہ جاہ و مال کا خواہاں ہوں۔ صرف ایک غرض، ایک مطلب اور ایک نصب العین میرے سامنے ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کا کلمہ سربلند ہو اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت تازہ ہو جائے:

> سو زبان سے خدائے تعالیٰ کا شکر بجا لاتا ہوں کہ مالک حقیقی کی اطاعت میں مشغول ہوں اور صرف اسی کی رضا مطلوب ہے۔ خدا کے سوا ہر چیز کی طرف سے آنکھیں اور کان بند کر لیے ہیں۔ دنیا و مافیہا سے ہاتھ اٹھا لیا ہے اور محض لوجہ اللہ علمِ جہاد بلند کیا ہے مال و منال، جاہ و جلال، امارت و ریاست اور حکومت و سلطنت کی طلب سے کاملاً الگ ہو چکا ہوں۔ خدا کے سوا کسی کی جستجو نہیں رہی[1]

امامت و سلطنت کا فرق

ایک مکتوب میں امامت و سلطنت کا فرق واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: امام کا وظیفہ یہ ہوتا ہے کہ جہاد قائم کرے اور بغی و فساد کو مٹائے۔ امام یا اس کے ساتھیوں کو شہروں اور ملکوں پر تسلط بالذات مقصود نہیں ہوتا بلکہ وہ مستحقوں کو حکومت کی گدیوں پہ بٹھا دیتے ہیں۔ اس کے برعکس منصب سلطنت کا مقصود ہی یہ ہوتا ہے کہ حکومت ملے، سلطنت بنے، علاقے اور ملک فتح ہوتے رہیں[2]:

> عالم السرائر والخفیات گواہ است بریں معنی کہ بر دلِ اخلاص منزل ایں جانب آرزوئے حصولِ خزائنِ بے شمار و تسلط بلاد و امصار یا طلب عزت و وجاہت و ریاست یا فرمانروائی بر اقران و اخوان یا اہانت روٴسا عالی مقدار از سلب سلطنتِ سلاطین والا تبار گاہے خطور ہم نہ کردہ، وسوسہ آں ہم ہم نہ رسیدہ[3]

> خفیہ باتوں کو جاننے والا خدا اس حقیقت پہ گواہ ہے کہ میرے دل میں کبھی یہ خیال بھی نہیں گزرا، کبھی وسوسہ بھی پیدا نہیں ہوا کہ بے شمار خزانوں کا مالک بن جاؤں۔ شہر اور ولایتیں میرے قبضے میں آ جائیں۔ عزت و وجاہت یا امارت دنیا مل جائے، اپنے بھائیوں اور ہمسروں پہ حکمران بن جاؤں یا اونچے خاندان والے بادشاہوں کی سلطنتیں چھین کر ان کے لیے اہانت کا باعث بنوں

---

[1] مکاتیب سید صاحب صفحہ ۱۸۱۔ [2] مکاتیب شاہ اسماعیل صفحہ ۴۳۔ [3] ایضاً صفحہ ۴۰۔

صرف احیاءِ دین

غرض سید صاحب کا مدعا اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ کلمۂ حق سربلند ہو، رسولِ پاک کی سنتیں تازہ ہو جائیں۔ اسی مدعا کے لیے انھوں نے وطن چھوڑا، اہل و عیال اور عزیزوں سے جدائی منظور کی۔ زندگی کے بہترین لیل و نہار جدال و قتال کی مصیبتوں میں گزارے اور یہ مدعا دنیا و مافیہا کی کسی غرض سے ملوث نہ ہونے دیا۔[1] للّٰہیت کی یہ شان تھی کہ اس مدعا کی بھی محض تکمیل کے لیے مضطرب تھے۔ یہ غرض نہ تھی کہ ان کے ہاتھ سے پورا ہوتا ہے یا کسی دوسرے کے ہاتھ سے:

> تاج فریدوں و تختِ سکندر بر جوے نمی شمارم و مملکت قیصر و کسریٰ بہ خیال ہم نمی آرم۔ آرے ایں قدر آرزو دارم کہ در اکثر افراد بنی آدم بلکہ در جمیع اقطار عالم احکام حضرت رب العالمین کہ مسمیٰ بہ شرع متین است، بلا منازعت احدے نافذ گردند، خواہ از دستِ من، خواہ از دستِ کسے دیگر۔ پس ہر حیلہ کہ باعث حصول دین مبین باشد، برروے کار می آرم و ہر تدبیرے کہ مفید ایں مقدمہ باشد بجا می آرم۔[2]

تاج فریدوں اور تخت سکندر میری نظروں میں جَو کے برابر بھی نہیں ہیں، قیصر و کسریٰ کی مملکت کا خیال تک دل میں نہیں لاتا۔ صرف یہ آرزو ہے کہ اکثر افراد بنی آدم بلکہ دنیا کے تمام خطوں میں رب العالمین کے احکام جاری ہو جائیں جنھیں ہم شریعت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور اس بارے میں کسی کی طرف سے کشمکش کا امکان باقی نہ رہے۔ صرف اس کام کی تکمیل مقصود ہے۔ خواہ یہ میرے ہاتھ سے پورا ہو یا کسی دوسرے کے ہاتھ سے۔ جو حیلہ اس مدعا کے حصول کا باعث ہو سکتا ہے، اسے بروے کار لاتا ہوں اور جو تدبیر اس مقدمے کے لیے مفید نظر آتی ہے اس سے کام لیتا ہوں۔

صحیح اسلامی نصب العین

مادی اغراض کی تیرگی کے موجودہ دور میں یہ باتیں یقیناً اجنبی معلوم ہوں گی۔ ہم لوگ انھیں ٹھیک ٹھیک ذہن نشین کر لینے کی صلاحیت بھی کھو چکے ہیں، لیکن سچے مسلمان کا نصب العین اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کی نظریں صرف خدا کے احکام پر جمی ہوئی ہوں۔ وہ زندگی کی ہر متاع کو ان احکام کے پورا کرنے میں لگا دے

---

[1] مکاتیب شاہ اسماعیل صفحہ ۴۹-۵۰۔
[2] ایضاً صفحہ ۵۰۔

اور اس غرض کے لیے طریقے بھی وہی اختیار کرے، جو خدا کے نزدیک پسندیدہ ہوں۔ اسلام یہ نہ تھا کہ چند مخصوص کلمے بوقتاً فوقتاً دہرا دیے۔ چودہ سو برس کی اسلامی تاریخ کے درخشاں واقعات کو اپنے لیے سرمایۂ فخر کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے اور عام اعمال میں صرف ذاتی اغراض کو محور بنائے رکھا۔ اسلام یہ تھا کہ ہر مدعی اسلام کی ہر حرکت و جنبش صرف رضائے باری تعالیٰ کے تابع ہو۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سونا جاگنا محض اللہ کے لیے ہو۔ وہ جیے تو اس لیے کہ اس کے حسنِ عمل سے خدا کے دین کی محبت و الفت لوگوں کے دلوں میں بڑھے، مرے تو اس لیے کہ دنیا اس پاک مسلک پر چلنے لگے، جو خدا کے آخری رسول صلعم نے پیش فرمایا۔

سید صاحب کا نصب العین یہی تھا جو اسلام کے ابتدائی دَور کے بعد کہیں قائم نہ رہ سکا، اس لیے کہ محض ملک گیری اور کشور کشائی مقصودِ حقیقی بن چکی تھی۔ صرف اسی بات کو خدمتِ اسلام سمجھ لیا گیا تھا کہ بڑے بڑے خطوں پر قبضہ جما لیا جائے، اگرچہ کوئی بھی عمل خدا و رسولؐ کے ارشادات کے عین مطابق نہ ہو۔ غور فرمائیے کہ کیا یہ نصب العین صرف سکھوں کے خلاف جہاد سے پورا ہو سکتا تھا؟ یا سکھ پنجاب کے مسلمانوں پر تعدیاں نہ کرتے تو یہ نصب العین خود بخود پورا ہو جاتا؟ یا انگریزوں نے اپنے مقبوضات میں اک گونہ رواداری برتی تو کیا، ہم معاذ اللہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نصب العین پورا ہوتا رہا۔

کور ذوقاں داستانہا ساختند　　　وسعتِ ادراکِ او نشناختند

للہیت کا یہ ایسا مقام ہے، جس میں سید صاحب کے امتیاز و اختصاص کو کوئی دوسرا قائد نہ پہنچ سکا۔

چوبیسواں باب

شبہات واعتراضات کی حقیقت

جہاد فرض کفایہ ہے

خود سید صاحب کے زمانے میں ان پر جو اعتراضات ہوئے یا ان کے موقف کی تضعیف کے لیے جو شبہات پیش کیے گئے، ان پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لینی چاہیے۔

ایک گروہ نے اس بات کو لے لیا کہ جہاد فرض کفایہ ہے۔ اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت اس کام کے لیے کھڑی ہو جائے تو تمام مسلمانوں کی گردن سے بار فرض اتر جاتا ہے اور سب میدان جہاد میں نکلنے کے مکلف نہیں رہتے۔ لیکن سوچیے کہ "کفایت" کا مطلب کیا ہے؟ کفایت کے معنی ہیں "کافی ہونا"۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جس قوت سے جہاد درپیش ہو، اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی جماعت عقلِ سلیم کی بناء پر بظاہر کافی ہو۔ نہ یہ کہ ضرورت مثلاً دس ہزار مجاہدوں کی ہو اور صرف دو چار سو یا ہزار بارہ سو مسلمانوں کا میدان جہاد میں پہنچ جانا کافی سمجھ لیا جائے۔ باقی تمام مسلمان فرض کفایہ کو دستاویز بنا کر اطمینان سے گھروں میں بیٹھے رہیں۔ ملتان کے ایک غازی نے خود سید صاحب سے ایک مرتبہ یہی کہا تھا کہ ہمارے علماء جہاد کو فرض کفایہ قرار دیتے ہیں۔ سید صاحب نے یہی جواب دیا کہ کفایت سے مراد ہے، مجاہد مسلمان موقع اور مقام کے لحاظ سے کافی ہوں نہ یہ کہ صرف چند سو مسلمانوں کے قیام کو بلا لحاظ موقع و محل کافی تصور کر لیا جائے۔

پھر معاملے کی صورت یہ نہ تھی کہ بلاد اسلام محفوظ تھے اور سرحدوں پر اغیار کی متفرق ٹولیوں سے چھیڑ چھاڑ پیش آ رہی تھیں۔ معاملے کی صورت یہ تھی کہ بلاد اسلام اغیار کے قبضے میں جا چکے تھے۔ ایسے موقع پر "فرض کفایہ" کا عذر کیا کام دے سکتا تھا؟ خود صحابہ کرامؓ کی مثالیں سامنے تھیں۔ جب اسلامی فتوحات کے علم جا بجا گڑ چکے تھے اور جہاد کی دعوت دی جاتی تھی تو وہ بوڑھے بھی تلواریں لے کر نکل پڑتے تھے، جن کی بھویں ضعف پیری کے باعث آنکھوں پر گر رہی تھیں۔ ان سے جب کوئی کہتا کہ بڑھاپے میں مشقت اٹھانے کی کیا ضرورت تھی تو وہ جواب دیتے کہ "انفروا خفافاً وثقالاً" کے فرمان خداوندی کے بعد بڑھاپے کا عذر کون پیش کر سکتا ہے؟

جامع الشروط امام کا معاملہ

دوسری ضروری بات جس پر بطورِ خاص زور دیا گیا، یہ تھی کہ جہاد کے لیے امام جامع الشروط ہونا چاہیے۔ بے شک امام کو بہتر سے بہتر اوصاف کا مالک ہونا چاہیے، لیکن ہمارے علماء نے شروط کی اہمیت میں مبالغہ کرتے کرتے معاملہ یہاں تک پہنچا دیا کہ بعض اربابِ علم نے بے تکلّف فرما دیا، ہمارے زمانے میں جامع الشروط امام ناپید ہے، لہٰذا جہاد ہو ہی نہیں سکتا۔ گویا فریضۂ جہاد کی بجاآوری صرف جامع الشروط امام کے میسر آجانے پر منحصر ہے، ورنہ اسے ساقط العمل سمجھنا چاہیے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

غور کیجیے کہ امام کے لیے جو شرطیں تجویز ہوئی تھیں، ان کی غرض و غایت کیا تھی؟ محض یہ کہ امامت کے وظائف احسن طریق پر پورے ہوں۔ حالتِ امن و جنگ میں مسلمانوں کے تمام انتظامی و دفاعی کام بہتر سے بہتر صورت میں پورے ہوتے رہیں۔ گویا شرطوں کا مقصود اصل وظائف کی بہتر بجاآوری تھی، نہ کہ ان کے جوشِ اہتمام میں حقیقی فرائض ہی کو ختم کر کے بیٹھ جاتا؟ پھر جب مسلّم ہے کہ جہاد میں کفار و فساق سے بھی مدد لی جاسکتی ہے، غیر مسلم دشمن کے مقابلے میں غیر مسلم معاہد کو رفیق بنایا جاسکتا ہے تو جامع الشروط امام کے انتظار میں مسلمانوں کا معطل بیٹھے رہنا کس بناء پر جائز مانا جاسکتا ہے؟

دَورِ انحطاط کی مصیبتیں

حقیقت یہ ہے کہ جیسے جیسے مسلمان انحطاط کا شکار ہوتے رہے، ان کے فکر و عمل پر بھی انحطاط طاری ہو گیا۔ اس دَور میں انھوں نے شاید ہی یہ کوشش کی ہو کہ حالات کو ہمت و قوت سے اپنے مطابق بنائیں۔ خود اپنے آپ کو حالات کے مطابق بناتے رہے۔ علماء کی پوری سعی و کاوش رخصتوں اور اجازتوں کی تلاش میں صرف ہوتی رہی جو ان کی بے چارگی کے لیے تسکین کا سہارا بن سکتی تھیں۔ معذرتیں اس لیے تراشی گئیں، شرائطِ امامت کی سختی اور سنگینی میں اس وجہ سے مبالغہ کیا گیا کہ خود ان لوگوں میں اُٹھنے اور بروئے کار آنے کی ہمت نہ تھی۔ بس انھیں یہی مناسب معلوم ہوا کہ سب کو بٹھائے رکھیں اور ہاتھ پاؤں توڑ کر اس طرح سُلا دیں کہ اُٹھنے کا خیال بھی دلوں میں باقی نہ رہے۔ جو کچھ ہونا چاہیے تھا اس پہ کسی کی نظر نہ تھی۔ جو کچھ پیش آرہا تھا اس پر بے تکلف قناعت کر لینے کے وعظ فرماتے اور اسے مطابق شریعت ثابت کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حالات میں بگاڑ کی رفتار تیز تر رہی۔ پہلے پہل ہمارے علماء نے اصل مسئلے کو قائم رکھتے ہوئے شرطوں کو غیر ممکن ظاہر کرنے پر زور دیا، اس کے بعد جو لوگ آئے، انھوں نے اصل مسئلے ہی کو ختم کر دینے کی بنیاد رکھ دی۔

حوصلے کے اضمحلال اور ہمت کی نگونساری کے اس اندھیرے میں جس بزرگ ہستی نے عزیمت کا چراغ ہر مسلمان کے دل میں روشن کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں اپنی جان بے دریغ قربان

کر ڈالی، وہ سید احمد بریلوی تھے۔ اور احیاء و تجدیدِ اسلامیت کا یہ درخشاں ترین کارنامہ ہے، جو اس بے نوا سید کے ہاتھوں انجام پایا۔ مسندِ درس پر معارفِ شریعت بیان کرنے والے بہت ہوئے منبرِ پُر وین کے وعظ کہنے والوں کی بھی ہماری ملت میں کمی نہ رہی، لیکن جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ عمل میں بے پروایانہ کھڑے ہونے کا شرف سید احمد کے سوا کس کے حصے میں آیا؟

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدرِ تو نشناخت دریغ

تحریکِ جہاد کی تضعیف

سید صاحب اور ان کی جماعت پر ہندوستان میں جو اعتراضات ہوئے تھے، وہ سرحد بھی پہنچ گئے تھے جب سید صاحب جہاد میں مشغول تھے۔ ان میں سے بعض کی کیفیت یہ تھی:

۱۔ سید صاحب اور ان کے رفیقوں پر ذاتی اعتراضات، جن کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

۲۔ سید صاحب کے پاس ساز و سامان کم ہے اور جس قوت سے مقابلہ درپیش ہے، اس جیسی طاقت میسّر نہیں۔

۳۔ بعض لوگ بیعت کر چکنے کے بعد منحرف ہو گئے۔ اس بناء پر باقی لوگوں کی استقامت بھی مشتبہ ہو گئی۔

ان اعتراضات کا مدعا بظاہر یہ نہ تھا کہ سید صاحب راہِ خدا میں جو کوششیں فرما رہے تھے، ا سے تقویت پہنچے تاکہ اصل مقصد جلد سے جلد پورا ہو جائے۔ بظاہر محض یہ تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ بھی م ہو جائے۔ شاہ اسماعیل نے ایک مفصّل مکتوب میں ان اعتراضات کا جواب لکھا، جس کے بعض مطالب اس غرض سے یہاں پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بھی جہاد کی ضرورت و اہمیت اور سید صاحب کے موقف پر روشنی پڑتی ہے۔

امام کے ساتھ قبائح کا انتساب

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اعتراضات کا جواب بھی اگرچہ جہاد کی ایک شکل ہے، لیکن ہمارے پاس تحریر و تقریر کے لیے وقت کہاں ہے؟ نماز کی تعلیم یقیناً ضروری ہے، لیکن جو شخص خود دادائے نماز میں مشغول ہو، تعلیم کیوں کر دے سکتا ہے؟ پھر پہلے اعتراض پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

امام صاحب سے جن قبائح کا انتساب کیا جاتا ہے وہ سراسر باطل ہیں۔

ان میں سے اکثر [illegible] قبائح

منسوب کیے جاتے ہیں، اُن میں سے بھی بیشتر خلاف حقیقت ہیں، لیکن اگر رفقائے امام کے متعلق ان قبائح کو بہ فرض محال تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے امامت میں کیا نقص واقع ہو سکتا ہے؟ اس کی مثال یہ ہے کہ امتیوں کے اعمال کی خرابیاں کبھی بھی نبی کی نبوت پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔

جو کچھ سید صاحب سے منسوب کیا جاتا ہے، اُسے بھی اگر درست مان لیا جائے تو امامت کے ثبوت و بقا میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ وہ باتیں زیادہ سے زیادہ مراتب ولایت پر اثر انداز ہوتی ہیں اور مراتب ولایت، امامت کی شرطوں میں داخل ہی نہیں، بلکہ امامت قائم ہو جائے تو فسق بھی اس کے زوال کا موجب نہیں ہو سکتا۔ اگلے پچھلے فقہا و متکلمین کی تحریرات اس کی شاہد ہیں۔

قوت میں مماثلت کا مسئلہ

دوسرے اعتراض یعنی منافقوں کی قوت کے برابر قوت و ہونے پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بقدرِ استطاعت سامان فراہم کرنا بلاشبہ ضروری ہے خواہ مخالفوں کے برابر قوت ہو یا نہ ہو۔ قرآن مجید میں اعدوا لهم ما استطعتم فرمایا گیا ہے۔ (یعنی جتنی قوت تمہارے بس میں ہو فراہم کرو) یہ نہیں کہا گیا کہ اعدوا لهم ما اعدوا لکم (یعنی جتنی قوت تمہارے مقابلے پر لائیں، اتنی ہی قوت تم بھی لاؤ) امام کے لیے "وجود شوکت" ضروری ہے لیکن:

> اس کا مطلب یہ نہیں، امام کے جسم میں ایسی قوت پیدا ہو جائے کہ وہ ایک لمحے میں مخالفوں کی سلطنتیں درہم برہم کر ڈالے اور یکہ و تنہا ان کے جنود و عساکر کو بکھیر کر رکھ دے۔ مطلب یہ ہے کہ امام کے پاس ساتھیوں کی ایسی جماعتیں فراہم ہو جائیں جن کے بل پر وہ ظاہر عقل کے اعتبار سے مخالفوں کی روک تھام کر سکے . . . .
>
> سلاطین میں صاحب شوکت وہ ہوتا ہے جس کے ہمراہ نوکروں کا کثیر گروہ ہو۔ افغانوں کی اصطلاح میں صاحب شوکت اسے سمجھا جاتا ہے، جس کی قوم اور برادری وسیع ہو۔ شریعت کے نزدیک اسی امام کو صاحب شوکت سمجھا جائے گا، جس کے ہاتھ پر مسلمانوں کا کثیر گروہ بیعت امامت کر چکا ہو اور شریعت میں بیعت کا رشتہ ملازمت و قرابت کے رشتوں سے زیادہ قوی ہے۔

سید صاحب کی کیفیت

باقی رہا دشمنوں کی شوکت سے مماثلت کا معاملہ تو اس سے مشرق و غرب کے تمام دشمنوں کی شوکت مراد نہیں ہو سکتی۔ اگلے پچھلے اماموں

میں سے کسی کی بھی امامت بحال و برقرار نہ رہے گی۔ صرف اتنا کافی ہے کہ بالفعل جن اعدا سے مقابلہ در پیش ہے ان کے برابر شوکت حاصل ہو جائے:

> اتنی شوکت البتہ حاصل ہے جو پکھلی، ہزارہ اور چھچھ کے ناظموں کی شوکت کے برابر ہو، اگرچہ رنجیت سنگھ اور کمپنی کی شوکت کے برابر نہ ہو[1]

> اور کس شخص نے آپ لوگوں کو بتایا کہ امام ہماری اتنی قلیل جمعیت سے لاہور اور کلکتہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ تو وہ رات دن مسلمانوں کی جمعیت بڑھانے اور شوکت کو ترقی دینے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ انھیں امید ہے کہ آہستہ آہستہ اسلامی شوکت عروج پائے گی اور یہ بات وقوع سے بعید نہیں، بلکہ ملتوں کے انقلاب میں اللہ کی یہی سنت جاری ہے کہ معمولی لوگوں میں سے ایک بے سروسامان آدمی اٹھتا ہے۔ آہستہ آہستہ رفیقوں کی جماعت فراہم کرتا ہے۔ تدریجاً اپنی شوکت کو اس حد تک بڑھا لیتا ہے کہ بڑے بڑے بادشاہوں اور ذی حشم خانوں کی مملکتیں توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ مثلاً نادر شاہ وغیرہ۔ کتنی بے انصافی ہے کہ جو شخص محض طلب دنیا کے لیے کمر باندھتا ہے اس کے متعلق تو فتح و نصرت کا گمان کیا جاتا ہے اور اسی گمان کی بنا پر اس کا ساتھ دیا جاتا ہے۔ لیکن جو مردِ حق محض للہ، فی اللہ اور ابتغاءً لوجہ اللہ دین کی حمایت کے لیے کھڑا ہوتا ہے اس کے لیے فتح و نصرت کو مستبعد سمجھا جاتا ہے۔

حصولِ شوکت کا طریقہ

پھر فرماتے ہیں کہ مان لیجیے قوّت والوں کے خلاف جہاد کے لیے زبردست قوت لازم ہے اور سید صاحب کو فی الحال یہ قوت حاصل نہیں، لیکن اس کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟:

> آیا کوئی امام ماں کے پیٹ سے بھی عساکر و جنود لے آیا ہے؟ آیا یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص اقامت جہاد کی تیاری کرتا ہے تو فی الفور غیب سے اس کے لیے لاؤ لشکر اور اسباب حرب مہیا ہو جاتے ہیں؟ یہ نہ کبھی ہُوا ہے اور نہ ہوگا۔ طریقہ یہی ہے کہ امام مقرر ہو۔ یہ کام تمام مسلمانوں کے ذمے فرض ہے اور اس میں سستی یا اس سے پہلوتہی معصیت ہے۔ پھر امام وقت کے لیے قوت بہم پہنچانا مسلمانوں ہی کا فرض ہے۔ چاہیے کہ

---

[1] کمپنی سے مراد ایسٹ انڈیا کمپنی ہے، جس کے ہاتھ میں اس وقت ہندوستان کے بیشتر حصّوں کی باگ ڈور تھی۔

ہر مسلمان جماعت ہر سمت سے دوڑتی ہوئی اس کے پاس پہنچ جائے اور جس شخص کو جو سامان مل سکے اُسے لاکر امام کی خدمت میں پیش کر دے۔ "اعدوا لهم ما استطعتم" اور "جاهدوا باموالکم و انفسکم" میں مخاطب عام مسلمان ہیں نہ کہ محض امراء و رؤسا۔

نمازِ جمعہ کی مثال

معترضین کو چاہیے کہ بقدر استطاعت سامان لے کر امام کے پاس پہنچ جائیں۔ کسی کے لیے دوسرے کا انتظار جائز نہیں۔ مثال کے طور پر نماز جمعہ کو لیجیے، جو سب پر واجب ہے۔ جماعت کے بغیر یہ نماز ادا نہیں ہو سکتی اور انعقادِ جماعت امام کے بغیر ممکن نہیں:

> لیکن اگر سب لوگ گھروں میں بیٹھے انتظار کرتے رہیں کہ جب امام آجائے گا، جماعت صورت پذیر ہو جائے گی، ہم بھی شامل ہو جائیں گے تو آیا اس حالت میں نماز جمعہ فوت نہ ہو جائے گی اور ہر شخص معصیت میں گرفتار نہ ہوگا؟ اس لیے کہ نہ ارواحِ مقدسہ میں سے امام اترے گا؛ نہ فرشتوں کا گروہ اقامت جمعہ کے لیے جماعت مہیا کرے گا۔ طریقہ یہی ہے کہ اگر کوئی فرد تنہا بھی ہے تو گھر سے نکل کر مسجد میں پہنچے جماعت موجود ہو تو اس میں شریک ہو جائے۔ موجود نہ ہو تو مسجد میں بیٹھ کر دوسروں کا انتظار کرے، اگر وہ مسجد کو خالی پا کر گھر لوٹ جائے گا تو نہ جماعت بنے گی اور نہ جمعہ قائم ہوگا۔

یہی حالت جہاد میں تہیہ قوت کی ہے۔ امام دعوت دے رہا ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ بے تامل اس کے پاس پہنچیں اور جتنی قوت درکار ہے، پوری کر دیں۔ یہ کون سی ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے گھروں میں بیٹھے بیٹھے امام پر قلت قوت کا اعتراض کرتے رہیں، حالانکہ قوت کی فراہمی خود ان کے ذمے ہے؟

مسلمان کیا تھے کیا ہو گئے

آخر میں شاہ صاحب کس دلسوزی سے لکھتے ہیں:

> سبحان اللہ! کیا اسلام کا حق یہی ہے کہ اس کے رکنِ اعظم کو جڑ سے اکھاڑا جا رہا ہو اور جس شخص کے سینے میں ضعف و ناتوانی کے باوجود، اسلامی حمیت نے جوش مارا، اُسے طعن و ملامت کا ہدف بنایا جائے؟ آیا یہ لوگ نصرانی یا یہودی یا مجوس یا ہنود ہیں کہ ملتِ محمدیہ کے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں؟ محمدیت کا مقتضا یہ تھا کہ اگر کوئی شخص ہنسی مذاق میں بھی جہاد کا نام لیتا تھا

تو مسلمانوں کے دل پھول کی طرح کھل جاتے تھے اور سنبل کی طرح تر و تازہ ہو جاتے تھے۔ اگر دور دست مقامات سے بھی جہاد کا آواز غیرت مندانِ اسلام کے کانوں میں پہنچتا تھا تو وہ دیوانہ وار دشت و کہسار میں دوڑ پڑتے بلکہ شہباز کی طرح اڑنے لگ جاتے۔ کیا جہاد کے معاملے کو، عظمت شان کے باوجود حیض و نفاس کے مسائل پڑھنے پڑھانے سے بھی کم تر سمجھ لیا گیا؟

بیعت کرنے کے بعد اس سے انحراف کرنے والوں کے مسئلے پر بحث کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ یہ امر خود انحراف کرنے والوں کے لیے موجب گناہ ہوگا۔ امام کی امامت کو اس سے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے؟ کیا یہ معلوم نہیں کہ محض نوکروں کی بے وفائی یا صوبیداروں اور سپہ سالاروں کی غداری کی بناء پر کسی بادشاہ یا فرمانروا کی بادشاہی ختم نہیں ہو جاتی؟

خلاصہ مطالب

جہاد کے متعلق ہم نے جو کچھ لکھا، اس کے مرکزی نکات پر پھر ایک مرتبہ نظر ڈال لیجیے:

۱ — سید صاحب کے نزدیک اسلامی قوت کے زوال و اضمحلال کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں میں روحِ اسلام اور روح جہاد باقی نہیں رہی تھی۔ یہی روح دوبارہ پیدا کرنا سید صاحب کا اصل مقصد تھا۔

۲ — ان کا نصب العین یہ تھا کہ کلمۃ اللہ سربلند ہو، سید المرسلینؐ کی سنتیں تازہ ہو جائیں اور بلاد اسلامی کو غیر مسلموں کے تصرف سے آزاد کرالیا جائے۔ انھیں اغراض کے پیش نظر انھوں نے جہاد کے لیے دعوت عام دے کر مسلمانوں کی تنظیم شروع کی تھی۔

۳ — وہ صرف سکھوں سے نہیں بلکہ انگریزوں سے بھی لڑنا چاہتے تھے اس لیے کہ بلاد اسلامی کا بدرجہا بڑا حصہ انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ نیز وہ انگریزوں کو زیادہ خطرناک سمجھتے تھے۔

۴ — ان کا مقصد یہ تھا کہ سارے ہندوستان میں شریعت حقہ کی حکومت قائم کریں۔ پھر اس نظام کو اقطار عالم میں پھیلائیں۔

۵ — وہ اس کام کو صرف رضائے باری تعالیٰ کے لیے پورا کرنا چاہتے تھے۔ دنیوی مال و دولت یا جاہ و منصب یا حکومت و ریاست کا وسوسہ بھی ان کے دل میں نہیں گزرا تھا۔

۶ — مسلمانوں نے سید صاحب کی تحریک جہاد سے اختلاف کے لیے جو عذر تراشے،

وہ ان کی بے ہمتی یا مقاصدِ دین سے نا آشنائی یا احکامِ دین کی تحریف پر مبنی تھے، اس لیے سراسر بودے اور بے بنیاد تھے۔

اب صرف ایک مسئلہ باقی رہ گیا اور وہ یہ کہ سید صاحب نے کس وجہ سے سرحد کو مرکزِ جہاد بنایا اور اس طرح سکھوں کے ساتھ سب سے پہلے ٹکر ہوئی؟ اس معاملے پر آیندہ باب میں روشنی ڈالی جائے گی۔

پچیسویں باب

سرحد کو کیوں مرکز بنایا؟

سید صاحب کا بیان

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ سید صاحب نے مرکز جہاد کے لیے صوبہ سرحد کو کیوں منتخب کیا؟ میرا خیال ہے کہ انھوں نے اپنے دوستوں اور رفیقوں سے طویل مشوروں کے بعد یہ فیصلہ کیا ہوگا۔ ایک مرتبہ اہل سرحد کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم آپ کے ملک میں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے آئے اور یہ سمجھ کر یہاں اترے کہ اس ملک میں مسلمان آباد ہیں۔ ان سب کے اتفاق سے دین کا کام درست کریں:

> میں نے ہندوستان میں خیال کیا کہ کوئی ایسی مامون جگہ ہو کہ وہاں مسلمانوں کو لے جاؤں اور تدبیر جہاد کروں۔ باوجود اس وسعت کے کہ صدہا کروہ میں ملک ہند واقع ہے، کوئی جگہ لائق ہجرت میرے خیال میں نہ آئی۔ کتنے لوگوں نے صلاح دی کہ اس ملک (یعنی ہندوستان) میں جہاد کر۔ جو کچھ مال، خزانہ، سلاح وغیرہ درکار ہوں ہم دیں گے۔ مجھ کو منظور نہ ہوا۔ اس لیے کہ جہاد موافق سنت کے چاہیے، بلوا کرنا منظور نہیں۔
>
> آپ کے اس ملک کے ولایتی بھائی (اہل سرحد) بھی وہاں حاضر تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا ملک اس کام کے لیے بہت خوب ہے۔ اگر آپ وہاں چل کر کسی جگہ مقام پکڑیں تو لاکھوں مسلمان دل و جان سے آپ کے شریک ہوں گے۔ خصوصاً اس سبب سے کہ رنجیت سنگھ والی لاہور نے وہاں کے مسلمانوں کو تنگ کر رکھا ہے۔ طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتا ہے . . . . میں نے کہا سچ ہے، بہتر یہ ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے وہیں چل کر ٹھہریں اور سب مسلمانوں کے اتفاق سے جہاد کریں۔

ہندوستان کی حالت

اس سے ظاہر ہے کہ سید صاحب اولاً اس وجہ سے سرحد کی طرف متوجہ ہوئے کہ ہندوستان میں انھیں کوئی آزاد و مامون مقام نظر نہ آیا،

جسے مرکز بنائیں۔ اگرچہ ان کے ہندوستانی دوست چاہتے تھے کہ اسی ملک میں کسی جگہ بیٹھ کر جہاد شروع کیا جائے اور وہ ہر قسم کی امداد دینے کے لیے تیار تھے۔ ثانیاً اس وجہ سے سرحد کو پسند فرمایا کہ وہاں مسلمانوں کی بھاری جمعیت موجود تھی اور وہ لوگ رزم وپیکار میں اونچی شہرت کے مالک تھے۔ نیز سکھوں کے حملوں کے باعث وہ تنگ تھے۔ اس لیے جلد سے جلد جہاد میں شمولیت پر آمادہ ہو سکتے تھے اور خود ان کو مدد دے کر اغیار کے حملوں سے محفوظ کر دینا بہت ضروری تھا۔

اس وقت کے ہندوستان کا نقشہ سامنے رکھا جائے تو سید صاحب کے بیان کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ ہندوستان یا تو براہ راست انگریزوں کے ماتحت تھا یا ان ریاستوں پر مشتمل تھا جو سید صاحب کے ایام طفلی ہی میں اپنی آزادی کھو کر انگریزوں کی دست نگر بن چکی تھیں۔ ان علاقوں میں سے کسی ایک کو مرکز بناتے تو اسلامی جہاد نہ رہتا۔ بلکہ بلوا بن جاتا۔ نیز بیسیوں الجھنیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ مثلاً انگریز اپنی عیاری سے مختلف طبقات میں تفرقہ پیدا کر کے سید کی تحریک کو ختم کرا سکتے تھے۔ اردگرد کی قوتوں کو ابھار کر خلاف کھڑا کر دیتے تو سید صاحب کا مرکز جہاد ہندوستان کے سمندر میں ایک بے حقیقت جزیرہ بن کر رہ جاتا، جسے باہر سے کوئی کمک نہ پہنچ سکتی۔ جن حکومتوں کو ایک حد تک آزاد سمجھا جاتا تھا، ان میں بھی انگریز اپنے دخل کا دروازہ کھول چکے تھے، مثلاً امیران سندھ کی حکومت اور ان میں سے کوئی شخص صاحب ہمت نہ تھا کہ بے باکانہ سید صاحب کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاتا۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے، اس وقت تک سید صاحب کے پاس اتنی قوت فراہم نہ ہوئی تھی کہ براہ راست انگریزی قوت سے ٹکر لے سکتے۔ اس غرض کے لیے وسیع ترتیبات ضروری تھیں۔ اور ان کے لیے وقت درکار تھا۔

سرحد کی کیفیت

صرف سرحد ہی ایک ایسا علاقہ تھا، جسے سید صاحب تحریک جہاد کے ابتدائی دور میں بہترین امیدوں کے ساتھ مرکز بنا سکتے تھے۔ اس لیے کہ:

۱ - سرحد کی پوری آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ ہندوستانیوں کا عام تصور یہ تھا کہ اہل سرحد بڑے جنگ جو اور جانباز ہوتے ہیں۔ وہ لوگ خلوص کے ساتھ حمایت پر آمادہ ہو جاتے اور سید صاحب کے بتلائے ہوئے اصولوں کے مطابق جہاد کرتے تو نہ محض ان کا ملک اغیار کی دستبرد سے محفوظ ہو جاتا، بلکہ پنجاب کو بھی آزاد کرایا جا سکتا تھا اور ہندوستان کی آزادی کے لیے نہایت مؤثر تدابیر اختیار کی جا سکتی تھیں۔

۲ - وہ لوگ سکھوں کے ظلم و جور اور ہجوم و یورش کا ہدف بنے ہوئے تھے۔ ان کے جذبات مجروح

تھے اور ایسے لوگوں کو بہ آسانی دفاع و ہجوم کے لیے منظم کیا جا سکتا تھا۔

٣ ۔ ان کی آزادی چھینی نہ تھی، چھن رہی تھی۔ لہٰذا انھیں غیروں کی دستبرد سے بچانا۔ ان لوگو مقابلے میں زیادہ ضروری تھا، جن کی آزادی بہت پہلے چھن چکی تھی۔

٤ ۔ سرحد کے شمال اور مغرب میں دُور دُور تک اسلامی آبادیاں تھیں۔ ان سے پوری امداد کی ہو سکتی تھی یا کم از کم مخالفت کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔

٥ ۔ سرحد کے مرکز کی جغرافیائی حیثیت ایسی تھی کہ دشمن صرف اسی حصے سے حملہ کر سکتا سید صاحب نے محاذِ جنگ بنایا تھا۔ اطراف و جوانب یا عقب سے حملے کا کوئی

٦ ۔ سید صاحب پنجاب میں پیش قدمی کرتے تو وہاں کے مسلمانوں کی اکثریت کے علاوہ غ آبادی بھی خیر مقدم کرتی۔ نیز دائیں جانب سے بہاول پور، سندھ اور بلوچستان کی حکومتیں معاون ہو سکتی تھیں۔

یہ تمام حقائق ہر شخص پر بہ ادنیٰ تامل واضح ہو سکتے ہیں، اگرچہ افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ سید صاحب کی توقعات پوری نہ ہوئیں۔ اہلِ سرحد کی نبرد آزمائی اور جنگ جوئی کی شہرت بھی محض سراب ثابت ہوئی۔ ان کی اسلامی حمیت بھی چنداں پائدار نہ نکلی اور سید صاحب کی عزیمت، جو اسلامیانِ ہند کی دوازدہ صد سالہ تاریخ میں بہترین متاع کی حیثیت رکھتی تھی، اہلِ سرحد کے قبائلی اوضاع و اطوار کی نذر ہو گئی۔ لیکن ظاہر عقل کی بناء پر سید صاحب کا فیصلہ ہر اعتبار سے محکم اور صائب و پختہ تھا۔ جو کچھ بعد میں پیش آیا اس کا علم قبل از وقت علام الغیوب کے سوا کسی کو نہ ہو سکتا تھا۔

مولوی محمد جعفر تھانیسری کا بیان

مولوی محمد جعفر تھانیسری نے لکھا ہے:

> براہ دور اندیشی معرفت شیخ غلام علی صاحب رئیس اعظم الٰہ آباد کے، نواب لفٹننٹ گورنر جنرل بہادر اضلاع شمالی و غربی کو بھی اس تیاری جہاد سکھوں کی اطلاع دی گئی تھی، جس کے جواب میں صاحب ممدوح نے یہ تحریر فرمایا کہ جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو، ہم ایسی تیاری کرنے کے مانع نہیں ہیں۔[1]

جو کچھ اوپر بیان ہو چکا ہے، اُسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایسی اطلاع کے لیے کونسی گنجائش

---

[1] تواریخ عجیبہ صفحہ ۔ ۔

تھی؟ یہ افسانہ بھی اسی غرض سے تیار کیا گیا جس غرض سے سید صاحب کے مکاتیب میں تحریفات کی جسارت کی گئی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ سید صاحب کا وطن رائے بریلی اس وقت انگریزی سلطنت میں شامل نہ تھا بلکہ سلطنت اودھ میں شامل تھا۔

جدید نظریہ

ہمارے زمانے میں ایک نیا نظریہ پیدا ہوا اور وہ یہ کہ انگریزوں نے حسن تدبیر سے کام لے کر سید صاحب کے جہاد کا رُخ سکھوں کی طرف پھیر دیا تھا۔ یہ رائے اسی صورت میں درست مانی جا سکتی ہے کہ سید صاحب پہلے ہندوستان میں بیٹھ کر عازم جہاد ہوتے، حالانکہ ان کا اپنا بیان یہ ہے کہ ہندوستان کے کسی حصے میں بیٹھ کر شرعی جہاد کے آغاز کی کوئی صورت نہ تھی اور انھوں نے خود تمام پہلوؤں پر طویل و عمیق غور و فکر کے بعد مرکز کے لیے علاقہ سرحد تجویز کیا تھا۔ اس سلسلے میں سکھوں سے ٹکر ناگزیر ہو گئی۔ یہاں انگریزوں کے حسنِ تدبر یا حسنِ تدبیر کا موقع کہاں سے نکل آیا؟ حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب کے مقاصد و عزائم ہی نہیں بلکہ احوال و ظروف سے بھی ناواقفی کے باعث لوگ نئی نئی قیاس آرائیاں کرتے رہے، اگرچہ سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ سید صاحب کے احوال سے آگاہی حاصل کی جاتی۔

چھبیسواں باب

سفرِ ہجرت

۱

از رائے بریلی تا اجمیر

غافل مرو کہ تا در بیت الحرام عشق   صد منزل است منزل اول قیامت است

مالوفات کی قربانی

ایک برس اور دس مہینے دعوت و تہیہ جہاد میں بسر ہوئے۔ ۷- جمادی الاخریٰ ۱۲۴۱ھ (مطابق ۱۷- جنوری ۱۸۲۶ء) کو دوشنبہ کے دن سید صاحب نے راہِ ہجرت میں قدم رکھا اور اس سرزمین سے ہمیشہ کے لیے مفارقت اختیار فرمائی، جس کے محبت پرور ماحول میں زندگی کی چالیس بہاریں گزاری تھیں اور جس کے چپے چپے کے ساتھ قلبی وابستگی کے بیسیوں رشتے قائم تھے۔ یہ فریضہ جہاد کی بجا آوری کا پہلا مرحلہ تھا۔

انسان کا دل مالوفات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ ماں باپ کی محبت، بال بچوں کی محبت، گھربار اور مال و دولت کی محبت، احباب و اقربا کی محبت، ان میں سے کون سا رشتہ ہے جسے بے تکلف بطیبِ خاطر توڑا جا سکتا ہے؟ لیکن ایک رشتہ اور بھی ہے جو ان سب پر فائق و برتر اور مومن صادق کے لیے سب سے بڑھ کر جاذب و گیرا ہے، وہ ہے مرضاتِ الٰہی کا رشتہ، جس کی خاطر تمام دوسرے رشتہ ہائے محبت کو ایک لمحے کا توقف کیے بغیر توڑ دینا چاہیے۔ سرفروشانِ حق اس دشوار امتحان گاہ سے ہمیشہ کامگار و فائز المرام گزرے ہیں۔ ان کا دامن عبودیت راستے کے کانٹوں میں کبھی نہ اُلجھا۔ ان کے قلب صافی کے آئینے پر علائق دنیا کی کوئی گرد کبھی نہ جمنے پائی۔

سیّد صاحب کی حالت

سید صاحب سراپا محبت تھے۔ ایک سلیم الفطرت انسان کی طرح ان کے دل میں بھی وطن اور اقربا کے لیے بڑی سے بڑی تڑپ موجود تھی۔ اگرچہ ان کا گھرانا دنیوی مال و جاہ کا کبھی طلب گار نہ ہوا اور اس متاع کا سد کے لیے اس کے ہاتھ کبھی کسی کے سامنے نہ پھیلے، تاہم دینی و روحانی دولت مندی نے اس گھرانے کے لیے رفعت ذکر اور پذیرائی عامہ کے ایسے دروازے کھول دیے تھے، جو علم و فضل اور امارت و حکم کی اونچی مسندوں پر بیٹھنے والوں

کے لیے بھی باعث رشد تھے۔ خصوصاً سید صاحب کے لیے ارادت کا تو یہ عالم تھا کہ اکابر عز و عظمت اپنی ہر متاعِ عزیز اخلاص مندی سے دامن میں ڈالے ہوئے اس بات کے منتظر رہتے تھے کہ یہ بزرگ ہستی التفات و قبول سے اسے مشرف فرمائے۔ سید صاحب گھر بیٹھے راحت و فراغت کی ایسی زندگی بسر فرما سکتے تھے، جو اکثر حکمرانوں کو بھی نصیب نہ تھی۔ پھر کیوں انھوں نے یہ سب کچھ ٹھکرا دیا اور کس وجہ سے اپنے لیے حد درجہ تکلیفوں، مشقتوں اور پریشانیوں کا راستہ پسند فرمایا؟ یہ سلطانِ فرض کا حکم تھا، یہ خدائے پاک کی خوشنودی کا عشق تھا، جس کی خاطر کنارہ کش ہوئے گویا ان سے کبھی جان پہچان ہی نہ تھی:

آں کس کہ ترنخواست جاں راچہ کند　　فرزند و عیال و خان وماں راچہ کند
دیوانہ کنی، ہر دو جہاں سے بخشی　　دیوانۂ تو ہر دو جہاں راچہ کند

قل ان کان اٰبآؤکم وابنآؤکم واخوانکم وعشیرتکم واموالُنِ اقترفتموها و تجارة تخشوْنَ کسادها و مساکن ترضونها احب الیکم من اللّٰہ ورسولہٖ وجہاد فی سبیلہٖ فتربّصوا حتٰی یاتی اللّٰہُ بامرہٖ ۔

(اے پیغمبر) کہہ دے کہ اگر تمھارے باپ، تمھارے بیٹے، تمھارے بھائی، تمھاری بیویاں، تمھارا مال جو تم نے کمایا ہے، تمھاری تجارت، جس کے مندا پڑ جانے سے ڈرتے ہو، تمھارے رہنے کے مکان جو تمھیں پسند ہیں۔ غرض یہ ساری چیزیں تمھیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے، وہ تمھارے سامنے لے آئے۔

سید صاحب عزم و ہمت کا پیکر تھے۔ وہ اپنی زندگی رضائے باری تعالیٰ کے لیے وقف کر چکے تھے۔ انھوں نے وہی راہ اختیار کی، جو خدائے پاک کی رضا کے مطابق تھی۔ اگر اس میں مالوفات کا خون کیے بغیر قدم نہیں رکھا جا سکتا تھا تو سید صاحب خون کے اس دریا میں سے یوں گزر گئے گویا یہ فصلِ بہار کا طوفانِ رنگ تھا۔

زادِ راہ

راوی کہتے ہیں کہ روانگی سے پیشتر خادمہ کی معرفت تہ خانے میں سے رقم نکلوائی گئی تو دس ہزار روپے نکلے۔ سید صاحب نے ان میں سے پانچ ہزار بی بیوں کے حوالے کر دیے اور پانچ ہزار اپنے لیے رکھے۔ چھوٹی چھوٹی رقمیں تھیلیوں میں سلوائیں اور یہ تھیلیاں مختلف غازیوں

کی کمروں میں باندھ دیں۔ جن غازیوں کو ساتھ لیا، ان کی تعداد پانسو اور چھ سو کے درمیان تھی۔ دیکھیں شانِ عزیمت کہ پانچ ہزار روپے اور پانچ ساڑھے پانسو غازی لے کر اس ارادے سے گھر بار چھوڑا کہ ہندوستان کی تطہیر کو پایۂ تکمیل پر پہنچایا جائے؟ اربابِ دانش و تدبیر کی نگاہوں میں یہ سروسامان کیا وقعت حاصل کر سکتا ہے؟ لیکن قوتِ عزم و ایمان کے کرشمے دیکھیے کہ سرحد پہنچ کر کام شروع کیا تو ساڑھے چار برس تک پنجاب کی طاقتور حکومت کو معرضِ اضطراب میں ڈالے رکھا، یہاں تک کہ وہ ایک موقع پر پورا سرحدی علاقہ دے کر صلح کر لینے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ اگر اپنوں کی غرض پرستیاں رخنہ انداز نہ ہو جاتیں تو معاملہ اسی زمانے میں تکمیل کی آخری منزل پر پہنچ جاتا۔ ساز و برگ کی فرومایگی اربابِ عزیمت کی عنانگیر کبھی نہ ہوئی۔ انھوں نے کبھی یہ نہ سوچا کہ ساتھی کتنے ہیں اور سامان کی مقدار کا درجہ کیا ہے۔ وہ ہمیشہ فرض کی پکار سُن کر میدانِ عمل میں پہنچ جاتے ہیں۔ پھر جو کچھ پیش آتا ہے، اسے صبر و شکر سے قبول کر لیتے ہیں:

نہ برگ و ساز کی پروا، نہ انتظارِ رفیق یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق
اگر خدا پہ بھروسا ہے، ہو یگانہ رواں خدا سے بڑھ کے نہیں برگ و ساز کی توفیق

اہل و عیال

سید صاحب نے ہجرت کی تھی، اس لیے اہل و عیال کو بھی وطن سے نکال لینے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن انھیں اس وجہ سے ساتھ نہ لیا کہ راستے کے احوال و مشکلات کا کوئی اندازہ نہ تھا، نہ یہ معلوم تھا کہ جس مقام پر پہنچنا ہے، اس کی کیفیت کیا ہے۔ یہ طے ہو چکا تھا کہ کوئی موزوں مامن دستیاب ہوتے ہی اہل و عیال کو بلا لیں گے۔ اس وقت غالباً خیال نہ ہو گا کہ دونوں بی بیوں اور بچوں سے یہ آخری ملاقات ہے۔ قضا و قدر کا حکم یہی تھا کہ ۷۔ جمادی الثانی ۱۲۴۱ھ کو بچھڑنے کے بعد پھر اس دنیا میں یکجائی نصیب نہ ہو۔ یہ سب کچھ ایک سرگزشت کی حیثیت میں پڑھ لینا شاید چنداں شاق نہ گزرے، لیکن اندازہ کر لینا چاہیے کہ اس مردِ حق کے حساس قلب کی کیا حالت ہو گی، جو سراپا محبت تھا، مگر ایک ایک محبوب رشتے کو خدا کی راہ میں بے تکلّف توڑ توڑ کر پھینک رہا تھا۔

یہاں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ سید صاحب پانچ ہزار روپے اس غرض سے ازواج کو دے گئے تھے کہ ان کے گزارے کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا اور انھیں بھی وطن چھوڑ کر غربت میں زندگی کے دن بسر کرنے تھے۔ سید صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد نیازمندوں نے ازواج کی خدمت میں بطورِ خود بھی رقمیں پیش کی ہوں گی۔ جب ازواج سندھ پہنچ گئیں اور انھیں لشکرِ اسلام کی عسرت کا علم ہوا تو بڑی بی بی صاحبہ نے دس ہزار روپے کی رقم ہنڈیوں کی شکل میں عیسیٰ خیل اور کالاباغ کے راستے حاجی بہادر شاہ خان کے ہاتھ سید صاحب کے پاس بھیج دی۔ گویا یہ خاندان ایثار و قربانی میں بھی سید صاحب کے نقشِ قدم پر چلتا رہا۔

جذبہ ایثار و خدمت

ہجرت کی خبر روانگی سے بہت پہلے مشہور ہو چکی تھی۔ ہندوستان میں یہ اقدام اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل یگانہ تھا۔ ممکن ہے پہلے مختلف لوگوں نے وطن کی سکونت ترک کر کے اجنبی سرزمین میں سکونت اختیار کی ہو، لیکن جہاد کی نیت سے ہجرت کا عزم کسی نے نہ کیا تھا۔ اس لیے جہاں جہاں یہ اطلاع پہنچتی رہی، لوگ جوق جوق زیارت کے لیے تکیہ شریف میں آنے لگے۔ وہ سب، کچھ نہ کچھ بطور ہدیہ لاتے ہوں گے، لیکن ہمیں اس بارے میں یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں۔ شیخ فرزند علی رئیس غازی پور، سید صاحب کے قدیمی نیازمند تھے۔ وہ آئے تو دو خوبصورت گھوڑے وردی کے بہت سے کپڑے اور چالیس جلد خوبصورت قلمی قرآن لے کر آئے، ساتھ اپنے فرزند عزیز شیخ امجد علی کو لائے، جو سید صاحب کے ساتھ گئے۔ جنگ اوتمان زئی میں "زندہ شہید" کا خطاب پایا۔ بالاکوٹ میں سید صاحب کے ساتھ شرف یاب شہادت ہوئے۔

شیخ غلام علی رئیس الہ آباد کی شانِ عقیدت کے بعض واقعات سفرِ حج کے سلسلے میں پیش کیے جا چکے ہیں۔ ہجرت کے موقع پر وہ آئے تو قسم قسم کے اسلحہ، خیمے، گھوڑے، کپڑوں کے تھان، کتابیں، قلمی قرآن مجید، برتن، سید صاحب کے لیے پوشاکیں اور نقد روپیہ لائے۔ ایک خیمہ مسجد کی شکل کا خاص سید صاحب کے لیے تیار کرایا تھا۔ اُسے مع فرش نذر کیا۔ جب سنا کہ سید صاحب راجپوتانہ اور سندھ کے راستے سرحد جائیں گے اور اس راستے کے کنوؤں میں پانی بہت گہرا ہوتا ہے تو شیخ صاحب نے بیسیوں چھوٹے چھوٹے ڈولچے بنوائے۔ ان کے لیے لمبی رسیوں کا انتظام کیا اور یہ سب چیزیں غازیوں میں تقسیم فرما دیں۔

تاریخ ہجرت

جہاد کی غرض سے سید صاحب کی روانگی کی دو تاریخیں حکیم مومن خاں نے کہی تھیں:

۱ - جو سید احمد امام زماں و اہلِ زماں
کرے ملاحدہ بے دین سے ارادۂ جنگ
تو کیوں نہ صفحۂ عالم پہ لکھے سالِ وغا
"خروجِ مہدیِ کفار سوز" کلکِ تفنگ

۴۲ ھ ۱۲

۲ - گلاب ناب سے دھوتا ہوں نحرِ اندیشہ
کہ فکرِ مدحتِ سبطِ قسیمِ کوثر ہے
وہ کون؟ امامِ جہان و جہانیاں احمد
کہ محض مقصد ہی سنتِ پیمبر ہے
زمیں کو مہرِ فلک سے نہ کیوں ہو دعویٔ نور
کہ اس کا رایتِ اقبال سایہ گستر ہے
زبسکہ کام نہیں اسے سوائے جہاد
جو کوئی اس سے مقابل ہے سو وہ کافر ہے

وہ بادشاہِ ملائک سپاہ، کوکبِ دیں — کہ نورِ شمس و قمر جس کی گردِ لشکر ہے
وہ شعلہ خصلت دشمن سوز و کفر گداز — کہ جس کا نقشِ قدم مہرِ روزِ محشر ہے
وہ برقِ خرمنِ اربابِ شرکِ اہلِ ضلال — کہ شعلہ خوشۂ حاصل تو دانہ اخگر ہے
وہ قہرمانِ فلک توسن و نجوم حشم — کہ تُرکِ چرخ غلام اس کا، مہر چاکر ہے
وہ شاہِ مملکتِ ایماں کہ جس کا سالِ خروج ۔ — "امام برحق مہدی نشاں، علی فر" ہے

۴۲ ۵ ۱۲

۳ - ایک اور شاعر نے بھی روانگی کی تاریخ کہی تھی، اس کے شعر اچھے نہ سہی، لیکن یادگار کے طور پر اس کے شعر بھی محفوظ رہنے چاہئیں:

بعزمِ جہادِ آں شہِ ملک و دیں — کہ شد احمدِ عصر نامش غریب
چو بربست رختِ سفر، شد سوار — گرفت از پس و پیش فوجِ حبیب
ببحرِ تفکّر شدم غوطہ زن — دُرِ سالِ آں تا کہ گردد نصیب
بریدہ سرِ کفر و پائے عدو — بہ آہنگِ راحت فزائے عجیب

سروشے ندا داد از بامِ چرخ
کہ نصرٌ من اللہ فتحٌ قریب

"نصرٌ من اللہ فتحٌ قریب" کے اعداد میں سے کفر کا سر" یعنی کاف" اور عدو کے پاؤں یعنی" واؤ" کے اعداد منہا کر دیے جائیں تو صحیح تاریخ نکل آئے گی۔

روانگی

سید صاحب نے ۷۔ جمادی الثانی کو خیمہ ستی ندی کے کنارے لگوالیا۔ دن بھر دوستوں اور عزیزوں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ رات کے وقت کشتی میں بیٹھ کر ندی کو عبور کیا اور دوسرے کنارے پہنچ کر شکرانے کے دو نفل پڑھے۔ شکرانے کا اس سے بڑا موقع کیا ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا و خوشنودی کے راستے میں قدم رکھنے کی توفیق عطا فرمائی اور مالوفات کی کوئی شے اس عزم کے سلسلے میں دامن گیر نہ ہو سکی۔ قرابت داروں میں سے عورتیں اور مرد رات بھر ندی کو عبور کر کے ملاقات کے لیے پہنچتے رہے۔ وہ وقت سب پر شاق گزر رہی تھی لیکن سید صاحب سکون و اطمینان کے ساتھ سب سے باتیں کرتے رہے۔ اگرچہ جانتے تھے کہ اس دنیا میں دوبارہ ملنے کی صورتیں صرف دو ہیں: اوّل یہ کہ تمام قرابت دار خود سید صاحب کی طرح ہجرت کی راہ اختیار کریں، دوم یہ کہ سرحد سے راستے پر یہ ملکِ ہندوستان اغیار سے پاک ہو

جو مجاہدین ساتھ جا رہے تھے، انھیں سرسری طور پر چار جماعتوں میں بانٹ لیا تھا۔ پہلی جماعت خود سید صاحب کے ساتھ روانہ ہوئی۔ چار روز بعد دوسری جماعت نے اللہ بخش خاں مورانوی کے زیرِ قیادت سفر اختیار کیا۔ پھر تیسری جماعت کچھ وقفے کے بعد نکلی اور آخر میں چوتھی جماعت۔ اس طرح تھوڑے تھوڑے وقفے سے مجاہدین روانہ ہوئے۔

۸۔ جمادی الثانی کو دلمئو میں قیام فرمایا اور ۹۔ کو فتح پور میں اترے۔ شیخ غلام علی اور شیخ فرزند علی تکیے سے رخصت ہو کر چلے گئے تھے، لیکن شوق کی بیتابی چین نہیں لینے دیتی تھی۔ دوبارہ زیارت کے لیے فتح پور پہنچ گئے اور شیخ غلام علی نے پورے قافلے کی مہمانداری کا انتظام اپنے ذمے لے لیا۔

فتح پور سے چلے تو بہوا میں منزل کی۔ چلہ تارا کے گھاٹ سے جمنا کو عبور کیا۔ پھر دسرمنڈا میں تین روز ٹھہرے۔ بعد ازاں جلال پور اور جالون ہوتے ہوئے گوالیار پہنچ گئے[1]۔

غالباً جالون میں یہ خبر پہنچی تھی کہ سید صاحب کے بھانجے سید حمید الدین کے گھر بچہ پیدا ہوا ہے جس کا نام محمد سعید رکھا گیا اور سید حمید الدین سید صاحب کے ساتھ تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ مردانِ راہِ حق رضائے باری تعالیٰ کے عشق میں کس اونچے مقام پر پہنچ گئے تھے اور انھوں نے دنیوی علائق کے عزیز ترین رشتوں کو بھی بے تکلف اس عشق کی تابعیت میں دے دیا تھا۔

گوالیار

گوالیار میں سید صاحب کے کئی عقیدت مند موجود تھے۔ ان میں سے غلام حیدر خاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، جو پہلے نواب امیر خاں کے ساتھ تھے اور اسی زمانے میں سید صاحب کے گہرے دوست بن گئے تھے۔ جب نواب کا کارخانہ درہم برہم ہو گیا تو غلام حیدر خاں مہاراجا سندھیا کے لشکر میں اونچے عہدے پر مامور ہو گئے۔ ان کے نام سید صاحب کا ایک مکتوب بھی مجموعۂ مکاتیب میں موجود ہے۔ راجا ہندو راؤ بھی سید صاحب کا بہت معتقد تھا۔ یہ دولت راؤ سندھیا کی مہارانی کا بھائی تھا۔ اس زمانے میں ریاست کا سارا انتظام ہندو راؤ ہی سے متعلق تھا۔ دولت راؤ بیمار تھا[2]۔

---

[1] اس سفر میں کالپی سے قریب ایک مقام "آٹا" میں بھی ٹھہرنے کا ذکر بعض روایات میں آیا ہے۔

[2] دولت راؤ سندھیا ریاست کا مالک تھا۔ وہ بعارضۂ استسقاء ۲۷۔ جون ۱۸۲۷ء کو فوت ہوا۔ اس کی بیوی مہارانی بیجا بائی مرہٹہ سردار گھاٹگے کی بیٹی تھی اور اپنے زمانے کی مشہور مہارانی تھی۔ ہندو راؤ بیجا بائی کا بھائی تھا، جس کے نام سے دہلی میں ہندو راؤ کا باڑہ مشہور ہے۔ رانی کی ذاتی جائداد تین کروڑ کی بیان کی جاتی ہے۔ اس کے بچہ کوئی نہ تھا اور دستور کے مطابق اس نے جنکوجی سندھیا کو متبنیٰ بنا لیا تھا۔ ۱۸۶۲ء میں رانی فوت ہوئی۔

گوالیار میں سید صاحب کو فتح علی خاں کے باغ میں ٹھہرایا گیا۔ مہاراجہ کی طرف سے مہمانداری کا پورا انتظام تھا۔ کئی مرتبہ ہندو راؤ نے دعوتیں کیں۔ ایک دعوت کی تفصیل راویوں نے یوں بیان کی ہے کہ مرہٹی کھانا بھی پکوایا۔ شیرمال، پراٹھے، پلاؤ، متنجن، قلیہ، فیرینی، یاقوتی، کباب، پسندے، مرغ بریاں وغیرہ بھی تیار کرائے۔ سید صاحب اور بعض بلند پایہ ساتھیوں کے ہاتھ ہندو راؤ نے خود دھلوائے۔ کھانے کے بعد جو پان پیش کیے، وہ سب ورق طلا میں ملفوف تھے۔ بہت سے تحائف خوانوں میں لگا کر نذر کے لیے لائے گئے۔ ان میں موتیوں کا ایک بیش بہا ہار اور دو چغے بھی تھے، جن پر زری کا نہایت عمدہ کام تھا۔

مہاراجا سے ملاقات

دولت راؤ بیماری کے باعث خود حاضر خدمت نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وجہ سے سید صاحب کو محل میں بلایا۔ جو غازی آپ کے ساتھ گئے، انھیں محل کے ایک بڑے کمرے میں بٹھایا گیا۔ پھر ہندو راؤ سید صاحب کا دست مبارک اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے آپ کو مہاراجا کے کمرے میں لے گیا۔ بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں، جن کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ راوی صرف اتنا بتاتے ہیں کہ مہاراجا نے عرض کیا: حضرت! سنا ہے آپ کی توجہ میں بڑی تاثیر ہے لطفاً مجھے بھی اس سے سرفراز فرمائیے۔ سید صاحب نے بے توقف فرمایا کہ توجہ تقرب الی اللہ کی بنا پر موثر ہوتی ہے کفر اور تقرب یکجا نہیں ہو سکتے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک قوت بخش غذا ہے۔ اگر تندرست اور صحیح البدن آدمی کھائے گا تو اس کی قوت بڑھے گی، لیکن اگر وہ ایک بیمار اور ضعیف الہضم آدمی کو دیا جائے گا تو اسے سازگار نہ ہو گی۔

مہارانی پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے عرض کیا کہ آپ ایک سال گوالیار میں قیام فرمائیں، تمام ساتھیوں کی مہمانداری ہمارے ذمے ہو گی۔ سید صاحب نے فرمایا: یہ ہو نہیں سکتا۔ پھر مہارانی نے کہا کہ اچھا اتنی مدت کے لیے ٹھہر جائیے کہ آپ کے لشکر کے لیے پورا سامان فراہم کیا جا سکے۔ سید صاحب یہ بات بھی نہیں مان سکتے تھے۔ اس اثنا میں نماز عصر کا وقت آ گیا۔ شیخ باقر علی نے اذان کہی۔ ہندو راؤ کے حکم سے فوراً سقے آ گئے۔ جنھوں نے سب غازیوں کو وضو کرایا۔ سید صاحب نے نماز پڑھائی۔ پھر مہاراجا سے رخصت ہو کر چلے آئے۔

افغانستان کے شاہی خاندان کا ایک شہزادہ گوالیار میں ٹھہرا ہوا تھا۔ سید صاحب نے اس کے لیے مہاراجا سے پرزور سفارش کی۔ شہزادے نے درخواست کی کہ میری لڑکی کو نکاح میں لے لیجیے سید صاحب نے فرمایا مجھے نکاح کی ضرورت نہیں، البتہ میرے بھانجوں یا بھتیجوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح منظور ہو تو قبول کرتا ہوں۔ شہزادے نے یہ بھی قبول کر لیا۔ جب ٹونک سے سید صاحب نے

اپنے بھانجے سید عبدالرحمٰن کو اس غرض سے رائے بریلی بھیجا تھا کہ اہل و عیال کو ساتھ لے آئے تو ایک خط اس شہزادے کے نام بھی لکھ دیا تھا۔ یہ خط راستے میں بھیگ کر خراب ہو گیا اور سید عبدالرحمٰن شہزادے سے ملے بغیر پہلے ٹونک پھر سندھ چلے گئے۔

غازیوں کی جماعتیں

غازیوں کی سرسری جماعت بندی روانگی سے پیشتر رائے بریلی میں کر لی گئی تھی۔ گوالیار پہنچ کر انھیں باقاعدہ پانچ جماعتوں میں تقسیم کیا۔ قیام و سفر میں ہر جماعت کو اس تقسیم کے مطابق عمل پیرا ہونے کا حکم ہو گیا۔ پانچوں جماعتوں کے الگ الگ سرعسکر مقرر فرما دیے۔ تقسیم یوں ہوئی:

۱ - جماعت خاص: یہ جماعت قیام و سفر میں قلب لشکر سمجھی جاتی تھی۔ اس کے سرعسکر مولوی محمد یوسف پھلتی قرار پائے، جو سید صاحب کے ساتھ شیفتگی میں سب پر فائق اور تمام امور کے مہتمم خاص تھے۔ خود سید صاحب بھی اسی جماعت کے ساتھ چلتے اور ٹھہرتے تھے۔

۲ - مقدمۃ الجیش: یہ جماعت سب سے آگے رہتی تھی۔ اس کے سرعسکر شاہ اسماعیل مقرر ہوئے۔

۳ - میسرہ: اس جماعت کے اصل سرعسکر سید صاحب کے بھتیجے سید محمد یعقوب تھے۔ چونکہ انھیں بعض ضروری کاموں کے سرانجام کے لیے ٹونک میں چھوڑ دیا تھا اس لیے شیخ بڈھن ان کی جگہ نیابۃً سرعسکر بن گئے۔

۴ - میمنہ: اس جماعت کے سرعسکر امجد خاں رئیس گنتہ تھے۔

۵ - ساقۃ الجیش: یہ جماعت چھکڑوں اور گاڑیوں کے ہمراہ چلتی تھی۔ سب سے پہلے روانہ ہو کر عموماً سب کے بعد منزل پر پہنچتی تھی۔ اس کے سرعسکر اللہ بخش خاں مورانوی تھے۔

سید صاحب نے یہ بھی ارشاد فرما دیا تھا کہ بار برداری کا انتظام شاہ اسماعیل اور سید محمد یعقوب باری باری کرتے رہیں۔ بعد میں جماعتوں کی تعداد بڑھ گئی۔ جو متفرق اصحاب شامل ہوتے تھے، انھیں امجد خاں کی جماعت میں رکھا جاتا تھا۔ جماعتوں کے چھوٹے چھوٹے دستوں کو بھیلے کہا جاتا تھا۔

گوالیار سے ٹونک تک

سید صاحب نے جمعہ کی دو نمازیں گوالیار میں ادا کیں، یعنی کم از کم دس بارہ دن ضرور ٹھہرے۔ سندھیا نے جو تقدمہ پیش کی، اس کی پوری کیفیت معلوم نہیں۔ روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ تین گٹھے کپڑوں کے تھے، جنھیں دو دو آدمی اٹھاتے تھے اور تین خریطے نقدی کے تھے۔ وہاں سے روانہ ہوئے تو ایک ہفتے میں قرولی پہنچے۔ قیام کا

ارادہ نہ تھا، لیکن کسمنڈی کے رئیس جلال الدین وہاں مقیم تھے۔ انھوں نے بہ اصرار ایک رات کے لیے روک لیا اور پورے لشکر کو کھانا کھلایا۔ پھر خوشحال گڑھ، دانتوبی، ٹھاڑی جھلائی ہوتے ہوئے چھ روز میں ٹونک پہنچ گئے۔ میرا اندازہ ہے کہ رائے بریلی سے ٹونک تک پورے سفر میں قریباً ایک مہینا صرف ہوا۔ اس لحاظ سے سید صاحب رجب کے آس پاس ٹونک پہنچے ہوں گے۔

نندڈاری میں ایک فقیر نہایت نامناسب انداز میں لوگوں سے سوال کر رہا تھا۔ سید صاحب نے اسے بٹھا کر ایسے پرتاثیر انداز میں نصیحت فرمائی کہ اس نے فوراً بیعت کر لی اور مجاہدین میں شامل ہو گیا۔ پہلا نام معلوم نہیں، سید صاحب نے اس کا نام عبداللہ رکھا اور محمد سعید خاں جہان آبادی کے جیلے میں داخل کر دیا۔ سرحد ہی میں اس نے شہادت پائی۔

قیامِ ٹونک

سید صاحب راجپوتانہ کے راستے سرحد جانے کا فیصلہ پہلے کر چکے تھے۔ یہ سنتے ہی نواب امیر خاں اور ان کے فرزند ارجمند نواب وزیر الدولہ نے بڑے اہتمام سے دعوت دے دی تھی کہ ٹونک ضرور ٹھہریں۔ نظر باغ قیام کے لیے مقرر ہوا۔ سید صاحب کے پہنچتے ہی نواب صاحب اور ان کے فرزند گھوڑوں پر سوار ہو کر زیارت کے لیے آئے۔ عصر اور مغرب کی نمازیں سید صاحب کے ساتھ ادا کیں اور ایک مہینے سے زائد اپنے ہاں ٹھہرائے رکھا۔ سید صاحب نے پہلی ہی ملاقات میں ایک نہایت عمدہ عربی گھوڑا نواب کو تحفے کے طور پر دیا۔

اس وقت تک اہل و عیال کو ٹھہرانے کے لیے کوئی موزوں مقام تجویز نہیں ہوا تھا۔ نواب امیر خاں کے اصرار پر فیصلہ کیا گیا کہ جب تک کوئی بہتر اور مستقل جائے سکونت تجویز ہو، اہل و عیال ٹونک میں ٹھہریں۔ چنانچہ سید صاحب نے سید عبدالرحمٰن (خواہر زادۂ سید صاحب)، سید محمد یعقوب (برادر زادہ سید صاحب) اور سید زین العابدین (ابن سید احمد علی خواہر زادۂ سید صاحب) کو وطن روانہ کر دیا کہ مستورات کو لے آئیں۔ یہ لوگ شوال تک رائے بریلی میں ٹھہرے رہے اور غالباً ذی قعدہ میں بریلی سے نکل کر اوائل ذی حجہ میں ٹونک پہنچے جب سید صاحب کا موکب شکار پور کے قریب تھا۔

یقین ہے نواب امیر خاں نے اسلحہ اور دوسرے ساز و سامان کے علاوہ نقد روپیہ بھی خاصی مقدار میں سید صاحب کی نذر کیا ہو گا۔ مکاتیب سے ظاہر ہوتا ہے، روانگی کے وقت سید صاحب سے یہ اقرار بھی لے لیا تھا کہ ضرورت پیش آنے پر مصارف کے لیے مجھے (نواب کو) اطلاع نہ دی گئی، تو یگانگی کا معاملہ باقی نہ رہے گا۔[1]

---

[1] مکاتیب سید صاحب صفحہ ۲۰۸

ہر مقام پر لوگ ذوق و شوق سے بیعت کرتے تھے۔ ٹونک کے بارے میں نواب وزیر الدولہ لکھتے ہیں:

زمانے کہ آنحضرت بعزم جہاد توجہ فرمودند و در دار الریاست والدم رونق افزا بودند، والدم و دیگر خلائق لاتعداد و لاتحصی بشرف بیعت مشرف گشتند[1]	جب سید صاحب جہاد پر جاتے ہوئے میرے والد کے دار الریاست میں رونق افزا تھے تو میرے والد اور دوسرے بے شمار لوگ بیعت سے مشرف ہوئے۔

ٹونک سے نکل کر دریائے بناس کو عبور کیا اور گلو گھاٹ میں منزل ہوئی، پھر جھلانہ میں ٹھہرے۔ وصایا سے معلوم ہوتا ہے کہ رخصت کے وقت نواب امیر خاں اور نواب وزیر الدولہ چار کوس تک ساتھ گئے[2]۔

رسالدار عبد الحمید خاں

جھلانہ میں رسالدار عبد الحمید خاں کو ہدایت نصیب ہوئی۔ یہ بڑے بہادر اور جوانمرد تھے۔ ٹونک میں اچھا عہدہ مل گیا۔ بری صحبت میں بیٹھ کر فسق و فجور میں غرق ہو گئے۔ جھلانہ میں اپنے ایک اوباش رفیق کے ساتھ سید صاحب کا لشکر دیکھنے کے لیے راستے پر آ کھڑے ہوئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ لشکر کی عام حالت پر نظر پڑی تو استہزا بھی کیا۔ سید صاحب نے انھیں دیکھا تو مسکرا کر فرمایا: ”خان جیو! آپ بھی بیعت کر لیجیے۔“ ساتھ ہی اپنا دست مبارک آگے بڑھا دیا۔ عبد الحمید خاں اور ساتھی پر ان چند لفظوں کا اتنا اثر ہوا کہ فوراً بیعت کر لی۔ اسی لمحے سے پوری زندگی بدل گئی۔ ان کے ندیموں نے گمراہ کرنے کی ہر چند کوششیں کیں لیکن عبد الحمید خاں راہ حق پر جمے رہے اور فیصلہ کر لیا کہ سید صاحب کا ساتھ دیں گے۔ ساتھیوں نے بہت روکا، لیکن وہ ملازمت چھوڑ کر سرحد پہنچے، تین برس سید صاحب کے ساتھ رہے۔ جنگ زیدہ کے بعد لشکر اسلام کے رسالدار بنا دیے گئے۔ مایار کی جنگ میں سخت زخم لگے، جن سے جانبر نہ ہو سکے۔ تورو میں انھیں دفن کیا گیا۔

ٹونک سے اجمیر تک چار منزلیں ہوئیں۔ نواب امیر خاں نے ایک بلند بالا گھوڑا چلتے وقت سید صاحب کو دیا تھا۔ آپ نے کئی مرتبہ کہا کہ یہ سفر کی صعوبتیں برداشت نہ کر سکے گا، لیکن نواب صاحب فرماتے رہے کہ جو چیز نذر کر چکا ہوں، اسے واپس نہ لوں گا۔ یہ گھوڑا اجمیر سے اگلی منزل پر پہنچ کر مر گیا۔

---

[1] وصایا نصف ثانی صفحہ ۱۱۰۔ [2] ایضاً

داد ابوالحسن اور سیّد ابو محمد

اجمیر میں سید صاحب یقیناً چند روز ٹھہرے ہوں گے۔ وہاں مولوی سراج الدین اور دوسرے عمائد نے بیعت کی۔

تکیہ شریف سے چلے تھے تو سید صاحب کے اقربا میں سے دو آدمی ساتھ تھے، ایک داد ابوالحسن، دوسرے سید ابو محمد، جو سید صاحب کی زوجہ اولیٰ زہرہ بی بی کے خالہ زاد بھائی تھے۔ یہ دونوں نصیر آباد کے باشندے تھے۔ دلمئو پہنچے تو لوگوں نے پوچھا کہ کیا آپ بھی جہاد کے لیے ساتھ جا رہے ہیں؟ دونوں نے جواب دیا کہ نہیں، ہم تو صرف میاں صاحب[1] کو چھوڑنے آئے ہیں۔ ایک دو منزل کے بعد پھر پوچھا تو اس وقت بھی یہی جواب دیا۔ ٹونک میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ اب اجمیر قریب ہے، خیال ہے کہ اسے دیکھتے چلیں۔ لیکن اجمیر سے بھی واپس نہ ہوئے تو آشکارا ہوا کہ معیت کا پختہ ارادہ کر کے نکلے تھے۔ دونوں سرحد میں شہید ہوئے۔

مولانا عبدالحی

اجمیر سے سید صاحب نے مولانا عبدالحی کو بعض خاص کاموں کے لیے دہلی بھیج دیا۔ وہ کچھ مدت ٹھہر کر بلاوے پر دہلی سے پانی پت، کرنال، تھانیسر، ممدوٹ، بہاول پور وغیرہ کے راستے سرحد گئے۔ مولوی محمد جعفر مرحوم نے مولانا عبدالحی کے اس سفر اور سید صاحب کے سفرِ ہجرت کو مخلوط کرتے ہوئے لکھ دیا کہ سید صاحب اجمیر سے دہلی آئے، پھر پانی پت کرنال وغیرہ کے راستے گئے[2]۔ یہ صحیح نہیں۔ سید صاحب نے اجمیر، مارواڑ اور سندھ کا راستہ اختیار کیا، جیسا کہ اگلے ابواب سے ظاہر ہوگا۔

منازل کے بارے میں ایک تحریر

سنی اوقاف دہلی کے ناظر سید محمد جعفر کے کتب خانے سے ایک تحریر ملی جو حاجی صابر علی کے ذریعے سے شیخ غلام علی الہ آبادی کو بھیجی گئی تھی۔ وہ ذیل میں درج ہے:

ہر کہ خواہد کہ بلشکر سید احمد برسد ہمیں منازلہا اختیار کند انشاء اللہ تعالیٰ بآرام تمام خواہد رسید:

اول منزل ٹونک، مال پور، بھمبولہ، کشن گڑھ، اجمیر، بریان، میرتھا،
۱۲ ۹ ۹ ۸ ۱۲ ۸
کھجوانہ، ناگور، تعلی، ازبکوشمش (کذا) برمکان چوبدار سنبولہ، بیکانیر،
۱۰ ۱۰ ۷ ۸ ۹ ۸

---

[1] خاندان کے لوگ سید صاحب کو میاں صاحب ہی کہتے تھے۔ [2] تواریخ عجیبہ صفحہ ۳۷۔

برمکان دیدار بخش۔

کاناسر و جلال ، کیلتی ، چھتر گڑھ ، لیلی ، بھوگرہ ، برمکان الٰہی بخش ،

۸ ۸ ۶ ۱۲

اسیر گڑھ بر مسجد ، مڑ ، بسرپور ، بہاول پور از انجا بہ ڈیرہ غازی خاں ۔ از انجا معلوم خواہد شد

۸ ۱۲

گویا ٹونک سے اجمیر تک ۸۳ کوس اور پورا فاصلہ ۱۸۰ کوس ہُوا بعض مقامات میں قیام کی جگہیں بتا دی گئیں یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ بہاول پور سے ڈیرہ غازی خاں پہنچ جانا چاہیے۔ آگے کا راستہ بتانے والے لوگ وہاں موجود ملیں گے۔ لیکن واضح رہنا چاہیے کہ نہ یہ تحریر سید صاحب کی ہے اور نہ اسے سید صاحب کے منازل سفر میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کسی موقع پر کسی نیاز مند نے غازیان جہاد کی سہولت کے لیے یہ تحریر ہندوستان بھیج دی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی ترتیب وارسال میں سید صاحب کا ایما شامل ہو۔

ستائیسواں باب

سفرِ ہجرت

(۲)

از اجمیر تا شکار پور

در رہِ منزلِ جاناں کہ خطرہاست بجاں   شرطِ اوّل قدم آن است کہ مجنوں باشی

اجمیر سے پالی اجمیر سے پالی غالباً اڑتالیس کوس ہے[1]۔ اس زمانے میں سفر کی منزلیں یہ تھیں: ناگیلہ، گوتی، چھوڑہ، کھوکھرہ، جاوَن اور پالی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ سید صاحب نے کونسا راستہ اختیار کیا اور کہاں کہاں ٹھہرے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ وسط رمضان میں آپ پالی میں تھے۔

پالی راجپوتانہ کا ایک بڑا تجارتی مرکز تھا۔ سید صاحب وہاں چار روز ٹھہرے رہے اور ۱۵-۱۶۔ رمضان کو روانہ ہوئے۔ وہاں دور نزدیک کے ہزاروں مردوں اور عورتوں نے بیعت کی۔ قریباً ایک سو آدمی روزے کی حالت میں گھروں سے چل پڑے کہ پالی پہنچ کر بیعت کریں۔ سید صاحب روانہ ہو چکے تھے۔ انھوں نے اگلی منزل پر پہنچ کر بیعت کی۔ سات آدمی دوسرے روز بھی ساتھ رہے۔ ایک بڑھیا اپنے گاؤں سے لمبی مسافت طے کر کے پالی پہنچی۔ سید صاحب نہ ملے تو وہ اپنے نواسے کو ساتھ لے کر پیچھے روانہ ہو گئی۔ کھنڈیا گڑھ پہنچ کر بیعت کی اور پچاس روپے لشکر کی دعوت کے لیے پیش کیے۔

پالی سے روانگی کے وقت پندرہ اونٹ اور تین چھکڑے (دو نواب امیر الدولہ کے اور ایک جماعت کا) کریم بخش گھاٹم پوری کے ہمراہ ٹونک بھیج دیے تھے۔ اس لیے کہ ریگ زار میں انھیں ساتھ لے جانا ممکن نہ تھا۔ ایک ٹھیکدار ساتھ ہو گیا جو ہر منزل پر مجاہدین کے لیے رسد کا انتظام کر دیتا اور ایک پیسہ فی روپیہ کمیشن لیتا۔

---

[1] ایک روایت میں ہے: اجمیر از ٹونک چہل کروہ و پالی از اجمیر پنجاہ کروہ۔

پالی سے سوراہا

پالی سے سوراہا تک یہ منزلیں ہوئیں :

۱ - کھٹیا گڑھ -

۲ - سلاباس : یہ مقام جودھ پور شہر سے چار کوس جنوب میں واقع ہے -

۳ - روپاباس : راستے میں خاردار جنگل سے گزرے - یہاں پانی کی بے حد قلت تھی - تین ہاتھ چوڑا ایک کنواں تھا، جس کا پانی ایک سو ہاتھ گہرا تھا اور سخت نمکین، لیکن چھ چھ کوس سے لوگ پانی کے لیے یہیں آتے تھے[۱] -

۴ - ارابو : سلاباس سے آٹھ کوس آگے - سید حمید الدین والی جودھ پور کی غفلت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس علاقے میں پانی کمیاب ہے - ایک کنواں تیار کرانے پہ کم و بیش ایک ہزار روپے خرچ ہو جاتے ہیں، لیکن جو کنوئیں موجود ہیں ان کی دیکھ بھال نہیں کی جاتی اور صاف نہیں کرایا جاتا -

۵ - برسکری : ارابو سے آٹھ کوس پر ہے - یہاں ایک جھیل کے کنارے ٹھہرے، جو نصف کوس چوڑی اور پانچ کوس لمبی تھی اور اس کا پانی میٹھا تھا -

۶ - پانچ پودرہ : ایک چھوٹے سے تالاب کے کنارے قیام کیا - یہاں بازار اور حویلیاں پختہ ملیں -

۷ - تروڑ : راستے میں بالوترہ کو تین کوس پر بائیں ہاتھ چھوڑا اور ندی کے بہاؤ میں ٹھہرے، جس کا پانی اتنا نمکین تھا کہ جانوروں نے بھی اسے منہ نہ لگایا - مجبور ہو کر بہاؤ میں جا بجا دو دو تین تین ہاتھ گڑھے کھودے تو بعض میں شیریں پانی نکل آیا -

۸ - چاندڑہ : راستے میں وحشت ناک خاردار جنگل سے گزرے - ریت اتنی زیادہ تھی کہ اس میں ایک کوس چلنے سے عام مسافت کے چار کوس کے برابر تکان ہوتی تھی - اس ریت کو مقامی اصطلاح میں "تھلی"[۲] کہتے ہیں - یہاں بھی پانی بہت خراب ملا -

۹ - پامو : یہاں ایک پختہ کنواں مل گیا، جس پر حوض بنا ہوا تھا -

۱۰ - کوٹھدا پار : اس منزل کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا -

۱۱ - باندرا : یہاں ایک گہرے تالاب کے عین کنارے پر ٹھہرے -

---

[۱] ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی رات روپاباس کے بعد لوناباس میں گزاری - [۲] اس "تھلی" کو سندھ میں "تھر" (تھرپارکر) اور پنجاب میں "تھل" کہتے ہیں -

۱۲ - برسالہ : یہاں ایک گہرا کنواں تھا اور اس پر پختہ حوض بنا ہوا تھا۔ پانی نکالنے کے لیے ایک اجیر مقرر ہوا، آبادی پہاڑ پر تھی۔ ایسا پہاڑ سلاباس کے بعد پہلی مرتبہ نظر آیا تھا۔

۱۳ - سوراہا۔

سوراہا میں شوال کا چاند دیکھا اور عید کے لیے ایک دن ٹھہرنا ضروری ہو گیا۔ ویسے بھی پالی سے آگے سوراہا تک مسلسل مسافت کے باعث لوگ بہت تھک گئے تھے اور انھیں ایک دن کے لیے آرام کا موقع دے دینا مناسب تھا۔ مجاہدین نے اس جگہ سید صاحب کے دستِ مبارک پر بیعت جہاد کی۔ نیز حاضرین و غائبین کے لیے دعا مانگی گئی۔

کھوسا بلوچ

مارواڑ کے اس حصے میں ڈکیتیوں اور غارت گریوں کا بڑا زور تھا۔ بلوچوں کے ایک قبیلے کو "کھوسا" کہتے تھے۔ یہ لوگ مختلف گروہ بنا کر لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ انگریزوں نے جب امیرانِ سندھ سے معاہدہ کیا تو اس میں ایک شرط یہ بھی رکھی تھی کہ کھوسا بلوچوں اور دوسرے قزاقوں کے انسداد میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ سید صاحب ۲- شوال ۱۲۴۱ھ (۱۰- مئی ۱۸۲۶ء) کو سوراہا سے بڑے تڑکے نکلے تو حفاظت کا پورا انتظام کر لیا تھا۔ دو چار کوس پر جا کر نماز فجر کے لیے کھڑے ہو گئے تو پہریداروں نے دیکھا کہ تقریباً بائیس سوار اور چند پیادے دور سے نمودار ہوئے۔ رہبر نے بتایا کہ یہ قزاق معلوم ہوتے ہیں اور ان کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے صرف تھوڑے سے آدمی سامنے آتے ہیں، باقی آس پاس چھپے رہتے ہیں۔ جب کسی قافلے سے لڑائی پیش آ جائے تو دوسرے لوگ بھی کمینگاہوں سے اچانک نکل آتے ہیں۔ سید صاحب نے حفاظت کے خیال سے سارے لشکر کو جنگی ترتیب میں آراستہ کر لیا۔ سواروں اور پیادوں کو دائیں بائیں ایک ایک تیر کے فاصلے پر متعین کر کے اونٹوں اور ضعیف آدمیوں کو بیچ میں لے لیا۔ اسی طریق پر پوری منزل طے کی۔

پاڑلیوا سے کٹھیار

ظہر کے وقت پاڑلیوا پہنچے، جسے مالیوا بھی لکھتے ہیں۔ یہاں سخت ہراس پھیلا ہوا تھا، اس لیے کہ چند ہی روز پیشتر قزاق چراگاہ سے مویشی ہانک کر لے گئے تھے۔

اگلی منزلیں یہ تھیں :

۱ - برسالی : یہاں کے لوگوں نے لشکر کو دیکھ کر سمجھا کہ غارت گر آ گئے۔ اس پہ وہ بہت پریشان ہوئے اور جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں نیز خاردار جھاڑیاں کاٹ کر کنوؤں میں ڈال دیں۔ سید صاحب نے آدمی بھیج کر انھیں مطمئن کر دیا۔ اس موضع میں کچے اور کم آب کوئیں

تھے۔ یہاں کی زبان کوئی نہیں سمجھتا تھا اور ساری باتیں ترجمانوں کی وساطت سے ہوتی تھیں۔

۲۔ کھنسر: یہاں کے لوگ بھی لشکر کو قزاقوں کا جتھا سمجھ کر جنگ پر آمادہ ہو گئے۔ سید صاحب دو گولی کے فاصلے پر ٹھہر گئے اور شیخ باقر علی کو ترجمان کے ساتھ اظہارِ حقیقت کے لیے بھیجا۔ وہ لوگ بالکل مطمئن ہو گئے تو لشکر نے آگے بڑھ کر قیام کیا۔ یہاں تھوڑے فاصلے پر تقریباً پندرہ کنوئیں تھے۔ لیکن حالت یہ تھی کہ دو تین ڈول کھینچے جاتے تو پانی ختم ہو جاتا۔ پھر اس کے جمع ہونے کا انتظار کرنا پڑتا۔ آدمیوں نے گدلا پانی پیا، جانور پیاسے رہے۔

۳۔ کوارسر: اس منزل کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکا۔

۴۔ ادلون: یہاں بھی پانچ چھ کچے کنوئیں تھے، جو تھوڑا سا پانی نکالنے پر خشک ہو جاتے۔ غازیوں نے سید صاحب کے حکم سے نیا کنواں کھودنا شروع کیا۔ رات کے وقت پانی نکلا۔ آدمی پانی پی چکے تو جانوروں کو پلایا۔

۵۔ بڑاڑہ: یہاں بھی لوگ مستعد جنگ ہو گئے، بلکہ تین چار مرتبہ بندوقیں بھی چلیں۔ پھر شیخ باقر علی کو بھیج کر انھیں مطمئن کیا گیا۔ یہاں پانی کافی تھا۔ چونکہ آگے بارہ کوس تک کہیں پانی ملنے کی امید نہ تھی، اس لیے یہاں ایک روز قیام کیا۔

۶۔ کٹھیار: تیسرے روز چار گھڑی رات گزر جانے پر روانہ ہوئے۔ ساری رات بے آب زمین پر چلتے رہے۔ چھ گھڑی دن چڑھے کٹھیار پہنچے۔

کٹھیار میں بھی پانی کی سخت تکلیف تھی۔ کچے کنوؤں کی وہی حالت کہ چند ڈول کھینچتے اور پانی ختم۔ آدمی اور جانور پیاس سے مضطرب۔ ہر لحظہ اندیشہ کہ کہیں کھینچ تان میں باہم لڑائی نہ ہو جائے اگرچہ دھوپ بہت تیز تھی، لیکن سید صاحب خود کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ گئے اور اپنی نگرانی میں آدمیوں اور جانوروں کو باری باری پانی پلوایا۔

سندھ میں داخلہ

کٹھیار پر جودھ پور کی سرحد ختم ہو گئی اور امیرانِ سندھ کی عملداری کا آغاز ہو گیا۔ سید حمید الدین (خواہرزادہ سید صاحب) لکھتے ہیں: سندھ میں اتنے درویش دیکھے کہ شاید ہی کسی دوسرے اسلامی خطے میں ہوں۔ ساتھ ہی فرماتے ہیں کہ سادات و فقرا کی جیسی قدر و منزلت یہاں دیکھی، اس کی مثال شاید ہی کسی اسلامی مملکت میں مل سکے۔ ایک شخص نے عقیدت مندی سے گائے پیش کی۔ اسے ذبح کر کے گوشت لشکر میں تقسیم کیا گیا۔ ایک رات تھکا میں گزاری، جہاں پانی بہ افراط ملا۔ عمر کوٹ وہاں سے صرف تین کوس پر تھا اور سید صاحب وہیں جانا چاہتے تھے۔

چنانچہ حاجی عبدالرحیم کو اجازت نامہ حاصل کرنے کے لیے قلعدار کے پاس بھیجا۔ سوءِ اتفاق سے قلعدار خود حیدر آباد گیا ہوا تھا۔ جو شخص اس کی جگہ کام کر رہا تھا، اس نے حاجی صاحب سے ملاقات بھی گوارا نہ کی۔ اندر سے پیغام بھیج دیا کہ تمھارا سردار سید اور مسافر ہے تو سیدھا حیدر آباد چلا جائے اور قلعے سے کم از کم دو کوس دور رہے۔ اس بے اعتمادی اور خشک مزاجی کی اصل وجہ یہ ہوئی کہ بارہ برس سے حکومت سندھ اور حکومت جودھ پور کے درمیان عمر کوٹ کے بارے میں جھگڑا چلا آتا تھا۔ کئی مرتبہ باہم لشکر کشی ہو چکی تھی۔ جودھ پور کی طرف سے ہر آنے والے قافلے کو سخت شبہات کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور انگریزوں کے بارے میں بھی عام فوجیوں کی رائے اچھی نہ تھی۔ سید صاحب کو بے سبب ان تمام شبہات کا ہدف بننا پڑا۔

قلعدار کا یہ پیغام ملا تو سید صاحب نے عمر کوٹ کو دو اڑھائی کوس بائیں ہاتھ چھوڑتے ہوئے کھاوڑہ میں قیام کیا۔ وہاں پھر قلعدار کا پیغام آیا کہ کوئی آدمی ہتھیار پہنے ہوئے شہر میں نہ آئے۔ نیز ایک رات سے زیادہ مقام نہ کیا جائے۔ سید حمید الدین چند غازیوں کو لے کر خالی ہاتھ عمر کوٹ دیکھنے کے لیے گئے۔ جب قلعہ کے دروازے کے پاس پہنچے تو گولہ اندازوں اور بندوقچیوں نے شور مچا دیا۔ انھیں تسلی تشفی دے کر شہر دیکھا اور واپس ہو گئے۔

پریشان کن حالات

پالی سے جو اونٹ کرایے پر لیے تھے، ان کی میعاد ختم ہو گئی۔ غلطی سے تین سرکاری اونٹ گم ہو گئے۔ ان کی بازیافت کے انتظار میں پورے لشکر کو ٹھہرانا قلعدار کے حکم کے منافی تھا، لہٰذا مولانا شاہ اسماعیل کو چالیس آدمیوں کے ساتھ کھاوڑہ میں چھوڑا اور باقی لشکر اگلے روز دوما نہ میں قیام پذیر ہوا۔ پھر سماٰلہ میں منزل کی، جہاں مولانا شاہ اسماعیل بھی آ ملے۔ سماٰلہ سے نکلے تو کارد میں ٹھہرے۔ یہاں اگرچہ کھیتی باڑی اور سرسبزی خاصی تھی۔ لیکن کوئی مکان نظر نہ آیا۔ مرد، عورتیں، بچے سب جنگلی درختوں کے سایے میں زندگیاں گزار رہے تھے۔

کارد میں سید چورن شاہ ایک ممتاز بزرگ تھے۔ سید صاحب کے حکم سے سید حمید الدین اور سید اولاد حسن (والد ماجد نواب صدیق حسن خاں مرحوم) نے ان سے ملاقات کی۔ وہ سید صاحب سے ملاقات کے لیے آئے اور ایک بڑا بھینسا بطور نذر پیش کیا۔ انھیں سے معلوم ہوا کہ لوگ عام طور پر سید صاحب کو انگریزوں کا جاسوس سمجھتے ہیں، اسی لیے بھٹکتے ہیں۔ سید صاحب نے ایک بڑا بیل سید چھمن شاہ کو اور ایک سلہٹی ڈھال اس کے لڑکے کو دی۔

سید چورن شاہ کو اندیشہ تھا کہ میرپور کا حاکم کہیں غلط فہمی میں سید صاحب کے ساتھ آمادۂ جنگ

نہ ہو جائے، چنانچہ انھوں نے خود آگے جا کر حاکم کو بتا دیا کہ یہ غازی ہندوستان سے ہجرت کر کے سندھ کو دارالاسلام سمجھتے ہوئے آئے ہیں۔ ان کو شبہ کی نظروں سے دیکھنا سراسر نامناسب ہے۔

کارو سے چل کر راستے میں ایک مقام کیا، پھر میرپور میں ٹھہرے۔ اگرچہ علی مراد حاکم میرپور کو سید چورن شاہ نے سید صاحب کے صحیح حالات بتا دیے تھے، لیکن اس کے دل سے وسوسے دور دُور نہ ہوئے۔ اس وجہ سے خود ملاقات کے لیے نہ آیا، البتہ شیرینی کی دس ہانڈیاں بہ طور نذر سید صاحب کی خدمت میں بھیج دیں اور دو سوار رہبری کے لیے ساتھ کر دیے۔

میرپور سے تیسرے روز چل کر ٹنڈو الہ یار میں ایک گھڑی ٹھہرے۔ یہاں خربوزے نہایت عمدہ اور بہ کثرت ملے۔ وہاں امیرانِ سندھ کی طرف سے دو آدمی آئے اور پورے حالات دریافت کر کے حیدرآباد اطلاع بھیجی۔ وہاں سے حکم آیا کہ سید صاحب شوق سے تشریف لائیں، یہ گھر انھیں کا ہے۔ چنانچہ وہاں سے چل کر ایک منزل ٹنڈو جام ہالہ میں کی، دوسری پھلیلی ندی کے مشرقی کنارے پر، جس کے مغربی کنارے پر حیدرآباد واقع تھا۔

حیدرآباد میں استقبال

سید صاحب نے اطلاع کی غرض سے حاجی رحیم بخش اور سید عبدالرحیم ولایتی کو امیرانِ سندھ کے پاس بھیج دیا تھا۔ ان کی طرف سے سید صبغۃ اللہ ولایتی استقبال کے لیے آئے۔ وہ مکہ معظمہ میں سید صاحب کی بیعت کر چکے تھے اور میر کرم علی امیرِ سندھ کے مصاحب بن گئے تھے۔ دریا اور شہر کے درمیان شہر سے تقریباً دو تیر کے فاصلے پر لشکر اسلام کو ٹھہرایا گیا۔ امیران سندھ کی طرف سے شیرینی پیش ہوئی اور مہمانداری کی ہر ضروری جنس لشکر میں پہنچ گئی[1]۔ آم اور خربوزے بھی بڑی مقدار میں آئے۔

تیسرے روز جمعہ تھا[2]۔ حکام سندھ نے کہلا بھیجا کہ سید صاحب جمعہ کی نماز قلعہ میں ہمارے ساتھ ادا کریں۔ چنانچہ آپ آٹھ آدمیوں کے ساتھ قلعہ میں گئے۔ میر صاحبان آپ سے مل کر بے حد خوش ہوئے۔ ہجرت و جہاد کا عزم دیکھ کر متحیر رہ گئے۔ کہنے لگے کہ اہل و عیال کو حیدرآباد میں ٹھہرا دیجیے اور خود بھی کچھ مدت ٹھہریے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ اگر اب ٹھہر جاؤں تو سردیوں کا آغاز ہو جائے گا اور اگلے سفر میں

---

[1] تفصیل یہ بتائی گئی ہے۔ دو خوانچے مصری اور قند کے دونوں بیس بیس سیر۔ چند برتن گھی، دس گوسفند، جنس خوردنی نفیس وافر و کاہ، دو تین پشتارے آم اور خربوزے۔

[2] سید صاحب ۵۔ ذی قعدہ کو اتوار کے دن حیدرآباد سے روانہ ہوئے گویا دو جمعے حیدرآباد میں گزارے۔ اس حساب سے وہ غالباً ۲۲۔ شوال کو بدھ کے دن حیدرآباد پہنچے۔

برف باری کی وجہ سے مشکلات پیش آئیں گی۔ امیروں نے ایک ہزار روپیہ، ایک بندوق اور ایک جوڑی طپنچوں کی پیش کی۔

یہ میر ٹالپور خاندان میں سے تھے، جو کلہوڑوں کے بعد ۱۷۸۳ء میں حکمرانی سندھ کے منصب پر پہنچا تھا۔ ان میں سے بڑا میر فتح علی خاں تھا جس نے زمان شاہ درانی سے فرمان سلطنت حاصل کیا تھا۔ پھر اپنے بھائیوں میر غلام علی، میر کرم علی اور میر مراد علی کو بھی شریک سلطنت کر لیا۔ یہ چاروں بھائی "چار یار" کہلاتے تھے۔ میر فتح علی خاں کا انتقال ۱۸۰۱ء میں ہوا اور میر غلام علی کا ۱۸۱۱ء میں۔ ان کے بیٹے خالی مسندوں پر بیٹھ گئے۔

حیدر آباد میں بھی ہزارہا لوگوں نے بیعت کی۔ ان میں سے بطور خاص قابل ذکر یہ ہیں:

۱ — میر اسماعیل شاہ جو حاکمان سندھ کے تحت نائب وزیر کے عہدے پر مامور تھا۔

۲ — حافظ مولوی محمد یوسف جو گورنر بمبئی کی طرف سے دربار سندھ میں وکیل تھا۔ اس نے کئی مرتبہ دعوت کی اور گراں بہا ہدایا پیش کیے۔

۳ — محمد یوسف خاں جو امرائے سندھ میں سے تھا۔

والی بہاولپور کو دعوتِ جہاد

سید صاحب حیدر آباد میں تیرہ روز ٹھہرے۔ اس اثنا میں آپ نے دعوت جہاد کا ایک خط سید دین محمد قندھاری کے ہاتھ بہاول خاں والی بہاول پور کے پاس بھیجا۔ والیان بہاول پور کے اجداد پہلے شکار پور کے پاس رہتے تھے۔ ان کے جد امجد کا نام داؤد تھا۔ اس وجہ سے پورا خاندان داؤد پوترہ کہلاتا تھا۔ ان میں سے بہاول خاں نے ہمت کر کے ایک خاصی بڑی ریاست پیدا کر لی۔ اس کا بیٹا سعادت خاں تھا، جس نے انگریزوں اور رنجیت سنگھ سے معاہدے کیے۔ سعادت خاں کا بیٹا بہاول خاں تھا، جس کے پاس سید صاحب نے دعوت نامہ بھیجا۔ میسن نے لکھا ہے کہ اس کی عمر بیس پچیس برس کی تھی اور بڑا خوبرو تھا۔ سید صاحب کے عزم جہاد کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ میسن کہتا ہے مجھ سے رحمت خاں نے کہا کہ تم سید صاحب کے پاس چلے جاؤ۔[1]

سید صاحب کی دعوت جہاد کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا لیکن اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کے سینے میں حمیت اسلام کی کتنی حرارت تھی اور وہ اس سے ہر فرزند توحید کے قلب و روح کو گرما دینے کے لیے

---

[1] میسن کی کتاب INDIA (ہندوستان) جلد اول ص۱۱۔

کتنے بے تاب تھے۔ ان حالات کے سامنے آتے ہی مولانا روم کے یہ شعر بے اختیار یاد آجاتے ہیں:

من بہ ہر جمعیتے نالاں شدم ۔۔۔ جفت خوشحالاں و بدحالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار من ۔۔۔ وز درونِ من نہ جست اسرارِ من

حیدر آباد ہی میں میرزا امیر بیگ فرخ آبادی پانچ چھ آدمیوں کے ساتھ سید صاحب کی خدمت میں پہنچ گیا اور ایک گھوڑا بہ طور نذر پیش کیا[۱] میرزا صاحب نواب امیر الدولہ والیِ ٹونک کے پاس ملازم تھے۔ ملازمت چھوڑ کر غازیوں میں شامل ہو گئے۔

حیدر آباد کے متعلّق تاثّرات

سید صاحب کو امید تھی کہ امیرانِ سندھ جہاد میں معیت کے لیے تیار ہو جائیں گے، لیکن اس عہد کی دوسری انجمنہائے میری وسلطانی کی طرح یہ انجمن بھی افسردہ و بے روح نکلی۔ اس حالت میں انھیں حیدر آباد سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ وہ خیل و خدم کے پھیلاؤ یا امر و حکم کے داب و تمکنت کی تلاش میں نہیں نکلے تھے۔ ان زندہ و غیور قلوب کی جستجو کر رہے تھے جن میں اسلامیت حقہ کی تڑپ موجود ہو۔ جو دینی برتری کی خاطر میدانِ جہاد کی صعوبتوں کو حاصلِ حیات سمجھنے کے لیے بیتاب ہوں۔ یہ متاعِ عزیز دستیاب نہ ہوئی تو میرانِ سندھ کی مہمانداری میں ان کے لیے کونسی کشش باقی رہ گئی تھی؟ چنانچہ ۵۔ ذی قعدہ کو حیدر آباد سے روانہ ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے، حکام حیدر آباد کی ملاقات سید صاحب کے لیے اس درجہ افسردگی زا ثابت ہوئی کہ اہل و عیال کو بھی حیدر آباد میں ٹھہرانے پر طبیعت راضی نہ ہوئی۔ چنانچہ سید حمید الدین اپنے ایک مکتوب میں جو حیدر آباد سے لکھا گیا تحریر فرماتے ہیں کہ اہل و عیال کو آنے کا حکم ابھی نہیں دیا جا سکتا۔ ممکن ہے شکارپور سے کوئی ہدایت بھیجی جائے۔

حیدر آباد سے پیرکوٹ

سید صاحب نے حیدر آباد سے دو کشتیاں اسّی روپے کرایہ پر لیں۔ ایک بجرہ میرانِ سندھ نے عاریۃً دے دیا۔ سارا مال و اسباب ان کشتیوں میں رکھا۔ کمزور آدمیوں کو بھی ان میں بٹھا دیا[۲] توانا غازی گھوڑوں اور اونٹوں کے ساتھ خشکی کے راستے روانہ ہوئے اور شمالی سمت میں سفر شروع ہو گیا۔ سید صبغۃ اللہ شاہ ولایتی اور مولوی محمد یوسف

---

[۱] روایت میں ہے کہ میرزا امیر بیگ فرخ آبادی ٹونک سے دو گھوڑے، ایک اونٹ، ایک یابو اور پانچ چھ ملازم لے کر پہنچا اور حیدر آباد میں سید صاحب سے آملا۔ [۲] ان آدمیوں کی تعداد ایک سو چالیس بتائی گئی ہے۔ یقیناً وہ سب کمزور نہ ہوں گے۔ غالباً یہیں سے حاجی رحیم بخش کو خانگی خطوط دے کر ٹونک بھیجا۔

مشایعت کی غرض سے ساتھ ہو گئے۔ اگلی منزلیں یہ ہیں:

۱ ۔ کاٹھڑی : یہ مقام حیدر آباد سے قریباً گیارہ میل ہے۔ اسی کے قریب ۱۸۴۳ء میں میانی کی جنگ ہوئی تھی، جس میں سندھ کی عنان تقدیر انگریزوں کے ہاتھ آئی۔ مولوی محمد یوسف یہاں سے واپس ہو گئے۔ اس سفر میں سید صاحب کبھی فرزند علی غازی پوری کے دیے ہوئے یابو پر سوار ہوتے اور کبھی سانڈنی پر۔

۲ ۔ کھبڑ : اس کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

۳ ۔ ہالہ[1] : اس جگہ سید نوحؒ کا مزار تھا جو سنہ ۱۰۰۷ھ میں فوت ہوئے۔ میران سندھ کا خاندانی مقبرہ بھی اسی جگہ تھا۔

۴ ۔ کوٹ سید: یہ آج کل سیّد آباد کے نام سے مشہور ہے۔ ہالہ سے قریباً گیارہ میل کے فاصلے پر ہے۔

۵ ۔ لمبا کا کھبا۔

۶ ۔ اُن حتری : یہاں ٹھہرنا چاہتے تھے، لیکن دریا میں پانی تیزی سے بڑھ رہا تھا، اس لیے لالو کوٹ میں ٹھہرے۔

۷ ۔ ملا کا بٹ : لالو کوٹ اور ملا کا بٹ کی منزل کو ایک سمجھنا چاہیے۔ دونوں میں قریباً چھ سات میل کا فاصلہ ہے۔ سید صاحب نے پیادوں کو لالو کوٹ میں ٹھہرنے کی اجازت نہ دی اور ملا کا بٹ بھیج دیا۔ یہاں دھوپ اتنی تیز تھی کہ بعض ہمراہی ہلاکت کے قریب پہنچ گئے۔

۸ ۔ ہنگورجہ : پیادے یہاں ٹھہرے، لیکن اونٹ اور گھوڑے محراب پور بھیج دیے۔ ہنگورجہ میں سید ناصر علی نے بیعت کی اور دو روز لشکر کو ٹھہرائے رکھا۔ دونوں دن کھانا اپنے پاس سے کھلایا۔

۹ ۔ رانی پور : یہاں سید صالح شاہ بغدادی ایک مشہور پیر زادے تھے۔ انھوں نے سارے لشکر کو کھانا کھلایا۔ اتفاق سے پیر سید صبغۃ اللہ راشدی بھی ایک سوار ارادت مندوں کے ساتھ رانی پور آئے ہوئے تھے۔ سید صاحب ان سے ملنے کے بڑے مشتاق تھے، اس لیے کہ ان کے جذبۂ دینی کا عام شہرہ تھا۔ ملاقات ہوئی۔ سید صبغۃ اللہ شاہ کو ایک ضروری کام

---

[1] ہالہ حیدر آباد سے ۳۶ میل کے فاصلے پر ہے اب یہ دو قصبے ہیں۔ ہالہ قدیم اور ہالہ نو۔ نیا ہالہ ۱۸۰۰ء میں بنا تھا، جب دریا کی طغیانی کے باعث پرانے قصبے کی بستی خطرے میں پڑ گئی تھی۔

کے لیے ایک دن رانی پور میں ٹھہرنا پڑا۔ سید صاحب اور غازیوں کو انھوں نے اپنے بھائی کے ہمراہ آگے بھیج دیا۔

۱۰- ٹنڈو مستی خاں:

۱۱- پیر جو گوٹھ یا پیر کوٹ: یہ سید صبغۃ اللہ شاہ راشدی کا وطن اور مرکز تھا۔

سید صبغۃ اللہ شاہ

پیر سید صبغۃ اللہ شاہ کے اجداد اسلام کے ابتدائی دَور ہی میں حجاز سے نکل کر بغداد، پھر سندھ پہنچ گئے تھے، ان میں سے پیر محمد مکی بہت مشہور ہُوئے۔ علم وفضل اور زہد وتقویٰ ابتدا سے اس خاندان کا نشانِ امتیاز تھا، اس وجہ سے ہر دَور میں یہ مرجعِ خلائق رہا۔ سید صبغۃ اللہ شاہ کے والد پیر محمد راشد کے عہد میں مریدوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔ ان کے متعدد فرزند تھے، جن میں سجادہ نشینی کے متعلق منازعت شروع ہو گئی۔ سید صبغۃ اللہ شاہ چونکہ سب میں ممتاز تھے، اس لیے وہی پیر بنے۔

اس خاندان کو عملی سیاسیات سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا اور نہ اس کی ضرورت پیش آئی تھی لیکن سید صبغۃ اللہ شاہ صاحب مسند نشین ہُوئے تو ملکی حالات بہت بدل چکے تھے۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے حساس دل، عاقبت اندیش دماغ اور بصیر آنکھیں عطا کی تھیں۔ دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں کی دینی جمعیت اور جماعتی تنظیم میں ضعف پیدا ہوتے ہی ان کی سیاسی قوت بھی معرضِ انحطاط میں آگئی ہے۔ ہندوستان کے ہر حصے میں مخالف عناصر مضبوطی سے جم چکے تھے اور سلطنتِ اسلامیہ کا ایک ایک عضو کٹ رہا تھا۔ پنجاب پر سکھ چند ہی برسوں میں چھا گئے تھے۔ سندھ کے لیے بھی سکھوں اور انگریزوں کی طرف سے شدید خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ پھر سندھ کی حکومت حقیقۃً "طوائف الملوکی" تھی، بعید سی بھی امید نہ تھی کہ یہ سفینہ زیادہ دیر تک طوفان کے ہولناک تھپیڑوں سے محفوظ رہے گا۔ لہذا انھوں نے اپنے مریدوں کو ایسے طریق پر منظم کرنا شروع کر دیا کہ موقع پیش آتے ہی ان سے جانباز مجاہدین کے جیش تیار کیے جا سکیں یہی "حر" تحریک کی ابتدا تھی۔

پیر سید صبغۃ اللہ کے ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سکھ حکومت سندھ کی جانب پھیلنے لگی تو پیر صاحب نے جہاد کا پختہ ارادہ کر لیا۔ جو وعظ فرماتے، اس میں جہاد کی فضیلتیں ضرور بیان کرتے۔ کچھ اور لاڑ کے مرید وعظ میں شامل نہیں ہو سکتے تھے، انھیں جہاد کے لیے تحریری دعوت نامے ارسال کیے۔

بہرحال پیر صبغۃ اللہ شاہ بڑی سلامت روی اور احتیاط سے دینی تحریک کے سلسلے میں سیاسی کام کی داغ بیل ڈال چکے تھے۔ ایک مخلص ناصرِ حق کی حیثیت سے پیر صبغۃ اللہ شاہ کے لیے یہی مناسب تھا

کہ حتی الامکان سید صاحب کی حمایت و نصرت کے لیے تیار ہو جاتے۔ یہی انھوں نے کیا۔[1]

سید حمید الدین کی شہادت

سید حمید الدین نے پیر صبغۃ اللہ شاہ کے متعلق لکھا ہے:

در تمام مملکت سندھ ہمچو او شیخے و مرشدے در زعم مردمان ملک نیست۔ قریب سہ لک مریدانش از قوم بلوچ ہستند و بہ کمال جاہ و جلال و رجوعات خلائق خوش می گزرانند در جود و کرم و اخلاص و مروّت ہم شہرۂ آفاق۔

باشندگان سندھ کے نزدیک سارے ملک میں اس جیسا شیخ و مرشد کوئی نہیں۔ قریباً تین لاکھ بلوچ مرید ہیں۔ رجوعِ خلق عام ہے۔ جاہ و جلال میں زندگی گزار رہے ہیں۔ جود و کرم اور اخلاص و مروّت میں بھی شہرۂ آفاق ہیں۔

در خانہ سید مذکور کتب خانہ عجیب و غریب بہ نظر آمد کہ ہرگز در خانہ سلاطین و امرا نبودہ باشد۔ پانزدہ ہزار جلد نامی از کتب معتبرہ دراں موجود ہاست از انجملہ صد دیوان فارسی بہ خط ولایت مطلا — شصت و پنج جلد تفاسیر معتبرہ، پنج جلد مکرر از شاہ نامہ فردوسی سہ مع تصاویر و مطلا، احادیث ہر قدر کہ مشہور اند مع شروح و جامع الاصول و تیسیر الوصول سہ جلد مکرر احیاء العلوم و سہ جلد مکرر فتوحات مکیہ و ہمہ جلد شاہانہ۔

ان کا کتب خانہ بڑا عجیب و غریب تھا۔ سلاطین اور امرا کے پاس بھی ایسا کتب خانہ نہ ہوگا۔ پندرہ ہزار جلد کتب معتبرہ اس میں موجود ہیں۔ سو دیوان فارسی کے ایرانی خط میں مطلا، پینسٹھ جلدیں معتبر تفسیروں کی، شاہنامہ فردوسی کے پانچ نسخے جن میں سے تین مصور و مطلا تھے۔ حدیث کی تمام مشہور کتابیں مع شروح۔ جامع الاصول، تیسیر الوصول، احیاء العلوم اور فتوحات مکیہ کے تین تین نسخے اور سب جلدیں (حسنِ کتابت و اہتمام صحافت کے اعتبار سے) شاہانہ۔

پیرکوٹ میں قیام

سید صاحب ۱۷۔ ذی قعدہ (۲۴۔ جون ۱۸۲۶ء) کو پیرکوٹ پہنچے تھے۔ پیر صبغۃ اللہ شاہ کے بھائیوں اور مریدوں نے لوازم مہمانداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ دو گھڑی کے بعد خود پیر صاحب تشریف لے آئے۔ تین روز تک سارے لشکر کو خود کھانا کھلایا۔ پھر سید صاحب نے بہ اصرار انھیں روک دیا اور رسد بٹنے لگی۔ وہاں کشتیوں کے انتظار میں کم و بیش

---

[1] پیر سید صبغۃ اللہ شاہ کے خاندان کے حالات میں نے اس باب کے آخر میں بہ طور ضمیمہ شامل کر دیے ہیں۔ رانی پور میں سید صاحب سے ملاقات کا ذکر سید صبغۃ اللہ شاہ کی ملفوظات میں [illegible]

تین روز ٹھہرے رہے۔ اسی مقام کو اہل و عیال کے قیام کے لیے پسند فرمایا[۱]۔ وہیں سے دریائے سندھ کو کشتیوں کے ذریعہ سے عبور کر کے شکارپور کا قصد فرمایا:

۲۶- ذی قعدہ کو پیر صبغۃ اللہ شاہ کے حکم کے مطابق کشتیاں فراہم ہو گئیں اور ساز و سامان دریا سے اتارا جانے لگا۔ ۳۰- ذی قعدہ تک سارا لشکر دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ اسی روز سید صاحب بھی پیر صاحب سے رخصت ہوئے۔ ۲۶- ذی قعدہ سے عبور دریا کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو لوگ پہلے پار ہوئے وہ مدہجی میں خیمہ زن ہو گئے۔ سید صاحب نے ۳۰- ذی قعدہ (۶- جولائی) کو بروز جمعہ دریا عبور کیا اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ نماز جمعہ ادا کی[۲]۔ پیرکوٹ سے گاڑھے کے دو سو تھان مجاہدین کے کپڑوں کے لیے خریدے گئے تھے۔

پیر صاحب کے ساتھ سید صاحب کا سلسلہ مکاتبت برابر جاری رہا۔ غالباً باہم یہ فیصلہ ہوا تھا کہ جب اچھے مرکز کا بندوبست ہو جائے تو پیر صاحب بھی وہاں پہنچ جائیں۔ بعد میں ایسے حالات پیش آئے کہ افغانستان و پشاور کا راستا ایرانی سرداروں کے عناد کے باعث مخدوش ہو گیا۔ اس اثنا میں پیر صبغۃ اللہ شاہ بالکل تیار ہو گئے اور سید صاحب کو اس باب میں اطلاع بھیج دی گئی۔ ایک خط میں سید صاحب نے انھیں لکھا کہ آپ تمام مسلمانوں کو دعوت دیں۔ مخلصین کی ایک جماعت ساتھ لے کر سکھوں کی سرحد سے متصل محفوظ مقام پر بیٹھ جائیں اور جہاد شروع کر دیں۔ اپنے اہل و عیال کے ساتھ میرے اہل و عیال کو بھی کسی ایسی جگہ بٹھا دیں جو دشمن کی دسترس سے باہر ہو[۲]۔

جب سرحد میں سید صاحب کی بیعت امامت ہو چکی تو مختلف علاقوں میں نائب بھیجے گئے تھے، جو نیابۃً بیعت لینے کے مجاز تھے۔ محمد قاسم کو سندھ سے بھیجا گیا تھا۔ پیر صبغۃ اللہ شاہ کو لکھتے ہیں کہ سندھ میں نیابۃً بیعت لینے کے اہل صرف آپ تھے، لیکن چونکہ آپ کے بھائی رقابت کے مرض میں مبتلا ہیں، اس لیے اندیشہ ہے کہ وہ شاید اسی باعث امر مسنون کی بجاآوری سے محروم رہ جائیں لہٰذا میں نے نیابت کے لیے دوسرے آدمی کو بھیج دیا[۳]۔

سید صاحب جب پنجتار سے راج دواری جانے والے تھے تو پیر صبغۃ اللہ شاہ کے نام ایک خط بھیجا، جس کا مضمون یہ تھا کہ اگر ہماری زندگی جہاد ہی میں تمام ہو جائے تو ہمارے اہل و عیال کو

---

[۱] سید صاحب کے اہل و عیال صفر ۱۲۴۲ / ستمبر ۱۸۲۶ میں سندھ پہنچے تھے۔ [۲] سید حمید الدین کا خط۔ [۳] ملاحظہ ہو مکتوب سید صاحب بنام پیر صبغۃ اللہ شاہ [illegible] منظورۃ السعداء صفحہ [illegible]

حرمین شریفین پہنچا دیں۔

پیرکوٹ ہی میں مولوی امام الدین بنگالی اور نواب امیر الدولہ کے بھیجے ہوئے ہرکارے پہنچے تھے نیز سید صاحب نے غازیوں کے لیے گاڑھے کے دو سو تھان خریدے تھے۔ یہیں سے سید صبغۃ اللہ شاہ کابلی کو پندرہ روپے اور ایک دو شالہ دے کر رخصت کیا، نیز قاصد کو ٹونک بھیجا۔

پیرکوٹ سے شکارپور

عبور دریائے سندھ کے بعد پہلی منزل راہجی میں ہوئی۔ آگے راستے میں چھوٹی چھوٹی نہریں آتی تھیں اور لدے ہوئے اونٹوں کا ان سے گزرنا مشکل تھا لہٰذا دو کشتیاں کرایے پر لے کر بھاری سامان ان کے ذریعے سے شکارپور پہنچایا۔ مدہجی کے بعد اکھا میں منزل ہوئی۔ اس دن بھی نہروں کے باعث سفر میں بڑی تکلیفیں پیش آئیں۔ تیسری منزل جبیب کوٹ میں شاہ غلام محی الدین پیرزادہ سرہندی کے مہمان کی حیثیت میں ہوئی۔

پیر غلام محی الدین کے والد پشاور میں رہتے تھے۔ جب سکھوں نے پشاور کو خراب کیا تو وہاں سے نکل کر اہل و عیال کے ساتھ نواح شکارپور میں آگئے۔ یہاں حکام سندھ نے انھیں بڑی جاگیر دے دی۔ پیر صاحب حیدر آباد میں بھی سید صاحب سے مل چکے تھے۔ اسی وقت سے آرزو تھی کہ ان کو بھی مہمانداری کا شرف حاصل ہو۔ چنانچہ انھوں نے اپنے بیٹوں پیر نظام الدین اور پیر فدا محی الدین کو لکھ دیا تھا۔ وہ دونوں منتظر بیٹھے تھے۔ بہ اصرار گھر لے گئے اور لشکر کی خاطر داری کے علاوہ جانوروں کے لیے بھی چارہ دانہ مہیا کیا۔ چنانچہ سید صاحب ایک رات جبیب کوٹ میں گزار کر شکارپور پہنچ گئے[۱]

شکارپور میں قیام

یہ شہر پہلے شاہ شجاع بادشاہ افغانستان کے قبضے میں تھا جو اپنے بھائی محمود شاہ کے مقابلے میں شکست کھا کر پنجاب ہوتا ہوا انگریزوں کے پاس پہنچ چکا تھا اور لدھیانہ میں مقیم تھا۔ سید صاحب کے پہنچنے سے تین برس پیشتر امیران سندھ نے اس پر قبضہ جما لیا۔ سید صاحب پہنچے تو اہل شہر میں خدا جانے کس بنا پر افواہ پھیل گئی کہ شاہ شجاع نے ایک دستہ فوج اس غرض سے بہ تبدیل لباس بھیج دیا ہے کہ خفیہ شکارپور پر قبضہ کر لے۔ اس پر اضطراب پیدا ہوا۔ حاکم شہر کو حکم دینا پڑا کہ سید صاحب کے غازی شہر میں داخل نہ ہوں۔

---

[۱] شکارپور ۱۶۱۷ء میں آباد ہوا تھا اور اچھی جائے وقوع کے اعتبار سے بہت جلد مشہور تجارتی منڈی بن گیا۔ خشکی کے راستے جو مال ہندوستان آتا تھا یا ہندوستان سے باہر بھیجا جاتا تھا، عموماً اسی منڈی سے گزرتا تھا۔ اس وجہ سے وہاں ہر ملک اور خطے کے لوگ آباد ہو گئے تھے۔ پشتو، سندھی، پنجابی، فارسی، اردو اور بلوچی زبانیں وہاں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھیں۔

سید صاحب نے سید حمیدالدین اور سید اولاد حسن قنوجی کو حاکم شکارپور کے پاس بھیج کر اطمینان کرا دینا ضروری سمجھا کہ ہمیں شاہ شجاع سے کوئی تعلق نہیں اور ہمارے متعلق دشمنی کا وسوسہ سراسر بے اصل ہے۔ حاکم نے جواب دیا کہ رعایا خوف زدہ ہے۔ لہٰذا جو شخص بازار میں آئے، اسے ہتھیار ساتھ نہ لانے چاہئیں۔ خوف جاتا رہے گا تو یہ پابندی دور کر دی جائے گی۔ سید صاحب نے یہ پابندی قبول کر لی سب سے پہلے علماء و فضلا ملاقات کے لیے آئے۔

حاکم، میر اسماعیل کا بیٹا میر کاظم تھا۔ وہ بھی حاضر ہوا اور بڑی عقیدت و مدارات سے پیش آیا۔ روزانہ سید صاحب کے لیے پرتکلف کھانے بھیجتا جو دس بارہ آدمیوں کے لیے کافی ہوتے۔ جس چیز کی ضرورت ہوتی اپنے آدمیوں کے ذریعہ سے خرید کرا دیتا۔ جب لوگوں کا شک رفع ہو گیا تو شہر میں داخلے کی ممانعت بھی اٹھ گئی۔ سید صاحب کے ساتھی بھی شہر میں جانے لگے اور شہر کے شرفا و عوام بھی کثرت سے سید صاحب کے پاس آنے لگے۔

سید صاحب عید اضحیٰ کی نماز کے لیے نکلے تو دو تین سو مجاہدین ہم رکاب تھے۔ اہل شہر نے خود درخواست کی کہ نماز میں امام سید صاحب ہوں۔ مجمع بیس ہزار سے کم نہ ہوگا۔ سید صاحب نے جو خطبہ پڑھا وہ بے حد پُرتاثیر تھا۔ خطبے کے بعد دعا، مصافحہ اور معانقہ کے بعد آپ اس شان سے قیام گاہ کی طرف لوٹے کہ سید حمیدالدین لکھتے ہیں، اس کا بیان مشکل ہے۔ سید صاحب نے عید کے دن تیرہ دنبے ذبح کیے۔

میر کاظم سید صاحب سے اس درجہ متاثر ہوا کہ خود بیعت کی اور ملازمت چھوڑ کر ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا، لیکن سید صاحب نے اس وقت اسے ساتھ لینا خلاف مصلحت سمجھا۔ البتہ پختہ عہد لے لیا کہ عند الطلب بہ دل و جان حاضر ہو جائے گا

شکارپور ہی میں سید صاحب نے غازیوں کو گاڑھے کے کپڑے بنوا دیے۔ سبحان اللہ! یہ اس قدوسی لشکر کی وردی تھی، جس میں وقت کے تاجداران علم و فضل اور بڑے بڑے ارباب جاہ و ثروت شریک تھے۔

شکارپور سے روانگی کے وقت سید صاحب نے ایک عمدہ گھوڑا میر کاظم کو دیا۔ میر نے ایک سانڈنی پیش کی، جو کابل تک سید صاحب کی سواری میں رہی۔

میرزا عطا محمد خاں کا بیان

سندھ کے سلسلے میں صرف ایک چیز رہ گئی اور وہ میرزا عطا محمد خاں کا روزنامچہ ہے۔ اس میں مرقوم ہے:

سید صاحب جماعت مسلمین کے ساتھ آ گئے۔ امراء و مشائخ اور خواص و عوام کو دعوت جہاد دی، لیکن دوں ہمتی کے باعث کوئی تیار نہ ہوا، بلکہ مجاہدین کی قلت تعداد اور فرومائیگی سامان کے پیش نظر وہ لوگ اس سارے معاملے کو محض ایک فریب سمجھتے رہے۔ کوئی یہ کہہ دیتا کہ سید صاحب انگریزوں کے جاسوس ہیں۔ میرزا نے صرف پیر صبغۃ اللہ شاہ کی بہت تعریف کی ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ سید صاحب نے اہل و عیال کو انھیں کے ہاں ٹھہرانے کا انتظام کیا۔

میر کاظم کے متعلق لکھا ہے کہ بیعت کی، عند الطلب حاضری کا عہد بھی کیا، لیکن شکارپور کی حکمرانی بے طرح دامن گیر ہو گئی اور کئی مرتبہ بلانے کے باوجود میر کاظم جہاد میں شرکت کی سعادت حاصل نہ کر سکا[1]۔

---

[1] روزنامچہ میرزا عطا محمد خاں صفحہ ۲۰۷ - ۲۰۸

ضمیمہ

راشدی خاندان کا شجرہ نسب ذیل میں درج ہے:

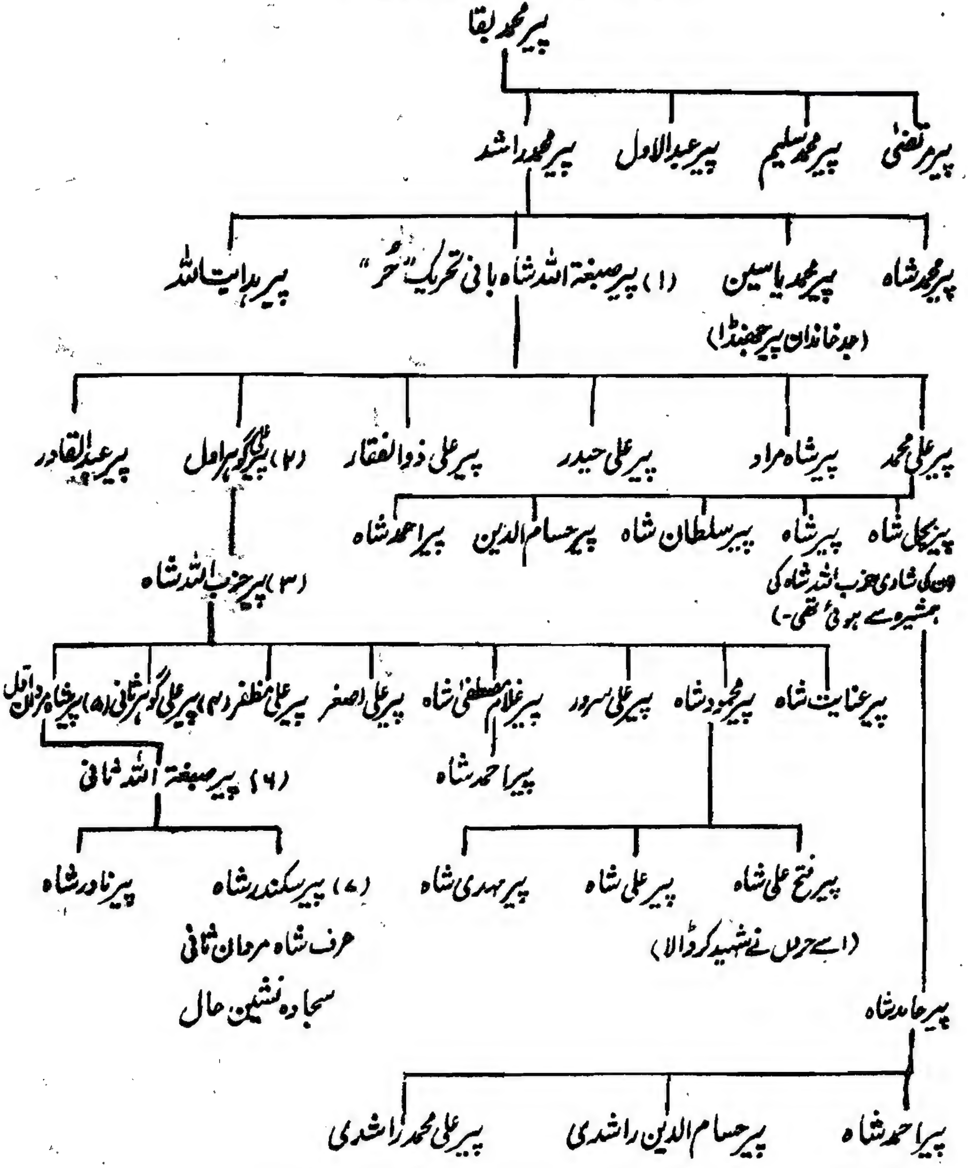
پیر محمد بقا
پیر مرتضیٰ
پیر محمد سلیم
پیر عبد الاول
پیر محمد راشد
پیر محمد شاہ
پیر محمد یاسین
(جد خاندان پیر جھنڈا)
(۱) پیر صبغۃ اللہ شاہ بانی تحریک "حُر"
پیر ہدایت اللہ
پیر علی محمد
پیر شاہ مراد
پیر علی حیدر
پیر علی ذو الفقار
(۲) پیر علی گوہر اول
پیر عبد القادر
پیر یکل شاہ
پیر شاہ
(ان کی شادی حزب اللہ شاہ کی ہمشیرہ سے ہوئی تھی۔)
پیر سلطان شاہ
پیر حسام الدین
پیر احمد شاہ
(۳) پیر حزب اللہ شاہ
پیر عنایت شاہ
پیر محمود شاہ
پیر علی سرور
پیر غلام مصطفیٰ شاہ
پیر احمد شاہ
پیر علی اصغر
پیر علی مظفر
(۴) پیر علی گوہر ثانی
(۵) پیر شاہ مردان اول
(۶) پیر صبغۃ اللہ ثانی
پیر فتح علی شاہ
پیر علی شاہ
(اسے حروں نے شہید کر ڈالا)
پیر مہدی شاہ
(۷) پیر سکندر شاہ
عرف شاہ مردان ثانی
سجادہ نشین حال
پیر نادر شاہ
پیر حامد شاہ
پیر احمد شاہ
پیر حسام الدین راشدی
پیر علی محمد راشدی

پیر صبغۃ اللہ شاہ اول پیر محمد راشد کے بعد سجادہ نشین ہوئے اور دستار وراثت روحانی ان کے سر پر باندھی گئی۔ اس وجہ سے وہ "پیر پگاڑو" یعنی "صاحب دستار" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کے

بھائی پیر محمد یاسین جھنڈا یا علم لے کر دوسری جگہ چلے گئے اور "پیر جھنڈا" کے تلقب سے زبان زد خاص و عام ہوئے۔ ان کے اخلاف کو جمع و فراہمی کتب کا خاص اہتمام رہا۔ چنانچہ "پیر جھنڈا" کا کتب خانہ سندھ کا نہایت نادر علمی ذخیرہ سمجھا جاتا ہے۔ ان کے جانشینوں میں سے پیر رشید الدین، پیر مرشد اللہ، پیر ضیاء الدین شاہ قابل ذکر ہیں۔

پیر صبغۃ اللہ شاہ کے بعد دستار وراثت پیر علی محمد کے سر پہ بندھنے والی تھی، لیکن وہ علمی مذاق کے آدمی تھے اور خود اپنے ہاتھ سے اپنے بھائی پیر علی گوہر اوّل کو وارث بنا دیا۔ پھر پیر حزب اللہ شاہ پیر پگاڑو ۳ بنے۔ بعد ازاں پیر علی گوہر ثانی، پھر شاہ مردان یکے بعد دیگرے سجادہ نشین ہوئے۔ پیر شاہ مردان کی وفات پر پیر صبغۃ اللہ شاہ ثانی کم عمر تھے۔ وہی سجادہ نشین قرار پائے۔ یہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے، لیکن طبیعت کے بڑے سخت و درشت تھے۔ پہلے ان کے خلاف ایک مرتبہ مقدمہ بنا اور قید کی سزا ہوئی۔ رہائی کے بعد ان کے عہد میں حروں نے بد امنی شروع کی، جس کی وجہ سے پیر صبغۃ اللہ شاہ کو پہلے نظر بند کر کے وسط ہند بھیجا گیا۔ پھر ان کے خلاف حیدر آباد میں مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا دی گئی۔

سید صاحب کے زمانے کا پیر کوٹ دریا کی دستبرد میں آگیا تو تقریباً پانچ میل ہٹ کر نیا کوٹ آباد ہوا، جہاں پیران عظام کی میتیں بھی لا کر دفن کی گئیں۔ یہاں کا کتب خانہ بھی بڑا نادر تھا، لیکن اب معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہوا۔ صرف مسجد اور مقبروں والا احاطہ رہ گیا باقی ساری عمارتیں مسمار کر دی گئیں۔ اب نئے سرے سے عمارتیں بنی ہیں۔

دس برس گزر جانے کے بعد پیر صبغۃ اللہ شاہ ثانی کے فرزند اکبر پیر سکندر شاہ مردان ثانی کے لقب سے زینت آرائے سجادہ نشین ہوئے۔ انھوں نے جماعت میں عظیم الشان اصلاحی کاموں کا آغاز کر دیا۔

ان پیروں کے ساتھ عوام کی عقیدت کے حالات بڑے حیرت انگیز ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ باہر نکلتے تھے تو عقیدت مند اپنی ساری دنیوی متاع ان کے قدموں پر ڈال دیتے تھے۔ اگر یہ ریل میں سفر کرتے تھے تو ہر جگہ کے مرید ریلوے لائن پر سارے اندوختے لے کر جمع ہو جاتے تھے۔

پیر صبغۃ اللہ شاہ اول کے صاحبزادوں میں سے پیر علی محمد بہت بڑے طبیب اور صاحب علم و فضل تھے جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، انھیں سجادہ نشین بنایا جا رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے بھائی کے سر پہ دستار باندھ کر الگ ہو گئے اور املاک میں زمینیں اور کتابیں لے کر بیٹھ گئے۔ انھیں مطالعہ اور طب کے ذریعہ

سے خدمت خلق کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ اپنے ایثار اور علم و فضل ہی کے باعث دستار بند خاندان میں انھیں خاص اعزاز حاصل تھا۔ پیر حزب اللہ نے اپنی بہن کی شادی ان کے بیٹے پیر شاہ سے کردی تھی، جن سے حامد شاہ پیدا ہوئے۔ یہ پیر حزب اللہ کے حقیقی بھانجے اور شاہ مردان و پیر علی گوہر ثانی کے عمہ زاد بھائی تھے۔ پیر حامد شاہ کے تین فرزند ہوئے۔ ان میں سے پیر علی محمد راشدی ابتدا سے پبلک کاموں میں سرگرم حصہ لیتے رہے ہیں۔ انگریزی بہت اچھی لکھتے ہیں۔ سیٹھ عبداللہ ہارون مرحوم کی رفاقت میں لیگ کی مجلس امور خارجہ کے سیکرٹری تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے لیگ کی قرارداد لاہور کے اصول کی بناء پر تقسیم ہند کی ایک سکیم تیار کی تھی۔ نیز سندھ کی آزادی کے لیے بڑا ہی قابل قدر کام کیا۔ پاکستان بننے کے بعد سندھ میں وزیر بھی رہے۔ پاکستان کی طرف فلپینز اور چین میں خدمات سفارت بھی انجام دیں۔

پیر حسام الدین کو مطالعہ کا خاص شوق ہے اور قلمی و مطبوعہ کتابوں کا ایک بیش بہا ذخیرہ انھوں نے جمع کرلیا ہے۔ پیر احمد شاہ زمینوں کی دیکھ بھال کا کام کرتے ہیں۔

نوٹ: جن ناموں کے سامنے نمبر لگے ہوئے ہیں وہ ترتیب وار پیر پگاڑو یعنی اصحاب دستار بنے۔

اٹھائیسواں باب

سفرِ ہجرت

(۳)

از شکارپور تا کوئٹہ

صد بیاباں بگزشت و دگرے در پیش است

شکارپور سے جاگن شکارپور سے آگے سارا سفر بلوچستان کے صحرائی اور پہاڑی علاقوں میں سے تھا۔ ان علاقوں سے گزرنا امن کی حالت میں بھی جان جوکھوں کا کام تھا اور جس زمانے میں سید صاحب جانے والے تھے، قزاقیوں کی گرم بازاری کے باعث حالت اتنی مخدوش ہو چکی تھی کہ زیادہ سے زیادہ کرایہ دینے پر بھی اونٹ نہیں ملتے تھے۔ سید صاحب کے ساتھ جو اونٹ بار برداری کے لیے تھے، ان میں سے نصف سفر کی صعوبتوں کے باعث بے بس ہو چکے تھے۔ خاصی تگ و دو کے بعد بارہ اونٹ بہ مشکل مل سکے، جو کافی نہ تھے۔ اس لیے بہت سا سامان، شکارپور میں فروخت کر دیا یا غریبوں میں بانٹ دیا۔ ان میں زیادہ تر تانبے اور پیتل کے برتن تھے۔

تیز گرمی شروع ہو چکی تھی۔ حدت و تپش بے پناہ، پانی اور سایہ کوسوں تک ناپید۔ پھر ہر لحظہ سموم کا خطرہ، ارادت مندوں نے بار بار التجائیں کیں کہ برسات تک سفر ملتوی رکھا جائے۔ وہ سب زیادہ سے زیادہ مدت تک مہمانداری کے لیے تیار تھے، لیکن مصیبت یہ تھی کہ اگر بلوچستان کے صحرائی علاقے میں سے گزرنے کے لیے موسم کی خنکی کا انتظار کیا جاتا تو کوئٹہ اور اس کے آگے کے کوہستانی علاقے میں برف پڑنے لگتی، جس میں بعض اوقات ہفتوں راستے بند رہتے۔ لہٰذا اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ سموم اور لو کا خطرہ برداشت کیا جائے۔ خدا کی رحمت کہ روانگی سے ایک روز پیشتر خلاف امید اور خلاف موسم اچانک غیر معمولی بارش ہو گئی، جس سے موسم کی حدت میں خاصی کمی آ گئی۔

۱۴- ذی حجہ ۱۲۴۱ھ (۲۰- جولائی ۱۸۲۶ء) کو سید صاحب شکارپور سے روانہ ہوئے۔ شہر کے اکابر، علماء، لشکری اور عوام چار کوس تک ساتھ گئے۔ چھ کوس پر جاگن[1] میں پہلی منزل ہوئی۔ بارش

---

[1] بمبئی کی انگریزی فوج کے کوارٹر ماسٹر جنرل نے سندھ، گجرات، کچھ، جودھپور وغیرہ کے راستوں اور منزلوں کے متعلق (باقی صفحہ ۲۹۹ پر)

روانگی سے ایک دن پہلے بھی ہو گئی تھی، راستے میں بھی ہُوئی۔ جاگن پہنچنے کے بعد اس زور سے مینہ برسا کہ لہڑی، جھان، برشوری اور مکھن بیلہ کے راستے سے سفر غیر ممکن ہو گیا۔ اس وجہ سے یہ سیدھا راستہ بیس کوس بائیں ہاتھ چھوڑ کر خان گڑھ کا رخ کرنا پڑا۔

سید انور شاہ امرتسری

سید صاحب جاگن میں اس وجہ سے چار روز ٹھہرے کہ سید انور شاہ امرتسری کا انتظار تھا، جن کی آمد کی اطلاع شکارپور ہی میں مل چکی تھی۔

سید انور شاہ امرت سر کے سادات عظام میں سے تھے۔ رنجیت سنگھ کے دربار میں بھی بہت محترم تھے۔ سکھ امرا اور عام لوگ بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ سکھوں کے کسی مذہبی پیشوا کا ایک عزیز ان کے پاس آتا جاتا تھا۔ اس نے مسلمان ہونا چاہا۔ سید انور شاہ نے بے تکلف اسے کلمہ پڑھا دیا۔ کسی مفسد نے انور شاہ کی ناک کو بھی نقصان پہنچایا۔ سید موصوف نے اس ظلم و جبر کے خلاف جہاد آرائی کا فیصلہ کر لیا۔ مفسدوں نے حکمران طبقے کی امداد سے ان کے لیے گھر ہی میں اک گونہ نظربندی کا بندوبست کرا دیا۔

تکیہ شریف میں جب جہاد کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو ہندوستان کے گوشے گوشے سے ارباب ہمت و حمیت کے متعلق خبریں منگائی جا رہی تھیں۔ اس سلسلے میں سید انور شاہ کے حالات بھی معلوم ہوئے اور غالباً کسی ذریعے سے ان کے ساتھ ربط و تعلق بھی پیدا کر لیا گیا۔ جب سید صاحب نے ہجرت کی تو فتح پور سے حاجی یوسف کشمیری کو امرت سر روانہ کر دیا کہ سید انور شاہ کو ساتھ لے کر سندھ پہنچ جائے۔

حاجی یوسف امرت سر پہنچا تو معلوم ہُوا کہ جو افسر سید انور شاہ کی نگرانی پر متعین تھا، وہ کسی بات پر ناراض ہو کر کام چھوڑ بیٹھا ہے اور اس کی جگہ نیا آدمی مقرر نہیں ہُوا۔ ممکن ہے حکومت نے نیا افسر مقرر کرنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی ہو۔ سید موصوف نے اس فرصت کو غنیمت سمجھا۔ اپنے پندرہ خادموں کو تین گھوڑے اور باربرداری کے اونٹ دے کر خفیہ خفیہ آگے بھیج دیا۔ پھر خود بھی چپ چاپ نکل کر ان سے مل گئے اور ریاست بہاول پور کی سرحد میں داخل ہو گئے۔ بہاول پور میں ان کی ملاقات سید زین محمد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۸) ایک مجموعہ معلومات ۱۸۴۶ء میں، یعنی سید صاحب کے سفر سے بیس برس بعد شائع کیا تھا۔ بعض منازل بلوچستان کے سلسلے میں اس کا حوالہ آگے بھی آئے گا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ جاگن میں صرف سات گھر ہیں اور چند دکانیں۔ پانی کے لیے پانچ کنوئیں ہیں، گھوڑوں اور اونٹوں کے لیے چارہ بکثرت مل جاتا ہے۔ قافلے کے ٹھہرنے کی جگہ گاؤں کے جنوب مغرب میں ہے (مجموعہ مذکورہ صفحہ ۱۵۱)۔ ۲؎ "منظورہ" میں ہے: حسن چہرۂ زیبائش بہ نقصان سر بینی متغیر ساختند۔ (صفحہ [illegible]

قندھاری سے ہوئی، جنھیں سید صاحب نے دعوت نامہ جہاد دے کر نواب بہاول خاں کے پاس بھیجا تھا۔ پھر یہ اکٹھے منزل مقصود کی طرف چلے۔ سید صاحب خود شکارپور میں زیادہ دن انتظار نہ کر سکے۔ البتہ اکبر خاں کو دس غازیوں کے ساتھ سید انور شاہ کے استقبال کے لیے چھوڑ گئے اور جاگن میں یہ لوگ سید صاحب سے ملحق ہوئے[1]۔

خان گڑھ سے بھاگ

سید صاحب جاگن سے براہ جانی درہ خان گڑھ[2] گئے اور وہاں سے شاہ پور کا راستہ اختیار کر لیا، جو روجھان، برشوری وغیرہ کے سیدھے راستے سے بیس بائیس کوس دائیں جانب تھا۔ یہ سارا راستہ صحرائی تھا۔ پہلی منزل آٹھ کوس پہ صحرا میں ایک جوہڑ کے کنارے ہوئی، جس میں برسات کا پانی جمع ہو گیا تھا۔ مزید دس کوس کا فاصلہ طے کر کے دوسری منزل بھی صحرا میں ہوئی۔ تیسرے روز شاہ پور پہنچے۔ اس سفر میں خان گڑھ کے زمیندار کا بھائی رہبر کے طور پر ساتھ رہا۔

شاہ پور میں محسن شاہ نام ایک سید رہتے تھے جو بلوچوں کے بڑے محترم پیر تھے۔ انھوں نے رہبری کے لیے اپنے دو فرزند ساتھ کر دیے۔ شاہ پور سے بھاگ تک منزلوں کی کیفیت یہ ہے:

۱ - **چھتر** : یہ مقام شاہ پور سے آٹھ کوس شمال میں ہے، اس کے پاس ہی ایک مقام پھلیجی ہے۔ آج کل ان دونوں مقاموں کا نام عموماً اکٹھا لیا جاتا ہے یعنی چھتر پھلیجی۔ چھتر میں محراب خاں فرمانروائے بلوچستان کی طرف سے ملا محمد حاکم تھا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ اسی کی وساطت سے سید صاحب نے دعوت نامۂ جہاد محراب خاں کے پاس بھیجا۔ اگرچہ اہل و عیال کو پیر کوٹ میں ٹھہرانے کا ارادہ فرما چکے تھے، لیکن خیال تھا

---

[1] سید انور شاہ جہاد میں شریک رہے پھر معلوم نہیں کس کام کے لیے انھیں واپس بھیج دیا گیا۔ سید صاحب کے رفیقوں میں سے جو لوگ اکا دکا پنجاب کے راستے آتے جاتے رہے، ان میں سے بعض کے حالات سفر میں سید انور شاہ کا بھی ذکر آیا ہے۔

[2] خان گڑھ اب نہیں رہا یہاں ایک کچی گڑھی تھی جس کے اندر کھاری پانی کا کنواں تھا باہر تین چار کنوئیں میٹھے پانی کے تھے۔ جنرل جان جیکب جب یہاں پہنچا تو اس نے اسے ایک اہم سرحدی مقام سمجھتے ہوئے چوکی بنائی۔ جلد وہاں ایک قصبہ آباد ہو گیا، جس کا نام جیکب آباد رکھا گیا۔ آج کل یہ سندھ کے ایک ضلع کا صدر مقام ہے۔ جیکب نے ۱۸۵۸ء میں وفات پائی اور وہ جیکب آباد ہی میں دفن ہوا۔ شکارپور سے یہ ۲۶ میل شمال میں ہے۔

کہ اگر اس سے بھی بہتر اور موزوں تر مقام مل جائے تو وہاں ٹھہرائیں۔ اس لیے محراب خاں کو بھی لکھا کہ ہمارے اہل و عیال کو اپنے پاس ٹھہرالیں تو بہ فراغت بال کاروبار جہاد میں مشغول ہوں۔

۲۔ کھنہ بار: بہتر سے نکلے تو کھنہ بار میں ٹھہرے۔ ملا محمد ساتھ آیا اور لشکر کی ضرورت کی تمام چیزیں کرادیں۔

۳۔ کھنہ بار سے: نکلے تو دو کوس پر ندی آگئی۔ اونٹوں کو ندی میں سے گزارنے میں بڑی دقتیں پیش آئیں، سارا دن اسی کام میں گزر گیا۔ مجبور ہو کر رات وہیں گزاری۔

۴۔ بھاگ: ۲۶ ذی حجہ (یکم اگست) کو سید صاحب بھاگ پہنچ گئے۔

بھاگ سے ڈھاڈر

بھاگ اس زمانے میں کچھی علاقے کا بہت بڑا قصبہ تھا۔ دو ہزار کے قریب مکان تھے اور کم و بیش ایک سو دس دکانیں تھیں۔ اب بھی اس کی آبادی خاصی بڑی ہے، لیکن سفر کے ذرائع بدل جانے کے باعث اسے پہلے کی سی اہمیت حاصل نہیں رہی۔

سید صاحب قصبے کے مشرق میں دروازے کے باہر ٹھہرے تھے اور دو روز وہاں مقام رہا۔ حاکم علاقہ، قاضی، شرفا، علماء اور عوام بڑی عقیدت سے ملے۔ حاکم نے سید صاحب کو پچاس ساٹھ غازیوں کے ساتھ دعوت طعام دی۔ خربوزے یہاں اتنے سستے تھے کہ ایک پیسے میں پندرہ بیس مل جاتے تھے[1]۔

۲۹ ذی حجہ کو بھاگ سے نکلے تو حاجی[2] میں ٹھہرے۔ راستے کا ایک رئیس سید صاحب کو انتہائی رستے اپنے مکان پر لے گیا اور پر تکلف کھانا کھلایا۔ حاجی سے نکلے تو آبڑی میں قیام کیا۔ یکم محرم الحرام

---

[1] روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ بھاگ میں ہر قسم کے میوے ملتے ہیں اور نہایت عمدہ باغ ہیں۔ انار بے حد شیریں ہوتا ہے اور اتنا ہی بڑا جتنا قندھار کا انار ہوتا ہے نیز ویسا ہی آبدار۔ انگور اور تربوز بھی بہت عمدہ ہوتے ہیں۔

[2] بعض نقشوں میں اسے "حاجی شہر" یا "حاجی کا شہر" لکھا ہے۔ سید صاحب کے زمانے میں اس کے گرد فصیل تھی اور اڑھائی تین سو مکانات تھے۔ یہاں سے مٹھڑی جائیں تو سبی کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ ڈھاڈر جانا ہو تو آبڑی کا راستہ زیادہ موزوں ہے۔ حاجی اور بھاگ کے درمیان قریباً دس کوس کا فاصلہ ہے۔ بھاگ کے نزدیک فرمانروایان بلوچستان کے خاندان میں سے مصطفیٰ خاں اور رحیم خاں کے مقبرے ہیں۔ نیز ایک پیر کا مقبرہ ہے جو وزیر فتح خاں بارک زئی کا مرشد تھا۔

۱۲۴۲ھ کو سید صاحب ڈھاڈر پہنچ گئے۔ جو درۂ بولان کے جنوبی دہانے کا مشہور مقام ہے۔ قافلے پیدل جاتے آتے تھے تو ڈھاڈر کی اہمیت بہت بڑھی ہوئی تھی۔ جب ریل بن گئی تو ڈھاڈر کی جگہ سبّی نے لے لی۔ اب وہاں خان قلات کا ایک محل ہے، جہاں وہ کچھ وقت گزارتا ہے۔

درۂ بولان کا سفر

ڈھاڈر سے درۂ بولان شروع ہو جاتا ہے۔ یہ سفر دو وجہ سے نہایت صعب اور خطرناک تھا، ایک تو راستے میں کھانے کی کوئی جنس میسر نہیں آتی تھی؛ دوسرے دونوں جانب بلند پہاڑوں کی دیواریں کھڑی تھیں۔ چور اور ڈاکو ان پہاڑوں کی کمین گاہوں سے نکل کر اچانک مسافروں پر حملے کر دیتے تھے۔ ڈھاڈر میں لوگ مہینوں اس انتظار میں بیٹھے رہتے تھے کہ بڑا قافلہ بن جائے تو حفاظت کا پختہ انتظام کر کے قدم آگے بڑھائیں۔

سید صاحب نے چار روز کے لیے اشیائے خوردنی ساتھ لے لیں اور ۸۔ محرم الحرام کو درۂ بولان میں داخل ہو گئے۔ حفاظت کی مصلحتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے قافلے کی ترتیب یوں رکھی: سب سے آگے بندوقچیوں کا دستہ، ان کے پیچھے اونٹ، پھر ضعیف آدمی۔ ان کے بعد باقی غازیوں کے دستے؛ سب سے آخر میں سید صاحب خود سواروں کے ساتھ چلے۔ درے کے پورے سفر میں یہ ترتیب برابر قائم رکھی۔

درۂ بولان کی منزلیں

اب درۂ بولان کی منزلوں کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ ندی کے کنارے ببول کے ایک پرانے درخت کے اُس پاس۔ جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں یہ مقام کھنڈلائی کے قریب ہوگا۔

۲۔ کیرتا: اس نام کے دو مقام آس پاس واقع ہیں: ایک شمالی کیرتا، دوسرا جنوبی کیرتا۔ سید صاحب کی منزل شمالی کیرتا میں ہوئی ہوگی، جو کھنڈلائی سے گیارہ میل ہے۔ اسے ایک چھوٹے سے قصبے کی حیثیت حاصل ہے۔ کھیتی باڑی بھی خوب ہوتی ہے، اس لیے کہ پانی یہاں مستقل طور پر جاری رہتا ہے۔

۳۔ بی بی نانی: یہاں کوئی آبادی نہیں۔ بلند ٹیلے کے دامن میں ایک سیدہ کی قبر ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ بی بی صاحبہ اپنے بھائی کے ساتھ درے میں سے گزر رہی تھیں۔ آس پاس کے بلوچوں نے حملہ کر دیا۔ بھائی، حملہ آوروں سے لڑتا ہوا تھوڑی دور نکل گیا۔ پیچھے سے بلوچوں کے دوسرے دستے نے بی بی صاحبہ پر یورش کر دی۔ وہ تنہا کیا کر سکتی تھیں؟ خدا سے دعا کی کہ میری عفت کو بچا لے۔ اچانک پہاڑ میں شگاف پیدا ہوا، سیدہ اس میں سما گئیں اور پہاڑ پھر مل گیا۔ بلوچوں نے

پاس ہی قبر بنالی۔ سیدہ کا نام معلوم نہیں، مقام کا نام بی بی نانی اس وجہ سے پڑا کر بلوچ یہاں عام طور پر نان تقسیم کرتے ہیں۔ یہ مقام کیرتا سے نو دس میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں مغرب کی طرف سے ایک چشمہ آکر درۂ بولان میں ملا ہے۔ آج کل بی بی نانی کے قریب حکومت نے ایک چوکی بھی بنادی ہے۔ جس میں پانچ سات سپاہی رہتے ہیں۔

۴۔ مچھ قدیم: سید حمید الدین نے اپنے خط میں اس مقام کا نام "سرآب" اور "سر کھجور" لکھا ہے[1] ممکن ہے پرانے زمانے میں اس مقام کو "سرآب" اور "سر کھجور" بھی کہتے ہوں۔ مچھ قدیم موجودہ مچھ سے دو میل شمال میں ہے اور بی بی نانی سے قریباً سولہ میل ہوگا۔ سر بولان، جہاں سے درے کا شمالی دہانہ شروع ہوتا ہے، مچھ قدیم سے پانچ میل ہے۔

۵۔ دشتِ بے دولت: اس مقام کو محض "دشت" بھی کہتے ہیں اور بعض اوقات "دروازہ" بھی، اس لیے کہ درۂ بولان کے شمالی دروازے سے بالکل متصل ہے اور پورے سفر کا یہی سب سے بڑھ کر دشوار گزار حصہ تھا، کیونکہ آخری چار پانچ میل کے علاقے میں دونوں طرف کے پہاڑ بالکل قریب آگئے ہیں اور بیچ میں ایک تنگ گلی رہ گئی ہے۔ اوپر سے اگر کوئی شخص پتھر بھی لڑھکاتا جائے تو بڑی فوج کو پریشان کرسکتا ہے، خود اسے کوئی گزند اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا، جب تک کوئی دستہ گلی سے باہر آکر پہاڑ پر نہ چڑھ جائے۔

درّے کی اہمیت

سید حمید الدین اس درے کی جغرافیائی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بالائے آں کوہ ہائے ہر دو جانب اگر — اگر دونوں جانب کے پہاڑوں پر سو آدمی

---

[1] "سرآب" کوئٹہ ریلوے لائن کا ایک سٹیشن ہے، جو درۂ بولان سے گزر کر آتا ہے۔ "سر کھجور" بی بی نانی سے تین چار میل مغرب میں راستے سے ہٹا ہوا ہے۔ کوئٹہ جانے والے کے لیے بی بی نانی سے "سر کھجور" جانا خارج از بحث ہے۔ مچھ سے چند میل شمال مشرق میں ایک مقام "سر بایت" ہے۔ یہ بھی راستے سے الگ ہے۔ بلوچی میں مچھ کے معنی ہیں کھجور اور یہاں ایک بڑے پتھر سے شیریں اور مصفٰی پانی کے کئی چشمے پھوٹے ہیں جن پر لوہے کا ٹینک بنا دیا گیا ہے اور یہیں سے پانی موجودہ مچھ میں لایا گیا ہے اس وجہ سے مچھ قدیم کو "سرآب" اور "سر کھجور" کہنا تعجب انگیز نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بی بی نانی کے بعد سید صاحب نے یہیں قیام فرمایا۔ [2] اس مقام کو دشتِ بے دولت اس وجہ سے کہتے ہیں کہ وہاں نہ پانی ہے، نہ سبزی۔

صد کس با ساز جنگ بر سر مخالفت بنشینند، لک
سوار و پیادہ بر ہر سامان کہ بودہ باشد، مجال گزر کردن
ازاں راہ نتوانند[1]

بھی سامانِ جنگ لے کر بیٹھ جائیں تو ایک لاکھ
کے لشکر سوار و پیادہ کے لیے گزرنے کی کوئی شکل
نہ رہے، اگرچہ وہ کتنے ہی سامان سے لیس ہو۔

اس کی تصدیق بعد کے انگریز مبصروں کے بیانات سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ریورنڈ ایلن، جو سنہ ۱۸۴۲ء میں شاہ شجاع کے معاون انگریزی لشکر کے ساتھ اس راستے سے گزرا تھا، لکھتا ہے:

> یہ لوگ (یعنی بلوچستان والے) بڑے ہی نادان تھے، جنھوں نے ایسے درے کے ہوتے ہوئے ہمیں اپنے ملک میں آنے دیا[2]

کنولی لکھتا ہے:

> اس درے کی ہر چھوٹی بڑی چیز کو تفصیلاً بیان کر دینے سے بھی اُس کے استحکام کا صحیح نقشہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک ایسی گھاٹی ہے، جہاں بہادر آدمیوں کی ایک رجمنٹ کو بٹھا کر بڑی فوج کو کامیابی سے روکا جا سکتا ہے[3]

کوئٹہ

درۂ بولان کی شمالی سمت میں نکلے تو بہت بلندی پر پہنچ گئے۔ ڈھاڈر میں گرمی کا یہ عالم تھا کہ دن کے وقت سایے سے باہر قدم رکھنا بھی مشکل تھا۔ درے کے اندر صرف اتنی سردی تھی کہ ایک چادر یا اس سے ذرا موٹے کپڑے کی ضرورت پڑتی تھی۔ دشت میں پہنچے تو سردی کے مارے سب کے جسموں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ مچھ سے ظہر کے وقت چلے تھے، دشت میں پہنچے تو رات قریب الختم تھی۔ صبح کی نماز سب نے تیمم کر کے پڑھی۔ وہاں سے چلے تو سرآب میں ٹھہرے، جو دشت سے سولہ میل تھا۔ سرآب سے کوئٹہ صرف آٹھ میل رہ گیا۔ اسی روز یا اگلے روز کوئٹہ پہنچ گئے۔

حاکم کوئٹہ نے سید صاحب اور غازیوں کی مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ دوران قیام میں روزانہ پُر تکلف کھانے اور میوے بھیجتا رہا۔ بیعت بھی کی اور ساتھ جانے کے لیے بھی تیار ہو گیا۔ سید صاحب نے اسے روک دیا؛ اس لیے کہ اکا دکا مامورین کو ساتھ لینا خلاف مصلحت تھا۔ اس طرح حاکموں کے

---

[1] منظورہ صفحہ ۹۲۵۔ [2] "مارچ تھرو سندھ اینڈ افغانستان" (سندھ اور افغانستان میں سے کوچ) صفحہ ۱۰۶۔ [3] کتاب مذکور صفحہ ۷۔ [4] سید حمید الدین نے اس مقام کا نام "شال" لکھا ہے۔ اصل نام شال کوٹ تھا۔ مخففاً اسے شال کہتے تھے جو اس وادی کا بھی نام ہے جس میں کوئٹہ واقع ہے۔ انگریزوں نے اسے کوئٹہ بنا دیا۔ وادیِ شال بارہ میل لمبی اور تین چار میل چوڑی ہے۔

دلوں میں وسوسے پیدا ہونے کا احتمال تھا اور سید صاحب خود حاکموں کو ساتھ ملانا چاہتے تھے۔ سید حمید الدین لکھتے ہیں:

در فرقۂ امراء و رؤسا ایں چنیں مرد دیندار	امراء و رؤسا میں ایسا نیک کردار اور دیندار
نیک کردار کمتر بنظر آمدہ۔	آدمی بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔

کوئٹہ سے دو کوس پر سادات کا ایک گاؤں تھا۔ ایک روز وہ لوگ آئے اور سید صاحب کو ایک سو غازیوں کے ہمراہ اپنے ہاں لے گئے۔

بلوچستان کی سرگزشت

بلوچستان پہلے افغانستان کے غلزئی بادشاہوں کے ماتحت تھا، جو صفویوں کے آخری دور میں ایران پر بھی قابض ہو گئے تھے۔ ان کی سلطنت کو نادر شاہ افشار نے ختم کیا۔ نادر کے قتل پر افغانستان و بلوچستان کو احمد شاہ درانی نے سنبھال لیا۔

بلوچستان کے حکمران خاندان کا جد امجد میر عبد اللہ غلزئیوں کا خاص رفیق تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے جن میں سے نصیر خاں اول بہت مشہور ہوا۔ اسی نے بلوچستان کو ایک مستقل دولت بنایا۔ ۱۷۹۴ء میں نصیر خاں کی وفات پر اس کا بیٹا میر محمود خاں مسند نشین ہوا۔ اس کے عہد میں نصیر خاں کے بھائیوں کی اولاد نے بڑے فتنے بپا کیے۔ برسوں خانہ جنگی جاری رہی۔ اس دور میں اخوند ملا فتح محمد نے، جو نصیر خاں کا مشیر خاص تھا بڑے خلوص و دیانت سے محمود خاں کا ساتھ دیا۔ ۱۸۱۶ء میں محمود خاں فوت ہوا تو محراب خاں حاکم بنا۔

سید صاحب محراب خاں کے پاس جہاد کا ایک دعوت نامہ چھتر سے بھیج چکے تھے۔ اس اثنا میں قندھار و بلوچستان کے درمیان حالت جنگ پیدا ہو گئی۔ عبد اللہ خاں درانی قندھاری فوج لے کر مے زئی پہنچ گیا جو کوئٹہ سے قریباً تیس کوس پر ہے۔ بلوچستان کی فوج اخوند فتح محمد کی سرکردگی میں مستونگ پہنچ گئی۔ دعوت نامے کے جواب میں دیر ہو گئی تو سید صاحب نے "دشت بے دولت" سے ایک وفد اخوند فتح محمد کے پاس بھیج دیا، جو سید اولاد حسن قنوجی، حاجی بہادر شاہ خاں رامپوری، مولوی نظام الدین چشتی اور سید حمید الدین پر مشتمل تھا۔

اخوند نے بڑی گرم جوشی سے وفد کا استقبال کیا۔ دعوت نامے کے جواب میں تاخیر کی وجہ یہ بتائی کہ صورت جنگ در پیش ہے۔ اسی وقت ایک خاص قاصد قلات بھیج دیا۔ وفد چونکہ فوری مراجعت کا متقاضی تھا، اس لیے اخوند نے خود ایک خط سید صاحب کے نام لکھ دیا کہ تین روز میں جواب کوئٹہ

پہنچ جائے گا۔ دو سوار رہنمائی کے لیے وفد کے ساتھ کر دیئے۔ ایک بار شتر سردے، تربوز اور خربوزے بھیجے۔

اخوند فتح محمد

سید حمید الدین اخوند فتح محمد کے متعلق فرماتے ہیں:

ایں چنیں کمتر کسے را عمر و اقبال و دیانت و تقویٰ باہم یاری کنند۔

ایسی مثالیں بہت کم دیکھی گئی ہیں کہ ایک شخص کو عمر و اقبال، و دیانت و تقویٰ بہ یک وقت اس پیمانے پر نصیب ہوئے ہوں۔

ایک سو بیس برس کی عمر ہو چکی تھی لیکن قویٰ ضعف و انحطاط سے محفوظ تھے۔ اس عمر میں بھی اخوند صاحب گھوڑے پر سوار ہو کر لشکر کی سرداری کرتے تھے۔ نادر شاہ کے پاس ملازم ہوئے تھے۔ پھر نصیر خاں اول کے وزیر رہے۔ میر محمود خاں کے زمانے میں تمام امور ملک داری کے کفیل بن گئے۔ محراب خاں نے بھی ان کا عہدۂ وزارت بحال رکھا۔[1]

محراب خاں کی طرف سے یہ جواب کوئٹہ پہنچا:

شما بہ مہمے کہ می روید، تشریف ببرید در قندھار مطلوب نیست، بعد تصفیہ جنگ با مردم قندھار ہرچہ مناسب منظور خواہد شد، بروئے کار خواہد آمد۔

آپ جس مہم پر جا رہے ہیں، تشریف لے جائیں۔ قندھاریوں کے ساتھ جنگ کا تصفیہ ہو جانے کے بعد جو کچھ مناسب سمجھا جائے گا، بروئے کار آ جائے گا۔

---

[1] چند برس بعد اخوند فتح محمد کو محراب خاں کے دوسرے مشیر داؤد محمد نے بڑی بیدردی سے قتل کرا دیا۔ پھر اخوند کے بیٹے ملا حسن نے عجیب و غریب فتنہ انگیزیاں شروع کر دیں، جن کے ضمن میں محراب خاں ناحق مارا گیا، لیکن یہ تفصیلات ہمارے پیشِ نظر موضوع سے خارج ہیں۔

انتیسواں باب

سفرِ ہجرت

(۴)

از کوئٹہ تا پشاور

این رہ بہ پائے تن بہ پایاں نہ رسد   تا جاں نہ زند قدم، بہ جاناں نہ رسد

کوئٹے سے روانگی محراب خاں کا جواب موصول ہو جانے کے بعد کوئٹہ میں ٹھہرے رہنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ چنانچہ سید صاحب ۱۵۔ محرم الحرام ۱۲۴۲ھ (۲۲ اگست ۱۸۲۶ء) کو چل پڑے۔ حاکم کوئٹہ پچاس ساٹھ سواروں کو لے کر تین کوس تک ساتھ گیا۔ عام لوگ بھی ساتھ تھے۔ رخصت کے وقت حاکم پر رقت طاری ہو گئی۔ اخوند فتح محمد نے زبانی پیغام بھیجا تھا کہ سید صاحب قندھار و بلوچستان کے درمیان مصالحت کے لیے دعا فرمائیں۔ اسی مقام پر سید صاحب نے عجز و الحاح سے دعا کی اور سب کو رخصت فرمایا۔

کوئٹہ سے قندھار تک کی منزلیں یہ تھیں:

(۱) کیتر (۲) حیدرزئی (۳) سدوزئی، جسے بعض نقشوں میں شادی زئی بھی لکھا ہے۔ (۴) مے زئی (۵) کوژک تیمر (۶) چوکی (۷) کاریز ملا فتح اللہ خاں (۸) ایک ویرانے میں منزل (۹) قلعہ حاجی یا دہ حاجی (۱۰) کاریز ملا عبداللہ (۱۱) خوشاب (۱۲) قندھار۔

کوئٹہ تک کے سفر کا بیشتر حصہ عام مسافروں ہی کی حیثیت میں طے ہوا تھا۔ زیادہ تر لوگوں کی یہ کیفیت رہی کہ یا تو سید صاحب کے ساز و سامان اور لشکر کی قلت کو دیکھتے ہوئے عزمِ جہاد کے متعلق وسوسوں میں مبتلا ہو جاتے تھے یا انھیں انگریزوں کا جاسوس سمجھ لیتے تھے۔ کوئٹہ سے قدم آگے بڑھا تو عوام کے جوشِ پذیرائی کا رنگ بالکل دوسرا ہو گیا۔ جگہ جگہ سے لوگ خربوزے وغیرہ لے کر راستے پر آبیٹھتے تاکہ اس قدوسی لشکر کی زیارت سے برکت حاصل کریں۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ عورتیں تبرکاً بچوں کے سروں پر ہاتھ پھرواتیں۔ ہر طرف سے سلام علیک، مرحبا اور "ستڑے موشے" کی صدا بلند ہوتی۔ سید صاحب سب کے لیے دعا فرماتے۔

سید صاحب کا دستور یہ تھا کہ ہر مملکت میں داخل ہوتے ہی قریب کے ذمہ دار افسر کو اپنے مقاصد سفر سے آگاہ کر دیتے تاکہ کوئی اور وسوسہ نہ گزرے۔ عبداللہ خاں سپہ سالار عساکر قندھار کو بھی اطلاع بھیج دی۔ سید صاحب حیدر زئی پہنچے تو لوگوں نے اہتمام سے دعوت کی۔ وہیں عبداللہ خاں کا خط پہنچا کہ سے زئی آئیں۔ چنانچہ سید صاحب کو راستہ چھوڑ کر ادھر جانا پڑا۔ عبداللہ خاں بڑے تپاک سے ملا اور تین روز اپنے پاس ٹھہرائے رکھا۔ اس اثنا میں قندھار سے اجازت آ گئی، پھر سید صاحب روانہ ہوئے۔

مے زئی سے دس کوس پر کوہ توبہ کا درہ ہے، جسے کوژک تیر کہتے ہیں۔ عشا کے وقت اس کے دامن میں پہنچے۔ پہاڑ کی چڑھائی بڑی سخت تھی۔ صعود و ہبوط کا کل فاصلہ اگرچہ چار کوس سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن پورا دن اس میں لگ گیا اور شام کے وقت چوکی پہنچے، وہاں پانی کے دو تین چشمے تھے۔ اس مقام سے ایک راستہ سیدھا کابل جاتا تھا، دوسرا قندھار۔ سید صاحب نے قندھار والا راستہ اختیار کیا، اس لیے کہ حاکمانِ قندھار سے مل کر کابل جانا چاہتے تھے۔ مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھیں بھی جہاد کی دعوت پہنچا دیں۔

افغانستان کی سیاسی کیفیت

اب آگے بڑھنے سے پہلے افغانستان کی سیاسی حالت کا سرسری نقشہ سامنے رکھ لینا چاہیے۔ افغانستان میں نئی حکومت کا آغاز احمد شاہ درانی سے ہوا۔ پھر اس کا بیٹا تیمور بادشاہ بنا۔ تیمور کے کئی بیٹے تھے، جن میں سے بعض کو مختلف علاقوں کی حکومتیں دے دی گئی تھیں۔ زمان شاہ نے تاج و تخت پر قبضہ کر لیا۔ وہ بڑا خود سر اور غیور تھا۔ اس کے بھائیوں میں سے محمود نے مخالفانہ چھیڑ چھاڑ جاری رکھی۔

زمان شاہ کے مشیروں میں سے پایندہ خاں بارک زئی بہت معزز و مقتدر تھا۔ اسے سرفراز خاں کا خطاب حاصل تھا۔ شاہ کے وزیر رحمت خاں (جسے بعد میں وفادار خاں کا خطاب دیا گیا) کو پایندہ خاں اور بعض دوسرے قدیم سرداروں سے بے وجہ کاوش پیدا ہو گئی۔ اس نے غلط بیانیوں سے شاہ کو سب کا مخالف بنا دیا اور ایک مرتبہ غصے میں شاہ نے پایندہ خاں اور بعض دوسرے قدیم سرداروں کو قتل کرا دیا۔ پایندہ خاں کا قبیلہ بہت بڑا تھا اور اس کے بائیس بیٹے تھے۔ وہ سب شاہ کے دشمن بن گئے۔ سب سے بڑا بیٹا فتح خاں بڑا بہادر اور زیرک تھا۔ اس نے شاہ محمود کے ساتھ ہو کر کابل پر چڑھائی کر دی۔ زمان شاہ شکست کھا کر ہندوستان کی طرف بھاگا۔ جلال آباد کے قریب عاشق شنواری کے قلعے میں سستانے کے لیے ٹھہر گیا۔ عاشق نے اسے گرفتار کرا دیا۔ محمود نے زمان شاہ کی آنکھوں

میں سلائی پھرادی اور اسے قید کر دیا۔

محمود بادشاہ بنا تو اس نے فتح خاں کو تمام امور کا کفیل بنا دیا۔ زمان شاہ کا ماں جایا بھائی شاہ شجاع مدت تک لڑتا رہا اور اسے اطمینان سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ بالآخر پنجاب ہوتا ہوا لدھیانہ پہنچ گیا۔ زمان شاہ ایران چلا گیا۔ پھر حج کے لیے حجاز پہنچا، بعدہ لدھیانہ آ گیا۔ انگریز اسے دو ہزار روپے وظیفہ دیتے تھے۔ ۱۸۴۵ء میں وفات پائی۔

ادھر محمود کے بیٹے کامران کو فتح خاں کا اقتدار پسند نہ آیا۔ اس نے موقع پا کر فتح خاں کو قتل کرا دیا۔ اس کے بھائی مختلف علاقوں کے حاکم تھے، وہ سب خود مختار بن گئے۔ صرف ہرات محمود و کامران کے پاس رہ گیا۔

بارک زئیوں کی حکومت

پائندہ خاں کے قتل نے زمان شاہ کی سلطنت کا تختہ الٹ دیا تھا، فتح خاں کے قتل نے سدوزئیوں کی بساط حکومت لپیٹ دی اور بارک زئی افغانستان کے بڑے حصے کے مالک بن گئے۔ انھوں نے سلطنت کو یوں تقسیم کیا:

قندھار	پُردل خاں، شیردل خاں، رحمدل خاں، مہردل خاں، کہن دل خاں۔ یہ پانچوں بھائی ایک ماں کے بطن سے تھے۔
غزنی	میر محمد خاں
کابل	دوست محمد خاں
پشاور	یار محمد خاں
کوہاٹ	سلطان محمد خاں
ہشت نگر	سید محمد خاں

فتح خاں کے بعد عظیم خاں سب میں بڑا تھا اور اسی کو سب سے افضل مانا جاتا تھا۔ اس نے ۱۸۲۳ء میں نوشہرہ میں سکھوں سے سخت جنگ کی تھی۔ وہ فوت ہوا تو اس کا بیٹا حبیب خاں جانشین بنا۔ آخر دوست محمد خاں سب پر غالب آیا اور اس نے آہستہ آہستہ پورے افغانستان پر قبضہ جما لیا۔ یار محمد خاں اور سلطان محمد خاں پشاور میں رہتے تھے۔ کبھی کبھی کابل بھی چلے جاتے تھے۔ سید صاحب کے ساتھ کشمکش یار محمد خاں ہی نے پیدا کی۔ یہی شخص ہے، جس کی رخنہ اندازیوں کے باعث سید صاحب کے لیے قدم قدم پر خوفناک مشکلات پیدا ہوئیں۔ تمام بھائیوں میں سخت اختلافات تھے۔ سید صاحب نے ان اختلافات کو دور کرنے کی بے حد کوششیں کیں، لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ سید صاحب

قلعہ حاجی پہنچے تو پردل خاں کے بھائی شیر دل خاں[1] کے انتقال کی خبر ملی۔ اسی وجہ سے بلوچستان کے ساتھ بھی صلح ہو گئی۔

قندھار میں قیام

کاریز ملا عبداللہ خاں میں پردل خاں کی طرف سے ایک سردار پندرہ سواروں کے ساتھ استقبال کے لیے پہنچ گیا تھا۔ اسی کی معیت میں سید صاحب ۲۸۔ محرم (یکم ستمبر ۱۸۲۶ء) کو قندھار پہنچے۔ شہر پناہ کی جنوبی دیوار سے ہوتے ہوئے ایک باغ میں پہنچے جو ہرانی دروازے کے باہر شہر سے آدھ کوس کے فاصلے پر تھا، وہیں انھیں ٹھہرایا گیا۔ مہمانداری کے تمام انتظامات پہلے سے کر دیے گئے تھے۔ کھانے پینے کی جنسیں موجود تھیں۔ شرفا، علماء اور عوام نے کئی میل باہر نکل کر استقبال کیا اور وہ قیامگاہ پر پہنچنے تک ساتھ رہے۔ دوسرے روز سید صاحب شیر دل خاں کی تعزیت کے لیے پردل خاں کے پاس گئے۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ بے سروسامانی کے باوجود سید صاحب کے عزم جہاد پر بے حد متحیر ہوا۔

اس اثنا میں لوگ جوق جوق سید صاحب کے پاس پہنچ کر جہاد میں ساتھ لے جانے کی درخواستیں کرنے لگے۔ رجوع خلق کا یہ رنگ دیکھ کر پردل خاں پر سراسیمگی طاری ہو گئی۔ پہلے اس نے کوشش کی کہ شہر کے دروازوں پر لوگوں کو روکا جائے۔ یہ تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی تو سید صاحب کے پاس پیغام بھیج دیا کہ لوگ شوق جہاد میں آپ کے ساتھ جانے کے لیے خاص جوش سے تیار ہو رہے ہیں اور ہمارے انتظام میں خلل پیدا ہو گیا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ جلد سے جلد کابل روانہ ہو جائیں ورنہ ہمارے اور آپ کے درمیان بے لطفی پیدا ہو جائے گی۔ یہ بھی کہلا بھیجا کہ جو لوگ جانے کے لیے تیار ہیں، انھیں روک دیجیے اور ساتھ نہ لے جائیے۔ اس وجہ سے سید صاحب کو چھٹے روز قندھار سے نکلنا پڑا۔ اگر پردل کی طرف سے رکاوٹ پیدا نہ ہوتی تو قندھار ہی سے سید صاحب بہت بڑا لشکر تیار کر لیتے۔

قندھار سے غزنی

قندھار سے غزنی تک کی منزلیں یہ تھیں:

(۱) کاریز حاجی عبداللہ (۲) قلعہ اعظم خاں (۳) دہ ملا نور محمد (۴) شہر صفا (۵) جلوگیر (۶) توت (۷) قلعہ رمضان خاں (۸) جلدک (۹) کوڑم (۱۰) خاکہ (۱۱) بشمل زئی (۱۲) قلعہ ملا نور محمد (۱۳) قلعہ ملا تاج محمد (۱۴) کاریز اتمک (۱۵) مشکئی (۱۶) تانی (۱۷) غزنی۔

---

[1] شیر دل خاں نے شدید تپ میں مبتلا ہو کر ۲۰۔ محرم الحرام ۱۲۴۲ھ (۲۹۔ اگست ۱۸۲۶ء) کو وفات پائی۔ سید صاحب تین روز بعد قندھار پہنچے۔

اگرچہ سید صاحب نے پُردل خاں کی خواہش کے مطابق سب لوگوں کو محبت سے سمجھا بجھا کر روک دیا تھا، لیکن جب آپ قلعہ اعظم خاں میں پہنچے تو چار سو آدمی جہاد کے لیے تیار ہو کر آ گئے۔ ان میں علماء و شرفا بھی تھے۔ ناچار سید صاحب نے اخوند ظہور اللہ کو پُردل خاں کے پاس بھیجا کہ سارے حالات بتا کر کہیں اجازت ہو تو انھیں ساتھ لے جاؤں۔ پُردل خاں کو یہ اندیشہ کھائے جا رہا تھا کہ اگر سید صاحب ٹھہر گئے تو مزید لوگ تیار ہو جائیں گے۔ اس نے کہا کہ ان لوگوں کو بے شک لے جائیے، لیکن جلد سے جلد چلے جائیے۔ چنانچہ سید صاحب نے دو سو ستر آدمی چن کر ساتھ لے لیے اور سید دین محمد قندھاری کو ان کا سالار بنایا۔ یہ سید صاحب کے لشکر کی قندھاری جماعت تھی جس کے سالار بعد میں ملا لعل محمد قندھاری بنے۔ توت کے قریب شاہراہ پر دو فریقوں میں جنگ ہو رہی تھی، سید صاحب تھوڑا سا چکر کاٹتے ہوئے اس مقام سے بچ کر نکل گئے۔

خوانین غلزئی

قلعہ رمضان خاں سے جلدک جا رہے تھے کہ خوانین غلزئی کی جانب سے دعوت نامہ ملا۔ انھیں سرداروں کے اجداد نے افغانستان کو پہلے پہل آزاد کر کے ایک مستقل حکومت کی بنیاد رکھی تھی۔ پھر انھوں نے ایران کے بڑے حصے کو بھی مسخر کر لیا تھا۔ نادر شاہ افشار نے انھیں شکستیں دے کر پہلے ایران سے نکالا، پھر قندھار و کابل پر بھی قبضہ کر لیا۔ نادر کے قتل پر قومی حکومت کی عنان درانیوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ سید صاحب نے غلزئی خوانین کی دعوت قبول نہ کی اور معذرت میں کہلا بھیجا کہ اگر دعوت قبول کر لوں تو غزنی، کابل اور پشاور کے حاکم خواہ مخواہ وسوسوں میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ان لوگوں کو غلزئیوں پر بالکل بھروسا نہ تھا اور ان سے جو ملتا تھا، اسے بھی شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھنے لگتے تھے۔ جلدک پہنچے تو غلزئی سرداروں کی طرف سے دو سوار نیا دعوت نامہ لے آئے۔ سید صاحب نے دوبارہ معذرت کی اور مصلحتیں تفصیل سے لکھ بھیجیں۔ اس پر انھوں نے لکھا کہ ہم خود حاضر ہونے کا ارادہ کر رہے تھے تاکہ اگر آپ ہمارے مہمان نہیں بن سکتے تو کم از کم ہم بیعت سے تو محروم نہ رہیں۔ گرامی نامہ پڑھ کر یہی فیصلہ کیا کہ ہماری حاضری سے آپ کے کارِ خیر میں بے وجہ الجھنیں پیدا ہوں گی۔ ساتھ ہی عرض کیا کہ آغاز جہاد کی اطلاع جب ہمیں ملے گی چالیس پچاس ہزار سوار پیادے لے کر کوہستان کے راستے خدمت والا میں حاضر ہو جائیں گے[1]

---

[1] خانخاناں ان خوانین میں سے ممتاز تھا۔ یہ عبدالرحیم کا فرزند اور شاہ حسین غلزئی کا پوتا تھا، جس سے نادر شاہ نے قندھار چھینا تھا۔ شاہ حسین غلزئی شاہ محمود کا بھائی تھا، جس نے ایران کو فتح کیا تھا۔ خانخاناں کے نام سید صاحب کے مجموعہ مکاتیب میں کئی مکتوب ہیں۔

کرّم پہنچے تو شہاب الدین خاں ملا جس کے اجداد غلزئیوں کی بادشاہی کے زمانے میں وزارت پر فائز تھے، اس نے بھی سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ بلاوا آتے ہی جہاں حکم ہو گا پہنچ جاؤں گا۔

حکّام کابل وغزنی کے نام خطوط

مشکئی سے سید صاحب نے حاکمِ غزنی اور حاکمِ کابل کے نام خط بھیجے۔ جنھیں پہنچانے کے لیے ملا ظہور اللہ جہانگیر والا تجویز ہوا۔ وہ ہندوستان میں رہ چکا تھا اور ٹونک سے ساتھ آیا تھا۔ بیس آدمی اس کے ساتھ کر دیے۔ مضمون یہ تھا:

ما زمرۂ مومنین ہندی در کفرستان ہندوستان بہ تنگ آمدہ بہ عزم جہاد و ہجرت از وطن گزیدہ برائے دعوتِ مسلمین بناء بر اقامت آں رکن رکین جہت تائیدِ ملتِ بیضاء حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ابتغاءً لمرضات اللہ ایں قدر مسافت دور و دراز طے نمودہ، در بلادِ شما رسیدہ، ہمیں طور منتہائے سرِ خود تا بہ دیارِ یوسف زئی کہ در حوالی پشاور است پیش نہادِ خاطر ساختہ از راہ شہرہائے شما خواہیم رفت۔ لازمہ دانائی و مروت ایں کہ چیزے توحش بہ خاطر نیاوردہ اجازت نامہ قبل از رسیدنِ ما فرستید کہ بلا وسوسہ از آں حدود بہ سمتِ مقصود بگذریم۔

ہم ہندی مسلمانوں نے ہندوستان کے کفرستان سے تنگ آ کر جہاد کے ارادے سے ہجرت کی۔ مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دیتے اور حضرت سید المرسلینؐ کی ملتِ بیضا کی تائید پر آمادہ کرتے ہوئے رضائے باری تعالیٰ کے شوق میں یہ مسافت طے کر کے آپ کے بلاد میں پہنچ گئے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ اسی طرح یوسف زئی میں پہنچ جائیں، جو پشاور کے حوالی میں ہے۔ مروت و دانائی کا لازمہ یہ ہے کہ دل میں کسی قسم کا وسوسہ نہ لائیں۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے اجازت نامہ بھیج دیں تاکہ ہم کھٹکے کے بغیر ان حدود سے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو جائیں۔

میر محمد خاں حاکمِ غزنی کو خط ملا۔ وہ دورہ کرتا ہوا ایک روز سید صاحب کی منزل کے قریب پہنچ گیا، پھر ضروری کام پیش آ گیا اور اسے ملے بغیر واپس جانا پڑا، لہٰذا معذرت کے ساتھ لکھ بھیجا کہ تشریف آوری ہمارے لیے انتہائی سعادت اور خوشی کا باعث ہو گی۔

---

[1] یہ معلوم ہوا کہ ملا نور محمد شافائی سید صاحب کا پرانا معتقد تھا۔ سفرِ حج میں ساتھ تھا۔ وہ مدینہ منورہ سے بیت المقدس گیا اور بغداد ہوتا ہوا واپس آیا۔ ملاقات کے لیے بریلی جا رہا تھا کہ خبر ملی کہ سید صاحب ہجرت فرما گئے۔ چنانچہ وہ

(باقی صفحہ ۳۱۳ پر)

سید صاحب غزنی پہنچے تو لوگوں نے جوش و خروش سے استقبال کیا۔ وہ دُور دُور تک راستے کے دونوں طرف کھڑے تھے۔ پہلے سے روضہ[1] میں سید صاحب کے قیام کے لیے جگہ مقرر ہو چکی تھی۔ میر محمد خان کا بیٹا باوجود آشوبِ چشم سید صاحب کے استقبال میں شریک ہوا۔ خود خان نے روضہ میں سید صاحب سے ملاقات کی۔

سید صاحب صرف دو روز غزنی میں ٹھہرے۔ اس اثنا میں کابل سے خیر مقدم کا خط آگیا۔ ۲۵ صفر ۱۲۴۲ھ (۲۸- ستمبر ۱۸۲۶ء) کو غزنی سے روانہ ہو کر ہفت آسیاب، شیخ آباد اور میدان ٹھہرتے ہوئے قلعہ قاضی پہنچے، جس کے بعد اگلی منزل کابل تھی۔ قلعہ قاضی میں مصلحتاً قیام رہا۔ ۲۹- صفر کو وہاں ربیع الاوّل کا چاند دیکھا۔ یکم ربیع الاوّل کو قاضی قلعہ سے روانہ ہوئے۔ حاکم کابل کی طرف سے پہلے حاجی ملا علی استقبال کے لیے آیا، جو سلطان محمد خاں کی فوج میں سردار تھا اور بڑے سرداروں میں محسوب تھا۔ پھر سلطان محمد خاں نے اپنی طرف سے امین اللہ خاں کو وکیل بنا کر بھیجا[2]۔ شہر ایک کوس رہ گیا تو خلقت کا ہجوم اس قدر بڑھ گیا کہ چلنا بھی مشکل ہو گیا۔ سلطان محمد خاں اپنے بھائیوں اور پچاس سواروں کے ساتھ شہر کے دروازے پر منتظر کھڑا تھا۔ سید صاحب نمودار ہوئے تو خان اور اس کے بھائی احتراماً گھوڑے سے اتر گئے اور معانقہ کیا۔ پہلے سید صاحب کو سوار کرایا، پھر خود سوار ہوئے۔

کابل میں قیام

سید صاحب کے قیام کے لیے پہلے سے وزیر فتح خاں کا باغ تجویز ہو چکا تھا اور آپ شہر سے گزر کر باغ میں پہنچ گئے۔

قیام کابل کی تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں۔ سید صاحب کے ایک مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کم و بیش پینتالیس روز کابل میں ٹھہرے رہے (از یکم ربیع الاوّل تا ۵- ربیع الثانی) ایک کام یہ تھا کہ اہل کابل کو جہاد میں ہر گونہ اعانت پر آمادہ کریں۔ دوسرا کام یہ تھا کہ بھائیوں میں اتفاق پیدا کر دیں۔ ان میں سخت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۱) [illegible] کی طرف پلٹا۔ اثنا میں ملاقات نہ ہوئی۔ ٹونک تک ساتھ رہا۔ وہاں سے وطن آگیا جو تاتی کے متصل تھا۔ چنانچہ وہ مع پسر و برادر ملاقات کے لیے حاضر ہو گیا۔ ملا موسیٰ عبدالرحیم خاں قندھاری کے مصاحبوں میں تھا۔ مدت تک لکھنؤ میں رہا۔ خیر آباد میں اس نے شادی کی تھی۔ ملاقات کے لیے پہنچنے پر بچہ [illegible] بشکل غزنی سے دو تین کوس پر راستے میں بیٹھا تھا۔ سید صاحب چار پانچ سواروں کے ساتھ اس کے مکان پر گئے۔

[1] روضہ اس مقام کو کہتے ہیں جہاں سلطان محمود غزنوی کا مقبرہ ہے۔ اس کے ساتھ ایک وسیع باغ ہے اور پاس آبادی ہے۔ یہ مقام موجودہ غزنی سے تین میل مشرق میں ہے۔ [2] سلطان محمد خاں اس وقت کابل میں تھا۔

اختلافات بپا تھے، جن کی وجہ سے ان کی قوت ایک دوسرے کے خلاف صرف ہو رہی تھی اور سلطنت کا شیرازہ بکھرا جا رہا تھا، سید صاحب خود فرماتے ہیں:

فقیر بنا برامید ایں معنی کہ شاید بسعی من	میں اس امید پر پینتالیس روز کابل میں
رفع منازعت و وقوع مصالحت صورت بندد،	بیٹھا رہا کہ شاید میری کوشش سے جھگڑا رفع ہو جائے
چہل و پنج روز تخمیناً دراں بلدہ اقامت نمود۔	اور مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔ آخر جب
آخرالامر چوں سعی خود را مفید ندید، رخت اقامت	دیکھا کہ میری سعی سودمند نہیں ہو سکتی تو وہاں سے
از بلدۂ مذکورہ برکشید[1]	رخت قیام اٹھا کر نکل پڑا۔

سلطان محمد خاں کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے، اس نے کابل میں وعدہ کیا تھا کہ سید صاحب کو ایک خاص رقم برابر پہنچتی رہے گی[2] سید محمد خاں نے بھی ایک خط میں ذکر کیا ہے کہ پشاور تک سید صاحب کو اسی نے پہنچایا تھا اور زرِ نقد کے علاوہ گھوڑے بھی پیش کیے تھے[3]

سید صاحب کے عزمِ جہاد نے لوگوں میں خاص جوش اور شیفتگی پیدا کر دی تھی، لیکن وہ سامان و لشکر کی قلت دیکھ کر افسردہ ہو جاتے تھے۔ ایک روز دیوان حافظ سے فال نکالی گئی تو یہ شعر نکلا:

تیغے کہ آسمانش از فیضِ خود دہد آب   تنہا جہاں بگیرد بے منتِ سپاہی

یہی شعر ایک مرتبہ راستے بریلی میں بھی نکلا تھا، جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

منزلِ مقصود

میرے اندازے کے مطابق سید صاحب ۲۔ اکتوبر کو کابل پہنچے تھے۔ اگر پینتالیس روز وہاں ٹھہرے تو ۱۵ یا ۱۶ نومبر کو نکلے ہوں گے۔ پانچ روز میں پشاور پہنچ گئے۔ غالباً جلال آباد اور ڈکہ کا راستہ اختیار کیا ہوگا۔ اس راستے میں بھی لوگوں کا جوشِ پذیرائی انتہا پر پہنچا ہوا تھا جیسا کہ خود سید صاحب کے بیان سے واضح ہوتا ہے[4]

---

[1] منظورہ صفحہ ۳۱۶۔ ایک عجیب و غریب بیان میری نظر سے گزرا یعنی سلطان محمد خاں اور دوست محمد خاں کے درمیان مصالحت کی کوئی صورت نہ بنی تو سلطان محمد خاں، غلزئیوں اور بعض دوسرے سرداروں نے یہ تجویز پیش کی کہ دوست محمد خاں کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا جائے اور سید صاحب کو حکمران بنا کر سکھوں سے جنگ کی جائے۔ سید صاحب نے یہ تجویز منظور نہ کی۔ [2] مکاتیب شاہ اسماعیل صفحہ ۱۱۳۔ [3] مکاتیب شاہ اسماعیل صفحہ ۱۱۴۔

[4] منظورہ صفحہ ۳۱۶۔ سید صاحب کا بیان یہ ہے: درا ثنائے ایں راہ ہم مثل سابق بلکہ زائد ازاں ازدحام مومنین مخلصین و اجتماع مسلمین صادقین پیش آمد۔

پشاور میں سید صاحب صرف تین دن ٹھہرے۔ پھر چارسدہ چلے گئے، بعدازاں جہاد کا آغاز ہو گیا۔ اس کے حالات آیندہ ابواب میں بیان ہوں گے۔

ھٰذِہٖ تَذْکِرَۃٌ

اب آپ اس سفر پر ایک نظر پھر ڈال لیں، جس میں کم و بیش دس مہینے بسر ہوئے اور مسافت اڑھائی تین ہزار میل سے کم نہ ہوگی۔ رائے بریلی سے بندھیل کھنڈ ہوتے ہوئے گوالیار اور ٹونک پہنچے۔ پھر راجپوتانہ کے بے آب و گیاہ ریگ زار طے کیے۔ جنوب مشرق سے سندھ میں داخل ہوئے تو شمال مغرب سے باہر نکلے۔ اس کے بعد بلوچستان کا صحرائی علاقہ، قیامت خیز گرمی، پھر خشک پہاڑ، خطرناک درے، دشوار گزار گھاٹیاں، اکثر کھانے کی تکلیف، پانی کی قلت، زیادہ تر متواتر سفر، بیشتر غازی پیدل۔ ان تمام مقامات میں سے سفر کی مشکلات کا اندازہ آج کے حالات کی بنا پر نہیں بلکہ سوا سو سال پیشتر کے حالات کی بنا پر کرنا چاہیے۔ تاریخ ہند کے اوراق کو خوب کھنگال لو، پھر بتاؤ کہ کیا کوئی ایسی جماعت مل سکتی ہے، جس نے احیاے دین، اعلاء کلمۃ الحق اور آزادی بلاد مسلمین کے لیے ایسی صعوبتیں دلی عشق و شیفتگی کے ساتھ قبول کی ہوں، جس طرح سید صاحب کی جماعت نے قبول کیں؟ اس ساری مدت میں ایک شخص کی زبان پر بھی کبھی حرفِ شکایت نہ آیا۔ راحت و آسایش کو چھوڑ کر اذیتوں کے مواج سمندر میں کود پڑنے پر ایک لمحہ کے لیے بھی کسی کو پشیمانی نہ ہوئی۔ یہ تھی وہ قدوسی جماعت، جسے سید صاحب نے چند برسوں میں تیار کیا۔ یہ تھی وہ جماعت، جسے ہم سوا سو برس تک یا تو مجانین کا گروہ سمجھے رہے یا دینداری کی رگ جوش میں آئی تو تکفیر کے تیر اس پر برسانے لگے یا بہ درجۂ آخر اسے ناقابل توجہ قرار دے لیا؛ حالانکہ اس متاعِ عزیز کو ہزار سالہ اسلامیت ہند کا سرجوش سمجھنا چاہیے۔ اگر یہ متاع اپنے دامن سے نکال پھینکیں تو تاج و تخت یا مادی عظمت و جبروت کے لیے ایک ہنگامۂ مسلسل کے سوا ہمارے پاس کیا رہ جاتا ہے؟ اسی ہنگامے کی ہمہ سوز آگ آخر ہمارے تاج و تخت اور عظمت و جبروت کو بھی خاکستر بنا گئی۔

تیسواں باب

پنجاب و سرحد کا دورِ مصائب

مغلوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب

اب آگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ جس قوت سے سید صاحب کو سابقہ جنگ پڑا، وہ کیوں کر معرضِ وجود میں آئی اور کن حالات میں پنجاب پر مسلط ہو کر اس نے سرحدی علاقوں پر ترکتازیں شروع کیں؟ نیز اس وقت سرحدی علاقوں کا نقشہ کیا تھا؟ یہ داستان اس وجہ سے بھی اختصاراً بیان کر دینی چاہیے کہ اس کے بغیر سید صاحب کے کام کی عظمت اور مشکلات کی وسعت و شدت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے بھی خاص توجہ کی مستحق ہے کہ اس میں عبرت و موعظت کا ذخیرۂ وافر موجود ہے۔

ہندوستان میں مغلوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب وہ خانہ جنگی تھی، جس کے جراثیم ابتدا ہی سے موجود تھے: عالمگیرِ اعظم کی وفات کے بعد یہ اس درجہ عام ہو گئی تھی کہ کسی شہزادے کے لیے دریائے خون سے گزرے بغیر تخت تک پہنچنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ امراء نے بھی مختلف شہزادوں کی پاسداری کو اپنے عروج کی سیڑھی بنا لیا تھا۔ اس طرح وہ خود بھی یکے بعد دیگرے خانہ جنگی کی آگ کا ایندھن بنتے رہے اور سلطنت کی عظمت و شوکت کو بھی بے پروائی سے اسی بھٹی میں جھونکتے گئے۔ اس مسلسل رزم و پیکار نے مرکز کو بالکل بیدم کر دیا اور سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ بعض صوبیداروں نے اپنے اپنے علاقوں میں خود مختاری کی بنیاد رکھ دی۔ نئی نئی قوتوں نے ابھر کر جگہ جگہ پاؤں جمانے کا بندوبست کر لیا۔ دکن میں مرہٹوں کا زور ہوا، پھر وہ ہندوستان کے بڑے حصے پر چھا گئے۔ پنجاب میں سکھوں نے جتھے بنا کر قتل و غارت کا سلسلہ جاری کر دیا۔ انگریزوں نے کرناٹک، بنگال، بہار اور اڑیسہ کو اپنے زیرِ اثر لانے کی کوششیں شروع کر دیں۔

بندا بیراگی

سکھوں کی منظم غارت گری کا آغاز بندا بیراگی سے ہوا۔ یہ شخص پونچھ کا رہنے والا تھا۔ بیراگی بن کر پھرتا پھراتا سکھوں کے دسویں اور آخری مذہبی پیشوا گرو گوبند سنگھ سے وابستہ ہو گیا۔ گرو جی ۱۷۰۸ء میں ناندیڑ (حیدرآباد دکن) میں فوت ہوئے تو بندا سکھوں کا ایک گروہ ساتھ لے کر شمالی ہند میں آ گیا۔ شاہ عالم بہادر شاہ اس وقت راجپوتانہ کے فتنہ انگیزوں کی سرکوبی کر رہا تھا۔ بیراگی نے دہلی کے شمالی و مغربی علاقے میں جمعیت فراہم کی اور سرہند پر چڑھائی کر دی، جہاں عام روایت

کے مطابق گرو گوبند سنگھ کے دو صاحبزادوں کو زندہ دیواروں میں چن دیا گیا تھا۔ سرہند کا حاکم و فوجدار مقابلے کے لیے نکلا۔ اتفاق سے ایک تیر اس کے حلق میں لگا اور وہ مارا گیا۔ فوج بکھر گئی۔ بیراگی نے شہر کے ساتھ جو سلوک کیا وہ لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔ قتل عام شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ بچے، بوڑھے اور عورتیں بھی نہ چھوڑی گئیں اور شہر کو آگ لگا دی گئی۔ صاحبزادوں پر ظلم کا ذمہ دار کوئی ہو، مگر بدلہ بے گناہ لوگوں یا مکانوں اور اینٹوں سے لیا گیا، جو کسی بھی صورت میں اصل فعل کے ذمہ دار نہ تھے۔

جان میلکم کا بیان

پھر یہ سیل ظلم و ستم دریائے ستلج کو عبور کر کے شمالی سمت میں بڑھا۔ قتل و غارت اور آتش زنی کے سوا اس کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ جان میلکم نے لکھا ہے:

> ہمیشہ یاد رہنے والی اس یورش کی تفصیلات بیان کرنا غیر ضروری ہے۔ تمام روایتوں کے مطابق یہ بدترین لعنت تھی، جو کبھی کسی ملک کے لیے سرچشمۂ آزار بنی۔ نہایت درجہ وحشیانہ بربریت جن قعدیوں کی مرتکب ہو سکتی تھی اور انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ جن بے دردیوں کی جانب رہنمائی کر سکتی تھی، وہ سب اس صوبے (پنجاب) کے... تمام بدنصیب باشندوں پر پوری شدت سے نازل ہوئیں، جہاں جہاں ان یورشیوں کے قدم پہنچے صرف ان لوگوں کو زندہ چھوڑا گیا، جنھوں نے سکھ دھرم قبول کر لیا اور سکھوں کی سی وضع قطع کے پابند ہو گئے[1]

بادشاہ کی آمد

پھر بربریت کا یہ طوفان دریائے بیاس سے گزر کر بٹالہ جا پہنچا۔ وہاں کے لوگوں نے مردانگی سے بیراگی کا مقابلہ کیا، مگر شکست کھا گئے اور سرہند کی داستان ظلم بٹالہ میں بھی پورے اہتمام سے دہرائی گئی۔ بٹالہ سے بیراگی کے لشکریوں نے لاہور کا رُخ کر لیا۔ اگرچہ وہ لاہور کو فتح نہ کر سکے، لیکن شالامار باغ تک ہر خطے کو برباد کر ڈالا۔ بہادر شاہ کو یہ حالات معلوم ہوئے تو راجپوتانہ سے بجلی کی تیزی کے ساتھ پنجاب پہنچا۔ بیراگی کو بادشاہ کی آمد کا علم ہوا تو پہاڑوں میں جا چھپا۔ تعاقب میں فوج بھیجی گئی، جس نے بیراگی کو کئی شکستیں دیں۔ ایک مقام پر وہ شاہی فوج کے نرغے میں آ گیا، لیکن بھیس بدل کر بچ نکلا۔ بادشاہ نے لاہور میں ٹھہر کر سارے برباد شدہ علاقے کو از سر نو آباد کرایا۔

---

[1] میں نے شہادتیں پیش کرتے وقت اس امر کا خاص خیال رکھا ہے کہ زیادہ تر ان لوگوں کے بیانات درج کروں، جن کے متعلق جانبداری کا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا بلکہ جو ہندوستانی اقوام میں سے مسلمانوں کو سب سے بُرا سمجھتے تھے؛ کیونکہ مسلمانوں کو دبائے بغیر ان کی حکومت استوار نہیں ہو سکتی تھی۔

۱۷۱۲ء میں لاہور ہی میں وفات پائی۔ ساتھ ہی اس کے بیٹوں میں تاج و تخت کے لیے جنگ شروع ہوگئی۔ معز الدین اپنے تین بھائیوں کو مار کر جہاندار شاہ کے لقب سے بادشاہ بنا۔ اس کا بھتیجا فرخ سیر بن عظیم الشان عظیم آباد پٹنہ کا گورنر تھا۔ اس نے سادات بارہہ (عبداللہ خاں حسن علی اور امیر الامرا حسین علی) کو ساتھ ملا کر جہاندار شاہ سے بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ اس خانہ جنگی نے بندا بیراگی کو پھر لوٹ مار شروع کرنے کا موقع دے دیا۔

عبدالصمد خاں دلیر جنگ

جہاندار شاہ صرف ایک برس بادشاہ رہا اور فرخ سیر سے شکست کھا کر مارا گیا۔ فرخ سیر نے بادشاہ بنتے ہی بیراگی کی گوشمالی پر خاص توجہ مبذول کی۔ اس مقصد کے لیے عبدالصمد خاں دلیر جنگ کو پنجاب کا گورنر بنایا، جو تورانی امیروں میں بڑا قابل اور دلیر تھا۔ دلیر جنگ نے تھوڑے ہی دنوں میں بیراگی اور اس کے سات آٹھ سو ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ یہ قیدی پہلے لاہور لائے گئے، پھر انھیں دہلی بھیجا گیا۔ عام لوگ بیراگی کے ظلم و ستم سے اس درجہ غیظ و غضب میں آئے ہوئے تھے کہ جہاں سے ان قیدیوں کے گزرنے کی خبر پہنچتی، مرد، عورتیں اور بچے سنگ و خشت لے کر راستوں پر آ بیٹھتے۔ دہلی پہنچنے کے بعد یہ سب کیفر کردار کو پہنچے۔

بیراگی کو سزائے موت دینے سے پہلے پوچھا گیا کہ تو نے اتنے ظلم کیوں کیے اور بے گناہوں کو کس وجہ سے موت گھاٹ اُتارا؟ اس نے جواب دیا کہ جب بندگان خدا کی سرکشی حد سے بڑھ جاتی ہے:

منتقم حقیقی در مکافات اعمال تنہا چوں	منتقم حقیقی سرکشوں کو ان کی بدعملیوں کی سزا دینے
من ظالمے را مے گمارد تا جزائے ہر یکے در کنارش	کے لیے مجھ ایسے ظالم کو مقرر کر دیتا ہے پھر تم ایسے
نہد، بعد ازاں مثل شما مقتدرےاں را بر و تسلط داد	طاقتوروں کو اس ظالم پر مسلط کر دیتا ہے تاکہ
اورا بہ سزائے کردارش مے رساند[1]	اسے کیفر کردار کو پہنچائیں۔

گویا بیراگی اپنے آپ کو خدا کی طرف سے تعزیر کا تازیانہ سمجھتا تھا۔

مرکزی حکومت کی ابتری اور پنجاب کی حالت

فرخ سیر کی بادشاہی کا ابتدائی دور بہت اچھا تھا۔ پھر سادات بارہہ سے اختلافات شروع ہو گئے، جن کی وجہ سے وہ مارا گیا اور سید برادران سلطنت کے مختار کل بن گئے۔ وہ جس شاہزادے کو اپنے ڈھب کا

---

[1] سیر المتاخرین صفحہ [illegible]

پاتے شاہی تخت پر بٹھا دیتے۔ آخر شاہ عالم اول کے پوتے اور جہاں شاہ خجستہ اختر کے بیٹے روشن اختر کو محمد شاہ کے لقب سے بادشاہ بنایا گیا۔ اس کے عہد میں مختلف امیروں نے مل کر سید حسن علی اور حسین علی کو ختم کیا۔

اس ساری مدت میں پنجاب نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ کے زیر نگرانی ہر آفت سے محفوظ رہا۔ نواب نے ۱۷۳۷ء میں وفات پائی تو اس کا قابل فرزند زکریا خاں گورنر بن گیا۔ ۱۷۳۹ء میں ایران سے نادر شاہ آندھی کی طرح آیا۔ اس کی یورش نے مغلوں کی مرکزی حکومت کا رہا سہا وقار بھی تباہ کر ڈالا اور جو نوادر دو سو برس سے دہلی کے خزانے میں جمع ہو رہے تھے، انھیں بھی جھاڑو سے سمیٹ کر ساتھ لے گیا۔ مرکزی حکومت کی ابتری نے فساد و انتشار کی رفتار بہت تیز کر دی اور مخالف قوتوں نے مغل سلطنت کو بازی گاہ عام بنا دیا۔

پنجاب میں زکریا خاں کے بعد عبدالصمد خاں دلیر جنگ کا بھتیجا معین الملک گورنر بنا۔ اس نے سکھوں کا فتنہ بھی دبایا اور ابدالیوں کی ترکتازوں کے باوجود صوبے کا امن بھی بحال رکھا۔ وہ مرا تو آخری بند ٹوٹ گیا جو فتنوں کے سیل کو روکے کھڑا تھا۔ مرکز میں نظام الملک آصف جاہ کا پوتا عماد الملک مختار کل بن گیا اور پنجاب میں آدینہ بیگ برسر اقتدار آ گیا۔ آخری دور میں مغلوں کی تباہی کے یہ دو سب سے بڑے عامل تھے۔ عماد الملک نے مرہٹوں اور جاٹوں کو ذاتی اغراض کی پیش برد کے لیے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ آدینہ بیگ نے سکھوں کے غارت گر جتھوں کی تربیت و پرورش کو اپنا نصب العین بنا لیا۔ احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۱ء میں مرہٹوں پر کاری ضرب لگائی۔ ۱۷۶۲ء میں سکھوں کو خوفناک سزا دی۔ سکھ اس تادیب کو "گھلو گھارا" کے نام سے یاد کرتے ہیں، یعنی نادیدہ آفت، مگر فتنوں کی آگ ایک مرتبہ سلگی تو پھر نہ بجھی۔ تھوڑی دیر بعد سکھوں کے غارت گر جتھے جنھیں مسلیں کہتے تھے، پنجاب میں جگہ جگہ قدم جما کر بیٹھ گئے۔ وہ عوام کو بھی لوٹتے اور آپس میں بھی لڑتے۔ ان میں سے تین مسلوں کے سردار لاہور پر قابض ہو گئے۔ شہر اور اس کے حوالی کو تین حصوں میں بانٹ لیا۔ جنوبی سمت میں نیاز بیگ تک سوبھا سنگھ کی حکومت تھی۔ مشرقی سمت میں کابلی مل کی حویلی تک کا علاقہ گوجر سنگھ کے ماتحت تھا، جس کے نام سے قلعہ گوجر سنگھ کا علاقہ منسوب ہے، باقی سارا شہر جس میں قلعہ اور شاہی مسجد وغیرہ شامل تھے، لہنا سنگھ کی تحویل میں آ گیا۔ یہی تین سکھ سالار تھے جنھوں نے شالامار میں سے سنگ یشب کا قیمتی سائبان اٹھوایا اور چوبیس ہزار میں لاہور کے سنگ تراشوں کے ہاتھ بیچا۔

رنجیت سنگھ اس عہد میں پنجاب کے باشندوں پر جو مصیبتیں نازل ہوتی رہیں، ان کی داستان بڑی

دردناک ہے۔ سکھوں کی ایک مسل شکرچکیہ مسل کہلاتی تھی، اس کے سالاروں میں سے چڑھت سنگھ اور مہاں سنگھ نے خاصی شہرت حاصل کر لی۔ مہاں سنگھ کا بیٹا رنجیت سنگھ تھا۔ ۱۷۸۰ء میں پیدا ہوا۔ ابھی لڑکا ہی تھا کہ باپ کے مرنے پر مسل کا سردار بن گیا۔ عقلمند اور دور اندیش نوجوان تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے پوتے زمان شاہ کی توپیں دریا میں گر گئی تھیں، انھیں نکلوا کر شاہ کی خدمت میں پیش کیا اور خوشنودی کا پروانہ لیا۔ پھر اہل لاہور سے خفیہ خفیہ ساز باز کر کے ۱۷۹۹ء میں نواں کوٹ کے چوہدری محکم دین کی مدد سے لاہور پر قابض ہو گیا۔ بعد ازاں آہستہ آہستہ حسن تدبیر سے اپنا اختیار بڑھانے لگا۔ ۱۸۰۹ء میں انگریزوں کے ساتھ عہدنامہ کر لیا، جس میں دریائے ستلج رنجیت سنگھ اور انگریزوں کے درمیان ملکی حد بن گیا۔ جنوبی و مشرقی جانب سے بے فکر ہو کر رنجیت سنگھ نے شمال و مغرب میں پیش قدمی شروع کر دی۔ پنجاب میں کوئی قابل ذکر قوت تھی نہیں، چھوٹے چھوٹے رئیس یا زمیندار تھے۔ رنجیت سنگھ ایک ایک کر کے سب کو کھا گیا۔ افغانستان میں بھی خانہ جنگی کی آگ شعلہ زن تھی، جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اس کی وجہ سے بھی رنجیت سنگھ کو بڑا فائدہ پہنچا۔ کشمیر اور اٹک اسی خانہ جنگی کے باعث اسے ملے۔ یہ کہانی بڑی عبرت انگیز ہے۔

عطا محمد خاں اور اس کا بھائی جہانداد خاں حکومت افغانستان کی طرف سے علی الترتیب کشمیر اور اٹک کے گورنر تھے۔ دونوں سرکشی پر آمادہ تھے۔ وزیر فتح خاں نے انھیں سزا دینی چاہی، جہانداد خاں مطیع بنا رہا۔ فتح خاں نے پنجاب کے راستے کشمیر پر حملے کا ارادہ کیا اور رنجیت سنگھ سے بھی مدد مانگی۔ وعدہ یہ کیا کہ کشمیر کے مال غنیمت سے تیسرا حصہ سکھوں کو دیا جائے گا۔ سکھ اور افغان فوجیں پیر پنجال کے دامن میں پہنچیں تو راستے برف سے اٹے پڑے تھے۔ سکھ آگے نہ بڑھ سکے اور افغانوں نے بے تکلف پیش قدمی کر کے کشمیر لے لیا۔ چونکہ سکھ فوج سے کوئی مدد نہیں ملی تھی، اس لیے اسے حصہ بھی نہ دیا گیا۔ رنجیت سنگھ نے یہ بات دل میں رکھی۔ وزیر فتح خاں واپس چلا گیا تو جہانداد نے خفیہ خفیہ رنجیت سنگھ سے ساز باز کر کے پنجاب میں جاگیر لے لی اور اٹک کا قلعہ سکھوں کو دے دیا۔ تھوڑی دیر بعد وزیر فتح خاں مارا گیا تو رنجیت سنگھ نے کشمیر پر بھی قبضہ کر لیا۔

صوبہ سرحد کی حالت

فتح خاں کے بعد عظیم خاں بارک زئیوں کا سردار بنا۔ اس کے بھائی یار محمد خاں، پیر محمد خاں، سلطان محمد خاں اور سید محمد خاں پشاور میں رہتے تھے۔ رنجیت سنگھ نے اٹک سے آگے بڑھ کر پیش قدمی شروع کی تو یار محمد خاں نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور خراج دینے لگا۔ عظیم خاں کو اس پر سخت غصہ آیا۔ وہ لڑائی کے ارادے سے نکلا، لیکن سوء اتفاق سے نوشہرہ کے

پاس شکست کھائی اور صوبہ سرحد کو سکھوں نے پامال کر ڈالا۔

چاروں بارک زئی سردار سکھوں کے فرمانبردار بن گئے۔ متفرق خوانین کی حالت عجیب تھی۔ وہ سکھوں کو دل سے پسند نہیں کرتے تھے، لیکن مقابلے کی ہمت نہ تھی اور کہیں سے انھیں امداد مل نہیں سکتی تھی۔ سکھ عام طور پر گھوڑے اور باز خراج میں وصول کرتے تھے۔ جو خراج گزار تھے وہ اطمینان سے اپنے علاقے میں بیٹھے رہتے تھے۔ سکھ فوج آتی تو اس کے لیے رسد کا انتظام کر دیتے۔ جو خراج پر راضی نہ تھے، وہ سکھوں کی یورش کے وقت اپنی جگہیں چھوڑ کر بال بچوں کے ساتھ پہاڑی علاقوں میں چلے جاتے۔ سکھ ان کے دیہات کو آگ لگا دیتے اور واپس چلے جاتے۔

خوانین میں سے جن لوگوں کو سید صاحب سے براہِ راست سابقہ پڑا، ان کے حالات یہاں الگ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ ان کی حیثیت ذرا اونچے درجے کے با اثر زمینداروں کی تھی۔ جہاں ان کا ذکر آئے گا، وہیں ان کے مختصر سے حالات بیان کر دیے جائیں گے۔ ہزارہ کے عام حالات اور وہاں سکھوں کے داخلے کی سرگزشت اس موقع پر عرض کی جائے گی، جب سید صاحب نے مجاہدین کے جیش ہزارہ بھیجے تھے۔

سکھ راج کی کیفیت

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ سکھ راج در حقیقت کوئی باقاعدہ اور منظم راج نہ تھا بلکہ ایک نوع کا عارضی فوجی غلبہ تھا؛ جسے رنجیت سنگھ نے منظم حکومت کی شکل دینے کا ارادہ ضرور کیا ہو گا لیکن نہ اسے موقع مل سکا اور نہ وہ اپنی زندگی میں تصرفات سے باز رہ سکا۔ تصرفات کی آرزو ایسی صورت میں پوری ہو سکتی تھی کہ عسکریت کو زیادہ سے زیادہ بے لگام رکھا جاتا۔

یہاں میں ان لوگوں کی تحریرات سے چند اقتباسات پیش کروں گا؛ جو مسلمان نہ تھے کہ ان پر طرفداری کا الزام عائد ہو سکتا بلکہ فرنگی تھے، جنھوں نے سکھوں کے دوستداروں کی حیثیت میں پنجاب کو دیکھا تھا۔

جنرل فین انگریزی فوج کا سپہ سالار تھا۔ اسے کنور نونہال سنگھ کی شادی کے موقع پر نمایندے کی حیثیت میں لاہور بھیجا گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

> سکھ فوجیں جب نقل و حرکت میں ہوتی ہیں تو کھیتی باڑی کا کچھ خیال نہیں کرتیں۔ ان کا توپ خانہ اور رسالہ کھڑی فصلوں سے بے تکلف گزرتا ہے۔[1]

کیا یہ ان لوگوں کی کیفیت ہو سکتی ہے جو عوام کے محافظ اور ہمدرد ہوں؟ اس کے برعکس شاہ جہاں

---

[1] فین: ہندوستان میں پانچ سال (FIVE YEARS IN INDIA

کا عہد سامنے لاؤ۔ جب اس کی سواری نکلتی تھی تو دو رویہ فوجی کھڑے ہو جاتے تھے تاکہ کسی فصل کو خفیف سا نقصان بھی نہ پہنچے۔ جہاں سے اتفاقیہ نقصان کی اطلاع ملتی تھی، فوراً اس کا معاوضہ ادا کیا جاتا تھا۔

انگریزوں سے سکھوں کی پہلی جنگ کے بعد لاہور میں انگریز ریذیڈنٹ مقرر ہو گیا تھا۔ اس نے انگریز کارکنوں کی مدد سے انتظام کو بہتر بنانے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ ہربرٹ ایڈورڈس مروت گیا، جہاں دیوان مولت رائے حاکم تھا۔ دیوان کے بارے میں ایڈورڈس لکھتا ہے:

> یہ شخص چاہتا ہے کہ دریائے سندھ کی اس سمت میں مختار کل رہے، لوگوں کو جتنا چاہے لُوٹے۔ نہ کوئی غیر جانبدار ناظر موجود ہو اور نہ اس کی رپورٹ کی جائے۔ مروت میں جو کچھ میں نے دیکھا ہے، اس کی بناء پر کہہ سکتا ہُوں کہ یہ حکومت بے پروایانہ غارت گری کا ایک منظم سلسلہ ہے۔

۱۸۱۶ء میں محمد خاں حاکم لیہ و بھکر فوت ہُوا۔ سکھوں نے اس کے جانشین احمد خاں سے خراج مانگا۔ اس نے انکار کیا تو سکھوں نے خان گڑھ اور محمود کوٹ کے قلعے لے لیے۔ تھوڑی دیر کے لیے مان لیجیے کہ خراج کا مطالبہ پورا نہ ہونے کی بناء پر پیش قدمی اور تصرف جائز تھا، لیکن معاملہ یہاں پر ختم نہ ہُوا، بلکہ:

> پھولا سنگھ اکالی کو اجازت دے دی گئی کہ وہ مسلمان آبادی پر نہایت گھناؤنے ظلم کرے اور انھیں حد درجہ مکروہ بے عزتیوں اور ذلتوں کا ہدف بنائے[1]

پھولا سنگھ اکالی نہنگ گروہ کا لیڈر تھا جو لرزہ خیز ظلم و ستم کی وجہ سے بے حد رسوا تھا۔ رنجیت سنگھ اسے اپنی فوج میں سب سے آگے رکھتا تھا تاکہ باقاعدہ فوج کے پہنچنے سے پیشتر آبادی پھولا سنگھ کے بے پناہ ظلم و جور سے مرعوب ہو جائے۔ یہ شخص ۱۸۲۳ء میں نوشہرہ کی جنگ میں مارا گیا۔

اکثر لوگوں کی روایتوں کے مطابق لاہور اس درجہ تباہ ہو چکا تھا کہ بہ مقابلہ سابق اس کی آبادی دسواں حصّہ رہ گئی تھی۔ پشاور برباد ہو چکا تھا۔ اس کے عالی شان باغ ویران ہو چکے تھے۔

مزید بیانات

مورکرافٹ نے ۱۸۲۰ء میں سفر کیا تھا۔ وہ کشمیر کے حالات بیان کرتے ہُوئے لکھتا ہے:

> اس وقت کشمیر میں رنجیت سنگھ کی حکومت حد درجہ ظالمانہ ہے۔ کشمیریوں کے

---

[1] پنجاب گزٹیر [illegible] جلد پنجم صفحہ [illegible]

پاس جو کچھ ہے، وہ انتہائی بے دردی سے چھینا جاتا ہے۔ درانی بھی سخت لٹیرے تھے، لیکن ان کی غارت گری غیر منظم تھی۔ بہت سے لوگ ان کی بے پروائی کے باعث لوٹ مار سے بچ جاتے تھے، مگر رنجیت سنگھ نہایت منظم طریقے پر سب کو ظلم و غضب کی چکی میں پیستا ہے[1]۔

عین اسی قسم کے خیالات ڈاکٹر جیکماں نے اپنے خطوط میں ظاہر کیے ہیں۔ آرچ نے ۱۸۲۰ء میں سفر کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

> سکھوں کے مذہبی پیشواؤں یا اکالیوں میں (جن کی حیثیت جنونی قسم کے مذہبی فقیروں کی ہے) رواداری اور اعتدال بالکل ناپید ہے اور مسلمان مجبور ہیں کہ اپنے مذہبی فرائض چھپ چھپ کر ادا کریں[2]۔

بالکل یہی نقشہ آپ کو ہزارہ گزیٹیر اور پشاور گزیٹیر میں نظر آئے گا۔ مثلاً یہ کہ حکومت صرف دہشت انگیزی پر مبنی تھی[3] یا دریائے اباسین یعنی سندھ سے وادی لوند خوڑ تک شاید ہی کوئی گاؤں ہو، جسے سکھوں نے لوٹا یا جلایا نہ ہو[4]۔

یہ حکومت تھی، جس سے سید صاحب کو جنگ پیش آئی۔ وہ نظم و نسق کے اعتبار سے کتنی ہی ناکام رہی ہو، لیکن فوجی طاقت و قوت اور وحشت و بربریت میں اپنی مثال آپ تھی۔ رنجیت سنگھ نے کئی فرنگیوں کو ملازم رکھ کر زبردست دستے تیار کیے تھے۔ ان فرنگیوں میں سے ونتورا اور ایلارڈ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہوں مورکرافٹ حالات قیام کشمیر۔ [2] ہندوستان میں سفر (TRAVELS IN INDIA) جلد اول ص ۱۶۳

[3] ہزارہ گزیٹیر صفحہ ۱۳۔ [4] پشاور گزیٹیر ص ۶۔

اکتیسواں باب

چارسدہ میں قیام

چارسدہ کا قصد

سید صاحب نومبر ۱۸۲۶ء کے اواخر میں پشاور پہنچے تھے۔ وہاں تین یا چار دن ٹھہرے۔ وہ ہزاروں میل کی دشوار گزار مسافتیں طے کر کے اس غرض سے سرحد نہیں گئے تھے کہ کسی ایک مقام پر پڑاؤ ڈال کر بیٹھ جائیں اور انتظار کریں کہ حالات کس کروٹ بیٹھتے ہیں، پھر اپنے طریقِ عمل کا فیصلہ فرمائیں۔ وہ سارے علاقے کا دورہ کر کے عوام کو جہاد کے لیے جلد سے جلد منظم کر دینا چاہتے تھے، اس لیے پشاور میں زیادہ قیام گوارا نہ کیا اور چارسدہ[1] کا قصد فرمایا، چمکنی کے گھاٹ سے دریائے لنڈے[2] کو عبور کیا۔

عزمِ جہاد کی خاصی شہرت ہو چکی تھی۔ عام اہلِ سرحد آج بھی مجاہدانہ اوصاف و عزائم کو خاص قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس زمانے میں ان کی دینی حیثیت آج کل کے مقابلے میں ضرور بہتر ہوگی۔ پھر اجنبیوں کی متواتر یورشوں کے باعث جینا ان کے لیے دوبھر ہو چکا تھا اور وہ انتہائی بیتابی سے منتظر تھے کہ خدا کا کوئی بندہ عزیمت کا جھنڈا اٹھا کر سامنے آئے تو اس کے ساتھ ہو کر مصیبتوں سے نجات

---

[1] راویوں نے اس مقام کا نام "ہشت نگر" لکھا ہے، جسے بول چال میں تخفیفاً "اشنغر" بھی کہتے ہیں۔ یہ دراصل اس پرگنے کا نام ہے جو نوشہرہ سے ابازئی تک دریائے سوات کے مشرقی کنارے پر واقع ہے اور آج کل کی طرح سید صاحب کے زمانے میں بھی صوبہ سرحد کا ایک نہایت زرخیز خطہ تھا۔ اس میں آٹھ بڑی بستیاں تھیں، جن کی وجہ سے خطے کا نام ہشت نگر پڑا۔ ان میں سے پڑانگ، چارسدہ، اتمان زئی، ترنگ زئی اور تنگی زیادہ ممتاز تھیں۔ سید صاحب کا لشکر چارسدہ میں اترا تھا۔ میں نے اسی وجہ سے چارسدہ کا نام لیا کہ ہشت نگر کے نام سے غلط فہمی کا اندیشہ تھا۔ پرانے زمانے میں اس مقام کا نام پشکلاوتی تھا اور علاقے کو گندھارا کہتے تھے۔

[2] "ل" مضموم اور "ڈ" مفتوح، اس سے مقصود دریائے کابل ہے۔ پشتو میں لنڈے کے معنی ہیں چھوٹا اور مختصر۔ دریائے کابل کے کئی مقامی نام ہیں۔ پہاڑیوں سے نکلنے کے بعد دریائے سوات سے اتصال تک اسے "ناگمان" کہتے ہیں۔ نستا پر دریائے سوات اس میں مل جاتا ہے۔ وہاں سے اس کا نام لنڈے مشہور ہے۔ یہ اٹک کے سامنے دریائے اباسین یعنی سندھ میں مل جاتا ہے۔

کی کوئی صورت پیدا کریں۔ سید صاحب کے سفر چارسدہ کی خبر ملی تو گزرگاہ کے حوالی کی بستیوں کے لوگ گروہ در گروہ زیارت کی غرض سے جمع ہوتے رہے۔ ان میں خواتین کی بھی کثیر تعداد تھی۔ سید صاحب اُونٹ پر سوار تھے۔ اس پر جھالر والا زین پوش پڑا ہُوا تھا۔ راویوں کا بیان ہے کہ زائرین پوش کے تار نکال نکال کر بہ طور تبرک لے گئے، بلکہ اونٹ کی دم کے بال بھی محفوظ نہ رہے۔ جنھیں ان تبرکات میں سے کوئی حصہ نہ مل سکا وہ اونٹ کے نقش ہائے پا کی خاک اُٹھا اُٹھا کر سر اور آنکھوں پر ملتے رہے۔

رات کے وقت یہ قدوسی لشکر چارسدہ پہنچا اور قصبے سے باہر قیام پذیر ہُوا۔ مولوی محمد یوسف پھلتی سید صاحب کے داروغہ خاص، خزینہ دار اور رسد کے ناظم اعلیٰ تھے۔ ان کے ماتحت دو کارکن تھے۔ اجناس کی خرید میاں عبداللہ کے سپرد تھی، جو لشکر میں عبداللہ "والیا" کے لقب سے مشہور تھے، اجناس کی تقسیم شیخ باقر علی[1] عظیم آبادی کے حوالے تھی۔

لشکر کی معیشت و معاشرت

راویوں کا بیان ہے کہ چارسدہ پہنچنے پر کھانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ نہ غلہ موجود تھا اور نہ خریدنے کے لیے روپیہ پاس تھا، اس لیے سید صاحب کے ارشاد کے مطابق چند مسی ظروف ایک بنیے کے پاس بہ طور کفالت رکھ کر جنس خریدی گئی۔ لشکر میں تقسیم رسد کا پیمانہ ایک تالوٹ تھا، جس میں تین پاؤ غلہ یا آٹا سماتا تھا۔ چارسدے میں پہلی رات جو جنس ملی، وہ بہ سہم مساوی تقسیم ہُوئی تو تین تین غازیوں کے حصے میں ایک ایک تالوٹ آیا، یعنی فی غازی ایک پاؤ جنس[2]۔ معیشت کی اس عسرت کے باوجود ہر فرد شاکر و شاد ماں تھا۔ جو لوگ گھروں

---

[1] شیخ باقر علی، مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے عم زاد بھائی تھے۔ سلسلہ نسب یہ ہے: باقر علی، ابن مولانا بشارت علی، برادر مولانا فتح علی (والد ماجد مولانا ولایت علی)۔

[2] یہ بات قرینِ قیاس نہیں کہ سید صاحب کے قصدِ چارسدہ سے بستی والے آگاہ نہ تھے یا چند من جنس کی خرید کے لیے بھی روپے موجود نہ تھے۔ میرا خیال ہے کہ لشکر رات کے وقت دیر سے پہنچا ہوگا۔ بستی والوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ راستے میں منزل کر لی گئی اور صبح چارسدہ پہنچیں گے، اس لیے کھانے کا انتظام نہ کیا۔ جن لوگوں کے پاس روپیہ تھا، وہ بھی پیچھے رہ گئے ہوں گے۔ سید صاحب کے ساتھ اس وقت سات سو کے قریب غازی تھے۔ اگر فی غازی ایک پاؤ جنس بٹی تو کل جنس چار پانچ من سے زیادہ نہ ہوگی۔ قرینہ یہی ہے کہ دیر سے پہنچے، روپے والے لوگ پیچھے ہوں گے اور سید صاحب نے اس خیال سے کفالت پر جنس لے لینے کا حکم دے دیا کہ پیچھے والے آجائیں گے تو نقد روپیہ دے کر برتن واپس لے لیے جائیں گے۔

کی راحت بار زندگیوں سے کنارہ کش ہو کر اس نیت سے دور دراز کی مسافت طے کر کے آئے تھے کہ اپنی جانیں راہِ خدا میں نثار کر دیں اور اسے اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے، انھیں رسد کی قلت کیا پریشان کر سکتی تھی۔

کھانے سے فراغت ہوئی تو معمول کے مطابق پہر دار پہرے پر کھڑے ہو گئے۔ جن لوگوں کے ذمے رات کی گشت تھی وہ اپنے کاموں میں لگ گئے۔ دستور یہ تھا کہ ہر شب کے لیے کوئی لفظ دستک یا نشان[1] کے طور پر مقرر ہو جاتا اور سب کو اس سے آگاہ کر دیا جاتا۔ پہریداروں کے ٹوکنے پر اگر کوئی شخص مقررہ لفظ نہ دہراتا تو سمجھ لیا جاتا کہ اجنبی ہے۔

سید صاحب کے ارشادات سے مستفیض ہونے کے اشتیاق میں اکثر مجاہدین آپ کے پلنگ کے ارد گرد بیٹھ جاتے اور وہیں زمین پر سو رہتے۔ مولوی فتح علی فرماتے ہیں:

> حضرت کے پلنگ کے ارد گرد اکثر لوگ آپ کی باتیں سننے کو رہا کرتے تھے اور اس کثرت سے رہا کرتے تھے کہ کسی کا سر، کسی کا پیر، کسی کا پیٹ اور کسی کی پیٹھ، کسی کو کسی بات کا کچھ تکلّف نہ تھا۔ جس نے جہاں کہیں جگہ پائی، وہیں بے تکلف سو رہا۔ سو اس رات کو (یعنی چارسدہ میں قیام کی پہلی رات کو) بھی یہی حال تھا۔[2]

نماز و دعا

پورا لشکر تہجد خواں تھا۔ سید صاحب تہجد کے لیے اٹھتے، تو سب اُٹھ جاتے۔ چارسدہ میں پہلی رات تہجد سے فارغ ہوئے تو سید صاحب نے فرمایا: قبولِ دعا کا وقت ہے، میں دُعا کرتا ہوں، سب بھائی مل کر آمین کہیں۔ پھر برہنہ سر ہو کر آپ نے دعا کی، جس کے الفاظ راویوں کے بیان کے مطابق اس قسم کے تھے:

> اے پروردگار! تو بڑا قادر و بے نیاز ہے۔ ہم سب تیرے بندے محتاج و ناچار ہیں۔ سوا تیرے کوئی ہمارا حامی و مددگار نہیں۔ ہم سب تیری ہی رضامندی کے واسطے اپنے شہر و دیار چھوڑ کر یہاں آئے ہیں تو ہم سب پر اپنی رحمت کی نظر کر۔

سلسلۂ دعا دیر تک جاری رہا۔ ہمراہیوں کے حلقے سے محویت کے عالم میں برابر "آمین" کی صدا بلند ہوتی رہی۔

---

[1] وقائع احمدی میں اسے "بلول" لکھا ہے۔ [2] وقائع صفحہ ۹۴۴۔ منظورہ میں ہے: از غایت بے تکلفی بستر جداگانہ وضعے کہ اہلِ دنیا را باشد، نبود، بلکہ پائے یکے بر سوے سرِ دیگرے و پہلوے کسے خلافِ احدے گردیدہ۔

ذرا تصور فرمائیے، تہجد کا وقت، جہاد فی سبیل اللہ کا مقام، گھربار چھوڑ کر ہزاروں میل پر بیٹھے ہوئے فداکارانِ حق کا گروہ، جن میں ہر فرد جان قربان کرنے کا محکم عزم کیے بیٹھا تھا اور اس امام ہمام کا خشوع و خضوع جس نے ظلمت زارِ ہند میں دینی حمیت کا چراغ از سر نو روشن کیا۔ پھر "وقائع" کے اس بیان پر تعجب کی کون سی گنجایش باقی رہ سکتی ہے کہ رحمت الٰہی نے ایسا جوش مارا، ہر شخص کا اور ہی حال ہو گیا، گویا سب پر ایک حالت فنا کی ساری و طاری تھی کہ بیان اس کا لکھنے میں نہیں آ سکتا۔[1]

سید صاحب کی عادت تھی کہ نماز تہجد کے بعد حاضرین کو کچھ دیر تک نصیحتیں فرماتے، پھر سو جاتے۔ چارسدے میں بھی یہی ہوا۔ صبح کی نماز میں لشکریوں کے علاوہ بستی کے لوگ بھی شامل ہو گئے۔ سید صاحب نے پھر لمبی دعا فرمائی۔

بیعت اور دعوتیں

ہشت نگر کا علاقہ اس وقت درانی سرداروں میں سے سید محمد خاں کی تحویل میں تھا۔ وہ چارسدہ کے بالاحصار میں رہتا تھا۔ صبح کی نماز کے بعد زیارت کے لیے آیا اور بیعت سے مشرف ہوا۔ پھر لوگ اس کثرت سے بیعت کے لیے جمع ہو گئے کہ ایک ایک سے بیعت لینا مشکل ہو گیا۔ سید صاحب اپنا دوپٹا پھیلا دیتے۔ ایک سرا اپنے دست مبارک میں رکھتے اور دوپٹے کو لوگ پکڑ لیتے۔ اس طرح بیعت سے فراغت پائی۔ بعد میں کھانے کی دعوتیں مختلف افراد کی طرف سے پے بہ پے آنے لگیں۔ سید صاحب نے غازیوں کو تیس تیس چالیس چالیس کی جماعتوں میں بانٹ دیا اور داعیوں کی باریاں مقرر کر دیں تاکہ کسی کو دعوت قبول نہ کرنے کی شکایت نہ رہے۔ آپ قریباً دو ہفتے چارسدہ میں ٹھہرے رہے۔ دونوں وقت غازیوں کی مختلف جماعتیں مختلف داعیوں کے ہاں کھانا کھاتیں۔ سید صاحب نے پہلے دن دوپہر کا کھانا سید محمد خاں کے ہاں کھایا۔ باقی دنوں کے متعلق یقینی و حتمی اطلاع نہ مل سکی۔ اغلب ہے اور اصحاب کے ہاں بھی گئے ہوں۔ میرا خیال ہے کہ سید محمد خاں نے بھی ایک مرتبہ کی دعوت پر قناعت نہ کی ہو گی۔ اس اثنا میں سید صاحب آس پاس کے دیہات کا دورہ بھی فرماتے رہے اور تدابیر جنگ کے بارے میں بھی مشورے کرتے رہے۔

حسن تربیت کا ایک واقعہ

چارسدہ ہی میں ایک واقعہ پیش آیا، جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سید صاحب کے فیضِ صحبت نے غازیوں کے مزاج و طبیعت کو کس درجہ بدل دیا تھا اور وہ لوگ فضائل اخلاق و اخوت اسلامی کے کس بلند مقام پر پہنچ گئے تھے۔ نیز

---

[1] وقائع صفحہ ۹۴۴۔

سید صاحب کا طریق اصلاح کتنا دلکش تھا۔

غازیوں میں ایک شخص رسول خاں نام ملیح آباد کا باشندہ تھا اور نامی بانکوں میں شمار ہوتا تھا۔ عام بانکوں کی طرح طبیعت بڑی جوشیلی اور غصہ ور تھی۔ بات بات پر تلوار میان سے نکال لیتا تھا۔ سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تو جوش اور غصہ باقی نہ رہا۔ جہاد کے لیے نکلا تو اپنے ایک بھتیجے کو بھی ساتھ لے لیا، جس کی عمر گیارہ سال کی تھی۔ اس بچے کو تعلیم و تربیت کی غرض سے اپنے ایک رفیق اکبر خاں کے حوالے کر رکھا تھا۔

چارسدہ میں جو لوگ بیعت کے لیے آتے تھے، وہ عموماً مٹھائی ساتھ لاتے تھے۔ رسول خاں کے بھتیجے نے اس مٹھائی میں سے ایک دو لڈو اجازت کے بغیر کھا لیے۔ اکبر خاں کو یہ بات معلوم ہوئی تو تادیباً بچے کے ایک تھپڑ مارا۔ رسول خاں نے یہ سنا تو ایک دم طبیعت جوش پر آ گئی اور حالتِ غیظ میں اکبر خاں کو بہت سخت سست کہا۔ ایک اور غازی، نور خاں پاس کھڑا تھا اس نے پورا واقعہ سید صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ نے فوراً رسول خاں کو بلایا۔ بڑی خاطرداری سے پاس بٹھایا، پہلے مزاج پوچھا، پھر شفقت بھرے انداز میں فرمایا:

> ہم نے سنا ہے کہ اکبر خاں نے آپ کے بھتیجے کو دھول ماری سو آپ کو اس کا بڑا رنج ہوا۔ یہ بات آپ کو نہ چاہیے۔ انھوں نے اپنا لڑکا سمجھ کر تعلیماً مارا ہوگا۔

رسول خاں کا غصہ تو پہلے ہی فرو ہو چکا تھا اور اپنی اضطراری حرکت پر پشیمان بھی تھا۔ سید صاحب کا ارشاد سن کر عرض کیا:

> حضرت! جیسا میرا مزاج ہے، آپ بھی جانتے ہیں اور اکثر لوگ بھی واقف ہیں کہ میں کسی کی سخت بات برداشت نہ کر سکتا تھا۔ جب سے میں نے آپ کی باتیں سنیں اور آپ کے ہاتھ پر توبہ کی، تب سے جہالت اور شورہ پشتی میری اللہ تعالیٰ نے دور کر دی۔ واللہ وہ جہالت اور شیطنت، نعوذ باللہ منہا، جو مجھ میں ہوتی تو باوجود اس کے کہ آپ کے لشکر میں اتنے لوگ ہندوستانی اور قندھاری وغیرہ بہادری اور شجاعت میں یکتائے زمانہ ہیں، مگر میں کسی کو خیال میں نہ لاتا اور سخت بات کا تلوار ہی سے جواب دیتا۔ سو میں نے تو سچے دل سے آپ کے ہاتھ پر توبہ کی ہے اور اکبر خاں میرے بھائی ہیں۔ بھتیجے کو مارا تو خوب کیا۔[1]

---

[1] وقائع صفحہ ۱۵۲۱ و [illegible]

یہ سُن کر سید صاحب بہت خوش ہُوئے اور رسول خاں کے لیے دعا فرمائی۔

ایک مشتبہ آدمی کی گرفتاری

اسلامی لشکر میں کچھ اوپر دو سو قندھاری تھے۔ ان کی جماعت کے چند افراد ایک روز شمشیر خاں نام ایک آدمی کو پکڑ لائے اور کہا کہ یہ سکھوں کا جاسوس ہے لہٰذا اسے ۳ کر دینا چاہیے۔ سید صاحب نے شمشیر خاں کو اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ نمازِ عشاء کے بعد تنہائی میں اس سے کہا اپنا حال صحیح صحیح بتا دو اور کسی بات کا اندیشہ نہ کرو۔ اس نے اقبال کر لیا کہ واقعی سکھوں نے مجھے جاسوسی کی غرض سے بھیجا ہے اور بدھ سنگھ بڑے لشکر کے ساتھ دریائے سندھ عبور کر کے حیرآباد میں داخل ہو چکا ہے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ بھائی! بدھ سنگھ سے جا کر کہہ دے کہ جس طرح تو اپنے آقا رنجیت سنگھ کا فرمانبردار ہے اور اس کے حکموں کی تعمیل میں لگا ہوا ہے، اسی طرح ہم بھی اپنے مالک حقیقی کے فرمانبردار اور اس کے احکام کے پابند ہیں۔ بدھ سنگھ کو خبر پہنچی کہ ایک سید ملک کو سکھوں کے تصرف سے نکالنے کا ارادہ لے کر ہندوستان سے آیا ہے۔ یہ بالکل درست ہے۔ ہم عنقریب اس سے جنگ کریں گے۔

شمشیر خاں سید صاحب کی صورت دیکھتے ہی گرویدہ ہو چکا تھا۔ گفتگو سُنی اور طرزِ سلوک دیکھا تو بے تابانہ بیعت کے لیے تیار ہو گیا۔ ساتھ ہی عرض کیا کہ خدا نے چاہا تو میں بدھ سنگھ کے لشکر کا پورا حال معلوم کر کے آؤں گا اور خدمتِ والا میں پیش کر دوں گا۔ سید صاحب نے شمشیر خاں کو اللہ بخش خاں مورانوی کے حوالے کر دیا اور فرمایا کہ پہر رات باقی رہے تو اسے حفاظت کے ساتھ تین چار میل باہر لے جا کر چھوڑ دینا، جہاں چاہے چلا جائے[1]

---

[1] یہ وقائع کا بیان ہے۔ منظورہ میں ہے: ایں را در ہر جماعت سیر کنانیدہ دقت ماندن پاسے از شب بہ حفاظت تمام تا سہ میل از لشکر رخصت باید نمود۔ ممکن ہے اس سے کسی دل میں وسوسہ پیدا ہو کہ سید صاحب اپنی نیک طبعی کے باعث فوجی مصالح کا خیال نہیں رکھتے تھے، مگر شمشیر خاں کو مختلف جماعتوں میں پھرا کر باہر نکال دینا کسی بھی مصلحت کے خلاف نہ تھا۔ اس طرح لوگ اس کی شکل صورت سے واقف ہو جاتے اور لشکر میں پھر کر اسے زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ سید صاحب کی جمعیت کم ہے۔ یہ حقیقت ہزاروں آدمیوں پر آشکارا تھی۔ سید صاحب کے ساتھ جو غازی آئے تھے ان کی تعداد ہر فرد کو معلوم تھی، لیکن کون خیال کر سکتا تھا کہ سید صاحب انھیں سات سو غازیوں کے بل پر سکھ حکومت سے لڑنے کا ارادہ کیے بیٹھے تھے؟ ان کی سکیم تو یہ تھی کہ ایک موزون مرکز مل جائے تو ہندوستان سے مجاہدین کو بلائیں، نیز سرحد کے مسلمانوں کو جلد سے جلد منظم کر کے میدانِ جنگ میں پہنچا دیں۔

بدھ سنگھ سے جنگ کا فیصلہ

یہ خبر مل ہی چکی تھی کہ بدھ سنگھ خیرآباد پہنچ گیا ہے اور وہاں سے آگے بڑھنے کی تدبیریں کر رہا ہے۔ اس اثنا میں امیر خاں خٹک رئیس اکوڑہ چارسدہ پہنچا اور سید صاحب سے مل کر بدھ سنگھ کی آمد کی تصدیق کر دی۔ ساتھ ہی کہا کہ میرا بھتیجا خواص خاں سکھوں کے ساتھ مل گیا ہے۔ اگر بدھ سنگھ دریائے لنڈے کو عبور کر کے آگے نکل آیا تو سارے ملک سمہ[1] میں قتل و غارت کا خوفناک طوفان امنڈ آئے گا اور لوگ اپنے اہل و عیال کو بچانے کی سراسیمگی میں آپ کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔ مناسب یہ ہے کہ آپ پیش قدمی کر کے بدھ سنگھ کو لنڈے کے پار ہی روک دیں۔ سید صاحب نے یہ مشورہ قبول فرما لیا اور ساتھ ہی فیصلہ ہو گیا کہ چارسدہ سے نکل کر نوشہرہ پہنچنا چاہیے جہاں سے بدھ سنگھ پر حملہ کر کے کاری ضرب لگائی جا سکتی تھی۔

مسلمانوں کے سیاسی زوال کی سرگزشت کا ایک نہایت المناک باب یہ ہے کہ وہ جماعتی و قومی مقاصد سے بے پروا ہو کر صرف انفرادی اغراض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ صوبہ سرحد کے اکثر رئیس گھرانے بھی اسی مرض کا شکار ہو چکے تھے۔ امیر خاں اور اس کے بھتیجے خواص خاں میں جھگڑا تھا۔ بھتیجا بے تکلف سکھوں سے مل گیا۔ امیر خاں جماعتی مقاصد کی خاطر نہیں بلکہ بھتیجے کے ساتھ دشمنی کے باعث سید صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ وہ دل سے سید صاحب یا ان کے مقاصد کا حامی نہ تھا جیسا آگے چل کر معلوم ہو گا۔ خواص خاں کے بارے میں صرف یہ کہہ دینا چاہیے کہ اگر وہ بدھ سنگھ کا خیر مقدم نہ کرتا اور اسے ہر ممکن امداد کا یقین نہ دلاتا تو سکھ لشکر بے تکلفی سے پیش قدمی نہ کرتا۔

نوشہرہ کا قصد

سید صاحب چارسدہ سے نکلے تو خویشگی[2] پہنچے، جو چھوٹی سی بستی تھی اور وہاں لشکر کے لیے کھانے کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا۔ سید صاحب نے غازیوں کو حکم دے دیا کہ نماز عشا تک کلمہ توحید کا ورد جاری رکھیں۔ اطمینان قلب کے لیے ذکر الٰہی سے بڑھ کر کون سی چیز مفید ہو سکتی ہے؟ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔

قدرت کی کرشمہ فرمائی ملاحظہ ہو، اس اثنا میں کنار دریا کی بعض بستیوں کے لوگوں کو علم ہو گیا کہ سید صاحب خویشگی میں ٹھہر گئے ہیں۔ انھوں نے آٹا فراہم کر کے ایک کشتی میں بھرا۔ غازی عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے تو یہ کشتی خویشگی پہنچ گئی۔ اتنا سامان تھا کہ غازیوں میں دو وقت کی رسد بانٹ کر بھی بچ رہا۔

---

[1] سمہ پشتو زبان میں میدان کو کہتے ہیں۔ اس سے مقصود وہ میدانی علاقہ ہے جو دریائے سندھ اور سرحدی پہاڑوں کے درمیان ہے۔ [2] خویشگی چارسدہ اور نوشہرہ کے درمیان ہے۔

اس وقت سید صاحب کے ہمراہی غازی پندرہ سو تھے: قریباً پانسو ہندوستانی، کچھ اُوپر دو سو قندھاری، کوئی آٹھ سو ملکی۔ اکثر ملکی اپنے گھروں سے کھانا کھا کر آئے تھے۔ بہت کم لوگ تھے، جنھوں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ انھیں غازیوں کے برابر رسد دے دی گئی۔ سید صاحب کے ہندوستانی غازیوں کی اتنی ہی جماعتیں تھیں، جو گوالیار میں مرتب ہوئی تھیں۔ قندھاریوں کی جماعت الگ بن گئی تھی۔ یہ تصریح اس لیے ضروری معلوم ہوتی کہ بعض سوانح نگاروں نے جنگ اکوڑہ کے وقت جماعتوں کی تعداد زیادہ بتائی ہے، حالانکہ زیادہ جماعتیں آگے چل کر بنی تھیں۔ ان کا ذکر موقع پر آئے گا۔

سید صاحب ۱۸- دسمبر ۱۸۲۶ء (۱۸- جمادی الاولیٰ ۱۲۴۲ھ) کو خویشگی پہنچے تھے۔ ۱۹- دسمبر کو ڈیڑھ پہر دن چڑھے نوشہرہ[1] میں وارد ہوئے۔ بدھ سنگھ اس وقت خیر آباد سے آگے بڑھ کر اکوڑہ[2] میں داخل ہو چکا تھا، جو نوشہرے سے سات آٹھ میل جنوب میں دریائے لنڈے کے مغربی کنارے پر ہے۔ دشمن کے قرب کو پیش نظر رکھتے ہوئے سید صاحب نے حکم دے دیا کہ غازی کمریں نہ کھولیں اور کھانا کھا کر تیار رہیں۔

---

[1] اس سے مقصود موجودہ چھاؤنی اور اس سے ملحقہ آبادی نہیں جو لنڈے کے مغربی کنارے پر ہے۔ پشاور والی ریل کا اسٹیشن بھی اسی طرف ہے۔ سید صاحب جس نوشہرہ میں وارد ہوئے تھے، اس سے مقصود پرانا شہر ہے، جو دریا کے مشرقی کنارے پر ہے۔ آج کل اسے نوشہرہ کلاں کہتے ہیں۔ مقامات کی ترتیب یوں ہے: اٹک سے تین میل خیر آباد، وہاں سے چار پانچ میل جہانگیرا روڈ، جہانگیرا روڈ سے تین میل شیدو، اس سے آگے اکوڑہ، پھر نوشہرہ۔ [2] اکوڑہ دریائے لنڈے کے مغربی کنارے پر ہے۔ یہ قبیلہ خٹک کے سردار اکوڑہ نے سولھویں صدی میں آباد کیا تھا۔ اس کے سامنے مشرقی کنارے پر مصری باندہ ہے، جو خوشحال خاں خٹک کا گاؤں تھا۔

بتیسواں باب

جنگ اکوڑہ

طریقِ جنگ کا فیصلہ

نوشہرہ پہنچتے ہی سکھ لشکر کے حالات معلوم ہو چکے تھے۔ اس کی تعداد کم از کم سات اور زیادہ سے زیادہ دس ہزار تک بتائی جاتی تھی[1] اور مجاہدین کل ڈیڑھ ہزار تھے۔ سکھوں کے پاس ہر قسم کا ساز و سامان موجود تھا۔ کم از کم آٹھ توپیں تھیں۔ مجاہدین میں سے سب کے پاس بندوقیں بھی نہ تھیں۔ پھر ہندوستانی مجاہدین کے بارے میں یقین تھا کہ وہ جانبازی میں دریغ نہ کریں گے۔ قندھاریوں کی شجاعت و مردانگی کا بھی ایک حد تک اندازہ ہو گیا ہو گا۔ سرحدی مسلمانوں کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا کہ امتحان و آزمایش کی حالت میں کس حد تک ثبات و استقامت کا ثبوت دے سکیں گے۔ یہ تمام حالات سامنے رکھ کر مشورہ کیا گیا کہ جنگ کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ سید صاحب کی یہ پہلی جنگ تھی، جس کے خوشگوار اور حوصلہ افزا نتائج پر سرحد میں کاروبارِ جہاد کی تنظیم موقوف تھی۔ اس لیے معاملے کے ہر پہلو کو خوب جانچا اور تولا گیا۔ آخر یہ رائے ٹھہری کہ سکھ لشکر پر

---

[1] سید صاحب نے جو خط ہندوستان بھیجا تھا، اس میں سکھ لشکر کی تعداد ہفت ہزار سوار و پیادہ بتائی تھی۔ ظفرنامہ کنہیا لال، ظفر نامہ دیوان امرناتھ اور لطیف کی تاریخ پنجاب میں جنگ اکوڑہ کا کوئی ذکر نہیں۔ میں جس حد تک مختلف ذرائع سے معلوم کر سکا ہوں تعداد سات ہزار سے کم اور دس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ یہ حقیقت سب تسلیم کرتے ہیں کہ سید صاحب کی آمد نے ایک عام سراسیمگی پیدا کر دی تھی۔ دیوان امرناتھ لکھتے ہیں کہ بدھ سنگھ سندھانوالہ، سرداران اٹاری، گلاب سنگھ اور سوچیت سنگھ پہلے وہاں بھیجے گئے تھے، بعد میں کنور شیر سنگھ، کنور کھڑک سنگھ اور جمعدار خوشحال سنگھ کو بھی ادھر ہی روانہ کر دیا گیا (ظفر نامہ دیوان امرناتھ۔ صفحہ ۲۰۰) مولوی محمد جعفر نے تعداد نو ہزار سے زیادہ لکھی ہے (صفحہ ۹۸) اور صاحب حیات طیبہ نے دس ہزار (صفحہ ۱۶۲) آخر الذکر نے شبخون کے لیے بھیجے جانے والے غازیوں کی تعداد دو ہزار بتائی ہے۔ یہ بالکل غلط ہے کیوں کہ سید صاحب کے پاس اس وقت کل ڈیڑھ ہزار آدمی تھے اور ان میں سے شبخون کے لیے نو سو آدمی چنے گئے تھے۔

شبخون مارا جائے۔ شبخون کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ اپنی قوت کو کم سے کم گزند پہنچے اور دشمن کی قوت پر اچانک فوری ضرب لگا کر اسے ہراس زدہ بنا دیا جائے۔ ہراس زدگی کے علاوہ یہ اندازہ بھی کر لیا جائے کہ منظم جنگ کے لیے اس میں کتنی صلاحیت موجود ہے۔ سید صاحب کا فیصلۂ شبخون انھیں مقاصد پر مبنی تھا۔

اعلام و انتباہ

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب پیشتر ہی دربار لاہور کو ایک اعلام بھیج چکے تھے، جس میں تین صورتیں پیش کی گئی تھیں:

۱ - اسلام قبول کر لو تو ہمارے بھائی بن جاؤ گے اور برابر کا درجہ حاصل کر لو گے۔ لیکن اس باب میں ہماری طرف سے جبر نہیں ہو سکتا اس لیے کہ دین کا قبول یا عدم ہر انسان کی مرضی پر موقوف ہے۔

۲ - ہماری اطاعت اختیار کر لو اور جزیہ دو۔ اس حالت میں تمھارے اموال و نفوس کی حفاظت اسی طرح ہم پر واجب و لازم ہو جائے گی جس طرح ہم خود اپنے اموال و نفوس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

۳ - دونوں باتیں منظور نہیں تو لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ سارا یاغستان اور سارا اسلامی ہند ہمارے ساتھ ہے اور راہِ حق میں شہادت ہمیں اس درجہ عزیز و محبوب ہے کہ تمھیں شراب اتنی عزیز و محبوب نہ ہو گی۔

یہ روایت درست بھی مان لی جائے تو ظاہر ہے کہ لاہور کی حکومت ایک بے نوا سیّد کے انتباہ کو کب خاطر میں لا سکتی تھی؟ تاہم پورے یقین و ثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس پر اضطراب طاری ہو گیا ہو گا، خصوصاً اس وجہ سے کہ کہیں سرحد کے عوام سید صاحب کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر یورش عام نہ کر دیں۔ اس حالت میں پنجاب کی اسلامی آبادی بھی جا بجا مقابلے پر کھڑی ہو جاتی اور رنجیت سنگھ کے لیے ایسی مشکلات پیدا ہو جاتیں کہ ان سے شاید ہی عہدہ برآ ہو سکتا۔ دفاع کے لیے علاقہ سرحد میں پیش قدمی کی علت نظر بظاہر یہ تھی کہ اگر سکھ فوج اٹک میں بیٹھی رہتی تو سید صاحب کا پہلا حملہ اٹک اور حضرو پر ہوتا۔

شبخون کے لیے مجاہدین کا انتخاب

بہرحال شبخون کا فیصلہ کر لینے کے بعد تمام جماعتوں کے سالاروں کو حکم دے دیا گیا کہ چست و توانا غازیوں کی فہرستیں تیار کر کے پیش کریں تاکہ انھیں سامنے رکھ کر مناسب جیش منتخب کر لیا جائے۔ فہرستیں پیش ہوئیں تو سید صاحب نے نو سو آدمی چُن لیے۔ بعض غازیوں کے نام قلمزد ہو گئے۔ ان میں جہان آباد (رائے بریلی) کا عبدالمجید خاں آفریدی بھی تھا۔ اسے اس وجہ سے منتخب نہ کیا گیا کہ ان دنوں بخار میں مبتلا تھا اور خاصا کمزور ہو گیا تھا۔ عبدالمجید خاں کو یہ خبر ملی تو بے تابانہ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پرداز ہوا: حضرت! میں

کچھ ایسا بیمار تو نہیں کہ چلنے کی طاقت نہ ہو اور یہ پہلا محاربہ ہے، جس میں جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد رکھی جائے گی۔ میرا نام ضرور شامل فرما لیجیے تاکہ سبقت کی فضیلت سے محروم نہ رہ جاؤں۔ سید صاحب نے عبدالمجید خاں کا ذوق و شوق دیکھ کر اس کی خواہش پوری کر دی اور دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ہمت میں برکت دے۔

اس واقعہ سے آپ پر اس قدوسی جماعت کے شرکاء کا جذبۂ سبقت بالخیرات واضح ہو سکتا ہے جہاد کی فرضیت و اہمیت کے معتقدوں کے نزدیک بھی رخصت و اجازت کے عذر مسلّم ہیں۔ جو شخص واقعۃً بیمار تھا، اتنا بیمار کہ امام وقت نے احیاناً اسے ادائے فرض کا مکلّف نہ سمجھا، اس کی معذوری میں کسے کلام ہو سکتا تھا؟ لیکن سید صاحب نے اپنے ساتھیوں میں خدمت حق کی ایسی والہیت پیدا کر دی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی سہولتوں اور رخصتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کے برعکس ہر شخص کے دل میں عزیمت و سبقت کی شیفتگی موجزن تھی۔ عبدالمجید خاں آفریدی نے شبخون اکوڑہ کی شام کو سید صاحب کے کمال تربیت اسلامی کا سچا نمونہ پیش کر دیا۔

اس شبخون کی سالاری کے لیے اللہ بخش خاں مورانوی تجویز ہُوا۔ سبحان اللہ! کتنی قابل رشک سعادت تھی، جو اس مرد مجاہد کے حصے میں آئی۔ ہندوستان میں اسلام کی برتری و فرمانفرمائی کی متاع عزیز لٹ جانے کے بعد اس کی بازیافت کے لیے رائے بریلی کے پاک نفس سید نے مجاہدات کا جو سلسلہ شروع کیا، اس میں سب سے پہلے معرکے کی سالاری کا تاج اللہ بخش خاں کے سر پہ رکھا گیا:

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

ترتیبات و ہدایات

سید صاحب نے نماز مغرب کے بعد اللہ بخش خاں سے فرمایا کہ آج جو شبخون جا رہا ہے، اس کے قائد آپ ہوں گے۔ چند غازیوں کو لے کر دریا کے دوسرے کنارے پہ چلے جائیے۔ باقی غازی چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں آہستہ آہستہ وہاں پہنچتے جائیں گے۔ اللہ بخش خاں اسی وقت چند رفیقوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر لنڈے کے مغربی کنارے پہ پہنچا اور اپنے ساتھیوں کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

نو سو آدمیوں میں سے ایک سو چھبیس ہندوستانی تھے، قریباً اسّی قندھاری، باقی اہل سرحد تھے۔ نماز عشاء کے بعد سید صاحب نے ان سب کو جمع کر کے فرمایا کہ آپ لوگ جس مقام پر جا رہے ہیں، وہاں پہنچنے میں سات آٹھ میل کا فاصلہ طے کرنا ہو گا۔ جس بھائی میں اتنے سفر کی طاقت نہ ہو، وہ رُک جائے اگر کسی کو بیماری وغیرہ کا عذر ہو تو بتا

جب تمام مجاہدین اللہ بخش خاں کے پاس پہنچ گئے تو خان ممدوح پھر چند رفیقوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر رخصتی ملاقات کے لیے خیمہ گاہ میں پہنچا۔ یقین ہے کہ اسے پہلے سے اس قسم کی ہدایت ہو چکی ہوگی۔ اس وقت سید صاحب نے برہنہ سر ہو کر انتہائی عجز و الحاح سے دعا فرمائی:

> اے کریم کارساز، بندہ نواز! یہ تیرے بندے محض عاجز و خاکسار اور ضعیف و ناچار ہیں۔ تیری ہی مدد کے امیدوار ہیں۔ تیرے سوا ان کا کوئی حامی و مددگار نہیں۔ یہ صرف تیری ہی رضامندی اور خوشنودی کو جاتے ہیں۔ تو ہی ان کی مدد کرنا۔

آدھی[1] رات کے قریب یہ جماعت دریائے لنڈے کے مغربی کنارے سے، جہاں آج کل نوشہرہ چھاؤنی ہے، منزلِ مقصود کی جانب روانہ ہوئی۔ "منظورہ" میں ہے کہ روانگی سے پیشتر سب نے ایک دوسرے سے کہا سنا معاف کرایا۔ ہر ایک کی زبان پر تھا کہ خدا زندہ لائے گا تو پھر ملیں گے، ورنہ جنّت میں ملاقات ہوگی۔

گر بمانیم زندہ بر دوزیم   جامۂ کز فراق چاک شدہ
ور بمیریم عذرِ ما بپذیر   اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

سید صاحب نے فرمایا تھا کہ روانگی سے پیشتر ہر شخص گیارہ گیارہ مرتبہ سورۂ قریش پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لے، پھر قدم اٹھایا جائے[2]۔ اس ہدایت پر پورا عمل ہوا۔

لشکر گاہ کی کیفیت

سکھ لشکر اکوڑہ سے باہر کھلے میدان میں مقیم تھا۔ وقت کے عام رواج کے مطابق لشکر گاہ کے اردگرد خاردار درختوں کی شاخوں سے سنگھر بنا لیا گیا تھا[3]۔ خود سردار بدھ سنگھ سندھانوالہ[4] جو سالارِ لشکر تھا، رات کے وقت اکوڑہ میں چلا جاتا تھا۔

---

[1] روایات میں ہے "پہر رات پر کچھ گھڑیاں بجی تھیں"۔ [2] سید صاحب کے معمولات میں سے ایک خاص چیز یہ تھی کہ جنگ اور خطرے کے موقع پر سورۂ قریش گیارہ مرتبہ پڑھ کر دم کر لینے کی ہدایت فرماتے تھے۔ جن لوگوں کو سورۂ قریش یاد نہ ہوتی، فرماتے کہ دوسرے پڑھ کر ان پر دم کر دیں۔ [3] میں نے اکوڑہ میں سن رسیدہ اشخاص سے سکھ لشکر کے قیام کی جگہ معلوم کرنی چاہی، کوئی کچھ نہ بتا سکا۔ سب نے یہی کہا کہ سکھ لشکر گاہ گاؤں کے جنوب میں تھی۔ [4] بدھ سنگھ کو بعض سوانح نگاروں نے رنجیت سنگھ کا چچیرا بھائی لکھا ہے۔ سید صاحب نے جو پہلا مکتوب ہندوستان بھیجا تھا اس میں بھی "ابنِ عمِ رنجیت سنگھ" کے الفاظ موجود ہیں۔ یہ بیان تفصیل کا محتاج ہے۔ سندھاں والے خاندان کے شجرے کے مطابق، ان کے پانچویں جد کا نام بھی بدھ سنگھ تھا، جس کے دو بیٹے تھے: نودھ سنگھ اور چندا سنگھ

اگرچہ اس کا خیمہ لشکر گاہ میں نصب تھا۔

غازی جب سکھ لشکر گاہ سے تھوڑے فاصلے پر رہ گئے تو ایک نالہ ملا، جو اس وقت خشک ہوگا، اس لیے کہ صوبہ سرحد کے اس حصے کے نالوں میں صرف برسات کے موسم میں پانی بہتا ہے۔ غازی نالے کے بہاؤ میں ٹھہر گئے اور ایک آدمی کو آگے بھیج دیا گیا تاکہ لشکر گاہ کی عام کیفیت معلوم کرائے[1]۔

سید صاحب نے مولوی امیر الدین ولایتی کو مشیر کے طور پر ساتھ کر دیا تھا۔ وہ بڑے صائب الرائے اور دانشمند بزرگ تھے اور مقامی احوال و مصالح کو خوب سمجھتے تھے۔ انھوں نے اللہ بخش خاں سے کہا کہ اگلا لائحہ عمل ابھی سے طے کر لینا چاہیے۔ اگر ملکیوں کو آگے رکھا جائے تو ان کی استقامت کا ابھی تک تجربہ نہیں ہوا۔ اگر وقت پر طرح دے جائیں گے تو جماعتی مقاصد کو سخت نقصان پہنچے گا۔ اگر غازیوں کو آگے رکھا جائے تو وہ ہندوستانی ہوں یا قندھاری، سب مقامی حالات اور راستوں سے بالکل ناواقف ہیں۔ غور و فکر کے بعد یہ بات طے ہوئی کہ غازی سب سے آگے رہیں۔ البتہ ملکیوں میں سے ایک باخبر آدمی ان کے ساتھ رہ کر رہبری کا فرض انجام دیتا رہے۔ وہیں مختلف گروہوں کے ذمے مختلف کام لگا دیے گئے تھے۔ مثلاً خیموں کی طنابیں کاٹنا، بندوقیں اور تلواریں چلانا، جنگی ضرورت کی چیزیں سمیٹنا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳۵) اول الذکر کے اخلاف میں رنجیت سنگھ تھا (رنجیت سنگھ، بن مہاں سنگھ، بن چڑھت سنگھ، بن نودھ سنگھ)، چندا سنگھ کی اولاد میں سے بدھ سنگھ تھا (بدھ سنگھ بن امیر سنگھ، بن بیدار سنگھ، بن چندا سنگھ) اس طرح اگرچہ پانچویں پشت میں رنجیت سنگھ اور بدھ سنگھ کا نسب مل جاتا تھا، لیکن ابن عم کا جو عام مفہوم ہے، اس سے اس رشتہ داری کا کوئی تعلق نہ تھا۔ سندھا نوالے خاندان کے افراد میں سے بدھ سنگھ کے بھائی لہنا سنگھ اور بھتیجے اجیت سنگھ نے ۱۸۴۲ء میں مہاراجا شیر سنگھ اور اس کے بیٹے پرتاپ سنگھ کو قتل کیا اور خود بھی مارے گئے۔ ۱۸۲۷ء میں لاہور میں ہیضے کی وبا اس شدت سے پھیلی تھی کہ ایک روایت کے مطابق ایک لاکھ اڑتالیس ہزار آدمی اس وبا کی نذر ہوئے۔ رنجیت سنگھ شہر سے نکل کر شاہدرہ میں جا بیٹھا۔ اس وبا میں بدھ سنگھ بیمار رہا۔ مہاراجہ نے فقیر عزیز الدین اور بعض دوسرے اطبا کو علاج کے لیے بھیجا۔ لیکن بدھ سنگھ جانبر نہ ہو سکا۔ سکھ جرنیلوں میں وہ سب سے زیادہ شریف اور کاردان سمجھا جاتا تھا۔

راجہ سانسی کی جاگیر اسی کی اولاد کے قبضے میں ہے۔

[1] وقائع میں ہے کہ یہ نالہ لشکر گاہ سے "پاؤ کوس" پر تھا۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، اس لیے کہ لشکر گاہ کی جگہ متعین نہ ہو سکی اور اس مقام پر ٹیلے کئی ہیں۔

یا تباہ کرنا۔

اس اثنا میں بھیجا ہوا آدمی حالات معلوم کر کے واپس آگیا۔ پھر اسی کی رہبری میں مجاہدین آگے بڑھے اور تھوڑے عرصے میں لشکر کے اس حصے میں پہنچ گئے، جہاں رہبر کے اندازے کے مطابق زیادہ تر سکھ لشکری غافل سوئے پڑے تھے۔

شبخون

راویوں کا بیان ہے کہ سکھ لشکر کے گھڑیال نے تین پہر پر تین گھڑیاں بجائیں۔ ساتھ ہی غازی اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے سنگھر کو پھاند کر لشکر گاہ میں گھس گئے۔ جن لوگوں کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ خیموں کی طنابیں کاٹیں، وہ تیزی سے خیموں کو گرانے لگے۔ جن لوگوں کا فرض یہ قرار دیا گیا تھا کہ جنگی ضرورت کی چیزیں سمیٹیں، وہ اپنے کام میں لگ گئے۔ باقی لوگوں نے تلواروں اور بندوقوں سے کام لینا شروع کر دیا۔ پوری لشکر گاہ میں سراسیمگی پھیل گئی۔ ایک سکھ پہریدار نے تکبیر کی آواز سنتے ہی بندوق سر کی۔ اس کی گولی مولوی باقر علی عظیم آبادی کے لگی۔ زخم کاری تھا۔ وہ بیٹھ گئے اور بولے: "بھائیو! میرا کام تمام ہوا۔ اب مجھ سے ہتھیار لے لو۔ یہ اللہ کا مال ہے۔" بس ساتھ ہی ان کی روح اعلیٰ علیین میں پہنچ گئی۔ سید صاحب کی قدوسی جماعت میں وہ پہلے شہید تھے۔ گویا احیاء و تجدید اسلامیت کی راہ میں سب سے پہلی جانی قربانی عظیم آباد کے اس جلیل المنزلت خاندان کی طرف سے پیش ہوئی جو آگے چل کر سید صاحب کی جاری کردہ تحریک کا علمدار بننے والا تھا اور اس نے اپنی ہر متاع سبیلِ حق میں بے دریغ لٹا دی۔

مولوی باقر علی کے پاس چار چیزیں تھیں: دو پستول، جن میں سے ایک کا نام "بسم اللہ" اور دوسرے کا نام عبداللہ تھا، ایک تلوار اور ایک بندوق۔ غازیوں نے دونوں پستول بھی لے لیے، تلوار بھی لے لی، بندوق افراتفری میں ہاتھ نہ لگی۔

شبخون کی کامیابی میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا تھا، لیکن اہلِ سرحد نے اپنی عادت کے مطابق اصل کام چھوڑ دیا اور متاع سمیٹنے لگے۔ کسی نے گھوڑا سنبھال لیا، کسی نے ہتھیار اٹھا لیے، کسی نے کپڑوں کی گٹھڑی باندھ لی۔ نہایت افسوسناک امر یہ ہے کہ جس شخص کے پاس مالِ غنیمت بہ اندازہ تحمل و برداشت فراہم ہوتا گیا، وہ چپ چاپ مال اٹھا کر لشکر گاہ سے باہر نکلتا گیا تاکہ جلد سے جلد سمیٹی ہوئی دولت گھر پہنچا دے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یورش کی شدت و وسعت میں معتدبہ کمی آگئی۔

سکھوں نے پہلے سمجھا تھا کہ ہزاروں غازی بجلیاں بن کر آگرے ہیں۔ جب گولہ انداز نے رن ہتاب[1]

---

[1] میں اس کی صحیح کیفیت معلوم نہ کر سکا۔ قیاس یہ ہے کہ یہ کوئی ایسی چیز ہو گی، جس سے اندھیرے میں دور دور تک روشنی ہو جاتی تھی۔

جلائی اور ڈور کھینچ کر اسے بلند کر دیا تو دُور دُور تک میدان روشن ہو گیا۔ اس وقت سکھوں کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ حملہ آوروں کی تعداد بہت کم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی اور قندھاری غازی ہی لشکر گاہ میں رہ گئے تھے۔ اہل سرحد میں سے زیادہ تر واپس جا چکے تھے۔

غازیوں کے کارنامے

غازیوں میں سے ایک ایک نے آٹھ آٹھ دس دس آدمیوں کو موت کی نیند سُلایا۔ عبدالمجید خاں آفریدی نے کمزوری کے باوجود چودہ آدمی قتل کیے پھر اس کی تلوار ٹوٹ گئی۔ مولوی امیر الدین ولایتی کے پاس دو تلواریں تھیں۔ انھوں نے جھٹ ایک تلوار عبدالمجید خاں کو دے دی۔ اس سے بھی کئی آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا[1]۔ پھر خود بھی جام شہادت پی کر "عند ربھم یُرزقون" کے انعام یافتہ گروہ میں شامل ہو گیا۔ یہ وہی جوانمرد تھا، جسے بیمار ہونے کے باعث شبخون مارنے والے گروہ میں شامل نہیں کیا گیا تھا اور اس نے بہ اصرار و الحاح اپنا نام شامل کرایا تھا۔ ہدایت اللہ کے پاس صرف برچھی تھی۔ اُس نے برچھی سے سات آدمی گرائے۔ اللہ بخش خاں مورانوی، امیر جیش، شمشیر خاں جمعدار، غلام رسول خاں، غلام حیدر خاں، شیخ ہمدانی، علی حسن خاں، شیخ بڈھن، شیخ رمضانی، میرزا ہمایوں بیگ اور دوسرے غازیوں نے شجاعت کے حیرت انگیز جوہر دکھائے، یہاں تک کہ اکثر سکھ سراسیمہ وار بھاگ نکلے اور غازی توپوں کے قریب پہنچ گئے۔

بدھ سنگھ حملے کی اطلاع پاتے ہی لشکر گاہ میں پہنچا۔ نقارہ بجا کر بھاگتے ہوئے سکھوں کو جمع کر کے جوابی حملہ کیا، تو غازی جو بہت تھوڑے رہ گئے تھے ایک گوشے میں جمع ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اس وقت تک زیادہ سے زیادہ پندرہ غازی شہید ہوئے ہوں گے اور سکھ لشکر کو سخت نقصان پہنچ چکا تھا۔ اللہ بخش خاں امیر جیش نے اب سیکھر کی طرف ہٹنا شروع کر دیا تاکہ اپنے تمام ساتھیوں کو باہر نکال کر خود بھی نکل جائے۔ راستے میں شیخ ہمدانی اور علی حسن خاں ایک جگہ کھڑے بندوقیں چلا رہے تھے۔ انھوں نے قرائن سے امیر جیش کے عزم مراجعت کو بھانپ لیا اور پکار اُٹھے:

> امیر المؤمنین نے آپ کو ہمارا سردار بنا کر بھیجا ہے۔ آپ دشمن کے مقابلے میں پیچھے کیوں ہٹتے جا رہے ہیں؟

یہ آوازہ نہ جنگی مصلحتوں کے مطابق تھا، نہ شبخون کے مفہوم سے اسے کوئی مناسبت تھی، بلکہ یہ محض تہور و حمیت کے بے پایاں طوفان کی ایک لہر تھی۔ اللہ بخش خاں کو یہ گوارا نہ ہوا کہ جیش کا سردار

---

[1] منظورہ میں ہے: "ازاں ہم چند کس را کشتند"

بنا کر اسے بھیجا گیا تھا، اس کے ایک حصّے کو پیچھے چھوڑ کر سلامت نکل جائے۔ چنانچہ اس نے مراجعت کا خیال چھوڑ دیا اور جم کر اس لشکر سے باقاعدہ جنگ کرنے لگا جو اس کی پوری جماعت سے پچاس ساٹھ گنا تھا۔ جب تک دونوں گروہوں میں فاصلہ زیادہ تھا بندوقیں چلتی رہیں، فاصلہ کم رہ گیا تو قرابینیں اور شیر بچے چلنے لگے۔ پھر تلواریں میانوں سے نکل آئیں۔ اللہ بخش خاں نے ایک چھوٹے سے گروہ کو ساتھ لے کر ایسا شدید حملہ کیا کہ سکھ فوج دور تک پیچھے ہٹ گئی۔ اس حملے میں خود بھی ہمراہیوں کے ساتھ خلعتِ شہادت پا کر جنت الفردوس میں پہنچ گیا۔

واپسی

یہ دیکھ کر باقی غازی آگے بڑھے لیکن اکبر خاں ہیلہ دار نے انھیں یہ کہہ کر روک دیا کہ ابھی میدان میں آخری فیصلہ نہ ہوگا۔ اب واپس چلو، انشاء اللہ پھر لڑیں گے، صبح نمودار ہو رہی تھی، سکھوں کی سراسیمگی ہی سے ظاہر ہے کہ کسی کو ان کے تعاقب کا حوصلہ نہ ہوا۔ جو لوگ پہلے نکلے تھے، انھوں نے دریا پر وضو کر کے صبح کی نماز پڑھی۔ بعد میں آنے والے لوگوں نے تیمم کر کے فریضۂ صلوٰۃ ادا کیا۔

سید صاحب نے صبح ہی سے غازیوں کی ایک جماعت کو دریا کے مغربی کنارے پر کھڑا کر دیا تھا تاکہ اگر دشمن کی فوج غازیوں کے تعاقب میں آ رہی ہو تو اس کے مقابلے پر جم جائیں اور شبخون مارنے والے غازی اطمینان سے دریا کو عبور کر لیں۔ زیادہ تر غازی صبح ہوتے ہی پہنچ گئے۔ باقی دو دو چار چار کی ٹولیوں میں عصر تک آتے رہے۔ جب تک سب جمع نہ ہو گئے۔ ان میں سے کسی نے دریا عبور نہ کیا۔ صرف زخمیوں کو لشکر گاہ میں پہنچا دیا گیا، جن کی مرہم پٹی کا فوری انتظام ضروری تھا۔

اکوڑہ کی جنگ ۲۰- جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۴۲ھ (مطابق ۲۰- دسمبر سنہ ۱۸۲۶ء) چہارشنبہ اور پنجشنبہ کی درمیانی رات میں سوا چار بجے سے چھ بجے صبح تک جاری رہی۔ سید صاحب نے تمام شہدا کے لیے دعائے مغفرت کی۔ شہدا کی فہرست اگلے دن تک مکمل نہ ہو سکی، اس لیے کہ کئی غازی راستہ بھول کر خدا جانے کہاں کہاں چلے گئے اور وہ پنجشنبہ اور جمعہ کی درمیانی رات میں نوشہرہ پہنچے۔

شہدا کے نام

اس جنگ میں چھتیس ہندوستانی غازی اور چھیالیس قندھاری غازی شہید ہوئے دونوں جماعتوں کے زخمیوں کی تعداد تیس اور چالیس کے درمیان تھی[1]۔ اہلِ سرحد

---

[1] وقائع میں ہے پینتیس چھتیس ہندوستانی اور چالیس پینتالیس قندھاری شہید ہوئے۔ دونوں جماعتوں کے زخمی تیس چالیس تھے۔ میرے نزدیک منظورہ کا بیان درست ہے، جس میں ہندوستانی شہدا کی تعداد تعین کے ساتھ "چھتیس" بتائی گئی ہے۔ اس کی تصدیق دوسرے ذریعے سے بھی ہوتی ہے۔ تفصیل آگے چل کر معلوم ہوگی۔

میں سے غالباً کسی نے بھی شہادت نہ پائی۔ اگر کوئی شہید ہوا تو اس کی کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔ ہندوستانی شہدا کے نام یہ ہیں:

۱۔ اللہ بخش خاں، امیر ساقۃ العسکر و امیر شبخون (موراواں، ضلع اناؤ۔ یو پی)
۲۔ شمشیر خاں جمعدار (" " ")
۳۔ شیخ رمضانی (" " ")
۴۔ عبدالجبار خاں (" " ")
۵۔ عبدالمجید خاں آفریدی (جہان آباد، رائے بریلی ")
۶۔ شیخ ہمدانی (خالص پور، ملیح آباد ")
۷۔ غلام حیدر خاں (" " ")
۸۔ غلام رسول خاں (" " ")
۹۔ اکبر خاں (" " ")
۱۰۔ منور خاں (" " ")
۱۱۔ علی حسن خاں (گنتہ۔ ضلع پرتاپ گڑھ ")
۱۲۔ شیخ معظم (جگدیش پور " ")
۱۳۔ کریم بخش (بڑھانہ، ضلع مظفر نگر ")
۱۴۔ میاں جی احسان اللہ (" " ")
۱۵۔ فہیم خاں (حسین پور " ")
۱۶۔ سید محمد (لہاری " ")
۱۷۔ عبدالرحمٰن (سیانلی " ")
۱۸۔ شادل خاں (خیر آباد، ضلع سیتا پور ")
۱۹۔ امام خاں (" " ")
۲۰۔ دین محمد (کورہرستانہ " ")
۲۱۔ عباد اللہ (مئو، ضلع جھانسی ")
۲۲۔ اولاد علی (راٹھ، ضلع ہمیر پور ")
۲۳۔ میرزا ہمایوں بیگ (لکھنؤ)

۲۴- جواہر خاں	(لکھنؤ)
۲۵- عبدالرزاق	(دیوبند، ضلع سہارن پور-یوپی)
۲۶- امام الدین	(رام پور " ")
۲۷- محمد کمال	(خرم پور " ")
۲۸- شیخ بڈھن	(وطن معلوم نہ ہو سکا غالباً یوپی)
۲۹- خدا بخش	(" " ")
۳۰- قاضی طیب	(" " ")
۳۱- غلام نبی	(گوالیار)
۳۲- شیخ مخدوم	(مسجد فتح پوری، دہلی)
۳۳- کریم بخش	(" ")
۳۴- شیخ باقر علی قاسم غلہ	(صادق پور، عظیم آباد، بہار)
۳۵- سید عبدالرحمن	(سندھ)
۳۶- حسن خاں	(")

ایک غلط فہمی کا ازالہ

عام سوانح نگاروں نے ہندوستانی شہدا کی تعداد سینتیس بتائی ہے، جو صحیح نہیں۔ اس عدد کی ابتدا مولوی محمد جعفر تھانیسری نے کی۔ ان سے دو غلطیاں سرزد ہوئیں: اوّل وہ نمبر ۳۳ (کریم بخش مسجد فتح پوری) کا نام اصل فہرست میں سے چھوڑ گئے۔ وجہ غالباً یہ ہوئی کہ انھوں نے کریم بخش بڑھانوی اور کریم بخش دہلوی کو ایک شخص سمجھ لیا۔ دوسرے انھوں نے برکت اللہ بنگالی اور حیات خاں بریلوی کو شہدائے اکوڑہ میں شامل کر لیا، حالانکہ وہ دونوں جنگ بازار میں شہید ہوئے تھے، جو قصبہ حضرو پر شبخون سے دوسرے دن دریائے اباسین کے کنارے پیش آئی تھی اور مولوی صاحب نے ان کی شہادت کا ذکر جنگ بازار کے سلسلے میں بھی کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سید صاحب نے جنگ بازار کے بعد جو پہلا مکتوب ہندوستان بھیجا تھا، اس میں اکوڑہ اور بازار کے شہدا کی فہرست یکجا درج کر دی ہوگی۔ یہی فہرست سوانح نگاروں نے جنگِ اکوڑہ کے سلسلے میں نقل کر دی۔

بہرحال جنگ اکوڑہ کے ہندوستانی شہدا چھتیس تھے، نہ کہ سینتیس۔ قندھاری شہدا کے نام اس لیے معلوم نہ ہو سکے کہ ہندوستان میں ان کے ناموں کی فہرست بھیجنی بے معنی تھی اور سید صاحب

کے دفتر میں جو ریکارڈ تھا، وہ جنگِ بالاکوٹ میں نذرِ آتش ہو گیا۔ ہندوستانی غازیوں میں سے جو زخمی ہوئے اُن میں سے مندرجہ ذیل کے نام معلوم ہو سکے:

۱۔ سید رستم علی (چل گاؤں) ان کی پنڈلی میں گولی لگی تھی[1]۔
۲۔ ابراہیم خاں خیر آبادی۔ ان کی کہنی پر گولی کا زخم تھا۔
۳۔ احمد (فتح پور ہسوہ) ان کے دونوں پاؤں مجروح ہو گئے تھے۔
۴۔ اکبر خاں، ان کی پشت پر تلوار کا زخم تھا۔
۵۔ امام الدین پانی پتی، ان کے سر پر تلوار لگی تھی۔
۶۔ پیر محمد۔
۷۔ شیخ ولی محمد پھلت (ضلع مظفر نگر)
۸۔ شیخ امجد علی غازی پوری۔
۹۔ قاضی حمایت اللہ۔
۱۰۔ برہان الدین۔
۱۱۔ خدا بخش منجھاؤں۔
۱۲۔ حافظ عبد الوہاب لکھنوی، جو شیخ باقر علی کے بعد قاسم غلہ مقرر ہوئے۔
۱۳۔ حمزہ علی خاں لہاری
۱۴۔ خدا بخش بنارسی
۱۵۔ حاجی عبد اللہ

ان میں سے اکثر جنگِ شیدو سے پیشتر تندرست ہو چکے تھے۔

سید صاحب کا مکتوب

"وقائع احمدی" اور "منظورة السعدا" کے علاوہ جنگِ اکوڑہ کے سرسری حالات سید صاحب کے دو خطوں میں مرقوم ہوئے: اوّل وہ خط جو پہلے پہل احوالِ جہاد کے متعلق ہندوستان بھیجا گیا۔ اس میں پشاور سے چارسدہ، پھر خویشگی اور نوشہرہ پہنچنے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سکھ لشکر اکوڑہ میں تھا، جو نوشہرہ سے سات کوس ہے۔ بیچ میں دریائے لنڈے حائل ہے:

---

[1] انھوں نے [illegible] میں بیعت کی تھی اور اس وقت عمر صرف پندرہ سولہ سال کی تھی۔

> مصلحتِ وقت چناں اقتضا کرد کہ جمعے از مجاہدین صادقین شبا شب از دریاے مسطور عبور کنانیدہ . . . . . . بر طریقِ شبخون روانہ ساختہ، چنانچہ مجاہدین محمود حین بر شب بستم شہر جمادی الاولیٰ ۱۲۴۲ھ ہجری قدسی . . . قریب صبح تاخت آوردند . . . . در آخر ہماں شب برسر غافلین دفعۃً رسیدند و توپ و تفنگ را معطل کنانیدہ کار و بار بہ سیوفِ قاطعہ رسانیدند . . . . بالجملہ بابے از ابواب فتوح برروے مجاہدین مفتوح گردید[۱]

مصلحتِ وقت کا تقاضا یہ ہوا کہ مجاہدین کی ایک جماعت کو راتوں رات دریا سے گزار کر شبخون کے لیے بھیجا جائے۔ چنانچہ اس جماعت نے ۱۰۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۲ھ کو حملہ کیا، رات کے آخری حصے میں غافلوں پر جا گرے۔ توپیں اور بندوقیں معطل ہو گئیں اور تلواروں کی لڑائی ہوئی بالجملہ مجاہدین کے لیے فتح کا ایک دروازہ کھل گیا۔

پھر امیر دوست محمد خاں کو ایک خط میں یہی حالات رقم فرمائے[۲]۔ مولانا عبدالحی سید صاحب سے چند ماہ بعد سرحد گئے تھے۔ انھوں نے بھی اپنے پہلے خط میں جنگِ اکوڑہ کا حال لکھا ہے میرزا عطا محمد خاں شکارپوری کے روزنامچے میں بھی سید صاحب کے مکتوب کی بنا پر اس جنگ کا ذکر آیا ہے۔

جنگِ اکوڑہ کے نتائج

اکوڑہ کا حملہ محض شبخون تھا۔ اگر بعض غازی جوشِ شجاعت میں شبخون کے حدود سے تجاوز نہ کرتے تو یقین ہے کہ ان کا نقصان بہت کم ہوتا[۳]۔ سکھوں کے نقصان کی نسبت روایات مختلف تھیں۔ ابتدا میں یہ افواہ تھی کہ کم و بیش ایک ہزار مارے گئے۔ سید صاحب نے اپنے مکتوب میں یہی تعداد درج کی۔ پھر امیر خاں خٹک نے اکوڑہ جا کر پوری تحقیقات کی اور بتایا کہ مقتولین کی تعداد سات سو سے کم نہ ہو گی۔ مجروحین اس سے کہیں زیادہ تھے۔

بدھ سنگھ کے پائے ثبات میں سخت تزلزل پیدا ہو گیا۔ وہ اکوڑہ سے ہٹ کر شیدو پہنچ گیا، جو تین میل جنوب میں ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ دریاے اباسین کو عبور کر کے اٹک چلا جائے، لیکن قلعہ دار اٹک نے یہ کہہ کر روکا کہ اگر سرحدی علاقے سے فوجیں ہٹا لیں تو اٹک خطرے میں پڑ جائے گا اور سید صاحب

---

[۱] منظورہ صفحہ (۳۱۵ ۔ ۳۲۰) [۲] مکاتیب سید صاحب صفحہ ۲۸۲ ۔ اس میں لکھتے ہیں کہ سکھوں میں سے ایک ہزار بلکہ زیادہ آدمی مارے گئے۔ [۳] مولانا عبدالحی بھی اپنے خط میں فرماتے ہیں: حکم یہ تھا کہ حملہ کر کے پلٹ آئیں لیکن بعض برگزیدگان لشکر نے اس حکم کا پورا خیال نہ رکھا۔

عام سرحدیوں کو لے کر یورش کر دیں گے تو مقابلہ مشکل ہو جائے گا۔ سکھوں میں سے ہر شخص کی زبان پر یہ بات تھی کہ ہم نے سید صاحب کے غازیوں جیسے جوانمرد نہ دیکھے، نہ سُنے[1] اہلِ سرحد پر فوری اثر یہ ہُوا کہ وہ جوق در جوق سید صاحب کے پاس پہنچ کر بیعت جہاد کرنے لگے اور ان کے جھنڈے تلے لڑنے کو باعث فخر سمجھنے لگے۔ حق یہ ہے کہ اجنبی تسلط سے نجات حاصل کرنے کی یہ واحد امید گاہ تھی[2]۔

---

[1] یہ افواہ ان لفظوں میں بیان ہُوئی کہ "سکھاں ایں چنیں مقاتلان دیدہ و شنیدہ نہ شدہ۔

[2] الفاظ یہ ہیں: بظہور ایں واقعہ مسلمینِ ایں دیار فراہم شدن شروع کردند۔ یار محمد خاں نے سید صاحب کے بارے میں سکھ قلعدار اٹک کو مراسلہ بھیجا تھا کہ عام افغان اور زمینداران یوسف زئی ساتھ ہو گئے ہیں۔ اٹک اور خیرآباد کے تھانیدار بھی برابر عرضداشتیں بھیج رہے تھے تاکہ مزید کمک پہنچے۔ چنانچہ رنجیت سنگھ نے اپنے بیٹے کو حکم دے دیا کہ توپخانہ، لشکر اور سرگروہ اصحاب کو لے کر اٹک جائے اور اس علاقے کا بندوبست کرے۔

تینتیسواں باب

واقعہ حضرو اور جنگ بازار

خوانین و عوام کا رجوع عام اہل سرحد نے سید صاحب کی تحریک جہاد کے خیر مقدم میں اگرچہ بظاہر ولولہ انگیز جوش و خروش کا اظہار کیا تھا، لیکن عملی تعاون کے لیے بہت کم لوگوں نے قدم بڑھائے تھے۔ ان کے تامل کی بڑی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ سید صاحب کے پاس جمعیت بہت کم تھی اور ساز و سامان بھی برائے نام تھا۔ اہل سرحد سمجھتے ہوں گے کہ جس قوت کا مقابلہ کابل و پشاور کے دونوں سردار باوجود فراوانی وسائل نہ کر سکے، اس کے سیل اقتدار کو سید صاحب کا مختصر سا بے سر و سامان قافلہ کیوں کر پیچھے ہٹا سکے گا؟ لیکن جنگِ اکوڑہ نے اکثر قلوب کو تذبذب اور بے یقینی کی آلائشوں سے پاک کر دیا اور چھوٹے بڑے سید صاحب کے ساتھ تعاون کے لیے تیار ہو گئے۔ ممتاز خوانین میں سے خادے خاں[1] رئیس ہنڈ[2] نے سبقت کی۔ وہ اونچے درجے کا سردار تھا اور اہل سمہ میں سب سے باجبروت خان سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد اشرف خاں رئیس زیدہ نے بیعت کی، جو خادے خاں کا قریبی رشتہ دار تھا۔

سید صاحب ہنڈ میں خادے خاں نے بیعت کے ساتھ ہی اصرار کیا کہ سید صاحب ہنڈ تشریف

---

[1] یہ فارسی کے نام شادی خاں کی پشتو شکل ہے۔ [2] ہنڈ بہت پرانا مقام ہے۔ اس کے مختلف تلفظ ہیں: ہنڈ (بکسر اول) ہَنڈ (بہ فتح اول)، ہُنڈ (بہ ضمہ اول)۔ پرانے زمانے میں اسے "اوہنڈ" اور "ویہنڈ" بھی کہتے تھے۔ پشکلاوتی (چارسدہ) کے بعد ہنڈ ہی گندھارا (یعنی سمہ، سوات، باجوڑ، بونیر وغیرہ علاقے) کا اہم مقام تھا۔ اٹک کی آبادی سے پہلے لوگ جنوب سے آگے بڑھ کر ہنڈ پر دریا کو عبور کرتے تھے۔ چینی سیاح یوان چوانگ (ہیون سانگ) بدھ مت کے قلمی نسخے لے کر واپس ہوا تھا تو دریا کو عبور کرتے وقت کئی قیمتی نسخے ضائع ہو گئے تھے، ان کی نقلیں یوان چوانگ نے ہنڈ ہی میں حاصل کی تھیں۔ سکندر نے بھی اسی جگہ سے دریا کو عبور کیا تھا۔ جلال الدین اکبر نے اس جگہ ایک مضبوط قلعہ بنوایا تھا جو اب تک باقی ہے۔ اٹک کو عروج ہوا تو ہنڈ کی اہمیت کم ہو گئی۔ یہ اٹک سے سترہ میل مشرق میں دریائے سندھ کے اس کنارے پر ہے جو سرحد کی جانب ہے۔

لے چلیں۔ وہاں آسائش کے تمام سامان بہ آسانی فراہم ہو سکیں گے۔ اُس وقت تک مجاہدین کے لیے کوئی مرکز تجویز نہیں ہُوا تھا۔ سید صاحب پشاور سے چارسدہ پہنچے، وہاں دو ہفتے گزار کر نوشہرے گئے۔ جنگ اکوڑہ کے بعد بھی وہیں مقیم تھے۔ ہنڈ اگرچہ موزون مرکز نہ تھا، اس لیے کہ عین سرحد پر واقع تھا۔ لیکن وہاں ایک مضبوط قلعہ موجود تھا اور جہاد کے ابتدائی دَور میں اس سے اچھا کام لیا جا سکتا تھا۔ نیز خادے خاں بااصرار ساتھ لے جا رہا تھا۔ کسی دوسرے مقام سے دعوت نہیں آئی تھی، اس لیے سید صاحب نے خادے خاں کی درخواست منظور فرمائی تاکہ ایک جگہ بیٹھ کر تنظیم کا کام باقاعدہ شروع کر دیں۔ زخمیوں کو آپ نے نوشہرہ سے اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ مولوی عبدالقیوم اور سید امانت علی کو اُن کی دیکھ بھال کے لیے مقرر فرمایا اور خود غازیوں سمیت نوشہرہ سے نکل کر مصری بانڈہ میں ٹھہرے، جو اکوڑہ کے عین سامنے دریائے لنڈے کے مشرقی کنارے پر ہے۔ وہاں سے نکلے تو تور ڈھیر میں دو راتیں گزاریں۔ وہیں خادے خاں چالیس سواروں کے ساتھ پیشوائی کے لیے پہنچ گیا۔ ان کے ہمراہ سید صاحب ہنڈ پہنچے۔ اگرچہ ہندوستانی اور قندھاری غازیوں کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہُوا تھا، لیکن اہل سرحد کی جمعیت بہت بڑھ گئی تھی۔ ہنڈ پہنچے تو سید صاحب کے قیام کے لیے موضع بازار تجویز کیا، جو ہنڈ کے مشرق میں قریباً ایک میل کے فاصلے پر لبِ دریا واقع تھا۔ وہیں رؤسا و خوانین اور عوام بیعت کے لیے آنے لگے۔

خادے خاں

خادے خاں نے جس طرح سید صاحب کے خیر مقدم میں پہل کی، اسی طرح مخالفت میں بھی سبقت اسی کی طرف سے ہُوئی۔ سرداروں کے علاوہ جو اشخاص سید صاحب کے لیے مشکلات پیدا کرنے کے باعث ہُوئے، ان میں خادے خاں سب سے پہلے آتا ہے۔ طبعاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ سید صاحب کی عقیدت میں ابتدائی جوش کی علت کیا تھی؟ آیا وہ واقعی مخلصانہ حاضر ہُوا تھا اور جہاد فی سبیل اللہ میں سبقت کا درجہ حاصل کر کے عنداللہ ماجور ہونا چاہتا تھا؟ آیا وہ اس غرض سے سید صاحب کو ساتھ لے گیا تھا کہ سرحد پر سکھوں کی ترکتازوں کا پہلا اہم مقام ہنڈ تھا اور اسے امید تھی کہ سید صاحب ہنڈ میں رہیں گے تو سکھ حملہ کرتے ہُوئے ہچکچائیں گے؟ آیا وہ سید کا مہماندار بن کر سرحد کے رؤسا و خوانین میں وجہ امتیاز حاصل کرنا چاہتا تھا؟ نیتوں کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ قرائن یہی ہیں کہ خادے خاں ابتدا میں مخلص تھا، مگر اس نے طبیعت ایسی پائی تھی کہ کسی دوسرے شخص کے اعتماد و اعتبار کی افزائش اُسے گوارا نہ تھی۔ فتح خاں رئیس پنجتار اور اشرف خاں رئیس زیدہ زیادہ نیک، نرم طبیعت اور مخلص تھے۔ انھیں سید صاحب کے نزدیک معزز دیکھا تو خادے خاں کے دل میں اک گونہ رنج پیدا ہُوا۔ پھر شرعی حکومت کے قیام پر خادے خاں کو از روئے انصاف بعض تصرفات سے دست کش ہونا پڑا تو وہ سید صاحب

کا دشمن بن گیا۔ یہ تفصیلات موقع پر پیش ہوں گی۔

حضرو پر چھاپے کی تجویز

سید صاحب باآزار ہی میں مقیم تھے، جب حضرو پر چھاپے کا واقعہ پیش آیا۔ اس واقعے کو سید صاحب کے مجاہدات سے اصلاً کوئی تعلق نہ تھا،[1] لیکن اس کے ضمن میں ایک چپقلش پیش آگئی، اس لیے حضرو کے چھاپے کا کچھ حال بیان کر دینا ضروری ہے۔

اہل سرحد اگرچہ جہاد کے لیے فراہم ہونے لگے تھے تاہم انھیں سید صاحب کی تحریک کے مقاصد عالیہ یعنی جہاد کے شرعی اصول و ضوابط سے قطعاً آگاہی نہ تھی۔ ان کے نزدیک جہاد کا مضمون محض یہ تھا کہ جہاں جی چاہا چھاپا مارا، روپیہ یا سامان لوٹا اور چلے آئے۔ حضرو[2] آج بھی بڑا تجارتی قصبہ ہے۔ سید صاحب کے زمانے میں شمالی ہند کی تجارت کا ممتاز مرکز تھا۔ اور وہاں دولت مند تاجر رہتے تھے۔ سکھوں سے اہل سرحد کی محاربت مدت سے جاری تھی اور ان کے علاقے میں کسی مقام پر چھاپا مارنا شرع و قانون کے اعتبار سے ناجائز نہ تھا۔ خود سکھوں کی بھی یہی حالت تھی کہ جب موقع پاتے حملے کر لیتے اور جو چیز ہاتھ لگتی اٹھا کر لے جاتے۔ سید صاحب دشمن کی جنگی قوت یا امن و نظم کو نقصان پہنچانے کے لیے تو چھاپے مار سکتے تھے، صرف لوٹ مار کی غرض سے چھاپے مارنا نہ انھیں پسند تھا، نہ ان میں شرکت فرما سکتے تھے اور نہ یہ چھاپے ان مقاصد کے لیے مفید تھے، جو سید صاحب کے پیش نظر تھے۔

سرحدیوں نے خود حضرو پر چھاپے کی سکیم تیار کی۔ جب یہ سکیم سید صاحب کی خدمت میں پیش کی گئی تو آپ کے ارشاد کے مطابق اخوند ظہور اللہ نے پشتو میں اہل سرحد پر واضح کر دیا کہ ہندوستانی غازی اس ملک میں نووارد ہیں اور یہاں کے رسم و راہ سے واقف نہیں نیز ان کی خاصی تعداد جنگ اکوڑہ میں شہید و مجروح ہو چکی ہے؛ لہٰذا وہ چھاپے میں شریک نہ ہوں گے۔ آپ لوگ تمام مراسم سے آگاہ ہیں، جو چاہیں کریں۔ چنانچہ ہندوستانیوں غازیوں میں سے ایک بھی اس چھاپے میں شریک نہ ہوا۔ قندھاریوں میں تیس چالیس آدمی تیار ہو گئے۔ سید صاحب نے اس شرط پر اجازت دی کہ کسی مسلمان کو ان کے ہاتھ سے گزند نہ پہنچے۔

چھاپا

غرض رات کے ابتدائی حصے میں اہل سرحد کی ایک بڑی جماعت نے، جن میں قندھاری بھی

---

[1] افسوس کہ عام سوانح نگار اس بے تعلقی کا پورا اندازہ نہ کر سکے، اگرچہ سب نے لکھا کہ سید صاحب نے حضرو کے چھاپے میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ [2] حضرو علاقہ چھچھ ضلع کیمبل پور کا مشہور مقام اور دریائے اباسین سے قریباً چھ سات میل کے فاصلے پر ہے۔ تمباکو کی بہت بڑی منڈی ہے اور یہاں کی نسوار پاک و ہند میں اوّل درجے کی مانی جاتی ہے۔

شامل تھے، کشتیوں، جالوں اور شناسوں[1] کے ذریعے سے دریا کو عبور کیا۔ پھر جمع ہو کر حضرو پر بڑھے۔ وہاں ایک گڑھی تھی، جس میں سکھ سپاہی رہتے تھے، ایک توپ بھی تھی، چھاپے کی تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں، صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ قندھاریوں نے جاتے ہی گڑھی پر قبضہ کر لیا۔ اہل سرحد منڈی لوٹنے میں مشغول ہو گئے، جن لوگوں نے مقابلہ کیا، وہ مارے گئے۔ خود سید صاحب کے اندازے کے مطابق مقتولین چار سو سے کم نہ ہوں گے[2]۔ طلوع سحر سے پہلے پہلے سب لوگ سامان اٹھا کر دریا کے کنارے پہنچ گئے۔

سید صاحب صبح کی نماز ادا فرما چکے تو ایک شخص نے نہایت عمدہ گھوڑا بطور نذر پیش کیا جو زیور سے مزین تھا۔ آپ نے گھوڑا اسی کو دے دیا۔ کچھ غازی بھی نماز سے فارغ ہو کر دریا کے کنارے جمع ہو گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ دوسرے کنارے کے آس پاس اہل سرحد سامان کی گٹھڑیاں اٹھائے ہوئے قطار در قطار چلے آ رہے ہیں۔ قندھاری سب کے پیچھے تھے اور ان کے پاس کوئی سامان نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے قندھاری ان کے پیچھے پیچھے چلے تا کہ عقب سے حملہ آوروں کی روک تھام کر سکیں۔

سکھ سواروں کی یورش

دفعۃً عقب سے پندرہ بیس سکھ نمودار ہوئے اور قندھاریوں پر بندوقیں سر کیں۔ قندھاری پاس کے خشک نالے میں مورچے پکڑ کر ٹھہر گئے اور گولیوں کا جواب گولیوں سے دینے لگے۔ سوار رک گئے۔ اہل سرحد نے یہ حالت دیکھی تو یورشیوں کے مقابلے میں قندھاریوں کا ساتھ دینے کے بجائے سامان اٹھا کر سراسیمہ وار دریا کی طرف دوڑ پڑے تا کہ جلد سے جلد پار پہنچ جائیں جو لوگ دریا پر پہنچ چکے تھے انھوں نے کشتیوں یا جالوں کا انتظار بھی نہ کیا، سامان کے ساتھ پانی میں کود پڑے۔ ان میں سے خاصی تعداد غرق ہو گئی۔ قندھاری پورے اطمینان و تنظیم سے دشمن کے سواروں کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس اثنا میں مزید پانسو سکھ سوار موقع پر آ پہنچے۔

اہل سرحد کے لیے زیبا یہ تھا کہ مال اسباب کو چھوڑ کر پہلے دشمن کو بھگاتے، پھر دلجمعی سے کشتیوں یا جالوں میں بیٹھ کر دریا کو عبور کرتے۔ انھوں نے اس اہم مصلحت کو نظر انداز کر کے صرف سامان کو بچانے کا خیال رکھا۔ اس سراسیمگی میں بعض کی جانیں بھی گئیں اور سامان بھی گیا۔

سید صاحب کو یہ حالات معلوم ہوئے تو حکم دے دیا کہ تمام غازی ہتھیار باندھ کر کنارۂ دریا پر پہنچ جائیں

---

[1] سرحد میں عبور دریا کے لیے کئی چیزیں استعمال ہوتی تھیں: جالا ایک بڑا ٹوکرا ہوتا تھا۔ جسے چمڑے سے منڈھ لیا جاتا تھا تاکہ پانی اس میں نفوذ نہ کر سکے۔ شناس مشکیزے کو کہتے ہیں، جس میں ہوا بھری جاتی ہے اور اسے بغل میں دبا کر تیرتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔

[2] مکاتیب سید صاحب صفحہ ۲۸۳۔

خادے خاں سے کہا کہ اپنے آدمی قندھاریوں کی امداد کے لیے تیار کر دیجیے۔ سید انور شاہ امرت سری کو ان کا قائد مقرر کر کے ہدایت فرما دی کہ آپ فوراً دریا سے پار اُتر کر قندھاریوں کو کمک پہنچائیں۔

غازیوں کی پامردی

سید انور شاہ پچاس ساٹھ آدمیوں کو لے کر کشتی کے ذریعے سے دریا کے پار پہنچے اور قندھاریوں کے برابر مورچے جما کر لڑنے لگے۔ اگرچہ سید صاحب نے غازیوں کو ساتھ جانے کا حکم نہیں دیا تھا، صرف یہ حکم تھا کہ وہ کنارۂ دریا پر ٹھہرے رہیں، مگر بعض غازی جوشِ شجاعت میں اس خیال سے سید انور شاہ کے ساتھ ہو گئے کہ جب مقصود محض یہ تھا کہ قندھاریوں کو کمک پہنچانا ہے تو کیوں نہ اس سلسلے میں سبقت کا درجہ حاصل کریں ان میں سے جن اصحاب کے اسمائے گرامی وقائع نگاروں نے محفوظ رکھے، وہ یہ تھے: حیات خاں بریلوی، شیخ فیض الدین بنگالی، شیخ برکت اللہ بنگالی، محمد صالح[1] سندھی اور شیخ نظام الدین "اولیا"۔ اس گروہ غزاۃ نے سکھوں پر زور زور سے باڑھیں ماریں اور تھوڑی ہی دیر میں انھیں بھگا دیا۔ غازیوں میں سے حیات خاں بریلوی اور شیخ برکت اللہ بنگالی شہید ہو گئے، شیخ فیض الدین بنگالی، محمد صالح سندھی اور شیخ نظام الدین "اولیا" زخمی ہوئے۔

سکھ سوار بھاگ نکلے تو سید صاحب کے حکم سے غازیوں کے لیے کشتیاں بھجوا دی گئیں۔ وہ سوار ہو رہے تھے کہ سکھ سوار تھوڑی دور سے پلٹ آئے۔ اس مرتبہ شاہینیں بھی ان کے پاس موجود تھیں، جن کے گولے موضع بازار کی سمت کے کنارے پر آنے لگے۔ سید صاحب بھی دریا پر پہنچ گئے تھے وہاں کوئی اوٹ نہ تھی۔ سکھوں کے گولے اور گولیاں پے بہ پے آ رہی تھیں۔ ہر غازی سید صاحب کے لیے فکرمند تھا۔ بعض نے بے تاب ہو کر عرض کیا کہ آپ پیچھے چلے جائیں یا ہمیں آگے آنے دیں اور ہماری اوٹ میں قیام فرمائیں۔ سید صاحب نے اطمینان سے فرمایا: یہ نہیں ہو سکتا آپ سب بھائی میرے پیچھے ہو جائیں۔

غرض جب تک حملہ آور سکھ شکست کھا کر واپس نہ چلے گئے اور تمام غازی بازار نہ پہنچ گئے، سید صاحب دریا کے کنارے پر ٹھہرے رہے۔ اس کشمکش میں سارا دن گزر گیا۔ سید انور شاہ نے تمام غازیوں کے بعد دریا عبور کیا اور مغرب کے وقت بازار پہنچے۔

مال غنیمت کی تقسیم پر جھگڑا

اہل سرحد جو مال غنیمت لائے تھے، خادے خاں نے بطور خود حکم دے دیا کہ وہ سب ایک جگہ جمع کر دیا جائے تاکہ اسے سید صاحب کے فرمان کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ بعض لوگوں نے خان کا یہ حکم تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر گرم گفتاری

---

[1] "وقائع" میں ان صاحب کا نام "محمد صلاح" مرقوم ہے۔

بلکہ کشمکش کی صورت پیدا ہو گئی۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، وہ لوگ اصول و مقاصد جہاد سے بالکل بے خبر تھے۔ ان کے سامنے مال فراہم کرنے کے سوا کوئی غرض نہ تھی۔ سید صاحب کے لیے اہل سرحد کے عادات و خصائل کا یہ دوسرا تلخ تجربہ تھا۔ پہلا تجربہ اکوڑہ کے شبخون میں ہو چکا تھا۔ اس طرح اندازہ ہو گیا کہ ان لوگوں کو ایک نظام میں لانا اور مقاصد جہاد کی تعلیم دینا کتنا ضروری ہے۔ اس موقع پر ختم تنازع کے لیے یہی مناسب سمجھا گیا کہ جو کچھ جس کے پاس ہے، اُسی کے پاس رہنے دیا جائے۔ چنانچہ سید صاحب نے اخوند ظہور اللہ کی معرفت خادے خاں کو پیغام بھیجا کہ اپنا حکم واپس لے لیجیے اور مال غنیمت کی از سر نو تقسیم کا سوال نظر انداز کر دیجیے۔ اس طرح جھگڑا ختم ہُوا۔

سکھوں کی دُوسری یورش

مولوی الٰہی بخش رام پوری فرماتے ہیں کہ حضرو کے چھاپے سے دو تین روز بعد پھر دو تین ہزار سکھ دریا کے بائیں کنارے پر جمع ہو گئے۔ ان کے پاس چھ شاہینیں تھیں، جنھیں ابتدا میں مخفی رکھا۔ جب غازی مقابل کے کنارے پر جمع ہو گئے تو اچانک شاہینیں چلنی شروع ہوئیں۔ سید صاحب نے کشتیوں کی فراہمی کا حکم دے دیا تاکہ غازی دریا سے پار اُتر کر سکھوں سے جنگ کریں۔ اشرف خاں رئیس زیدہ نے عرض کیا کہ اس سکھ لشکر سے مقابلے کی اجازت مجھے دی جائے۔ البتہ تھوڑے سے ہندوستانی غازی بطور تیمن ساتھ کر دیجیے۔ سید صاحب نے پاسبانوں اور پہرہ داروں کے سوا سب غازیوں کو اشرف خاں کی معیت کا حکم دے دیا۔ اکثر سرحدی لوگ شاہینوں کے گولے دیکھتے ہی منتشر ہو گئے اور اشرف خاں کی کوئی سعی انھیں مجتمع نہ رکھ سکی۔ ایک گولہ سید متا سندھی کے لگا اور وہ شہید ہو گئے۔

ملکیوں میں نیک دل اور بہادر آدمی بھی تھے۔ ایک ملکی کمال مردانگی سے تنہا آگے بڑھا اور مشک بغل میں دبا کر بے تکلف دریا میں کُود پڑا۔ اکبر خاں غازی کو سید صاحب نے ایک دستار عطا کر رکھی تھی، جو بہت قیمتی تحفہ تھی۔ غازی نے یہ دستار اپنے سر سے اتار کر ملکی مجاہد کے سر پر رکھ دی اور کہا کہ آج سید صاحب کی دستار کا مستحق تجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ اس کا پٹکا لے کر اپنے سر پر لپیٹ لیا۔ پچاس ساٹھ اور ملکی اس کے پیچھے روانہ ہو گئے[1]۔ انھوں نے وسط دریا سے سکھوں پر گولیاں چلائیں۔ مقابلے کا جوش و خروش دیکھ کر سکھ تیزی سے واپس چلے گئے۔

مولانا عبدالحی اس وقت تک ہندوستان میں تھے۔ کئی مہینے بعد وہ سرحد پہنچے تو پہلی جنگوں

---

[1] روایت میں ہے "پنجاہ و شش خنگ سوار" خنگ شناس کو کہتے ہیں یعنی ہوا بھرا مشکیزیں۔

کے حالات سُنے۔ اپنے ایک مکتوب میں انھوں نے بھی جنگ باآنار کا ذکر اجمالاً کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضرو پر چھاپا مارنے والوں کو واپسی میں نکبت پہنچی۔ ان پر سکھوں نے حملہ کر دیا۔ بعض دریا میں غرق ہو گئے۔ غازیوں نے یہ دیکھا تو سید صاحب سے عرض کیا کہ کلمہ گو گروہ تلف ہو رہا ہے۔ جو کشتیاں ہمارے قبضے میں ہیں، وہ اس وقت تک دوسرے کنارے پر نہیں پہنچائی جا سکتیں جب تک ہم ان کی حفاظت کے لیے اس طرف نہ کھڑے ہو جائیں۔ سید صاحب نے یہ درخواست قبول فرما لی اور تیاری کے بغیر غازیوں کو لے کر کنارۂ دریا پر جا کھڑے ہوئے۔ یہ دیکھتے ہی دشمن بھاگ گئے۔

چونتیسواں باب

بیعت امامتِ جہاد

ضرورتِ نظم و مرکزیت

اکوڑہ اور بازار کی لڑائیوں سے یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ اہل سرحد میں نظم و جمعیت قطعاً موجود نہیں، اور نہ اُن کے سامنے دینی مقاصد ہیں۔ وہ مال اسباب کے دالہ و شیفتہ تھے۔ سید صاحب کا ساتھ دیتے تو اس لیے نہیں کہ ان بلند اغراض کے لیے جانیں لڑائیں، جن کی خاطر آپ وطن عزیز سے نکل کر سرحد پہنچے تھے۔ محض مال کی غرض سے معیت اختیار کرتے۔ جب مال مل جاتا تو رزم و پیکار کی ہر مصلحت سے بے پروا ہو کر گھروں کی راہ لیتے۔ انھیں بھیڑ یا انبوہ تو کہا جا سکتا تھا، "جماعت" نہیں کہا جا سکتا تھا۔ جس کے لیے مختلف افراد میں وحدت فکر و عمل اور وحدت مقاصد ضروری ہے۔ اس قسم کے حالات کسی بڑے نصب العین کی تکمیل کے لیے کیوں کر سازگار سمجھے جا سکتے تھے؟ ضروری تھا کہ ان لوگوں کی تنظیم و تربیت کا بندوبست کیا جاتا۔ یہ کام ایک مرکز اطاعت و انقیاد کی تاسیس کے بغیر شروع نہیں کیا جا سکتا تھا۔

پھر وہاں مختلف خوانین و رؤسا تھے، جن میں باہم رقابتیں بھی تھیں۔ جب تک ان کی رضامندی سے ایک مرکزی نظام کا بندوبست نہ ہو جاتا، انھیں ایک جھنڈے کے نیچے کیوں کر جمع کیا جا سکتا تھا؟ وہ ایک جھنڈے کے نیچے جمع نہ ہوتے تو علاقہ سرحد کی آزادی کے تحفظ اور منصوبہ بلاد اسلامیہ کی بازیافت کے لیے نتیجہ خیز جدوجہد کی کیا امید ہو سکتی تھی؟

فتح خاں پنجتاری کی بیعت

سید صاحب جنگ بازار کے بعد، ہنڈ کے شمال میں ایک تالاب پر مقیم ہو گئے تھے، وہیں علماء و خوانین اور عوام ملاقات و بیعت کے لیے آتے تھے۔ اسی مقام پر خدو خیل کے رئیس فتح خاں پنجتاری نے بیعت کی اور عرض کیا کہ پنجتار تشریف لے چلیں۔ سید صاحب تیار ہو گئے۔ وہ فتح خاں کے اخلاص سے بھی متاثر ہوئے ہوں گے۔ پنجتار کو موقعیت کے لحاظ سے بھی زیادہ موزوں مرکز سمجھا ہو گا اس لیے کہ وہ پہاڑوں کے بیچ میں محفوظ مقام تھا اور سکھوں کی عام یورش گاہوں سے ہٹا ہوا تھا۔ ہنڈ میں رہنا سید صاحب کو اس وجہ سے بھی مناسب نظر نہیں آتا تھا کہ یہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہو گیا تھا، بعض خوانین سے خادے خاں کے تعلقات خوشگوار

تھیں اور وہ ہنڈ میں آنے سے ہچکچاتے تھے۔ خادے خاں کو سید صاحب کے قصدِ پنجتار کا علم ہوا تو اس نے بے تابانہ عرض کیا کہ میں فرمانبردار ہوں، آپ ہنڈ ہی میں قیام فرمائیں۔ جس جس خان یا رئیس کو بلانا منظور ہوگا، میں یہیں بلالوں گا۔[1]

فتح خاں پنجتاری اس وجہ سے خوانینِ سرحد میں ممتاز ہے کہ اُس نے سید صاحب کے ساتھ جو عہد باندھا تھا، اُسے نباہنے اور پورا کرنے میں سب پر فوقیت لے گیا۔ اگرچہ آخر میں ایک موقع پر اس کے قدم بھی ڈگمگا گئے۔ نیز اس کا مقام پنجتار برسوں سید صاحب کا مرکز بنا رہا اور آپ نے اپنی مجاہدانہ زندگی کے زیادہ تر اوقات اسی مرکز میں گزارے۔ اس کے بعد خوانینِ سرحد میں سے جس شخصیت نے سید صاحب کی اعانت و یاوری کا حق ادا کیا، وہ اشرف خاں رئیس زیدہ تھا۔ افسوس کہ اس کی عمر نے وفا نہ کی۔ اُس کے بیٹوں میں سے فتح خاں اور ارسلا خاں برابر سید صاحب کے وفادار رہے۔

فیصلہ امامتِ جہاد

علماء و خوانین کے ساتھ گفتگو برابر ہوتی رہتی تھیں کہ کاروبارِ جہاد کی تنظیم کے لیے کیا بندوبست کیا جائے۔ سید صاحب کی جماعت میں سے شاہ اسماعیل ان گفتگوؤں میں زیادہ تر حصہ لیتے رہے۔ اس مسئلے کے شرعی اور انتظامی پہلو خوب واضح ہو گئے تو علماء و خوانینِ سرحد نے یہ فیصلہ کیا کہ جہاد کے لیے ایک امیر یا امام کا انتخاب ضروری ہے اور اس منصبِ جلیل کے لائق صرف سید صاحب ہیں، اس لیے بھی کہ ان میں امامت کی تمام شرطیں موجود ہیں اور اس لیے بھی کہ وہی ہیں، جن پر تمام رؤسا و خوانین اور علماء و عوام کے زیادہ سے زیادہ حصے کا اتفاق ہو سکتا ہے چنانچہ ۱۲۔ جمادی الاخری ۱۲۴۲ھ (۱۱۔ جنوری ۱۸۲۷ء) کو جمعرات کے دن ہنڈ کے تالاب کے کنارے "سادات کرام، علماء عظام، مشائخ ذوی الاحترام، امرائے عالی مقام و سائر خواص و عوام" نے سید صاحب کے ہاتھ پر امامتِ جہاد کی بیعت کر لی۔ اس سے اگلے روز نمازِ جمعہ کے خطبے میں سید صاحب کا اسم گرامی شامل ہو گیا۔ ہندوستانی غازی پہلے سے آپ کو "امیر المومنین" کہتے تھے۔ اہلِ سرحد نے آپ کو "سید بادشاہ" کا لقب دے دیا۔ سکھ بول چال اور خط و کتابت میں آپ کے لیے "خلیفہ صاحب" کی اصطلاح استعمال کرتے تھے۔

بیعت کی حیثیت

میں سید صاحب کی امامت و امارت کے تمام پہلو قبل ازیں واضح کر چکا ہوں۔ ان مطالب کو دہرانے کی ضرورت نہیں، تاہم یہ حقیقت پھر ایک مرتبہ

---

[1] منظورہ صفحہ ۳۱۵۔

ٹھیک ٹھیک ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ امامت کے بعد سید صاحب کو صرف کاروبارِ جہاد کی تنظیم کے لیے مختار بنایا گیا تھا، رؤسا و خوانین کے عام امورِ ریاست و خانیت سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ دعوت کے ذریعے سے لوگوں میں جہاد کے جذبے کو اُبھار سکتے تھے۔ انھیں دینی واجبات سمجھا سکتے تھے جن جن رئیسوں نے بیعت کی تھی، ضرورت کے مطابق ان سے امداد طلب فرما سکتے تھے۔ میدانِ جنگ میں سب لوگ ان کی تنظیمات قبول کرنے پر مجبور تھے، لیکن میدانِ جنگ سے باہر آتے ہی سب اپنے اپنے علقوں میں بالکل آزاد تھے۔ موجودہ زمانے کی عام اصطلاح میں یوں سمجھ لینا چاہیے کہ جہاد کی غرض سے تمام عناصر کو یکجا رکھنے کے لیے یہ ایک نوع کی کنفڈریسی یعنی عوام و خوانین و رؤسا کا وفاق و اتحاد بن گئی تھی، جس کے رئیسِ اعلیٰ سید صاحب تھے۔

بلاشبہ اس وفاق میں استحکام و پختگی کی وہ روح موجود نہ تھی جو ایک بلند پایہ نظام میں ہونی چاہیے مگر یہ سروسامانِ جہاد کی ابتدا تھی۔ طوع و رغبت اور دعوت و ارشاد پر انحصار کے سوا چارہ نہ تھا۔ اگر تمام خانیوں اور ریاستوں کو ختم کر کے سارے علاقوں کو ایک حکومت میں منضبط کرنے کا سوال اٹھایا جاتا تو فوراً باہمی رزم و پیکار کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور اصل مقصد کے لیے کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے ہی پوری متاعِ عمل ختم ہو جاتی۔ سید صاحب فتح کی صورت میں مختلف رؤسا کے ساتھ عطائے ملک و جاگیر کے وعدے بھی فرماتے رہے۔ تالیفِ قلوب کا طریقہ یہی ہو سکتا تھا، لیکن آپ نے ہر وعدہ دو شرطوں سے مشروط رکھا: اوّل یہ کہ ملک و جاگیر پانے والے شخص کا نظامِ حکومت خالصتاً اسلامی ہوگا اور وہ اپنے حلقے میں شریعتِ حقہ کے احکام بالاہتمام رائج کرے گا۔ دوم یہ کہ مال و قوت کا ایک مناسب حصہ دواماً جہادِ عمومی کے لیے وقف رکھے گا۔

دعوتِ عام

اس انتظام کے بعد سید صاحب نے جہاد کے لیے دعوتِ عام کا انتظام کیا۔ تمام رؤسا و اُمراء اور ملوک و سلاطین کو باقاعدہ خطوط ارسال کیے۔ بعض کے پاس سفارتیں بھیجیں۔ ہندوستان کے تمام دوستوں اور محبّوں کو بھی خط لکھے۔ ایک خط میں فرماتے ہیں:

> کام کا وقت سر پر آ پہنچا . . . . پس ہر راسخ الاعتقاد مومن اور ہر اطاعت گزار مسلم کے لیے لازم ہے کہ جس طور بھی ممکن ہو، فقیر کے پاس پہنچ کر جماعتِ مجاہدین میں منسلک ہو جائے۔ اگرچہ حق جل و علا اپنی قدرتِ کاملہ سے خود اس مقدمے کو منزلِ تمام پر پہنچائے گا۔ اس کا اپنا ارشاد ہے: كذلك حق علينا نصر المومنين اور دینِ محمدی کو اپنے وعدے کے مطابق تمام ادیان پر غلبہ عطا کرے گا، لیکن جو شخص اپنی جان اس

معرکے میں حاضر کرے گا، وہ سعادت جاودانی پائے گا اور جو آج اس مقدمے میں سستی اختیار کرے گا، وہ قیامت کے دن افسوس و ندامت میں مبتلا ہو گا۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں:

> یہ محمود زمانہ اور یہ مبارک وقت مخلصوں کے اخلاص اور مومنوں کے یقین کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو بہار کو گل و بلبل کے تعلق میں اور برسات کو درختوں یا دوسری نباتات کے تعلق میں حاصل ہوتی ہے۔ اہل اخلاص کا اخلاص اور اہل یقین کا یقین عمل میں نمایاں ہونا چاہیے۔ جو پھول موسم بہار میں نہ کھلا، اسے کانٹے کے برابر سمجھنا چاہیے۔ جو فصل برسات میں نہ اُگی اس کے درو کی امید ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانی چاہیے۔ جو درخت فصل ربیع میں سرسبز نہ ہُوا، اُسے ہیزم خشک کی طرح جڑ سے کاٹ ڈالنے کے سوا چارہ کیا ہے؟

امامت اور بورڈ

سید صاحب کی امامت پر ان کے زمانے میں جو اعتراضات ہُوئے تھے، مَیں ان کی حقیقت پہلے بیان کر چکا ہُوں۔ ہمارے عہد میں مولانا عبید اللہ مرحوم نے اعتراض کا بالکل نیا زاویہ نگاہ ایجاد فرمایا اور وہ یہ کہ شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی نے اپنے بعد ایک شخص میں امامت کی صلاحیت نہ پائی تو فرائض امامت کی بجا آوری کے لیے دو بورڈ مقرر فرما دیے۔ عسکری امور کے لیے سید احمد کو امیر، مولانا عبدالحی اور شاہ اسماعیل کو مشیر بنایا، تنظیمی امور کے لیے شاہ محمد اسحاق کو امیر اور شاہ محمد یعقوب کو ان کا شریک قرار دیا۔[1]

اس بنیادی توضیح کے ساتھ ساتھ مولانا فرماتے ہیں:

۱۔ ہند میں سید صاحب کی امامت پر اجماع ہُوا، وہی اختلافات کا سرچشمہ بن گیا[2] اگر معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہوتا تو ہم افغانوں کا امیر افغان کو بناتے اور اسے امیر شہید (سید احمد) کے بورڈ کا ممبر بنا دیتے۔[3]

۲۔ مولانا عبدالحی جب تک زندہ رہے، کوئی فتنہ نہ اُٹھا، اس لیے کہ سید احمد اپنی ذاتی رائے پر عمل نہیں کر سکتے تھے، بلکہ اجتماعی فیصلہ حکومت کر رہا تھا۔[4] مولانا موصوف کی

---

[1] شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک صفحہ ۱۵۲-۱۵۳۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۱۶۔ [3] ایضاً صفحہ ۱۴۵

[4] ایضاً صفحہ ۱۵۶-۱۵۷۔

وفات کے بعد تحریک میں بنیادی تغیر پیدا ہوگیا۔ ماورائے سندھ کا مرکز (سید صاحب کا مرکز) مستقل بن گیا۔ دہلی کے مرکز سے اس نے سرکشی اختیار کرلی۔ حزب ولی اللہ کی حکومت کا طریقہ بورڈ کی حکومت سے شخصی امامت (ڈکٹیٹر شپ) میں تبدیل ہوگیا۔ اس طرح امیر شہید (سید صاحب) امیر المومنین اور دنیائے اسلام کے مصلح خلیفہ مانے گئے[1]

آخر میں فرماتے ہیں کہ سید صاحب کو کشف و کرامات کا مالک بنا کر ساری جماعت کا امام تسلیم کرایا گیا، حالانکہ اصل امام شاہ عبدالعزیز تھے۔ سید صاحب جماعت کے ایک سپاہی تھے۔ ان کی بندگی میں مولانا عبدالحی اور شاہ اسماعیل کا اشتراک ہے۔ شاہ اسحاق روپیہ بھیجتے تھے۔ یہ تمام اصحاب شاہ عبدالعزیز سے تربیت یافتہ تھے۔

> یہ سارا کام امام عبدالعزیز کا تھا۔ انھوں نے آدمی تیار کیے، پروگرام بنایا اور کام شروع کیا۔ پھر غلطیاں اس قدر ہوئیں کہ ان کا لازمی نتیجہ شکست تھا[2]

حقیقت حال ان اعتراضات پر مفصل بحث کی ضرورت نہیں اور اُن کا مدار سراسر قیاس ہے یا یہ خواہش کہ ایسا ہونا چاہیے تھا۔ شاہ ولی اللہ کے پورے خاندان اور خود سید صاحب کے متعلق جو مکتوب و مطبوعہ ذخیرۂ معلومات اب تک میری نظر سے گزرا ہے اس میں محولہ بالا قیاس آرائیوں کے لیے بعید سا اشارہ بھی موجود نہیں اور خود مولانائے مرحوم نے بھی کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔

ذرا غور کیا جائے تو ان دعاوی کی بے حقیقتی خود بخود آشکارا ہو جاتی ہے۔ مثلاً:

۱ - مئی ۱۸۱۹ء کے بعد سید صاحب اور شاہ عبدالعزیز میں کوئی ملاقات نہ ہوئی، یہاں تک کہ شاہ صاحب ۱۸۲۴ء میں واصل باللہ ہو گئے۔ اس سے دو برس بعد سید صاحب جہاد کے لیے نکلے۔ مجھے یقین ہے کہ شاہ صاحب کی زندگی میں یہ فیصلہ بھی نہیں ہوا تھا کہ جہاد کا آغاز کہاں سے ہو۔

۲ - ۱۸۲۷ء میں بیعت امامت کا سارا انتظام شاہ اسماعیل نے کیا تھا۔ مولانا عبدالحی چند ماہ بعد سرحد پہنچے تو انھوں نے بھی خوشی اور رضامندی سے اسے قبول کرلیا، گویا یہ ان کی آرزوؤں کے مطابق تھا۔ مگر یہ سب کچھ مولانا عبید اللہ کے قول کے مطابق شاہ عبدالعزیز کے مقررات کے مطابق

---

[1] شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک صفحہ ۱۵۸ - ۱۵۹ - [2] ایضاً صفحہ ۱۶۳ - ۱۶۴

نہ تھا تو شاہ صاحب کی ہدایات کو پس پشت ڈالنے کے ذمہ دار اُن کے گھر کے دو آدمی تھے، جنھیں مشیر بنایا گیا تھا، نہ کہ سید صاحب۔

۳ - عجیب بات یہ ہے کہ نہ سید صاحب کی امامت کی حیثیت وہ تھی، جو مولانا نے فرض فرمالی، نہ امامت کی وجہ سے کوئی جھگڑا پیدا ہُوا۔ نہ سید صاحب نے کبھی کسی معاملے میں خود رائی سے کام لیا۔ ان کے تمام کاموں کے لیے شروع ہی سے ایک مجلس شوریٰ موجود تھی۔ اس میں مولانا عبدالحی، شاہ اسماعیل اور متعدد دوسرے ذی رائے اصحاب شامل رہے۔ ہر چھوٹی بڑی بات کے متعلق باہم مشورے ہوتے تھے۔

۴ - یہ بھی صحیح نہیں کہ روپیہ شاہ محمد اسحاق بھیجتے تھے۔ یوں کہیے کہ روپیہ جمع ہونے کے جو مرکز تھے، ان میں سے ایک مرکز دہلی میں تھا، جس کا ذمہ دار شاہ اسحاق کو بنایا گیا تھا، لیکن جگہ جگہ دوسرے مرکز بھی تھے۔ سید صاحب کے قاصد بھی وقتاً فوقتاً آتے رہتے تھے، جو روپیہ لے جاتے تھے۔ ہنڈیوں کے ذریعے سے بھی مختلف مرکزوں سے روپیہ بھیجا جاتا تھا[1]۔

۵ - بلاشبہ ایک ہنڈی کا روپیہ سید صاحب کو وصول نہ ہُوا تو شاہ اسحاق نے دعویٰ کرکے ڈگری حاصل کرلی۔ اس بنا پر یہ نکتہ پیدا کیا گیا کہ اگر روپیہ روانہ کرنے کا انتظام شاہ صاحب کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو وہ نہ دعویٰ کرسکتے اور نہ ڈگری لے سکتے[2]۔ دعویٰ کی بنا یہ نہ تھی کہ شاہ عبدالعزیز نے شاہ اسحاق کو روپیہ بھیجنے کا مختار بنا دیا تھا اور یہ مختارنامہ انگریزی عدالت میں پیش کرکے ڈگری حاصل کی گئی تھی۔ بنا یہ تھی کہ روپیہ بھیجنے والے شاہ اسحاق تھے، ہنڈی یا منی آرڈر کا روپیہ یا تو مرسل الیہ کو ملنا چاہیے تھا یا مرسل کو واپس ہونا چاہیے تھا۔ اگر دوسرے لوگوں کی بھیجی ہوئی ہنڈیوں کا روپیہ بھی سید صاحب کو نہ ملتا تو وہ بھی دعویٰ کرکے ڈگریاں لے لیتے۔

مسئلہ تربیت

بہرحال واقعہ یہ ہے کہ نہ شاہ عبدالعزیز نے بورڈ بنائے، نہ ان کی زندگی میں جہاد کی تنظیمات اس پیمانے پر پہنچی تھیں کہ وہ کوئی خاص مسلک تجویز فرمانا ضروری سمجھتے۔ مسئلہ تربیت کو زیرِ بحث لانے کی ضرورت نہیں۔ دنیا جب سے بنی ہے، علوم ظاہر و باطن میں استادی اور شاگردی

---

[1] مختلف مرکزوں ہی نہیں شہر اور قصبے بھی براہ راست روپے بھیجتے رہتے تھے۔ "انفاس العارفین" میں مرقوم ہے۔ ۹۔ صفر ۱۲۴۳ھ کو مراد آباد کے مسلمانوں نے تین ہزار تہتر روپے آٹھ آنے ہنڈی کے ذریعے سے بھیجے (صفحہ ۸۱۸)۔

[2] شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک صفحہ ۱۱۲۔

کا سلسلہ برابر چلا آتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز نے شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحی، شاہ اسحاق، شاہ یعقوب ہی نہیں سیکڑوں اصحاب کی تربیت فرمائی۔ جو خاص صلاحیتوں کے مالک تھے وہ بلند منزلت بن گئے۔ خود شاہ عبدالعزیز کی تربیت شاہ ولی اللہ نے فرمائی۔ شاہ ولی اللہ کی تربیت شاہ عبدالرحیم نے فرمائی۔ پھر کیا ہر تربیت یافتہ کے فضائل، تربیت کنندہ کے حوالے کردینے چاہئیں؟ سید صاحب نے یقیناً شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کے حُسنِ تربیت سے فیض اٹھایا، لیکن خدا نے انھیں روحانی صلاحیت اور عزیمت کے جو جوہر عطا کیے تھے، وہ ہر شخص کو نہ مل سکے۔ اس وجہ سے ہر شخص سید احمد نہ بن سکا۔

احکام دین کی تعلیم اور ان احکام کے نفاذ و اجرا کے لیے عملی اقدامات میں فرق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص دواؤں کے خواص و اثرات کی تحقیق و معرفت میں درجہ کمال حاصل کر چکا ہو، مگر ان دواؤں سے موقع اور محل کے مطابق ٹھیک ٹھیک کام لینا اور خلق خدا کے لیے صحت و شفا کا بندوبست کرنا بالکل الگ کام ہے۔ شاہ صاحب زندگی بھر دین کی تعلیم دیتے رہے۔ اس دائرے میں ان کی فضیلت و رفعت کسی شرح کی محتاج نہیں۔ ان کے اکثر شاگرد محض تعلیم پا لینے یا تدریس کی مسندیں آراستہ کر لینے پر قانع رہے۔ سید صاحب نے علم دین حاصل کر لینے کے بعد اسے جا بجا نافذ کرنے اور بندگانِ خدا کو اس کا پابند بنانے کا بیڑا اٹھایا اور اس کارِ عزیمت میں اپنی ہر متاع بے دریغ قربان کر ڈالی۔ پھر ان کے فضائل کو کیوں دوسروں کے دامن میں ڈالنے کی سعی کی جائے؟

غیر ضروری اضطراب

مولانا عبیداللہ مرحوم دورِ حاضر کے ایک عظیم الشان مجاہد تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی ملک کی آزادی کے لیے وقف کر دی۔ پچیس برس جلاوطنی میں گزارے۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات سے عمل کا ایک مستقل پروگرام مدوّن فرمایا۔ ان فضیلتوں سے کسی کو بھی انکار کی گنجائش نہیں۔ مولانا کو شاہ صاحب اور ان کے خاندان سے جو گہری عقیدت پیدا ہو گئی تھی، وہ بھی ہر مسلمان کے لیے افتخار کا گراں بہا سرمایہ ہے، لیکن مولانا کا نقطۂ نگاہ کچھ اس قسم کا بن گیا تھا کہ شاہ ولی اللہ کے عہد مبارک سے اس وسیع سرزمین میں جو قابلِ ذکر علمی یا عملی کام ہوا وہ یا تو براہ راست شاہ صاحب کے بلند منزلت خاندان نے کیا یا اس کی تجویز سے تکمیل تک سب سے بڑا حصہ اس خاندان کا تھا، اس نقطۂ نگاہ کی اندھا دھند توثیق کون کر سکتا ہے؟

یقیناً تعلیم دین میں شاہ صاحب کے خاندان کی حیثیت نظام شمسی کی تھی، جس سے آسمان ہند کے ہزاروں چاند تارے مستنیر ہوئے، بلکہ روشنی کی کرنیں ہندوستان سے باہر بھی پہنچیں، لیکن اس کا یہ

مطلب نہیں کہ دوسروں کو ہر فضیلت سے محروم کر دیا جائے۔ خصوصاً سید احمد بریلوی نے فضائل عمل اور مکارم خدمت اسلام و مسلمین میں جو مقام عزیمت حاصل کیا اس کے اعتراف میں تذبذب کس بنا پر مناسب ہے؟ ولی اللٰہی خاندان کے لیے اس کے اپنے فضائل بس کرتے ہیں۔ دوسروں کے فضائل اس خاندان کے دامن میں ڈالنے کا اضطراب بالکل غیر ضروری ہے۔[1]

---

[1] یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ بعض سوانح نگاروں نے بیعت امامت جہاد اور بیعت اقامت شریعت کو مخلط کر دیا ہے حالانکہ دونوں بیعتیں الگ الگ موقعوں پر ہوئی تھیں اور ان میں کم و بیش دو سال دو مہینے کا فصل ہے۔ بیعت اقامت شریعت کا ذکر موقع پر ہوگا۔

پینتیسواں باب

اجتماعِ جیوشِ اسلامیہ

اہلِ سرحد کا جوش و خروش

بیعتِ امامت کے بعد سرحد کے خوانین، رؤسا اور عوام نے گروہ در گروہ اور فوج در فوج بیعتِ جہاد شروع کر دی۔ وہ سکھوں کی ترکتازوں سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ ان کے گاؤں وقتاً فوقتاً نذرِ آتش ہوتے رہتے تھے۔ خود انھیں آئے دن گھر بار چھوڑ کر بال بچوں کے ساتھ پہاڑوں میں پناہ لینی پڑتی تھی۔ اس حالتِ اضطراب کو ختم کرنے کی شکل یہی تھی کہ وہ جم کر سکھوں کا مقابلہ کرتے اور ثبات و استقامت سے اُن کی قوت پر کاری ضرب لگاتے۔ اس غرض کے لیے ایک مرکز درکار تھا۔ سید صاحب کی ذاتِ بابرکات سے یہ ضرورت پوری ہو گئی تو وہ اطراف و اکناف سے آ آ کر بیعت کرنے لگے۔ میرزا عطا محمد خاں نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے کہ بیعت کے بعد ہر شخص بلسانِ حال سے یہ ترانہ گاتا تھا:

ما سبک رُوحاں بہ اُمیدِ شہادت زندہ ایم
پیشِ ما ذکرِ حیاتِ جاوداں باشد گراں

سردارانِ پشاور کی عرضیاں

سردارانِ پشاور میں سے سلطان محمد خاں اور سید محمد خاں پہلے سید صاحب کی بیعت کر چکے تھے۔ یار محمد خاں اور پیر محمد خاں کی بیعت کا ذکر میری نظر سے نہیں گزرا۔ ان کی طرف سے اب اطاعت و فرمانبرداری کی عرضیاں پہنچیں۔ اہلِ سرحد کو ان عرضیوں کا علم ہوا تو اکثر نے سید صاحب سے عرض کیا کہ ان کا اظہارِ اطاعت مکر و فریب پر مبنی ہے اور ان پر اعتماد نہ کرنا چاہیے۔ یہ اپنے سگے بھائیوں یعنی وزیر فتح خاں اور عظیم خاں سے بھی دغا کر چکے ہیں، کسی دوسرے کو ان سے وفا کی کیا امید ہو سکتی ہے؟[1] خصوصاً یار محمد خاں کے بارے میں سب کی رائے بالاتفاق یہ تھی کہ غدر و خیانت اس کا عام شیوہ ہے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہادیٔ مطلق ہے۔ وہ ایک دم میں فاسق کو متقی بنا دیتا ہے۔ جب یہ شخص ہماری شرکت کا دم بھرتا ہے تو ہمیں اس پر بھروسا کرنا چاہیے۔ دل کا حال

---

[1] منظورہ صفحہ ۳۲۱۔

خداے علیم کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ اگر وہ دغا کرے گا تو اپنے واسطے کرے گا، ہمارا کیا بگاڑے گا؟[1]

سرداروں کے خصائل

یار محمد خاں کے متعلق اہل سرحد کی راے میری معلومات کے مطابق بالکل درست تھی۔ سلطان محمد خاں یقیناً اس سے زیادہ مخلص تھا، لیکن وہ عزم وہمت کا آدمی نہ تھا۔ جو لوگ اس سے ملے، وہ لکھتے ہیں کہ خوش پوشی اور خوش نوشی سے اسے بہت محبت تھی۔ ایسے لوگوں میں ماحول اور گرد و پیش کے عام اثرات سے اوپر اُٹھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ جب سلطان محمد خاں ان اثرات سے دب گیا تو اس نے بھی سید صاحب کے ساتھ وہی سلوک کیا، جو اس سے پیشتر یار محمد خاں کر چکا تھا۔ پیر محمد خاں کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ اسے فوجی امور سے خاص دلچسپی تھی اور وہی عسکری صلاحیت کے اعتبار سے سب بھائیوں میں ممتاز تھا۔ سید محمد خاں کی حیثیت بالکل معمولی تھی۔

مختلف مورخوں کے بیانات

درانی سردار (خصوصاً یار محمد خاں) اگر دل سے سید صاحب کی معیت پر آمادہ نہ تھے تو وہ معیت سے الگ بھی نہیں رہ سکتے تھے، اس لیے کہ سرحد کے عام خوانین و رؤسا سید صاحب کے پاس پہنچ رہے تھے۔ دیوان امرناتھ نے لکھا، یار محمد خاں نے جب دیکھا کہ لوگ [illegible] سید صاحب کی طرف دوڑے جا رہے ہیں اور ملک میں خرابی پیدا ہو رہی ہے تو مصلحۃً خود بھی مرید بن گیا۔ میسن کہتا ہے:

> یوسف زئیوں کو میدانِ کارزار میں لا کھڑا کرنے میں سید صاحب کو جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی، اُس نے سردارانِ پشاور کو سید صاحب کے ساتھ مذاکرت و مکاتبت پر راغب کر دیا۔ . . . سید صاحب کا ساتھ دینے والے بے شمار گروہ تھے۔ ان کی فیروز مندی اگرچہ یقینی نہ تھی تاہم غیر اغلب بھی نظر نہیں آتی تھی[3]

سید صاحب کا طرزِ عمل

ان پر سید صاحب کا اعتماد بھی درست ثابت نہ ہوا، مگر آپ سوچیں خاص اس موقع پر اعتماد کے سوا چارہ کیا تھا؟ سید صاحب نفیرِ عام کے داعی تھے۔ جو لوگ اس دعوت پر لبیک کہہ رہے تھے، ان میں سے کسی کو رد کس بنا پر کر سکتے تھے؟ یہ کیونکر کہہ سکتے تھے کہ فلاں کا تعاون منظور ہے، فلاں کا منظور نہیں؟ خصوصاً ان بھائیوں میں تفرقہ غیر ممکن تھا۔ اگر یار محمد خاں کے

---

[1] وقائع صفحہ ۵۸۰۔ [2] ظفرنامہ دیوان امرناتھ صفحہ ۱۷۵۔ عمدۃ التواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یار محمد خاں خفیہ خفیہ سید صاحب کی سرگرمیوں کے متعلق دربار لاہور کو اطلاعیں پہنچا رہا تھا۔ مثال کے طور پہ ملاحظہ ہو دفتر دوم صفحہ ۳۵۰۔

[3] میسن جلد سوم صفحہ ۶۷۔

تعاون کو قبول نہ کرتے تو دوسرے بھائیوں سے تعاون کی کیا اُمید ہو سکتی تھی؟ اگر ان سب کو چھوڑ دیتے تو کیا وہ اہل سرحد کے تعاون میں خلل انداز نہ ہوتے اور سکھوں سے ساز باز کر کے سید صاحب کے لیے دو جانب سے خطرات پیدا نہ کر دیتے؟ پھر انھیں سرداروں کے بھائی افغانستان کے بڑے حصے پر مسلط تھے، ان سے اعانت و امداد کی کیا امید ہو سکتی تھی؟ حالات و مصالح کے اعتبار سے وہی طرزِ عمل درست تھا، جو سید صاحب نے اختیار کیا۔ آگے چل کر غدر و خیانت کے جو واقعات پیش آئے، ان کا اندازہ قبل از وقت کوئی نہیں کر سکتا تھا اور غدر و خیانت کا ارتکاب تنہا ان سرداروں ہی کی طرف سے نہ ہوا۔ خادے خاں بھی اسی مسلک پر چلا، جس کے گھر میں بیعت امامت ہوئی تھی اور جو سید صاحب کی مہمانداری میں پیش پیش تھا۔

درحقیقت سید صاحب جانتے تھے کہ اہل سرحد عموماً تذبذب اور بے یقینی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ یہ مرض سکھوں کے مقابلے میں احساس کہتری سے پیدا ہوا تھا اور احساس کہتری اسی صورت میں زائل ہو سکتا تھا کہ سرحدیوں کی قوت کو منظم کر کے سکھوں پر کاری ضربیں لگائی جاتیں۔ جہاد میں ابتدائی عہد و مندی کے بعد غدر و خیانت کے امکانات خود بخود کم ہو جاتے، لیکن اس موقع پر بعض کے رد اور بعض کے قبول سے تنظیم کا پورا سلسلہ مختل ہو جانے کا شدید خطرہ موجود تھا۔ سید صاحب نے اہون البلیتین کو قبول کیا۔ دانشمندی اور مصلحت اندیشی کا راستہ یہی تھا۔

ان بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ کم از کم یار محمد خاں سید صاحب کی معیت میں مخلص نہ تھا۔ گرد و پیش کے حالات نے اُسے مجبور کر دیا تھا۔ اگر وہ الگ تھلگ بیٹھا رہتا اور سید صاحب عوام اہل سرحد کی امداد سے سکھوں کو شکست دے کر پیچھے ہٹا دیتے تو درانیوں کی سرداری خود بخود ختم ہو جاتی۔

گدڑی شہزادہ

اس زمانے میں جو لوگ بیعت کے لیے آئے، ان میں ایک صاحب "گدڑی شہزادہ"[3] کے لقب سے مشہور تھے۔ وقائع میں انھیں ایک "جلیل القدر پیرزادہ" بتایا گیا ہے[1]۔ سردار سید محمد خاں نے اپنے ایک مکتوب میں انھیں "صاحبزادہ گودڑی" کہا ہے[2]۔ شہزادہ صاحب یا صاحبزادہ صاحب نے خلوص سے بیعت کی اور کہا: "میں خالصۃً لوجہ اللہ حاضر ہوا ہوں۔ آج کے بعد آپ کا

---

[1] وقائع صفحہ ۵۵۸۔ — [2] مکاتیب شاہ اسماعیل صفحہ ۳۱۲۔ — [3] افسوس کہ ان کا نام اور حال کہیں سے معلوم نہ ہو سکا۔ بعض اصحاب نے بتایا کہ گودڑی یا گدڑی افغانستان کا ایک علاقہ ہے، جہاں کے یہ پیرزادے تھے یا ایک قوم ہے جس کے یہ معزز فرد تھے۔ کابل میں ایک مسجد گودڑی بھی ہے، جو گودڑی قوم نے بنائی۔ ایک بیان سے معلوم ہوا کہ یہ مجدد الف ثانیؒ کے خاندان سے تھے۔

ساتھ چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گا، انشاء اللہ تعالیٰ۔" یہ شہزادہ اہل سرحد کے ان مردان حق میں سے ہے، جنھوں نے اپنا عہد جان کے ساتھ نباہا۔ ومنہم من قضیٰ نحبہٗ۔

اطاعت و رفاقت کا عہد کر لینے کے بعد سرداران پشاور نے لشکر اور توپ خانے کے ساتھ پشاور سے نوشہرہ کا رُخ کیا۔ جب سرائی "پہنچے"، جہاں سے نوشہرہ پانچ کوس رہ جاتا ہے، تو ہنڈ اطلاع بھیجی۔ سید صاحب نے پانسو آدمی ساتھ لیے اور سرداروں کی ملاقات کے لیے نوشہرہ پہنچ گئے۔ فتح خاں پنجتاری، اشرف خاں رئیس زیدہ، خادے خاں رئیس ہنڈ اور گوڈری شہزادہ بھی ہم رکاب تھے۔ دو یا تین روز نوشہرہ میں باہم مشورے ہوتے رہے۔ پھر گوڈری شہزادے کو یار محمد خاں نے روک لیا۔ سید صاحب اور باقی اصحاب ہنڈ چلے آئے۔ اسی ملاقات میں فیصلہ ہُوا کہ متحدہ قوت سے سکھوں پر یورش کی جائے۔ چنانچہ واپسی پر فتح خاں، اشرف خاں اور خادے خاں نے اپنے اپنے حلقوں میں جہاد کی دعوت عام کا انتظام کر دیا۔

سید صاحب کے لشکر کی معیشت

ان دنوں ہندوستانی غازیوں کے لشکر میں سامان معیشت کی بے حد قلت تھی۔ سید صاحب نے چلتے وقت جو روپے ساتھ لیے تھے، وہ غالباً ختم ہو چکے تھے، جن رقموں کا انتظار تھا، وہ پہنچی نہیں تھیں۔ کسی پر بوجھ ڈالنا یا سوال کرنا سید صاحب کی عادت شریف، طبیعت اور شان تربیت کے خلاف تھا۔ کبھی کبھی ضرورت کے مطابق کھانا مل جاتا۔ اکثر فاقے کرنے پڑتے یا ساگ پات کھا کر گزارہ کر لیا جاتا[1]۔ یہ حالت عسرت کئی مہینے جاری رہی، لیکن سب بالکل مطمئن تھے۔ کسی کی زبان پر حرف شکایت نہ آیا۔ کچھ آدمی بیمار ہو گئے۔ سید صاحب نے انھیں پنجتار بھیج دیا۔ جو لوگ جنگ اکوڑہ میں زخمی ہُوئے تھے اور انھیں نوشہرے ہی میں چھوڑ دیا گیا تھا، وہ وہیں رہے۔ اہل نوشہرہ نے ان کی خدمت گزاری اس شان سے کی کہ راوی بتاتے ہیں، ان کے اقربا بھی پاس ہوتے تو اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتے۔ سید صاحب نے اہل نوشہرہ کے لیے دعا فرمائی۔

ہنڈ ہی سے احوال جہاد کے متعلق پہلا مکتوب ہندوستان بھیجا گیا، جس میں اکوڑہ، حضرو اور بازار کے واقعات بیان کیے گئے۔ یہیں سے بیعت امامت کی اطلاع کے ساتھ ساتھ جہاد کے دعوت نامے جا بجا ارسال کیے گئے۔

بُدھ سنگھ کا خط

سید صاحب ہنڈ ہی میں تھے کہ بدھ سنگھ کی طرف سے ایک خط ملا، جس میں حضرو پر چھاپے کے متعلق طعن و تعریض سے کام لیا گیا تھا۔ مثلاً یہ کہ آپ دُور سے شہادت کا

---

[1] منظورہ میں ہے: گاہے نوبت بہ سیری می رسید و اکثر بہ فاقہ می گزشت یا بخوردن حشیشات ترہ قناعت می کردند

شوق لے کر آئے تھے، میدان میں آکر مقابلہ کرتا تھا۔ حضرو کے غریب بیوپاریوں پر چھاپا مارنا کہاں کی مردانگی تھی؟ سید ہو تو سامنے آکر لڑو، چھپ چھپ کر تاخت و تاراج کیوں کرتے ہو۔

ہم بتا چکے ہیں کہ سید صاحب کو حضرو کے چھاپے سے براہ راست تعلق نہ تھا اور بدھ سنگھ کی تعریضات بالکل بے محل تھیں۔ حالتِ جنگ میں دشمن کی قوت کو ہر ممکن طریقے سے گزند پہنچانا اور اس کے نظامِ حکومت کو مختل کرنے کی تدبیریں عمل میں لانا قطعاً باعثِ اعتراض نہ ہو سکتا تھا۔ اس خط سے صاف ٹپکتا تھا کہ اکوڑہ اور حضرو کی تاختوں نے بدھ سنگھ کو سراسیمہ کر دیا تھا اور سراسیمگی نے طعن و تعریض کا جامہ پہن لیا۔

سید صاحب کا جواب

سید صاحب نے ۱۵۔ جمادی الاخری ۱۲۴۲ھ (۱۴۔ جنوری ۱۸۲۷ء) کو ہنڈ سے اس خط کا جواب بھیجا، جس کے ضروری حصے اس خیال سے یہاں درج کیے جاتے ہیں کہ یہ جواب بھی سید صاحب کے مقاصد و عزائم کا ایک نہایت عمدہ مرقع ہے۔ فرماتے ہیں کہ اہل حکومت و ریاست سے کشمکش کی کئی غرضیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً جاہ و مال کی محبت یا محض شجاعت و شہامت کی نمائش۔ میرا مقصود یہ ہے کہ:

> دین محمدی کی نصرت میں اپنے مولا کا حکم بجا لاؤں، جو مالک مطلق اور بادشاہ برحق ہے خدائے عز و جل گواہ ہے کہ اس ہنگامہ آرائی سے میرا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں۔ نہ اس میں کوئی نفسانی غرض شامل ہے۔ ایسی غرض نہ کبھی زبان پر آئی ہے، نہ دل میں گزری ہے۔ دینِ محمدی کی نصرت کے لیے جو کوشش کسی صورت میں بھی ممکن ہوگی، ضرور بجا لاؤں گا اور جس تدبیر کو بھی مفید پاؤں گا، اُسے لازماً اختیار کروں گا۔ انشاء اللہ زندگی کے آخری سانس تک اسی سعی میں مشغول رہوں گا۔ پوری عمر اسی کام میں صرف کر دوں گا اور جب تک زندہ ہوں اس مقصد کے لیے تگ و دو جاری رکھوں گا۔ جب تک سر گردن پر سلامت ہے، اس میں یہی سودا سمایا رہے گا اور جب تک پاؤں تابِ رفتار سے محروم نہیں ہو جاتے اسی راستے پر چلتا جاؤں گا۔

شانِ عزیمت

آگے چل کر فرماتے ہیں:

> مفلس بن جاؤں یا دولت مند، منصبِ سلطنت پر پہنچ جاؤں یا کسی کی رعیت بن جاؤں۔ بزدلی کی تہمت لگے یا شجاعت کی ستایش کی جائے۔ میدانِ جہاد سے کامیاب ہو کر زندہ لوٹوں یا شہید ہو جاؤں۔ اگر میں دیکھوں میرے مولا کی رضا اسی میں ہے، کہ اپنی جان ہتھیلی پر [illegible]

ہو جاؤں گا اور لشکروں کے ہجوم میں گھستے وقت دل میں ذرا سا بھی کھٹکا نہ ہو گا۔

مجھے نہ بہادری جتانا مقصود ہے، نہ ریاست حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا ثبوت یوں مل سکتا ہے کہ (سکھوں کے) بڑے بڑے سرداروں اور رئیسوں میں سے جو شخص دینِ محمدی کو قبول کرلے، میں سو زبان سے اس کی مردانگی کا اعتراف و اظہار کروں گا اور ہزار جان سے اس کی سلطنت کی ترقی چاہوں گا ...... جب آپ اپنے حاکم کے احکام کی تعمیل میں کوئی عذر و حیلہ روا نہیں رکھتے، حالانکہ وہ آپ جیسا انسان ہے، بلکہ آپ کی برادری میں سے ہے تو میں احکم الحاکمین کے فرمانوں کی بجا آوری میں کیونکر عذر کرسکتا ہوں، حالانکہ وہ تمام انسانوں کا خالق ہے اور سارے جہان اسی نے بنائے ہیں[1]

لشکروں کی فراہمی

بیعتِ امامت کے بعد کم و بیش دو مہینوں میں اسی ہزار سرحدی عوام جہاد کے لیے فراہم ہو گئے۔ سردارانِ پشاور کا لشکر اس سے الگ تھا۔ اس کی تعداد بیس ہزار بتائی جاتی تھی اور اس کے ساتھ آٹھ توپیں تھیں۔ اتنا بڑا لشکر سرحد میں پہلے کبھی جمع نہیں ہوا تھا۔ مبین نے کثرتِ تعداد ہی کی بنا پر لکھا ہے کہ سید صاحب کی کامیابی یقینی نہیں تو کم از کم غیر اغلب نہ تھی۔

بے شک ان لوگوں نے باقاعدہ فوجی تربیت نہیں پائی تھی، لیکن اس موقع پر جا بجا فوجی چھاؤنیاں بنا کر تربیت گاہیں کھولنے کا نہ وقت تھا، نہ سر و سامان تھا۔ سید صاحب اس وقت یہی کر سکتے تھے کہ خود ہر قربانی کے لیے تیار ہو جائیں اور سب کو اس مسلک پر کاربند ہونے کی دعوت دیں۔ موقع اور محل تدبیر آرائیوں کا نہ تھا، بلکہ شجاعت اور مردانگی کا تھا۔ شجاعت اور مردانگی ہی کے بل پر تدبیر آرائیوں کے وسائل پیدا ہو سکتے تھے۔ اسی ہزار کی فراہمی میں سب سے بڑا حصہ فتح خاں پنجتاری، اشرف خاں اور خادے خاں کا تھا۔ دوسرے خوانین دروسلانے بھی سعی فرمائی، جن میں سے امیر احمد خاں باجوڑی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ان میں سے ہر گروہ کا نشان الگ الگ تھا اور بڑے بڑے نشان ایک ہزار سے کم نہ ہوں گے۔ سید صاحب نے اپنے ڈیروں کی نگرانی کے لیے چوکیدار مقرر کیے۔ مارچ کے پہلے ہفتے میں ہنڈ سے نکل کر ایک یا دو دن "جلسئی" میں ٹھہرے، ایک رات مصری بانڈہ میں گزاری، پھر نوشہرہ پہنچ گئے، جہاں سے بدھ سنگھ پر یورش منظور تھی۔ وہ شیدو میں خیمہ زن تھا، جو اکوڑہ سے چار میل جنوب میں ہے۔ بدھ سنگھ کی

---

[1] منظورہ صفحہ ۳۴۴ و مجموعہ مکاتیب۔

فوج تیس پینتیس ہزار سے کم نہ تھی۔ اس کے پاس ساز و سامان بہت زیادہ تھا، نیز سوہن لال کے بیان کے مطابق ” راجا سوچیت سنگھ، راجا گلاب سنگھ اور دوسرے سرکردگان عالی شان اس کے ساتھ تھے۔

۱۸۲۳ء کی جنگ نوشہرہ کے بعد یہ پہلی لڑائی تھی، جس میں اہل سرحد سکھوں کے مقابلے پر آئے اور سید صاحب کے غازیوں کی بھی سکھوں سے یہ پہلی رُو در رُو ٹکر تھی۔

چھتیسواں باب

جنگِ شیدو

مقامِ جنگ شیدو[1] صوبہ سرحد کا مشہور گاؤں ہے۔ اتنا بڑا ہے کہ اسے گاؤں کے بجائے چھوٹا قصبہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ اکوڑہ سے قریباً چار میل جنوب میں ہے، یعنی اٹک کی سمت میں۔ جرنیلی سڑک اس کے پاس مشرقی سمت میں ہے۔ اسی جانب تھوڑے فاصلے پر دریائے لنڈے بہتا ہے۔ ریل کی لائن مغربی سمت میں ہے۔ سید صاحب کے زمانے میں یہ گاؤں موجودہ جگہ کے بجائے مشرق میں دریا کے قریب آباد تھا۔ دریا میں طغیانی آئی تو گاؤں کی جگہ بدلنی پڑی۔ ایک مرتبہ پھر طغیانی ہی کی وجہ سے نقلِ مقام کی ضرورت پیش آئی، گویا موجودہ گاؤں تیسری جگہ واقع ہے۔ جس لڑائی کا ذکر اس باب کا طرازِ عنوان ہے، وہ اس وقت ہوئی تھی، جب گاؤں پہلی جگہ آباد تھا۔ اس کے بچے کھچے آثار یا پرانے قبرستان کے نشان اب تک دریا کے کنارے دکھائی دیتے ہیں۔

گاؤں کے مغرب میں میل ڈیڑھ میل پر خشک کی پہاڑیاں ہیں۔ ان پہاڑوں کے دامن سے دریا تک زمین برابر ڈھلواں ہوتی چلی گئی ہے۔ جابجا نالوں کے بہاؤ ملتے ہیں، جو پہاڑیوں کی سمت سے آکر دریا میں ملتے ہیں۔ برسات ہو جائے تو ان میں زور سے پانی بہنے لگتا ہے، لیکن جلد خشک ہو جاتا ہے۔

سکھوں کی لشکرگاہ میری تحقیق کے مطابق گاؤں کے جنوب مغرب میں تھی۔ شاید اس جگہ کے قریب ہو، جہاں آج کل گاؤں آباد ہے۔ لشکرگاہ کے اردگرد حفاظت کے لیے خاردار جھاڑیوں سے سنگھر بنائی گئی تھی۔

نوشہرے میں انتظامات یقینی طور پر تو معلوم نہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ سید صاحب نوشہرہ میں

---

[1] میسن نے اس مقام کا نام "سیدوالا" لکھا ہے (مختلف سفروں کا بیان {NARRATIVE OF VARIOUS JOURNEYS} جلد اول صفحہ ۱۳۳) "منظورہ" اور "وقائع" میں اسے "سیدو" بتایا گیا ہے، جو بظاہر "سیدوالا" کا مخفف ہے، لیکن میں نے وہ تلفظ اختیار کیا، جو پٹھانوں میں متداول ہے۔ "عمدۃ التواریخ" میں اسے شیدو ہی لکھا گیا ہے۔

بھی ایک دو دن ضرور ٹھہرے ہوں گے۔ جنگ اکوڑہ کے زخمیوں میں سے بعض اس وقت تک بھی صحت یاب نہیں ہوئے تھے۔ مولوی عبدالقیوم اور سید امانت علی ان کی تیمارداری پر مامور تھے۔ انھوں نے جنگ اکوڑہ سے جنگِ شیدو تک ایک دن کے لیے بھی نوشہرہ نہیں چھوڑا تھا۔ سوءِ اتفاق سے شیخ امجد علی غازی پوری نوشہرہ پہنچ کر بیمار ہو گئے۔ سید صاحب نے ان کی تیمارداری کے لیے مولوی فتح علی کو مقرر کر دیا۔ مولوی عبدالقیوم سے فرمایا کہ ہم تو اب دریا کے پار جائیں گے اور جب خدا لائے گا آئیں گے۔ آپ اونٹوں کے چار پانچ کجاوے جلد تیار کرا لینا۔ معلوم نہیں کیا سانحہ پیش آ جائے۔ شاید معذوروں کو محفوظ مقام پر بھیجنے کی ضرورت پڑے۔

سردارانِ پشاور پہلے سے دریا کے مغربی کنارے پر تھے۔ اُدھر ہی سے سکھوں کی لشکر گاہ پر پیش قدمی کرنا منظور تھا۔ اہلِ سرحد کے لشکر بھی دریا کو عبور کر کے ادھر ہی پہنچ گئے اور درانی لشکر کے قریب ڈیرا جما لیا۔ سید صاحب بھی اپنے غازیوں کے ساتھ دریا عبور کر کے دوسری طرف چلے گئے۔

لشکر و لشکر گاہ کی کیفیت

جس وقت سے سید صاحب نے دریا عبور کیا تھا، اسی وقت سے آپ کے لیے دونوں وقت کا کھانا اور میوہ یار محمد خاں بھیجتا تھا۔ نذر محمد کشمیری اور اس کا بھائی ولی محمد، سردار کی طرف سے مہمانداری کے منتظم تھے، وہی کھانا خوانوں میں لگا کر لاتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نوشہرہ کے سامنے مغربی کنارے پر بھی ایک دو روز مقام ہوا۔ مختلف لوگ جاتے آتے تھے۔ مولوی فتح علی فرماتے ہیں:

> ایک روز حاجی عبداللہ صاحب جو مولانا محمد اسماعیل صاحب کی جماعت میں تھے، اس پار لشکر میں حضرت کے پاس گئے۔ پھر جب وہاں سے نوشہرہ میں آئے، میں نے پوچھا کہ بھائی صاحب کہو، لشکر کا کیا حال ہے؟ کہا: سب طرح سے خدا کا فضل ہے، مگر حضرت (علیہ الرحمۃ) کی طبیعت فیض طویت قدرے علیل سی ہے۔[1]

لشکر کے کوچ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے مولوی فتح علی کہتے ہیں کہ نوشہرہ بلند زمین پر واقع ہے اور جس طرف لشکر تھا وہ زمین نشیب میں ہے۔ صبح کے وقت شیدو کی طرف سے کوچ شروع ہوا:

> ہم لوگ اس پار (یعنی نوشہرہ کی جانب سے) اچھی طرح دیکھتے تھے۔ لشکر میں قریب ایک لاکھ کی جمعیت تھی اور کوئی آٹھ دس ہزار فقط نشان تھے، کیونکہ اس ملک کا دستور

---

[1] وقائع صفحہ ۱۲

ہے کہ اگر دس بارہ آدمی کی جماعت ہے تو اس میں بھی ایک نشان ضرور ہوتا ہے اور اگر پانچ سات آدمی کی جماعت ہے تو اس میں بھی ایک نشان ہوتا ہے۔ بڑی جماعتوں میں تو کئی کئی نشان ہوتے ہیں۔ الغرض ملکی لوگ دف بجاتے اور چار بیت گاتے، ننگی تلواریں ہلاتے اور اچھلتے کودتے جاتے تھے۔ جب جاتے جاتے موضع اکوڑہ کوس یا ڈیڑھ کوس رہا تو وہاں تمام لشکر نے ڈیرا کیا اور وہ تمام ڈیرے خیمے اپنے لشکر کے ہم لوگ نوشہرہ سے دیکھتے تھے[1]

سید صاحب کی علالت

پڑاؤ پر پہنچتے ہی باہم مشورہ کر کے فیصلہ کر لیا گیا کہ صبح کو لڑائی ہوگی۔ سید صاحب کی طبیعت تو اسی وقت سے ناساز ہو گئی تھی، جب سے آپ یار محمد خاں کے اصرار پر اس کے ہاں کا کھانا کھانے لگے تھے۔ صبح جنگ سے پیشتر کی رات کو سردار کے ہاں سے کھچڑی اور گنڈیریاں آئیں۔ آپ نے کھچڑی کھائی اور چند گنڈیریاں چوسیں، کچھ دیر بعد طبیعت بگڑ گئی۔ اچانک غشی طاری ہو جاتی، کسی وقت افاقہ معلوم ہوتا۔ رات میں تکلیف بڑھ گئی۔ قے اور استفراغ شروع ہو گئے۔ دو تین گھڑی رات رہے لڑائی کی تیاری کا نقارہ بجا اور مولانا اسماعیل سید صاحب کے خیمے میں آئے تو آپ کو بے ہوش پایا۔ جب ذرا افاقہ ہوا تو عرض کیا کہ لڑائی کے لیے نکلنے کا وقت آ گیا۔ سردار یار محمد خاں نے آپ کی سواری کے لیے ہاتھی بھیجا ہے۔ فرمایا: ہمارا سفید گھوڑا جو فتح خاں پنجتاری نے ہم کو دیا ہے، شاہول خاں کنج پوری سے کہو کہ اس پر سوار ہو کر فتح خاں کے پاس جائیں، باقی ہندوستانی سب کے سب ہمارے ساتھ رہیں۔

سید صاحب چونکہ بار بار بے ہوش ہو جاتے تھے، اس لیے سوار ہونے میں توقف ہوا۔ اس اثنا میں یار محمد خاں کی طرف سے پے در پے قاصد آتے رہے۔ تکلیف ہی کی حالت میں آپ ہاتھی پر سوار ہو گئے۔ مولانا اسماعیل ساتھ ہودے میں بیٹھے، اس لیے کہ سید صاحب کی طبیعت بہت خراب تھی۔

لشکر کی صف آرائی

جس حد تک میں تحقیق کر سکا ہوں، اسلامی لشکر کی صف آرائی کا نقشہ یہ تھا:

---

[1] وقائع صفحہ ۲۶۴۔ نوشہرہ سے اکوڑہ اگرچہ آٹھ میل ہے اور لشکر کی قیام گاہ چھ میل سے کم نہ ہوگی، لیکن ظاہر ہے لشکر بہت بڑا تھا اور قیام کے لیے وسیع جگہ گھیری ہوگی۔ ممکن ہے بعض خیمے صرف تین چار میل کے فاصلے پر ہوں۔ علاقہ میدانی ہے، اس لیے مولوی فتح علی نے کہا کہ ڈیرے خیمے نوشہرہ سے نظر آتے تھے۔

۱ - یار محمد خاں اپنے لشکریوں کو لے کر خٹک کی پہاڑیوں سے متصل پرا باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا رُخ سکھ لشکرگاہ کی طرف تھا جو یار محمد خاں کی جائے قیام سے مشرق میں تھی[1]

۲ - یار محمد خاں کے بائیں ہاتھ سلطان محمد خاں کا لشکر تھا۔

۳ - سلطان محمد خاں کے بائیں ہاتھ پیر محمد خاں فوج لیے کھڑا تھا۔

۴ - پیر محمد خاں کے بائیں ہاتھ فتح خاں پنجتاری، خاوے خاں ہنڈ، اشرف خاں زیدہ، امیر احمد خاں باجوڑی اور دوسرے خوانین سمہ کے لشکر تھے۔

۵ - سید صاحب کے غازی خوانین سمہ کے لشکر کے پاس تھے۔

۶ - گودڑی شہزادہ اپنے غازیوں کے ساتھ رشیدو گاؤں میں تھا۔

گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ اسلامی لشکر خٹک کی پہاڑیوں سے دریائے لنڈے تک ہلالی شکل میں صف بستہ تھا۔ مختلف جیشوں کے درمیان تھوڑا تھوڑا فاصلہ بھی ہوگا اور ہر جیش کی کئی کئی صفیں تھیں۔

لڑائی کا آغاز

سکھ لشکرگاہ اور اسلامی جیوش کے درمیان ایک خشک نالہ تھا۔ سکھوں نے توپیں لشکرگاہ میں مناسب جگہ پر نصب کر رکھی تھیں اور ان کے چند جیشوں نے آگے بڑھ کر نالے میں چار مورچے بنا لیے تھے۔ لڑائی ہوتے ہی ان مورچوں سے اسلامی لشکر پر گولیاں برسنے لگیں اور لشکرگاہ سے توپوں کے گولے دنادن آنے شروع ہو گئے۔

سلطان محمد خاں، پیر محمد خاں، فتح محمد خاں پنجتاری اور دوسرے مجاہدوں نے جو گھوڑوں پر سوار تھے، باگیں اٹھائیں اور بجلی کی سرعت سے نالے والے مورچوں پر حملہ آور ہوئے۔ امیر احمد خاں باجوڑی سید صاحب سے بہت قریب تھا۔ اس نے پانسو سواروں اور پیادوں کو تیار کیا اور سید صاحب سے یورش کی اجازت چاہی۔ آپ نے فرمایا: "فی امان اللہ" غرض اس یورش سے نالے کے سارے مورچے فتح ہو گئے۔ زیادہ تر سکھ سپاہی مارے گئے، باقی جانیں لے کر فرار ہو گئے۔ اسلامی لشکر ایک بڑی آفت سے محفوظ ہو گیا۔ اس مدت میں یار محمد خاں اپنی سپاہ کے ساتھ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ نہ یورش میں شریک ہوا، نہ لڑائی میں کوئی حصہ لیا۔

جو سکھ نالے کے مورچے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، وہ پیچھے ہٹ کر ایک اور جگہ اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔

---

[1] ایک روایت ہے: اس کنارہ گیری کو دیکھ کر بعض خوانین سمہ نے لڑائی سے پیشتر ہی سید صاحب سے عرض کر دیا تھا کہ یار محمد خاں کے دل میں کھوٹ ہے، ورنہ اسے دامن کوہ میں کھڑا ہونے کی کیا ضرورت تھی۔

سمہ کے غازیوں نے اس اوٹ پر بھی ہلہ بول دیا اور دشمن کو جاروب کی طرح صاف کرتے ہوئے سکھ لشکرگاہ کی سنگھر کے پاس پہنچ گئے۔ اس اثنا میں گودڑی شہزادہ اپنے مجاہدوں کو لے کر گاؤں سے نکلا اور ہر رکاوٹ بہ زور ہٹاتا ہوا سکھ لشکرگاہ میں گھس گیا۔ غازیانِ سمہ اور گودڑی شہزادے کی یورش نے سکھوں میں ہل چل مچا دی اور ان کی توپیں بھی بند ہو گئیں۔ اب نظر بہ ظاہر اسلامیوں کی فتح میں شبہ باقی نہیں رہا تھا، بلکہ ایک شخص نے سید صاحب کو فتح کی مبارک باد بھی دے دی۔ آپ کی کیفیت وہی تھی، کبھی ہوش آجاتا، اکثر بے ہوش رہتے۔ مولانا اسماعیل آپ کی دیکھ بھال میں اس درجہ مصروف تھے کہ انھیں لڑائی کے دم بدم حالات کا بھی پورا علم نہ تھا۔

یار محمد خاں کی حرکت

مقدمات فتح نمایاں ہو چکے تھے کہ سردار یار محمد خاں کی ایک رنج افزا حرکت نے اچانک فتح کو مصیبت خیز شکست میں بدل دیا۔ روایتوں میں اس کی تفصیل کے متعلق جزوی اختلاف ہے، لیکن اصل حرکت پر سب متفق ہیں۔

ایک روایت یہ ہے کہ سکھ لشکرگاہ سے ایک گولہ یار محمد خاں کے لشکر کی طرف آیا، جس سے کئی سوار اڑ گئے اور وہ گھبرا کر بھاگ نکلا۔ دوسری حکایت یوں ہے کہ یار محمد خاں کے لشکر سے دو آدمی سکھوں کی طرف آئے، بات کر کے واپس گئے تو یار محمد خاں نے باگ اٹھائی اور چل دیا۔ ان میں سے کسی روایت کو صحیح سمجھ لیجیے۔ اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ یار محمد خاں نے لڑائی میں قطعاً حصہ نہ لیا۔ پھر جب سکھوں کی جمعیت ریزہ ریزہ ہو رہی تھی تو اس بے درد نے راہِ فرار اختیار کی۔ لشکری بھی ساتھ ہی کافور ہو گئے

محض یہی نہیں بلکہ ایک یا ایک سے زیادہ آدمیوں نے اس فرار کی خوب اشاعت کی۔ مختلف لشکروں میں پھر پھر کر اور پکار پکار کر اعلان کیا کہ یار محمد خاں بھاگ گیا۔ یہ سنتے ہی سلطان محمد خاں اور پیر محمد خاں بھی اپنے لشکروں کے ساتھ بے تحاشا اٹھ دوڑے۔ غازیانِ سمہ نے یہ شور سنا تو سوچے سمجھے بغیر انھوں نے بھی راہ گریز اختیار کی۔ پھر پریشانی اور بے ترتیبی کا یہ عالم تھا کہ جس نے فرار کا لفظ سنا اٹھ بھاگا اور جس طرف رُخ ہوا نکل گیا۔

گودڑی شہزادے کی شہادت

جو غازی یورش کر کے سکھ لشکرگاہ تک چلے گئے تھے یا خاربندی سے گزر کر لشکرگاہ کے اندر پہنچ گئے تھے، انھوں نے اپنے پیچھے فرار کا نقشہ دیکھا تو حیران رہ گئے۔ انھیں یقیناً معلوم نہ ہو گا کہ کیا صورت پیش آئی۔ میرا خیال ہے کہ اسی عالمِ حیرت میں وہ پیچھے ہٹے۔ سکھوں کے ایک جیش نے درانیوں کا تعاقب کیا۔ دوسرے نے سمہ والوں کا پیچھا کیا۔ باقی کوئی گروہ نہ ٹھہر سکا۔ صرف گودڑی شہزادے نے بھاگنا گوارا نہ کیا۔ سکھ لشکرگاہ سے پیچھے ہٹ کر شیدو گاؤں

میں مورچا قائم کر لیا۔ سکھوں نے پورا زور لگایا، لیکن بہادر شہزادے نے مقابلہ نہ چھوڑا۔ جب شدید پر سکھوں کا ہجوم بہت بڑھ گیا تو شہزادہ لڑتا ہوا قدم بہ قدم گاؤں سے باہر نکلا۔ ایک ایک ساتھی شہید ہوتا رہا اور شہزادہ پیچھے کی طرف ہٹتا گیا۔ جب قبرستان میں پہنچا تو خود بھی خونِ شہادت میں تیرتا ہوا مالکِ حقیقی کے دربار میں پہنچ گیا۔ یاد ہو گا کہ ڈیڑھ دو مہینے پیشتر سید صاحب کی بیعت کی تھی تو کہا تھا آپ کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گا۔ شیدو کے میدان میں اس صادق العہد نے اپنے اس پیمان پر خونِ شہادت سے مہر لگا دی۔ ادائے فرض کی سرخروئی کا یہی درجۂ علیا ہے، جو ہر مسلمان کا نصب العین ہونا چاہیے۔

"منظورہ" میں ہے:

شجاعت رستمانہ نمودہ تنہا بسیارے را
سبے سر ساخت . . . . . . با جماعت خود کا نہم
بنیانٌ مرصوص قدم فشردہ داد شجاعت داد و ثمنِ جنّت
گرفتہ جاں بہ جاں آفریں سپرد۔

رستمانہ شجاعت سے کام لیتے ہوئے بہت سے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا . . . . . . اپنی جماعت کے ساتھ جو استقامت میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی حیثیت رکھتی تھی، قدم جما کر دادِ شجاعت دی اور جنّت لے کر جاں جاں آفریں کے حوالے کی۔

جنگ کی تاریخ

یقیناً شہزادہ اور اس کے ساتھی جنّت میں مراتبِ عالیہ پر فائز ہوئے اور راہِ حق کے پاک نفس شہیدوں سے بڑھ کر جنت کا حق دار کون ہو سکتا ہے؟ لیکن مقصودِ حقیقی جنت سے کہیں بڑھ کر یہ تھا کہ خدائے پاک کی رضا و خوشنودی حاصل کریں۔

کسی سوانح نگار نے نہیں بتایا کہ شیدو کی جنگ کس تاریخ کو ہوئی۔ "عمدۃ التواریخ" میں ۱۴ پھاگن درج ہے۔

سید صاحب ایک مقام پر اس جنگ کی اجمالی کیفیت بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مجاہدین اخیار ایک سے زیادہ مرتبہ سکھوں پر مظفر و منصور ہوئے، لیکن چند منافقوں کی مداخلت کے باعث انھیں گزند پہنچا۔ الحمد للہ کہ مومنوں کی ہمتِ عالیہ میں قصور و فتور کو راہ نہ ملی[1]

سید صاحب کو زہر دینے کا معاملہ

اب سب سے پہلے ہمیں دو سوالوں پر غور کر لینا چاہیے:

۱۔ آیا یار محمد خاں نے واقعی سید صاحب کو زہر دیا؟

۲۔ آیا یار محمد خاں نے سکھوں سے خفیہ ساز باز کر لیا تھا؟ آیا ساز بازہی کی وجہ سے وہ اچانک بھاگ نکلا اور اس طرح فتح شکست میں تبدیل ہو گئی؟

---

[1] مکاتیب شاہ صاحب صفحہ

سید صاحب کو زہر دینے کی روایات تواتر تک پہنچ چکی ہیں۔ خود سید صاحب اور شاہ اسماعیل کے مکاتیب میں بھی اس واقعہ کا ذکر آیا ہے[1] پھر اس حادثے کے بعد سید صاحب کے جسم پر بثور نکل آئے۔ اطبا نے بالاتفاق انھیں زہر کا اثر قرار دیا اور معالجے کے سلسلے میں نکاح پر خاص زور دیا۔ چنانچہ بالآخر سید صاحب کو مجبور ہو کر تیسرا نکاح کرنا پڑا، جس کی کیفیت آگے چل کر بیان ہو گی

محض یہی نہیں بلکہ جنگ شیدو سے کچھ مدت بعد سید صاحب نے بونیر و سوات کا دورہ کیا تھا تو منگورہ میں نذر محمد اور ولی محمد مل گئے تھے، جو یار محمد خاں کے ہاں خانساماں رہ چکے تھے اور وہی سید صاحب کے لیے کھانا لاتے تھے۔ زہر دینے کا واقعہ اس درجہ عام ہو چکا تھا کہ لوگوں نے دونوں کو پہچان کر گرفتار کر لیا اور سزا دینے پر آمادہ ہو گئے۔ سید صاحب نے انھیں چھڑا کر روانہ کیا۔ راستے میں وہ پھر پکڑے گئے اور ہاتھ پاؤں باندھ کر انھیں ایک جھونپڑے میں ڈال دیا گیا۔ اتفاق سے سید صاحب کا گزر ادھر سے ہوا۔ پہرے دار نے عرض کیا کہ جن لوگوں نے آپ کو زہر دیا تھا، ہم نے انھیں پکڑ لیا ہے اور اپنے خان کو بلایا ہے تاکہ انھیں سزا دے۔ خان بھی پہنچ گیا اور سید صاحب سے عرض کیا کہ آپ تشریف لے جائیں۔ ہم انھیں قتل کریں گے۔ سید صاحب نے بمشکل انھیں چھڑا کر ساتھ لیا۔ جب اندھیرا ہو گیا تو فرمایا کہ زہر دینے کا راز کھل کر جگہ جگہ پھیل گیا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہاں سے کسی دوسری سمت نکل جاؤ[2]

گویا محض سید صاحب کے ساتھیوں ہی کو نہیں بلکہ سرحد کے عوام کو بھی اسی زمانے میں معلوم ہو چکا تھا کہ سید صاحب کو زہر دیا گیا اور جن لوگوں نے زہر دیا، ان کے نام بھی معلوم تھے۔

عمدۃ التواریخ کی شہادت

رنجیت سنگھ نے بھی سلاطین کی طرح اپنے دربار کا روزنامچہ مرتب کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ یہی روزنامچہ بعد میں "عمدۃ التواریخ" کے نام سے چھپا۔ اس میں ہے:

منقول السنہ باشندگان آں روئے آب اٹک است کہ عالی جاہ یار محمد خاں بہ پاس ارتباط و	اٹک پار کے لوگوں کا بیان ہے کہ جب جنگ کی آگ بھڑکی تو یار محمد خاں نے رنجیت سنگھ

---

[1] مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیے مکاتیب سید صاحب صفحہ ۲۵۱ و مکاتیب شاہ اسماعیل صفحہ ۱۹۶۔ نواب وزیر الدولہ لکھتے ہیں۔ جنگ میں مومنوں کو گزند پہنچا۔ (این فقیر) در مرضے صعب کہ آں را از آثار سم تشخیص نمودند، مبتلا گردید (اور یہ فقیر بھی ایک سخت مرض میں مبتلا ہو گیا، جسے تشخیص کرنے والوں نے زہر کا نتیجہ قرار دیا)۔

[2] یہ تمام حالات وقائع میں تفصیل سے مرقوم ہے۔

اتحاد سرکار دولتمدار رنجیت سنگھ، در حین اشتعال
نوائرِ جدال و قتال احمد شاہ را شربت شیریں سم
قاتل نوشانیدہ فرار بر قرار دادند و تمامی لشکریان
نیز بر متابعت او پرداختند[1]

کے ساتھ ربط و اتحاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سید صاحب
کو زہر دے دیا اور خود بھاگ نکلنے کی ٹھان لی۔
اس کا لشکر بھی ساتھ ہی فرار ہو گیا۔

زہر دینے کا واقعہ ثابت ہو جانے کے بعد بتانے کی ضرورت نہیں رہتی کہ یہ سب کچھ سکھوں سے سازباز کے بعد عمل میں آیا۔ میرا خیال ہے کہ سازباز لڑائی شروع ہونے سے پیشتر پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ اسی وجہ سے یار محمد خاں نے میدانِ جنگ میں ایسے مقام پر فوج کھڑی کی جہاں سے وہ بسہولت تمام فرار ہو سکتا تھا۔ نیز جنگ میں اس نے کوئی حصہ نہ لیا۔ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان محمد خاں اور پیر محمد خاں اس معاملے میں آخری وقت تک بے خبر رہے۔

انگریزوں کے بیانات

اب آخر میں اس جنگ کے متعلق انگریزوں کے بیانات سن لیجیے۔ "پشاور گزٹیئر" میں ہے، سید صاحب یہ غرض لے کر نوشہرہ پہنچے تھے کہ آگے بڑھ کر اٹک کا محاصرہ کر لیں، لیکن ہری سنگھ نے بدھ سنگھ کو بھاری فوج دے کر مجاہدین کے مقابلے کے لیے شیدو بھیج دیا اور خود بیس ہزار آدمیوں کے ساتھ دریائے اٹک پر موجود رہا۔

> سید نے بدھ سنگھ کی فوج کو گھیر کر سخت بدحال کر دیا۔ آخر وہ لڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اُس نے درانی سرداروں کو بتا دیا کہ اگر سید کی اعانت سے الگ تھلگ رہو گے تو تمھارے علاقوں پر قبضہ نہیں کیا جائے گا۔ یہ بھی بتا دیا کہ رنجیت سنگھ خود آ رہا ہے، اگر سید کا ساتھ دیا اور لڑائی میں حصہ لیا تو تمھارا جو حشر ہو گا وہ کسی شرح کا محتاج نہیں۔
>
> سرداروں پر، جن کا سرخیل یار محمد خاں تھا، اس انتباہ کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ لڑائی کے شروع ہوتے ہی بھاگ نکلے۔ یار محمد خاں سب سے آگے تھا۔ اس غدر و خیانت نے مطلوب نتیجہ پیدا کر دیا۔ سکھ سپاہیوں نے مسلمانوں کو بھاری نقصان پہنچا کر شکست دی[2]

ہیجبٹ اور ہیمسن کی کتاب میں بھی حرفاً حرفاً یہی مرقوم ہے۔ صرف اس اضافے کے ساتھ کہ یار محمد خاں

---

[1] عمدۃ التواریخ دفتر دوم صفحہ ۴۴۳۔ [2] پشاور گزٹیئر صفحہ [illegible]

کو اس غداری سے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ رنجیت سنگھ نے خراج کی رقم دُگنی کر دی، مسجدوں کی بے حرمتی کی، ملک کو لوٹا اور آخر کار وہ یار محمد خاں کے بیٹے کو یرغمال میں لے کر واپس ہوا[1]

میسن نے "کلکتہ ریویو" میں بھی ایک مضمون لکھا تھا، جس کا مفاد یہ ہے کہ سید صاحب نے بدھ سنگھ کو سیدوالا میں گھیر لیا۔ وہ کئی روز تک تذبذب میں پڑا رہا۔ اس اثنا میں درانی سرداروں سے نامہ و پیام کا سلسلہ پیدا کیا۔ انھیں یقین دلایا کہ اگر لڑائی سے الگ رہو گے تو سرکار والا (رنجیت سنگھ) سے سفارش کروں گا اور سید کے ساتھ مل جانے کا جرم معاف کر دیا جائے گا، لیکن اگر حصہ لیا اور مجھے تباہ بھی کر دیا تو اس سے عام حالات پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ ہماری سرکار بڑی زور آور ہے اور بہت بڑی فوج میری کمک کے لیے پہنچ رہی ہے۔ اس دھمکی نے سرداروں پر گہرا اثر ڈالا:

> لڑائی کے دن وہ اپنے رسالے اور توپ خانے کے ساتھ آگے کھڑے تھے۔ پھر اچانک پیچھے بھاگے۔ یار محمد بھاگنے میں پیش پیش تھا اور ساتھ ساتھ زور زور سے چلا رہا تھا: "شکست، شکست"۔

برنز بھی بخارا جاتے ہوئے اس مقام سے گزرا تھا اور اس نے اپنی کتاب "سیاحت بخارا" میں جنگ شیدو کا ذکر کیا ہے[2] لیکن جو حالات بیان کیے ہیں، وہ غیر مستند ہیں۔ مثلاً اس نے سکھوں کی فوج صرف آٹھ ہزار بتائی ہے اور اسلامی فوج کو ڈیڑھ لاکھ پر پہنچا دیا ہے۔

غدّاری کے اسباب

بہرحال ان لوگوں کے سامنے لڑائی کی واضح کیفیت نہ تھی، لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ سکھوں نے جنگ شروع ہونے سے پیشتر دُرانی سرداروں کو یا کم از کم یار محمد خاں کو ساتھ ملا لیا تھا اور میدانِ جنگ میں فوج آراستہ کرنے سے پیشتر یار محمد دل میں پختہ ارادہ کیے بیٹھا تھا کہ اسے بھاگنا ہے نیز اپنے بھائیوں بلکہ تمام اہل سرحد کو بھی ساتھ لے جانا ہے۔ اگر وہ سید صاحب کے ساتھ شامل نہ ہوتا تو شاید سکھوں کے عتاب سے محفوظ رہتا۔ شامل ہونے کے بعد اپنے نامۂ اعمال سے دھبے کو دھونے کی شکل یہی تھی کہ اسلامی مقاصد کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا کر سکھوں کی خوشنودی حاصل کرتا۔ یہی اس نے کیا۔ سید صاحب کو زہر دیا۔ پھر جب فتح کے اسباب نمایاں ہو گئے تو اپنی سوچی سمجھی ہوئی سکیم کے مطابق اسے شکست سے بدلا۔

---

[1] "پیجٹ اینڈ میسن" صفحہ ۸۱۔ عمدۃ التواریخ کا بیان ہے کہ یار محمد خان نے اپنے بیٹے کو ایشر سنگھ، خوشحال سنگھ، دھنا سنگھ ملوئی اور دیوان بھوانی داس کے پاس بھیج دیا تھا۔ ساتھ چند گھوڑے بھی بطور نذر بھیجے تھے۔ [2] جلد دوم صفحہ ۲۳۔

ہم پہلے میسن کی زبان سے بتا چکے ہیں کہ اہلِ سرحد کو اپنے گرد جمع کر لینے میں سید صاحب کی غیر معمولی کامیابی نے اسے ارادت مندی پر آمادہ کر دیا تھا میسن ہی نے لکھا ہے: جب یار محمد خاں نے دیکھا کہ سید صاحب نے حاکمانہ حیثیت حاصل کر لی ہے تو اس کے دل میں وسوسے پیدا ہو گئے اور اس نے سکھوں کے ساتھ نامہ و پیام شروع کر دیا۔

لیکن سید صاحب نے قطعاً حاکمانہ حیثیت اختیار نہیں کی تھی۔ ہنڈ کی بیعت امامت جہاد کے لیے تھی۔ یار محمد خاں اس بیعت کے بعد سید صاحب کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ شیدو میں بھی سید صاحب صرف امام جہاد تھے، حاکم نہ تھے۔ پھر یار محمد خاں کے دل میں وسوسے پیدا ہونے کی کون سی وجہ تھی؟ سید صاحب اگر حاکم بھی بن جاتے تو ان کی حکومت یار محمد خاں کے لیے اس درجہ مذموم تو نہ ہونی چاہیے تھی کہ وہ رنجیت سنگھ کی تابعیت اور سرحد پر سکھوں کے تسلط کو ترجیح دینے کے لیے آمادہ ہو جاتا۔

سکھ دربار کا جشن

یہ فتح سکھ دربار کے نزدیک اتنی عظیم الشان تھی کہ اس کی خوشی میں توپیں سر کی گئیں اور شہر میں چراغاں کا حکم دیا گیا۔[1]

دیوان امرناتھ لکھتے ہیں:

چراغاں در لاہور و تمامی ممالک محروسہ شد و سرکار والا ہزارہا بر محتاجین و فقرا ایثار کردہ جشن شاہانہ فرمودند۔[2]	لاہور اور تمام سکھ مقبوضات میں چراغ جلائے گئے۔ رنجیت سنگھ نے شاہانہ جشن منایا، ہزاروں روپے محتاجوں اور فقیروں میں بانٹے گئے اور شاہانہ جشن منایا گیا۔

اس واقعے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سید صاحب کی تحریک جہاد نے سکھوں پر کس درجہ سراسیمگی طاری کر دی تھی اور فتح کو انھوں نے کتنی اہمیت دی۔ یار محمد خاں سے پامردی کی امید تو شاید ہو ہی نہیں سکتی تھی، لیکن اگر وہ غدر و خیانت سے دور رہتا اور غازیوں میں ابتری پیدا نہ کرتا تو بدھ سنگھ شیدو میں شکست کھا جاتا۔ اس کی فوج کٹ جاتی۔ ساز و سامانِ جنگ غازیوں کے ہاتھ لگتا اور ان کا دوسرا قدم حصار اٹک پر پڑتا۔ افسوس کہ یار محمد خاں کی نالائقی نے ان تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ درانی سردار اس وقت سے مستقل طور پر سکھوں کی تابعیت میں چلے گئے اور سید صاحب کی مساعی جہاد میں شدید رکاوٹیں پیدا کرنے لگے۔ اس سلسلے میں اہلِ سرحد کو جن ظلموں کا ہدف بننا پڑا، ان کے زخم سوا سو سال

---

[1] عمدۃ التواریخ دفتر دوم صفحہ ۳۴۱ - [2] ظفرنامہ دیوان امرناتھ صفحہ ۱۸۱

گزر جانے کے بعد بھی کاملاً مندمل نہیں ہوئے۔

غازیوں کا نقصان

کسی نے یہ نہیں لکھا کہ لڑائی کتنی دیر جاری رہی اور غازیوں کا کس قدر نقصان ہُوا۔ ہندوستانی غازیوں میں سے جو اصحاب نوشہرہ میں تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ پہر دن چڑھا ہوگا جب توپوں اور شاہینوں کے چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پہر ڈیڑھ پہر تک جاری رہنے کے بعد یہ آوازیں مَوقوف ہوگئیں۔ ہم ظہر کی نماز پڑھ چکے تو کسی نے بتایا کہ پیادوں اور سواروں کا غول آیا۔

اس سے ظاہر ہے گھمسان کی لڑائی پہر ڈیڑھ پہر سے زیادہ نہ ہُوئی۔ دیوان امرناتھ نے لکھا ہے کہ چھ ہزار غازی مقتول ہُوئے[1]۔ یہ پاک اور قیمتی خون صرف یار محمد خاں کی خیانت کے باعث رائیگاں بہا۔

---

[1] ظفرنامہ صفحہ ۱۸۱

سینتیسواں باب

سفرِ چنگلئی

شاہ اسماعیل کا انہماک

فتح و فیروزمندی کے آثار نمودار ہو جانے کے بعد یکایک شکست کے اسباب پیدا ہو جانا بالکل غیر متوقع تھا۔ مولانا شاہ اسماعیل سید صاحب کی سواری کے ہاتھی کو غالباً ایسی جگہ لے گئے تھے، جہاں سے لشکریوں کی آویزش گاہ اتنے فاصلے پر تھی کہ لڑائی کی لحظہ بہ لحظہ کیفیت معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔ سید صاحب پر پے در پے بے ہوشی کے دورے پڑتے تھے۔ مولانا انھیں سنبھالنے کے تردد میں بھی بہت منہمک ہوں گے۔ راوی بیان کرتا ہے کہ درانیوں اور ان کے ساتھ اہل سمہ کے فرار کو دیکھ کر مہاوت نے مولانا سے عرض کیا، مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ اب جلد سے جلد کسی محفوظ مقام پر پہنچ جانا چاہیے۔ مولانا نے حیران ہو کر پوچھا "چہ می گوئی؟ مسلماناں فتح یاب اند" (تو کیا کہتا ہے، مسلمان تو کامیاب ہیں) جب اس نے بتایا کہ درانی بھاگ گئے اور اہل سمہ نے ان کی پیروی میں میدان چھوڑ دیا تو مولانا کو پہلی مرتبہ حقیقت حال کا علم ہوا۔

شاہ صاحب کی شان ایثار

اس وقت سید صاحب بے ہوش تھے۔ ہاتھی کو تیز چلایا گیا[1] سارے لشکر اسلام میں چونکہ یہی ایک ہاتھی تھا، اس لیے بہت

---

[1] اس ہاتھی کے متعلق سب راویوں اور سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ لنگڑا تھا۔ چونکہ یار محمد خاں سکھوں سے سازباز کر چکا تھا، اس لیے اس نے دانستہ لنگڑا ہاتھی سواری کے لیے پیش کیا، لیکن مجھے یقین ہے کہ راویوں کو اس بارے میں غلط فہمی ہوئی اور سوانح نگاروں نے اس روایت کی اصلیت پر غور نہ فرمایا۔ اگر ہاتھی لنگڑا ہوتا تو مولانا شاہ اسماعیل جیسے بالغ نظر، دور اندیش اور دقیقہ سنج بزرگ سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہ سکتی تھی اور ہاتھی پر سوار ہونا لوازم جنگ میں سے نہ تھا کہ بدرجہ مجبوری لنگڑے ہاتھی ہی کی سواری قبول کر لی جاتی۔ میں جس حد تک اندازہ کر سکا ہوں، سید صاحب کو ہاتھی پر اس وجہ سے سوار کرنا پڑا کہ وہ سخت بیمار ہو گئے تھے اور جنگ میں ان کا شامل ہونا ضروری تھا۔ اگر وہ کسی کی اعانت کے بغیر گھوڑے پر سوار رہ سکتے تو کبھی ہاتھی پر سوار نہ ہوتے۔ ممکن ہے جنگ میں ہاتھی کے پاؤں کو خفیف سا گزند پہنچا ہو یا اس کی سستیِ رفتار سے بعض لوگوں کو لنگڑے پن کا دھوکا ہوا ہو۔ لیکن سید صاحب کی سواری کے وقت وہ قطعاً لنگڑا نہ ہو گا۔

نمایاں ہوگا اور یار محمد خاں نے سکھوں کو بتا دیا ہوگا کہ سید صاحب ہاتھی پر سوار ہیں، اس لیے ایک سکھ جیش نے ہاتھی کے تعاقب کا خاص اہتمام کیا۔ مولانا نے یہ دیکھا تو سید صاحب کو ہاتھی سے اُتار کر گھوڑے پر سوار کرا دیا اور خود ہاتھی ہی پر رہے۔ مقصود یہ تھا، تعاقب کرنے والے سکھ اس خیال سے ہاتھی کے پیچھے لگے رہیں کہ سید صاحب اس پر سوار ہیں۔ اس اثنا میں سید صاحب کو خطرے کے مقام سے دور نکل جانے کا موقع مل جائے[1] مولانا کی یہ جاں نثاری اور فداکاری ان کے اعمال حسنہ کا ایک نہایت شاندار واقعہ ہے۔ جب اندازہ فرما لیا کہ سید صاحب دُور نکل گئے تو مولانا بھی ہاتھی سے اُتر گئے۔ جو غازی آپ سے قریب تھے اُنھیں ساتھ لیا اور پیدل پشاور کی طرف روانہ ہو گئے[2]۔

فرار و انتشار کی حالت میں راہ و مقام کا کسے خیال ہو سکتا تھا۔ ہندوستانی غازی بھی مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ چند آدمی سید صاحب کے ساتھ تھے۔ ایک جماعت مولانا شاہ اسماعیل کی معیت میں تھی۔ ایک گروہ اکوڑہ پہنچ گیا، جہاں غازیوں کی لشکرگاہ تھی۔ ایک غازی کا بیان ہے کہ ہم وہاں پہنچے تو لوٹ کا منظر رونما تھا۔ جو اسباب اٹھانے کے قابل تھا ملکی لوگ سراسیمگی کی حالت میں اُٹھا کر بھاگے جا رہے تھے۔

سید صاحب کا سفر

سید صاحب پہلے تسر کے گھاٹ پر پہنچے۔ ہمراہیوں نے آپ کو گھوڑے سے اُتارا اور زین پوش بچھا کر اس پر لٹا دیا۔ پھر پتھر پر پتھر مار کر شعلہ پیدا کیا اور آگ جلائی تاکہ سردی زائل ہو جائے۔ سید عبدالرؤف شاہ نے گاؤں والوں کو جالا لانے کے لیے آواز دی۔ وہ لوگ خود سکھوں کی ترکتاز کے خوف سے گاؤں چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے، جالا کون لاتا؟ ناچار سید صاحب کو سوار کرا کے آگے بڑھے اور اس گھاٹ پر پہنچے جہاں دریائے ناگمان،

---

[1] وقائع میں ہے: فیل بان نے جب دیکھا کہ سکھوں کے سوار بندوقیں چلاتے ہوئے پیچھے آ رہے ہیں تو مولانا سے کہا کہ آپ کی خیر خواہی کے خیال سے عرض کرتا ہوں کہ حضرت کو گھوڑے پر سوار کرکے چند آدمیوں کے ہمراہ پہاڑ کی طرف جو ایک گاؤں ہے، ادھر کو روانہ کر دیجیے۔ آپ باقی جمعیت کے ہمراہ اسی ہاتھی پر سوار رہیے (۲۷۶) [2] ایک روایت میں ہے کہ پہلے اونٹ پر سوار کرایا گیا، پھر گھوڑے پر۔ شیخ کریم بخش فرماتے ہیں کہ مولانا نے سید صاحب کو رخصت کرتے وقت ساتھیوں کو کہہ دیا تھا کہ آپ سید صاحب کو پہاڑ کی طرف لے چلیں، میں دوسرے راستے سے پہنچ جاؤں گا۔ "منظورہ" میں ہے کہ پانچ چھ آدمی سید صاحب کے ساتھ تھے، جن میں سے تین کے نام یہ ہیں: شیخ صلاح الدین پھلتی، مولوی امیر الدین ولایتی اور سید عبدالرؤف۔

دریائے سوات سے ملتا ہے۔ وہاں صرف ایک کشتی تھی اور دریا کو عبور کرنے والے آدمی بہت زیادہ تھے۔ پھر ان لوگوں پر اس درجہ اضطراب طاری تھا کہ کشتی کنارے پر پہنچنے نہیں دیتے تھے، دریا میں گھس پڑتے اور سوار ہو ہو کر کنارے کی طرف لے جاتے۔ شیخ صلاح الدین پھلتی، سید صاحب کو گھوڑے ہی پر دریا میں لے گئے تاکہ پہلے سوار ہو جائیں۔ اتفاق سے گھوڑے کا پاؤں پھسلا اور سید صاحب پانی میں گر گئے۔ اس اثنا میں اشرف خاں رئیس زیدہ پہنچ گیا۔ وہ کشتی کے پاس نیزہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ جو شخص قریب آتا اُسے نیزے سے پیچھے ہٹا دیتا۔ اس نے پہلے سید صاحب اور ان کے ساتھیوں کو سوار کرایا اور دریا سے پار اُتارا۔ جو لوگ رہ گئے، وہ دوسرے گھاٹ سے پار اُتر کر بابڑہ میں سید صاحب سے ملحق ہوئے[1]

مولانا شاہ اسماعیل، پشاور پہنچے۔ شہر سے باہر ٹھہر کر کھانا منگایا۔ سلطان محمد خاں کو اُن کے آنے کا علم ہوا تو پیغام بھیجا کہ میرے بھائی یار محمد خاں کو آپ لوگوں سے سخت عداوت ہے۔ بہتر یہ ہو گا کہ آپ جلد چلے جائیں۔ چنانچہ شاہ صاحب زیادہ دیر نہ ٹھہرے اور بابڑہ میں سید صاحب کے پاس پہنچ گئے۔

باقی منزلیں

دریا سے پار اُترنے کے بعد کی منزلوں کے متعلق روایتیں مختلف ہیں۔ وقائع کا بیان ہے کہ چارسدہ کے سادات سید صاحب کو لے گئے۔ اس وقت آپ کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اور آپ اکثر بے ہوش رہتے تھے۔ جب ہوش آتا اور مولانا حال پوچھتے تو فرماتے: "اللہ کا شکر ہے؛ اندیشہ نہ کیجیے، خدا مجھے بچا لے گا۔" پھر سادات نے آپ کو جلالکہ اور تمبٹی کے راستے پلٹی اور وہاں سے باغ پہنچا دیا۔

منظورہ کا بیان ہے، بابڑہ پہنچے تو سید صاحب پر زہر کا اتنا اثر ہو چکا تھا کہ گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتے تھے لہٰذا چارپائی پر لٹا کر چار آدمیوں نے اٹھایا۔ ڈاگئی ہوتے ہوئے گوجر گڑھی گئے۔ جہاں لوگوں نے بہ اصرار روک لیا۔ ان سے کہا بھی گیا کہ درانی سید صاحب کے دشمن ہیں، مبادا اس مہمانداری کی

---

[1] وقائع میں ایک روایت ہے کہ تورو کے معاً دمی لڑائی سے اپنے گاؤں پہنچے تو بہادر خاں رئیس تورو نے ان سے سید صاحب کا حال پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ آدمی سید صاحب کو چارپائی پر اٹھائے ہوئے گھاٹ پر پہنچے تو وہاں ملکیوں اور درانیوں کا ہجوم تھا اور وہ سید صاحب کی چارپائی کشتی پر نہیں رکھنے دیتے تھے۔ بعض لوگوں نے بتایا کہ یار محمد خاں نے اس غرض سے درانیوں کو گھاٹ پر بھیج دیا ہے کہ سید صاحب کو پار نہ اُترنے دیں، اس اثنا میں سکھ آ پہنچیں گے اور وہ سید صاحب کو گرفتار کر لیں گے۔ پھر شاہ اسماعیل گھاٹ پر آ پہنچے۔ انھوں نے چارپائی کشتی پر رکھوائی۔ اس طرح سید صاحب پار اُترے۔ میرے نزدیک وہی روایت صحیح ہے، جسے متن میں نقل کر چکا ہوں۔

پاداش میں تمھیں گزند نہ پہنچائیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم درانیوں سے خود سمجھ لیں گے۔ گوجر گڑھی میں غالباً ایک رات گزاری۔ وہاں سے نکلے تو موضع محب ہوتے ہوئے سُرخ ڈھیری[1] پہنچے۔ وہاں کے ملک فیض اللہ خاں نے سید صاحب کی چارپائی اٹھانے کے لیے بارہ قوی آدمی مہیا کر دیے۔ یوں آپ کو پہلے بلغ پہنچایا گیا، جو درے کے عین دہانے پر واقع ہے۔ پھر چنگلئی لے گئے۔

میرے نزدیک "منظورہ" کا بیان زیادہ قرینِ صحت ہے، اس لیے کہ چارسدہ سے جلالہ اور مجھئی جانے میں میری معلومات کے مطابق بڑا چکر کاٹنا پڑتا ہے۔ سید صاحب اس وقت سخت تکلیف میں تھے، نیز انھیں جلد سے جلد محفوظ مقام پر پہنچانا ضروری تھا اس لیے میرا خیال ہے کہ زیادہ لمبا اور چکر والا راستہ اختیار نہ کیا ہوگا۔ تاہم دشمن کے تعاقب سے محفوظ رہنے کے لیے قریبی راستہ چھوڑ کر طویل راستہ اختیار کر لینا خارج از قیاس نہیں سمجھا جا سکتا۔

سید صاحب کے رفقاء

میں عرض کر چکا ہوں کہ سید صاحب کے رفقاء شیدو کے میدان ہی میں بکھر گئے تھے۔ چند اصحاب سید صاحب کے ساتھ رہے۔ ایک جماعت مولانا اسماعیل کے ساتھ تھی، جو میری معلومات کے مطابق باٹڑہ میں سید صاحب سے مل گئے۔ کچھ لوگ شیدو سے نوشہرہ پہنچ گئے۔ وہاں پہلے سے زخمی اور بیمار غازیوں نیز اُن کے تیمارداروں کی ایک جماعت موجود تھی۔ انھیں پیغام بھیج دیا ہوگا کہ نوشہرہ کو چھوڑ دو۔ تندرست غازیوں نے کجاوے اونٹوں پر باندھے۔ خچر اور ٹٹو بھی تیار کیے، سب سے پہلے ان لوگوں کو سوار کیا گیا جو چلنے پھرنے سے بالکل معذور تھے انھیں تورو پہنچا کر سواریاں واپس آئیں تو باقی بیماروں کو سوار کیا گیا۔ تندرست لوگ پیدل تورو پہنچ گئے۔ زخمیوں اور بیماروں میں سے مندرجہ ذیل اصحاب کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:

(۱) شیخ ولی محمد پھلتی (۲) شیخ امجد علی غازی پوری (۳) قاضی حمایت اللہ (۴) قاضی برہان الدین (۵) ابراہیم خاں خیرآبادی (۶) خدا بخش منجھانوی (۷) عبدالوہاب لکھنوی ناسم غلہ (۸) حاجی حمزہ علی خاں۔ (۹) سید رستم علی چل گانؤں (۱۰) خدا بخش چارنالی بندوق والے (۱۱) حاجی عبداللہ (مولانا اسماعیل کی جماعت کے)۔

مولوی فتح علی فرماتے ہیں کہ دیر تک اناج کا ایک دانہ بھی میسر نہ آسکا۔ پھر جوار ملی جو خود بھی کھائی

---

[1] روایتوں میں اسے سرڈھیری لکھا گیا ہے۔ "سر" اصل میں سوُر ہے (بروزن قمر) پشتو میں بہ معنی "سُرخ"۔ آج کل اسے عام طور پر "سُرخ ڈھیری" کہتے ہیں، اس لیے میں نے مروج نام اختیار کیا۔

اور گھوڑوں کو بھی کھلائی۔ تورو پہنچے تو وہاں کے رئیس بہادر خاں نے مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جانور بھوکے تھے، خان نے کہا کہ انھیں ہمارے گیہوں کے کھیتوں میں چھوڑ دیا جائے۔ سب لوگ سید صاحب کی بابت پوچھتے تھے۔ چونکہ تورو بھی خطرے میں تھا اور افواہ تھی کہ سکھ اس طرف پیش قدمی کرنے والے ہیں، اس لیے وہاں ٹھہرے رہنا خلاف مصلحت تھا؛ چنانچہ نکل پڑے۔ ڈاگئی میں مولوی مظہر علی اور خیر اللہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ ضعف اور تکان کے باعث سید صاحب کے قافلے سے پیچھے رہ گئے تھے۔ ان سے سید صاحب کے چنگلئی جانے کا حال سنا تو سب کو اطمینان ہو گیا۔

ڈاگئی میں مصری باندہ، دوڈھیر، لہاور، جلسئی، کنڈوہ وغیرہ کے مہاجرین بھی موجود تھے۔ وہاں کے خان کو یہ خوف لاحق ہوا کہ سکھوں کو ان لوگوں کی موجودگی کا علم ہوگا تو ضرور یورش کریں گے، اس لیے سب سے کہا کہ جلد نکل جاؤ۔ لیکن شدید بارش ہو رہی تھی اور رات کی تاریکی میں ان لوگوں کے لیے سفر کی کوئی صورت نہ تھی اور وہ راستے سے بالکل ناواقف تھے۔ مجبوراً بھوکے پیاسے رات گزاری اور علی الصباح بارش ہی میں روانہ ہو گئے۔ اڑھائی کوس گئے ہوں گے کہ مطلع صاف ہو گیا۔ نواکلئی ہوتے ہوئے شیخ جانا پہنچے۔ ایک رات وہاں گزاری۔ ایک رات دامن کوہ کے ایک گاؤں میں بسر کی۔ پھر بعض پنجتار میں ٹھہر گئے، بعض چنگلئی میں سید صاحب کے پاس چلے گئے۔ غازیوں کی متفرق ٹولیاں کئی روز تک آہستہ آہستہ پہنچتی رہیں۔

قیام چنگلئی

چنگلئی میں سید صاحب کے لیے اور بعض دوسرے غازیوں کے لیے کچھ مکان خالی کرا لیے گئے تھے، باقی غازی حجروں اور مسجدوں میں ٹھہر گئے۔ آٹھ روز تک سید صاحب پر بے ہوشی کے دورے پڑتے رہے۔ جب طبیعت بحال ہو گئی تو جنگ اور بعد کی مصیبتوں کا پورا حال سنا۔ اس وقت آپ نے پنجتار اور تورو کے غازیوں کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔

راہ اخلاص و ایثار میں انسان کے لیے بعض اوقات امتحان کے نہایت کٹھن مرحلے پیش آ جاتے ہیں، جن میں عزم و ہمت کو تزلزل سے محفوظ رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ سید صاحب نے کس طرح صرف اسلام و مسلمین کی بہتری کے لیے قربانی کی منزل میں جانبازانہ قدم رکھا تھا اور کس طرح ایک حق ناشناس فرد یا گروہ کی نالائقی کے باعث فتح شکست میں بدلی، ہزاروں مسلمانوں کا قیمتی خون

---

[1] ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ بعض غازی تورو ہی میں رہے۔ ان میں سے سید حمید الدین خواہر زادہ سید صاحب نیز سید ابوالقاسم اور سید موسیٰ (صاحبزادگان سید احمد علی برادر سید حمید الدین) کے اسمائے گرامی بتصریح موجود ہیں۔

لاحاصل بہا۔ سرحد کی مختلف آبادیوں کو اور خود سید صاحب نیز ان کی جماعت کو خوفناک آفتوں سے سابقہ پڑا۔ اس نازک امتحان سے وہی لوگ محفوظ و مامون گزر سکتے ہیں، جن کے ایمان پہاڑوں سے زیادہ مضبوط و مستحکم ہوں۔ سید صاحب نے سارے حالات سُن کر فرمایا:

> یہ جو کچھ حال ہم پر اور سب بھائیوں پر گزرا، کچھ جنابِ الٰہی میں ہم لوگوں سے خطا اور بے ادبی ہوئی ہے اسی کا یہ بدلا ہے اور یہ بھی ایک امتحان تھا۔ وہ سبحانہٗ تعالیٰ ایسی ایسی آزمائشوں پر ہم کو اور ہمارے مجاہدین بھائیوں کو ثابت قدم رکھے اور ہماری تکلیفوں کو ساتھ راحت کے بدل دے۔ اور ان لوگوں نے جو ہم کو زہر دیا سو یہ بھی حکمت الٰہی سے خالی نہیں۔ یہ بھی ایک سنتِ حضرت خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہم سے ادا ہوئی۔

بارگاہِ الٰہی میں دُعا

پھر ننگے سر ہو کر عجز و الحاح سے جناب باری میں دعا کرنے لگے:

> الٰہی! ہم سب تیرے بندے ذلیل و خاکسار و عاجز و ناچار ہیں۔ سوا تیرے کوئی ہمارا حامی و مددگار نہیں۔ محض تیرے ہی فضل و کرم کے امیدوار ہیں۔ ہم تیرے امتحان و آزمایش کے قابل نہیں ہیں۔ ہماری خطاؤں کو نہ پکڑ، اپنی رحمت سے معاف کر اور ہم کو اپنے صراط مستقیم پر ثابت قدم رکھ۔ جو لوگ تیری اس راہ کے مخالف ہیں، ان کو ہدایت کر۔

اس قسم کے الفاظ دیر تک آپ کی زبان پر جاری رہے۔ پھر آپ نے غازیوں کو تسلی دی اور فرمایا: بھائیو! گھبراؤ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم پر اپنا فضل و کرم کرے گا[1]

مقامِ رضا میں عزیمت کا نقشہ

اسے کہتے ہیں للّٰہیت اور یہ ہے عزیمت و سبقت فی الخیرات کا حقیقی عملی نقشہ۔ صرف اللہ کی رضا کے لیے خاندان و وطن کے ہر محبوب پیوند کو بے تکلف قطع کیا۔ ہزاروں میل کا دشوار گزار راستہ طے کر کے ایک اجنبی سرزمین میں پہنچے۔ صرف اللہ کی رضا کے لیے جہاد کا علم بلند کیا اور دعوت و ارشاد سے ایک لاکھ فرزندانِ توحید کو اس کے نیچے جمع کر دیا۔ صرف اللہ کی رضا کے لیے نہایت طاقتور دشمن کے مقابلے پر سربکف جا کھڑے ہوئے۔ اپنوں نے، جو بظاہر ارادت مندی کے ساتھ بیعت امامت کر چکے تھے، دشمن سے ساز باز کر کے زہر دے دیا۔

---

[1] وقائع صفحہ ۴۷۱، ۴۷۲

اپنوں کی خیانت کے باعث فتح شکست میں تبدیل ہوئی۔ پھر صدہا نادیدہ و ناشنیدہ مصیبتیں برداشت کرتے ہوئے ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں قیام اور خور و نوش کے اسباب بھی بقدرِ کفایت میسر نہ تھے۔ لیکن پاک نفسی کا یہ رنگ ہے کہ ہر افتاد کو اپنے نفس کی خطا، اپنے عمل کی کوتاہی اور اپنی تدبیر کی درماندگی سے منسوب کرتے ہیں اور اللہ کی رضا کے لیے صراطِ مستقیم پر چٹان کی طرح جمے کھڑے ہیں۔ قدم میں لرزش، حوصلے میں لغزش یا دل میں تذبذب کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ اس ترازو میں ہم اپنے ایمان باللہ، اپنی حمیتِ دین اور اپنی شانِ اخلاص کو تولیں تو نتیجہ کیا نکلے گا؟ پھر اس سے بڑھ کر بدبختی اور حرماں نصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ سیکڑوں مسند نشینانِ شریعت اور سیکڑوں سجادہ گسترانِ طریقت سوا سو برس تک اس بزرگ مجاہد اور اس کی قدوسی جماعت کو ایک دوسرے سے آگے بڑھ بڑھ کر گوناگوں ملام و مطاعن کا ہدف بناتے اور حبِ اسلام ہی نہیں بلکہ اسلام کو بھی محلِ نظر بتاتے رہے؟ ہم سب نے ان مطاعن کو اس شوق و لذت سے سنا گویا یہ حفظِ دین کے لیے نیکی اور پارسائی کا یگانہ کارنامہ تھا:

لِمِثْلِ هٰذَا يَذُوبُ الْقَلْبُ مِنْ كَمَدٍ
اِنْ كَانَ فِي الْقَلْبِ اِسْلَامٌ وَّ اِيْمَانٌ

ابتلا پر ابتلا

ابتلا اور آزمائش کا دور شیدو کی جنگ پر ختم نہ ہوا بلکہ چنگلئی پہنچ جانے کے بعد بھی بدستور قائم رہا۔ سید صاحب تندرست ہو گئے۔ ایک طرف اکثر غازی ناسازگاریِ آب و ہوا کے باعث بیمار پڑ گئے اور روزانہ ایک ایک، دو دو، تین تین فوت ہونے لگے، دوسری طرف معاش کی تنگی انتہا کو پہنچ گئی۔ مولوی فتح علی فرماتے ہیں کہ سیکڑوں میں سے چھ سات تندرست رہے ہوں گے اور ان کی حالت یہ تھی کہ دن رات کا ایک ایک لمحہ بیماروں کی تیمارداری اور غمخواری میں صرف ہونے لگا۔ سید رستم علی (ساکن چل گاؤں) اکوڑہ میں زخمی ہوئے تھے۔ وہ اڑھائی مہینے نوشہرہ میں صاحبِ فراش رہے۔ چنگلئی پہنچنے پر ان کی صحت پوری طرح بحال نہیں ہوئی تھی، تاہم تنہا چالیس بیماروں کی تیمارداری کا بوجھ اٹھا لیا اور حتی المقدور کسی کو بھی ذرا سی تکلیف نہ ہونے دی۔

عسرت کا یہ حال کہ ہر شخص کو روزانہ صرف مٹھی بھر جوار ملتی تھی۔ تندرست غازی اسے پیس کر روٹیاں پکاتے اور کھا لیتے۔ بیماروں کے لیے پانی میں اُبال کر آش بنا دیتے۔ جب مٹھی بھر جوار بھی نہ ملتی تو یہ لوگ باہر جنگل میں نکل جاتے اور ایسی جڑی بوٹیاں تلاش کرتے یا درختوں کے ایسے پتے توڑ لاتے جو کھانے میں بدمزہ نہ ہوتے اور پانی میں جوش دینے سے گل جاتے۔ انھیں چیزوں کو بڑی بڑی ہانڈیوں میں ابالتے اور نمک ڈال کر خود بھی کھاتے، مریضوں کو بھی کھلا دیتے۔ یہ تو غذا کی کیفیت تھی اور دوا؟ سرحد کے جنگلوں میں ایک بوٹی

ہوتی ہے، جیسے پشتو میں "ترو کہ"، اردو میں "تپتیا" اور فارسی میں "سر برگر" کہتے ہیں۔ ذائقے میں ذرا ترش ہوتی ہے۔ اسے پیس کر پانی میں پکاتے اور نمک ڈال کر مریضوں کو پلا دیتے۔ یہ ان خاصانِ بارگاہ الٰہی کا "کونین مکسچر" تھا، جو اپنی جانیں اسلام و مسلمین کی سربلندی کے لیے قربان کر دینے کا حلف اٹھا چکے تھے:

دل خون شد و شرط جاں گدازی این است | در حضرت تو کمینہ بازی این است
با این ہمہ ہیچ دم نمی آرم زد | شاید کہ ترا بندہ نوازی این است

رضا بہ قضا

لیکن سب اپنے مالک و مولا کی رضا پر دل سے صابر و شاکر تھے۔ سب کی آرزو یہ تھی کہ "رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ" کے مقام بلند سے نیچے نہ گریں۔ خدا ان سے یقیناً راضی تھا، اس لیے کہ ان کے تمام اعمال مسلک رضا کے عین مطابق تھے، لیکن وہ بھی خدا سے راضی تھے۔ جن حالات کو ہم تکلیف و مصیبت سے تعبیر کرتے ہیں، ان لوگوں کے لیے وہ بھی سراپا رحمت و آسودگی کا پیغام تھی، اس لیے کہ خدائے پاک نے اپنی حکمتِ بالغہ سے ان کے لیے یہ حالات پسند فرمائے۔ رضا کا مضمون یہی ہے کہ خدا کی طرف سے جو کچھ پیش آئے، اُسے خوش دلی سے قبول کیا جائے۔ حافظ نے اس مقام میں کیا خوب کہا ہے:

بہ دُرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ آنچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

اہل صادق پور کی شانِ ایثار

اس زمانے میں جن اصحاب نے وفات پائی، ان سب کے نام معلوم نہ ہو سکے۔ ان میں سے صرف دو کے نام مجھے مل سکے: ایک مولوی طالب علی، عرف طالب حسین، دوسرے عبداللہ بسم اللہ۔ مولوی طالب علی مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے چھوٹے بھائی تھے۔ صرف اٹھارہ انیس برس کے جوان۔ شیدو کی جنگ میں شریک تھے۔ ورم جگر و طحال میں مبتلا رہ کر چنگلئی میں فوت ہوئے۔ اللہ اکبر اہل صادق پور (عظیم آباد) کی شانِ ایثار فی اللہ کتنی بلند ہے! سرحد میں یہاں ان کے شہدا موجود نہیں!! مولانا ولایت علی کے عم زاد بھائی، مولوی باقر علی، سید صاحب کی جماعت کے پہلے شہید تھے، وہ اکوڑہ میں دفن ہوئے۔ ایک حقیقی بھائی، مولوی طالب علی کو چنگلئی کی زمین پسند آئی۔ دوسرے حقیقی بھائی مولانا عنایت علی نارنجی اور منگل تھانہ میں لڑتے ہوئے ستھانہ سے اوپر چنبئی کے پہاڑوں میں جا سوئے۔ خود مولانا ولایت علی ستھانہ کی مجاہد خیز خاک میں آسودۂ خواب ہیں۔ ان کے فرزندوں میں سے مولانا عبداللہ نگرئی میں دفن ہوئے اور مولانا عبدالکریم اسمست میں اور اخلاف و اقربا خدا جانے کہاں کہاں بکھرے پڑے ہیں۔ پھر ان مردانِ حق نے علاقہ سرحد پر قناعت نہ کی بلکہ خلیج بنگال

کے ان ٹاپوؤں میں بھی شہادت کے جھنڈے جا گاڑے، جنھیں عام طور پر "کالے پانی" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مولانا احمد اللہ اور مولانا یحییٰ علی انڈیمان کے دو مختلف جزیروں میں سوئے پڑے ہیں۔ گویا صادق پور والوں کے دل میں آرزو تھی کہ یوم النشور آئے تو حتی المقدور کوئی خطۂ ارضی ایسا نہ رہے، جہاں سے ان کے شہدا مالک حقیقی کی حمد و ثنا کے ترانے گاتے ہوئے نہ اٹھیں:

خیزند چوں زخاک شہیدان ما بہ حشر　　در محشر آوریم دو عالم سپاہ را

عبداللہ بسم اللہ

عبداللہ بسم اللہ مخنثوں کے طائفے میں شامل تھے۔ سید صاحب کی زیارت نصیب ہوئی تو فطری سعادت کی برکت سے بیعت توبہ کر لی۔ پھر مرشد کا دامن ایسا تھاما کہ تادم واپسیں الگ نہ ہوئے۔ شیدو کی جنگ میں شریک تھے۔ چنگلئی میں وفات پائی۔ راویوں کا بیان ہے کہ جوان ہی تھے:

با فلک گویم کہ آرامم نگر　　دیدۂ آغاز و انجامم نگر

ضمیمہ

سید صاحب کے ساتھ جو غازی گئے تھے، ان کی تعداد میرے اندازے کے مطابق پانچ سو اور چھ سو کے درمیان تھی۔ ایک جماعت قندھاریوں کی راستے میں مل گئی تھی۔ ٹونک اور دوسرے مقامات سے بھی اکا دکا غازی شامل ہو گئے تھے۔ ان سب کے نام معلوم نہ ہو سکے۔ دوران قیام چنگلئی میں جو غازی سید صاحب کے ساتھ تھے، ان میں سے جن جن اصحاب کے نام مولوی فتح علی عظیم آبادی کو یاد تھے، ان کی ایک فہرست انھوں نے بعد میں مرتب کر دی تھی۔ میں نے اسے سامنے رکھ کر ترتیب کے ساتھ ایک نئی فہرست تیار کر دی ہے، جو ذیل میں درج ہے:

۱۔ سید حمید الدین (خواہرزادہ سید صاحب)
۲۔ سید حسن مثنیٰ عرف سید موسیٰ [سید احمد علی خواہرزادہ سید صاحب کے صاحبزادے]
۳۔ سید ابو القاسم کے صاحبزادے۔
۴۔ سید ابو محمد نصیر آبادی
۵۔ سید داؤد ابو الحسن 〃
۶۔ سید اسماعیل رائے بریلی
۷۔ شیخ عبد الرحمٰن 〃
۸۔ شیخ احمد اللہ (۷ کے بھائی) 〃
۹۔ عبد الرحمٰن خاں 〃
۱۰۔ محمد سعید خاں 〃
۱۱۔ خدا بخش جنگی 〃
۱۲۔ مہربان خاں 〃
۱۳۔ زین محمد پلیشنی 〃
۱۴۔ اکبر خاں 〃
۱۵۔ نور داد خاں یکہ 〃
۱۶۔ حافظ الٰہی بخش 〃
۱۷۔ عنایت اللہ رائے بریلی
۱۸۔ نور بخش جراح 〃
۱۹۔ رحیم بخش 〃
۲۰۔ حاجی جانی 〃
۲۱۔ مولانا شاہ اسماعیل دہلوی
۲۲۔ مولانا محمد یوسف پھلت
۲۳۔ شیخ ولی محمد 〃
۲۴۔ میانجی محی الدین 〃
۲۵۔ سعد الدین 〃
۲۶۔ عماد الدین 〃
۲۷۔ ضیاء الدین 〃
۲۸۔ صلاح الدین 〃
۲۹۔ ناصر الدین 〃
۳۰۔ عبد الحکیم 〃
۳۱۔ عبد الواحد 〃
۳۲۔ محمد حسن 〃

۳۳- عبدالرؤف	پھلت
۳۴- عبدالرحمٰن	〃
۳۵- مولانا ولایت علی	عظیم آباد
۳۶- میر امام علی	〃
۳۷- واجد علی	〃
۳۸- محمدی	〃
۳۹- سید کرامت اللہ	〃
۴۰- حاجی ولی اللہ	〃
۴۱- عبدالواحد	〃
۴۲- بنی حسین	〃
۴۳- طالب علی (برادر مولانا ولایت علی)	〃
۴۴- مظہر علی	〃
۴۵- عبدالقادر	〃
۴۶- عبدالرحیم	〃
۴۷- فسیح علی	〃
۴۸- مولوی امام الدین	بنگال
۴۹- ظہور اللہ	〃
۵۰- لطف اللہ	〃
۵۱- طالب اللہ	〃
۵۲- فیض الدین	〃
۵۳- قاضی مدنی	〃
۵۴- مولوی محمدی انصاری (بردوانی) (میر منشی سید صاحب	〃
۵۵- شکر اللہ	لکھنؤ
۵۶- امان اللہ	〃
۵۷- قادر بخش ۱؎	لکھنؤ
۵۸- قادر بخش ۲؎	〃
۵۹- عبدالکریم	〃
۶۰- محمود خاں	〃
۶۱- عبدالخالق	غازی پور
۶۲- کریم اللہ	〃
۶۳- خدا بخش	〃
۶۴- غازی خاں	〃
۶۵- مظہر علی	〃
۶۶- میاں گدڑی	〃
۶۷- میاں لاہوری	〃
۶۸- امجد علی (فرزند مولوی فرزند علی رئیس)	〃
۶۹- شیخ درگاہی	〃
۷۰- حاجی زین الدین	رام پور
۷۱- نعیم خاں	〃
۷۲- حاجی عبداللہ	〃
۷۳- پیر خان	〃
۷۴- میاں خدا بخش	〃
۷۵- میاں الٰہی بخش (برادر ۷۴)	〃
۷۶- رحمت خاں	〃
۷۷- پیر خاں	مدراس
۷۸- عمر خاں	〃
۷۹- منگل خاں	〃
۸۰- عبدالجبار خاں	〃
۸۱- خیریت خاں	〃

۸۲ - خدا بخش	تھانیں
۸۳ - رمضانی خاں	〃
۸۴ - عبدالسبحان خان	〃
۸۵ - فقیر اللہ	〃
۸۶ - شیخ رمضانی	〃
۸۷ - کریم بخش	بنارس
۸۸ - احمد	〃
۸۹ - عبدالمنان	〃
۹۰ - خدا بخش	〃
۹۱ - حافظ جانی	پانی پت
۹۲ - حافظ مانی	〃
۹۳ - حافظ محب اللہ خاں	〃
۹۴ - دینا شاہ	〃
۹۵ - حافظ امام الدین	〃
۹۶ - پیر محمد	〃
۹۷ - حافظ عبدالکریم	〃
۹۸ - قاضی حمایت اللہ	منجھاؤں
۹۹ - برہان الدین	〃
۱۰۰ - شیخ عبدالوہاب	〃
۱۰۱ - خدا بخش	〃
۱۰۲ - نور محمد	فتح پور
۱۰۳ - احمد اللہ	〃
۱۰۴ - عبدالرحیم	
۱۰۵ - حمزہ علی خاں	لہاری
۱۰۶ - عبدالحکیم خاں	〃

۱۰۷ - کریم بخش	گھاٹم پور
۱۰۸ - کریم بخش (وطن نامعلوم)	
۱۰۹ - حاجی یوسف کشمیری	
۱۱۰ - پیر خاں دکنی	
۱۱۱ - شیخ منور قدوائی	
۱۱۲ - مولوی امیر الدین ولایتی	
۱۱۳ - سید انور شاہ امرتسری	
۱۱۴ - عبداللہ احمد آبادی	
۱۱۵ - فقیر اللہ 〃	
۱۱۶ - شیخ عبدالرحمن حیدرآبادی	
۱۱۷ - امام الدین بمبئی	
۱۱۸ - محمدی 〃	
۱۱۹ - عبداللہ گجراتی	
۱۲۰ - حاجی عبدالرحیم ولایتی	
۱۲۱ - سید رستم علی چل گاؤں	
۱۲۲ - کریم بخش خیاط	فیض آباد
۱۲۳ - عبداللہ	〃
۱۲۴ - اللہ بخش	〃
۱۲۵ - حافظ ولی محمد	وطن نامعلوم
۱۲۶ - حافظ اللہ یار	〃
۱۲۷ - حافظ میر خاں	〃
۱۲۸ - مولوی سعد اللہ	〃
۱۲۹ - مولوی عباد اللہ	〃
۱۳۰ - عبدالرحمن مدراسی	
۱۳۱ - بادل خاں	وطن نامعلوم

۱۳۲۔ واصل خاں وطن نامعلوم
۱۳۳۔ ارادت خاں ”
۱۳۴۔ ابراہیم خاں برادر ۱۳۳ ”
۱۳۵۔ نہال خاں
۱۳۶۔ مستقیم خاں
۱۳۷۔ غازی الدین
۱۳۸۔ شیخ امام علی
۱۳۹۔ محمد حسن جعفی
۱۴۰۔ لعل محمد
۱۴۱۔ لکھمیر جگدیش پور
۱۴۲۔ منصب خاں
۱۴۳۔ شیخ رحم علی
۱۴۴۔ مرزا امانت علی
۱۴۵۔ عبداللہ والیا
۱۴۶۔ عبدالرزاق نگرامی
۱۴۷۔ نور احمد (مؤرخ اسلام) نگرامی
۱۴۸۔ ابراہیم خاں
۱۴۹۔ شادل خاں
۱۵۰۔ میاں جی نظام الدین چشتی
۱۵۱۔ ظہور اللہ (ن ۱۵۰ کا بھائی)
۱۵۲۔ نظام الدین اولیاء
۱۵۳۔ حاجی رحیم بخش
۱۵۴۔ شیخ حسن علی
۱۵۵۔ عبدالقادر (برادر زادہ ۱۵۳)
۱۵۶۔ محمد خاں گنگنوی
۱۵۷۔ دین محمد
۱۵۸۔ عبدالقیوم
۱۵۹۔ شیخ امیر اللہ تھانوی
۱۶۰۔ شیخ کرامت اللہ
۱۶۱۔ قنبر
۱۶۲۔ نصیر الدین منگلوری
۱۶۳۔ بخش اللہ خورد
۱۶۴۔ سید جمعیت علی
۱۶۵۔ فرجام (خادم سید صاحب)
۱۶۶۔ عبدالرحیم حجام
۱۶۷۔ فیض اللہ شیدی
۱۶۸۔ میرزا امیر بیگ
۱۶۹۔ نظام الدین خاں
۱۷۰۔ سید صادق علی
۱۷۱۔ شیخ بلند بخت دیوبندی
۱۷۲۔ مراد خاں خورجوی
۱۷۳۔ بخش اللہ ”
۱۷۴۔ شیخ نصر اللہ ”
۱۷۵۔ عبدالرحیم
۱۷۶۔ مخدوم بخش
۱۷۷۔ نور سندھی
۱۷۸۔ رحمت خاں رام پوری
۱۷۹۔ محمد حسین سہارن پوری
۱۸۰۔ کریم بخش ”
۱۸۱۔ میر محمد قاصد

۱۸۲ - لعل محمد قندھاری

۱۸۳ - ملا عزت

۱۸۴ - ملا قطب الدین ننگرہاری

۱۸۵ - ملا بازار

۱۸۶ - ملا جمعہ

۱۸۷ - خان بہادر خان

۱۸۸ - خیر اللہ خاں غزنوی

۱۸۹ - ملا گلزار

۱۹۰ - اللہ بخش

۱۹۱ - خضر خاں

۱۹۲ - قلندر

۱۹۳ - نور محمد

۱۹۴ - محمد

۱۹۵ - ملا نور خاں

۱۹۶ - احمد

۱۹۷ - ملا علی خاں

۱۹۸ - مومن خاں

۱۹۹ - سید دین محمد

۲۰۰ - عبداللہ بسم اللہ

ان میں اکوڑہ نیز بازار وغیرہ کے شہدا شامل کر لیے جائیں تو میرے اندازے کے مطابق دو سو باون نام بنتے ہیں۔ باقی اصحاب کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ آگے چل کر بعض ایسے نام آئے ہیں، جو اس فہرست میں نہیں ملتے اور اس وقت تک ہندوستان سے غازیوں کے قافلے نہیں آئے تھے۔ ممکن ہے ان لوگوں کے نام مولوی فتح علی کو یاد نہ رہے ہوں۔

اڑتیسواں باب

بونیر وسوات کا دورہ

دَورے کا آغاز

چنگلئی میں سید صاحب قریباً ایک مہینا ٹھہرے رہے۔ پھر دعوت جہاد کی غرض سے بونیر وسوات کے دورے کا ارادہ فرمایا۔ بیمار غازیوں کی دیکھ بھال کا کام شیخ ولی محمد پھلتی کے حوالے کیا اور فرمایا کہ جو بھائی تندرست ہوتے جائیں، انھیں ہمارے پاس بھیجتے جائیں۔ خود غازیوں کی ایک جماعت کے ساتھ بونیر کی جانب روانہ ہوئے۔[1] چنگلئی اور وادی چملہ کے درمیان ایک بلند پہاڑ ہے، اس کی چوٹی پر پہنچے تو ننگے سر ہو کر دیر تک دعا میں مشغول رہے، پھر فرمایا: امید ہے بارگاہ باری تعالیٰ میں ہماری دعا قبول ہو اور تکلیف دُور ہو جائے۔

پہاڑ سے اُتر کر ظہر کے وقت کوگا پہنچے، جو درۂ امبیلہ کے قریب وادی چملہ کا ایک مشہور گاؤں ہے اور وادی کے جنوبی ومغربی گوشے میں واقع ہے۔ امبیلہ وادی کے شمال ومغربی گوشے میں کوگا سے تین چار میل کے فاصلے پر ہوگا۔ اتنی ہی دور ناواگئی ہے، جو پہلے بھی ممتاز مقام تھا، آج کل چملہ تحصیل کا مستقر ہے۔ میرا خیال ہے کہ دورہ شروع کرنے سے پیشتر چملہ اور بونیر کے اکابر کو پیغامات بھیج دیے گئے ہوں گے، اس لیے کہ ناواگئی سے سید حسن رسول ایک بڑی جماعت کے ساتھ سید صاحب کی زیارت کے لیے کوگا پہنچ گئے اور بیعت کا شرف حاصل کیا۔ رات وہیں ٹھہرے۔ انھوں نے بیان کیا کہ ہماری بستی (ناواگئی) میں محب اللہ خاں نام ایک مجذوب رہتا ہے، جس نے کبھی لباس نہیں پہنا۔ آج صبح لوگوں نے دیکھا کہ مسجد کا بوریا لے کر اس نے تہمد کے طور پر لپیٹ لیا۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو اس نے کہا: آج اس ضلع میں ایک "آدمی" آرہا ہے، مجھے اندیشہ ہوا مبادا وہ اچانک پہنچ جائے۔ مجھے برہنہ دیکھ لے تو بڑی ندامت ہوگی۔ لوگوں نے کہا: کیا ہم آدمی نہیں ہیں؟ جواب ملا: تم میں ویسا آدمی کوئی نہیں۔

کوگا میں سید صاحب چار روز ٹھہرے۔ گرد ونواح سے خوانین ورؤسا برابر ملنے کے لیے آتے رہے کھانے کا یہ طور تھا کہ جو شخص سید صاحبؒ کو دعوت طعام دیتا تو عرض کر دیتا کہ اتنے آدمی ساتھ لائیے، باقی

---

[1] میرے اندازے کے مطابق یہ سفر اوائل اپریل میں شروع ہوا ہوگا۔ رمضان شریف کا مہینا تھا۔

غازیوں کو بستی کے لوگ چار چار، پانچ پانچ کی تعداد میں اپنے ساتھ لے جاتے۔ مہمانوں کے لیے چارپائیاں اور بستر بھی میزبان ہی مہیا کرتے تھے[1]

تختہ بند کوگا سے بونیر جانے کا راستہ امبیلہ کے پاس سے ہے۔ وادیِ چیلہ کی شمالی حد گرڈو پہاڑ ہے۔ اسے عبور کر لیا جائے تو بونیر شروع ہو جاتا ہے۔ بونیر میں پہلا مقام دامنِ کوہ کی ایک بستی میں ہوا، جس کا نام راوی کو یاد نہ رہا۔ وہیں سید میاں ساکن تختہ بند آ گئے اور عرض کیا کہ ہمارے ہاں بستی بستی کی پتنہ داری ہے اور کوئی شخص دوسری پتنہ داری میں جا نہیں سکتا۔ کوگا چونکہ میری پتنہ داری سے باہر ہے، اس لیے میں آ نہ سکا۔

دوسرے روز سید میاں آپ کو تختہ بند لے گئے۔ وہاں بھی آپ چار روز ٹھہرے رہے۔ ملحقہ علاقے کے خوانین و عوام نے بیعت کی[2]۔ سب نے اقرار کیا کہ ہم جان و مال سے آپ کے فرمانبردار ہیں۔ جو آپ فرمائیں گے بسر و چشم اسے بجا لائیں گے۔ مولوی فتح علی بیان کرتے ہیں کہ خوانین اور روساکے کھانے سے کھانا کھانے والوں کی تعداد پانچ چھ سو پر پہنچ گئی تھی۔ سید میاں نے چاروں دن تنہا پوری جمعیت کی مہمانداری کی۔ سرحدِ آزاد کے دساتیر میں سے ایک عجیب و غریب دستور یہ بھی تھا کہ سادات کی بستی میں کوئی افغان نہیں رہتا تھا اور کتنے ہی مہمان آ جائیں، سادات کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا شخص انھیں کھانا کھلانے کا مجاز نہ تھا۔

پتنہ داری یعنی گروہ بندی اس علاقے کی سب سے بڑی مصیبت تھی۔ سید صاحب نے اپنے دل میں یہ فیصلہ فرما لیا تھا کہ اس مصیبت کو ہر جگہ سے دور کریں گے۔ چنانچہ سید میاں سے کہا کہ جب ہم سوات کے دورے سے واپس آئیں گے تو ان شاء اللہ سب گروہوں کے درمیان صلح کرا دیں گے۔

الٹی، تورسک اور جوڑ مولانا شاہ اسماعیل اور شیخ سعد الدین پھلتی تختہ بند میں بیمار ہو گئے۔ سید صاحب

---

[1] سرحد میں اب بھی مہمانداری کا یہی دستور ہے۔ اکا دکا مہمانوں کی تواضع کے لیے باریاں مقرر ہیں۔ کوئی مہمان آ جائے، باری والا شخص خود اس کے پاس پہنچ کر طعام و قیام کا بندوبست کرے گا۔ زیادہ مہمان آ جائیں گے تو دعوت اجتماعی صورت اختیار کر لے گی۔ میں نے تو یہ دیکھا کہ کھانے کے وقت آپ کسی گاؤں میں پہنچ جائیں، غیر ممکن ہے کہ جو لوگ راستے پر ملیں، وہ کھانے پر اصرار نہ کریں۔ چملہ، بونیر اور سوات میں یہ دستور دیکھا کہ صبح کی چائے کے ساتھ ہر مہمان کے لیے ایک بھنا ہوا مرغ اور ایک پراٹھا ضرور آتا ہے، خواہ میزبان غریب ہو یا امیر۔ ممکن ہے، سید صاحب کے زمانے میں بھی یہی دستور ہو۔

[2] وقائع میں ہے کہ سید میاں اور ان کی برادری والوں کے علاوہ ڈھائی سو آدمیوں نے بیعت کی۔

نے انھیں بحالیٔ صحت کے لیے وہیں چھوڑ دیا اور خود علاقہ سوات کا رُخ کر لیا۔ تختہ بند سے نکل کر آپ نے ایک مقام اَلٹی میں کیا، جو بالا بونیر میں سالار زئی قبیلے کا بڑا گاؤں ہے۔ یہاں اس زمانے میں تین مسجدیں تھیں اور ان کے ساتھ تین حجرے تھے۔ نواب امیر خاں والیٔ ٹونک کے اجداد اسی علاقے کے رہنے والے تھے۔ جب ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ نواب سید صاحب کے عقیدت مندوں میں سے تو بہت خوش ہوئے زیادہ گرمجوشی سے عقیدت کا اظہار کرنے لگے۔ الٹی سے تورسک کے لوگ بہ اصرار لے گئے۔ ایک رات ان کے ہاں ٹھہرے، اسی طرح ایک رات جوڑ میں قیام کیا۔[1]

جُوڑ سے نکلے تو کوہ کڑاکڑ آگیا جو سوات اور بونیر کے درمیان حد فاصل ہے اور بڑا دشوار گزار پہاڑ ہے۔ اس کی چوٹی پر پہنچ جائیں تو دونوں طرف بونیر و سوات کی بستیاں دُور دُور تک نظر آتی ہیں۔ کڑاکڑ سے سوات کی جانب اُترتے ہی ایک بستی ملتی ہے، جس کا نام ناواگئی ہے۔ راویوں نے اسے "شافعیوں کی بستی" لکھا ہے، غالباً اس لیے کہ سوات یا سرحد میں یہی ایک بستی ہے، جس میں شافعی رہتے ہیں۔

بری کوٹ، تھانہ اور چکدرہ

سید صاحب نے ناواگئی میں قیام نہ فرمایا اور سیدھے بری کوٹ[2] تشریف لے گئے۔ معلوم نہیں وہاں ایک رات ٹھہرے یا زیادہ۔ اس مقام پر حاجی ولی اللہ اور حاجی رحیم بخش بیمار ہو گئے۔ سید صاحب نے انھیں خان بری کوٹ کے پاس چھوڑا اور خود تھانہ[3] تشریف لے گئے۔ اس جگہ دو مقام کیے۔ پھر دریاے سوات کو عبور کرکے چکدرہ[4] چلے گئے، جو تھانہ سے جنوب مشرق میں دریا کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ اس جگہ بھی دو ہی روز قیام کیا۔ ان تمام مقامات پر عوام و خواص میں سے کثیر تعداد نے بیعت کی۔ ہر شخص یہی اقرار کرتا کہ خدا کی راہ میں جہاد کے لیے ہمہ تن

---

[1] میں نے یہ مقام دیکھے ہیں۔ بڑے بڑے گاؤں ہیں۔ مکان سب مٹی کے ہیں۔ میں جس زمانے میں گیا، گرمی کا موسم تھا، فصلیں کٹ چکی تھیں اور کھیت خالی پڑے تھے۔ اس لیے منظر بے رونق سا تھا، لیکن کھیتوں کو دیکھ کر اندازہ ہوا ہے کہ فصل خوب ہوتی ہے۔ "جَوُّڑ" (جیم مفتوح، واؤ مشدد و مضموم) کو وقائع میں جوہڑ لکھا ہے۔ صحیح تلفظ وہی ہے جو ہم نے اختیار کیا۔ [2] بری کوٹ آج کل سوات میں غلے کی بہت بڑی منڈی ہے (پرگنہ اماخیل سوات)۔ [3] تھانہ پہلے علاقہ سوات میں شامل تھا (پرگنہ خان خیل) آج کل یاغستان میں ہے۔ بہت بڑا مقام ہے۔ [4] منظورہ اور وقائع میں اسے "چک دراز" لکھا ہے، ممکن ہے اصل نام یہی ہو، کثرت استعمال سے چکدرہ ہو گیا۔

حاضر ہوں۔

سید صاحب چکدرہ ہی میں تھے کہ سید گل بادشاہ پشاوری نے ایک جھپان آپ کی سواری کے لیے بھیج دیا۔ سید گل بادشاہ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ سید صاحب دورے پر نکل پڑے ہیں اور فلاں وقت تک سوات پہنچ جائیں گے۔ جھپان کے ساتھ چار کہار تھے۔ چاروں کو سید گل بادشاہ نے دو مہینے کی تنخواہ اپنے پاس سے دے کر تاکید کر دی تھی کہ دو وقت کے کھانے کے سوا سید صاحب پر کوئی بوجھ نہ ڈالا جائے۔ دورۂ سوات میں جھپان سید صاحب کے ساتھ رہا۔

نماز عید

چکدرہ سے سید صاحب اوچ[1] تشریف لے گئے، اس لیے کہ وہاں کے سیدوں نے ایک وفد چکدرہ بھیج دیا تھا اور تاکید کر دی تھی کہ سید صاحب کو ساتھ لے آئیں۔ سید عبدالقیوم نے بڑے اہتمام سے دعوت کی اور دوسرے ہدایا کے علاوہ ایک بھینسا سید صاحب کی نذر کیا، جو اتنے غیر معمولی ڈیل ڈول کا تھا اور اس درجہ موٹا تازہ تھا کہ ہاتھی کا بچہ معلوم ہوتا تھا۔ اسی مقام پر مولوی محمد یوسف پھلتی بیمار ہوئے، جو سید صاحب کے خزینہ دار، معتمد خاص اور لشکر اسلام کی رسد کے ناظم اعلیٰ تھے۔ اوچ میں کوٹی گرام کے سادات کی طرف سے دعوت پہنچ چکی تھی۔ سید صاحب ادھر روانہ ہوئے تو مولوی محمد یوسف پھلتی کو جھپان پر سوار کر کے ساتھ لے لیا۔

کوٹی گرام میں چار روز قیام کیا، لیکن اس طرح کہ دن کے وقت آس پاس کی بستیوں میں تشریف لے جاتے، رات کوٹی گرام میں گزارتے۔ اسی جگہ عید الفطر ۱۲۴۲ھ (۲۷ اپریل ۱۸۲۷ء) کا چاند دیکھا اور نماز عید کوٹی گرام ہی میں ادا فرمائی۔ ہجرت کے بعد پہلی عید الفطر پالی اور عمر کوٹ کے درمیان ہوئی تھی۔ دوسری علاقہ سوات میں۔ ذرا نقشے پر ایک نظر ڈالیے کہ کہاں رائے بریلی ہے، کہاں مارواڑ کے ریگ زار کا مغربی حصہ اور کہاں سوات۔ وطن و مرز بوم کی محبت سے کس انسان کا دل خالی ہوتا ہے، لیکن جن داعیانِ حق کو خدائے عز و جل اپنی خوشنودی و رضا کے مسلک پر قیام و ثبات کی توفیق عطا فرماتا ہے، ان کی نظروں میں دنیا کا ہر محبوب رشتہ مالک حقیقی کی رضا کے سامنے تنکے سے زیادہ بے حقیقت اور خاک کی چٹکی سے زیادہ بے وقعت رہ جاتا ہے۔ وطنیت کا رشتہ محبت جب مالک الملک کی رضا کے تابع ہو جائے تو اسی

---

[1] اوچ دو ہیں، جنھیں عام بول چال میں "اوچوں" یا "وچوں" (بہ حذف الف) (پرگنہ ادن زئی) کہتے ہیں دونوں پاس پاس ہیں۔ سید صاحب پہلے ایک بستی میں ٹھہرے تھے۔ پھر کوٹی گرام ہوتے ہوئے بر سوات (سوات بالا) کی طرف گئے تو واپسی جاتے دوسری بستی میں ٹھہرے۔

وقت انسان کے ساز وجود سے یہ دلکش ترانہ اٹھتا ہے کہ

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

کوڈی گرام ہی میں ہندوستان سے غازیوں کا پہلا قافلہ پہنچا، جس کے قافلہ سالار مولوی قلندر تھے۔ چونکہ ساتھیوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اس لیے سید صاحب نے انھیں کئی جماعتوں میں تقسیم کر کے مختلف بستیوں میں بھیج دیا تھا تاکہ ایک ہی مقام پر سب کی مہمانداری کا بوجھ نہ پڑے۔ اس وقت تک مولانا شاہ اسماعیل بھی تندرست ہو کر تختہ بند سے سوات پہنچ گئے تھے۔

عید کے بعد ایک روز سید صاحب کوڈی گرام میں ٹھہرے رہے۔ تیسرے دن بر سوات (سوات بالا) کے قصبے سے نکلے اور پہلا مقام اوچ کی دوسری بستی میں کیا۔ پھر ایک اور موضع میں پہنچے جس کا نام معلوم نہ ہو سکا وہاں قاضی احمد اللہ میرٹھی کا قافلہ سید سے آملا۔

مولوی محمد یوسف کی وفات

مولوی محمد یوسف پھلتی باوجود علالت ساتھ تھے۔ نہ ان کو سید صاحب سے مفارقت گوارا تھی اور نہ سید صاحب انھیں الگ رکھنا پسند فرماتے تھے۔ ان کی علالت روز بروز بڑھتی گئی۔ سید صاحب جہاں جاتے، وہاں دعوت جہاد اور اصلاح عقائد و اعمال کے علاوہ مختلف گروہوں کے اختلافات مٹانے کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اوچ سے نکلے ہوئے تیسرا دن تھا کہ ایک موضع کے لوگوں نے آپ کو روک لیا اور عرض کیا کہ ساتھ کے گاؤں والوں سے ہماری کشمکش چلی آرہی ہے آپ صلح کرا دیں۔ سید صاحب کے زیادہ تر ساتھی آگے کے ایک بڑے گاؤں میں پہنچ گئے۔ سید صاحب مسجد میں بیٹھ گئے اور اخوند ظہور اللہ کے ذریعے سے دوسرے گاؤں کے لوگوں کو بلا کر صلح کی بات چیت شروع کر دی۔ اسی حالت میں میاں دین محمد نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ مولوی محمد یوسف بڑی تکلیف میں ہیں۔ سید صاحب نے فرمایا: بھائی، بارگاہِ الٰہی میں دعا کیجیے اور ان کی خدمت میں حاضر رہیے۔

مجمع میں پاس کے گاؤں کا ایک آدمی بھی موجود تھا۔ اس نے کہا کہ ہمارے ہاں دو تین آدمی طبابت کرتے ہیں، مولوی صاحب کو ان کے ہاں بھیج دیجیے۔ سید صاحب بولے: "صحت و بیماری اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔" لوگوں نے کہا کہ علاج کرانا ضروری ہے۔ اجازت دیجیے کہ مولوی صاحب کی چارپائی کو اٹھا کر اس گاؤں میں لے جائیں۔ سید صاحب نے اجازت دے دی۔ میاں عبدالقیوم بھی ساتھ گئے۔

راوی بیان کرتے ہیں کہ مولوی صاحب نے بیماری کی شدت کے عالم میں کہا کہ میرا دل نان پیاز کھانے کو چاہتا ہے اور تھوڑا سا رہی بھی لاؤ۔ تیمارداروں نے عرض کیا کہ کھچڑی تیار ہے اور آپ کو کھچڑی ہی کھانی چاہیے۔ مولوی صاحب بولے کہ میں تو صرف نان پیاز کھاؤں گا۔ چنانچہ یہ غذا دے دی گئی۔

جب ان کی چارپائی پاس کے گاؤں میں پہنچی تو طبیعت اس درجہ بگڑ گئی کہ بظاہر جانبری کی کوئی امید نہ رہی۔ اس حالت میں طبیب کیا کرتے؟ مولوی صاحب نے کہا کہ اب جس طور بھی ممکن ہو، مجھے جلد سے جلد حضرت کی خدمت میں پہنچاؤ تاکہ جان دینے سے پہلے ان کی زیارت کا شرف حاصل کر لوں۔ اس وقت چارپائی اٹھانے والے آدمیوں کی تلاش شروع ہو گئی۔ فصل کے درو کا موسم تھا، لوگ باہر کھیتوں میں تھے۔ ان کے آنے میں دیر ہو گئی۔ مولوی صاحب نزع کی حالت کو پہنچ گئے۔ فرمایا: مجھے اٹھا کر بٹھاؤ، سہارا دے بٹھا دیا گیا، اسی حالت میں اس پاک نفس مجاہد کی روح عالم علوی میں پہنچ گئی۔

قطبِ لشکرِ اسلام

امجد خاں گنتنوی کا بیان ہے کہ سید رستم علی چل گانوی گھوڑے پر سوار ہو کر یہ دردناک خبر سید صاحب کے پاس لائے۔ آپ اس وقت تک مسجد ہی میں بیٹھے تھے۔ سنتے ہی انا للہ پڑھا، تھوڑی دیر خاموش رہے، پھر فرمایا:

> یہ دنیا بڑی سخت جگہ ہے۔ جو یہاں سے ثابت قدم گیا، وہی خوش نصیب ہے۔

یہ اشارہ تھا کہ مولوی محمد یوسف صاحب اس دنیا سے ثابت قدم گئے۔ سید صاحب دیر تک مولوی صاحب کے اوصاف بیان فرماتے رہے۔ اہل پھلت میں سے شیخ ضیاء الدین، شیخ صلاح الدین، شیخ عبدالحکیم، شیخ ناصر الدین اور حافظ ناصر الدین اور حافظ عبدالرحمٰن کو میت لانے کے لیے بھیجا گیا۔ اہل سرحد مُردوں کو عموماً ان قبرستانوں میں دفن کرنا افضل سمجھتے تھے، جہاں کسی مشہور بزرگ کی قبر ہوتی تھی۔ جس گاؤں میں مولوی صاحب فوت ہوئے تھے، وہاں بھی ایک بزرگ دفن تھے، اس لیے اہل موضع نے عرض کیا کہ مولوی صاحب کو یہیں دفن کرنے کی اجازت دیجیے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ہمارے مولوی صاحب خود ولی اللہ تھے، ان کی میت لے آئیے۔

میت آئی۔ قاضی احمد اللہ نے غسل و کفن کا انتظام کیا۔ سید صاحب نے جنازے کی نماز پڑھائی۔ پھر مولانا شاہ اسماعیل سے مخاطب ہو کر فرمایا:

> یوسف جی اس لشکر اسلام کے قطب تھے۔ آج لشکر قطب سے خالی ہو گیا۔ وہ بڑے قانع، زاہد، متوکل، مستقیم الحال اور مستقل مزاج تھے۔

یہ الفاظ زبان مبارک پر جاری تھے اور آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ سید صاحب اور شاہ اسماعیل نے لشکر اسلام کے اس مایہ ناز وجود کی میت لحد میں اتاری[1]۔

---

[1] تمام سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ مولوی محمد یوسف کا انتقال کوٹی گرام میں ہوا جو درہ چترال والی سڑک پر ملاکنڈ سے پندرہ میل آگے ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ مولوی صاحب ایک چھوٹے سے گاؤں میں فوت ہوئے۔ (منظورہ میں ہے "دریزہ خورد") اور دوسرے چھوٹے گاؤں میں دفن ہوئے جو اوچ اور [illegible] کے [illegible] ہو گیا۔

مولوی محمد یوسف حقیقۃً بڑے بلند پایہ بزرگ تھے۔ ان کے مفصل حالات بیان کرنے کا یہ محل نہیں[1]۔ مولانا عبدالحی اور مولانا اسماعیل سے پیشتر بیعت کی تھی۔ "منظورہ" میں ہے کہ ان کا مرتبہ دونوں صاحبوں سے بلند تھا۔ دونوں کی آرزو تھی کہ ہمیں بھی مولوی محمد یوسف کا مقام نصیب ہو۔ رمضان میں ہر روز ایک مرتبہ قرآن شریف ضرور ختم کر لیتے۔ کچھ حصہ تراویح میں سناتے اور باقی تہجد میں پڑھتے۔ ویسے بھی قضائے حوائج بشریہ کے سوا قرآن ہر وقت ان کی زبان پر جاری رہتا تھا۔

برسوات کا دورہ

جس موضع میں مولوی محمد یوسف کو دفن کیا گیا، اسی میں عبدالحمید خاں، شیر خاں، رستم خاں، شیخ رمضان اور شیخ لکھو کا قافلہ سید صاحب کے پاس پہنچا۔ سید صاحب وہاں سے نکلے تو ایک رات بھانڈہ میں گزاری۔ وہاں منگورہ[2] کے اخوند میر پہنچ گئے، سید صاحب کو منگورہ میں لے آئے اور تین روز اپنے پاس رکھا۔ اسی جگہ نذر محمد اور ولی محمد کشمیری ملے، جو پہلے یار محمد خاں کے پاس ملازم تھے۔ سید صاحب کو انھیں کے ذریعہ سے زہر دیا گیا تھا۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ سید صاحب نے دو مرتبہ انھیں سزائے قتل سے بچایا۔ رخصت کے وقت اخوند میر نے دو سیاہ لنگیاں ریشمی کنارے کی، اور ایک سبزہ گھوڑا اور کچھ روپیہ بہ طور نذر پیش کیا۔ سید صاحب نے ایک لنگی اور گھوڑا قاضی مدنی کو دے دیا۔

منگورہ سے روانہ ہوئے تو ایک رات منگلور (پرگنہ بابوزئی) میں گزاری، دوسرے روز چار باغ (پرگنہ متوڑزئی) میں پہنچے۔ چار باغ آج کل بھی بڑا قصبہ ہے۔ سید صاحب کے زمانے میں بھی آبادی خاصی وسیع تھی۔ مسجدیں نہایت اچھی، سایہ دار درختوں کی قطاریں اور نہریں۔ اہل قصبہ نے نقاروں سے سید صاحب کا استقبال کیا۔ مجاہدین مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ مختلف اصحاب نے ایک ایک گروہ کی میزبانی سنبھال لی۔ چار باغ والے چاہتے تھے کہ سید صاحب ایک مہینا ان کے ہاں گزاریں، لیکن سید صاحب تین دن سے زیادہ مدت نہ نکال سکے۔

چار باغ سے گلی باغ گئے۔ اس وقت لوگوں کے ذوق عقیدت کا یہ رنگ تھا کہ ایک ایک وقت میں کئی کئی مقامات سے دعوت نامے آ جاتے تھے بلکہ لے جانے کے لیے جماعتیں پہنچ جاتی تھیں۔ سید صاحب چار باغ ہی میں تھے کہ ایک بستی کے لوگ عہد لے گئے آپ گلی باغ جائیں گے تو ان کے ہاں بھی قدم فرمائیں گے۔

---

[1] یہ حالات آپ کو اس کتاب کے تیسرے حصے میں ملیں گے۔ [2] بھانڈہ دریائے سوات کے مغربی کنارے پر پرگنہ نکپی خیل میں ہے اور منگورہ مغربی کنارے پر پرگنہ بابوزئی میں۔ یہی مقام آج کل سوات کا مرکزی مقام ہے۔ اس سے قریب ہی سیدو میں والیٔ سوات رہتا ہے۔

سید صاحب خود تو نہ جا سکے لیکن اپنے بھانجے سید حمید الدین، شیخ جلال الدین (برادر عم زاد مولانا عبدالحی اور مولوی عبدالقیوم (صاحبزادہ مولانا عبدالحی) کو بھیج دیا۔ چند آدمی ساتھ کر دیے۔ گلی باغ والوں نے سوا کوس باہر نکل کر استقبال کیا اور اس شان سے گاؤں میں لے گئے کہ آپ کی سواری کے آگے آگے لوگ پشتو زبان میں مدحیہ اشعار گاتے جاتے تھے۔ یہاں دو راتیں بسر کیں۔ ایک روز نمازِ عشا کے بعد آپ لیٹے ہوئے تھے، ساتھیوں نے علماء ہند کا ذکر شروع کر دیا۔ سید صاحب نے فرمایا: ہمیں مولانا عبدالحی کی ملاقات کا بڑا اشتیاق ہے۔ خدا چاہے تو عنقریب ان سے اسی ملک میں ملاقات ہو گی۔

گلی باغ سے آپ نے خونہ کا قصد فرمایا۔ راستے میں خواجہ خیل کے لوگوں نے بہ اصرار روک لیا۔ اس بستی کے لوگوں نے آپ سے سلیمان شاہ والی کاشکار[1] کا ذکر کیا کہ وہ بڑا دیندار ہے اور اس کے دل میں جہاد کا بے پناہ جذبہ موجود ہے۔ یہ بھی کہا کہ آپ اس کے پاس تشریف لے جائیں تو بہت اچھا ہو۔ خواجہ خیل سے خونہ گئے۔ وہاں کے پیرزادوں نے پرجوش استقبال کیا۔ سید صاحب کو اپنے مکان میں اُتارا۔ باقی سب غازی خانقاہ میں ٹھہرے۔ وہیں سے آپ نے غور و مشورہ کے بعد اخوند فیض محمد کو سفیر بنا کر سلیمان شاہ کے پاس بھیجا۔ ایک نہایت نفیس قلمی قرآن مجید، ایک جوڑی پستول اور ایک قیمتی پیش قبض بہ طور تحائف دے دیے۔ خونہ سے

---

[1] کاشکار سے مراد چترال ہے، اس لفظ کا املا مختلف ہے۔ مثلاً: کاشکار، کاشقار، کاشغار، قاشقار اور کاس گار۔ وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ مثلاً کاشش، ایک دیو تھا جو اس جگہ رہتا تھا، چونکہ چترال کی حیثیت بلند پہاڑوں کے درمیان ایک غار کی سی ہے اس لیے ملک کا نام کاش غار پڑ گیا۔ یا کاس بمعنی پیالہ، گار بمعنی برف۔ چونکہ یہاں برف زیادہ پڑتی ہے، اس لیے یہ نام مشہور ہوا۔ موجودہ چترال کے قریب اب تک کاشکار نام ایک بستی کا ذکر نقشوں میں ملتا ہے۔ چترال کی وجہ تسمیہ یہ بتاتے ہیں کہ اصل لفظ "چتر" تھا۔ چتر چترالی زبان میں چمن کو کہتے ہیں، چترار بمعنی چمن زار۔

چونکہ راویوں نے اس کا نام کاش غار سنا تھا، اس لیے بیان کرتے وقت کبھی کبھی کاشغر بھی بولتے رہے۔ عام لوگوں نے اسے معروف کاشغر سمجھ لیا جو یارقند کے پاس ہے۔ غلط فہمی اس حد تک پہنچ گئی کہ مولانا سید ابوالحسن علی کے بیان کے مطابق سید صاحب کی چھوٹی بی بی کے اخلاف بھی اپنے مادری سلسلے کو معروف کاشغر ہی کی طرف منسوب کرتے رہے۔ بی بی صاحب نے بھی کبھی کاش غار اور کاشغر میں فرق واضح نہ فرمایا۔ ہو سکتا ہے، انھیں علم ہی نہ ہو کر یہ مختلف خطے ہیں۔

نکلے تو اشالہ[۱]، درشست[۲] خیل اور بھانڈہ ہوتے ہوئے چار باغ پہنچ گئے۔ اس سلسلے میں خنجرہ اور شکر درہ کے نام بھی ملتے ہیں۔

سفرِ مراجعت

چار باغ پہنچے تو خبر ملی کہ مولانا عبدالحی چکدرہ آ گئے ہیں۔ سید صاحب نے اپنی سواری کا جھپّان ان کے لیے بھیج دیا۔ پھر خود کنارِ دریا تک استقبال کے لیے آئے۔ معانقے کے بعد مولانا نے آپ کا ہاتھ چوما۔ چار باغ ہی میں ذی الحجہ کا چاند دیکھا۔ اس وقت ارادہ فرما لیا کہ عید کی نماز چنگلئی میں ادا کریں گے۔

چار باغ سے نکلے تو ایک رات منگورہ میں بسر کی۔ وہاں دو رئیسوں نے کھانا تیار کرا لیا اور ہر ایک کو اصرار تھا کہ سید صاحب پہلے اس کے ہاں کھانا کھائیں۔ آپ نے دونوں کے مکانوں کے درمیان ایک جگہ تجویز کر کے دونوں کے ہاں سے کھانا منگا لیا۔ اس طرح تقدم و تاخر کا جھگڑا ختم کیا۔ منگورہ سے آپ ہوڈی گرام[۳] پہنچے۔ اسی جگہ میاں مقیم رام پوری کا قافلہ ملا۔ بعد کی منزلیں یہ ہیں:

۱۔ ناوا گئی یعنی شافعیوں کی بستی دامن کڑاکڑ میں۔

۲۔ جوڑ

۳۔ تورسک کے راستے باچا جہاں آپ نے سید علی ترمذی غوث بونیر کے مزار کی زیارت کی۔ اس کے اردگرد کمر سے اونچی سنگین دیوار تھی۔ صحن میں زیتون کے درخت تھے۔ سید صاحب نے بعد میں فرمایا کہ یہ بڑے رتبے والے بزرگ اور صاحب ہدایت تھے۔ ان کی روح سے ملاقات ہوئی، کمال محبت و اخلاص سے میرا ہاتھ پکڑا اور تین مرتبہ اللہ اکبر کہا[۴]۔

---

[۱] اشالہ فتح پور اور خواجہ خیل کے درمیان ہے۔ [۲] درشست خیل یا درش خیل دو ہیں، ایک بالا (بر) دوسرا زیریں (کز)۔ اس علاقے میں غلّے کی ارزانی کا یہ حال تھا کہ ایک روز امید خاں نے ایک پیسے کا آٹا خریدا تو سوات کے اوزان کے مطابق سات سیر ملا۔ جو ہمارے اوزان کے مطابق ساڑھے تین سیر تھا۔ ایک روپے کے پیسے اڑتالیس ملتے تھے، یعنی ایک روپے کا آٹا خریدا جاتا تو ہمارے حساب سے چار من آٹھ سیر ملتا۔ [۳] اصل نام غالباً اوڈے گرام تھا۔ [۴] سید علی ترمذی غوث بونیر بابر کے عزیزوں میں سے تھے۔ جنگ پانی پت کے بعد امیری چھوڑ کر فقیر ہو گئے۔ سرحد میں تبلیغ و اشاعت اسلام کے لیے زندگی وقف فرما دی۔ انھیں کی کوششوں سے اہل سرحد میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ ہوئی۔ کنڑ (افغانستان) سے وادی کاغان تک زیادہ تر سادات آپ ہی کے اخلاف میں سے ہیں۔ آپ کے صرف ایک فرزند تھے۔ سادات ستھانہ انھیں کی اولاد میں سے ہیں، سید جمال الدین افغانی بھی اسی خاندان میں سے تھے۔ مفصل حالات میری کتاب "تاریخ سادات ستھانہ" میں ملیں گے۔ باچا بادشاہ کا پشتو تلفظ ہے۔ سید علی کا مزار جس جگہ ہے اس کا نام ابتدا میں غالباً مزار سید بادشاہ ہو گا، بول چال میں باچارہ ہو گیا۔

۴۔ باجا سے شل بانڈی گئے، جہاں سید عبدالوہاب (عرف عبدل بابا)[1] کے مزار پر فاتحہ خوانی کی۔ اس روز ذی حجہ کی ساتویں تاریخ تھی (۲۔ جولائی ۱۸۲۷ء) رات وہاں نہ رہے، خان کے اصرار پر دوپہر کا کھانا کھایا۔

۵۔ برندو ندی کو عبور کر کے تختہ بند پہنچے۔ یاد ہوگا کہ جاتے وقت مولانا اسماعیل اور شیخ سعدالدین کو بوجہ علالت تختہ بند میں چھوڑ گئے تھے۔ مولانا تو صحت یاب ہو کر سوات میں سید صاحب سے جا ملے۔ سعدالدین کی طبیعت بحال نہ ہوئی۔ انھوں نے سید صاحب کی غیر حاضری میں تختہ بند ہی میں وفات پائی۔

۸۔ ذی حجہ کی رات کوگا میں گزاری جہاں سید حسن رسول بھی پانچ سات آدمی لے کر ملاقات کے لیے آ گئے تھے۔

۹۔ کی صبح کو کوگا سے چلے، ظہر کی نماز پہاڑ کی بلند ترین چوٹی پر ادا کی اور دیر تک دعا میں مشغول رہے وہیں شیخ ولی محمد پھلتی، مولوی الٰہی بخش رام پوری، شیخ نظام الدین اولیا اور چینگلنی کے بعض دوسرے غازیوں نے شرفِ زیارت حاصل کیا۔ فتح خاں استقبال کے لیے بستی سے سوا کوس باہر پہنچا ہوا تھا۔ شام تک آپ پنجتار پہنچ گئے۔

اس دورے کے نتائج و برکات کی سرسری کیفیت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ سید صاحب جہاں جہاں گئے، لوگوں کے دینی ذوق میں تازگی و بالیدگی پیدا ہو گئی۔ ان کے عقائد و اعمال کی اصلاح و درستی کا بندوبست ہو گیا۔ ان میں اسلامی مقاصد کے لیے سعی و جہد کا جذبہ جاری و ساری ہو گیا۔ نئی زندگی آ گئی جس میں اسلامیت سب سے بڑھ کر نمایاں تھی۔ وہ مختلف گروہوں میں منقسم اور بتنہ داریوں میں مبتلا تھے۔ سید صاحب نے ان کے لیے قومیت صالحہ کا سانچا تیار کر دیا۔ دشمنیاں مٹ گئیں اور وہ بھائی بھائی بن گئے۔ ان کی جو قوتیں باہمی رزم و پیکار میں صرف ہو رہی تھیں، ان میں ایک مرکز کے تابع ہو کر بلند اسلامی اغراض کے لیے کارکردگی کی صلاحیت اُبھر آئی۔ خود سید صاحب میاں یقین اللہ شاہ لکھنوی کو جنگ شیدو کا مجمل حال سناتے ہوئے فرماتے ہیں:

> اس حادثے کے بعد فقیر نے یوسف زئی کے مختلف اضلاع مثلاً چملہ، بونیر اور سوات کا دورہ کیا اور ان بستیوں کے مومنوں اور مسلمانوں کو بالمشافہ اقامتِ جہاد و ازالۂ فساد کی ترغیب

---

[1] سید عبدالوہاب عرف عبدل بابا سید علی ترمذی کے پوتے تھے۔

دی۔ افغانوں کے متعدد گروہوں مثلاً آفریدیوں، مہمندوں، خلیلوں وغیرہ کو تحریری دعوت نامے بھیج کر اس سعادت عظمیٰ کے حصول اور اس عبادت کبریٰ کی بجا آوری پر متوجہ کیا۔ الحمد للہ مومنین صادقین نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔ . . . .

پھر فرماتے ہیں کہ انشاء اللہ چند روز میں اہل کفر و ضلال کے ساتھ قتال شروع ہو گا اور خدا کے فضل سے قوی امید ہے کہ دین حق تمام ادیان باطلہ پر غالب آئے گا۔ آپ منافقوں کی بے بنیاد باتوں کا اعتبار نہ کریں اور جمعیت خاطر سے دین کی نصرت کے لیے دعا کرتے رہیں:

> ہر چند ہر کام میں فاعل مختار صرف خدا کی ذات ہے اور صحیح العقیدہ مومن پر لازم ہے کہ تمام کاموں میں رب العباد کی کارسازی پر دل و جان سے یقین رکھے، لیکن حکم شرع کی بنا پر جمع اسباب کے لیے بھی سعی ضروری ہے۔ پس اس حکم شرعی کے مطابق اسلامی لشکروں کی فراہمی کے لیے قدرے سعی کی گئی۔ الحمد للہ کہ یہ سعی اتمام کو پہنچی اور مومنین افاغنہ میں سے بہت سی قوموں نے، جن میں ہر ایک کی تعداد ہزاروں لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ اس فقیر کا ساتھ دینے پر اتفاق کر لیا اور اس عاجز کی اطاعت مان لی۔

والیِ چترال کا جواب

سید صاحب ابھی سوات ہی میں تھے کہ سلیمان شاہ والی چترال کا جواب آ گیا، جس میں یقین دلایا تھا کہ میں ہر اعانت کے لیے تیار ہوں اور گلگت کے راستے آپ سے آ ملوں گا۔ اس زمانے میں بدخشاں سے آدینہ خاں نام ایک صاحب سید صاحب کی آمد کا شہرہ سن کر اشغال طریقت سیکھنے کے لیے آئے تھے۔ ان سے سلیمان شاہ کے مزید حالات معلوم ہوئے۔ آدینہ خاں واپس جانے لگے تو سید صاحب نے سلیمان شاہ کو اور ایک مکتوب بھیجا۔ اس مرتبہ شیخ نظام الدین کو سفارت کی خدمت سپرد کی۔ وہ آدینہ خاں کے ساتھ چترال گئے۔ اس طرح باقاعدہ خط و کتابت جاری ہو گئی۔ ہر خط کے ساتھ فریقین تحائف بھی بھیجتے تھے۔

انتالیسواں باب

دعوتِ جہاد

مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوششیں

یوں تو سید صاحب کی پوری زندگی دعوت حق کے لیے وقف تھی، لیکن سرحد پہنچنے کے بعد انھوں نے جہاد کے لیے نفیرِ عام کی جو مساعی فرمائیں، ان کا جائزہ ذرا تفصیل سے لے لینا چاہیے۔ اس کے بغیر سید صاحب کے علوِ ہمت، جوشِ حمیتِ دین، شیفتگی اسلامیت اور بے پناہ جذبۂ اعلاء کلمۃ اللہ کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ کس طرح ڈیڑھ دو مہینے کی قلیل مدت میں انھوں نے یوسف زئی کے میدانی علاقے میں ایک ہمہ گیر حرارت پیدا کر دی تھی جس کی بنا پر ایک لاکھ آدمی شیدو کے میدانِ جنگ میں پہنچ گئے۔ افسوس کہ یہ اجتماع یار محمد خاں کی نالائقی کے باعث مطلوب نتیجہ پیدا نہ کر سکا۔ پھر سید صاحب نے ان تمام گروہوں، قوموں، جماعتوں، قبیلوں یا ان کے سلاطین و ملوک و خوانین کو دعوت نامے بھیجے، جن کے نام انھیں معلوم ہو سکے اور جن تک رسائی ان کی حدِ وسع میں تھی۔ جن کو خطوط بھیجنے کافی سمجھے خطوط ارسال کیے، جن کے پاس سفیروں کا بھیجنا مناسب نظر آیا، ان کے پاس سفیر بھیجے۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے ساتھ سفرِ ہجرت میں روابط پیدا ہو چکے تھے، ایسے بھی تھے، جن سے قطعاً شناسائی نہ تھی۔

سلاطین و فرماں روا

سید صاحب کے تمام مکاتیب اور دعوت نامے محفوظ نہیں رہے۔ صرف اُن کا ایک حصہ باقی ہے۔ میں یہاں پہلے ان سلاطین اور فرماں رواؤں کی فہرست درج کرتا ہوں، جن کے ناموں کے مکاتیب محفوظ رہ گئے۔ اس کے بعد امرا و خوانین کی فہرست دوں گا۔ پھر یہ بتاؤں گا کہ تحریری دعوت ناموں کے علاوہ سید صاحب نے مسلمانوں کو جہاد کے لیے اُبھارنے اور منظم کرنے کے سلسلے میں کیا کیا کارنامے انجام دیے۔

سلاطین اور فرماں رواؤں کی فہرست یہ ہے:

۱ - امیر دوست محمد خاں بارک زئی فرماں روائے کابل
۲ - یار محمد خاں والیٔ پشاور
۳ - سلطان محمد خاں والیٔ کوہاٹ و بنوں

۴ ۔ سید محمد خاں والی ہشت نگر

۵ ۔ شاہ محمود درانی والی ہرات

۶ ۔ شہزادہ کامران ولی عہد ہرات

۷ ۔ زمان شاہ درانی ۔ یہ بلند ہمت بادشاہ اگرچہ معزول و مکحول ہو کر لدھیانہ پہنچ گیا تھا، لیکن سرحدات میں اسے بہت زیادہ اثر و رسوخ حاصل تھا، اس لیے سید صاحب نے اسے بھی نظر انداز نہ کیا۔

۸ ۔ نصر اللہ بادشاہ بخارا

۹ ۔ مراد بیگ حاکم قندز

۱۰ ۔ سلیمان شاہ والی چترال

۱۱ ۔ سکندر جاہ فولاد جنگ، آصف جاہ ثالث فرمانروائے دولت آصفیہ

۱۲ ۔ احمد علی فرمانروائے رام پور

۱۳ ۔ حافظ الملک رکن الدولہ محمد بہاول خاں عباسی نصرت جنگ فرمانروائے بہاول پور۔

امیرانِ سندھ، محراب خاں حاکم بلوچستان اور حاکمان قندھار و غزنین کو سفر ہجرت میں کار حق کے ساتھ تعاون کی دعوت دے چکے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ بعد میں بھی ان سب کو یا ان میں سے بعض کو ضرور مکاتیب بھیجے ہوں گے، اگرچہ وہ خطوط محفوظ نہ رہ سکے۔

اُمرا و خوانین امرا و خوانین کی فہرست بہت طویل ہے:

۱ ۔ حبیب اللہ خاں بارک زئی فرزند عظیم خاں

۲ ۔ احمد خاں بن لشکر خاں (رئیس ہوتی) معتمد یار محمد خاں

۳ ۔ یار محمد خاں کے لشکر کے درانی اور غلزئی سردار

۴ ۔ مولوی عبدالکریم مشیر سلطان محمد خاں

۵ ۔ شاہ پسند خاں وزیر شاہ محمود

۶ ۔ حاجی خان کاکڑ

۷ ۔ شہزادہ محمود بخت

۸ ۔ شہزادہ میر غلام حیدر خاں

۹ ۔ خانخاناں غلزئی نبیرہ شاہ حسین غلزئی۔

۱۰ - یار محمد خاں غلزئی ساکن میدان
۱۱ - طرہ باز خاں غلزئی " "
۱۲ - شبیر محمد خاں " " مرغہ
۱۳ - نعمت اللہ خاں غلزئی ساکن مرغہ
۱۴ - تاج خاں غلزئی ساکن کشنوار
۱۵ - رحمت خاں غلزئی " "
۱۶ - بختیار خاں غلزئی ساکن غزنین
۱۷ - سبحان خاں غلزئی " "
۱۸ - لودی خاں ساکن کابل
۱۹ - عبداللہ خاں غلزئی ساکن رزیلی
۲۰ - سید گل شاہ ساکن سرودہ
۲۱ - پائندہ خاں تنولی والی امب و دربند
۲۲ - سربلند خاں تنولی رئیس شنگڑی
۲۳ - ناصر خاں " بھٹ گرام
۲۴ - حسن خاں " پیچوّں
۲۵ - راجا زبردست خاں " مظفر آباد
۲۶ - راجا نجف خاں " خان پور
۲۷ - عجب خاں
۲۸ - فیض اللہ خاں مہمند ساکن ہزار خانی
۲۹ - رؤسا بتو و داماں (جن کی تعداد معلوم نہ ہو سکی)۔
۳۰ - نور محمد خاں
۳۱ - خان زماں خاں رئیس گنگر
۳۲ - امیر عالم خاں رئیس باجوڑ

اس فہرست میں ایک ہندو بھی ہے۔ یعنی راجا ہندو راؤ مختار مہاراجا گوالیار۔ اسے سید صاحب سے جس درجہ عقیدت تھی، اس کا اظہار پہلے ہو چکا ہے۔ سید صاحب نے اسے یہ ہدایت فرمائی تھی کہ

جو اصحاب خدمتِ دین کے لیے یہاں آ رہے ہیں، اُن کے بال بچوں کی نگرانی اور گزارے کے بندوبست میں کوئی وقیقہ سعی اُٹھا نہ رکھا جائے۔

ہندوستان یا سرحد کے عام علماء و اکابر کو جو دعوت نامے برابر آتے رہے، ان کا تفصیلی ذکر میں یہاں نہیں کروں گا۔ آپ ان فہرستوں کو سامنے رکھ کر غور فرمائیں کہ آیا مملکت سندھ سے سرحد کشمیر تک پورے علاقے کا ایک بھی قابلِ ذکر فرد تھا، جس کے کان تک سید صاحب نے دین کی پکار نہ پہنچائی ہو۔

داعیانِ دین کا تقرر

اس کے علاوہ سید صاحب نے اپنے خاص آدمی مختلف ہندوستانی علاقوں میں دعوتِ دین کے لیے مقرر فرمائے جو عقائد و اعمال کی اصلاح کے ساتھ ساتھ سید صاحب کی تحریکِ جہاد کے لیے روپے کی فراہمی کے علاوہ غازیوں کو تیار کرتے تھے۔ مثلاً:

۱ - مولانا سید محمد علی صاحب رامپوری کو حیدرآباد دکن بھیجا اور ان کے ساتھ تین آدمی مقرر کیے: عنایت اللہ خاں، عبداللہ اور نعیم خاں۔ ان کا ایک فرض یہ بھی قرار دیا تھا کہ غازیوں کے لیے ہندوستان سے سرحد پہنچنے کے مناسب راستے کا انتظام کر دیں۔ جس میں کسی منزل پر کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ مولانا سید محمد علی نے خود کالاباغ اور ڈیرہ اسماعیل خاں کا راستہ اختیار کیا۔ ڈیرہ کے نواب پر چونکہ اعتماد نہیں ہو سکتا تھا اس لیے سید محمد علی نے ایک آدمی کو مناسب مقام پر بٹھا دیا۔ وہ غازیوں کو ڈیرہ سے اوپر اوپر جانے کی تاکید کرتا رہتا تھا۔

یہ انتظام کر کے مولانا سید محمد علی نے نواب کے لشکر میں جا کر وعظ کیا، کشتی میں بیٹھ کر ڈیرہ غازیخاں پہنچے۔ پھر خشکی کے راستے پیر کوٹ گئے۔ جہاں سید صاحب کے اہل و عیال مقیم تھے۔ بعد ازاں کراچی سے جہاز پر بیٹھ کر بمبئی اور وہاں سے حیدرآباد تشریف لے گئے۔ جب سید صاحب نے مولانا ولایت علی کو حیدرآباد بھیج دیا تو سید محمد علی حکم کے مطابق مدراس چلے گئے۔ مدراس میں ان کے تبلیغی اور اصلاحی کارنامے تفصیلاً بیان کرنے کا یہ محل نہیں۔

۲ - کچھ دن بعد مولانا ولایت علی عظیم آبادی کو حیدرآباد کے لیے مقرر فرمایا۔ مولانا بھی کالاباغ اور ڈیرہ اسماعیل خاں کے راستے حیدرآباد سندھ پہنچے۔ وہاں مسئلہ امامت پر فارسی میں ایک رسالہ لکھا، جس کی نقلیں قندھار و کابل وغیرہ بھیجی گئیں۔ سندھی زبان میں اس کا ترجمہ کرا کے خوب پھیلایا۔ پھر حیدرآباد دکن چلے گئے۔ ان کے ساتھ بھی تین ہی آدمی تھے:

عبدالقادر، عبدالواحد اور کرامت اللہ۔

۳ - مولانا عنایت علی عظیم آبادی کو بنگال بھیجا گیا۔

۴ - مولانا محمد قاسم پانی پتی بمبئی میں دعوت و تبلیغ پر مامور ہوئے۔

۵ - مولانا سید اولاد حسن قنوجی (والد نواب صدیق حسن خاں) اور سید حمید الدین (خواہر زادہ سید صاحب) یو۔ پی کے مختلف حصوں میں تبلیغ و تنظیم کے لیے بھیجے گئے۔

۶ - میاں دین محمد اور میاں پیر محمد نیز متعدد دوسرے اصحاب کا کام صرف یہ تھا کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں خطوط پہنچاتے اور وہاں سے روپیہ لاتے رہیں۔

غازیوں کی حالت

میں بتا چکا ہوں کہ سید صاحب دورے پر روانہ ہوئے تھے تو بہت سے غازی بیمار تھے۔ معاش کی تنگی کا ذکر بھی کر چکا ہوں۔ جو غازی فوت ہوئے، ان کے کفن کے لیے بھی کپڑا میسر نہ تھا۔ شیخ ولی محمد یا تو انھیں کی چادریں اُڑھا دیتے یا جاجم کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر اس کام میں لاتے۔ جب پریشانی بہت بڑھ گئی تو ایک سندھی بندوق بنیے کے پاس گرو رکھ کر جنس لینی چاہی۔ یہ بندوق ایک صاحب نے گیارہ سو روپے میں خرید کر سید صاحب کی نذر کی تھی لیکن بنیا اسے لینے پر راضی نہ ہوا اور دو وقت فاقے میں گزر گئے۔ سید صاحب کے ذخیرۂ پارچات میں کچھ پگڑیاں تھیں، ان میں سے ایک پگڑی سات روپے میں فروخت کی اور اس رقم سے غلہ خرید کر دو تین دن گزارے۔ جب فتح خاں پنجتاری کو کسی ذریعے سے ان حالات کی اطلاع ملی تو اُس نے بقدرِ ضرورت غلے کا انتظام کر دیا۔[1]

عیدِ اضحیٰ

سید صاحب عید سے ایک دن پہلے پنجتار پہنچے تھے۔ ذی الحجہ کی گیارھویں تاریخ کو آپ نے دو اونٹوں کی قربانی دی اور وہ بھینسا بھی ذبح کیا جو سید عبدالقیوم نے اوچ (سوات) میں سید صاحب کی نذر کیا تھا اور جسے غازی اپنے ساتھ پنجتار لائے تھے۔ راوی لکھتے ہیں کہ اس میں سے اٹھارہ من گوشت نکلا۔ اس وقت قندھاریوں کے علاوہ سات سو ہندوستانی غازی سید صاحب کے پاس تھے۔ ان سب میں گوشت تقسیم ہوا، جو بچ رہا وہ ملکیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

جو قافلے ہندوستان سے آئے تھے، وہ سب اپنے ساتھ نقد روپیہ بھی لائے ہوں گے، اس وجہ سے لشکرِ اسلام میں پھر کشایش پیدا ہو گئی اور معمول کے مطابق ہر غازی کو ایک ایک تالوٹ گندم اور دو دو مٹھی دال بٹنے لگی۔ اس زمانے میں غلے کی خرید کا کام محمود خاں لکھنوی اور عبداللہ کے ذمے تھا۔ تقسیم پر مولوی عبدالوہاب

---

[1] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انتہائی عسرت میں بھی غازیوں نے کبھی کسی سے درخواست نہ کی اور نہ اپنا حال کسی پر ظاہر کیا۔ البتہ اگر کسی نے بہ طوع و رغبت امداد کا انتظام کر دیا تو اُسے خوشی سے قبول کر لیا۔ یہ خصوصیت آپ کو ہر موقع پر نمایاں نظر آئے گی یہ سید صاحب کی تربیت کا کرشمہ تھا۔

اور امانت علی مامور تھے۔

اسلامی سادگی اور محنت

پنجتار میں پن چکیاں بھی تھیں لیکن بارش نہ ہونے کے باعث نالے میں پانی خشک ہو گیا۔ اس لیے پن چکیاں بند ہو گئیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ جو بھائی چاہے اُجرت دے کر گاؤں میں کسی سے غلہ پسوا لے، چاہے خود پیس لے۔ چنانچہ اس ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ چکیاں بھی خرید لی گئیں۔

ایک روز سید صاحب پھرتے پھراتے اپنی جماعت کی طرف نکل گئے، جس کے نائب سالار شیخ ولی محمد تھے۔ آپ نے دیکھا کہ مولوی الٰہی بخش رام پوری اپنے ہاتھ سے آٹا پیس رہے ہیں۔ سید صاحب بے تکلف ان کے سامنے بیٹھ گئے اور ساتھ ہتا پکڑ کر ایک سیر آٹا پیس دیا۔

جو جگہ نماز کے لیے مخصوص کر لی تھی، وہ محض ایک احاطہ تھا۔ نہ چھت تھی نہ فرش۔ نماز پڑھتے وقت غازیوں کو کنکر چبھتے تھے۔ ایک روز سید صاحب نے فرمایا کہ درانتیاں لے کر چلو جنگل سے گھاس کاٹ لائیں۔ چنانچہ آپ سب کو لے کر گئے۔ خود بھی برابر گھاس کاٹتے رہے۔ اتنی گھاس آگئی کہ مسجد کے فرش پر ایک فٹ موٹی تہ بچھا دی گئی۔ اسی طرح چند روز کے بعد چھپر بنا کر چھت کا انتظام کر لیا۔

"منظورہ" میں ہے:

> حضرت کی تعلیم کے مطابق کسی کو کسی کام میں عار نہ تھی۔ سب اپنے ہاتھ سے کپڑے دھوتے، اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتے، جنگل سے لکڑی لاتے۔ چکی پیستے۔ بیماروں اور معذوروں کی قے اور نجاست اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر باہر پھینکتے۔ جو لوگ بعد میں آئے، انھوں نے پہلوں کو دیکھ کر سبق حاصل کیا۔ لشکر بھر کی زبان فحش و دشنام سے بالکل محفوظ تھی۔

حصہ دوم

پہلا باب

ہزارہ کا محاذِ جہاد

ہزارہ کی سرگزشت

اگرچہ ہزارہ ابدالیوں کے عہد اوج و عروج میں افغان سلطنت کا ایک جزو تھا اور کشمیر کے راستے پر واقع ہونے کے باعث اس کی اہمیت بہت زیادہ تھی؛ لیکن افغان حکمرانوں نے مقامی خوانین و رؤسائے ہزارہ کے انتظامی معاملات میں کبھی مداخلت نہ کی؛ بلکہ اس علاقے کے لیے کبھی گورنر بھی مقرر نہ کیا۔ صرف تھوڑے سے میدانی علاقے سے انھیں براہِ راست مالیہ وصول ہوتا تھا، جو عاملِ اٹک کی تحویل میں تھا۔ باقی تمام مقامات میں متفرق رؤسا عملاً خود مختار تھے۔ ابدالیوں کی مصلحت صرف یہ تھی کہ امن قائم رہے اور کشمیر کا راستہ مخدوش نہ ہو۔ اس مصلحت کی حفاظت میں رؤسائے ہزارہ نے کبھی تامّل نہ کیا۔ بڑے بڑے سردار کشمیر جاتے یا وہاں سے لوٹتے تو مختلف رؤسا اپنے اپنے علاقوں میں ان کے لیے مہمانداری کا انتظام کر دیتے۔ دریا سے گزرنے کے لیے کشتیاں بہم پہنچا دیتے۔ کبھی کبھی تحائف کی صورت میں نذریں بھی پیش کر دیتے۔ ابدالی اس صورت حال پر بالکل مطمئن تھے۔ رؤسا میں کشمکش کا کوئی واقعہ پیش آجاتا تو ابدالی اس کا تصفیہ کر دیتے۔ ضرورت کے وقت اپنی فوج کے لیے تنخواہ دار آدمی لے لیتے۔

جب سدوزئیوں اور بارک زئیوں کی باہمی خونریزیوں کے باعث افغان سلطنت کا پرچم اقبال سرنگوں ہو گیا تو رؤسائے ہزارہ نے رسمی تابعیت سے بھی آہستہ آہستہ بے پروائی اختیار کر لی اور تمام گروہوں نے اپنی مستقل سرداریوں کی داغ بیل ڈال دی۔ ان میں زیادہ ممتاز یہ تھے: نجیب اللہ خاں ترین، جعفر خاں گکھڑ، گلشیر خاں تنولی، ہاشم خاں ترک، سعادت خاں سواتھی اور اس کا بیٹا حبیب اللہ خاں۔

سکھوں کی آمد

اچانک ایک واقعہ پیش آگیا، جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے آزاد سرحدی علاقے میں انوکھا نہ تھا، لیکن اس کی وجہ سے ہزارہ میں ایک نئی قوت کے لیے قبض و تصرف کے دروازے کھل گئے۔ پھر اہلِ ہزارہ پر ہولناک مصیبتیں آئیں اور تیس پینتیس برس تک ان کا خون پانی کی طرح بہتا رہا۔ یہ داستان حد درجہ درد انگیز ہے اور اس کی اجمالی کیفیت یہ ہے:

مانک رائے کے ترک رئیس ہاشم خاں نے کمال خاں ترک کو قتل کر دیا۔ محمد خاں ترین مقتول کے

ا دوڑ ندی کے کنارے ایک بڑا گاؤں ہے۔ ترک پہلے پہل سے ہزارہ کے سردار تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی قوت گھٹتی گئی اور صرف چند دیہات میں ان کی زمینداریاں رہ گئیں۔ ان میں سے ایک مانک رائے بھی تھا۔

دارثوں کا مددگار بن گیا اور ہاشم خاں کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ اس نے تشویش و اضطرار کے عالم میں راولپنڈی کے سکھ گورنر مکھن سنگھ سے مدد مانگی۔ وہ فی الفور پانسو سوار لے کر ہزارہ پہنچ گیا اور سرائے صالح میں قلعہ تعمیر کر کے میدانی علاقے سے بالجبر خراج وصول کرنے لگا۔

اس بلائے ناگہانی نے خوانین ہزارہ کی آنکھیں کھول دیں۔ انھوں نے چپکے چپکے ایکے کا بندوبست کیا۔ دوڑ ندی کے کنارے شاہ محمد کے مقام پر مکھن سنگھ کو شکست دی اور وہ مارا گیا۔ سکھ فوج سرائے صالح کو چھوڑ کر اٹک کے سکھ گورنر حکما سنگھ چمنی کے پاس پہنچ گئی۔ حکما سنگھ نے اہل ہزارہ کی تادیب کے لیے لاہور سے کمک منگائی، جس کا سالار دیوان رام دیال تھا۔ ترینوں، اتمان زئیوں اور مشوانیوں نے متحد ہو کر اس فوج کو کوہ گنگر کے دامن میں ناڑا نام مقام پر شکست دی۔ رام دیال اس لڑائی میں مارا گیا۔

اس کے بعد امر سنگھ مجیٹھیہ کو ہزارہ کا گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ اس نے نرمی اور ملائمت کی پالیسی اختیار کی۔ اسی کشمکش میں وہ بھی مارا گیا۔ پھر کنور شیر سنگھ اور اس کی نانی مائی سدا کور ہزارہ پہنچے۔ سدا کور نے محمد خاں ترین کو منہ بولا بیٹا بنا کر ساتھ ملا لیا اور تربیلہ میں ایک گڑھی کی بنیاد رکھی۔

ہری سنگھ نلوہ

سدا کور کی پالیسی کامیاب ہو رہی تھی کہ اچانک ہری سنگھ نلوہ ہزارہ کے سٹیج پر نمودار ہوا۔ یہ شخص معمولی حیثیت سے اُٹھ کر سکھ فوج میں جرنیل بنا تھا۔ ظلم و تشدد اور سنگدلی کی وجہ سے سکھوں میں بڑی شہرت حاصل کر لی تھی۔ رنجیت سنگھ نے اسے کشمیر کا گورنر بنا دیا۔ پھر شکایتیں پہنچیں کہ ہری سنگھ نے روپے میں بہت تغلب کیا ہے۔ رنجیت سنگھ نے حساب کتاب کی غرض سے لاہور بلایا تو اُسے خیال ہوا کہ کوئی بڑا کارنامہ انجام دیے بغیر محاسبے اور بازپرس سے بچنا محال ہے۔ چنانچہ اس نے ہزارہ کو مسخر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ سات ہزار منظم فوج کے ساتھ مظفر آباد اور گڑھی حبیب اللہ خاں کے راستے ہزارہ میں داخل ہوا۔ مانسہرہ اور ایبٹ آباد کے درمیان درۂ مانگل میں پہنچا تو جدون اور تنولی راستہ روکے کھڑے تھے۔ خونریز جنگ ہوئی۔ ہزارہ کے بے قاعدہ لشکر سکھوں کی منظم فوج کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ہری سنگھ نے اپنی عادت کے مطابق ایک ایک جدون کے گھر سے چار چار پانچ پانچ روپے تاوان وصول کیا۔ چونکہ کئی مرتبہ کی شکستوں کے بعد سکھوں کو فتح حاصل ہوئی تھی، اس لیے رنجیت سنگھ ہری سنگھ کے اس کارنامے پر بہت خوش ہوا، نہ محض محاسبہ چھوڑ دیا بلکہ اسے ہزارہ کا گورنر بنا دیا۔

محمد خاں ترین سدا کور کا بیٹا بن کر لاہور پہنچ گیا تھا۔ ہری سنگھ نلوے نے پچپن ہزار روپے دے کر اسے رنجیت سنگھ سے لیا۔ پھر اس غریب کو قید خانے میں کھار کی روٹی کھلا کھلا کر مار ڈالا۔ رنجیت سنگھ کو جو رقم دی تھی، وہ بھی تاوان لگا کر گھر گھر سے وصول کر لی۔ اگرور، کونش اور نیکری کی وادیوں پر بھی حملے کیے اور

گاؤں جلائے۔ خصوصاً سربلند خاں پلال تنولی کے مرکز شنگری کو تو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا۔ اس کے فرزند فقیر خاں کو پھانسی دے دی۔ سکندر پور کے قریب ہرکشن گڑھ کے نام سے ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ اس کے آس پاس نئی بستی آباد ہو گئی۔ اسی بستی کو بعد میں ہری پور کہنے لگے اور یہی تحصیل ہری پور کا صدر مقام ہے۔

سرداران ہزارہ سید صاحب کی خدمت میں

یہ حالات تھے جب سید صاحب یوسف زئی پہنچے اور ان کی جہاد آرائی کی بدولت سرحدی علاقوں کی یاس افزا تاریکی میں امید کی ایک نئی کرن چمکی۔ اب تمام تباہ حال خوانین و رؤسا سید صاحب کے دامن میں پناہ لینے لگے۔ سرحد میں تشریف فرمائی کے بعد دو تین مہینوں میں مندرجہ ذیل رؤسا نے آپ سے رابطۂ عقیدت استوار کر لیا:

۱۔ سربلند خاں پلال تنولی، ہری سنگھ کی دراز دستیوں کے باعث جلا وطن ہو چکا تھا۔ اس نے امداد کے لیے ایک عریضہ لکھا اور قاصد کے ساتھ ایک سبزہ رنگ گھوڑا بطور نذر بھیجا۔ سید صاحب نے یہ گھوڑا شیخ امجد علی غازی پوری کو دے دیا، جن کا گھوڑا مر چکا تھا۔

۲۔ حبیب اللہ خاں سواتی گڑھی والا، اس کا باپ سعادت خاں اپنے وقت میں اس درجہ معزز و محترم تھا کہ تمام اہلِ ہزارہ اپنے تنازعات میں اسی کو حَکَم بناتے تھے۔ حبیب اللہ خاں کے بیٹے کو سکھوں نے اسی کی گڑھی میں محصور کر رکھا تھا۔ اس نے سید صاحب کے پاس درخواست بھیجی کہ میرے بیٹے کو محصوری سے نجات دلانے کا بندوبست فرمائیں۔

۳۔ مظفر آباد کے سلطان زبردست خاں اور سلطان نجف خاں کا وکیل اطاعت کے معروضے لایا۔ اُن میں یہ بھی مرقوم تھا کہ اگر حضرت ہمارے وطن میں قدم رنجہ فرمائیں تو جہاد فی سبیل کا کام احسن طریق پر انجام پائے گا۔

۴۔ اگرور کے خان عبدالغفور خاں نے اپنے بھائی کمال خاں کے ہاتھ اطاعت نامہ بھیجا۔ کمال خاں نے خود اصالۃً اور اپنے بھائی کی طرف سے وکالۃً بیعت کی۔

۵۔ امان اللہ خاں، خان خیل اور اس کا بیٹا عنایت اللہ خاں سکھوں کی دراز دستیوں سے تنگ ہو کر عشرہ (علاقہ امب) میں پناہ گزین تھے، وہ سید صاحب کی بیعت سے مشرف ہوئے۔

۶۔ ناصر خاں بھٹ گرامی (علاقہ نندھیاڑ) نے پہلے عریضۂ فرمانبرداری بھیجا، پھر خود سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی۔

۷۔ سردار پایندہ خاں تنولی والیِ امب کے کئی علاقے ہری سنگھ نے دبا لیے تھے۔ اس نے بھی اطاعت نامہ

بھیجا۔ سردار موصوف کے تفصیلی حالات سید صاحب کو ملّا شاہ سید ساکن چیڑمنگ (علاقہ نندھیاڑ) سے معلوم ہوئے تھے۔ چونکہ وہ قلت وسائل کے باوجود سکھوں سے برابر لڑ رہا تھا، اس لیے سید صاحب کے دل میں اس کے متعلق بہت اچھا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ جب ایک مجلس میں بعض لوگوں نے پایندہ خاں کو ناقابل اعتماد قرار دیا تو سید صاحب نے فرمایا: وہ بڑا نامی بہادر اور شجاع سردار ہے۔ اس کے خلاف بُری بات نہ کہنی چاہیے۔ ہدایت و ضلالت اللہ کے اختیار میں ہے۔

علاقہ ہزارہ کے بڑے بڑے سردار یہی تھے۔ ان کو منظم و متحد کر کے اوّل ہزارہ میں سکھوں کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کیا جا سکتا تھا، دوسرے کشمیر کی طرف پیش قدمی کا راستہ صاف ہوتا تھا اور سلیمان شاہ والیِ چترال لکھ ہی چکا تھا کہ اگر سید صاحب کشمیر کا رُخ کریں تو میں فوج لے کر گلگت کے راستے اعانت کے لیے پہنچ جاؤں گا[1]۔ ان مقاصد و مصالح کے پیش نظر سید صاحب پکھلی (ہزارہ) کی طرف انتظام جہاد کے امکانات سے فائدہ اٹھانے کے لیے معاً تیار ہو گئے۔

قبول دعوت کا شاندار دور

سید صاحب کی دعوت جہاد کے قبول و پذیرائی کا یہ نہایت شاندار دور تھا۔ ہندوستان سے مجاہدین کے قافلے پہنچنے لگے تھے۔ چملہ، بونیر اور سوات کے قبائل رفاقت کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ خلیل، خٹک، آفریدی، شنواری، ننگرہاری، مہمند وغیرہ قبائل کو اٹھانے کا پورا بندوبست ہو چکا تھا اور ان میں سے بعض ممتاز اصحاب سید صاحب کے پاس پہنچ گئے تھے۔ افغانستان کے علمائی رؤسا صرف اس بات کے منتظر تھے کہ سید صاحب کوئی ایسا مقام تجویز فرما دیں، جہاں سے معرکہ آرائی شروع کر کے آپ کے ساتھ جلد سے جلد اتصال پیدا کیا جا سکے۔ یار محمد خاں کی غداری کے باعث اگرچہ خود سمہ کے اندر کاروبار جہاد میں رخنہ پیدا ہو چکا تھا اور اس کی اصلاح و درستی کے امکانات بہت کم نظر آتے تھے، لیکن اس کے بھائی سلطان محمد خاں اور سید محمد خاں برابر اطاعت کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ یار محمد خاں کی حرکت پر رنجیدہ بھی معلوم ہوتے تھے۔ باقی خوانین سید صاحب کے ساتھ تھے۔ ہزارہ کے علاوہ راہ کشمیر کے دوسرے اکابر بھی سراپا عقیدت و اشتیاق بنے ہوئے تھے۔ سید صاحب ہندوستان سے چلے تھے تو اگرچہ خاصی دلکشا اُمیدوں سے ان کا قلب صافی

---

[1] سلیمان شاہ کے مکتوب کا متعلقہ حصہ یہ تھا کہ اگر کشمیر کی طرف توجہ فرمائیں تو: انشاء اللہ تعالیٰ ایں خادم سادات و علماء و فقرا ہر وقتے کہ اعلام خواہند در مقدمہ مسلک مذکورہ (کشمیر) شریک می شوم کہ بہ ما یاں قریب است، ماہ اسپ بر حد ملک کشمیر بالائی میسر است۔ ہر محیے کہ طرف کشمیر بروند باشد آگاہ والہم (مکاتیب شاہ اسماعیل صفحہ ۲۲)

معمور تھا لیکن سازگار ترین حالات میں بھی انھیں اتنی تھوڑی مدت کے اندر ایسے ممکنات کامیابی کے پیدا ہو جانے کا خیال نہ تھا۔ افغانستان سے انتہائے کشمیر تک پورے علاقے میں حیات تازہ کی لہریں جوشاں ہو گئی تھیں۔

سید صاحب نے تمام رؤسائے پکھلی کو لکھ بھیجا کہ مجاہدین کے جیش جلد پہنچیں گے۔ آپ لوگ تیار رہیں اور جن سرداروں کی عملداری میں سے مجاہدین کو گزرنا ہے، وہ ضرورت کی چیزیں مہیا کر دینے کا خیال رکھیں۔

پکھلی کے لیے لشکر

جب پکھلی کی جانب لشکر بھیجنے کی تجویز پختہ ہو گئی تو سید محمد مقیم رام پوری نے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ ہم یہاں آرام کی غرض سے نہیں آئے۔ یہ آرزو لے کر آئے ہیں کہ خدا کی راہ میں جہاد کریں اور ہر قسم کی مشقتیں اُٹھائیں۔ میرا قافلہ ضروری ساز و سامان سے لیس ہے۔ تمام مجاہدین آزمودہ کار ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس مہم پر ضرور بھیجا جائے[1]۔

سید محمد مقیم کے قافلے میں چالیس پچاس غازی تھے۔ سید صاحب نے ایک سو مجاہد دوسری جماعتوں سے منتخب کیے۔ ڈیڑھ سو آدمیوں کے اس لشکر کا سالار شاہ اسماعیل کو بنایا۔ مولوی خیرالدین شیرکوٹی[2] اور ملا شاہ سید چترمنگی بھی اس میں شامل تھے بلکہ شاہ اسماعیل کے مراسلوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد مقیم اور ملا شاہ سید کو اس لشکر میں نیابت کا درجہ حاصل تھا[3]۔ فتح خاں پنجتاری رہنما کی حیثیت میں ساتھ گیا۔ امب کے قریب اس کا بھی ایک گاؤں تھا۔

اس لشکر کے لیے گولی بارود کے علاوہ بانس کے پانچ سات سو نل بھی دے دیے گئے تھے، جو ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ بالشت لمبے تھے۔ ان میں بارود بھری ہوئی تھی۔ ان نلوں کو آگ دے کر دشمن پر پھینکتے تھے۔ انھیں اس زمانے کے ہینڈ گرنیڈ سمجھنا چاہیے۔ جس مقام کو آگ لگانی منظور ہوتی، وہاں یہ نل بہت کام دیتے تھے۔ رخصت کے وقت سید صاحب نے عادت شریفہ کے مطابق ننگے سر ہو کر دعا فرمائی اور سب کے ساتھ مصافحہ کیا۔

---

[1] منظورہ صفحہ ۳۶۳۔

[2] مولوی خیرالدین شیرکوٹی سید صاحب کے معتمد علیہ رفیق تھے۔ جنگ و سیاست دونوں میں ان کا پایہ بہت بلند تھا جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس قافلے کے ساتھ سرحد پہنچے تھے۔ ان کا ذکر پہلی مرتبہ ہزارہ کی جنگ ڈمگلہ میں آیا ہے۔

[3] شاہ اسماعیل کی تحریرات میں مہم ہزارہ کے متعلق مجھے پانچ مراسلے ملے۔ ابتدائی دو مراسلے خود شاہ صاحب، سید محمد مقیم اور ملا شاہ سید تینوں کی طرف سے ہیں (مکاتیب شاہ صاحب صفحہ ۲۰۸ و صفحہ ۲۱۱) تیسرا مراسلہ شاہ صاحب اور سید مقیم کی طرف سے ہے (مکاتیب صفحہ ۲۱۴) اس وقت ملا شاہ سید دعوت جہاد کے سلسلے میں کہیں گئے ہوئے تھے۔ باقی دو مراسلے صرف شاہ صاحب کی طرف سے ہیں (مکاتیب ۲۱۶، ۲۱۷) اس وقت سید محمد مقیم کو بھی مولانا نے ایک مقام پر بھیج دیا تھا۔

دوسرا باب

شاہ اسماعیل کی تنظیمی سرگرمیاں

مجاہدین کا سفر

مولانا شاہ اسماعیل نے پنجتار سے نکل کر پہلی رات ٹوپی میں گزاری اور دوسری رات کھبل میں بسر فرمائی[1]۔ کھبل سے لشکر کو سیدھا امب بھیج دیا، خود ملا شاہ سید اور چند ساتھیوں کے ہمراہ ستھانہ چلے گئے، جو راستے سے کسی قدر ہٹا ہوا تھا۔ ستھانہ میں اس وقت کھبل اور اخون خیل کے اکابر جمع تھے۔ سید اعظم شاہ اور سید اکبر شاہ والیان ستھانہ نے پرتپاک خیر مقدم کیا۔ وہاں پورے مجمع کے سامنے مولانا نے وعظ کہا، جس کا موضوع جہاد تھا اور سید صاحب کی طرف سے بیعت لی۔ آپ کی خواہش تھی کہ تمام لوگ اب چلے چلیں۔ انھوں نے عذر کیا اور کہا کہ اب جانا مشکل ہے، پھر جب آپ بلائیں گے تو ہم حاضر ہو جائیں گے۔ اخوند زادہ اسماعیل البتہ ساتھ ہو گئے، جو مولانا کے بیان کے مطابق سب میں "مشارٌ الیہ" تھے۔

سید اکبر شاہ، پکھلی کے تمام رئیسوں اور سرداروں کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے خلوت میں مولانا کو بتایا کہ ان میں سے اکثر نفاق پیشہ ہیں۔ مقابلہ ہوگا تو آپ کو لڑائی میں تنہا چھوڑ کر تماشا دیکھیں گے۔ فتح حاصل ہوگی تو چیلوں اور گدھوں کی طرح مال غنیمت پر گریں گے۔ شکست ہوگی تو بالا بالا گھروں کو بھاگ جائیں گے۔ ممکن ہے، عنایت اللہ خاں (خان خیل)، عبدالغفور خان (اگروری)، کمال خاں (اگروری) اور ناصر خاں (بھٹ گرامی) وفادار ہیں۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ رائے حرفاً حرفاً درست تھی، لیکن جو فداکاران حق تمام مسلمانوں کو منظم کر کے میدان عمل میں لا کھڑا کرنے کے لیے مضطرب تھے، وہ اس کے سوا کیا کر سکتے تھے کہ ہر فرد کے پاس پہنچیں، ہر فرد کے کان میں خدا اور رسولؐ کی آواز پہنچائیں اور ہر فرد کو دین کی خدمت پر متوجہ کریں؟ وہ دعوت اشتراک و تعاون میں تفریق کیوں کر گوارا کر سکتے تھے؟ اگر ایسا کرتے تو خود اپنے مقصد و نصب العین کی راہ میں گوناگوں رکاوٹیں پیدا کرنے کے ذمہ دار ٹھہرتے۔ ان کے لیے صحیح راستہ یہی تھا کہ ہر ایک کے پاس پہنچیں، ہر ایک کو ساتھ ملانے کی کوشش کریں۔ جس حد تک

---

[1] مکاتیب شاہ اسماعیل صفحہ ۲۰۸۔ "وقائع" میں ہے کہ پہلی منزل مبنئی میں، دوسری گیارہ میں اور تیسری کھبل میں ہوئی، لیکن خود مولانا شاہ اسماعیل کا بیان "وقائع" کی اس روایت کے خلاف ہے۔

معیت کے لیے تیار ہو، اس کی معیت بخوشی قبول کر لیں اور صاف بات یہ ہے کہ مذبذبین کا تذبذب اس وقت تک ختم نہیں ہوتا، جب تک معاملہ یک سُو نہ ہو جائے۔ اہل حق ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے فوراً آمادہ ہو جاتے ہیں، جن لوگوں کی حمیت کمزور ہوتی ہے، وہ عموماً اس وقت تک میدان عمل میں آنے سے کتراتے ہیں، جب تک کامیابی کے امکانات بالکل واضح اور روشن نہ ہو جائیں۔ عالم انسانیت کی جو سرگزشت ہمارے سامنے کھلی پڑی ہے، اس سے ہمیں ہر قدم پر یہی سبق ملتا ہے۔

مولانا اسماعیل امب میں

بہر حال مولانا شاہ اسماعیل ستھانہ سے فارغ ہو کر رات کے وقت امب پہنچے۔ سردار پایندہ خاں نے بستی سے باہر نکل کر استقبال کیا اور اپنے مکان سے دُور مجاہدین کے لیے فرودگاہ مقرر کی[1] صبح اٹھ کر شاہ صاحب نے گردوپیش کے نقشے کا جائزہ لیا۔ فرماتے ہیں:

> دریائے سندھ کے ایک کنارے پر (مغربی کنارے پر) امب واقع ہے۔ دوسرے کنارے (مشرقی کنارے) پر سکھوں کے چھوٹے چھوٹے قلعے بنے ہُوئے ہیں اور (سلسلۂ کوہ میں) یکے بعد دیگرے تنگ و دشوار گزار گلیاں ہیں۔ خود ہم فدائیوں کی پناہ گاہ کے سامنے بھی قریباً ایک گولی کے فاصلے پر گڑھی نظر آتی ہے[2]

ہزارہ پہنچ کر جس سکیم پر کاربند ہونا منظور تھا، وہ غالباً پنجتار ہی میں سید صاحب کے سامنے مکمل کر لی گئی تھی۔ اس میں یہ بھی طے کر لیا گیا ہو گا کہ پایندہ خاں کو ساتھ لے کر دریا کے مشرقی کنارے پر پیش قدمی کی جائے گی اور جو علاقے سکھوں کے اثر و اقتدار سے محفوظ تھے، ان میں مسلمانوں کو منظم کر کے سکھ عملداروں کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا جائے گا۔ امب پہنچ کر پایندہ خاں کے ساتھ مولانا نے بات چیت کی تو معلوم ہُوا کہ وہ دریا

---

[1] منظورہ میں ہے: "تا عشرہ استقبال نمودہ در مسجد فرودکش کنانید"۔ ممکن ہے مجاہدین کے پہنچنے پر پایندہ خاں استقبال کے لیے عشرہ پہنچ گیا ہو اور جب معلوم ہُوا کہ مولانا شاہ اسماعیل ستھانہ میں رُک گئے تو واپس چلا گیا ہو۔ خود مولانا شاہ اسماعیل کا استقبال امب سے باہر نکل کر ہُوا، جیسا کہ خود مولانا کے بیان سے ظاہر ہے۔ مولانا تفنن کے طور پر فرماتے ہیں کہ "الحزم سوء الظن" کے قول ماثور کی بنا پر مجاہدین کو اپنے مکان سے دُور ٹھہرایا۔ پرانا امب ۱۸۴۱ء کی طغیانی سندھ میں بالکل برباد ہو گیا تھا اور اس کی جگہ یا اس سے قریب دوبارہ ایک گاؤں آباد ہُوا۔ پایندہ خاں نے اپنے لیے اس سے تین میل شمال میں ایک نیا امب بنا لیا۔ اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ امب قدیم میں مولانا پہنچے تھے تو اس میں پایندہ خاں کا مکان کہاں تھا اور مجاہدین کی فرودگاہ کس جگہ تھی یا اگر مجاہدین کو مسجد میں ٹھہرایا گیا تو وہ کس مقام پر تھی۔ [2] یہ غالباً قادر آباد کی طرف اشارہ ہے، جو پہلے اہم مقام تھا اور اب موجود نہیں۔ اس بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ مجاہدین کی فرودگاہ امب کے مشرقی کنارے پر دریا کی سمت میں تھی اور پایندہ خاں کا مکان یقیناً بستی کے مغربی کنارے ہوگا۔

کے مشرقی کنارے پر جانے اور مجاہدین کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں۔ معلوم نہ ہو سکا کہ خان نے مساعدت سے احتراز کے لیے کیا وجوہ پیش کیے۔ ممکن ہے، وہ اس وجہ سے توقف میں پڑا ہو کہ مولانا کے ساتھ مجاہدین بہت کم تھے۔ پائندہ خاں ہی نہیں بلکہ اس عہد کے تمام رؤسا کی نظریں صرف ظواہر پر تھیں۔ جب وہ دیکھتے تھے کہ سید صاحب کے پاس آدمی کم ہیں اور ساز و سامان نہ ہونے کے برابر ہے تو اس وہم میں پڑ جاتے کہ یہ معمولی سی قوت سکھوں کے مقابلے سے کیوں کر عہدہ برآ ہو سکے گی۔ اس لیے کھل کر بےباکانہ مخالفت میں مشاغل ہو جاتے۔ حالانکہ صحیح راہ عمل یہ تھی کہ اصل نصب العین کو پیش نظر رکھ کر جانبازانہ مساعدت کرتے اور جن چیزوں کی کمی محسوس کرتے تھے، ان کی تلافی میں ساعی ہو جاتے۔

پائندہ خاں کی افسردگی دیکھ کر شاہ صاحب نے ارادۂ اقدام ترک نہ کیا۔ سید صاحب کا حکم بھی یہی تھا کہ اگر پائندہ خاں موافقت میں متوقف ہو تو اس حالت میں بھی قدم جلد سے جلد آگے بڑھایا جائے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ جس جگہ پہنچنا تھا وہ دریا کے مشرقی کنارے سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھی۔ اگر اب ہی سے دریا کو عبور کیا جاتا تو دشمن کے ساتھ جھڑپ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ مولانا آغاز جنگ سے پیشتر باحمیت مسلمانوں کی تنظیم ضروری سمجھتے تھے، لہٰذا اب سے اس گھاٹ کا رخ کر لیا جو تین کوس شمال میں تھا۔[1] یہ چھتر بائی کا گھاٹ تھا۔

روانگی سے پیشتر مولانا نے عیسیٰ زئی، امان زئی، جدون، اوتمان زئی اور پنج بہار کی طرف داعی بھیج دیے۔ اپنے خطوط کے علاوہ سید صاحب کے مہری اعلام نامے بھی ان کو دے دیے۔

عبور دریا اور پیش قدمی

چھتر بائی میں صرف ایک جالہ تھا، جس میں تھوڑے آدمی سوار ہو سکتے تھے۔ امید نہ تھی کہ دن بھر میں پورے مجاہدین دوسرے کنارے پر پہنچ سکیں گے اور مولانا کو یہ منظور نہ تھا کہ رات اس حالت میں آ جائے جب نصف مجاہدین ایک کنارے پر اور نصف دوسرے کنارے پر ہوں، اس لیے مجاہدین کی ایک جماعت کو چھتر بائی سے بھی اوپر کے ایک گھاٹ پر بھیج دیا جہاں دو جالے تھے۔ دونوں جماعتوں نے رات مغربی کنارے پر بسر کی۔ صبح دریا سے گزر کر اکٹھے ہوئے اور بروڑی ہوتے ہوئے نگاپانی پہنچ گئے۔ پائندہ خاں نے اپنے بھائی امیر خاں کو اس غرض سے ساتھ کر دیا تھا کہ غازیوں کی مہمانداری میں کوتاہی نہ ہو۔

نگاپانی سے بھی مولانا شاہ اسماعیل نے گرد و پیش کے تمام مقامات پر جہاد کے دعوت نامے بھیج دیے۔

---

[1] مکاتیب شاہ اسماعیل صفحہ ۲۱۲۔

مختلف علماء نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ اگر ابھی جہاد شروع کرنے کا ارادہ ہو تو سات آٹھ سو آدمی تیار ہیں۔ مولانا نے فرمایا: ابھی ضرورت نہیں، وقت آئے گا تو بلا لیں گے۔ ہاں مجاہدین کو تیار کرنے کا کام جاری رکھا جائے۔

نکا پانی سے شیر گڑھ پہنچے[1]۔ مولانا کی دقیقہ سنجی اور امعانِ نظر کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ایک ایک چیز اور ایک ایک مصلحت پر گہری نظر تھی۔ چونکہ راستہ سنگلاخ پہاڑیوں میں سے تھا اور میدانی علاقے کے باشندے اُسے بہ آسانی طے نہیں کر سکتے تھے، اس لیے سید صاحب کی خدمت میں عریضہ بھیجا کہ اس طرف صرف آزمودہ کار غازی بھیجے جائیں، جو طویل مسافت میں ہر قسم کی مشقتیں ضبط و صبر کے ساتھ برداشت کر سکیں، سواری کے عادی یا محتاج نہ ہوں اور انھیں امام کی نسبت انقیادِ کلی اور اذعانِ جبلی کا مرتبہ حاصل ہو۔ ساتھ ہی گزارش کی کہ غازیوں کو چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم کر کے ایک ایک، دو دو، تین تین روز کے وقفے سے بھیجا جائے۔ اس میں کئی مصلحتیں تھیں۔ مثلاً: چھوٹی جماعتوں کے لیے دریا سے پار اترنا آسان تھا، کھانے پینے کی چیزیں حاصل کرنے میں دقت پیش نہیں آ سکتی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے جیش لگتے رہتے تو عام مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب ہوتی اور ان پر یہ اثر پڑتا کہ پیچھے بہت بڑا لشکر ہوگا جو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر آ رہا ہے، اس لیے حوصلہ مندی سے ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاتے۔ دشمن ہر دوسرے تیسرے روز لشکروں کی آمد کا ذکر سنتے رہتے تو ان پر دہشت اور ہیبت طاری ہوتی۔

مجاہدین اگرور میں

شیر گڑھ میں پائندہ خاں کے جمعدار، جانو تام، نے مجاہدین کی مدارات پورے اہتمام سے کی، لیکن وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا گیا اور مولانا اگرور کی طرف روانہ ہو گئے۔ عبدالغفور خاں رئیس اگرور کو پہلے سے خبر بھیج دی گئی تھی۔ اس کا بھائی کمال خاں راستے میں استقبال کے لیے موجود تھا۔ خود عبدالغفور خاں اس وجہ سے نہ آ سکا کہ بیمار ہو گیا تھا۔ مولانا نے رات کلکئی میں بسر کی اور اگلے روز عبدالغفور خاں کی جائے اقامت پر پہنچے، جہاں احمد خاں پکھلی والا، حیدر شاہ ابن عم سید محمد علی شاہ (جسے پکھلی کے تمام خوانین کا سرخیل سمجھا جاتا تھا) اور ارسلان خاں برادر زادۂ عبدالغفور خاں بھی بہ سلسلہ زیارت آئے ہوئے تھے۔ ان سب نے مولانا کے ہاتھ پر سید صاحب کی امامت کی بیعت کی۔

اب مولانا صاحب نے یہ سوال اُٹھایا کہ غازیوں کے قیام کے لیے کوئی مناسب گڑھی تجویز کر دی جائے۔ عبدالغفور خاں کی تین گڑھیاں تھیں: چھتر گڑھی، جبسی کوٹ، شمدڑہ۔ چھتر گڑھی اس کے قبضے میں نہ تھی، گڑھی جبسی کوٹ محاذِ جنگ سے دُور تھی۔ گڑھی شمدڑہ کو موزوں سمجھ کر تجویز کر دیا گیا۔ مولانا یہ وعدہ لے کر کلکئی

---

[1] بروٹی، نکا پانی اور شیر گڑھ سابق ریاست امب کے مقامات ہیں۔ یہ سب دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر ہیں۔

چلے آئے کہ کمال خاں اگلی صبح کو خود کلکٹی پہنچ کر غازیوں کو شمدڑہ میں بٹھا دے گا۔ ملا شاہ سیّد کو ان قبیلوں میں ترغیبِ جہاد کے لیے بھیج دیا گیا جو اگرچہ والیِ اگرور کی برادری میں تھے لیکن اس کے تابع نہیں تھے۔

اخوند زادہ ملا اسماعیل کو اطراف میں دعوتِ جہاد کی غرض سے بھیجا گیا تھا۔ کلکٹی میں ان کی طرف سے پیغام پہنچا کہ جب تک اور لشکر نہیں آئے گا یہاں کے لوگ جہاد میں رفاقت کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ پھر سید محمد نصیر پیچ بھاری کی طرف سے بھی جواب آیا کہ مزید غازی بُلائے جائیں۔ خصوصاً بونیر والوں کو کمک پر آمادہ کیا جائے۔ اس صورت میں یہاں بہت آدمی جمع ہو جائیں گے۔ جب تک یہ نہ ہو گا، پکھلی سے قابلِ ذکر امداد کی امید نہ رکھنی چاہیے۔ سید محمد علی شاہ اور ناصر خاں کے خط آئے تو ان میں لکھا تھا کہ غازی فی الحال اگرور میں ٹھہرے رہیں۔ بہ ظاہر ان کی غرض یہ تھی کہ جب تک انھیں کامیابی کا قطعی یقین نہ ہو جائے، دشمنوں سے پیوند کے انقطاع کے لیے قدم نہ اٹھایا جائے۔ مولانا شاہ اسماعیل نے پھر عبدالغفور خاں اور بعض دوسرے رئیسوں مثلاً ارسلان خاں، احمد خاں، سید حمید شاہ وغیرہ سے مفصل گفتگو فرمائی اور یہ اثر لے کر لوٹے کہ ان لوگوں کی ساری مدارات محض زبانی جمع خرچ تک محدود ہے۔ ایمانی غیرت، اسلامی حمیت، اخلاص اور فرمانبرداری احکامِ خداوندی کا ایک ذرہ بھی ان کے دل میں موجود نہیں، وہ صرف حطامِ دنیوی کے خواہاں ہیں۔

پریشانی در پریشانی

مولانا کلکٹی واپس پہنچے تو ایک نئی پریشانی رونما ہوئی۔ لشکرِ مجاہدین کے خزینہ دار نے جو رقم ساتھ لی تھی، اس میں روپے بھی تھے، اشرفیاں بھی تھیں۔ روپے خرچ ہو گئے تو اشرفیوں کو بھنانے کی کوشش کی۔ اہلِ اگرور کو ان کا نرخ معلوم نہ تھا، اس لیے اشرفیاں لے کر غلّہ دینے سے انکار کر دیا۔ اشرفیوں کے روپے باہر ہی سے منگائے جا سکتے تھے، لیکن اس وقت تک ادھار غلّہ اسی صورت میں مل سکتا تھا کہ رؤسا میں سے کوئی ایک بنیوں کو اشارہ کر دیتا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ اگر مجاہدین حبیب اللہ خاں کی تائید پر آمادہ ہوں تو ان کے لیے ہر سہولت کا بندوبست کر دیا جائے۔ اگر آمادہ نہ ہوں تو کچھ نہ کیا جائے۔ مولانا شاہ اسماعیل مجاہدین کو صرف حبیب اللہ خاں کی تائید کے لیے استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اس بات کے لیے بھی تیار نہ تھے کہ حبیب اللہ خاں کا مقصد پورا ہو جائے تو معطل ہو کر بیٹھ جائیں۔ وہ چاہتے تھے کہ کاروبارِ جہاد کا سروسامان ہو جائے، اس غرض کے لیے مستقل تنظیمات کے خواہاں تھے۔ اس پریشانی میں دو روز تک رزق و معیشت کی اتنی تنگی رہی کہ لشکرِ اسلام میں سے اکثر آدمی خصوصاً اہلِ رام پور مضطرب ہو گئے۔ بعض نے واپسی کا مشورہ دیا۔ سید محمد مقیم اپنی جبلی شجاعت کی بنا پر اصرار کرنے لگے کہ فوراً لڑائی چھیڑ دینی چاہیے۔ مولانا نے حسنِ تدبیر سے انھیں روکے رکھا اور خواجہ محمد (حسن پوری) کو اشرفیاں دے کر سربلند خاں کے پاس بھیج دیا کہ ان کے ذریعے سے بھنا لے آئے۔

سربلند خاں سے ملاقات

یہ حالت تھی جب ارسلان خاں اہلِ اگرور کی ایک جمعیت لے کر آیا اور اس نے کہا کہ میں تو حبیب اللہ خاں کی امداد کے لیے جاتا ہوں۔ اگر آپ

لوگوں میں سے بھی کسی کو جہاد کا شوق اور ایک مظلوم مسلمان کی اعانت کا خیال ہو تو تیار ہو جائے۔ اس کا خرچ میں برداشت کروں گا۔ سید محمد مقیم اور کئی لوگ تیار ہو گئے اور مولانا سے اجازت مانگی۔ اگرچہ انھیں اجازت دینا مولانا کے نزدیک مصلحتِ وقت کے خلاف تھا، لیکن سید صاحب نے روانگی کے وقت تاکید فرما دی تھی کہ ان کی دلداری میں کوتاہی نہ ہو، لہذا مولانا نے اجازت دے دی۔ خود ان کے پاس صرف چالیس غازی رہ گئے، باقی سب ارسلان خان کے ساتھ چلے گئے۔ مولانا ان غازیوں کو لے کر جبی کوٹ تشریف لے گئے، جو ارسلان خاں کی جائے اقامت تھی۔

اب مولانا نے سربلند خاں تنولی سے ملنے کا ارادہ فرمایا۔ چنانچہ اخوندزادہ محمد اسماعیل، ملا شاہ سید چیڑ منگی اور چند غازیوں کو ساتھ لے کر سربلند خاں کے پاس پہنچ گئے، جو سکھوں کی چیرہ دستیوں کے باعث اپنا وطن چھوڑ کر شاہی خان کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں ملا شاہ سید کے بھائی ملا رحمت اللہ بھی موجود تھے۔ مولانا نے دو دن اور دو راتیں سربلند خاں کے پاس گزاریں۔ اس کے علاوہ شاہی خاں اور اس کے بھائیوں سے مفصل باتیں کیں اور اس نتیجے پر پہنچے کہ سربلند خاں کا اصل مقصود پایندہ خاں تنولی کی بیخ کنی ہے۔ اگر مجاہدین کو سکھوں پر غلبہ حاصل ہو جائے تو یہ تمام لوگ ساتھ ہو جائیں گے ورنہ کوئی قدم نہ اٹھائیں گے۔ البتہ محمد علی شاہ ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جائے تو یہ بھی معیت اختیار کر لیں گے۔

مولانا کی رائے

پایندہ خاں اور سربلند خاں میں پشتوں سے خاندانی دشمنی چلی آ رہی تھی، اس لیے سربلند خاں کے نزدیک اصل شے یہی تھی کہ اس کے دیرینہ دشمن کو ختم کیا جائے۔ مولانا کے پیشِ نظر یہ امر تھا کہ تمام مسلمانوں کو سکھوں کے مقابلے کے لیے متحد کریں۔ وہ مختلف خوانین کی ذاتی دشمنیوں کا آلۂ کار کیوں کر بن سکتے تھے؟ انھوں نے سید صاحب کو لکھا:

۱ - دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر پایندہ خاں کی حکومت ہے۔ گھاٹ اس کے قبضے میں ہیں۔ اگرور اس کے تابع ہے۔ اگر اس سے رشتہ منقطع کر لیا جائے تو غازیوں کے لیے آمد و رفت میں مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

۲ - پایندہ خاں تمام خوانین ہزارہ سے حشمت و شوکت میں بڑھا ہوا ہے۔ اسے مخالف بنا کر بعض دوسرے خوانین کی موافقت حاصل کرنا بالکل غلط ہو گا۔

۳ - پایندہ خاں، حبیب اللہ خاں اور خوانین اگرور کے درمیان رشتۂ اتحاد قائم ہے اور ہمارے غازی حبیب اللہ کی امداد کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو علم ہو جائے کہ ہمارے اور پایندہ خاں کے درمیان رابطۂ اتحاد منقطع ہو چکا ہے تو غازیوں کو مضرت پہنچانے کے درپے ہو جائیں یا کم از کم ان کی موافقت سے کنارہ کشی اختیار کر لیں۔

۴ ۔ زبردست خاں حوالی کشمیر کے بڑے رؤسا میں سے ہے ۔ وہ حبیب اللہ خاں کا قدیمی دوست ہے ۔ ممکن ہے حبیب اللہ خاں کے ذریعے سے زبردست خاں کے ساتھ ربط و ضبط پیدا ہو جائے ۔

غرض پاینده خاں کے ساتھ دوستی کا رشتہ منقطع کرنا اصولاً بھی غیر مناسب تھا اور مختلف مصالح وقت کے بھی خلاف تھا ، اس لیے مولانا اس پر راضی نہ ہوئے ۔

خوانین ہزارہ کی حالت

خوانین ہزارہ میں سے بعض کی کیفیت اُوپر پیش کی جا چکی ہے ۔ مولانا نے سربلند خاں ، سعادت خاں ، احمد شاہ خاں ، احمد خاں ، شاہی خاں وغیرہ سے ملاقاتیں کیں ۔ ناصر خاں ، حسن علی خاں اور محمد علی شاہ سے نہ مل سکے ۔ لیکن سب کے متعلق اپنا تاثر یہ بیان فرمایا کہ بحالت موجودہ ان سے لشکرِ اسلام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا ۔ یہ اس وقت تک مجاہدانہ اقدام کے لیے تیار نہ ہوں گے ، جب تک اہلِ اسلام کا غلبہ نمایاں نہ ہو جائے ۔

بالآخر مولانا ضلع نیکری کے ایک مقام ”جویاں مستور“ میں ٹھہر گئے ۔ سید محمد علی شاہ اور ناصر خاں کو ایک ایک خط سربلند خاں سے لکھوایا ۔ خود بھی انھیں اور ان کے اعزہ کو اپنے آدمی کے ہاتھ خطوط ارسال کیے ۔ ملا عصمت اللہ کو دیشی قوم کے پاس دعوت جہاد کے لیے بھیجا ۔ ایک شخص کو سادات کوائی (کاغان) کی طرف روانہ کیا ۔ فرماتے ہیں کہ اگرچہ خدا کے فضل سے حصولِ مقصود کی اُمید ہے لیکن ان اضلاع میں لشکر بھیجنے کا وقت ابھی نہیں آیا تھا ۔ یہ قدم وقت سے پہلے اُٹھا لیا گیا ۔ بہتر یہ تھا کہ میں چند ساتھیوں کو لے کر آتا ۔ تمام دیہات میں پھر پھر کر جہراً اور سِرّاً دعوت جہاد دیتا ۔ جب رؤسا تیار ہو جاتے تو لشکر کی جگہ متعین کر کے غازیوں کو یہاں بُلاتا ۔ یا یہ مناسب تھا کہ زبردست لشکر بھیج کر تمام خوانین و رؤسا کی موافقت سے قطع نظر کرتے ہوئے سکھوں سے جنگ کی جاتی ۔ خیر جو کچھ واقع ہُوا ، اسی کو باعث خیر سمجھنا چاہیے ۔ اگر سید محمد مقیم کامیاب واپس آئے تو امید ہے کہ حصول مقصد کی صورت جلد پیدا ہو جائے گی ، ورنہ کچھ دیر لگے گی ۔ اس موقع پر واپس آجانا بھی مضر ہے اور تامل و تدبر کے بغیر کام میں ہاتھ ڈالنا خلاف مصلحت ہے[1]

ملا اسماعیل اخوند زادہ

مولانا نے اپنے مراسلات میں اخوند زادہ ملا محمد اسماعیل کو بار بار سراہا ہے ۔ ان کے علم و فضل ، اخلاص و تقویٰ ، عقل و دانش ، حسن تدبیر اور اصابت رائے کی بہت تعریف فرمائی ہے ۔ آخر میں فرماتے ہیں :

---

[1] مکاتیب شاہ اسماعیل ۲۲۱ ۔ نمبر ۴۷ ۔

ملا اسماعیل اخوند زادہ نہایت ہوشیار و دیانت دار ہیں اور مشاورت و مصالحت میں پختہ کار۔ وہ ان اطراف کے تمام فضلا کے پیشکار ہیں اور جملہ خوانین کے معتمد۔ دین کے کام میں بجان مصروف ہیں اور تالیف و ترغیب میں بہ دل مشغول۔ ان کے نام تحسین و آفرین کا ایک شقہ بھیجا جائے۔ یہ شقہ یقیناً بھیجا گیا ہوگا، لیکن سیّد صاحب کے مکاتیب کا جو مجموعہ محفوظ رہ سکا، اس میں شامل نہ ہو سکا۔ دوسری سیکڑوں تحریروں کی طرح وہ بھی ضائع ہو گیا۔

تیسرا باب

ڈمگلہ اور شنکیاری کے معرکے

ڈمگلہ پر یورش کی شہرت

مولانا شاہ اسماعیل نے مقدمات جہاد کی ترتیب کے سلسلے میں جو کچھ کیا، وہ گزشتہ باب میں تفصیلاً بیان ہو چکا ہے۔ اس کے بعد معلومات کے ذخائر میں دفعۃً ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے اور کچھ پتا نہیں چلتا کہ ڈمگلہ اور شنکیاری کی لڑائیاں کس بنا پر پیش آئیں۔ قیاس سے کام لیے بغیر چارہ نہیں رہتا۔

پچھلے باب میں ہم بتا چکے ہیں کہ غازیوں کی ایک جماعت ارسلان خاں کے ساتھ روانہ ہو گئی تھی، جو حبیب اللہ خاں کے بیٹے کو سکھوں کے محاصرے سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ مولانا کے پاس صرف چالیس غازی رہ گئے تھے۔ یہ لوگ گڑھی حبیبی کوٹ میں مقیم تھے۔ خود مولانا چند آدمیوں کے ساتھ علاقہ ٹیکری کے مقام "جوریاں مستور" میں چلے گئے تھے اور عبداللہ خاں کو غازیوں کا سرعسکر مقرر کر گئے تھے۔

اس اثنا میں مشہور ہو گیا کہ غازی ڈمگلہ پر حملہ کرنے والے ہیں، جو میدان پکھلی سے مشرق مائل بہ شمال واقع ہے۔ اس کے فتح ہو جانے سے مظفرآباد و کشمیر کی طرف پیش قدمی کا راستہ کھل سکتا تھا۔ ہری سنگھ نلوہ حاکم ہزارہ نے پھول سنگھ کو تین ہزار آدمیوں کے ساتھ ڈمگلہ کی حفاظت کے لیے بھیج دیا۔ پھر آس پاس کی گڑھیوں سے مزید تین ہزار سکھ پھول سنگھ کی کمک کے لیے روانہ کر دیے۔ اس افراتفری میں اس گڑھی کا محاصرہ بھی اٹھا لیا گیا، جس میں حبیب اللہ خاں کا بیٹا محصور تھا۔ اس طرح خوانین ہزارہ کا فوری مقصد پورا ہو گیا۔

شبخون کا فیصلہ

ڈمگلہ میں سکھوں کے اجتماع کی خبر سن کر مولانا نے مناسب نہ سمجھا کہ ان پر ضرب لگائے بغیر پیچھے ہٹ جائیں۔ انھیں یہ امید بھی ہو گی کہ ممکن ہے اس سرباز انہ اقدام سے خوانین و رؤسائے ہزارہ کا سویا ہوا جذبۂ غیرت بیدار ہو جائے اور وہ قلت وسائل کی بنا پر تذبذب کی جس دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، اس سے باہر نکل کر بے باکی سے اعانت کے لیے تیار ہو جائیں۔ دعوت جہاد کو عوام تک پہنچانے کا بھی یہ ایک نہایت موثر طریقہ تھا۔ لیکن سکھوں کی فوج بہت زیادہ تھی، اس لیے شبخون مارنے کا فیصلہ کیا۔ خود مولانا شنکیاری کے قریب ٹھہر گئے جو ڈمگلہ سے تین میل پر درہ بھوگڑمنگ

کے سامنے ایک مشہور مقام ہے۔ وہاں کی گڑھی میں سکھوں کا ایک جیش رہتا تھا۔ سید محمد مقیم رام پوری کو ایک سو غازیوں کا سالار بنا کر ڈمگلہ پر یورش کے لیے بھیج دیا۔ چودہ پندرہ سو ملکی بھی ان غازیوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ مولوی خیر الدین شیر کوٹی کو سید محمد مقیم کا مشیر و نائب بنا دیا۔ گولی بارود کے علاوہ بارود بھرے ہوئے نل بھی غازیوں کو دے دیے اور ہدایت فرما دی کہ سکھ لشکر گاہ کے قریب پہنچ کر پہلے نل اندر پھینکے جائیں، پھر چھاپا مارا جائے۔ چھاپے کے دوران میں بھی جہاں جہاں سکھوں کا ہجوم نظر آئے، نل پھینک کر انھیں منتشر کیا جائے۔ غازیوں نے کچھ چارپائیاں بھی ساتھ لے لیں تاکہ لشکر گاہ کی خار بندی کے ساتھ کھڑی کر کے بہ آسانی اندر پہنچ سکیں۔

جنگ سید محمد مقیم منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئے۔ ڈمگلہ اگرچہ دور نہ تھا لیکن وہاں تک پہنچتے پہنچتے صرف تین چار سو ملکی رہ گئے، باقی سب ادھر ادھر چھپ گئے۔ سید موصوف صاحب عزم و ہمت تھے۔ اپنے رفیقوں کی اس خلاف توقع تقلیل سے بالکل پریشان نہ ہوئے۔ لشکر گاہ کے پاس پہنچ کر پہلے بارود بھرے نل پھینکے، پھر چارپائیاں خار بندی سے لگا دی گئیں اور سب سے پہلے جس شخص نے لشکر گاہ میں قدم رکھا، وہ ان غازیوں کا بہادر سالار محمد مقیم تھا۔ پورے زور سے نعرۂ تکبیر لگا کر حملہ کیا۔ راوی کا بیان ہے کہ سکھ غول غول بن کر کئی جگہ جمع ہو گئے۔ ہم لوگ نل داغ داغ کر پھینکتے تو بکھر جاتے، پھر ہم قرابینیں مارتے ہوئے ان پر حملہ کرتے۔ سید محمد مقیم اور ان کے ساتھیوں نے جوانمردی کے وہ جوہر دکھائے کہ منظورہ کے بیان کے مطابق رستم و اسفندیار کی داستانیں فراموش ہو گئیں:

> وہ لوگ اس طرح سکھوں کے ہجوم میں گھستے تھے، جیسے کوئی کبڈی کھیلتا ہے۔ تین چار ہلوں میں انھیں (سکھوں کو) سنگھر سے باہر نکال دیا۔[1]

جو ملکی اِدھر اُدھر چھپ گئے تھے، اب وہ بھی آ پہنچے، لیکن انھوں نے لڑائی میں کوئی حصہ نہ لیا اور مال و اسباب اُٹھا کر بھاگنے لگے۔ سکھوں نے پھوس کے چند چھپروں کو آگ لگا دی۔ آگ بھڑکی تو ماحول دُور دُور تک روشن ہو گیا اور لشکر گاہ کے اندر کی ایک ایک چیز نظر آنے لگی۔ اس وقت سکھوں کو معلوم ہوا کہ لڑنے والے غازی بہت کم ہیں اور ملکی لوگ صرف مال اُٹھا اُٹھا کر بے ترتیبی سے نکلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ وہ پھر منظم ہو ہو کر مقابلے کے لیے آنے لگے۔

مراجعت مولوی خیر الدین نے یہ حالت دیکھی تو مشورہ دیا کہ اب نکل جانا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ مولوی صاحب

---

[1] منظورہ صفحہ ۴۴۸

خود ایک جماعت کو لے کر سکھوں کا مقابلہ کرنے لگے، باقی غازیوں کو حکم دیا کہ اطمینان سے باہر نکل جاؤ اور زخمیوں کو بھی اٹھا لو۔ چھ سات زخمیوں کو اٹھا لیا گیا۔ دو کی حالت نازک تھی: اوّل عبدالخالق محمد آبادی، دوم سید لطف علی۔ ان دونوں نے خود کہا کہ ہمارے ہتھیار لے لو اور اٹھانے کی تکلیف گوارا نہ کرو۔ ہمیں اسی میدان میں جان دے دینا پسند ہے۔

جب سارے غازی نکل گئے تو مولوی خیرالدین بھی قدم بہ قدم پیچھے ہٹتے ہٹتے باہر نکل گئے۔ سکھوں پر اتنی ہیبت طاری تھی کہ کسی کو سنگھر سے باہر نکل کر تعاقب کی ہمّت نہ ہوئی۔ اس شبخون میں چند غازی شہید ہوئے، جن میں سے صرف دو کے نام معلوم ہو سکے۔ یعنی وہی دو جنھوں نے کہا تھا کہ ہمیں اسی میدان میں جان دے دینا پسند ہے۔ چند زخمی ہوئے۔ ان میں سے ایک سالارِ لشکر سید محمد مقیم تھے، جن کی ٹانگ پر تلوار لگی تھی۔ سکھ مقتولین کی تعداد ایک روایت کے مطابق دو سو اور ایک روایت کے مطابق تین سو تھی[تہ]۔ وقائع "میں یہ تعداد" قریب تین سو کے" بتائی گئی ہے۔

جنگ شنکیاری

اِدھر غازیوں کی بڑی جماعت شبخون کے لیے ڈُمگلہ آئی ہوئی تھی، اُدھر مولانا کو شنکیاری کے پاس اچانک جنگ پیش آگئی۔ مولانا کے ساتھی دو فاقے کاٹ چکے تھے۔ کسی قدر غلّہ ملا تو وہ کھانے کے انتظام میں لگ گئے۔ بعض کھا چکے تھے، بعض کھا رہے تھے اور بعض ابھی پکانے ہی میں مصروف تھے کہ اچانک سکھوں کا ایک گروہ گڑھی شنکیاری سے باہر نکلا۔ مختلف روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جوار کاٹنے کی غرض سے نکلے تھے۔ مولانا نے دُور سے دیکھا تو سمجھے کہ جنگ کی غرض سے آئے ہیں۔ فوراً غازیوں کو حکم دے دیا کہ مورچے پکڑ کر بیٹھ جاؤ۔ شاہینیں اور بندوقیں چلنے لگیں۔ سکھ نزدیک پہنچ گئے تو غازی قرابینیں مارنے لگے۔ بالکل پاس آگئے تو تلواریں نکال لیں۔ تھوڑی ہی دیر میں سکھ بھاگ نکلے۔ زیادہ دُور نہیں گئے تھے کہ ایک بولا: "یہ تو بہت تھوڑے آدمی ہیں، بھاگے کیوں جا رہے ہو؟" چنانچہ وہ پھر پلٹے۔ اس وقت مولانا کے ساتھ صرف بارہ آدمی تھے، لیکن ایک اِنچ بھی پیچھے ہٹنا گوارا نہ کیا[تہ]۔ وقائع" کا بیان ہے کہ مارے تلواروں کے لاش پر لاش بچھا دی۔ کئی سکھ مولانا کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ وہ پھر بھاگے تو گڑھی میں پہنچ کر دم لیا۔ اس لڑائی میں دو ڈھائی سو سکھ مارے گئے[لہ]۔ غازیوں میں سے چھ سات شہید اور نو دس زخمی ہوئے۔

مولانا کی عزیمت

سکھوں کی گولیاں مینہ کی طرح برستی رہیں، مولانا کی قبا چھلنی ہو گئی، لیکن نہ آپ میدان سے ہٹے، نہ مورچے کی پناہ لی اور نہ جنگ روکی۔ امجد خاں نے خود مولانا کی زبان سے سُنا کہ شنکیاری کی جنگ میں سکھ ہم سے بہت قریب آگئے تھے۔ ایک سکھ تلوار لے کر میری طرف

[لہ] منظورہ صفحہ ۴۴۸

بڑھا، میں نے گولی سے اُسے ٹھنڈا کر دیا، پھر بندوق بھرنے لگا۔ اس اثنا میں دوسرا سکھ آگیا۔ اسے بھی مار دیا۔ تیسری مرتبہ بندوق بھر رہا تھا تو میری انگلی پر گولی لگی اور ہاتھ بندوق کے پیالے سے ہٹ گیا۔ میں نے اس حالت میں بھی بندوق چلا دی۔ ایک اور سکھ مارا گیا۔ چوتھی مرتبہ بندوق بھرنے کا ارادہ کیا تو بارود لہو سے تر ہو گئی۔ چوتھا سکھ مجھ پر حملے کی غرض سے بڑھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب زندہ بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ میں نے خالی بندوق کا منہ اس کی طرف پھیر دیا۔ وہ گھبرا کر بھاگ گیا۔

مولانا اپنی زخمی انگلی کو (جو چھنگلی تھی) دکھا کر مزاحاً فرمایا کرتے تھے کہ یہ ہماری "انگشت شہادت" ہے۔ سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ یہ بہترین انگشت شہادت ہے، فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ قبول کرے، ورنہ بہت سی ضربیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا کوئی ثواب نہیں ملتا۔

ہزارہ سے واپسی

ڈُمگلہ اور شنکیاری کے معرکوں نے سکھوں پر سخت سراسیمگی طاری کر دی تھی۔ کمال خاں اور ناصر خاں نے مولانا سے کہا کہ اب آپ اگرور تشریف لے چلیں تاکہ وہاں اطمینان سے مزید اقدامات کی تجویزیں سوچی جائیں۔ چنانچہ مولانا شنکیاری، بفہ، خاکی، بیر کھنڈ، ملک پورہ وغیرہ کے پاس سے گزرے۔ جب سکھوں کی گڑھی قریب آتی تو حکم دیتے کہ زور زور سے نقارہ بجاؤ تاکہ اگر کوئی مقابلہ کرنا چاہے تو باہر نکل کر دل کا حوصلہ نکال لے۔

اوگی پہنچ کر مولانا آٹھ روز ٹھہرے رہے۔ ارادہ یہ تھا کہ مناسب موقعوں پر غازیوں کو بٹھا کر سکھوں کی گڑھیوں پر شبخونوں کا لامتناہی سلسلہ جاری کر دیں۔ اس اثنا میں سید صاحب کا فرمان آگیا کہ ہندوستان سے غازیوں کے بہت سے قافلے پہنچ گئے ہیں، آپ تشریف لے آئیں۔ چنانچہ مولانا کلکئی، شیر گڑھ، نکا پانی اور بروڈی ہوتے ہوئے دریا پر پہنچ گئے۔ دربند بروڈی سے قریب تھا، جہاں سکھوں کی گڑھی تھی۔ کچھ غازی جنگل سے لکڑی لائے، پن چکیوں پر آٹا پسوایا۔ سکھ انھیں دیکھتے ہی اونچے ٹیلوں پر چڑھ گئے اور وہاں سے گولیاں چلانے لگے۔ عبور دریا کے بعد مولانا امب، ستھانہ، کھبل اور ٹوپی ٹھہرتے ہوئے پنجتار پہنچ گئے۔ ۱۰ ستمبر ۱۸۲۷ء میں مولانا ہزارہ گئے تھے، اسی مہینے یا اکتوبر میں ڈُمگلہ اور شنکیاری کے معرکے پیش آئے۔[1]

---

[1] "وقائع" میں ہے کہ مولانا ٹوپی پہنچے تو ارد گرد کے خوانین اور سرداروں کے علاوہ اخوند سید میر (ملا صاحب کوٹھا) بھی چند مسائل کی تحقیق کے لیے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے تمام مسائل اخوند ممدوح کے اطمینان کے مطابق حل کر دیے۔ رات اخوند صاحب نے مولانا ہی کے پاس گزاری۔ پھر مولانا ٹوپی سے جھنڈا بو لگئے جو فتح خاں پنجتاری کی عملداری میں تھا۔ ترتالی وارد ہوئے تو پنجتار سے پچاس ساٹھ آدمی پیشوائی کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سید صاحب پنجتار سے نکل کر بیر کے باغ تک پہنچ چکے تھے، جو قتل سے ذرا آگے تھا (صفحہ ۱۰۰)

چوتھا باب

غازیوں کے قافلے

غازیوں کا انتظام سید صاحب ہجرت فرما کر نکلے تو آپ کے ساتھ صرف پانچ چھ سو غازی تھے، لیکن یہ وسوسہ نہ پیدا ہونا چاہیے کہ صرف اسی مختصر سی جماعت کے بل پر پنجاب کی تسخیر اور ہندوستان کی تطہیر کو پایہ تکمیل پر پہنچا دینے کا خیال تھا۔ آپ نے روانگی سے پیشتر ہندوستان کے مختلف حصوں میں غازیوں کی جماعتیں تیار کر لی تھیں۔ ان سب کو ساتھ لے کر نکلنا خلاف مصلحت تھا، اس لیے کہ اوّل یہ معلوم نہ تھا، جہاں مرکز بنا کر بیٹھنا ہے، اس کے حالات کیا ہیں۔ دوسرے ہزاروں آدمیوں کو ساتھ لے جانے میں قوی اندیشہ تھا کہ راستے کی تمام حکومتوں کے دل میں گوناگوں شبہات پیدا ہو جائیں گے۔ مزاحمت کی صورت پیدا ہو جانا غیر اغلب نہ تھا۔ تیسرے راستہ ایسا اختیار کیا تھا، جہاں کوسوں تک پانی بہت کمیاب تھا اور غلہ ملنا بھی سخت مشکل تھا۔ ان پریشان کن حالات کے پیش نظر آپ نے تھوڑے آدمی ساتھ لیے، باقی اصحاب سے فرمایا کہ بلاوے کا انتظار کریں۔ جب سرحد میں امامت کی بیعت ہو گئی اور سیّد صاحب کو قائد و پیشوا سے جہاد مان لیا گیا تو تمام مقامات پر اطلاع بھیج دی گئی کہ اب بے تکلّف چلے آؤ۔ سید صاحب نے مختلف حصوں میں داعی بھی بھیج دیے کہ غازیوں کی ترتیب و ارسال اور وسائل جہاد کی فراہمی کا کام انجام دیتے رہیں۔ ان داعیوں کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

ابتدائی قافلوں کی آمد سید صاحب اضلاع سوات کا دورہ فرما رہے تھے۔ جب غازیوں کے قافلے سرحد پہنچنے لگے۔ ان کی کیفیت یہ ہے:

۱ - مولوی قلندر کا قافلہ، جو کوٹ گرام میں سید صاحب کے پاس پہنچا تھا اس میں غالباً اسّی غازی تھے۔

۲ - قاضی احمد اللہ میرٹھی کا قافلہ۔ اس میں ستّر غازی تھے اور یہ اس زمانے میں پہنچا تھا جب سید صاحب اوچ (سوات) میں تھے۔

۳ - رسالدار عبدالحمید خاں کا قافلہ۔ عبدالحمید خاں نواب امیرالدولہ والی ٹونک کے پاس ملازم تھے۔ من چلے آدمی تھے۔ اس عہد کے عام فارغ البال لوگوں کی طرح زندگی رنگینیوں میں گزر رہی تھی۔ سید صاحب کو دیکھا تو فطری سعادت کا جذبہ بیدار ہوا، بیعت کی اور اسی وقت سے پورا نقشہ حیات

بدل گیا۔ ملازمت چھوڑ کر ہجرت پر آمادہ ہوئے۔ جو رفیق مساعدت پر آمادہ ہوئے، انھیں ساتھ لے کر سید صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ ان کے رفیقوں میں سے پانچ کے نام معلوم ہیں: شیر خاں، رستم خاں، مستقیم خاں، شیخ رمضان، شیخ مکھو۔ اس قافلے کے ساتھ صاحبزادہ محمد وزیر خاں ولی عہد ریاست ٹونک نے ایک گھوڑا بھی سید صاحب کے لیے بھیجا تھا، جس کے لیے زریں زین پوش تیار کرایا تھا۔

۴ - مولوی محمد رمضان رڑکی والے کا قافلہ۔ اس میں ایک سو غازی تھے اور یہ بھانڈہ (سوات) میں سید صاحب سے ملا تھا۔

۵ - مولانا عبدالحی کا قافلہ - یہ چار باغ میں سید صاحب سے ملاقی ہوا، اس کے افراد کی تعداد معلوم نہ ہو سکی

۶ - سید محمد مقیم رام پوری کا قافلہ - اس میں چالیس غازی تھے، تمام جوان، شجاع اور حد درجہ پرہیز گار۔

تمام قافلوں کے متعلق معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس راستے سے سرحد پہنچے اور کن کن مقامات سے گزرتے ہوئے سوات گئے۔ مولانا عبدالحی کا قافلہ بہاول پور، سندھ، بلوچستان اور افغانستان کے راستے گیا تھا۔ ان قافلوں کے ساتھ روپیہ اور ساز و سامان جنگ بھی پہنچتا رہا۔ محمد مقیم کے قافلے کے متعلق تو تصریحاً مذکور ہے کہ نقد روپے کے علاوہ اس کے ساتھ قرابینیں اور حرب و ضرب کی دوسری چیزیں بھی تھیں۔

مزید قافلے

سید صاحب دورۂ سوات سے فارغ ہو کر پنجتار پہنچ گئے تو مزید قافلے آئے، جن میں سے مندرجہ ذیل کے نام مجھے مختلف روایتوں سے معلوم ہو سکے:

۱ - سید احمد علی بریلوی خواہر زادۂ سید صاحب کا قافلہ

۲ - مولانا عنایت علی عظیم آبادی، برادر مولانا ولایت علی کا قافلہ

۳ - مولوی قمر الدین عظیم آبادی کا قافلہ

۴ - مولوی عثمان علی کا قافلہ

۵ - مولوی مظہر علی عظیم آبادی کا قافلہ

۶ - مولوی خرم علی بلہوری (ناظم جہادیہ فارسی و اردو و مصنف کتب عدیدہ) کا قافلہ

۷ - مولوی عبدالقدوس کان پوری کا قافلہ

۸ - مولانا سید محمد علی رام پوری کا قافلہ

۹ - مولوی باقر علی کا قافلہ

۱۰ - مولوی عبداللہ امروہے والے کا قافلہ

۱۱ - حافظ قطب الدین پھلتی کا قافلہ

۱۲ - مولوی عبدالحق (نیوتنہ) کا قافلہ

۱۳ - مولوی محبوب علی دہلوی کا قافلہ

۱۴ - حکیم محمد اشرف دہلوی کا قافلہ

۱۵ - میرن شاہ نارنولی کا قافلہ

ان میں سے کسی کے افراد کی تعداد معلوم نہیں ہو سکی۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ہندوستان کے کسی ایک مقام پر جمع ہو کر اکٹھے چلے یا یکے بعد دیگرے الگ الگ نکلتے رہے۔ سکھر کے پاس انھوں نے دریائے سندھ کو عبور کیا۔ پھر ڈیرہ غازی خاں، ڈیرہ اسماعیل خاں اور کالا باغ ہوتے ہوئے علاقہ خٹک میں پہنچے تو درانیوں نے روک دیا اور دو مہینے تک کنڈوہ میں پڑے رہے۔

سدِ طریق کی سرگزشت

درانیوں میں سے یار محمد خاں اسی وقت سے سید صاحب کا دشمن بن گیا تھا، جب سے شیدو کی جنگ میں اس نے غداری کا ارتکاب کیا تھا۔ لیکن سلطان محمد خاں نے مکاتبت کا سلسلہ جاری رکھا اور برابر عقیدت و نیاز کے دعوے کرتا رہا۔ سید صاحب نے جب اسے لکھا کہ غازیوں کے قافلے کیوں روکے گئے تو جواب آیا کہ سکھ جنگ شیدو کے بعد یار محمد خاں کے فرزند محمد حسن خاں کو ناظر مراد علی کے ساتھ بطور یرغمال لاہور لے گئے تھے۔ مہینوں کی کوشش کے بعد رنجیت سنگھ ان کی رہائی پر رضامند ہوا۔ عین اس اثنا میں لاہور خبر پہنچ گئی کہ غازیوں کے قافلے پشاور کے اطراف سے گزر کر سید صاحب کے پاس پہنچ رہے ہیں۔ رنجیت سنگھ یہ سنتے ہی بگڑ بیٹھا اور محمد حسن خاں کو بلا کر دھمکی دی کہ اپنے باپ اور چچا کو لکھو، اگر غازیوں کو فوراً نہ روک دیا گیا تو تمھیں عذاب کے شکنجے میں کس دوں گا۔ محمد حسن خاں نے یار محمد خاں اور سلطان محمد خاں کو لکھا کہ جب تک غازیوں کے قافلے نہ روکے جائیں گے میرے لیے مخلصی کی کوئی شکل نہ بنے گی۔ یار محمد خاں نے پریشان ہو کر تیس سواروں کو ظاہرداری کے طور پر حد اجاخیل[1] تک دیکھ بھال کا حکم دے کر رنجیت سنگھ کو اس انتظام کی اطلاع دے دی۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ اب تک غازیوں کا کوئی گروہ نظر نہیں آیا۔

گویا سلطان محمد خاں کے نزدیک روک تھام کے انتظامات کا مدعا محض یہ تھا کہ رنجیت سنگھ مطمئن ہو کر محمد حسن خاں اور ناظر مراد علی کو رہا کر دے۔ آخر میں اس نے یہ بھی لکھا کہ میرے اور یار محمد کے تعلقات اچھے

---

[1] اجاخیل پشاور سے نو کوس ہے۔ بظاہر یہ بیان درست بھی ہو تو قافلوں کو روکنے کا مطلب یہ تھا کہ سکھوں کے خلاف جو بھی سعی و جہد شروع ہوئی ہے، اسے برباد کر دیا جائے۔

نہیں رہے۔ میں نے اس کے مقرر کیے ہوئے سواروں کو واپس بلالیا ہے اور اپنے آدمی مقرر کر کے خفیہ طریق پر تاکید کردی ہے کہ سید صاحب کے غازیوں کو سلامتی سے گزر جانے میں حتی الامکان امداد دیں۔[۱]

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ ابتدا میں غازیوں کو روکنے کا کوئی انتظام نہ تھا اور جو قافلے سوات میں سید صاحب کے پاس پہنچے تھے: انھیں کہیں رکنا نہیں پڑا تھا۔ اغلب ہے محمد حسن خاں کی طرف سے اطلاع آنے پر سدِ طریق مناسب سمجھا گیا ہو، لیکن یہ صحیح نہیں کہ سلطان محمد خاں نے اپنے آدمیوں کو غازیوں کی اعانت کا حکم دے دیا تھا، اس لیے کہ ۱۴۔ محرم الحرام ۱۲۴۳ھ (۷۔ اگست ۱۸۲۷ء) تک قافلے کنڈوہ ہی میں رُکے بیٹھے تھے۔ اسی شدید رکاوٹ کی بنا پر مولوی محبوب علی نے سید صاحب کو لکھا تھا کہ کافروں کو چھوڑ کر پہلے ان "کلمہ گو کافروں" (یعنی درانی سرداروں) کا فیصلہ کیجیے۔[۲]

سید صاحب کے انتظامات

آخر سید صاحب نے ملا قطب الدین ننگرہاری، مرزا احمد گل بیگ اور ارباب بہرام خاں کو ان قافلوں کے لانے پر مامور فرمایا۔ ارباب کے پاؤں میں چھالے نکل آئے تھے اور وہ چلنے سے بالکل معذور تھے، اس لیے خود نہ جاسکے اور اپنے آدمیوں کو بھیج دیا۔ "وقائع" میں ہے کہ میاں دین محمد کو اس کام پر مقرر فرما کر حکم دے دیا تھا کہ جسے چاہو، اپنے ساتھ لے لو۔ چنانچہ انھوں نے شیخ ولی محمد پھلتی، شیخ نصر اللہ نورجوی، ملا قطب الدین ننگرہاری، ملا علی خاں اور چند ولایتیوں کو ساتھ لے لیا، جو غالباً ارباب بہرام خاں کے آدمی تھے۔

غرض یہ لوگ دریائے لنڈے پر پہنچے۔ کشتی والوں سے مل کر قافلوں کو گزارنے کا معاملہ طے کیا۔ نشانی یہ بتادی کہ جو شخص تمھارا ہاتھ پکڑلے، سمجھ لینا کہ ہمارا آدمی ہے اور اس کے ساتھ جتنے لوگ ہوں، انھیں پار اتار دینا۔

ان انتظامات کی اطلاع سید صاحب کو بھیج کر منتظمین لمکار بابا[۳] کی زیارت گاہ پر پہنچے، جہاں مولوی

---

[۱] مکتوبات شاہ اسماعیل صفحہ ۱۱۵۔ سلطان محمد خاں کا یہ خط ۲۳۔ ذی حجہ ۱۲۴۲ھ کا مرقومہ ہے۔ (۱۸۔ جولائی ۱۸۲۷ء)۔ [۲] مکتوبات شاہ اسماعیل صفحہ ۱۹۰ و ۱۹۹۔ [۳] حضرت لمکار باباؒ سرحد کے عالی منزلت اولیا میں سے تھے۔ عام طور پر حضرت کاکا صاحبؒ کے لقب سے مشہور ہیں۔ ان کی زیارت نوشہرہ سے قریب ہے اور زیارت کاکا صاحب کہلاتی ہے۔ ان کی اولاد کو کاکاخیل کہتے ہیں۔ "وقائع" میں مرقوم ہے کہ قافلوں کو پار اتارنے کے لیے حضرت کاکا صاحبؒ کے اخلاف سے بھی مدد مانگی گئی تھی، لیکن انھوں نے درانیوں کے خوف کی وجہ سے تامل کیا۔ پاس کی بستی والوں نے بڑے جوش عقیدت سے امداد کا پورا انتظام کر دیا (صفحہ ۵۰۲)

عنایت علی عظیم آبادی، سید احمد بریلوی اور حافظ قطب الدین پھلتی ٹھہرے ہوئے تھے۔ مولوی عنایت علی فوراً ایک رفیق کے ہمراہ پنجتار روانہ ہو گئے، باقی قافلوں کی روانگی کا انتظام تدریجاً عمل میں آیا۔ سب کو تاکید کر دی گئی تھی کہ نوشہرہ میں قیام نہ کیا جائے۔

درۂ پنجتار میں استقبال

دوسرے یا تیسرے دن تمام قافلے درۂ پنجتار میں پہنچ گئے۔ سید صاحب استقبال کے لیے درے میں پہنچنے کا ارادہ کیے بیٹھے تھے۔ آپ کی سواری کے لیے وہ سبزہ رنگ گھوڑا تیار کیا گیا، جو سید محمد خاں دُرّانی نے نذر کیا تھا اور غالباً سید صاحب کی اجازت کے بغیر نیازمندوں نے اس پر مخمل کا وہ زین پوش ڈال دیا تھا، جو صاحبزادہ محمد وزیر خاں نے رسالدار عبدالحمید خاں کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اس پر زری کا نہایت عمدہ کام تھا۔ سید صاحب پیادہ نکل پڑے اور پگ ڈنڈی سے درے میں پہنچ گئے۔ گھوڑا عام راستے سے کوتل آیا۔ مولوی محبوب علی نے گھوڑے پر زریں زین پوش دیکھا تو راستے میں دو مہینے رکے رہنے کے باعث غصے اور تلخی کی جو آگ دل میں سلگ رہی تھی، وہ ایک دم بھڑک اٹھی۔ معاً طعن آمیز انداز میں بولے: سبحان اللہ! گھوڑے پر زریں زین پوش ہے۔ جہاں ایسا امیرانہ ٹھاٹھ ہو، وہاں دیکھنا چاہیے، انجام کیسا ہو[1]۔ یہ اس غلط فہمی کی ابتدا تھی، جو بڑھتے بڑھتے اس حد پر پہنچ گئی کہ مولوی صاحب نیز بعض دوسرے اصحاب سید صاحب کی معیت چھوڑ کر واپس چلے گئے اور طویل و صبر آزما سفر کے بعد مقام جہاد پر پہنچ کر اس عظیم الشان کار حق کے ثمرات و برکات سے محروم رہ گئے۔

سید صاحب نے تمام غازیوں سے مصافحہ و معانقہ فرمایا۔ بڑے اعزاز و اکرام سے انھیں پنجتار لے گئے۔ اطمینان و مسرت کا اس سے بڑھ کر کیا موقع ہو سکتا تھا کہ چند برس کی محنت و جاں کاہی سے وہ انتظامات بار آور ہونے لگے، جو ملک کی آزادی اور تطہیر کے لیے بے سر و سامانی کی حالت میں شروع کیے گئے تھے۔ عالمگیر کی وفات کے بعد جو کام وقت کے سلاطین و امرا، باستثناء چند، انجام نہیں دے سکے تھے، حالانکہ ان کے پاس ہر قسم کے وسائل موجود تھے، اس کام کے سرانجام کا بندوبست ایک بے نوا سید نے اپنے وطن سے اڑھائی ہزار میل کے فاصلے پر اجنبی سرزمین میں بیٹھ کر کر لیا۔ جگہ جگہ سے راہِ حق کے سرفروش علم جہاد کے نیچے جمع ہونے لگے۔ لیکن مسلمانوں کی قسمت میں امتحان و ابتلا کے کئی مرحلے ابھی باقی تھے اور یہ تدبیر بھی فائز المرام کا ناصیہ جمال دکھا کر توقف کے نقاب میں مستور ہو گئی۔

مولوی محبوب علی کا معاملہ

مولوی محبوب علی نے پنجتار پہنچ کر اپنا خیمہ الگ نصب کیا۔ پھر سید صاحب کے پاس پہنچے تو ظاہر ہوا کہ ہر چیز سے غیر مطمئن ہیں۔ انھیں پہلا اعتراض یہ تھا کہ درانی سرداروں کے ساتھ مصالحانہ روش

---

[1] وقائع صفحہ ۵۳، ۵۴۔ [2] وقائع صفحہ ۵۰۲۔

اختیار کرنا غیر مناسب ہے۔ سید صاحب نے صلح حدیبیہ کی مثال کر وسیع مصلحتیں واضح فرمائیں۔ پھر مولوی صاحب نے یہ اعتراض کر دیا کہ سید صاحب امام ہو کر امتیاز پیدا کر رہے ہیں۔ نفیس لباس پہنتے ہیں، لذیذ کھانے کھاتے ہیں۔ اس کے برعکس مجاہدین چکیاں چلاتے ہیں، گھاس چھیلتے ہیں اور پاؤ پاؤ بھر غلہ پاتے ہیں۔ یہ اعتراضات بے جا تھے، اس لیے کہ سب کو معلوم تھا سید صاحب وہی معمولی لباس پہنتے ہیں جو ہندوستان میں پہنتے تھے اور اس لباس پر بھی بیت المال کے روپے سے کبھی ایک حبہ صرف نہ ہوا۔ سید صاحب کے بعض ہندوستانی عقیدت مند جماعت کے لیے تحائف بھیجنے کے علاوہ آپ کے لیے کپڑے سلا کر بھیجتے رہتے تھے۔ ان میں سے وقتاً فوقتاً ضرورت مند غازیوں کو بھی کپڑے دیے جاتے تھے۔ امرا نے جو بیش قیمت عبائیں سید صاحب کی نذر کی تھیں، وہ آپ نے کبھی نہ پہنیں اور سرحدی سرداروں مثلاً سلطان محمد خاں، سید محمد خاں وغیرہ کو دے دیں۔ غلّہ بھی سید صاحب کو عام غازیوں کے برابر ملتا تھا، البتہ مہمانوں کے لیے الگ غلّہ ضرورت کے مطابق لے لیا جاتا تھا۔ بعض اوقات ان مہمانوں کے اکرام کی خاطر اچھا کھانا بھی پکوانا پڑتا تھا اور سید صاحب ان کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانے کے لیے مجبور ہو جاتے تھے۔

سید صاحب نے تمام اعتراضات کو تحمل سے سُنا۔ مولوی صاحب کی دل جوئی اور رفع شبہات میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ آخر میں فرمایا کہ غلّے کا انتظام آپ خود سنبھال لیں اور مہمانوں کے ساتھ آپ ہی کھانا کھایا کریں[1]

"منظورہ" سے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب نے سید صاحب کی امامت میں بھی قدح شروع کر دی تھی۔

---

[1] وقائع میں ہے کہ مہمانوں کو کھلانے کی کئی صورتیں تھیں۔ مثلاً اگر مہمان سویرے آ جاتے تو سید صاحب ایک ایک دو دو چار چار آدمیوں کو مختلف جماعتوں میں بھیج دیتے اور وہ جماعتوں کے ساتھ کھانا کھاتے۔ اگر بڑے مولوی یا خان آ جاتے تو سید صاحب کے لیے تحائف میں وقتاً فوقتاً جو مُرغ، انڈے، چاول وغیرہ آتے، وہ سب ان معزز مہمانوں کے صرف میں لائے جاتے۔ کھانا پک چکنے کے بعد مہمان آ جاتے تو ان کی تعداد کے مطابق غازیوں کے کھانے کی مقدار فی کس گھٹا دی جاتی مثلاً آدھ سیر کھانا فی کس پکتا تو تقسیم میں سب کو پاؤ پاؤ بھر ملتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ سید صاحب خود کچھ نہ کھاتے، مہمانوں کو کھلانے کے بعد بچتا تو چند نوالے کھا لیتے، ورنہ کسی جماعت کے ساتھ بیٹھ کر جو کچھ ہوتا نوش فرما لیتے۔ سید صاحب نے مولوی محبوب علی صاحب کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا تھا، لیکن جب مولوی صاحب نے سید صاحب کے کھانے کی کیفیت معلوم کر لی تو کہا کہ ہم سے ہر روز بھوکا نہیں رہا جاتا۔ (صفحہ ۵۰۳، ۵۰۴)

سید صاحب نے فرمایا کہ یہ بارِ گراں مجھ پر رکھ دیا گیا۔ اگر آپ کے نزدیک میں اس کے قابل نہیں تو آپ عالم ہیں، سیّد ہیں، مہاجر ہیں، یہ کام خود سنبھال لیں۔ مجھے سرداری کی خواہش نہیں۔ صرف اس کام کا انصرام مطلوب ہے، خواہ مجھے کوئی حیثیت دی جائے۔

فتنۂ تفرقہ

غرض مولوی صاحب کی روش نے تفرقے کی ایک عجیب و غریب فضا پیدا کر دی۔ وہ سید صاحب پر معترض تھے، ان کے جو ساتھی مولانا اسماعیل کے معتقد تھے، انھوں نے خود مولوی محبوب علی پہ اعتراضات شروع کر دیے کہ آپ جہاد کا وعظ کہہ کہہ کر ہم سب کو یہاں لائے، اب کون سی بات خلاف شرع و سنت دیکھی کہ اعتراض کے تیروں کا ترکش بن گئے؟ جو لوگ مولوی صاحب کے ہم خیال تھے، انھوں نے جب دیکھا کہ مولوی صاحب سید صاحب کے شریک طعام ہونے سے بھی گریزاں ہیں تو کہنے لگے کہ پہلے سید صاحب پر نفیس کھانے کا الزام تھا، اب دو ہی دن میں گھبرا کیوں گئے؟ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جہان آباد کے تر لقمے یاد آتے ہیں۔

مولوی محمد حسن کی گفتگو

مولوی صاحب نے ایک قدم آگے بڑھا کر غازیوں سے کہنا شروع کیا کہ گھر واپس چلو اور اقارب کے جو حقوق تم پر ہیں انھیں بجا لاؤ۔ یہاں رہ کر ان کے اتلاف کا بوجھ اپنی گردن پہ نہ لو۔ غازیوں نے عرض کیا کہ ہم تو یہاں جہاد کی غرض سے بیٹھے ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا: جہاد کہاں ہے؟ تم نے کون سے دن کسی کافر کو مارا ہے؟ کون سے ملک میں تمھارا دخل ہوا ہے؟ یہاں صرف کھانا پکانے کی فکر میں رہتے ہو۔

آخر ایک روز مولوی محمد حسن نے پوچھا کہ حضرت! آپ کس دلیل سے غازیوں کے قیام کو لغو ٹھہراتے ہیں؟ مولوی محبوب علی نے کہا کہ آخر یہاں کس کافر سے جنگ در پیش ہے؟ مولوی محمد حسن نے جواب دیا کہ جنگ کو قتال کہتے ہیں اور اس کا موقع گاہے گاہے آتا ہے۔ جہاد یہ ہے کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے سعی کی جائے۔ یہاں لوگ اس کام میں مصروف ہیں۔ آپ ان کے فعل کو عبث قرار دیتے ہیں۔ اگر کسی روز کفار سے مقاتلہ پیش آ جائے اور آپ دہلی میں ہوں تو کون سی کرامت سے راہ دُور دراز طے کرتے ہوئے اس میں شریک ہو سکیں گے؟ مولوی صاحب یہ سُن کر لاجواب ہو گئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنک مزاج بزرگ تھے۔ سفر کی صعوبتوں اور راہِ حق کی مشقتوں کا پورا اندازہ نہ تھا۔ کنڈ وہ میں رُکے رہنے سے جو ملال و کبیدگی پیدا ہو چکی تھی، وہ ان کے تمام افکار و عقائد کو بے طرح متاثر کر گئی، نہ حالات پر صبر کے ساتھ غور و فکر کی صلاحیت باقی رہی اور نہ کسی نیک دل بزرگ کی نصیحت ان پر اثر انداز ہو سکی۔ مولانا شاہ اسماعیل اس زمانے میں پکھلی گئے ہوئے تھے۔ انھیں یہ حالات معلوم ہوئے

تو متواتر خط لکھتے رہے کہ مولوی صاحب کو میری واپسی تک روکا جائے۔ لیکن شاہ صاحب کی تشریف آوری سے تین روز قبل مولوی محبوب علی صاحب کسی کو اطلاع دیے بغیر رات کے وقت اچانک پشاور روانہ ہو گئے۔

مراجعت کے اثرات

ان قافلوں میں سے میرن شاہ نارنولی تیسرے ہی دن واپس چلے گئے۔ جگنی پہنچ کر بیمار پڑے اور وہیں وفات پائی۔ یہ واقعہ یقیناً تعجب انگیز ہے کہ ہزاروں میل کی دشوار گزار مسافت قطع کر کے جہاد کی نیت سے پنجتار پہنچے، لیکن اس کے ثوابِ عظیم سے محرومی گوارا کرتے ہوئے مرکزِ جہاد سے تھوڑے فاصلے پر بہ عالمِ غربت جاں بحق ہوئے۔ اجتہادی غلطی کی یہ کتنی افسوس ناک اور عبرت خیز مثال ہے۔

کچھ دن بعد مولوی محبوب علی صاحب بھی چلے گئے اور بہ خیر و عافیت دہلی پہنچے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے تک زندہ تھے۔ "ارواحِ ثلاثہ" میں ہے کہ جن علماء نے اس ہنگامے میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تھا، مولوی صاحب نے ان سے اختلاف کیا تھا اور فتوے پر مُہر ثبت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ انگریزوں نے انھیں گیارہ گاؤں بہ طور انعام معافی میں دینے چاہے، مولوی صاحب نے پروانۂ معافی لے کر چاک کر ڈالا اور کہا کہ میں نے تمھارے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔ میرے نزدیک مسئلہ یونہی تھا۔[1]

حکیم محمد اشرف دہلوی بھی واپس چلے گئے۔ ان لوگوں کی واپسی کا اثر ہرگز اچھا نہیں ہو سکتا تھا، خصوصاً اس وجہ سے کہ اپنی واپسی کو حق بہ جانب ثابت کرنے کے لیے یہ بزرگ انتظاماتِ جہاد کے بارے میں کوئی مستحسن کلمہ زبان پر نہیں لا سکتے تھے۔ چنانچہ اس وجہ سے مختلف حلقوں میں بددلی اور افسردگی پیدا ہوئی اور دیر تک قافلوں کی آمد رُکی رہی، یہاں تک کہ سید صاحب نے بہ حالتِ مجبوری بعض رفقاء کے مشورے کے مطابق تنخواہ دار سپاہی بھرتی کیے۔ تنخواہ دار سپاہیوں کی بھرتی یقیناً غیر مناسب نہ تھی، لیکن اس کے لیے بقدرِ ضرورت وسائل موجود نہ تھے۔ اس لیے نہ وسیع پیمانے پر سپاہی بھرتی کیے جا سکے، نہ تنخواہ دار سپاہ کا سلسلہ زیادہ دیر تک باقی رہ سکا۔ خاصی مدت کے بعد سید صاحب کے نیازمندوں، خصوصاً شاہ اسحاق اور شاہ یعقوب کی کوششوں سے غلط فہمیوں کے بادل چھٹے تو پھر قافلے پہنچنے لگے۔

آخری دَور کے قافلے

آخری دَور کے تمام قافلوں کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ صرف مندرجہ ذیل کا سُراغ

---

[1] "ارواحِ ثلاثہ" صفحہ ۲۱۶۔ بعض اصحاب نے اس انعام کو میدانِ جہاد سے مراجعت کا صلہ ظاہر کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ انعام ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں فتوائے جہاد پر دستخط نہ کرنے کا صلہ تھا۔ میدانِ جہاد سے مراجعت کا صلہ دینے کی انگریزوں کو کیا ضرورت تھی؟

مختلف روایتوں میں مل سکتا ہے:

۱ - مولوی محمد اسحاق گورکھ پوری کا قافلہ ، اس میں صرف پانچ آدمی تھے ، خود شیخ صاحب، شیخ برکت اللہ، پیر محمد، امام خاں سہسرامی اور شرف الدین شاہ جہان آبادی۔ چونکہ یہ بہت تھوڑے آدمی تھے اور کوئی خاص سامان بھی ساتھ نہیں لے گئے تھے، اس لیے سکھوں کی حکومت سے گزرتے ہوئے سرحد پہنچے۔

۲ - مولوی جعفر علی نقوی کا قافلہ ، اس میں اُنیس آدمی تھے۔ یہ قافلہ گورکھ پور سے چلا اور سارے یو۔ پی کو طے کرتا ہوا دہلی پہنچا۔ پھر انبالہ، پٹیالہ، ممدوٹ، بہاول پور، تونسہ (ضلع ڈیرہ غازی خاں) اور کالاباغ ہوتا ہوا پہلے پنجتار گیا بعد ازاں امب میں سید صاحب کی زیارت سے مشرف ہوا۔ اس کے سفر کی تفصیل مولوی سید جعفر علی نقوی کے ذاتی حالات میں ملے گی۔ مولوی صاحب سید صاحب کے منشی خانے میں بطور محرر کام کرتے رہے۔ واقعہ بالاکوٹ کے بعد گھر پہنچے، پھر نواب وزیرالدولہ کے کہنے پر سید صاحب کے حالات میں تاریخ احمدی لکھی، جس کا نام منظورۃ السعدا فی احوال الغزاۃ والشہدا ہے۔ زیر مطالعہ کتاب میں اس کے حوالے جا بجا ملتے ہیں۔

۳ - حاجی وزیر خاں پانی پتی کا قافلہ ، اس میں مندرجہ ذیل اصحاب شریک تھے: غلام رسول خاں ملتانی ، محمد بخش گولہ انداز ، احمد خاں قاصد اور علیم الدین برادر مولوی امام الدین بنگالی۔ کالاباغ میں یہ قافلہ سید جعفر علی نقوی کے قافلے سے ملحق ہو گیا تھا۔

ہنڈیاں

بالکل ابتدا میں ہندوستان سے بے واسطۂ قاصد روپیہ منگانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ جو غازی جہاد کی نیت سے آتے تھے، وہ روپیہ لے آتے تھے۔ سرحد پہنچنے کے بعد سید صاحب نے ہنڈیوں کے ذریعے سے روپیہ منگانے کا انتظام فرما لیا اور اس بارے میں ہندستان اطلاعات بھیج دیں۔ پہلے پہل ہنڈیاں پشاور کے ساہوکاروں سے بھنائی جاتی تھیں۔ پشاور چونکہ بڑا تجارتی مقام تھا، اس لیے وہاں کے ساہوکاروں نے ہندوستان کے ہر حصے سے تعلقات پیدا کر رکھے تھے۔ جب درانیوں کے ساتھ تعلقات بہت بگڑ گئے اور انھوں نے پشاور کے ساہوکاروں کو سید صاحب کے ساتھ روابط داد و ستد رکھنے سے منع کر دیا۔ تو منارہ کے ساہوکاروں سے رابطہ پیدا کر لیا گیا۔ منارہ دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر ہنڈ سے قریب واقع تھا۔ سید صاحب کے زمانے میں خاصا بڑا تجارتی مرکز ہوگا۔ ۱۸۴۱ء کی طغیانی سندھ میں تباہ ہو گیا۔ اس مقام

کے دو ساہوکاروں کا نام سید صاحب کے تذکروں میں آیا ہے: ایک کا نام موتی تھا، دوسرے کا سنتو۔ یہ غالباً بھائی تھے اور بارہ روپے فی صد متی لیتے تھے، یعنی ایک سو روپے کی ہنڈی کے اٹھاسی روپے دیتے تھے۔ یہ لوگ حضرو کے ساہوکاروں کے ذریعے سے ہنڈیوں کا روپیہ وصول کرتے تھے۔

پانچواں باب

خہر میں قیام

علاقہ سمہ میں دورے کی تجویز

سید صاحب بونیر اور سوات کا دورہ فرما چکے تھے۔ مولانا شاہ اسماعیل ہزارہ کے مختلف حصّوں میں جہاد کا پیغام پہنچا چکے تھے۔ ارباب بہرام خاں تہکالی سید صاحب کی خدمت میں پہنچے تو عرض کیا کہ پنجتار میں کوئی خاص مشغولیت تو ہے نہیں، اگر مناسب سمجھیں تو گرد و نواح کے علاقے کا دورہ فرمائیں۔ لوگوں میں گروہ بندیاں اور فتنہ داریاں ہیں، نیز ان میں جاہلیت کی رسمیں پھیلی ہوئی ہیں۔ آپ کے وعظ و نصیحت سے سچی اسلامیت کی روح بیدار ہوگی اور عداوتیں مٹ جائیں گی۔ سید صاحب کو یہ مشورہ بہت پسند آیا۔ چنانچہ آپ نے بیماروں اور معذوروں کو پنجتار میں چھوڑا، باقی غازیوں کو ساتھ لے کر دورہ شروع کر دیا۔

ارباب بہرام خاں اپنی حق پسندی اور دین داری کی وجہ سے وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے۔ پنجتار کے قریب موضع مہر علی میں رہتے تھے۔ وہیں سے بیس پچیس سواروں کے ساتھ سید صاحب کے پاس پہنچے تھے۔ ایک سبزہ رنگ گھوڑا بطور نذر پیش کیا، جس کا نام اژدر تھا۔ سید صاحب کے سرحدی رفقا میں ارباب موصوف کا رتبہ بہت بلند ہے۔ پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ سید اکبر شاہ ستھانوی کے سوا اکابر سرحد میں سے کوئی بھی اخلاص، تدبر، وفا کیشی اور ایثار و حق کوشی میں ارباب مرحوم کے برابر نہ تھا۔ جب سے سید صاحب کا دامن پکڑا، تا دمِ مرگ نہ چھوڑا اور سید صاحب کے ساتھ ہی بالاکوٹ میں شہادت پائی۔

دورے کی کیفیت

سید صاحب پنجتار سے نکلے تو پہلے شیوہ پہنچے، جہاں کے رئیس انند خاں نے خلوص کے ساتھ استقبال کیا۔ سید صاحب کو اپنے مکان میں ٹھہرایا۔ غازیوں کو مسجدوں اور حجروں میں اُتارا۔ پھر علاقہ سرحد کے عام شیوے کے مطابق اہل شیوہ دو دو چار چار غازیوں کو مہمان بنا کر لے گئے۔ اس مقام میں سید صاحب دو روز ٹھہرے۔ لوگوں کو آپ کے مواعظ سے بڑا فائدہ پہنچا اور اکثر بیعت سے مشرف ہوئے۔

وہیں چارگلٹی کا رئیس منصور خاں پہنچ گیا اور سید صاحب کو غازیوں سمیت اپنے گاؤں لے گیا۔ راستے

میں موضع مہر علی سے گزرے۔ ارباب بہرام خاں کے اہل و عیال وہیں تھے۔ انھوں نے تمام اصحاب کے لیے ناشتے کا انتظام کیا۔ آگے بڑھے تو موضع مچنی کے لوگ راستہ روک کر کھڑے ہو گئے اور ایک رات اپنے ہاں ٹھہرایا۔ چارگلئی میں عام باشندوں کے علاوہ محمود خاں رئیس تنگی نے بھی بیعت کی۔ اسے درانیوں نے جلاوطن کر رکھا تھا اور وہ منصور خاں کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ چارگلئی میں سید صاحب تین روز ٹھہرے۔ بعد کے دورے کی سرسری کیفیت یہ ہے:

مقام	مدت قیام
امان زئی	چار دن
اسماعیلہ	ایک شب
کالو خاں	ایک شب
تلانڈی	ایک شب
شیخ جانا	ایک شب

پندرہ سولہ روز دورے میں گزار کر سید صاحب پنجتار واپس ہوئے۔ دوسری مرتبہ نکلے تو شیوہ، مچنی، چارگلئی ہوتے ہوئے کاٹ لنگ اور لوند خوڑ کے راستے شاہ کوٹ تشریف لے گئے۔ وہیں سے سید حمید الدین (خواہرزادۂ سید صاحب)، سید ابوالقاسم (ابن سید احمد علی خواہرزادۂ سید صاحب) اور شادی خاں گنج پوری کو ہندوستان بھیجا۔

معلوم ہوتا ہے کہ شاہ کوٹ میں کئی دن گزارے۔ الاڈنڈ کا رئیس عنایت اللہ خاں خود شاہ کوٹ پہنچا اور ساتھ لے جانے پر مصر ہوا۔ چنانچہ سید صاحب ملاکنڈ کی گھاٹی سے گزر کر پہلے درگئی پہنچے، جو شمال مغرب میں علاقہ سمہ کا آخری مقام ہے۔ پھر دو سو غازیوں کے ساتھ خہر[1] تشریف لے گئے۔ بعد میں عنایت اللہ خاں کے مشورے سے باقی غازیوں کو بھی خہر میں بلا لیا۔ صرف پیر خاں مورانوی درگئی میں رہ گئے، اس لیے کہ لشکر اسلام کے اونٹ وہیں تھے اور درگئی میں اونٹوں کے چرانے کا انتظام بہت اچھا تھا۔

قیام خہر خہر میں سید صاحب پہلے بڑی مسجد میں اُترے اور باقی مجاہدین کو دوسری مساجد یا ان کے ملحقہ حجروں میں اتارا گیا۔ چند روز کے بعد ملا کلیم اخوندزادہ، سید صاحب کو مسجد سے اُٹھا کر اپنے

---

[1] خہر اصل میں فارسی کے لفظ شہر کی پشتو شکل ہے۔ اس کا ایک تلفظ "خار" بھی ہے۔ یہ دریائے سوات کے مشرقی کنارے پر سوات زیریں کا مشہور مقام ہے۔ موجودہ سڑک سے ذرا ہٹا ہوا ہے۔ سید صاحب کے سوانح میں اس مقام کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے، اس لیے کہ یہ تقریباً ایک برس مجاہدین کا مرکز رہا اور مولانا عبدالحی نے اسی مقام پر وفات پائی۔

مکان پر لے گئے۔

صحیح تاریخ معلوم نہیں، لیکن میرا اندازہ ہے کہ سید صاحب جمادی الاخری ۱۲۴۳ھ (دسمبر ۱۸۲۷ء) میں خہر پہنچے تھے اور جمادی الاخری ۱۲۴۴ھ (دسمبر ۱۸۲۸ء و جنوری ۱۸۲۹ء) تک وہیں قیام فرما رہے۔ منظورہ میں ہے: "زائد از یک سال قیام داشتند" گویا ۱۲۴۳ھ کا ماہ رمضان اور دونوں عیدیں خہر ہی میں گزاریں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پنجتار کو چھوڑ کر خہر میں کیوں اتنی دیر تک قیام کیا، یہاں تک کہ وہ مقام بظاہر مستقل مرکز بن گیا؟ میں سمجھتا ہوں کہ سید صاحب درانیوں کا خرخشہ ختم کرنے کا فیصلہ فرما چکے تھے اور اس کی بہترین تدبیر یہی تھی کہ پشاور کے آس پاس کے خوانین و عوام کو راہِ راست پر لاتے۔ اس غرض کے لیے خہر موزوں ترین مقام تھا۔ درانی کاروبارِ جہاد میں بے طرح رکاوٹ کا باعث بن گئے تھے اور ہر وقت خوانین کو سید صاحب کے خلاف ابھارتے رہتے تھے۔ سکھ انھیں کی وجہ سے بے تکلف علاقۂ سرحد میں داخل ہو کر مسلمانوں کو ظلموں کا ہدف بنانے میں سرگرم تھے۔ ہندوستان سے غازیوں کی آمد کا راستہ بھی انھیں نے روک رکھا تھا۔

خہر اگرچہ مستقل قیام گاہ بن گیا تھا، لیکن سید صاحب کا اصل مقصد یہ تھا کہ عوام میں دعوت جہاد اور تنظیم کا سلسلہ جاری رہے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے آپ نے دورے شروع کر دیے۔ کئی بستیوں میں گئے۔ ایک ایک دو دو دن قیام کیا۔ روایتوں میں صرف دو مقامات کے نام تصریحاً آئے ہیں: ایک ڈھیری جو خہر سے دو اڑھائی کوس کے فاصلے پر ہے، دوم برم گولہ[1]، جہاں سید صاحب چار روز مقیم رہے۔

مولانا عبدالحی کی وفات

قیام خہر کا ایک نہایت رنجدہ واقعہ مولانا عبدالحی کی وفات ہے۔ مولانا بہت بوڑھے تھے۔ بواسیر کا مرض پہلے سے تھا۔ قیام خہر کے زمانے میں شدید دورہ پڑا۔ علاج میں کوئی کوتاہی نہ ہوئی لیکن جو دوا دی جاتی، مفید نہ پڑتی۔ کمزوری روز بروز بڑھتی گئی، یہاں تک کہ وقتاً فوقتاً بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ سید صاحب روزانہ عیادت کے لیے مولانا کی قیام گاہ پر جاتے۔ ایک روز آپ گئے تو بے ہوشی سے افاقہ ہوتے ہی مولانا نے آنکھیں کھولیں اور سید صاحب کو پہچان لیا۔ آپ نے مزاج پوچھا تو بولے: "نہایت تکلیف ہے۔ آپ میرے لیے دعا فرمائیں اور میرے سینے پر پاؤں رکھ دیں

---

[1] اس نام کے دو مقام ہیں: ایک "کیا برم گولہ"، دوسرا "بٹ برم گولہ"۔ یہ دونوں خہر کے سامنے دریائے سوات کے مغربی کنارے سے کسی قدر ہٹے ہوئے ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہیں۔

شاید اس کی برکت سے میری مشکل آسان ہو جائے اور اس مصیبت سے نجات پاؤں۔" سید صاحب نے فرمایا: "مولانا! آپ کا سینہ علوم کتاب و سنت کا گنجینہ ہے۔ میں اس پر پاؤں نہیں رکھ سکتا۔" پھر پاس بیٹھ گئے اور سینے پر ہاتھ رکھا، جس سے کسی قدر تسکین ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد چند بار "اللہ رفیق الاعلیٰ"، "اللہ رفیق الاعلیٰ" کہا اور روح جسد عنصری کو چھوڑ کر مالک حقیقی کی بارگاہ میں پہنچ گئی۔

اوائل ذی حجہ ۱۲۴۲ھ میں پہنچے تھے اور چار باغ (سوات) میں سید صاحب سے ملے تھے۔ ۸- شعبان[1] ۱۲۴۳ھ (۲۴- فروری ۱۸۲۸ء) کو رحلت فرمائی۔ مولوی محمد یوسف پھلتی قطب لشکر اسلام کی وفات کے بعد مولانا عبدالحی کا انتقال غازیان اسلام کے لیے دوسرا نہایت غم انگیز حادثہ تھا۔ مولانا کے اکلوتے فرزند مولوی عبدالقیوم ساتھ تھے۔ سید صاحب نے از روے فرطِ شفقت انھیں سینے سے لگا لیا اور بہت تسلی دی۔

تجہیز و تکفین مولانا شاہ اسماعیل، مولوی محمد حسن، قاضی علاؤالدین بگھروی، میاں جی چشتی اور میاں جی محی الدین میت کے غسل میں لگ گئے۔ سید صاحب مولانا کے فضائل و محاسن بیان فرماتے رہے۔ "وقائع" کے بیان کے مطابق اس قسم کے الفاظ فرمائے: "مولانا، دین کے ایک رکن تھے اور بڑی برکت والے شخص تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھا لیا۔ جو مرضی مالک کی۔" آنکھوں سے برابر آنسو بہ رہے تھے۔

جنازہ اٹھانے والوں میں خود سید صاحب بھی تھے۔ آپ ہی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اہل خمر کے علاوہ سات سو غازیانِ اسلام اس نماز میں شریک تھے۔ اس رتبۂ اختصاص پر کسے رشک نہ آئے گا کہ وقت کا امام جہاد نماز جنازہ میں پیش امام تھا اور دوسرے اصحاب کے علاوہ سات سو غازی شریک نماز و دعا

---

[1] منظورہ میں ہے: "درآخر عشرۂ رجب رحلت فرمودند۔" "وقائع" میں مولوی فتح علی کی روایت بھی اسی مضمون کی ہے۔ لیکن سید احمد علی نے نواب وزیرالدولہ کو اس حادثۂ فاجعہ کی اطلاع دیتے ہوئے تعین کے ساتھ تاریخ وصال ۸- شعبان لکھی ہے۔ مولانا کے وصیت نامے کی تمہیدی عبارت یوں ہے: جناب ہدایت مآب، زبدۂ اسلاف، قدوۂ اخلاف، پیشواے اصحاب شریعت، رہنماے ارباب طریقت، عالم ربانی، عامل حقانی، مقبول بارگاہ رب قوی، مولانا عبدالحی بتاریخ ہشتم شہر شعبان سنہ یک ہزار و دو صد و چہل و سہ در قریہ "خار" ضلع سوات یوسف زئی، بہ تقدیر ربانی . . . . از یں جہان فانی بہ دار البقاء جاودانی شتافتند۔ گویا اس میں بھی تاریخ وفات ۸- شعبان ہی بتائی گئی ہے۔ بہرحال دونوں تاریخوں میں صرف نو دس دن کا فرق ہے اور یہ فرق چنداں اہم نہیں۔ میرے نزدیک ۸- شعبان ہی مستند ہے۔

تھے، جن میں سے ہر فرد اپنی جان راہِ خدا میں نذر کیے بیٹھا تھا۔ خہر کے جنوب مشرق میں ایک تیر کی زد پر قبرستان تھا، جہاں لشکرِ مجاہدین کے اس مایۂ ناز شیخ الاسلام کو آغوشِ لحد میں سلایا گیا۔ بڑھانہ (ضلع مظفر نگر) میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں فضل و کمال کی منزلیں طے کیں۔ ہندوستان کو از سرِ نو اسلام کے زیرِ نگین لانے کی شیفتگی میں سرحد پہنچے۔ سوات میں آخری آرام گاہ پائی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

وفات سے پیشتر مولانا نے سید صاحب اور بعض دوسرے اصحاب کی موجودگی میں، جن میں سے مولانا شاہ اسماعیل، حکیم محمد اشرف خاں دہلوی، شیخ نظام الدین برھانوی، قاضی علاؤ الدین بگھروی اور حافظ محمد صابر تھانوی کے اسمائے گرامی مذکور ہوئے، ایک وصیت نامہ لکھوایا تھا، جس کے مطابق تمام مملوک اشیا اور ولایت بنات و ابنا میں اپنے تمام حقوقِ تصرف اپنی اہلیہ یعنی والدۂ مولوی عبدالقیوم کے حوالے کر دیے تھے[1]۔

مولوی عبدالقیوم اور دوسرے اقربا

مولانا عبدالحی کے صاحبزادے، مولوی عبدالقیوم، سید صاحب کے ساتھ سرحد پہنچے تھے۔ مولانا کے انتقال کے وقت سے سید صاحب مولوی عبدالقیوم کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے تھے۔ ان کے دو ماموں بھی لشکرِ اسلام میں تھے: ایک شیخ جلال الدین، دوسرے شیخ صلاح الدین۔ مولانا کی وفات سے آٹھ روز بعد شیخ جلال الدین نے عرض کیا کہ مولانا کے انتقال کی خبر والدۂ عبدالقیوم کو ملے گی تو بہت رنج ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ میں عبدالقیوم کو وطن پہنچا دوں۔ سید صاحب کو یہ تجویز پسند نہ تھی، لیکن شیخ جلال الدین کا اصرار و ابرام دیکھ کر اجازت دے دی۔

سید احمد علی نے مولانا کے انتقال کی اطلاع صاحبزادہ محمد وزیر خاں ولی عہد ریاست ٹونک کو بھیجی تو بالکل بجا لکھا کہ مولانا کا غمِ مفارقت ایسا نہیں جو ایک شخص یا چند اشخاص تک محدود ہو۔ یہ عام ماتم ہے چاہیے کہ ہر مسلمان بھائی دوسرے سے تعزیت کرے۔ ساتھ ہی تحریر فرمایا کہ مولانا کی دو اہلیہ ہیں: ایک دہلی میں (ہمشیر مولانا شاہ اسماعیل) دوسری بڑھانہ میں۔ دونوں جگہ خدمت کا بندوبست کر دیا جائے۔

مولانا کے ایک عم زاد بھائی مولوی احمد اللہ[3] ناگپوری تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں

---

[1] مکاتیب شاہ اسماعیل صفحہ ۱۳۸-۱۴۰۔ [2] اس سے ظاہر ہے کہ مولانا کی تین شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی شاہ عبدالعزیز کی صاحبزادی سے، جس کے انتقال پر دوسری شادی بڑھانہ یا پھلت میں کی، اسی بی بی کے بطن سے عبدالقیوم پیدا ہوئے۔ تیسری شادی اس وقت شاہ اسماعیل کی بہن بی بی رقیہ سے ہوئی جب نکاحِ بیوگاں کی تحریک چلی تھی۔

[3] "وقائع" میں انھیں مولانا کا علاتی بھائی لکھا ہے یعنی والد ایک اور والدہ دو۔

تھا۔ خط و کتابت جاری تھی۔ جب مولانا سرحد چلے آئے تو مولوی احمد اللہ کمر ہمت باندھ کر زیارت کی نیت سے ٹونک ہوتے ہوئے سرحد پہنچ گئے۔ چند آدمی بھی آپ کے ساتھ تھے، لیکن مولانا کی وفات سے تین چار روز بعد خہر میں وارد ہوئے۔ درگئی میں یہ جانگزا خبر سُن چکے تھے۔ ان کے رنج و قلق کا اندازہ کون کر سکتا ہے جنھوں نے صرف اشتیاقِ دیدار میں اتنا لمبا اور کٹھن سفر اختیار کیا تھا۔ خہر پہنچے تو کہا: مجھے بڑا اشتیاق تھا کہ بھائی صاحب سے ملوں گا، لیکن مرضی الٰہی یہ ہوئی کہ عالمِ ناسوت میں ملاقات نہ ہو۔ پھر سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اور خدامِ خاص میں شامل ہو گئے۔ علم و تقویٰ میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ علاوہ بریں تیر اندازی چابک سواری اور کشتی کے فنون میں اُستادِ کامل تھے۔ جانوروں کے علاج میں بڑا کمال حاصل تھا۔ دعوت اسماء میں بھی خاص دسترس تھی۔ بیعت کے بعد سید صاحب کا ساتھ نہ چھوڑا اور بالاکوٹ کے معرکے میں شہید ہوئے۔

متفرق واقعات

قیامِ خہر کے زمانے میں ایک مرتبہ غازیوں کو سخت عسرت سے سابقہ پڑا۔ گنے کا موسم تھا۔ زمیندار مزدوری دے کر گنے چھلواتے تھے۔ غازی بھی سید صاحب سے اجازت لے کر اس کام میں لگ گئے۔ انھیں نقد اُجرت کے علاوہ فی کس آٹھ آٹھ دس دس گنے مل جاتے تھے۔ چونکہ وہ بڑے دیانت کیش اور پاک باز تھے، اس لیے سارا کام خلوص و محنت سے انجام دیتے تھے اور ذرا سا نقصان بھی انھیں گوارا نہ تھا۔ اس طرح زمینداروں کو بڑا فائدہ پہنچا۔

اسی زمانے کا واقعہ ہے، ایک روز سرکاری خزانے میں اتنا ہی غلّہ تھا کہ صرف سید کے لیے کھچڑی تیار ہو سکی۔ آپ نے تناول فرمانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک غازیوں کے لیے انتظام نہ ہو، میں خود کیوں کر کھا سکتا ہوں؟ آخر ایک پیش قبض کی کفالت پر بنیے سے چاول خریدے گئے۔ سب کے لیے کھچڑی تیار ہو گئی تو سید صاحب نے بھی کھائی۔

ہندوستان سے ہنڈیاں آنے لگی تھیں اور انھیں منارے کے ساہوکاروں سے بُھنایا جاتا تھا۔ سید صاحب نے معاش کی تنگی دیکھ کر اپنے بھانجے سید احمد علی کو پچیس سواروں کے ساتھ منارے بھیج دیا کہ ضرورت کی چیزیں ساہوکاروں سے قرض لے آئیں۔ چنانچہ وہ پانسو روپے کا کپڑا اور پانسو نقد لے آئے دو روز بعد ہنڈیاں آگئیں تو قرض ادا کر دیا گیا۔

غازیوں کے زہد و تقویٰ سے ہر شخص متاثر تھا۔ ایک مرتبہ ملا کلیم اخوند زادہ نے خود گاؤں کی عورتوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا کہ سید بادشاہ کے ساتھی یا تو خلقاً خواہشات نفس سے محروم ہیں یا اولیا ہیں۔ پن چکیوں پر آٹا پسوانے آتے ہیں، لیکن کیا مجال کہ آج تک کسی غازی کی نگاہ عورت کی طرف اُٹھی ہو۔

ملا کلیم نے کہا وہ واقعی اولیا ہیں اور یہ سید صاحب کی صحبت و تربیت کا اثر ہے کہ خلاف شرع بات ان کے دل میں خطور ہی نہیں کرتی۔

ایک مرتبہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ غازیوں سے قواعد اور چاند ماری کرائی جائے چنانچہ میر عبدالرحمٰن جھالوی[1]، حافظ امام الدین سلام پوری اور بعض دوسرے حضرات ان غازیوں سے نشانے کی مشق کرانے لگے، جن کے پاس توڑے والی بندوقیں تھیں۔ حاجی عبداللہ رام پوری، مولوی امام علی عظیم آبادی، شیخ خواہش علی غازی پوری، شیخ بلند بخت دیوبندی، شیخ نصر اللہ خورجوی اور اکبر خاں نے ان غازیوں کی تربیت کا کام سنبھال لیا، جن کے پاس چقماقی بندوقیں یا قرابینیں تھیں۔ اڑھائی مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ سید صاحب نے مشاق کے کمالات دیکھ کر بڑی تحسین فرمائی، لیکن ساتھ ہی کہا کہ اپنی مشاقی پر نازاں نہ ہونا، فتح صرف خدا کے فضل پر موقوف ہے۔

اس زمانے میں ایک دستور یہ تھا کہ لوگ چھرّے مُنہ میں بھر لیتے تھے اور بندوق بھرتے وقت تھوڑے تھوڑے مُنہ سے نکال نکال کر ڈالتے جاتے تھے۔ سید صاحب نے فرمایا: اس میں بڑی مضرتیں ہیں مثلاً یہ کہ بندوق گرم ہو جائے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ بارود بھرتے وقت آگ نہ پکڑ لے۔ ایسی حالت میں منہ سے چھرّے نالی میں ڈالنا خالی از خطرہ نہیں۔ بارود جل اٹھے تو جان کا نقصان ہو۔ دوسرے اگر چھرّے مُنہ میں ڈالے جائیں تو میدان میں تکبیریں کہی جا سکے گی۔ چنانچہ لشکر اسلام میں یہ طریقہ بالکل بند کر دیا۔

سید محمد حبّان قیام خہر ہی کے دوران میں مولوی سید محمد حبان سید صاحب کی خدمت میں پہنچے تھے۔ یہ کانڑا غوربند کے باشندے تھے۔ بہت بڑے عالم، ذکی الطبع، غیور اور خوش تقریر تھے۔ غالباً ہندوستان میں رہ کر علم حاصل کیا تھا اور کچھ مدت کلکتہ میں بھی گزار چکے تھے۔ سید صاحب سے عرض کیا کہ میں آسودہ حال ہوں۔ روپیہ پیسا خدا نے دے رکھا ہے۔ کسی چیز کی احتیاج نہیں۔ صرف خدا کے لیے آیا ہوں۔ اگر اپنے دل کو متاثر دیکھوں گا تو بیعت کروں گا، ورنہ واپس چلا جاؤں گا۔ سید صاحب نے فرمایا بیعت کیجیے، اللہ برکت دے گا۔ بیعت کے بعد سید محمد حبان گویا ہوئے کہ میں اندھا تھا، بصیر ہو گیا، کافر تھا، مسلمان ہو گیا۔ سید صاحب نے فرمایا: یوں کہیے کہ پہلے ہی مسلمان تھا، اب ایمان ترقی کر گیا۔ سید حبان نے کہا کہ میں اب نئے سرے سے مسلمان ہوا ہوں، اگلی عمر یونہی برباد ہوئی۔

سید اکبر شاہ اور ارباب بہرام خاں کے بعد سرحدیوں میں سے یہ تیسرے بلند پایہ بزرگ تھے جو سید صاحب

---

[1] جھالو ضلع بجنور میں ہے۔

سے وابستہ ہوئے۔ بیعت کے بعد اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ خدمتِ دین کے لیے وقف فرما دیا اور دمِ واپسیں تک سید کا ساتھ نہ چھوڑا۔ بیعت اقامت شریعت کے بعد سید صاحب نے انھیں قاضی القضاۃ مقرر کر دیا تھا، اس لیے انھیں عام طور پر قاضی سید محمد حبان کہتے تھے۔ مردان کی جنگ میں شہید ہوئے۔

تیسری شادی

جنگ شیدو کے موقع پر سید صاحب کو زہر دیا گیا تھا، اس سے بہ فضل ایزدی جان تو بچ گئی لیکن آپ کے جسم پر اس کا اثر قائم رہا۔ آخر سارا جسم ثبور سے بھر گیا۔ بہت علاج کیا، افاقت کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ اطبا نے یہ تجویز کیا کہ آپ نکاح کر لیں۔ سید صاحب کو نکاح میں تامل تھا، اس لیے کہ دو بی بیاں موجود تھیں، جو انتظامات کے مطابق آپ کے بعد رائے بریلی سے ٹونک اور وہاں سے بیرکوٹ (سندھ) پہنچ گئی تھیں۔ انھیں سرحد لے جانے کی کئی تجویزیں ہوئیں، لیکن درانیوں کی مخالفت کے باعث کسی پر بھی عمل نہ ہو سکا۔ جب دیکھا کہ بی بیوں کو لانے کی کوئی صورت مستقبل قریب میں بن نہیں سکتی اور مضرت بڑھ رہی ہے تو نکاح پر راضی ہوئے۔ سب سے پہلے ایک قاصد کے ہاتھ بی بیوں کے نام خط بھیجا اور پورے حالات انھیں بتا کر نکاح کی اجازت طلب کی[1]۔ وہاں سے اجازت آگئی تو پہلے کن گلئی کی ایک سیدہ سے نکاح کا خیال ہوا جو سید علی غوث بونیر کے خاندان سے تھیں۔ پھر رفیقوں نے یہ مشورہ دیا کہ سلیمان شاہ والیِ چترال نے جو لڑکی آپ کی خدمت میں بھیجی تھی، اس سے نکاح کر لیا جائے۔ اس لڑکی کے حالات دریافت کیے گئے تو معلوم ہوا کہ وہ بھی سادات میں سے ہے۔ والد کا نام نواب شاہ اور والدہ کا نام خدیجہ ہے۔ دو بھائی بھی ہیں، جن میں سے ایک کا نام نجف علی شاہ اور دوسرے کا احمد علی شاہ ہے[2]۔

---

[1] روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ سید صاحب نے سیدہ ولیہ ام اسماعیل سے نکاح کرتے وقت عہد کیا تھا کہ ان کی اجازت کے بغیر اور نکاح نہ کروں گا، اس وجہ سے اجازت ضروری تھی۔ یہ درست ہوگا لیکن میرا خیال ہے کہ ازواج کی دلداری کے لیے دونوں سے اجازت منگوائی ہوگی۔

[2] سید صاحب کے ایک نسب نامے میں مرقوم ہے کہ سیدہ فاطمہ کا ایک بھائی ان سے ملنے کے لیے ٹونک آیا تھا اور اس کا نام قربان علی تھا۔ ممکن ہے یہ تیسرا بھائی ہو اور سیدہ کے چلے آنے کے بعد پیدا ہوا ہو۔ میرے عزیز دوست سید غلام حسن شاہ صاحب کاظمی نے اس سلسلے میں بہت چھان بین کی۔ معلوم ہوا کہ فاطمہ یقیناً سیدہ تھیں اور حضرت امام موسیٰ کاظم کی نسل سے تھیں۔ مگر ان کا خاندان عقائد کے لحاظ سے اسماعیلی مولائی تھا۔ ایک جنگ میں جو مہتر محترم شاہ والیِ چترال اور مہتر سلیمان شاہ والیِ یاسین و مستوج کے مابین ہوئی تھی، سیدہ گرفتار ہو کر مہتر سلیمان شاہ کے پاس پہنچیں۔ مہتر سلیمان شاہ نے انھیں سید صاحب کے پاس بھیج دیا۔ سیدہ کا خاندان بلاشبہ اسماعیلی تھا لیکن وہ خود نہ ابتداء میں تعلیم یافتہ تھیں اور نہ غالباً انھیں دین کے متعلق چنداں آگاہی تھی۔ سید صاحب کے پاس پہنچ جانے کے بعد آپ ہی کے مقرر کیے ہوئے اساتذہ سے علم دین حاصل کیا اور آپ ہی کی بابرکت صحبت میں دینی تربیت

پورا اطمینان ہو گیا تو ان سیدہ سے، جن کا نام فاطمہ تھا، سید صاحب نے نکاح کر لیا۔ سید احمد علی بریلوی، مولانا شاہ اسماعیل اور شیخ ولی محمد کے روبرو میاں جی چشتی نے خطبہ نکاح پڑھا اور ایجاب وقبول کرایا۔

ٹھر میں ایک بڑی بی رہتی تھی۔ شوہر فوت ہو چکا تھا۔ اس نے جو مال واسباب چھوڑا تھا، وہ اس کے بھائی اور بھتیجے اٹھا لے گئے۔ بڑی بی کے اولاد نہ تھی، محنت کر کے گزارا کرتی تھی، وہ ایک روز سید صاحب کے لیے کھانا پکا کر لائی اور اپنا حال سنا کر زار قطار رونے لگی۔ سید صاحب نے فرمایا کہ اماں! میں تیرے لیے بہت دعا کروں گا۔ اپنے دل میں غمگین نہ ہو، صبر کر۔ اگر تیرے کوئی بیٹا نہیں تو مجھے اپنے بیٹے کی جگہ سمجھ لے۔ میں تجھے ماں کے برابر سمجھتا ہوں۔ ہر ممکن خدمت کرتا رہوں گا۔

پشتو میں ماں کو "ابئی" کہتے ہیں۔ بڑی بی اتنی خوش ہوئی کہ ہر شخص سے فخریہ کہتی: سید بادشاہ نے مجھے "ابئی" کہا ہے۔ غازی بھی اسے ابئی کہتے تھے۔ نکاح کے بعد سید صاحب نے ابئی کو بی بی صاحبہ کی رفاقت کے لیے اپنے گھر میں بلا لیا۔ واقعہ بالاکوٹ کے کئی برس بعد بی بی صاحبہ سرحد سے پیرکوٹ اور وہاں سے ٹونک پہنچیں تو "ابئی" ان کے ساتھ تھی۔ ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷-۵۸) میں وقائع زیر ترتیب تھی تو اس وقت تک "ابئی" زندہ تھی۔ غالباً ٹونک میں فوت ہوئی۔

سیدہ کی تعلیم

سید صاحب نے نکاح کے بعد سیدہ فاطمہ کی تعلیم کا انتظام فرمایا تاکہ وہ دینی مسائل سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں۔ سب سے پہلے قرآن مجید پڑھایا گیا۔ اس کام کے لیے میاں غلام محمد سہارن پوری کو مقرر کیا۔ یہ بہت بوڑھے تھے۔ اپنے فرزند مولوی سعادت علی کو، جو لشکر اسلام میں شریک تھے، دیکھنے اور ساتھ لے جانے کے لیے سرحد پہنچے تھے۔ سید صاحب کی صحبت میں بیٹھے تو خود بھی واپس جانے کا خیال دل سے نکل گیا۔ بڑھاپے کے باعث جہاد میں شریک نہ ہو سکتے تھے، اس لیے سید صاحب نے انھیں سیدہ فاطمہ کی تعلیم پر لگا دیا۔

قاضی علاؤالدین بگھروی مولانا عبدالحی کے شاگرد تھے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے۔ سید صاحب نے ان سے فرمایا کہ ضروری دینی مسائل سادہ اور سلیس اردو میں نظم کر دیجیے تاکہ لوگ انھیں آسانی سے یاد کر لیا کریں۔ انھوں نے یہ کام شروع کر دیا، لیکن تکمیل سے پہلے شہید ہو گئے۔ قاضی صاحب نے جو نظم شروع کی تھی، اس کے ابتدائی اشعار یہ تھے:

کروں حمد اس ذات بے عیب کی ۔۔۔ غنی و صمد عالم الغیب کی
جو محتاج ہرگز کسی کا نہیں ۔۔۔ اسی کے ہیں محتاج سب ہر کہیں

خدمت دین میں سید صاحب کے اختصاص و امتیاز کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے

پاس جس علم وفن کا کوئی آدمی آیا، اس کے فن کے مناسب حال دینی کام لگا دیا۔ مولوی خرّم علی بلہوری نے فارسی اور اُردو میں فضائل جہاد نظم کر دیے۔ یہ نظمیں جنگوں میں اراجیز کے طور پر پڑھی جاتی تھیں۔

چھٹا باب

جنگِ اوتمان زئی

دُرّانی سرداروں کی کیفیت

آپ دیکھ چکے ہیں کہ دُرّانی سرداروں کی عداوت روز بروز زیادہ تیز و شدید ہوتی گئی۔ ان کے تعلق کا آغاز حسنِ عقیدت اور بیعت امامت سے ہُوا تھا۔ جنگ شیدو میں وہ سکھوں کے آلۂ کار بن گئے اور انھیں کی غیر شایاں حرکات کے باعث فتح شکست میں بدل لی۔ اُس وقت یہ خیال ہو سکتا تھا کہ شاید سکھوں کی تہدیدات نے انھیں ہراساں کر دیا ہوگا۔ جو لوگ یقین و ایمان کی پختگی سے بہرہ مند نہ ہوں اور ان کے قلب و رُوح میں کسی بلند نصب العین کی حرارت موجزن نہ ہو، ان سے ایسی لغزشیں سرزد ہوتی ہی رہتی ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ترک رفاقت کو اپنے لیے مفید سمجھا۔ لیکن وہ اس منزل پر رُکے نہیں، بلکہ ہندوستان سے سرحد پہنچنے والے غازیوں کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے اور پشاور کے تمام ساہوکاروں کو ہدایت کر دی کہ سید صاحب سے کوئی سروکار نہ رکھیں، یہاں تک کہ ان کی ہنڈیوں کا روپیہ بھی نہ دیں، حالانکہ یہ کاروبار وہ اپنے نفع کے خیال سے کرتے تھے۔ تیسرا قدم یہ اٹھایا کہ ان تمام رئیسوں اور سرداروں کے وہ دشمن بن گئے، جو سید صاحب سے عقیدت رکھتے تھے اور ناحق کوشی میں درانیوں کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان سرداروں اور رئیسوں کو اتنا تنگ کیا گیا کہ وہ گھر بار چھوڑ کر باہر پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ مثلاً ارباب بہرام خاں تہکالی، ان کا بھائی جمعہ خاں، عالم خاں رئیس اوتمان زئی، رسول خاں رئیس جلالہ اور محمود خاں رئیس تنگی۔ اکا دکا غازیوں اور سید صاحب کے قاصدوں کو بھی تنگ کرنے کی شکایتیں بار بار پہنچیں۔ بُرائی کے تین ہی درجے ہیں، چوتھا کوئی نہیں: اوّل برائی کو برائی سمجھنا لیکن کیے جانا، دوم برائی کرنا اور اس کا احساس نہ رکھنا، سوم بُرائی کو اس رنگ میں اختیار کر لینا گویا وہ بڑی ہی نیکی اور کارِ خیر ہے۔ دُرّانی سردار یہ تینوں منزلیں طے کر چکے تھے۔ سید صاحب خہر کی طرف جا رہے تھے تو اس موقع پر درانیوں نے ایک لشکر مقابلے کے لیے بھیج دیا تھا، لیکن سید صاحب طرح دے کر نکل گئے۔

پشاور پر پیش قدمی کی تجویز

ایک روز عالم خاں، رسول خاں، ارباب بہرام خاں کے آدمی یہ خبر لائے کہ درانیوں کا لشکر دریائے لنڈے کو عبور کر کے اوتمان زئی پہنچ چکا ہے،

اس کا مدعا یہ ہے کہ مناسب موقع پلٹے تو سید صاحب سے جنگ کرے۔ سب نے عرض کیا کہ یہ خبر مصدقہ ہے۔ اس لشکر کے آگے بڑھنے کا انتظار کرنے کے بجائے بہتر یہ ہوگا کہ آپ خود اوتمان زئی پر پیش قدمی کریں، پھر پشاور پہنچیں۔

سید صاحب کو یہ تجویز قبول کرنے میں توقف تھا۔ توقف کیوں نہ ہوتا؟ وہ اس غرض سے سرحد نہیں پہنچے تھے کہ اصل کام چھوڑ کر مقامی خوانین ورؤسا کے جھگڑوں میں الجھ جائیں۔ یہ غرض لے کر پہنچے تھے کہ سب کو غفلت و سرگشتگی کے خواب سنگیں سے بیدار کر کے اسلامیت کا حق ادا کرنے پر آمادہ کریں۔ اسی پر ملت کی عمومی بہتری اور ہندوستان کی تطہیر موقوف تھی۔ اسی کے ساتھ خود ان خوانین ورؤسا اور ان جیسے تمام ہندوستانیوں کی دنیوی مصلحتیں وابستہ تھیں۔ اس سلسلے میں ترک رفاقت کو ایک حد تک گوارا کیا جا سکتا تھا لیکن مخالفت کیوں کر برداشت کی جا سکتی تھی؟ ایک مسلمان فرائض دین کی بجاآوری میں قاصر رہے تو اسے یقیناً اچھا نہ سمجھا جائے گا، لیکن جو شخص یہ فرائض بجالانے والوں کا دشمن بن جائے اور ان کی پوری سرگرمیوں کو بے اثر بنا دینے کے درپے ہو جائے، اسے اپنا سمجھنے کی کونسی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟

تاہم سید صاحب آخری قدم اٹھانے سے پیشتر ہر پہلو پر ٹھنڈے دل سے غور کر لینا چاہتے تھے۔ انھوں نے تمام خوانین و علما کو جمع کر کے سرداران پشاور کی فتنہ انگیزیاں بے کم و کاست بیان فرما دیں اور آخری فیصلہ انھیں پر چھوڑ دیا۔

خوانین و علمائے سرحد کا فیصلہ

فیصلہ کرنے والوں میں سے جن اصحاب کے اسماء کا علم ہو سکا، وہ یہ ہیں: بہرام خاں، جمعہ خاں (تہکالی)، عنایت اللہ خاں (الاڈنڈ)، زید اللہ خاں (خہر)، محمد خاں (گھڑیالی)، منصور خاں (چارگلئی)، مولوی سید محمد حبان (کانڑا غوربند)، مولوی عبدالرحمٰن (تورو)، ملا کلیم اخوندزادہ (خہر)۔ ان اصحاب نے غور و فکر اور بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ کیا کہ سردارانِ پشاور نے امامت قبول کر لینے کے بعد بغاوت کا راستہ اختیار کیا، ان کا خون مباح ہے اور ان کے ساتھ جنگ ناگزیر ہو گئی ہے۔ علما نے پشاور پر لشکر کشی کو اس وجہ سے بھی جائز قرار دیا کہ جو علاقے سردارانِ پشاور کے تصرف میں ہیں، وہاں ظلم و فسق و فجور کی گرم بازاری ہے اور رسوم جاہلیت کا زور ہے۔ ان علاقوں کی پیشانی پر اسلامیت کا نقش بٹھانے کی یہی تدبیر ہے کہ حملہ کیا جائے۔

اس فیصلے کے بعد نقشہ عمل تیار کیا گیا، مقصود حقیقی وہ فوج نہ تھی جو اوتمان زئی پہنچی ہوئی تھی۔ غرض یہ تھی کہ پشاور کو لے لیا جائے تاکہ وہ سرچشمہ بند ہو جائے جس سے نفاق و عداوت کی سوتیں بار بار پھوٹ

پھوٹ کر نکل رہی تھیں۔ اس کے بغیر سرحد میں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے مستحکم محاذ قائم کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک جماعت کو خیبر کی سمت بھیجا جائے۔ یہ جماعت وعظ و تبلیغ سے ادھر کے قبائل کو اٹھا کر پشاور پہنچے اور پشاور و کابل کے درمیان اتصال و تعلق کا رشتہ کاٹ دے، دوسری جماعت شمالی سمت سے اوتمان زئی کے راستے اقدام کرے۔

داعیانِ خیبر

سید صاحب نے خیبر کی سمت ارباب بہرام خاں اور ان کے بھائی جمعہ خاں کو بھیجا، اس لیے کہ انھیں قبائل خیبر میں خاص اثر و رسوخ حاصل تھا۔ پچاس ساٹھ آدمی ان کے ساتھ کر دیے۔ ان میں سے اکثر ارباب ہی کے آدمی ہوں گے۔ ہندوستانیوں میں سے سیّد احمد علی (خواہرزادہ سید صاحب)، مولوی مظہر علی عظیم آبادی، شیخ ولی محمد پھلتی، شیخ علی محمد دیوبندی، مولوی محمد حسن رام پوری اور مولوی نصیر الدین منگلوری کے اسمائے گرامی کا ہمیں علم ہے۔ سید احمد علی کو اس جماعت کا امیر اور مولوی محمد حسن کو نائب امیر و مشیر مقرر کیا گیا۔ اہل خیبر کے نام ایک اعلام نامہ بھی تیار کر کے دے دیا گیا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ مجاہدین کی اعانت و رفاقت ایمان و انقیاد کی علامت ہے، ان سے الگ رہنا نفاق و فساد کا نشان ہے۔ بغی و طغیان کا دائرہ اتنا پھیل چکا ہے کہ انھیں ختم کیے بغیر چارہ ممکن نہیں رہا، لہذا منافقوں کے مقابلے کے لیے کھڑے ہو جاؤ اور اسے جہاد کا اعلیٰ مرتبہ سمجھو۔

سید صاحب نے عادت شریف کے مطابق ان اصحاب کو رخصت کرتے وقت بڑے عجز و الحاح سے بارگاہ الٰہی میں دعا کی۔ چند روز کے بعد اطلاع آ گئی کہ حالات سازگار ہیں۔ مہمند اور خلیل نے دعوت قبول کر لی ہے اور سعادت خاں لال پوری مجاہدین کی رفاقت کے لیے تیار ہو گیا ہے۔ یہ شخص درۂ خیبر کے مغربی کنارے پر رہتا تھا۔ سید صاحب جب کابل سے پشاور آ رہے تھے تو اس نے عقیدت کے ساتھ بیعت کی تھی اور اپنے عہد پر پکا تھا۔

سیّد صاحب کی روانگی اور فیصلۂ شبخون

یہ اطلاع مل جانے کے بعد سید صاحب بھی تیار ہو گئے۔ جو لوگ کمزور تھے انھیں خر میں بی بی صاحبہ کے پاس چھوڑا۔ میاں جی غلام محمد سہارن پوری کو وہاں کے تمام امور کا منصرم بنایا۔ خود باقی غازیوں کو لے کر نکلے۔ عنایت اللہ خاں، زبید اللہ خاں، رسول خاں اور عالم خاں ساتھ تھے۔ ورگئی اور موسیٰ گڑھی ہوتے ہوئے ٹوٹئی پہنچ گئے[1]

---

[1] تمام روایتوں میں ورگئی کے بعد موسیٰ گڑھی کا ذکر ہے۔ خان غلام محمد خاں رئیس لوند خوڑ نے بتایا کہ موسیٰ گڑھی کوئی مقام نہیں۔ اس مقام کا نام موسیٰ میانہ ہے۔ اس کے پاس ایک گڑھی تھی، جسے گڑھی عثمان خیل کہتے تھے۔ اب وہ موجود نہیں۔ موسیٰ میانہ ورگئی سے چار میل ہے اور ٹوٹئی وہاں سے سات آٹھ میل ہے۔

خان ٹوٹئی نے سید صاحب اور غازیوں کے لیے مناسب قیام گاہیں تجویز کر دیں۔ وہاں قریباً ایک مہینا قیام رہا۔ اس اثنا میں سوات و سمہ کے تمام خوانین کو اطلاع بھیج دی گئی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کون کون سید صاحب کی اعانت کے لیے آیا، صرف انبالی خاں رئیس سوات بالا کا نام معلوم ہو سکا۔

ٹوٹئی ہی میں یہ فیصلہ ہوا کہ اوتمان زئی پر شبخون مارا جائے۔ چنانچہ ضرورت کے مطابق لشکر میں سازو سامانِ جنگ تقسیم کر دیا گیا۔ ہر غازی کو ایک ایک سیر آٹا، ایک ایک پاؤ گھی اور ایک ایک پاؤ گڑ دے دیا گیا تاکہ سب روغنی روٹیاں تیار کر لیں جو تین چار وقت کام دیں۔

اس وقت سید صاحب کے خزانے میں تیس پینتیس ہزار روپے نقد جمع تھے۔ سارا روپیہ ساتھ لے جانا مناسب نہ تھا۔ پانچ ہزار روپے الگ کر کے چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں بھر لیے گئے اور یہ تھیلیاں مختلف غازیوں کی کمروں میں باندھ دی گئیں۔ سب کو تاکید کر دی کہ اگر کسی بھائی کو حادثہ پیش آئے تو دوسرا بھائی اس کی کمر سے تھیلی کھول کر اپنی کمر میں باندھ لے۔ باقی سارا روپیہ ایک محفوظ مقام پر دفن کر دیا گیا۔

ابتدا ہی میں طے کر لیا گیا تھا کہ ایک جماعت آگے جائے۔ اس کے امیر مولانا شاہ اسماعیل ہوں۔ دوسری جماعت سید صاحب کی معیت میں پیچھے پیچھے چلے۔

غازیوں کی پریشانیاں

”منظورہ“ میں ہے کہ عصر کے وقت ٹوٹئی سے نکلے۔ باہر نالے پر پہنچ کر سید صاحب نے نماز عصر پڑھائی۔ دعا کے بعد مولانا اسماعیل کی جماعت کو رخصت کیا اور ایک ایک غازی سے مصافحہ فرمایا۔“ ”وقائع“ میں ہے ٹوٹئی سے اڑھائی تین کوس پر ایک گھاٹی ہے، جہاں غازیوں کا چورپہرہ رہتا تھا۔ مولانا شاہ اسماعیل مغرب کے وقت وہاں پہنچے۔ پھر سید صاحب بھی پہنچ گئے اور نالے پر وضو کر کے مغرب و عشا کی نمازیں ادا کی گئیں۔ مولانا پہلے روانہ ہوئے۔ رہبر ساتھ تھا۔ سید صاحب کچھ دیر رُکے رہے اور بعد میں روانہ ہوئے۔ چلتے وقت نالے سے پانی مشکیزوں میں بھر لیا گیا۔

آگے میدانی علاقہ تھا۔ رات کے اندھیرے میں رہبر راستہ بھول گیا اور ساری رات لشکر کو دائیں بائیں لیے پھرا، یہاں تک کہ سورج نکل آیا اور دھوپ تیز ہو گئی۔ جو پانی ساتھ تھا، وہ رات رات ختم ہو چکا تھا۔ دن کی روشنی ہوئی تو معلوم ہوا کہ کوسوں تک آبادی یا پانی کا نشان نہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ منزل مقصود کتنی دُور ہے۔ ابتدا میں لوگوں کو شبہ ہوا کہ رہبر نے دھوکا دیا۔ دراصل اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ اس نے بڑی دانش مندی اور دُور اندیشی سے کام لے کر اپنا اعتماد بھی بحال رکھا اور لشکر کو بھی ایک خوفناک مصیبت سے بچا لیا۔ روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ وہ ایک جگہ چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر ایک ٹیلے کی طرف اشارہ کیا، جو دو اڑھائی کوس پر تھا اور بولا کہ وہاں پانی ملے گا۔ اس ٹیلے پر پہنچے تو نہ پانی ملا، نہ کوئی آبادی تھی۔ پھر اس نے دوسرے ٹیلے کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں پہنچے تو رہبر نے صاف صاف بتا دیا کہ میں نے آپ لوگوں کا دل رکھنے کے لیے یہ تدبیر کی تھی۔ اب دو میل پر جو ٹیلہ ہے، وہاں پانی بھی ملے گا، دودھ اور چھاچھ بھی ملے گی۔ اگر پہلے ہی چھ سات کوس کا فاصلہ بتا دیتا تو اکثر لوگ ہمت ہار بیٹھتے۔ میں تھوڑا تھوڑا فاصلہ بتا کر آپ کو چار پانچ کوس لے آیا۔ اب ذرا ہمت کر کے باقی دو میل بھی طے کر لیجیے۔ جو غازی زیادہ قوی تھے، وہ رہبر کو لے کر جلد پہاڑ پر پہنچے۔ وہاں سے پکھال پانی سے بھر کے بیلوں اور گدھوں پر لاد کر لے آئے۔ پس ماندہ اور کمزور غازیوں نے پانی پی لیا تو تازہ دم ہو گئے۔ پہاڑ پر پہنچے تو وہاں گوجروں نے دودھ اور چھاچھ سے سب کی تواضع کی۔ اس رات میں جن غازیوں کو نہایت سخت مصیبتوں سے سابقہ پڑا، ان میں شیخ حسن علی، پیر مبارک علی جھنجھانوی، رحم علی اور خدا بخش لکھنوی کے نام خاص طور پر مذکور ہوئے ہیں۔

جلالہ میں قیام

پہاڑ پر پہنچتے پہنچتے دوپہر ہو چکی تھی۔ مولانا وہیں ٹھہر گئے۔ عصر اور مغرب کے درمیان سید صاحب دو اڑھائی سو سواروں اور پیادوں کے ساتھ پہنچ گئے۔ غازیوں کی تکلیف کا حال سنا تو سب کو تسلی دی اور فرمایا کہ یہ بھی الٰہی امتحانوں میں سے ایک امتحان تھا۔ اسے صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنے والوں کے لیے رحمت و مغفرت کی بشارت ہے۔ پھر اس پُر تاثیر انداز میں دعا کی کہ غازیوں کے آنسو نکل آئے اور آلام و مصائب کی ساری کوفت دھل گئی[1]۔ جوشِ حمیت میں سب نے درخواست کی کہ اوتمان زئی پر پیش قدمی کی اجازت دی جائے۔ لیکن سید صاحب نے فرمایا کہ آج رات یہیں آرام کرو۔ اگلے روز وہاں سے روانہ ہو کر جلالہ میں قیام کیا، جو ٹوٹی سے پندرہ سولہ میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں سے پانی کے لیے مشکیں لے لیں اور سب غازیوں میں تقسیم کر دیں۔ دو جاسوس بھیج دیے کہ اوتمان زئی کے حالات معلوم کر آئیں۔ انھوں نے واپس آ کر بتایا کہ درانیوں کی چار ہزار فوج اوتمان زئی میں موجود ہے اور اس کے ساتھ دو توپیں ہیں۔ راستے میں بھی پانی سے بھرے ہوئے بڑے بڑے برتن رکھوا دیے۔ لمبا اور کٹھن سفر تھا، اس لیے قوی غازیوں کو چن لیا گیا۔ وہ دو وقت کی روٹی تیار

---

[1] وقائع میں ہے: دفعتہً دریائے محبت الٰہی نے جوش مارا اور آپ برہنہ سر ہو کر جناب الٰہی میں دعا کرنے لگے اور طرح طرح سے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرنے اور گوہر اشک سے دامن بھرنے لگے اور وہ وہ الفاظ تعریف میں اللہ تعالیٰ کی اپنی زبان گوہر افشاں پر لاتے تھے کہ خامہ بے زبان تحریر کیفیت ان کی سے عاجز ہے۔ صفحہ ۵۴۱)

کرکے عصر سے پہلے تیار ہو گئے۔ سید صاحب نے ظہر کی نماز کے ساتھ ہی حکم دے دیا تھا کہ غازی عصر سے پہلے پہلے جلالہ کے باہر ندی پہ پہنچ جائیں، نماز وہیں ادا کی جائے گی۔ چنانچہ ندی پہ خود نماز پڑھائی اور دعا کے بعد وہاں سے روانہ ہوئے۔

کامیاب حملہ

سفر چونکہ لمبا تھا، لہٰذا مغرب و عشا کی نمازیں ادا کرنے کے لیے تو ٹھہرے، لیکن کھانا کھانے کے لیے ٹھہرنے کی اجازت نہ دی گئی۔ چنانچہ غازیوں نے چلتے چلتے کھانا کھایا اور بلکوں سے پانی پی لیا۔ جب بلکیں خالی ہو جاتی تھیں تو راستے کے برتنوں سے پانی لے کر بھر لیتے تھے۔ اوتمان زئی کے قریب پہنچ کر لشکر کے دو حصے کیے۔ ایک جماعت کو مولانا کی سرکردگی میں لشکر پہ شبخون مارنے کا حکم دے دیا گیا۔ دوسرے حصے کو سید صاحب نے اپنی کمان میں رکھا۔ اس کا وظیفہ یہ ٹھہرا کہ اگر درانی سپاہی لشکرگاہ سے بھاگ کر بستی میں داخل ہونے کی کوشش کریں تو انھیں روکا جائے۔ سید صاحب نے تمام غازیوں کو تاکید فرما دی کہ جو لڑے، اس سے لڑو، جو پناہ مانگے، اسے بے توقف پناہ دو۔

مولانا منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گئے۔ درانی لشکرگاہ ایک گولی کے فاصلے پہ رہ گئی تو اپنے ساتھیوں کو تاکید فرما دی، جب تک میں گولی نہ چلاؤں، کوئی نہ چلائے۔ درانی لشکر کے چوکیدار نے دُور سے دیکھ کر آواز دی کہ کون ہے؟ مولانا خاموش رہے۔ پھر آواز دی، مولانا نہ بولے۔ جب تیسری آواز پر بھی جواب نہ ملا تو اس نے گولی چلا دی اور شور مچاتا ہوا لشکرگاہ کی طرف بھاگا کہ سید بادشاہ کے غازی آ گئے۔

مولانا نے بلند آواز سے تکبیر کہہ کر حملے کا حکم دیا۔ خود سب سے آگے تھے۔ درانی گولہ انداز نے توپ داغنی چاہی۔ مولانا ساتھیوں سمیت زمین پہ بیٹھ گئے۔ توپ چلی اور گولہ غازیوں کے سروں کے اوپر سے نکل گیا۔ پھر مولانا نے اس تیزی سے حملہ کیا کہ دوسری مرتبہ گولہ چلنے سے پہلے پہلے توپچیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور توپ پہ قبضہ کر لیا۔ اس اثنا میں سارے درانی بھاگ نکلے اور لشکرگاہ کو چھوڑ کر ایک ٹیلے پہ پناہ گزیں ہو گئے۔

دن بھر لڑائی

سید صاحب کو اطلاع ملی تو اس فتح پر بارگاہِ الٰہی میں دوگانۂ شکر ادا کیا۔ توپیں اس ٹیلے کے سامنے نصب کرا دیں، جن پر درانی جمع ہو گئے تھے۔ غازیوں کو دو حصوں میں بانٹ کر صبح کی نماز ادا فرمائی۔ خیال تھا کہ درانی جمع ہو کر حملہ کریں گے۔ سید صاحب نے جا بجا چار مورچے بنوا کر غازیوں کو ان میں بٹھا دیا اور اس تواتر سے باڑھیں مارنے کی تاکید کر دی، کہ درانیوں کو اپنی جگہ سے جنبش کرنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ پھر خود توپ کھنچوا کر ایک اونچی جگہ لائے، بھروائی، خود شست باندھی اور میرزا حسین بیگ کو حکم دیا کہ اب گولے پھینکو۔ پہلے ہی گولے سے دو سوار اڑ گئے۔

درانی ٹیلے سے اتر کر پیچھے کی طرف جا بیٹھے۔

دن بھر لڑائی جاری رہی۔ خدا کے فضل سے کسی غازی کے خراش تک نہ آئی۔ پاس تالاب تھا، غازی اسی پر وضو کرتے اور دو دو جماعتوں میں بٹ کر نمازیں پڑھتے رہے۔ مغرب کے وقت درانیوں کی طرف سے گولیوں کی شدید بارش شروع ہو گئی۔ اس وقت تک شاہینیں بھی انھوں نے فراہم کر لی تھیں۔ اب یہ تجویز پیش ہوئی کہ دشمن پر بائیں جانب سے حملہ کیا جائے۔ ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ میرزا حسین بیگ نے توپ سے گولے پھینکنے شروع کیے۔ درانیوں کے نقصان جان کا حال تو معلوم نہ ہو سکا لیکن پھر ان کی شاہینوں سے کوئی گولہ نہ آیا۔

صورتِ حال میں تغیر

یہ حالات تھے جب اچانک اور بالکل غیر متوقع طور پر تکمیل فتح میں رکاوٹ کے اسباب پیدا ہو گئے۔ سید عبدالرؤف بابڑے والے نے عصر کے وقت سید صاحب کی خدمت میں عرض کر دیا تھا کہ مجھے عالم خاں رئیس اوتمان زئی کی نیت میں فتور معلوم ہوتا ہے۔ سید صاحب نے سمجھا کہ شاید سید عبدالرؤف کو غلط فہمی ہوئی، لیکن تھوڑی دیر بعد عالم خاں خود آیا اور پگڑی اتار کر سید صاحب کے قدموں پر رکھتے ہوئے بولا: "میرا لڑکا قابو میں نہیں رہا اور میرے آدمیوں کو لے کر درانیوں سے جا ملا ہے۔"

یہ شخص پشاور پر پیش قدمی کی تحریک میں پیش پیش تھا۔ خود سید صاحب کو اوتمان زئی لایا تھا۔ جب معاملہ یکسوئی کے قریب پہنچا تو دبدا میں پڑ گیا۔ حقیقتِ حال کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے درانیوں نے دھمکیاں دے کر بیٹے کو ساتھ ملا لیا ہو یا کہہ دیا ہو کہ عالم خاں کو چھوڑو اور خود مسندِ خانی سنبھال لو۔ مان لیجیے کہ عالم خاں کو بیٹے پر کوئی اختیار نہیں رہا تھا لیکن خود اس کے لیے تو فرض کا رستہ بالکل صاف و ہموار تھا۔ افسوس کہ وہ بھی استقامت سے محروم ہو گیا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ خان بھائی! مجھے آپ کے بیٹے یا کسی دوسرے شخص کی پروا نہیں، میرے لیے خدا کافی ہے۔"

عین اسی وقت مولوی نصیر الدین منگلوری، ارباب بہرام خاں اور سید احمد علی کی طرف سے یہ پیغام لائے کہ ابتدا میں سمت خیبر کے قبائل مجاہدین کی اعانت پر متفق ہو گئے تھے، پھر ان میں تفرقہ پڑ گیا اور وہ درانیوں کے طرفدار بن گئے۔ گویا پشاور پر پیش قدمی کی دونوں تدبیریں کامیابی کے قریب پہنچ کر ناکام ہو گئیں۔ اس کے بعد جنگ جاری رکھنا بالکل عبث تھا۔ احسن صورت یہی تھی کہ مجاہدین کو لے کر سید صاحب واپس چلے جائیں اور کسی دوسری مہلت کا انتظار فرمائیں۔

مراجعت کی تدبیر

عین میدانِ جنگ سے غازیوں کو بہ حفاظت ہٹا کر لے جانا سہل نہ تھا۔ آپ نے

تھوڑے سے غازیوں کو مورچوں میں بٹھا دیا، باقی سب کو حکم دے دیا کہ وہ درختوں کے اس جھنڈ میں جمع ہو جائیں جو اوتمان زئی سے پاؤ کوس کے فاصلے پر تھا۔ بستی والوں نے یہ سمجھا کہ سید صاحب درختوں کے جھنڈ میں بیٹھ کر دشمن پر شبخون مارنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس اثنا میں خبر ملی کہ یار محمد خاں اور سلطان محمد خاں کا بھائی سید محمد خاں کمک لے کر اوتمان زئی پہنچ رہا ہے۔ یہ خبر غالباً عالم خاں نے پہنچائی تھی۔ ممکن ہے اس نے خیر خواہی کی ہو، ممکن ہے، اسے خیال ہو کہ سید صاحب درانیوں کی کمک کا حال سنیں گے تو جلد واپس جانے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ سید صاحب نے یہ سُنا تو فرمایا: خان بھائی! آپ باطمینان اپنے مکان پر بیٹھے رہیں، ہم سید محمد خاں کی فوج پر بھی شبخون ماریں گے۔ عالم خاں نے فوراً درانیوں سے کہا یا کہلا بھیجا کہ ہوشیار ہو جاؤ، سید بادشاہ کا چھاپا تمھاری کمکی فوج پر آتا ہے۔ عجب نہیں تم پر بھی آپڑے۔[1]

واپسی

اکثر غازی درختوں کے جھنڈ میں پہنچ گئے تو سید صاحب نے پچاس آدمی روک لیے۔ باقی سب کو مولانا شاہ اسماعیل کی سرکردگی میں جلالہ بھیج دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مورچوں والے غازیوں کو بھی سید ابو محمد کے ذریعے سے بُلوا لیا۔ وہ سب آ گئے تو خود سید صاحب واپس ہوئے۔ چار پانچ کوس کا فاصلہ طے کر کے ایک مناسب مقام پر تین چار گھڑی ٹھہرے رہے تاکہ اگر درانی تعاقب میں آ رہے ہوں تو ان کو روکا جائے۔ صبح صادق نمودار ہوئی تو آپ رہ گرا سے جلالہ ہوئے۔

انتہائی احتیاط کے باوجود بعض غازی پیچھے رہ گئے۔ رات کی تاریکی میں انھیں سید صاحب کا پیغام نہ مل سکا اور وہ اپنی جگہ کو چھوڑ کر درختوں کے جھنڈ میں نہ پہنچے۔ یہ آٹھ دس آدمی تھے، جن میں سے شیخ امجد علی غازی پوری، حافظ رحیم بخش الہ آبادی اور حافظ عبداللطیف نیوتنوی (برادر مولوی عبدالحق) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے ساتھ ایک ہندو راجا رام نام بھی تھا جو بیسواڑہ (نزد سلون) کا باشندہ تھا۔ اس نے اپنا قصہ یوں بیان کیا کہ میں مورچے میں سو گیا تھا۔ آنکھ کھلی تو کسی کو نہ پایا۔ بستی میں جا کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ

---

[1] راویوں نے اسے عالم خاں کی بے وفائی کا ثبوت بنا کر پیش کیا ہے۔ بلا شبہ سید صاحب کی کسی بات کو دشمن تک پہنچانے اور اسے قبل از وقت ہوشیار کر دینے کو وفاداری نہیں، بے وفائی ہی کہنا چاہیے، لیکن معاملے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ سید صاحب یہی چاہتے تھے۔ عالم خاں نے درانیوں کو آگاہ کر دیا تو وہ سید صاحب کے تعاقب کی تدبیریں اختیار کرنے کے بجائے اپنے حفظ و دفاع میں لگ گئے۔ اس طرح سید صاحب کو اطمینان کے ساتھ نکل جانے کی مہلت مل گئی۔ مجھے یقین ہے، سید صاحب نے شبخون کا عزم اسی خیال سے بے تکلف عالم خاں کے سامنے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ اسے درانیوں تک پہنچا دے، ورنہ اصلاً وہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ اسے اپنی جنگی تدبیروں سے آگاہ کیا جاتا۔

تمام غازی اس فوج پر شبخون مارنے کے لیے گئے ہیں، جو دوآبہ کی طرف سے کمک کے طور پر آ رہی تھی۔ میں یہ سُن کر توپوں کے پاس پہنچا۔ اندیشہ پیدا ہُوا کہ مبادا دشمن توپیں لے جائیں۔ ان میں گولے بھر بھر کر چلانے لگا۔ اسی حالت میں صبح ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ اگر شبخون مارا جاتا تو بندوقوں کی آواز آتی، پھر بستی میں گیا تو وہاں شیخ امجد علی اور حافظ رحیم بخش مل گئے۔ وہ بھی چھاپے کی خبر سُن کر بہ اطمینان بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ دن نکل آیا ہے، یہاں سے چل دینا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ ہم نکلے۔ راستے میں جو آدمی ملے انھیں ساتھ لیتے آئے۔

سید صاحب نے راجا رام کی بہادری اور حسن تدبیر کی ستائش فرمائی۔ شیخ امجد علی کو دیکھ کر مُسکراتے ہُوئے فرمایا کہ شیخ بھائی ہمارے "زندہ شہید" ہیں۔ جس نے شہید کو نہ دیکھا ہو، انھیں دیکھ لے۔ اسی وقت سے شیخ امجد علی "زندہ شہید" کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

درانی رات بھر شبخون کے خوف سے کانپتے رہے۔ دن نکل آیا تو بستی والوں نے بتایا کہ غازی چلے گئے۔ تاہم انھیں پہر دن چڑھے تک بستی کے قریب آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ یہی سمجھتے رہے کہ غازی کہیں چھپے بیٹھے ہیں۔

سید صاحب عصر کے وقت جلالہ سے رخصت ہُوئے اور ٹوپئی کا راستہ چھوڑ کر ایک رات ورگئی میں بسر فرماتے ہُوئے خہر پہنچ گئے، آٹھ دس روز بعد غازیوں کی ایک جماعت کو ٹوپئی بھیج کر دفن کیا ہُوا روپیہ منگا لیا۔ ان غازیوں کے نام یہ ہیں: سید رستم علی چلگانوی، کریم بخش سہارنپوری، حاجی عبداللہ، خدا بخش منجھانوی، شیخ بلند بخت دیوبندی، شیخ علی محمد دیوبندی، شیخ حفیظ اللہ دیوبندی، کریم بخش پنجابی، نظام الدین اولیا، شیخ نصرت بانس بریلوی، چراغ علی پٹیالوی، پیر خاں مورانوی، سلو خاں، فتح خاں، مراد خاں، بخش اللہ خاں، ولی داد خاں، اللہ داد خاں، شیخ نصر اللہ، میاں الٰہی بخش رام پوری اور ارباب جمعہ خاں۔ مولانا شاہ اسماعیل اس جماعت کے امیر تھے۔

تنخواہ دار فوج

قیام خہر میں سید صاحب خوانین کے منازعات کو ختم کر کے ان میں اتحاد و اتفاق پیدا کرتے رہے۔ مولوی محبوب علی کی واپسی کے بعد ہندوستان سے قافلوں کی آمد رُک گئی تھی اس لیے سید احمد علی، منشی خواجہ محمد، شیخ بلند بخت، اخوند عصمت اللہ، اخوند ظہور اللہ، شیخ علی محمد، اخوند گل پشاوری، مولوی سید حبان وغیرہ کے مشورے سے تنخواہ دار فوج بھرتی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اخوند ظہور اللہ دو سو آدمی بھرتی کر کے کاٹ لنگ پہنچ گئے۔ دو ماہ بعد یہ طے ہُوا کہ ابھی تنخواہ دار فوج رکھنے کا وقت نہیں آیا۔ سید صاحب اس وقت پنجتار جانے کا فیصلہ فرما چکے تھے اور بی بی صاحبہ کو بونیر کے راستے پنجتار بھیج دیا تھا۔

آپ نے ملازموں کو دو ماہ کی تنخواہ دے دی۔ پھر ان کے روبرو فضائل جہاد پر وعظ کہا۔ ان میں سے چالیس آدمی غازیوں میں شامل ہو گئے۔ ان کے سرخیل میرزا احمد بیگ پنجابی تھے[1]

خیبر سے سید احمد علی اور ارباب بہرام خاں جلالہ میں سید صاحب کے پاس پہنچ گئے تھے۔ تفصیلی حالات سُن کر آپ نے فرمایا:

> اس ملک کے رئیسوں کا یہی حال ہے کہ اپنے عہد و پیمان کے پکے نہیں ہیں، کبھی کسی کی طرف کبھی کسی کی طرف۔

---

[1] منظورہ میں ہے کہ دین محمد ہندوستان سے خطوط اور ہنڈیاں لے کر آیا تو اس نے سید صاحب سے عرض کیا کہ کوئی ملک ابھی تک آپ کے ہاتھ نہیں آیا، اس لیے تنخواہ دار سپاہ رکھنا مناسب نہیں۔ مولانا شاہ اسماعیل، ارباب بہرام خاں، قاضی احمد اللہ میرٹھی، مولوی محمد حسن اور منشی خواجہ محمد نے میاں دین محمد کی رائے سے اتفاق کیا۔ سید صاحب نے منشی محمدی انصاری میر منشی کو حکم دیا کہ سب کی تنخواہیں ادا کر دی جائیں۔ پھر ان سے پوچھا: آپ لوگوں نے اپنا حق لے لیا؟ اس کے بعد فضائل جہاد پر یوں وعظ فرمایا:

> جو شخص ملازم ہو کر جہاد کرتا ہے، اسے بھی ثواب ملتا ہے، لیکن جو خوش نصیب خالصاً لوجہ اللہ جہاد کرتے ہیں ان کے درجے کو کوئی نہیں پہنچتا۔ جو غازی ہمارے ساتھ ہیں یہ سب اپنے گھروں میں کھاتے پیتے اور خوش حال تھے۔ کئی بیش قرار ملازمتیں چھوڑ آئے۔ کئی جاگیروں، زمینوں اور تجارتوں کو ترک کر کے آئے۔ یہاں ہمارے پاس صرف اللہ کے لیے رہتے ہیں۔ فقر و فاقہ سہتے ہیں اور خوش و خرم، راضی برضا، صابر ہیں۔ اگر اسی طرح تم بھی رہو تو ہم حاضر ہیں۔

یہ وعظ سن کر میرزا احمد بیگ اور ان کے چالیس ساتھی غازیوں میں شامل ہو گئے۔ روایت سے یہ بھی واضح ہوا کہ سید صاحب کے لشکر میں ہر فرد رائے دینے کا مجاز تھا، حتیٰ کہ قاصد بھی۔

ساتواں باب

بیعت شریعت

بیعت اقامتِ شریعت کا فیصلہ سید صاحب جب سرحد تشریف لائے تھے تو آپ کو یقین ہوگا کہ شرع شریف کے احکام کی پابندی اور اسلامیت پر فداکاری میں اہل سرحد، مسلمانانِ ہند سے فائق و برتر ہیں۔ لیکن یہاں پہنچ کر قریباً دو برس تک ایک ایک طبقے کے احوال و مراسم دیکھ چکنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا اسلام بھی رسمی ہے۔ یقیناً اہل سرحد بھی اس وقت محض نام کے مسلمان رہ گئے تھے (الا ما شاء اللہ)، عملاً ان کی پوری زندگی جاہلیت کے الواث سے آلودہ تھی۔ لہذا فیصلہ کیا گیا کہ سروسامانِ جہاد کے ساتھ ساتھ انھیں اسلامیت کا پابند بنایا جائے۔ اس کے بغیر وہ اہم دینی مقاصد کے لیے کیا کام کر سکتے تھے؟ چنانچہ قیام خہری کے دوران میں فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ امامت جہاد کی بیعت کے ساتھ ساتھ سب سے اقامت شریعت کی بیعت بھی لی جائے۔ پٹھانوں کی اصلاح و تنظیم کے سلسلے میں یہ دوسرا قدم تھا۔ سید صاحب نے خود ایک موقع پر فرمایا کہ جو لوگ کمال اخلاص سے خدائے ذوالجلال کی اطاعت میں جان و مال فدا کرنے پر آمادہ ہوں اور اسی کو دارین میں سرخروئی کا باعث سمجھیں، وہ کم ہوں یا زیادہ، انھیں کو مجاہدین ابرار کا درجہ حاصل ہوگا اور انھیں سے نصرت کا کار اہم سرانجام کو پہنچے گا۔

مذموم مراسم کا نقشہ افغانوں میں جو بُرائیاں عام ہو چکی تھیں، ان سب کو تفصیل سے بیان کرنا مشکل ہے۔ جن مذمومات کا ذکر مختلف مقامات پر سید صاحب کی سیرت کے مآخذ میں آیا ہے، ان کی سرسری کیفیت ذیل میں درج ہے:

۱ ـ لوگ احکام شریعت کی پیروی سے بالعموم بے پروا تھے۔ ان کے تمام معاملات کی باگ ڈور ملاؤں کے ہاتھ میں تھی اور ملاؤں کی اعتقادی و عملی حالت بہت گری ہوئی تھی۔ پھر بعض بڑے بڑے رئیس ملاؤں کی بھی پروا نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنے صواب دید کی بنا پر جو قدم اُٹھا لیتے، مُلّا لوگ از روئے شریعت اسی کو حق بہ جانب ثابت کر دیتے۔

۲ ـ جب کوئی شخص فوت ہو جاتا تو اس کے گناہوں کا کفارہ یوں ادا کیا جاتا کہ ملاؤں کی جماعت بیٹھ جاتی۔

قرآن شریف کا ایک نسخہ اور کچھ رقم دست بہ دست پھرائی جاتی اور آخر میں دونوں چیزیں پوری جماعت کے حوالے کر دی جاتیں۔ اس عمل کو سرحد کی اصطلاح میں "اسقاط" کہتے تھے، یعنی متوفیٰ کے گناہوں کو ختم کرنے کا عمل۔

۳ - لڑکیوں کے نکاح کے لیے گراں قدر رقمیں لینے کا دستور تھا۔ کئی مرد روپیہ فراہم نہ کر سکنے کے باعث نکاح سے محروم رہ جاتے اور لڑکیاں والدین کے ہاں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جاتیں۔

۴ - ایک دستور یہ تھا کہ نکاح کے وقت اگر کچھ روپیہ دولھا کے ذمے رہ جاتا تو اس کے ادا نہ ہونے تک دُلھن کو رخصت نہ کیا جاتا۔ ہزاروں لوگ صرف اس روپے کی فکر میں محنت مزدوری کے لیے دُور دُور نکل جاتے اور سالہا سال باہر گزار دیتے۔ لڑکیاں بیچاری والدین کے گھروں میں بیٹھی رہتیں۔

۵ - گروہ بندی اور پرہ جنبہ نے ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ کسی کو حق و ناحق کی تمیز باقی نہیں رہی تھی۔ ہر شخص صرف اپنے گروہ اور اپنے جتھے کی طرفداری کو زندگی کا نصب العین بنا لیتا، اگرچہ اس کی کارروائیاں کتنی ہی ناواجب و ناجائز ہوتیں۔

۶ - ازواجِ میت بھی عام ترکے کی طرح متوفیٰ کے بھائی بندوں میں تقسیم ہو جاتیں۔

۷ - پاسِ قول اور ایفائے عہد سے وہ لوگ یک قلم بے پروا ہو چکے تھے۔ آج وعدہ کرتے، کل انتہائی بے تکلفی سے اُسے توڑ ڈالتے۔ اس کی کئی مثالیں ہم پیش کر چکے ہیں۔

۸ - حقیر دنیوی فوائد کے لیے دینی اور قومی مصالح کو قربان کر دینے میں انھیں کوئی باک نہ تھا۔

۹ - چار سے زیادہ نکاحوں کا رواج تھا۔

۱۰ - لڑکیاں حقِ وراثت سے محروم تھیں۔

۱۱ - حریر پوشی، شراب نوشی اور بعض دوسرے مناہی کے ارتکاب میں وہ اتنے بے باک تھے کہ علانیہ اس قسم کی حرکتوں پر فخر کیا کرتے تھے۔

۱۲ - بلوائیوں، ڈاکوؤں اور چوروں کی حیثیت میں لوگوں کا مال و اسباب لُوٹنے اور شرعی جہاد کرنے میں ان کے نزدیک کوئی تمیز نہ تھی۔ وہ ہر اس فعل کو جہاد سمجھ لیتے تھے، جس سے انھیں فائدہ پہنچے، اگرچہ وہ کتنا ہی ناجائز ہو۔

فتح خاں اور اشرف خاں کے خطوط

"منظورہ" میں ہے کہ سید صاحب اوتمان زئی کی جنگ سے خہر واپس پہنچے تو فیصلہ فرما لیا کہ اہلِ سرحد میں ہر گروہ کو شرعِ ربانی کے احکام قبول کر لینے اور افغانی رسوم ترک کر دینے پر آمادہ کیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ جہاد ابھی

صورت میں تائید آسمانی کے نزول کا باعث بن سکتا ہے کہ سب لوگ حقیقی معنی میں مسلمان بن جائیں۔ جو کچھ کریں، خدا کی رضا کے لیے کریں۔ اسی صورت میں اطاعت امام کی حقیقت سے وہ آگاہ ہو سکتے ہیں۔ اسی صورت میں بدعات و منکرات اور معصیت امام سے پاک ہو کر خدا اور رسولؐ اور اولی الامر کی فرمانبرداری کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ اسی صورت میں کاروبار جہاد مستحکم و استوار ہو کر مطلوب نتیجہ پیدا کر سکتا ہے[1]

منفرداً ہزاروں آدمیوں نے سید صاحب کی اس دعوت کو قبول کر لیا تھا اور ان آدمیوں میں مخلصوں کی تعداد بھی کم نہ تھی، لیکن اصل غرض انفرادی قبول و پذیرائی سے پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ ضروری تھا کہ ایک ہمہ گیر نظام پیدا کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے علماء و اکابر کا اجتماع ضروری تھا۔ سید صاحب نے دعوت عام کا سلسلہ شروع کر دیا تھا لیکن ساتھ ساتھ اس امر پر بھی غور فرما رہے تھے کہ اجتماع کے لیے کون سی جگہ زیادہ موزوں ہوگی۔ اس اثنا میں فتح خاں رئیس پنجتار اور اشرف خاں رئیس زیدہ کی طرف سے خطوط پہنچے کہ آپ نے خہر میں خاصا وقت گزرا اور بظاہر کوئی فائدہ مترتب نہ ہوا۔ سوات کے عوام یقیناً بہت مخلص و مستعد ہیں، لیکن خوانین مرض نفاق میں مبتلا ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ہمارے ہاں تشریف لائیں، ہم جان و مال سے اطاعت کا اقرار کرتے ہیں اور عام لوگوں کی آواز بھی یہی ہے کہ آپ آئیں تو آپ کی قیادت میں اسلامی و قومی فرائض کی بجا آوری کا سر و سامان کریں۔ اشرف خاں کے خطوں میں خادے خاں رئیس ہنڈ کے ساتھ منازعت کا ذکر بھی تھا اور سید صاحب ہی کے ذریعے سے اس نزاع کے ختم ہونے کی امید تھی۔

پنجتار کے لیے روانگی

چنانچہ سید صاحب نے پنجتار کے ارادے سے رخت سفر باندھ لیا۔ خہر میں ٹھہرے رہنا اس وجہ سے چنداں ضروری نہیں رہا تھا کہ سرداران پشاور کے خلاف مستقبل قریب میں اقدام کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا اور بیعت اقامت شریعت کو عام اہل سمہ خوانین و علما کے اتفاق سے قبول کر لیتے تو نتیجہ خیز اقدامات کا بہتر سے بہتر سامان مہیا ہو جانے کی امید تھی۔ اس صورت میں سرداران پشاور یا دوسرے مذبذبین و مخالفین کا فیصلہ بھی سہل معلوم ہوتا تھا۔ بی بی صاحبہ کو بونیر کے راستے پنجتار بھیج چکے تھے، خود خہر سے نکلے تو درگئی کے ٹیلے سے گزر کر ایک تالاب پر ٹھہرے وہاں شیر علی (ساکن شیرپور ضلع پٹنہ) نے وفات پائی۔ دوسرا مقام لوند خوڑ میں اور تیسرا کاٹ لنگ میں ہوا۔ پھر آپ چارگلئی کو جانب چپ چھوڑتے ہوئے مٹھی پہنچے۔ بعد ازاں شیوہ میں ٹھہرے اٹلہ خاں

---

[1] منظورہ صفحہ ۳۱۳

اور اس کے بھائی مشکار خاں نے سید صاحب کو بستی میں ٹھہرایا۔ غازیوں کے لیے بستی سے سوا سو قدم کے فاصلے پر زیتون کے جنگل میں قیام کا انتظام کیا۔ شیوہ سے بہت تڑکے روانہ ہوئے، نماز فجر سلیم خان میں ادا کی، پھر پنجتار چلے گئے۔ فتح خاں نے بستی سے باہر نکل کر بیر کے باغ کے پاس استقبال کیا۔[1]

دعوتِ عام

سید صاحب نے پنجتار پہنچتے ہی بیعت شریعت کے لیے دعوت عام کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ آپ مختلف بستیوں اور قبیلوں میں دورے فرماتے اور علما و اکابر کو جمع کر کے پابندی احکام اسلام کی ہدایت کرتے۔ مثلاً ایک مرتبہ ڈاگئی گئے، جو مندن قبیلے کی ایک شاخ کا بڑا مرکز تھا۔ وہاں کم و بیش دو سو عالم جمع تھے۔ ان میں سے مولانا نیاز محمد ممتاز ترین تھے۔ پھر مندن قوم کی دوسری شاخ کے مرکز باجا بام خیل میں گئے۔ وہاں بھی ارد گرد کے عوام اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان دوروں کے ذریعے سے فضا سازگار بن گئی۔ فتح خاں پنجتاری سے بھی صاف صاف فرما دیا کہ اگر نظام شریعت کو بہ انشراح خاطر قبول نہ کیا تو میں پنجتار میں نہ رہ سکوں گا۔ اگر مجھے ٹھہرانا منظور ہے تو تمام غیر شرعی رسوم سے دست کش ہو جائیے اور شریعت کے احکام منظور کر لیجیے۔ جو مال غیر مشروع طریق پر آپ کو ملتا ہے، اسے بھی ٹھکرا دیجیے اور معاش کے لیے صرف رازق مطلق کے فضل و کفالت پر بھروسا کیجیے۔[2]

اجتماعِ عظیم

دوروں اور وعظ و نصیحت کے ذریعے سے قبول عام کا جذبہ بیدار ہو گیا تو فیصلہ ہوا کہ پنجتار میں اجتماعِ عظیم منعقد کیا جائے جس میں سرحد کے ہر حصے سے علما و خوانین شریک ہوں۔ یکم شعبان ۱۲۴۴ھ (۶۔ فروری ۱۸۲۹ء) کی تاریخ اور جمعہ کا دن اس اجتماع کے لیے تجویز ہوا۔ خوانین و اکابر کے علاوہ دو ہزار کے قریب علما اس موقع پر آئے۔ اتنے ہی ان کے تلامذہ تھے۔[3] اشرف خاں رئیس زیدہ اور خادے خاں رئیس ہنڈ بھی اس اجتماع میں شریک ہوئے۔ سب کے لیے کھانے کا انتظام سید صاحب نے فرمایا۔ پیش نظر معاملہ پہلے ہی ہر ایک پر واضح تھا۔ اس اجتماع میں سید صاحب نے ایک افتتاحی تقریر فرمائی۔ پھر فتح خاں پنجتاری سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر آپ ہماری بات ماننا چاہتے ہیں تو اسی مجمع میں مان لیجیے، ورنہ اتحاد کا رشتہ کٹ جائے گا اور ہمیں یہاں سے نکل جانا پڑے گا۔

---

[1] سید صاحب کی شہادت کے بعد پنجتار پر خوف ناک آفتیں نازل ہوئیں، جن کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں، یہاں تک کہ نہ وہ بستی باقی رہی، نہ اس کے باغات یا دوسرے متعلقات کا کوئی نشان باقی رہا۔ ساٹھ برس تک اس مقام پر نہ کوئی مکان تھا، نہ کوئی متنفس وہاں رہتا تھا۔ اب نہیں بتایا جا سکتا کہ بیر کا باغ کس جگہ تھا۔ [2] منظورہ صفحہ ۴۴۷۔

[3] منظورہ صفحہ ۴۴۷۔ بعض مکاتیب میں ہے: قریب ہزار علما و طلبہ

آپ نے بڑے اخلاص کے ساتھ ہمیں سوات سے بلایا۔ میں خدائے عزوجل کا ایک عاجز بندہ ہوں ، میری آرزو اس کے سوا کچھ نہیں کہ سب لوگ احکام الٰہی کے فرمانبردار بن جائیں :

اگر شما را فی الحقیقت خدمت دین منظور است ، اگر آپ کو واقعی دین کی خدمت منظور ہے
پس احکام شرعی بے کم و کاست قبول نمائید تو پہلے خود شرعی احکام بے کم و کاست قبول کر لیجیے ۔

فتح خاں نے تھوڑا تامل کیا پھر کہا کہ اگرچہ یہ امر نہایت مشکل ہے ۔ مال و جاہ کا ترک لازم ہو گا ، ذرائع معاش جاتے رہیں گے ۔ صدہا برس کے مراسم ترک کرنے کے باعث افغانوں کے ساتھ اختلافات بھی رونما ہو جائیں گے ، لیکن میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اور اس کی کفالت پر تکیہ کرتے ہوئے اس حکم کو بہ دل و جاں قبول کرتا ہوں ۔

سید صاحب خود مجمع میں سے اٹھ گئے ۔ علما آپس میں مشورے کرتے رہے ۔ آخر اس فیصلے پر پہنچے کہ نظام شرعی کا قیام لازم ہے ۔ نماز جمعہ کے بعد سب نے سید صاحب کے ہاتھ پر اقامت شریعت کے لیے بیعت کی اور سب نے مُہری بیعت نامے آپ کی خدمت میں پیش کر دیے ۔ علما کے بیعت نامے عربی میں تھے اور خوانین کے فارسی میں[1]

استفتا اور اس کا جواب

بیعت کے بعد ایک استفتا علماء کی خدمت میں پیش کیا گیا ۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ اگر کوئی شخص امام کی بیعت کرنے اور اس کی اطاعت اپنے اوپر لازم کر لینے کے بعد خدمت دین اور اجرائے شرع مبین کے سلسلے میں امام کے کسی حکم کو رد کر دے اور مخالفت پر کمربستہ ہو جائے ، بلکہ جدال و قتال میں بھی متامل نہ ہو ، تو اس کے متعلق اور اس کے ساتھیوں کے متعلق شریعت کا فیصلہ کیا ہے ؟ علماء نے غور و فکر کے بعد اس کا مفصل جواب مرتب کیا ۔ اس کے مطالب کا خلاصہ یہ تھا :

---

[1] پنجتار اونچی جگہ واقع ہے ، اس کے مغرب میں ایک نالہ بہتا ہے ، جس کا بہاؤ بہت گہرائی میں ہے ۔ اس نالے کے مغربی کنارے پر شیشم کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا ۔ وہیں سید صاحب اور غازی جمعہ اور عیدین کی نمازیں ادا کرتے تھے ۔ اسی مقام پر اجتماع ہوا تھا اور اسی جگہ بیعت لی گئی تھی ۔ ۱۸۵۸ء میں پنجتار کو انگریزوں نے تباہ کیا تو درختوں کا یہ جھنڈ بھی باقی نہ رہا ۔ اب اس مقام پر ببول اور پھلاہی کے درخت اگ آئے ہیں اور آس پاس ریت ہی ریت ہے ۔ لوگوں نے بتایا کہ نالے میں کئی مرتبہ طغیانی آئی ۔ اس میں وہ زمین بھی بہ گئی ، جہاں سید صاحب اور ان کے غازیوں کے زمانے میں نماز ہوتی

۱۔ اثباتِ امامت کے بعد حکمِ امام سے سرتابی سخت گناہ اور قبیح جُرم ہے۔

۲۔ مخالفوں کی سرکشی اگر اس پیمانے پر پہنچ جائے کہ قتال کے بغیر اس کا استیصال ممکن نہ رہے تو تمام مسلمانوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ ان مخالفوں کی تادیب کے لیے تلواریں نکال لیں اور امام کے حکم بزور مخالفوں پر نافذ کریں۔

۳۔ اس معرکے میں لشکرِ امام سے جو شخص قتل ہوگا، وہ شہید و نجات یافتہ سمجھا جائے گا اور لشکرِ مخالف کے مقتولین مردود و ناری متصور ہوں گے۔ ان کی حالت اکثر فاسقوں مثلاً زانیوں اور سارقوں سے بھی بدتر ہوگی، اس لیے کہ فاسقوں کے جنازے کی نماز واجب ہے، لیکن ان مخالفوں کے جنازے کی نماز بھی جائز نہیں۔ اس فتوے پر علمائے سرحد میں سے مندرجہ ذیل پچیس اصحاب کے دستخط تھے: ملا نیاز محمد، ملا ولی محمد، ملا محمد اسماعیل، اخوندزادہ سعد اللہ، ملا ستار خاں، سید علی، اخوند شاہ ولی خاں، اخوند محمد غلام، ملا محمد عظیم، اخوند کرم، ملا عماد، ملا سید احمد، ملا محمد عرفان، ملا عبداللہ، ملا پیر محمد، اخوند محمد غفران، اخوند اکبر شاہ، اخوند محمد وصال، ملا عبدالرحمٰن، اخوند ولی محمد، اخوند عبدالغفور، اخوندزادہ محمد گل، اخوند صفی اللہ۔

اصلاحِ عام

غالباً ۱۵۔ شعبان ۱۲۴۴ھ کو جمعے کے دن (۲۰۔ فروری ۱۸۲۹ء) پھر ایک اجتماع ہوا، جو فتح خاں کے قبیلے کے افراد پر مشتمل تھا۔ خان نے ان سب کو بیعتِ شریعت کی ترغیب دی، اور انھوں نے بطیبِ خاطر نظامِ اسلامی کی پابندی قبول کر لی۔ پھر مختلف علاقوں کے لیے سید صاحب نے قاضی مقرر فرما دیے۔ مولوی سید محمد حبان کو قاضی القضاۃ بنایا گیا۔[1] ملا قطب الدین ننگرہاری کو احتساب کا کام سونپا گیا اور تیس تفنگچی ان کے ساتھ مقرر ہو گئے۔ وہ قریہ بہ قریہ اور دیہ بہ دیہ دورہ کرتے رہتے، جہاں کوئی امر خلافِ شرع پاتے، اس کا انسداد کرتے۔

راویوں کا بیان ہے کہ تھوڑی ہی مدت میں پورے علاقے کی کایا پلٹ گئی۔ تمام لوگوں نے شریعت کی پابندی اختیار کر لی۔ پتنہ داریاں ٹوٹ گئیں۔ مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق ہونے لگے۔ اگر

---

[1] بعض اصحاب نے لکھا کہ ملا سید امیر (ملا صاحب کوٹھا) کو قاضی القضاۃ بنایا گیا تھا۔ یہ صحیح نہیں۔ ملا صاحب ممدوح کے نام ۱۵۔ شعبان ۱۲۴۴ھ کو جو قضا نامہ صادر ہوا تھا، اس میں صاف مرقوم ہے کہ صاحب موصوف کو "قریہ کوٹھا ضلع ادتمان زئی" کے لیے منصبِ قضا پر مقرر کیا گیا۔ اسی طرح ملا صفی اللہ تشیوہ کے قاضی مقرر ہوئے تھے۔ قاضی القضاۃ ملا سید حبان تھے، جو اپنی شہادت تک اسی عہدے پر مامور رہے۔

ملا قطب الدین کے آدمی دوسرے کام کے سلسلے میں بھی کسی گاؤں میں جاتے تو گاؤں والے دوڑے ہوئے آتے اور بتاتے کہ یہاں کوئی بے نماز نہیں رہا۔

اشرف خاں، فتح خاں اور خادے خاں کا بیعت نامہ

اشرف خاں، خادے خاں اور فتح خاں نے مشترکہ بیعت نامہ سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس کے اہم اجزا یہ تھے:

۱ - ہمارے قبائل میں جو مراسم خلاف شریعت رائج ہیں، ہم ان سب سے دست بردار ہو کر احکام شرع قبول کرتے ہیں۔

۲ - ہم نے نظام شرع کے اجرا کے لیے سید صاحب کو برضا و رغبت اپنا امام بنایا ہے اور آپ کے دست مبارک پر بیعت کی ہے۔

۳ - ہم پہلے بھی بیعت کر چکے تھے، اب علماء کے روبرو اس کی تجدید کی ہے۔ حضرت سے درخواست ہے کہ ہمارے لیے دعائے استقامت فرماتے رہیں تاکہ ہمارا جینا اور مرنا قانون اسلام اور سنت سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہو۔

بیعت شریعت کی برکات

بیعت اقامت شریعت کے برکات و حسنات کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے آج ہمارے سامنے پورے واقعات کا نقشہ نہیں، صرف متفرق روایتیں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر بیعت سے تین ماہ بعد فتح خاں پنجتاری کے سوار گردوپیش کے علاقے کا دورہ کر رہے تھے۔ گڈھ اور پنج پیر میں انھیں تقریباً ایک سو مویشی ادھر ادھر پھرتے نظر آئے اور انھیں ہانک کر پنجتار لے گئے۔ جانتے ہی خان کو اس واقعے کی اطلاع دی۔ اس نے فوراً گڈھ اور پنج پیر کے باشندوں کو خط لکھا کہ میرے سواروں سے غلط فہمی کی بنا پر یہ حرکت سرزد ہوئی۔ ہم لوگ قدیم افغانی مراسم اور جاہلیت کے معمولات سے تائب ہو چکے ہیں۔ آپ لوگوں سے عرض ہے کہ بے تکلف آئیں اور اپنے جانور لے جائیں:

از ضمان مال خود بہ زودی گردن این جانب	مجھے اس مال کے بارِ ضمانت سے جلد از جلد
را خلاص کنید کہ وقت موت کسے را معلوم	سبک دوش فرمائیے، موت کا وقت کسی کو
نیست مبادا این جانب را ساعت موت	معلوم نہیں، مبادا میرے چل چلاؤ کا وقت
برسد و دریں مظلمہ گرفتار ماند[1]	آ جائے اور اس ظلم میں گرفتار رہوں۔

---

[1] مکاتیب شاہ اسماعیل صفحہ ۴۴

یہی افغان تھے جو بیعت شریعت سے پہلے اس قسم کے تصرفات کو اپنا قومی حق سمجھتے تھے اور پورے علاقۂ سرحد میں اخذ و سلب کے ایسے واقعات کا بازار گرم تھا۔

مجرموں کو سزائیں

افغانوں کا عام شیوہ یہ تھا کہ اگر کوئی شخص ارتکاب جرم کے بعد بھاگ کر دوسرے گاؤں میں چلا جاتا تو وہاں کے لوگ اس کی حفاظت کے ذمہ دار بن جاتے۔ پھر حاکم بھی لشکر لے کر چڑھائی کر دیتا تو اسے حوالے نہ کرتے اور مجرم کی ناواجب طرف داری میں صرف اموال و نفوس کو مقتضائے غیرت و حمیت سمجھتے۔ اس قسم کے بے شمار واقعات پیش آ چکے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مظلوموں کے طرفدار، مجرموں کو پناہ دینے والوں کی ایذا میں کوشاں رہتے۔ اس طرح تمام آبادیوں میں رزم و پیکار کا لامتناہی سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ سید صاحب نے تمام دیہات میں آدمی بھیج کر اس نوع کے پناہ گیر مجرموں کی فہرستیں تیار کرائیں۔ پھر جگہ جگہ اپنے آدمی بھیج کر مجرموں کو پکڑوا بلایا اور سب کو شرعی سزائیں دے کر تمام منازعات ختم کر دیے۔ چونکہ پناہ گیری کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی، اس لیے جگہ جگہ سے جرائم کا استیصال ہو گیا۔

مانیری کا واقعہ

اس سلسلے میں مانیری کا واقعہ خاص توجہ کا محتاج ہے۔ مانیری درۂ پنجتار سے باہر صوابی کے قریب ایک بڑی بستی ہے۔ "منظورہ" کے بیان کے مطابق سید صاحب کے زمانے میں تنہا اس بستی کے ایک ہزار تفنگچی تھے اور ان کے جو ہم قوم آس پاس کے دیہات میں آباد تھے، ان میں سے بھی لڑنے والوں کی تعداد چھ ہزار سے کم نہ ہو گی۔ سید صاحب سے نوے برس پیشتر اس بستی کے مختلف افراد میں کشمکش بپا ہوئی اور اس میں بعض مالکان اراضی نکل کر دوسرے مواضع میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ ان کی زمینیں غصب کر لی گئیں۔ مخرجین نے باہر سے کمک کا بندوبست کر کے بستی پر حملہ کیا، لیکن شکست کھا گئے۔ اس وقت سے کشت و خون کا ایک سلسلہ جاری ہو گیا۔ مخرجین جب موقع پاتے، چڑھائی کر دیتے۔ اہل مانیری کو حالات سازگار ملتے تو وہ بھی جوابی یورشوں میں تامل نہ کرتے۔ نوے برس کے ہنگامۂ حرب و ضرب میں کم و بیش چار ہزار آدمی مارے گئے۔ مالی نقصان کا حساب ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

بیعت اقامت شریعت کے بعد سید صاحب نے مانیری اور آس پاس کے تمام خوانین کو بلا کر پورے حالات دریافت کیے۔ جب معلوم ہو گیا کہ مخرجین مظلوم ہیں تو آپ نے حکم دے دیا کہ زمینیں ان کے حوالے کر دی جائیں۔ اہل مانیری خود بھی بڑے سرکش تھے اور خادے خاں رئیس ہنڈ ان کا طرفدار تھا جو خوانین سمہ میں بڑا اچابر اور طاقتور سردار مانا جاتا تھا۔ انھوں نے سید صاحب کا حکم ماننے سے انکار

کر دیا اور عذر یہ پیش کیا کہ افغانوں کا مسلمہ دستور اس کے خلاف ہے۔ دستور یہ ہے کہ جب کسی مغصوبہ مال کے سلسلے میں کشت و خون تک نوبت پہنچ جائے تو اصل مالک کا حق بازیافت زائل ہو جاتا ہے اور ہمارے تصرف کے بعد تو چار ہزار آدمیوں کا خون بہ چکا ہے، پھر ہم زمینیں اصل مالکوں کو کیوں کر دے سکتے ہیں؟

سید صاحب نے مجبور ہو کر علماء سے مسئلہ پوچھا۔ انھوں نے فتویٰ دیا کہ اہل مانیری کا خون مباح ہے۔ سید صاحب نے لڑائی کا حکم دے دیا۔ جو فوج مانیری پہنچی، اس میں ہندوستانیوں کے علاوہ فتح خاں پنجتاری، اشرف خاں رئیس زیدہ اور قوم مندن کے جوان بھی شریک تھے۔ یہ حالت دیکھ کر اہل مانیری پریشان ہو گئے اور پوری زمینیں اصل مالکوں کو دے دیں۔ اس طرح نوے برس کا سلسلہ کشت و خون منقطع ہُوا۔

خادے خاں کی برگشتگی

یہ بڑی مبارک ساعت تھی، جس میں اہل سرحد کے تمام منازعات کا استیصال شروع ہو گیا تھا، لیکن اسی وقت سے خادے خاں اور سید صاحب کے درمیان ملال و کدورت کا ایک پردہ حائل ہو گیا، جس نے انجام کار خادے خاں کو سید صاحب کی تحریک خدمت دین کا جانی دشمن بنا دیا۔ میرا تاثر یہ ہے کہ خادے خاں کے جذبات عقیدت میں جنگ شیدو کے بعد ہی افسردگی پیدا ہونے لگی تھی۔ شاید اس لیے کہ سید صاحب ہنڈ کے بجائے پنجتار کو مرکز بنانے کا فیصلہ فرما چکے تھے اور خادے خاں کو یہ پسند نہ تھا کہ اس کا رقیب فتح خاں سید صاحب کی نظروں میں مدار اعتماد بنے۔ یا شاید اس لیے کہ سید صاحب للہیت کے جس مسلک پر گامزن تھے، وہ خادے خاں کے فہم سے بالا تھا۔ جب سید صاحب خہر میں تھے تو فتح خاں اور اشرف خاں کی طرف سے برابر عقیدت کے معروضے پہنچتے رہے۔ خادے خاں کی جانب سے کوئی عقیدت نامہ نہ بھیجا گیا۔ بایں ہمہ سید صاحب نے اس کے ساتھ تعلق منقطع نہ کیا۔ بیعت اقامت شریعت میں بھی اسے بلایا، تمام مشوروں میں بھی شریک رکھا اور اظہار اطاعت میں وہ فتح خاں کا شریک رہا۔ واقعہ مانیری کے بعد وہ سید صاحب سے بگڑ بیٹھا، یعنی احکام شریعت کی پیروی کا اقرار کر لینے کے باوجود افغانیت اور اس کے جاہلانہ مراسم پر وہ بدستور قائم رہا۔

ایک سوال

اب صرف ایک سوال باقی رہ گیا اور وہ یہ کہ آیا بیعت اقامت شریعت کے بعد سید صاحب کے اختیارات فرمانروائی میں کوئی اضافہ ہُوا؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ بیعت امامت نے سید کو نظم قوائے جہاد کا مجاز بنایا تھا۔ بیعت اقامت شریعت کے رو سے وہ احکام شرعی کا مرکز بن گئے۔ رؤسا و خوانین کے اختیارات پر صرف اس حد تک پابندیاں عائد ہوئیں، جو از روئے شریعت حقہ ضروری تھیں، لیکن ان کی ریاستیں اور سرداریاں بدستور قائم رہیں۔

آٹھواں باب

مرکز پنجتار

سرگزشت پنجتار

پنجتار خدو خیل کا مرکزی مقام ہے، جو ضلع مردان کے شمالی و مغربی گوشے سے متصل ایک پہاڑی علاقہ ہے۔ سید صاحب پہلے پہل جنگ شیدو کے بعد اس علاقے میں پہنچے تھے اور دورۂ سوات کے بعد انھوں نے پنجتار میں سکونت اختیار کی تھی۔ پھر خہر چلے گئے اور دیر تک مقیم رہے۔ وہاں سے واپس ہوئے تو پنجتار کو مستقل مرکز بنا لیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مرکز کے حالات بھی بیان کر دیے جائیں۔

ابتدا ہی میں عرض کر دینا چاہیے کہ جس پنجتار نے سید صاحب کے ساتھ شرف انتساب سے شہرت کے ایوانوں میں جگہ پائی، جس کے در و بام میں اس پاک نفس داعی حق کی حیات مہاجرت کے بیشتر اوقات صرف ہوئے، وہ مدت ہوئی مٹ چکا ہے۔ فتح خاں کی وفات پر اس کا بیٹا مقرب خاں خدو خیل کا سردار بنا۔ اگرچہ پنجتار کو مجاہدین برسوں پیشتر چھوڑ چکے تھے لیکن سرحد میں جابجا ان کی چوکیاں بنی ہوئی تھیں۔ ۱۸۵۸ء میں انگریزوں نے ان تمام مقامات کو تباہ کر دینے کا فیصلہ کر لیا، جو مجاہدین کے مامن رہ چکے تھے یا بن سکتے تھے۔ اس سلسلے میں پنجتار پر بھی چڑھائی ہوئی۔ توتالی کے باشندے مقرب خاں سے بگڑے بیٹھے تھے۔ وہ انگریزی فوج کے ہراول بن گئے۔ مقرب خاں چنگلئی چلا گیا۔ پنجتار کو خالی کر دیا گیا۔ توتالی کے باشندوں نے انگریزوں کی ہدایت کے مطابق خالی مکانوں کو آگ لگا دی۔ دیواریں باقی رہ گئی تھیں، انگریزوں نے پاس کے ایک ٹیلے پر، جس کا نام برہ مند (یا برہ مان) ہے، توپیں لگا کر دیواروں کو بھی تہس نہس کر ڈالا اور پنجتار کی جگہ ملبے کے ڈھیر رہ گئے۔ باغ ویران ہو گئے۔ درخت جلا دیے یا کاٹ ڈالے اور حکم دے دیا کہ وہاں دوبارہ کوئی مکان نہ بنے۔ توتالی کے بعض لوگوں نے مختلف زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ وہ کھیتی باڑی کرتے تھے، لیکن ان کی سکونت توتالی ہی میں تھی۔

نئے سرے سے آبادی

ساٹھ برس گزر گئے اور پنجتار کے مقام پر ایک جھونپڑی بھی نہ بن سکی۔ ۱۹۱۸ء میں سید عبدالجبار شاہ صاحب ستھانوی نے، جو اس زمانے میں ریاست امب کے وزیر تھے، احیاء اسلامیت کے اس مرکز کو نئے سرے سے آباد کرنے کا ارادہ فرمایا، وہ خود صاحب

کی فوج کے ساتھ پنجتار پہنچے۔ اس وقت توتالی کا ایک شخص، عبد الرحمٰن، زمینوں پر قابض تھا۔ سید عبد الجبار شاہ نے اس سے زمینیں واگزار کرائیں اور فتح خاں کے ایک پوتے کو بلا کر قبضہ دلا دیا، نیز اپنے سامنے مکان تعمیر کرا دیے۔ پھر فتح خاں کے دوسرے اخلاف بھی آہستہ آہستہ وہاں پہنچ گئے اور پرانے مکانوں کے ملبے پر پھر ایک مختصر سی آبادی صورت پذیر ہوئی۔ میں نے ستمبر ۱۹۴۹ء میں اسے دیکھا تھا۔ یہ آبادی قدیم کے صرف شمالی و مغربی گوشے تک محدود ہے اور شکست و ریخت کے آثار گرد و پیش اتنے نمایاں ہیں کہ پنجتار فی الجملہ کھنڈروں کا ذخیرہ معلوم ہوتا ہے۔

تحقیق احوال کی مشکلات

ان حالات میں پرانی آبادی کی وسعت و کیفیت کا سراغ ٹھیک ٹھیک لگا لینا سہل نہیں۔ پنجتار کے مکانوں کی حیثیت عہد قدیم کے تاریخی شہروں جیسی نہ تھی، جن کے نقشے آثار کی کھدائی سے تیار کر لیے گئے۔ معمولی حیثیت کے مکان تھے، انہدام کے بعد ساٹھ برس تک وہاں کسی کو جھونپڑی تک بنانے کی اجازت نہ دی گئی تو اصل آبادی کی سطح پر ملبہ خاصی دبیز تہ کی شکل میں جم گیا۔ اس وجہ سے یقینی طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ سید صاحب کے زمانے کا پنجتار کیسا تھا۔ تاہم مجھے جو معلومات مختلف روایتوں سے مل سکیں، انھیں اپنے خیال کے مطابق بصورت مرتب پیش کر دینا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے یہ معلومات آیندہ کے لیے ارباب تحقیق کو ایک مشعل کا کام دے سکیں اور ان کی روشنی میں مزید تفصیلات کا کھوج لگایا جا سکے۔ اگر کوئی نئی بات معلوم نہ بھی ہو سکے تو یہ نقشہ تو بہر حال محفوظ ہو جانا چاہیے، جو اگرچہ ایک حد تک قیاس کے موقلم سے تیار ہوا ہے، تاہم اس کے متعلق بنیادی معلومات مستند روایات سے حاصل کی گئی ہیں اور احیاء اسلامیت کی سرگزشت میں اس مقام کو جو بلند حیثیت حاصل ہے، اس کا مقابلہ پاکستان و ہند کے اکثر شہر نہیں کر سکتے، جن کی عظمت کے افسانے عام تاریخوں کے صفحات کی زینت ہیں۔

موقع اور محل

پنجتار پہاڑوں کے بیچ میں خاصا محفوظ مقام ہے۔ یہ ایک نالے کے مشرقی کنارے پر واقع ہے، جو شمالی سمت سے بہتا ہوا آیا ہے اور توتالی کے پاس پہاڑوں سے باہر نکلا ہے۔ پھر صوابی، اونچ بیر اور زیدہ ہوتا ہوا ہنڈ سے ذرا آگے بڑھ کر دریائے سندھ میں مل گیا ہے۔ عام لوگ اسے نالہ کہتے ہیں، اہل علم "درۂ خدو خیل" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ میدانی علاقے میں اس کا نام "بدرئی" ہے[1]

---

[1] پشتو میں نالے کو "درہ" بھی کہتے ہیں اور "خوڑ" بھی (بروزن گھُڑ)۔ توتالی کے ایک عالم سے معلوم ہوا کہ علاقہ خدو خیل سے متصل کی میدانی آبادیوں کی زبان میں "بدرئی" کے معنی بھی نالے کے ہیں، اگر یہ درست ہے تو "بدرئی" کو معرفہ نہیں بلکہ نکرہ سمجھنا چاہیے۔

عام پہاڑی نالوں کی طرح بدرئی میں بھی اطراف سے نالے آ آکر ملے ہیں۔ مثلاً ایک نالہ پنجتار کے مشرق سے آیا ہے اور آبادی کے شمالی و مغربی گوشے میں بدرئی میں گرا ہے۔ اسی کی ایک شاخ پنجتار کی زمینوں کے جنوبی حصے سے گزرتی ہوئی، نیچے آکر بدرئی میں شامل ہوئی ہے۔ اس طرح پنجتار ایک مثلث جزیرہ بن گیا ہے۔

آبادی کا مقام اور اس سے متصل زمینیں، اطراف کے مقامات سے ڈیڑھ دو سو فٹ بلند ہوں گی موقع اور محل کی اس توضیح کو سامنے رکھا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ پرانے زمانے میں جن وسائل تحفظ کو خاص اہمیت حاصل تھی، چونکہ وہ پنجتار میں بوجہ اتم مہیا تھے، شاید اسی لیے یہ مقام خدو خیل کا مرکز بنا۔

عام حالات

وجہ تسمیہ کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ مختلف اصحاب نے بتایا کہ اس مقام کو چونکہ آس پاس کی پانچ آبادیوں میں مرکزی حیثیت حاصل تھی، اس وجہ سے پنجتار کہنے لگے[1] پنجتار سے میل ڈیڑھ میل شمال میں قاسم خیل نالے کے مشرقی کنارے پر، غورغشتی جنوب مغرب میں نالے کے غربی کنارے پر، اس کے قریب جنوب مغرب میں سنگ ٹبئی، مزید جنوب میں خلی کلی۔ سنگ ٹبئی اب باقی نہیں رہا، صرف اس کا نشان رہ گیا ہے۔

پنجتار کے مشرق اور جنوب میں ہموار کھیت ہیں۔ جنوبی و مغربی حصے میں پہلے ایک باغ تھا، جسے دیوان شاہ کا باغ کہتے تھے، اب اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ اس کے قریب ہی پنجتار کا قبرستان تھا، جو غازی زمانۂ قیام پنجتار میں فوت ہوتے رہے، وہ سب اسی قبرستان میں دفن ہوئے۔ اب اس مقام پر توت کے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آتا ہے۔

پنجتار کے شمال میں کوئی آدھ میل کے فاصلے پر نالے کے مشرقی کنارے پر ایک ٹیلہ ہے جو اوپر سے ہموار ہے۔ یہاں سید صاحب نے توپیں رکھوائی تھیں، پاس ہی ایک مکان توپچیوں کے رہنے کے لیے، نیز ایک میگزین بنوا دیا تھا۔ آبادی کے مغرب میں نالے سے گزر کر ایک جگہ آتی ہے، جہاں پہلے شیشم کے درخت تھے۔ یہیں جمعہ اور عیدین کی نمازیں ہوتی تھیں۔ اسی جگہ بیعت شریعت کے لیے اجتماع منعقد ہوا تھا۔ میں سرسری طور پر بتا چکا ہوں کہ اب شیشم کے درخت باقی نہیں رہے، ببول وغیرہ کے درخت اگ آئے ہیں اور آس پاس کی زمین میں ریت ہی ریت نظر آتی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ

---

[1] ضلع ہزارہ میں ایک مقام "سہ تار" بھی ہے اور ایک "دو تار" بھی۔

نالے میں ایک مرتبہ سخت طغیانی آئی تھی، جس میں زمین بہ گئی۔ پانی کم ہُوا تو ریت رہ گئی۔ اس جگہ سے پہاڑ کی مغربی دیوار تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر ہوگی۔ مقابل کے ٹیلے کو مقامی لوگ "ستے" کہتے ہیں۔ اسی میدان میں گھوڑ دوڑ ہوتی تھی، اسی جگہ غازی نیزہ بازی، چاند ماری اور قواعد کرتے تھے۔

گرد و پیش

درے کے دہانے سے پنجتار کا فاصلہ چار میل ہوگا۔ آنے جانے کا عام راستہ نالے کے ساتھ ساتھ ہے۔ لوگ پہلے پیدل یا گھوڑوں پر جاتے تھے، اب پنجتار کے سامنے تک موٹر بھی چلی جاتی ہے۔ لیکن موضع چونکہ بلندی پر واقع ہے، اس لیے بدرئی کے مغربی کنارے پر موٹر سے اُتر کر باقی فاصلہ پیدل طے کرنا پڑتا ہے۔

پنجتار کے جنوب میں غلی کلئی کے سامنے ایک ٹیلہ آس پاس کے پہاڑی علاقے سے چند سو فٹ بلند ہو گیا ہے۔ اس کا مقامی نام برہ مند (برہ مان یا بہرہ مان) کی ڈھیری ہے۔ اسی پر انگریزوں نے ۱۸۵۸ء میں توپیں نصب کر کے پنجتار کو تباہ کیا تھا۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر مشرق میں ایک اور پہاڑ ہے جو آس پاس کی سطح سے بلند ہے۔ اسے رانی کوٹ کا ٹیلہ کہتے ہیں۔ برہ مند کی جانب جنوب دہانۂ درہ کے مشرقی گوشے میں توتالی ہے۔ رانی کوٹ اور برہ مند کے بیچ میں سے ایک پگ ڈنڈی بھی توتالی سے پنجتار جاتی ہے لیکن اس سے صرف پیدل جا آ سکتے ہیں۔ توتالی کے قریب بھی ایک چھوٹا سا ٹیلہ ہے۔ اس پر چڑھ کر دیکھیں تو پنجتار کا ایک ایک مکان صاف نظر آتا ہے۔ توتالی سے جنوب میں مانیری اور جنوب مشرق میں ڈاگئی ہے۔ نقشہ سامنے رکھ کر ان مقامات کو بہ غور دیکھ لینا چاہیے، تاکہ اس سلسلے کے تمام حالات کو سمجھنے میں دقت پیش نہ آئے۔

پُرانی آبادی کی کیفیت

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، پرانی آبادیٔ جزیرۂ پنجتار کے شمالی و مغربی گوشے میں تھی، مجاہدین جب پہلے پہل پنجتار پہنچے تو فتح خاں نے ان کے لیے کئی مکان خالی کرا دیے تھے۔ کچھ غازی اپنے بھیلوں سمیت ان مکانوں میں ٹھہر گئے۔ جنھیں مکان نہ مل سکے، انھیں مختلف آبادیوں میں ٹھہرایا گیا یا وہ خیموں اور چھپروں میں رہتے تھے۔ بعد میں سید صاحب نے پنجتار کی آبادی کے جنوب میں مجاہدین کے لیے ایک نئی آبادی کا انتظام کر لیا۔ وہاں ایک مسجد بھی بنائی اس آبادی، مسجد اور ساتھ کے کنوئیں کے آثار اب تک موجود ہیں۔ فتح خاں نے اپنے لیے پنجتار میں ایک مکان محفوظ رکھا تھا، لیکن وہ زیادہ تر باہر رہتا تھا۔

پوری آبادی کے اردگرد سنگین فصیل تھی، جس کے چاروں کونوں پر چار بُرج تھے۔ فصیل کے طول و عرض کی نسبت مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اس کا دروازہ مشرقی دیوار میں تھا۔

ابتدائی سکونت کا نقشہ ابتدا میں سید صاحب شمالی و مشرقی بُرج میں مقیم ہُوئے۔ اس کے قریب ہی آپ کی جماعت کے افراد رہتے تھے جس کا نام جماعت خاص تھا۔ بُرج کے سامنے جو میدان تھا، اس میں ایک چھپر ڈال لیا گیا تھا۔ اس میں سید صاحب کا پلنگ بچھا رہتا تھا، اس کے آس پاس سید اسماعیل بریلوی اور شیخ عبدالحکیم پھلتی کے ڈیرے تھے، جو جماعت خاص کے آدمی تھے۔ غالباً اسی چھپر میں سید صاحب ملاقاتیں کرتے تھے اور اسی میں مجالس شوریٰ منعقد ہوتی تھیں، شمالی و مغربی برج میں سید صاحب کا باورچی خانہ اور اس کے پاس ہی غلے کا گودام تھا۔

دونوں برجوں کے درمیان مکانوں کی ایک قطار تھی، جن میں مشرقی سمت سے مغربی سمت تک مندرجہ ذیل اصحاب رہتے تھے:

۱۔ مولوی وارث علی بنگالی، جو بڑے جید عالم اور پرہیزگار بزرگ تھے۔
۲۔ مولوی امام الدین بنگالی، جو باعمل عالم اور بے مثال صوفی تھے۔
۳۔ سید احمد علی بریلوی، جو سید صاحب کے خواہرزادہ تھے۔
۴۔ سید ابو محمد نصیر آبادی، جو سید صاحب کے اقربا میں سے تھے۔
۵۔ دادا سید ابوالحسن نصیر آبادی علم دار لشکر اسلام۔ یہ بھی سید صاحب کے اقربا میں سے تھے۔
۶۔ سید حسن مثنیٰ عرف سید موسیٰ، ابن سید احمد علی۔

سید احمد علی کے مکان کے جنوب میں امان اللہ خاں لکھنوی کا مکان تھا۔ اس سے جنوبی اور مشرقی سمت میں جو مکان تھے، ان میں حافظ جانی، حافظ مانی، قاضی حمایت اللہ، قاضی برہان الدین اور شیخ عبدالوہاب رہتے تھے۔ مشرقی دروازے کے ساتھ ہی جنوبی سمت میں مسجد تھی۔ اس کے پاس قاضی احمد اللہ ناگپوری کا مکان تھا۔ جنوبی و مشرقی بُرج میں مولانا شاہ اسماعیل رہتے تھے اور جنوبی و مغربی بُرج میں مولوی مظہر علی۔ باورچی خانے کے جنوب میں فصیل کی مغربی دیوار سے ملا ہُوا فتح خاں کا مکان تھا۔ اس کے قریب مشرق میں مسجد تھی جو اب تک موجود ہے۔ فتح خاں کے مکان اور مسجد کے جنوب میں پیر خاں مورائیں کی قیامگاہ اور منشی خانہ تھے۔ اسی جگہ قاضی احمد اللہ میرٹھی مقیم تھے۔ گودام کے پاس فتح خاں کے مکان میں شیخ ولی محمد پھلتی مع جماعت رہتے تھے۔ وہی توشہ خانے کے ناظم تھے۔

بیرونی آبادی جس حد تک میں تحقیق کر سکا ہُوں، مشرقی دیوار کے باہر شتر خانہ اور اصطبل تھا۔ سید صاحب کی فرودگاہ کے سامنے مشرقی سمت میں فصیل سے باہر ابراہیم خاں خیرآبادی اور ان کے بھائی امام خاں اپنے اپنے بیلوں سمیت رہتے تھے۔ ان سے متصل شیخ حسن علی اپنے

بیٹے اور بھائیوں سمیت مقیم تھے۔ یہ دونوں خاندان ایسے تھے، جن میں کے ہر فرد نے اس دنیا کی ہر چیز راہِ حق میں قربان کر دی تھی۔ تفصیل اس کتاب کی تیسری جلد میں ملے گی۔ ان کے قریب ہی صوفی نور محمد بنگالی، مولوی خیر الدین شیر کوٹی اور شیخ صلاح الدین پھلتی کے ڈیرے تھے۔

باقی غازیوں کی فرودگاہوں کا نقشہ یہ تھا:

۱ - میرزا احمد بیگ پنجابی اپنے ہمراہیوں سمیت درختوں کے اس جھنڈ میں رہتے تھے، جہاں جمعہ اور عیدین کی نمازیں ہوتی تھیں۔

۲ - ارباب بہرام خاں، ان کے بھائی ارباب جمعہ خاں اور بھتیجا محمد خاں اہل و عیال سمیت شہتوت کے اس باغ میں مقیم تھے جو پنجتار کے جنوب مغرب میں ایک تیر کی زد پر تھا۔

۳ - حاجی زین العابدین خاں اپنے ہمراہیوں اور چند قندھاریوں سمیت قاسم خیل میں تھے۔ بعد ازاں مولوی احمد اللہ ناگپوری اور مولوی خیر الدین شیر کوٹی نے سید صاحب کے ارشاد کے مطابق قاسم خیل میں گولے ڈھالنے کا ایک کارخانہ بنا لیا تھا، جس میں ڈیڑھ سیر، تین سیر اور پانچ سیر کے گولے ڈھلتے تھے۔

۴ - حاجی حمزہ علی خاں ساکن لہاری کے رفقا غورغشتی میں تھے، اسی گاؤں کے جنوبی حصے میں مولوی نصیر الدین منگلوری مع جماعت رہتے تھے۔

۵ - قندھاری جماعت سنگ بٹی میں تھی۔ اس جماعت کے چار بڑے سردار تھے: ملا لعل محمد، ملا قطب الدین، ملا نور محمد اور ملا عزت۔

۶ - متفرق قندھاری خلی کلئی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

۷ - متفرق ہندوستانی پنجتار کے اندر مکانوں میں یا باہر چھپر ڈال کر جا بجا مقیم ہو گئے تھے۔

نئی آبادی

جو اصحاب باہر چھپروں یا خیموں میں رہتے تھے، انھیں دھوپ اور بارش میں بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ اس وجہ سے سید صاحب نے آہستہ آہستہ سب کے لیے مکان بنا دینے کا فیصلہ فرما لیا۔ آپ ایک روز نالے سے واپس ہوتے وقت دو پتھر اٹھا لائے۔ غازیوں نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا کہ جو شخص باہر جاتا وہ کم سے کم دو پتھر ضرور لے آتا۔ تھوڑے دنوں میں ایک بڑا انبار جمع ہو گیا۔ سب سے پہلے سید صاحب کے لیے گارے سے دس ہاتھ لمبا دالان بنایا گیا، جس میں قبلہ رخ تین دروازے تھے۔ یہ مکان غالباً آبادی کے جنوب میں تھا۔ اس کے سامنے چھپر کا سائبان بنا دیا گیا۔ اسی طرح دوسرے غازیوں کے لیے مکان بن گئے۔ اس نئی آبادی میں بھی ایک

مسجد بنالی گئی اور ایک کنواں کھود لیا گیا۔ مسجد اور کنوئیں کے نشانات اب تک پنجتار کی موجودہ آبادی کے جنوب میں موجود ہیں۔ ان مکانوں میں وہ لوگ منتقل ہو گئے، جو پہلے چھپروں اور ڈیروں میں رہتے تھے یا جن کے لیے آبادی کے اندر جگہ ناکافی تھی۔ فصیل کے شمالی و مشرقی بُرج میں بھی سید صاحب وقتاً فوقتاً استراحت فرمایا کرتے تھے۔ بستی سے خاصے فاصلے پر مشرق میں بارود کا میگزین بنا دیا گیا تھا۔ پاس ہی بارود سازی کا کارخانہ تھا۔

نظامِ رسد

جب تک عُشر کی باقاعدہ تحصیل کا انتظام نہیں ہُوا تھا، غازی یا تو اپنے ہاتھ سے غلّہ پیستے تھے یا اُجرت دے کر پسوا لیتے تھے۔ بعد میں غلّے کی فراوانی ہو گئی تو موضع مینئی میں پانچ پن چکیاں سید صاحب نے اپنے انتظام میں لے لیں اور سید حامد علی جھنجھانوی کو پچیس تیس غازیوں کا سردار بنا کر مینئی میں بھیج دیا۔ وہاں کے خان نے ان کے لیے تین مکان خالی کرا دیے، ایک میں غلّہ جمع رہتا؎ دوسرے میں آٹا اور تیسرے میں غازی رہتے تھے۔ گندم کی پسوائی ایک سیر دس چھٹانک فی من اور مکّی کی پسوائی اڑھائی سیر فی من مقرر ہو گئی۔ پنجتار سے غلّہ اونٹوں اور خچروں پر لاد کر مینئی بھیج دیا جاتا اور وہاں سے آٹا پس کر آجاتا۔

ابتدا میں ہر غازی کی مقررہ رسد روزانہ تین پاؤ آٹا اور مٹھی بھر دال تھی۔ اوقاتِ عسرت میں تناسب سے مقدار گھٹا دی جاتی۔ جب عُشر کا غلّہ باقاعدہ وصول ہونے لگا تو یومیہ رسد ایک سیر کر دی گئی۔ سید صاحب اپنے لیے بھی عام غازیوں کے برابر رسد لیتے تھے۔ لیکن چونکہ آپ کے پاس مہمان آتے رہتے تھے، اس لیے کھانے کا انتظام الگ کرنا پڑا، جتنے مہمان آتے فی کس کے حساب سے اتنی ہی زائد رسد لے لیتے۔

متفرق اُمور

جماعت متعدد بھیلوں میں منقسم تھی۔ ہر بھیلے میں کم سے کم بیس اور زیادہ سے زیادہ پچیس آدمی ہوتے تھے۔ پورے بھیلے کے آدمیوں کا کھانا ایک جگہ پکتا۔ جب تک مینئی میں آٹا پسوانے کا انتظام نہیں ہُوا تھا، بھیلے کے چار آدمی روزانہ باری باری آٹا پیستے، چار آدمی باری باری کھانا پکاتے۔ باقی ندی سے پانی لا دیتے۔ لکڑیاں جنگل سے لائی جاتی تھیں۔ عام دستور یہ تھا کہ بھیلہ دار فارغ آدمیوں کو لے کر جنگل میں چلا جاتا۔ سب کلھاڑیوں سے لکڑی کاٹتے اور پشتارے بنا کر لے آتے۔ ایک ایک وقت میں بارہ بارہ چودہ چودہ پشتارے آجاتے، جو کئی دن کے لیے کفایت کرتے۔

سید صاحب کے باورچی خانے کا انتظام قادر بخش گنج پوری کے حوالے تھا۔ جب اس باورچی خانے کا ایندھن ختم ہونے لگتا تو سید صاحب صبح کی نماز کے بعد لشکر کے ان تمام آدمیوں کو ساتھ لے لیتے جو کام کاج سے فارغ ہوتے۔ خود بھی برابر لکڑیاں کاٹتے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غازی تھک کر

تھوڑی دیر کے لیے سستانے لگتے، لیکن سید صاحب متواتر لکڑیاں کاٹنے میں لگے رہتے۔ اس طرح ایک وقت میں کئی روز کے لیے ایندھن آ جاتا۔ اگر کسی دن کھانا پک چکنے کے بعد مہمان آ جاتے تو سید صاحب مختلف بھیلوں سے تھوڑا تھوڑا کھانا منگا لیتے۔ بعض اوقات خود کچھ نہ کھاتے یا کسی بھیلے میں چلے جاتے اور جو پکا ہوتا نوش فرما لیتے۔

تقسیم لباس کا یہ دستور تھا کہ سال بھر میں ہر غازی کو دو جوڑے جوتے اور تین جوڑے کھادی کے موٹے کپڑے ضرور ملتے تھے۔ اگر کسی کے کپڑے جلد پھٹ جاتے یا گم ہو جاتے تو اسے نئے کپڑے دے دیے جاتے۔ سردیوں کے لیے ہر ایک کو ایک دگلہ یا میرزئی اور ایک ایک دوہری دی جاتی تھی۔ ہر جمعرات کو کپڑے دھونے کے لیے سراسم دو دو ٹکیاں صابن کی دی جاتیں۔

زندگی کا طریق

غازیوں کی زندگی حد درجہ سادی تھی۔ وہ ہر کام کو عبادت سمجھ کر انجام دیتے تھے۔ سید صاحب کی صحبت سے ان کے اخلاق میں اسلامیت کی سچی جلا پیدا ہو چکی تھی۔ ہر غازی کے نزدیک اپنے بھائیوں کی خدمت مقتضائے اسلامیت تھی۔ چنانچہ جو غازی کپڑے دھونے کے لیے جاتا، وہ اپنے ایک دو ساتھیوں کے کپڑے بھی ساتھ لے جاتا۔ سید صاحب سبقت بالخیر کے سلسلے میں اپنی زندگی کے واقعات بیان کرتے رہتے۔ مثلاً کئی مرتبہ فرمایا کہ جب ہم نواب امیر الدولہ کے لشکر میں تھے تو کپڑے دھونے کے وقت اپنے پانچ سات ساتھیوں کے میلے کپڑوں کا بھی گٹھا باندھ کر لے جاتے۔ ساتھی ہر چند نہیں نہیں کرتے، لیکن ہم ایک نہ سنتے۔

کسی چھوٹے یا بڑے کو کسی کام سے عار نہ تھی۔ میاں جی نظام الدین چشتی لشکر کے بزرگ آدمیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ایک موقع پر غازی کھانا کھا رہے تھے کہ اندھیرا ہو گیا۔ میاں جی فوراً مشعل روشن کر کے کھڑے ہو گئے۔ غازیوں نے ان کی بزرگی کے پیش نظر عرض کیا کہ تکلیف نہ اٹھائیں۔ میاں جی بولے: اگر یہ خدمت موجب ثواب ہے تو مجھے اس سے محروم کیوں رکھنا چاہتے ہو؟

سیّد صاحب کے ارشادات

سیّد صاحب اکثر فرماتے:

> ہمارے جو بھائی محض خدا کے واسطے نیت خالص سے چکی پیستے ہیں، کھانا پکاتے ہیں، لکڑی لاتے ہیں، گھاس کھودتے ہیں، کپڑے سیتے ہیں، اپنے ہاتھ سے کپڑے دھوتے ہیں اور اسی طور کے سب کام کرتے ہیں تو یہ سب عبادت میں داخل ہیں اور یہ کام کرنے حضرت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ کرامؓ سے ثابت ہیں اور سب اولیاء اللہ ایسے ہی کام کرتے آئے ہیں، جتنے موافق شرع کام ہیں۔ کسی کے کرنے میں عار نہیں

> ہونی چاہیے اور ان سب کا اجر خدا تعالیٰ کے ہاں سے ملنا یقینی ہے۔ ۔ ۔ ۔ یہ ہمارے بھائی مسلمان باایمان اپنے گھربار، خویش و تبار، عیش و آرام کو ترک کر کے محض واسطے خوشنودی پروردگار کے اور اتباع رسول مختار صلی اللہ علیہ وسلم کے آئے اور یہ سب ہمارے نزدیک گوہر نایاب اور لعل بے بہا کے ٹکڑے ہیں کہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں میں سے چھنٹ کر آئے ہیں۔ ان کی قدر و منزلت ہم جانتے ہیں، ہر کوئی نہیں پہچانتا[1]

اس قسم کے کلمات فرمانے کے بعد عجز و الحاح سے دعا کرتے کہ خداوندا! ہمیں اور ہمارے مسلمان بھائیوں کو اپنے صراط مستقیم پر حضرت خیرالانامؐ اور صحابہ کرامؓ کے قدم بہ قدم ثابت و قائم رکھ۔

مولوی عبدالوہاب کا واقعہ

مولوی عبدالوہاب لکھنوی کمزور و نحیف آدمی تھے اور مختلف عوارض میں مبتلا تھے۔ سید صاحب نے پنجتار میں انھیں قاسم رسد مقرر فرما دیا۔ قرآن مجید حفظ کر لیا تھا، تقسیم رسد کے ساتھ ساتھ قرآن بھی پڑھتے جاتے۔ مولوی صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ جو پہلے آتا، اسے پہلے دیتے، جو بعد میں آتا بعد میں دیتے۔ بڑے چھوٹے کا امتیاز ہرگز روا نہ رکھتے۔ ایک روز مولوی امام علی عظیم آبادی، جو نو وارد تھے، رسد لینے کے لیے آئے۔ وہ قوی اور جسیم آدمی تھے۔ چونکہ جماعت کے طریقے سے ناواقف تھے، اس لیے اصرار کیا کہ پہلے مجھے رسد دیجیے۔ مولوی عبدالوہاب نے فرمایا کہ باری سے ملے گی۔ انھوں نے غصے میں مولوی صاحب کو دھکا دے دیا اور وہ آٹے پر گر پڑے۔ کچھ قندھاری بھی وہاں موجود تھے، وہ امام علی کو مارنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مولوی عبدالوہاب نے انھیں روک دیا اور کہا: امام علی میرا بھائی ہے، دھکا دیا تو مجھے دیا، آپ لوگ کیوں جوش میں آ گئے؟

شدہ شدہ یہ بات سید صاحب تک پہنچی۔ آپ نے مولوی عبدالوہاب کو بلا کر پوچھا۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ امام علی نیک بخت آدمی ہیں۔ وہ رسد لینے آئے تھے، باری ان کی نہ تھی، انھوں نے جلدی کی اور مجھے دھکا لگ گیا، کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ جب لوگوں نے مولوی صاحب کے عفو و تحمل کی یہ داستان امام علی کو سنائی تو وہ بہت پشیمان ہوئے۔ خود سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی زیادتی کا اقرار کیا اور عرض کیا کہ مولوی صاحب سے میرا جرم معاف کرا دیجیے۔ سچی اسلامی اخوت کے یہ دلکشا مناظر جماعت مجاہدین میں عام تھے۔ انھیں سے سید صاحب کی شان تربیت کا نقشہ معلوم ہو سکتا ہے۔

سید محمد اسحاق گورکھپوری کا واقعہ

غازیوں کی للہیت و اخلاص کا اندازہ شیخ محمد اسحاق گورکھپوری

---

[1] وقائع صفحہ ۹۱۷ - ۹۱۸

کے واقعہ سے ہوگا۔ شیخ صاحب کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ ان کے لیے معاش کا کوئی انتظام نہ تھا۔ لیکن حمیت دین کے جوش میں وہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر سید صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ ایک مرتبہ مولانا شاہ اسماعیل نے وعظ میں "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" کی تفسیر بیان فرمائی۔ شیخ محمد اسحاق مجلس وعظ کے بعد اپنے حجرے کا دروازہ بند کرکے لیٹ گئے، کھانے میں بھی شریک نہ ہوئے۔ سید صاحب نے پاس بٹھا کر کیفیت پوچھی تو صرف اتنا عرض کیا: "میری کم نصیبی ہے کہ آپ جیسے شیخ کامل کی صحبت میں بھی گمراہ ہی رہا"۔ پھر سید صاحب نے مولانا سے وعظ کا موضوع دریافت کرکے شیخ اسحاق سے بات چیت فرمائی۔ اس وقت شیخ نے عرض کیا کہ مولانا کے وعظ سے یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ جس دل میں خدا کی محبت ماسوا پر غالب نہ ہو، وہ ایمان کی لذت سے محروم ہوتا ہے۔ میرے دل سے بیوی بچوں کا خیال جدا نہیں ہوتا۔ کئی تدبیریں کر چکا ہوں، لیکن ناکام رہا۔ اگر ہو سکے تو یہ خیال دل سے نکال دیجیے۔ مولانا نے پوچھا: آیا یہ ممکن ہے کہ بیوی بچوں کی محبت کے جوش میں لشکر اسلام کو چھوڑ کر وطن چلے جاؤ؟ شیخ نے کہا یہ ممکن نہیں۔ مولانا نے فرمایا: پھر میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کے دل میں خدا اور رسول ؐ کی محبت بیوی بچوں کی محبت پر غالب ہے۔ اس کے بعد شیخ نے کھانا کھایا۔

---

[1] منظورہ صفحہ ۱۱۰۶ و ۱۱۰۷

فتح خاں پنجتاری کے اخلاف

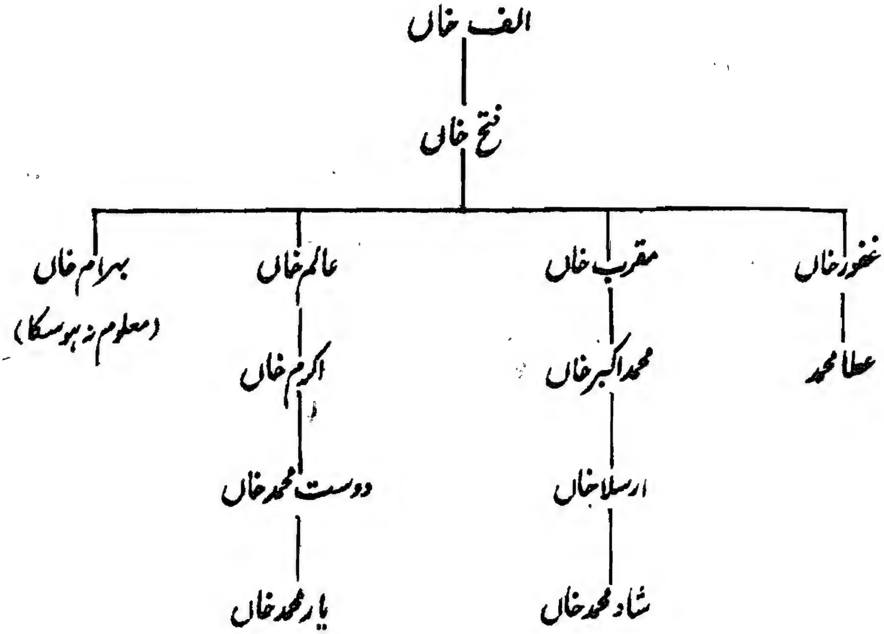
الف خاں
فتح خاں
غفور خاں
مقرب خاں
عالم خاں
بہرام خاں
(معلوم نہ ہوسکا)
عطا محمد
محمد اکبر خاں
ارسلا خاں
شاد محمد خاں
اکرم خاں
دوست محمد خاں
یار محمد خاں

(ان میں سے عطا محمد خاں ابن غفور خاں، دوست محمد خاں ابن اکرم خاں اور یار محمد خاں ابن دوست محمد خاں سے میں پنجتار میں ملا تھا۔)

نواں باب

خادے خاں کا انحراف

خادے خاں کی غلط اندیشی

خادے خاں علاقہ سرحد کا غیور و جسور رئیس تھا۔ سید صاحب کے ساتھ اظہار عقیدت میں سبقت کا شرف حاصل کیا۔ آپ کو مہمان بنا کر اپنے ہاں لے گیا اور وہیں امامت جہاد کی بیعت ہوئی۔ لیکن نہایت افسوس کا مقام ہے کہ سید صاحب کی مخالفت میں بھی پہل اسی سے ہوئی۔ اس انحراف کے مندرجہ ذیل وجوہ ذہن میں آتے ہیں:

۱۔ اس کی طبیعت ضدی اور خود پسند تھی۔ افغانی مراسم کو وہ اسلامی تقاضوں پر ترجیح دیتا تھا۔

۲۔ فتح خاں پنجتاری اور اشرف خاں رئیس زیدہ کو وہ رقیب سمجھتا تھا۔ سید صاحب چونکہ اول الذکر دونوں رئیسوں کو بہت اچھا سمجھتے تھے، اس وجہ سے خادے خاں کے دل میں اک گونہ برگشتگی پیدا ہو گئی، جو برابر بڑھتی رہی۔

۳۔ ہنڈ کو چھوڑ کر پنجتار کو مرکز مجاہدین بنا لینے کے باعث فتح خاں پنجتاری کا اعزاز بہت بڑھ گیا۔ خادے خاں کو یہ اعزاز قطعاً پسند نہ تھا۔

۴۔ سب سے آخر میں مانیری کے واقعہ نے اس کی آتش غیظ کو ہوا دے کر بھڑکا دیا۔ مانیری کی زمینوں کو بیعت شریعت کے بعد جن لوگوں کے قبضے سے نکال کر اصل مالکوں کے حوالے کیا گیا تھا، وہ خادے خاں کے طرف دار اور ہم نوا تھے اور خان اپنے طرفداروں کی سبکی اور بے عزتی کو اپنی سبکی اور بے عزتی سمجھتا تھا۔ یہ حق شناسی کی ذہنیت نہ تھی بلکہ طریق جاہلیت کی پیروی تھی۔ غرض وہ آہستہ آہستہ مخالفت میں زیادہ جری اور دلیر ہوتا گیا۔

سکھوں سے ساز باز

ابتدا میں وہ ہندوستان سے آنے والے اکا دکا غازیوں کو تنگ کرنے لگا۔ غازی بھیس بدل کر پنجاب میں سے گزرتے اور ہنڈ کے گھاٹ سے دریا عبور کر کے سرحد پہنچتے تھے۔ خادے خاں کے آدمی انھیں گرفتار کر لیتے۔ ان کے پاس جو کچھ ہوتا، چھین لیتے، پھر دریا میں غوطے دے کر دوسرے کنارے پر پہنچاتے۔ بعض غازیوں کو اس شرط پر چھوڑا گیا کہ جو مال خادے خاں کے آدمی لے چکے تھے، اسے بحل کر دیا جائے۔ سید صاحب کے پاس پے در پے شکایتیں

پہنچیں لیکن آپ صبر کیے بیٹھے رہے۔ مظلوم غازیوں سے بھی فرماتے کہ صبر کرو اور اپنی تمام شکایتیں اللہ کے حوالے کر دو۔

پھر مانیری اور آس پاس کے مقامات سے رپورٹیں آئیں کہ خادے خاں کے سوار مویشی ہانک کر لے جاتے ہیں اور کچی فصلیں کاٹ لیتے ہیں۔ سید صاحب نے ان رپورٹوں پر بھی برابر صبر کیا اور یہی کوشش فرماتے رہے کہ خادے خاں کو مخالفت میں آگے بڑھنے کا موقع نہ ملے۔

جس زمانے میں سید صاحب خہر میں تھے، خادے خاں نے اشرف خاں رئیس زیدہ سے بھی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ بلکہ رئیس زیدہ کی بعض زمینوں پر زبردستی قبضہ کر لیا حالانکہ دونوں ہم خاندان تھے اور ان میں گہری رشتہ داری تھی، یعنی اشرف خاں کی صاحبزادی خادے خاں کی بیوی تھی اور خادے خاں کی ہمشیر اشرف خاں کے بیٹے مقرب خاں سے بیاہی ہوئی تھی۔ سید صاحب پنجتار پہنچے تو اشرف خاں کے بھائی لطف اللہ خاں نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ ہمارے امام ہیں، اس ظلم و چیرہ دستی کا ازالہ فرمائیں۔

لڑائی

سید صاحب ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ کیا تدبیر اختیار فرمائیں، اس اثنا میں اطلاع ملی کہ خادے خاں لڑائی کا پورا بندوبست کر چکا ہے اور اشرف خاں پر حملہ ہونے والا ہے۔ سید صاحب نے شاہ اسماعیل کو پونے دو سو غازیوں کے ساتھ بھیج دیا کہ بیچ میں پڑ کر لڑائی رکوا دیں۔ پھر مستقل مصالحت کا انتظام فرمائیں۔ شاہ صاحب سلیم خاں ٹھہرتے ہوئے مانیری پہنچے تو شاہ منصور کی طرف سے گولیوں کی آواز آئی۔ آپ جلد سے جلد آواز کے نشان پر گئے تو دیکھا کہ اشرف خاں لشکر سمیت زیدے واپس جا رہا ہے، پوچھا: "خان بھائی! یہ لڑائی کیسی؟ ہم تو حضرت کے فرمان کے مطابق مصالحت کی غرض سے آئے تھے۔" اشرف خاں نے بتایا کہ ہم تو سید بادشاہ کے حکم کے مطابق اپنی گڑھی میں بیٹھے تھے، سورج نکلتے ہی خادے خاں کا لشکر میدان میں آ گیا۔ مجبوراً ہمیں بھی دفاع کی غرض سے نکلنا پڑا۔ ہم اپنی حد پر نہیں پہنچے تھے کہ خادے خاں کے آدمی بندوقیں چلانے لگے۔ ہمیں بھی جواب دینا پڑا۔ تھوڑی دیر لڑائی جاری رہی، پھر خادے خاں کے آدمی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے اور ہم واپس آ گئے۔ خدا کے فضل سے ہمارا کوئی بھی آدمی زخمی نہیں ہوا۔

اشرف خاں کی وفات

اشرف خاں گھوڑے پر سوار تھا اور بشاشت و شادمانی کی فراوانی میں گھوڑے کو کداتا ہوا جا رہا تھا۔ شاہ منصور کے قریب پہنچا تو گھوڑا اچانک سیخ پا ہو گیا، پھر اس طرح گرا کہ اشرف خاں نیچے تھا اور گھوڑا اوپر۔ زین کا ہرنا خان کے سینے میں گڑ گیا۔

گھوڑے کے نیچے سے اسے نکالا گیا تو بے ہوش تھا۔ تھوڑی دیر میں واصل بہ حق ہو گیا۔ اس ناگہانی حادثے نے سب کو حزن و ملال کا پیکر بنا دیا۔ وہ بہت نیک بخت، سخی اور خوش اخلاق رئیس تھا۔ سید صاحب کے ساتھ اسے دلی محبت و عقیدت تھی۔

میت کو چارپائی پر ڈال کر زیدہ لے گئے۔ خادے خاں بھی یہ خبر سن کر زیدہ پہنچا اور نماز جنازہ میں شریک ہوا۔ تدفین سے فارغ ہو کر تعزیت و دعا کے لیے مسجد میں جمع ہوئے۔ شاہ اسماعیل نے مرحوم کے محامد و فضائل بیان فرمائے، پھر مغفرت کے لیے دعا مانگی۔

جانشینی کا فیصلہ اور خادے خاں

مولانا ایک رات زیدہ میں گزار کر پنجتار گئے۔ تیسرے روز فتح خاں پنجتاری زیدہ پہنچا، جہاں خان مرحوم کی جانشینی کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ اشرف خاں کے تین بیٹے تھے: مقرب خاں، فتح خاں اور ارسلان خان۔ ان میں سے فتح خاں سب سے لائق، دانش مند اور دیندار تھا اور اشرف خاں نے اسی کو جانشینی کے لیے نامزد کیا تھا۔ تمام خوانین نے اسی کو خانی و سرداری کی دستار بندھوائی۔ خادے خاں کو اس فیصلے سے بھی اختلاف تھا، وہ چاہتا تھا کہ مقرب خاں کو سردار بنایا جائے، جو اس کا بہنوئی تھا۔ یہ واقعہ خادے خاں کے لیے رنجش کا تازہ سبب بن گیا۔ سرحد میں اسے کہیں سے دوستی اور اعانت کی امید نظر نہ آئی تو خفیہ خفیہ سکھوں سے رشتہ موافقت پیدا کر لیا۔ اس کے دل میں مدت سے اجتماعیت و انفرادیت یا اسلامیت و افغانیت کی کشاکش جاری تھی، اب وہ فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ گئی۔ خادے خاں خاصی دیر تک لڑکھڑاتا رہا۔ آخر سنبھلنے کے بجائے گر گیا اور ایسی جگہ گرا جہاں اسلامیت کے کسی منتسب کے لیے اطمینان و مسرت کی کوئی گنجایش نہ تھی۔

سکھوں کی آمد

سکھ وقتاً فوقتاً لشکر لے کر علاقہ سرحد میں پہنچ جاتے تھے۔ وہ مسکین دیہاتیوں پر سخت ظلم کرتے، خوانین و رؤسا سے گھوڑے، باز اور شکاری کتے خراج میں لیتے۔ اب کے جنرل دنتورا حضرو پہنچا تو خادے خاں نے خود حضرو حاضر ہو کر ایک گھوڑا، ایک باز اور ایک شکاری کتا بہ طور نذر پیش کر کے سکھ حکومت کا طوق فرمانبرداری اپنے گلے میں ڈال لیا۔ پھر دنتورا کو ترغیب دی کہ دریا کو عبور کر کے سمہ میں پہنچو گے تو باقی رؤسا بھی خراج ادا کر دیں گے۔ مانیری پر مجھے قبضہ دلا دو گے تو خاصی رقم معاوضے میں ملے گا۔

دنتورا محتاط آدمی تھا۔ اس نے خادے خاں کے بھائی امیر خاں کو یرغمال میں لے کر پیش قدمی کی۔ خادے خاں نے مقرب خاں ابن اشرف خاں کی طرف سے بھی گھوڑا اور باز پیش کر کے اسے زیدہ کا رئیس

تسلیم کرالیا۔ مقرب خاں دل سے سید صاحب کا عقیدت مند تھا۔ فوراً قاصد بھیج کر پورے حالات سید صاحب کے گوش گزار کر دیے۔ یہ بھی عرض کیا کہ میں نے جو کچھ کیا، مجبوری کی حالت میں کیا۔ مقرب کے اخلاص کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ دم بہ دم سکھ لشکر کے بارے میں صحیح اطلاعات سید صاحب کو پہنچاتا رہا۔

دنتورا کا خط

خادے خاں نے دنتورا سے کہہ کر ایک پروانہ فتح خاں پنجتاری کے نام بھی بھجوایا جو خراج کے مطالبے پر مشتمل تھا۔ فتح خاں نے جواب دیا کہ ہم نے نہ کبھی خراج دیا اور نہ دیں گے۔ تمھیں اپنی فوج پر اعتماد ہے تو جو چاہو کر لو۔

خادے خاں تو ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔ دنتورا سے کہا کہ خان پنجتار کا یہ جوش و خروش اور دم خم سید بادشاہ کے بل پر ہے۔ دنتورا نے خود سید صاحب کو خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ آپ عالی خاندان، سید، حاجی حرمین، غازی اور ولی ہیں۔ آپ کی برکت سے اس ملک میں شر و فساد کم ہو رہا ہے لیکن یہ ملک مہاراجا رنجیت سنگھ کے قلمرو میں داخل ہے۔ خوانین باقاعدہ خراج ادا کرتے تھے، آپ کی تشریف آوری کے بعد باغی ہو گئے۔ آپ انھیں مہاراجا کی اطاعت کا حکم دیں، نیز لکھیں کہ کس غرض سے اس ملک میں آئے ہیں، جواب وکیل کی معرفت روانہ کریں۔

سید صاحب کا جواب

سید صاحب نے جواب میں لکھا کہ جس طرح آپ اپنے حاکم کے تابع فرمان ہیں، اسی طرح ہم اپنے خدا کے فرمانبردار ہیں، جو زمین و آسمان کا مالک برحق ہے۔ اس احکم الحاکمین نے جو احکام بھیجے ہیں، انھیں بجا لاتا ہوں، سب کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں، جو اسے قبول کر لے، وہ میرا بھائی ہے۔ آپ اہل کتاب ہیں اور سمجھ سکتے ہیں کہ جو دعوت آپ کو دے رہا ہوں، وہ آپ کے آقا کے لیے بھی ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ ملک خالصہ جی کا ہے۔ یہ دعویٰ محض بے دلیل ہے۔ حقیقۃً مشرق سے مغرب تک سارا ملک خدا کا ہے۔ پھر ملکیت کے اعتبار سے یہ ملک مسلمانوں کا ہے۔ میرا ارادہ بھی آپ سے مخفی نہیں۔ یہاں سمجھ بوجھ کر ہی آیا ہوں۔ آپ مسلمانوں کو تباہ کر رہے ہیں۔ اگر اسلام قبول کر لیں تو ملک آپ کے پاس رہے گا، ورنہ میں آپ سے جہاد جاری رکھوں گا۔

”وقائع“ کا بیان ہے کہ مولوی خیرالدین شیرکوٹی کو وکیل بنا کر سید صاحب نے دنتورا کے پاس بھیجا۔ مولوی صاحب نے مکتوب کے تمام مطالب کو تفصیل سے دُہرایا اور ہر اعتراض کا شافی جواب دیا۔ دنتورا تلخ ہو کر بولا تو مولوی صاحب نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ آخر میں کہہ دیا کہ آپ کو اپنے لشکر پر ناز ہے تو ہمارا بھروسا اللہ پر ہے۔ اس کا لشکر سب سے زیادہ قوی ہے اور ہمیشہ سب پر غالب رہا ہے۔

دنتورا کی واپسی

مولوی صاحب دنتورا سے مل کر پنجتار پہنچے اور ساری گفتگو تفصیلاً سید صاحب کو سنا دی، چونکہ پنجتار پر حملے کا اندیشہ تھا اس لیے سید صاحب نے مولوی خیر الدین کو تین سو غازیوں کے ساتھ درے کی حفاظت کے لیے بھیج دیا۔ وہ درے سے باہر نکل کر خیمہ زن ہوئے۔ دنتورا کی فوج مغربی جانب کے میدان میں اُتری ہوئی تھی۔ دونوں فوجوں میں دو اڑھائی کوس کا فاصلہ تھا۔ غازیوں کے شبخون کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ مانیری اور صوابی کے باشندے سکھ لشکر کی وجہ سے پریشان تھے۔ غازیوں کا لشکر آگیا تو اطمینان کے ساتھ ارد گرد کے مواضع میں پھرنے لگے۔ سکھ لشکریوں نے سمجھا کہ شاید شبخون کے لیے پخت و پز ہو رہی ہے۔ ان پر سراسیمگی طاری ہو گئی۔ دنتورا نے یہ حالت دیکھ کر فوج کو واپسی کا حکم دے دیا۔ وہ لوگ اس افراتفری میں واپس گئے کہ خاصا سامان بھی پیچھے چھوڑ گئے[1]

---

[1] عام سوانح نگار پنجتار پر صرف ایک حملے کا ذکر کرتے ہیں میری تحقیق یہ ہے کہ دنتورا دو مرتبہ حملے کے لیے آیا۔ تمام روایات کو سلجھانے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں۔ افسوس کہ سکھ لشکر کی ہر نقل و حرکت کے صحیح حالات معلوم نہ ہو سکے، ورنہ قطعی فیصلے میں آسانی پیدا ہو جاتی۔ بہر حال جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں، اسے پیش کر دیا ہے، حقیقت حال صرف اللہ کو معلوم ہے۔

دسواں باب

تسخیر اٹک کی تجویز

بیعت شریعت کی برکات

بیعت شریعت نے پورے علاقے میں دینی فضا پیدا کرنے کا سروسامان کر دیا تھا۔ ملا قطب الدین ننگرہاری بہ سلسلہ وظائف احتساب دیہات کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ خود سید صاحب بھی خوانین و رؤسا کی دعوت پر مختلف مقامات میں تشریف لے جاتے تھے۔ پٹھانوں کا ایک بہت بڑا مرض تفرقہ تھا، جس نے ان کی اجتماعی زندگی کی بنیاد متزلزل کر رکھی تھی۔ معمولی باتوں پر وہ لڑ پڑتے، پھر ہر فریق کی کوشش یہ ہوتی کہ گاؤں یا اقوام کے زیادہ سے زیادہ افراد اپنے ساتھ ملا لے۔ اس طرح معمولی مناقشتوں کی بنا پر جگہ جگہ مستقل جنگی محاذ بن گئے تھے۔ سید صاحب جہاں تشریف لے جاتے، پرانی مناقشتوں کی تحقیقات کر کے شرعی فیصلے صادر فرما دیتے۔ خدو خیل کے علاقے میں فتح خاں پنجتاری اور اس کے بھائی ناصر خاں کے درمیان شدید عداوت پیدا ہو چکی تھی اور ناصر خاں نے چنگلئی میں بیٹھ کر اردگرد کے خوانین کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا، یہاں تک کہ فتح خاں کے لیے پنجتار سے قدم باہر رکھنا مشکل ہو گیا۔ سید صاحب نے ان دونوں بھائیوں میں بھی صلح کرا دی۔

اٹک پر حملے کی تجویز

اس زمانے میں اٹک سے خیر الدین نام ایک شخص بار بار پنجتار آیا۔ وہ دو تین دن ٹھہرتا، تخلیہ میں سید صاحب سے بات چیت کرتا اور واپس چلا جاتا۔ اس وقت کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ اس کی غرض و غایت کیا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے اٹک کا قلعہ سید صاحب کے حوالے کر دینے کی ایک سکیم سوچی تھی اور اس سلسلے میں تفصیلات طے کرنے کی غرض سے آتا تھا۔

اٹک کا قلعدار خزانہ مل نام ایک شخص تھا۔ خیر الدین وہاں کے معززین میں سے تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے تمام اندرونی معاملات کی کیفیت معلوم کر لی۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ قلعے پر قبضہ کر لینا مشکل نہیں تو شہر اٹک کے ان مسلمانوں سے بات چیت کی، جن کی اسلامی حمیت پر بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ سب نے خیر الدین کی رائے سے اتفاق کیا، لیکن کہا کہ باہر سے کمک حاصل کیے بغیر اس کام کا سر انجام کو پہنچنا مشکل ہے۔ باہر سے سید صاحب کے سوا کون مدد دے سکتا تھا؟ جوانمرد خیر الدین نے اس

خفیہ سفارت کی خدمت اپنے ذمے لے لی۔

اٹک اس زمانے میں نہایت اہم مقام تھا۔ اسے قبضے میں لے لینے کے بعد پنجاب میں پیش قدمی کے لیے ایک نہایت موزوں مرکز مل جاتا۔ یہ بھی یقین تھا کہ اٹک لے لینے کے بعد ایک طرف اہل سرحد زیادہ سرگرمی سے کاروبار جہاد میں اعانت کے لیے تیار ہو جائیں گے، دوسری طرف مسلمانان پنجاب کے حوصلے بڑھ جائیں گے اور سکھ حکومت میں تزلزل کا اچھا بندوبست ہو جائے گا۔ لیکن معاملہ ایسا نہ تھا کہ تنہا ایک فرد کی روایت پر بھروسا کر کے آخری اقدام کا فیصلہ کر لیا جاتا۔ چنانچہ سید صاحب نے مولوی امام الدین پھلتی والے کو دو غازیوں کے ساتھ بہ تبدیل لباس اٹک بھیج دیا۔ دس روز میں انھوں نے پورے حالات تحقیق کیے اور پنجتار پہنچ کر خیر الدین کی ایک ایک بات کی تصدیق فرما دی[1]۔ سید صاحب نے اسی وقت پانسو روپے کی رقم خیر الدین کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا کہ ضروری سامان اور ہتھیار خرید لیجیے۔ سب سامان مکمل ہو جائے تو ہمیں اطلاع بھجوا دیجیے۔

غازیوں کا ارسال

سید صاحب اس کے بعد خود دورے پر روانہ ہو گئے اور جگہ جگہ ٹھہرتے ہوئے گڑھی امان زئی پہنچے۔ وہیں خیر الدین نے خود یہ اطلاع پہنچائی کہ تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں، مسلمانانِ اٹک میں سے پانسو آدمی ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں۔ جن کے پاس ہتھیار نہیں تھے انھیں ہتھیار لے دیے ہیں۔ قلعے پر حملے کے لیے سیڑھیاں اور رسّے درکار تھے، یہ چیزیں بھی مہیا کر لی گئی ہیں۔ میں اپنے بھائی کے علاوہ، سید جمیل شاہ، ان کے بہنوئی سید محبوب شاہ، فتح شیر خاں اور ان کے بھائی منگا خاں، محمود، قادر بخش، محمد بخش وغیرہ سے کہہ آیا ہوں کہ فلاں رات برات کے استقبال کے بہانے دریا کے کنارے فلاں مقام پر پہنچ جائیں، وہیں غازیوں کو لے آؤں گا۔ گویا تجویز یہ تھی کہ غازی باہر سے برات کی شکل میں اٹک میں داخل ہوں اور اندر پہنچ کر مسلمانان اٹک کی امداد سے قلعے پر قبضہ کر لیں۔

سید صاحب نے قریباً ستر چست وچالاک غازی منتخب کیے، ارباب بہرام خاں کو ان کا امیر بنا کر اٹک بھیج دیا اور فرمایا کہ اگر خدا نخواستہ ارباب کو کوئی حادثہ پیش آجائے تو حاجی بہادر شاہ خاں کو اور

---

[1] بعض روایتوں میں ہے کہ مولوی امام الدین کو زیادہ مرتبہ اٹک بھیجا گیا اور وہ ہر مرتبہ دس دس بیس بیس روز وہاں گزارتے رہے۔ میرے نزدیک یہ روایتیں غلط فہمی پر مبنی ہیں، اس لیے کہ اٹک کا واقعہ بیعت شریعت سے تھوڑی دیر بعد پیش آیا اور محض تحقیق احوال میں دو تین مہینے کی مدت بسر کر دینا قرینِ قیاس نہیں۔

ان کے بعد اہ خاں خیرآبادی کو امیر بنایا جائے۔ پھر غازی جسے چاہیں امیر مقرر کر لیں۔ اخوند ظہور اللہ جہانگیرا کے تھے، جو اٹک سے قریب ہے۔ ان اطراف کے حالات سے پوری طرح واقف تھے۔ انھیں غازیوں کی رہبری کے لیے ساتھ کر دیا۔ ان سب نے دو دو وقت کی روٹیاں پکا لیں، چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں روانہ ہو گئے اور باہر جا کر مقررہ مقام پر مل گئے۔

بھید کھل گیا

گڑھی امان زئی سے پندرہ سولہ میل کے فاصلے پر جلسئی ہے۔ غازی جلسئی سے دو کوس پر ہوں گے کہ صبح ہو گئی۔ ادائے نماز کے بعد سب چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بکھر کر ادھر ادھر چھپ گئے۔ سارا دن اسی حالت میں گزارا۔ عشا کے وقت پھر منزل مقصود کی جانب روانہ ہوئے۔ جہانگیرا کے گھاٹ پر پہنچے تو سید جمیل شاہ، سید محبوب شاہ، فتح شیر خاں، محمود اور قادر بخش انتظار کر رہے تھے۔ عبور دریا کے لیے جالے موجود تھے۔ عین اس حالت میں محمد بخش شناس پر سوار ہو کر آ پہنچا اور اس نے بتایا کہ ہمارے ایک ساتھی نے راز فاش کر دیا۔ نیز خادے خاں کی طرف سے ایک قاصد پہنچ گیا، جس نے بتا دیا کہ سید صاحب کے غازی اٹک پر حملہ کرنے والے ہیں۔ قلعدار نے مقابلے کے لیے پوری تیاری کر لی ہے اور کئی مسلمان گرفتار ہو چکے ہیں[1]

اس اطلاع کے بعد قدم آگے بڑھانے کی کوئی صورت نہ تھی اور ٹھہرے رہنا بے سود تھا، اس لیے ارباب نے غازیوں کی واپسی کا حکم دے دیا۔ مولوی خیر الدین اور دوسرے لوگ بھی ساتھ ہو گئے[2] پہلے کی طرح دن چھپ چھپا کر گزارا، پھر امان زئی پہنچ کر سارے حالات سید صاحب کے گوش گزار کر دیے۔

جو لوگ اٹک میں گرفتار ہوئے تھے، ان میں سے بعض کو موت کی سزا دی گئی، بعض کو قید کر دیا گیا۔ ان میں سے ہنگا خاں نے پیر ظہور شاہ نام ایک درویش کے ذریعے سے رہائی پائی۔ مولوی خیر الدین کے

---

[1] وقائع میں ہے کہ مخبر نے لالہ خزانہ مل قلعدار کو بتایا کہ جو لوگ برات کے استقبال کی اجازت لے کر گئے ہیں، وہ سید صاحب کے غازیوں کو لائیں گے۔ خزانہ مل کو یقین نہ آیا۔ مخبر نے کہا کہ ان کے گھروں کی تلاشی لے لیجیے۔ اگر وہاں سے ہتھیار، سیڑھیاں اور رستے مل جائیں تو میں سچا، ورنہ مجھے توپ دم کرا دیجیے۔ عین اس حالت میں خادے خاں کا قاصد پہنچ گیا۔ خزانہ مل نے تلاشی لی اور سارا سامان مل گیا۔

[2] روایتوں میں خیر الدین کے نام کی تصریح ہے، میرا خیال ہے کہ دوسرے لوگ بھی ساتھ رہے ہوں گے، اگر وہ لوٹتے تو گرفتار ہو جاتے، پھر قتل کیے جاتے یا قید کی سزا پاتے۔

بال بچوں کو بھی بعد میں رہا کر دیا گیا اور وہ پنجتار پہنچ گئے۔

سید عبدالجبار شاہ کا بیان

واقعۂ اٹک کے متعلق سید عبدالجبار شاہ صاحب ستھانوی نے اپنی کتاب "عبرۃ لاولی الابصار" میں مستند خاندانی روایات کی بنا پر لکھا ہے کہ اخوند سید امیر عرف ملّا صاحب کوٹھا کے جد امجد طریق مجددیہ کے شیخ تھے۔ اٹک میں رنگریزوں کا ایک خاندان ان کا مرید تھا۔ اس خاندان نے یورش اٹک کو کامیاب بنانے میں سب سے بڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ سیڑھیاں اور رسّے انہیں کے ہاں رکھے گئے تھے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ خادے خاں کو اس تجویز کا حال کہاں سے معلوم ہوا؟ سید عبدالجبار شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اخوند عبدالغفور، جو بعد میں اخوند صاحب سوات کے لقب سے مشہور ہوا (موجودہ والی سوات کا پردادا) اس زمانے میں بیکی[1] کے قریب دریائے سندھ کے کنارے ایک غار میں رہتا تھا۔ یہاں اس نے بارہ برس چلہ کشی میں گزار دیے تھے۔ ملا صاحب کوٹھا سے اس کا گہرا تعلق تھا۔ سید صاحب کے پاس بھی آتا جاتا تھا اسے اٹک پر یورش کی تجویز کا علم ہو گیا تھا۔

زہد و ریاضت کی وجہ سے خادے خاں کو بھی اخوند عبدالغفور کے ساتھ عقیدت تھی۔ اخوند کو علم نہ تھا کہ خادے خاں سید صاحب سے منحرف ہو چکا ہے۔ باتوں باتوں میں اخوند نے یورش اٹک کی تجویز کا ذکر خادے خاں سے کر دیا۔ خان نے یہ اطلاع پاتے ہی ایک تیز سوار ہری سنگھ نلوہ حاکم ہزارہ کے پاس بھیج دیا۔ اس نے خزانہ مل کو حکم دے دیا کہ رنگریزوں کے گھروں کی تلاشی لی جائے۔ سامان برآمد ہو گیا۔ رنگریز گرفتار کر لیے گئے۔ بعد میں انھیں موت کی سزا ملی۔

اخوند کو اپنی بے احتیاطی کے نتائج الیمہ کا علم ہوا تو اس درجہ ندامت لاحق ہوئی کہ وہ فوراً بیکی کو چھوڑ کر کسی نامعلوم مقام پر چلا گیا۔ کئی برس کے بعد زیارت فلاناں میں اس کا سراغ ملا۔ ملّا صاحب کوٹھا کے ساتھ اخوند کی عداوت بھی اسی وقت سے شروع ہوئی۔ انجام کار ملا صاحب پر "وہابیت" کا الزام لگایا اور انھیں بڑی مصیبتوں میں اُلجھائے رکھا۔

مسلمہ حقائق

میں اس روایت کے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ:

۱ - اٹک پر حملے کی اطلاع سکھوں کو خادے خاں نے پہنچائی تھی[2]

---

[1] ہنڈ کے قریب ایک گاؤں ہے میں اسے دیکھ نہ سکا۔

[2] اے جنرل رپورٹ آن دی یوسف زئی (انگریزی مصنفہ بیلیو صفحہ ۸۰ مطبوعہ ۱۸۶۴ء)

۲ - اخوند سوات اس زمانے میں بیکی میں مقیم تھا اور خادے خاں کے ساتھ اس کے تعلقات بہت گہرے تھے[۵]

۳ - اسی واقعہ کے بعد اخوند نے بیکی کو چھوڑا -

ان حالات میں اغلب ہے یہ روایت درست ہو، خصوصاً اس لیے کہ خادے خاں کو اٹک پر حملے کی تجویز کا علم اخوند صاحب کے سوا اور کسی ذریعے سے ہو ہی نہ سکتا تھا۔

مجلس شوریٰ

سید صاحب امان زئی سے شیخ جانا ہوتے ہوئے پنجتار پہنچے تو چھ سات روز کے بعد مجلس شوریٰ منعقد کی، جس میں مولانا شاہ اسماعیل، سید احمد علی، ارباب بہرام خاں، مولوی محمد حسن، فتح خاں پنجتاری اور بعض دوسرے اکابر شریک تھے، آپ نے فرمایا:

> آپ خوب جانتے ہیں کہ ہم لوگ اتنی مدت سے اس ملک میں واسطے جہاد فی سبیل اللہ آئے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کی ریاست سمجھ کر یہاں اُترے ہیں۔ فقط اس نیت سے کہ سب مسلمان بھائیوں کے اتفاق سے دین اسلام کا کام درست ہو۔ لیکن یہاں کے مسلمان بھائیوں کی نا اتفاقی کا یہ حال ہے کہ اگر ہم کوئی صورت کفار کو زیر کرنے کی نکالتے ہیں تو انھیں مسلمانوں میں سے ایک نہ ایک ان کا حامی بن کر بیچ میں حارج ہو جاتا ہے اور ان کو خبر دے دیتا ہے۔
>
> چنانچہ ایک سردار یار محمد خاں کہ اس کا فساد آپ سب جانتے ہیں۔ شیدو کی لڑائی میں اسی نوّے ہزار آدمی ہماری طرف سے جمع تھے۔ اس کی شرارت سے لڑائی میں شکست ہو گئی اور جمعیت مسلمانوں کی پراگندہ ہو گئی۔
>
> دُوسرا ان میں سے خادے خاں ہے کہ چند مہینے سے کیسی کیسی حرکتیں بے جا کرنی شروع کی ہیں۔ چنانچہ آپ کو خود معلوم ہے کہ جو غازی ہندوستان سے واسطے جہاد فی سبیل اللہ کے

---

[۵] اے جنرل رپورٹ آن دی یوسف زئی (انگریزی مصنفہ بیلیو صفحہ ۸۰ مطبوعہ ۱۸۶۴ء)

بیلیو نے لکھا ہے کہ سید صاحب نے اخوند سوات کے ذریعے سے خادے خاں کو بلایا تھا۔ جب وہ آ گیا تو موقع پا کر اسے قتل کرا دیا۔ اس وجہ سے اخوند کو سخت ندامت ہوئی اور اسے روپوش ہونا پڑا لیکن یہ بیان سراسر غلط ہے۔ نہ خادے خاں کو اخوند کے ذریعے سے بلایا گیا، نہ بلا کر قتل کیا گیا۔ سید صاحب نے ہنڈ پر باقاعدہ یورش کی تھی جس میں خادے خاں لڑتا ہوا مارا گیا۔

ارادہ کرتا ہے، سکھوں کے ملک سے تو سلامت چلا آتا ہے لیکن اس (خادے خاں) کے ہاں سے کسی طور سلامت نہیں پہنچتا۔ کسی کو لوٹ کر دریائے اباسین میں غوطے دلاتے ہیں۔ کسی کا مال و اسباب چھین کر بہ زور بخشواتے ہیں اور سردار اشرف خاں مرحوم پر جو انھوں نے فوج کشی کی، فقط اس عداوت سے کی کہ خان مرحوم ہم سے موافق تھے۔ اس کے بعد یہ فساد کیا کہ دنتوا کو چڑھا لائے۔ اس میں حتی المقدور انھوں نے تو درگزر نہیں کی مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی مدد سے اس کو دفع کیا۔

اس کے بعد ایک تازہ فساد یہ کیا کہ ادھر سے اٹک پر ہمارا چھاپا چلا اور ادھر سے خادے خاں نے اپنا آدمی بھیج کر قلعدار کو خبر کر دی۔ اس طور کے اور بھی بہت سے فساد انھوں نے کیے ہیں۔ ابھی دیکھا چاہیے کہ یہ کیا کیا فساد کریں اور انھوں نے جو شرارتیں ہمارے ساتھ کی ہیں ان کی کدورت اصلاً ہمارے دل میں نہیں ہے۔ جو کچھ کیا اپنے واسطے کیا۔ وہ جانیں، ان کا خدا جانے۔ جیسا کرے گا ویسا پاوے گا۔ اب کوئی ایسی تدبیر کرو کہ مسلمانوں میں اتفاق ہو جائے۔ جس کے سبب سے کچھ اللہ تعالیٰ کا کام نکلے۔ دین اسلام کی ترقی ہو۔[1]

اجتماع کا انتظام

یہ تقریر سن کر سردار فتح خاں نے عرض کیا کہ آپ ملک سمہ کے سادات و علماء و خوانین کو بلائیں اور بہ طور نصیحت یہی باتیں ان سے فرمائیں۔ وہ سب آپ کے دست مبارک پر بیعت کر چکے ہیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ آپ یہاں کے رئیس ہیں، اس لیے آپ ہماری طرف سے دعوت نامے بھیجیں۔

چنانچہ جمعہ کا دن مقرر کر کے جگہ جگہ آدمی دوڑا دیے گئے۔ "منظورہ" کا بیان ہے کہ تین ہزار سے زیادہ آدمی جمع ہوئے۔[2] پنجتار کی پانچوں بستیوں نے مل کر دعوت کا انتظام کیا۔ ضرورت کے مطابق تمام جنسیں مولانا شاہ اسماعیل کے پاس پہنچا دی گئیں اس لیے کہ کھانا تیار کرانے کے مہتمم وہی تھے۔[3] "وقائع" میں ہے

---

[1] وقائع صفحہ ۱۰۷۵ - ۱۰۷۶ - میں نے اس تقریر کو بجنسہ لے لیا اس لیے کہ اس میں سید صاحب کے انداز گفتار کی زیادہ سے زیادہ جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن خطاب میں "تم" کی جگہ "آپ" بنا دیا ہے۔ کیونکہ سید صاحب کسی کو بھی "تم" سے خطاب کرنے کے عادی نہ تھے۔ وہ اپنے مریدوں اور نیازمندوں کو بھی ہمیشہ بھائی کہہ کر پکارتے تھے۔ شیخ بھائی، سید بھائی، خان بھائی صرف مولانا شاہ اسماعیل کو "میاں صاحب" کہتے تھے کہ یہ ان کا خاندانی لقب تھا۔

[2] "وقائع" میں ہے دس گیارہ سو۔ سامان دعوت کی مقدار کے پیش نظر "منظورہ" کا بیان زیادہ قرین صحت معلوم ہوتا ہے۔

کہ دس من گوشت، آٹھ من گھی[1] اور پندرہ سولہ من آٹا خرچ ہوا۔ سید صاحب نے حکم دے رکھا تھا کہ طلوعِ آفتاب سے پیشتر کھانا تیار ہو جائے تاکہ مہمان پنجتار پہنچتے ہی کھانا کھا کر اصل کام کے لیے فارغ ہو جائیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عام وعظ و تذکیر کے علاوہ سید صاحب کی ایک خاص غرض یہ بھی تھی کہ خادے خاں کو پھر ایک مرتبہ سمجھا کر راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جائے اور اگر یہ تفہیم بھی بے سود رہے تو علما سے فتویٰ حاصل کیا جائے کہ ایسے شخص کے متعلق شرعی حکم کیا ہے۔

شیشم کے درختوں کے نیچے نمازِ جمعہ ادا کی گئی۔ قاضی احمد اللہ میرٹھی نے خطبہ پڑھا۔ نماز کے بعد سید صاحب خطبے کے لیے اٹھے۔ قابل اخوند زادہ کو برابر کھڑا کر لیا۔ وہ ہندوستانی، پشتو، فارسی وغیرہ بہت سی زبانیں جانتے تھے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ میں ہندوستانی میں تقریر کروں گا۔ جس بھائی کو کسی بات کے سمجھنے میں دِقت محسوس ہو وہ قابل اخوند زادہ سے دریافت کر لے۔

سیّد صاحب کا خطبہ

حمد و ثنا کے بعد آپ نے فرمایا:

آپ سب بھائی جانتے ہیں کہ دنیا میں لوگ اپنی معاش اور میراث کے حاصل کرنے میں کیسی کیسی کوشش اور جانفشانی کرتے ہیں اور طرح طرح کی محنت اور تکلیف اٹھاتے ہیں۔ بلکہ اس رنج کو راحتِ جان کر ہرگز نہیں گھبراتے۔ فقط اس خیال سے کہ اگر وہ معاش و میراث ہاتھ لگے تو چین سے کھاویں اور یہ امر موہوم ہے۔ اگر یہ موافق خواہش کے حاصل ہوا۔ فبہا ورنہ کچھ نہیں۔

واسطے حاصل کرنے دولتِ دین کے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے، جس کے باعث فلاح دنیا اور آخرت کی، ترقی اسلام اور رضا مندی ربِ انام کی حاصل ہوتی ہے اور یہ امر ہر حال میں مقدم ہونا چاہیے۔ سو اس سے لوگ غافل ہیں۔

مجھ کو جناب باری سے ارشاد ہوا کہ دار الحرب ہند سے ہجرت کر کے دار الامان میں جا اور کفار سے جہاد فی سبیل اللہ کر۔ سو میں نے ہندوستان میں خیال کیا کہ کوئی جگہ ایسی مامون ہو کہ وہاں مسلمانوں کو لے جاؤں اور تدبیر جہاد کروں۔ باوجود اس وسعت کے کہ صدہا کوس میں

---

[1] دس من گوشت کے ساتھ آٹھ من گھی پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ سرحد میں پُر تکلف تواضع کا طریقہ اب بھی یہی ہے کہ مہمانوں کے پیالوں یا رکابیوں میں شوربا ڈال چکنے کے بعد گھی لوٹوں میں بھر بھر کر ڈالتے ہیں۔ اس طرح گوشت پکانے کے علاوہ بھی گھی خاصی مقدار میں خرچ ہوتا ہے۔

ملک ہند واقع ہے، کوئی جگہ لائق ہجرت کے میرے خیال میں نہ آئی۔

کتنے لوگوں نے صلاح دی کہ اسی ملک میں (یعنی ہندوستان میں) جہاد کرو۔ جو کچھ مال، خزانہ، سلاح وغیرہ درکار ہو، ہم دیں گے، مجھ کو منظور نہ ہوا۔ اس لیے کہ جہاد موافق سنت کے چاہیے، بلوا کرنا منظور نہیں تھا۔

آپ کے اس ملک کے ولایتی بھائی بھی وہاں حاضر تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا ملک اس امر کے واسطے بہت خوب ہے۔ اگر آپ وہاں چل کر کسی جگہ قیام پکڑیں تو لاکھوں مسلمان وہاں کے جان و مال سے آپ کے شریک ہوں گے۔ خصوصاً اس سبب سے کہ رنجیت سنگھ والی لاہور نے وہاں کے مسلمانوں کو تنگ کر رکھا ہے۔ طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتا ہے۔ ہتک حرمت اہل اسلام کی کرتا ہے۔ جب اس کی فوج کے لوگ اس ملک میں آتے ہیں، مسجدوں کو جلا دیتے ہیں، کھیتی تباہ کرتے ہیں، مال و اسباب لوٹتے ہیں بلکہ عورتوں، بچوں کو پکڑ لے جاتے ہیں اور اپنے ملک پنجاب میں بیچ ڈالتے ہیں اور اپنے ملک پنجاب میں تو وہ . . . . مسلمانوں کو اذان بھی نہیں کہنے دیتے اور مسجدوں میں گھوڑے باندھتے ہیں اور گاؤکشی کا تو کیا ذکر۔ جہاں سنتے ہیں کہ کسی مسلمان نے گائے ذبح کی، اس کو جان سے مار ڈالتے ہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ یہ سچ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے وہیں چل کر ٹھہریں اور سب مسلمانوں کو متفق کر کے کفار سے جہاد کریں۔

علما سے بالخصوص مخاطب ہو کر آپ نے فرمایا:

آپ لوگوں نے ہمیں جگہ دی، ہمارے ہاتھ پر امامت کی بیعت کی۔ آپ کے مشورے کے مطابق اس مقام سے جہاد شروع ہوا۔ اب آپ مساعی جمیلہ سے دست کش ہو رہے ہیں، حالانکہ آپ کو وارث الانبیا کہا گیا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟

سید صاحب نے اس سلسلے میں کئی مثالیں بھی دیں۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ دل میں حمیت اسلام کا دریا موجزن تھا۔ لوگ بھی یہ پُر تاثیر تقریر سُن کر رونے لگے۔ اس کے بعد دعا فرمائی اور کہا کہ اب مولانا اسماعیل جو کچھ فرمائیں اسے بھی سُن لیجیے۔ اگر کسی کے دل میں شک ہو تو اسے صاف کر لیا جائے۔

مولانا شاہ اسماعیل کی تقریر

پھر آپ مجلس سے اُٹھ کر قیام گاہ پر تشریف لے گئے اور مولانا شاہ اسماعیل نے تقریر شروع کی۔ اس کا عنوان تھا یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ . . . . . الخ آپ نے اس آیہ کریمہ کی مفصل

تفسیر فرمائی، پھر علما سے پوچھا کہ آیا اس کے رو سے امام کی اطاعت ضروری نہیں؟ سب نے کہا کہ ضروری ہے۔ مولانا نے پھر سوال کیا کہ عاصی کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ سب نے جواب دیا کہ وہ باغی ہے۔ پھر مولانا نے بغاوت کے سلسلے میں شرعی احکام کے متعلق استفتا پیش کیا۔ سب نے فتویٰ دیا کہ باغیوں کی سزا قتل ہے اور فتوے پر مہریں ثبت کر دیں۔

بعد ازاں مولانا نے علما سے مخاطب ہو کر فرمایا:

> سارا قصور آپ کا ہے، اس ملک کے تمام خوانین آپ کے تابع فرمان ہیں لیکن آپ لوگ اظہار حق میں مداہنت سے کام لیتے رہے ہیں، ورنہ یہ خرابی پیدا نہ ہوتی۔

پھر آپ نے دردِ دل سے دعا کی۔ سب لوگ اس میں شریک رہے، لیکن خادے خاں مجلس سے اٹھ کر چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ علما کے فتوے کی روشنی میں اسے اپنے اعمال کی بدوضعی اور مشئومیت کا پورا احساس ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے وہ حد درجہ مشوش و پریشان تھا۔ ممکن ہے اس نے سمجھ لیا ہو کہ فتویٰ صرف اسی کے لیے تیار ہوا ہے، لیکن ضد اور ہٹ اس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی اور متنبہ ہونے کے بجائے وہ اپنی روش میں اور بھی متصلب ہو گیا۔

عصر کی نماز سید صاحب ہی نے پڑھائی۔ اس کے بعد اکثر مہمان رخصت ہو گئے۔ جو شب بھر کے لیے ٹھہر گئے یا ٹھہرا لیے گئے، ان میں خادے خاں بھی تھا۔

خادے خاں سے بات چیت

رات کے وقت سید صاحب نے خادے خاں کو اپنے پاس بلا کر فرمایا:

> خان بھائی! آپ ہی نے ہم کو اس ملک میں ٹھہرایا تھا اور آپ ہی ہمارے انصار بھی سب سے پہلے بنے تھے۔ آج اس مجلس علما کی مشورت سے منحرف ہو کر اٹھ گئے۔ یہ بات آپ کی دانشمندی سے نہایت بعید تھی۔ آپ کو لازم تھا کہ اگر کوئی اور منحرف ہو کر اٹھتا تو اس کو سمجھاتے، نہ کہ خود سبقت کرتے۔ آپ کو لائق ہے کہ جس بات پر علما نے اتفاق کیا ہے اس کی مخالفت نہ کریں۔ اسی میں دین و دنیا کی بہتری ہوتی ہے اور اس کے خلاف میں دنیا و عقبیٰ دونوں کی خرابی ہے۔ ہم آپ کی خیرخواہی کی راہ سے کہتے ہیں۔ ماننا نہ ماننا آپ کا اختیار ہے۔

خادے خاں نے جواب میں کہا:

> حضرت ہم پختون (پٹھان) لوگ کاروبار ریاست کا رکھتے ہیں اور یہ مشورہ ملاؤں نے مل کر کیا ہے۔ یہ لوگ ہمارے یہاں اسقاط اور خیرات کے کھانے والوں میں ہیں۔ کاروبار ریاست

> میں ان کو کیا شعور؟ ان کا جو مشورہ ہمارے ذہن میں آتا ہے، اسے تسلیم کر لیتے ہیں اور جو سمجھ میں نہیں آتا اسے نہیں مانتے۔ ان کی صلاح اور مشورت کی ہمیں کچھ پروا نہیں۔ خود ہماری قوم اور جمعیت بہت ہے۔ کسی طور ہم پہ ان کا دباؤ نہیں۔ یہ ہمارے تابع ہیں، ہم ان کے تابع نہیں ہیں۔

سید صاحب کا خاصہ تھا کہ اگر کسی دوست اور عزیز کی زبان سے کوئی بات ایسی نکل جاتی جس کا اثر خدا اور رسولؐ کے احکام و اوامر کی حرمت پر پڑتا تو آپ کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ خادے خاں کا جواب سنتے ہی چہرۂ مبارک متغیر ہو گیا۔ لیکن آپ نے تحمل سے کام لیتے ہوئے فرمایا:

> علما وارث الانبیاء ہیں۔ ان کی شان میں ایسا کلام کمال نادانی ہے۔ یہ لوگ دین اور سنت سیدالمرسلینؐ سے واقف ہیں۔ کتاب و سنت کے مطابق جو کچھ کہیں مسلمان کو اس سے مجال انکار نہیں۔

خادے خاں: ہم لوگ پختون بے علم ہیں۔ ہماری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں۔

سید صاحب: ہم نے سمجھانے کا حق ادا کر دیا، اب اخیر ایک بات سن لیں۔ آپ نے حد شریعت سے قدم باہر نکالا، صرف اس خیال سے کہ آپ ملک کے خان ہیں، قوم و جمعیت کے مالک ہیں، کوئی کیا کر سکے گا؟ یہ محض گمراہی ہے اور شیطان کا فریب ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑا قادر ہے۔ اس نے کروڑوں پیدا کیے اور کروڑوں کو نابود کر ڈالا۔ کیا معلوم کہ کسی صبح آپ کی آنکھ کھلے تو انتظام کی باگ کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہو۔

نماز عشا کے بعد وہ اپنی قیامگاہ پر چلا گیا۔ صبح کے وقت رخصت ہو رہا تھا تو سید صاحب نے پھر فرمایا: ہم نے اتنا سمجھایا، مگر آپ کے خیال میں نہ آیا، اب ہم ناچار ہیں، آپ جانیں۔

وہ چپ چاپ رخصت ہو گیا۔ سید صاحب بڑا افسوس کرتے رہے کہ ایسا ہوشیار اور دانا شخص جو سب سے پہلے ہماری نصرت کے لیے کھڑا ہو کر انصار سابقین میں شامل ہوا، اسی نے سب سے پہلے بغاوت کا علم بلند کیا۔[1]

---

[1] میں نے یہ تقریریں اور سوال و جواب زیادہ تر "وقائع" سے لیے ہیں، لیکن ان میں بعض ٹکڑے "منظورہ" سے بھی لے کر شامل کر دیے ہیں، جو وقائع میں نہیں تھے۔

گیارھواں باب

جنگ پنجتار

دنتورا کی دوبارہ آمد

سید صاحب سے لڑے بغیر دنتورا کی سراسیمہ وار مراجعت نے اس کی شہرت کا دامن داغدار کر دیا تھا، دربار لاہور میں اس پر ناراضی کا اظہار ہوا۔ بعض لوگوں نے بے تکلف یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ خلیفہ صاحب[1] کے ساتھ مل گیا ہے، لہٰذا پھر پنجتار پر پیش قدمی ضروری ہو گئی[2]۔ خادے خاں بہ دستور اس کا معاون و رفیق تھا۔ اس کی آرزو یہ تھی کہ مقرب خاں کو زیدے کا رئیس مان لیا جائے اور مانیری پر اس کے حلیفوں کا قبضہ ہو جائے۔

ایک روز مقرب خاں نے اپنے خاص آدمی کے ذریعے سے سید صاحب کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ چند روز کے لیے پنجتار کو چھوڑ کر چنگلئی چلے جائیں، دنتورا واپس چلا جائے گا تو آ جائیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ یہ ممکن نہیں۔ ہم خدا کی رضا کے لیے برغرض جہاد نکلے ہیں، دشمن کے مقابلے سے ہٹنا ہمارے لیے حد درجہ مکروہ ہے۔ البتہ اگر فتح خاں کو مضرت کا اندیشہ ہو تو ہم اس مکروہ کو بھی گوارا کر لیں گے۔ آخری فیصلے کا حقدار وہی ہے۔ اس لیے کہ ہم اس کی جگہ میں بیٹھے ہیں اور اس جگہ میں اس کی رائے کو اپنی مصلحت پر مقدم رکھیں گے۔ فتح خاں نے یہ سنا تو فرمایا کہ میں خلوص نیت سے سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کر چکا ہوں، اب کسی مخالف طاقت سے نہیں ڈرتا[3]۔

---

[1] سکھ سید صاحب کو خلیفہ صاحب ہی کہتے تھے۔ [2] اس مقام پر روایتوں میں بڑی پیچیدگی ہے۔ وقائع میں ہے کہ جنگ پنجتار کے بعد رمضان کا چاند ہوا، سال درج نہیں۔ اگر اسے رمضان ۱۲۴۴ھ سمجھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ۱۵ شعبان ۱۲۴۴ھ کو بیعت اقامت شریعت کے بڑے اجتماع کے بعد پندرہ دن میں اٹک کا واقعہ بھی پیش آیا، امان زئی کا دورہ بھی ہوا، پنجتار پر پہلی مرتبہ پیش قدمی کے بعد دنتورا لوٹا اور دوبارہ بھی آ گیا۔ رمضان ۱۲۴۵ھ ہو نہیں سکتا۔ اس لیے کہ اس زمانے میں سید صاحب امب کی طرف تھے۔ "منظورہ" میں ہے کہ جنگ پنجتار اواخر ذی قعدہ میں ہوئی۔ سال اس میں بھی درج نہیں۔ میرے نزدیک "منظورہ" کا بیان درست ہے۔ یہ جنگ اواخر ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ (اوائل جون ۱۸۲۹ء) میں ہوئی۔ گویا دنتورا پہلی پیش قدمی سے مہینے ڈیڑھ مہینے بعد دوبارہ اس حصے میں پہنچ گیا۔ [3] "منظورہ" میں ہے: من مال و جان خود را و خان و مان خود را لِلّٰہ فی سبیل اللّٰہ بہ اختیار امیر المومنین دادہ ام۔ . . . . بارہا بنا بر دین با کفار منازعت و جنگ کردم . . . . . حالانکہ حق جل وعلا امامت حقہ قائم گردانید و باب جہاد بر اصل شرع رب العباد مفتوح گردید۔ صد حیف کہ درین وقت از جنگ کفار پہلو تہی کنم۔ بسم اللّٰہ، حضور مستعد مقابلہ و مقاتلہ شوند۔

دفاعی انتظامات

سید صاحب فتح خاں کے جواب پر بہت خوش ہوئے اور پوری سرگرمی سے حفظ و دفاع کے انتظامات میں مصروف ہو گئے۔ سب سے پہلے فتح خاں سے فرمایا کہ سرحد آزاد کے تمام علما و خوانین کو خط لکھیے۔ ان کا مضمون یہ تھا کہ پنجتار چملہ و بونیر کا دروازہ ہے۔ یہ دشمن کے قبضے میں چلا جائے گا تو چملہ و بونیر محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ آؤ اور ہمارے ساتھ ہو کر دشمن کو درۂ پنجتار میں روکو۔ ان خطوط کا اثر بہت اچھا ہوا۔ مختلف حصوں سے جنگی دستے پنجتار پہنچنے لگے۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، پنجتار پہنچنے کے دو راستے تھے: اوّل درے کا راستہ، دوم وہ پگ ڈنڈی جو توتالی سے سیدھی آتی تھی اور پنجتار کے سامنے درے میں داخل ہوتی تھی، جہاں غازی جمعہ اور عیدین کی نمازیں ادا کرتے تھے۔ بڑا لشکر اور بھاری ساز و سامان صرف پہلے راستے سے لایا جا سکتا تھا۔ پگ ڈنڈی سے چھوٹے چھوٹے دستے پیدل آ سکتے تھے۔ سید صاحب نے دونوں کی حفاظت کے لیے دیواریں تعمیر کرانے کا فیصلہ کیا۔ ان کے دو فائدے تھے: ایک یہ کہ دشمن دیواروں کو توڑے بغیر اندر نہیں آ سکتا تھا۔ دوسرے ان دیواروں کی اوٹ میں بیٹھ کر غازی اسے زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا سکتے تھے۔ دونوں دیواروں کی جگہیں خود سید صاحب نے موقعے اور ماحول کی مناسبت کے مطابق تجویز کیں۔

دو دیواریں

پہلی دیوار خلتی کلئی کے سامنے بنوائی۔ یہ قدِ آدم اونچی اور چار ہاتھ (یعنی چھ فٹ) چوڑی تھی۔ یہ دیوار دائیں اور بائیں جانب کے پہاڑوں سے ملا دی گئی تھی اور راستہ بالکل روک دیا تھا۔[1] یہ پوری دیوار فتح خاں کے ہم قوموں نے بنائی تھی۔ سید صاحب اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ آپ نے اس میں غازیوں کی چار جماعتوں کے لیے چار چوکیاں مقرر کر دیں: دو چوکیاں قندھاریوں کے لیے تھیں اور دو ہندوستانیوں کے لیے۔ چار چوپہرے لگائے: دو دائیں جانب کے پہاڑ پہ اور دو بائیں جانب کے پہاڑ پر۔ ان لوگوں کو حکم تھا کہ جب دشمن کی آمد کا یقین ہو جائے تو نیچے کے غازیوں کو خبردار کرنے کے لیے بندوقیں سر کر کے ان سے آملنا۔ فتح خاں کے سواروں کو اس حصے میں شب گردی کے لیے مامور فرمایا۔

دوسری دیوار پنجتار کے سامنے اس جگہ کے قریب بنائی گئی جہاں غازی جمعہ اور عیدین کی نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ یہ اولاً پگ ڈنڈی سے آنے والوں کے لیے روک تھی۔ ثانیاً درے کے اندر دوسرے زبردست

---

[1] میرے دل میں یہ شبہ تھا کہ نالے میں دیوار کیوں کر بنی ہوگی؟ سید عبدالجبار شاہ مرحوم نے بتایا کہ گرمیوں میں نالے کا پانی بعض حصوں میں بالکل خشک ہو جاتا ہے۔ اگر تھوڑا سا پانی بہتا بھی ہوگا تو اس کے گزرنے کے لیے دیوار میں چھوٹی چھوٹی موریاں چھوڑ دی ہوں گی۔

مورچے کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ پوری دیوار ہندوستانی غازیوں نے بنائی۔ اس کا طول چالیس پچاس گز (سوا سو ڈیڑھ سو فٹ) ہوگا۔ سید صاحب نے اس دیوار کے مختلف حصے غازیوں کی مختلف جماعتوں میں بانٹ دیے اور خود بھی ان کے ساتھ کار تعمیر میں برابر شریک رہے۔

دشمن کی آمد

دیواریں بن چکنے کے بعد دوسرے یا تیسرے دن شب گرد سواروں نے نماز فجر کے وقت اطلاع دی کہ دشمن کا لشکر درے کے سامنے پہنچ گیا ہے۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی سید صاحب نے غازیوں کو کمر بندی کا حکم دے دیا اور پنجتار کے سامنے والی دیوار کے پاس پہنچ گئے۔ دن کا اُجالا ہُوا تو صوابی اور مانیری کی طرف سے دھوئیں کے بادل اٹھنے لگے۔ معلوم ہُوا کہ سکھوں نے عادت و معمول کے مطابق دیہات سے گزرتے وقت مختلف مکانوں کو آگ لگا دی۔ موضع سلیم خاں درے کے دہانے پر تھا۔ وہ بھی آتش زنی سے محفوظ نہ رہا۔

سید صاحب نے میرزا احمد بیگ پنجابی کو ایک سو غازیوں کے ساتھ خلی کلٹی والی دیوار کی طرف یہ حکم دے کر بھیج دیا کہ چاروں چور پہروں کے آدمیوں کو واپس کر دیجیے۔ سکھ درے کے اندر آ جائیں تو دائیں جانب پہاڑ پر چڑھ جائیے اور مقابلہ نہ کیجیے۔ جب ان کا پورا لشکر آگے بڑھ کر غازیوں کے ساتھ پیکار میں مصروف ہو جائے تو عقب سے ان پر حملہ کیجیے۔ فتح خاں نے بھی اپنے چالیس پچاس آدمی میرزا احمد بیگ کے ساتھ کر دیے۔ باقی آدمیوں کو سید صاحب کے حکم کے مطابق بائیں جانب کے پہاڑ پر بھیج دیا۔ پھر دونوں دیواروں کے درمیان دونوں جانب کے پہاڑوں پر جا بجا چملہ و بونیر کے آدمیوں کو بٹھا دیا۔ صرف غازیوں کو میدان میں سکھ لشکر کے مقابلے کے لیے رکھا۔ پہاڑوں پر بیٹھنے والے تمام مجاہدوں کو حکم تھا کہ سکھوں کی پیش قدمی کے وقت مزاحمت نہ کریں، جب غازیوں سے ان کی جنگ شروع ہو جائے تو ہر طرف سے ان پر ہلہ بول دیں۔

موت کی بیعت

سید صاحب اس دیوار کے پاس بیٹھے تھے جو غازیوں کی نماز گاہ کے قریب تھی۔ غازیوں کے علاوہ علما و سادات و خوانین میں سے جو لوگ آئے تھے، وہ بھی آپ کے پاس تھے۔ کُل اصحاب نو سو کے قریب ہوں گے۔ دشمن کی جمعیت دس ہزار کے لگ بھگ بتائی جاتی تھی۔ اس کے پاس ساز و سامان کی بھی فراوانی تھی۔ اس بنا پر مقابلے میں انتہائی ہمت و استقامت درکار تھی۔ مولانا شاہ اسماعیل نے موقعے اور محل کی نزاکت کو محسوس کرتے ہُوئے تجویز پیش کی کہ سب غازی سید صاحب کے دست مبارک پر موت کی بیعت کریں۔ چنانچہ مولانا نے پہلے بیعت رضوان کی آیت پڑھی، پھر اس بیعت کے فضائل نہایت موثر و دل نشین انداز میں بیان فرمائے۔ آخر میں کہا:

> اس وقت سب صاحب جو حاضر ہیں، حضرت امیر المومنین کے دست مبارک پر اس نیت خالصہ سے بیعت کریں کہ انشاء اللہ زندہ جان آج ہم مقابلۂ کفار سے نہ ہٹیں گے۔ یا ان کو مار کر فتح پائیں گے یا اسی میدان میں شہید ہو جائیں گے۔ اس میں جو صاحب بہ مشیت ایزدی شہید ہوں گے، شہادت کبریٰ کا درجہ پائیں گے اور جو زندہ بچیں گے، وہ اعلیٰ مراتب کے غازی ہوں گے۔[1]

سب سے پہلے مولانا نے بیعت کی، پھر وہ غازی اس سے مشرف ہوئے جو سید صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ سب غازی آپ تک پہنچ نہیں سکتے تھے اس لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ جن غازیوں نے سید صاحب کے دست مبارک میں ہاتھ دے رکھے تھے، متصل غازیوں نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ لیے، اسی طرح آخر تک یہ سلسلہ قائم کر کے بیعت کی گئی۔

بیعت کے بعد سید صاحب نے ننگے سر ہو کر بہ عجز و الحاح دعا کی:

> الٰہی! ہم تیرے بندے عاجز و ناچار صرف تیری مدد کے امیدوار ہیں۔ ہم پر ان کافروں کو نہ لا اور ہم کو ان کے شر سے بچا۔ اگر تیری مشیت ازلی میں لانا ہی منظور ہے تو ہم عاجزوں اور ضعیفوں کو صبر اور استقامت عطا کر۔ ان کے مقابلے میں ثابت قدم رکھ اور پر فتح یاب کر۔

شانِ للہیت

راوی کہتا ہے کہ اس دعا کی تاثیر و برکت سے سب پر اور ہی عالم طاری ہو گیا ہر ایک اپنی ہستی سے گزر چکا تھا۔ تمام بھائی کمال تپاک اور اشتیاق سے ایک دوسرے کے گلے مل مل کر خطائیں معاف کرانے لگے۔ دنیوی علائق کا ہر نقش ان کے صفحات قلوب سے محو ہو چکا تھا۔

ایک دوسرے کو وصیت کرتے تھے تو یہ نہیں کہ ہمارے بال بچوں کا خیال رکھنا یا اقربا کو سلام پہنچانا یا ہماری جائیدادوں کو سنبھالنا اور یادگاریں قائم کرنا، حاشا! ثم حاشا!! وہ قدوسی رضائے باری تعالیٰ میں

---

[1] یہ "وقائع" کی روایت ہے۔ "منظورہ" میں ہے کہ بیعت جنگ سے دو روز پیشتر ظہر کی نماز کے بعد یا عصر کے وقت لی گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے اس کا موزوں ترین وقت وہی تھا، جب دشمن سے مقابلہ ہونے والا تھا۔ مولانا کی تقریر میں "آج" کے لفظ سے بھی یہی واضح ہوتا ہے۔ جس حد تک میں معلوم کر سکا ہوں یہ تحریک مولانا نے پیش کی تھی۔ سید صاحب کے نشینوں کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل تحریک سید صاحب نے فرمائی تھی۔ دونوں روایتوں میں توافق یوں ہو سکتا ہے کہ تجویز سید صاحب کی ہو گی اور اسے پیش مولانا شاہ اسماعیل نے کیا۔

اس طرح گم ہو چکے تھے کہ عالم ناسوت کے ساتھ گویا ان کا رشتہ ہی باقی نہیں رہا تھا۔ سب کی زبانوں پر صرف ایک توصیہ اللہ ایک پیام تھا اور وہ یہ کہ بھائیو! ہم شہید ہو جائیں یا زخموں سے چُور ہو کر گر پڑیں، ہمیں اٹھانے یا سنبھالنے سے بے پروا ہو کر فرصت و مہلت کے ہر لمحے کو صرف آگے بڑھنے، لڑائی جیتنے اور دشمن کو مار بھگانے کے لیے وقف رکھنا۔

اللہ اللہ للہیت کے یہ گہر ہائے شب چراغ تھے، جنھیں سید صاحب آج سے صرف سوا سو برس پیشتر ظلمت زار ہند سے نکال کر سرحد لے گئے تھے کہ شاید ان کی جلا سے یہ سرزمین از سر نو منور ہو جائے۔

سیّد صاحب کا مقام

یہاں مسلمان ہزار برس تک اس شان و شکوہ اور اس جاہ و جلال سے فرمانفرما رہے کہ اس کی مثالیں دنیا کی تاریخ میں شاذ ہی مل سکیں گی۔ اس بوقلموں مرقعے میں رنگ برنگ تصویریں نظر آتی ہیں۔ بالکل ابتدائی ورق کھولیے تو سترہ برس کا ایک عرب نوجوان سامنے آتا ہے، جس نے پانچ سات ہزار غازیوں کے ساتھ بڑے بڑے لشکروں کو شکست دے کر سندھ اور ملتان پر اسلامیت کا گہرا نقش جمایا۔ یہ محمد بن قاسم ثقفی تھا۔ اس کے بعد غزنوی کی ترکتازیوں، غوری کی سلطنت آرائیوں اور خلجی کی کشور کشائیوں کے ہنگامے یکے بعد دیگرے رونما ہوتے ہیں اور ہر نقش و اثر کی دلفریبی کا یہ عالم ہے کہ:

کرشمہ دامن دل مے کشد کہ جا ایں جاست!

پھر مختلف رنگوں کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ کوئی تلوار کا دھنی ہے اور اسی کے بل پر سلطنتیں پیدا کر لیتا ہے۔ کسی کو خدمت خلق سے دلچسپی ہے اور وہ اپنے اوقات گراں مایہ کا بیشتر حصہ آبادی و عمران ہی کے وسائل فراہم کرنے میں صرف کر دیتا ہے۔ آخر میں فرغانہ کا ایک مجاہد نظر آتا ہے، جسے اقربا و اعدا نے وطن میں ٹھہرے رہنے کی مہلت نہ دی۔ وہ کابل پہنچتا ہے، پھر ہندوستان آ کر ایک ایسی سلطنت کی بنیاد رکھ دیتا ہے، جس کی عظمت و ہیبت کے جلوے سرگزشت عالم میں یگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ظہیر الدین بابر تھا، جس کے جانشینوں نے ہندوستان کو شہرت و عزت کے اس مقام بلند پر پہنچا دیا جو اُسے نہ پہلے کبھی نصیب ہُوا تھا اور نہ غالباً دوبارہ نصیب ہو گا۔ ان میں سے کون سی تصویر ہے جس کی دلکشی اور نظر افروزی پر سینے میں فخر و مباہات کا دریا جوشاں نہیں ہوتا؟ لیکن کیا آپ کو اس پورے مرقعے میں کوئی ایسا خاکہ بھی ملتا ہے جو سید احمد شہید کے مجاہدوں نے جنگ پنجتار کے روز بیعت موت سے پیش کیا؟ بلاشبہ سید صاحب کے مرقعے میں تاج محل، لال قلعہ، تخت طاؤس اور کوہ نور یا دریائے نور کی تلاش بے سود ہو گی۔ ایسے بڑے بڑے لشکر بھی نظر نہیں آئیں گے، جن کے علم اٹھتے تھے تو فضا اپنی ساری پہنائیوں کے باوجود

تنگ نظر آتی تھی۔ رزم و پیکار کے ایسے طوفان بھی نہیں ملیں گے، جن میں سلطنتوں کے شیرازے بکھر بکھر کر جمے، تاج و تخت ریزہ ریزہ اور پاش پاش ہو کر نئے سرے سے استوار ہوئے، لیکن اس خاکے میں وہ سرمدی دولت بدرجۂ کمال موجود ہے، جس سے پہلے خاکے بڑی حد تک خالی نظر آتے ہیں۔ وہ ہے للہیت کی دولت، وہ ہے رضائے باری تعالیٰ کی دولت، وہ ہے جذبۂ سربلندی اسلام کی دولت۔ ایسے سلاطین کی کمی نہیں، جنھوں نے اپنوں اور دوسروں کے خون سے صرف اس لیے ہولی کھیلی کہ روئے زمین کے بڑے حصّے پر اپنی حکمرانی کے تخت بچھا لیں، لیکن اپنے خونِ حیات کے ہر قطرے کو صرف اسلام کی راہ میں بہا دینے کی قدوسیت ہر جگہ نہیں مل سکتی اور معاوضے میں نہ تاج و تخت کی آرزو ہے، نہ حکومت و سلطنت کی۔ نہ شہرت کا خیال ہے، نہ شجاعت و جوانمردی کے لیے تحسین کی طلب ہے۔ نہ یہ ہوس ہے کہ کوئی یادگار قائم ہو یا ایسا عالی شان مقبرہ بنے، جس کی زیارت کے لیے دنیا کے ہر حصّے سے لوگ شدِ رحال کر کے آئیں اوّل و آخر ایک ہی طلب اور ایک ہی آرزو ہے اور وہ یہ کہ کلمہ حق سربلند ہو۔ دنیا کا ہر گوشہ اسلام کے پیغام کا عملی مرقع بن جائے۔ جو آنکھیں اسلامیت کو عالمگیر لشکروں، عدیم المثال تخت گاہوں اور جاہ و جلال کے ہیبت انگیز سامانوں میں دیکھنے کی عادی ہو چکی ہیں، انھیں درویشوں اور مسکینوں کے داعیۂ اسلامیت کا صحیح اندازہ خدا جانے کب ہوگا!

جنگی پوشاک بیعت موت کے بعد سید صاحب نے اسی مقام پر جنگی پوشاک پہنی اور ہتھیار لگائے۔ ان کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے:

۱ - سپید پاجامہ
۲ - سرمئی الخالق، جس میں سرخ تافتے کی سنجاف لگی ہوئی تھی۔
۳ - آبی پٹکا
۴ - کانگریزی دستار
۵ - ساز اور سینگڑا گینڈے کا
۶ - انگریزی پستولوں کی جوڑی جن میں سابری تسمے لگے ہوئے تھے۔
۷ - ولایتی فولاد کی ایک چھری جو شیخ غلام علی الہ آبادی نے نذر کی تھی۔ اس کا تسمہ بھی سابری تھا۔
۸ - ایک تلوار جس میں الٹی کٹوری کا سنہرا قبضہ لگا ہوا تھا۔ اس کا پرتلہ کاکڑ کا تھا۔ یہ ارباب بہرام خاں کی نذر تھی۔
۹ - بڑے تیر کی رائفل، جو دیوان عنایت اللہ (ساکن موضع سالار ضلع مرشد آباد) نے شیخ باقر علی کے

ہاتھ تکیہ شریف (رائے بریلی) بہ طورِ نذر بھیجی تھی۔

نشان لشکر میں تین نشان تھے:

۱۔ صبغۃ اللہ: یہ جماعت خاص کا نشان تھا اور دادا ابوالحسن کے پاس رہتا تھا جو جماعت خاص کے علمدار تھے۔ اس پر پارہ الٓمٓ کا آخری رکوع سُرخ ریشم سے کڑھا ہوا تھا۔ یہ نشان صرف اس لڑائی میں جاتا تھا، جس میں سید صاحب بہ نفس نفیس شریک ہوتے تھے۔

۲۔ مطیع اللہ: یہ ابراہیم خاں خیر آبادی کے پاس تھا۔ اس پر سورۂ بقر کا آخری رکوع سرخ ریشم سے کڑھا ہوا تھا۔

۳۔ فتح اللہ: اس پر سورۂ صف کی یہ آیتیں سُرخ ریشم سے کڑھی ہوئی تھیں: يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ . . . . . . الخ۔ یہ نشان پہلے محمد بن عرب کے پاس تھا، پھر فرج اللہ کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

تینوں نشان اس وقت لشکر میں موجود تھے۔ سید صاحب غازیوں کو لے کر دیوار کے پاس گئے۔ جماعتوں کو جا بجا ٹھہرا دیا، نیز تاکید فرما دی کہ جب تک ہم بندوق نہ چلائیں، کوئی بھائی نہ بندوق چلائے، نہ دیوار پھاند کر آگے بڑھے۔ پھر صفوں کے آگے چل قدمی کرتے ہوئے فرماتے جاتے تھے کہ جس بھائی کو سورہ قریش یاد ہو، گیارہ مرتبہ پڑھ کر دم کر لے۔ جسے یاد نہ ہو، دوسرا بھائی پڑھ کر اس پہ دم کر دے۔ اس سے فارغ ہو کر اپنی رائفل دیوار سے لگا دی اور متوجہ الی اللہ ہو گئے۔

ونتورا کی نقل و حرکت ونتورا سلیم خاں سے آگے بڑھ کر توتالی کے برابر پہنچا۔ وہیں اس نے کھانا کھایا۔ پھر توتالی کے ٹیلے پر چڑھ کر دوربین سے پنجتار اور آس پاس کے مقامات کو بہ غور دیکھا۔ اگرچہ غازی سرحدی مجاہدوں سمیت اڑھائی تین ہزار سے زیادہ نہ تھے[1] لیکن انھیں پہاڑوں پہ اس ترتیب سے بٹھا دیا گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا درے کے دونوں جانب کے ٹیلے غازیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اس پہ ونتورا شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس اثنا میں خادے خاں نے توتالی کے بعض مکانوں کو آگ لگوا دی۔

پھر ونتورا نے اپنی فوج کو پیش قدمی کا حکم دیا۔ چنانچہ ابتدائی دستے پہلی دفاعی دیوار کے پاس پہنچ کر اسے ڈھانے لگے۔ سید صاحب نے سواروں کو پیش قدمی کا حکم دیا اور میرزا حسین بیگ سے فرمایا کہ شاہینوں

---

[1] ایک روایت کے مطابق پانچ ہزار۔

سے دشمن پر گولے پھینکے جائیں۔ جو غازی دائیں بائیں جانب کے پہاڑوں پر بیٹھے تھے وہ عین اس موقع پر نیچے اترنے لگے تاکہ ایسے مقامات پر پہنچ جائیں، جہاں سے دشمن پر موثر حملہ ہو سکے۔ اس حالت میں ایسا معلوم ہونے لگا کہ پہاڑوں کا ایک ایک پتھر حرکت میں آگیا ہے۔ یہ کیفیت دیکھ کر ونتورا کو یقین ہو گیا کہ درے کے اندر جا کر لڑنے سے فوج کو سخت نقصان پہنچے گا۔ ساتھ ہی اس نے فوج کو واپسی کا حکم دے دیا۔ غازیوں نے درے کے ڈھلنے تک دشمن کا تعاقب کیا۔ ایک روایت ہے، خادے خاں نے ونتورا کو یقین دلا رکھا تھا کہ پنجتار میں غازیوں کی تعداد بہت معمولی ہے۔ ونتورا کو جب پہاڑوں پر آدمی ہی آدمی نظر آئے تو خادے خاں پر خفا ہوا۔

اداے شکر

سید صاحب کو ونتورائی واپسی کی خبر ملی تو تالے ہی پر دوگانۂ شکر ادا کیا۔ پھر پنجتار تشریف لے گئے۔ جب خبر مل گئی کہ ونتورا دریائے سندھ سے گزر کر پنجاب پہنچ گیا ہے تو چملہ اور بونیر سے جو لوگ امداد کے لیے بلائے تھے، فتح خاں نے انھیں رخصت کر دیا۔

اس لڑائی میں غازیوں کے خراش تک نہ آئی۔ سکھوں کے دو آدمی مارے گئے۔ خادے خاں نے مانیری پر قبضہ کر لیا تھا، جب ونتورا واپس چلا گیا تو مانیری کے باشندوں نے خادے خاں کے آدمیوں کو مار مار کر بھگا دیا۔

بارھواں باب

تنگی پر شبخون

خادے خاں کی اصلاح کے لیے ایک اور کوشش

خادے خاں کی روش حد درجہ یاس انگیز ہو چکی تھی، لیکن سید صاحب کو اس کی مخالفت میں قدم اٹھاتے ہُوئے بار بار تامل ہوتا تھا۔ حقیقی مصلح کی حیثیت میں آپ چاہتے تھے کہ خان انحراف کا راستہ ترک کر کے کارو بار دین میں معاون بن جائے یا کم از کم مخالف نہ رہے۔ چنانچہ آپ نے ایک معتبر قاصد ہنڈ بھیج کر اسے پنجتار بُلایا۔ اس نے جواب دیا کہ میں پنجتار نہیں آسکتا، سلیم خاں میں مل سکتا ہوں۔ سید صاحب اس کے لیے بھی تیار ہو گئے اور تین سو غازیوں کو لے کر سلیم خاں پہنچ گئے۔ خادے خاں چوتھے پانچویں دن ساٹھ سوار اور چار سو پیادے لے آیا۔ ملاقات کی جگہ مقرر ہو گئی۔ سید صاحب جانے لگے تو دوسرے اصحاب کے علاوہ مولانا شاہ اسماعیل نے اختلاف کیا اور خود جانے کی اجازت مانگی۔

چنانچہ مولانا ایک سو غازیوں کو لے کر مقام ملاقات کی طرف روانہ ہُوئے۔ تورو کے مولوی عبدالرحمٰن، اخوند زادہ قابل اور ڈاگئی کے ایک مولوی صاحب بھی ساتھ تھے۔ تھوڑا فاصلہ رہ گیا تو آپ نے تینوں ساتھیوں کو خادے خاں کے پاس بھیجا۔ اس نے کہا کہ تین چار آدمی لے کر مولانا آجائیں۔ اب غازی مولانا کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ خادے خاں دغا باز آدمی ہے، ہم آپ کو تین چار آدمیوں کے ساتھ نہ جانے دیں گے۔ مولانا نے ان سب کو سمجھا کر مطمئن کیا اور فرمایا کہ خدا ہمارے ساتھ ہے اور کسی بات کا اندیشہ نہیں۔ ملاقات سے مقصود یہ ہے کہ خادے خاں کو سمجھا بجھا کر راہ راست پر لایا جائے۔

ملاقات اور گفتگو

بہر حال میدان میں خادے خاں سے ملاقات ہوئی۔ بات چیت کی کیفیت خلاصۃً یہ تھی:

مولانا: خان بھائی! آپ سے یہ امید نہ تھی کہ سکھوں کو مسلمانوں پر چڑھا لائیں گے اور ان کے ساتھ ہو کر اپنے بھائیوں سے جنگ کریں گے۔ یہ بہت بُرا کیا۔ بغاوت کا ثبوت فراہم کر دیا۔ آپ نے بغاوت پر کیوں کمر باندھ لی ہے؟ اب بھی خیر اسی میں ہے کہ سکھوں کی مشارکت سے توبہ کیجیے۔ توبہ کا دروازہ

ہر وقت کھلا ہوا ہے۔ شریعت کے دائرے سے قدم باہر نہ رکھیے۔ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔ وہ آپ کے گناہ معاف کر دے گا، ورنہ دنیا اور آخرت میں ذلت و رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

خادے خاں: مولانا! خفا نہ ہونا۔ ہم لوگ رئیس اور حاکم ہیں، سید بادشاہ کی طرح مُلّا مولوی نہیں، ہمارا طریقہ جدا ہے، ان کا راستہ جدا۔ سید بادشاہ کی شریعت پر ہم پٹھان لوگ کیوں کر چل سکتے ہیں؟ سید بادشاہ کیوں ہمارے درپے ہیں؟ ہمارے حق میں جو کچھ ان سے ہو سکے، درگزر نہ کریں۔

کمال مایوسی

یہ کمال مایوسی کا پیغام تھا، اگر اس کے رنج و ملال کی کوئی معقول وجہ ہوتی تو سید صاحب اس کی تلافی کے لیے ہمہ تن تیار تھے۔ تالیفِ قلب کے سلسلے میں اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رعایت بھی فرما سکتے تھے، لیکن اس بنیاد کے انہدام پر کیوں کر راضی ہو سکتے تھے جس پر سید صاحب کی ساری تحریک قائم تھی؟ شریعت حقّہ کی جگہ افغانیت اور پختونیت کے تقاضوں کا ساتھ کیوں کر دے سکتے تھے؟ بے شک خادے خاں بہت بڑا رئیس تھا اور اس کے مرکز کو جائے وقوع کے اعتبار سے خاص اہمیت حاصل تھی۔ اگر اسے سکھوں کی مشارکت سے الگ کر لیا جاتا تو سکھ لشکروں کے لیے میدانی علاقے پر بے تکلف چڑھ آنا سہل نہ رہتا۔ اس کے لیے مصالح وقت کے اعتبار سے ہر قیمت ادا کی جا سکتی تھی لیکن یہ کیوں کر گوارا ہو سکتا تھا کہ اس کے پاس خاطر سے شریعت کی جگہ افغانیت کے مراسم و مروجات کو مدارِ کار بنا لیا جائے؟ اور ایک دعوے دار اسلام کی زبان سے یہ کلمہ کس درجہ جسارت و بے باکی پر مبنی تھا کہ ہم لوگ رئیس اور حاکم ہیں، مُلّا مولوی نہیں اور ہم شریعت پر نہیں چل سکتے۔ خادے خاں کے دل و دماغ پر پختونیت اس درجہ غالب تھی کہ ہر سعیِ تفہیم اسے قریب تر لانے کے بجائے دُور ہٹاتی گئی۔ اس کے بعد مجبوراً اس کے باب میں قطعی فیصلہ کرنا پڑا، جس کی تفصیل آگے چل کر معلوم ہوگی۔

خوانین میں مصالحت

چند روز بعد سُدّم سے مبین خاں اور اس کا بھائی امیر خاں سید صاحب کے پاس پہنچے اور منصور خاں رئیس چارگلئی کے خلاف شکایت کی۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارے ہاں برادری کا دستور یہ ہے کہ جب باہمی تقسیم میں دو بھائی دو مختلف گاؤں لے لیں اور ان کی آمدنی میں تفاوت ہو تو سال دو سال کے بعد قبض و تصرف میں مبادلہ ہوتا رہتا ہے تاکہ حصہ داری از روئے انتفاع برابر ہو جائے۔ منصور خاں چونکہ زور آور ہے، اس لیے بدل پر راضی نہیں ہوتا۔ سید صاحب فیصلے کے لیے دورے پر نکلے۔ فتح خاں کو پنجتار سے اور آنند خاں، مشکار خاں کو شیوہ سے ساتھ لیا۔ گڑھی امان زئی میں پہنچ کر گرد و پیش کے خوانین کو بُلایا۔ پورے حالات معلوم کر لینے کے بعد فریقین منازعت کو بلا کر فرمایا کہ آپ راضی ہوں تو ہم خدا و رسولؐ کے حکم کے مطابق فیصلہ کر دیں۔ جب انھوں نے رضامندی

کا اظہار کر دیا تو آپ نے منصور خاں کے خلاف فیصلہ صادر فرمایا۔ منصور خاں نے اسے بہ دل و جان منظور کر لیا۔ پھر سید صاحب گھڑیالہ (یا گھڑیالی) اور چارگلئی ٹھہرتے ہوئے سُدّم تشریف لے گئے۔

اسماعیل زئی اور دولت زئی

اہلِ سمہ میں دو قبیلے بڑے زور آور، پختگیِ قول و عہد میں مسلّم جمہور اور صداقت و وفاداری میں زبانزدِ و مشہور تھے: ایک اسماعیل زئی، دوسرا دولت زئی۔ وہ بیعتِ شریعت میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ مُلا قطب الدین ننگرہاری دورۂ سیر کرتے ہوئے ان کے دیہات میں بھی پہنچ گئے اور حسبِ عادت بڑی صاف گوئی سے انھیں شریعت کے احکام سے آگاہ کیا۔ ان قبیلوں کے مُلّاؤں اور مولویوں کو اجراءِ قانونِ شریعت سے اس لیے اختلاف تھا کہ اول عُشر ملّاؤں کو ملنے کے بجائے امام کے پاس جمع ہوتا، دوسرے غیر شرعی مراسم خصوصاً رسمِ اسقاط سے انھیں جو مالی منفعت حاصل تھی، اس کا دروازہ بند ہو جاتا۔ مُلا قطب الدین ان حقائق سے آگاہ تھے، اس لیے سب باتیں کھول کر بیان کیں۔ اس سلسلے میں ملّاؤں اور مولویوں کی غلط اندیشیوں اور غلط کاریوں کو بھی واضح کیا۔ آخر میں فرمایا: تم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو، حالانکہ تمھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ جو شخص بیعتِ امامت کے بغیر مرا، وہ جاہلیت کی موت مرا اور امام تمھارے درمیان موجود ہے۔ نیز اسقاط شرعاً کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور خدا کے نزدیک یہ قطعاً مقبول نہیں۔

ان لوگوں نے ملّاؤں کو بلا کر کہا کہ مولوی قطب الدین سے مذاکرہ کرو۔ وہ مذاکرہ کیا کرتے؟ شرمندگی اور ندامت کے ساتھ اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کر کے خاموش ہو گئے۔ لوگ اتنے متاثر ہوئے کہ ایک وفد سید صاحب کو بُلانے کے لیے بھیج دیا۔ سید صاحب تشریف لے گئے۔ ان سب سے اقامتِ شریعت کی بیعت لی اور ان کے باہمی جھگڑے ختم کر دیے۔

اہلِ تنگی کا دعوت نامہ

اس قسم کے واقعات نے مختلف مقامات کے افغانوں کو سید صاحب کی طرف مائل کر دیا اور سردارانِ پشاور کی رعایا میں سے بعض افراد آ آکر التجائیں کرنے لگے کہ لشکرِ اسلام کا ایک حصہ ہمارے ہاں بھی بھیج دیجیے، ہم ہر ممکن خدمت بجا لائیں گے۔

ان دنوں میں مولوی امیر الدین ولایتی سید صاحب سے مشورے کر کے کبھی کبھی تنگی[1] جایا کرتے تھے اور وہاں سے بھی دو تین مرتبہ چار چار پانچ پانچ آدمی آتے۔ ان مشوروں کا حال کسی کو معلوم نہ تھا۔ ایک روز خود سید صاحب نے بعض خوانین سے ذکر کیا کہ تنگی سے ہمارے پاس کئی آدمی آ چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

---

[1] تنگی ہشت نگر کے علاقے میں ہے۔ پشاور کے شمال میں قریباً ۲۹، ۳۰ میل کے فاصلے پر ہو گا۔

جب سے ہماری بستی میں دُرانیوں کا عمل دخل ہوا ہے، ہم مصیبت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ ہمیں بہت تنگ کرتے ہیں۔ ہم نے بڑی کوشش سے بستی کے تمام لوگوں کو ہم رائے بنایا ہے۔ اگر آپ کچھ غازی بھیج دیں تو بستی پر آپ کا قبضہ کرا دیں گے۔ اس طرح پشاور کا راستہ کُھل جائے گا۔ یہ بیان فرما کر سید صاحب نے خوانین سے پوچھا کہ آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟

سب نے غور و فکر کے بعد اس تجویز پر پسندیدگی ظاہر کی۔ سید صاحب نے تین سو غازیوں کا لشکر تیار کیا اور مولانا شاہ اسماعیل کو امیر بنا کر تنگی بھیج دیا۔ ارباب بہرام خاں اور مولوی امیر الدین ولایتی بھی ساتھ تھے۔

رخنہ اندازی

تنگی سُدم سے بیس بائیس کوس ہوگا۔ عشا کے وقت غازی روانہ ہوئے۔ پورا فاصلہ ایک مسافت میں طے نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے صبح ہوئی تو ایک نالے پر ٹھہر گئے۔ تنگی کے دو آدمیوں کو عصر کے وقت آگے بھیج دیا کہ اپنے ہمسروں کو خبر کر دیں۔ خوب اندھیرا ہو گیا تو پھر روانہ ہوئے۔ جب تنگی پاؤ کوس پر رہ گیا تو غازیوں کو روک کر گاؤں کے ان آدمیوں کو بھیجا گیا، جو لشکر کے ساتھ تھے۔ تیس چالیس قدم کے فاصلے پر انھیں چار زرہ پوش سوار ملے۔ ان سے بات چیت کر کے واپس آئے تو مولانا، ارباب بہرام خاں اور مولوی امیر الدین کو ساتھ لے گئے۔ اس وقت یہ راز کُھلا کہ ایک گروہ پہلے فیصلے سے پھر گیا ہے۔ اس نے درانیوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ان حالات میں اگر بستی پر حملہ کیا گیا تو ان لوگوں کو خوفناک مصیبتوں سے سابقہ پڑے گا جو خلوص کے ساتھ درانیوں کے خلاف کوششیں کرتے رہے۔

مولانا کو طبعاً اس صورت حالات پر سخت رنج ہوا۔ میاں دین محمد نے کہا کہ تنگی والوں کی مشکیں کس لینی چاہئیں۔ محمد عرب بھی انھیں سخت سزا دینا چاہتے تھے، لیکن بہرام خاں اور مولوی امیر الدین نے جو سرحد کے اوضاع و رسوم سے پوری طرح واقف تھے، سب کو روک دیا اور ان لوگوں کو بہ خیر و عافیت بستی میں جانے کی اجازت دے دی۔

لشکر واپس ہوا تو اسی نالے پر پڑاؤ کیا جہاں پہلا دن گزارا تھا۔ برسات کا موسم تھا۔ غازیوں کی ایک جماعت پار اُتر گئی تو نالے میں اچانک زور کا پانی آ گیا اور عبور ممکن نہ رہا۔ چنانچہ سب غازی ایک دن اور ایک رات وہیں ٹھہرے رہے۔ جب پانی پایاب ہوا اور بقیہ غازی پار اُترے تو لشکر سُدم پہنچا۔ تنگی کا واقعہ ۱۵۔ محرم ۱۲۴۵ھ (۱۷۔ جولائی ۱۸۲۹ء) کو پیش آیا۔

تیرھواں باب

جنگِ ہنڈ

دور کاوٹیں بیعت شریعت اور جنگ پنجتار کو سید صاحب کی تحریک میں بہ اعتبار تاثیر و نفوذ خاص اہمیت حاصل ہے۔ جن لوگوں میں سعادت کا جوہر موجود تھا، وہ اقامت شریعت کی برکات و حسنات سے متاثر ہوئے۔ جن کی نظریں کسی تحریک کے معنوی ثمرات پر نہیں بلکہ صرف اس کی صلاحیت استقامت اور استعداد دفاع پر ہوتی ہیں، ان کے لیے یہ واقعہ جالب توجہ ہوا کہ جنگ پنجتار میں غازیوں کی چھوٹی سی جماعت نے سکھوں کی بہت بڑی فوج کو ناکام مراجعت پر مجبور کر دیا۔ اس وجہ سے ان طبقات میں بھی بیعت و اطاعت کی رغبت پیدا ہو گئی، جو ابھی تک سید صاحب سے الگ تھے۔ لیکن اس راستے میں دو بڑی مشکلیں کھڑی ہو گئی تھیں: اوّل سرداران پشاور خصوصاً یار محمد خاں، دوم خادے خاں رئیس ہنڈ۔

یار محمد خاں یار محمد خاں نے جنگ شیدو کے وقت سے سید صاحب کی مخالفت کو شعار خاص بنا لیا تھا اور وہ سکھوں کا معین و رفیق بن گیا۔ ابتدا میں وہ چھپ چھپ کر مزاحمت کے اسباب پیدا کرتا رہا، لیکن کچھ عرصے کے بعد کھلم کھلا میدانِ مقابلہ میں آ گیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس اثنا میں سکھوں کی طرف سے پے بہ پے اس کی تذلیل بھی ہوتی رہی۔ کبھی اس کے بیٹے کو یرغمال میں پکڑ کر لاہور لے گئے، کبھی خراج بڑھا دیا اور کبھی "لیلیٰ" نام گھوڑی کی طلب کے سلسلے میں پشاور پر چڑھائی کر دی، لیکن تازیانۂ تذلیل کی پیہم ضربیں بھی یار محمد خاں کی حس غیرت و حمیت کو بیدار نہ کر سکیں اور وہ جس غلط راستے پر پڑ چکا تھا، تادم واپسیں اسی سے چمٹا رہا۔

خادے خاں خادے خاں کی حیثیت اس سے مختلف تھی۔ وہ ایک حد تک رقیبانہ جذبات کے زیر اثر سید صاحب سے برگشتہ ہوا تھا۔ یعنی اسے یہ منظور نہ تھا کہ سید صاحب خان زیدہ کو اس سے بہتر سمجھیں، حالانکہ ہر شخص کو بہتر یا کم تر سمجھنے کا انحصار اصلاً اس کے اعمال پر ہوتا ہے۔ نیز اسے یہ منظور نہ تھا کہ سید صاحب ہنڈ کو چھوڑ کر پنجتار کو مرکز بنائیں اور اس طرح خادے خاں کے بجائے فتح خاں کو اس تحریک میں مرکزی حیثیت مل جائے۔ پھر مانیری کے واقعے نے اس کی "افغانیت"

اور "اسلامیت" کے درمیان سخت کشمکش پیدا کر دی، جس میں "افغانیت" غالب آئی اور وہ بھی سید صاحب سے کٹ کر سکھوں کا معاون گیا۔

تین راستے

سمہ تحریک جہاد و تحریک اقامت شریعت کا مرکز تھا۔ اب اس کے لیے دو جانب سے خطرے پیدا ہو چکے تھے۔ شمال و مغرب میں سرداران پشاور کی طرف سے اور جنوب میں خادے خاں کی طرف سے۔ تنگی سے بے نیل مرام مراجعت کے بعد غازیوں کے لیے عمل کے تین راستے رہ گئے تھے:

۱۔ موت پر بیعت کر کے سرداران پشاور سے لڑیں، اس لیے کہ ان کی قوت غازیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔

۲۔ خادے خاں کی سرکوبی کریں اور اس کا خرخشہ مٹا دیں۔

۳۔ سمہ کو چھوڑ کر پکھلی چلے جائیں اور وہاں نیا مرکز پیدا کریں، جو کم از کم اپنوں کی مصیبت خیز دراندازیوں سے محفوظ ہو۔

نئے مرکز کی تاسیس میں تامل کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی، لیکن سرداران پشاور اور خادے کا مقابلہ کیے بغیر نکل جانے کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا کہ جن لوگوں کو دو اڑھائی برس کی کوششوں سے ایک نظام کے ماتحت لانے کا مناسب انتظام کیا تھا اور جو سید صاحب کی معیت میں دونوں مخالف قوتوں کے غیظ و عتاب کا مرجع بن چکے تھے، وہ بے یار و مددگار رہ جاتے۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوتا کہ نئے مرکز میں بھی مختلف لوگ جب چاہتے، ذاتی اغراض کے جنون میں ویسی ہی مشکلات پیدا کر دیتے، جیسی سمہ میں پیدا ہو گئی تھیں۔ لہٰذا سید صاحب کے لیے حفظ و دفاع میں لڑنا بالکل ناگزیر ہو گیا تھا۔ لڑائی سرداران پشاور اور خادے خاں سے یکے بعد دیگرے ہی ہو سکتی تھی۔

باطل کی دو صورتیں

جن لوگوں کی نظریں بالعموم ظاہری و سطحی حالات سے متاثر ہو جاتی ہیں، ان کے اطمینان کے لیے یہ حقیقت واضح کر دینا ضروری ہے کہ اہل حق کی لڑائی ذاتی اغراض، شخصی مقاصد اور انفرادی مصالح کی نجاستوں سے بالکل پاک ہوتی ہے۔ ان کا مدعا صرف یہ ہوتا ہے کہ باطل کو مٹا کر حق کے لیے غلبہ و تفوق کا بندوبست کریں۔ باطل کی دو صورتیں ہیں: ایک جلی، دوسری خفی۔ جلی وہ ہے جو اپنے ظاہر و باطن میں کسی بحث و دلیل یا تشریح و توضیح کا محتاج نہ ہو۔ خفی وہ ہے، جس کے ظاہر پہ باطل کا حکم لگانے کی کوئی وجہ نہ ہو، تاہم اس کے فعل و عمل کی ہر صلاحیت حق کے بجائے باطل کے رسوخ و برتری کی خاطر وقف ہو جائے اور اس طرح صورۃً نہیں تو معناً اور ظاہراً نہیں تو باطناً وہ

باطل کے حکم میں داخل سمجھا جائے۔ ان حالات کے پیشِ نظر اہلِ حق کے لیے فیصلہ و تحکیم میں یقیناً امتیاز و استثناء کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی اور باطل کی ہر قوت سے لڑنا پڑتا ہے، اگرچہ لڑائی کتنی ہی ناپسند ہو۔

یہی حالت سید صاحب کو پیش آئی جس سے بچنے کے لیے انھوں نے کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا۔ لیکن حالات کے بے پناہ سیل کا بہاؤ نہ رکا اور جو کچھ پیش آیا اس پر جتنا بھی افسوس اور رنج کیا جائے، بالکل بجا ہوگا، لیکن اس سلسلے میں سید صاحب کے فیصلہ و تحکیم کا دامن ہر داغ سے کاملاً پاک ہے۔ جب اس قسم کے اسباب پیش آئیں گے، شریعتِ حقہ اور مصالحِ ملیہ کا حکم بہرحال وہی ہوگا جس پر سید صاحب عمل پیرا ہوئے۔

ہنڈ پر حملے کی تیاری

غرض غور و مشورہ کے بعد یہ تجویز قرار پائی کہ سب سے پہلے خادے خاں کا خرخشہ مٹایا جائے۔ اول اس لیے کہ بار بار تفہیم و انتباہ کے باوجود وہ مخالفت میں زیادہ سرگرم و متصلب ہوتا گیا، یہاں تک کہ سکھوں کو ترغیب دے دے کر ایک سے زیادہ مرتبہ اہلِ سمہ کے لیے مصیبتیں پیدا کرنے میں بھی متامل نہ ہوا۔ دوم اس لیے کہ اس کا مقام (ہنڈ) جائے وقوع کے اعتبار سے بڑا اہم تھا اور سکھ اس سے پورا فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ سوم اس لیے کہ اگر خادے خاں کو چھوڑ دیا جاتا تو اجرائے شریعت کا جو بندوبست کیا گیا تھا وہ دوسرے حصوں میں بھی مختل و مضطرب ہو جاتا، اس لیے کہ سب پرسش و احتساب سے بے پروا ہو جاتے[1]۔

ہنڈ پر حملے کا فیصلہ ہو چکا تو تیاری کے لیے سید صاحب نے سُدّم میں بستی کے کنارے پر ایک حویلی خالی کرائی جس میں اخفاء کی مصلحتیں بہتر طریق پر پوری ہو سکتی تھیں۔ وہاں آپ نے چیڑ کی لکڑی کے قلابے اور سیڑھیاں بنوائیں۔ تمام جماعتوں میں سے پانسو آزمودہ کار غازی چُنے۔ مولانا شاہ اسماعیل کو ان کا امیر اور ارباب بہرام خاں کو نائب امیر بنایا، لیکن امیر اور نائب امیر کے سوا (جو مجلس شوریٰ کے ممتاز رکن تھے) کسی کو معلوم نہ تھا کہ کس طرف جانا مقصود ہے۔ رخصت کے وقت سید صاحب نے مولانا سے علی الاعلان صرف یہ کہا کہ "آپ گڑھی امان زئی ہو کر جائیں، ہم بھی آپ کے پیچھے پیچھے پنجتار آتے ہیں" ساتھ ہی باورچی خانہ کا سامان خچروں پر لدوا کر بھیج دیا۔ سیڑھیاں اور قلابے شلیتوں میں لپیٹ کر اونٹوں پر سوار کرا دیے۔ ارباب بہرام خاں کو ان کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اس طرح عوام اور غازی یہی سمجھتے رہے کہ

---

[1] منظورہ میں خود سید صاحب کی ایک تحریر ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خان ہنڈ کی مثال نے بعض شریروں کو اس درجہ دلیر و جری بنا دیا تھا کہ وہ برملا کہتے تھے: خانِ ہنڈ نے شریعت قبول نہ کی، با او چہ شد کہ با ما خواہد شد۔

پنجتار جانا منظور ہے۔

سفر کی صعوبتیں

مولانا، بازار (سُدم) سے گڑھی امان زئی ہوتے ہوئے ترکئی پہنچے۔ ارباب بہرام خاں پہلے شیوہ گئے پھر ترکئی میں مولانا سے جا ملے۔

ترکئی سے ہنڈ گیارہ بارہ کوس پر تھا۔ مولانا نے غازیوں کو ضرورت کے مطابق رسد دے کر تاکید فرما دی کہ جلد سے جلد دو وقت کا کھانا تیار کر لیں۔ مغرب کے بعد ترکئی سے نکل کر پہلے پنجتار کی جانب گئے تاکہ اہل ترکئی میں سے بھی کسی کو شبہ پیدا نہ ہو کہ کسی دوسری طرف جا رہے ہیں۔ دو کوس پر نماز عشا ادا کی، پھر جن کے پاس گھوڑے اور ٹٹو تھے انھیں پنجتار بھیج دیا اور خود ہنڈ کی جانب اس علاقے میں نکل پڑے جہاں دُور دُور تک کوئی آبادی نہ تھی[1] اندھیری رات اور میدانی علاقہ، وہاں سے ہنڈ سات کوس، نہ آبادی کا سُراغ، نہ سمت وجہت کا پتہ۔ خادے خاں کے ایک عم زاد بھائی، محمد بیگ[2] خاں کو خان کے خلاف خون کا دعویٰ تھا، وہ رہبری کے لیے ساتھ تھا۔ لیکن تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ بھی راستہ بتانے سے معذور ہو گیا۔ اگست[3] کا مہینا، شدید گرمی کا موسم، قدم قدم پر پیاس لگتی۔ ان سب مصیبتوں اور زحمتوں پر مستزاد یہ پریشانی کہ اگر صبح ہونے سے پہلے پہلے ہنڈ نہ پہنچے تو اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ چلتے چلتے کافی رات گزر گئی تو یہی مناسب سمجھا گیا کہ کسی ایسے مقام کی طرف نکل جانا چاہیے جہاں صبح ہونے سے پہلے پہلے جا چھپیں اور سارا دن اخفا میں گزار کر اگلی شب میں حملے کی تدبیر کریں۔ اس مصلحت کے پیش نظر غازیوں کی کئی ٹولیاں ایک دوسری سے الگ ہو گئیں۔

آخر خود مولانا نے ایک جگہ ٹھہر کر توکلاً علی اللہ ایک سمت مقرر کی اور ادھر چل پڑے۔ پھر ایک ایک آدمی مل گیا جو ہنڈ کے راستے سے بخوبی واقف تھا۔ اس طرح صبح کاذب کے وقت مولانا قریباً ڈیڑھ سو غازیوں کے ہمراہ اس تالاب پر پہنچ گئے جو ہنڈ سے ایک گولی کی زد پر تھا۔ واقعہ حضرو کے بعد سید صاحب اسی جگہ ٹھہرے تھے۔ بیعت امامت جہاد بھی اسی مقام پر ہوئی تھی۔

وقائع میں ہے مولانا بازار سے گڑھی امان زئی پہنچے (آٹھ کوس)، اور تین چار روز تک وہاں بعض انتظامات کی تکمیل میں مصروف رہے۔ پھر سید صاحب سے دوبارہ اجازت لے کر ترکئی آ گئے (سات کوس)، ظاہراً رخ اگرچہ پنجتار ہی کی طرف تھا اور اعلان بھی یہی تھا کہ پنجتار جا رہے ہیں، لیکن ترکئی میں خان ہنڈ کے دوست بھی رہتے تھے؛ انھیں شبہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے ترکئی سے بہ اہتمام خاص پنجتار کا رخ کیا۔ [2] "منظورہ" میں محمد بیگ خاں کو خادے خاں کا عم لکھا ہے: یکے از اقربائے والی ہنڈ، محمد بیگ خاں نام عم او بود (صفحہ ۵۱۷)۔ [3] ہنڈ پر حملہ ۸۔ صفر ۱۲۴۵ھ (۱۰۔ اگست ۱۸۲۹ء) کو ہوا تھا۔

حملے کی نئی سکیم

اب بقیہ غازیوں کا انتظار ہونے لگا، زیادہ تر اس لیے کہ سیڑھیاں بھی انھیں کے پاس تھیں اور سیڑھیوں کے بغیر قلعہ کی دیواروں پر چڑھ کر اندر پہنچنا غیر ممکن تھا۔ جب ان کا کوئی نشان نظر نہ آیا اور ادھر صبح صادق نمودار ہونے لگی تو مولانا نے حملے کو ملتوی کرنے کے بجائے نئی سکیم بنائی، جس میں سیڑھیوں کی بھی ضرورت نہ تھی۔ سیڑھیاں آ بھی جاتیں تو بیکار تھیں، اس لیے کہ صبح ہو چکی تھی اور دیواروں پر چڑھ کر حملے کا وقت گزر چکا تھا۔

مولانا نے ڈیڑھ سو غازیوں کو پانچ دستوں میں تقسیم کیا۔ ایک دستہ اپنے پاس رکھا اور چار دستے شیخ ولی محمد کے حوالے کر کے حکم دے دیا کہ انھیں قلعے کے دروازے سے باہر دونوں طرف گنّے کے کھیتوں میں مناسب مقامات پر بٹھا دیجیے۔ جب دروازہ کھلے تو فوراً بندوقیں چلا کر اندر داخل ہو جائیے۔ ہم بھی بندوقوں کی آواز سنتے ہی پہنچ جائیں گے۔ شیخ نے تین دستے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ایک سمت کے کھیتوں میں بٹھائے، چوتھے دستے کو خود لے کر کھیت کے اس گوشے میں جا بیٹھے جو دروازے سے عین متصل تھا۔

یہ انتظامات ہو چکے تو قلعے میں سے پہلے ایک گدھے کے بولنے کی آواز آئی۔ پھر مسجد میں اذان ہوئی، بعد میں ایک شخص نے قلعے کے اندر سے آ کر چوکیدار سے کہا کہ دروازہ کھول دو۔ وہ بولا کہ سید بادشاہ کے چھاپے کی خبر تھی۔ دروازہ خان کے حکم کے بغیر نہ کھولوں گا۔[1] اس شخص نے کہا کہ اب تو نماز فجر کی اذان بھی ہو گئی۔ چھاپا آتا تو رات کو آتا، اب کیا آئے گا؟ چوکیدار نے پھر بھی احتیاط کے طور پر ایک آدمی سے کہا کہ کوٹھے پر چڑھ کر ادھر ادھر دیکھ لے۔ چنانچہ دیکھا گیا، لیکن نظر کیا آ سکتا تھا۔ مولانا اپنے دستے کے ساتھ تالاب کے پاس چھپے بیٹھے تھے، باقی غازی گنّے کے کھیتوں میں مستور تھے۔[2][3]

---

[1] سید عبدالجبار شاہ ستھانوی نے اس سلسلے میں بابا بہرام خاں تنولی کا بیان پیش کیا ہے۔ جو خود حملۂ ہنڈ میں غازیوں کے ساتھ تھے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ مولانا محض اخفا کی غرض سے پہلے گڑھی امان زئی پھر ترکئی گئے۔ پانی کی بطلیں ساتھ لے لی تھیں، اس لیے کہ سامنے بے آب بیابان تھا جو پینتیس میل لمبا اور قریباً اتنا ہی چوڑا تھا۔ باقی غازی اس کے مغربی گوشے میں سے ہو کر صبح کے وقت ہنڈ پہنچے۔ نیز مولانا کے ساتھ صرف اسّی آدمی تھے۔ ملخصاً (عبرۃ لاولی الابصار صفحہ ۲۳۶)

[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہنڈ والوں کو صحیح وقت اور تاریخ یورش کا علم ہو یا نہ ہو، لیکن یہ اندیشہ ضرور تھا کہ سید صاحب یورش کریں گے۔ ایک روایت میں ہے کہ پہلے ۱۰۔ صفر کی تاریخ طے کی تھی، پھر تین دن پہلے حملہ کر دیا۔ بہرحال حملے کی شہرت ضرور تھی۔

[3] بابا بہرام خاں تنولی کا بیان ہے کہ مولانا نے کل ۲۵ قرابین دار بھیجے تھے۔ منظورہ میں بھی یہی ہے کہ: مولانا صاحب بست و پنج نفر قرابین چیاں و تفنگچیاں چغتائی را کہ بہ چابک دستی و چالاکی ممتاز لشکر بودند اولاً روانہ نمودند کہ شمایاں نزدیک دروازہ قلعہ بہ کمال ہوشیاری خفیہ خفیہ برسید (صفحہ ۵۱۵)

قلعے کے دروازے پر قبضہ

شیخ ولی محمد چونکہ بالکل پاس تھے، اس لیے ساری گفتگو سُن رہے تھے۔ آخر دروازہ کھلا اور وہ شخص اس سمت میں نکل گیا جدھر کوئی غازی نہ تھا۔ پھر ایک کسان ہل کندھے پر رکھے اور بیلوں کی جوڑی ساتھ لیے نکلا اور اسی راستے پر ہو لیا، جو کھیتوں کے بیچ میں تھا۔ وہ تین دستوں کے پاس سے گزر گیا چوتھے کے روبرو پہنچا تو اتفاقاً اس کی نظر کسی غازی پر پڑ گئی۔ دیکھتے ہی اس نے شور مچانا چاہا۔ عبداللہ خاں رام پوری نے بجلی کی تیزی سے لپک کر ایسا وار کیا کہ آواز نکلنے سے پیشتر ہی اس کا کام تمام ہو گیا۔

عین اسی وقت شیخ ولی محمد کمین گاہ سے نکل کر دروازے میں جا گھسے اور دو چار ہی لمحوں میں وہاں اپنا بندوبست کر لیا۔ ملا قطب الدین نے فوراً قرابین چلا دی، جس کی آواز سنتے ہی مولانا اپنے دستے کو لے کر نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے شیخ ولی محمد کے پاس پہنچ گئے۔ اس اثنا میں بچھڑے ہوئے غازیوں کی ایک جماعت بھی قریب آ گئی تھی۔ ان کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔

مولانا نے پہنچتے ہی بہ آواز بلند اعلان کرا دیا کہ جو شخص دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کرے گا، مارا جائے گا۔ جو لوگ اپنی جگہوں پر چپ چاپ بیٹھے رہیں گے اور کسی معاندانہ حرکت میں حصہ نہیں لیں گے، انھیں کوئی ضرر نہ پہنچایا جائے گا۔ ہم صرف خادے خاں کے لیے آئے ہیں اور کسی سے کوئی سروکار نہیں۔ سب لوگ دم بخود ہو کر اپنے گھروں میں بیٹھ گئے۔ محمد بیگ خاں غازیوں کی ایک جماعت کے ساتھ خادے خاں کے مکان کی طرف گیا۔

خادے خاں کا قتل

بعض لوگوں نے ایک رات پہلے اسے آگاہ کر دیا تھا کہ سید پادشاہ کا لشکر حملے کے لیے آنے والا ہے، خبردار رہو۔ وہ بے اختیار ہنس پڑا اور بولا کہ نامرد لوگ اپنی عورتوں سے باتیں سُن سُن کر مجھے سُنانے کے لیے آ جاتے ہیں:

سید چیست کہ ارادۂ ایں طرف نماید؟
یک بے چارہ فقیر محتاج نانِ خود ست۔

سیّد کی کیا ہستی ہے کہ اس طرف کا ارادہ کرے؟ وہ بیچارہ فقیر خود اپنی روٹی کے لیے بھی محتاج ہے۔

اسے یقین تھا کہ اس پر حملہ ہو گا تو راستے کے اہل دیہات پہلے خبر پہنچا دیں گے۔

علی الصباح قرابینوں کی آواز نے اسے جگایا تو مبہوت رہ گیا۔ اپنے آدمیوں کو کمر بندی کا حکم دیا، لیکن وہ سب تو پہلے ہی اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے تھے۔

اس کے بعد جو کچھ پیش آیا، اس کے متعلق روایتوں میں اختلاف ہے اور کسی ایک کی توثیق یا ترجیح

کا کوئی ذریعہ نہیں۔ "منظورہ" کا بیان ہے کہ خادے خاں نے اپنے اہل خانہ کو سادات کے مکان پر بھیج دیا، اس لیے کہ سادات اور ملاؤں کے مکانات پٹھانوں میں جائے امن سمجھے جاتے تھے اور سخت سے سخت دشمن بھی ان کے مکانوں میں کسی کو آزار نہیں پہنچاتے تھے۔ پھر اپنا مال سمیٹنے لگا۔ غازی پہلی مرتبہ اس مکان میں داخل ہوئے تو کچھ سراغ نہ ملا۔ دوسری مرتبہ تلاش کرتے کرتے وہاں پہنچے تو وہ چھت پر چڑھ کر اضطرار کے عالم میں ادھر ادھر پھر رہا تھا[1]۔ غازیوں نے پے بہ پے بندوقیں سر کیں اور وہ مارا گیا۔ اس وقت تک دو سو مزید غازی ہنڈ پہنچے تھے۔ باقی دو گھڑی دن چڑھے آئے[2] اس کا مال و اسباب معلوم نہیں کہاں گیا اور کون لے گیا۔

"وقائع" میں ہے کہ غازیوں کے حملے کی اطلاع پا کر خان نے تلوار باندھی، پستول کی جوڑی لی اور کوٹھے پر چڑھ کر پکارنے لگا کہ جلد نقارہ بجاؤ اور مقابلے کے لیے کمریں باندھ لو۔ اس اثنا میں چار غازیوں نے جوڑ کر بندوقیں ماریں۔ خدا جانے کس کی گولی لگی کہ وہ اپنی جگہ سے اچھل کر دھم سے زمین پر آگرا۔ محمد بیگ خاں نے آگے بڑھ کر کئی مرتبہ تلوار کے وار کیے اور اس کا کام تمام کر ڈالا[3]

بابا بہرام خاں تنولی فرماتے ہیں کہ قلعہ کے دروازے پر قبضہ ہو گیا تو خادے خاں گھوڑے پر سوار آرہا تھا اور اپنے آدمیوں کو مقابلے کے لیے اُٹھا رہا تھا۔ اسی حالت میں وہ قرابینوں سے مارا گیا[4]

قلعے میں غازیوں کا حسنِ انتظام

خان کے مارے جانے کے بعد مولانا نے اس کے مکان کے باہر جماعت خاص کا پہرہ لگا دیا تا کہ کوئی شخص اندر نہ گھسنے پائے۔ پھر شیخ ولی محمد، ارباب بہرام خاں اور چار پانچ ممتاز ملاؤں کو بھیجا کہ دروازے پر کھڑے ہو کر خواتین کو تسلی دیں اور کہیں کہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، خود انھیں کوئی آزار نہیں پہنچے گا۔ خان کا بڑا بیٹا شور و غل میں کہیں

---

[1] منظورہ میں ہے دو وسہ بار حملہ کردند۔ [2] منظورہ صفحہ ۵۱۷، ۵۱۸ [3] وقائع صفحہ 1112 ۔ [4] سید عبدالجبار شاہ کی کتاب عبرۃ لاولی الابصار ۲۳۶ ۔

بیلیو (BELLEW) نے خدا جانے کس بنا پر لکھ دیا کہ سید صاحب نے خادے خان پر حملہ کیا۔ جب کامیاب نہ ہوئے تو اخوند سوات کے ذریعے سے صلح کی کوشش شروع کر دی۔ اخوند سوات نے اسے بلایا۔ جب وہ محافظوں سے الگ ہوا تو سید صاحب نے اسے قتل کرا دیا اور خود پنجتار چلے گئے۔ یہ بیان سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ میرا خیال ہے کہ بیلیو نے یہ بات مقامی آدمیوں سے سنی، جو غرض مندوں کی پھیلائی ہوئی جعلی کہانیوں کے سوا کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ میں بالاکوٹ اور بعض دوسرے مقامات پر ایسے کئی افسانے سن چکا ہوں۔

بھاگ گیا تھا۔ چھوٹا بیٹا بھوسے والی کوٹھڑی میں چھپا ہوا ملا۔ اسے بہ حفاظت تمام زنانے میں پہنچا دیا گیا۔ قلعے میں عام اعلان ہو گیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر باہر نہ نکلے اور نہ بھاگنے کی کوشش کرے۔ سب کو امن ہے۔ خادے خاں کی لاش چارپائی پر ڈال کر اس کے مکان کے پچھواڑے میں ایک حجرے کے اندر رکھوا دی گئی۔

فتح ہنڈ غازیوں کی حیرت انگیز صلاحیت تحمل شدائد، وفور عشق مقاصد، کمال تدبر و حسن تدبیر اور یگانہ جرأت و مردانگی کا ایک درخشاں کارنامہ ہے۔ خاص طور پر قابل ذکر امر یہ ہے کہ اتنا بڑا قلعہ فتح ہو گیا۔ ایک بہت بڑا خطرہ ختم ہو گیا، لیکن خادے خاں اور اس کسان کے سوا جو راستے میں مارا گیا تھا، اہل ہنڈ میں سے کسی کے خراش تک نہ آئی اور نہ ایک دمڑی کا مال لُٹا۔ سید صاحب حسب قرارداد سُدّم سے گھڑیالی پہنچ چکے تھے۔ وہیں ان کے پاس مژدۂ فتح بھیج دیا گیا۔

خان کی تدفین

خان کے گھر کی خواتین اپنے کپڑے، زیور اور نقد روپیہ لے کر پڑوس میں ایک ملا کے مکان پر چلی گئیں اور باقی اثاث البیت کو ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ چند گھنٹوں کے بعد خادے خاں کے بھائیوں امیر خاں اور غلام خاں[1] کی طرف سے پیغام آیا کہ خان کی لاش اور اس کے اہل و عیال کو ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ مولانا نے فرمایا کہ خان کی لاش جس وقت چاہو لے جاؤ اور جہاں چاہو دفن کرو، لیکن اہل و عیال کو امیر المومنین کی اجازت کے بغیر نہیں بھیجا جا سکتا۔ آخر غلام خاں اور امیر خاں نے لاش اٹھوائی اور قلعہ ہنڈ سے آٹھ نو سو قدم کے فاصلے پر آبائی گورستان میں اسے دفن کر دیا۔ مولانا نے تاکیدی حکم دے دیا تھا کہ کوئی غازی ان سے متعرض نہ ہو۔

اقربا کی دو عملی

اس کے بعد پھر روایتوں میں جزوی اختلاف ہے۔ "وقائع" کا بیان ہے مولانا نے سید صاحب کی خدمت میں عریضہ بھیجا تھا کہ خادے خاں کے بھائی اس کے اہل و عیال کو لے جانا چاہتے ہیں، اس پر سید صاحب نے اجازت دے دی، لیکن "منظورہ" میں ہے کہ خادے خاں کے بھائی ملکی خوانین کو ورغلانے اور برانگیختہ کرنے لگے تھے اور سید صاحب کے خلاف جوڑ توڑ میں مشغول ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے مولانا کی رائے ہوئی کہ اہل و عیال کو ان کے حوالے نہ کیا جائے۔ اب ان کی شرارتوں کا یہ عالم ہے تو اہل و عیال کی رہائی کے بعد

---

[1] منظورہ میں غلام خاں کو بھائی نہیں بلکہ ایک قریبی رشتہ دار اور مشیر لکھا ہے (صفحہ ۵۲۱)

خدا جانے کیا کریں۔

زیدہ کا رئیس مقرب خاں اگرچہ سید صاحب کا عقیدت مند مرید تھا، لیکن خادے خاں کے ساتھ اس کی دوہری رشتہ داری تھی۔ خان کی بہن اس کی بیوی تھی اور اس کی بہن خان کی بیوی تھی، لہٰذا وہ بھی اسی بات پر زور دے رہا تھا کہ اہل و عیال کو رہا کر دیا جائے اور ہنڈ کی ریاست امیر خاں کو دے دی جائے۔ سید صاحب نے اس کے پاس خاطر سے لکھ بھیجا کہ خادے خاں کے اہل و عیال کو رہا کر دیا جائے۔

چودھواں باب

از ہُنڈ تا زیدہ

آتش فتنہ کا اشتعال

خادے خاں کے اقربا ایک طرف خان کے اہل و عیال کی رہائی کے لیے التجائیں کر رہے تھے، دوسری طرف اُس پاس کے دیہات میں پھر پھر کر لوگوں کو اکسا رہے تھے کہ خان کے خون کا بدلہ لینے میں امداد دو۔ وہ مقرب خاں کے پاس بھی پہنچے، جو رشتہ داری کے باعث خادے خاں کے قتل پر رنج و غم میں ان کا شریک تھا، لیکن مخالفانہ سرگرمیوں کا قطعاً روادار نہ تھا، بلکہ اس نے صاف کہہ دیا کہ پوچھے بغیر میرے پاس چلے آنا بالکل نامناسب تھا۔ مخالفت کا طریقہ غلط ہے، اگر اسے چھوڑ دو تو میں سید صاحب کے پاس جا کر تمھارے قلعے اور خان کے اہل و عیال کی رہائی کے لیے بھی کہہ سکتا ہوں[1]

اس اثنا میں سید صاحب نے حکم بھیج دیا تھا کہ خان کے اہل و عیال کو چھوڑ دیا جائے۔ مقرب بھی بار بار اسی بات پر زور دے رہا تھا۔ مولانا نے ایک خط میں تمام مصلحتیں بطریق مرموز لکھیں جن کا مطلب سید صاحب کے سوا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا اور یہ خط مقرب خاں کے حوالے کر دیا کہ سید صاحب کو پہنچا دیا جائے۔ مقرب نے اُسے اپنے منشی سے پڑھوایا تو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ وہ وہمی طبیعت کا آدمی تھا، دل میں وسوسہ بیٹھ گیا کہ مولانا نے مرموز طریق پر اس کی شکایتیں لکھ دی ہیں۔ بس یہ سمجھتے ہی زیدہ کو چھوڑ کر کسی سمت نکل گیا۔ آخر اس کے بھائی فتح خاں نے سید صاحب کی اجازت سے زیدہ کی ریاست سنبھال لی۔

---

[1] ایک روایت ہے، سید صاحب نے مقرب خاں کو کہلا بھیجا تھا کہ یکسو ہو جاؤ۔ یا ہمارا ساتھ دو یا مخالفت کا اعلان کر دو۔ اسلام کی خیر خواہی میں پدر و مادر اور فرزند و برادر کی جانب داری جائز نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ میں حضور کا فرمانبردار ہوں نہ کہ خان ہنڈ کا۔ خادے خاں کے بھائیوں نے مقرب خاں سے کہا کہ یہ ہمرہی قوم ہمارا ساتھ دو۔ مقرب کے بھائی فتح خاں نے دنداں شکن جواب دیا کہ خان ہُنڈ ہمارے باپ کا دشمن تھا اور سید صاحب کا بھی دشمن تھا۔ تم لوگ دین کے بھی دشمن ہو اور ہمارے باپ کے بھی دشمن ہو۔ مقرب خاں ہمارا بھائی ہے۔ اگر وہ تمھارا ساتھ دے گا تو ہم اس سے بھی بیزاری کا اعلان کر دیں گے۔

مولانا نے دوسرا خط ملا شاہ سید جیٹر منگی کے ہاتھ پنجتار روانہ کیا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ خادے خاں کے بھائی خوانین کے پاؤں پر پگڑیاں رکھ کر اور خوشامدیں کر کر کے کہہ رہے ہیں کہ ہمارا بھائی مارا گیا، ریاست چھن گئی، ہماری امداد کرو۔ سید بادشاہ نے آج ہم سے جو معاملہ کیا ہے، وہی کل تم سے بھی کریں گے۔ نیز وہ ہر روز حملے کی نیت سے ہنڈ سے کوس دو کوس کے فاصلے پر آتے رہتے ہیں۔ آپ کے پاس جو شاہینیں ہیں، وہ بہ حفاظت یہاں بھیج دیں تو مناسب ہوگا۔

غازیوں پر اچانک حملہ

سید صاحب نے ۱۲۔ صفر ۱۲۴۵ھ (۱۳- اگست ۱۸۲۹ء) کو دو شاہینیں خچروں پر لدوا کر دس آدمیوں کے ہمراہ روانہ فرما دیں۔ ان میں ایک کالے خاں شاہینچی تھا۔ ملا شاہ سید بھی ساتھ ہی لوٹے۔ رات شاہ منصور میں گزاری جو ہنڈ سے چار کوس پر ہے۔ وہیں سے کسی نے امیر خاں (برادر خادے خاں) اور غلام خاں کو خبر بھیج دی اور وہ پچیس تیس سوار لے کر ہنڈ سے آدھ کوس کے فاصلے پر گھات میں جا بیٹھے۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ ہنڈ کے برجوں سے کسی نے ان سواروں کو دیکھ لیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ امیر خاں کے آدمی ہیں۔ اس پر بعض غازیوں نے کہا بھی کہ ہمارے آدمی شاہینیں لا رہے ہیں، یہ لوگ کہیں ان پر حملہ نہ کر دیں۔ لیکن دوسروں نے کہا یہ یونہی پھرتے رہتے ہیں، حملہ کیا کریں گے۔ بہ ہر حال اسی حیص بیص میں دو گھڑی کا وقت گزر گیا۔

شاہینوں والے غازی شاہ منصور سے نکل کر امیر خاں کی کمین گاہ کے پاس پہنچے تو اچانک ان پر حملہ ہو گیا۔ باقی لوگ تو مقابلہ کرنے لگے، بارہ برس کے ایک لڑکے نے دوڑ کر ہنڈ خبر پہنچائی۔ قلعے سے ایک جماعت فوراً اپنے بھائیوں کی امداد کے لیے نکل پڑی۔ یہ لوگ موقع پر پہنچے تو دیکھا کہ امیر خاں واپس جا چکا ہے۔ دس یا چودہ غازیوں[1] میں سے دو تین میں قدرے دم ہے، باقی جا بہ جا بے دم پڑے ہیں۔ کالے خاں سسک رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ حملے کے بعد شاہینوں کو بچانے کی کوئی شکل نظر نہ آئی تو میں نے انھیں کوئیں میں ڈال دیا۔ پہلے بندوقیں چلتی رہیں، پھر تلواروں کی نوبت آئی۔ ملا شاہ سید نے کئی آدمیوں کو مارا اور زخمی کیا۔ جب ان پر ہجوم ہوا تو وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے کوئیں میں جا گرے، دشمنوں نے اوپر سے دو تین پتھر ڈال دیے۔ پانچ چھ سوار بندوقوں سے مارے گئے۔ دس بارہ زخمی ہوئے۔ پھر وہ اپنے مقتولوں کو اٹھا کر چلے گئے۔ یہ داستان سنا کر کالے خاں بھی جاں بحق ہو گیا[2]۔

---

[1] ایک روایت ہے کہ چودہ آدمی تھے، جن میں سے صرف ایک ہندوستانی تھا۔ [2] منظورہ میں ہے کہ سب متاسف تھے، پہلے کیوں نکلے۔ پھر بولے: آنچہ مشیت ایزدی است، لابد و ناگزیر شدنی است۔

کوئیں سے ملا شاہ سید کی لاش نکالی گئی۔ چیڑمنگ (درہ نندھیاڑ) کے رہنے والے تھے۔ ابتدا ہی سے سید صاحب کے خاص رفیقوں میں شامل ہو گئے تھے۔ پکھلی کی سمت مجاہدین کا جو پہلا لشکر مولانا شاہ اسماعیل کی قیادت میں گیا تھا، اس میں معاون و مشیر خاص کے عہدے پر مامور تھے۔ ان کی لاش اور باقی شہیدوں کی لاشیں چارپائیوں پر ڈال کر ہنڈ لائے اور وہیں ان فدا کاران راہ حق کو آغوش خاک میں سلا دیا گیا۔

مقرب کا فرار اور فتح خاں کی سرداری

اس واقعے کی اطلاع دیتے ہوئے مولانا نے پھر سید صاحب کی خدمت میں عریضہ بھیجا کہ خادے خاں کے اہل و عیال کی رہائی فی الحال خلاف مصلحت ہے۔ ہنڈ میں جتنے غازی تھے، ان سب نے مولانا کی رائے سے اتفاق کیا۔ مولانا اور سید صاحب کی رائے میں اختلاف کا سبب یہ ہوا کہ مولانا گرد و پیش کے حالات اور اپنے موقف کی مشکلات سے آگاہ تھے۔ یہ سب باتیں سید صاحب کو تفصیلاً معلوم نہ تھیں۔ ان کے سامنے یہ چیز تھی کہ خادے خاں کا قصہ طے ہو گیا، اب اس کے ضمن میں مفسدوں کو شورش انگیزی کا موقع کیوں دیا جائے؟

مقرب خاں زیدہ کو چھوڑ کر نکل گیا تھا۔ فتح خاں نے ریاست کی عنان ہاتھ میں لیتے ہی تمام خوانین و رؤسا کو خطوط بھیجے کہ امیر خاں اور غلام خاں مفسد و باغی ہیں۔ جو شخص ان کی جماعت میں شریک ہو گا، اس کا انجام بھی خادے خاں کا سا ہو گا۔ ان خطوط کے جواب آئے تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں بھائی ہر خان و رئیس کے پاس پہنچ کر خادے خاں کے خون کے فریادی ہوئے۔ لیکن سب نے ان کی اعانت سے صاف انکار کر دیا۔ اس طرح فتح خاں کے رئیس بننے سے غازیان ہنڈ کی مشکلات ایک حد تک دور ہوئیں۔

فتح خاں (رئیس زیدہ) نے سید صاحب کی خدمت میں بھی عرض کیا کہ زیدہ ہنڈ سے صرف دو کوس کے فاصلے پر ہے۔ آپ تشریف لے آئیں تو شرارت و سرکشی کا ہر فتنہ خود بخود فرو ہو جائے گا۔ چنانچہ سید صاحب پنجتار کو چھوڑ کر زیدہ پہنچ گئے۔

سید صاحب کی خواہش

سید صاحب کی رائے یہ تھی کہ اگر امیر خاں یا خادے خاں کا کوئی دوسرا رشتہ دار بیعت کر لے اور احکام شریعت کی پابندی کا قول دے دے تو ہنڈ کو اس کے حوالے کر دیا جائے، لیکن امیر خاں دورخی پالیسی پر کاربند تھا۔ وہ سید صاحب کی خدمت میں التماسیں کر رہا تھا کہ مجھے تمام شرطیں منظور ہیں، ادھر خوانین و رؤسا کی طرف سے اطلاعیں آ رہی تھیں کہ وہ بھائی کے خون اور خاندان کی مظلومیت کا واسطہ دے کر انھیں ساتھ ملانے کے لیے کوشاں ہے۔ اسی سعی و کوشش کے سلسلے میں وہ پشاور بھی پہنچ گیا۔ وہاں سے ملا شاہ گل نے خبر بھیجی کہ بارہ ہزار روپے دے کر

اس نے یار محمد خاں کو اپنی حمایت پر راضی کر لیا ہے۔ حملے کی تیاریاں شروع ہیں اور حاجی خاں کاکڑ کو کچھ سوار اور پیادے دے کر بہ طور مقدمۃ الجیش بھیجا جا رہا ہے[1]۔ یار محمد خاں صرف توپوں کے ڈھل جانے کا منتظر بیٹھا ہے۔

یار محمد خاں کے مقاصد

اس اطلاع کے کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ حاجی خاں کاکڑ ہریانہ پہنچ گیا، جو امیر خاں کا مرکز تھا۔ یار محمد خاں کے سامنے اس لشکر کشی میں کئی فائدے تھے۔ مثلاً: اسے بارہ ہزار کی رقم یک مشت ملتی تھی اور اس عہد میں یہ خاصی وقیع رقم تھی۔ وہ سید صاحب کو دشمن سمجھتا

---

[1] حاجی خاں کاکڑ اپنے عہد کا ایک عجائب کار شخص تھا۔ پشین (بلوچستان) کا رہنے والا تھا اور اس کا اصل نام تاج محمد تھا۔ (ابن عطا محمد) ابتدا میں بھیڑیں چراتا تھا۔ پھر رستم خاں کی مسجد میں تھوڑی سی تعلیم پائی اور عزیز اللہ خاں کاکڑ کے پاس ملازم ہو گیا۔ وہ بڑا ہوشیار آدمی تھا۔ اکثر کہا کرتا تھا کہ مجھے بہت فریب آتے ہیں لیکن تاج محمد (حاجی خاں کاکڑ) وہ سب جانتا ہے۔ علاوہ بریں اسے ایک ایسا فریب بھی یاد ہے جو سب کا توڑ بن سکتا ہے۔

تاج محمد ملازمت چھوڑ کر پیادہ حج کو چلا گیا۔ واپس آیا تو مختلف رئیسوں کے پاس ملازم رہا۔ جس کے ملازم ہوتا، اسے کچھ مدت بعد کوئی نہ کوئی فریب دے کر دوسرے کے پاس چلا جاتا۔ آخر وزیر فتح خاں بارک زئی کے پاس پچاس سواروں کا افسر بن گیا۔ ہرات میں اس کے ساتھ بھی فریب کیا۔ بعد میں کافر قلعہ کی جنگ میں اس بہادری سے لڑا کہ فتح خاں کے دل سے فریب کا رنج بھلا دیا۔ پھر کامران کا پیش خدمت بن گیا۔ وہاں سے شیر دل کے پاس قندھار آ گیا۔ اس کے رازوں سے دوست محمد خاں کو آگاہ کر کے پانسو سواروں کا افسر اور بامیان کا گورنر بن گیا۔ غالباً اسی زمانے میں اسے حاجی خاں کا خطاب ملا۔ دوست محمد خاں اکثر کہا کرتا تھا کہ "حاجی خاں بڑا اچھا آدمی ہے لیکن ملک میں سب سے بڑا کتا (سگ) ہے"۔

پھر دوست محمد خاں کے پاس سے پشاور چلا آیا۔ پشاور سکھوں کے قبضے میں چلا گیا تو حاجی خاں دوبارہ دوست محمد خاں کے پاس پہنچ گیا۔ ۱۸۳۷ء میں اکبر خاں نے ہری سنگھ کے خلاف درۂ خیبر میں جو جنگ کی تھی، اس میں حاجی خاں بھی اکبر خاں کے ہمراہ تھا، لیکن اسی زمانے میں اس نے سکھوں سے چالیس ہزار روپے لے کر ان کی امداد شروع کر دی تھی۔ پھر رحم دل کے پاس قندھار چلا گیا۔ بعد میں اس کے بھائی کہن دل سے جا ملا۔ انگریز شجاع الملک کو لے کر افغانستان پر بڑھے تو شاہ کا طرف دار بن گیا اور نصیر الدولہ خطاب پایا۔ پھر شاہ کے خلاف دوست محمد خاں کی امداد کی۔ اس کا انجام غالباً اچھا نہ ہوا۔ سید صاحب نے اسے بھی ایک مرتبہ جہاد کی دعوت دی تھی جب وہ دوست محمد خاں کے پاس تھا۔ یہ دعوت نامہ سید صاحب کے مجموعہ مکاتیب میں موجود ہے۔ کاکڑ اس کی قوم کا نام ہے۔ "منظورہ" میں حاجی خاں کا نام نہیں دیا صرف یہ مرقوم ہے کہ "معتمد خود را با سہ صد سواران و با چار سرداران کلاں کلاں پیش خیمہ فرستاد"۔

تھا اور اب خادے خاں کے بھائیوں اور ان کے ہم قوموں کی معیت میں اس دشمن کو ختم کرنے کا ایک اچھا موقع ہاتھ آگیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ سید صاحب ختم ہو جائیں گے تو سمہ کے سارے خوانین خود اس کی تابعیت قبول کر لیں گے۔ یوں اس کی سرداری کا حلقہ بہت وسیع ہو جائے گا۔[1] ایک خیال یہ بھی ہو گا کہ جن غازیوں نے خادے خاں جیسے باجبروت رئیس کو اتنی آسانی سے ختم کر ڈالا، وہ اسے بھی نہ چھوڑیں گے، لہذا انھیں فرصت و مہلت نہ دینی چاہیے، بلکہ جلد سے جلد مٹا دینا چاہیے۔

غازیوں سے چپقلشیں

حاجی کاکڑ ہریانہ پہنچ گیا تو غازیوں کے ساتھ پے در پے چپقلشیں ہونے لگیں۔ ایک روز حاجی اور امیر خاں چھ سات سو سوار لے کر ہنڈ کی طرف بڑھے۔ قلعہ کا جنوبی دروازہ دریا کی سمت تھا۔ اس سے ڈیڑھ دو سو قدم کے فاصلے پر کچھ ٹیلے تھے۔ مولانا نے ڈیڑھ سو غازی ان میں چھپا دیے اور کہہ دیا کہ جب سوار قلعہ کے پاس آجائیں اور ہم لوگ ان پر بندوقیں اور شاہینیں مارنے لگیں تو کمین گاہ سے نکل کر ان پر حملہ کر دینا، اس سے پیشتر اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلنا۔

سوار آئے۔ پہلے ان پر شاہینوں سے گولے پھینکے گئے، وہ نہ رُکے۔ پھر بندوقوں کے فائر شروع ہوے اس اثنا میں کمینگاہ والوں نے ایک ایسی باڑھ ماری کہ سب سوار منتشر ہو کر ہریانہ کی طرف بھاگ گئے۔ اس چپقلش میں غازیوں یا مخالفوں میں سے نہ کوئی مارا گیا اور نہ زخمی ہُوا۔

مزید تین مرتبہ اس قسم کے واقعات پیش آئے۔ ایک روز امیر خاں اڑھائی تین ہزار کی جمعیت لے کر آگیا۔ مولانا نے قلعے کی جنوبی سمت میں غازیوں کو کمینگاہ میں بٹھا دینے کے علاوہ شمالی سمت میں بھی دو اڑھائی سو قدم کے فاصلے پر کمین نشینی کا انتظام کر دیا۔ شیخ بلند بخت دیوبندی کو شمالی کمین گاہ کے ڈیڑھ سو غازیوں کا کماندار بنایا، خود قلعے میں رہے اور دونوں کمین نشیں لشکروں کو ہدایت کر دی کہ جب تک دشمن قریب نہ آجائے حرکت نہ کرنا۔ چنانچہ یہ سوار قریب آئے تو مولانا نے قلعہ سے نکل کر نعرۂ تکبیر کے ساتھ ایسا سخت حملہ کیا کہ وہ بے تحاشا بھاگ نکلے۔ غازی آدھ میل تک ان کے تعاقب میں گئے۔[2]

ہندوستانی غازیوں کی چابک دستی

غازیوں کے پاس دس اُونٹ تھے، جنھیں چرنے کے لیے روزانہ باہر بھیجا جاتا تھا۔ بیس تیس بندوقچی ان کی حفاظت کے لیے جاتے تھے۔ ایک روز کنڈوہ کی طرف سے، جو ہنڈ اور زیدہ کے درمیان شمال مائل بہ غرب واقع ہے، بندوقوں کی آواز آئی۔ مولانا دریافت احوال کے لیے قلعہ کے دروازے سے باہر نکلے۔ جب کچھ معلوم نہ ہو سکا تو وہیں بیٹھ گئے۔

---

[1] منظورہ صفحہ ۵۲۸ [2] وقائع ۱۱۲۱ و ۱۱۲۲

دوسرے غازی اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ اس اثنا میں بُرجوں والے غازیوں نے دیکھا کہ اطراف سے دشمن کے سوار چلے آرہے ہیں اور وہ حوالی قلعہ کو میدانِ قتال بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ اطلاع مولانا کو ملی تو آپ نے خود نقارہ بجاکر غازیوں کو تیاری کا حکم دے دیا لیکن سخت تاکید کر دی کہ کوئی باہر نہ نکلے۔ صرف ایک جماعت کو دروازے سے نکال کر مکئی اور گنے کے کھیتوں میں چھپا دیا اور فرمایا کہ جب دشمن قریب آجائے تو باڑھ ماری جائے۔

مجاہدین گھات میں بیٹھے رہے، لیکن جب دشمن کو دیکھا تو جوشِ تہوّر میں مولانا کے فرمان کو فراموش کر بیٹھے اور باہر نکل کر دوبدو جنگ کرنے لگے۔ چونکہ ان کی تعداد کم تھی اس لیے نرغے میں آگئے۔ اس وجہ سے ان کو کمک پہنچانا ضروری ہو گیا۔

مولانا نے تین سو غازیوں کو باہر بھیج دیا۔ ان کی چابک دستی اور مہارتِ جنگ کا یہ عالم تھا کہ جب تک دشمن کی طرف سے ایک مرتبہ گولیوں کی باڑھ آتی، مجاہدین کئی مرتبہ بندوقیں چلاتے۔ یار محمد خاں کے آدمی پیچھے کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ یہ ہندوستانی تو ایک بلا ہیں۔ کس قیامت کی آگ برساتے ہیں۔ اپنے بندوقچیوں کو دیکھو، جب تک وہ ایک فائر کرتے ہیں، ہندوستانی بے شمار فائر کر جاتے ہیں[1]۔

آخر خود یار محمد خاں کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ وہ نوشہرہ میں تھا کہ سید صاحب نے مولانا کو ہُنڈ سے اپنے پاس بُلا لیا۔ مولانا مظہر علی عظیم آبادی قلعے کی فوج کے افسرِ اعلیٰ، پیر خاں مورانئیں اور میرزا احمد بیگ پنجابی ان کے مشیر مقرر ہوئے۔

یار محمد خاں ہریانہ پہنچا تو اس کے پاس نو دس ہزار آدمیوں، چھ توپوں کے علاوہ شاہینیں اور اونٹ بھی تھے۔ ایک ہاتھی بھی تھا۔ سلطان محمد خان نے اسے بہت روکا۔ یہ بھی بتایا کہ سید صاحب کو زیر کرنے کے لیے دستورا اتنا بڑا لشکر لے کر آیا، لیکن زیر نہ کر سکا۔ کیوں خواہ مخواہ بلا میں پڑتے ہو؟ لیکن یار محمد خاں نہ رُکا یا سمجھ لیجیے کہ گردشِ تقدیر نے اسے نہ رُکنے دیا اور اسے کشاں کشاں انجام گاہ پہ لے آئی۔

ایک دردناک حادثہ

اس عہد کا ایک دردناک واقعہ بھی سُن لیجیے:

عبدالرحیم نومسلم منشی محمدی انصاری کا رفیق تھا۔ منشی صاحب نے اپنی بندوق اسے دے کر تاکید کر رکھی تھی کہ اگر اچانک جنگ چھڑ جائے تو اسے جلد میرے پاس پہنچا دینا۔ عبدالرحیم ایک روز

---

[1] منظورہ ۵۳۱

اونٹ چرانے چلا گیا، پیچھے جنگ شروع ہو گئی۔ منشی صاحب اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ بہادر عبدالرحیم جوشِ حمیت میں خود شریکِ جنگ ہو گیا اور بندوق کا چقماق گم کر بیٹھا۔ بھاگا بھاگا قلعہ میں آیا۔ منشی صاحب نے بندوق لے کر خود جنگ میں جانا چاہا۔ اس کے لیے موزوں چقماق نہ ملا تو ایک پرانا مستعمل ٹکڑا اٹھا کر لگایا۔ منشی صاحب کا خیال تھا کہ بندوق خالی ہے۔ عبدالرحیم نے بھی کچھ نہ بتایا۔ منشی صاحب نے بندوق کی لبلبی دبادی تاکہ نئے چقماق کی درستی کا اندازہ ہو جائے۔ اس چقماق کے چار ٹکڑے ہو گئے۔ منشی صاحب نے ان میں سے بڑا ٹکڑا اٹھا کر دوبارہ لگایا اور عبدالرحیم سے فرمایا کہ اگر یہ ٹکڑا آگ دے گیا تو فی الحال اسی سے کام لوں گا۔ عبدالرحیم یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جانتا تھا کہ بندوق بھری ہوئی ہے اگر چقماق آگ دے گیا تو گولی چلے گی۔ لیکن تقدیر کی بات، وہ اب بھی چپ رہا۔ منشی صاحب نے دوبارہ لبلبی دبائی۔ ادھر لبلبی دبی، ادھر چقماق سے شعلہ نکلا۔ بھری ہوئی بندوق چلی اور گولی عبدالرحیم کے شانے سے نیچے کی ہڈی کو توڑتی ہوئی نکل گئی۔ دوسرے دن (بروز جمعہ ۲۷۔ صفر ۱۲۴۵ھ مطابق ۲۶۔ اگست ۱۸۲۹ء) اسی صدمے سے عصر کے وقت عبدالرحیم کا انتقال ہوا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس لڑائی کا ذکر اوپر آیا ہے، وہ صرف ایک روز پہلے یعنی ۲۶۔ صفر مطابق ۲۵۔ اگست کو ہوئی تھی۔

منشی محمدی کو اس واقعہ کا بڑا قلق تھا، لیکن بہادر و نیک دل عبدالرحیم سکرات موت میں بھی بار بار منشی صاحب کو تسلی دیتے ہوئے کہتا رہا: بھائی صاحب! رنج و غم نہ کریں۔ آپ نے مجھے نہیں مارا، آپ کو کیا معلوم تھا کہ بندوق بھری ہوئی ہے؟ میں بتا نہ سکا۔ جو کچھ پیش آیا، وہ تقدیری معاملہ تھا۔

پندرھواں باب

جنگ زیدہ

یار محمد خاں کی تدبیریں

یار محمد خاں نے ہریانہ پہنچتے ہی زور شور سے توپیں چلانے کا حکم دے دیا۔ اہل سمہ توپوں سے بہت خائف تھے۔ یار محمد کی غرض یہ تھی کہ جو لوگ سید صاحب کا ساتھ دینے پر آمادہ ہیں، وہ توپوں کی آواز سن کر رک جائیں یا پہاڑوں پر بھاگ جائیں۔ یوں کہ دوران جنگ میں اندیشہ ہی نہ رہے گا کہ وہ کسی موقع پر سید صاحب کی اعانت کے لیے تیار ہو جائیں گے یہ تدبیر خاصی کامیاب ہوئی۔ اکثر ملکی لوگ گھر چھوڑ کر پہاڑوں پر چلے گئے اور سید صاحب کے ساتھ رؤسا میں سے صرف فتح خاں پنجتاری، فتح خاں والیِ زیدہ، اس کا بھائی ارسلان خان یا ان کے کچھ عزیز اور متفرق لوگ رہ گئے۔

پھر یار محمد خاں نے زیدہ سے تھوڑے فاصلے پر بدرئی ندی کے کنارے ڈیرہ جمایا۔ غازیوں نے مقابلے پر صف بندی کر لی جو زیدہ سے شاہ منصور تک پہنچی ہوئی تھی۔ دفعتہً یار محمد خاں کے لشکر سے پانسو سوار الگ ہو کر غازیوں کی صف بندی کے دائیں جانب بڑھے۔ خیال ہوا کہ شاید وہ عقب میں پہنچنا چاہتے ہیں، لیکن وہ دریا کے کنارے کنارے کالادرہ، صوابی اور مانیری کی طرف نکل گئے اور راستے میں کچھ مویشی پکڑ لیے۔ پھر لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ساتھ ملانا چاہا۔ مانیری والوں نے اس زور سے ان پر حملہ کیا کہ وہ بھاگ نکلے اور مویشی بھی چھوڑ گئے۔ سید صاحب نے فتح خاں کے پچیس تیس سوار بھیج کر تمام مویشی اصل مالکوں کو لوٹا دیے۔

ساتھ ہی یار محمد خاں کے کچھ آدمیوں نے قلعہ ہُنڈ کے سامنے جا بجا دمدمے بنانے کی تیاری کی مقصود یہ تھا کہ توپیں لگا کر قلعے پر گولے برسائیں۔ مولوی مظہر علی عظیم آبادی نے ایسی باڑھ ماری کہ خان کے سب آدمی بھاگ گئے۔

پیام مصالحت

اس اثنا میں چار نلا گھوڑوں پر سوار یار محمد خاں کی طرف سے صلح کا پیغام سید صاحب کے پاس لائے۔ مضمون یہ تھا کہ آپ زیدہ سے پنجتار چلے جائیں اور ہُنڈ خالی کر دیں، ورنہ توپیں لگا کر زیدہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی اور غازیوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالا

جائے گا۔ "وقائع" کے بیان کے مطابق سید صاحب نے فرمایا:

> یار محمد خاں کو ہماری طرف سے بعد سلام کہنا کہ ہم مسلمان ہیں اور ہندوستان سے ہجرت کرکے مسلمانوں کے ملک میں آئے ہیں۔ صرف اس لیے کہ سب بھائیوں کو متفق کرکے جہاد [illegible]یں تاکہ دین اسلام ترقی کرے اور قوت پکڑے۔ آپ بھی مسلمان رئیس، والیِ ملک اور نامور ہیں۔ آپ کو بھی لازم ہے کہ ہمارا ساتھ دیں، نہ کہ کافروں اور باغیوں کے حمایتی اور طرفدار بن کر ہم سے لڑیں۔ ہم نے خادے خاں کو جو قتل کیا اور اس کا قلعہ چھین لیا تو ہمارے ہاتھ پر بیعت امامت کرکے باغی ہو گیا تھا اور کئی بار سکھوں کو مسلمانوں پر چڑھا لایا تھا۔ اپنی دانست میں اس نے ہماری خونریزی اور بدخواہی میں کوتاہی نہ کی، مگر اللہ تعالیٰ ہمارا حافظ و ناصر تھا۔ اس نے ہم لوگوں کو اس کے شر سے محفوظ رکھا۔ اب آپ اس باغی کے خون کا دعویٰ لے کر ہم سے لڑنے آئے ہیں۔ یہ حرکت آپ کی شان سے بعید ہے۔ واجب ہے کہ آپ اس بات سے توبہ کریں، خدا سے ڈریں، اپنے ملک کو چلے جائیں اور دائرہ اسلام سے قدم باہر نہ دھریں۔ حد شریعت سے تجاوز نہ فرمادیں۔ نہ مانیں گے تو دنیا میں رسوا و شرمسار اور قیامت کے دن عذاب الٰہی میں گرفتار ہوں گے[1]

سید صاحب نے یہ جواب دے کر ملا صاحبان سے کہا کہ سہ پہر چھ گھڑی میں اس کا جواب لادیجیے۔ وہ مقررہ وقت پر نہ آئے تو سید صاحب نے اپنی طرف سے چار آدمیوں کو بھیج دیا: ایک قابل اخوند زادہ ساکن منگل تھانہ، دوسرا مولوی عبدالرحمٰن تورو، تیسرا ملا صاحب ڈاگئی اور چوتھا ملا صاحب گبائی۔ منشی خواجہ محمد اور چار قرابین دار ساتھ کر دیے۔ تاکید فرمادی کہ ان پانچوں غازیوں کو سردار کے لشکر سے ورے ٹھہرا دینا۔

یار محمد خاں نے سید صاحب کے پیغام مصالحت کا نہایت درشت جواب دیا۔ آخر میں یہ بھی کہہ دیا کہ اگر اب کوئی شخص صلح کا پیام لایا تو اس کا سر اڑا دوں گا[2] سید صاحب نے اسی وقت حکم دے دیا کہ تمام

---

[1] وقائع صفحہ ۱۱۲۷، "منظورہ" میں ہے کہ سادات میں سے ایک شخص صلح کا ایلچی بن کر آیا تھا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ صلح بہرحال بہتر ہے، لیکن یہ تو دیکھا جائے کہ کشمکش کا سبب کیا ہے؟ ہماری کوئی ذاتی غرض نہیں۔ صرف یہ چاہتے ہیں کہ مخالف لوگ خدا اور رسول ؐ کے احکام قبول کرلیں۔ وہ مسلمان ہیں، ان کے لیے یہی زیبا ہے۔ یہ ایلچی کئی مرتبہ آیا گیا، یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ اس پر مجاہدین کے دل میں شبہ پیدا ہو گیا، دشمن نے صلح کا دام فریب صرف اس غرض سے بچھایا ہے کہ رات اطمینان سے گزار لے۔ [2] "منظورہ" صفحہ ۵۰۴

غازیوں کو باہر کے مورچوں سے بستی میں بلا لیا جائے۔

قلندر کا واقعہ

لشکر اسلام میں ایک مجذوب درویش رہتا تھا، جسے سب "قلندر" کہتے تھے۔ اسے پکی پکائی روٹی دی جاتی تھی۔ وہ پھرتا پھراتا درانیوں کے لشکر میں چلا گیا۔ واپس آیا تو دونوں کانوں سے خون بہ رہا تھا۔ غازیوں نے سبب پوچھا تو بولا: بھائیو! میرا خون بہ چکا ہے، اب تمھارا خون نہیں بہے گا۔ سید صاحب نے حالات پوچھے تو اس نے بتایا کہ مجھے یار محمد خاں کے پاس لے گئے تھے اور وہاں یوں سوال و جواب ہوئے:

یار محمد: تم کہاں رہتے ہو اور ہمارے لشکر میں کیا دیکھتے پھرتے ہو؟

قلندر: میں مسلمانوں کے لشکر میں رہتا ہوں۔

یار محمد: یہ لشکر بھی تو مسلمانوں کا ہے۔

قلندر: نہیں، یہ باغیوں کا لشکر ہے۔

یار محمد (خفگی کے لہجے میں): ادھر ادھر کیا دیکھتا پھرتا تھا؟

قلندر: مسلمانوں کا مال و اسباب۔

یار محمد: تو اس لشکر کو باغیوں کا بتاتا ہے، تو اس کا مال کن مسلمانوں کا ہے؟

قلندر: یہ سب انھیں مسلمانوں کا ہے، جن کے لشکر میں رہتا ہوں۔

یار محمد: ایسی بات منہ سے نہ نکال، ہمارے لیے دعا کر، ورنہ مارا جائے گا۔

قلندر: میں موت سے نہیں ڈرتا۔ دعا انھیں مسلمانوں کے لیے کروں گا، تیرے لیے نہیں کر سکتا۔ تو باغی ہے اور باغیوں کا ساتھی۔

سردار نے حکم دے دیا کہ اسے قتل کر دو۔ مصاحبوں نے کہا کہ یہ تو دیوانہ ہے، جو منہ میں آتا ہے بکتا پھرتا ہے۔ اس بیچارے کو سزا دینا مناسب نہیں۔ یار محمد نے کہا کہ اچھا اس کے ہاتھ اور ناک کاٹ دو۔ مصاحبوں نے پھر نرمی کی درخواست کی۔ سردار نے کہا کہ اچھا اس کے کان کاٹ کر رخصت کر دو۔ اس پر عمل ہوا۔

سید صاحب یہ سن کر دیر تک سکوت میں رہے۔ پھر فرمایا: وہ بڑا بے درد ہے۔ تمھارا بدلہ منتقم حقیقی لے گا۔ نور بخش جراح کو حکم دیا کہ قلندر کی مرہم پٹی کر دو۔

لشکروں کی کیفیت

اسی وقت مغرب کی اذان ہوئی۔ بعد نماز سید صاحب نے دعا فرمائی:

الٰہی! تو بڑا قادر، کارساز اور عاجز نواز ہے۔ ہم تیرے بندے

عاجز و ناچار تیرے فضل و کرم کے امیدوار ہیں۔ تو ہی ہم عاجزوں کا حامی و مددگار ہے۔ دشمنوں کے شر و فساد سے ہم لوگوں کو محفوظ و مامون رکھ اور اپنی مدد سے ناتوانوں کو ان پر مظفر و منصور کر۔

غازیوں اور درانیوں کے لشکروں کا موازنہ کرتے ہوئے صاحب "منظورہ" نے کیا خوب لکھا:

> ایک طرف کمال شوکت و قوت کا مظاہرہ تھا، دوسری طرف رب العزت کی اعانت پر نظر تھی۔ ایک طرف عساکر و توپ خانہ کا غرور، دوسری طرف قادر یگانہ کی قوت کے بھروسے پر دل مطمئن۔ سردار کی فوج شکوہ و جلال میں اصحاب فیل کے مثیل تھی، غازی عجز و ناتوانی کے پیش نظر رب ابابیل سے مدد کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ مخالفوں میں لشکر جالوت کا سا تبختر نمایاں تھا، مجاہدین کے دل قصۂ طالوت سے فرحاں تھے۔

جنگ کے مشورے

"وقائع" کا بیان ہے کہ نماز مغرب کے بعد سید صاحب نے اپنے خاص رفیقوں سے جنگ کے بارے میں صلاح پوچھی۔ مختلف تجویزیں پیش ہوئیں لیکن کسی بھی تجویز پر طبیعت میں انشراح پیدا نہ ہوا۔ آخر سید صاحب نے فرمایا کہ بھائیو! ہر بات کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو۔ صبح کو بستی کے کنارے قبرستان والے میدان میں مقابلہ ہوگا۔ پھر یا تو اللہ تعالیٰ ہمیں فتح عطا کرے گا یا اسی جگہ ہم سب شہادت پائیں گے۔ مولانا سے فرمایا کہ شہر پناہ میں مناسب مقامات پر پہروں کا انتظام کر دیجیے۔ باقی سب بھائی آرام کریں لیکن کمریں باندھے رہیں۔

"منظورہ" میں ہے کہ درانیوں کی تعداد چونکہ غازیوں سے بہت زیادہ تھی اور ان کے پاس سازوسامان جنگ بھی بہت اچھا تھا، اس لیے مشیروں نے عرض کیا کہ شبخون کی اجازت دی جائے۔ اگر دشمن لشکر کے لوگ غافل ہوں گے تو ہم انھیں مار لیں گے۔ اگر وہ غافل نہ ہوئے اور لڑائی چھڑ جائے گی تو اس کے لیے بھی رات ہی کا وقت بہتر ہے، جس میں غازیوں کو اپنی قلت اور دشمن کی کثرت کا مشاہدہ پریشان نہ کرے گا۔ لیکن اس وقت تک گفتگوئے صلح کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی۔ اس وجہ سے سید صاحب نے اجازت نہ دی۔ آخر یار محمد خاں کی طرف سے یہ پیغام ملا کہ اب کوئی شخص صلح کی تجویز لے کر آیا تو اس کا سر اڑا دوں گا۔ اس وقت سید صاحب نے شبخون کا حکم دے دیا۔ اسی لیے باہر کے مورچوں کے غازیوں کو بستی میں بلا لیا گیا تھا۔

آخری حکم

"وقائع" کے بیان کے مطابق سید صاحب نے نماز عشا کے بعد کھانا کھایا۔ مولانا بھی ساتھ بیٹھے۔ فارغ ہو کر مولانا سے فرمایا کہ آپ اب آرام کریں۔ گویا اس وقت تک صبح کے وقت قبرستان کے میدان میں جنگ کرنے کی تدبیر پکی تھی۔ تھوڑی دیر آرام فرمانے کے بعد آپ اٹھے اور آواز دی کہ کوئی ہے؟ حافظ صابر تھانوی حاضر ہوئے تو فرمایا: میاں صاحب (مولانا شاہ اسماعیل) کو بلا لائیے۔

مولانا آئے تو فرمایا کہ شبخون کی تدبیر بہت مناسب ہے۔ آپ بستی سے باہر گڑھی میں ٹھہریں، ہم وہیں آدمیوں کو بھیجتے ہیں[1]۔ بعض بیانات میں بتایا گیا ہے کہ یار محمد کے لشکر میں ایسے اصحاب بھی تھے جو سید صاحب کے ساتھ دلی خلوص رکھتے تھے۔ مثلاً ارباب فیض اللہ خاں مہمند ہزار خانی، ارباب جمعہ خاں (برادر ارباب بہرام خاں)۔ وہ مجبوراً سردار کے ساتھ آئے تھے۔ انھوں نے عبدالحلیم نام ایک شخص کے ہاتھ خفیہ پیغام بھیجا کہ صبح زیدہ کو توپوں سے تباہ کر ڈالنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ آپ اس وقت جو تدبیر فرما سکیں، اس میں توقف نہ فرمائیں[2]۔

مولانا گڑھی میں پہنچ گئے۔ سید صاحب نے تھوڑی دیر میں تین سو غازی اور چار سو ملکی ان کے پاس بھیج دیے[3]۔ حسب معمول سب سے فرمایا کہ گیارہ گیارہ مرتبہ سورۂ قریش پڑھ کر دم کر لو۔

سواروں سے مڈبھیڑ

مولانا نے غازیوں کو گڑھی سے نکال کر میدان میں کھڑا کیا۔ دیر تک ننگے سر ہو کر دعا کرتے رہے۔ پھر ایک رہبر کے پیچھے پیچھے منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئے۔ درانیوں کا لشکر اگرچہ دور نہ تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ غازی سیدھے جانے کے بجائے کوس ڈیڑھ کوس کا چکر کاٹ کر گئے تھے۔ اس وجہ سے ذرا دیر ہو گئی۔ اخفا کی یہ کیفیت تھی کہ جن لوگوں کے پاس توڑے دار بندوقیں تھیں، انھیں حکم دے دیا گیا تھا کہ توڑوں کو اس وقت تک مٹھیوں میں چھپائے رکھیں، جب تک بندوقیں سر کرنے کی نوبت نہ آئے۔ چلتے چلتے ایک سو سوار ہنڈ کی طرف سے آتے ہوئے دکھائی دیے[4]۔ غازی ان پر گولیاں چلانا چاہتے تھے۔ مولانا نے سب کو روک دیا۔

سوار عین سامنے پہنچ گئے تو انھوں نے غازیوں کو دیکھ لیا۔ ایک نے پشتو میں پوچھا: "سوکے؟" (یعنی کون ہو؟) شیخ علی محمد دیبنی (دیوبندی) بے تکلف پشتو بولتے تھے۔ انھوں نے جواب دیا: "اخپل" (یعنی اپنے ہی لوگ ہیں)۔ سوار نے پھر پوچھا: کم جاے را غلے؟ (کہاں سے آئے ہو؟) شیخ نے جواب دیا: لنگراوتمان زئی

---

[1] ایک روایت کے مطابق آپ نے فرمایا کہ مجھے ابھی جناب الٰہی سے اشارہ ہوا کہ دشمن تدبیر کر رہے ہیں، تو کیوں اپنی تدبیر سے غافل ہے؟ [2] بعض اصحاب نے حاجی خاں کاکڑ کو بھی انھیں مخلصین میں شمار کیا ہے۔ [3] منظورہ میں ہے: مجاہدین ہندوستانی و قندھاری و دیگر مخلصین اہل دیار شش ہفت صد، غایت ہشت صد نفر سوار و پیادہ خواہند بود۔

[4] "وقائع" میں ہے چار یا پانچ سو، میرے نزدیک "منظورہ" کا بیان صحیح ہے۔ ویسے رات کا وقت تھا۔ راویوں نے تخمینہ پیش کیا۔ صحیح تعداد کسی کو معلوم نہ ہو سکتی تھی۔ "منظورہ" میں یہ بھی ہے کہ پہلے ایک چوکیدار مشعل لیے نظر آیا۔ اس نے غازیوں کو دیکھ کر خوف سے مشعل بجھا دی۔ غازی آگے بڑھے تو سوار دکھائی دیے۔

(او تمان زئی سے لشکر آیا ہے)۔ یہ سُن کر ایک سوار قریب آیا۔ غازیوں کو پہچان کر شور مچاتا ہُوا بھاگا: "دا غازیاں دے"، "دا غازیاں دے" (یہ غازی ہیں، یہ غازی ہیں)۔ باقی سوار بھی بھاگے۔ غازیوں نے نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہُوے حملہ کر دیا۔ لشکر گاہ کے قریب پہنچے تو توپخانے کی مہتابی روشن ہُوئی اور توپیں چلنے لگیں۔ ان کی آواز سُن کر ملکی لوگ سراسیمگی میں زیدہ کی جانب لوٹ پڑے۔ مولوی امیر الدین ولایتی بھی انھیں میں تھے۔ انھیں غالباً کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ کیا صورت پیش آئی[لہ]

جنگ کی کیفیت

مولانا نے گڑھی سے نکلتے ہی اپنے غازیوں اور ملکی لشکریوں کی ٹولیاں الگ الگ بنا دی تھیں۔ اپنے غازیوں کو تین جماعتوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ پہلے سے بتا دیا تھا کہ حملہ اس جگہ کیا جائے گا جہاں توپیں اور شاہینیں ہیں۔ توپوں سے گولے چھوٹنے لگے تو مولانا نے اپنے غازیوں کی ایک جماعت کو توپوں کی دائیں جانب، دوسری کو بائیں جانب بڑھنے کا حکم دیا۔ تیسری جماعت کو لے کر خود عین سامنے سے پیش قدمی کی۔ گولے برابر آ رہے تھے۔ دو مرتبہ پہلے فائر ہُوا تھا، تین مرتبہ بعد میں ہُوا۔ اس اثنا میں مولانا نے پانچ توپوں پر قبضہ کر لیا۔ چھٹی توپ وہاں سے کسی قدر فاصلے پر کنڈوہ کی جانب تھی۔ اس سے تیزی کے ساتھ فائر ہونے لگے۔ مولانا نے چالیس پچاس بندوقچیوں اور قرابین چیوں کو اس کے عقب سے حملے کے لیے بھیج دیا۔ دو گولہ انداز گرفتار ہو گئے، تیسرا بھاگ گیا اور وہ توپ بھی قبضے میں آ گئی۔ گویا درانی لشکر کا سب سے کارگر اور دہشت انگیز سامانِ جنگ غازیوں کے ہاتھ آ گیا۔

اس اثنا میں یار محمد خاں کا ایک مصاحب پکڑا گیا، جس کی پشت پر تلوار لگی تھی۔ اس سے اور دوسرے اسیروں سے یار محمد خاں کا پتا پوچھا گیا تو معلوم ہُوا کہ وہ کنڈوہ والی توپ کے پاس تھا۔ اس کے گولی لگی اور ساتھی اسے اٹھا کر لے گئے۔

اس توپ سے چند فائر کرنے کے بعد غازیوں نے لشکر گاہ میں پھر پھر کر دیکھنا شروع کیا تو زیادہ تر خیمے خالی پائے۔ بعض خیموں سے دو دو چار چار آدمی سراسیمہ وار بھاگ رہے تھے۔ بعض لوگ یار محمد خاں کی امداد کے لیے ادھر ادھر سے جمع کیے گئے تھے۔ انھوں نے پانسا پلٹتے دیکھا تو جو مال ہاتھ لگا اٹھا کر اپنے گھروں کو فرار ہو گئے۔

[لہ] "منظورہ" میں ہے کہ غازی، سواروں کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ کسی غازی نے اچانک گولی چلا دی۔ گولی کی آواز سن کر سوار بھاگے اور غازی ان کے پیچھے لشکر گاہ میں پہنچ گئے۔

اگرچہ فتح حاصل ہو چکی تھی لیکن اندیشہ تھا کہ یار محمد خاں کہیں پلٹ کر حملہ نہ کردے۔ مولانا نے حکم دے دیا کہ غازی توپوں سے ادھر ادھر نہ ہوں۔ اس اثنا میں مولانا مظہر علی عظیم آبادی اور پیر خاں مورائیں ہنڈ سے ستر اسّی غازیوں کے ساتھ آ گئے۔ انھوں نے بتایا کہ یار محمد خاں کے لشکری ہمارے پاس سے بھاگے جا رہے تھے۔ ہم نے بھی ان پر گولیاں چلائیں۔ مولانا نے فرمایا کہ اس نازک موقع پر قلعے کو چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا، آپ واپس چلے جائیں۔

یار محمد کا انجام

مولانا نے مال غنیمت جمع کرایا تو مندرجہ ذیل چیزیں تھیں: ایک ہاتھی، ساٹھ ستر اونٹ، کچھ کم تین سو گھوڑے، چھ توپیں، پندرہ سولہ شاہینیں۔ تلواروں اور بندوقوں کا شمار نہ تھا۔ ملکی لوگ جو مال اٹھائے لیے جا رہے تھے، اسے حسن تدبیر سے واپس لیا۔ بستر اور خیمے سب محفوظ پڑے تھے۔ اکثر لوگ جوتے بھی چھوڑ گئے تھے۔ پلاؤ کی دیگیں تیار پڑی تھیں۔ منوں خشک میوہ موجود تھا۔ بعض خیموں سے مستورات نکلیں، جنھیں سردار کے لشکری عیش رانی کی غرض سے زبردستی پکڑ لائے تھے۔ انھیں مولانا نے فوراً ان کے گھروں میں بھیج دیا۔

یار محمد خاں کے کاری زخم لگا تھا۔ اسے بمشکل گھوڑے پر سوار کر کے میدان سے باہر پہنچایا گیا۔ وہ ہریانہ اور دوڈھیر کے درمیان لہادر میں یا اس کے آس پاس فوت ہوا۔ میت کو پشاور پہنچا کر دفن کیا گیا۔ اس یورش میں یار محمد خاں کے تین سو ساتھی مارے گئے، جن میں سے سات بڑے سردار تھے۔ ایک ہزار کے قریب گھوڑے ان ملکوں کے قبضے میں چلے گئے جنھیں یار محمد خاں نے دھمکا کر ادھر ادھر سے اپنے لشکر میں شامل کر لیا تھا۔

کارنامے کی حیثیت

غازیوں میں سے دو شہید ہوئے: ایک محمد حسن جن کے سینگڑے میں اتفاقیہ آگ لگ گئی اور وہ جل گئے، دوسرے نور محمد۔ چار غازی زخمی ہوئے: ایک کے ہاتھ پر تلوار لگی اور چار انگلیاں کٹ گئیں، صرف انگوٹھا باقی رہ گیا۔ دیندار خاں کے دائیں مونڈھے پر تلوار کا زخم آیا، میرزا وزیر بیگ کے ہاتھ پر تلوار لگی، شیخ علی محمد دیبنی کے سر پر تلوار کا زخم آیا۔[1] اتنے تھوڑے نقصان کے ساتھ اتنے کثیر الانفار اور ہر قسم کے ساز و سامان سے لیس لشکر کو ایسی سخت شکست دینا یقیناً ایک عظیم الشان کارنامہ تھا، جسے بڑے بڑے جرنیلوں کی بہترین فتوحات کے مقابلے میں بے تکلف فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس سے مولانا شاہ اسماعیل کی یگانہ صلاحیت قیادت اور مہارت فنونِ حرب کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

---

[1] منظورہ میں ہے: چار نفر بدرجہ شہادت معزز و سرفراز گشتند۔

زیدہ کے حالات

مولانا میدانِ جنگ میں مالِ غنیمت کی فراہمی اور فہرستوں کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔ فتح کی خبر زیدہ بھیجی تو یہ حیرت انگیز اطلاع ملی کہ سید صاحب پنجتار روانہ ہو گئے۔ ہُوا یہ کہ غازی شبخون کے لیے روانہ ہوئے تو سید صاحب مسجد میں جا بیٹھے اور بڑی دیر تک دُعا کرتے رہے۔ پھر گڑھی کے بُرج میں پہنچے۔ دیر تک گولیوں کی آواز نہ آئی۔ سید صاحب دوبارہ دُعا میں مشغول ہو گئے۔ چند مرتبہ توپیں چلنے کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ اس اثنا میں دو ملکی لوگ پہنچ گئے، جو میدانِ جنگ سے خواہ مخواہ بھاگ نکلے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ سب غازی شہید ہو گئے[1] یہ خبر سُن کر ہر دل پر غم و الم کی گھٹائیں چھا گئیں۔ فتح خاں پنجتاری نے سید صاحب سے عرض کیا کہ آپ پنجتار تشریف لے چلیں۔ آپ سلامت ہیں تو خدا پھر سامان درست کر دے گا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ خان بھائی! ذرا توقف کریں، تعجیل مناسب نہیں۔ اللہ کے فضل سے ہمیں فتح کی امید ہے۔ سید احمد علی نے کہا کہ آپ کس دلیل سے فتح کی امید ظاہر کرتے ہیں؟ سید صاحب نے جواب دیا کہ پہلے توپیں اور بندوقیں چلی تھیں تو شعلہ ہائے رنجک سمتِ مخالف میں تھے اور شعلہ ہائے کارتوس ہماری جانب۔ دوسری مرتبہ معاملہ برعکس نظر آیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ پہلے توپیں درانیوں کے قبضے میں تھیں، پھر غازیوں کے قبضے میں آ گئیں۔ لیکن فتح خاں اور سید احمد علی اصرار کرتے رہے۔ پھر سید صاحب کا ہاتھ پکڑ کر بُرج سے اُتارا اور ساتھ لے کر یہ کہتے ہوئے پنجتار کی جانب روانہ ہو گئے کہ اگر فتح ہماری ہے تو پھر بھی نکل جانے میں قباحت نہیں۔ دوبارہ واپس آ سکتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں چلنا ہی قرینِ احتیاط ہے۔ سید صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ اگر غازیوں کی شہادت کا بیان درست ہے تو ہم تھوڑے غازیوں کو لے کر کہاں جائیں گے۔ بہتر یہ ہے خدا کے بھروسے پر یہیں بیٹھیں۔ جو کچھ منظور ہو گا، ہو رہے گا۔ لیکن یہ بات کسی نے نہ سُنی۔

سفرِ مراجعت

مولانا نے سید عبدالرؤف بارہ والے اور مومن خاں خیسری کو بھیجا اور سید صاحب کو

---

[1] "وقائع" میں ہے کہ یہ خبر مولوی امیر الدین ولایتی نے دی تھی۔ لیکن مولوی صاحب ممدوح بڑے متقی، دیندار، مخلص، شجاع اور سید صاحب کے معتمد علیہ تھے۔ ان کے ساتھ اس قسم کی غیر محقق بات منسوب نہیں کی جا سکتی۔ واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو ملکی لوگ میدان چھوڑ کر آ گئے تھے، انھوں نے اپنی مراجعت کو معقول ظاہر کرنے کے لیے یہ داستان وضع کر لی۔ مولوی امیر الدین چونکہ ان میں شامل تھے، اس لیے ممکن ہے، مختلف لوگوں کے بیانات کی بنا پر غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہوں۔ "منظورہ" میں ہے: ولایتیاں کہ وقت مقابلۂ درانیاں گریختہ بودند، بہ لحاظ بے سامانی مومنین بر ظن فاسد خود خبر دروغ شکست مومنین رسانیدند۔

مانیری سے واپس بُلایا۔ دیر کے بعد مال اسباب لے کر زیدہ کی طرف چلے۔ آگے آگے چار توپیں تھیں۔ پچاس ہندوستانی غازی اور سارے ملکی ان کے ساتھ تھے۔ دو توپیں سب سے پیچھے تھیں۔ بیچ میں مال سے لدے ہُوئے گھوڑے، خچر اور اونٹ تھے۔ جو قیدی پکڑے گئے تھے وہ بھی ساتھ تھے۔ غازیوں کے جیش دائیں بائیں جا رہے تھے۔ سید صاحب شاہ منصور پہنچے تو مولانا خود پیشوائی کے لیے باہر نکلے۔ سید صاحب نے گھوڑے سے اُتر کر فرطِ محبت سے مولانا کو سینے سے لگا لیا۔

غازیوں میں ایک صاحب "نواب" کے لقب سے مشہور تھے۔ نہر میں سید صاحب کے پاس پہنچے تھے۔ اس تلقب کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ خدمت میں حاضر ہُوئے تو سید صاحب کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا: "آؤ نواب بھائی"۔ انھوں نے عرض کیا کہ حضرت نے مجھے نواب تو بنا دیا، اب سواری کے لیے ہاتھی دیجیے۔ فرمایا خدا تعالیٰ کی رحمت سے یہ بھی ہو سکتا ہے۔ جنگ زیدہ میں جو ہاتھی ملا تھا، مولانا نے "نواب" کو اس پر سوار کر کے پیشوائی کے لیے پہلے بھیج دیا تھا۔ "نواب" نے خود عرض کیا کہ آپ کی دعا سے ہاتھی بھی مل گیا۔

چوتھے روز سید صاحب پنجتار روانہ ہُوئے۔ کالا درہ، صوابی، مانیری، سلیم خاں، خلی کلی، سنگ بٹی اور غور غشتی ہوتے ہُوئے گئے۔ ہر موضع میں کچھ روپے بہ طور انعام تقسیم فرمائے۔

جنگ زیدہ کی تاریخ

اب ایک سوال رہ گیا کہ جنگ زیدہ کس تاریخ کو ہوئی؟ منظورہ میں ہے کہ ربیع الاول کی پندرھویں تاریخ (۱۲۴۵ھ) اور ہفتے کا دن تھا۔ دو گھڑی دن چڑھا تھا کہ مخالف لشکر نمودار ہُوا۔ تقویم سے معلوم ہوتا ہے کہ ہفتے کا دن یا ۵۔ ربیع الاول کو تھا یا ۱۲۔ کو۔ اس بنا پر ۵۔ ربیع الاول کی تاریخ تو قبول کی جا سکتی ہے، ۱۵۔ درست نہیں سمجھی جا سکتی۔

سید صاحب نے جنگ زیدہ کے بعد پشاور کے بعض مشہور علما کو ایک مکتوب بھیجا تھا، جس پر ۱۰۔ ربیع الاول کی تاریخ ثبت ہے۔ اس میں خادے خاں اور یار محمد خاں دونوں کے یکے بعد دیگرے قتل کا ذکر ہے[1]۔ ایک اعلام سلطان محمد خاں کو بھی ارسال فرمایا تھا۔ اس پر ۸۔ ربیع الاول مرقوم ہے[2]۔ اس میں بھی جنگ زیدہ کا ذکر ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ ۵۔ یا ۶۔ ربیع الاول ۱۲۴۵ھ (۴۔ یا ۵۔ ستمبر ۱۸۲۹ء) کو ہُوئی۔

اہم کاغذات

مالِ غنیمت میں یار محمد خاں کے کچھ کاغذات بھی ملے تھے، جن میں رنجیت سنگھ کا

---

[1] منظورہ صفحہ ۵۳۸۔ [2] مکاتیب شاہ اسماعیل صفحہ ۲۰۵۔

ایک فرمان تھا۔ اس کا مضمون یہ تھا:

۱ - غازیوں پر لشکر کشی کی جائے۔

۲ - لیلیٰ، مروارید، سبھ کہار وغیرہ گھوڑے ونتورا کے حوالے کر دیے جائیں۔ (یہ تینوں گھوڑے سلطان محمد خاں کے تھے اور اس عہد میں اپنی خوبصورتی اور تیز رفتاری کے باعث دور دور مشہور تھے۔ لیلیٰ کی قیمت ساٹھ ہزار روپے بتائی جاتی تھی)۔

۳ - سید صاحب اور ان کے ساتھیوں کو جلد سے جلد ملک سے نکال دیا جائے۔

۴ - ہنڈ کو خادے خاں کے متعلقین کے حوالے کر دیا جائے۔

اگر ان تمام ہدایات کی تعمیل نہ ہوئی تو مجھے خود لشکر لے کر آنا پڑے گا۔[1]

ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یار محمد خاں اپنی غلط اندیشی کے باعث کس نوع کے نازیبا مقاصد کے لیے وقف ہو چکا تھا اور سکھوں کی نظروں میں اس نے اور خادے خاں نے جو اعتبار حاصل کیا تھا، اس کے لیے کس طرح انھیں اسلامیت کے تقاضوں سے یک قلم بے پروائی اختیار کرنی پڑی تھی۔

ملکیوں کو تفہیم

پنجتار پہنچتے ہی سید صاحب نے سب سے پہلے مسجد میں جا کر دوگانہ شکر ادا کیا۔ پھر قیام گاہ پر گئے۔ تھوڑے دن بعد جنگ ہنڈ اور جنگ زیدہ کا پورا مال غنیمت آگیا۔ سید صاحب نے ایک روز وعظ میں لوٹ مار کی برائیاں بھی واضح کیں۔ فرمایا:

> لوٹ بہت بری چیز ہے۔ درحقیقت یہ اسلام کی بدخواہی ہے۔ جہاد بارگاہ الٰہی میں مقبول ہے۔ اس وجہ سے گناہ بخشے جاتے ہیں۔ لیکن لوٹ اور وہ بھی عین معرکے کے وقت، قوت اسلام کی شکست کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس کی وجہ سے تمام نیک اعمال حبط ہو جاتے ہیں

یہ وعظ سن کر مختلف ملکیوں نے اپنے گھروں سے ایک سو ستائیس گھوڑے لا کر پیش کر دیے۔ سید صاحب نے ان کے اس طریقے کی تحسین فرمائی۔

مال غنیمت کی تقسیم

جب پورا مال غنیمت پنجتار پہنچ گیا تو سید صاحب نے توپیں، شاہینیں، بندوقیں، تلواریں، تپنچے اور ڈیرے خیمے پورے مال سے الگ کر کے بیت المال میں داخل کر دیے۔ باقی مال کی قیمت کا اندازہ کر لینے کا حکم دیا اور فرمایا کہ جتنی قیمت بنے اس کے چار حصے غازیوں میں تقسیم کر دیے جائیں۔ ایک حصہ بیت المال میں رہے۔ غازیوں کے حصے میں سے سواروں کو

---

[1] مکاتیب شاہ اسماعیل صفحہ ۲۰۶

دوہرا حصہ دیا جائے، پیادوں کو اکہرا۔ کل تخمینہ بائیس تئیس ہزار کا کیا گیا۔ ملکی لوگ اپنے حصے لے کر چلے گئے۔ ہندوستانی غازیوں نے عرض کیا کہ ہم تو بیت المال سے لے کر کھاتے ہیں۔ بیت المال ہی سے کپڑا اور دوسری ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ ہم حصہ لے کر کیا کریں گے؟ یہ بھی بیت المال میں داخل فرما لیجیے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ جو بھائی خوشی سے اپنا حصہ بیت المال کو دیں گے، اس کا ثواب جدا پائیں گے۔ اکثر نے اپنا حصہ لوٹا دیا۔ بعض اصحاب نے صرف وہ چیزیں رکھ لیں جن کی انھیں فوری ضرورت تھی۔

یار محمد خاں کے قتل کے بعد سلطان محمد خاں کی حالت اتنی نازک ہو گئی تھی کہ سید صاحب چاہتے تو زیدہ سے نکل سیدھے پشاور پہنچ جاتے۔ چونکہ سلطان محمد خاں کبھی کبھی اخلاص و ارادت کا اظہار کرتا رہتا تھا اس لیے سید صاحب نے فرمایا کہ اس پر اعلام کے بغیر حملہ نہیں کریں گے۔

سلطان محمد خاں کی پریشانیاں

سلطان محمد خاں سخت کشمکش میں مبتلا تھا۔ ایک طرف یہ خطرہ تھا کہ سید صاحب پشاور پر چڑھائی نہ کر دیں، دوسری طرف رنجیت سنگھ کی طرف سے بار بار "لیلیٰ"، "مروارید" اور "سبھ کہار" نام گھوڑوں کے لیے تقاضے ہو رہے تھے اور یہ مطالبہ مانے بغیر اس کے شر سے محفوظ رہنا مشکل تھا۔ سلطان محمد گھوڑے دینے پر راضی نہ تھا، خصوصاً لیلیٰ (جو غالباً گھوڑی تھی) اسے بہت عزیز تھی۔ فتح علی شاہ قاچار بادشاہ ایران نے اس کے لیے ساٹھ ہزار روپے پیش کیے تھے، لیکن سلطان محمد خاں نے اس قیمت پر بھی دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اب ہراس زدگی کے عالم میں "لیلیٰ" اور "مروارید" دونوں سکھوں کے حوالے کرنے پڑے، "سبھ کہار" جنگ زیدہ میں یار محمد کے ساتھ تھا۔ جب شبخون کی وجہ سے افراتفری مچی اور مختلف لوگ مال اسباب لوٹنے لگے تو خٹک قوم کے ایک فرد بخت خاں نے یہ گھوڑا سنبھال لیا اور لے کر میدان سے نکل گیا۔ چونکہ اُسے معلوم تھا کہ رنجیت سنگھ اس کا بہت آرزومند ہے، اس لیے بڑی قیمت لے کر یہ گھوڑا اٹک پہنچا دیا۔

یار محمد خاں اور خادے خاں کے مارے جانے سے سید صاحب کی تحریک دو بڑے خطروں سے فی الوقت محفوظ ہو گئی۔ یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ ان حیرت انگیز فتوحات پر دوستوں کے حوصلے بڑھ گئے، دشمنوں، مخالفوں اور مذبذبوں کے دلوں پر رعب چھا گیا۔

جنگی فنون کی مشق

ورزش اور مختلف فنون حرب کی تعلیم کا زیادہ اہتمام اسی زمانے میں ہوا۔ نماز گاہ جمعہ و عیدین کے پاس جو میدان تھا اس میں اسپ سواری، نیزہ بازی، نشانہ بازی، شمشیر زنی وغیرہ کی باقاعدہ مشق ہوتی تھی۔ مختلف فنون کے لیے الگ الگ اکھاڑے بن گئے تھے۔ مثلاً:

۱ - پھری گدکا اور رستم خانی : اس اکھاڑے کی ساری تعلیم شیخ عبدالوہاب اور خدا بخش ساکن منجھاؤں کے زیر اہتمام ہوتی تھی۔

۲ - امر صبح : یہ اکھاڑہ میرزا محمدی بیگ شاہ جہان آبادی نے قائم کیا تھا۔

۳ - غفور خانی : اس اکھاڑے کے استاد سید لطف اللہ اور امام الدین رام پوری تھے۔

۴ - اپلٹی : اس فن کے استاد رجب خاں تھے۔

اسپ دوانی اور نشانہ بازی کی مشقیں الگ ہوتی تھیں۔

رسالدار کی تجویز

ایک روز سید صاحب اپنی قیامگاہ میں تشریف فرما تھے۔ مولانا شاہ اسماعیل، ارباب بہرام خاں، سردار فتح خاں پنجتاری، سید احمد علی بریلوی پاس تھے۔ فرمایا: ہمارا خیال ہے، اب کسی کو رسالدار مقرر کر دیں۔ سید احمد علی نے فوراً کہا کہ حمزہ علی خاں لوہاری والے اس کام کے لیے بہت موزون ہیں۔ وہ بڑے ہوشیار اور بردبار آدمی ہیں۔ مولانا شاہ اسماعیل نے عبدالحمید خاں کا نام پیش کیا اور ارباب بہرام خاں نے مولانا کی تائید فرماتے ہوئے کہا کہ عبدالحمید خاں واقعی فن سپہ گری میں بڑے ہوشیار، تجربہ کار اور بہادر ہیں۔ سید احمد علی نے کہا کہ ان اوصاف کا سب اعتراف کرتے ہیں، لیکن وہ مزاج کے بڑے تند ہیں اور بات بات پر ناخوش ہو جاتے ہیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ مجھے میاں صاحب (مولانا شاہ اسماعیل) اور ارباب صاحب کی تجویز بہتر معلوم ہوتی ہے۔

اگلے روز سید صاحب نے مولانا، ارباب، سید احمد علی، شیخ عبدالحکیم، شیخ ولی محمد وغیرہ کو جمع کیا، پھر عبدالحمید خاں کو بھی بلایا اور فرمایا: خان بھائی! ہم کئی روز سے کسی کو رسالدار مقرر کرنا چاہتے تھے۔ سو ہم نے آپ کو یہ عہدہ دیا۔ آپ ان بھائیوں کو سواری اور سپہ گری کی تعلیم دیتے رہیں۔

عبدالحمید خاں نے عذر کرتے ہوئے کہا کہ حضرت! میں فرمانبردار ہوں لیکن میرا مزاج ذرا تند ہے اور یہ امر اختیاری نہیں کہ چھوڑ دوں۔ شاید بھائیوں کو میری افسری گراں گزرے۔ یہ کام خدا کے واسطے ہے اور عام رئیسوں کی سی فوج کا نہیں۔ سید صاحب نے سراپا شفقت بن کر فرمایا: خان بھائی! آپ اس کا اندیشہ نہ کریں۔ ہم دعا کریں گے، امید ہے اللہ تعالیٰ مزاج کی تیزی دور کر دے۔

اہم تقرر

پھر اپنا عمامہ دست مبارک سے عبدالحمید خاں کے سر پہ باندھا اور فرمایا دوشالہ اور رومال دونوں میں سے جو پسند ہو لے لیجیے۔ خان نے رومال لے لیا۔ ایک سروہی سنہری قبضے کی جو خود ان دنوں باندھتے تھے، اس کا پرتلہ سابری تھا، خان کے گلے میں ڈال دی۔ یہ سروہی نواب امیر الدولہ نے سید صاحب کو نذر میں دی تھی اور نواب کو یہ راجا مان سنگھ والی جودھ پور سے ملی تھی۔ ایک تلوار عنایت

کی اور گھوڑا دے دیا جو نواب وزیر الدولہ نے ٹونک سے عبدالحمید خاں کے ہاتھ سید صاحب کے لیے بھیجا تھا۔ پھر برہنہ سر ہو کر دعا کی کہ اللہ تعالیٰ کفار پر کامیابی عطا کرے۔

رسالدار عبدالحمید خاں نے ایک اشرفی اور پانچ روپے بہ طور نذر پیش کیے۔ پھر وہاں سے نکل کر سیدھے مسجد میں گئے اور شکرانے کے دو نفل پڑھے۔

جنگ زیدہ کے بعد یہ عہدہ قائم ہوا اور سب سے پہلے عبدالحمید خاں نے اس پر تقرر کا شرف حاصل کیا۔ وہ شہید ہوئے تو حمزہ علی خاں کو رسالدار بنایا گیا۔ عبدالحمید خاں کے اخلاق و فضائل کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔ بلاشبہ ان کے مزاج میں ذرا تیزی تھی، لیکن سب راوی متفق ہیں کہ رسالدار بننے کے بعد حلم، بردباری اور سلامت مزاج کا پیکر بن گئے تھے۔

سولھواں باب

تربیلہ، ستھانہ اور امب

تربیلے پر حملے کی دعوت

ہزارہ میں محاذ جنگ قائم کرنے کی سعی سید صاحب نے ۱۸۲۷ء میں فرمائی تھی، لیکن حالات ایسے پیش آ گئے کہ اچانک وہاں سے لوٹنا پڑا۔ تاہم ہزارہ سید صاحب کی نگاہوں سے کبھی اوجھل نہ ہوا۔ انھیں صرف یہ انتظار تھا کہ سمہ میں قدرے اطمینان کی شکل پیدا پیدا ہو جائے تو ہزارہ پر توجہ کریں۔ جنگ ہنڈ و زیدہ کے بعد خان زماں مشوانی رئیس گنگر نے ایک عریضہ اپنے ایک عزیز کے ہاتھ بھیجا کہ تربیلہ[۱] سکھوں سے خالی پڑا ہے۔ اگر آپ غازیوں کی ایک جماعت کو کھبل[۲] بھیج دیں تو میری قوم (مشوانی) پختہ ارادہ کر چکی ہے کہ فوراً تربیلہ پر ہلہ بول کر اس اہم مقام کو قبضے میں لے لیا جائے اور خود تربیلہ کے مسلمان اس تجویز پر متفق ہیں۔ وہ ہماری پوری امداد کریں گے۔

خان زماں سید صاحب کے اخلاص مندوں میں سے تھا۔ آپ نے فیصلہ فرما لیا کہ اب کے خود اس طرف تشریف لے چلیں۔ چنانچہ خان زماں خاں کو لکھ دیا گیا کہ مجاہدین جلد پہنچیں گے، آپ تیار رہیں۔ پانچ چھ روز کے بعد سید صاحب نے ڈیڑھ سو سوار تین سو پیادے اور چھ یا آٹھ شاہینیں ساتھ لیں اور تربیلہ کی تسخیر کے لیے نکل پڑے۔ جو غازی پنجتار میں رہے ان پر مولوی احمد اللہ ناگپوری کو امیر بنا دیا گیا۔

سید صاحب کی روانگی

پنجتار سے نکل کر دو روز مینئی میں رہے جہاں غازیوں کے لیے پن چکیوں پر آٹا پستا تھا وہاں پن چکیوں کا معائنہ کیا۔ سید حامد علی کو ہدایت فرمائی کہ جو غازی کھبل کی طرف جا رہے ہیں ان کی رسد وہاں بھیجی جائے۔ پھر گیارہ بارہ پہنچے۔ پھیوڑ[۳] کے گھاٹ سے

---

[۱] تربیلہ کسی ایک بستی کا نام نہیں بلکہ ایک مقام کی چھوٹی چھوٹی بستیوں کے مجموعے کا نام ہے۔ اس مقام پر سرن ندی دریائے سندھ میں ملتی ہے۔ پہلے یہاں شیشم کا گھنا جنگل تھا جو ۱۸۴۱ء کی طغیانی میں بہ گیا۔ اب تربیلہ میں کم و بیش گیارہ مواضع یا اطراف ہیں، جن کے نام یہ ہیں: تربھگی، لقمانیر، گوجرہ، ٹاہلی، میرا، مورتی، بانڈی یا گدھڑ بانڈی، ڈھوں، تندولہ، جھاڑ، جنٹو۔

[۲] کھبل دو ہیں، جو ایک دوسرے کے پاس پاس ستھانہ سے چھ میل جنوب میں تربیلہ کے عین متصل دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر واقع ہیں۔

[۳] پھیوڑ سمہ کے انتہائی مشرقی گوشے میں ٹوپی سے آگے دریا کے کنارے پر واقع ہے۔ اسے کھبل کی جانب سے سمہ میں داخل ہونے کا دروازہ سمجھنا چاہیے۔

پچاس ساٹھ قندھاریوں کو پار اتار کر خان زمان کے پاس گنگر بھیج دیا اور خود باقی غازیوں کے ساتھ کھبل پہنچ گئے۔ سکندر پور[1] سے جو راستہ تربیلہ آتا ہے، اس سے ذرا ہٹ کر تربیلہ سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر بہاروکوٹ[2] ایک مقام ہے۔ سید صاحب کے زمانے میں یہاں مضبوط قلعہ تھا، جس میں ہری سنگھ پانچ ہزار فوج لیے بیٹھا تھا۔ خان زمان خاں نے دو سو آدمی بہاروکوٹ کا راستہ روکنے کے لیے مقرر کر دیے، خود غازیوں اور اپنے آدمیوں کو لے کر تربیلہ پر حملہ کیا اور سارے خطے پر قبضہ جما لیا۔ صرف ایک گڑھی[3] باقی رہ گئی، جس میں سو سوا سو سکھ فوجی تھے۔ اس کا محاصرہ ہو گیا، ارد گرد مورچے بن گئے اور فریقین میں آتش باری شروع ہو گئی۔

سکھوں کی آمد

عین اس حالت میں معلوم ہوا کہ ہری سنگھ کو تربیلہ پر شبخون کی اطلاع مل گئی ہے اور وہ بہاروکوٹ سے فوج لے کر آ رہا ہے۔ جن لوگوں کو اس کا راستہ روکنے پر مامور کیا گیا تھا وہ باوجود قلت تعداد چار گھنٹے تک مقابلہ کرتے رہے۔ جب کثیر فوج کی روک تھام سے عاجز رہ گئے تو آس پاس کے پہاڑوں پر چڑھ گئے اور ہری سنگھ آگے نکل گیا۔ اس کے بعد تربیلہ پر قابض رہنے کی کوئی شکل نہ تھی۔ خان زمان خاں نے اپنے آدمیوں کو آس پاس کے پہاڑوں پر بھیج دیا اور غازیوں کو کشتیوں میں بٹھا کر سید صاحب کے پاس کھبل پہنچا دیا۔

ہری سنگھ کے سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے آ گئے اور غازیوں پر گولیاں چلانے لگے۔ سید صاحب یہ سارے حالات مقابل کے کنارے پر کھڑے دیکھ رہے تھے۔ آپ نے معاً عبداللہ جمعدار، شیخ وزیر اور میرزا حسین بیگ کو حکم دے دیا کہ شاہین لگا کر سکھوں پر گولے برساؤ۔ غازیوں کی ایک جماعت دریا کے کنارے گھات پکڑ کر بیٹھ گئی، جب سکھ ان کی زد میں آئے تو غازیوں نے گولیوں کی بارش شروع کر دی۔ سکھ اولاً ٹھٹک کر ٹھہر گئے، پھر تھوڑی دیر مقابلے کے بعد لوٹ گئے۔ قندھاری غازی باطمینان کھبل پہنچ گئے۔

متفرق چپقلشیں

کھبل کی جانب سے شاہینیں برابر چل رہی تھیں۔ سوء اتفاق سے ایک شاہیں پھٹ گئی۔ میرزا احمد بیگ چند قدم کے فاصلے پر بیٹھے تھے۔ ایک ٹکڑا ان کی پنڈلی میں لگا، جس سے ہڈی ٹوٹ گئی۔ چارپائی پر ڈال کر انھیں گاؤں پہنچایا گیا۔ سید صاحب نے نور بخش جراح

---

[1] سکندر پور اس زمانے میں ہزارہ کا مشہور مقام تھا اور ہری پور موجود ہی نہ تھا ہری سنگھ نلوہ نے اپنی گورنری کے زمانے میں سکندر پور کے پاس ایک گڑھی بنائی جس کا نام ہرکشن گڑھ رکھا۔ اس کے پاس بستی بس گئی جو ہری پور کے نام سے مشہور ہوئی۔ سکندر پور اب بھی موجود ہے اور اسے ہری پور کا ایک حصہ سمجھنا چاہیے۔

[2] یہ مقام اب بھی موجود ہے لیکن آج اس کی کوئی اہمیت نہیں، نہ وہاں کوئی قلعہ ہے۔

[3] کہتے ہیں یہ گڑھی جھاڑ اور جبٹنو کے درمیان اس جگہ تھی جہاں آج کل تھانہ ہے۔

سے مرہم پٹی کرائی۔

سکھ فوج سرن ندی کے کنارے ٹھہری رہی۔ دوسرے روز غازی ظہر کی نماز سے فارغ ہوئے تو تین چار سو سکھ سوار کھبل کے محاذ میں نمودار ہوئے سید صاحب کے حکم سے ٹیکری پر شاہینیں نصب کر کے گولہ باری شروع کر دی گئی۔ دو سوار مارے گئے، باقی پھر تیزی سے واپس چلے گئے۔

یہ غالباً دسمبر ۱۸۲۹ء کا زمانہ تھا جب کہ ان حصوں میں سخت سردی ہوتی ہے اور دریا کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے سید صاحب نے غازیوں میں اعلان کر دیا تھا اگر کسی بھائی کو غسل کی حاجت ہو اور گرم پانی نہ مل سکے تو ازالہ نجاست کے بعد تیمم کر کے نماز ادا کرے ایسا نہ ہو کہ ٹھنڈے پانی میں غسل موجب مضرت بن جائے۔

تیسرے دن سکھ رات کی تاریکی میں دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر چھپ کر بیٹھ گئے۔ صبح کے وقت غازی اور عام مسلمان وضو کے لیے دریا پر پہنچے تو سکھوں کی گولیاں آئیں لیکن کسی غازی کو گزند نہ پہنچا۔ کھبل کی طرف سے شاہینیں چلنے لگیں چند سکھ مقتول ہوئے باقی بھاگ گئے۔ تربیلہ سے ایک ملکی آیا تو اس نے بتایا کہ دو تین روز کی لڑائیوں میں دس گیارہ سکھ مارے گئے اور ان سے زیادہ زخمی ہوئے۔

پنجاب کے ایک شاہینچی نے بھری ہوئی شاہین کو خالی سمجھ کر اس میں مزید گولی بارود بھر لی۔ شاہین چلائی تو وہ پھٹ گئی۔ ایک ٹکڑا اس بیچارے کی کنپٹی پر لگا اور اندر گھس گیا۔ اس صدمے سے اس مرحوم نے دو تین گھڑی بعد وفات پائی۔

سادات ستھانہ

سید صاحب ابھی کھبل ہی میں تھے کہ سید اکبر شاہ ستھانوی اپنے بھائی سید اصغر شاہ اور بعض دوسرے عزیزوں (مثلاً سید نور جمال ساکن منڈی اور سید کامل شاہ) کو ساتھ لے کر ملاقات کے لیے پہنچے۔ ان سادات کرام کے ساتھ مکاتبت مدت سے جاری تھی اور ان کے اخلاق کریمہ کی وجہ سے سید صاحب اور تمام غازیوں کے دل میں ان کے لیے خاص عزت پیدا ہو گئی تھی۔ مولوی سید جعفر علی نقوی فرماتے ہیں:

اخلاق کریمۂ ایں سادات خصوصاً سید اکبر شاہ بیروں از بیان است و وفا از ابتدا تا انتہا یکساں نمودند[1]	ان سادات خصوصاً سید اکبر شاہ کے اخلاق کریمہ دسترس ذکر و بیان سے باہر ہیں۔ ابتدا سے لے کر انتہا تک وہ اخلاص و وفا میں برابر ثابت قدم رہے۔

---

[1] منظورہ صفحہ ۵۸۸۔

"وقائع" میں ہے:

> سید اکبر شاہ کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ کا بیان کہاں تک کروں۔ جس نے ان کو دیکھا ہے اور ان کی صحبت اٹھائی ہے، وہی خوب واقف ہے کہ ایسا خوش خلق، خندہ رو، کشادہ پیشانی، سلیم الطبع، سلیم المزاج، سخی، شجاع، صاحب تدبیر، صاحب دل، راست گفتار۔ اور حضرت امیر المومنین کا مخلص بے ریا اور محبّ باوفا اور معتقد صادق کوئی رئیس اس ولایت میں نہ تھا[5]

ان بیانات کا ایک ایک حرف درست ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ جو کچھ بیان ہُوا، حقیقت حال اس سے کہیں زیادہ ہے۔ سرحد میں یہی ایک خاندان ہے؛ جس کے ہر فرد کا ایک ایک لمحہ سید صاحب کے ساتھ ابتدائی تعلق سے لے کر ان کی شہادت تک بے توقف اخلاص و محبّت کے ساتھ تمام دینی مقاصد کی اعانت کے لیے وقف رہا اور یہی ایک خاندان ہے جس نے سید صاحب کی شہادت کے بعد اپنی جانوں اور مالوں کو بالکل بے غرضانہ اور بے دریغ مجاہدین کی خدمت کے لیے وقف کیا۔ یہاں تک کہ ان سادات کو پشتوں کے وطن ستھانے سے بھی محروم ہونا پڑا۔ پھر وہ پینتیس میل پہاڑوں میں ملکا نام ایک مقام پر جا بیٹھے۔ وہاں سے بھی محروم ہُوئے اور اس دنیا میں نام نیک کے سوا کوئی متاع باقی نہ رکھی۔ پھر اسی خاندان کے ایک فرد جلیل سید عبدالجبار شاہ صاحب ستھانوی نے اپنے اجداد کرام کی ویران سکونت گاہوں کے نشان از سر نو قائم کیے، ستھانہ کم و بیش پچاس برس تک صفحۂ ہستی سے محو رہنے کے بعد دوبارہ آباد ہُوا۔ سید صاحب کی ذات گرامی اور ان کی مقدس دینی تحریک کی برکات اعزاز و احترام میں آج بھی سادات ستھانہ کے گھرانے کا پرچم سرحد میں سب سے اونچا ہے۔

ستھانہ کی سرگزشت

پہلے مجملاً بتایا جا چکا ہے کہ یہ سادات کرام سید علی ترمذی غوث بنیر کے اخلاف میں سے تھے۔ سید اکبر شاہ کے جد امجد سید ضامن شاہ اپنے آبائی وطن تختہ بند سے نکل کر دہلی گئے۔ راستے میں چھچھ کے ایک افغان سردار نے اپنی صاحبزادی ان سے بیاہ دی۔ دہلی سے ان کو نوشہرہ کا علاقہ جاگیر میں ملا، لیکن آپ آزاد منش اور سیر چشم تھے۔ اس جاگیر کو بے توقف دوسروں کے حوالے کر دیا۔ اوتمان خیئیوں نے انھیں ستھانہ کی اراضی دے دیں، جہاں ایک آبادی قائم کی۔ پکھلی بلکہ پورا ہزارہ ان کا معتقد و مخلص تھا۔ شجاعت اور خدا دوستی کے لحاظ سے اپنے عہد میں یگانہ تھے

---

[5] وقائع صفحہ ۱۱۸۶

پکھلی میں دورے پر گئے ہوئے تھے، بفہ میں اچانک وفات پائی۔ میت کو ستھانہ لا کر دفن کیا گیا۔

ان کے دو فرزند تھے: سید شاہ مردان اور سید شاہ گل عرف شاہ جی۔ سید شاہ مردان والد کی وفات کے بعد نوجوانی ہی میں واصل بحق ہو گئے۔ سید شاہ گل کی شادی گندف میں سید شیر شاہ کی صاحبزادی سے ہوئی، جو ان کا ہم خاندان تھا۔ گندف اور ستھانہ کے درمیان رشتہ داریوں کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

سید اکبر شاہ

سید شاہ گل بڑے عابد و زاہد اور صلح کل بزرگ تھے۔ اپنے پیچھے چھ فرزند چھوڑے: سید اعظم شاہ، سید اکبر شاہ، سید عمر شاہ، سید عمران شاہ، سید اصغر شاہ اور سید شاہ مدار۔

ان میں سے ہر ایک اپنے خاندان کی عزیز ترین متاع یعنی فضائل اخلاق، دینداری، محبت و اخلاص اور راہ حق میں ایثار و قربانی کا پیکر تھا۔ سارے بھائیوں میں باہم انتہائی محبت تھی۔ لیکن سید اکبر شاہ درخشاں ستاروں کی اس انجمن میں بدر منیر کی حیثیت رکھتے تھے۔ سید اعظم شاہ سب سے بڑے تھے۔ ان کی شادی احمد علی خاں پلال کی صاحبزادی سے ہوئی تھی جو صوبہ خانی تنولیوں کا رئیس تھا۔ یہ صاحبزادی نواب خاں رئیس ہندوال تنولی کی حقیقی بھانجی تھی اور اس کی دوسری بہن سردار پایندہ رئیس امب و دربند کی بیگم تھی۔ رشتہ داریوں کی اس سرسری تفصیل سے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ سادات ستھانہ کا خاندان دنیوی وجاہت میں بھی اس عہد کے بلند ترین گھرانوں میں شمار ہوتا تھا اور دینی وجاہت میں تو نہ پہلے علاقہ سرحد میں کسی کو اس کی ہمسری نصیب ہوئی اور نہ بعد میں کوئی اس کے رتبۂ عالی پر پہنچ سکا۔

سید شاہ گل کی وفات کے بعد قاعدے کے مطابق دستار قیادت سید اعظم شاہ کے سر پر رکھی گئی لیکن کچھ مدت بعد سید اعظم نے بطیب خاطر یہ اعزاز سید اکبر شاہ کے حوالے کر دیا۔ تاہم ان کا اعزاز بزرگی بدستور قائم رہا، بلکہ ان بھائیوں کے باہمی تعلقات کی محبت و گرمجوشی کو دیکھتے ہوئے ان کے درمیان چھوٹے بڑے کا امتیاز پیدا کرنا ہی غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ستھانہ میں مشورے

سید اکبر شاہ ملاقات کے بعد خواہاں ہوئے کہ سید صاحب ستھانہ تشریف لے چلیں اور کہا کہ ستھانہ سے یہی ارادہ لے کر کھبل آیا تھا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ سید بھائی! انشاء اللہ کل چلیں گے۔

اس اثنا میں سید حسن شاہ اور شاما جمعدار سردار پایندہ خاں کی طرف سے آرزوے ملاقات کا پیغام لے کر پہنچ گئے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ہم پہلے اکبر شاہ کے ساتھ ستھانہ جانے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ اپنے خان سے جا کر کہو کہ ہم ستھانہ میں ٹھہریں گے۔ پھر جو کچھ وہ فرمائیں اس کے متعلق ستھانہ ہی میں ہمیں اطلاع دے دینا۔

چنانچہ سید صاحب دوسرے روز ڈیڑھ سو غازیوں کے ساتھ ستھانہ چلے گئے باقی سب کو کبل میں چھوڑ دیا۔ سید اکبر شاہ کے سارے بھائی انتہائی محبت و عقیدت سے ملے۔ ان کی والدۂ ماجدہ بھی زندہ تھیں۔ سب نے بیعت کی۔ سید اکبر شاہ نے سارے لشکر کے لیے پلاؤ پکوایا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو الگ بیٹھ کر پاینده خاں سے ملاقات کے متعلق مشورہ کیا، جس میں سید صاحب اور سید اکبر شاہ کے علاوہ صرف مولانا شاہ اسماعیل اور منشی خواجہ محمد شریک تھے۔

سید اکبر شاہ نے جو کچھ مولانا شاہ اسماعیل سے ۱۸۲۷ء میں کہا تھا، اسے پھر دہرایا یعنی یہ کہ یہاں لوگوں میں عہد کی پابندی اور اخلاص و وفا بہت کم ہے اور سردار پاینده خاں بھی اس عام قاعدے سے مستثنیٰ نہیں[1]۔ مزید کہا کہ ہمارے عزیزوں میں سید نادر شاہ ایک بزرگ اور جہاندیدہ آدمی ہیں۔ وہ پاینده خاں کے والد کے زمانے سے ریاست امب کے مشیر ہیں۔ انھیں منڈی سے بلا لیتا ہوں تاکہ آپ کو زیادہ صحیح مشورہ مل جائے۔ سید صاحب خود منڈی جانے کے لیے تیار تھے، لیکن سید اکبر شاہ نے نادر شاہ اور ان کے بھائی کو ستھانہ بلا لیا۔

تنولیوں کی داستان

پاینده خاں تنولی کے دل و دماغ کی صحیح کیفیت اسی صورت میں واضح ہو سکتی ہے کہ وہ فضا اور ماحول آنکھوں کے سامنے آ جائے جس میں اس نے تربیت پائی۔ اس سلسلے میں تنولیوں کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔

تنولی دو گروہ تھے: ایک پلال اور دوسرا ہندوال۔ پلالوں کی ریاست ہزارہ سے کرپلیاں تک تھی اور ہندوال اگرور سے دربند اور وہاں سے تین میل جنوب تک کے مالک تھے۔ ریاست کا منصب سب سے پہلے پلالوں نے حاصل کیا۔ جن میں سے اول صوبہ خاں رئیس بنا، پھر اس کا بیٹا سرفراز خاں بعد ازاں گلشیر خاں۔ ہندوالوں میں سب سے پہلے ہیبت خاں نے بلند حیثیت حاصل کی اور گلی بدرہال کو اپنا مرکز بنایا۔ پھر دونوں گروہوں میں لڑائیاں چھڑ گئیں۔ صلح اس بات پر ہوئی کہ ہیبت خاں کی صاحبزادی گلشیر خاں کے فرزند احمد علی خاں سے بیاہ دی جائے اور گلشیر خاں کی صاحبزادی کی شادی ہیبت خاں کے خلف اکبر ہاشم علی خاں سے ہو جائے۔ یہ انیسویں صدی کے اوائل کے واقعات ہیں۔ ان رشتہ داریوں کے بعد آپس میں اختلاف کا کیا اندیشہ تھا؟ لیکن گلشیر خاں اور ہیبت خاں کی وفات کے بعد جب دونوں ریاستوں کے مالک بالترتیب احمد علی خاں اور ہاشم علی خاں بنے تو اول الذکر کی بے چین طبیعت امن و صلح پر مطمئن نہ رہ سکی، اس لیے دوبارہ لڑائی چھڑ گئی، جس میں خود اس نے سخت شکستیں کھائیں۔ بدقسمتی سے وہ اپنے

---

[1] منظورہ صفحہ ۵۸۸

دوسرے عزیزوں کو دشمن بنا چکا تھا۔ جب اسے بچاؤ کی کوئی صورت دکھائی نہ دی تو اپنے بہنوئی ہاشم علی خاں سے صلح کا طریق یہ سوچا کہ اپنی بہن کو بلا لیا اور اسے اطمینان دلا کر ہاشم علی خاں کو پیغام بھیجا کہ وہ برادرانہ آئے اور اپنی اہلیہ کو لے جائے۔ ہاشم علی خاں انتہائی صاف دلی سے صرف چالیس آدمی لے کر گیا۔ جو اس عہد کے رئیسوں کے ساتھ عموماً رہتے تھے۔ احمد علی خاں نے اسے اپنے قلعہ میں قتل کر دیا اور لاش بیوہ بہن کے ہمراہ گلی بدرہال بھیج دی جہاں ہاشم علی خاں کا چھوٹا بھائی نواب خاں مقیم تھا۔

نواب خاں

نواب خاں فی الفور انتقام کے لیے تیار ہو گیا۔ احمد علی خاں درہ نندھیاڑ کی طرف بھاگا جہاں اس کے ایک عزیز سربلند خاں نے اسے پکڑ کر قتل کروا ڈالا۔ اس کی دو لڑکیاں تھیں۔ ایک کی شادی سید اعظم شاہ ستھانوی سے ہو چکی تھی، دوسری اپنی والدہ (ہمشیرہ نواب خاں) کے ساتھ سربلند خاں کی قید میں تھی۔ نواب خاں نے انھیں قید سے رہائی دلائی۔ ہاشم علی خاں کی بیوہ سے خود شادی کر لی اور بڑے اطمینان سے ریاست کا کاروبار انجام دینے لگا۔

سوء اتفاق سے ایک ایسا واقعہ پیش آگیا کہ نواب خاں بھی مصائب کا ہدف بن گیا۔ کشمیر سے سردار عظیم خاں کی والدہ کابل جا رہی تھی۔ نواب خاں کے آدمیوں نے اس کا کچھ مال لوٹ لیا۔ عظیم خاں نے جوش انتقام میں نواب خاں کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے لیا اور راستے میں اسے دریائے لنڈے میں غرق کرا دیا۔

پائندہ خاں اس وقت سولہ سترہ برس کا ہوگا۔ وہ بھی والد کے ساتھ گرفتار ہوا تھا لیکن نواب خاں نے ایک حیلے سے اس کے لیے رہائی کی صورت پیدا کر دی اور تاکیداً وصیت کی کہ کبھی کسی سردار یا حاکم یا رئیس سے صاف دلی کے ساتھ نہ ملنا۔ کسی پر بھروسا نہ کرنا اور سب سے الگ تھلگ رہنا۔

پائندہ خاں

سید نادر شاہ نے بتایا کہ پائندہ خاں کی تربیت ابتدا ہی سے شکوک و بے اعتمادی کی فضا میں ہوئی۔ دور مصائب میں حسن زئیوں اور مداخیلوں کے علاوہ سادات ستھانہ اور الف خاں پنجتاری (والد فتح خاں) نے اس کی امداد میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا، لیکن پائندہ خاں نے قدم جماتے ہی الف خاں سے عشرہ، حسن زئیوں سے چھتربائی اور مداخیلوں سے بھیسٹ گلی کے علاقے چھین لیے۔ ستھانہ بھی لینا چاہتا تھا لیکن اکبر شاہ اور اس کے بھائیوں کا نصیب یاور تھا، اس لیے پائندہ کامیاب نہ ہوا۔

اس نے خود مجھ سے کئی بار ذکر کیا کہ والد کی وصیت کے مطابق میرا دل کبھی کسی رئیس یا حاکم سے صاف اور مطمئن نہیں ہوا۔ بایں ہمہ آپ کے نزدیک پائندہ خاں سے ملاقات ضروری ہے تو یہاں سے آدھے کوس پر کھڑی ہے، پائندہ خاں کو اس مقام پر بلا لیجیے۔ اس کا دل صاف ہوگا تو بے توقف چلا آئے گا۔

سیّد صاحب کا ارشاد

سید صاحب نے نادر شاہ کی تکلیف کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ عقل کے رو سے آپ کا ارشاد بالکل بجا ہے:

> جو سردار اور رئیس جاہ طلب اور دنیا دار ہیں، ان سب کا یہی برتاؤ ہے۔ ان کو اوّل خطرہ اپنی جان کا ہوتا ہے، دوسرا زوال ریاست کا۔ ہمارا معاملہ تو خواہ دین کا ہو یا دنیا کا صرف اللہ تعالیٰ کی رضا پر موقوف ہے۔ اس کی رضا کے کام میں جان و مال صرف کرنا سعادت ابدی سمجھتے ہیں۔ کوئی ہم سے دغا اور فریب کرے گا تو ہمارا دین بگاڑے گا نہ ایمان۔ اس کا عوض وہ اللہ سے پاوے گا۔ ہم کو خطرہ کس بات کا ہے؟ ہم پاینده خاں سے ملاقات کا ارادہ رکھتے ہیں تو صرف اس نیت سے کہ وہ ہمارا مسلمان بھائی ہے۔ رئیس، خان اور مرد آدمی ہے اگر وہ ہم سے موافق ہو جائے تو اس کے عمل میں سے ہو کر ہمارے لیے راستہ کشمیر کا صاف ہو جائے اور لوگ بے دغدغہ آنے جانے لگیں۔ کھڑی پر بلانے سے ممکن ہے وہ بدگمان ہو جائے[1]۔

سید نادر شاہ نے کہا کہ حضرت اگر حسبۃً للہ یہی نیت ہے تو بہر صورت آپ کا فائدہ ہے، نقصان کسی طور کا متصوّر نہیں[2]۔

ملاقات کا فیصلہ

پاینده خاں کے متعلق سید صاحب کی رائے بھی درست تھی۔ سید اکبر شاہ اور سید نادر شاہ نے جو کچھ کہا تھا، وہ بھی صحیح تھا۔ خان یقیناً بہادر، بلند ہمت اور باتدبیر رئیس تھا۔ اس کی ریاست ایسے موقع پر واقع تھی کہ مشرقی سمت میں یعنی ہزارہ یا کشمیر کی طرف کوئی تحریک اس کی سرگرم اعانت کے بغیر شروع نہیں ہو سکتی تھی اور اس کی شجاعت و اولوالعزمی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ سب سردار سکھوں سے دب گئے، لیکن وہ ہزاروں مصیبتوں اور پریشانیوں کے باوجود بہ دستور مقابلے پر جما رہا۔

یہ بھی درست ہے کہ اس کے والد کی وصیت جس موقع پر اور جن حالات میں ہوئی تھی وہ بڑے درد انگیز تھے اور اس وصیت کا نقش اس کے دل پر اس طرح جما کہ پھر وہ کسی پہ بھروسے کا اہل نہ رہا۔ اس کی

---

[1] "منظورہ" میں ہے کہ سید صاحب نے فرمایا: ہر چند ہم چنیں است کہ آں بزرگ (سید نادر شاہ) بیان فرمودند اما از طرفِ ما جائے مقرر نمودن ضرورتے ندارد۔ ہر جا کہ دل او بخواہد ملاقات نماید۔

[2] "وقائع" ۱۱۹۶ - ۱۱۹۷

طبیعت ایسی بن گئی تھی کہ شکوک سے لبریز اور غیر مطمئن قلب کے آئینے میں اسے ساری دنیا سراسر مکر و فریب نظر آتی تھی۔ یقیناً یہ ایک بہت بڑی کوتاہی تھی، سید صاحب کے سامنے اس کے محاسن بھی تھے۔ انھیں امید تھی کہ ممکن ہے اللہ کے فضل سے اس کا دل شک و ریب کے زنگ سے پاک ہو جائے۔

غرض ملاقات کا فیصلہ ہو جانے کے بعد پاینده خاں کے وکیل آئے تو انھوں نے پیغام دیا کہ خان عشرہ میں ہے۔ وہیں دریا کے کنارے بڑ کے نیچے ملاقات ہوگی۔ تھوڑے سے آدمی ساتھ لے کر آپ تشریف لے آئیں۔ سید صاحب نے یہ دعوت قبول فرمالی۔

سترھواں باب

پاینده خاں کی فرمانبرداری اور سرکشی

سید صاحب کو اندازہ ہو چکا تھا کہ پاینده خاں کی شکی طبیعت اس کے لیے وجہ مصیبت بنی ہوئی ہے اس کا علاج یہی تھا کہ راہ و رسم پیدا کر کے عملاً اسے یقین دلایا جاتا کہ شکوک و اوہام میں مبتلا رہنے کی کوئی وجہ نہیں۔ جب ملاقات کا وقت اور مقام طے ہو گیا تو سید صاحب نے مولانا شاہ اسماعیل سے فرمایا کہ ہمارے ساتھ زیادہ آدمی نہ جائیں تاکہ خان کے دل میں سوء ظن نہ پیدا ہو۔ مولانا نے عرض کیا کہ ستھانہ میں سب آدمیوں کو روکنے کی ضرورت نہیں۔ جائے ملاقات سے تھوڑے فاصلے پر جن جن کو چاہیں روک دیں اور جن جن کو چاہیں ساتھ لے لیں۔ سید صاحب کی معیّت کے لیے مندرجہ ذیل اصحاب تجویز ہوئے:

۱۔ مولانا شاہ اسماعیل ۲۔ منشی خواجہ محمد (حسن پوری) ۳۔ حافظ صابر تھانوی
۴۔ مولوی امام الدین بنگالی ۵۔ شیخ شرف الدین بنگالی ۶۔ حافظ عبدالرحمٰن پھلتی
۷۔ شیخ ناصرالدین پھلتی ۸۔ شیخ عبدالرؤف پھلتی ۹۔ شیخ عنایت اللہ (منڈھیاؤں ضلع
۱۰۔ زبردست خاں رائے بریلوی ۱۱۔ شیخ عبدالرحمٰن رائے بریلوی جرن پھلد)
۱۲۔ شیخ عبدالرحمٰن خیرآبادی

مولانا نے بہ نظر احتیاط چھبیس آدمیوں کو بطور خود منتخب کر کے حکم دے دیا کہ دریا کے کنارے کی اوٹ میں مقام ملاقات کے قریب پہنچ جاؤ اور وہاں جا کر اوٹ میں تیار کھڑے رہو۔ اگر خان یا کسی دوسرے آدمی کی طرف سے مخالفانہ حرکت کا ذرا سا بھی احساس ہو تو بجلی کی تیزی سے حضرت کے پاس پہنچ کر انھیں اپنی حفاظت میں لے لینا۔ ان اصحاب کے نام ذیل میں درج ہیں:

۱۔ شیخ علی محمد دیوبندی ۲۔ ابراہیم خاں خیرآبادی ۳۔ امام خاں خیرآبادی
۴۔ محمد خاں خیرآبادی ۵۔ گلاب خاں دوآبہ گنگ و جمن ۶۔ محمود خاں لکھنوی
۷۔ کریم بخش بنارسی ۸۔ چراغ علی رام پوری ۹۔ شیخ نجم الدین رام پوری
۱۰۔ حاجی عبداللہ رام پوری ۱۱۔ شیخ نصرت بانس بریلوی ۱۲۔ مرادہ خاں خورجوی
۱۳۔ بخش اللہ خاں خورجوی ۱۴۔ ولی داد خاں خورجوی ۱۵۔ شیخ نصراللہ خورجوی

۱۶- سید ظہور اللہ بنگالی
۱۷- سید لطف اللہ بنگالی
۱۸- قاضی مدنی بنگالی
۱۹- ملا بازار قندھاری
۲۰- ملا عزت قندھاری
۲۱- ملا عمر خاں قندھاری
۲۲- ملا لعل محمد قندھاری
۲۳- پیر خاں پھکیت
۲۴- فتح علی عظیم آبادی

اس احتیاطی تدبیر کا علم غالباً سید صاحب کو بھی نہ تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ پائندہ خاں نے بھی مقام ملاقات سے ایک گولی کی زد پر دامن کوہ میں، جہاں غڑاسکا کا جنگل تھا، پانسو پیادے چھپا رکھے تھے۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا[1]

ملاقات

سید صاحب ظہر کی نماز پڑھ کر تیار ہوئے۔ کمر میں تلوار اور تینچہ باندھا اور ہاتھ میں برچھا لیا۔ سواری کے لیے عبدالحمید خاں رسالدار کا گھوڑا طلب فرمایا۔ پہاڑ سے گزر کر عشرہ کے قریب پہنچے تو پائندہ خاں کے وکیل پیشوائی کے لیے موجود تھے۔ انھوں نے عرض کیا کہ آپ کے ساتھ آدمی زیادہ ہیں۔ سید صاحب نے سب کو روک دیا اور صرف بارہ آدمی ساتھ لیے جو پہلے سے تجویز ہو چکے تھے۔ جب مقام ملاقات پچاس ساٹھ قدم رہ گیا تو مزید دس آدمیوں کو روک دیا۔ صرف مولانا شاہ اسماعیل اور خواجہ محمد ساتھ رہے۔

عشرہ سے باہر نکل کر دریا کی جانب دامن کوہ میں بڑ کا ایک بھاری درخت تھا۔ اس کے نیچے عمدہ چبوترہ بنا ہوا تھا۔ پائندہ خاں کے وکیل سید حسن شاہ نے اس پر فرش بچھا کر سید صاحب کو بٹھایا۔

---

[1] بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ یہ چوبیس آدمی سید صاحب کے ساتھ گئے تھے۔ جس مقام پر جا کر رُکے مولانا نے وہاں سے انھیں دریا کے کنارے ٹھہرنے کے لیے بھیج دیا۔

[2] عشرہ ستھانہ سے تقریباً تین میل شمال میں ہوگا۔ پرانے امب اور عشرہ کے درمیان بھی اتنا ہی فاصلہ تھا۔ اب ان مقامات پر دریا کے کنارے اوٹ کی کوئی جگہ نہیں۔ ۱۸۴۱ء کی طغیانی میں دریائے سندھ کے اردگرد کی زمین تیرہ تیرہ گز گہرائی میں کھد گئی تھی، لہٰذا ان مقامات کے جس نقشے کا ذکر متن میں ہے، اسے آج کل موقع پر تلاش کرنا بے سود ہوگا۔ ستھانہ اور عشرہ کے درمیان ایک کھڑی بھی تھی یعنی پہاڑ کی ایک کم بلند دیوار عین دریا کے کنارے تک پہنچی ہوئی تھی اور آنے جانے والے اس کے اوپر سے گزرتے تھے۔ اس وجہ سے دریا کے کنارے کنارے ستھانہ سے عشرہ جانا سہل نہ تھا۔ فرمانروائے امب نے اس کھڑی کو کٹوا دیا اور آج کل یہ راستہ ہموار ہے۔ ستھانہ سے عشرہ جانے کا ایک راستہ پہاڑ پر سے بھی تھا۔ سید صاحب ملاقات کے لیے اسی راستہ سے گئے تھے۔ جائے ملاقات کے سلسلے میں بڑ کے جس درخت کا ذکر ہے، وہ بھی ۱۸۴۲ء کی طغیانی میں بہ گیا تھا۔ بعد میں اس کی جگہ نیا بڑ لگا دیا گیا۔ وہ آج کل موجود ہے۔ اس سے جائے ملاقات کا نشان مل سکتا ہے۔

خان ایک گولی کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس نے زرہ، چار آئینہ اور خود پہن رکھا تھا، صرف آنکھیں کھلی تھیں سید صاحب بیٹھ گئے تو خان پہنچا۔ مصافحہ و معانقہ اور مزاج پرسی کے بعد سید صاحب نے فرمایا:

> خان بھائی! آپ کسی بات کا اندیشہ نہ کریں۔ آپ ہمارے بھائی ہیں۔ ملاقات کی غرض محض یہ ہے کہ ہم اپنے پروردگار کا حکم جاری کر سکیں۔ آپ کی عملداری سے کشمیر کا راستہ ہے۔ دریائے اباسین کی کشتیاں آپ کے قبضے میں ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے لوگ اللہ تعالیٰ کے کاروبار کے لیے آپ کی عملداری میں سے آئیں جائیں تو کوئی ان کا حارج اور مزاحم نہ ہو۔ اگر آپ بھی للہ فی اللہ اس کار خیر میں شریک رہیں گے تو اللہ تعالیٰ دین اور دنیا میں فلاح اور خیر عطا کرے گا۔

پاینده خاں نے عرض کیا کہ آپ پیر و مرشد اور امام ہیں اور ہم مطیع و فرمانبردار، جو کچھ آپ فرماتے ہیں، مجھے منظور ہے۔

خان کی پریشانی

سید صاحب چاہتے تھے کہ بات چیت کے ذریعے سے طریق کار کے متعلق مزید تفصیلات طے کر لیں، لیکن پاینده خاں ڈرا ہُوا تھا اور اس کی روش سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ملاقات کو جلد سے جلد ختم کرنا چاہتا ہے۔ سید صاحب نے اس کے لیے ایک دستار رومال میں بندھوا کر ساتھ لے لی تھی۔ چاہتے تھے کہ اپنے دست مبارک سے دستار اس کے سر پر باندھیں، لیکن اس نے رومال سمیت دستار اٹھالی اور عرض کیا کہ مکان پر جا کر باندھ لوں گا۔

اس اثنا میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ معلوم ہُوا کہ پاینده خاں کے سوار باگیں اٹھائے آ رہے ہیں۔ غازیوں کی جو جماعت دریا کے کنارے متعیّن تھی وہ تیزی سے جائے ملاقات پر پہنچ کر سید صاحب اور پاینده خاں کے گرد حلقہ بنا کر کھڑی ہو گئی۔ پاینده خاں پر اور بھی گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ لیکن سید صاحب نے اسے تسلّی دی۔ آخر میں فرمایا:

> خان بھائی! آپ خدا کے لیے ہم سے ملے ہیں۔ کار خیر میں شرکت کر لیجیے۔ آپ کی عملداری سکھوں کی سرحد سے ملی ہُوئی ہے، ہم آپ کو ایک ضرب توپ اور ایک ہاتھی دیں گے

ملاقات ختم ہو گئی۔ دن تھوڑا رہ گیا تھا۔ سید صاحب فیصلہ فرما گئے تھے کہ خان روکے گا تو عشرہ میں رات گزار لیں گے لیکن پاینده خاں نے ایک مرتبہ بھی نہ کہا کہ ٹھہر جائیے، بلکہ کہا: میں دعوت کا سامان ستھانہ پہنچا دوں گا۔ گویا چاہتا تھا کہ سید صاحب تشریف لے جائیں۔ عشا کے وقت سید صاحب ستھانہ پہنچے۔ اس وقت پاینده خاں کی طرف سے دو اونٹ آئے، ایک پر باریک چاول لدے ہُوئے تھے،

دوسرے پر دو مٹکے شہد کے اور دو مٹکے گھی کے تھے۔[1]

مراجعت

ستھانہ سے سید صاحب نے لشکر کے بڑے حصے کو مولانا کے ہمراہ کھبل بھیج دیا۔ خود چنئی تشریف لے گئے، جہاں ایک مُلّا سے ملاقات منظور تھی۔ وہ اصلاً مانسہرہ کا تھا لیکن جب وہاں سکھوں کا عمل دخل ہُوا تو ہجرت کر کے آزاد علاقے میں پہنچ گیا۔ اس مُلّا سے مل کر سید صاحب بہت خوش ہُوئے۔ تین راتیں اس کے پاس گزاریں۔

چنئی میں آپ کو اچانک یہ خبر ملی کہ درانیوں نے موقع پا کر قلعہ ہنڈ پر حملہ کیا اور غازیوں کی جو جماعت وہاں موجود تھی، اس سے قلعہ خالی کرا لیا۔ اب وہ پنجتار پر چڑھائی کی تیاری کر رہے ہیں۔ یہ اطلاع پاتے ہی آپ نے مولانا کو لکھا کہ جلد سے جلد گندف[3] میں ملیے۔ چنانچہ مولانا سے گندف میں ملاقات ہُوئی تو فیصلہ فرمایا کہ پنجتار جانا ضروری ہے۔ جھنڈا بوکا پہنچے تو فتح خاں پنجتاری استقبال کے لیے موجود تھا۔ پنجتار پہنچ کر شیشم کے درختوں میں آپ نے ظہر کی نماز ادا کی۔ بہت سے ملکی ملاقات کے لیے آئے ہُوئے تھے۔ وہاں سرداران پشاور کے عزم پنجتار کا ذکر چھڑا تو سید صاحب نے برسرِ مجلس فرمایا: وہ کیا کریں گے؟ میرے پاس پانسو گھوڑے ہیں۔ غازیوں کو دو روز کی رسد دے کر ایک ایک گھوڑے پر دو دو کو سوار کر کے بھیج دوں گا تو پشاور سے اُدھر دم نہ لیں گے۔ یہ خبر سرداروں تک پہنچ گئی تو وہ سب مخالفانہ تدبیروں سے دست کش ہو کر پشاور کی حفاظت کے انتظامات میں لگ گئے۔

ہنڈ پر حملہ

سلطان محمد خاں کے متعلق تو معلوم ہو چکا ہے کہ سید صاحب کے خلاف اقدام میں اسے یار محمد خاں سے اتفاق نہ تھا۔ لیکن اس کی اور یار محمد خاں کی والدہ بار بار زور دے رہی تھی کہ بھائی کے خون کا بدلہ لو، بلکہ ایک موقع پر والدہ نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ تم نے کچھ نہ کیا تو میں خود باہر نکل کر فریادی بنوں گی اور سب لوگوں کو اٹھا کر سید پر چڑھائی کرا دوں گی۔ جب سید صاحب کھبل اور ستھانہ کی طرف چلے گئے تو سلطان محمد خاں نے سمجھا کہ والدہ کی خواہش کو پورا کرنے کا اچھا موقع نکل آیا ہے۔ چنانچہ اس نے فوج لے کر ہنڈ پر حملہ کر دیا۔ قلعے میں صرف ساٹھ غازی تھے۔ اخوند ظہور اللہ جہانگیرہ والے ان کے افسر اور محمد خاں پنجابی اخوند کے نائب تھے۔ انھوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ محاصرہ کئی دن جاری رہا۔

---

[1] "وقائع" میں ہے کہ چاول خچر پر لدے ہُوئے تھے، گھی اور شہد کے مٹکے مزدوروں کے سر پر تھے۔ [2] چنئی ستھانہ کے پیچھے پہاڑوں کے بیچ میں ہے۔ [3] یہ گندف پہاڑوں کے بیچ میں چنئی سے پنجتار کے راستے پر واقع ہے۔ دوسرا گندف تربیلہ سے آگے دریائے سندھ کے مشرقی کنارے سے ذرا ہٹا ہُوا ہے۔

سلطان محمد خاں کی فوج کا ایک فرنگی افسر محاصرے کا مہتمم تھا۔[1] اس نے ایک روز غازیوں کو پیغام بھیجا کہ مقابلہ بے سود ہے۔ باہر سے کمک پہنچ نہیں سکتی بلکہ کمک کے لیے پیغام بھی بھیجنا مشکل ہے۔ بہتر یہ ہے کہ قلعہ حوالے کر دو۔ میں ذمہ لیتا ہوں کہ آپ لوگوں کو اسلحہ سمیت عزت سے نکال دوں گا۔

غازیوں نے یہ شرط قبول کر لی۔ قلعہ حوالے ہو گیا تو سلطان محمد خاں غازیوں کو ساتھ لے کر پشاور کی طرف روانہ ہوا۔ فرنگی افسر سے کہا کہ خٹک کے علاقے میں پہنچ کر انھیں رخصت کر دیا جائے گا۔ جب غازیوں سے ہتھیار لے کر انھیں قیدی بنا لیا گیا تو فرنگی افسر کو بد عہدی پہ سخت رنج ہوا اور وہ سلطان محمد خاں کو چھوڑ کر نوشہرہ چلا گیا۔

غازیوں کی جوانمردی

اب سلطان محمد خاں روزانہ مجلس میں بڑ مارنے لگا کہ تمام غازیوں کو پشاور لے جا کر بھائی کی قبر پر ذبح کروں گا۔ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ جب مرنا ہی ہے تو لڑ کر کیوں نہ مریں۔ چارسدہ پہنچے تو انھیں ایک کمرے میں بند کر کے پہرے لگا دیے گئے۔ ایک غازی کے پاس چھری رہ گئی تھی۔ رات کے وقت اس چھری سے کام لے کر مکان کے پچھواڑے میں نقب کا بندوبست کیا گیا۔ جب آدمی کے لیے بے تکلف نکل جانے کا راستہ بن گیا تو ہر غازی نے دیوار سے نکلے ہوئے پتھروں میں سے دو دو اُٹھا لیے اور بے باکانہ باہر نکل پڑے۔ بعض لوگوں نے انھیں دیکھ کر شور مچایا کہ سید کے غازی شبخون مارنے کے لیے آ پہنچے۔ اس سے سلطان محمد خاں کی سپاہ میں سراسیمگی پھیل گئی۔ غازی اس خداداد مہلت سے فائدہ اٹھا کر تین فرسنگ نکل گئے۔

اب یہ مشورہ ہوا کہ کہاں جائیں۔ بعض نے کہا کہ امیر المومنین کے پاس جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ قلعے کی حوالگی نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔ اب حضرت کو کیا منہ دکھائیں؟ لیکن محمد خاں پنجابی نے کہا کہ بھائیو! ہمارا جینا اور مرنا حضرت کے ساتھ ہے۔ کچھ بھی ہو ہمیں وہیں جانا چاہیے۔ چنانچہ وہ بیس غازیوں کو لے کر پنجتار پہنچ گئے۔ سید صاحب نے ان کی مردانگی کی داد دی اور پنجتار آنے کے فیصلے پر مسرت کا اظہار فرمایا۔

سلطان محمد خاں نے ہنڈ کو خادے خاں کے بھائی امیر خاں کے حوالے کر دیا۔ اسے تنہا قلعے کو سنبھالے رکھنا مشکل نظر آیا تو سکھوں سے مدد مانگی۔ سکھوں نے سات سو آدمی ہنڈ بھیج دیے۔ جب قاضی سید محمد حبان علاقہ سمہ کا دورہ کرتے ہوئے ہنڈ پہنچے تو سکھ قلعے کو خالی کر گئے۔ اس بارے میں تفصیلی حالات

---

[1] روایتوں میں اس کا نام کیول بتایا گیا ہے۔ مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ یہ انگریز تھا یا فرانسیسی یا اطالوی۔

موقع پر بیان ہوں گے۔

سید صاحب کے عزائم

پایندہ خاں سے ملاقات کے بعد سید صاحب فوراً پنجتار نہیں آنا چاہتے تھے اسی لیے لشکر کو کھبل میں ٹھہرنے کا حکم دے دیا تھا کہ جلد سے جلد پکھلی میں پیش قدمی کی جائے۔ پنجتار پر حملے کے خطرے کی اطلاع پا کر لوٹنے پر مجبور ہوئے۔ جب اطمینان ہوگیا کہ سرداران پشاور کسی فوری اقدام کی ہمت نہیں رکھتے تو پھر پکھلی میں محاذ جنگ پیدا کرنے کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔ اس اثنا میں ناصر خاں بھٹ گرامی، سربلند خاں تنولی، کمال خاں اگروری، امان اللہ خاں عشرہ والے، مدد خاں (برادر پایندہ خاں)، راجا زبردست خاں مظفرآبادی کے عرائض بھی پہنچ گئے کہ ہم اعانت کے لیے ہمہ تن حاضر ہیں۔ چنانچہ سید صاحب نے غازیوں کے ایک جیش کو مقدمے کے طور پر مولانا شاہ اسماعیل کی قیادت میں بھیج دینے کا فیصلہ فرمایا اور ان سے کہہ دیا کہ جیسے حالات پیش آئیں، ان کے مطابق آیندہ کے لیے پروگرام بنا لیا جائے۔ مولانا خیرالدین شیرکوٹی کو شاہ اسماعیل کا نائب بنایا گیا۔

پایندہ خاں کی مزاحمت

شاہ صاحب نے ستھانہ پہنچ کر پایندہ خاں کو اطلاع دی کہ ہم امیرالمومنین کے حکم سے پکھلی جا رہے ہیں، آپ کشتیاں تیار رکھیں۔ خاں کی طرف سے بالکل خلاف توقع یہ جواب آیا کہ میں امیرالمومنین کا فرمانبردار ہوں، لیکن اگر آپ میری ریاست میں سے گزریں گے تو ہری سنگھ (ہزارہ کا سکھ گورنر) مجھے تنگ کرے گا۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ کوئی دوسرا راستہ اختیار کریں۔

زبان سے اقرار اطاعت اور عمل میں صریح نافرمانی کا یہ عجیب و غریب منظر دیکھ کر شاہ صاحب حیران رہ گئے۔ بلاشبہ سکھوں کی طرف سے آزار کا اندیشہ غیر معقول نہ تھا، لیکن پایندہ خاں تو ابتدا سے سکھوں کے خلاف لڑ رہا تھا اور اس نے مصالحت منظور نہیں کی تھی، بلکہ سکھوں نے اس کے کچھ علاقے بھی دبا رکھے تھے۔ جو شخص بجائے خود سکھوں کا مخالف تھا، اسے سید صاحب کی اعانت کے سلسلے میں سکھوں کی طرف سے مخصوص آزار کا کیا خوف ہو سکتا تھا؛ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ سید صاحب نے ملاقات کے دوران میں اس سے صرف ایک رعایت طلب کی تھی اور وہ یہ کہ آمد و رفت میں غازیوں کے لیے سہولت پیدا کی جائے۔ اس رعایت کو وہ ظاہراً بہ دل و جان قبول کر چکا تھا۔ اس وقت اسے سکھوں کی طرف سے اندیشۂ آزار کا خیال کیوں نہ آیا؟

شاہ صاحب نے دوبارہ لکھا کہ آپ ایک طرف امیرالمومنین کی فرمانبرداری کے دعوے دار ہیں، دوسری جانب سکھوں کے خوف سے ہمارا راستہ روک رہے ہیں، حالانکہ سکھوں سے آپ کے تعلقات

بدستور معاندانہ ہیں۔ یہ کیسی فرمانبرداری ہے؟ اگر آپ اپنے علاقے میں سے عبور دریا کی اجازت کو خلاف مصلحت سمجھتے ہیں تو ہم کسی دوسرے گھاٹ سے گزر جائیں گے، لیکن اس حالت میں بھیٹ گلی سے گزرنا ناگزیر ہے، جو آپ کی عملداری میں شامل ہے۔ اس گزرہی کی اجازت دے دیجیے۔ پائندہ خاں نے جواب دیا کہ امب ہو یا بھیٹ گلی، میرے علاقے میں سے ہرگز نہ گزریئے، ورنہ لڑائی ہو جائے گی۔

تفہیم کی مساعی

شاہ صاحب خود ستھانہ میں ٹھہر گئے۔ سید صاحب کو پورے حالات لکھ بھیجے اور پوچھا کہ اب کیا حکم ہے؟ سید صاحب نے پکھلی کے ان اصحاب سے مشورہ کیا جو آپ کے پاس موجود تھے۔ انھوں نے عرض کیا کہ رُکنا خلاف مصلحت ہے، پیش قدمی کا حکم دیجیے اور خود بھی ادھر ہی تشریف لے چلیے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ہمیں مسلمانوں کے ساتھ لڑائی اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ کشمیر کی طرف جانا بھی ضروری ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ میاں صاحب (مولانا شاہ اسماعیل) کو بغرض مشورہ بلا لیا جائے۔ نیز پائندہ خاں کو للّٰہ فی اللّٰہ سمجھایا جائے۔ اگر وہ مان گیا فہو المراد، ورنہ جیسا کچھ ہوگا، دیکھا جائے گا[1]۔

شاہ صاحب آئے تو سید صاحب نے فرمایا کہ ہم جس بات کا ارادہ کرتے ہیں، یہاں ایک نہ ایک مسلمان خارج ہو جاتا ہے اور وہ کام نہیں ہونے پاتا۔ مشورے کے بعد سید صاحب نے خود پائندہ خاں کو خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ ہم کاروبارِ دین کے لیے آپ کی عملداری میں سے گزر کر جانا چاہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ شرکت کیجیے۔ اگر شرکت ممکن نہ ہو تو کم سے کم مزاحمت نہ کیجیے، یہ بھی آپ کا احسان ہوگا[2]۔ اس کا جواب بھی وہی آیا کہ میں فرمانبردار ہوں لیکن اس راستے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اگر آپ زور و قوت سے کام لیں گے تو لڑائی ہو جائے گی۔

اس کے بعد قدم آگے بڑھانے کے سوا چارہ نہ رہا۔ مسلمانوں کی کتنی کم نصیبی تھی کہ سید صاحب نے سمہ میں جہاد کا جو انتظام کیا تھا وہ سرداران پشاور اور رئیس ہنڈ کی وجہ سے متوقع نتائج پیدا نہ کر سکا۔ کشمیر کی سمت پیش قدمی کا ارادہ فرمایا تو پائندہ خاں راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ لطف یہ کہ وہ سید صاحب

---

[1] یہ "وقائع" کا بیان ہے۔ ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ مولانا کو بلایا نہیں تھا بلکہ خط لکھ دیا تھا کہ پیش قدمی میں عجلت نہ کریں اور پائندہ خاں کو نرمی سے سمجھائیں۔ "منظورہ" کی عبارت ہے: "بذریعہ خط آں جناب مولاناے ممدوح حاضر پنجتار گردیدند" گویا اس سے "وقائع" کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

[2] خط کی عبارت یہ تھی: لشکر ما بہ سمت کشمیر می رود۔ راہ از ملک شما است و بجز تائید دین دیگر غرض ما نیست پس شما کہ دعواے تابعداری ما مے کنید، مے باید کہ خود شریک حال ما باشید والا از رفتن آں طرف مزاحم نہ شوید۔ خیر دنیا و دین شما در ہمین است۔

کی فرمانبرداری کا دعوے دار تھا اور سکھوں کے ساتھ اس کی جنگ جاری تھی۔

سیّد صاحب چنئی میں

سید صاحب نے توپوں کو محفوظ مقام پر دفن کرایا[1]۔ بی بی صاحبہ اور بعض دوسرے غازیوں کی خواتین کو دکھاڑہ بھیج دیا، جو پنجتار سے اڑھائی تین کوس پر پہاڑوں میں زیادہ محفوظ مقام تھا۔ سید احمد علی اور رسالدار عبدالحمید خاں سے فرمایا کہ کھبل ہوتے ہوئے پیر خاں کی جماعت کو ساتھ لے کر ستھانہ پہنچ جائیں۔ چنانچہ وہ ٹوپی اور کھبل ہوتے ہوئے ستھانہ گئے تو معلوم ہو گیا کہ پاینده خاں لڑائی کی تیاری میں مشغول ہے۔ یہ اطلاع سید صاحب کو بھیج دی۔ سید اکبر شاہ نے دو روز تک پورے لشکر کی مہمانداری کی، پھر رسد بٹنے لگی۔ سید صاحب پابنئی ٹھہرتے ہوئے چنئی پہنچے تو آپ کے ساتھ مندرجہ ذیل اصحاب بھی تھے:

شاہ اسماعیل، ارباب بہرام خاں، مولوی محمد حسن (رام پور منہاراں)، شیخ ولی محمد پھلتی، شیخ عبدالحکیم پھلتی، ملا لعل محمد قندھاری، اخوند قطب الدین قندھاری، ملا عزت قندھاری، شیخ بلند بخت دیوبندی، شیخ علی محمد دیوبندی، صوفی نور محمد بنگالی، مولوی وارث علی بنگالی، مولوی امام الدین بنگالی، مولوی خیر الدین شیرکوٹی، سید اسماعیل رائے بریلوی، مولوی مظہر علی عظیم آبادی، مولوی عثمان علی عظیم آبادی، مولوی باقر علی عظیم آبادی، جعفر خاں ترین، میرزا احمد بیگ پنجابی، حاجی عبداللہ رام پوری، حافظ امام الدین رام پوری، امام خاں خیرآبادی، ابراہیم خاں خیرآبادی، حافظ مصطفےٰ کاندھلوی (نبیرۂ مفتی الٰہی بخش)، قاضی علاؤ الدین بگھروی، میانجی چشتی بدھانوی، خواجہ محمد حسن پوری، قاضی احمد اللہ میرٹھی، قاضی حمایت اللہ منجھانوی، قاضی برہان الدین منجھانوی، امان اللہ خاں خان خیل (عشرہ) ناصر خاں بھسٹ گرامی، قاضی سید محمد حبان، مدد خاں (برادر پاینده خاں)۔

چنئی میں پہنچ کر شاہ اسماعیل کو لشکر کا امیر بنایا۔ ان سے کہا کہ آپ لڑائی میں پہل نہ کریں۔ فریق مخالف پیش دستی کرے تو آپ حفاظت کے لیے جو مناسب سمجھیں، عمل میں لائیں۔ پھر سارے قافلے کو دعائے خیر کے بعد مداخیل کی جانب روانہ کیا۔ مدعا یہ تھا کہ پاینده خاں پر جنوب اور شمال مغرب دونوں سمتوں سے دباؤ ڈالا جائے۔ خود سید صاحب کے پاس صرف ساٹھ غازی رہ گئے۔

---

[1] اس کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے کہ پہلے مولوی احمد اللہ سے فرمایا کہ توپوں کو ٹیلے سے اتار کر پنجتار لے آئیں۔ مقام دفن خاص اصحاب کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا۔ توپوں کو چرخوں سے اتارا اور اونٹوں پر لاد کر دفن کے مقام پر لے گئے۔ جن آدمیوں سے اتارنے چڑھانے میں مدد لی گئی، ان سے اخفا کا حلف بھی لیا گیا تھا اور ان کی آنکھوں پر پٹی بھی باندھ دی گئی تھی۔

مولانا کی روانگی

شاہ اسماعیل نے چنئی سے رخصت ہو کر پہلا مقام گباٹی میں کیا، جہاں کے باشندوں نے دستور کے مطابق کھانا کھلایا۔ مدد خاں ساتھ تھا۔ راستے میں باڑا نام ایک بستی آتی تھی، جو پاینده خاں کی عملداری میں تھی۔ اگرچہ اس کے کنارے سے جانا تھا لیکن اندیشہ تھا کہ پاینده خاں کے آدمی تعرض نہ کریں۔ اس لیے مدد خاں کو پہلے سے باڑا میں بھیج دیا گیا کہ لوگوں کو سمجھا دیا جائے۔ پھر شاہ صاحب دگیڑہ پہنچ گئے۔ اس وقت مقامی خوانین میں سے مندرجہ ذیل اصحاب آپ کے ساتھ تھے:

۱ - رحمت خاں ، رئیس نگرئی
۲ - سرور خاں ، رئیس مداخیل
۳ - غلام خاں ، " "

شاہ صاحب نے دوسو غازی دگیڑہ میں چھوڑے، خود باقی غازیوں کو لے کر فروسہ چلے گئے، جو دگیڑہ سے کوس سوا کوس کے فاصلے پر تھا۔

اٹھارھواں باب

عشرہ اور امب کی جنگیں

مقامات کا نقشہ اب سب سے پہلے مقامات کا نقشہ سامنے رکھ لینا چاہیے، جس کے بغیر فریقین کی جنگی تدابیر کا صحیح اندازہ مشکل ہے۔

۱۔ امب اور ستھانہ دونوں دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر ہیں۔ پہلے یہ موجودہ سطح سے بارہ تیرہ گز بلندی پر واقع تھے۔ ۱۸۴۱ء کی طغیانی میں زمین کھد گئی۔ امب آج کل چھوٹا سا گاؤں ہے، اسے امب قدیم کہتے ہیں۔ طغیانی کے بعد پائندہ خاں نے دو تین میل شمال میں نیا امب آباد کر لیا تھا۔ اس کا نام امب جدید ہے۔ پُرانے امب اور ستھانہ کے درمیان چھ میل کا فاصلہ ہوگا۔

۲۔ عام پہاڑی علاقوں کی طرح اس مقام کے پہاڑوں میں بھی جا بجا چھوٹے بڑے نالے بہتے ہیں۔ نالوں کی گزرگاہیں ہی راستوں کا کام دیتی ہیں۔ ایک بڑا نالہ مہابن سے نکل کر مختلف مقامات کے چکر لگاتا ہُوا امب اور ستھانہ کے عین وسط میں پہاڑ سے باہر نکل کر دریا میں ملا ہے، اس کا نام "بھیٹ گلی" ہے۔ یہ بارہ تیرہ میل سے کم لمبا نہ ہوگا۔

۳۔ بھیٹ گلی کے آغاز میں اس کے مغربی کنارے پر دیگرہ ہے اور اس سے دو تین میل نیچے فروسہ۔ دریا میں داخل ہونے کے مقام پر ٹیلے کے اوپر عشرہ آباد ہے۔ اس کا فاصلہ امب اور ستھانہ سے یکساں ہے۔

۴۔ عشرہ کے مقابل بھیٹ گلی کے مغربی کنارے پر درے کے اندر ایک اونچا ٹیلہ ہے جس کی حیثیت ایک بُرج کی سی ہے۔ یہ بارہ سو فٹ اونچا ہوگا۔ اس کا نام کوہ کنیرڑی ہے اور اس پر کنیرڑی نام گاؤں آباد ہے۔

۵۔ عشرہ سے متصل شمالی جانب ایک اور اونچا ٹیلہ ہے۔ اس پر بھی ایک بستی آباد ہے، جس کا نام کوٹلہ ہے۔

۶۔ دریا کی جانب سے عشرہ کے مقام پر پہاڑوں میں داخل ہوں تو بھیٹ گلی سے ہوتے ہُوئے فروسہ اور دیگرہ پہنچتے ہیں۔

۷ - امب کے عین پیچھے ایک گلی ہے، جس سے ہوتے ہُوئے بھیسٹ گلی میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اسے گلنگڑی کہتے ہیں۔ گلنگڑی کا دوسرا بھیسٹ گلی سے ملتا ہے، اس جگہ گوجر ہٹیاں نام بستی آباد ہے۔ دوسرا سرا امب کے سر پہ ہے۔ یہاں بھی پیدل آ جا سکتے ہیں۔

فریقین کی فوجیں

اب فریقین کی فوجوں کا نقشہ پیشِ نظر لائیے:

۱ - غازیوں کی بڑی فوج ستھانہ میں تھی۔ اس کے سپہ سالار سید احمد علی (خواہر زادہ سید صاحب) تھے اور نائب سالار رسالدار عبدالحمید خاں۔

۲ - پورے محاذ کی فوج کے سپہ سالارِ اعظم مولانا شاہ اسماعیل تھے، جو فروسہ میں مقیم تھے۔

۳ - شاہ اسماعیل نے دو سو غازیوں کو ڈیگڑہ میں ٹھہرا رکھا تھا۔ قندھاری غازی فروسہ سے نیچے بجانب امب مقیم تھے۔

۴ - پائندہ خاں کا مرکز امب میں تھا۔ وہیں اس کی فوج رہتی تھی، لیکن فوج کا ایک حصہ اس نے عشرہ میں متعین کر رکھا تھا۔

جنگی سکیمیں

پائندہ خاں کی سکیم یہ تھی کہ کچھ سپاہی بھیج کر کوہ کنیرڑی پر مورچے قائم کر لیے جائیں۔ اس طرح عشرہ کے لیے حفاظت کا پورا بندوبست ہو سکتا تھا نیز ستھانہ، فروسہ اور ڈیگڑہ میں بیٹھے ہُوئے غازیوں کے درمیان رشتہ اتصال منقطع کیا جا سکتا تھا؛ لیکن پائندہ خاں کے بھائی مدد خاں اور دوسرے مقامی خوانین سے پورے حالات معلوم کر کے مولانا کوہ کنیرڑی کی اہمیت کا اندازہ فرما چکے تھے۔ اس لیے انھوں نے غازیوں کی ایک جماعت کو اس پر قبضے کی غرض سے بھیج دیا۔ ارباب بہرام خاں تہکالی کو اس کا امیر بنایا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ اگر ارباب کو کوئی ناگوار حادثہ پیش آ جائے تو شیخ بلند بخت دیوبندی امیر بنیں، ان کے بعد مولوی امیرالدین، پھر امام خاں خیر آبادی۔ امام خاں کے بعد غازی جسے چاہیں امیر بنا لیں۔ مدد خاں کو اس جماعت کے ساتھ بھیجا۔

اس جماعت کو حکم دے دیا کہ کنیرڑی پر قبضہ کر لینے کے بعد عشرہ کی جانب اتر آئے۔ سید احمد علی کو ستھانہ حکم بھیج دیا کہ صبح غازیوں کو لے کر عشرہ کے میدان میں پہنچیں۔ خود فروسہ سے پیش قدمی کا ارادہ فرمایا۔

اب آپ غور فرمائیں کہ مولانا کی جنگی سکیم کتنی عمدہ تھی۔ اگر پائندہ خاں عشرہ کی جانب بڑھتا تو مولانا گلنگڑی کے راستے امب پہنچ سکتے تھے۔ اگر وہ خود گلنگڑی کے راستے فروسہ پر پیش قدمی کرتا تو ستھانہ کی فوج عشرہ اور امب پر قابض ہو جاتی۔ اگر وہ امب میں بیٹھا رہتا تو مولانا جنوب اور شمال مغرب دو سمتوں

سے اسب پر بڑھتے۔

فریب صلح پاپندہ خاں کو کنیر ڑی پر غازیوں کے قبضے کی اطلاع ملی تو اسے معلوم ہو گیا کہ اب ان کی دوہری زد سے بچنا مشکل ہے۔ گھبرا کر اس نے صلح کا جال بچھایا۔ مولانا کو پیغام بھیجا کہ میں تو فرمانبردار ہوں جو گستاخی ہوئی اس پر نادم ہوں۔ بہ صدق دل توبہ کرتا ہوں۔ آپ بھی میرا قصور معاف فرما دیں۔ صبح پانچ سات غازی لے کر باندہ تشریف لے آئیں[2] میں بھی وہیں پہنچ جاؤں گا۔ پھر بات چیت کر کے آخری فیصلہ کر لیا جائے گا۔

مولانا اس پر بے حد خوش ہوئے، اس لیے کہ وہ پاپندہ خاں سے لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ سید صاحب کا حکم بھی یہی تھا۔ ساتھ ہی آپ نے ایک حکم کوہ کنیر ڑی کے غازیوں کو بھیج دیا کہ پہاڑ پر ہوشیار بیٹھے رہیں اور روانگی ملتوی کر دیں، اگر روانہ ہو چکے ہوں تو واپس چلے جائیں اور ستھانا میں ٹھہریں۔

سید احمد علی روانہ ہو چکے تھے۔ سپہ سالار اعظم کا حکم راستے میں ملا، انھوں نے وہیں سے گھوڑے کی باگ پھیر لی۔ رسالدار عبدالحمید خاں اور سید اکبر شاہ ستھانوی دونوں کی رائے تھی کہ مولانا کو جو خط پاپندہ خاں نے بھیجا ہے، وہ فریب پر مبنی ہے اور پلٹنا نہیں چاہیے بلکہ عشرہ کے میدان میں پہنچ جانا چاہیے اس لیے کہ پاپندہ خاں کے لشکر کی تیاری صاف نظر آتی تھی لیکن سید احمد علی نے فرمایا: میں سپہ سالار اعظم کے حکم سے مجبور ہوں۔ وہی کروں گا جو انھوں نے فرمایا ہے[3]

فریب کھل گیا غرض پاپندہ خاں کے فریب صلح کے باعث غازیوں کے ہر جنبش کی ساری جنگی تدابیر معطل

---

[1] جو لوگ اب تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ غازی محض علماے دین تھے، اور انھیں فنون حرب سے چنداں آگاہی نہ تھی، وہ محض اس جنگی نقشے کو دیکھ کر اندازہ فرما سکتے ہیں کہ غازیوں کی مہارت حربیات کا درجہ کتنا بلند تھا۔ سید عبدالجبار شاہ ستھانوی کو میں نے یہ تفصیلات سنائیں تو انھوں نے فرمایا کہ جو مقاصد مولانا کے سامنے تھے ان کے حصول کے لیے اس سے بہتر نقشہ ذہن میں نہیں آ سکتا۔ بڑے سے بڑا جرنیل بھی ان مقاصد کے لیے وہی نقشہ جنگ بنائے گا جو مولانا نے بنایا۔ [2] یہ مقام فردسہ سے قریب، اسب کی سمت ہے۔ [3] روایت میں ہے کہ سید اکبر شاہ نے فرمایا: میں اس معاملے میں پاپندہ خاں کے فریب کو اسی طرح دیکھ رہا ہوں، جس طرح اپنے ہاتھ کو۔ واپس نہ چلیں، دو چار گھڑی اس مقام پر ٹھہرے رہیں۔ حقیقت خود بخود آشکارا ہو جائے گی۔ سید احمد علی نے جواب دیا: بھائی سید اکبر! آپ بجا فرماتے ہیں، میرے خیال میں بھی یہی بات ہے۔ مگر کیا کروں امر اطاعت سے ناچار ہوں۔

ہوگئیں[1]۔ اگلے روز مولانا دس بارہ آدمیوں کے ساتھ بانڈہ جانے کے لیے تیار ہوگئے، جہاں پاینده خاں نے بھیٹ گلی کے رحمت خاں کو اس غرض سے بٹھا رکھا تھا کہ جس طور بھی ممکن ہو مولانا کو گرفتار کر لیا جائے۔ شیخ ولی محمد اور قاضی سید محمد حبان نے مولانا کو روک دیا اور کہا کہ ہم اتنے تھوڑے آدمیوں کے ساتھ آپ کو نہ جانے دیں گے۔ اگر پاینده خاں بانڈہ پہنچ جائے گا تو آپ بھی چلے جائیں، ورنہ ہم سب آپ کے ساتھ جائیں گے۔

پاینده خاں نے رحمت خاں کو بانڈہ بھیج کر اپنا پورا لشکر تیار کر لیا۔ اس میں قریباً ایک ہزار پیادے اور دو سو سوار تھے۔ کچھ متفرق لوگ بھی اس میں شامل ہوگئے تھے۔ اس نے تین زنبورکیں اونٹوں پر سوار کرائیں، گھوڑے پر نقارہ رکھوایا۔ یہ لشکر لے کر امب سے روانہ ہوا۔ پیادے عشرہ میں داخل ہوگئے۔ سوار ستھانہ کی جانب رُخ کر کے میدان میں کھڑے ہوگئے۔ کوہ کنیر ڑی کے غازی بلندی سے یہ پورے حالات دیکھ رہے تھے۔ مولانا کی طرف سے اطلاع مل چکی تھی کہ پاینده خاں صلح پر آمادہ ہے۔ غازیوں کے سامنے جنگ کا نقشہ پیش ہو رہا تھا۔ مدد خاں کی بھی رائے تھی کہ پاینده خاں نے دغا کی۔

کوہ کنیر ڑی پر حملہ

خان کو جب یقین ہوگیا کہ آمادگی صلح کے اظہار نے دیگڑہ، فروسہ اور ستھانہ کے غازیوں کو مطمئن کر کے بٹھا دیا ہے تو اس نے سوچا کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر کوہ کنیر ڑی کے غازیوں کو ختم کر دینا چاہیے اور اس پہاڑ پر قبضہ کر لینے کے بعد دوسرا قدم اٹھانا چاہیے۔ چنانچہ دفعتہً اس کے پیادے اور سوار دو دو گروہوں میں بٹ گئے۔ سواروں کا ایک غول کنیر ڑی سے آگے بڑھ کر بھیٹ گلی میں فروسہ کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔ دوسرا غول ستھانہ کے راستے پر جم گیا۔ پیادوں کے ایک گروہ نے کنیر ڑی کے دائیں جانب سے پیش قدمی شروع کی، دوسرے نے بائیں جانب سے۔

کنیر ڑی کے غازیوں کو آٹا نہیں ملا تھا، صرف مکئی میسر آئی تھی۔ بعض مکئی بھون چکے تھے، بعض بھون رہے تھے۔ انھوں نے جلدی جلدی کھانے سے فراغت پائی اور نماز ادا کر کے مقابلے کے لیے تیار ہوگئے۔ مصیبت یہ تھی کہ پیش آمدہ حالات کی اطلاع نہ فروسہ بھیج سکتے تھے اور نہ ستھانہ، اس لیے کہ سارے راستے بند ہوگئے تھے۔

---

[1] پاینده خاں کی آمادگی صلح کو بے توقف قبول کر لینے پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ نہ یہ غلط فہمی مناسب ہوگی کہ غازی بہت سادہ لوح تھے۔ انتہائی مجبوری کی حالت میں جنگی تدابیر اختیار کرنی پڑی تھیں۔ جب دیکھا کہ مقاصد بلا جنگ پورے ہو سکتے ہیں تو خطرات سے بالکل بے پروا ہو کر صلح پر راضی ہوگئے۔

جنگ

پایندہ خاں کے آدمی کنیرڑی کے دونوں جانب سے اوپر چڑھنے لگے۔ غازی انھیں قدم قدم پر روکتے رہے۔ ابتدائی حملے ہی میں چھ غازی شہید ہوگئے، جن میں سے صرف چار کے نام معلوم ہوسکے: سید ظہور اللہ بنگالی، فیض الدین بنگالی، حاجی عبداللہ رام پوری اور سید مدد علی۔ غازیوں کی پوزیشن لحظہ بہ لحظہ نازک ہورہی تھی۔ غور وفکر کے بعد مدد خاں نے یہ تجویز پیش کی کہ اجازت ہو تو میں بیس غازی لے کر چوٹی پر پہنچ جاؤں، وہاں مورچے جماکر پایندہ خاں کے آدمیوں کو اوپر چڑھنے سے روکنا سہل ہوگا۔ ارباب بہرام خاں نے حسب عادت فرمایا: بسم اللہ۔ اس اثنا میں سید دلاور علی کے گولی لگی۔ وہ گرے تو غازیوں نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔ نیچے پایندہ خاں کے آدمی پاؤں پکڑ کر کھینچنے لگے۔ امام خاں خیرآبادی نے ذرا آگے بڑھ کر بندوق سرکی، معاً ایک گولی ان کی کنپٹی میں لگی اور وہ وہیں شہید ہوگئے۔ بڑے شجاع اور باتدبیر غازی تھے۔ مولانا شاہ اسماعیل نے جنگ کے بعد فرمایا کہ دشمن کے ساتھ رزم وپیکار کے لیے انسانوں کی قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض صاحب تدبیر ہوتے ہیں، بعض شجاع ودلاور۔ بعض دونوں خصوصیتوں کے جامع ہوتے ہیں، یعنی مدبّر بھی اور شجاع بھی۔ محض باتدبیر لوگ ہمیں اس مقام پر کام نہیں دے سکتے، اس لیے کہ یہ مقام شجاعت کا ہے، نہ کہ تدبیر کا۔ منشی محمدی انصاری بولے: امام خاں دونوں خصوصیتوں کے حامل تھے اور شیخ ولی محمد میں بھی دونوں جوہر موجود ہیں۔

غیبی امداد

امام خاں کی شہادت غازیوں کے لیے بہت بڑا صدمہ تھی۔ بہ ظاہر لڑائی کا رنگ بگڑ گیا تھا۔ شیخ بلند بخت دیو بندی نے ارباب سے عرض کیا کہ آپ اپنی جگہ پر جمے رہیں اور مجھے اجازت دیں تو کچھ تدبیر کروں۔ ارباب نے فرمایا: بسم اللہ۔ شیخ چند غازیوں کو لے کر مولوی خیرالدین شیرکوٹی کے مورچے پر پہنچے، جو کنیرڑی کے بائیں جانب تھا۔ انھیں امام خاں کی شہادت کی خبر دی۔ ساتھ ہی کہا کہ کچھ غازی میں لایا ہوں کچھ آپ لیں اور پہاڑ سے نیچے اُتر کر پہلو سے پایندہ خاں کے لشکر پر حملہ کریں۔ مولوی صاحب تیار ہوگئے۔ چنانچہ دونوں نے نیچے اُتر کر حملہ کیا۔ اس اثنا میں نالے کی جانب سے قرابینیں چلنے کی آواز آئی۔ تھوڑی دیر میں قندھاری غازی نمودار ہوئے۔ پایندہ خاں کے جو سوار فروسہ کا راستہ روکے کھڑے تھے وہ بھاگ نکلے۔ ساتھ ہی وہ پیادے بھی میدان چھوڑ کر فرار ہوگئے، جنھوں نے دو جانب سے کنیرڑی پر حملہ کر رکھا تھا۔

قندھاریوں اور بعض دوسرے اصحاب کے وہاں پہنچنے کا قصہ یہ ہے کہ شیخ ولی محمد نے کنیرڑی کی طرف سے گولیوں کی آواز سنی تو مولانا سے عرض کیا کہ یہ تو جنگ کا نشان ہے۔ مولانا بولے کہ تولی یونہی گولیاں چلایا کرتے ہیں۔ شیخ کو اطمینان نہ ہوا۔ وہ قاضی سید محمد حبان کو ساتھ لے کر فروسہ سے نیچے مولوی نصیر الدین کے پاس پہنچے، جن کے ساتھ پچاس ساٹھ پنجابی غازی تھے۔ پاس ہی قندھاری غازی ٹھہرے ہوئے تھے۔ شیخ ان سب کو لے کر

گولیوں کی آواز پر چل پڑے۔ اس طرح خدا نے اپنی رحمت سے غازیانِ کنیر ڑی کے لیے کمک کا بندوبست کر دیا۔

عشرہ اور کوٹلہ پر قبضہ

پائندہ خاں اب تک عشرہ میں تھا اور اپنے آدمیوں کو للکار للکار کر لڑائی کا حوصلہ دلا رہا تھا۔ سواروں اور پیادوں کو بھاگتے دیکھا تو خود بھی عشرہ کو چھوڑ کر امب کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس کے بچے کھچے آدمی اب زور شور سے پکار پکار کر کہہ رہے تھے "خان جل گیا ہے"، یعنی خان چلا گیا۔ جس کے کان میں یہ آواز پڑی وہ معاً بھاگ نکلا۔ غازیوں نے تھوڑی دیر میں عشرہ پر قبضہ جما لیا۔

پائندہ خاں کے لشکریوں میں عظیم مو تراش بڑا نشانچی تھا۔ اس نے خان سے پچیس گولیاں لی تھیں اور کہا تھا کہ جنگ کے بعد اتنے ہی غازیوں کی لاشیں گن لینا۔ بھاگڑ پڑی تو وہ بھی جان بچا کر نکلا۔ اس نے بڑے گھیرے والی شلوار پہن رکھی تھی۔ ایک کھیت کی خار بندی سے کودا، شلوار کا پائنچا خار بندی میں اُلجھ گیا اور وہ اوندھے منہ گرا۔ جو غازی تعاقب میں آ رہے تھے، انھوں نے تلواریں مار کر اس کا کام تمام کر دیا۔

عشرہ پر قبضہ ہو گیا لیکن کوٹلہ میں پائندہ خاں کے آدمی بیٹھے زور شور سے گولیاں چلا رہے تھے۔ شیخ ولی محمد نے غازیوں سے کہا کہ بھائیو! اب کوٹلے کا بھی فیصلہ کر لو۔ غازی شیروں کی طرح حملہ آور ہوئے۔ کوٹلہ چند لمحوں میں خالی ہو گیا۔ اس سلسلے میں چند غازی زخمی ہوئے۔ خدا بخش رام پوری کی پنڈلی میں گولی لگی۔ حافظ صابر تھانوی کا ہاتھ زخمی ہوا۔ عبدالقادر بنگالی کے مونڈھے پر زخم آیا۔

شیخ ولی محمد کوٹلہ سے پہاڑ کے اوپر اوپر امب کے قریب پہنچ گئے۔ پائندہ خاں انھیں دیکھتے ہی امب کو چھوڑ کر چھتر بائی چلا گیا، جو چند میل شمال میں تھا۔

ستھانہ کے غازی

شیخ ولی محمد گولیوں کی آواز سُن کر کنیر ڑی کی طرف آئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف غازیانِ کنیر ڑی کو شدید مخمصے سے نجات ملی بلکہ عشرہ اور کوٹلہ پر بھی قبضہ ہو گیا۔ جو غازی ستھانہ میں بیٹھے تھے، وہ بھی برابر گولیوں کی آواز سُن رہے تھے۔ عبدالحمید خاں رسالدار نے سید احمد علی سے کہا کہ لڑائی شروع ہو چکی ہے اور ہمیں جلد سے جلد پہنچنا چاہیے۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ سید احمد علی کو بھی مولانا شاہ اسماعیل کی طرح یہی خیال آیا کہ تنولی یونہی گولیاں چلایا کرتے ہیں۔ کسی کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہو گا۔ گولیوں کی آواز بہ دستور جاری رہی یہاں تک کہ عصر کا وقت ہو گیا۔ رسالدار نے پھر عرض کیا کہ ہمارے بھائی کٹ رہے ہیں۔ ہمیں جلد سے جلد موقع پر پہنچ کر امداد دینی چاہیے، بلکہ گھوڑے پر سوار ہو کر باگ اٹھالی دوسرے لوگ بھی ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن سید احمد علی نے آگے بڑھ کر رسالدار کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور مولانا کا امتناعی خط کھول کر سامنے کر دیا۔ رسالدار مجبوراً گھوڑے سے اتر پڑا اور کہا: سید احمد علی!

تعجب کی بات ہے، نہ آپ خود چلتے ہیں، نہ ہمیں جانے دیتے ہیں۔ وہاں غازی تلف ہوں گے، ان کے بارے میں جو مواخذہ ہوگا، آپ جانیں۔ یہ کہہ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

مغرب کے قریب شیخ ولی محمد کا بھیجا ہوا قاصد عشرہ سے آیا۔ اس نے لڑائی کی کیفیت بتائی۔ یہ بھی بتایا کہ عشرہ فتح ہو چکا تھا۔ امید ہے اب تک کوٹلہ بھی فتح ہو گیا ہوگا۔ اسی وقت سب عشرہ روانہ ہو گئے۔ مغرب کی نماز ستھانہ کی کھڑی سے گزر کر ادا کی۔ عین اسی وقت شیخ کا ایک قاصد فرِ سہ میں مولانا کے پاس بھی پہنچ گیا۔

امب کی حوالگی

شیخ ولی محمد مغرب کے وقت امب پہنچ گئے تھے۔ پائندہ خاں اپنے آدمیوں کی صلاحیت مزاحمت سے اتنا مایوس ہو چکا تھا کہ چھترباِئی سے نکل کر دریا کے پار پروٹی چلا گیا۔ ستھانہ کے غازیوں نے عشا کی نماز عشرہ میں ادا کی۔ پھر سید احمد علی اور سید اکبر شاہ ستھانوی کچھ آدمیوں کے ساتھ امب چلے گئے۔ رسالدار عبدالحمید خاں جانے کے لیے بہت مضطرب تھا لیکن اسے یہی حکم ملا کہ رات عشرہ میں گزارو اور صبح امب پہنچو۔

مدد خاں کے آدمیوں نے امب پہنچ کر بعض مکانوں کو آگ لگا دی۔ شیخ ولی محمد اس حرکت پر سخت خفا ہوئے۔ اپنے آدمیوں کو آگ بجھانے کا حکم دیا اور مدد خاں کے آدمیوں کو تاکید کی کہ آیندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔ یہ سکھوں کا شیوہ ہے۔ مسلمانوں کے لیے ایسی حرکتیں ہرگز زیبا نہیں۔

مولانا کو یہ پیغام بھی بھیج دیا گیا تھا کہ رات کو سفر کی زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں، صبح کو تشریف لے آئیں۔ سید صاحب کو چنئی میں مفصل حالات لکھ بھیجے۔ بستی پر قبضہ ہو چکا تھا۔ گڑھی میں پائندہ خاں کے آدمی موجود تھے۔ مولانا طلوعِ آفتاب کے ساتھ پہنچ گئے۔ اس وقت گڑھی سے صلح کا جھنڈا بلند ہوا۔ مولانا نے شیخ ولی محمد اور شیخ بلند بخت کو آٹھ غازیوں کے ساتھ بھیجا کہ پوچھیے وہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ انھوں نے امان طلب کی اور کہا کہ ہمیں اپنا سامان اور ہتھیار لے کر نکل جانے کی اجازت دی جائے۔ مولانا نے ان لوگوں کو ذاتی مال لے جانے کی اجازت دے دی۔ دروازہ کھلا۔ مولانا نے پورے سامان کا جائزہ لیا پھر پائندہ خاں کے آدمیوں کو، جو قریباً دو سو تھے، کشتیوں پر سوار کر کے دریا کے پار بھیج دیا۔ امب میں غازیوں کا بندوبست جاری ہو گیا۔ لشکر میں باقاعدہ رسد بٹنے لگی۔ زخمیوں کو عشرہ میں رکھا گیا۔

چھترباِئی

پائندہ خاں ایک توپ دریا میں ڈلوا گیا تھا، اسے نکلوا کر گڑھی کے دروازے پر رکھا گیا۔ اس اثنا میں خبر ملی کہ چھترباِئی[1] کی گڑھی بھی خالی ہو چکی ہے۔ مولانا نے رسالدار عبدالحمید خاں

---

[1] چھترباِئی کی بستی سنہ ۱۸۴۱ء کی طغیانی میں بہ گئی۔ پھر اس کی جگہ کوئی بستی آباد نہ ہوئی۔ اس بستی کا نشان اب تک بتایا جاتا ہے۔ امب قدیم سے پانچ میل شمالاً دریا کے مغربی کنارے پر واقع تھی۔

کو فوراً چھتر بائی پہنچنے کا حکم دے دیا۔ خود امب کے ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر ادھر گئے۔ اس وقت معلوم ہُوا کہ تخلیہ کی اطلاع درست تھی، لیکن چونکہ غازی اطلاع نہ ملنے کے باعث جلد نہ پہنچ سکے، اس لیے پاینده خاں کے آدمی دوبارہ گڑھی میں جم کر بیٹھ گئے۔

امب سے چھتر بائی کے دو راستے تھے: ایک زیریں راستہ جو دریا کے کنارے کنارے جاتا تھا، دوسرا پہاڑی راستہ۔ رسالدار عبدالحمید خاں پہاڑی راستے گئے۔ مولانا نے زیریں راستہ اختیار کیا۔ گڑھی سے ایک گولی کے فاصلے پر دروازے کے بالمقابل ٹھہر گئے اور دریا کی سمت چھوڑ کر گڑھی کے تینوں جانب مورچے بنا لینے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ جا بجا آٹھ مورچے بنا لیے گئے: تین شمالی و مغربی کونے میں، تین جنوبی و مغربی کونے میں، دو جنوبی سمت میں جدھر گڑھی کا دروازہ تھا۔ محاصرہ اگرچہ بڑا سخت تھا لیکن گڑھی کے فتح ہونے کی کوئی صورت نہیں بنتی تھی۔ مولانا نے امب سے توپ منگا کر گولہ باری بھی کی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ آخر یہ سارے حالات سید صاحب کو لکھ بھیجے کہ آپ امب پہنچ جائیں اور گڑھی کو مسخر کرنے کی کوئی تدبیر فرمائیں۔

پنجتار سے توپیں منگائی گئیں

سید صاحب نے امب پہنچ کر فیصلہ کیا کہ چھتر بائی پر حملے کے لیے پنجتار سے توپیں منگا لینی چاہئیں۔ چنانچہ آپ نے شیخ بلند بخت دیوبندی کو پچیس تیس غازیوں کے ساتھ چھتر بائی سے بلا لیا اور ضروری ہدایتیں دے کر پنجتار بھیج دیا۔ شیخ ستھانہ سے درہ برگ[1] کے راستے گندف اور پابینی ہوتے ہُوئے پنجتار پہنچے۔ دو غازیوں کو (امام الدین اور عنایت اللہ خاں تونالی والے) اس غرض سے گندف چھوڑ گئے کہ خان گندف سے مدد لے کر درے کا راستہ خوب درست کرالیں تاکہ اونٹ توپیں لے کر آسانی سے گزر سکیں۔ پنجتار پہنچ کر دفن شدہ توپیں نکلوائیں۔ دکھاڑا سے قوی اونٹ منگائے۔ توپیں لاد کر امب لے گئے۔ سید صاحب کے حکم سے میرزا حسین بیگ، شیخ ہمدانی اور شیخ مولا بخش نے انھیں چرخوں پر چڑھا کر گڑھی کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اس اثنا میں رن گڑھ تیار کرانے کا بھی حکم ہو گیا۔

ایک افسوسناک واقعہ

سید صاحب نے فرما دیا تھا کہ حملے میں عجلت نہ کی جائے اور محاصرہ جاری رہے۔ اچانک وہاں ایک افسوسناک واقعہ پیش آ گیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ غازی اپنے اپنے مورچوں میں بیٹھے تھے۔ ایک روز حافظ عبداللطیف نے بطور خود مورچوں میں پھر پھر کر غازیوں سے کہہ دیا کہ نماز عصر کے بعد گڑھی پر حملہ ہو گا۔ مولانا اس سے قطعاً بے خبر تھے حالانکہ وہی سالار لشکر تھے اور ان کے

---

[1] یہ درہ کیا اور بالا ڈھیری (نزد ستھانہ) کے درمیان ہے۔ برگ بروزن پلگ ہے۔

حکم کے بغیر کوئی حملہ ہو نہیں سکتا تھا۔ غازیوں نے سمجھا کہ حافظ عبداللطیف نے مولانا کے حکم کے مطابق پیغام پہنچایا ہوگا، اس لیے وہ بالکل تیار ہو گئے۔

گڑھی کے ارد گرد دوہری خار بندی تھی۔ پھر دور دور تک میدان میں کانٹے بو دیے گئے تھے۔ اچانک غازیوں نے حملہ کیا۔ حافظ عبداللطیف خود تکبیر کہتے ہوئے سب سے آگے تھے۔ کانٹوں اور خار بندیوں سے گزرتے ہوئے دیواروں کے پاس پہنچے تو سیڑھیوں کی ضرورت پڑی، جو مولانا کے خیمے میں تھیں۔ مولانا حیران کہ حملہ کس کے حکم سے ہوا۔ سیڑھیاں دے دیں۔ انھیں دیواروں سے لگایا تو چھوٹی نکلیں اور غازی اوپر نہ پہنچ سکے۔ تاریکی پھیلی تو ناچار انھیں واپس ہونا پڑا۔ چند غازی شہید ہو گئے۔ ان میں شیخ بلند بخت کے بھائی شیخ علی محمد بھی تھے۔ کئی غازی زخمی ہوئے۔ مثلاً نہال خاں کے ہاتھ کی چار انگلیاں کٹ گئیں۔ اخوند زعفران کے سینگڑے میں آگ لگ گئی اور ان کا جسم جگہ جگہ سے جل گیا۔ ملا گلزار قندھاری کے بازو میں گولی لگی۔ رحیم بخش بنارسی کی دونوں ہنسلیوں کے درمیان زخم آیا۔

غازیوں کی شان ایثار

جب مولانا کو معلوم ہوا کہ حافظ عبداللطیف نے بطور خود یہ حکم دے دیا تھا تو انھیں سخت ملامت کی اور فرمایا کہ شہیدوں اور زخمیوں کے نقصان کی ذمہ داری تم پر ہے۔ پھر سارا واقعہ تفصیل سے سید صاحب کو لکھ بھیجا۔ آپ نے بھی حافظ عبداللطیف کو بہت ڈانٹا[1]۔

شیخ بلند بخت کو گندف میں معلوم ہو چکا تھا کہ غازیوں نے گڑھی پر یورش کی جو ناکام رہی۔ ستھانہ پہنچے تو بھائی کی خبر ملی۔ اس پیکر صبر نے فرمایا: الحمد للہ ہمارا بھائی جو مراد لے کر آیا تھا، وہ پوری ہو گئی۔ ہم سب کو اللہ تعالیٰ شہادت نصیب کرے۔

شیخ امب پہنچے تو سید صاحب نے انھیں محبت سے پاس بٹھایا۔ کچھ دیر خاموش رہے، پھر شہید بھائی کی تعزیت کرتے ہوئے تسلی دی۔ آخر میں فرمایا:

> آپ کے بھائی جس مراد کو لے کر اللہ کی راہ میں وطن سے نکلے تھے، وہ پوری ہوئی۔ ہم

---

[1] حافظ عبداللطیف بڑے مخلص غازی تھے لیکن من چلے تھے۔ میرا خیال ہے، انھیں یقین تھا کہ گڑھی ایک یورش سے فتح ہو جائے گی اور محاصرے کو طول دینا مناسب نہیں۔ سید صاحب کے ارشاد کے بعد مولانا کو حملے پر راضی کرنا غیر ممکن تھا، اس لیے بطور خود ایک سکیم طے کر کے حملہ کرا دیا۔ سوچا ہوگا کہ گڑھی فتح ہو جانے کے بعد اس خود رائی پر چنداں باز پرس نہ ہوگی اور قصور معاف کرا لیا جائے گا۔ یہ حرکت یقیناً سخت نامناسب تھی لیکن ان کی نیت پر شبہ کی کوئی وجہ نہیں۔

سب کو اللہ تعالیٰ اپنی رضامندی کی راہ میں صرف کر دے اور ہم سب سے راضی ہو۔ یہی ہم سب بھائیوں کی مراد ہے۔

یہ تھی روح ایثار و فداکاری جو سید صاحب کے فیضان صحبت میں پیدا ہوئی۔ شیخ نے وہی کلمات کہے جو سید صاحب کی زبان مبارک پر جاری ہوئے۔ بھائی کسے عزیز نہیں ہوتا؟ اور پھر ایسا بھائی جو دنیا میں خیر و سعادت کا قابلِ فخر پیکر تھا۔ وطن سے دُور، عزیزوں سے الگ اور اقربا سے مفارقت کی حالت میں موت آئی۔ ہم لوگوں نے زندگی کے جو تصورات قائم کر رکھے ہیں، شیخ بلند بخت ان سے فارغ نہ تھے۔ انھیں بھی ہر رشتہ ویسا ہی عزیز تھا، جیسا ہمیں عزیز ہے۔ لیکن ایک بلند تر جذبے اور رفیع تر نصب العین نے ان کی تمام محبتوں اور علاقہ بندیوں کو دوسرے ہی سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ ذرا اپنے اسلام کا موازنہ ان بلند ہمت غازیوں کے اسلام سے کیجیے۔ ہمارے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے یا انگلی میں ہلکی سی خراش آجائے تو درد سے بے تاب ہوجاتے ہیں۔ ان لوگوں کے دلوں پر برچھیاں چلتی تھیں لیکن صبر سے جھیلتے تھے، اس لیے کہ جانتے تھے راہ حق و صداقت میں قربانیوں سے مفر نہیں اور مومن صادق وہی ہے جس کا رشتہ رضائے باری کے تابع ہو۔ کیا یہی لوگ نہ تھے، جن پر ہندوستان کے بعض مسند آرایان علوم دین سوا سو برس تک گوناگوں مطاعن کے تیر پھینک پھینک کر سمجھتے رہے کہ دین حق اور سنت خواجہ بدر و حنین صلی اللہ علیہ وسلم کے حفظ و احیا کا حق ادا ہو رہا ہے؟

گر دہم شرح ستم ہائے عزیزاں غالب
رسم امید ہمانا ز جہاں برخیزد

غازی کھبل بائی میں

سید صاحب نے اس حادثے کے بعد حکم بھیجا کہ غازی چھتر بائی کا محاصرہ چھوڑ کر کھبل بائی[1] پہنچ جائیں اور وہاں قیام کریں۔ مولانا نے پہلے اڑھائی سو غازیوں کو مورچوں میں چھوڑا، باقی اصحاب کو کھبل بائی بھیج دیا۔ پھر خود باقی غازیوں کو لے کر اس طور روانہ ہوئے کہ دشمن ہجوم نہ کرسکے۔ پائندہ خاں کے آدمی دریا پار سے بھی گولیاں چلا رہے تھے۔ گڑھی کی فوج بھی حوصلہ پاکر یورش پر آمادہ تھی۔ ایک جمعدار کی کلائی پر اس زور سے گولی لگی کہ مولانا نے، جو پاس کھڑے تھے چٹاخ کی آواز سُنی۔ اس بہادر نے کچھ خیال نہ کیا۔ رومال نکال کر کلائی پر باندھا اور مقابلہ کرتا رہا۔ بڑی احتیاط اور تدبیر سے غازیوں کو سلامت نکال کر لائے۔ مولانا بوجہ ضعف پہاڑ پر نہیں چڑھ سکتے تھے۔ ایک قندھاری غازی نے انھیں پشت

---

[1] یہ مقام چھتر بائی سے دو اڑھائی میل جنوب میں تھا۔ ۱۸۴۱ء کی طغیانی میں اس کا نشان بھی مٹ گیا۔

پر سوار کر کے اوپر پہنچایا۔ کھبل بائی میں ڈیرے لگ گئے۔ پہرے کھڑے ہو گئے۔ اس جگہ غازیوں نے کئی مہینے گزارے۔

پاینده خاں کی واقفیت

جب پاینده خاں کو معلوم ہو گیا کہ سید صاحب نے پنجتار سے توپیں منگا لی ہیں، رن گڑھ بھی تیار ہو گئے ہیں تو اس نے سید حسن شاہ اور منشی محمد غوث کو وکیل بنا کر بھیجا تاکہ صلح ہو جائے۔ اور وہ یرغمال میں اپنا اکلوتا بیٹا بھی دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ سید صاحب نے پہلے سید احمد علی کو بیس پچیس آدمیوں کے ساتھ بروئی بھیجا۔ پاینده خاں نے بڑے خلوص سے استقبال کیا لیکن کہا کہ لشکر کھبل بائی سے ہٹا لیا جائے۔ پھر شیخ ولی محمد، مولوی خیر الدین شیرکوٹی اور مولوی محمد حسین پاینده خاں کے پاس سفیر بن کر گئے اور سید صاحب کی طرف سے یہ پیغام پہنچایا کہ ہمیں نہ چھتر بائی سے غرض ہے، نہ اس کے بیٹے کو یرغمال میں لینے کا شوق ہے۔ ہمیں تو اپنے پروردگار کے کام سے کام ہے۔ اگر پاینده خاں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانبردار بن جائے تو ہمارا بھائی ہے۔

یہ لوگ واپس آئے تو پاینده خاں نے اپنے بیٹے کو بھی بھیج دیا۔ وہ کئی روز امب میں رہا۔ جاتے وقت مدفون مال نکال کر لے گیا۔ ۲۷۔ شوال ۱۲۴۶ھ (۲۹۔ مارچ ۱۸۳۱ء) کو ایک اعلام سید صاحب نے شائع فرمایا کہ اگر پاینده خاں اپنے عہد کے مطابق مدد خاں کا علاقہ اور مال اس کے حوالے کر دے تو گلی بدر ہال کی خانی اور نمبرداری پاینده خاں کے لیے مسلّم رہے گی۔

شرائط صلح

۲۹۔ ذی قعدہ کو ایک اور اعلام شائع ہوا، جس کا مفاد یہ تھا کہ اگر پاینده خاں خدمت دین کا راستہ اختیار کر لے، منافقوں اور کافروں سے موافقت ترک کر دے، لشکر اسلام اور مسلمانوں کی بدخواہی سے تائب ہو جائے، اپنے بھائی مدد خاں کے حقوق ادا کر دے، خان اگرور کا ملک چھوڑ دے تو وہ ہنڈوال تنولیوں کی سرداری پر قائم رہے گا اور کشمیر و پشاور کی فتح کے بعد اسے تیس ہزار کی جاگیر کشمیر میں اور دس ہزار کی جاگیر پشاور میں دی جائے گی۔ اسی تاریخ کو پاینده خاں نے مندرجہ ذیل اقرار نامہ لکھا:

۱۔ مجھ سے جو قصور سرزد ہوئے، ان پر نادم ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔

۲۔ شرع مبین کی خدمت و اتباع اور حضرت امیر المومنین کی امامت کو بدل قبول کرتا ہوں۔

۳۔ کبھی کفار کا ساتھ نہ دوں گا، نہ ان سے کوئی واسطہ رکھوں گا۔

۴۔ مدد خاں کے تمام حقوق ادا کر دوں گا۔

۵۔ کلکئی کے سوا اگرور کا سارا علاقہ چھوڑ دوں گا۔

۶ - پلال تنولیوں کے ملک و ریاست سے کوئی غرض نہ رکھوں گا۔

۷ - بالفعل ایک سو ساٹھ سوار مع شاہین برخوردار جہاں داد (پسر پائندہ خاں) کے ہمراہ ملک سمہ میں بھیجوں گا۔

۸ - دو ہزار پیادوں کا لشکر اکبر علی کے ہمراہ کشمیر روانہ کروں گا۔

۹ - اگر ان امور کے خلاف کروں تو میری جان اور مال مسلمانوں کے لیے حلال و مباح ہوں گے۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پائندہ خاں کو صلح پر آمادہ کرنے کا کام قاضی سید محمد حبان نے پورا کیا تھا۔ انھوں نے بڑی بے باکی سے گفتگو کی۔ یہ طے کرایا کہ دریائے سندھ کے مغربی کنارے کا ملک جو غازیوں نے فتح کیا ہے ان کے قبضے میں رہے۔ مشرقی سمت کا ملک پائندہ خاں کے پاس رہے، بشرطیکہ خدمت دین اور رفاقت مجاہدین میں اس سے کوتاہی نہ ہو اور اپنے بھائی کے حقوق ادا کرے۔

انیسواں باب

جنگ پھولڑہ

پیش قدمی کے مقدمات

سید صاحب امب کی طرف اس غرض سے آئے تھے کہ سکھوں کے خلاف پکھلی میں محاذ قائم کریں اور گرد و پیش کے مسلمان امراء و عوام کو لے کر کشمیر کو سکھوں کے قبضے سے نجات دلائیں۔ جنگ بالکل ناخواستہ پیش آ گئی جبکہ پائندہ خاں راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ امب و عشرہ پر قبضے کے بعد سید صاحب نے آگے بڑھنے کی تدبیریں اختیار فرمائیں۔ سلیمان شاہ والی چترال (کاشکار) دو برس پیشتر قول دے چکا تھا کہ اگر کشمیر کی طرف رُخ کریں تو میں گلگت کے راستے امداد کے لیے پہنچ جاؤں گا۔ کوائی (وادی کاغان) کے سید ضامن شاہ سے بھی تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ وہ کشمیر کے پہلو میں تھا، اس بناء پر پورے حالات سے اسے آگاہی تھی۔ وہ خود ملاقات کی غرض سے سید صاحب کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا کہ کشمیر کے گورنر دیوان رام دیال کے خلاف بے شمار شکایتیں والی لاہور کے پاس پہنچی تھیں۔ اسے لاہور بلا لیا گیا ہے۔ فی الحال کشمیر میں کوئی شخص گورنر مقرر ہو کر نہیں آیا۔ اگر اس جانب جلد پیش قدمی کی جائے تو کامیابی یقینی ہے۔ شوال ۱۲۴۵ھ (اپریل ۱۸۳۰ء) میں سید صاحب نے میاں جی نظام الدین چشتی اور منشی خواجہ محمد (حسن پوری) کو مظفر آباد کی جانب کھکھا بمبا نام قبیلوں میں دعوت و ارشاد کی غرض سے بھیج دیا۔ وہاں کے بہت لوگ میاں جی صاحب کے مرید بن گئے۔

قادر آباد کا غیر مسلم قلعدار

قادر آباد[1] کی گڑھی عشرہ کے عین سامنے دریا کے مشرقی کنارے پر واقع تھی، جس کا قلعدار رام سنگھ (یا رام سُکھ) سید صاحب کا ہم وطن تھا۔ عشرہ کے لوگ گھاس کھودنے کے لیے دریا کی طرف نکلتے تھے اور قادر آباد کے باشندے پن چکیوں پر آٹا پسوانے کے لیے جاتے تھے۔ اگرچہ دریا بیچ میں حائل تھا لیکن کبھی کبھی گولیاں چل جاتی تھیں۔ رام سنگھ کو سید صاحب کے خاندان کی عزت و شرف کا حال بخوبی معلوم تھا، اس وجہ سے وہ ان کشمکشوں کو روکنا چاہتا تھا۔ ایک روز

---

[1] قادر آباد ۱۸۴۱ء کی طغیانی میں بہ گیا تھا۔ پھر اس جگہ نئی آبادی نہ بنی۔ سن رسیدہ لوگوں سے اس کی جگہ کا نشان اب بھی معلوم ہو سکتا ہے۔

خفیہ خفیہ کشتی پر سوار ہو کر عشرہ میں مولوی مظہر علی عظیم آبادی کے پاس پہنچا اور کہا کہ باہم فیصلہ کر لیجیے۔ میں اپنے آدمیوں کو تاکید کر دوں گا کہ آپ کے کسی آدمی کو نہ چھیڑیں۔ آپ اپنے آدمیوں کو تاکید فرما دیں کہ میرے آدمیوں کو آزار نہ پہنچائیں۔ وہ سید صاحب کو خط بھی لکھتا رہتا تھا جن میں سے صرف ایک محفوظ رہ گیا۔ اس پر ۲۱ شعبان ۱۲۴۵ھ کی تاریخ ثبت ہے[1]۔ اپنے ہاں کے مسلمانوں کو خود سید صاحب کی بیعت کے لیے وقتاً فوقتاً امب بھیجتا رہتا تھا۔ منشی محمدی انصاری خوش طبعی کے عالم میں فرمایا کرتے تھے: عجیب بات ہے کہ خود کافر ہے لیکن مسلمانوں کو راہِ راست دکھاتا ہے۔

پھولڑہ پر یورش کا فیصلہ

اس زمانے میں ملکی لوگ خصوصاً تنولی دریا سے گزر کر تین تین چار چار میل سکھ علاقے میں نکل جایا کرتے تھے۔ ان ترکتازوں سے مقصود یہ تھا کہ سکھوں کا قائم کردہ نظم و نسق درہم برہم ہو جائے اور وہ پریشان ہو کر پیچھے ہٹ جائیں۔ لیکن اس سلسلے میں منظم اقدام لازم تھا۔ سید صاحب جلد کشمیر پہنچنا چاہتے تھے۔ مولانا فرماتے تھے کہ فاصلہ زیادہ ہے۔ لوگ نفاق پیشہ ہیں اور پہلے بیچ کے اہم مقامات پر قبضہ جما لینا چاہیے۔ غالباً ماہ شوال ۱۲۴۵ھ کے آخر یا ماہ ذی قعدہ کے اوائل میں مدد خاں ہندوال اور سر بلند خاں پلال نے یہ تجویز پیش کی کہ اب غازیوں کو پھولڑہ پر بڑھنا چاہیے جو ضلع ہزارہ کے تنولی علاقے کا مرکز تھا[2]۔ سید احمد علی، سید اکبر شاہ ستھانوی، ارباب بہرام خاں، مولوی محمد حسن (رام پور منہاراں)، شیخ ولی محمد پھلتی نیز دوسرے اکابر نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ کسے لشکر کا امیر بنا کر بھیجا جائے؟ سید احمد علی بولے کہ میں یہ ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار ہوں، بہ شرطیکہ مجھے ساتھیوں کے انتخاب کی اجازت دی جائے۔ سید احمد علی کی زبان سے پہلے کسی موقع پر ایسی بات نہیں نکلی تھی اور انھیں بھیجنے کا سید صاحب کو خیال بھی نہ تھا، لیکن جب وہ خود تیار ہو گئے تو اجازت دے دی۔

---

[1] ملاحظہ ہو مجموعہ مکاتیب مولانا شاہ اسماعیل صفحہ ۲۷۹۔ [2] تاریخ تصریحاً مرقوم نہیں۔ میرے قیاس کے مبانی یہ ہیں: اول پکھلی پر پیش قدمی کے دوران میں مختلف لوگوں کو جو امان نامے دیے گئے، ان پر ذی قعدہ ۱۲۴۵ھ درج ہے۔ دوسرے مولوی سید جعفر علی نقوی رمضان ۱۲۴۵ھ میں امب پہنچے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کی صلاحیتیں سب پر آشکارا ہو گئیں۔ سید احمد علی نے انھیں پھولڑہ ساتھ لے جانا چاہا تو سید صاحب نے فرمایا کہ وہ دور سے آئے ہیں۔ سفر کی ماندگی ابھی باقی ہو گی۔ کسی دوسرے بھائی کو لے لیجیے۔ تیسرے سید احمد علی جاتے وقت ایک سیاہ قبا سید صاحب سے عاریتہً لے گئے تھے، جو آپ نے (سید صاحب نے) ۲۷۔ رمضان ۱۲۴۵ھ کی شب میں عبادت کرتے وقت پہنی تھی۔

سید صاحب نے سواری خاصہ کا گھوڑا سید احمد علی کو دیا[1]۔ سیاہ قبا بھی دی جو آپ نے ۱۷۔ رمضان کی شب کو عبادت کرتے وقت پہن رکھی تھی۔ جن غازیوں کو معیت کے لیے منتخب کیا، انھیں تیاری کا حکم دے دیا۔ اپنی بندوق کے لیے چقماق سید احمد علی نے اپنے فرزند سید حسن مثنیٰ عرف سید موسیٰ سے لیا۔

لشکر اسلام کی پیش قدمی

پورے لشکر کو ایک گھاٹ سے دریا کے پار اُتارنے میں بہت وقت صرف ہوتا۔ نیز اندیشہ تھا کہ سکھوں سے کنار دریا ہی پر مڈبھیڑ نہ ہو جائے، اس لیے لشکر کو تین حصوں میں بانٹ کر الگ الگ گھاٹ سے پار اترنے کا حکم دیا گیا۔ ایک حصے کا سالار محمد خاں تھا، جو پہلے اٹک میں سکھوں کے ہاں ملازم تھا۔ پھر ملازمت چھوڑ کر سید صاحب کے پاس آگیا۔ میر فیض علی گورکھ پوری کو محمد خاں کا مشیر مقرر کیا گیا۔ دوسرے حصے کا سردار سید نور الحسن تھا، جسے اہل لشکر بالعموم "ماما نور الحسن" کہتے تھے۔ تیسرا حصہ براہ راست سید احمد علی کی سالاری میں تھا۔

محمد خاں کا لشکر کربلیاں کے گھاٹ سے پار اُترا، جو امب کے سامنے تھا۔ اس حصے میں سکھوں کی طرف سے مزاحمت کا قوی اندیشہ تھا، اس لیے کنارہ دریا پر دو توپیں محفوظ جگہ نصب کر دی گئیں۔ جب کربلیاں کی گڑھی سے گولیاں آئیں تو محمد خاں کے حکم سے چکر توپ چلائی گئی۔ کسی سکھ کو گڑھی سے باہر نکلنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ محمد خاں کا پورا لشکر تین پھیروں میں سلامت پار اُتر گیا۔ سید نور الحسن کا لشکر غالباً ستھانہ کے گھاٹ سے بلا مزاحمت پار اُتر گیا۔ سید احمد علی نے بھی کربلیاں کے گھاٹ سے دریا عبور کیا۔ مولوی محمد حسن رام پوری سید احمد علی کے مشیر خاص تھے۔ مقامی خوانین میں سے مدد خاں ہندوال، سر بلند خاں پلال، امان اللہ خاں خان خیل اور جعفر خاں ترین بھی سید احمد علی ہی کے ہم رکاب تھے۔ ہر ایک کے ہمراہ تیس تیس چالیس چالیس آدمی تھے[2]۔

پھولڑہ کا موقع

پھولڑہ پہاڑوں کے حلقے میں ہے۔ دامن کوہ کی زمین اونچی ہے اور اسی پر بستی آباد ہے۔ نیچے میدان میں کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ مانسہرہ سے یہ دس میل ہو گا۔ سرن ندی بستی کے مشرق میں قریباً ایک میل کے فاصلے سے گزرتی ہے۔ اس کے دونوں کنارے اتنے اونچے ہیں کہ ان پر کھڑے

---

[1] اس کا نام اژدر تھا۔ یہ ارباب بہرام خاں نے بطور نذر سید صاحب کو دیا تھا۔ [2] اس لشکر کے شرکا میں سے بعض اور اصحاب کے نام بھی مختلف روایتوں میں آئے ہیں، مثلاً سید عبدالرزاق نگرامی (برادر سید نور احمد مورخ اسلام)، مولوی کریم بخش سہارن پوری، رحیم بخش جراح سالی کے، عبدالکریم عظیم آبادی، زبردست خاں رائے بریلوی، کالے خاں، جو خچروں کے محافظ تھے۔ بعض کے نام آگے چل کر آئیں گے۔

ہو جائیں تو مانسہرہ کی طرف چار میل تک ہر چیز بخوبی دکھائی دیتی ہے۔ بستی کے پاس سے ایک نالہ گزرتا ہے، جس کا نام "ٹھنڈا بہن" ہے۔ اس سے پن چکیاں بھی چلتی ہیں اور کھیتوں کو پانی بھی ملتا ہے۔ مانسہرہ جانے والا راستہ مشرقی سمت میں ہے۔ اس کے علاوہ دو راستے جنوبی سمت میں ہیں: اول ترپی اور خیل کا راستہ، دوسرا گڈوال کا راستہ۔ دونوں راستوں پر قبرستان ہیں۔

پھولڑہ بعد میں مددخاں کو بطور جاگیر مل گیا تھا۔ اس کے اخلاف دیر تک اس پر قابض رہے۔ حال میں اس کا انتظام حکومت سرحد نے سنبھال لیا ہے۔ مقامی خان اس قبرستان میں دفن ہوتے تھے، جو گڈوال سے آنے والے نالے کے کنارے پر ہے۔ سید احمد علی کو بھی یہیں دفن کیا گیا۔ باقی شہداء اس گنج شہیداں میں دفن ہوئے، جو ترپی اور خیل کے راستے پر ہے[1]۔

سید احمد علی نے پھولڑہ جانے کے لیے غالباً وہ راستہ اختیار کیا تھا، جسے آج کل لستاں کا راستہ کہتے ہیں[2]۔ وہ شاہ کوٹ سے لستاں پہنچے اور اس پر قبضہ جماتے ہوئے پھولڑہ میں داخل ہو گئے۔ راستے میں کہیں جدال و قتال کی نوبت نہ آئی۔ بستی سے باہر مانسہرہ والے راستے کی جانب خیمہ زن ہوئے۔ محمد خاں اور سید نور الحسن مختلف راستوں سے پہلے پھولڑہ پہنچ کر میدان میں مقیم ہو گئے تھے۔ مقامی خوانین نے بستی میں قیام کیا۔

پایندہ خاں کا اضطراب

پایندہ خاں کے ساتھ اس وقت تک صلح نہیں ہوئی تھی۔ اسے غازیوں کی پیش قدمی کا حال معلوم ہوا تو بروٹی سے نکل کر شیر گڑھ کی طرف بھاگا۔ سید صاحب کو یہ خبر ملی تو آپ نے مولانا شاہ اسماعیل کو غازیوں کی ایک جماعت کے ساتھ بروٹی بھیج دیا۔ وہ بروٹی پہنچے تو پایندہ خاں شیر گڑھ سے اگرور چلا گیا۔ اسے غالباً یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ اگر ایک طرف سے مولانا اور دوسری طرف سے سید احمد علی بڑھتے ہوئے شیر گڑھ پہنچ گئے تو بچ نکلنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔ مولانا بروٹی سے نکا پانی اور شیر گڑھ ہوتے ہوئے پہلے شنگلئی، پھر شمدڑہ پہنچ گئے۔ پایندہ خاں فرار کے اضطراب میں اپنے اہل و عیال کو شنگلئی میں ارسلان خاں (برادر زادۂ خان اگرور) کے پاس چھوڑ گیا۔ ان کے ساتھ مال و اسباب کے علاوہ دس بارہ ہزار روپے بھی تھے۔ مولانا نے سارا مال و اسباب اور روپے ارسلان خاں کے حوالے کر دیے۔ اہل و عیال کو بھی اسی کے پاس چھوڑا کہ جس طرح مناسب سمجھے، انھیں خان کے پاس پہنچا دے۔

---

[1] میں پھولڑہ کو نہ دیکھ سکا۔ یہ تفصیلات مختلف اصحاب سے معلوم ہوئیں۔ کہہ نہیں سکتا کہ میں انھیں ٹھیک ٹھیک بیان کر سکا ہوں یا نہیں۔

[2] لستاں پھولڑہ کے قریب ایک مقام ہے جو میدان میں واقع ہے۔ چونکہ راستہ اس میں سے گزرتا ہے اس لیے لستاں کا راستہ نام پڑ گیا۔ پہاڑوں میں اس کا مدخل عشرہ کے سامنے ہے۔

شبخون کی افواہ

بعض روایتوں میں ہے کہ پھولڑہ پر غازیوں کی پیش قدمی کی خبر پایندہ خاں نے مانسہرہ بھیجی تھی۔ ممکن ہے یہ درست ہو، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اتنی بڑی فوج کا مختلف راستوں سے گزر کر آگے بڑھنا کسی حال میں بھی سکھوں سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا۔ پایندہ خاں کے علاوہ بھی سیکڑوں آدمی سکھوں تک ہر قسم کی خبریں پہنچا رہے تھے۔

سید احمد علی کو پھولڑہ پہنچتے ہی اطلاع ملی کہ مانسہرہ میں ہری سنگھ نلوہ غازیوں پر شبخون مارنے کی تیاری کر رہا ہے۔ یہ سنتے ہی موصوف نے مانسہرہ والے راستے پر پہرے بٹھا دیے اور انھیں تاکید فرما دی کہ جب خطرہ نظر آئے تو فوراً بندوقیں سر کر دینا۔ ہم مقابلے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ دو راتیں غازیوں نے آنکھوں میں گزار دیں۔ جب کوئی نہ آیا تو انھیں خیال ہو گیا کہ شبخون کی افواہ کسی نے خواہ مخواہ اڑا دی۔ اس وجہ سے چوکی پہرے بھی چنداں چوکس نہ رہے اور پیش بندی کے انتظامات میں بھی پہلا اہتمام ختم ہو گیا۔

غازیوں کے ڈیروں کا مقام

سید صاحب نے سید احمد علی کو روانگی کے وقت جو وصیتیں فرمائی تھیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ کسی بھی حالت میں دامن کوہ کو نہ چھوڑنا۔ آپ پھولڑہ پہنچے۔ وہاں محمد خاں اور میر فیض علی کا ڈیرہ دامن کوہ سے فاصلے پر میدان میں دیکھا تو فرمایا میدان سے اٹھ کر دامن کوہ میں ٹھہرنا چاہیے۔ میر فیض علی نے کہا کہ ہم جہاں ٹھہرے ہیں وہاں آس پاس مورچے بنا لیے ہیں۔ اب انھیں پیچھے ہٹانا مناسب نہ ہوگا۔ آپ بھی وہیں چلیں۔ میدان خاصا وسیع ہے۔ یہ سنا تو سید احمد علی کو سید صاحب کی وصیت بالکل فراموش ہو گئی اور وہ بھی دامن کوہ سے فاصلے پر میدان میں ڈیرہ لگا کر بیٹھ گئے۔ سید نور الحسن کا ڈیرہ بھی میدان ہی میں تھا۔

جنگ

غرض دو دن گزر گئے۔ تیسرے دن صبح کے وقت اذان ہوئی۔ غازی نماز کی تیاری میں لگ گئے۔ بعض وضو کر رہے تھے اور بعض سنتیں پڑھ رہے تھے کہ دفعۃً پہریداروں کی بندوقیں سر ہوئیں۔ یہ سکھ لشکر کی آمد کا پہلا اعلان تھا۔ چونکہ وہ سب سوار تھے۔ اس لیے تیزی سے آ رہے تھے۔ درے کے پہرے پر زیادہ تر ملکی لوگ تھے۔ وہ درے سے ہٹ کر پہاڑوں پر چڑھ گئے۔ مقابلہ کرنا بھی چاہتے تو کر نہیں سکتے تھے۔ سکھ سوار بگٹٹ میدان میں پہنچ گئے۔ اس طرح غازیوں کو اچانک لڑائی پیش آ گئی، جس کا انھیں خواب و خیال بھی نہ تھا اور وہ دور دور تک میدان میں بکھرے پڑے تھے۔

سید احمد علی فوراً قبلہ رو کھڑے ہو کر دعا میں لگ گئے۔ ساتھیوں کو بھی پکار کر کہا کہ دعا میں شامل ہو جاؤ۔ دعا بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ سکھ سوار سر پہ آ پہنچے۔ انھوں نے پہلے سے ایک سکیم طے کر لی تھی۔ میدان میں پہنچتے ہی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں ادھر ادھر بکھر گئے۔ یہ دیکھ کر غازی بھی ان کے تعاقب میں دو دو چار چار کی ٹکڑیوں

میں منقسم ہو گئے ۔ غازیوں کے اس انتشار کو دیکھ کر سکھ سوار تیزی سے اکٹھے ہو گئے اور ایک ایک ٹکڑی کو یکے بعد دیگرے ہدف جرح وقتل بنانے لگے ۔ غازی چونکہ پیدل تھے، اس لیے جلد مجتمع ہو کر اُن کے مقابلے پر جم نہیں سکتے تھے ۔ نتیجہ یہ نکلا جا بجا شہادت پا کر بارگاہ الٰہی میں پہنچ گئے ۔

تاریخ تنولیاں کا بیان

سید مراد علی بن سید عنایت علی متوطن علی گڑھ سرحد میں چوک منشی بن گئے تھے اور انھوں نے خاصی مدت دربند کی چوکی میں گزار دی ۔ ۱۸۷۸ء میں تاریخ تنولیاں مرتب کی جو مطبع کوہ نور میں چھپی ۔ اس میں سید مراد علی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ درج ذیل ہے :

۱ ۔ تنول میں سید صاحب کی حکومت چھ مہینے تک بلا خرخشہ جاری رہی ۔ ایک فصل کے محاصل بھی لے لیے گئے ۔

۲ ۔ پائندہ خاں نے ہری سنگھ نلوہ کو امداد کے لیے خط بھیجا ۔ ہری سنگھ نے سوچا کہ دونوں دشمن ہیں (خلیفہ صاحب (سید صاحب) علاقہ تنول فتح کر چکے ہیں اور اب ان کی توجہ پکھلی کی طرف منعطف ہو گی، لہذا مناسب یہی ہے کہ پائندہ خاں کو امداد دے کر دونوں کو لڑایا جائے ۔ چنانچہ اس نے جواب میں لکھا :

نہیں ہے کمک سے تری انحراف   و لے بات سُن لے میری صاف صاف
کہ اپنے جہاں داد فرزند کو   یہاں بھیج دے مدت چند کو
بہ رسمِ گرو وہ رہے میرے پاس   کہ ہم تم رہیں روز و شب بے ہراس
یقین جاننا جب وہ آیا یہاں   اسی وقت کر دوں گا لشکر رواں
پسر کو نہ بھیجا گر اے نامدار   تو پھر کس کی فوج اور کہاں اعتبار

آخر میں یہ بھی لکھا کہ جہانداد خاں آ جائے تو پھولڑہ کو آزاد کرا دوں گا ۔

۳ ۔ پائندہ خاں نے اپنے بیٹے جہانداد خاں کو بطور یرغمال ہری سنگھ کے پاس بھیج دیا تو اس نے دو جنگی پلٹنیں مع سامان حرب پائندہ خاں کے پاس بھیج دیں خود مہا سنگھ اور فوج کشمیر کے ساتھ شبا شب پھولڑہ روانہ ہوا تاکہ غازیان ہند سے جنگ کرے ۔

۴ ۔ سید احمد علی نے سربلند خاں پلال، مدد خاں تنولی اور محمد عباس اتالیق کے مشورے کے مطابق دریائے سرن کی ناکہ بندی کی ۔

۵ ۔ وہیں جنگ ہوئی اور ہندوستانی غازیوں نے دو مرتبہ مہا سنگھ کو مع لشکر پسپائی پر مجبور کر دیا ۔ کچھ سکھ اس معرکے میں کام آئے ۔

۶۔ یہ حالت دیکھ کر ہری سنگھ غم ناک ہوا اور اس نے خود حملہ کر دیا۔ بہ وجہ ہجوم و غلبۂ سکھاں غازی دریائے سرن سے ہٹنے پر مجبور ہوئے۔

۷۔ اب مشیروں یعنی سر بلند خاں، مدو خاں اور محمد عباس نے بالاتفاق سید احمد علی کو مشورہ دیا کہ ہٹ جانا مناسب ہے، پھر کوئی تدبیر کریں گے، مگر سید احمد علی نے انکار کر دیا۔

۸۔ سکھوں کا لشکر سواروں اور پیادوں کو ملا کر چار ہزار سے کم نہ ہوگا۔ ہندوستانی کل پانسو تھے۔ سکھوں نے انھیں چاروں طرف سے نرغے میں لے لیا اور سب شہید ہوئے۔ سکھ مقتولین کی تعداد ایک ہزار تھی[1]

شہدا

روایت ہے کہ سکھوں کے آنے کی ابتدائی اطلاع پاتے ہی بعض غازیوں نے سید احمد علی کو مشورہ دیا تھا کہ پیچھے ہٹ کر بستی کے قریب پہنچ جائیے یا دامن کوہ میں ہو جائیے۔ سکھ خود بے بس ہو کر لوٹ جائیں گے، لیکن سید احمد علی نے فرمایا کہ اب ان کے مقابلے سے ہم ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ جو کچھ پیش آنے والا ہے یہیں دیکھ لیں گے۔

حملہ بالکل اچانک ہوا اور غازیوں کو تیغ و تفنگ کا ہدف بنا کر سکھ اس تیزی سے واپس چلے گئے کہ خوانین ان کے ہوتے ہوئے بستی سے نکل کر میدان تک نہ پہنچ سکے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کل کتنے غازی شہید ہوئے۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: سید احمد علی رائے بریلوی امیر لشکر، محمد خاں خیر آبادی (برادر امام خاں شہید کوہ کنیر ڑی)، سید عبدالرزاق نگرامی، مولوی کریم بخش سہارن پوری، رحیم بخش جراح، میرزا عبدالقدوس کشمیری، امام خاں سہسرامی، فیض الدین بنگالی، شیخ برکت اللہ گورکھ پوری، میر فیض علی گورکھ پوری، مولوی محمد حسن (رام پور منہاراں)، میر احمد علی بہاری۔

راہ حق کے ان فداکاروں کی شان شجاعت کے بارے میں کیا عرض کیا جائے؟ ہمارے پاس اس خونچکاں داستان کے صرف چند اوراق پہنچے ہیں۔ ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ رائے بریلی کے بے نوا سید کی آغوش صحبت میں کیسے لوگ تیار ہوئے تھے، جن کی نظیر مسلمانانِ ہند کی ہزار سالہ تاریخ شاید ہی پیش کر سکے۔

سید احمد علی اور میر فیض علی

سید احمد علی امیر لشکر اور میر فیض علی گورکھ پوری یکجا تھے۔ دونوں اپنی جگہ جمے ہوئے مردانگی سے لڑتے رہے۔ بیسیوں کو ٹھنڈا کیا۔ سید احمد علی کا سنگ چقماق خراب ہو گیا اور بندوق سے کام لینے کی کوئی صورت نہ رہی تو خالی بندوق ہاتھ میں لے کر لٹھ کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ اس طرح بھی کئی دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ آخر نیزوں، تلواروں اور گولیوں کے زخموں سے

---

[1] تاریخ تنولیاں مطبوعہ مطبع کوہ نور صفحہ ۵۱، ۵۲۔ بلاشبہ غازیوں کا بڑا نقصان ہوا لیکن یہ صحیح نہیں کہ سب شہید ہوئے۔

چُور ہو کر گر گئے۔ گرتے ہی روح اعلیٰ علیین میں پہنچ گئی۔ غور فرمائیے، کہاں رائے بریلی اور کہاں پھولڑہ۔ پھر اہل و عیال کہیں، بھائی اور دوسرے اقربا کہیں۔ دو فرزند ہندوستان میں، ایک جگر بند امب میں۔ تنہا پھولڑہ میں جان دی۔ وقتِ رخصت نہ کسی عزیز کا چہرہ دیکھا، نہ اپنا چہرہ کسی کو دکھایا۔ نہ کسی کی بات سُنی، نہ اپنی بات سُنائی۔ نہ اس مبارک ساعت میں ایسا کوئی خیال دل میں گزرا۔ وہ جلیل المنزلت ماموں بھی دور بیٹھا تھا، جس کی دعوتِ حق نے جہاد فی سبیل اللہ کی آرزو سے دل کا گوشہ گوشہ معمور کر دیا تھا۔ راویوں نے بیان کیا ہے کہ بے شمار زخم لگے تھے، لیکن سب جسم کے اگلے حصے میں تھے۔ پچھلے حصے میں خراش تک نہ آئی تھی۔ جن بزرگانِ ملت نے سوا سو سال تک سید صاحب اور ان کے ساتھیوں کو ناقابلِ ذکر طعنوں کا ہدف بنائے رکھا، ان میں سے کتنے ہیں، جن کی سرگزشتہائے حیات میں کلمہ حق کی سربلندی کے لیے اس نوع کے ایثار کی خفیف سی بھی جھلک مل سکتی ہے؟

میر فیض علی گورکھپور کے ایک رئیس ذوالفقار علی خان کے فرزند ارجمند تھے۔ منشی خانے میں کام کرتے رہے۔ سید صاحب نے ایک مرتبہ منشیوں کو بھاری بوجھ اٹھانے سے معاف کر دیا تھا، لیکن میر فیض علی نے اس معافی سے قطعاً فائدہ نہ اٹھایا اور استحباباً سب کے برابر جسمانی محنت کرتے رہے؛ وہ سید احمد علی کے ساتھ شہید ہُوئے۔

مولوی محمد حسن، میرزا عبدالقدوس اور رحیم بخش جرّاح

مولوی محمد حسن اور رحیم بخش جراح کو سید احمد علی کی شہادت کا علم ہُوا تو گھمسان کے رن میں گھُس کر مردانگی سے لڑتے ہُوئے قربان ہو گئے۔ "منظورہ" میں ہے کہ مولانا شاہ اسماعیل کے بعد لشکرِ اسلام میں عجز، حلم، خاکساری اور قابلیت میں کوئی غازی مولوی محمد حسن کا ہمتا نہ تھا۔[1]

میرزا عبدالقدوس کشمیری اگرچہ پیدل تھے لیکن دیر تک سواروں کا مقابلہ کرتے رہے۔ جب کوئی سکھ گھوڑا دوڑاتا ہُوا ان کی طرف آتا تو اس کے قریب پہنچتے ہی بجلی کی سُرعت سے گھوڑے کی باگ پکڑ لیتے ساتھ ہی تلوار سے سوار کا سر اڑا دیتے۔ کوئی سوار نیزہ لے کر حملہ کرتا تو اگر اس کا نیزہ دائیں جانب ہوتا میرزا صاحب اچھل کر بائیں جانب ہو جاتے۔ نیزہ بائیں جانب ہوتا تو دائیں جانب ہو جاتے۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہُوا کہ پہلے سوار کا نیزہ کاٹا، پھر اس کا سر قلم کیا۔ اس طرح کئی سواروں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ آخر خود بھی جامِ شہادت پی کر زندۂ جاوید گروہ میں شامل ہو گئے۔

---

[1] "منظورہ" صفحہ ۷۷۰۔

میر احمد علی، امام خاں اور برکت اللہ

میر احمد علی بہاری نہایت خوشرو اور سرو قامت جوان تھے۔ بڑے دلیر و جوانمرد، تلوار اور بندوق چلانے میں انھیں یکساں مہارت تھی۔ بہت سے سکھوں کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ آخر سواروں کے ایک گروہ نے انھیں نرغے میں لے لیا۔ بولے: ٹھہر جاؤ۔ میں بھاگ نہیں جاؤں گا۔ مجھ پر گولی نہ چلاؤ اور ذرا میری شمشیر زنی کا رنگ دیکھ لو[1]۔ پھر خاصی دیر تک تنہا تمام سواروں سے لڑتے رہے۔ جس پر ان کی تلوار پڑ جاتی، یا تو سر قلم ہو جاتا یا بازو کٹ جاتا یا پاؤں اڑ جاتا۔ آخر ایک سکھ نے انھیں گولی سے شہید کر ڈالا۔

امام خاں سہسرامی کئی سکھوں کو مار کر گرے۔ شیخ برکت اللہ نے بڑے کمالات دکھائے۔ پھر ان کے سینگڑے میں آگ لگ گئی، جس سے سارا جسم جل گیا۔ اسی حالت میں انھیں شہید کر ڈالا گیا۔

ایک غازی کے پاس لکڑیاں کاٹنے والے کلھاڑے کے سوا کوئی ہتھیار نہ تھا۔ وہ ایک پتھر پر کھڑا ہو گیا۔ جو سکھ سوار قریب سے گزرتا، کلھاڑے سے اس کا سر اڑا دیتا۔ ایک گھوڑے کے پٹھے پر کلھاڑا پڑا اور گوشت میں گڑ گیا۔ گھوڑا چند قدم پر جا کر گرا۔ میر احمد علی بہاری اس وقت تک زندہ تھے۔ انھوں نے سوار کا سر اڑا دیا۔

اڑدر اور محمد خاں

سید احمد علی کی شہادت کے بعد اڑدر گھوڑے کو سکھوں نے پکڑ لیا اور اسے ساتھ لے چلے۔ محمد خاں خیر آبادی نے یہ دیکھا تو غازیوں کو پکار کر کہا کہ بھائیو! یہ امیر المومنین کی سواری کا گھوڑا ہے۔ اسے دشمن کے قبضے میں نہ جانے دو۔ یہ کہتے ہی تنہا سکھوں کے گروہ پر حملہ کر دیا۔ جس جس غازی کے کان میں یہ آواز پہنچی، وہ بھی محمد خاں کی معیت کے لیے دوڑ پڑا۔ تھوڑی ہی دیر میں اڑدر کو چھڑا کر لے آئے۔ سکھوں نے دوبارہ جمع ہو کر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں اڑدر بھی مارا گیا، محمد خاں بھی شہید ہو گئے۔

اس اثنا میں جو غازی میدانِ جنگ سے ذرا فاصلے پر تھے، وہ پاس کے ٹیلوں پر چڑھ کر گولیاں چلانے لگے۔ اُدھر بستی سے خوانین کا لشکر نکلا۔ یہ صورت دیکھی تو سکھ جس تیزی سے آئے تھے، اسی تیزی سے واپس چلے گئے۔ منظورہ میں ہے کہ مسلمانوں کا جو مال و اسباب لُوٹ کر لے جا رہے تھے، وہ بھی چھوڑ گئے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کتنے سکھ مارے گئے۔ لیکن اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ غازیوں کے مقابلے میں ان کا نقصانِ جان بہت زیادہ تھا۔

غلط بیانات

”وقائع“ میں ہے کہ جنگ پھولڑہ کے بعد سکھوں نے بستی میں آگ لگا دی۔ میرے نزدیک یہ روایت غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سکھ بستی تک پہنچے ہی نہ تھے، میدان ہی سے

---

[1] منظورہ میں ہے: شما را بحق آفریننده شماست کہ کسے برمن تفنگ سرہا زد و باز ہنر شمشیر زنی ما ببینید (۶۶۵)

واپس ہو گئے تھے۔ اس جنگ میں غازیوں کا نقصان بلاشبہ بہت ہوا۔ لیکن اسے لشکر اسلام کی شکست اور سکھوں کی فتح سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ غازی بہ دستور میدانِ جنگ میں موجود تھے۔ سکھ واپس چلے گئے تو غازیوں نے اطمینان کے ساتھ اپنے شہیدوں کو دفن کیا۔

ہزارہ گزٹیئر[1] میں ہے کہ ۱۸۲۸ء میں ہری سنگھ کی لڑائی پھولڑہ میں ہندوستانی مجاہدوں سے ہو گئی۔ ہندوستانیوں کے ساتھ دو ہزار اہل ہزارہ بھی تھے۔ وہ لڑائی چھڑتے ہی بھاگ گئے۔ غازی ایک ایک کر کے کٹ گئے۔ ان میں سردار لشکر سید احمد علی شاہ بھی تھے، جو خلیفہ سید احمد کے بھانجے تھے۔

یہ بیان سراسر غلط ہے۔ نہ جنگ پھولڑہ کی تاریخ درست ہے، نہ غازیوں کو شکست ہوئی، نہ ایک ایک غازی کٹا، نہ ان کے ساتھ دو ہزار اہل ہزارہ تھے۔

غم نامہ شہادت

پھولڑہ سے جو قاصد لڑائی کی خبریں لے کر امب گیا تھا، وہ دریا سے پار اُترا تو سید صاحب نے اُسے دُور سے دیکھ لیا۔ قاصد پہلے میاں عبدالقیوم کو ملا۔ وہ سید احمد علی کی شہادت کی خبر سنتے ہی وفورِ غم و اندوہ سے زمین پر بیٹھ گئے۔ سید صاحب نے فرمایا: "قاصد کو جلد بُلاؤ، وہ کیسی خبر لایا جسے سُنتے ہی میاں عبدالقیوم زمین پر بیٹھ گئے۔" قاصد پہنچا۔ محبوب بھانجے کی شہادت کی خبر سُنی تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھتے ہوئے فرمایا: "الحمد للہ، وہ جو مراد لے کر آئے تھے، اللہ تعالیٰ نے انھیں اس مراد کو پہنچایا۔" پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر آنسو پونچھ ڈالے۔

"منظورہ" میں ہے: جب قاصد نے بیان کیا کہ شمشیر و نیزہ کے تمام زخم سید احمد علی کے چہرے پر لگے تو پھر آنسو جاری ہو گئے۔ آپ "الحمد للہ"، "الحمد للہ" کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے آنسو پونچھتے جاتے تھے۔

سید احمد علی اگرچہ بھانجے تھے، لیکن سید صاحب ہمیشہ انھیں "بھائی" کہہ کر پکارتے تھے۔ عمر میں وہ سید صاحب سے دو برس بڑے تھے۔ ماموں بھانجے میں رضاعت کا رشتہ بھی تھا۔ تمام بھانجوں میں سے ان کے ساتھ سب سے زیادہ محبت تھی۔ اس لیے کہ سید احمد علی بڑے ہی پاک طینت، پاک سیرت اور فدا کار حق و صداقت تھے۔ صلائے دعوت پاتے ہی اپنے دو جگر بندوں، ابوالقاسم اور موسیٰ کو سید صاحب کے ساتھ بھیج دیا، پھر خود آ گئے۔ سید صاحب نے ابوالقاسم کو کار خاص کے لیے ہندوستان بھیج دیا۔ موسیٰ، بلند منزلت باپ کے بعد خلعت شہادت سے سرفراز ہوئے۔

پس ماندگان شہدا کی دلداری

سید صاحب دیر تک چُپ بیٹھے رہے۔ نماز مغرب ادا کرنے کے بعد

---

[1] ہزارہ گزٹیئر، مطبوعہ ۱۹۰۷ء (صفحہ ۱۲۰)

گڑھی میں چلے گئے۔ عشا کی نماز ہو چکی تو سید موسیٰ (ابن سید احمد علی شہید)، ابراہیم خاں (برادر محمد خاں شہید)، نور بخش جراح (برادر رحیم بخش جراح شہید) اور دوسرے شہدا کے عزیزوں کو بلا کر دیر تک تسلی و تشفی دیتے دیتے اور نصیحتیں فرماتے رہے۔ پھر سب کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ سید صاحب کا عام طریقہ یہی تھا کہ شہدا کے اقربا کو کم از کم ایک وقت کا کھانا اپنے ساتھ کھلاتے تھے۔

مولانا شاہ اسماعیل کو سید احمد علی کے شہید ہو جانے کی خبر ملی تو انھوں نے بھی پیش قدمی ملتوی فرما دی، اس لیے کہ جس نظام کے مطابق غازی ہزارہ میں بڑھے تھے، اس میں کچھ عرصے کے لیے تعطل ناگزیر ہو گیا تھا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب نے انھیں واپس بُلا لیا تھا۔ وہ آس پاس کے خوانین سے خدمت دین اور رفاقت مجاہدین کا عہد لیتے ہوئے واپس ہو گئے۔

پایندہ خاں اور خوانین اگرور

یہاں اجمالاً یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ مولانا کی مراجعت کے بعد پایندہ خاں پھر اگرور سے شیر گڑھ پہنچ گیا اور اس نے ارسلان خاں سے مال و اسباب اور متعلقین کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ متعلقین میں اس کی ہمشیر بھی تھی، جس کی نسبت ابتدا میں عبدالغفور خاں والیِ اگرور سے ہو گئی تھی، لیکن جب پایندہ خاں طاقت ور بن گیا تو شادی سے انکار کر دیا۔ ارسلان خان کی والدہ نے کہا کہ یہ لڑکی تو نہیں بھیجی جا سکتی۔ باقی چیزیں اور تمام متعلقین واپس کر دیے جائیں۔

چنانچہ پایندہ خاں کی ہمشیر کا نکاح عبدالغفور خاں سے ہو گیا۔ یہی امر امب و اگرور کے درمیان انتہائی دشمنی کا باعث بن گیا۔ پایندہ خاں نے اس کے بعد ارسلان خاں کو بہ ظاہر محبت سے اپنے پاس بُلایا اور کہا کہ اپنی خیر خواہی کا انعام لے جاؤ۔ وہ موضع بجنا میں پایندہ خاں کا روپیہ لے کر پہنچا تو اس مسکین کو قتل کرا دیا۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد پایندہ خاں کی اسی دشمنی کے باعث عبدالغفور خاں اور اس کا بھائی کمال خاں بھی مارے گئے۔ تفصیلات موجودہ کتاب کے موضوع سے خارج ہیں۔

بیسواں باب

امب میں قیام کے حالات

دینی احکام کا اجرا امب کو مرکز بنا کر مشرقی سمت میں پیش قدمی کا فیصلہ کر لیا گیا تو سید صاحب نے بی بی صاحبہ اور دوسری خواتین کو بھی نکھاڑہ سے بلا لیا۔ اس زمانے میں بیسیوں افراد کو امان نامے اور بر شرط خدمت دین عطا نامے لکھ کر دیے گئے جن میں سے بعض مکاتیب میں محفوظ ہیں[1]۔

علاقے کی عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی شرعی قوانین جاری ہو گئے۔ حافظ عبد اللطیف کو احتساب پر مقرر کر دیا گیا۔ جو مرد نماز نہیں پڑھتے تھے، امان خاں کنج پوری حسب احکام قاضی تازیانے لگاتے تھے۔ عورتوں کو خود سید صاحب حرم میں لے جا کر سزا دیتے تھے۔ راویوں نے لکھا ہے کہ قیام امب کے زمانے میں صرف دو عورتوں کو تازیانوں کی سزا دی گئی۔ ایک تارک صلوٰۃ تھی۔ دوسری ٹوپی سے آئی تھی اور اس نے اپنے آپ کو بیوہ ظاہر کیا تھا لیکن تحقیق پر معلوم ہوا کہ اس کا شوہر موجود ہے۔ سید صاحب نے خود حرم میں اسے سیڑھی سے بندھوا کر تازیانے لگائے۔

اخوند عصمت اللہ سید صاحب کے معتمد علیہ مشیر تھے۔ ایک روز معلوم ہوا کہ ان کی اہلیہ نے ایک ملکی عورت کو طعنہ دیا کہ تو نے کالے کلوٹے ہندی سے شادی کر لی۔ سید صاحب اس پر بہت خفا ہوئے اور بہت سے آدمیوں کے روبرو اخوند سے فرمایا کہ اپنی اہلیہ کو ایسی حرکات سے روکیے، جو زوجین میں تکدر و تفریق کا باعث ہو سکتی ہیں۔ یہ کار شیطان ہے، ورنہ میں اسے سزا دوں گا۔

اصلاح اخلاق اس حصۂ ملک میں عام رواج یہ تھا کہ لوگ دریا پر ننگے نہاتے تھے۔ سید صاحب نے حکم دے دیا کہ جو شخص ننگا نہاتا ہوا پکڑا جائے اس سے آٹھ آنے جرمانہ وصول کیا جائے۔ بعد میں جرمانے کی جگہ تازیانے کی سزا مقرر ہو گئی۔

قاضی سید محمد حبان ایک موقع پر کھبل گئے تو ایک شخص نے بڑے شوق سے تازہ مچھلی پکڑ کر قاضی صاحب کو کھلائی۔ اتفاق سے دوسرے یا تیسرے روز وہ ننگا نہاتا ہوا پکڑا آیا اور مقدمہ قاضی صاحب کے رو برو

---

[1] مکاتیب شاہ اسماعیل از صفحہ ۲۵۸ - ۲۶۷

پیش ہُوا۔ جرم ثابت ہو گیا تو قاضی صاحب نے حسب ضابطہ آٹھ آنے جرمانہ کر دیا۔ وہ جوش میں بولا کہ مچھلی معاف نہیں کروں گا۔ قاضی صاحب نے بے تکلف فرمایا کہ مچھلی ہضم ہو چکی، اب تمھاری معافی کی احتیاج نہیں لیکن جو ضابطہ جاری ہے وہ نہیں ٹل سکتا۔

جانوروں کی چرائی میں فصلوں کے نقصان کی شکایتیں موصول ہونے لگیں تو مختلف جانوروں کے لیے جرمانے مقرر کر دیے گئے۔ مثلاً بھینس چر جائے تو دو آنے وصول کیے جائیں۔ گائے، گھوڑا، یا بو یا گدھا چر جائے تو ایک آنہ۔ بکری چر جائے تو دو پیسے۔ لیکن اس طرح فصل کے مالک کو جو نقصان پہنچ جاتا تھا اس کی "تلافی نہیں ہو سکتی تھی، لہٰذا حکم دے دیا گیا کہ ہر نقصان کا صحیح اندازہ کر کے مالک کو پورا تاوان دلایا جائے۔

پھلیلہ ڈاکو

پھلیلہ نام ایک شخص توپی کا رہنے والا، بڑا ظالم و مردم آزار تھا۔ لوگ اس کے ہاتھ سے اتنے تنگ آ گئے کہ اتفاق کر کے اسے بستی سے نکال دیا۔ وہ سکھوں کے پاس چلا گیا۔ انھوں نے دریا کے کنارے اس کے لیے ایک بُرج بنا دیا۔ پچاس ساٹھ آدمی ہر وقت اس کے پاس رہتے تھے۔ جب موقع پاتا، دریا سے گزر کر مسلمانوں کے دیہات میں ڈاکے ڈالتا۔ ایسے مواقع پر اس کے ساتھ سو سو آدمی ہوتے تھے۔

دریائے سندھ کے وسط میں ایک جزیرہ تھا جسے تہائی کا بیلہ کہتے تھے۔ اس میں مشوانی لوگ آباد تھے۔ جس زمانے میں مکھن سنگھ ہزارہ کا گورنر تھا، پھلیلہ نے اس کی اجازت سے اس بیلے پر ڈاکہ مارا۔ سکھ بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ مشوانیوں نے سخت مقابلہ کیا اور پھلیلہ کے ساتھیوں میں سے قریباً اسی مارے گئے۔ ان میں سے پندرہ سولہ سکھ تھے۔ مقتولوں میں پھلیلہ کا بھائی احمد علی بھی شامل تھا۔ لیکن بیلے اور بستی پر پھلیلہ کا قبضہ ہو گیا اور اس نے وہیں سکونت اختیار کر لی۔ اس جگہ سے وہ توپی، مینئ، منارہ، کھبل اور اردگرد کے تمام بڑے بڑے مقامات پہ یورشیں کرتا رہتا تھا۔ جب سید صاحب امب تشریف لائے تو لوگوں نے انتہائی پریشانی کے عالم میں اس کے تدارک کی درخواست کی۔

سیّد صاحب کی سعیٔ مشکور

سید صاحب نے اسے ایک خط لکھا کہ آپ مسلمان ہیں۔ اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں۔ آپ کے لیے یہ کیوں کر زیبا ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کو لوٹیں اور ایذائیں دیں؟ ہمارے پاس آ جائیں۔ آپ کی زمینیں بھی دلا دیں گے اور بستی میں از سرِ نو آباد بھی کرا دیں گے۔

یہ دعوت نامہ پڑھتے ہی اس کی سوئی ہوئی اسلامی حمیت جاگ اٹھی اور وہ اپنے پچاس آدمیوں کو لے کر سید صاحب کے پاس امب پہنچ گیا۔ تین گھوڑے، تین تلواریں اور تین بندوقیں بطور نذر پیش کیں۔ سید صاحب

نے ایک سبز دوشالہ، بہت سے کپڑے اور نقد روپیہ دیا نیز اس کے تمام ساتھیوں کو ایک ایک دستار اور ساتھ ایک ایک لنگی عطا کی۔ ان سب نے بیعت کر لی۔ پھر آپ نے ٹوپی کے رئیسوں کو بلا کر پھلیلہ کا معاملہ ان کے سامنے پیش کیا اور اس کے تمام حقوق دلا دیے۔ کھبل کے پاس ایک بے چراغ گاؤں تھا جو ٹوپی، گندف اور گیارہ باڑہ والوں کی مشترکہ ملکیت میں تھا۔ سید صاحب کے ارشاد پر سب نے وہ گاؤں پھلیلہ کو دے دیا۔ اس طرح ایک مسلمان گمراہی سے بھی محفوظ ہو گیا اور مسلمانوں کو اس کے شر سے بھی امن مل گیا۔

سکھوں کے قافلۂ رسد پر حملہ

کچھ مدت کے بعد پھلیلہ کو معلوم ہوا کہ سکھوں کی رسد سکندر پور سے دربند جا رہی ہے۔ اس نے سید صاحب کے پاس حاضر ہو کر عرض کیا کہ اجازت ہو تو تماشا دکھاؤں۔ میں رسد کے قافلے پر حملہ کروں گا۔ کسی امداد کی ضرورت نہیں، البتہ اگر کوئی خاص مشکل پیش آ جائے اور سکھوں کا دباؤ ہم پر بڑھ جائے تو توپیں چلا کر ہماری اعانت فرما دیجیے۔ چنانچہ وہ دریا سے پار اترا اور اپنے آدمیوں کو لے کر ایک نالہ میں بیٹھ گیا۔ سید صاحب نے چند غازیوں کو دیکھ بھال کے لیے عشرہ کے اوپر کوٹلے میں بٹھا دیا، جہاں سے سب کچھ نظر آتا تھا۔

رسد بیلوں، خچروں اور گدھوں پر لدی ہوئی تھی اور اس کی حفاظت کے لیے پانسو سکھ ساتھ تھے۔ پھلیلہ نے اچانک گھات سے نکل کر حملہ کیا۔ چودہ سکھ مارے گئے۔ باقی رسد کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پورا سامان پھلیلہ کے قبضے میں آیا۔ اس چپقلش میں اس کے تین ساتھی مارے گئے۔ اس کے ہمراہیوں میں سے ایک شخص شیخ محمد غازیوں میں شامل ہو گیا اور واقعہ بالاکوٹ کے بعد غالباً شیخ ولی محمد کے ساتھ ٹونک چلا آیا۔ محلہ قافلہ میں رہا اور غالباً ٹونک ہی میں فوت ہوا۔

کھیتی باڑی

غازی امب آئے تھے تو اشیائے خوردنی کی تنگی تھی، اس لیے کہ گندم کی فصل پکی نہیں تھی۔ چنانچہ سرکاری اونٹ دور دور سے جا کر غلہ لاتے تھے۔ سید صاحب نے عام اعلان کر دیا کہ جو لوگ امب چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں، وہ واپس آ جائیں اور اپنی فصلیں سنبھال لیں۔ جو لوگ نہ آئے، سید صاحب نے ان کے کھیت غازیوں کے حوالے کر دیے۔ کچھ دنوں تک غازی بالیں بھون بھون کر کھاتے رہے۔ فصل پک گئی تو کاٹ کر غلہ نکالا۔ غلہ ابھی باہر پڑا تھا کہ اچانک بارش آ گئی۔ سید صاحب نے سب غازیوں کو حکم دے دیا کہ گٹھڑیاں باندھ باندھ کر غلہ اٹھا لائیں۔ خود بھی عام غازیوں کی طرح بوجھ ڈھوتے رہے۔

گڑھی کے شمال میں دریا کے کنارے کچھ زمین غیر مزروعہ پڑی تھی۔ سید صاحب نے فرمایا کہ اس میں تربوز بو دیے جائیں۔ اکثر غازیوں نے اپنے اپنے کھیت الگ کر لیے اور کم و بیش دس بیگھے زمین میں تربوز بوئے۔ فصل

خوب ہوئی۔ ایک فصل ہو چکی تو سید صاحب نے فرمایا کہ بیلیں جڑ سے نہ اکھاڑی جائیں۔ پھر آپ پنجتار تشریف لے گئے۔ فصل دوبارہ بھی خوب ہوئی۔ شیخ ولی محمد اور شیخ بلند بخت نے بہت سے تربوز خچروں اور اونٹوں پر لاد کر پنجتار بھیجے۔

آم

دریا کے کنارے آم[1] کا ایک بھاری درخت تھا۔ سید صاحب نے پوچھا یہ پھلتا بھی ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ ہم نے اپنے بزرگوں سے سُنا ہے کہ جب یہاں دیانت دار حاکم تھے تو پھلا کرتا تھا۔ اب مدت سے بے ثمر چلا آتا ہے۔ فرمایا اگر یہی بات ہے تو ہم پروردگار سے اس کی ثمرداری کے دعا کریں گے۔ ہمارے غازی بھائی اپنے گھر بار اور خویش و تبار کو چھوڑ کر صرف اللہ کی رضا کے لیے یہاں آئے ہیں۔ کیا عجب ہے ان کی نیک نیتی کی برکت سے یہ درخت پھل دینے لگے۔

بعد نماز مغرب آپ نے درخت کے پاس جا کر ننگے سر بہ کمال عجز و الحاح دعا کی۔ میانجی سید محی الدین پھلتی قرآن پڑھایا کرتے تھے۔ ان سے فرمایا کہ کل سے اپنے شاگردوں کو اسی درخت کے نیچے بیٹھ کر درس دیا کریں۔

اللہ کے فضل سے آم خوب پھلا اور غازی کیریوں کی چٹنی کھانے لگے۔ پھر سید صاحب پنجتار چلے گئے تو شیخ ولی محمد نے درخت پر پہرے لگا دیے۔ آم ٹپکے تو بی بی صاحبہ کو کھلائے اور پال ڈال کر کئی ٹوکرے سید صاحب کے پاس پنجتار بھیجے۔ حضرت نے بھی کھائے اور غازیوں کو بھی کھلائے۔

دو حادثے

گڑھی کے دروازے پر ایک بُرج تھا جو بارش میں ٹپکنے لگا۔ اس میں دس بارہ غازی رہتے تھے۔ باقی سب تو دوسرے مکانوں میں چلے گئے لیکن داؤد خاں، حفیظ اللہ دیوبندی اور پیر خاں شاہ جہان پوری وہیں رہے۔ بُرج سے مٹی گرنے لگی تو حفیظ اللہ اور پیر خاں بھی نکل گئے۔ داؤد خاں بیمار تھے۔ انھیں بھی نکالنا چاہا۔ وہ بولے کہ میں تکلیف میں ہوں، یہیں پڑا رہنے دو۔ بُرج گرنے والا نہیں کہ کوئی خطرہ ہو۔ سوء اتفاق سے بُرج اچانک گر گیا۔ سید صاحب کو خبر ملی تو فوراً غازیوں کو لے کر ملبہ ہٹایا۔ داؤد خاں زندہ نکل آئے انھیں دھنی ہوئی روئی میں رکھا، لیکن ڈیڑھ دوپہر کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

اسی طرح قلعہ امب کے جنوبی و مغربی گوشے میں ایک بُرج تھا، جس کا کچھ حصہ گر گیا اور دو آدمی دب گئے۔ سید صاحب فوراً خود کدال لے کر مٹی ہٹانے لگے۔ چونکہ بُرج کے بقیہ حصوں کے بھی گر جانے اندیشہ تھا اس لیے بعض لوگوں نے آپ کو روکنا چاہا۔ لیکن آپ ہر خطرے سے بالکل بے پروا ہو کر کام میں لگے رہے

---

[1] غالباً اسی کی وجہ سے اس مقام کا نام امب پڑ گیا۔ پنجاب اور ہزارہ کی بولی میں آم کو "امب" کہتے ہیں۔

اور ایک آدمی جو اٹک کا باشندہ تھا سلامت نکل آیا۔ فرمایا: "اگر میں آپ کے روکنے سے رُک جاتا تو ایک مسلمان کی جان بچانے کے ثواب سے محروم ہو جاتا۔"[1]

دریا سے پانی لانے کا واقعہ

ایک رات بارش ہو رہی تھی کہ ماخیلوں اور حسن زئیوں کے دس آدمی بے وقت آ گئے۔ سید صاحب نے انھیں عزت سے ٹھہرایا۔ میاں عبداللہ سے کہا کہ ان کے لیے کھانا تیار کرائیے۔ میاں صاحب نے باورچی خانہ میں دیکھا تو پانی نہیں تھا۔ نیز عرض کیا کہ دونوں سقے بیمار ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ کوئی بھائی دو چار مشکیں دریا سے لے آئے۔ غازی بالعموم اس قسم کے مواقع پر سبقت کے درپے رہتے تھے لیکن اس روز سوءِ اتفاق سے سب اپنی اپنی جگہ سمجھتے رہے کہ کسی ایک بھائی نے اس حکم کی تعمیل کر دی ہوگی۔ تھوڑی دیر کے بعد میاں عبداللہ نے پھر عرض کیا کہ پانی ابھی تک نہیں آیا۔ سید صاحب نے فرمایا مشک لے آئیے۔ مشک آ گئی تو آپ بسم اللہ کہہ کر اُٹھے اور مشک کندھے پر ڈال کر دریا کی طرف چل پڑے۔[2] یہ دیکھ کر تمام غازی بے تابانہ اُٹھے۔ مشک، پکھال، ڈول، بدھنا، گھڑا جو چیز جسے ملی لے کر سید صاحب کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ دریا ایک گولی کی زد پر تھا۔ اس سارے فاصلے میں آدمیوں کا تار بندھ گیا۔

اطاعت امام

واپس آ کر سید صاحب نے حمد و ثنا کے بعد اطاعت امام کا مضمون چھیڑا اور فرمایا کہ ہمارے بعض بھائی:

> اب تک اطاعت کا مضمون نہیں سمجھے ہیں اور دعوٰی للہیت کا کرتے ہیں۔ بھائیوں کو اس بات کا خیال ضرور کرنا چاہیے کہ جو کام کریں خالص اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور اطاعت سمجھ کر کیا کریں۔ کسی آدمی کی رواداری اور خوشامد کا خیال نہ کریں۔
>
> جب میں نے کہا کہ کوئی جا کر پانی لے آئے، اپنی سادہ مزاجی اور غفلت طبیعت سے کوئی نہ گیا اور جب میں مشک لے کر چلا تو ہر ایک میری خاطرداری سے ساتھ ہو لیا۔ سو ایسی بات نہ چاہیے۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ سب بھائی یہاں اللہ تعالیٰ ہی کے واسطے آئے ہیں۔ بہ مقتضائے بشریت ایسی بات ہو جاتی ہے، مگر اس کو خیال میں رکھنا چاہیے۔[3]

ممکن ہے کسی صاحب کے دل میں خیال پیدا ہو کہ ایک یا زیادہ غازیوں کا نام لے کر کیوں حکم نہ دیا؟

---

[1] منظورہ صفحہ ۷۶۶

[2] یہ وقائع کا بیان ہے۔ منظورہ میں ہے مولانا شاہ اسماعیل پاس بیٹھے تھے۔ ان سے فرمایا: چلو پانی لائیں۔ مولانا مشک نہیں اُٹھا سکتے تھے، لیکن کہا کہ چند سبو تو ضرور لے آؤں گا۔

[3] وقائع صفحہ ۱۲۸۹-۱۲۹۰

منظورہ کا بیان ہے:

آں جناب را منظور بود کہ حکم علی العموم باشد و مسلماناں براں سبقت کنند و بالخصوص کسے را حکم دادہ نشود[1]

سید صاحب کے پیشِ نظر ہمیشہ یہ بات رہی کہ حکم علی العموم دیا جائے تاکہ ہر مسلمان اس کی تعمیل میں سبقت و پیش قدمی کرے اور تخصیص و تعیین کے ساتھ کسی کو حکم نہ دیا جائے۔

لاہوری سائیس اور عنایت اللہ کا معاملہ

قاضی مدنی بنگالی کا سائیس لاہوری، غازی پور کا باشندہ تھا۔ شکل و صورت چنداں اچھی نہ تھی، لیکن حسنِ اخلاق میں اس کا پایہ بڑا بلند تھا۔ عنایت اللہ ساکن منڈھیاؤں جماعت خاص کا آدمی اور سید صاحب کے ابتدائی ہمراہیوں میں تھا۔ حج بھی ساتھ کیا تھا اور حضرت کو اس سے بڑی محبت تھی۔ وہ لاہوری کے ڈیرے سے ایک طاس آٹا گوندھنے کے لیے اٹھا لایا۔ ابھی آٹا گوندھا نہ تھا کہ لاہوری نے آکر پوچھا طاس پوچھے بغیر کیوں لائے؟ عنایت اللہ ذرا تند مزاج تھا۔ بولا:

"طاس سرکاری ہے تمھارا کیوں کر ہوا؟"

لاہوری: بے شک سرکاری ہے لیکن قاضی مدنی کی تحویل میں ہے۔ انھوں نے ہمیں سونپ رکھا ہے۔ ایک تو بغیر پوچھے طاس لے آئے، اس پر گرم ہوتے ہو۔ ہم طاس لے جائیں گے۔

عنایت اللہ: دیکھیں کیسے لے جاتے ہو؟

لاہوری نے آٹا کپڑے میں ڈالا اور طاس اٹھا لیا۔ عنایت اللہ نے دو گھونسے رسید کر دیے اور طاس چھین لیا۔ لاہوری گر پڑا۔ آواز سن کر لوگ آ گئے۔ اُسے اٹھایا، پانی پلایا اور تسلی دی۔ سید صاحب کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو دونوں کو بُلا کر حالات پوچھے۔ عنایت اللہ نے انتہائی راست گفتاری سے لاہوری کے بیان کی حرفاً حرفاً تصدیق کر دی۔ سید صاحب عنایت اللہ کی حرکت پر کمال ناخوش ہوئے اور فرمایا:

> آپ اپنے دل میں سمجھتے ہوں گے کہ ہم سید کے پُرانے رفیق ہیں۔ اس کے پلنگ کے پاس ہمارا پہرہ رہتا ہے۔ یہ خیال نہ آیا کہ آپ یہاں اللہ کے واسطے آئے ہیں اور کام ایسے نکمے کرتے ہیں؟ ہمارے نزدیک آپ اور لاہوری بلکہ سب بھائی برابر ہیں۔ قاضی کا سائیس جان کر اور کم رو دیکھ کر مارا، سخت غلطی کی۔ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں۔

---

[1] منظورہ صفحہ ۷۶۳

پھر حافظ صابر تھانوی اور شرف الدین بنگالی سے فرمایا کہ مقدمہ قاضی سید حبان کے پاس لے جائیے ۔ زیادتی عنایت اللہ کی ہے ۔

مقدمہ قاضی کی عدالت میں

عنایت اللہ پھلت والوں کی جماعت میں تھا ۔ وہ سب بہت پریشان ہوئے ۔ لاہوری کی منّت سماجت کرنے لگے کہ عنایت اللہ نے بُرا کیا، لیکن لاہوری نہ مانا اور بولا : بھائیو ! اب تو امیر المومنین نے جو فرمایا ہے وہی ہوگا ، یعنی ، مقدمہ قاضی صاحب کے پاس جائے گا ۔

قاضی صاحب مسجد میں بیٹھے تھے ۔ گھڑی ڈیڑھ گھڑی دن باقی تھا ۔ آپ نے فریقین کے بیانات سُنے پھر کہا کہ اب تو دیر ہوگئی ہے ، کل بعد نماز اشراق اس مقدمے کا فیصلہ سنایا جائے گا ۔

عنایت اللہ کی زیادتی میں کسی کو بھی شبہ نہیں رہا تھا ۔ لیکن سب کی آرزو تھی کہ لاہوری معاف کر دے ۔ شیخ عبدالرحمٰن رائے بریلوی نے قاضی صاحب سے کہا کہ کسی طرح لاہوری کو راضی کرنے کا انتظام کر دیجیے ۔

دوسرے دن قاضی صاحب نے عنایت اللہ کو بہت ملامت کی اور کہا کہ تم نے بہت بُری حرکت کی ، جو مستوجب سزا ہے ۔ پھر لاہوری سے مخاطب ہو کر کہا :

> بھائی صاحب ! تم بہت نیک بخت اور باشعور آدمی ہو ۔ سب ہندوستان سے اپنا اپنا گھربار اور خویش و تبار چھوڑ کر محض واسطے جہاد فی سبیل اللہ کے آئے ہو کہ اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہو اور آخرت میں ثواب ملے ۔ کارخانۂ دنیا تو واسطے چند روز کے ، مانند خواب و خیال کے ہے ، سراسر بے اصل اور بے بنیاد ۔ عنایت اللہ تمھارا بھائی ہے اور اس سے بر سبب شامت نفس کے یہ قصور ہو گیا ، معاف کر دو ۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں سے اجر پاؤ گے ۔

لاہوری کی شانِ اخوت

لاہوری نے عرض کیا کہ قاضی صاحب ! اگر میں عنایت اللہ کو معاف کر دوں تو اجر پاؤں ، عوض لے لوں تو برابر ، گناہ تو نہیں ؟ فرمایا : نہیں ۔ لاہوری نے کہا : میں تو اپنا حق چاہتا ہوں ۔

قاضی صاحب نے چند لمحے سکوت کیا ۔ پھر فرمایا کہ بھائی لاہوری حق تمھارا تو یہ ہے کہ عنایت اللہ کے اسی جگہ دو گھونسے مارو ۔

لاہوری بولا : "جو بھائی حاضر ہیں ، گواہ رہیں کہ قاضی صاحب نے ہم کو ہمارا عوض دلا دیا ، لیکن ہم نے اسے رضائے الٰہی کے لیے چھوڑ دیا ۔ اس کے ساتھ ہی آگے بڑھ کر عنایت اللہ کو اپنی چھاتی سے لگا لیا ۔

اس واقعہ پر سب بے حد خوش ہوئے ۔ سید صاحب نے بھی لاہوری کو پاس بٹھا کر کہا کہ آپ نے

بڑے دیندار مردوں کا کام کیا۔

ایک لطیفہ

گڑھی کے جس مکان میں سید صاحب رہتے تھے، اس کے سامنے شیشم کا ایک بڑا درخت تھا۔ پاس کے دالان میں جن غازیوں کے بستر تھے، ان میں شیخ منور علی قدوائی بھی تھے۔ کسی کے لیے جگہ مقرر نہ تھی۔ جو جہاں چارپائی ڈال لیتا، سو رہتا۔ ایک روز شیخ منور علی کہیں گئے ہوئے تھے۔ وہ جس جگہ روزانہ چارپائی بچھاتے تھے، وہاں ان کی غیبت میں کسی دوسرے غازی نے بچھالی۔ شیخ صاحب اُٹھے تو کہنے لگے کہ یہ تو میری جگہ تھی۔ جواب ملا کہ جگہ مقرر تو ہے نہیں، میں خالی جگہ پا کر سو گیا، اب آپ کو جہاں جگہ ملے انتظام فرما لیجیے۔

شیخ صاحب کے دل میں خدا جانے کیا سمائی کہ فوراً چارپائی کو ایک رسہ باندھا۔ اس کا ایک سرا پکڑ کر درخت پر چڑھ گئے۔ اوپر کھینچ کر چارپائی ایک شاخ پر جمائی۔ رستے سے اسے باندھ کر وہیں لیٹ گئے۔ اب سب غازیوں نے اٹھ کر منت سماجت سے انھیں راضی کرنا چاہا، مگر وہ غصے میں تھے، نہ مانے۔ سید صاحب باہر تشریف لائے تو معاملہ ان کی خدمت میں عرض کیا گیا۔ آپ نے پوچھا: شیخ بھائی آپ نے چارپائی درخت پر کیوں بچھائی؟ عرض کیا: "حضرت اب میرے لیے زمین پر جگہ نہیں رہی، آج آسمان کی طرف پہلی منزل ہوئی ہے، کل جو کچھ پیش آئے گا دیکھ لوں گا۔"

یہ لطیفہ سُن کر سب بے اختیار ہنس پڑے۔ سید صاحب نے فرمایا: شیخ بھائی! اُتر آئیے۔ آپ کے لیے زمین ہی پر جگہ نکل آئے گی۔ چنانچہ وہ اُتر آئے اور سید صاحب نے ان کی چارپائی ایک اچھی جگہ ڈلوا دی۔

حقِ سیادت

ایک روز سکھ علاقے کے ایک آدمی نے آکر سید صاحب سے خیرات مانگی۔ آپ نے اسے جہاد کی ترغیب دی۔ وہ بولا: میں ضعیف ہوں اور اندیشہ ہے کہ سکھ میرے بال بچوں کو نقصان پہنچائیں گے۔ آپ نے فرمایا: ہم اپنا لشکر بھیج کر آپ کے اہل و عیال کو یہاں منگا لیتے ہیں کہ اطمینان ہو جائے۔ اس نے کہا: اس طرح جانیں تلف ہوں گی اور اگر دشمن کامیاب رہا تو مصیبت پیش آئے گی۔ بالآخر سید صاحب نے فرمایا کہ اسے دو روپے دے دیے جائیں۔ یہ حکم سُن کر اس نے کہا کہ میں سید ہوں، زیادہ رقم ملنی چاہیے۔ یہ سُنتے ہی سید صاحب کا چہرہ سُرخ ہو گیا، فرمایا:

وقتیکہ بشما کارے فرمودم کہ بر دیگراں واجب و بر سادات اوجب است، عذر کردید، اکنوں برائے یک دو روپیہ سیادت خود را می فروشید۔ ایں عجب است کہ شخصے برائے	جب میں نے ایک ایسے کام کے لیے کہا جو دوسروں کے مقابلے میں سادات پر بہ درجہ اولیٰ واجب ہے، تو عذر کرتے رہے اور اب ایک دو روپے کی خاطر سیادت کو فروخت کرنے لگے۔

بجا آوردن احکام الٰہی اظہار سیادت خود نہ کند اگرچہ اقدام و سبقت در امور عبادت شایان سیادت است و در مقام طمع اظہار سیادت خود مے نماید۔

یہ عجیب بات ہے کہ احکام الٰہی کی بجا آوری میں سیادت کا اظہار نہ کیا حالانکہ امور عبادت میں سبقت و اقدام شایانِ سیادت ہے لیکن طمع کی خاطر سیادت جتانے لگے۔

پاینده خاں کی زنبورکیں

پاینده خاں جب بروٹی کو چھوڑ کر اگرور چلا گیا تھا تو اطلاع ملی کہ اس کی چھ زنبورکیں بروٹی سے آگے راستے میں پڑی ہیں۔ شیخ بلند بخت کو حکم ہوا کہ ان زنبورکوں کو لانے کا انتظام کیجیے۔ وہ شیخ محمد اسحاق گورکھپوری کی تلاش میں اٹھے۔ سید جعفر علی نقوی نے بتایا کہ شیخ صاحب گھی خریدنے کے سلسلے میں دن بھر فروسہ کی طرف پھرتے رہے، شام کو واپس آئے تھے۔ نماز عشا جلد پڑھ کر سو گئے ہیں۔ کہتے تھے کہ بہت تھک گیا ہوں۔ طبیعت بھی اچھی نہیں، مجھے نہ جگانا۔ ساتھ ہی کہا کہ اگر کوئی ضروری کام ہو تو مجھے فرمائیے۔ شیخ صاحب نے فرمایا کہ کام بڑا اہم ہے یا تو شیخ صاحب اسے انجام دے سکتے ہیں یا آپ خود تیار ہو جائیں۔ اور کسی کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ سید جعفر علی تیار ہو گئے۔ شیخ بلند بخت نے کہا کہ اپنی جماعت میں سے چار پانچ آدمی لے لیجیے، چالیس آدمی میں دیتا ہوں۔ انھیں لے کر آدھی رات سے قبل چھتر بائی میں مولانا خیر الدین شیر کوٹی کے پاس پہنچ جائیے۔ وہ، زنبورکیں لانے کے متعلق جو مشورے دیں، ان پر عمل کیجیے۔

مولوی جعفر علی نقوی کی عزیمت

چنانچہ سید جعفر علی اسی وقت روانہ ہو کر چھتر بائی پہنچ گئے۔ مولوی خیر الدین نے فرمایا کہ صرف پانچ آدمی آپ لے لیجیے اور چھٹا رہبر میں دیتا ہوں۔ سید جعفر علی کے علاوہ چار اصحاب کے نام یہ تھے: امام خاں، الہ داد خاں، پیر محمد خاں اور شرف الدین۔

یہ چھ آدمی جالے میں بیٹھ کر دریا سے پار اترے اور ایک گاؤں میں پہنچے۔ رہبر نے گاؤں والوں کو آواز دی اور سید جعفر علی کے کہنے کے مطابق بتا دیا کہ یہ امیر المومنین کے آدمی ہیں۔ پاینده خاں کے تعاقب میں جا رہے ہیں۔ اور آدمی بھی آ رہے ہیں۔ چپ چاپ بیٹھے رہو اگر کوئی معاندانہ حرکت کی تو گاؤں نذر تاراج ہو جائے گا۔

وہاں سے سخت گھاٹیوں کو طے کرتے ہوئے یہ ایک مقام پر پہنچے جہاں اونٹ اور زنبورکیں تھیں۔ پاینده خاں کے آدمی ان کے پاس بیٹھے تھے۔ چھ زنبورکیں بتائی گئی تھیں، لیکن ان کے پاس صرف چار تھیں۔ بقیہ کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک چھتر بائی ہی میں ہے اور ایک بگڑ گئی تھی۔ اسے مرمت کے لیے پاس کے گاؤں میں دے آئے ہیں۔

سید جعفر علی نے پاینده خاں کے آدمیوں کو بتایا کہ جو کچھ تم کو خان سے ملتا تھا وہی ہم دیں گے، ہمارے ساتھ ہو جاؤ۔ کہنے لگے ہم حقہ پیتے ہیں۔ سید جعفر علی نے بتایا کہ حقہ کشی پر کسی کو سزا نہیں دی جاتی، البتہ ہم اسے مکروہ

سمجھتے ہیں، لیکن بھنگ وغیرہ مسکرات کے لیے سزا ہے۔ غرض انھیں راضی کر کے چاروں زنبورکیں اونٹوں پر سوار کرائیں۔ پانچویں کے لیے دو آدمی اس گاؤں میں بھیج دیے، جہاں وہ مرمت کے لیے دے رکھی تھی۔

چھتر بائی کا گھاٹ دربند سے قریب تھا جہاں سکھوں کی چوکی تھی۔ سید جعفر علی نے حکم دے دیا کہ اگر سکھوں کی گڑھی سے کوئی باہر نکلے تو فوراً زنبورکیں سر کی جائیں۔ گھاٹ پر پہنچے تو مولوی خیرالدین شیرکوٹی سامنے کے میدان میں نماز عید اضحیٰ ادا کر رہے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر انھوں نے جالے بھیجے تو سب لوگ سوار ہو کر چھتر بائی پہنچے۔ رات بھر سخت زحمتیں برداشت کی تھیں۔ سید جعفر علی کو بخار آ گیا لیکن بیماری کی حالت میں بھی چھتر بائی میں نہ رُکے اور امب پہنچ کر زنبورکیں پیش کر دیں۔

غازیوں کی شان سبقت بالخیرات

غازیوں کے ایثار اور جذبۂ سبقت بالخیرات کا اندازہ فرمائیے کہ اتنی سخت مشقت کا کام تھا، جس میں ہر قدم پر جان کا خوف تھا، لیکن یہ کام بطیب خاطر اپنے ذمے لے لیا اور شیخ محمد اسحاق کو زحمت نہ دی۔ اگرچہ حکم ان کے نام تھا۔ شیخ محمد اسحاق بیدار ہوئے اور سارے حالات سُنے تو سخت ناراض ہُوئے۔ سید جعفر علی سے بار بار جھگڑتے تھے کہ جب حکم میرے نام تھا تو مجھے کیوں نہ جگایا اور خود کیوں اس کام کو سنبھال بیٹھے؟

اسی طرح جب پھولڑہ لشکر بھیجا جا رہا تھا تو سید احمد علی نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ میر فیض علی گورکھ پوری کو میرے ساتھ نہ بھیجا جائے۔ وہ تجربہ کار منشی ہیں اور مرکز میں ہر وقت ان کی ضرورت پڑتی رہے گی۔ سید جعفر علی نقوی کو بھیج دیجیے۔ سید صاحب نے دونوں کو بلا کر فرمایا کہ جو بھائی چاہے، چلا جائے۔ دونوں نے عرض کیا کہ جیسے حکم ہو، جانے کے لیے تیار ہے۔ بالآخر سید صاحب نے میر فیض علی سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ کا یہ بھائی دُور سے آیا ہے، سفر کی ماندگی ابھی تک باقی ہو گی۔ مناسب یہ ہے کہ آپ چلے جائیں۔ عرض کیا: بسر و چشم۔ چنانچہ میر فیض علی چلے گئے اور پھولڑہ میں سید احمد علی کے ساتھ شہید ہُوئے۔

شاہ اسماعیل کا واقعہ

سید صاحب، مولانا شاہ اسماعیل اور دوسرے اکابر کا عام شیوہ تھا کہ خود شدائد کی برداشت میں پیش قدمی کرتے اور اس طرح دوسروں کو ترغیب و تعلیم دیتے۔ سید جعفر علی نقوی بیان کرتے ہیں کہ ایک موقع پر سکھوں نے چھتر بائی کا قصد کیا۔ ایک زنبورک کو امب سے چھتر بائی پہنچانا منظور تھا۔ مولانا نے مجھے طلب فرمایا اور کہا آؤ اسے اٹھائیں۔ اٹھائی اور سینے تک پہنچی تو مولانا نے اپنے کندھے پر رکھوانی چاہی۔ میں نے عرض کیا کہ بھاری ہے، مجھے اٹھانے دیجیے۔ فرمایا: مصلحت یہی ہے کہ میرے کندھے پر رکھو۔ اس حکم کی تعمیل کر دی گئی۔ بوجھ کی زیادتی سے مولانا کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ آس پاس کے لوگوں نے دیکھا تو بھاگے آئے اور زنبورک سنبھال لی۔ مولانا نے فرمایا کہ تین کوس کا فاصلہ طے کرنا ہے، باری باری اٹھاؤ۔

منشی مہتاب رائے کی حق گوئی

ہری سنگھ کے مشیروں میں ایک صاحب منشی مہتاب رائے، بڑے مہذب، وضع دار اور خوش اخلاق آدمی تھے۔ زمانہ قیام امب میں معلوم ہوا کہ ایک روز کسی نے ہری سنگھ کی مجلس میں سید صاحب کا نام بے تمیزی سے لیا۔ یہ سنتے ہی منشی مہتاب رائے نے ہری سنگھ سے کہا: "اب آپ کی مجلس شرفا کے قابل نہیں رہی۔ اس میں رذیل گھس آئے ہیں، جو شرفا کا نام کمینگی سے لیتے ہیں۔ اگر ایسی باتیں ہوتی رہیں تو میں نوکری چھوڑ دوں گا اور سید صاحب کے پاس چلا جاؤں گا، جو میرے ہم وطن ہیں"۔[1]

ہری سنگھ معاً متنبہ ہوا اور منشی مہتاب رائے کو سراہتے ہوئے بولا: لڑنا بھڑنا سپاہیوں کا کام ہے، لیکن فحش و دشنام پاجیوں اور رذیلوں کا شیوہ ہے۔ یاد رکھو ہماری مجلس میں آیندہ کوئی شخص خلیفہ صاحب کا نام بے تمیزی سے نہ لے۔

ہری سنگھ ایک مرتبہ سکندر پور سے تنول کے دورے پہ نکلا۔ پانچ ہزار آدمی ساتھ تھے۔ قادر آباد میں ٹھہرا۔ پھر ہزار بارہ سو آدمیوں کو ساتھ لے کر پلیاں کے عقب سے دربند گیا۔ چھتر بائی پر کچھ گولے بھی پھینکے۔ واپس ہوا تو میرزا حسین بیگ نے اس کے سواروں پر تاک کر گولے مارے۔ پہلے گولے سے ایک سوار اڑ گیا۔ دوسرے گولے سے ہری سنگھ کا چتر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ پھر سارے سکھ پراگندہ ہو گئے۔

کاروبار جہاد اور ملا و سادات

سید عبدالرؤف ساکن بابڑہ (ضلع ہشت نگر) نے ایک روز سید صاحب سے شکایت کی کہ میں گھر چلا گیا تھا، واپس آیا تو مولانا نے مجھ پر سخت عتاب فرمایا۔ مولانا بھی اس وقت موجود تھے۔ وہ بولے: دنیاداروں کے نوکر کبھی افسر سے اجازت لیے بغیر ادھر ادھر نہیں ہوتے، یہ کیوں بے اجازت چلے گئے؟

پھر حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا:

تجویز عہدہ کہ فلاں کس قابل فلاں کار است	عہدے کی تجویز کرنا یعنی یہ کہ فلاں شخص فلاں کام
ایں امر امام را می سزد۔ اما کسانیکہ ہمراہ ما خواہند	کے لائق ہے، یہ امام ہی کو زیبا ہے۔ لیکن جو لوگ
بود، ما در گرفتن کار و بار جہاد، مولوی باشد خواہ	میرے ساتھ ہوں گے مولوی ہوں یا ملا، میں
ملا، رعایت نخواہیم کرد، زیراکہ تمام کاروبار	ان سے کام لینے میں رعایت نہ کروں گا۔

---

[1] منظورہ کے الفاظ یہ ہیں: مجلس سرکار شما مجلس شرفا نیست۔ مردم اراذل در حضور مجلس مے آیند و نام رؤسا و شرفا بہ بے تمیزی بر زبان مے آرند و سفلگی خود اظہار می نمایند۔ اگر کسے خاک بر آفتاب مے اندازد روئے خود را آلودہ مے سازد (۷۶۰)

لشکر اسلام عبادت است و در کار عبادت ملّا و سادات را مسابقت تمام مے باید۔ پس شکایت من از ایشاں عبث محض، قابلِ شکایت خود شاں اند کہ بے اجازت امیر بخانہ خود رفتند۔	لشکر اسلام کا سارا کاروبار عبادت ہے اور عبادت میں ملاؤں اور سیدوں کو سبقت کرنی چاہیے۔ پس میرے بارے میں ان کی شکایت بالکل بے اصل ہے، بلکہ شکایت ان سے ہونی چاہیے کہ امیر کی اجازت کے بغیر گھر چلے گئے۔

ایک دلچسپ مناظرہ

ایک روز سید صاحب نے فرمایا کہ بعض دل دیوانے ہوتے ہیں۔ مجھے بہشت کی بھی خواہش نہیں، محض اللہ کی رضا پر نظر ہے۔ چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے راضی رہے، خواہ بہشت سے جدا رکھے، خواہ بہشتیوں کا خدمت گزار بنائے۔ میرا دل تو رضا سے وابستہ ہے۔

مولانا نے یہ سُن کر کہا کہ یہ بڑا اونچا مرتبہ ہے لیکن بہشت سے بے پروائی کا ذکر زبان پر نہ لائیں، اس لیے کہ بہشت سے مراد حق اور دوزخ سے مراد باطل ہے۔ پس مومن کے لیے حق سے بے پروائی مناسب نہیں۔

سید صاحب: میاں صاحب! جب خدا راضی ہوگا تو بندے کو خود بہشت میں بھیجے گا۔ اصل بہرحال اس کی رضا ہے۔ بہشت محض رضا کی ایک شاخ ہے۔

مولانا: ایسا نہیں، بلکہ بہشت کی بہترین شاخوں میں سے رضا ایک شاخ ہے۔

مولوی عبدالوہاب قاسم نگری نے معاً یہ آیت پڑھی:

وعد اللہ المومنین والمومنات جنّٰت تجری من تحتها الانهار خالدین فیها ومساکن طیبة فی جنّٰت عدن ورضوان من اللہ اکبر ذالک هو الفوز العظیم۔ (سورہ توبہ)	مومن مردوں اور عورتوں کے لیے اللہ کی طرف سے (نعیم ابدی کے) باغوں کا وعدہ ہے، جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور ان سب سے بڑھ کر نعمت یہ کہ اللہ کی خوشنودی کا ان پہ نزول ہوگا۔ اور یہ بڑی بھاری کامیابی ہے۔

اور کہا کہ اس سے ظاہر ہوا، رضا دوسری چیز ہے، جس کا ایک ثمرہ بہشت بھی ہے۔

مولانا: چونکہ بہشت کی بہترین شاخ رضا ہے، اس لیے اسے شرف و برتری کے باعث الگ بیان گیا۔

سید صاحب: میں تو نہ تکلیف کا خواہاں ہوں، نہ راحت کا۔ دل سراسر رضا کے خیال سے لبریز ہے۔

تفسیر صبر

مولانا نے ایک روز صبر کی تفسیر کرتے ہوئے کہا کہ اس کی دو قسمیں ہیں: بدنی اور نفسانی۔ بدنی کی پھر دو قسمیں ہیں: ایک فعلی دوسری انفعالی۔ فعلی یہ ہے کہ انسان اعمال شاقہ

بہ طیب خاطر ادا کرے۔ انفعالی یہ کہ اگر اس پر شدائد و مصائب آئیں تو ثابت قدم رہے۔

نفسانی کے بہت سے پہلو ہیں مثلاً:

۱۔ اگر انسان بطون و فروج کی شہوتوں سے محفوظ رہے تو اسے عفت کہتے ہیں۔

۲۔ اگر طلب فضول سے پرہیز کرے تو اس کا نام زہد و قناعت ہے۔

۳۔ اگر مصیبت کے وقت جزع فزع سے پرہیز کرے تو یہ معروف صبر ہوگا۔

۴۔ اگر حالت جنگ میں فرار سے باز رہے تو اسے شجاعت کہا جائے گا۔ یہ بھی صبر نفسانی ہی کا ایک پہلو ہے۔

۵۔ اگر غضب کی حالت میں انسان دوسرے کو مارنے یا بُرا بھلا کہنے سے باز رہے تو یہ حلم ہوگا۔

۶۔ کسی مہم کے سرانجام میں تحیّر و اضطراب سے محفوظ رہنے کو وسعت حوصلہ قرار دیں گے۔

۷۔ اظہار اسرار میں ضبط و صبر کو رازداری سے تعبیر کریں گے۔

اس طرح ثابت کر دیا کہ انسان کے اکثر محاسن و فضائل دراصل صبر ہی کے مختلف شیون و مظاہر ہیں۔

شیخ داراب کا واقعہ

مولوی سید جعفر علی لکھتے ہیں کہ میں ایک روز سید صاحب کے پاس بالاخانے میں تھا۔ شیخ داراب میری تلاش میں نکلے۔ مغرب کے بعد ذرا اندھیرا ہو چکا تھا۔ انھیں معلوم نہ تھا کہ راستے میں ایک کوٹھڑی کی چھت ٹوٹی ہوئی ہے وہ سیدھے آئے اور نیچے گر گئے۔ سید صاحب نے گرنے کی آواز سُنی تو عجلت سے باہر تشریف لائے اور پوچھا: "بھائی! کون ہے؟" شیخ نے آواز دی کہ داراب ہوں اور فلاں افسر کے ہمراہیوں میں سے ہوں۔ پھر پوچھا: "بھائی! چوٹ تو نہیں لگی؟" داراب نے عرض کیا کہ آپ کی دعا سے محفوظ رہا۔

حُروف مقطّعات اور مسئلۂ عُشر

قابل اخوند زادہ نے ایک روز مولانا شاہ اسماعیل سے حروف مقطعات کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے فوراً یہ آیت تلاوت فرمادی:

فامّا الّذین فی قلوبھم زیغ یتّبعون
ما تشابہ منہ ابتغآء الفتنۃ وابتغاء
تاویلہ وما یعلم تاویلہٗ الّا اللہ

(سورہ آل عمران)

پس جن کے دلوں میں کجی ہے وہ (محکم آیتوں کو چھوڑ کر) متشابہ ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں، اس غرض سے کہ فتنہ پیدا کریں اور ان کی تاویل معلوم کر لیں، حالانکہ ان کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

مسئلۂ عفو حقوق حسن زئی ایک موقع پر آئے اور سید صاحب سے عفو عُشر کی درخواست کی۔ آپ نے غالباً بغرض تالیف قلوب یہ درخواست قبول فرمائی۔ لوگوں میں اس کا چرچا ہُوا تو مولانا نے روسائے قوم کو طلب کر کے فرمایا :

> عُشر مثل زکوٰۃ و خُمس منجملہ حقوق است و امام
> را در معاف نمودن آں اختیار نیست بلکہ اگر
> خود امام زراعت کند عُشر از غلہ او در بیت المال
> رسانیدن واجب شود۔

> عُشر بھی خُمس و زکوٰۃ کی طرح منجملہ حقوق شرعی
> ہے اور امام کو اس کی معافی کا اختیار نہیں،
> بلکہ امام بھی اگر زراعت کرے گا تو لازم ہوگا
> کہ غلّے کا عُشر بیت المال میں پہنچائے۔

جب ان پر ثابت ہو گیا کہ یہ شرعی امر ہے اور معاف نہیں ہو سکتا تو انھوں نے قبول کر لیا۔

اکیسواں باب

سکھوں کا پیغام مصالحت

پیغام مصالحت رنجیت سنگھ کو ابتدا میں خیال ہوگا کہ سید صاحب بھی ویسے ہی جاہ طلب آدمی ہیں، جیسے مغلوں کے زوال پر ہندوستان میں جا بجا پیدا ہو گئے تھے اور ان میں سے بعض نے ریاستیں بھی قائم کر لی تھیں۔ خود رنجیت سنگھ بھی انھیں میں سے تھا۔ اس وجہ سے اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ دو چار شکستوں کے بعد وہ دل برداشتہ ہو کر واپس چلے جائیں گے؛ لیکن جب اس نے دیکھا کہ سید صاحب جس طرف جاتے ہیں، فضا کو جلد از جلد ساز گار بنا کر زبردست جنگی محاذ پیدا کر لیتے ہیں، نیز اسے غازیوں کی بے غرضی، شان ایثار اور راہ حق میں بے مثال شجاعت کا صحیح اندازہ ہو گیا تو اس نے صلح کے ذریعے سے سید صاحب کو رام کرنا چاہا۔ چنانچہ ایک فوج، کنور شیر سنگھ، ونتورا اور ایلارڈ کے زیر سرکردگی علاقہ سرحد میں بھیج دی۔ فوج کے ساتھ ہی ایک سفارت بھی سید صاحب کی خدمت میں امب پہنچی، جو وزیر سنگھ اور فقیر عزیز الدین پر مشتمل تھی[1]۔ سفیر یہ پیغام لائے کہ مہاراجہ ماورائے دریائے سندھ کا پورا علاقہ حوالے کرنے کے لیے تیار ہے، بہ شرطیکہ اس پر قناعت کی جائے اور دریا کے مشرقی و جنوبی کناروں کے علاقوں پر حملے ترک کر دیے جائیں۔ رنجیت سنگھ نے یہ بھی کہلا بھیجا کہ خلیفہ صاحب فقیر ہیں، میں امیر ہوں۔ امیروں کا فرض ہے کہ فقیروں کی خدمت کریں۔ فقیروں کا کام دعا گوئی ہے۔ اگر خلیفہ صاحب زیادہ قصد کریں گے تو حریص اور دنیا دار سمجھے جائیں گے، نیز یہ امر لڑائی کا موجب بنا رہے گا، جس میں فریقین کا نقصان یقینی ہے۔

وکیل بھیجنے کا فیصلہ سید صاحب نے سفیروں کی مدارات میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ ہونے دیا۔

---

[1] روایتوں میں ہے کہ وزیر سنگھ، رنجیت سنگھ کے اقربا میں سے تھا۔ مجھے اس کی کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔ فقیر عزیز الدین، حضرت عبداللہ المومن انصاری کے اخلاف میں سے تھے۔ اسی بزرگ کی اولاد میں میرے عزیز دوست حکیم احمد شجاع ہیں، جو علم و فضل میں شہرت عام کے باعث تعارف کے محتاج نہیں۔ فقیر عزیز الدین، رنجیت سنگھ کے طبیب خاص، مشیر معتمد اور کفیل امور خارجہ تھے۔ ان کی گفتگو بڑی دلکش ہوتی تھی۔ ان کے دو حقیقی بھائی، فقیر نور الدین اور فقیر امام الدین بھی سکھوں کے عہد میں بلند عہدوں پر فائز تھے۔ فقیر عزیز الدین کے دو صاحبزادے تھے: شہاب الدین اور چراغ الدین۔

ان کے ساتھ گفتگو کی کوئی تفصیل بیان نہیں ہوئی۔ قرائن یہ ہیں کہ سید صاحب نے اپنے مقاصد تفصیل سے بیان فرما دیے ہوں گے۔ پھر فیصلہ ہوا کہ آپ اپنے وکیل کنور شیر سنگھ، ونتورا اور ایلارڈ کے پاس گفتگو کے لیے سمہ بھیج دیں۔ اس کی ضرورت غالباً یوں پیش آئی کہ سفیر چاہتے تھے، سید صاحب کا نقطۂ نگاہ کنور اور بڑے سالاروں کے ذریعے سے بھی رنجیت سنگھ تک پہنچ جائے۔

سید صاحب نے سفیروں کو عزت کے ساتھ رخصت کیا۔ روایتوں میں ہے کہ وزیر سنگھ سید صاحب کے پاکیزہ اوضاع و اطوار اور پاکیزہ افکار دیکھ سن کر مسلمان ہو گیا۔ مصلحتہً اس نے اپنا اسلام مخفی رکھا۔ ہر نازک موقع پر وہ سید صاحب کو خیر خواہانہ ضروری خبریں بھیجتا رہا۔ اکادکا آنے والے غازیوں کی بھی امداد کرتا رہا۔

سید صاحب نے اپنی طرف سے مولوی خیرالدین شیرکوٹی[1] اور حاجی بہادر شاہ خاں کو وکیل بنا کر پنجتار بھیج دیا تاکہ وہاں سے سمہ جا کر شیر سنگھ، ونتورا اور ایلارڈ سے ملاقات کریں۔ خرچ راہ کے لیے انھیں دس روپے بیت المال سے دیے گئے۔ آپ نے بڑی بڑی سفارتوں کے حالات پڑھے اور سنے ہوں گے ان کے مقابلے میں سید صاحب جیسے درویش باصفا کی سفارت بہ ظاہر آپ کی نظروں میں کیا بچے گی، جس کے خرچ کے لیے کل دس روپے کافی سمجھے گئے؟ تاہم ان درویش سفیروں کی شان ادائے فرائض سب سے ممتاز نظر آئے گی۔

ملاقات

مولوی خیرالدین اور حاجی بہادر شاہ خاں نے پنجتار سے سلیم خاں پہنچ کر اپنی آمد کی اطلاع سکھ لشکر میں بھیج دی۔ وہاں سے پانچ سوار پیشوائی اور رہنمائی کے لیے آئے۔ لشکر میں پہنچے تو ان کے لیے جو قیام گاہ تجویز ہو چکی تھی، وہاں اُترے۔ چاول، آٹا، گھی، بکرا اور بیس روپے بہ طور دعوت ان کی خدمت میں پیش کیے گئے۔ دوسرے روز وزیر سنگھ انھیں ونتورا اور ایلارڈ کے پاس لے چلنے کی غرض سے آیا۔ ونتورا نے کہہ دیا تھا کہ سفیر چاہیں تو ہتھیاروں سمیت آئیں۔ اس ملاقات میں ایلارڈ کے علاوہ وزیر سنگھ اور فقیر عزیزالدین بھی ونتورا کے پاس موجود تھے۔ ایک اخبار نویس اس غرض سے بلا لیا گیا کہ گفتگو کی تفصیل لکھتا جائے۔ ونتورا بے تکلف فارسی بولتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے پوچھا کہ آپ دونوں صاحبوں میں سے علوم دین کا زیادہ ماہر کون ہے؟ حاجی بہادر شاہ خاں نے مولوی خیرالدین کی طرف اشارہ کیا۔ ونتورا نے کہا کہ میں کچھ علمی گفتگو بھی

---

[1] منظورہ میں ہے کہ شروع میں سید صاحب کو مولوی شیرکوٹی کا خیال نہ تھا۔ اچانک وہ سامنے آ گئے تو سید صاحب نے فرمایا: مولانا! آپ کا خیال مجھے بالکل نہیں رہا تھا۔ تین روز سے حاجی بہادر شاہ خاں کو ضروری باتیں بتا رہا ہوں اور دل مطمئن نہیں۔ آپ جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔

کرنا چاہتا ہوں۔ مولوی خیرالدین بولے کہ اگر دینی گفتگو منظور ہے تو سخت جواب سے رنجیدہ نہ ہوں۔ ونتورا نے کہا کہ جو مناسب سمجھیں کہیں، لیکن گفتگو عالمانہ ہونی چاہیے۔ میں خود بھی مذہب اسلام کا مطالعہ کر چکا ہوں اور اسلامی تاریخ کی کتابیں بھی دیکھ چکا ہوں[1]

غلط فہمی کا ازالہ

اس کے بعد یوں گفتگو ہوئی:

ونتورا: ہمارا ڈیرہ جب حضرو میں تھا تو ایک فقیر صورت آدمی ہمارے پاس آیا تھا۔ کہتا تھا کہ میں خلیفہ صاحب کا آدمی ہوں۔ اس نے تجویز پیش کی تھی کہ اگر مہاراجا رنجیت سنگھ علاقہ یوسف زئی کی مالگزاری خلیفہ صاحب کی معرفت وصول کر لیا کریں تو فوج کشی کی ضرورت نہ ہے اور ملک تاخت وتاراج کا ہدف نہ بنے۔ یہ تجویز مجھے پسند آئی، اس لیے کہ اس میں فریقین کی بھلائی ہے۔ کیا یہ درست ہے؟

مولوی خیرالدین: یہ بالکل غلط ہے۔ معلوم نہیں وہ کون شخص تھا۔ اس نے افسوس ناک سخن سازی سے کام لیا۔ ہمارے حضرت کو کفار کا فرمانبردار بننے اور انھیں مالیہ دینے سے کیا واسطہ؟ وہ ملک وجاگیر کے لیے اس دور دست سرزمین میں نہیں آئے۔

ارکان اسلام

ونتورا: اگر ملک وجاگیر کی طمع نہیں تو بے سروسامانی کے باوجود اس فرمانروا سے جنگ کا قصد کیوں رکھتے ہیں، جو خزائن وممالک کا مالک ہے اور جس کے جھنڈے تلے بہت بڑا لشکر جمع ہے؟

مولوی صاحب: آپ نے سنا ہوگا کہ امیرالمومنین ہندوستان میں بڑی عزت ووجاہت کے مالک ہیں۔ لاکھوں آدمی ان کے مرید ہیں۔ وہاں امیروں کی طرح عیش وآرام کی زندگی میسر تھی۔ اسے چھوڑ کر پہاڑوں میں سرگردانی کی ضرورت نہ تھی۔ انھیں ہر قسم کی راحت حاصل تھی۔ حکام ان کی توقیر کرتے تھے۔ اس زندگی سے کنارہ کش ہو کر اس کوہستان کے اندر رات دن محنت ومشقت برداشت کرنا اور بے سروسامانی کے باوجود ایک قوی اور صاحب ملک وفوج دشمن کے مقابلے کا ارادہ رکھنا کسی بھی عقلمند کے نزدیک بے سبب نہیں ہو سکتا۔ غور سے سنیے۔ سبب یہ ہے کہ اسلام کے پانچ ارکان ہیں، جنھیں بجا لانے کی اشد تاکید ہے۔ اوّل نماز جو ہر مسلمان پر فرض ہے، خواہ وہ غنی ہو یا فقیر۔ یہی حالت روزے کی ہے۔ زکوٰۃ صرف دولت مندوں کے لیے ہے۔ جب ان کے مال پر ایک سال گزر جائے

---

[1] روایتوں میں ہے کہ ونتورا ذرا جوان تھا اور ایلارڈ قدرے معمر۔ دوران ملاقات میں ایلارڈ زیادہ تر خاموش رہا۔

تو اس کا چالیسواں حصہ خدا کی راہ میں دے دینا چاہیے۔ حج ان تینوں سے زیادہ مشکل ہے۔ اگرچہ یہ عبادت صاحب استطاعت کو عمر بھر میں ایک مرتبہ ادا کرنی پڑتی ہے، لیکن اس میں سمندر کے سفر کی تکلیفیں ہیں۔ جان کے لیے خطرات و مہالک ہیں۔ گھر بار سے جدا ہونا پڑتا ہے۔ دوسرے شدائد بھی لگے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے اکثر مالدار بھی اس رکن کی بجا آوری میں سستی کرتے ہیں۔ لیکن آپ نے سنا ہوگا کہ ہمارے حضرت نے بے سروسامانی کے باوجود سیکڑوں آدمیوں کے ساتھ حج کیا اور ہزاروں روپے خرچ کیے۔ کسی مالدار میں بھی آج ایسی ہمت نہیں۔

ونتورا: بے شک موجودہ زمانے میں اس طرح کسی نے حج نہیں کیا۔

جہاد فی سبیل اللہ

مولوی صاحب: جہاد حج سے بھی مشکل تر عبادت ہے۔ یہ عبادت محض مال کی کثرت کے بل پر بھی ادا نہیں ہو سکتی۔ ہاں اللہ کی توفیق شامل حال ہو تو سب کچھ ممکن ہے۔ مشکلات کی وجہ سے عبادت جہاد کا ثواب بھی سب سے زیادہ ہے۔ اس لیے کہ اس عبادت میں جان و مال و عیال سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ جہاد محض ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر فرض نہ تھا بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام وغیرہ پر بھی فرض تھا۔ یہ حقیقت آپ پر تاریخ کے مطالعے سے واضح ہوگی۔

ونتورا: بے شک۔

مولوی صاحب: ہمارے حضرت خدا کی عنایت سے بارگاہ الٰہی کے مقبول، صاحب ارادہ اور صاحب عزم ہیں۔ چاہتے ہیں کہ یہ عبادت بھی ادا فرمائیں۔ اس کی دو شرطیں ہیں: اوّل وجود امام جسے عرف میں سردار کہا جاتا ہے، دوم جائے امن۔ ہندوستان میں جائے امن نہ تھی۔ سنا جاتا تھا کہ قوم یوسف زئی کو سکھوں سے جہاد درپیش ہے اور ان کے پاس سردار نہیں، لہٰذا ہمارے حضرت چھ سو آدمیوں کے ساتھ یہاں تشریف لے آئے۔ یہاں کے مسلمانوں کو ترغیب و تحریص سے اس کار خیر پر آمادہ کیا۔ حضرت کے دست مبارک پر بیعت امامت ہوئی۔ اسی دن سے سب آپ کو امام، امیر المومنین یا خلیفہ کہنے لگے۔

یہ بھی سمجھ لیجیے کہ جہاد کا مطلب جنگ اور ملک گیری نہیں۔ اس لفظ کے معنی ہیں اپنی طاقت و قوت کے مطابق اعلاء کلمۃ اللہ میں سعی و کوشش۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ امام کا سامان اعدا کے برابر ہو۔ ہاں، یہ ضروری ہے کہ دین کی ترقی میں انتہائی سعی کی جائے۔ اس سلسلے میں اگر جنگ بھی پیش آ جائے اور مصلحت کا اقتضا یہی ہو تو حرب و ضرب میں بھی توقف نہ کیا جائے، لیکن اصل مطلب محض ترقی دین

ہے ۔ فتوحات اس کا محض ثمرہ ہیں ۔ سب سے بڑی فتح یہی ہے کہ انسان زندگی بھر مجاہد فی سبیل اللہ بنا رہے ۔ غازیوں کے درجے قرآن مجید میں واضح کر دیے گئے ہیں ۔ اگر وہ شہید ہو جائیں تو اس رتبے پر پہنچ جاتے ہیں کہ رسالت کے بعد اس سے بڑا رتبہ کوئی نہیں ۔ اگر فتح پائیں اور ملک ہاتھ آئے تو نورٌ علیٰ نور ۔

سامان اور بے سامانی

ونتورا : بے شک آپ کے مذہب میں جہاد اور شہادت کا مرتبہ بہت اونچا ہے ۔

مولوی صاحب : یہ عجیب بات ہے ۔ ابھی آپ مان چکے ہیں کہ دوسرے پیغمبروں نے بھی جہاد کیا ۔ پھر "آپ کے مذہب" کی قید کا کیا مطلب ؟ کہنا چاہیے کہ اس عبادت کا درجہ سب پیغمبروں کے نزدیک بہت اونچا ہے ۔

ونتورا : میں مانتا ہوں لیکن یہ بات خلاف عقل ہے کہ ایک ایسا آدمی یہ ارادہ کرے ، جس کے پاس نہ فوج ہے ، نہ توپیں ہیں ، نہ مال و متاع ہے ، نہ ملک ہے ۔

مولوی صاحب : اہل دنیا کو فوجوں ، توپوں اور خزانوں پر اعتماد ہے ۔ ہمارا بھروسا صرف خدائے قادر و توانا کی قدرت و قوت پر ہے ۔ نہ ہمیں فتح کا دعویٰ ہے اور نہ شکست کا غم ۔ یہ دونوں چیزیں خدائے قادر کے ہاتھ میں ہیں ۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ کم من فئةٍ قليلةٍ غلبت فئة كثيرةٍ باذن الله ، (بسا اوقات چھوٹے گروہوں نے خدا کے حکم سے بڑے گروہوں پر غلبہ پایا) اگر آپ کو اس سے انکار ہے تو تاریخ دانی کا دعویٰ غلط ہے ۔ اس لیے کہ تاریخوں سے ثابت ہے بہت سی جبّار و سرکش قومیں فقیروں اور کمزوروں کے ہاتھ سے پامال ہوئیں ۔ خصوصاً پیغمبروں کو ہر جگہ ایسا ہی معاملہ پیش آیا ۔ ان میں سے کسی کے پاس خزانہ یا توپیں یا فوجیں نہ تھیں ۔ اپنے مسکین و فقیر ہمراہیوں میں سے چھوٹی چھوٹی جماعتیں لے کر اٹھے اور بڑے بڑے جابروں کے سر توڑ ڈالے ۔ نائبوں نے بھی ان کی پیروی میں بڑی بڑی سلطنتوں کو پارہ پارہ کر ڈالا ۔

ایلارڈ : ایسا نہیں ہو سکتا کہ بے سر و سامان اہل سامان پر اور بے سلاح ارباب سلاح پر غالب آجائیں ۔

ونتورا : (ایلارڈ سے) مولوی صاحب سچ فرماتے ہیں کہ بڑے چھوٹوں کے ہاتھ سے بھی تباہ ہوتے رہے ہے ۔

تجویز مصالحت

(پھر ونتورا مولوی صاحب سے مخاطب ہوا) ہم بات کچھ کر رہے تھے بیچ میں اور ذکر چھڑ گیا ۔ ہمیں خلیفہ صاحب سے محبت ہے ، جس کی وجہ سے سرکار خالصہ میں بدنام

ہو گئے ہیں۔ یہ محبت جنگ کے موقع پر کسی کام نہ آسکے گی؟

مولوی صاحب: یہ درست ہے کہ آپ اپنی سرکار میں نمک حرام ٹھہریں گے۔

ونتورا: میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہمارے اور خلیفہ صاحب کے درمیان تحائف و ہدایا کی رسم جاری ہو جائے۔ پہلے میں کوئی چیز بھیجتا ہوں، پھر خلیفہ صاحب بھیجیں تاکہ مجھے واپس جانے کے لیے عذر ہاتھ آجائے۔ بعد میں خلیفہ صاحب یوسف زئیوں کے باب میں جو چاہیں، کریں۔ اس ملک پر خالصہ فوج نہیں آئے گی۔

مولوی صاحب: ہمارے حضرت صاحب کو آپ کی دوستی اور محبت سے کوئی غرض نہیں۔ اگر آپ کو غرض ہے تو پہلے خود سلسلہ جنبانی کریں۔ ہمارے حضرت بڑے عالی حوصلہ اور بلند ہمت بزرگ ہیں، آپ کے تحائف کے معاوضے میں ضرور تحائف بھیجیں گے۔ مگر ان کی سرکار کے تحفے کیا ہیں؟ کسی کو سربند یا کلاہ یا جبہ عنایت فرما دیا۔ حضرت کے پاس عمدہ ہتھیار بھی ہیں۔ ممکن ہے کوئی ہتھیار بھیج دیں۔

ونتورا: ہمیں سربند و کلاہ و سلاح کی حاجت نہیں، ہاں گھوڑا مرحمت فرمائیں تو بات بھی ہے۔

مولوی صاحب: میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ گھوڑا ہم کبھی نہ دیں گے[1]

ونتورا: اپنی طرف سے انکار نہ کیجیے، خلیفہ صاحب کو لکھیے، وہ بڑے عاقل اور معاملہ فہم ہیں۔ امید ہے اس بات کو خوشی سے مان لیں گے۔

گھوڑا کیا گدھا بھی نہیں دے سکتے

اس موقع پر فقیر عزیز الدین اور حاجی بہادر شاہ خاں نے بھی مولوی خیر الدین سے کہا کہ جرنیل صاحب کی یہ تجویز مان لینے میں مضائقہ نہیں، لیکن مولوی صاحب بولے:

"جو شخص ملک و جاگیر کا طلب گار ہو، اس کے لیے یہ چیز اچھی ہو گی۔ جو اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کی نیت سے نکلا ہے، اس کے لیے یہ بہت بری ہے۔ چنانچہ جو شخص نماز، روزہ یا دوسرے نیک کام محض خلق خدا میں بزرگی حاصل کرنے کی غرض سے کرتا ہے، وہ کام اس شخص کے لیے عذاب و خسران کا باعث بن جاتے ہیں۔ اسی طرح جہاد بھی فساد نیت سے باعث وبال

---

[1] سکھوں کا عام دستور تھا کہ اہل سرحد سے گھوڑے، باز اور شکاری کتے خراج میں لیتے تھے اور گھوڑا دے دینے کو نشان اطاعت سمجھا جاتا تھا۔ ونتورا بہ لطائف الحیل گھوڑا لے کر سید صاحب کو دربار لاہور کا مطیع ثابت کرنا چاہتا تھا۔ مولوی صاحب پر یہ حقیقت آشکارا تھی، اس لیے بہ شد و مد انکار کیا۔ باڑے کے چاول بہت مشہور تھے۔ سکھ یہ چاول بھی کثیر مقدار میں درانی سرداروں سے سال بہ سال وصول کرتے تھے۔

ہو جاتا ہے کہ ہم نے انھیں امام بنایا ہے اور امام کے بغیر جہاد ہو نہیں سکتا، لیکن جو شے ثواب جہاد میں افساد کا باعث ہے، اس سے انکار میں ہم اور حضرت برابر ہیں۔

دنتورا نے دو تین مرتبہ اصرار کیا، مولوی صاحب بولے کہ اصرار بے سود ہے، ہم آپ کو گھوڑا کیا گدھا بھی نہیں دے سکتے۔ آپ سے خراج و جزیہ لینے کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں، آپ کو کس طرح دیں؟

ختم ملاقات

دنتورا: اچھا اگر خلیفہ صاحب باوجود بے سروسامانی مہاراجہ جیسے صاحب لشکر و جاہ و حشمت کے مقابلے میں کامیاب ہو جائیں گے تو ہم ان کی اطاعت قبول کرلیں گے۔

مولوی صاحب: میں حضرت کا حال آپ سے کیا کہوں؟ آپ نے انھیں دیکھا نہیں۔ اگر ایک دفعہ مل لیں تو یقین ہے کہ ان کی باتیں سن کر آمنا و صدقنا کے سوا کچھ آپ کی زبان پر نہ آئے گا۔

دنتورا: اچھا! اگر آپ یہ تجویز لکھ کر خلیفہ صاحب کے پاس نہیں بھیج سکتے تو زبانی بات کرلیں۔

مولوی صاحب: اطمینان رکھیے، ایک ایک بات حضرت کی خدمت میں پہنچے گی۔

دنتورا: جو جواب دیں ہمیں حضرو کے مقام پر پہنچا دیا جائے۔

مولوی صاحب: جواب بھیجنا میرے اختیار میں نہیں، یہ حضرت کے اختیار میں ہے۔

دنتورا: جو کچھ آپ نے ہمارے سامنے بیان کیا ہے، کیا آپ ہمارے کنور صاحب (شیر سنگھ) کے سامنے بھی بیان فرمائیں گے؟

مولوی صاحب: انشاء اللہ تعالیٰ مع شیِ زائد۔

قصد حملہ اور مراجعت

مولوی صاحب پنجتار ہوتے ہوئے امب پہنچے اور مفصل گفتگو سید صاحب کو سنائی۔ جب اس بات پر پہنچے کہ ہم گھوڑا کیا گدھا بھی نہیں دیں گے تو سید صاحب نے خوش ہو کر فرمایا: اسی غرض سے میں نے آپ کو بھیجا تھا۔ دوسرے شخص سے ایسی صاف گوئی ممکن نہ تھی۔ سید صاحب نے جواب بھیجنے کے متعلق مشورہ طلب فرمایا تو مولوی صاحب نے کہا کہ فضول باتوں کے جواب کی ضرورت نہیں۔ اسی وجہ سے میں نے جواب بھیجنے کا اقرار نہیں کیا تھا۔

اب صرف دو سوال رہ گئے۔ اوّل یہ کہ گفتگو کب ہوئی؟ میرا اندازہ ہے کہ یہ مئی ۱۸۳۰ء میں ہوئی۔ دوم یہ کہ دنتورا جب پہلے مولوی خیرالدین سے مل چکا تھا تو گفتگو میں سابقہ معرفت کا حوالہ کیوں نہ دیا؟ میرا خیال ہے کہ یہ فروگزاشت راوی سے ہوئی جس نے صرف خاص مطالب کا بیان کافی سمجھا۔

بائیسواں باب

سمہ میں انتظامِ عُشر

قاضی سید محمد حبان کی تجویز

پائندہ خاں سے مصالحت کی صورت پیدا ہو گئی تو قاضی سید محمد حبان نے یہ تجویز پیش کی کہ علاقہ سمہ میں سرکشی کے آثار نمودار ہیں۔ جن لوگوں نے خود بخود ادائے عُشر کا اقرار کیا تھا وہ بھی بے پروا ہو رہے ہیں۔ اگر آپ کچھ لشکر میرے ہمراہ کر دیں تو میں وعظ و نصیحت سے سارے اہل سمہ کو حلقہ بگوش بنا دوں۔ جو نہ مانیں انھیں بزور راضی کر دوں، لیکن شرط یہ ہے کہ مجھے اس لشکر کا امیر بنا کر پورے اختیارات دے دیے جائیں، اس لیے کہ میں مقامی آدمی ہوں۔ اور اپنے اہل وطن کی طبیعت و مزاج کو خوب جانتا ہوں۔ ایسا آدمی یہاں اور کوئی نہیں۔ مولانا شاہ اسماعیل کو میرے ساتھ کر دیں تاکہ اگر مجھ سے نادانستہ کوئی فعل خدا و رسولؐ کی رضا کے خلاف سرزد ہونے لگے تو مولانا روک دیں۔

قاضی صاحب کی روانگی

سید صاحب کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔ پکھلی کی سمت پیش قدمی رُک گئی تھی اور معلوم نہ تھا کہ کب تک حالات سازگار ہوں۔ اس اثنا میں سمہ کے اندر نظام شریعت کو مستحکم بنا لینا بہت ضروری تھا۔ چنانچہ آپ نے تین سو سوار اور اڑھائی سو پیادے قاضی صاحب کے ساتھ کر دیے۱؎ سب کو ہدایت فرما دی کہ قاضی صاحب کے احکام بدل و جان مانیں۔ کچھ ضرب زنبورکیں بھی دے دیں۔ ایک اونٹ پر نقارہ تھا۔ مولانا شاہ اسماعیل کے علاوہ رسالدار عبدالحمید خاں کو قاضی صاحب کے ساتھ کر دیا۔ رخصت کرتے وقت نصیحت فرمائی کہ یہ کام خدا و رسولؐ کا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس میں نفس کی خواہش دخیل ہو جائے۔

قاضی صاحب گندف ہوتے ہُوئے پابنٹی پہنچے۲؎۔ غازی جہاں جہاں ٹھہرے دستور کے مطابق لوگوں نے کھانا بھی کھلایا اور گھوڑوں کے لیے چارے کا انتظام بھی کر دیا۔ چارے کا طریقہ یہ تھا کہ ہر شخص کے ہاں سے

۱؎ منظورہ میں ہے قریب شش صد سوار و پیادہ و نقارہ و شتری و زنبورک ہمراہ کردہ شد۔ ایک روایت میں ہے کہ پائندہ خاں نے بھی کچھ آدمی ساتھ کر دیے تھے۔ ۲؎ ایک روایت ہے کہ گیارہ باڑہ کے راستے گئے۔

باری باری ایک بوجھ کاٹا جاتا۔ ایک کھیت والے نے کہا کہ میری باری ہو چکی ہے۔ کالا باغ کے دو غازی گلشیر خاں اور شہباز زخمی ہوئے۔ رسالدار تک یہ بات پہنچی تو سخت خفا ہوئے بلکہ گلشیر کے کندھے پر اُلٹی تلوار ماری۔ پھر لوگوں نے انھیں روک دیا۔

پنجتار پہنچ کر دیوان شاہ کے باغ میں اُترے۔ دو روز تک فتح خاں نے مہمانداری کی۔ پھر ارد گرد غلّے کے لیے حکم بھیج دیا گیا اور دستور کے مطابق رسد تقسیم ہونے لگی۔

خوانین کا اتفاق

ایک روز قاضی صاحب نے فتح خاں سے کہا کہ سکھوں نے سمہ کا جو علاقہ دبا رکھا ہے، ہماری غرض یہ ہے کہ اسے آزاد کرائیں۔ فتح خاں نے کہا کہ میں تو فرمانبردار اور ہر حال میں شریک کار ہوں، لیکن بہتر یہ ہوگا کہ ان تمام خوانین سے بھی مشورہ کر لیا جائے جو سکھوں کے تصرفات کی وجہ سے اپنے وطن چھوڑ کر باہر بیٹھے ہیں۔ مثلاً زیدہ کے خان فتح خاں اور ارسلا خاں، کھلابٹ کے خان ابراہیم خاں اور اسماعیل خاں، مرغز کے خان سرفراز خاں وغیرہ۔ وہ اگر اس بارے میں متفق ہو جائیں تو اصل مدعا آسانی سے پورا ہو سکے گا۔

ملّاؤں سے گفتگو

چنانچہ تمام مہاجر خوانین کو خط لکھوائے گئے۔ سب نے قاضی صاحب کی تجاویز سے اتفاق کیا۔ پھر انھوں نے اپنی اپنی بستیوں کے ملّاؤں اور عالموں کو بھی بُلا کر بات چیت کی۔ جب سب ایک رائے پر متفق ہو گئے تو فتح خاں نے کہا کہ میں تو اپنی قوم سے قاضی صاحب کو عُشر دلانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ آپ کو بھی چاہیے کہ جب اپنے علاقوں پر قابض ہو جائیں تو باقاعدہ ادائے عُشر کا انتظام کریں۔ یہ تجویز خوانین نے تو بخوشی قبول کر لی، لیکن ملّاؤں میں کچھ قیل و قال شروع ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ عُشر کی رقمیں ملّاؤں کو ملتی تھیں اور نئے انتظام کے رو سے اصل زد براہ راست انھیں پر پڑتی تھی، لہٰذا وہ متذبذب تھے۔

مولانا شاہ اسماعیل اور قاضی حبان نے دوسرے دن ملّاؤں اور عالموں کو جمع کر کے مفصل گفتگو کی مستند کتابوں سے ثابت کیا کہ عُشر صرف امام کا حق ہے۔ ملّاؤں کا دعویٰ اس بارے میں بالکل غلط اور بے دلیل ہے۔ انھیں اس کارِ خیر میں معاون و مددگار ہونا چاہیے، نہ کہ رکاوٹ پیدا کریں۔ وہ بہ ظاہر تو مان گئے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دل سے اس پر راضی نہ تھے۔ یہی نفاق آمیز صورت حال آیندہ چل کر ہولناک واقعات کی صورت اختیار کر گئی۔

جو روایتیں میری نظر سے گزری ہیں، ان میں کہیں اشارہ تک نہیں کیا گیا کہ مولانا شاہ اسماعیل یا قاضی سید حبّان نے ملّاؤں اور عالموں کے گزارے کی کوئی دوسری صورت تجویز کر دی تھی، لیکن مجھے یقین ہے کہ

انھوں نے عُشر وصول کرنے کے بعد بیت المال سے ان کے لیے مشاہروں کا انتظام سوچ لیا ہوگا۔ یہ بات خیال میں نہیں آتی کہ اس گروہ کو صدیوں کے وسائل معاش سے محروم کر کے تسکین و تلافی کے لیے کوئی متبادل ذریعہ تجویز نہ کیا ہو۔ بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ سرحدی ملاؤں اور عالموں کے دلی اختلاف کا اولین سرچشمہ یہی واقعہ بنا۔

یہ مقدمات مکمل ہو گئے تو قاضی صاحب نے علما اور خوانین کو اس نصیحت کے ساتھ رخصت کیا کہ اپنی اپنی بستیوں کے ہر ملک، خان اور عالم کو سکھوں کی اطاعت سے نکال کر غازیوں کے شریک حال ہو جانے کی ترغیب دو۔ اگر وہ مان جائیں تو خیر ورنہ ہم خود سمجھائیں گے۔

دورہ شروع ہوگیا

اسی طرح تھوڑی سی مدت میں پیش نظر مقاصد کی اشاعت کا کاروبار بہ ظاہر وسیع پیمانے پر جاری ہوگیا اور کم سے کم وقت میں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ خود قاضی صاحب کو تفہیم و تذکیر کے لیے کہاں کہاں جانا پڑے گا۔

علما و خوانین نے اپنے حلقوں میں کیا کیا؟ یہ معلوم نہیں۔ لیکن تیسرے چوتھے روز ملاّ صاحب کوٹھا کا ایک خط قاضی صاحب کو ملا، جس کا مفاد یہ تھا کہ اگر آپ سمجھتے ہیں یہاں کے لوگ محض وعظ و نصیحت سے سیدھے رستے پر آجائیں گے اور صلح و مدارا سے احکام خدا و رسولؐ کے روبرو جھک جائیں گے، تو یہ دشوار ہے۔ ان کا علاج صرف یہ ہے کہ زور و قوت سے انھیں مغلوب کیا جائے۔ یہ اطلاع بھی دے دی کہ کھلابٹ کے لوگ آپ کے مقابلے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

قاضی صاحب نے یہ خط خوانین کو سنایا۔ پھر خود تجویز پیش کی کہ ہمیں فوراً کھلابٹ پہنچ جانا چاہیے اور مخالفوں کو فراہمی قوت کی مہلت نہ دینی چاہیے۔ چنانچہ قاضی صاحب تیسرے روز کھلابٹ کی طرف روانہ ہو گئے جو پنجتار سے قریباً سات کوس تھا۔ اس وقت تک آپ کے ساتھ ہندوستانی اور ملکی غازی ملا کر ساڑھے نو سو افراد ہوں گے۔ ساڑھے چار سو سوار اور پانسو پیادے۔

ٹوپی سے چار میل تپہ اوتمان نامہ میں اطلاع ملی کہ دو تین ملاّ مخالفت میں کام کر رہے ہیں۔ ایک ٹوپی کے آس پاس کا باشندہ تھا، دوسرا شیخ جانا کا اور تیسرا اکلٹی کا۔ قاضی صاحب انھیں سمجھا کر راہ راست پر لائے۔ بُری رسمیں بند کرا دیں۔ روپے لے کر نکاح کرنے کا سلسلہ ختم کر دیا اور باہمی عداوتیں مٹا دیں۔

کھلابٹ سے ایک کوس پر نماز ظہر ادا کی۔ جب بستی پاؤ کوس پر رہ گئی تو قاضی صاحب نے حکم دے دیا کہ سب ٹھہر جائیں۔ پھر رسالدار عبدالحمید خاں سے کہا کہ آپ یہاں تیار کھڑے رہیں، ہم پیادوں کو لے کر آگے بڑھتے ہیں۔ جب ہماری طرف سے بندوق چلے تو فوراً باگیں اٹھا کر بستی کی جنوبی سمت سے حملہ کر دیں۔

قاضی صاحب نے شمالی سمت میں ایک ٹیلے پر زنبورک لگا کر گولہ باری شروع کر دی۔ اس اثنا میں رسالے کے ایک سوار مومن خاں کو پیشاب کی حاجت ہوئی۔ وہ اپنے ساتھیوں سے آگے بڑھا۔ گھوڑے کی باگ پاؤں کے نیچے دبا کر پیشاب کے لیے بیٹھ گیا۔ دفعۃً گھوڑا ابھڑکا اور اس کی باگ پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ وہ گاؤں کی طرف بھاگا۔ رسالدار نے آواز دی کہ لینا جانے نہ پائے۔ دو دو چار چار سوار اس کے تعاقب میں نکلنے لگے۔ قاضی صاحب نے سمجھا کہ سواروں نے ہلہ بول دیا۔ چنانچہ انھوں نے بھی گولہ باری چھوڑ کر حملہ کر دیا۔ اس طرح ایک معمولی سا واقعہ کامیاب یورش کی شکل اختیار کر گیا۔ پیادہ فوج بستی میں داخل ہو گئی۔ سواروں کا مقابلہ صرف دو آدمیوں نے کیا اور دونوں مارے گئے۔ غازیوں میں سے کسی کے چرکہ بھی نہ لگا اور کھلابٹ فتح ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا وہاں مقابلے کے لیے پانچ ہزار آدمی فراہم تھے۔

صلح و اطاعت

کھلابٹ کے اصلی خان ابراہیم خاں اور اسماعیل خاں تھے۔ قاضی صاحب نے ابراہیم خاں کو خانی کی مسند پر بٹھایا۔ چار سوار اس کی حفاظت کے لیے مقرر کیے۔ اسماعیل خاں کو اپنے ساتھ رکھا اور مرغز پہنچے، جو کھلابٹ سے ایک میل پر تھا۔ مرغز کے لوگ مجاہدین کے آنے کی خبر سنتے ہی مطیع ہو گئے۔ وہاں جس غاصب نے خانی پر قبضہ کر رکھا تھا، وہ بھاگ گیا۔ قاضی صاحب نے مرغز کو وہاں کے اصلی خان، سرفراز خاں کے حوالے کر دیا۔ چار سوار اس کی حفاظت کے لیے بھی چھوڑے اور خود ٹھنڈ کوئی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹھنڈ کوئی اور اس کے بعد کدا میں بھی مرغز کی سی صورت پیش آئی یعنی دونوں بستیوں کے لوگوں نے بے چون و چرا فرمانبرداری کا عہد کر لیا۔ مغرب کی نماز قاضی صاحب نے زیدہ اور کدا کے درمیان ایک نالے پر ادا کی اور وہیں مع لشکر ٹھہر گئے۔ اسی جگہ پنج پیر کے خان نے خود آ کر اطاعت کا اقرار کیا۔ اس طرح ایک دن میں کھلابٹ، مرغز، ٹھنڈ کوئی، کدا اور پنج پیر زیر فرمان آ گئے۔

رسالدار کی تجویز

ہنڈ وہاں سے قریباً تین کوس کے فاصلے پر تھا۔ رسالدار عبدالحمید خاں نے قاضی صاحب سے کہا کہ آپ اجازت دیں تو میں اپنے سوار اور چار ضرب زنبورک لے کر ہنڈ چلا جاؤں۔ اگر حالات سازگار دیکھوں گا تو وہیں ٹھہر جاؤں گا۔ صبح کے وقت آپ بھی پیادوں کو لے کر آ جائیں۔ اگر دیکھوں گا کہ ٹھہرنا مناسب نہیں تو چلا آؤں گا۔

مولانا اور قاضی صاحب دونوں نے اس تجویز کو پسند فرمایا۔ چنانچہ رسالدار بے توقف ادھر روانہ ہو گیا۔ جب ہنڈ ایک گولی کے فاصلے پر رہ گیا تو چند گھوڑے زور سے ہنہنائے۔ تھوڑی دیر بعد قلعے کے چاروں برجوں پر اتنی روشنی ہوئی کہ ارد گرد کی ہر شے دور دور تک صاف نظر آنے لگی۔ رسالدار نے سواروں کو وہیں روک دیا۔ پھر آہستہ آہستہ انھیں جنوبی سمت میں تالاب کے کنارے کی اوٹ میں پہنچا دیا۔ وہاں زنبورک لگا کر

قلعے پر چار پانچ گولے پھینکے۔ بعد ازاں سارے سوار قاضی صاحب کے پاس لشکر گاہ میں پہنچ گئے۔

ہنڈ پر قبضہ

صبح صادق نمودار ہوئی، تو دو آدمیوں نے آکر یہ خوشخبری سنائی کہ ہنڈ خالی پڑا ہے۔ آپ قلعے کے انتظام کے لیے وہاں تشریف لے چلیں۔ پھر ایک ملّا آیا اور اس سے ہنڈ کے تخلیے کی تصدیق ہو گئی۔ تخلیے کی تفصیل یہ ہے کہ کھلابٹ، مرغز، ٹھنڈ کوئی، کدا اور پنج پیر کے مطیع ہو جانے کی خبریں ہنڈ پہنچیں تو وہاں جو سکھ فوجی بیٹھے تھے، بہت پریشان ہوئے۔ انھیں یقین ہو گیا کہ اب ساری بستیوں کے مسلمان متحد ہو کر ہنڈ پر چڑھائی کر دیں گے اور بچ نکلنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی چنانچہ انھوں نے آہستہ آہستہ سارا ضروری سامان اٹھا کر دریا کے کنارے پہنچایا، پھر کشتیوں میں بیٹھ کر واپس چلے گئے۔ وہ قریباً سات سو آدمی تھے۔

مجاہدین ہنڈ پہنچے تو وہاں رسد بہ مقدار کثیر جمع تھی۔ مثلاً گیہوں کے تین کوٹھے، آٹے کے دو کوٹھے۔ ان کے علاوہ گھی، گڑ اور میوے کے بہت سے کنستر اور بوریاں تھیں۔

قلعہ ڈھانے کی تجویز

ہنڈ کا قلعہ بہت مستحکم اور جائے وقوع کے لحاظ سے بڑا اہم تھا۔ کہتے ہیں کہ اکبر کے زمانے میں اسے بیربل نے تعمیر کرایا تھا۔ چونکہ یہ دریائے سندھ کے بڑے گھاٹ پر واقع تھا، اس لیے اس کے استحکام کا خاص اہتمام کیا گیا۔ قاضی صاحب نے مولانا شاہ اسماعیل، فتح خاں پنجتاری، فتح خاں اور ارسلا خاں (زیدہ)، اسماعیل خاں (کھلابٹ) اور رسالدار عبدالحمید خاں کے مشورے سے فیصلہ کیا کہ اسے منہدم کر دینا چاہیے۔ اگر یہ باقی رہا تو فسادات کا سرچشمہ بنا رہے گا۔ خادے خاں کے بھائی کبھی خود قلعے میں بیٹھ کر ارد گرد کی بستیوں کو لوٹتے تھے، کبھی سکھوں کو لا کر اس میں بٹھا دیتے تھے۔ چونکہ قلعہ بہت مضبوط تھا اس لیے کسی کو ان پر حملے کا حوصلہ نہ تھا۔ انہدام کا فیصلہ ہوتے ہی مانیری، صوابی، کالا درہ، شاہ منصور، پنج پیر، زیدہ، کدا، ٹھنڈ کوئی، کھلابٹ، مرغز، باجا، بام خیل، منارہ، کنڈوہ وغیرہ دیہات سے کم و بیش پانچ ہزار آدمی بلا لیے گئے۔ وہ پھاوڑے کدال لے کر آئے اور سات روز تک قلعے کو ڈھانے میں لگے رہے۔ جب دیکھا کہ اس کا ڈھانا سخت مشکل ہے تو ارادہ ترک کر دیا[1]۔

---

[1] وقائع میں ہے کہ آٹھ دس روز تک بلاناغہ کھودا گیا، سو کسی طرف کی منڈیر ایک ہاتھ بھر کھدی اور کسی طرف سے ایک بالشت، کھودنے والے تنگ آ گئے اور ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے اس لیے کہ وہ زمیندار تھے، سنگ تراش نہ تھے، ورنہ کچھ تو کھد جاتا۔ لیکن اس کی ہیئت اور رونق بگڑ گئی۔ (صفحہ ۱۳۴۴)۔ منظورہ میں ہے: بہ سعی و زور بسیارے از مردم چیزے نقصان اش نمودہ شد۔ چنانچہ امیر خاں برادر خادے خاں اناں طرف دیوار را خراب و بے رونق دیدہ بسیار گریست۔

توسیع حلقہ اطاعت

اس کے بعد قاضی صاحب نے فتح خاں پنجتاری، اسماعیل خاں کھلابٹ، فتح خاں اور ارسلا خاں زیدہ کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا:

> یہ ملک فضلِ الٰہی اور امیر المومنین کی دُعا سے سکھوں کے قبضے سے چھوٹا۔ مستحق لوگ اپنے حق کو پہنچے اور عُشرِ شرعی سب نے قبول کیا۔ اب خلاصہ تقریر کا یہ ہے کہ فتح خاں اور ارسلا خاں دونوں بھائی زیدہ کو آباد کریں نیز اس قلعے (ہنڈ) کو بخوبی زیرِ نظر رکھیں۔ چونکہ قوم ززڑ اب تک پھری ہوئی معلوم ہوتی ہے اور اسے سیدھا کرنا ضروری ہے، اس لیے ہم غازیوں کو لے کر اس طرف کو جائیں گے۔

قاضی صاحب ہنڈ سے زیدہ گئے۔ دو روز وہاں گزارے۔ پھر شیوہ پہنچ گئے۔ بستی کے باہر مغربی جانب درختوں کا ایک جھنڈ تھا، وہاں ٹھہرے۔ آنند خاں اور مشکار خاں نے معمول کے مطابق لشکر کو کھانا کھلایا اور جانوروں کے لیے دانے چارے کا بندوبست کیا۔ وہیں نوا کلئی اور شیخ جانا کے آدمیوں کو بلایا گیا۔ ان کا جواب آیا کہ فصل کے درو کا موسم ہے۔ ہم بہر صورت فرمانبردار ہیں، لیکن عُشر کی تکلیف سے ہمیں معاف رکھا جائے۔ قاضی صاحب یہ جواب سن کر سخت خفا ہوئے اور بولے جب تک ان پر شریعت کا تازیانہ نہیں پڑے گا، یہ سیدھے نہیں ہوں گے۔ چنانچہ سید صاحب کے پاس قاضی صاحب نے مزید آدمیوں کے لیے درخواست بھیجی تو وہاں سے مولوی مظہر علی ایک سو غازیوں کے ساتھ امداد کے لیے آگئے۔

ایک لطیفہ

ایک لطیفہ بھی سُن لیجیے۔ قاضی سید محمد حبان نے ایک روز وعظ میں فرمایا کہ اہلِ رسوم خدا و رسولؐ کے احکام کے خلاف باپ دادا کی ریت پر چلتے ہیں۔ شریعت کا حکم انھیں سنایا جائے تو نہیں مانتے۔ وہ لوگ عملاً کافر ہیں۔ قاضی صاحب کا ایک شاگرد اس پر پکا ہو گیا، لیکن جب اس نے ایک روز ایک شخص سے یہ بات کہی تو وہ بولا کہ قاضی حبان جھوٹ کہتا ہے۔ یہ بات قاضی صاحب تک پہنچی تو انھوں نے اس شخص کو بلا کر پوچھا کہ کیا واقعی تو نے کہا کہ قاضی حبان نے جھوٹ بولا؟ وہ گھبرا گیا اور کہنے لگا ایسا تو نہیں کہا البتہ میں نے کسی کتاب میں دیکھا ہے کہ اہلِ رسوم کافر نہیں۔ قاضی نے پوچھا کس کتاب میں؟ اس نے جواب دیا: "منیۃ المصلی" میں۔ قاضی صاحب یہ سنتے ہی جوش میں آگئے۔ اسے زمین پر گرا کر گھونسوں سے مارنے لگے کہ نا معقول پڑھتا ہے منیۃ المصلی اور مسئلہ بیان کرتا ہے اہلِ رسوم کا۔ جن کتابوں میں اہلِ رسوم کے مسائل ہیں وہ تو تیرے استادوں نے بھی نہ پڑھی ہوں گی۔ توبہ کر کے کلمہ پڑھے گا تو تجھے چھوڑوں گا۔ چنانچہ کلمہ پڑھوا کر چھوڑا۔

احمد خاں کمال زئی کا انحراف

بہرحال قاضی صاحب نے چند روز میں شیوہ، چار گلئی، سدرہ، گھڑیالی، نوا کلئی، شیخ جانا، اسماعیلہ، امان زئی وغیرہ کے لوگوں کو جمع کر کے وعظ

فرمایا اور کہا کہ آپ بھائیوں نے بہ رضا و رغبت عُشر دینا منظور کیا تھا۔ پھر خود ہی موقوف کر دیا۔ اب بتاؤ کیا مرضی ہے۔ بعض لوگ چاہتے تھے کہ وہیں انکار کر دیں لیکن اکثریت نے کہا کہ ہمیں باہم مشورہ کر لینے دیجیے۔ بعد مشورہ انھوں نے متفقہ فیصلہ قاضی صاحب کے پاس پہنچا دیا کہ ہم نے ادائے عُشر اور اعانت مجاہدین کا جو عہد و پیمان کیا تھا، دل سے اس کے پابند ہیں۔ کاٹ لنگ اور لوند خوڑ کے لوگوں نے بھی سب شرطیں مان لیں۔

ہوتی مردان کے رئیس احمد خاں کو بھی بلایا گیا[1]۔ اس کی طرف سے جواب آیا کہ آٹھویں روز ملاقات کروں گا قاضی صاحب نے سمجھا کہ شاید اسے کوئی ضروری کام ہو گا۔ اس اثنا میں گوجر گڑھی کے ایک غازی اخوند خیرالدین آئے اور بتایا کہ احمد خاں اپنے بھائی رسول خاں کو نائب بنا کر خود درانیوں سے فوجی مدد لینے کے لیے پشاور چلا گیا ہے۔ دو تین روز میں پے در پے اس خبر کی تصدیق ہوتی رہی۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ ان حالات میں مردان کو بہ زور مسخر کر لینے کے سوا چارہ نہیں۔ چنانچہ سب کے مشورے سے مردان پر پیش قدمی کا فیصلہ ہو گیا۔ غازیوں کو حکم دے دیا گیا کہ دو روز کے لیے روغنی روٹیاں پکا کر تیار ہو جائیں۔

ناظموں کا تقرر

مناسبت مضمون کا تقاضا یہ ہے کہ انتظام عُشر کے سلسلے میں جو اصحاب مختلف مقامات کے لیے مقرر ہوئے، ان کی فہرست بھی یہاں درج کر دی جائے، اگرچہ یہ تقررات جنگ مردان کے بعد عمل میں آئے:

ناظم	علاقہ
حاجی بہادر شاہ خاں	تپہ امان زئی (یعنی گڑھی امان زئی اور آس پاس کا علاقہ)
حاجی محمود خاں رام پوری	ضلع سدم

---

[1] مجھے معلوم ہوا کہ احمد خاں کے کئی بھائی تھے اور احمد خاں کو کوئی بھی اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق ہوتی کی سرداری اس کے بھائی محمد خاں کو مل گئی۔ دونوں کے اخلاف کا سرسری نقشہ یہ ہے:

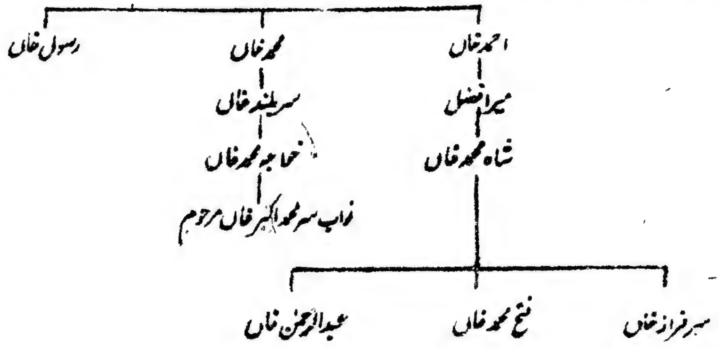

ناظم	علاقہ
مولوی نصیر الدین منگلوری	سمہ اور تمان نامہ (یعنی ٹوپی، مینئی، گندف، باجا، بام خیل، پابنٹی، کھلابٹ، مرغز، دونوں منارے، کدا، کڑیدہ، پنج پیر، شاہ منصور، کنڈوہ، ہنڈ)۔
فتح خاں پنجتاری	خدوخیل

ہر شخص کے ساتھ کچھ غازی مقرر ہو گئے۔ مولوی نصیر الدین کے ساتھ تیس یا چالیس غازی تھے۔ رسالدار کو حکم دے دیا گیا کہ دیہات میں دورہ کرتے رہیں۔ مندرجہ ذیل اصحاب کی مجلس شوریٰ بنا دی گئی:

شیخ عبدالحکیم پھلتی، شیخ ناصر الدین پھلتی، شیخ ضیاء الدین پھلتی، حافظ عبدالرحمٰن پھلتی، شیخ عبدالرحمٰن رائے بریلوی، نورداد خاں (لوہانی پورہ، رائے بریلی)، عبدالحکیم خاں (لوہاری)، ملا عزت قندھاری، ملا نور قندھاری، ملا قطب الدین قندھاری، عبدالغفار قندھاری، ملا لعل محمد قندھاری۔

رسالدار کی حق شناسی

سید صاحب کو اس بات کا خاص خیال تھا کہ عوام کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہو، اس لیے یہ تجویز پیش کی کہ آٹھ آٹھ دس دس سوار مختلف علاقوں میں بکھر جائیں۔ رسالدار کو اس تجویز سے بدیں وجہ اختلاف تھا کہ لشکر بکھر جائے گا تو ضرورت کے وقت اسے یکجا کرنا مشکل ہو گا۔ خود دوروں میں اس درجہ احتیاط کا طریقہ اختیار کیا کہ ہر بستی سے پاؤ کوس باہر ٹھہر جاتے۔ وہیں بعض اکابر کو بلا کر حالات پوچھ لیتے۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو اسی جگہ منگا لیتے۔ سواروں کو بستی میں جانے یا کوئی چیز مانگنے کی سخت ممانعت تھی۔ ایک مرتبہ شیخ لکھمیر نے ڈاکٹی میں کسی سے چھاچھ مانگ لی۔ رسالدار تک یہ بات پہنچی تو بہت ناراض ہوئے۔ خود بستی والوں نے کہا کہ معمولی معاملہ ہے لیکن رسالدار نے شیخ لکھمیر سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارے ساتھ رہنا منظور ہے تو تمام ضابطوں کی پابندی لازم ہوگی۔ پابندی منظور نہیں تو جائیے، امیر المومنین کے پاس چلے جائیے۔

ایک مرتبہ منارہ خورد سے پیغام آیا کہ عُشر کی جنس منگا لیجیے۔ رسالدار نے مستقیم خاں اور سلطان خاں کو بھیج دیا۔ انھوں نے جنس لدوائی۔ ناشتا کر کے چلنے لگے تو کسی سے شکر مانگی، اس نے کہا کہ شکر نہیں گُڑ موجود ہے۔ ابھی لائے دیتا ہوں۔ ان پر نفسانیت غالب آگئی۔ ناراضی کے جوش میں رسالدار کے پاس گاؤں والوں کے خلاف اُلٹی سیدھی باتیں کہیں۔ رسالدار کو سخت غصہ آیا۔ آدمی بھیج کر کیفیت پوچھی۔ حقیقت حال معلوم ہوئی تو حیران رہ گئے۔ مستقیم خاں اور سلطان خاں نے اپنی غلطی کا اقرار کر لیا، بایں ہمہ رسالدار نے ان کے بیس بیس تازیانے لگوائے۔

تئیسواں باب

جنگ مردان

مردان کی جانب پیش قدمی

مردان پر حملے کے لیے تیاری کا حکم دینے کے بعد قاضی سید محمد حبان نے دو ملکی آدمیوں کو صحیح حالات معلوم کرنے کے لیے بھیج دیا۔ وہ خبر لائے کہ ہوتی کی گڑھی میں بیس پچیس اور مردان کی گڑھی میں تیس چالیس آدمی ہوں گے۔ رسول خاں موجود ہے اور احمد خاں پشاور گیا ہوا ہے۔ حملے کا اس سے بہتر موقع کیا ہو سکتا تھا؟ اگر انتظار کیا جاتا تو درانیوں کا لشکر آ جاتا۔

بہرحال غازی حسب الحکم دو روز کے لیے روغنی روٹیاں پکا کر تیار ہو گئے۔ نماز عشا کے بعد قاضی صاحب نے ننگے سر ہو کر کمال گریہ و زاری سے دعا کی اور مردان کی طرف روانہ ہو گئے۔ جو ملکی پہلے مردان سے خبریں لے کر آئے تھے، انھیں رہبر بنا لیا۔ پیادے آگے تھے اور سوار پیچھے۔ گھڑیالی کے میدان میں گھوڑوں نے خلاف معمول زور سے ہنہنانا شروع کیا۔ روکنے کی ہرچند کوشش کی، مگر وہ نہ رکے۔ جب مردان صرف ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر رہ گیا تو نقارہ بجنے کی آواز آئی۔ یہ اس حقیقت کا اعلان تھا کہ دشمن کو حملے کی اطلاع مل چکی ہے اور وہ مقابلے کے لیے تیار ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے۔

قاضی صاحب نے سارے لشکر کو ٹھہرا کر اکابر سے مشورہ کیا۔ مولانا شاہ اسماعیل اور رسالدار عبدالحمید خاں نے کہا کہ قاضی صاحب: یہاں تک تو اللہ تعالیٰ نے پہنچا دیا ہے، اب پیچھے ہٹنا مناسب نہیں۔ اگر دشمن خبردار ہو چکا ہے اور شبخون کی صورت باقی نہیں رہی تو مضائقہ نہیں۔ ہم دن کے وقت لڑائی کریں گے۔ امید قوی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں فتح و ظفر سے سرفرازی بخشے گا۔

حملے کی سکیم

قاضی صاحب اس مشورے پر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ میرے دل میں بھی یہی بات تھی۔

دو مخبروں کو آگے بھیج دیا تاکہ وہ پورے حالات دیکھ کر مزید خبریں لائیں اور بسم اللہ کہہ کر قدم آگے بڑھانے کا حکم دے دیا۔ جب ہوتی آدھ کوس پر رہ گیا تو مخبروں کا انتظار کرنے لگے۔ بستی میں نقارہ زور سے بج رہا تھا۔ لوگوں کا شور و غل بھی سنائی دیتا تھا۔ غازیوں کے گھوڑے بدستور ہنہنا رہے تھے۔ اس اثنا میں مخبر خبر لائے کہ ہوتی کی گڑھی سے گولی کی زد کے فاصلے پر بسمت جنوب کھلیان ہیں۔ وہاں چالیس پچاس آدمی بندوقیں لیے

بیٹھے ہیں۔ بستی کے دروازے پر بھی کافی جمعیت ہے۔ البتہ گڑھی سے مغربی سمت کا میدان بالکل خالی ہے اور شمالی سمت میں بھی کوئی نظر نہیں آتا۔

قاضی صاحب نے مولوی مظہر علی عظیم آبادی سے کہا آپ جیش کو لے کر کھلیانوں کی طرف جائیں۔ رسالدار عبدالحمید خاں کو حکم دیا کہ سواروں کو لے کر مغربی جانب کے میدان میں پہنچ جائیں۔ جب کھلیانوں کی سمت سے بندوقوں کی آواز آئے تو نقارہ بجاتے ہوئے بستی پر حملہ کر دیں۔ خود دروازے کا قصد کیا، جہاں دشمن کی بھاری جمعیت کی اطلاع ملی تھی۔ مُلکیوں کو قاضی صاحب نے صفِ اوّل میں رکھا اور ہندوستانیوں کو صفِ دوم میں۔ دُعا کے بعد تینوں جیش اپنے مقامات کی طرف روانہ ہو گئے۔

مولوی مظہر علی کی شانِ صبر و ہمت

مولوی مظہر علی صاحب چپ چاپ کھلیانوں کے قریب پہنچے تو ادھر سے ایک باڑھ آئی۔ جس کے ساتھ ہی مولوی صاحب نے ہلّہ بول دیا۔ یہ اس زور کا تھا کہ کھلیانوں والے بندوقچی بھاگ نکلے۔ مولوی صاحب فوراً آگے بڑھے تو ان کی ران کے بالائی حصّے میں گولی لگی، جس کے باعث وہ زمین پر گر پڑے[1]، لیکن اس شیرِ دل مجاہد نے اپنی تکلیف کسی پر ظاہر نہ ہونے دی کہ مبادا غازیوں کے اقدام میں توقف ہو جائے اور بعض بھائی اپنے محبوب سردار کو سنبھالنے کی بے تابی میں اصل کام سے دست کش ہو جائیں۔ چنانچہ مولوی صاحب سنبھل کر زمین پر بیٹھ گئے۔ جو غازی پاس سے گزرتا ہُوا حال پوچھتا، بلند آواز سے فرماتے: "تم چلو میں ابھی آتا ہوں"۔ بلند آواز سے اس لیے کہ کسی کو زخمی ہونے کا شبہ نہ ہونے پائے۔ ہر شخص یہی سمجھتا کہ غالباً پاؤں میں کانٹا چُبھ گیا ہے، جسے نکالنے کی غرض سے دم بھر کے لیے ٹھہر گئے ہیں۔ رات کی تاریکی میں کسی کو نظر بھی نہیں آ سکتا تھا کہ ان پر کیا گزر چکی ہے۔ مولانا شاہ اسماعیل ان کے پاس پہنچے اور حال پوچھا تو بولے: آپ میرا خیال نہ فرمائیں۔ پہلے گڑھی کا فیصلہ کر لیں۔ فتح حاصل ہو جائے گی تو دیکھ لیجیے گا کہ میں کس حال میں ہُوں۔

ہوتی پر حملہ

بہرحال مولوی مظہر علی کا جیش کھلیانوں سے آگے بڑھ کر دروازے پر پہنچا۔ ادھر سے قاضی صاحب بھی آ گئے اور سب متفقہ طور پر ہلّہ کر کے بستی میں داخل ہو گئے۔ اس اثنا میں گڑھی کے اندر سے آواز آئی کہ "بھائیو! تم میں ہندوستانی بھی ہیں؟" جب پوچھا گیا کہ مدعا کیا ہے؟ تو آواز آئی کہ آپ لوگوں کے قول و اقرار کی سچائی زمانے بھر پر آشکارا ہے۔ ہم امان چاہتے ہیں۔ اس طرح دس بیس آدمی گڑھی کی دیوار پھاند کر سواروں کی پناہ میں آ گئے۔

---

[1] یہ منظورہ کا بیان ہے۔ وقائع میں ہے کہ گولی مولوی صاحب کی کمر میں لگی تھی اور گوشت میں رہی۔ کسی ہڈی کو نقصان نہ پہنچا۔

مردان پر ہجوم

غازی دوسری سمت سے گڑھی کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ مولانا اور قاضی صاحب ملا نور محمد قندھاری کو پچیس آدمیوں کے ساتھ ہوتی کے انتظام کے لیے چھوڑ کر مردان جا چکے تھے۔ جب سواروں کو اس واقعے کا علم ہوا تو وہ بھی مردان کی طرف چلے گئے۔ ہوتی اور مردان کے درمیان انھوں نے صبح کی نماز ادا کی۔

مردان میں، بندوقیں چل رہی تھیں۔ سید صاحب بستی کے باہر مولانا شاہ اسمٰعیل کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے تاکہ باہر سے کوئی کمک اندر نہ جا سکے۔ قاضی صاحب پیادوں کے ساتھ گڑھی کی تسخیر میں مصروف تھے۔ اس اثنا میں چار ملکی آدمی مولانا مظہر علی کو چارپائی پر ڈال کر لائے۔ وہیں مولانا نے ان تمام آدمیوں کو رہا کر دیا جنھیں سوار ہوتی کی گڑھی سے امان دے کر ساتھ لائے تھے اور فرمایا کہ مسلمان کی جان، عزت اور مال ہر مسلمان پر حرام ہے سوائے اس حالت کے کہ وہ باغی یا محارب ہو۔

قاضی حبان کی شہادت

دو گھڑی دن چڑھا ہو گا کہ چار پانچ آدمی بستی سے دوڑے آئے اور مولانا کو یہ غم انگیز خبر سنائی کہ قاضی سید محمد حبان شہید ہو گئے۔ تفصیل یہ بتائی کہ بستی میں گھسے تو گڑھی والوں کی گولیاں غازیوں پر برسنے لگیں اس وجہ سے غازی خانہ بخانہ ہو کر گڑھی کی جانب بڑھنے لگے۔ وہ جس گھر میں گھستے، اس کی دیوار توڑ کر گڑھی سے قریب تر ہو رہے تھے۔ ایک دیوار ٹوٹی تو سامنے چوڑی گلی آ گئی، جہاں دشمن کی گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ چار پانچ غازی تیزی سے سلامت نکل گئے۔ پھر ایک ملکی کے گولی لگی اور وہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ دوسرے ریلے میں بھی کچھ بچ نکلے اور ایک نے شہادت پائی۔ پھر ایک ہندوستانی غازی شہید ہوا۔ اس پر قاضی صاحب خود چند آدمیوں کو لے کر آگے بڑھے۔ ان کے سارے ساتھی بچ نکلے، لیکن قاضی صاحب کے سر میں گولی لگی، ساتھ ہی دم پورا ہو گیا۔ مولانا نے یہ خبر سنتے ہی انا للہ کے بعد فرمایا: "الحمد للہ قاضی القضاۃ نے اپنی دلی مراد پا لی۔" لیکن یہ واقعہ کو علی الاعلان بیان نہ کرو تاکہ دشمنوں پر یہ ظاہر نہ ہو، لشکر کا امیر شہید ہو گیا۔

سرحد کا مخلص ترین عالم

قاضی صاحب کی شہادت کا واقعہ حقیقۃً بہت المناک تھا۔ وہ بڑے دیندار اور مخلص مجاہد تھے۔ سرحدی علما میں سے جتنے لوگ سید صاحب کے رفیق اور ارادت مند بنے، ان میں سے ایک بھی علم و فضل، غیرت و حمیت دین اور زہد و تقویٰ میں ان کا مثیل نہ تھا۔ اعلائے کلمۃ الحق میں بڑے جری اور بے باک تھے۔ سمہ میں انھیں کی ہمت و کوشش سے عُشر کا پختہ انتظام ہوا تھا۔ وہ کانڑا غوربند کے رہنے والے تھے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ بڑے فارغ البال بلکہ امیر گھرانے کے فرد تھے۔ محض اللہ کے لیے سید صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ پھر آپ کا دامن اس مضبوطی سے پکڑا کہ

تادم واپسیں نہ چھوڑا۔ ان کے ایک حقیقی بھائی بھی ساتھ تھے۔ وہ جنگ مردان کے بعد قاضی صاحب کی میت کو اپنے وطن لے گئے اور وہیں انھیں دفن کیا۔

مردان کی حوالگی

مولانا نے رسالدار عبدالحمید خاں کو حکم دیا کہ چالیس پچاس سواروں کو بستی میں بھیج دیجیے۔ وہ گھوڑے چھوڑ دیں، شاہینیں لے کر پیدل جائیں اور شاہینوں سے گڑھی کے برجوں کو خالی کرائیں۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ گڑھی مردان کے چھ بُرج تھے، سب پر گولہ باری شروع ہوگئی۔ دو شاہینیں صرف اس بُرج کے خلاف لگائی گئیں جس کی گولیوں سے قاضی سید حبان اور دوسرے غازی شہید ہوئے تھے۔

بہرحال شاہینوں نے دشمن کا عزم مزاحمت مضمحل کرکے رکھ دیا۔ گڑھی کے پانچ برجوں پر خاموشی چھاگئی۔ صرف ایک باقی رہ گیا جس سے گولیاں آرہی تھیں۔ اس اثنا میں ملا لعل محمد قندھاری اس بُرج کے نیچے پہنچ گئے گئے اور بآواز بلند پشتو میں پکارے: "اندر پائی راوڑا، اندر پائی راوڑا" یعنی سیڑھی لاؤ، سیڑھی لاؤ۔ حالانکہ کوئی سیڑھی پاس نہ تھی۔ یہ سُن کر بُرج والوں پر ہراس طاری ہوگیا اور انھوں نے حوالگی کی درخواست پیش کردی۔ قرارداد کے مطابق پہلے ہتھیار نیچے پھینک دیے، پھر ایک ایک کرکے اُتر آئے۔

مولانا شاہ اسماعیل کے متعلق بیان ہے کہ جنگ کے بعد آپ نے دو غازیوں کے کارناموں کو بڑا قابل قدر بتایا۔ اوّل مولوی مظہر علی صاحب جن کی مجروحیت کا واقعہ عرض کیا جاچکا ہے، دوم ملّا لعل محمد قندھاری جن کے حسن تدبیر سے گڑھی کا آخری بُرج خالی ہُوا۔

مولانا کے انتظامات

جب ساری مزاحمت ختم ہوگئی تو احمد خاں کا بھائی رسول خاں بھی گڑھی کے تہ خانے سے باہر نکل کر امان کا خواستگار ہُوا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اثناء جنگ میں مجرا سنتا رہا تھا۔ مولانا شاہ اسماعیل نے، جو قاضی سید محمد حبان کی شہادت کے بعد امیر لشکر بن گئے تھے، فرمایا کہ اپنے تمام آدمی لے کر گڑھی سے باہر نکل جاؤ۔ تمھیں امان دی جاتی ہے۔ تمھارا اور ساری رعایا کا مال و اسباب بالکل محفوظ رہے گا اور کوئی غازی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے گا، لیکن احمد خاں کے مال و اسباب میں سے کوئی چیز نہ چھیڑنا۔ وہ باغی ہے اور اس کی ہر چیز لے لی جائے گی۔

جب تمام انتظامات مکمل ہوگئے تو رسول خاں کو خانی کی مسند پر بٹھا دیا گیا۔ شہدا کو مردان ہی میں دفن کیا گیا۔ حملے کے دوران میں جو مال غازیوں کے ہاتھ آیا تھا وہ سارا مالکوں کو لوٹا دیا گیا اور فرمایا کہ امان دینے کے بعد کسی کا مال واسباب لینا حرام و ناروا ہے۔ ہمارے تمام مسلمان بھائی یہ مسئلہ یاد رکھیں۔ بعد ازاں دعا کی کہ اللہ تعالیٰ ہم سب عاجز بندوں سے اپنی رضا کے کام لے، توفیق خیر دے اور صراط مستقیم پر ثابت قدم رکھے۔

امان زئی، پنجتار اور امب

اس روز ہوتی میں مقام کیا۔ سو سوار احمد خاں کا سامان جمع کرنے کے لیے مقرر کر دیے۔ اگلے دن ظہر کے وقت روانہ ہو کر مغرب کی نماز گڑھی امان زئی میں ادا کی۔ سوار اور اکثر پیادے بستی کے باہر نالے پر اترے۔ خود مولانا نے سرور خاں کی مسجد میں قیام کیا جو بستی کے ایک کنارے پر تھی۔ وہاں تین روز ٹھہرے۔ آس پاس کے خوانین ملاقات کے لیے آئے۔ مولانا نے اس جگہ بھی قاضی سید محمد حبان کی مغفرت کے لیے دعا کی۔ اسی موقع پر حاجی بہادر شاہ خاں کو گڑھی امان زئی میں تحصیلِ عُشر کا کام سپرد کیا اور پندرہ آدمی ان کے ساتھ مقرر کر دیے۔ پھر سدم پہنچ کر حاجی محمود خاں کو وہاں کا تحصیلدار بنایا۔ بعد ازاں شیوہ ہوتے ہوئے پنجتار تشریف لے گئے۔ چند روز کے بعد سید صاحب کی طرف سے بلاوا آ گیا تو زخمیوں اور بیماروں کو پنجتار میں چھوڑا اور پہلی منزل کالا درہ کے پاس نالے پر کی، پھر کوٹھا اور کھبل ہوتے ہوئے امب پہنچ گئے اور سید صاحب کی خدمت میں انتظامِ عُشر، جنگ مردان اور شہادت قاضی حبان کی تفصیلات پیش کیں۔ سید صاحب بھی قاضی القضاۃ کی شہادت پر بے حد متالم ہوئے[1]

---

[1] یہاں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ ہوتی اور مردان کی حیثیت اب بالکل بدل چکی ہے۔ سید صاحب کے زمانے میں ان مقامات کی جو حالت تھی وہ موجودہ سے بالکل مختلف تھی۔ اب یہ دونوں مقام مل کر ایک بڑا شہر بن گئے ہیں۔ مرحوم خان اکبر خاں (ہوتی) سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خوانین ہوتی کے مورث اعلیٰ کا نام محمد خاں تھا۔ پھر اس خاندان میں لشکر خاں نے بلند حیثیت حاصل کر لی۔ اس کے پانچ لڑکے تھے۔ بڑا احمد خاں تھا۔ اس کا چلن اچھا نہ تھا، اس لیے لشکر خاں نے از روے وصیت اسے محروم کر دیا تھا اور اپنے دوسرے بیٹے محمد خاں کو جانشین بنایا تھا۔ احمد خاں کی رشتہ داری اہلیہ کی جانب سے سلطان محمد خاں کے ساتھ تھی۔ محمد خاں کا شجرہ یوں ہے:

محمد خاں
|
سر بلند خاں
|
خواجہ محمد خاں
|
نواب سر اکبر خاں

چوبیسواں باب

سردارانِ پشاور کا نیا فتنہ

سلطان محمد خاں

جنگ زیدہ کے بعد سید صاحبؒ کی دلی خواہش یہ تھی کہ سلطان محمد خاں کے ساتھ دوستی کے تعلقات استوار ہو جائیں اور یار محمد خاں کی افسوسناک حرکات کے باعث جو ناگوار حالات پیش آگئے تھے، ان کی تلخیاں مٹ جائیں۔ معلوم ہے کہ سلطان محمد خاں خود اپنے بھائی کی حرکات کو ناپسند کرتا تھا، لیکن وہ کمزور طبیعت کا آدمی تھا۔ اس کی والدہ بار بار طعنے دے رہی تھی کہ ایک فقیر نے تیرے بھائی کو مار ڈالا۔ تو لاؤ لشکر کا مالک ہونے کے باوجود بدلہ نہیں لے سکا۔ پہلے والدہ ہی کے طعنوں نے اس سے ہنڈ پر حملہ کرایا تھا، پھر پنجتار کا قصد کیا۔ جب معلوم ہوا کہ سید صاحبؒ کے غازی پشاور پر شبخون مارنے میں بھی تامل نہ کریں گے تو خوفزدہ ہو کر بیٹھ گیا۔ سید صاحبؒ امب کی طرف گئے تو اس کی والدہ اور مشیروں نے پھر مخالفت پر ابھارا۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ اب تک اس کی تمام معاندانہ حرکات میں نیم دلی صاف نمایاں رہی۔ اس کا کوئی بھی اقدام یار محمد خاں کی طرح متصلب دشمن کا اقدام نہ تھا، جس کا دل زہرِ عناد سے لبریز ہو، بلکہ ایسے آدمی کا اقدام تھا جسے خواہش و آرزو کے خلاف کسی کام پہ مجبور کر دیا گیا ہو۔

احمد خاں کمال زئی کی حرکت

اس اثنا میں احمد خاں کمال زئی کا واقعہ پیش آگیا جس نے ادائے عُشر کے عہد و پیمان کو بالائے طاق رکھا اور ہر اقرار سے منحرف ہو گیا۔ باز پُرس ہوئی تو فوجی امداد حاصل کرنے کے لیے پشاور پہنچ گیا۔ اس پر جنگ مردان پیش آئی جس میں قاضی سید محمد حبان شہید ہوئے اور رسول خاں کو خانی کی مسند پر بٹھایا گیا۔ یار محمد خاں اور خادے خاں کے خون کا بدلہ لینے کی آگ آہستہ آہستہ مدھم ہونے لگی تھی۔ احمد خاں نے اسے مشتعل کرنے کے لیے نیا ایندھن فراہم کر دیا۔ سلطان محمد خاں اور اس کے بھائیوں کی مجالس میں پھر اس قسم کی باتیں شروع ہو گئیں کہ اگر اسی طرح یکے بعد دیگرے ایک ایک رئیس کی امارت و خانی کے دیے گُل ہونے لگے تو خود درانی سرداروں کی ریاست کا چراغ کب تک روشن رہ سکے گا؟ چنانچہ سلطان محمد خاں، اس کے بھائیوں سید محمد خاں اور پیر محمد خاں نیز اس کے بھتیجے حبیب اللہ خاں (ابن عظیم خاں) نے متفق الرائے ہو کر ایک لشکر فراہم کیا اور احمد خاں کمال زئی کی امداد کو دستاویز بنا کر سید صاحبؒ سے لڑنے کے لیے چمکنی پہنچ گئے۔ رسالدار عبدالحمید خاں

کو دیہات کا دورہ کرتے ہوئے یہ اطلاعات ملیں۔ وہ پنجتار پہنچے تو حاجی بہادر شاہ خاں نے امان زئی سے اس بارے میں مفصّل روداد بھیج دی۔ فتح خاں پنجتاری اور دوسرے غازیوں نے مشورہ کرکے پورے حالات سید صاحب کو لکھ بھیجے۔ ساتھ ہی درخواست کی کہ آپ کا بنفسِ نفیس تشریف لے آنا مناسب ہوگا۔

سید صاحب کے انتظامات

سید صاحب امب سے پنجتار جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ روانگی سے پیشتر آپ نے مندرجہ ذیل انتظامات فرمائے:

۱ ۔ قلعہ امب کا انتظام شیخ بلند بخت دیوبندی کے حوالے کیا۔ لیکن تمام انتظامات میں سید اکبر شاہ ستھانوی کو اس طرح شریک رکھا، گویا ان کی حیثیت شریک منتظم کی تھی۔

۲ ۔ قلعے سے باہر جتنا اسلامی لشکر تھا، اس کا امیر و سالارِ اعظم مولانا شاہ اسماعیل کو بنایا۔ شیخ ولی محمد پھلتی کو ان کا مشیر نامزد کیا۔ سید جعفر علی نقوی اس سمت میں میر منشی کے منصب پر مامور ہوئے۔

۳ ۔ چھتر بائی کے قلعدار مولوی خیرالدین شیرکوٹی تھے۔ حافظ مصطفیٰ کاندھلوی کو ان کا نائب بنایا۔

امب میں پچاس کے قریب مستورات تھیں۔ ان میں سید صاحب کی بی بی صاحبہ بھی تھیں، انھیں اور بچوں کو وہیں چھوڑا۔ چند مقام ستھانہ میں کیے۔ چند روز کھبل میں ٹھہرے۔ غازیوں کے بڑے حصّے کو مینئی کے راستے پنجتار بھیج دیا۔ خود تھوڑے سے غازیوں کے ساتھ منارہ کلاں گئے، جہاں حافظ دراز نام ایک مجذوب سے ملاقات منظور تھی۔ اس مجذوب کا ایک شیوہ بے حد عجیب تھا۔ وہ روزانہ دریائے سندھ میں نہانے جاتا اور اس مقام پر نہاتا جہاں پانی کی دھار بے حد تیز رہتی تھی۔ یہاں تک کہ کسی توانا آدمی کو بھی وہاں جانے کا حوصلہ نہ ہوتا۔ مجذوب بہ اطمینان جاتا۔ اپنی لاٹھی پانی میں گاڑ کر اس پر کپڑے رکھتا۔ خوب دلجمعی سے نہا کر واپس آتا۔ اسے وہی جگہ پسند تھی۔

منارہ سے سید صاحب چلے تو کھلابٹ اور مرغز کے بیچ میں سے نکلے۔ دونوں بستیوں کے سرداروں نے کھانے کے لیے اصرار کیا۔ سید صاحب نے معذرت کردی کہ کارِ ضروری درپیش ہے۔ توتالی میں فتح خاں پنجتاری نے استقبال کیا۔ عصر کی نماز پنجتار کے سامنے نالے پر ادا کی۔ رسالدار عبدالحمید خاں دورے پر نکلے ہوئے تھے، انھیں حکم بھیج دیا کہ ضروری تیاری کرلیں اور جتنی رقم مطلوب ہو، حاجی بہادر شاہ خاں سے لے لیں۔

مخالفوں کے ہنگامے

پنجتار پہنچ کر درانیوں کے بارے میں مشورہ کیا تو سب نے یہ رائے دی کہ لشکر لے کر گڑھی امان زئی یا تورو تک جانا چاہیے۔ اگر درانی اپنا لشکر ڈالیں

لے جائیں، تو خود بھی واپس آ جانا چاہیے، اگر آگے بڑھیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ جنگ ہوگی۔

سید صاحب پنجتار آئے تو خبر پہنچی کہ پائندہ خاں اور سکھ امب و عشرہ پر حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ قادر آباد کے قلعدار رام سنگھ (یا رام سکھ) نے غازیوں کے ساتھ خفیہ خفیہ سمجھوتا کر لیا تھا۔ جب ہری سنگھ لشکر لے کر اس طرف آیا تو رام سنگھ نے بھی پیغام بھیج دیا کہ اب میرے لیے اس کے سوا چارہ نہیں رہا کہ کبھی کبھی گولیاں چلواتا رہوں۔ چنانچہ قادر آباد اور دریا پار کی دوسری سکھ گڑھیوں سے گولیاں آنے لگیں[1]۔ مولانا بھی جواب میں توپیں لگا کر گولے پھینکنے لگے۔ ایک روز غازی عشرہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ چند گولیاں مسجد کی دیواروں میں آکر لگیں۔ مولانا کے حکم سے خدا بخش نے ایک جزائل مسجد کے ستون سے باندھ کر گولے پھینکے۔

مولانا اس زمانے میں ہر جمعہ کے وعظ میں سورۂ فتح کی تفسیر رکوع بہ رکوع سنایا کرتے تھے۔ آخری رکوع کی تفسیر سنا رہے تھے کہ سکھوں کی طرف سے گولیاں چلیں۔ مولانا نے غازیوں کو بکھر جانے کا حکم دیا۔ اور جن غازیوں کے پاس رائفلیں یا لمبی زد کی بندوقیں تھیں، انھیں حکم دیا کہ گولیاں چلائیں۔ دریا کے کنارے اور قلعہ امب کے پاس مناسب مقامات پر مورچے بھی بنا لیے تھے۔ قلعے کے شمال میں ایک خندق کھودی گئی، جس کی کھدائی میں خود مولانا بھی شریک رہے۔ چھتر بائی کے لیے سب سے بڑھ کر خطرہ تھا۔ پائندہ خاں حملہ کرتا تو چھتر بائی ہی پر کرتا۔ شیخ ولی محمد روزانہ صبح کو سو سوا سو غازی لے کر چھتر بائی جاتے۔ دن وہاں گزارتے رات کی تاریکی میں واپس آ جاتے۔

سید صاحب کا فرمان

یہ حالات دیکھ کر سید صاحب نے فرمان بھیجا کہ عورتوں اور بچوں کو امب سے نکال کر ستھانہ پہنچا دیا جائے۔ مولانا کے نزدیک یہ طریقہ مناسب نہ تھا۔ اندیشہ تھا کہ اس طرح اردگرد کے علاقے میں سراسیمگی پھیل جائے گی اور لوگ سمجھیں گے کہ غازی ڈر گئے ہیں۔ چنانچہ مولانا نے لکھ بھیجا کہ ستھانہ امب سے زیادہ محفوظ نہیں اور میں مسلمانوں میں ہراس نہیں پیدا کرنا چاہتا۔ اس وقت سکھوں پر ہراس طاری ہے۔ لاہور سے گورنر کشمیر کے نام فرمان پہنچا ہے کہ خلیفہ صاحب سے ڈرتے رہو اور کشمیر کے راستوں کی خوب حفاظت کرو۔ جس طرح علیوں نے خلیفہ صاحب کو امب پہنچایا۔ ایسا نہ ہو کہ اسی طرح انھیں کشمیر پہنچا دیں۔

سید صاحب نے دوبارہ لکھا کہ سید اکبر شاہ سے مشورہ کر لیجیے۔ مولانا نے مشورہ کیا اور لکھا کہ میں اپنی

---

[1] منظورہ ۸۳۲

پہلی رائے پر قائم ہوں۔ حکم و اختیار آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے خیر خواہی کی بنا پر اپنی رائے بے تکلف عرض کر دی، اس لیے کہ آپ اکثر مجھ سے مشورہ فرماتے رہتے ہیں، لیکن اگر آپ کا حکم بحال رہے تو لاریب اس کی تعمیل ہوگی:

اگر از ارسال زناں خصوصاً حرم محترم آنجناب نقصانے در شوکت اسلام راہ خواہد یافت، جواب دہی آں عند اللہ بر ذمہ آنجناب خواہد افتاد۔ ایں قدر بالیقیں باید دانست کہ وقتیکہ سر بر تن ہائے سہ صد مردم نخواہد بود، آں وقت خدا نخواستہ نوبت بہ حرم محترم آنجناب خواہد رسید۔[1]	اگر عورتوں خصوصاً آنجناب کے حرم محترم کو (امب سے نکال کر ستھانہ) بھیجنے کے باعث شوکت اسلام کو نقصان پہنچا تو اس کے لیے خدا کے پاس آپ جواب دہ ہوں گے۔ یہ بھی یقین رکھیے کہ جب تک تین سو غازیوں کے سر بدنوں سے الگ نہ ہو جائیں گے، خدانخواستہ آپ کے حرم محترم تک نوبت نہ آسکے گی۔

سید صاحب نے یہ تحریر دیکھی تو فرمایا کہ یہ تو میرے بھانجے سید احمد علی جیسی تحریر ہے، جو سچی بات کہنے میں مراعات ادب کی بھی پروا نہیں کیا کرتے تھے۔[2]

دو تصریحات

سید صاحب کے فرمان اور مولانا شاہ اسماعیل کے واشگاف جواب کے سلسلے میں دو باتوں کی توضیح ضروری ہے:

۱ — سید صاحب کا فرمان اپنی بی بی کی حفاظت کے خیال پر مبنی نہ تھا، اگرچہ خواتین کی حفاظت بہر حال ضروری تھی۔ جو بزرگ ہستی اس دنیا کی ہر متاع راہ حق میں لٹا دینے پر ہمہ تن تیار تھی۔ اس کے متعلق اس قسم کا وسوسہ بھی گناہ ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اگر حملہ ہوا تو عورتوں اور بچوں کی موجودگی غازیوں کے لیے دوران جنگ میں موجب تشویش و اضطراب بنی رہے گی اور وہ یکسو ہو کر فرائض فداکاری بجا نہ لا سکیں گے۔

۲ — مولانا کی تحریر منافی مراعات ادب نہ تھی۔ سچی بات کو چھپانا یا حقیقت حال کے اظہار میں متامل ہونا اصولاً غلط اور ادائے فرائض میں کوتاہی کا نشان ہے۔ ادب کا مفہوم یہ نہیں کہ انسان کسی بزرگ کے حکم کو خلاف مصلحت جانتے ہوئے اداء فرض سے بچ نکلنے کی دستاویز بنا لے۔ سید صاحب کا

---

[1] منظورہ صفحہ ۸۳۳ [2] ایضاً

ادب کیوں ضروری تھا؟ اس لیے کہ ایک اہم دینی فرض کی بجا آوری کی خاطر انھیں قائد و امام مانا گیا تھا، لہٰذا ہر معاملے میں اصل فرض کی مصلحتیں ہی مدارِ کار تھیں اور شخصیتِ امام کے ادب کا تقاضا ہرگز یہ نہ تھا کہ اس پر مصلحتیں واضح کرنے میں تامّل کیا جاتا۔ مولانا نے یہی کیا اور سید صاحب نے اپنے عمل سے اس پر مہرِ تصدیق لگائی، قولاً اس کی تحسین فرمائی۔ ہمارے ہاں ادب کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی بزرگ شخصیت کی زبان پر جو کچھ جاری ہو، بے چون و چرا اس کے سامنے سرِ تسلیم خم رکھا جائے، اگرچہ وہ کتنا ہی غلط ہو۔

سلطان محمد خاں کو خط

سید صاحب نے حکم دے دیا تھا کہ ہر ضلع کا غلّۂ عُشر مرکزی مقام پر جمع ہو جائے اور مختلف دیہات میں نہ بکھرا رہے۔ پھر چار سو غازیوں کے ساتھ پنجتار سے نکلے۔ شیوہ اور اسماعیلہ ہوتے ہوئے گڑھی امان زئی پہنچ گئے اور احمد خاں کاکا کی مسجد میں قیام فرمایا۔ وہیں اطلاع ملی کہ درانیوں کا لشکر چکنی سے چل کر چارسدہ ہوتا ہوا اوتمان زئی پہنچ گیا ہے۔ یہ عزمِ جنگ کا واضح اعلان تھا۔ فتح خاں پنجتاری اور منصور خاں (چارگلئی) نے مشورہ دیا کہ اب گڑھی امان زئی میں ٹھہرے رہنے کے بجائے تورو میں پہنچنا چاہیے۔

سید صاحب نے اس موقع پر سلطان محمد خاں کو ایک دردانگیز خط لکھا، جس میں دیرینہ تعلقات کی یاد دلاتے ہوئے فرمایا کہ ہم مسلمان محض خدمتِ دین اور احیاے سننِ سید المرسلین (صلعم) کی غرض سے وطن چھوڑ کر آئے تھے۔ کلمہ گویوں کو جہاد کی ترغیب دے رہے تھے۔ مسلمانوں سے جنگ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یار محمد خاں کو اپنے لاؤ لشکر پر ناز تھا۔ وہ بلاوجہ ہم پر چڑھ آیا۔ ہر چند سمجھایا، نہ سمجھا۔ اس پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ ہم ویسے ہی عاجز و ناچار ہیں، ہمارا مولا پہلے کی طرح اب بھی مالک الملک اور قادر و مختار ہے۔ ہم لوگوں سے ڈرنے کی کچھ ضرورت نہیں لیکن خدا کی بطشِ شدید سے ڈرتے رہیے:

او ست سلطاں ہرچہ خواہد آں کند   عالمے را در دمے ویراں کند
ہست سلطانی مسلم مر ورا   نیست کس را زہرۂ چون و چرا

احمد خاں کمال زئی کی خطاکاری بھی واضح فرمائی۔ یہ خط تورو کے عبدالرحمٰن کے ہاتھ بھیجا اور لکھا کہ باقی حالات قاصد کی زبانی معلوم ہوں گے۔

مزید نامہ و پیام

لیکن جو لوگ سلطان محمد خاں کو پشاور سے اٹھا کر لائے تھے، وہ اوتمان زئی پہنچ جانے کے بعد کیوں کر اسے صحیح راستے پر آنے کا موقع دے سکتے تھے؟ سلطان محمد خاں کے ہاتھ سے خیر خواہیِ اسلام کی حبل المتین نکل چکی تھی اور وہ ہر دینی و قومی مصلحت کی طرف سے آنکھیں بند کر چکا تھا

اس کا جواب سراسر واہی طعنوں کا مرقع تھا۔ مثلاً یہ کہ جہاد کی باتیں ابلہ فریبی کا کرشمہ ہیں۔ تم لوگوں کا عقیدہ بُرا اور نیّت فاسد ہے۔ بہ ظاہر فقیر بنے بیٹھے ہو، دل میں امارت کی ہوس ہے۔ ہم نے خدا کے نام پر کمر باندھی ہے کہ تمھیں قتل کریں تاکہ زمین تمھارے وجود سے پاک ہو جائے۔ ملّا عبدالرحمٰن نے زبانی بھی بتایا کہ جو حالات میں دیکھ آیا ہوں، ان کے پیش نظر صلح کی کوئی امید نہیں۔

سید صاحب نے بردباری سے کام لیتے ہُوئے اجراء نامہ و پیام اور رفع خصومت کا ایک پہلو نکال لیا۔ دوبارہ لکھا کہ آپ کی زبان سے خدا کا نام سُن کر بڑی خوشی ہوئی۔ مہربانی فرما کر یہ تو بتا دیجیے کہ ہمارے اعمال میں آپ کو کون سی چیز احکم الحاکمین کے امور رضا کے خلاف نظر آئی؟ اگر آپ کچھ بتا دیں تو ہم اس سے تائب ہو جائیں گے اور آپ کو لشکر کشی کی ضرورت نہ رہے گی۔

هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ

خدا کے نام پر کمر باندھنے کا مدعا یہی ہو سکتا تھا کہ جن لوگوں سے جنگ مقصود ہے، ان کے اعمال میں کوئی چیز باری تعالیٰ کی رضا کے خلاف موجود ہے۔ پھر جب وہ خود اسے چھوڑنے کا اقرار کر رہے تھے تو لڑائی کی کیا ضرورت تھی؟ صرف خلاف شریعت بات یا باتیں بتا دینی چاہیے تھیں۔ لیکن سلطان محمد خاں الزام تراشی کے جواب میں کون سی چیز پیش کر سکتا تھا؟ کیا بتاتا؟ کیا کہتا؟ کیا یہ کہتا کہ مسلمانان سرحد کو احکام شریعت حقہ کا پابند بنانا رضائے ایزدی کے خلاف ہے؟ یہ کہتا کہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کی چیرہ دستیوں سے نجات دلانے کی کوشش مقاصد اسلامی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی، اسے ترک کر دینا چاہیے؟ یہ کہتا کہ افغانیت کے جاہلانہ رسوم کا انسداد تقاضائے ایمانی کے منافی ہے؟ وہ بالکل لاجواب ہو گیا اور صرف یہ پیغام بھیج سکا کہ اس خط کا جواب شمشیر و سنان سے دیا جائے گا۔

اندازہ فرمائیں کہ یہ حالات دیکھ کر اس پاک باطن اور پاک نفس سید کے دل پر کیا گزری ہو گی؟ وہ اور ان کے رفیق گھر بار، اقربا اور راحت بار زندگیاں چھوڑ کر اس غرض سے سرحد پہنچے تھے کہ اسلام کا پرچم سربلند ہو، مسلمان مصیبتوں سے نجات پائیں۔ ان کا اعزاز و اکرام، ان کی آزادی، ان کی اسلامیت بحال ہو جائے۔ لیکن خود دعوی داران اسلام ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ ان لوگوں کی جو تلواریں اور جو نیزے غیر مسلموں کے خلاف نہ چل سکے، وہ ان مجاہدین اسلام کے خلاف پے بہ پے اچھلنے لگے، جو اپنے خون حیات کا آخری قطرہ مسلمانوں کی صلاح و فلاح کے لیے بہا دینے کا عزم لیے سرحد پہنچے تھے۔

اسلامی ہند کی تاریخ کا دردناک ترین منظر

ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں ایک دو نہیں بیسیوں واقعات موجود ہیں کہ مسلمانوں نے جُوع الارض کی خاطر مسلمانوں کے گلے کاٹے۔ کلمہ گویوں نے کلمہ گویوں کا خون بہایا۔ لیکن ایسی مثال آپ کو شاید ہی مل سکے کہ دعوی داران اسلام

نے ان غازیوں کو خونریزی و خوں آشامی کا ہدف بنایا، جنھیں رضائے حق کے سوا دنیا و آخرت کی کوئی چیز مطلوب نہ تھی، جن کے دلوں میں صرف ایک آرزو اور ایک تڑپ تھی کہ مسلمان سچے مسلمان بن جائیں، عزت و سربلندی کی زندگیاں بسر کریں۔ کوئی معاند انھیں آزار نہ پہنچا سکے۔ کسی بدخواہ کا ہاتھ ان کی طرف بڑھنے کی جرأت نہ کر سکے یہ مکروہ اور گھناؤنا کام صرف پشاور کے درانی سرداروں نے اپنے لیے پسند کیا:

لمثل ھذا یذوب القلب من کمد
إن کان فی القلب اسلام وایمان

سلطان محمد خاں نے سید صاحب کو یہ طعنہ بھی دیا تھا کہ تم لوگ شبخون مارتے ہو، دن کے وقت لڑو تو تمھاری بہادری اور مردانگی کا بھرم کھل جائے۔ سید صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ہم آپ سے یا کسی مسلمان سے نہ دن کو لڑنا چاہتے ہیں، نہ رات کو۔ البتہ اگر آپ زیادتی اور تعدی پر تلے رہیں گے تو ہم مجبور ہوں گے۔ ہمیں امید ہے خدا نے جس طرح آپ کے بھائی پر ہمیں رات کو فتح عطا کی تھی، اسی طرح آپ پر دن کو فتح یاب کرے گا۔ خدا سے ڈریئے اور ناحق پر اصرار نہ کیجیے۔

سید صاحب کا یہ قول بھی حرف بہ حرف پورا ہوا جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

مولانا کی تشریف آوری

غرض سید صاحب گڑھی امان زئی سے تورو پہنچ گئے۔ مولانا اسماعیل کو بھی امب سے بلا لیا۔ منشی محمدی انصاری نے اپنی طرف سے مولانا کو لکھ بھیجا کہ اپنی تشریف آوری کی خبر کو شہرت دیجیے، اس لیے کہ آپ کی شجاعت اس دیار کے خاص و عام پر روشن ہے۔ کیا عجب ہے کہ دشمن آپ کا نام سن کر مرعوب ہو جائیں اور اسی طرح مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔

مولانا نے امب کے سارے معاملات شیخ بلند بخت دیوبندی کے حوالے کیے۔ خود شیخ ولی محمد اور دو سو غازیوں کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ کشتیاں امب کے بجائے ستھانہ میں پہنچا دیں۔ دوپہر کا کھانا ستھانہ میں کھایا۔ رات کھبل میں گزاری، جہاں پیر محمد مورائیں کی جماعت موجود تھی۔ اس میں سے بھی ستر غازی ساتھ لیے توپی، پنج پیر اور دھوبیاں ہوتے ہوئے تورو پہنچ گئے۔ راستے کے خوانین و علما بھی اپنے آدمی لے کر ساتھ ہو گئے تھے۔ ان میں سے اخوند سید امیر صاحب (ملا صاحب کوٹھا) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سید صاحب نے تورو سے باہر نکل کر استقبال کیا اور تمام غازیوں سے معانقہ فرمایا۔

غازیوں کے درجات

راوی کہتے ہیں کہ ایک روز سید صاحب اپنے مخلص فداکاروں کے گروہ میں تشریف فرما تھے۔ باتیں کرتے کرتے فرمایا: ہمارے جو بھائی یہاں بیٹھے ہیں، بارگاہ الٰہی کے ستودہ ہیں اور رحمت نامتناہی کے مورد۔ میں اگر ان کے ایمان پہ سوگند شرعی کھاؤں تو انشاء اللہ حانث نہ ہوں گا

اور اگر ان کی مقبولیت پر قسم اٹھاؤں تو وہ جھوٹی نہ ہوگی"[1]

ایمان کی پختگی اور اخلاص و برگزیدگی کے استحکام کی اس سے بڑی شہادت کیا ہو سکتی ہے کہ یہ لوگ اس دنیا کی ہر شے رضائے خدا کے لیے وقف کر چکے تھے اور زندگی کے ہر محبوب رشتے کو اسلام کی سربلندی کے لیے توڑ چکے تھے۔

ایک انوکھا واقعہ

ٹورو میں اتفاقیہ ایک واقعہ پیش آگیا، جس سے سید صاحب کی دینی عظمت و اخلاص کا ایک دلکشا منظر سامنے آتا ہے۔ آپ کے باورچی خانے کا انتظام مولوی عبدالقیوم کے سپرد تھا۔ قادر بخش گنج پوری کھانا پکاتا تھا جو پخت و پز میں یگانہ استاد مانا جاتا تھا۔ میاں عبداللہ اور بعض دوسرے اصحاب وقتاً فوقتاً قادر بخش کا ہاتھ بٹاتے رہتے تھے۔

ایک روز گوشت کی ہنڈیا چولھے پر تھی اور اس میں پانی کم رہ گیا تھا کہ مغرب کا وقت آگیا۔ قادر بخش نے میاں عبداللہ سے کہا کہ ذرا خیال رکھنا میں نماز کی تیاری کر لوں۔ اذان ہوئی میاں عبداللہ نے آگ چولھے سے باہر نکال دی اور خود بھی نماز میں شریک ہو گئے۔ اس اثنا میں گوشت کو داغ لگ گیا۔ قادر بخش نماز سے فارغ ہو کر آیا تو داغی بوٹیاں الگ کیں، شوربا پک کر سید صاحب کے سامنے آیا تو اس میں جلنے کی بو باقی تھی۔ آپ نے پوچھا: آج کیسا پکایا کہ داغ کھا گیا۔ قادر بخش نے کہا کہ میں نماز کے لیے اٹھا اور میاں عبداللہ سے کہا کہ ہنڈیا کا خیال رکھنا۔ وہ بھی نماز کے لیے چلے گئے اور ہنڈیا چولھے سے نہ اتاری، اس طرح داغ لگ گیا۔ آپ کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ آپ اس کے سپرد کر گئے، اس "مردود" نے خبر نہ لی اور گوشت کھانے کے قابل نہ رہا۔ چنانچہ آپ نے دال سے روٹی کھائی۔

انتباہ اور معافی

اس موقع پر میاں جی نظام الدین چشتی، قاضی علاؤ الدین، مولوی وارث علی، مولوی امام الدین، حافظ صابر وغیرہ موجود تھے۔ سب چپ رہے، لیکن عشا کی نماز کے لیے نکلے تو آپس میں مشورہ کیا کہ حضرت کی زبان سے عادت شریف کے خلاف نادانستہ سخت لفظ نکل گیا۔ اس کی اطلاع آپ کو ضرور کر دی چاہیے۔ آپ خود کئی مرتبہ فرما چکے ہیں کہ میں بشر ہوں۔ اگر کسی وقت کچھ بے جا اور خلاف شریعت بات میری زبان سے صادر ہو تو ضرور مجھے آگاہ کرنا، ورنہ قیامت کے روز سب کا دامن پکڑوں گا۔

نماز سے فارغ ہو کر ڈیرے پر آئے تو میاں جی نظام الدین چشتی نے یاد دلایا کہ آپ نے میاں عبداللہ کو آج "مردود" کہا، یہ کلام کسی مسلمان کو کہنا کیسا ہے؟ آپ نے کچھ دیر سکوت فرمایا، پھر کہا کہ یہ لفظ کسی مسلمان

---

[1] منظورہ صفحہ ۲۴۴

کو نہ کہنا چاہیے۔ میری زبان سے بے اختیاری میں نکل گیا۔ سخت قصور ہُوا۔ پھر آپ نے میاں عبداللہ کو بُلایا اور پاس بٹھا کر کہا کہ بھائی ہم آپ کے قصوروار ہیں۔ غصّے میں ناوانستہ سخت لفظ زبان سے نکل گیا۔ ﷲ معاف کر دیجیے۔ میاں عبداللہ کو ذرا اونچا سنائی دیتا تھا، اس نے سمجھا کہ شام والے واقعہ کا ذکر ہے، بولا: حضرت! آپ کا سالن مجھ سے جل گیا ہے، سخت نادم ہُوں۔ مجھے معاف فرما دیجیے۔ سید صاحب نے بلند آواز سے دوبارہ کہا کہ آپ کی کچھ خطا نہیں، خطا میری ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ میاں عبداللہ نے سید صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ میں نے معاف کیا۔ آپ میرے لیے دعا فرمائیے۔ خدا مجھے معاف کرے۔ سید صاحب نے پھر بہ آواز بلند فرمایا کہ بھائیو! میں اپنی خطا سے توبہ کرتا ہُوں۔ اس کے بعد دیر تک وعظ فرماتے رہے۔ مولانا شاہ اسماعیل آئے تو خود پورا واقعہ اور اپنے معافی مانگنے کا حال انھیں سُنایا۔

پچیسواں باب

جنگ مایار

(۱)

میدانِ جنگ سید صاحب اس وجہ سے گڑھی امان زئی کو چھوڑ کر تورو پہنچے تھے کہ درانیوں کا رُخ مردان کی طرف تھا اور وہ لڑائی پر تُلے ہُوئے نظر آتے تھے۔ تورو مردان سے چار میل جنوب میں ہوگا۔ دونوں کے عین وسط میں مایار ہے، جس کی مغربی سمت کے میدان میں گھمسان کی جنگ ہوئی تھی۔ لہٰذا یہ مایار کی جنگ کہلائی۔ بعض اصحاب نے اسے ضلع تورو کی جنگ کہا[1]، یقیناً اس لیے کہ مایار کے مقابلے میں تورو زیادہ مشہور و ممتاز مقام تھا اور میدان جنگ سے قریب واقع تھا یا اس لیے کہ سید صاحب نے جنگ مایار کے لیے تورو کو بوجہ قرب مرکز بنایا تھا۔

سید صاحب خود تو غازیوں کے بڑے جتھے کے ساتھ تورو میں مقیم ہُوئے۔ قندھاریوں اور ننگرہاریوں کی ایک جماعت کو گڑھی مایار میں بٹھا دیا۔ درانی اگر ہوتی مردان سے تورو پر پیش قدمی کرتے تو مایار کے غازی انھیں روک سکتے تھے۔ جا بجا پہروں کا انتظام بھی کر دیا۔

پہلی جھڑپ مولانا شاہ اسماعیل کے پہنچنے سے دوسرے دن سید صاحب کے طلایہ گرد سواروں نے اطلاع دی کہ درانیوں کی فوج گڑھی مایار پر حملے کے ارادے سے نکلی ہے۔ سید صاحب اس وقت مسجد میں بیٹھے ہُوئے فرما رہے تھے:

> اللہ تعالیٰ کا کارخانہ دیکھیے۔ ہم ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے کہ مسلمانوں کو متفق کر کے کافروں سے جنگ کریں۔ بڑے افسوس کی جگہ ہے کہ کفار تو در کنار یہ مسلمان ہی ہمارے مخالف اور دشمن جانی بن گئے اور ہم سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ہم تو ہرگز نہیں چاہتے کہ ان سے لڑیں۔ چنانچہ سلطان محمد خاں کو بارہا سمجھایا۔ لیکن نفس و شیطان نے اس کو شر و فساد پر اس درجہ آمادہ کر دیا کہ کچھ اس کے ذہن میں نہ آیا۔ خیر، مشیت اگر یونہی ہے تو ہم ناچار ہیں، جو کچھ ہوگا، دیکھ لیں گے۔"

---

[1] وصایائے نواب وزیرالدولہ مرحوم حصہ دوم صفحہ ۱۱۱

درانیوں کے نکلنے کی خبر سنتے ہی سید صاحب نے شتری نقارہ بجا کر کوچ کا حکم دے دیا۔ میدان میں پہنچے تو خضر خاں مایار سے یہ خبر لایا کہ درانیوں نے کچھ آدمی بھیج کر گڑھی پر گولیاں چلوائی تھیں۔ جب گڑھی سے جواب میں باڑھیں ماری گئیں تو درانی واپس چلے گئے۔ سید صاحب دیر تک میدان میں ٹھہرے رہے کہ ممکن ہے درانیوں کی مراجعت جنگی چال پر مبنی ہو اور بے خبر پا کر وہ دوبارہ حملہ کر دیں۔ جب یقینی طور پر اطلاع مل گئی کہ فوری حملے کا کوئی اندیشہ نہیں تو سید صاحب پہروں کا انتظام کر کے تورڈ چلے آئے۔

صبح جنگ

آپ نے حکم دے دیا تھا کہ پیادوں اور سواروں میں سے باری باری آدھے سوئیں اور آدھے جاگتے رہیں۔ اس حکم پر پورے اہتمام سے عمل ہوا۔ دوسرے روز نماز فجر ادا کرنے کے بعد سید صاحب نے ننگے سر ہو کر عاجزی سے دعا کی۔ پھر غازی کھانا پکانے میں لگ گئے۔ عین اس حالت میں ملا نعل محمد قندھاری کے ایک آدمی نے یہ خبر پہنچائی کہ درانی فوج میں کوچ کا پہلا نقارہ بج چکا ہے۔ اس کے پیچھے مایار سے ایک اور آدمی آگیا کہ درانی فوج میں دوسرا نقارہ بھی بج چکا ہے۔ غازی کھانے سے بے پروا ہو کر فوراً تیار ہو گئے۔ اس وقت سید صاحب کے پاس مندرجہ ذیل ملکی خوانین و علما موجود تھے:

(۱) فتح خاں (پنجتار)، (۲) منصور خاں (گھڑیالہ)، (۳) آنند خاں (شیوہ)، (۴) مشکار خاں (شیوہ)، (۵) اسماعیل خاں (کھلابٹ)، (۶) سرور خاں (امان زئی)، (۷) خواص خاں (اکوڑہ خٹک)، (۸) شہباز خاں (اکوڑہ خٹک برادرزادہ خواص خاں)، (۹) فتح خاں (زیدہ)، (۱۰) دلیل خاں (تورو)، (۱۱) نسیم خاں (لوند خوڑ)، (۱۲) قاضی سید امیر (کوٹھا)، (۱۳) ملا بہاء الدین (ٹوپی)، (۱۴) ملا باقی (ڈاگئی)۔

فریقین کی جنگی قوت

میں جس حد تک تحقیق کر سکا ہوں درانی فوج اس وقت بارہ ہزار تھی —— چار ہزار پیادے اور آٹھ ہزار سوار —— ان کے پاس دو بڑی اور چار چھوٹی توپیں تھیں۔ سید صاحب کے پاس غازیوں کے علاوہ ملکی آدمی بھی تھے۔ ان سب کی مجموعی تعداد ساڑھے تین ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ سوار صرف پانسو تھے۔ توپ کوئی نہ تھی۔ سید صاحب لڑنے کے خواہاں بھی نہ تھے اور انھیں لڑائی کا خیال بھی نہ تھا۔ جب لڑائی ناگزیر ہو گئی تو اب گڑھی کے محاذ سے توپیں اٹھوا کر لانے کا کوئی موقع ہی نہ رہا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سید صاحب نے اس امر کو مشرقی خط دفاع کی مصلحتوں کے خلاف سمجھا ہو[1]

---

[1] وقائع میں ہے کہ درانی فوج تخمیناً بیس ہزار تھی، اور سید صاحب کے پاس ملکیوں سمیت بارہ ہزار آدمی تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مبالغہ آمیز شنید یا سرسری تخمینہ ہے۔ اس کے مقابلے میں مجھے "منظورہ" کا بیان زیادہ قرین قیاس معلوم ہوا۔ "وقائع" میں یہ بھی ہے کہ مایار کی طرف بڑھتے ہی توپوں کے گولے آنے لگے تو اکثر ملکی ادھر ادھر چھپ گئے اور سید صاحب کے ساتھ تخمیناً دو ہزار آدمی رہ گئے۔ خوانین نے ایک لحظہ کے لیے بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ بیلیو نے لکھا ہے کہ پیادے پانسو تھے اور سب کے سب ہندوستانی تھے۔ سوار [illegible] تھے اور ان میں زیادہ تر ملکی تھے۔ یہ بیان بھی صحیح نہیں۔

مایار اور تورو کے درمیان نالہ بہتا ہے جس کا نام "چھلپانی" ہے۔ سید صاحب نے پیادوں کی صف بندی شروع میں کر دی تھی۔ نالہ عبور کرتے وقت صف بندی قائم نہ رہ سکی۔ پانی کمر تک آیا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر صفیں پھر درست کر لی گئیں۔ تین صفیں تھیں۔ اگلی اور پچھلی صف میں ہندوستانی غازی تھے۔ بیچ کی صف میں ملکی تھے۔ سواروں کو پیادوں کی صفوں کے بائیں جانب پیچھے رکھا تھا۔ ان سے آگے شاہین زنوں کا جیش تھا، جس کے سر عسکر شیخ عبداللہ رام پوری تھے۔ سواروں کو تاکید کر دی گئی تھی کہ جب تک حکم نہ ہو، قطعاً حملہ نہ کریں۔ قندھاری اور ننگرہاری یا تو مایار میں تھے یا چھلپانی کے کنارے جا بجا پہروں پر۔ غازیوں نے پیش قدمی کی تو ندی والے غازی بھی ساتھ مل گئے ہوں گے۔

کالے خاں شمس آبادی

شمس آباد مئو کے کالے خاں ایک نہایت مخلص غازی تھے۔ کئی لڑائیوں میں شریک رہے۔ چھتر بائی پر جو حملہ حافظ عبداللطیف نے بطور خود کرا دیا تھا، اس میں بھی شامل تھے۔ یاد ہوگا کہ اس حملے میں سیڑھی بھی استعمال کی گئی تھی، جو چھوٹی تھی۔ اتفاق سے جو غازی اس سیڑھی پر سب سے پہلے چڑھا، اس کا قد چھوٹا تھا۔ اوّل سیڑھی چھوٹی، دوسرے غازی کا قد چھوٹا۔ چھتر بائی کی دیوار تک پہنچنا مشکل ہو گیا اور حملہ ناکام رہا۔ کالے خاں خوب لمبے قد کے تھے؛ انھیں خیال ہوا کہ اگر میں پہلے چڑھتا تو ہاتھ بڑھا کر منڈیر پکڑ لیتا اور میرے چڑھ جانے کے بعد دوسرے غازیوں کے لیے اُوپر جانے کی کوئی صورت نکل آتی۔ بس اسی واقعہ سے دل برداشتہ ہو کر واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ غازیوں نے بھی سمجھایا، سید صاحب نے بھی نصیحت فرمائی، کالے خاں پر کچھ اثر نہ ہوا۔ لاہور یا امرتسر میں ان کا ایک پرانا رفیق ملا۔ اس نے سارا قصہ سُن کر کہا کہ ہم تو سید صاحب کے پاس پہنچنے کے لیے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ تم بڑے کم نصیب ہو کہ انھیں چھوڑ کر چلے آئے! کالے خاں پر اتنا اثر ہوا کہ فوراً ایک یابو خریدا اور واپس ہو گئے۔ سید صاحب امب سے پنجتار آ گئے تھے کہ کالے خاں بھی پہنچ گئے۔ جاتے ہی عرض کیا کہ یابو کسی بھائی کو دے دیجیے، میں سارا وقت آپ ہی کی خدمت میں گزارنا چاہتا ہوں۔ سید صاحب نے ان سے وعدہ فرمایا کہ جنگ ہوئی تو گھوڑا دوں گا۔ چنانچہ جنگ مایار کے دن عبداللہ دالیا کا گھوڑا کالے خاں کو دے دیا۔ انھوں نے رکاب میں پاؤں رکھا تو بولے کہ ضرورت پڑی تو اپنا سر بھی دشمن کی توپ کے مُنہ میں دے دوں گا۔

پیادوں اور سواروں میں ادل بدل

مولوی فتح علی سواروں میں شامل تھے۔ اچانک انھیں خیال آیا کہ مقابلہ بڑا سخت ہے، خدا جانے کیا حالات پیش آئیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ میں پیادوں میں شامل ہو جاؤں تاکہ سید صاحب کے پاس رہوں۔ چنانچہ فوراً خدمتِ والا میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ [illegible] سواری کا [illegible] شوق نہیں [illegible] گھوڑا کسی [illegible] کو دے دیجیے جو میدانِ جنگ

میں اس سے بہتر کام لے سکے اور ساتھ ہی میرے بھیلے وار سید اسماعیل رائے بریلوی سے فرمادیجیے۔ سید صاحب نے مولوی فتح علی کی درخواست منظور فرمالی۔ پھر سب غازیوں کو حکم دے دیا کہ جو بھائی سواری میں زیادہ طاق نہ ہو، وہ اپنا گھوڑا دوسرے کو دے دے۔ چنانچہ فتح علی عظیم آبادیؒ کے علاوہ، مولوی مظہر علی عظیم آبادی، مولوی قمرالدین عظیم آبادی، مولوی عثمان علی عظیم آبادی اور مولوی مدد علی غازی پوری نے گھوڑے چھوڑ دیے۔ ان کے گھوڑے، بہادر خاں بنارسی، شمشیر خاں بنارسی، حسن خاں بنارسی، دین محمد عظیم آبادی اور عبداللہ خاں (وطن معلوم نہیں) کو دے دیے گئے۔

سیّد صاحب کا لباس

سید صاحب نے اس روز جو لباس زیب بر کیا اور جو ہتھیار لگائے، ان کی تفصیل راویوں نے یہ بتائی ہے: چندیری کی سفید دستار، بادامی گُٹی کا سفید پاجامہ، بہت باریک چکن کا دوہرا انگرکھا، کمر میں سفید پٹکا، اس کے اوپر سُرخ کناروں اور سیاہ دھاریوں کی پشاوری لنگی۔ لنگی کے سوا تمام پارچے شیخ غلام علی الہ آبادی کے نذر کیے ہوئے تھے۔ وہ وقتاً فوقتاً سید صاحب کے لیے خاص جوڑے تیار کرا کرا کے بھیجتے رہتے تھے۔ تپنچوں کی ہشت پہلو ولایتی جوڑی، فولادی چھُری، جس کا دستہ شیر ماہی کا تھا اور میان کیمختی ساختی۔ آپ کے ہمراہ دونوں بازوؤں پر آپ کے دو رفل بردار تھے۔ ایک حافظ صابر تھانوی، دوسرا اشرف الدین بنگالی۔ ایک ولایتی رفل متھو خاں قندھاری نے لکھنؤ میں بطور نذر پیش کی تھی۔ دوسری رفل آپ عرب سے خرید کر لائے تھے۔

جنگ کا آغاز

درانی ہوتی سے نکلے تو انھوں نے گزرگاہ عام پر ایک جگہ دائیں بائیں دو نیزے گاڑ دیے اور دروازہ سا بنا لیا۔ بیچ میں قرآن شریف لٹکا دیا۔ تمام پیادوں اور سواروں کو اس کے نیچے سے گزارا۔ یہ گویا ایک قسم کا حلف تھا کہ وہ جنگ سے منہ نہ موڑیں گے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ پہلے سید صاحب کے غازیوں پر توپوں سے گولوں کی بارش کریں، اس کے ساتھ ساتھ پیادے گڑھی امازئی پر حملہ کریں اور سوار غازیوں کے جیوش کو درہم برہم کر ڈالیں۔ سید صاحب نے چھلیانی سے گزر کر صف بندی کی، آگے بڑھے تو درانی توپوں کے گولے پے بہ پے آ رہے تھے۔ کالے خاں شمس آبادی سبزہ رنگ گھوڑے پر سوار سب سے آگے تھے۔ سب سے پہلے سقائے لشکر اسلام شہید ہوا، جو ندی سے مشکیزے میں پانی بھر بھر کر غازیوں کو پلاتا تھا۔ علاقہ میدانی تھا اور چھپنے یا مورچہ پکڑنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اسی اثنا میں ایک گولہ آیا اور کالے خاں سے تھوڑے فاصلے پر گرا۔ پھر اچھلا اور بہادر غازی کے پہلو میں لگا۔ ان کے مہلک زخم لگا۔ سید صاحب نے سنا تو فرمایا: انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ساتھ ہی حکم دیا کہ انھیں اٹھا کر امازئی پہنچا دیا جائے۔

قلندر کابلی بھی ساتھ تھا۔ وہ جب خوش ہوتا تو بڑی دلکش لے میں: "مرحبا سید مکی مدنی العربی" گاتا

کرتا تھا۔ صفوں سے چار قدم آگے اچھلتا کودتا اور گاتا جا رہا تھا۔ ایک گولہ اس کے قریب آ کر گرا۔ گرد و غبار کا ایسا طوفان اُٹھا کہ قلندر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ سب سمجھے کہ اس نے شہادت پائی۔ غبار چھٹا تو کیا دیکھتے ہیں کہ قلندر دلق کا ایک سرا پکڑے بے تکلفی سے سر کے گرد گھما رہا ہے اور وفورِ مسرت سے ناچ رہا ہے۔ مایار تک پہنچتے پہنچتے چند غازی شہید ہوئے۔

رجز خوانی

دو غازی "رجز خوانی" کر رہے تھے: ایک امان اللہ خاں ملیح آبادی، دوسرے شیخ ریاست علی موہانی۔ امان اللہ اگرچہ خاصے سن رسیدہ تھے، لیکن ہمت و شجاعت کا یہ عالم تھا کہ بزدل بھی ان کی باتیں سُن سُن کر شیر دل بن جاتے۔ ان کی لَے بڑی پُر تاثیر تھی۔ شیخ ریاست علی بھی بڑے خوش گلو تھے۔ مولوی خرّم علی بلہوری کا منظوم جہادیہ پڑھتے جا رہے تھے:

جس کے پیروں پہ گرے گردِ صفِ جنگ جہاد　　وہ جہنم سے بچا، نار سے ہے وہ آزاد
اے برادر تو حدیثِ نبویؐ کو سُن لے　　باغِ فردوس ہے تلواروں کے سایے کے تلے
جو مسلمان رہِ حق میں لڑا لحظہ بھر　　روضۂ خلد بریں، ہو گیا واجب، اس پہ
آج جو اپنی خوشی جان خدا کو دو گے　　پھر تو کل شوق سے جنت کے مزے لوٹو گے[1]

منظورہ کا بیان

اسی طرح غازی مایار کے باغ تک پہنچ گئے، جو غالباً بستی کے جنوب مشرق میں تھا اس کے بعد جنگ کی تفصیلات کے متعلق روایتوں میں اختلاف ہے۔ "منظورہ" کا بیان ہے کہ پیادوں کی صفوں میں صرف سید صاحب گھوڑے پر سوار تھے۔ ایک غازی نے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور ادب سے عرض کیا کہ یا تو گھوڑے سے اُتر جائیے یا پیچھے چلے جائیے۔ آپ سب میں نمایاں ہیں، مبادا دشمن تاک کر آپ پر گولے پھینکے۔ سید صاحب فوراً اتر گئے اور گھوڑا ایک غازی کو دے کر صفوں میں شامل ہونے کا حکم دے دیا۔ پھر فرمایا کہ سب سے پہلے توپوں پر قبضہ کرنا چاہیے۔ اس غرض کے لیے دوڑ کر توپوں کے مقام پر پہنچنا مناسب نہیں۔ دوڑنے میں سانس پھول جاتا ہے۔ صف بندی قائم رکھتے ہوئے تیز پیش قدمی لازم ہے۔

جب توپیں ایک گولی کے فاصلے پر رہ گئیں تو ایک گولہ غازیوں کے عین سامنے گرا۔ اس سے

---

[1] مولوی خرم علی نے فضائلِ جہاد کی آیات و احادیث فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں بطریقِ مثنوی نظم کر دی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ نظمیں عام طور پر پڑھی جاتی تھیں۔ روایتوں میں اُردو نظم کے پڑھے جانے کی تصریح صرف جنگ مایار کے ذکر میں ہوئی ہے۔ میں نے اس باب کے آخر میں جہادیہ (اردو) کو بہ طور ضمیمہ درج کر دیا ہے۔

میاں جی محی الدین کی ایڑی زخمی ہوگئی۔ اسی زخم کے باعث وہ کچھ مدت بعد پنجتار میں فوت ہوئے۔ سید صاحب تکبیر پڑھتے ہوئے بہ دستور آگے بڑھتے گئے۔ صفوں کا نظم بھی باقی رہا۔ ایک گولہ صفوں میں گرا جس سے تین غازی شہید ہوئے۔ اس اثنا میں ایک توپ کے پایے ٹوٹ گئے اور وہ چرخ سے نیچے گر پڑی۔ غازی قریب پہنچ گئے تو درانی توپچی بھاگ نکلے۔ غازیوں نے توپوں پر قبضہ کر لیا تو درانی سواروں نے شدید حملہ کر دیا۔ پھر پے بہ پے ان کے کئی گروہ آئے لیکن تھوڑی دیر میں سب درہم برہم ہو کر بھاگ گئے۔ راوی کہتا ہے کہ معلوم ہوتا تھا مکھیاں تھیں جو بار بار شیروں پر گرتی تھیں اور غائب ہو جاتی تھیں[1]۔

وقائع کا بیان

وقائع کا بیان زیادہ مفصّل اور واضح ہے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ درانی فوج کے چار غول تھے: ایک پیادوں کا اور تین سواروں کے۔ کالے خاں کے زخمی ہونے کے بعد سید صاحبؒ نے ننگے سر ہو کر بہ کمالِ عجز و زاری جنابِ باری میں دعا کی کہ الٰہی! ہم عاجز اور ضعیف بندے ہیں۔ تیرے سوا اور کوئی حامی و مددگار نہیں جو ہم کو بچائے۔ ہم نے بہتیرا ان کو سمجھایا کہ ہم مسلمانوں سے نہ لڑو، مگر وہ نہ مانے تو دانا و بینا ہے۔ ہمارے دلوں کے بھید جانتا ہے۔ اگر تیرے علم میں ہم حق پر ہوں تو ہم ضعیفوں کو فتح یاب کر اور اگر وہ حق پر ہوں تو ان کو فیروزمندی عطا کر۔

اس اثنا میں سواروں کا ایک غول باگیں اُٹھائے تیزی سے آیا۔ سب کی زبان پہ تھا: "سیّد کجاست، سیّد کجاست؟" (سید کہاں ہے؟، سید کہاں ہے؟) سید صاحب کا حکم تھا کہ کوئی بھائی ہماری اجازت کے بغیر بندوق نہ چلائے۔ سوار جب چالیس پچاس قدم کے فاصلے پر رہ گئے تو سید صاحب نے رفل اٹھائی، اور بلند آواز سے تکبیر کہہ کر سر کی، ساتھ ہی غازیوں نے باڑھ ماری۔ پھر تو انھیں بھرمار پر دھر لیا۔ قرابین چی قرابینیں مارتے تھے، بندوقچی بندوقیں، تلواروں اور گنڈاسوں والے اپنے ہتھیاروں سے کام لے رہے تھے۔ درانی سوار لوٹے تو سید صاحب نے فرمایا کہ اب ہمارے سوار تعاقب کریں، لیکن سید صاحب کے سوار پہلے ہی منتشر ہو چکے تھے۔

سواروں کا انتشار

دُرّانی سواروں نے حملہ کیا تو چونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس لیے دُور سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سید صاحب غازیوں سمیت ان کے نرغے میں آگئے

---

[1] معمول کے مطابق سید صاحب نے جنگ چھڑنے سے پیشتر فرمایا تھا کہ جس بھائی کو سورۂ قریش یاد ہو، گیارہ مرتبہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لے، نیز یہ دعا پڑھے: اَللّٰھُمَّ اھزِمھُم وَ زَلزِل اَقدَامَھُم وَشَتِّت شَملَھُم وَفَرِّق جَمعَھُم وَ خَرِّب بُنیَانَھُم وَخُذھُم اَخذَ عَزِیزٍ مُقتَدِرٍ۔ یہ دعا سید صاحب ہر نماز کے بعد بلند آواز سے پڑھا کرتے تھے۔

ہیں۔ اس وقت حاجی عبدالرحیم خاں، جو سید صاحب کے خاص جاں نثاروں میں سے تھے، بےتاب ہوگئے۔ آس پاس کے رفیقوں سے کہا کہ اگر حضرت نہ رہے تو ہماری زندگی کس کام آئے گی۔ آؤ ان پر دائیں جانب سے ہلہ کریں۔ یہ کہتے ہی باگیں اٹھا کر سرپٹ چل دیے۔ آس پاس کے سوار بھی ان کے ساتھ ہوگئے۔ رسالدار عبدالحمید خاں نے دیکھا تو سمجھے کہ حملے کا حکم ہوگیا، چنانچہ وہ بھی پورے رسالے کو لے کر بڑھے۔ ان کا حملہ بڑا سخت تھا لیکن سوار بکھر گئے۔ بعض اکا دکا دشمنوں میں گھر کر شہید یا زخمی ہوئے، بعض پیچھے ہٹتے ہٹتے دُور تک نکل گئے۔ سواروں میں سے ارباب بہرام خاں اور فتح خاں پنجتاری اپنے آدمیوں سمیت جگہ پر جمے رہے۔ انھوں نے سید صاحب کے حکم کے مطابق حملہ کرنا چاہا لیکن چونکہ تعداد میں بہت کم تھے، اس لیے انھیں روک دیا گیا۔

توپوں پر یورش

اس موقع پر مولانا شاہ اسماعیل نے شیخ ولی محمد سے کہا کہ اب توپوں پر قبضہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ وہ ڈیڑھ سو غازیوں کو لے کر بھاگنے والے سواروں کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ اس اثنا میں توپچی اپنے سنبے لے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مولانا نے توپوں پر قبضہ کر لیا۔ نواب خاں لنگری گتنے والے کے پاس ایک لٹھ سنبے جیسا تھا۔ اسے لے کر توپ بھری، شیر محمد خاں سے توڑا لے کر درانیوں پر داغی۔ چار مرتبہ فیر کیے تو درانی منتشر ہوگئے۔ پھر سید صاحب نے مولانا کو اپنے پاس بلا لیا۔ مولانا توپیں کھینچتے ہوئے سید صاحب کے پاس پہنچ گئے۔

درانیوں کا دوسرا حملہ

درانی سواروں کا ایک غول تتر بتر ہو چکا تھا۔ مولانا اور شیخ ولی محمد توپوں کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ اس اثنا میں درانیوں کے دوسرے غول نے حملہ کر دیا۔ وہ بھی پہلے غول کی طرح "سید کجا ست؟" "سید کجا ست؟" کہتے ہوئے آئے۔ سید صاحب کے پاس اس وقت زیادہ سے زیادہ پانسو غازی ہوں گے۔ آپ کے رفل بردار باری باری بندوقیں بھر بھر کر دے رہے تھے اور آپ داہنے بازو والے کی بندوق دائیں جانب اور بائیں بازو والے کی بائیں جانب سینے پر رکھ کر چلاتے جاتے تھے۔ ہر فائر کے بعد فرماتے: "سید ہمین است"۔ تھوڑی دیر میں یہ غول بھی بکھر گیا اور میدان صاف ہوگیا۔ کچھ غازی ان کے تعاقب میں ادھر ادھر نکل گئے۔ سید صاحب کے پاس صرف پچاس ساٹھ کی جمعیت رہ گئی۔

تیسرا حملہ

اس اثنا میں چھ سات سو سواروں کا ایک اور ہلہ آگیا۔ سید صاحب دوسری طرف مشغول تھے۔ ایک غازی نے خبردار کرنے کے لیے پکار کر کہا: حضرت ادھر سے ہلہ آرہا ہے۔ دوسرے غازیوں نے روک دیا کہ حضرت کا ذکر نہ کرو، دشمن کو خبر ہو جائے گی۔ اس غول کو بھی ناکام و نامراد بھاگنا پڑا۔

جب سارا درانی لشکر بندوقوں کی زد سے باہر نکل گیا تو آتش باری موقوف کی۔ پہلے حملے چونکہ بڑے بڑے غولوں نے کیے تھے، اس لیے گرد و غبار کی وجہ سے فضا پر تاریکی سی چھا جاتی رہی۔ تیسرے حملے کے سوار چونکہ کم تھے، اس لیے غبار زیادہ نہ اُڑا۔ سید صاحب کی ہر گولی سے سوار گرتا اور گھوڑا بھاگ جاتا۔

آخری حملے کے متعلق "منظورہ" کا بیان یہ ہے کہ درانیوں کا ایک رسالہ غازیوں کے سواروں کا تعاقب کرتا ہُوا تورو کی طرف نکل گیا۔ وہ واپس ہُوا تو اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ لڑائی کا نقشہ منقلب ہو چکا ہے۔ وہ غازیوں کو اپنے آدمی سمجھتے ہُوئے بے تکلف چلے آئے۔ قریب پہنچے اور غلط فہمی دور ہوئی تو پیچھے ہٹے۔ غازیوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ توپیں آگئیں تو سید صاحب نے خود شست دیکھ کر چند فائر کرائے۔ ان کی وجہ سے بھی درانی خائف ہو کر جلد بھاگ گئے۔

مولانا خطرے میں

مولانا شاہ اسماعیل کی انگلی پر جب سے شنکیاری میں زخم لگا تھا، وہ جلد جلد بندوق بھرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ اس حملے میں بھی کئی درانی سواروں کو انھوں نے مار گرایا۔ پھر ایک سوار ان کے بالکل قریب آگیا۔ وہ بندوق بھر نہ سکے۔ خود بعد میں فرماتے تھے کہ شہادت کا یقین ہو گیا۔ اس اثنا میں حافظ وجیہ الدین پھلتی کی نظر پڑی۔ انھوں نے فوراً سوار پر بندوق سر کی۔ وہ گولی لگتے ہی گرا، اس طرح مولانا کی جان بچی۔ اگر وہ چار لمحے کی بھی تاخیر جاتی تو مولانا کا زندہ بچنا بظاہر بالکل مشکل تھا۔

بہت سے درانی سوار مارے گئے۔ ان میں اسرائیل خاں بھی تھا جو پہلوانی میں بہت مشہور مانا جاتا تھا اور نشانچی بھی اعلیٰ درجے کا تھا۔ یار محمد خاں کی شادی اس کی بہن سے ہُوئی تھی۔ غالباً سلطان محمد خاں اور پیر محمد خاں کے ساتھ بھی رشتہ تھا۔ شیخ ولی محمد فرماتے تھے کہ اس پر میں نے اور بعض دوسرے غازیوں نے ایک دم گولیاں چلائیں۔ معلوم نہیں وہ کس کی گولی سے ہلاک ہُوا۔

جنگ کا خاتمہ

میدان درانیوں سے صاف ہو چکا تھا۔ سلطان محمد خاں دن کے وقت لڑائی کا طلب گار تھا، اس کی یہ طلب پوری ہو چکی تھی۔ سید صاحب دیر تک میدان میں ٹھہرے رہے کہ مبادا درانی پھر پلٹ کر حملہ کر دیں۔ غازیوں نے صبح سے کچھ کھایا نہیں تھا۔ گرمی کا موسم، پیاس لگی ہوئی تھی۔ میدان میں ایک چھوٹا سا تالاب تھا۔ اسی کا گرم پانی پیتے رہے۔ پھر مایار کی عورتیں گھڑوں اور بدھنوں میں پانی لے آئیں۔ جب اطمینان ہو گیا کہ اب درانی نہیں آئیں گے تو سید صاحب مایار کی مشرقی سمت کے باغ میں جا ٹھہرے۔ چہرے پر گرد و غبار کی دبیز تہ جمی ہُوئی تھی۔ ارباب بہرام خاں نے رومال نکال کر پونچھنا چاہا تو فرمایا: "خان بھائی! ابھی ٹھہر جائیے، یہ غبار بڑی برکت والا ہے۔ رسول اللہ

(صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ جن غازیوں کے پاس روٹی تھی، انھوں نے روٹی کھائی، بعض نے ستو گھول کر پی لیے۔ پھر مایار سے کچھ روٹیاں آ گئیں۔

زخمیوں اور شہیدوں کے متعلق ہدایات

سید صاحب نے مولوی مظہر علی عظیم آبادی کو حکم دیا کہ چند غازیوں کو ساتھ لے کر پورے میدان میں پھریں۔ زخمیوں کو پہلے مایار، پھر تورو پہنچائیں اور شہیدوں کو دفنانے کا انتظام کریں۔ گھوڑے بھی زخمی پڑے تھے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ جن گھوڑوں کے زخم زیادہ سخت نہ ہوں اور ان کا علاج ہو سکے، انھیں پکڑ کر تورو لے چلو، جن کا علاج نہ ہو سکتا ہو، انھیں ذبح کر ڈالو۔

مولوی مظہر علی صاحب نے پھر پھر کر تمام لاشیں جمع کرائیں۔ غازیوں کی کل اٹھائیس لاشیں انھیں ملیں، جنھیں دو قبروں میں دفن کرایا۔ اسّی لاشیں درانیوں کی تھیں۔ ان کی تدفین ملکیوں کے ہاتھ سے عمل میں آئی۔ زخمیوں کو تورو پہنچا دیا۔ سید صاحب نے ظہر کی نماز مایار کے باغ میں پڑھی[1] پھر آپ تورو تشریف لے گئے۔

بقیہ لاشیں

جو غازی مایار اور تورو کے درمیان شہید ہو کر گرے تھے، ان کی لاشیں تورو پہنچا دی گئیں۔ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جنھیں زندہ اٹھایا گیا لیکن صرف رمق باقی تھی اور جلد جاں بحق ہو گئے۔ ان کے نام "منظورہ" کے بیان کے مطابق یہ ہیں:

۱۔ مولوی عبدالرحمٰن ساکن تورو، جو ابتدا سے سید صاحب کے ساتھ رہے۔ بارہا سفارتی خدمات انجام دیں۔ ان کا سر تن سے الگ ہو چکا تھا۔

۲۔ شیخ عبدالحکیم پھلتی، ان کا سر بھی تن سے الگ تھا۔ بڑی مشکل سے سر ڈھونڈھ کر لائے اور تن سے ملا دیا گیا۔

۳۔ کریم بخش گھاٹم پوری۔ ادھر لڑائی شروع ہو گئی ادھر انھوں نے جلدی جلدی اپنے ساتھیوں کے لیے روٹیاں پکا کر کمر میں باندھیں اور میدان جنگ کی طرف چلے۔ راستے میں درّانی سوار سید صاحب کے سواروں سے لڑتے بھڑتے آ رہے تھے۔ کریم بخش ان میں گھر گئے۔ کسی نے تلوار مار کر انھیں شہید کر ڈالا۔

۴۔ فضل الرحمٰن بردوانی۔

---

[1] منظورہ میں ہے [illegible] کے باغ میں پڑھی

۵ ۔ لعل محمد: ان کا وطن معلوم نہ ہو سکا۔ یہ سید صاحب کے باورچی خانے سے متعلق تھے۔

۶ ۔ حاجی عبدالرحیم پھلتی والے۔

۷ ۔ شیخ عبدالرحمٰن رائے بریلوی۔ یہ سخت زخمی ہُوئے تھے۔ تورو لا کر ان کے زخم سیے گئے۔ کچھ باتیں بھی کیں، پانی بھی پیا، پھر جاں بحق ہو گئے۔ غازیوں میں سے یہی تھے جنھیں غسل بھی دیا گیا اور کفن بھی پہنایا گیا۔

۸ ۔ میر رستم علی چل گانوی۔ ان کو اٹھا کر لایا گیا تو سسک رہے تھے۔ راستے میں یا تورو پہنچ کر فوت ہُوئے۔

۹ ۔ سیّد ابو محمد نصیر آبادی۔ ان کے مفصّل حالات آگے چل کر بیان ہوں گے۔

دو اور صاحب تھے جن کے نام راوی کو یاد نہ رہے۔

تورو میں تدفین

شاہ اسماعیل نے تورو سے باہر شمالی و مشرقی کونے میں ایک بڑی قبر کھدوائی اور تمام لاشوں کو مندرجہ ذیل ترتیب سے رکھا: سب سے آگے قبلہ رخ حاجی عبدالرحیم پھلتی والے، ان کے ساتھ سید ابو محمد نصیر آبادی، پھر میر رستم علی، شیخ عبدالحکیم پھلتی، فضل الرحمٰن، مولوی عبدالرحمٰن ساکن تورو، کریم بخش اور باقی حضرات۔ سب کے بعد عبدالرحمٰن رائے بریلوی کی لاش رکھی گئی، جنھیں کفن بھی پہنایا گیا تھا۔ باقی تمام اصحاب کو بلا غسل و کفن ان کے لباسوں ہی میں بدستور رکھ دیا گیا۔ مولانا نے فرمایا کہ ان کے عماموں کا ایک سرا لے کر مُنہ ڈھانپ دیے جائیں۔

بعد تدفین مولانا نے غازیوں سمیت دیر تک شہدا کے لیے مغفرت کی دعا کی۔ سب کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ ہر ایک کی زبان پر یہ کلمہ تھا کہ یہ بھائی تو جس مراد کو آئے تھے حاصل ہو گئی، خدا ہم لوگوں کو بھی اسی طرح شہادت نصیب کرے۔

دعا

تھوڑی دیر بعد مغرب کی اذان ہُوئی۔ سیّد صاحب نے خود نماز پڑھائی، پھر عجز و الحاح سے دُعا کی کہ:

> اے ہمارے پروردگار تُو خوب جانتا ہے کہ یہ سب لوگ محض تیری خوشنودی اور رضا جوئی کے لیے اپنے گھر بار، خویش و تبار، اہل و عیال اور مال و منال چھوڑ کر یہاں آئے تھے اور صرف تیری راہ میں انھوں نے اپنی جانیں صَرف کیں۔ ان کے گناہوں کو اپنے دامنِ رحمت میں چھپا لے، فردوس میں جگہ دے اور ان سے راضی ہو۔ ہم [illegible]

خوشنودی کی راہ میں جان و مال قربان کرنے کی توفیق عطا فرما۔ ہمارے سینوں میں جو شیطانی خطرات اور نفسانی وساوس خطور کرتے ہیں، ان کو دُور کر دے۔ دلوں کو اپنے اخلاص و محبت سے معمور رکھ۔ اپنے دین کو قوت اور ترقی بخش۔ جو لوگ اس دین کے دشمن اور بدخواہ ہیں، انھیں ذلیل و رسوا کر۔ جو مسلمان شریعت کے راہِ راست سے ہٹ کر بادیہ ضلالت میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں، انھیں ہدایت دے اور پکے مسلمان بنا دے تاکہ اس کارِ خیر میں جان و مال اور اہل و عیال سے شریک ہوں

چھبیسواں باب

جنگِ مایار

(۲)

غازیوں کی شجاعت کے چند مناظر

جنگ مایار کے بارے میں ہمیں جو کچھ معلوم ہو سکا، اسے گزشتہ باب میں ترتیب کے ساتھ بیان کر چکے ہیں، لیکن بعض غازیوں کے ایثار و شجاعت کی کچھ تفصیلات بھی مختلف روایتوں میں بیان ہوئی ہیں، جنھیں اس غرض سے پیش کرنا ضروری ہے کہ اس سے آپ کو سید صاحب کی شانِ تربیّت اور درجہ مردم گری کا کسی قدر اندازہ ہو سکے گا۔ یہ جاننے کا موقع مل جائے گا کہ اب سے صرف سوا سو سال پیشتر رائے بریلی کے ایک مسکین سید نے اس سرزمین سے انسانیت کے کیسے کیسے روشن چاند اور ستارے جمع کر کے رضائے خدائے قدوس کی راہ میں کھڑے کر دیے تھے۔ یہ بھی واضح ہو سکے گا کہ جہاد فی سبیل اللہ اتنا سہل اور آسان نہیں جتنا کہ آج کل کے مدعیان دین و سیاست نے سمجھ رکھا ہے اور وقتاً فوقتاً تقریروں میں اس کا ذکر فرما کر سمجھ لیتے ہیں کہ وظیفہ ادا ہو گیا۔ سامعین اللہ اکبر کے نعرے لگا کر بجا آوری فرض سے سبک دوش ہو جاتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کا حق ادا کرنے والے خوش نصیبوں کی یہ چند داستانیں عبرت و تنبّہ حقیقی کا دعوت نامہ بن جائیں۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔ فذکّر، ان الذکرٰ تنفع المومنین۔

کالے خاں شمس آبادی

کالے خاں شمس آبادی کے حالات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یعنی ایک مرتبہ روٹھ کر چلے گئے۔ چونکہ فطرت سعید تھی، اس لیے راستے سے لوٹ آئے۔ مایار کی جنگ میں گھوڑا پا کر سب سے آگے نکل گئے۔ چھلپانی سے گزرنے کے بعد غازیوں کی صفیں پھر پھر کر درست کر رہے تھے کہ گولہ لگا۔ بری طرح زخمی ہو کر گرے تو سید صاحب کے حکم سے انھیں مایار کی مسجد کے حجرے میں لے گئے۔ ان پر جان کنی کی حالت طاری تھی، لیکن جب لب کھلتے تو تیمارداروں سے پوچھتے:

"بھائیو! لڑائی کا کیا حال ہے؟" درانیوں کے پہلے اور دوسرے حملے کے دوران میں انھیں بتایا گیا کہ ابھی جنگ جاری ہے اور فریقین ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہیں۔ یہ سن کر چپ رہے اور انشاءاللہ کہتے رہے۔ جب درانیوں کا آخری غول بھی شکست کھا کر میدان سے بھاگ نکلا اور بتایا گیا کہ بھائی کالے خاں! اللہ تعالیٰ نے حضرت کو فتح یاب کیا تو یہ بشارت سنتے ہی بولے: "الحمد للہ" بس ساتھ ہی دم نکل گیا۔ کتنی

قابلِ رشک زندگی تھی، جس میں آخری سانس تک زبان پر خدا کا ذکر تھا اور دل میں اس کے سوا کوئی آرزو نہ تھی کہ راہِ حق کے غازیوں کی فتح کا مژدہ سُن لیں اور کتنی قابلِ رشک موت تھی کہ دم رضائے خدا میں پورا ہُوا۔

راویوں نے لکھا ہے کہ شروع میں ٹھوڑی منڈاتے تھے۔ سید صاحب نے کبھی نہ ٹوکا اور عادت شریف یہی تھی کہ بات بات پر ٹوکتے نہ تھے اور جزئیات میں لوگوں کو حسنِ تربیت سے پابندِ شریعت بناتے تھے۔ ایک روز کالے خاں نے ٹھوڑی منڈائی۔ اتفاق سے سید صاحب ان کے پاس سے گزرے۔ اچانک کالے خاں کی ٹھوڑی دستِ مبارک سے پکڑ کر فرمایا: خان بھائی! آپ کی ٹھوڑی کیا چکنی چکنی ہے۔ کالے خاں چپ رہے۔ آٹھویں دن حجام خط بنانے کے لیے آیا تو اسے لوٹا دیا کہ اب میری ٹھوڑی کو حضرت کا ہاتھ لگ چکا ہے، تیرا ہاتھ نہ لگنا چاہیے۔

سید ابو محمد نصیر آبادی

سید ابو محمد سید صاحب کے ہم خاندان تھے۔ آپ کی پہلی بی بی سیدہ زہرہ سے قریبی رشتہ تھا۔ لشکرِ اسلام میں شامل ہونے کا حال ہم بسلسلۂ سفرِ ہجرت بیان کر چکے ہیں۔ بڑے خوبرو جوان تھے۔ نصیر آباد کے بانکوں میں شمار ہوتے تھے۔ برسوں لکھنؤ میں اہل اللہ کمیدان کی بٹالین میں ملازم رہے۔ سپہ گری کے علاوہ مختلف فنون میں طاق تھے۔ جنگ مایار کے لیے نکلنے لگے تو گھوڑا تھان پر چھوڑ کر سید صاحب کے پاس پہنچے اور بولے:

> میاں[1] صاحب! جس روز سے میں آپ کے ساتھ گھر سے نکلا ہوں، یہی سمجھتا رہا کہ آپ میرے عزیز اور رشتہ دار ہیں۔ آپ کو عروج ہوگا تو میرے لیے بھی ترقی اور بہبود کی صورت بنے گی۔ نہ میں خدا کے واسطے ساتھ رہا اور نہ ثواب جان کر کسی لڑائی میں شامل ہُوا۔ اب میں اس فاسد خیال سے توبہ کرتا ہوں۔ رضائے باری تعالیٰ کے لیے ازسرِنو بیعتِ جہاد کی نیت سے حاضر ہُوا ہوں۔ آپ مجھ سے بیعت لیں اور دعا کریں کہ خدا اس نیت اور ارادے پر ثابت قدم رکھے۔

سید صاحب نے بیعت لی اور دُعا کی۔ سب حاضرین کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ دُعا سے فراغت کے بعد سید ابو محمد نے سید صاحب سے مصافحہ کیا اور گھوڑے کی طرف چلے تو ان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہ رہے تھے۔ بسم اللہ کہہ کر دایاں پاؤں رکاب میں رکھا تو بہ آوازِ بلند پکار کر کہا:

---

[1] سید ابو محمد ہی نہیں، بلکہ خاندان کے تمام لوگ سید صاحب کو "میاں صاحب" ہی کہہ کر پکارتے تھے۔

بھائیو! گواہ رہنا، اب تک ہم صرف شان و شوکت اور خواہش نفس کے لیے سوار ہوتے تھے۔ خدا کا اس میں کچھ واسطہ نہ تھا۔ مگر اس وقت ہم محض خدا کی خوشنودی اور رضامندی کے لیے بہ نیت جہاد سوار ہوتے ہیں۔

شہادت چھیدا ان کے گھر کا آدمی تھا، وہ کہتا ہے کہ جب درّانیوں نے ہمارے سواروں پر یورش کی اور ہمارے سوار پیچھے ہٹے تو سید ابو محمد بھی چلے، کچھ دُور جا چکے تھے کہ میں درّانی سواروں میں گھر گیا۔ گھبرا کر انھیں مدد کے لیے آواز دی۔ انھوں نے آواز سنتے ہی باگ موڑی اور آ کر درّانی سواروں سے لڑنے لگے۔ میں موقع پا کر نکل گیا اور وہ لڑتے رہے۔ میں دور سے دیکھ رہا تھا، دو سواروں کو انھوں نے مارا، پھر خود بھی زخم کھا کر گھوڑے سے گر گئے۔

قاضی گل احمد الدین پڑھوواری کا بیان ہے کہ میں موضع شیوہ سے سوار ہو کر سید صاحب کے پاس تورو جا رہا تھا۔ توپوں کی آواز سُنی تو میں نے جانا کہ لڑائی شروع ہو گئی۔ لڑائی میں شریک ہونے کی غرض سے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ مایار پہنچا تو درّانی شکست کھا کر میدان سے جا چکے تھے۔ مولوی مظہر علی صاحب کو مجروحین و شہدا کی لاشیں اٹھوانے کا حکم ہُوا۔ سید صاحب نے مجھے بھی فرمایا کہ مولوی صاحب کے ساتھ جاؤ۔ میں نے میدان میں پھرتے پھرتے ایک جگہ سید ابو محمد کو زخمی پڑے ہُوئے دیکھا۔ زخم ایسے کاری کہ جان تو ان میں تھی، لیکن ہوش حواس بجا نہ تھے۔ میں نے کئی بار ان کے کان میں پکار کر کہا: "سید ابو محمد! حضرت امیرالمومنین کو فتح حاصل ہوئی۔" وہ ہونٹ چاٹ رہے تھے اور "الحمدللہ"، "الحمدللہ" کہہ رہے تھے۔ مجھے کچھ جواب نہ دیا۔ میں نے ساتھیوں کو آواز دی، کمل میں رکھ کر انھیں اٹھایا۔ کچھ دیر بعد جاں بحق ہو گئے۔

عبدالرحمٰن دکنی عبدالرحمٰن دکنی سواروں میں تھے۔ یہ اعلیٰ درجے کے پھکیت اور بھرمار تھے۔ جب سید صاحب کے سوار درانیوں کے ہجوم میں بکھر کر پیچھے ہٹے تو عبدالرحمٰن اپنی جگہ پر جمے ہُوئے ڈٹ کر دشمنوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ کچھ دیر تک گھوڑے پہ بیٹھے بندوق کے فائر کرتے رہے، پھر اُتر بیٹھے اور پیدل ہو کر قواعد بھرماری سے بندوق مارنے لگے۔ آٹھ نو درّانی سواروں نے انھیں نرغے میں لے لیا۔ آخر بہادر عبدالرحمٰن نے بندوق چھوڑ کر تلوار سنبھال لی۔ تنہا نو دس سواروں کا مقابلہ اس خوبی سے کرتے رہے کہ اکثر کو زخمی کیا اور خود محفوظ رہے۔ ایک درّانی سوار نے تاک کر پیچھے سے نیزہ مارا۔ یہ گرے تو اس نے تلوار سے سر قلم کر ڈالا۔

شیخ محمد اسحاق گورکھپوری شیخ محمد اسحاق پیدل تھے۔ ایک درّانی سوار نیزہ تان کر آپ کی طرف

بڑھا۔ نیزے کا رُخ سینے پر تھا۔ شیخ دائیں جانب جھک گئے۔ نیزہ بائیں شانے پر پڑا اور انی ٹوٹ کر اندر رہ گئی۔ اس حالت میں بھی شیخ نے تلوار مار کر حملہ آور کا سر تن سے الگ کر دیا۔ پھر اور درانی آ گئے اور ہر طرف سے شیخ پر تلواریں پڑنے لگیں۔ ایک ضرب سے دستار کٹ گئی اور سر پر گہرا خط بن گیا۔ ایک اور وار سے دائیں ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئیں۔ بے بس ہو کر شیخ نے اپنی رائفل سعدی خاں کو دے دی، تلوار ایک اور غازی کے حوالے کی جس کے پاس تبر کے سوا کوئی ہتھیار نہ تھا اور خود مایار کی طرف لوٹ پڑے۔ راستے میں دیکھا کہ میاں جی محی الدین کی ایڑی زخمی ہے اور وہ چلنے سے معذور ہیں۔ شیخ نے اپنے انگشت بریدہ ہاتھ کا سہارا دے کر انھیں اٹھایا اور آہستہ آہستہ ساتھ لے کر چلے۔ تھوڑی دُور گئے تھے کہ غش کھا کر گر پڑے۔ ہوش آیا تو پھر اُٹھے اور میاں جی کو پہلے کی طرح سہارا دے کر ایک درخت کے سایے میں پہنچایا، پھر چلنے کی سکت نہ رہی اور لیٹ گئے۔

ارشاد نبویؐ کی تصدیق

سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ ختم جنگ کے بعد میں ان کے پاس پہنچا تو سب سے پہلے یہ پوچھا کہ لڑائی کا نتیجہ کیا نکلا؟ میں نے فتح کا مژدہ سُنایا تو بہت خوش ہُوئے اور بولے: "آؤ بھائی، گلے سے لگ جاؤ۔" دیکھیے اس حالت بے چارگی میں بھی نہ اپنی تکلیف کا کوئی خیال تھا، نہ یہ خیال تھا کہ بال بچوں کے لیے کوئی وصیت کر دیں۔ دل و دماغ پر صرف ایک آرزو چھائی ہوئی تھی کہ جس مقصد کے لیے گھر بار چھوڑا، وہ پورا ہُوا یا نہ ہُوا۔

تھوڑی دیر بعد پھر بولے کہ بھائی حدیث نبویؐ برحق ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ شہیدوں کے سکرات موت کی کیفیت ایسی ہوتی ہے، جیسے کسی کو چیونٹی کاٹے۔ میرا جسم شدید زخموں سے چُور ہے۔ بائیں شانے میں نیزے کی انی ٹوٹی ہُوئی ہے۔ سر پر گہرا زخم ہے۔ ہاتھ کی انگلیاں کٹ چکی ہیں۔ لیکن تکلیف اتنی ہے کہ جیسے انگلی میں کانٹا چبھ گیا ہو۔

شیخ امیر اللہ تھانوی

شیخ امیر اللہ تھانوی کی ران اور دایاں بازو بری طرح زخمی ہو چکے تھے۔ آپ نے خون آلود تلوار بائیں ہاتھ میں لے لی اور پھیر پھیر کر پوچھنے لگے کہ یہ کسے دوں؟ اسے دوں گا جو آج اس کا حق ادا کر سکے۔

تورد پہنچے اور زخموں کی مرہم پٹی ہونے لگی تو نور بخش جراح نے مزاحاً کہا: شیخ صاحب آپ ہمیشہ کہتے رہتے تھے کہ یہاں آئے تو کیا حاصل کیا۔ ابھی تک نکسیر بھی نہیں پھوٹی۔ بتائیے اب نکسیر پھوٹی یا نہیں؟ فرمایا: "الحمد للہ، اللہ تعالیٰ قبول کرے۔"

رسالدار عبدالحمید خاں

رسالدار عبدالحمید خاں کو بلا حکم حملے کی اجازت نہ تھی۔ جب حاجی عبدالرحیم خاں

نے سید صاحب کے ساتھ محبت و عقیدت کے جوش میں خود حملہ کر دیا اور ان کے آس پاس کے سوار بھی گھوڑے دوڑاتے ہوئے پیچھے چلے تو مولوی احمد اللہ ناگپوری، محمد سعید خاں عظیم آبادی، قاضی مدنی وغیرہ جو رسالدار کے قریب کھڑے تھے، سمجھے کہ حملے کا حکم ہو چکا ہے۔ اس پر رسالدار نے بھی حملہ کر دیا۔ ان کے پاس دو گھوڑے تھے: ایک سبزہ رنگ، دوسرا سمند۔ دونوں پر باری باری سوار ہوتے تھے۔ جنگ مایار کے دن سمند کی باری تھی۔ جس طرف باگ اٹھا کر جاتے، صفوں کو چیر کر رکھ دیتے۔ پاس کے لوگوں نے بعد میں بیان کیا کہ بار بار کہتے تھے: کاش! آج سبزے گھوڑے کی باری ہوتی تو دل کا ارمان نکل جاتا۔ تین چار مرتبہ ساتھیوں کو لے کر درانیوں میں گھسے اور تلواریں مارتے ہوئے ان کی صفوں سے پار نکل گئے۔ رسالدار کے بھی کئی ہلکے سے زخم لگے لیکن آپ نے کچھ خیال نہ کیا اور برابر ہلے کرتے رہے۔ جب زخموں سے چُور ہو گئے تو [illegible]ے سے گر پڑے۔ جسم ذرا فربہ تھا، زرہ کی کڑیاں گوشت میں گھس گئی تھیں۔ راوی کا بیان ہے کہ انھیں میدان سے اٹھا کر مایار لائے تو جس کی نظر محبوب رسالدار پر پڑتی، بے اختیار اشکبار ہو جاتا۔ لیکن خود رسالدار بالکل صابر و شاکر تھا۔ ایک مرتبہ بھی تکلیف کا کوئی کلمہ زبان پر نہ آیا۔ پھر تورو میں وفات پائی۔[1]

سید موسیٰ سید موسیٰ (جن کا دوسرا نام سید حسن مثنیٰ تھا) سید احمد علی شہید پھولڑہ کے صاحبزادے تھے۔ جب سے ان کے والد شہید ہوئے تھے، بہت غمگین رہتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے دوستوں اور آشناؤں سے کہا کرتے تھے کہ اگر کسی لڑائی میں جانے کا اتفاق ہوا تو انشاء اللہ تعالیٰ بیچ کھیت کے مجھے دیکھ لینا۔ میں بھی لڑ کر شہید ہو جاؤں گا۔

سید صاحب کو بھی اپنے شہید بھانجے کے جگر بند کی یہ کیفیت معلوم تھی۔ وہ سواروں میں تھے۔ جب لشکر تورو سے مایار کی طرف چلا تو سید صاحب نے سید موسیٰ سے فرمایا کہ اپنا گھوڑا کسی بھائی کو دے دو اور خود ہمارے ساتھ پیادوں میں رہو۔ عرض کیا کہ آپ مجھے سواروں ہی میں رہنے دیں، میں رسالدار صاحب کے پاس رہوں گا۔ سید صاحب نے ان کی خواہش دیکھ کر اجازت دے دی۔ جب سواروں نے ہلہ کیا تو یہ بھی ساتھ تھے۔ مردانگی سے دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور خوب لڑے۔ آخر زخموں سے

---

[1] ایک روایت میں ہے کہ تورو سے انھیں پنجتار پہنچا دیا گیا تھا اور وہاں فوت ہوئے۔ سبزہ رنگ گھوڑے کو انھوں نے خوب سدھار کھا تھا۔ وہ برچھی، تلوار، بندوق پر خوب لگا ہوا تھا۔ سمند گھوڑا سید صاحب نے انھیں رسالدار بناتے وقت عطا کیا تھا۔ ہلے کے وقت سبزہ رنگ گھوڑا ان کے سائیس کے پاس تھا، جس کا نام کالیا تھا۔

دونوں ہاتھ بیکار ہو گئے۔ کئی زخم سر میں لگے اور بے بس ہو کر گر گئے۔ خادے خاں قندھاری انھیں پشت پر اٹھا کر سید صاحب کے پاس لائے۔ انھیں جو غازی دیکھتا، بے اختیار رو پڑتا۔

خادے خاں کا بیان

خادے خاں قندھاری کہتے ہیں، کہ میں زخمیوں اور شہیدوں کو تلاش کر رہا تھا۔ ایک جگہ دُور سے سُنا کہ کوئی اللہ اللہ کہہ رہا ہے۔ نزدیک جا کر دیکھا تو سید موسیٰ کو پایا۔ سر کے زخموں سے خون بہتے بہتے آنکھیں بند ہو گئی تھیں، میں نے کہا: "اٹھا کر لے چلوں؟" پوچھا: "کون ہے اور فتح کس کی ہُوئی؟" میں نے نام بتایا اور عرض کیا کہ سید بادشاہ کو خدا نے فتح دی۔ یہ سُن کر بولے: "الحمد للہ" اور کسی قدر ہوشیار بھی ہو گئے، ساتھ ہی کہا: "لے چلو"۔ چنانچہ میں پشت پر سوار کر کے لے آیا۔ سید صاحبؒ نے فرمایا کہ انھیں مایار کی مسجد کے حجرے میں لے جاؤ۔ احمد سندھی اور الٰہی بخش کوزپشت ان کے خاص رفیق تھے۔ انھیں تیمارداری کے لیے ساتھ بھیج دیا۔ پھر دوسرے زخمیوں کے ساتھ انھیں بھی تورو پہنچا دیا گیا۔

سید صاحب کے ارشادات

تورو میں سید صاحب شہید بھانجے کے بہادر جگر بند کو دیکھنے گئے تو فرمایا: یہ فرزند توفیق الٰہی سے بڑا بہادر نکلا، مالک حقیقی کا حق خوب ادا کیا۔ پھر سید موسیٰ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

> بیٹا! لکھنؤ میں دیکھا ہو گا کہ لوگ شیطان کے اکسانے سے فاحشہ عورتوں کے لیے یا کسی کے سامنے متکبرانہ کھانس کر یوں ہی لڑائی چھیڑ لیتے ہیں اور اس میں اپنے ہاتھ پاؤں کھو بیٹھتے ہیں۔ اس طرح ان کا ثمرہ دنیا میں حمیت جاہلیت اور عقبیٰ میں عذاب الیم ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ تمھارے ہاتھ پاؤں راہ مولیٰ میں کام آئے۔ خدا نے تمھاری مساعی جمیلہ کو مشکور فرمایا۔
>
> اب اگر دیکھو کہ کوئی شخص خوش رفتار گھوڑے پر سوار، اسے دوڑاتا کداتا ہُوا لے جا رہا ہے تو کبھی یہ حسرت دل میں نہ لانا کہ میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہوتے تو میں بھی ایسا ہی کرتا۔ تمھارے ہاتھ پاؤں بارگاہ ربانی میں قبول ہُوئے۔ خوش نصیب ہیں وہ ہاتھ پاؤں جو رضائے مولا میں قربان ہوں اور اس ذات پاک کی خاطر کٹیں، جو جہانوں کی پناہ گاہ ہے۔ اگر کسی کو شمشیر برہنہ کے ساتھ پٹہ بازی کرتے ہُوئے دیکھو تو یہ غم دل میں نہ لانا کہ میرے ہاتھ پاؤں ہوتے تو ایسے ہی جوہر دکھاتا۔ تمھارے دست و پا کو بڑا رتبہ ملا۔ ان زخموں کے عوض میں ثواب عظیم حاصل ہُوا۔ سالم

ہاتھ پاؤں والے کو ہر روز مظنہ گناہ درپیش ہے۔ تمھارے جوارح کو پروردگار حکیم کی بارگاہ میں بہت شاندار اجر ملا۔ حضرت علی مرتضیٰ ؓ کے بھائی حضرت جعفر طیار ؓ کے بازو جنگ موتہ میں کٹ گئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے بہشت بریں میں انھیں ذی الجناحین کے لقب سے مشرف فرمایا اور زمرد جنت سے دو بازو عطا کرکے طیور بہشت میں جگہ دے دی۔

سید موسیٰ کی شان صبر

سید موسیٰ نے صابرانہ عرض کیا: میں ہزار زبان سے اللہ کی رضا پر راضی اور شاکر ہوں۔ الحمدللہ کہ میری ہستی نیک ترین عبادت میں صرف ہوئی۔ خدا اسے قبول کرے۔ لیکن آپ سے ایک آرزو ہے:

> ہر روز خود تکلیف اٹھا کر اپنے جمال مبارک سے آنکھیں منور فرماتے رہیے۔ مَیں معذور ہو چکا ہوں۔ خود آپ کی مجلس میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ اس کے سوا نہ مجھے کوئی رنج ہے اور نہ حسرت[1]

سبحان اللہ، آج سے صرف سو برس پیشتر انسانیت کے یہ بے بہا گوہر اسی سرزمین کی سطح پر موجود تھے۔ کون سی قوم ہے جو ایسے افراد کے وجود کو اپنے تاج عزت اور اکلیل عظمت کے لیے باعث ہزار افتخار جاننے میں تامل کرے گی؟ لیکن ہم میں سے سیکڑوں، ہزاروں اصحاب نے یہ پوری مدت ان فدا کارانِ حق کے خلاف طعن و ملامت کے نئے نئے خدنگ تیار کرنے میں بسر کر دی:

انّ ھٰذا من اعاجیب الزّمن

ایک ملکی غازی

ایک ملکی نوجوان چودہ پندرہ برس کا ہوگا۔ اس کے پاس نہ نیزہ تھا، نہ تلوار اور نہ بندوق۔ سید صاحب نے کچھ گنڈاسے بنوا رکھے تھے، جن کی نوکیں ذرا خم دار تھیں۔ بڑے تیز تھے، ان میں لمبے دستے لگوا دیے تھے۔ جس غازی کو کوئی ہتھیار نہ مل سکتا، اسے گنڈاسے دے دیے جاتے۔ ملکی لوگ انھیں "کفر چٹ" کہتے تھے۔ جنگ مایار کے دن اس نوجوان کو بھی کفر چٹ مل گیا تھا۔ دشمن کا جو سوار قریب آتا وہ پورے زور سے کفر چٹ کا وار کرتا۔ ایک سوار کے کفر چٹ لگا تو اس کی خمدار نوک زرہ کی کڑی میں اٹک گئی۔ سوار بھاگا نوجوان دونوں ہاتھوں سے دستہ پکڑے پیچھے پیچھے جا رہا تھا اور پکار پکار کر کہہ رہا تھا: زما کفر چٹ پوڑ، زما کفر چٹ پوڑ (یعنی یہ شخص ہمارا کفر چٹ لیے جا رہا ہے)

---

[1] منظورہ صفحہ ۸۴۳ - ۸۴۵

یہ پکار سن کر کئی غازیوں نے سوار پر بندوقیں سر کیں۔ وہ گرا تو نوجوان نے کفر چیٹ مار کر اس کا سر الگ کر دیا۔

للّٰہیت

پھر آپ غازیوں کی للّٰہیت پر ایک نظر ڈالیے۔ صرف ساڑھے تین ہزار کے قافلۂ حق نے باوجود بے سروسامانی بارہ ہزار کے لشکر کو شکست فاش دی، جو ہر قسم کے سامان سے لیس تھا، لیکن کسی شخص کے دل میں احساس تک نہ تھا کہ یہ ان کے اپنے کمال شجاعت کا نتیجہ ہے۔ سب یہی کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قوت و قدرت سے زور آوروں پر فتح عطا کی، جو ملک و خزائن کے مالک تھے۔ اطمینان قلب کا یہ حال تھا کہ زد و خورد جنگ میں غازی اس طریق پر شریک ہوئے جیسے لوگ کسی کے ہاں دعوت طعام کے لیے جاتے ہیں۔[1]

مرہم پٹی

تورو پہنچ کر زخمیوں کی مرہم پٹی شروع ہوئی۔ نور بخش اور عبدالرحیم دونوں جراح موجود تھے۔ دوسرے آدمی بھی ان کی امداد کے لیے حاضر ہو گئے۔ لیکن زخموں کے سینے، دوا پکانے اور لگانے میں آدھی رات بسر ہو گئی۔ خود سید جعفر علی نقوی نے چراغ پکڑ کر مولوی احمد اللہ ناگپوری اور شیخ محمد اسحاق کی مرہم پٹی کرائی۔ اکثر غازیوں نے سارا دن کچھ نہیں کھایا تھا۔ دن بھر کی تگاپو سے تھک کر چور ہو چکے تھے۔ کئی تورو پہنچ کر کھائے پیئے بغیر ہی سو گئے۔

اس جنگ نے درانیوں پر اتنا ہراس طاری کر دیا تھا کہ بعد میں سید صاحب پشاور پہنچے تو انھیں بتایا گیا کہ بعض آدمی جو جنگ مایار سے بچ کر آئے تھے، رات کو دو دو تین تین مرتبہ ڈر کر چونک اٹھتے تھے۔

---

[1] منظورہ صفحہ ۸۷۴ - ۸۷۵

ضمیمہ

رسالہ جہادیہ

اس نظم کے سلسلے میں شعریت کا چنداں خیال نہ رکھنا چاہیے، صرف شاعر کے جوش، حمیت، حسن جذبات اور آرزوہائے ترقی اسلام کو دیکھنا چاہیے۔

بعد تحمیدِ خدا، نعت رسولِ اکرمؐ
یہ رسالہ ہے جہادیہ کہ لکھتا ہے قلم
واسطے دین کے لڑنا، نہ پئے طمعِ بلاد
اہلِ اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد
ہے جو قرآن و احادیث میں خوبیِ جہاد
ہم بیاں کرتے ہیں تھوڑا سا، اسے کر لو یاد
فرض ہے تم پہ مسلمانوں جہادِ کفار
اس کا ساماں کرو جلد، اگر ہو دیندار
جس کے پیروں پہ پڑے گردِ صفِ جنگِ جہاد
وہ جہنم سے بچا، نار سے ہے وہ آزاد
جو مسلمان رہِ حق میں لڑا لحظہ بھر
روضۂ خلد بریں ہو گیا واجب اُس پر
اے برادر تو حدیثِ نبوی کو سُن لے
باغِ فردوس ہے تلواروں کے سایے کے تلے.

دل سے اس راہ میں پیسہ کوئی دیوے گا اگر
سات سو اس کو خدا دیوے گا روزِ محشر
اور اگر مال بھی خرچا و لگائی تلوار
پھر تو دیوے گا خدا اس کے عوض سات ہزار
جو کہ مال اپنے سے غازی کو بنا دے اسباب
اس کو بھی مثلِ مجاہد کے خدا دے گا ثواب.
جو نہ خود جاوے لڑائی میں نہ خرچے کچھ مال
اس پہ ڈالے گا خدا پیشتر از مرگ وبال
جو رہِ حق میں ہوئے ٹکڑے، نہیں مرتے ہیں
بلکہ وہ جیتے ہیں، جنت میں خوشی کرتے ہیں
زندگی بھر کے گناہ شہدا مٹتے ہیں
کیوں نہ ہو، راہِ خدا ان کے تو سر کٹتے ہیں
فتنۂ قبر و غمِ صور و قیامِ محشر
ایسے صدموں سے شہیدوں کو نہیں کچھ بھی خبر
حق تعالیٰ کو مجاہد وہ بہت بھاتے ہیں
مثلِ دیوار جو صف باندھ کے جم جاتے ہیں
اے مسلمانوں سُنی تم نے جو خوبیِ جہاد
چلو اب اس کی طرف، مت کرو گھر بار کو یاد
مال و اولاد کی، جورو کی محبت چھوڑو
رہِ مولیٰ میں خوشی ہو کے شتابی دوڑو
مال و اولاد تری قبر میں جانے کے نہیں
تجھ کو دوزخ کی مصیبت سے بچانے کے نہیں
گر پھرے جیتے تو گھر بار میں پھر آؤ گے
اور گئے مارے تو جنت میں چلے جاؤ گے

دین اسلام بہت سست ہوا جاتا ہے
غلبۂ کفر سے اسلام مٹا جاتا ہے
پیشوا لوگ اسی طور نہ کرتے جو جہاد
ہند پھر کس طرح اسلام سے ہوتا آباد
زور شمشیر سے غالب رہا اسلام مدام
سستی اگلے جو کہیں کرتے تو ہوتا گمنام
کب تلک گھر میں پڑے جوتیاں چٹخاؤ گے
اپنی سستی کا جز افسوس نہ پھل پاؤ گے
اب تو غیرت کرو نامردی کو چھوڑو یارو
سیّد احمد کو ملو جلد سے، کافر مارو[1]
بارہ سو سال کے بعد ایسے ارادے والا
ہوا پیدا ہے مسلمانوں، کرو شکر خدا[2]
تھے مسلمان پریشاں بغیر از سردار
ہوا سردار ہے از آل رسول مختار[3]
بات ہم کام کی کہتے ہیں سنو اے یارو
وقت آیا ہے کہ تلوار کو بڑھ بڑھ مارو
حضرت مولوی اب طاق میں رکھ دیجیے کتاب
لیجیے تلوار و میدان کو چل دیجیے شتاب
وقت جانبازی ہے تقریروں کو مت اب چھانٹو
غیر شمشیر کسی سمت کو دل مت بانٹو
ہادیِ دین ہو تم، تم کو ہے سبقت لازم
تم چلو گے تو بہت ساتھ چلیں گے خادم
اے گروہِ فقرا، نفس کُشی کے اُستاد
عملِ نفس کُشی کون ہے بہتر ز جہاد
مت گھسو کونے میں اے پیر جی مانند چچا
چھوڑو اب چلّہ کشی وقتِ جہاد آ پہنچا
اے جوانانِ اسد حملہ و رستم قوّت
کام کس دن کو پھر آوے گی تمھاری جرأت
اُن کا سر کاٹ لیا یا کہ کٹا اپنا سر
دونوں صورت میں جو سمجھو تو تمھیں ہو بہتر
یعنی گر مار لیا ان کو تو پھر بن آئی
اور گئے مارے تو پھر خاص شہادت پائی
ایک دن تجھ سے یہ دنیا کا مزا چھوٹے گا
لشکرِ موت ترا ملک بدن لوٹے گا
دوستو جب تمھیں مرنا ہی مقرر ٹھہرا
پھر تو بہتر ہے کہ جاں دیجیے در راہِ خدا

---

[1] اس کے آگے ایک اور شعر دیکھا:

بارہ سو سال کے بعد آئی یہ دولت آگے
حیف اس دولت بیدار سے مومن بھاگے

[2] اس کے بعد ایک اور شعر بعض نسخوں میں دیکھا:

تھے مسلمان پریشان بغیر از اسباب
شکر، سب تو نے دیا اے مرے رب الارباب

[3] اس سے آگے ایک اور شعر تھا:

یعنی اسباب لڑائی کا جو کچھ تھا درکار
[illegible] تُو نے ہمیں اور دیا پھر سردار

سیکڑوں جنگ میں جاتے ہیں تو پھر آتے ہیں
سیکڑوں گھر میں بھی رہتے ہیں تو مر جاتے ہیں
موت کا وقت معیّن ہے تو سُن اے غافل
پھر بھلا موت سے ڈرنے سے تجھے کیا حاصل؟
جب تلک موت نہیں ہے تو نہیں مرتے ہیں
موت جب آئی تو گھر میں بھی نہیں بچتے ہیں
تم اگر ڈرتے ہو تکلیفِ سفر سے، نہ ڈرو
مرد ہو خطرہ و آلام کو دل سے کھو دو
جیسی عادت کرے انسان، سو ہو سکتا ہے
عیش و آرام کی عادت کو بھی کھو سکتا ہے
طمعِ دنیا کے لیے دیکھو ہزاروں یہ سپاہ
چھوڑ گھر سر کو کٹاتے ہیں، نہیں کرتے آہ
ہے عجب یہ کہ مسلمان بھی کہلاتے ہو
جھوٹے حیلے رہِ اللہ میں بتلاتے ہو
تم تو اس طور سے دنیا میں بہت پھول گئے
جورو لڑکوں کی محبت میں خدا بھول گئے
جورو لڑکوں کے لیے گھر میں چھپو گے کب تک؟
پنجۂ موت سے بتلاؤ بچو گے کب تک؟
آج اگر اپنی خوشی، جان، خدا کو دو گے
پھر تو کُل چَین سے جنت میں مزے لوٹو گے
چھوڑو گے لذتِ دنیا کو اگر بہرِ خُدا
پھر تو جنت میں ہمیشہ ہی اڑاؤ گے مزا
سر پٹک، پیر رگڑ گھر میں کا مرنا بہتر
یا رہِ حق میں فدا جان کا کرنا بہتر
گر رہِ حق میں نہ دی جان تو پچھتاؤ گے
اور پیمبرؐ کو یہ مُنہ کیا بھلا دکھلاؤ گے
ایک ہے شرط کہ تم مانو بہ دل حکمِ امام
ورنہ تلوار لگانا بھی نہیں آوے گا کام
جو کہ خود رائی سے لڑنے لگے در راہِ جہاد
ان کا ناحق بہا خوں اور ہوئی محنت برباد
خُوب اللہ و محمدؐ کو جو پہچانتے ہیں
اپنے سردار کے کہنے کو بہ دل مانتے ہیں
اہلِ ایمان کو کافی ہے دلا اتنا پیام
اب مناجات سے بہتر ہے کہ ہو ختم کلام
اے خداوند سماوات و زمیں، ربِ عباد
اب مسلمانوں کو دے جلد سے توفیقِ جہاد
اپنا دے زور، مسلمانوں کو زور آور کر
وعدۂ فتح جو ہے ان سے، اسے پورا کر

ہند کو اس طرح اسلام سے بھر دے اے شاہ
کہ نہ آوے کوئی آواز بجُز اللہ اللہ

ستائیسواں باب

پشاور کی جانب اقدام

مردان جانے کا حکم

فتح مایار کے بعد سید صاحب نے اپنے رفقائے خاص سے آیندہ طریق کار کے متعلق مشورہ کیا۔ اس شوریٰ میں مولانا شاہ اسماعیل، شیخ ولی محمد، خواجہ محمد (حسن پوری)، مولوی مظہر علی (عظیم آبادی)، ارباب بہرام خاں، فتح خاں پنجتاری وغیرہ شریک تھے۔ غور و خوض کے بعد فیصلہ ہوا کہ پشاور پر پیش قدمی ضرور ہونی چاہیے۔ ادھر مردان سے چند ملا صاحبان آئے۔ انھوں نے درانیوں کے بارے میں بتایا کہ جنگ سے پیشتر لاف و گزاف اور فواحش کے ارتکاب میں غرق تھے، اب سب کچھ چھوڑ کر سراسیمگی کی حالت میں فرار ہوگئے ہیں۔ ان کا متروکہ مال موجود ہے۔ سید صاحب نے اس مال کو سنبھالنے کی غرض سے مولانا شاہ اسماعیل کو فوراً ایک سو آدمیوں کے ساتھ مردان بھیج دیا۔ واضح رہے ایسے غازی بھی تھے جنھوں نے چوبیس تیس گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا تھا، نہ آرام کیا تھا لیکن مولانا نے اتنا توقف بھی مناسب نہ سمجھا کہ سب غازی کھانا کھالیں۔ مولوی جعفر علی نقوی کو بھی مولانا کے ساتھ جانے کا حکم ملا تھا۔ وہ اپنی حالت بتاتے ہیں کہ میں نے رات کو کچھ نہیں کھایا تھا۔ دن کے وقت ایک خشک ٹکڑا ملا۔ اسی کو کھا کر پانی پی لیا۔ مولانا سے عرض کیا کہ اجازت ہو تو جلدی جلدی دو نوالے کھالوں۔ انھوں نے فرمایا کہ روٹی ساتھ لے لو، تورو سے باہر نکل کر کھانا۔ درانیوں کے خیمے اور اسلحہ وغیرہ پڑے ہیں۔ اگر انھیں کوئی نقصان پہنچا تو بستی والے پکڑے جائیں گے۔ دوہری پریشانی پیدا ہوگی: اول نقصانِ مال، دوم شبہات کی بنا پر لوگوں کی گرفتاریاں اور ان پر سختی۔

مردان کے حالات

غرض مولانا تورو کے قریب پہنچے تو وہاں کی گڑھی سے گولیاں آئیں۔ اس پر مولانا نے حکم دے دیا کہ ہر غازی اپنے چاروں طرف چار چار قدم کا فاصلہ چھوڑ کر چلے۔ پھر گڑھی کے جنوبی دروازے کے پاس سے ہوتے ہوئے آگے بڑھے۔ مردان سے باہر مغربی سمت میں ایک باغ تھا، جس میں بڑے بڑے درخت تھے اور اس کی زمین دامنشیبی تھی۔ اس میں جا بیٹھے۔ گڑھی مردان کے برجوں سے گولیاں آنے لگیں، لیکن مولانا نے بیٹھنے کے لیے ایسی جگہ تجویز فرمائی تھی کہ کسی غازی کو نقصان کا اندیشہ نہ

ایک گھڑی کے بعد گولیاں مدھم پڑ گئیں اور چند ملّا صاحبان حاضر ہو کر مولانا کی خدمت میں عرض پرداز ہوئے کہ حکم ہو تو کھانا لائیں۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ لوگوں کا ارادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ باقی غازیوں کو زہر آلود کھانا کھلا کر ختم کر دیں۔ خبردار ہو جائیے۔ جو توپیں درّانیوں سے غنیمت میں ملی ہیں، انھیں ابھی منگا لیتا ہوں۔ ان کے آتے ہی گڑھی کو مسمار کر ڈالوں گا۔ ملاؤں نے معذرت کی اور کہا کہ یہ احمد خاں کے آدمیوں کا کام ہے جو جاہل ہیں۔ انھیں یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ لڑائی کے بغیر گڑھی حوالے کر دی تو خان نمک حرامی کا طعنہ دے گا۔ ادھر مولانا نے سید صاحب کے پاس آدمی بھیج کر شاہینیں منگا لیں۔ ادھر جب بستی والوں کو معلوم ہوا کہ توپیں آ رہی ہیں، تو بے تابانہ صلح کے خواستگار ہوئے۔ احمد خاں کے بھائی رسول خاں نے پیغام بھیجا کہ میں فرمانبردار ہوں، البتہ درّانیوں کی آمد کے باعث بے بس ہو گیا تھا۔

مصالحت

غرض رسول خاں نے اس شرط پر صلح کی پیش کش کی کہ غازی قصبے سے باہر ٹھہریں، اندر داخل نہ ہوں۔ مولانا نے یہ شرط منظور فرمالی لیکن کہا کہ حضرت امیر المومنین دوران قیام مردان بیں گڑھی میں ٹھہریں گے اور مولوی عبدالوہاب قاسم غلہ ہمراہیوں سمیت مسجد میں قیام کریں گے۔ اس کے بعد مرزا احمد بیگ پنجابی کو پچاس غازیوں کے ساتھ گڑھی پر قبضہ کرنے کے لیے بھیج دیا اور تاکید کر دی کہ تمام برجوں پر پہرے بٹھا کر بندوقیں چلا دینا تاکہ معلوم ہو جائے قبضہ مکمل ہو چکا ہے۔ اس اثنا میں ارباب بہرام خاں شاہینیں لے کر مردان پہنچ گئے۔

مولانا نے رسول خاں کو سید صاحب کی خدمت میں تورو کی طرف بھیج دیا۔ اس کے ساتھ اپنے جو سوار بھیجے، انھیں تاکید کر دی کہ حضرت کو صلح کی شرطوں سے آگاہ کر دینا۔ پھر نجابت علی سوار نے سید صاحب کی روانگی کی خبر پہنچائی تو مولانا نے ملا فیض محمد کو آگے بھیج دیا کہ حضرت سے عرض کریں آپ قصبے سے باہر تشریف رکھیں، اندر تشریف نہ لائیں۔ صلح کی شرط یہی ہے۔ آپ کے لیے آبادی سے باہر شمال مغرب میں مناسب فرودگاہ تجویز ہو چکی ہے۔ قصبے سے باہر ادھر تشریف لے جائیں۔

سیّد صاحب کی روانگی

سید صاحب نے روانگی سے پیشتر تورو سے توپیں اور دوسرا فالتو سامان پنجتار بھیج دیا۔ جن غازیوں کے سخت زخم لگے تھے، انھیں بھی پنجتار روانہ کر دیا۔ نور بخش جراح کو ان کے ساتھ بھیجا۔ جن کے زخم ذرا ہلکے تھے، انھیں ساتھ لے لیا۔ حاجی جانی امیٹھوی بڑے ماہر جراح تھے، وہ پہلے سے پنجتار میں موجود تھے۔ جن زخمیوں کو پنجتار بھیجا گیا ان کے نام یہ ہیں: سید موسیٰ، عبدالکریم خاں (ساکن آنولہ) نور محمد اور ان کے بھائی حاجی چاند (ناگور، بنگال)، اللہ بخش بانچھتی، میاں جی محی الدین پھلتی، محمد سعید خاں رائے بریلوی، قاضی مدنی، مولوی عبدالحکیم بنگالی، مولوی احمد اللہ ناگپوری،

عبدالرحمٰن دکنی، اعتباری، پیر محمد پانی پتی، شیخ محمد اسحاق گورکھپوری۔ جن زخمیوں کو ساتھ لیا تھا وہ یہ تھے: سید اسماعیل رائے بریلوی، شیخ نصراللہ خرجوی، امام الدین پانی پتی، کریم بخش پنجابی، اسماعیل خاں خان پوری۔ بعض کے نام معلوم نہ ہو سکے۔

سید صاحب چلے تو آگے پیچھے سواروں اور پیادوں کا ہجوم تھا۔ ملکی لوگ اپنے طریقے کے مطابق تلواریں بے نیام کیے، ناچتے اور اچھلتے کودتے جا رہے تھے۔ نہ وہ سوار سید صاحب تک مولانا کا پیغام پہنچا سکے جو رسول خاں کے ساتھ بھیجے گئے تھے، نہ ملا فیض محمد کو سید صاحب تک پہنچنے کی کوئی صورت نظر آئی۔ مولانا کے نزدیک شرط صلح کی پابندی بھی لازم تھی اور احتیاط کے خیال سے یہ بھی ضروری سمجھتے تھے کہ گڑھی اور قصبے کے کونے کونے کی چھان بین کر لینے کے بعد سید صاحب کو اندر بلائیں۔

غازیوں کا پاسِ عہد

سید صاحب شرط صلح سے بے خبر تھے، مولانا اس بات پر مطمئن تھے کہ دو مرتبہ پیغام بھیج چکے ہیں۔ وہ مغربی سمت کے باغ میں تھے، جب ایک شخص بھاگا بھاگا پہنچا اور بتایا کہ آپ کا لشکر قصبے کے اندر داخل ہو گیا۔ مولانا کو یقین نہ آیا۔ فرمایا: ممکن ہے کوئی آدمی بھول کر اندر آ گیا ہو، فکر نہ کرو۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ پھر چند آدمی آئے اور کہا آپ کے لشکر نے بدعہدی کی اور قصبے میں گھس آیا۔ یہ سنتے ہی مولانا غصے میں آ گئے۔ تلوار گلے میں ڈالی، ڈنڈا ہاتھ میں لیا، نجابت علی سوار کا گھوڑا تیار کھڑا تھا، اس پر سوار ہو کر دوڑاتے ہوئے قصبے میں پہنچے۔ مشرقی دروازے کے قریب ایک سوار ملا۔ اس سے پوچھا تم کیوں اندر آئے؟ جاؤ اپنی جگہ پر جا کر بیٹھو۔ پھر ایک پیادہ ملا جس نے چارپائی سر پر اٹھا رکھی تھی۔ مولانا نے اسے سخت سست کہا، بلکہ دو ڈنڈے بھی رسید کیے۔ دو چار اور غازیوں کو بھی ڈانٹ ڈپٹ کر باہر نکالا۔ سید جعفر علی نقوی جنوبی دروازے کی طرف بھاگے اور وہاں پہنچ کر غازیوں کو روکا۔

سید صاحب اور مولانا

اس اثنا میں مولانا کو خبر ملی کہ خود سید صاحب اندر آ گئے۔ مولانا غصے کی حالت میں ادھر پلٹے اور جاتے ہی عرض کیا:

> جناب خود خلاف شرع امر کے مرتکب ہوئے۔ لشکر اسلام میں سے ایک آدمی کے عہد کا ایفا بھی امام اور پورے لشکر پر واجب ہو جاتا ہے۔ مجھے آپ نے اپنا نائب بنا کر بھیجا تھا۔ لیکن آپ نے میرے عہد کا بھی خیال نہ رکھا اور قصبے میں داخل ہو گئے۔ یہ لشکر ہے، اسے میدان میں ٹھہرنا چاہیے۔ پیرزادوں کا قافلہ نہیں کہ قصبے میں گھس آئے۔[1]

---

[1] منظورہ صفحہ ۸۸۳ - ۸۸۴

"منظورہ" کا بیان ہے۔ "وقائع" میں ہے کہ مولانا قصبے میں مختلف مقامات کی تلاشی لے رہے تھے کہ کہیں بارود تو نہیں بچھا دی گئی۔ اس اثنا میں کسی ملکی نے سید صاحب سے کہہ دیا کہ مولانا آپ کو قصبے میں بلاتے ہیں۔ سید صاحب آ گئے۔ مولانا نے بہ حالت غیظ کہا کہ آپ نے فرمایا تھا بلا سنے بد اندر آئیں گے۔ نہ میں نے آپ کو بلایا، نہ آپ نے مجھ سے پچھوایا۔ رعایا کا سامان باہر نکلوایا جا رہا ہے، اگر کوئی شے گم ہو جائے تو نقض عہد ہو۔ بہتر یہی ہے کہ آپ تشریف لے جائیں۔ یہ بات بہ تکرار کہی۔ سننے والوں کو اس کا انداز پسند نہ آیا، لیکن کسی نے دم نہ مارا۔

سید صاحب پیکر علم تھے، فرمایا: مجھ سے کہا گیا تو آیا، ورنہ کاہے کو آتا۔ میں ابھی جاتا ہوں۔ یہ فرما کر مشرقی دروازے سے باہر نکلے اور ندی کے مشرقی کنارے پر توت کے درختوں کے سایے میں جا بیٹھے۔

مولانا کو جب شیخ ولی محمد کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ سید صاحب کو کوئی پیغام بھی نہیں پہنچا تھا تو سارے انتظامات سے فارغ ہو کر حضرت کی خدمت میں پہنچے اور سر جھکا کر سامنے دو زانو جا بیٹھے۔ اس وقت سید صاحب نے اہل قصبہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ نے میاں صاحب[1] سے ہماری شکایت کی اور ہم سے ناراض کر دیا۔ ہمارے لشکری کسی کی کوئی چیز نہیں لیتے یا سونے کے لیے چارپائیاں لے لیتے ہیں یا پکانے کے لیے ہنڈیاں۔ جاتے ہیں تو ہر چیز مالکوں کو لوٹا جاتے ہیں۔ پھر مولانا سے مخاطب ہو کر فرمایا: مجھے آپ کے عہد کی اطلاع کسی نے نہ دی، ورنہ ایسا ہرگز نہ ہوتا۔" مولانا نے ادب سے حقیقت حال عرض کی۔ اہل قصبہ نے لشکر اسلام کے سرداروں کی حق شناسی کا یہ رنگ دیکھا تو بہت معذرت کی اور خود بہ اصرار سید صاحب کو گڑھی میں لے گئے۔

پیش قدمی

سید صاحب نے رسالدار عبدالحمید خاں کی جگہ حمزہ علی خاں لہاری والے کو رسالداری کا عہدہ دے دیا تھا۔ حاجی بہادر شاہ خاں کو ایک سو آدمیوں کے ساتھ مردان میں چھوڑا، بعض زخمیوں کو بھی ان کے حوالے کیا۔ اس اثنا میں مختلف خوانین معہ لشکر لے کر پہنچ گئے۔ ملا کر چھ سات ہزار نبرد آزما جمع ہو گئے۔ نماز عصر کے بعد اس لشکر کے ساتھ پشاور کی جانب کوچ کیا۔ مغرب و عشا کی نمازیں راستے میں ادا کیں۔ سارا سفر میدانی علاقے میں سے تھا۔ راستے میں ایک کنوئیں پر پانی پیا۔ تھوڑی دیر آرام کر کے وہیں فجر کی نماز پڑھی۔ پاس کے ایک گاؤں والے تواضع کے لیے چھاچھ لے آئے۔ ایک گھڑی دن چڑھا تھا کہ سید صاحب چارسدہ پہنچ گئے۔

---

[1] جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، سید صاحب مولانا کو ہمیشہ "میاں صاحب" کہہ کر پکارتے تھے، اور یہی مولانا کا خاندانی لقب تھا۔

اہل چارسدہ نے مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ وہاں سے پشاور پندرہ سولہ میل تھا لیکن دریا سے گزرنے کی کوئی صورت نہ بن سکی۔ درانی جاتے جاتے ساری کشتیاں ڈبو گئے تھے یا توڑ کر جلا گئے تھے۔ دور دور تک کوئی کشتی نہ مل سکی تو فیصلہ کیا کہ تنگی پہنچیں جہاں سے دریا کو کشتی کے بغیر عبور کر لینا ممکن تھا۔

منزلیں

چارسدہ سے تنگی، وہاں سے مبٹ اور شب قدر ہوتے ہوئے مچنی پہنچے۔ راستے میں ہر مقام پر لوگ درانیوں کی شکایتیں لے کر آتے اور کہتے کہ وہ ہم سے پیداوار کا نصف حصہ لیتے تھے اور انتظام کا سارا خرچ بھی ہم پر ڈالتے تھے۔ اس طرح بمشکل ایک تہائی آمدنی ملتی تھی۔ سید صاحب نے فرمایا کہ فی الحال ہمیں ایک تہائی دیتے جانا۔ اسی میں سارا خرچ بھی چلائیں گے۔ جن لوگوں کے پاس سندیں تھیں، انھیں بحال رکھا۔ اس سلسلے میں تو تمگ زئی کے رسول خاں کی سند کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔

مچنی سے ناگمان کو عبور کرنے کے لیے کشتی بانوں کے ساتھ دو سو روپے اجرت کے طے ہوئے۔ سید صاحب نے میر عبدالرحمٰن عرف رحمٰن علی، ملا قطب الدین ننگرہاری اور ملا لعل محمد قندھاری کی جماعتوں کو آگے بھیج دیا تاکہ وہ دریا کے دوسرے کنارے پر اپنے مورچے بنا لیں اور اگر دشمن بر سلسلۂ عبور حملہ کرے تو اسے روک سکیں۔ سواروں نے گھوڑوں کو تیرا کر پار اتارا۔ جو لوگ تیرنا نہیں جانتے تھے انھوں نے گھوڑے تیراکوں کے حوالے کر دیے۔ فرج اللہ عرب نے جو لشکر اسلام کا ایک نشان بردار تھا، سترہ گھوڑوں کو پار پہنچایا۔ درانی ایک مرتبہ قریب پہنچے لیکن انھیں حملے کا حوصلہ نہ ہوا اور واپس چلے گئے۔

کھانے کی تنگی

مچنی کی آبادی اس زمانے میں جھونپڑیوں پر مشتمل تھی۔ ہر جھونپڑی الگ الگ۔ مولانا نے دیکھا تو مزاحاً فرمایا کہ انھیں خدا تعالیٰ نے دوزخ میں بھیجا تو یہ خسر الدنیا والآخرہ کے مصداق ہوں گے۔ ان کا گزارا صرف نان و نمک اور دودھ پر تھا۔ ایک ایک پتھر پر لڑ کر مر جاتے تھے۔

مچنی میں سید صاحب نے دو مقام کیے۔ ایک روز غلہ نہ مل سکا تو ایک گائے ذبح کی، اس کا گوشت کسی کو ملا، کسی کو نہ ملا۔ غلہ آیا تو سب سے پہلے ان لوگوں کو بھیجا گیا جو دریا کے دوسرے کنارے پر گزرگاہ کی حفاظت کے لیے بھیجے گئے تھے۔ باقی لشکر انتظار میں رہا۔ سید صاحب کے لیے کھانا پک کر آیا تو فرمایا: معاذ اللہ میں تنہا کھاؤں اور باقی بھائی فاقے میں رہیں! یہ کبھی نہ ہوگا۔ ہر چند لوگوں نے اصرار کیا، آپ نے انکار فرما دیا۔ جب غلہ آیا، سب میں تقسیم ہوا اور سب کھانا پکا چکے تو آپ نے بھی کھایا[1]

---

[1] منظورہ صفحہ [illegible]۔ ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ قلندر کابلی پکی پکائی روٹی لیتا تھا۔ غلے کی تنگی دیکھ کر بولا کہ مجھے آٹا دو۔ اسے آٹا دے دیا گیا تو [illegible] سید [illegible] فرمایا [illegible] پکا دو

دریا سے گزر کر آپ ریگی پہنچے جو ارباب بہرام خاں کی قوم یعنی خلیل کا گاؤں تھا۔ وہاں ارباب جمعہ خاں آ گئے اور یہ خبر پہنچائی کہ درانی پشاور کو خالی کر کے پہاڑوں پر چلے گئے ہیں۔ اہل و عیال کو انھوں نے کوہاٹ بھیج دیا ہے۔ وہاں سے گمٹ فروسہ میں گئے جس کے قریب پیر تاریک کی قبر تھی[1] ارباب فیض اللہ خاں مہمند ساکن ہزار خانی سلطان محمد خاں کی طرف سے صلح کا پیغام لے کر حاضر ہوا۔

---

[1] اس کا نام بایزید تھا۔ تجارت کے سلسلے میں ہندوستان آیا۔ جالندھر میں شادی کی۔ پھر ایک نیا مذہب پیدا کیا اور اپنا نام پیر روشن رکھا۔ دیندار لوگوں نے اسے پیر تاریک کا خطاب دیا۔ اخوند درویزہ نے اس کے فتنے کو ختم کرنے کے لیے بڑی ہمت کی۔ آخر بایزید بری حالت میں مرا۔ اس کے بیٹوں نے فتنہ اٹھایا، وہ بھی مارے گئے۔

اٹھائیسواں باب

دُرّانیوں سے مصالحت

پیغامِ مصالحت

سلطان محمد خاں نے ارباب فیض اللہ خاں کو مشورے کے لیے بلایا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ مصالحت قرینِ صواب ہے۔ جب میدانی علاقے میں جنگ نہ ہو سکی تو اب شہر میں لڑنے کی کون سی صورت ہے؟ اس پر سلطان محمد خاں کے بھائی جوش میں آ گئے اور بولے کہ ہم کبھی صلح کے لیے تیار نہیں ہو سکتے، بلکہ برابر لڑتے رہیں گے، لیکن سلطان محمد خاں نے تمام حالات پر غور و فکر کے بعد ارباب ہی کے مشورے کو پسند کیا۔ چنانچہ ارباب نے سید صاحب کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا کہ سلطان محمد خاں توبہ کے لیے تیار ہے اس کی تقصیریں معاف کر دیجیے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر کوئی کافر آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہے کہ میں ایمان لانا چاہتا ہوں تو کیا اسے حلقۂ اسلام میں داخل نہیں فرمائیں گے؟ میں تو مسلمان ہوں اور مسلمان زادہ ہوں۔ پھر میری خطاؤں پر خطِ عفو کھینچنے میں کیوں تامل ہے؟ میرا ملک مجھے دے دیجیے، مدت العمر اطاعت گزار رہوں گا۔

ارباب نے یہ بھی کہہ دیا کہ صلح کا محرک میں ہوں، میرے نزدیک قومی مصلحت صلح ہی کی متقاضی ہے، درّانیوں سے بھی میرا پرانا تعلق ہے۔ آپ کی خدمت میں بھی ارادت کا شرف حاصل ہے۔ بے شک آپ فتح حاصل کر چکے ہیں، لیکن سرداروں کے پاس اب بھی خاصا لشکر اور ساز و سامان ہے۔ اگر صلح نہ ہوئی تو اندیشہ ہے کہ باہمی رزم و پیکار کا لامتناہی سلسلہ جاری ہو جائے گا اور جو مقصد ہم سب کو عزیز ہے، وہ یقیناً ضغطے میں پڑ جائے گا۔

سید صاحب کا جواب

یہ گفتگو فارسی میں ہوئی تھی، غازیوں میں سے جو اصحاب فارسی جانتے تھے، انھیں یہ باتیں اچھی معلوم نہ ہوئیں۔ لیکن سید صاحب عادت شریف کے مطابق انتہائی نرمی اور ملائمت سے جواب دیتے رہے۔ آپ نے فرمایا:

> ہم دین کی تائید کے لیے یہاں آئے تھے۔ مسلمانوں کو کاروبارِ جہاد میں شریک کرنے کی کوشش کی۔ آپ کے سردار نے کج فہمی سے کام لیتے ہوئے ہمارا ساتھ چھوڑ کر غیر مسلموں سے اتفاق کر لیا۔ اس کے بڑے بھائی نے خواہ مخواہ ہمارے ساتھ جنگ

کی اور اپنی جان گنوائی۔ پھر ہم نے آپ کے سردار کو خطوں کے ذریعے سے نصیحت کی کہ وہ دینِ اسلام کی حمایت کے لیے تیار ہو جائے اور غیر مسلموں کا ساتھ چھوڑ دے۔ یہ نصیحت اس پر اثر انداز نہ ہوئی اور جنگ کی نوبت آئی۔ خدا کی مدد سے اسے شکست ہوئی اور ہمارا لشکر اس کے تعاقب میں یہاں تک پہنچ گیا۔

گویا جو امور درّانیوں کے خلاف جنگ کا باعث ہوئے تھے، وہ انتہائی صفائی سے پیش کر دیے ارباب نے کہا کہ میں وکیل بن کر صلح کرا رہا ہوں۔ اگر سلطان محمد خاں اور اس کے بھائی اس کے بعد بھی اپنے پُرانے وتیرے پر قائم رہے تو ارباب بہرام خاں کی طرح میں بھی ان کی رفاقت چھوڑ دوں گا اور آپ کے ساتھ مل جاؤں گا۔

آخری فیصلہ

اس روز کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور ارباب فیض اللہ خاں واپس چلا گیا۔ عصر کے وقت آسمان پر گھنگور گھٹا چھا گئی۔ ساتھ ہی خبر ملی کہ درّانیوں کا لشکر تہکال میں جمع ہو چکا ہے اور غازیوں سے لڑنے کے لیے آ رہا ہے۔ غازی مسلح ہو کر اپنی لشکر گاہ کے جنوبی و مغربی گوشوں میں کھڑے ہو گئے۔ درّانی انھیں راستوں سے آ سکتے تھے۔ یکایک تیز ہوا چلی اور گھٹا چھٹ گئی۔ پھر اطلاع پہنچی کہ درّانی شام کے وقت تہکال کو خالی کر کے واپس چلے گئے، اس لیے کہ انھیں غازیوں کے شبخون کا خوف تھا۔ دوسرے روز غازی تہکال پہنچ گئے۔ ارباب فیض اللہ خاں نے دوبارہ حاضر ہو کر سلطان محمد خاں کی طرف سے عجز و اطاعت کا اظہار کیا۔ سید صاحب نے فرمایا:

> جانیے، میں نے ملک اسے دے دیا۔ شرط یہ ہے کہ وہ بُرے افعال سے خلوص کے ساتھ توبہ کرے، غیر مسلموں کی اعانت سے دست کش ہو جائے اور جب ہمیں غیر مسلموں سے مقابلے کی نوبت آئے تو جان و مال اور لشکر سے ہمارا ساتھ دے۔

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سید صاحب نے اچانک ارباب کی رائے قبول کر لی۔ انھوں نے معاملے کے تمام پہلوؤں پر خوب غور کیا ہوگا۔ ممکن ہے بعض رفیقوں سے مشورہ بھی کیا ہو۔ تاہم یقین ہے کہ ارباب کے آنے سے پیشتر وہ قطعی فیصلہ کر چکے تھے کہ اگر مصالحت کی کوئی صورت پیدا ہوئی تو بحکم "ان جنحوا للسلم فاجنح لہا و توکل علی اللہ" اس کا خیر مقدم کریں گے۔

پشاور میں داخلہ

ساتھ ہی یہ بھی واضح فرما دیا کہ ہم فاتحانہ نہیں بلکہ بطور مہمان پشاور جائیں گے اور سردار سے عہد و پیمان مستحکم کر کے واپس چلے جائیں گے۔ درّانی چاہتے تھے کہ سید صاحب پشاور نہ جائیں۔ انھیں خیال ہوگا کہ اگر ایک مرتبہ پشاور میں داخل ہو گئے تو ممکن ہے پھر اسے چھوڑنے پر

راضی نہ ہوں۔ اس بنا پر فیض اللہ خاں کی آمد و رفت جاری رہی۔ تھکال پہنچنے سے تیسرے دن درانیوں نے رضامندی کا اظہار کیا۔ ظہر کے وقت غازی پشاور کی طرف روانہ ہوئے۔ پیادے سب سے آگے تھے، سوار سب سے پیچھے۔ سید صاحب پیادوں کے ساتھ سبزہ رنگ گھوڑے پر سوار تھے۔ ہر جماعت کے ساتھ اس کا نشان تھا۔ بندوقچیوں نے فتیلے روشن کر لیے تھے کہ مبادا اتفاقیہ کوئی ناگوار صورت سامنے آ جائے۔ روانگی سے پیشتر سید صاحب نے عاجزی کے ساتھ دعا کی۔ عصر اور مغرب کی نمازیں راستے میں ادا کیں۔ کابلی دروازے سے شہر میں داخل ہوئے۔

سید صاحبؒ کی قیامگاہ

سید صاحب کے قیام کے لیے پہلے سے سرائے گورکھتری تجویز ہو چکی تھی۔ جس کی حیثیت قلعے کی سی تھی۔ اس کے جنوبی و مغربی گوشے میں ایک تہ خانہ دار دو منزلہ حویلی تھی، جس میں تین طرف اکہرے اور ایک طرف دوہرے دالان تھے۔ اس حویلی میں سید صاحب ٹھہرے۔ مشرقی جانب کی کوٹھڑی میں آپ کا پلنگ بچھایا گیا۔ باقی دالانوں میں جماعت خاص کے آدمی مقیم تھے۔ اس جماعت خاص کے چار بہیلوں سے آٹھ آدمی سید صاحب کی خواب گاہ پر باری باری پہرے دیتے تھے۔ ان میں سے دو آدمی سید اسماعیل رائے بریلی والے کے بہیلے میں سے تھے، دو مولوی امام الدین بنگالی کے بہیلے میں سے، دو مولوی عبدالحکیم پھلتی کے بہیلے میں سے اور دو مولوی صلاح الدین پھلتی کے بہیلے میں سے[1] آپ نے حویلی میں پہنچ کر سب سے پہلے دعا کی۔

حویلی کے دروازے کے سامنے جو مکان تھا، اس میں مولانا شاہ اسماعیل ساتھیوں کے ہمراہ اُترے۔ حویلی کی پشت پر اس سے ملا ہوا جو مکان تھا، اس میں شیخ ولی محمد پھلتی نے مع جماعت قیام کیا۔ ارباب بہرام خاں سرائے کے دروازۂ کلاں میں اقامت پذیر ہوئے۔ جو لوگ سید صاحب سے ملنے کے لیے آتے، وہ پہلے ارباب سے ملاقات کرتے۔ خوانین سمہ سرائے کے مشرقی دروازے کے باہر مختلف مکانوں میں اُترے۔ فتح خاں (پنجتاری)، فتح خاں (زیدہ) اور ابراہیم خاں (کھلابٹ) دروازے کی جانب جنوب، منصور خاں (چارگلئی)، اسماعیل خاں (اسماعیلہ)، مشکار خاں اور راشد خاں (شیوہ) اور سردار خاں (امان زئی) دروازے کے جانب شمال۔ ارباب جمعہ خاں (برادر ارباب بہرام خاں) کو کابلی دروازے کے باہر ٹھہرایا گیا۔

غازیوں کی حق شناسی

سید صاحب نے پشاور میں داخل ہونے سے پہلے سب غازیوں پر واضح فرما دیا تھا کہ ہم بطور مہمان جا رہے ہیں، اس لیے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ غازی

---

[1] اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ اس وقت جماعت خاص کے چار بہیلے تھے۔

بھوکے تھے، لیکن امام کے حکم کی پابندی میں کھانے کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا۔ رات اسی حالت میں گزار دی۔ صبح بازار سے کھجوریں خرید کر سب کو ناشتے کے لیے دیں۔ پھر ارباب بہرام خاں نے بنیوں کو بلا کر رسد کا انتظام کیا۔ گھوڑے اور اونٹ بھی رات بھر بھوکے رہے۔ صبح کو ان کے چارے کے لیے تگ و دو شروع ہوئی۔ اس وقت ارباب فیض اللہ خاں نے بتایا کہ آس پاس کے کھیت سرکاری ہیں، ان سے مکئی کاٹ کر کھلائی جائے۔ غازیوں نے کاشتکاروں کو بلا کر فصل تقسیم کرائی۔ پھر جانوروں کے لیے چارہ لائے۔

سرائے کے بعض کوٹھوں کی منڈیریں خراب ہو چکی تھیں۔ سید صاحب نے غازیوں کو حکم دے دیا کہ سب منڈیروں کی مرمت کر دیں۔ جس مکان میں ارباب بہرام خاں ٹھہرے ہوئے تھے، اس کی ایک دیوار شکستہ تھی، سید صاحب نے اسے بھی درست کرا دیا۔ سرائے کے جنوبی و مغربی کونے میں ایک مسجد تھی، جو صاف نہ تھی، سید صاحب نے اس کی صفائی کرا دی اور وہیں نماز پڑھنے لگے۔

اگرچہ احتیاطاً اعلان کر دیا گیا تھا کہ لشکر کے داخلے کے وقت سب لوگ دکانیں بند کر دیں، لیکن چونکہ اکثر لوگوں کو معلوم تھا کہ غازی کسی چیز کو نہیں چھیڑتے، اس لیے دکانیں عام طور پر کھلی رہیں۔ بعض دروازوں میں چپا خاں کا انتظام تھا۔ ہزاروں مرد و زن کوٹھوں پر جمع تھے۔ غازیوں کی نظریں نیچی تھیں۔ سب خدا کی حمد و ثنا اور شکر کے پیکر بنے ہوئے تھے۔ سرائے کے دروازے پر پہنچ کر بعض نے بندوقیں سر کرنی چاہیں، سید صاحب نے انھیں منع فرما دیا۔ ارباب بہرام خاں نے سید صاحب کے حکم سے یہ اعلان بھی کر دیا کہ سب لوگ اطمینان سے اپنا کاروبار جاری رکھیں، کسی کو قطعاً کوئی آزار نہ پہنچے گا اور ایک حبے کا بھی نقصان نہ ہوگا، البتہ بھنگ خانے اور فواحش خانے بالکل بند ہو جانے چاہئیں۔

گفتگوئیں اور مشورے

اگرچہ مصالحت کا فیصلہ ہو چکا تھا لیکن باقاعدہ عہدنامہ نہیں ہوا تھا۔ سید صاحب پشاور پہنچے تو اس بارے میں بات چیت شروع ہو گئی۔ پہلے کی طرح اب بھی ارباب فیض اللہ خاں ہی درانیوں کی طرف سے وکیل تھے۔ ان کی تجویز تھی کہ:

۱۔ چالیس ہزار روپے سید صاحب کی خدمت میں پیش کیے جائیں: بیس ہزار پشاور میں، دس ہزار چارسدہ میں اور دس ہزار پنجتار پہنچنے پر۔

۲۔ اطاعت اور اعانت فی الجہاد کا پختہ اقرار کیا جائے۔

سلطان محمد خاں ان شرطوں پر راضی تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے پیر محمد خاں اور حبیب اللہ خاں کو یہ منظور نہ تھیں۔ ارباب نے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں تو انھیں شرطوں پر فیصلہ کرا سکتا ہوں، اگر یہ منظور نہیں تو گفتگو کو ختم سمجھنا چاہیے۔ اس پر وہ جھک گئے۔ سید صاحب کو یہ حالات معلوم ہوئے تو فرمایا:

> ہماری نیت تو محض یہ ہے کہ مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ پر متفق کریں۔ کفر مغلوب ہو جائے، مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو، دین اسلام ترقی کرے۔ نہ ہمیں پشاور سے غرض ہے، نہ کابل سے۔

ان گفتگوؤں کے دوران میں سید صاحب وقتاً فوقتاً خوانین سمہ کے علاوہ مولانا شاہ اسماعیل، مولوی مظہر علی، شیخ ولی محمد، ملا لعل محمد قندھاری، ملا قطب الدین ننگرہاری اور ارباب بہرام خاں تہکالی سے مشورے بھی کرتے رہتے تھے۔

مسئلہ حوالگی پشاور

جب تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا، سید صاحب کے تمام رفقا خاموش تھے۔ جب انھیں معلوم ہو گیا کہ پشاور کو درانیوں کے حوالے کر دینے کا فیصلہ ہو گیا ہے تو بعض مخلصوں کے دل میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ ان کے سامنے درانیوں کی بدعہدیاں اور خود غرضیاں تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ یہ لوگ مجبور ہو جائیں تو ہر شرط قبول کر لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، جب مطلب نکل جائے تو انھیں نہ خدا اور رسولؐ کا خوف رہتا ہے، نہ دنیا کی شرم۔ ان سب نے مولانا شاہ اسماعیل کے پاس حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضرت کو اس ارادے سے روکا جائے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں امیر المومنین کا تابع فرمان ہوں، خود کچھ نہیں کہوں گا، البتہ مجھ سے پوچھا جائے گا تو جو کچھ رائے ناقص میں آئے گا، عرض کر دوں گا۔ آپ حضرات کو جو کچھ کہنا ہے، براہ راست امیر المومنین سے کہو۔

ہندوستانی غازیوں کے علاوہ خوانین سمہ، غازیان قندھار و ننگرہار اور ملکی لوگوں کو بھی حوالگی پشاور سے اختلاف تھا۔ چنانچہ فتح خاں پنجتاری، اسماعیل خاں، جعفر خاں ترین، ملا لعل محمد، ملا قطب الدین، ملا نور محمد، ملا عزت وغیرہ ارباب بہرام خاں کے پاس پہنچے اور عرض کیا کہ حضرت کو اس مصالحت سے روکا جائے۔ اس پر نہ اہل لشکر راضی ہیں، نہ اہل شہر۔ ارباب نرم دل آدمی تھے، انھوں نے سب کو تسلی دی کہ ہم ضرور حضرت سے بات کریں گے۔

سید صاحب کا ارشاد

چنانچہ ارباب نے سید صاحب سے بات کی۔ درانیوں کے ظلم و ستم اور بدعہدیاں ایک ایک کر کے جتائیں۔ یہ بھی عرض کیا کہ سب کو سرداروں کے مکر و فریب کے پیش نظر اندیشہ ہے کہ کہیں آپ پر حملہ نہ کر دیں۔ نیز اکثر لوگ خصوصاً مردان دوآبہ اس مصالحت کے سخت خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے شاہ زمان اور شاہ شجاع سے کیا سلوک کیا کہ آپ کو بھلائی کی امید ہو؟

سید صاحب نے فرمایا:

> خان بھائی، اگر موت یونہی لکھی ہے تو میں ناچار ہوں۔ بے شک سردار کی مکاری اور غداری

کا مجھے علم ہے، لیکن ہم گھر بار چھوڑ کر اس نیت سے یہاں آئے ہیں کہ وہ کام کریں، جس میں پروردگار کی خوشنودی اور رضامندی ہو۔ مخلوق کی خوشی اور ناخوشی سے کچھ غرض نہیں۔ نادان سمجھتے ہیں کہ ملک گیری اور دنیا طلبی ہمارا مقصد ہے، حالانکہ حبّ و بُغض محض للہ فی اللہ ہے۔ اس جہاد میں نہ نفسانیت ہے، نہ جنبہ داری۔ باقی رہا رعایا کی خرابی اور تکلیف کا معاملہ تو اوّل تو رعایا کو آرام دینا ویسے ہی سب کا فرض ہے۔ پھر جب ہم خود ان سرداروں کو حاکم بنا کر بٹھا دیں گے تو امید ہے کہ کسی پر سختی اور تعدّی نہ ہو گی۔

رضائے حق کے سامنے ہفت اقلیم کی تاجداری ہیچ ہے۔ اب سلطان محمد خاں تائب ہے، دل کا حال خدا جانے۔ حکم شریعت کا مدار تو ظاہر پر ہے۔ ہم کیوں اس کا عذر نہ مانیں؟ ہمارے پاس اس پر کون سی دلیل اور حجت ہے؟ اگر کوئی دیندار اور خدا پرست عالم دلیل شرعی سے سمجھا دے کہ ہماری رائے غلط ہے تو ہم مان لیں گے[1]

یہ ارشاد سُن کر سب کے آنسو نکل آئے۔ ارباب نے عرض کیا، مجھ سے غلطی ہوئی، معافی چاہتا ہوں۔ آپ میرے لیے دعا فرمائیں۔

ارباب کی پیشکش

ایک روایت ہے کہ (غالباً خود عرض کرنے سے پہلے) ارباب بہرام خاں نے کسی ذریعے سے عرض کرایا تھا کہ ملک کسی کو دینا ہی ہے تو مجھے عنایت فرمائیں:

---

[1] ایک روایت میں سید صاحب کا ارشاد یوں منقول ہے: ہمارا بھروسا ناصرِ حقیقی پر ہے۔ اس مالک الملک نے شہزادوں کی کثرت تعداد و کثرت سامان کے باوجود ہمیں غلبہ عطا کیا۔ اگر وہ لوگ ہم فقیروں کی طرف سے ان مراعات کے باوجود غدر کریں گے تو خدا اس پر قادر ہے کہ تعزیراً انھیں بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکے اور دنیوی فلاح سے بھی ان کی امید منقطع ہو جائے۔ نیز ہمیں اپنے پروردگار کے نام کا ادب ہے جس کا وسیلہ انھوں نے ڈھونڈا اور از سرِ نو توبہ کا اظہار کرنے لگے۔ دنیا پر ہمارا حسن نیت بھی آشکارا ہو جائے گا۔ ہم نے للہ فی اللہ اس عبادت (جہاد) کا بارِ گراں اٹھایا ہے۔ ان نادانوں نے، الا ماشاء اللہ، گمانِ فاسد کی بنا پر سمجھ رکھا ہے کہ ہم ملک و جاہ کے طالب ہیں (منظورہ صفحہ ۹۴۱)۔

بعض روایتوں میں سید صاحب کا جواب یوں مرقوم ہے: سردار اطاعت کا اقرار کرتا ہے، عذر نہ مانیں تو کیا کریں۔ شریعت کا حکم ظاہر پر لگتا ہے۔ ہم اس سے وہی معاملہ کریں گے جو ظاہر شریعت کے مطابق ہے۔

۱ ۔ میں اس کی حفاظت کروں گا۔ سردار لشکر لے کر آئیں گے تو امیر المومنین سے مدد طلب کیے بغیر ان کا مقابلہ کرتا رہوں گا۔ میری قوم خاصی بڑی ہے، اس کی امداد میرے لیے کافی ہو گی۔

۲ ۔ چار ہزار سپاہی ملازم رکھ کر حضرت کے ہم رکاب کر دوں گا۔ ان کی تنخواہ اور خرچ کا سارا بوجھ مجھ پر ہو گا۔

۳ ۔ میں اس اعزاز کو دینی خدمات کا ذریعہ بنانا چاہتا ہوں، نہ کہ دنیوی عیش کا۔ میں اہل ملک کے حالات وعادات سے واقف ہوں۔ عام لوگ مجھ سے راضی ہیں۔

سید صاحب نے یہ سنا تو مسکراتے ہوئے فرمایا: ارباب نے ہمارا مقصد نہیں سمجھا۔ ہمارے اور ارباب کے درمیان قطعاً منازعت نہیں۔ ملک کو ارباب کے حوالے کرنے کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ اس پر ہم نے اپنا قبضہ بحال رکھا۔ ظاہر ہے کہ سید صاحب کی یہ رائے یقیناً درست تھی۔

ایک سیٹھ کا معروضہ

پشاور میں بدھ رام نام ایک مشہور سیٹھ تھا۔ وہ سید صاحب کی خدمت میں آیا تو نقد روپے کے علاوہ انگور، انار، پستہ، بادام، ناشپاتی اور بہی کی ٹوکریاں اور تھیلے لایا۔ اس نے بھی یہی کہا کہ پشاور کو نہ چھوڑیے۔ روپے کی ضرورت ہو تو جتنا درکار ہو اس کا انتظام میں کر دیتا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ زمیندار اور کاشتکار ہی نہیں بلکہ تاجر اور دکاندار بھی حالات کی ابتری کے باعث پریشان تھے۔ سب دیکھ چکے تھے کہ سرداروں کے ہوتے ہوئے کئی مرتبہ سکھوں نے یورشیں کیں اور جو کچھ مل سکا جبراً اٹھا کر لے گئے۔ خود سرداروں کی یہ حالت تھی کہ جب اطمینان سے بیٹھنے کا موقع پاتے، دیہاتیوں اور شہریوں کو ہر ممکن ذریعے سے لوٹتے۔ سید صاحب اور ان کے غازیوں کی حق شناسی معروف عوام تھی، اس لیے سب چاہتے تھے، معاملات کی باگ ڈور براہ راست ان کے ہاتھ میں رہے تاکہ بیرونی یورشوں کا بھی سدباب ہو اور اندرونی اخذ وسلب کا دروازہ بھی بند ہو جائے۔

سیّد صاحب نے بدھ رام کی باتیں سن کر فرمایا:

یہ مشورہ ملک گیروں کے کام کا ہے۔ ہم ان حاکموں میں سے نہیں ہیں۔ جو خطاکار عذر کرے اور معافی مانگے، اسے معاف کر دینا چاہیے۔

زمان شاہ درانی کی رائے

سید جعفر علی نقوی، واقعۂ بالاکوٹ کے بعد جب وطن آئے تھے تو لدھیانہ میں زمان شاہ درانی سے بھی ملے تھے۔ شاہ نے دوران گفتگو میں ان سے کہا:

وقتیکہ آں جناب آں ملک (پشاور) را
بہ حرام نمکاں (سرداران پشاور) دادند،
دل ما از بس رنجید۔ دانستیم کہ حضرت
امیر المومنین مسلمان کامل اند کہ در فریب
منافقاں در آمدہ، آں ملک را بہ آنہا دادند
و آں منافقاں خانۂ سلطنت ما بدولت
خراب ساختند، با دیگرے چہ وفا خواہند کرد؟
قابل عطائے آں ملک، ما بودیم۔ بہ تقدیر الٰہی
آں وقت وکیل ما حاضر نہ بود۔ خیال ما از
خاطر مبارک امیر المومنین ذاہل شدہ[1]

جب سید صاحب نے وہ ملک (پشاور)
ان نمک حراموں کو دے دیا تو ہمیں سخت
رنج ہوا۔ ہم نے سمجھ لیا کہ حضرت امیر المومنین
کامل مسلمان ہیں، ان منافقوں کے فریب
میں آگئے اور ملک انھیں دے دیا۔ ان
منافقوں نے ہماری سلطنت تباہ کر ڈالی
دوسرے کے ساتھ یہ کیا وفا کر سکتے تھے؟
یہ ملک ہمیں ملنا چاہیے تھا۔ تقدیر الٰہی
سے ہمارا وکیل اس وقت حاضر نہ تھا
اور امیر المومنین ہمارا خیال بھلا چکے تھے۔

معاملے کی حقیقت

غرض پشاور کی حوالگی سے سید صاحب کے زمانے میں بھی اختلاف کیا گیا تھا اور ہمارے زمانے میں بھی مولانا عبید اللہ مرحوم سندھی نے سید صاحب کے اس عمل کو ہدفِ اعتراض بنایا۔ میں جس حد تک تحقیق کر سکا ہوں ہندوستانی غازیوں میں سے حافظ امام الدینؒ امپوری کے سوا کسی کو اختلاف باقی نہیں رہا تھا۔ سید صاحب کا نقطۂ نگاہ سنتے ہی سب مطمئن ہو گئے۔ مولانا شاہ اسماعیل نے اس وقت اپنی رائے ظاہر کی اور نہ بعد میں کچھ فرمایا۔ منشی محمدی انصاری ابتدا سے سید صاحب کی رائے کو بہمہ وجوہ درست و محکم مانتے تھے اور آخر وقت تک ان کا عقیدہ یہی رہا۔ ارباب بہرام خاں کو حقیقت حال کا علم ہو گیا تو اعتراف کر لیا کہ جو تجویز انھوں نے پیش کی تھی، وہ غلط تھی۔

سارے حالات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ سید صاحب کا فیصلہ بالکل درست تھا:

۱ ۔ وہ سرحد اس غرض سے نہیں گئے تھے کہ مقامی رئیسوں اور امیروں کی گدیاں تہ و بالا کریں۔ ان کی غرض یہ تھی کہ مسلمانوں کو متحد کر کے راہِ حق پر لگائیں۔

۲ ۔ مسلمانوں سے جنگ ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی۔ جو کشمکش ناخواستہ پیش آئیں، وہ اس درجہ ناگزیر ہو گئی تھی کہ سید صاحب کے لیے امرِ حق کو ترک کیے بغیر اس سے بچنے کا کوئی راستہ

---

[1] منظورہ صفحہ ۱۲۲۷ - اصل رائے بھی غلط ہے اور استدلال بھی قطعاً صحیح نہیں۔ تفصیل پیش نہیں کی جا سکتی ۔

ہی نہیں رہا تھا۔

۳۔ پشاور پر پیش قدمی کی غرض یہ نہ تھی کہ پشاور اور گرد و نواح کا علاقہ لے لیا جائے۔ اصل غرض یہ تھی کہ سلطان محمد خاں اور اس کے بھائی مخالفت کا راستہ چھوڑ کر موافقت اختیار کر لیں۔ جنگ مایار سے پیشتر بھی سید صاحب نے اپنا سفیر بھیج کر سلطان محمد خاں کو راہِ راست پر لانے کی سعی فرمائی تھی۔

۴۔ جب سلطان محمد خاں اور اس کے بھائی توبہ کا اقرار کر رہے تھے اور سید صاحب کی تمام شرطوں کو قبول کرنے پر آمادہ تھے تو مصالح قومی کا تقاضا یہی تھا کہ انھیں ساتھ ملا کر قدم آگے بڑھایا جاتا۔ حق و انصاف کا حکم بھی یہی تھا۔ قرآن مجید کی رہنمائی بھی یہی تھی: وان جنحوا لِلسّلم فاجنح لھا وَ توکّل عَلَی اللہ۔

۵۔ اگر سید صاحب پشاور لے کر بیٹھ جاتے یا اس کا انتظام ارباب بہرام خاں کے حوالے کر دیتے تو نتیجہ اس کے سوا کیا نکلتا کہ درانیوں اور سید صاحب کے درمیان لامتناہی سلسلۂ جنگ جاری ہو جاتا، جیسا اس سے پیشتر سدوزئیوں اور بارک زئیوں میں یا دونوں برادریوں کے مختلف گروہوں میں جاری تھا اور سید صاحب کی ساری فرصت انھیں مجادلات کی نذر ہو جاتی۔ یہ بھی بعید نہ تھا کہ ایک طرف کابل کی قوت، دوسری طرف سے پنجاب کی قوت سلطان محمد خاں کی امداد کے لیے پہنچ جاتی اور نہ صرف سید صاحب پستے، بلکہ پورا سرحد پامال ہوتا۔ اس وقت یہ فرمایا جاتا کہ سید صاحب نے سلطان محمد خاں کی طرف سے اطاعت کی پیش کش قبول نہ کرنے میں سخت غلطی کی۔

۶۔ پشاور لے کر بیٹھ جاتے تو ساری دنیا یہ کہتی کہ سید صاحب ملک گیری کی غرض سے سرحد گئے تھے۔ جمع کلمۂ مسلمین اور جہاد پیش نظر نہ تھا، حالانکہ آپ کی دعوت کا ایک بنیادی نکتہ یہ تھا کہ سب کچھ للّٰہ فی اللہ کر رہے تھے۔ کوئی دنیوی غرض یا حبِ منصب پیش نظر نہیں تھی اور یہ دعویٰ سراسر خلوص پر مبنی تھا۔

صحیح راہِ عمل

غرض جس نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے۔ سید صاحب کا فیصلہ بالکل درست تھا۔ انھوں نے خادے خاں کو سمجھایا، وہ نہ مانا تو لڑائی ہوئی اور خادے خاں مارا گیا۔ پھر ساتھ ہی سید صاحب ہنڈ کو خادے خاں کے بھائی امیر خاں کے حوالے کرنے پر آمادہ تھے، لیکن اس کی دورخی پالیسی نے بات بننے نہ دی۔ پھر یار محمد خاں کو سمجھایا، وہ نہ سمجھا۔ لڑائی ہوئی اور یار محمد خاں مارا گیا۔ اگر پشاور لینا منظور ہوتا تو سید صاحب زیدہ سے سیدھے پشاور پر پیش قدمی نہ کر دیتے؟ لیکن انھوں نے یہ نہ کیا بلکہ

سلطان محمد خاں کو سمجھاتے رہے۔ اس نے بھی لڑائی ضروری سمجھی بلکہ پشاور سے مردان پہنچ کر سید صاحب پر باقاعدہ حملہ کیا۔ مجبوراً سید صاحب کو لڑنا پڑا۔ جب سلطان محمد خاں کی طبیعت درست ہو گئی اور اس نے بیعت و اطاعت اور اعانت فی الجہاد پر آمادگی ظاہر کی تو لڑائی جاری رکھنے کی کون سی وجہ ہو سکتی تھی؟ اگر بعد کے حالات توقع اور امید کے خلاف پیش آئے تو اس بنا پر سید صاحب کے فیصلہ حوالگی پشاور اور سعی اصلاح بین المسلمین کو کس بنا پر ہدفِ اعتراض بنایا جا سکتا ہے؟ کسی کا دل چیر کر دیکھنا اور اس پر خلوص یا عدم خلوص کا حکم لگانا خارج از بحث ہے۔ فیصلہ بہرحال ظاہر حالات اور اقرارات ہی کی بنا پر ہوگا۔ یار محمد خاں اور سلطان محمد خاں کے متعلق تو شروع میں بھی سب کہتے تھے کہ وہ قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتے، لیکن خادے خاں کے خلاف تو ایک شخص کی زبان بھی نہیں کھلی تھی؟ پھر اس نے موافقت کے بعد مخالفت اور اطاعت کے بعد بغاوت کا جو اقدام کیا، اس کے باب میں کیا کہا جائے گا؟ باقی خوانین میں سے بھی عملاً سب ایک رویے پر نہ رہے۔ کیا سید صاحب ان میں سے کسی کے دعوائے اطاعت کو رد کر سکتے تھے؟ نظم عساکر اور ملک داری کے معاملات میں کم حوصلگی سے کام نہیں چل سکتا۔ سید صاحب خدا کے فضل سے کم حوصلہ نہ تھے۔ انھوں نے جو مسلک اختیار کیا وہی درست تھا۔ بلاشبہ اس میں مضرتوں کے احتمالات بھی موجود تھے اور کس مسلک کو ایسے احتمالات سے کاملاً محفوظ قرار دیا جا سکتا ہے؟ لیکن دوسرا راستہ یقینی مضرتوں کا تھا۔ سید صاحب اسے کسی بھی حالت میں اختیار نہیں کر سکتے تھے۔

مولانا عبید اللہ مرحوم کا اعتراض

مولانا عبید اللہ مرحوم کے اعتراض پر بحث کی ضرورت نہیں۔ انھیں سید صاحب کی امامت سے بھی اختلاف تھا۔ فرماتے ہیں:

> جس دن سے امیر شہید افغانوں کے امیر بنے، اسی وقت سے بغاوت کی چنگاری اس اجتماع میں چمکتی رہی۔ اگر معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہوتا تو ہم افغانوں کا امیر افغان کو بناتے اور اسے امیر شہید کے بورڈ کا ممبر بنا دیتے[1]

حوالگی پشاور کے متعلق لکھتے ہیں کہ "حزب ولی اللہ" کو ایک صوبے کی حکومت مل گئی تھی، لیکن امیر شہید نے واپس کر دی:

> اس موقع پر جماعت مجاہدین کے خواص و عوام سب متفق الکلمہ تھے کہ یہ فیصلہ غلط

---

[1] شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک صفحہ ۱۴۰۔

ہے۔ مولانا اسماعیل اور ہندوستانی اور افغانی اہل الرائے نے پورا زور صرف کیا کہ امیر شہید یہ غلطی نہ کریں، مگر انھوں نے کسی کی نہ مانی[1]

یہ دونوں رائیں متضاد ہیں۔ سلطان محمد خاں کے اقرار اطاعت و اعانت پر پشاور کو اس کے حوالے کر دینے کا مطلب یہی تھا کہ سید صاحب نے "افغانوں" کا "امیر افغان" کو مان کر اسے اپنے "بورڈ" کا ممبر بنا لیا۔ لیکن مولانا کو یہ بھی منظور نہ ہُوا۔ یہ بالکل غلط ہے کہ مولانا شاہ اسماعیل یا افغانی و ہندوستانی اہل الرائے یا جماعت مجاہدین کے خواص و عوام سید صاحب کے فیصلے کو غلط قرار دینے میں متفق الکلمہ تھے۔ بلاشبہ متفرق اصحاب کو ابتدا میں اس سے اتفاق نہ تھا۔ لیکن سید صاحب کے ارشادات سُن کر سب اس سے متفق ہو گئے۔ میرے علم کے مطابق صرف حافظ امام الدین رام پوری کو آخری وقت تک اس سے اختلاف رہا۔ مولانا شاہ اسماعیل سے ایک حرف بھی منقول نہیں، جسے دلالۃً بھی سید صاحب کے فیصلے سے اختلاف کی تائید میں پیش کیا جا سکے۔ پھر مولانا کے اختلاف کی بنیاد دورِ حاضر کے سیاسی اوضاع و اطوار ہیں، لیکن سید صاحب کی تحریک کا مبنیٰ دین کے سوا کچھ نہ تھا۔

---

[1] شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک صفحہ ۱۲۹

انتیسواں باب

پشاور میں مشغولیتیں

سرداروں کا پیغام

مراتب صلح طے ہو چکے تو ارباب فیض اللہ خاں یہ پیغام لائے کہ سردار سید صاحب سے ملاقات کے آرزو مند ہیں تاکہ بے واسطہ بیعت کر لیں۔ سید صاحب نے حسب عادت شریف یہ معاملہ اپنی مجلس شوریٰ میں پیش کیا۔ وہاں فیصلہ ہوا کہ پہلے مولانا شاہ اسماعیل سلطان محمد خاں سے ملیں، پھر سید صاحب سے ملاقات کا وقت اور مقام طے کر لیا جائے۔ ارباب فیض اللہ خاں نے عرض کیا کہ میری بستی ہزار خانی[1] ابتدائی ملاقات کے لیے بہت موزوں ہے۔ مولانا اس کے لیے تیار ہو گئے۔ جو غازی مولانا کے ساتھ جانے کے لیے منتخب ہوئے ان کے نام یہ ہیں: حافظ وجیہہ الدین (باغپت)، انور خاں، شیر محمد خاں، خدا بخش رام پوری، مولوی لعل محمد خاں، سید چراغ علی (پٹیالہ)، محمود خاں (پٹیالہ)، محمود خاں (انبالہ)، طالب خاں (بنارس)، فتح علی (عظیم آباد)، کریم بخش (بنارس)، سلو خاں (دیوبند)، ولی داد خاں، نصر اللہ خاں (خورجہ)، کریم بخش، شیر انداز خاں پنجابی، نظام الدینؒ اولیا"، احمد کشمیری، شیخ نصرت (بانس بریلی)، کریم بخش (سہارن پور)، مستقیم خاں (جہان آباد)، نور محمد (قندھار)، خان بہادر اور مستقیم۔

مولانا سے ملاقات

اگرچہ مولانا کو سید صاحب نے گھوڑا دے رکھا تھا، لیکن آپ کی عادت تھی کہ اکثر پیدل چلتے اور اپنے گھوڑے پر کسی دوسرے بھائی کو سوار کرا دیتے۔ نیت یہ ہوتی تھی کہ خدا کا کام ہے، اس کے سر انجام میں جتنی زیادہ مشقتیں برداشت کریں گے، اتنا ہی ثواب زیادہ ملے گا۔ ہزار خانی بھی پیدل گئے۔ سلطان محمد خاں کی خواہش تھی کہ مولانا سے گڑھی میں ملاقات ہو اور میں دروازے تک استقبال کے لیے جاؤں۔ لیکن ارباب نے گڑھی کے دروازے کے سامنے باغ میں فرش بچھوا کر ملاقات کا انتظام کیا۔ مولانا نے پندرہ سولہ غازیوں کو اس مقام پر ٹھہرا دیا، جہاں سے سلطان محمد خاں کا لشکر آ سکتا تھا۔ خود جائے ملاقات پر پہنچ گئے[2]۔ شام ہو چکی تھی اور چاند نکل آیا تھا۔ ارباب نے ایک شمع روشن کی، ایک مشعلچی کو مشعل دے کر کھڑا کر دیا۔ سلطان محمد خاں آیا اور مولانا سے معانقہ کیا۔ فارسی میں باتیں ہوتی رہیں۔ سردار نے نیابۃً

---

[1] یہ بستی پشاور کے قریب ہے۔ [2] راویوں نے لکھا ہے کہ اس موقع پر مولانا کے پاس دو ہتھیار تھے: تلوار اور بندوق۔

مولانا کے ہاتھ پر بیعت کی، نیز اقرار کیا کہ دین کی خدمت میں سرگرم رہوں گا اور غازیوں کی اعانت میں بھی کوتاہی نہ ہوگی۔

اس اثنا میں بندوق چلنے کی آواز آئی۔ سردار کا رنگ فق ہوگیا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا: "خیر باشد، خیر باشد" مولانا دلجمعی سے بیٹھے رہے اور فرمایا: آپ بالکل نہ ڈریں۔ ارباب سے کہا کہ کاکا! دیکھو کیا معاملہ ہے[1]۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص پکڑا آیا۔ وہ خوف کے مارے کانپ رہا تھا۔ اس نے کہا کہ میری بندوق بھری ہوئی تھی اور انگلی لبلبی پر تھی۔ پاس کے ایک شخص کا ہاتھ میرے بازو پر لگا اور بندوق چل گئی۔

پہلی ملاقات معمولی بات چیت پر ختم ہوگئی۔ مولانا نے اجازت لی۔ ارباب نے عرض کیا کھانا کھا کر جائیے۔ مولانا نے فرمایا: میرا جلد چلے جانا ہی مناسب ہے۔ ارباب نے چار بہنگیوں پر کھانا پشاور بھجوا دیا۔ سردار نے کہا کہ کچھ اور باتیں بھی کرنی ہیں۔ دوسرا دن جمعہ کا تھا، اسے چھوڑ کر ہفتے کا دن دوسری ملاقات کے لیے مقرر ہوگیا۔ مولانا نے پشاور پہنچ کر کھانا ہمراہیوں میں تقسیم کر دیا۔ صبح کو سید صاحب کی خدمت میں ملاقات کی کیفیت عرض کی، جس میں بتایا کہ پچاس ہزار روپے دیتے ہیں: تیس ہزار پشاور میں، دس ہزار چارسدہ میں اور دس ہزار پنجتار پہنچنے کے بعد[2]۔

ہفتے کے دن مولانا دوبارہ ہزار خانی گئے۔ اس ملاقات میں سلطان محمد خاں نے سید صاحب سے ملنے کی آرزو ظاہر کی۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ بات خود حضرت کی رائے پر موقوف ہے، ان سے پوچھ کر بتا دیا جائے گا۔ اس مرتبہ بھی ہزار خانی سے کھانا مولانا کے ساتھ پشاور بھیجا گیا۔

سیّد صاحب سے ملاقات

سید صاحب سے ملاقات کے لیے پشاور اور ہزار خانی کے درمیان کا میدان تجویز ہوا۔ یہ بھی کہہ دیا گیا کہ سردار اپنا لشکر لے آئے، سید صاحب کا لشکر ساتھ آئے گا۔ مولانا اور ارباب نے ایک روز پیشتر احتیاطاً پورے میدان کا معائنہ کیا۔ سید صاحب نے روانہ ہوتے وقت اخوند درویزہ کے مزار پر فاتحہ خوانی کی۔ ظہر کی نماز میدان میں ادا فرمائی۔ جب جائے ملاقات سوا سوا سو قدم کے فاصلے پر رہ گئی تو لشکر کو روک دیا اور صرف بیس آدمی لے کر آگے بڑھے۔ مولانا شاہ اسماعیل

---

[1] ارباب سن رسیدہ شخص تھا۔ سب اسے کاکا (یعنی چچا) ہی کہتے تھے۔ [2] منظورہ میں ہے کہ پہلے دن مولانا ملاقات کے لیے پہنچے تو سلطان محمد خاں غازیوں کو دیکھ کر ڈر گیا اور ملاقات کے لیے نہ آیا، دوسری شام کو ملاقات ہوئی۔ سنا ہے کہ اسے کسی نے بتا دیا تھا کہ غازیوں نے ایک پوشیدہ مقام پر توپ لگا رکھی ہے۔ مولانا کے کان تک یہ افواہ پہنچی تو فرمایا: یہ لوگ کیسے نادان ہیں اتنا نہیں سوچتے کہ توپ لگا رکھی ہو تو آخر میں بھی تو سلطان محمد خاں کے ساتھ اڑوں گا۔ میرے نزدیک صحیح روایت وہی ہے جو متن میں درج ہے۔

اور ارباب بہرام خاں سید صاحب کے آگے آگے تھے۔ تھوڑی دور جا کر باقی آدمیوں کو بھی ٹھہرنے کا حکم دے دیا۔ صرف مولانا اور ارباب بہرام خاں ساتھ رہے۔ سلطان محمد خاں کے ساتھ ارباب فیض اللہ خاں اور مردان علی آئے۔ قریباً آدھ گھنٹے تک باتیں ہوتی رہیں۔

اس ملاقات میں سلطان محمد خاں نے ایک فتویٰ یا محضر خریطے سے نکال کر سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ اس پر بہت سی مُہریں ثبت تھیں۔ محضر میں خوانین سمہ سے خطاب تھا۔ مضمون یہ تھا کہ سید احمد چند عالموں کو اپنے ساتھ ملا کر تھوڑی سی جمعیت کے ہمراہ افغانستان گئے ہیں۔ وہ بظاہر جہاد فی سبیل اللہ کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن یہ ان کا فریب ہے۔ وہ ہمارے اور تمھارے مذہب کے مخالف ہیں۔ ایک نیا دین انھوں نے نکالا ہے۔ کسی ولی یا بزرگ کو نہیں مانتے، سب کو بُرا کہتے ہیں۔ انگریزوں نے انھیں تمھارے ملک کا حال معلوم کرنے کی غرض سے جاسوس بنا کر بھیجا ہے۔ ان کی باتوں میں نہ آنا۔ عجب نہیں تمھارا ملک چھنوا دیں۔ جس طرح بھی ہو سکے، انھیں تباہ کرو۔ اگر اس باب میں غفلت اور سستی برتو گے تو پچھتاؤ گے اور ندامت کے سوا کچھ نہ پاؤ گے۔

صحیح یا غلط، سلطان محمد خاں کا عذر یہ تھا کہ ہم لوگ اس محضر کی وجہ سے گمراہی میں مبتلا ہوئے۔ سید صاحب نے محضر دیکھ کر صرف اتنا فرمایا کہ یہ سراسر بہتان ہے اور اسے شاہ اسماعیل کے حوالے کرتے ہوئے تاکید فرما دی کہ کسی کو نہ دکھائیں۔ ممکن ہے غازیوں میں سے کوئی بھائی اسے دیکھ کر جوش میں آجائے اور کوئی غیر مناسب حرکت کر بیٹھے۔

سلطان محمد خاں نے تاوان کا مسئلہ چھیڑا۔ سید صاحب نے فرمایا: آپ ہمارے بھائی ہیں، تاوان یا جرمانے کا کوئی معاملہ اب باقی نہیں رہا۔ اس پر ملاقات ختم ہو گئی۔

محضر کا مسئلہ

کچھ معلوم نہیں کہ فتویٰ یا محضر کہاں تیار ہوا؟ کس نے تیار کرایا اور کس ذریعے سے سلطان محمد خاں کے پاس پہنچا؟ چونکہ اس میں سید صاحب پر تہمت لگائی گئی تھی کہ وہ انگریزوں کے فرستادہ اور مخبر ہیں، اس لیے اغلب ہے یہ لاہور میں رنجیت سنگھ کے کہنے پر تیار ہوا ہو اور اسی کے ذریعے سے سلطان محمد خاں کے پاس پہنچا ہو۔

شاہ اسماعیل کے مجموعہ مکاتیب میں دو مکتوب ایسے ہیں، جو پشاور کے دس علما کے نام بھیجے گئے۔[1]

---

[1] ان علما کے نام اور مختصر حالات ذیل میں درج ہیں:

۱ ۔ مولانا حافظ محمد احسن بن محمد صدیق معروف بہ حافظ دراز پشاوری۔ متبحر عالم۔ علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے۔ سرحد سے سمرقند تک

(بقیہ [illegible] پر)

پہلا ۹ - ربیع الثانی ۱۲۴۵ھ (۲۰ - اکتوبر ۱۸۲۹ء) کو، دوسرا ۱۷ - شوال ۱۲۴۵ھ (۱۱ - اپریل ۱۸۳۰ء) کو۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان علما کی طرف سے سید صاحب اور آپ کے رفقا پر کئی الزام لگائے گئے تھے مثلاً:

۱ - سید صاحب اور آپ کے رفقا الحاد و زندقہ میں مبتلا ہیں۔ ان کا کوئی مذہب و مسلک نہیں، نفسانیت کے پیرو ہیں اور لذاتِ جسمانی کے جویا۔

۲ - وہ ظلم و تعدی کے خوگر ہیں۔

۳ - بلا وجہِ شرعی مسلمانوں کے اموال و نفوس پر دست درازی کرتے ہیں۔

۴ - سید صاحب انگریزی رسالے میں ملازم تھے۔ مولانا اسماعیل اور بعض دوسرے لوگوں نے انھیں مہدی موعود قرار دیا۔ انگریزوں نے انھیں ملک سے نکال دیا۔

۵ - وہ مکہ معظمہ پہنچے، وہاں سے براہ مسقط و بلوچستان قندھار گئے۔

۶ - خادے خاں کو ملا عبدالغفور (اخوند سوات) کے ذریعے سے صلح کے بہانے بلایا اور قتل کرا دیا۔

۷ - وہ افغانوں کی لڑکیوں کو جبراً "جدید الاسلام" ہندوستانیوں کے حوالے کرتے ہیں۔

ان الزامات کی تردید میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ سراسر بے اصل ہیں۔ ممکن ہے یہ الزامات بھی اسی محضر سے ماخوذ ہوں جو سلطان محمد خاں نے پیش کیا۔

متفرق واقعات قیامِ پشاور کے متفرق واقعات بھی سن لیجیے:

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۵۹)

ان کے علم کا چرچا تھا۔

۲ - مولانا حافظ محمد عظیم: علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں شیخ وقت۔ صحاح ستہ کے اسانید زبانی یاد تھے۔ روتے بہت تھے۔ آخری عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ جب اخوند سید امیر عرف ملا صاحب کوٹھا پر معاندوں نے کفر کا فتویٰ لگایا تو انھوں نے علی الاعلان خلاف رائے دی۔ ملا صاحب کوٹھا انھیں کے شاگرد تھے۔ ۲ - جمادی الاولیٰ ۱۲۷۲ھ (۲۶ - دسمبر ۱۸۵۵ء) کو وفات پائی۔

۳ - مولانا غلام حبیب: بڑے عالم تھے۔ انھوں نے ملا صاحب کوٹھا کے خلاف فتوائی تکفیر کی مخالفت کی تھی۔ ان کے فرزند مولانا غلام جیلانی مرحوم نے کتب خانہ اسلامیہ کالج پشاور کو دے دیا تھا۔

۴ - مولانا مفتی محمد احسن بن مولانا مفتی محمد احمد، متبحر عالم تھے۔ مکان محلہ کوٹلہ رشید خاں علاقہ گنج پشاور میں تھا۔

۵ - مولانا مفتی حافظ احمد ۶ - مولانا عبدالمالک اخوندزادہ ۷ - مولانا مراد اخوندزادہ ۸ - مولانا قاضی سعدالدین ۹ - مولانا قاضی مسعود ۔ [illegible]

۱ ۔ جمعہ مسجد مہابت خاں میں ادا کیا جاتا تھا۔ مولوی مظہر علی عظیم آبادی نے خطبوں میں سورۂ صف کی تفسیر بیان کی۔ لوگوں نے بے حد پسند کی اور مولوی صاحب اہل پشاور میں بہت ہر دلعزیز ہو گئے۔ چنانچہ جب قاضی کے تقرر کا معاملہ سامنے آیا تو مولوی صاحب موصوف کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر تھی کہ اہل پشاور انھیں پسند کرتے تھے۔

۲ ۔ ابھی درانیوں کے ساتھ فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ خواص خاں خٹک پانسو سوار لے کر حاضر ہوا اور بولا کہ سکھوں نے ہمارا ملک خراب کر ڈالا۔ دریائے سندھ کے دونوں طرف میری قوم آباد ہے۔ ان کا علاقہ مجھے جاگیر میں دے دیجیے۔ سکھوں کو روکنے کا ذمہ اٹھاتا ہوں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ابھی مصالحت کی بات چیت ہو رہی ہے، اگر یہ کامیاب نہ ہوئی تو آپ سے معاملہ کر لیا جائے گا۔

۳ ۔ حافظ عبد اللطیف اور خضر خاں قندھاری کو حکم دیا گیا کہ شہر میں پھر پھر کر لوگوں کو نماز کی تلقین کیا کریں۔ حافظ کی ملاقات ایک روز ملا عظیم اخوند زادہ سے ہو گئی جو سلطان محمد خاں کا استاد تھا۔ اس سے پوچھا کہ حضرت سے ملاقات کیوں نہ کی؟ اب چلو۔ ساتھ لے کر چلے تو راستے میں پوچھا کہ درانیوں نے مجاہدین کی تکفیر کا جو فتویٰ تیار کرایا تھا، کیا آپ نے بھی اس پر دستخط کیے تھے؟ اخوند زادہ نے جواب دیا کہ میں نے اپنی مُہر ان کے سامنے پھینک دی تھی۔ حافظ نے کہا آپ عالم ہیں، کیا مسلمانوں خصوصاً مجاہدین کی تکفیر آپ کے لیے زیبا تھی؟ قیامت کے دن اس کی سزا کبائر سے بڑھ کر ہوگی۔ بہتر یہ ہے کہ اسی دنیا میں سزا تجویز کر لیجیے۔ پھر ان کے ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ دیے۔ ارباب بہرام خاں نے دیکھا تو بہت ناراض ہوئے۔ سید صاحب تک یہ بات پہنچی تو آپ نے فرمایا ابھی حافظ کو پکڑ کر لاؤ۔ اخوند زادہ کو عزت سے پاس بٹھایا اور کہا کہ مجھے کسی عالم سے عداوت نہیں۔ پھر مولانا کی سفارش پر حافظ عبد اللطیف کا قصور معاف ہوا۔ اخوند زادہ نے خود بھی معافی دے دی[1]

۴ ۔ سید بادشاہ گل، سید صاحب کے پرانے دوست تھے، لیکن وہ ملاقات کے لیے نہ آئے۔ کہتے

---

[1] ایک روایت میں ہے کہ جب سید صاحب نے فرمایا، حافظ کو پکڑ کر لاؤ اور ارباب بہرام خاں نے حافظ کو دیکھا تو کہا کہ معلوم نہیں کیا سزا ملے۔ حافظ بولے: وہ ہمارے پیر و مرشد ہیں، ان کی ہر سزا بسر و چشم منظور ہے۔ لیکن ملاؤں کے ہاتھوں میرا دل کباب ہو رہا ہے، جوش تو نکال لیا۔

تھے کہ سلطان محمد مجھے جبراً اپنے ساتھ جنگ مایار میں لے گیا تھا۔ میں روسیاہ ہوں۔ اب کس مُنہ سے ملاقات کروں؟ سید صاحب نے اپنا خاص آدمی بھیج کر بُلایا اور فرمایا کہ جب آپ دل سے راضی نہ تھے تو مضائقہ نہیں، لیکن وہ نہ آسکے۔

مراجعت

صلح کی شرطیں طے ہوگئیں اور ملاقاتیں ہو چکیں تو سید صاحب نے مولوی مظہر علی کو پشاور کا قاضی مقرر کیا۔ مولوی قمرالدین عظیم آبادیؒ[1] اور چند اور غازیوں کو ان کے ساتھ رہنے کا حکم دیا، پھر سید صاحب جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ ارباب فیض اللہ خاں نے ہزار خانی میں دعوت کا انتظام کیا اور پورے لشکر کے لیے دُنبوں کا پلاؤ پکوایا۔ سید صاحب دوپہر کے وقت ہزار خانی پہنچے۔ عصر کے وقت وہیں سے براہ مردان پنجتار روانہ ہوگئے۔

مغرب کے وقت چمکنی پہنچے، جہاں شیخ عمر نام ایک بزرگ کا مقبرہ تھا۔ ان کی اولاد میں سے ایک بی بی مقبرے کی متولیہ تھی۔ اس نے پورے لشکر کے لیے کھانا پکوایا۔ کھچڑی بھی تھی، گوشت بھی اور تنوری روٹیاں بھی۔ بعد نماز مغرب کشتیوں پر دریا کو عبور کیا اور چارسدہ پہنچ گئے۔ وہاں سے مولوی مظہر علی کو رفقا سمیت رخصت کر دیا۔

مسئلہ انتظام عُشر

چارسدہ میں انتظام عُشر کا مسئلہ پیش ہُوا۔ پہلے اس کام پر حاجی بہادر شاہ خاں اور حاجی محمود خاں کو مقرر کیا گیا تھا۔ مولانا شاہ اسماعیل کی رائے تھی کہ یہ نیا کام ہے اور دونوں صاحب اس سے ناواقف ہیں، بہتر یہ ہوگا کہ کسی مدبّر، واقف کار اور متحمل مزاج آدمی کو یہ کام سونپا جائے۔ غور و فکر کے بعد مولوی خیرالدین شیر کوٹی کا نام تجویز ہُوا۔ وہ چھتر بائی میں تھے، فوراً حکم بھیج دیا گیا کہ گڑھی کا انتظام حافظ مصطفیٰ کاندھلوی کے حوالے کر کے خود چلے آئیے۔ حاجی بہادر شاہ خاں اور حاجی محمود خاں نے عرض کیا کہ اگر ہم اطمینان کے مطابق کام نہ کر سکتے تو بے شک ہٹا دینا مناسب تھا، لیکن کام دیکھے بغیر ہی معزول کر دینا ہمارے لیے باعثِ خفت ہے۔ مولانا بے توقف بولے: بے شک مروت کا تقاضا یہی ہے، لیکن پیش نظر کام میں سرگرمی اور بہادری کی ضرورت نہیں، ہوشیاری اور تجربہ کاری

---

[1] مولوی قمرالدین، مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے ماموں رکن الدین حسین (بن رفیع الدین حسین ناظم بہار) کے فرزند تھے۔ ان کی شادی مولوی الٰہی بخش مرحوم کی صاحبزادی جمیلۃ النسا سے ہوئی تھی۔ وہ بارہ برس کی ہوئی تھی کہ مولوی قمرالدین جہاد کے لیے روانہ ہوگئے۔ پشاور میں ان کی شہادت کے بعد جمیلۃ النسا کا نکاح ثانی مولانا ولایت علی سے ہُوا۔ مولانا کے سب سے چھوٹے بیٹے شمس العلماء مولوی محمد حسین جمیلۃ النسا ہی کے بطن سے تھے

کی ضرورت ہے۔ جس میں یہ دونوں باتیں نہ ہوں گی، اسے خوانین سمہ کبھی عُشر نہ دیں گے۔ سید صاحب نے حکم دیا کہ جب تک مولوی خیر الدین نہ پہنچیں، حمزہ علی خاں رسالدار کو شیوہ میں ٹھہرا دیجیے تاکہ ان دونوں کا ہاتھ بٹاتے رہیں۔

اصلاح معاشرت

سید صاحب چارسدہ سے روانہ ہوئے تو گڑھی امان زئی میں ٹھہرے۔ وہاں کا کا احمد خاں ایک سن رسیدہ شخص تھا۔ اس نے عرض کیا کہ یہاں لڑکیوں کی شادیاں گرانقدر رقمیں لے کر کی جاتی ہیں۔ رقمیں مقرر کر کے نکاح کر دیے جاتے ہیں۔ جب تک دولھا کی طرف سے رقم پوری نہیں ہو جاتی، دلھنوں کی رخصتی عمل میں نہیں آتی۔ وہ گھروں میں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو چلتی ہیں۔ سُنا ہے خود عورتوں نے بھی سید صاحب کے پاس پیغام بھیجا تھا کہ آپ سب کی اصلاح فرماتے ہیں، ہمارے حال زار پر بھی توجہ مبذول فرمائیے۔

سید صاحب نے حسب عادت شریف اگلے روز بستی والوں کو بلا کر وعظ و نصیحت فرمائی۔ لوگوں نے آپ کا حکم قبول کر لینے کا اقرار کیا، تو فرمایا کہ جن لڑکیوں کے نکاح ہو چکے ہیں اور ان کے شوہر چار چار کوس کے اندر ہیں، انھیں آٹھ روز کے اندر اندر رخصت کر دیا جائے۔ جن لڑکیوں کے شوہر دُور گئے ہوئے ہیں، ان کی رخصتی کے لیے ایک ماہ کی مہلت مناسب ہو گی۔ جو شوہر غیر ممالک میں ہیں، ان کی بیویوں کو تین ماہ میں شوہروں کے گھر بھیج دیا جائے۔

مولانا کا واقعہ

گڑھی امان زئی میں سید صاحب نے دس بارہ مقام کیے۔ ایک روز درّانیوں کی طرف سے ایک لڑکا انگور اور سردے بہ طور پیش کش لایا۔ سید صاحب نے اسے انگرکھا اور بعض دوسرے پارچات بہ طور خلعت دیے۔ اس نے کہا کہ میں تو افغانی پارچے لوں گا۔ سید صاحب بالا خانے پر تھے، اوپر جانے کی سیڑھی لکڑی کی تھی۔ وہ سیڑھی پہ کھڑا ہو گیا اور اس طرح چڑھنے اُترنے والوں کا راستہ رُک گیا۔ اُسے نرمی سے ہٹانے کی کوشش کی گئی تو وہ زور زور سے رونے لگا۔ مجبور ہو کر مولانا شاہ اسماعیل نے اس کے دو تین طمانچے مارے۔ ایک مرتبہ مولانا کا ہاتھ سیڑھی میں لگا۔ لکڑی کا ایک باریک ریشہ ہتھیلی میں چُبھا اور خون جاری ہو گیا۔ عین اس حالت میں سید صاحب باہر نکل آئے۔ مولانا کے ہاتھ پر نگاہ پڑی تو پوچھا: میاں صاحب! یہ خون کیسا؟ مولانا سر جھکائے خاموش کھڑے رہے۔ مفتی محمدی انصاری نے مختصراً واقعہ عرض کیا۔ سید صاحب نے فرمایا: "میاں صاحب! آپ کا غصہ ان دنوں بڑھ رہا ہے، اسے دُور کرنا چاہیے۔"

بعد میں مولانا منشی خانے میں گئے تو منشی محمدی سے مخاطب ہو کر کہا کہ آج بڑی ندامت ہوئی

بے شک امیر المومنین نے سچ فرمایا۔ منشی جی نے کہا کہ مولانا عبدالحی کو بھی غصہ آتا تھا، لیکن مجھے یاد ہے کہ وہ کبھی جادۂ شرع سے اِدھر اُدھر نہ ہوئے۔ غصے کے باوجود دلائل شرعیہ ان کی تمام باتوں پر غالب رہتے تھے، لیکن آپ کو غصہ آتا ہے تو زبان پر بھی قابو نہیں رہتا۔

مولانا حقانی و ربانی آدمی تھے۔ اپنے عیوب کا صاف اقرار کر لیتے تھے۔ بولے: بھائی صاحب! مولانا عبدالحی کا غصہ "آورد" ہوتا تھا۔ وہ امور شرعیہ پر بقصد و ارادہ غصہ لاتے تھے، لہذا شریعت سے تجاوز کا کون سا موقع تھا؟ میرا غصہ "آمد" ہے۔ جب آتا ہے تو عقل و ہوش پر غلبہ پا لیتا ہے۔ زبان کیا کسی عضو پر بھی قابو نہیں رہتا۔

قاضی القضاۃ کا تقرر

سید صاحب گڑھی امان زئی سے ڈاگئی پہنچے تو مولوی خیر الدین شیرکوٹی آ گئے۔ انھوں نے عرض کیا کہ مجھے جس بستی میں اُترنے کا اتفاق ہوا، وہاں کے لوگوں کو قاضیوں کا شکوہ گزار پایا۔ وہ بعض اوقات معمولی خطاؤں پر زیادہ جرمانے لے لیتے ہیں۔ سید صاحب نے خود مولوی صاحب کو قاضی القضاۃ بنانا چاہا، موصوف نے معذرت کر دی۔ سید صاحب نے اصرار فرمایا تو مولوی صاحب بولے، اصرار سے مجھے گناہ گار نہ بنائیں۔ میں اس خدمت کو قبول نہ کروں گا۔ عدالتی اور مالی کاموں میں اکثر لوگوں کے قدم پھسل جاتے ہیں۔

پنجتار پہنچے تو سید صاحب نے مولوی محمد رمضان کو قاضی القضاۃ مقرر فرما دیا۔ کاٹ لنگ، لوند خوڑ اور ڈاگئی وغیرہ کے انتظامات مولوی خیر الدین شیرکوٹی کے حوالے کیے۔ قندھاری اور ہندوستانی غازیوں کی ایک جماعت ان کے ہمراہ کر دی۔ ان میں سے سید جعفر علی نقوی، میاں ضیاء الدین پھلتی، حافظ وجیہ الدین باغپتی اور کریم بخش دہلوی کے نام روایتوں میں مذکور ہیں۔

سفارت باجوڑ

اس اثنا میں خان باجوڑ کی طرف سے سفیر آ گئے۔ انھوں نے فتح پشاور پر مبارکباد عرض کرتے ہوئے درخواست کی کہ ہمارے ہاں بھی احکام شریعت کے اجرا کا بندوبست فرما دیجیے۔ سید صاحب نے مشورے کے بعد مولانا اسماعیل کو ایک سو غازیوں کے ساتھ باجوڑ بھیج دیا۔ مولانا اور مولوی خیر الدین شیرکوٹی پنجتار سے اکٹھے روانہ ہوئے۔ پہلا مقام گڑھی امان زئی میں کیا، دوسرا لوند خوڑ میں۔

لوند خوڑ میں دو رئیس قابل ذکر تھے: اول نسیم خاں، دوم حافظ پشم، جس کا نام مولانا نے حافظ ریشم مقرر کر لیا تھا۔ وسط دیہ میں ایک بلند، وسیع اور خوبصورت مسجد تھی، مولانا اسی میں ٹھہرے۔ وہیں کاٹ لنگ کے خوانین حاضر ہو گئے۔ ایک روز مولانا نے بستی والوں کی درخواست پر فارسی میں وعظ

فرمایا،[1] اخوند فیض محمد نے اس کا ترجمہ پشتو میں کیا۔

مولانا نے روانگی سے پیشتر مولوی خیرالدین کو نصیحت فرمائی کہ نسیم خاں رواداری آدمی معلوم ہوتا ہے، اس کے ساتھ ظاہرداری خوب نبھائی جائے۔ حافظ بااخلاص ہے، اس کے ساتھ محبت کے تعلقات بڑھائے جائیں، لیکن یہ امر نسیم خاں پر ظاہر نہ ہونے پائے۔

حافظ سے علمی گفتگو

حافظ اگرچہ نابینا تھا لیکن فقہ و اصول کا ماہر تھا۔ مولانا نے ایک روز تفریحاً اس سے علمی گفتگو فرمائی۔ پوچھا: حافظ صاحب افغانوں میں جو "اسقاط" رائج ہے یعنی نماز کا فدیہ، اس کی بنیاد کیا ہے؟

حافظ: قیاس۔

مولانا: مقیس علیہ کیا ہے؟

حافظ: مسئلہ شیخ فانی درباب فدیۂ صوم۔

مولانا: یہ قیاس مع الفارق ہے، اس لیے کہ دونوں کا حکم یکساں نہیں۔ قیاس کی تعریف شرع کے رو سے حمل النظیر علی النظیر ہے۔ "اسقاط" اس پر ٹھیک نہیں اترتا، اس لیے کہ مسئلہ صوم، مسائل صلوۃ سے الگ ہے۔ نماز میں قصر ہے، روزے میں قصر نہیں، بلکہ قضا ہے۔ حائضہ و نفسہ کو نماز معاف ہے، روزہ معاف نہیں۔

حافظ: خیر، آپ اسے صدقہ سمجھ لیں، جو بہرحال مُردے کے لیے مفید ہے۔

مولانا: مجھے اسقاط پر اعتراض ہے، صدقے پر نہیں۔ صدقے میں حساب کی حاجت نہیں۔

حافظ: اس میں قباحت کیا ہے؟

مولانا: اوّل یہ اصول اربعہ سے باہر ہے، اس لحاظ سے بدعت ہے۔ دوم بعض مقامات پر اموالِ متوفی کے وارث یتیم ہوں گے۔ آپ لوگوں نے رواجاً اسے لازم قرار دے لیا ہے اور اس کا ترک بعض کے نزدیک مثل ترک فرائض ہے۔ یتامیٰ کے مال میں بدوں وصیت تعرض ہوگا اور استعمال بے جا۔ اس لحاظ سے ان الذین یاکلون اموال الیتامیٰ انما یاکلون فی بطونهم نارًا …… کا مورد۔ سوم جب رکعتوں پر صدقہ مقرر ہوگیا تو آپ کو حق حاصل نہ ہوگا کہ تارک الصلوہ پر احتساب جاری کریں۔ اس طرح یہ قاعدہ مسقط صلوۃ ہوا۔

رکاوٹ

مولانا سوات کے راستے باجوڑ جانا چاہتے تھے۔ خہر سے ملا کلیم اور سید عمران لونڈ خوڑ پہنچ گئے اور بتایا کہ سوات کے لوگ مزاحمت کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ عنایت اللہ خاں رئیس الاطحد

ان کا سرخیل ہے۔ چونکہ اہل سوات اور اہل باجوڑ میں سخت دشمنی تھی، اس لیے عنایت اللہ خاں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ مولانا شاہ اسماعیل باجوڑ سے لشکر لے کر سوات پر چڑھائی کریں گے۔ یہ سنتے ہی لوگوں نے فیصلہ کر لیا کہ مولانا کو باجوڑ نہ جانے دیں گے۔

خبر پہنچ کر مولانا نے لوگوں کو بہت سمجھایا، لیکن عنایت اللہ خاں راضی نہ ہوا، بلکہ آخر میں اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب خان باجوڑ بھی نفاذ احکام شریعت میں آپ کا ساتھی بن جائے گا تو پھر ہم کو بھی انھیں احکام کی اطاعت پر مجبور ہونا پڑے گا۔ ہم سے عُشر لیا جائے گا جو ہم پر گراں گزرتا ہے لہٰذا ہم آپ کو ہرگز باجوڑ نہ جانے دیں گے۔ اگر آپ نے ہم پر عُشر نافذ کر دیا تو اس ملک کو چھوڑ کر کسی دوسری سرزمین میں چلے جائیں گے۔

مولانا نے فرمایا: میں نے تمھارے سوا ایسے مسلمان آج تک کہیں نہیں دیکھے، جن پر "شاهدین علیٰ انفسهم بالكفر" کا ٹھیک ٹھیک اطلاق ہوتا ہو۔ لیکن کیا کروں امیرالمومنین کا حکم یہی ہے کہ تم سے قتال نہ کیا جائے۔

مراجعت

کھبر سے آٹھ کوس پر ایک گاؤں تھا۔ وہاں سے پیغام آیا کہ ہم احکام شریعت قبول کرنے کے لیے ہمہ تن تیار ہیں۔ مولانا ہمارے گاؤں تک پہنچ جائیں، پھر ان کی اور غازیوں کی حفاظت کے ذمہ دار ہم بن جائیں گے اور بے دغدغہ باجوڑ تک پہنچا دیں گے۔ مولانا اس تجویز کو قبول کر لیتے لیکن اوّل، سید صاحب نے تاکید فرما دی تھی کہ لڑائی نہ کی جائے، سب کو نرمی اور ملائمت سے سمجھایا جائے۔ دوم، آگے بڑھنے کی صورت میں آٹھ کوس تک قدم قدم پر جنگ ناگزیر نظر آتی تھی اور یہ حقیقت واضح تھی کہ مولانا کے پاس غازی بہت کم تھے۔ سوم، اگر مولانا نکل بھی جاتے تو سید صاحب کے ساتھ سلسلۂ مواصلت اور رابطہ نامہ و پیام بالکل منقطع ہو جاتا۔

آخر مولانا نے تمام حالات تفصیلاً سید صاحب کو لکھ بھیجے۔ وہاں سے حکم آیا کہ تبدیلی نہ کیجیے، خدا کارساز ہے۔ یہاں بہتر صورت پیدا ہو جائے گی تو اہل سوات کی اصلاح بھی کر لیں گے۔ فی الحال مناسب یہی ہے کہ آپ واپس آ جائیں۔ چنانچہ مولانا کھبر ہی سے سید صاحب کے پاس چلے گئے اور باجوڑ تک نہ پہنچ سکے[1]۔

---

[1] ایگزانڈر گارڈنر [illegible] امیر [illegible] خاں والی باجوڑ کے ہاں مولانا شاہ اسماعیل،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ٦٦٦)

کی تقریر سنی تھی۔ اس سے لوگوں میں اتنا جوش پیدا ہوا کہ میں نے طے کر لیا مولانا کے پیرومرشد سے مل جاؤں کہ ان جیسے لوگ میرے پاس ہوں گے تو میری خدمات کی بہت قدر ہوگی۔ (الیگزینڈر گارڈنر صفحہ ١٦٩)

مولانا کا زورِ تقریر اور تاثیر دل پذیری بالکل مسلّم ہے، لیکن وہ باجوڑ جا ہی نہ سکے۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ گارڈنر امیر عالم خاں باجوڑی کے ہاں مولانا کی تقریر سنتا؟ یہ بیان بالکل بے سروپا ہے۔ اسی طرح گارڈنر کا یہ بیان بھی بے اصل ہے کہ میر عالم خاں باجوڑی نے مجھے تین سو آدمی دے کر سید صاحب کی امداد کے لیے بھیجا اور میں بالاکوٹ گیا۔ دیکھا تو جنگ شروع تھی۔ میرے سامنے سید صاحب اور مولانا اسماعیل شہید ہوئے۔

تیسواں باب

خوفناک سازش کا جال

روشن اُمیدیں

سلطان محمد خاں کے بعد درۂ خیبر سے امب تک پورے علاقۂ سرحد کے وسائل سید صاحب کی دسترس میں آ گئے تھے۔ مخالف عناصر ختم ہو چکے تھے۔ اب اطمینان سے ایک زبردست لشکر منظم کر کے سکھوں پر کامیاب یورش کے بہترین امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ اگر سید صاحب کشمیر کی طرف پیش قدمی کرتے تو سلیمان والی چترال زیادہ سے زیادہ امداد کے لیے تیار تھا اور کشمیر پر سکھوں کا قبض و تصرف خاصا کمزور نظر آ رہا تھا، جسے ختم کر دینا مشکل نہ تھا۔ پنجاب کی طرف بڑھتے تو غلزئی قبیلے کے سردار ساتھ دینے پر آمادہ تھے۔ جو بنوں ہوتے ہوئے سید صاحب سے مل جاتے۔ ابتدائی کامیابی کے بعد سندھ کو بھی رفاقت پر آمادہ کر لینے کے قوی امکانات موجود تھے۔ سلطان محمد خاں کو جو علاقہ واپس کیا گیا تھا، اس کی زرخیزی اور سیرابی کا اندازہ اسی سے کر لیجیے کہ ارباب بہرام خاں اسے سنبھال کر حفظ و دفاع کی پوری ذمہ داریاں قبول کرنے کے علاوہ چار ہزار غازیوں کا جیش اپنے خرچ پر مستقلاً سید صاحب کی رکاب میں دے دینے کا اقرار کر رہا تھا۔ اس علاقے کی آمدنی بدنظمی کی حالت میں بھی دس لاکھ سے کم نہ تھی۔ سید صاحب جب سے سرحد پہنچے تھے، سازگار حالات کا ایسا روشن منظر کبھی نہ آیا تھا۔

حسرت و افسوس

لیکن افسوس کہ خود مسلمانوں کی کج اندیشی، غرض پرستی اور ناحق کوشی کے باعث ان امیدوں کی روشنی دیکھتے دیکھتے گل ہو گئی بلکہ ان کی جگہ اشکہائے حسرت اور نالہائے غم باقی رہ گئے۔ تین چار برس کی جانفشانیوں سے جو کام سرانجام کو پہنچے تھے، وہ برباد ہو گئے۔ بہت سے غازی کاملاً بے خبری کے عالم میں خاک و خون میں تڑپے۔ حکمرانی سے محرومی کے بعد اسلامیانِ ہند میں سے غیرت و حمیت حق کی جو بہترین اور عزیز ترین متاع جمع کی گئی تھی، وہ یوسف زئی کے میدانی علاقے میں جا بجا لٹ گئی۔ سید صاحب اپنے چار سالہ مرکز کو چھوڑ کر کسی دوسری کارگاہ کی تلاش میں نکلنے پر مجبور ہوئے۔ ابھی کسی جگہ جم کر بیٹھنے نہ پائے تھے کہ خلعت شہادت سے سرفرازی پا کر رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

سرداروں اور ملاؤں کی سازش

سردارانِ پشاور جب اطمینان سے بیٹھ گئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسی وقت انھوں نے خفیہ سازش کا بندوبست شروع

کر دیا تھا۔ جگہ جگہ ان کے قاصد دوڑنے لگے تاکہ ڈھب کے آدمی ساتھ ہو جائیں اور سید صاحب کے بکھرے ہوئے غازیوں کو ایک ہی وقت میں جا بجا شہید کر دیا جائے۔

سرحدی پٹھان صدیوں سے قبائلی طریقوں کے خوگر چلے آتے تھے۔ جو چیزیں مرورِ زماں سے ان کی زندگی کا لاینفک جزو بن چکی تھیں، انھیں وہ شرعی احکام کی طرح مان رہے تھے اور ان کا ترک گوارا نہ تھا۔ کلمۂ توحید پر وہ بے شک ثابت قدم تھے۔ اسلام کے ساتھ محبت بھی تھی لیکن اسلامی نظم و جمعیت سے یا تو وہ کبھی شناسا ہی نہ ہوئے تھے یا سمجھیے کہ ایسے تمام نقوش بالکل مٹ چکے تھے۔ سید صاحب نے انھیں ضروریاتِ دین سے آگاہ کیا تو ان میں اصلاح کی ایک رو چلی۔ بیعت بھی کر لی لیکن اس بیعت کا مطلب ان کے نزدیک صرف یہ تھا کہ نماز ادا کرتے رہیں گے، روزے بھی رکھیں گے اور پیداوار میں سے کچھ حصہ ملّاؤں کے بجائے سید صاحب کو دیتے رہیں گے۔ جب ہر مقام پر باقاعدہ تحصیلدار مقرر ہو گئے اور ان کے ساتھ حساب کتاب کے لیے محرّر بیٹھ گئے تو یہ امر بعض لوگوں خصوصاً ملّاؤں پر بہت شاق گزرا۔ بے خبر اور سادہ لوح پٹھانوں کے اسلام کی باگ ملّاؤں ہی کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے خفیہ خفیہ سید صاحب کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا اور پٹھانوں کو اسلام کے نام پر اسلام کے خلاف مشتعل کرنے لگے۔ سید صاحب نے پٹھانوں کی مجلسی اور اخلاقی اصلاحات کا کام سرگرمی سے جاری کیا تو ملّاؤں کو اشتعال انگیزی کا ایک موثر حربہ مل گیا۔ وہ پٹھانوں سے کہنے لگے کہ دیکھو اب تو تمھارے ناموس بھی محفوظ نہیں رہے۔ یہ حالات سردارانِ پشاور کے لیے عین حسبِ مراد تھے۔ انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور خود غرض ملّاؤں کے ذریعے سے پورے علاقے میں سازش کا وسیع جال بچھا دیا۔

دینی حربہ ہم پہلے ایک محضر کا ذکر کر چکے ہیں، جو سلطان محمد خاں نے ملاقات کے وقت سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ ہمیں اس محضر نے گمراہ کیا۔ اس میں سید صاحب اور ان کے رفقا کے متعلق کہا گیا تھا کہ وہ کسی بھی مذہب کے پابند نہیں اور انھوں نے ایک نیا دین نکالا ہے۔

پٹھانوں کے دل تو شرعی پابندیوں پر راضی نہ تھے لیکن سید صاحب کے خلاف قدم اٹھاتے ہوئے انھیں یہ اندیشہ ضرور پریشان کر رہا تھا کہ یہ مخالفت کہیں خدا کی طرف سے وبال کا سرچشمہ نہ بن جائے۔ اس موقع پر سلطان محمد خاں نے محضر ملّاؤں کے حوالے کر دیا۔ ملّاؤں نے یہی محضر دکھا دکھا کر پٹھانوں کو اطمینان دلایا کہ سید صاحب کی مخالفت حقیقت میں دین کی بہت بڑی خدمت ہے اور اس کے لیے خدا کی بارگاہ سے اجر و ثواب ملے گا۔ اس طرح سازش کی کامیابی کے لیے سازگار فضا مہیا کر لی گئی۔ ظاہر ہے کہ جب

ایک چیز ناگوارِ خاطر ہو اور اس کی مخالفت کے لیے دینی سہارا بھی مہیا کر دیا جائے تو مخالفت میں کسے تامل ہوگا؟

مقامی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سرداروں نے ایک لڑکی کے کان چیر کر اور سر ننگا کر کے اسے فریادی کی حیثیت میں جگہ جگہ پھرایا تھا۔ پٹھانوں کے نزدیک فریاد کی یہ انتہائی دردانگیز صورت سمجھی جاتی تھی۔

حقیر اغراض کے لیے اسلام دشمنی

غرض مختلف اغراض و مصالح نے مختلف افراد و جماعت کو ایک مرکز پر جمع کر دیا۔ ان سب کا مقصد کیا تھا؟ یہ کہ سید صاحب جانبازانِ حق کے جس قدوسی قافلے کو لے کر ہزاروں میل کی منزلیں طے کر کے اس نیت سے سرحد پہنچے تھے کہ اسلام کی عزت، دین کی حمیت اور مسلمانوں کی آزادی کا پرچم بلند کریں، اس قافلے کو بے خبری کی حالت میں ذبح کر ڈالا جائے۔ سب کے سامنے حقیر ذاتی اغراض تھیں۔ سردار چاہتے تھے کہ وہ جس علاقے پر حکمران ہیں، اس میں شرعی محاسبے کا کوئی سوال پیدا نہ ہو اور وہ جو چاہیں کرتے رہیں۔ عام لوگوں کی غرض یہ تھی کہ ان کے قبائلی معمولات میں کوئی خلل نہ پڑے، اگرچہ وہ معمولات اسلام کے کتنے ہی خلاف ہوں اور اگرچہ ان کی وجہ سے آزادی اور اسلامیت پامال ہوتی رہے۔ ملاؤں کی غرض یہ تھی کہ وہ حسب سابق عوام سے پیسے بٹورتے رہیں، اگرچہ اس ضمن میں شریعت حقہ اسلامیہ کی جگہ رسوم جاہلیت فروغ پائیں۔ ان اغراض کو کوئی مسلمان کس بنا پر جائز و بجا سمجھ سکتا ہے؟

ملک گیری کے لیے مسلمان آپس میں خونریز جنگیں بھی کرتے رہے تھے اور اسلامی تاریخ کے صفحات سے برادر کُشی کا لہو بھی برابر ٹپک رہا ہے، لیکن سردارانِ پشاور، اہل سرحد اور ان کے حق ناشناس ملاؤں نے جن حد درجہ حقیر اور دینی لحاظ سے سراسر شرمناک اغراض کے لیے غازیانِ اسلام کے خلاف سازش کی، اس کا تصور آج بھی قلب و روح پر لرزہ طاری کر دیتا ہے۔ آہ! کہ یہ سب لوگ مسلمان تھے اور مسلمان ہونے پر فخر کرتے تھے۔ اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ جہل و بے خبری میں انھوں نے اسلام کے ساتھ کھلی ہوئی دشمنی کو دوستی سمجھ لیا۔ یہ زہرہ گداز اقدام مقدر ہو چکا تھا۔ قضا و قدر کا فیصلہ یہی تھا کہ ہندوستان کی اسلامی حمیت کا ایک مایہ ناز قافلہ اسی سرزمین میں لٹے، جس کی مظلوم اسلامیّت کو اعدا کی ہولناک چیرہ دستیوں سے نجات دلانا اس کا فوری مقصد بن گیا تھا اور اسے پورا کیے بغیر وہ اپنے اصل نصب العین یعنی آزادیٔ ہند کے لیے بھی کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔

فتنے کی ابتدا

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ سید صاحب اور سردارانِ پشاور کے درمیان مصالحت اسباب

فیض اللہ خاں نے کرائی تھی۔ ارباب نے سید صاحب سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر اب کے سرداروں کی طرف سے کوئی بے جا حرکت یا بے عنوانی سرزد ہوئی تو میں ان کا ساتھ چھوڑ کر غازیوں کی معیت اختیار کر لوں گا۔ مصالحت سے تھوڑے ہی دن بعد اس نے بھانپ لیا کہ سرداروں کی نیت صاف نہیں۔ جب اسے مخالفانہ توڑ جوڑ کی اطلاعات ملیں تو صاف دلی سے مولوی مظہر علی صاحب قاضی پشاور کو آگاہ کر دیا کہ ان لوگوں کی نیت میں فتور ہے۔ یہ غدار بغاوت کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ بہتر یہ ہو گا کہ آپ امیر المومنین کو اطلاع دے کر اپنے لیے مناسب احکام لے لیں۔[1]

مولوی صاحب نے مناسب سمجھا کہ عجلت کے بجائے خود حالات کا پورا اندازہ کرنے کے بعد سید صاحب کو لکھیں۔ اس اثنا میں ایک روز سلطان محمد خاں نے انھیں بلا لیا۔ وہاں کچھ علما جمع تھے اور یار محمد خاں کے قتل کی باتیں ہو رہی تھیں۔ مولوی مظہر علی صاحب کے پہنچتے ہی سلطان محمد خاں نے پوچھا کہ میرے بھائی (یار محمد خاں) کو کیوں مارا گیا؟ مجلس کے ہر فرد نے جوش و خروش سے یہی سوال دہرایا۔ مولوی صاحب نے اطمینان سے جواب دیا کہ شور مچانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ اطمینان سے سوال کرو اور ایک ایک بات کا جواب سنتے جاؤ۔ پھر مختلف سوالوں کے جواب میں بتایا کہ خادے خاں اور یار محمد خاں نے اس کا بدلہ لینے کے لیے کمر باندھی۔ امیر المومنین نے ہر چند سمجھایا، خان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ لہٰذا جو کچھ پیش آیا، اس کے ذمہ دار امیر المومنین نہیں ہو سکتے؟

غلط بیانیاں

پھر مولوی صاحب سلطان محمد خاں سے مخاطب ہوئے اور پوچھا کہ اگر آپ کے دل میں اس معاملے کے متعلق کوئی خلش تھی تو امیر المومنین کی بیعت سے پیشتر اس کا ازالہ کیوں نہ کرا لیا؟ سردار نے جواب دیا کہ اس وقت ہمارے علما سید صاحب کے عساکر کے خوف سے پہاڑوں میں جا چھپے تھے اور ہمیں کچھ معلوم نہ تھا۔ تحقیقات کے بغیر بیعت کر لی۔ نیز یار محمد خاں کو اس وجہ سے خادے خاں کے انتقام کے لیے کھڑا ہونا پڑا کہ خادے خاں نے یار محمد خاں کے ہاتھ پر سرداری کی بیعت کی تھی۔[2]

یہ دونوں باتیں غلط تھیں۔ اس لیے کہ یار محمد خاں کا استاد اخوند محمد عظیم سید صاحب کے قیام پشاور کے وقت شہر میں موجود تھا اور اس نے سید صاحب سے ملاقات بھی کی تھی۔ نیز یار محمد خاں کے قتل کے سلسلے

---

[1] مولوی صاحب نے سید صاحب کو اطلاع دی تھی کہ ارباب نے ایک معتبر آدمی کی زبان سے حالات سن کر مجھے بتایا، سردار غدر پر آمادہ ہیں۔ نیز کہا تھا کہ اگر سردار مجھے اپنے پاس بلائیں تو آپ کو (مولوی صاحب کو) اس مجلس میں نہیں جانا چاہیے۔ اگر وہ آپ کو بلائیں تو میں نہیں جاؤں گا۔ (منظورہ صفحہ ۹۶۴)۔ [2] یہ تمام حالات مولوی مظہر علی صاحب نے ایک مکتوب کے ذریعے سے پہنچا دیے تھے۔

میں علما سے کیا پوچھنا تھا؟ کیا یہ کہ وہ قتل جائز تھا یا ناجائز؟ اس بارے میں سلطان محمد خاں مہینوں پہلے نہ محض علما سے بلکہ اپنی مجلس کے ہر آدمی سے باتیں کر چکا تھا۔ پھر اس نے سید صاحب سے کیوں سب کچھ نہ پوچھ لیا؟ امر دوم کی حقیقت یہ ہے کہ اگر خادے خاں نے سید صاحب کے ورود سرحد سے پہلے یار محمد خاں کے ہاتھ پر بیعت کی تھی تو یار محمد خاں نے اس وقت یہ مسئلہ کیوں نہ اٹھایا، جب خادے خاں، سید صاحب کو اپنے ساتھ ہنڈ لے گیا تھا اور وہاں اپنے زیر اہتمام خوانین و عوام کو بلا کر بیعت کی تھی؟ اس بیعت کے بعد خود یار محمد خاں نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔ وہ اور خادے خاں دونوں سید صاحب کے زیر قیادت جنگ شیدو میں شریک ہوئے۔ زیدہ کی جنگ سے پیشتر سید صاحب نے صلح کے لیے کوشش فرمائی تھی تو اس موقع پر بھی یار محمد خاں نے کبھی یہ نہ کہا کہ خادے خاں اس کا ماتحت ہے اور ماتحت کے خون کا بدلہ اس کے ذمے ہے۔ وہ بارہ ہزار روپے لے کر خادے خاں کے بھائی امیر خاں کی امداد کے لیے گیا تھا۔

مولانا شاہ اسماعیل کا مکتوب

مولوی مظہر علی کی طرف سے یہ روداد پنجتار پہنچی تو مولانا شاہ اسماعیل نے سید صاحب کے حکم سے ایک مفصل مکتوب مولوی صاحب کے نام بھیج دیا جو مندرجہ ذیل مطالب پر مشتمل تھا:

۱ ۔ جن لوگوں نے یہ سوال اٹھائے، وہ یا تو عالم نہیں، اس لیے انھیں لائق خطاب نہیں سمجھا جا سکتا یا ان کا مقصود تحقیق نہیں، صرف مکابرہ اور فتنہ انگیزی ہے۔

۲ ۔ خان ہنڈ نے بیعت کے بعد بغاوت کی اور کفار سے مدد لی، لہٰذا اس کے خلاف باغی کا سلوک کیا گیا۔

۳ ۔ حضرت امیر المومنین نے اس کے وارثوں کو بہت سمجھایا، لیکن وہ نہ مانے اور بغاوت کے مسلک پر قائم رہے۔

۴ ۔ یار محمد خاں نے باغی کے خون کا بدلہ لینے کے لیے امام کے خلاف اقدام کیا۔ یہ فعل شریعت حقہ کے سراسر خلاف تھا۔

۵ ۔ اس نے ظلم میں ابتدا کی اور بادی بالظلم کا معاملہ شرعاً محتاج تصریح نہیں۔

۶ ۔ سلطان محمد خاں، یار محمد خاں کے نقش قدم پر چلا۔ لڑائی میں شکست کھا کر تائب ہوا اور اطاعت گزار بنا۔ اب اس کی طرف سے جو سوالات اٹھائے جا رہے ہیں، وہ سراسر بے محل اور تعجب انگیز ہیں۔

مسئلہ نفاق

ایک اعتراض یہ کیا گیا تھا کہ مشکوٰۃ کی ایک روایت کے رو سے نفاق رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کے بعد ختم ہو گیا، لہٰذا سرداروں کو منافق کہنا جائز نہیں۔ مولانا نے اس کے جواب میں لکھا کہ یہ حدیث نہیں بلکہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ اسے اگر ظاہر پر حمل کریں تو یہ متعدد آیتوں اور حدیثوں سے متعارض ہو گا۔ مثلاً ایک آیت میں کفار کی دوستی کو مدار نفاق قرار دیا گیا ہے اور یہ فعل کسی زمانے سے مختص نہیں۔ ایک آیت میں خدا سے فریب، نماز میں تکاسل، عبادت میں ریا اور قلت ذکر الٰہی کو نفاق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ منافق کی تین علامتیں ہیں: جھوٹ، خیانت اور عہد شکنی۔ یہ باتیں بھی کسی خاص وقت یا زمانے کے لیے نہیں۔ غرض زیر غور قول کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ زمانۂ رسالت میں منافقین کا علم وحی کے ذریعے سے ہو جاتا تھا۔ اب وہ ذریعہ باقی نہیں رہا۔ اب ہم صرف علامتوں کی بنا پر حکم لگا سکتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر زمانۂ رسالت میں وحی کے ذریعے منافقین کی قطعی تعیین ہو جاتی تھی۔ اب تعیین قطعی کا کوئی ذریعہ باقی نہیں۔ نہ یہ کہ نفاق ناپید ہو گیا یا کسی میں نفاق کی علامتیں پائی جائیں تو اسے منافق قرار نہیں دینا چاہیے۔

مولانا نے آخر میں لکھ دیا کہ ان معاملات کے متعلق خود گفتگو چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی شخص یہ سوال اٹھائے تو اسے نرمی سے جواب دیں۔ مباحثے کی نوبت آئے تو ہماری تحریر حوالے کر دیں اور خود ساتھیوں کو لے کر پنجتار چلے آئیں[1]

مخلصین کی اطلاعات

جس روز قاصد مولانا اسماعیل کا مندرجہ بالا مکتوب لے کر پشاور روانہ ہوا، اسی روز شیخ حسن علی[2] کا بھائی عبدالعزیز دکھاڑا سے پنجتار پہنچا اور عرض کیا کہ مسجد دکھاڑا کے امام سید محمد اصغر کو خوانین سمہ کی ایک سازش کا علم ہوا ہے، جس کا مدعا یہ ہے کہ سید صاحب کے جو غازی دیہات میں یا بجا بکھرے ہوئے ہیں، ان پر رات کے وقت اچانک حملہ کر کے شہید کر ڈالا جائے[1]

---

[1] یہ مکتوب پنجتار سے ۱۵۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۶ھ (یکم نومبر ۱۸۳۰ء) کو پشاور بھیجا گیا۔ [2] شیخ حسن علی، ان کے بھائی عبدالعزیز اور عبدالباقی نیز ان کا بھتیجا عبدالقادر اس زمانے میں سید صاحب کے حکم کے مطابق دکھاڑا میں مقیم تھے، جو پنجتار سے اڑھائی کوس شمال مشرق میں ہے۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اطلاع دینے والوں میں تورسک (علاقہ بونیر) کا ایک شخص محسن خاں بھی تھا، جسے کوہ کرنہ پر آگ جلانے کے نشان کی اطلاع ایک دوست سے ملی اور اس نے خود پنجتار جا کر غازیوں کو متنبہ کیا۔

سید صاحب کو اپنی پاک نفسی کی بنا پر یقین نہ آیا اور فرمایا:

> شیخ بھائی! یہ بات خیال میں نہیں آتی۔ غلط سی معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ اس ملک میں سب رئیس اور خوانین ہمارے موافق ہیں۔ ہم کو ان سے ہرگز ایسی امید نہیں۔ غالباً ہمارے اور ان کے درمیان نااتفاقی ڈالنے کے لیے یہ خبر اڑائی گئی ہو گی۔

شیخ عبدالعزیز نے خود یہ بات اپنے بھائی سے سُنی تھی تو کہا تھا کہ غلط معلوم ہوتی ہے۔ کہیں مسلمان بھی مسلمانوں سے ایسی دغابازی کر سکتے ہیں؟ لیکن شیخ حسن علی نے کہا کہ سید محمد اصغر بھروسے کا آدمی ہے، جھوٹ نہیں کہہ سکتا۔ تم جا کر یہ اطلاع پنجتار پہنچا آؤ۔

شیخ نے واپس جا کر اپنے بھائی اور سید محمد اصغر کو سید صاحب کی رائے سُنا دی تو انھیں بڑا افسوس ہوا۔ سید محمد اصغر نے دوبارہ شیخ صاحب کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ میری اطلاع غلط نہیں۔ ضروری ہے کہ تمام غازیوں کو فی الفور پنجتار بلا لیا جائے اور اس معاملے میں دیر بالکل نہ کی جائے۔ شیخ عبدالعزیز نے دوبارہ حاضر ہو کر معروضہ پیش کیا۔ سید صاحب نے از راہ شفقت ان کی پیٹھ تھپکتے ہوئے فرمایا:

> بھائی! یہ بات غلط ہے۔ سمے کے خوانین اور ملک ہمارے دوست ہیں۔ شاید کسی مفسد نے یہ خبر اس غرض سے مشہور کی ہے کہ مسلمانوں میں تفرقہ پڑ جائے۔ آپ جائیں اور اپنے گھر میں دلجمعی سے بیٹھیں[1]

شیخ عبدالعزیز دوبارہ دکھاڈا پہنچے اور سید محمد اصغر کو سید صاحب کی گفتگو سنائی تو فرط قلق سے اس پیکر اخلاص کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ بولا: میری اس بات کو یاد رکھنا، دو تین روز میں حقیقت آشکارا ہو جائے گی[2]

آتش بغاوت کے ابتدائی شعلے

صحیح تاریخ معلوم نہیں، مہینا نومبر کا تھا کہ منشی امام الدین مبٹی والا پشاور سے آدھی رات کو پنجتار پہنچا۔ محمد امیر خاں قصوری کی روایت ہے کہ میں پہرے پر کھڑا تھا۔ امیر المومنین برج کے کوٹھے پر محو آرام تھے۔ ایک سوار نے آواز دی۔ میں نے پوچھا کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ جواب ملا: امام الدین مبٹی والا ہوں اور پشاور سے آیا ہوں۔ حضرت کو ابھی

---

[1] یہ وقائع کی روایت ہے۔ منظورہ میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ایں مردم ولایتی با ما محبتے دارند۔ ایں سخن غلط خواہد بود (منظورہ صفحہ ۹۷۴ ، ۹۷۵)۔ [2] وقائع میں ہے کہ سید محمد اصغر نے تیسری مرتبہ شیخ حسن علی کو بھیجا، لیکن سید صاحب نے نیک طبعی کی بنا پر اسے دشمنوں کی افسانہ طرازی قرار دیا۔

اطلاع دو ۔

سید صاحب کو اطلاع ہوئی تو برج کی کھڑکی کھول کر پوچھا: کیا بات ہے؟ عرض کیا گیا کہ امام الدین بمبئی والا پشاور سے آیا ہے ۔ فرمایا: خیر ہے؟ پھر اسے اوپر بلا لیا ۔ پاس پہنچتے ہی اس نے بتایا کہ سرداروں نے مولوی مظہر علی صاحب اور ان کے ساتھی غازیوں، نیز ارباب فیض اللہ خاں کو شہید کر ڈالا ۔ میں اپنی تلوار صیقل گر سے لینے گیا تو راستے میں ایک شخص نے مجھے الگ لے جا کر واقعہ شہادت بتایا اور کہا کہ فوراً بھاگ جاؤ، ورنہ تم بھی مارے جاؤ گے ۔ میں وہاں سے نکلا ۔ ہزارخانی سے گھوڑا لیا ۔ اس پر زین بھی نہ ڈالی ۔ دریا کو عبور کر کے حمزہ علی خاں رسالدار کے پاس پہنچا ۔ ان سے دوسرا گھوڑا لے کر یہاں آیا ہوں“[1]

شہادت کی تفصیل صرف اس قدر معلوم ہو سکی کہ سلطان محمد خاں نے مولوی صاحب کو مشورے کے بہانے ایک کوٹھڑی میں بلایا ۔ وہاں پہلے سے چند آدمی تلواریں سنبھالے کھڑے تھے ۔ جونہی مولوی صاحب کوٹھڑی میں پہنچے، ان پر ایک دم تلواریں پڑیں اور وہ واصل بحق ہوئے ۔ ان کے ساتھیوں کو بعد میں شہید کر ڈالا گیا ۔ منشی امام الدین اس وجہ سے بچ گیا کہ قیامگاہ پر موجود نہ تھا ۔ ارباب فیض اللہ خاں کو اس وجہ سے جام شہادت پلایا گیا کہ وہ مرحوم قول کا سچا اور عہد کا پکا تھا ۔ سرداروں کی کمینہ حرکتوں کو مذموم جانتا تھا ۔ ان کی سنگ دلی اور محسن کشی ملاحظہ ہو کہ جس شخص نے انھیں ریاست واپس دلائی تھی، اسے بھی بے تکلف موت کے گھاٹ اتار دیا، یقیناً اس اندیشے کی بنا پر کہ اگر ارباب نے اپنے دعوے کے مطابق غازیوں کا ساتھ دیا تو سازش ناکام ہو جائے گی ۔

غازیوں کی کیفیت

غازی اس وقت مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے تھے ۔ میں جہاں تک معلوم کر سکا ہوں نومبر ۱۸۳۰ء میں یہ کیفیت تھی:

۱ ۔ ایک جماعت شیخ بلند بخت دیوبندی کی ماتحتی میں امب میں مقیم تھی ۔

۲ ۔ ایک جیش حافظ مصطفیٰ کاندھلوی کی سرکردگی میں گڑھی چھترباٸی کی حفاظت کر رہا تھا ۔

۳ ۔ ایک جماعت مولوی خیرالدین شیرکوٹی کے ساتھ لوند خوڑ میں تھی ۔

۴ ۔ ایک جماعت پیر خاں مورائیں کے ساتھ کھبل میں بیٹھی تھی ۔

۵ ۔ ایک جماعت مولوی نصیرالدین منگلوری کے زیر سرکردگی ٹوپی میں تھی ۔

۶ ۔ حاجی حمزہ علی رسالدار سواروں اور شاہین خانے کے ساتھ شیوہ میں تھے ۔ وہی مقام ان کا مستقل

---

[1] وقائع جلد سوم صفحہ ۲۵۱، ۲۵۲ ۔

مرکز تھا۔

۷ - مولوی حامد علی جھنجھانوی کم و بیش تیس غازیوں کے ہمراہ میںٹی میں تھے، جہاں پن چکیوں پر غازیوں کے لیے آٹا پستا تھا۔ اس وجہ سے میںٹی غازیوں کی رسد کا ایک مرکز بن گیا تھا۔

۸ - خود سید صاحب پنجتار میں تھے۔ آپ کے ساتھ بھی غازیوں کی خاصی بڑی جماعت تھی۔

۹ - کچھ مجروح اور بیمار دکھاڑا میں تھے جن کی خدمت پر کئی غازی مامور تھے۔ غالباً سید صاحب کی بی بی اور دوسری مستورات بھی وہیں تھیں۔

باقی غازی دو دو چار چار کرکے مختلف دیہات میں منتشر تھے۔ ان کا ذکر آگے آتا ہے۔

طلبی کا فرمان

سید صاحب نے منشی امام الدین کی بات سنتے ہی مولانا شاہ اسماعیل، شیخ ولی محمد پھلتی، منشی محمدی انصاری اور دوسرے مشیروں سے مشورہ کیا[1] قرار پایا کہ تمام غازیوں کو طلبی کا پیغام بھیج دیا جائے۔ یہ پیغام اسی وقت بھیج دینا چاہیے تھا، لیکن شیخ ولی محمد نے عرض کیا کہ رات کے وقت قاصدوں کا بھیجنا مناسب نہ ہوگا، صبح انتظام کر لیا جائے گا۔

صبح ہوئی تو سید اسماعیل رائے بریلوی کو حکم ملا کہ سید صاحب کی سواری کے گھوڑے پر شیوہ پہنچیں وہاں مولوی محمد رمضان اور دوسرے غازیوں کو بہ صیغہ راز یہ خبر سنا دیں اور کہہ دیں کہ سب عجلت کے ساتھ پنجتار آ جائیں۔ حمزہ علی خاں کو تاکید کر دی جائے کہ دو دو چار چار سوار مختلف دیہات میں بھیج کر سب غازیوں کو مراجعت کا پیغام پہنچا دیں۔ مولانا شاہ اسماعیل نے توپیں مسجد کے جنوبی و مغربی گوشے میں نصب کرا دیں[2]

گڑھی امان زئی کا ایک شخص نصر اللہ خاں اس وقت پنجتار میں تھا۔ وہ سازش میں شریک تھا اور غالباً مخبری کی غرض سے پنجتار پہنچا ہوا تھا۔ غازیان پشاور کی شہادت کا واقعہ راتوں رات پنجتار میں سب کو معلوم ہو چکا تھا۔ اس فیصلے کا بھی علم ہو گیا تھا کہ غازیوں کو بہ تاکید بلا لیا گیا ہے۔ نصر اللہ فوراً روانہ ہو گیا اور ہر بستی کے لوگوں کو بتاتا گیا کہ جس کام کے لیے پرسوں رات کا وقت مقرر ہو چکا ہے، اسے کل رات ہی

---

[1] مولوی سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ منشی خانہ مسجد کے جنوب میں تھا۔ منشی محمدی انصاری آدھی رات کے وقت بلائے گئے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آکر انہوں نے یہ الم انگیز واقعہ سنایا تو فرط قلق سے کسی کو نیند نہ آئی۔ [2] مسجد کی تفصیل کسی روایت میں نہیں بتائی گئی، یعنی آیا اس سے پنجتار کے اندر کی مسجد مراد ہے یا وہ جگہ جہاں غازی جمعہ کی نماز پڑھا کرتے تھے؟ میرا خیال ہے کہ اس سے آخر الذکر مقام مراد ہے۔

پورا کر لینا چاہیے، اگر یہ نہ ہُوا تو غازی سلامت نکل جائیں گے اور سازش بالکل بے نتیجہ رہے گی[1]

فیصلہ قضا و قدر

بہر حال سید اسماعیل رائے بریلوی شیوہ پہنچے تو حاجی حمزہ علی خاں نے سوار مختلف دیہات میں بھیج دیے۔ ان کے ذریعے سے یہی پیغام بھیجا جا سکتا تھا کہ جلد سے جلد پنجتار پہنچو۔ اصل واقعہ بتانا قرینِ مصلحت نہ سمجھا گیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ غازیوں کو فوری روانگی کا احساس نہ ہُوا۔ اکثر نے سمجھا کہ شاید پشاور پر دوبارہ حملہ ہونے والا ہے اور لشکر تیار ہو رہا ہے۔ اس وجہ سے وہ اپنے دیہاتی دوستوں اور شناساؤں سے بہ اطمینان وداعی ملاقاتیں کرتے رہے۔ ان ملاقاتوں میں دیہاتیوں کو غازیوں کے اوقات روانگی کا بھی علم ہو گیا، حالانکہ اسے مخفی رکھنا بے حد ضروری تھا۔

اب واقعات پر پھر ایک دفعہ نظر ڈال لیجیے:

۱ ۔ مولوی مظہر علی کو ارباب فیض اللہ خاں نے بہت پہلے بتا دیا تھا۔ وہ اس انتظار میں رہے کہ خود سارے حالات کا اندازہ کر کے اطلاع بھیجیں۔ ایسا نہ ہو کہ عجلت میں کوئی غیر محقق بات سید صاحب تک پہنچانے کے مرتکب ہوں۔

۲ ۔ سید محمد اصغر امام مسجد دکھاڑانے دو یا تین مرتبہ تاکیدی پیغامات بھیجے۔ سید صاحب سمجھتے رہے کہ یہ مخالفوں کی سخن سازی ہے۔

۳ ۔ واقعۂ پشاور کی اطلاع رات کو مل گئی تھی۔ اسی وقت قاصد جا بجا روانہ ہو جاتے اور غازیوں کو بے توقف بُلا لیا جاتا تو وہ محفوظ رہتے۔ اسے شیخ ولی محمد نے خلافِ مصلحت قرار دے کر توقف میں ڈالا۔

۴ ۔ سید اسماعیل رائے بریلوی اگر سواروں سے کہہ دیتے کہ بلاوے کے ساتھ اصل واقعے کی طرف اشارہ بھی کر دینا تو غازی روانگی میں تاخیر نہ کرتے اور حفاظت کے لیے چوکس ہو جاتے۔

۵ ۔ نصر اللہ خاں گڑھی امان زئی والے کو پنجتار میں روک لیا جاتا تو وہ اہل سمہ کو یہ اطلاع نہ دے سکتا کہ موعد قتل کو ایک رات مقدم کر لو۔

بہر حال عزیز و علیم کی تقدیر پوری ہو کر رہی۔ اگر یہ ناشدنی سانحہ پیش نہ آتا تو دعویٰ کرنا بے شک مشکل ہے، لیکن اس حقیقت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ اسلامیانِ ہند کی گزشتہ سوا سو برس کی سرگزشت کا رنگ بالکل مختلف ہوتا:

یک کاشکے بود کہ بہ صد جا نوشتہ ایم

---

[1] منظورہ میں ہے: «در دیہات سمہ جائیکہ رسید، در گوش ہمہ رازداران خود ایں افسوں دمید کہ کارِ کہ موعد آں بہ شب پس فرداست، فردا اگر ساختہ کنید کار از دست خواہد رفت» (صفحہ ۱۰۰۹)

اکتیسواں باب

مشہدِ اکبر

(۱)

بہ جرمِ عشق تو ام مے کشند غوغائے است
تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشائے است

سردارانِ پشاور اور اہلِ سمہ کی سازش سے جس دردانگیز مقتل کا انتظام ہُوا، اس کے پورے حالات ہمارے سامنے نہیں آئے، لیکن جو کچھ معلوم ہو سکا، اسے بیان کر دینا ضروری ہے، اس لیے کہ ہماری بدبختیوں کی یہ خونچکاں داستان بھی سننے اور عبرت کی غرض سے یاد رکھنے کے قابل ہے۔ مولوی محمد جعفر مرحوم تھانیسری نے بالکل صحیح فرمایا کہ قلم اس واقعہ محزنہ کی تفصیل لکھنے پر جرأت نہیں کرتا[1] لیکن سوانح نگار کے لیے اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ جو کچھ پیش آیا، اسے بہرحال بیان کر دے، اگرچہ وہ کتنا ہی المناک اور کتنا ہی حزن افزا کیوں نہ ہو؟ بدبختی اور سیہ نصیبی کا اس سے زیادہ قلق انگیز واقعہ کیا ہو سکتا ہے کہ جو جانبازانِ راہِ حق، عزت و حرمتِ اسلام کی تڑپ سے بے تاب ہو کر اور اپنے گھروں کی راحت افروز زندگیوں کو ٹھکراتے ہُوئے مہاجر الی اللہ بن کر سرحد پہنچے تھے، تاکہ پہلے اہلِ سرحد کو اغیار کی ترکتازیوں سے نجات دلائیں، ان کی آزادی کو بچائیں اور اسلام کی برکتوں سے مالامال کر دیں، پھر پورے ملک کے مسلمانوں کو محکومی کی ذلت سے باہر نکالیں، وہ غیروں نہیں بلکہ خویشوں کے ہاتھوں ذبح و قتل کا نشانہ بنے۔ جو غازی اپنی جانیں مسلمانوں کے امن و اطمینان اور راحت و آسائش کے لیے بے دریغ قربان کر رہے تھے، وہ مسلمانوں کی تلواروں سے خاک و خون میں تڑپے۔ جس سرزمین میں یہ مشہدِ اکبر پیش آیا، اگر اس کے ذروں کو آج طاقتِ گویائی مل جائے تو کتنے دل اس داستانِ غم کی تاب لا سکیں گے؟

اسماعیلہ

مولوی مظہر علی کی شہادت کے بعد غازیوں پر حملوں کا آغاز موضع اسماعیلہ سے ہُوا۔ حاجی بہادر شاہ خاں سید صاحب سے مل کر گڑھی امان زئی جا رہے تھے۔ اسماعیلہ پہنچے تو لوگوں نے بہ اصرار ایک رات کے لیے ٹھہرا لیا۔ اہلِ اسماعیلہ ہی نہیں، ساری رزڑ قوم کو حاجی صاحب

---

[1] تواریخ عجیبہ صفحہ ۱۳۰۔

سے خاص عقیدت تھی۔ وہ ٹھہر گئے۔ انھیں پُر تکلف کھانا کھلایا اور عشا کی نماز میں امام بنایا۔ جب وہ پہلی رکعت کے سجدے میں گئے تو موضع کے خان، اسماعیل خاں نے تلوار سے ان کا سر تن سے جدا کر دیا اور اس مرحوم کی روح پاک سبحان ربی الاعلیٰ کے ذکر میں ڈوبی ہوئی اعلیٰ علیین میں پہنچ گئی۔[1] سبحان اللہ! کیا موت تھی، جس پر تقویٰ اور شب بیداری کی سیکڑوں زندگیاں بے تکلف قربان کی جاسکتی ہیں۔

"خندروس کوبی"

حاجی بہادر شاہ خاں کی شہادت کے ساتھ ہی اسماعیلہ میں نقارہ بجا۔ اس کی آواز سُن کر بستی بستی نقاروں کا تار بندھ گیا۔ قرار داد کے مطابق یہ اس امر کا اعلان تھا کہ جو کچھ باہم طے کر چکے تھے، اس پر عمل کا وقت آگیا۔ بعض مقامات کے غازیوں نے نقارہ کوبی کو غیر معمولی فعل سمجھ کر وجہ پوچھی تو بے دردوں نے بتایا کہ "خندروس کوبی" (جوار کوٹنے) کے لیے لوگوں کو جمع کرنا منظور ہے، تاکہ جلد سے جلد اس کام سے فارغ ہو جائیں، پھر عُشر حضرت امیر المومنین کے پاس پہنچا دیں۔ اصل میں "خندروس کوبی" پہلے سے ایک اصطلاح مقرر کر لی تھی جس سے مراد غازیوں کا قتل تھا، لیکن غازی بیچارے اس اصطلاح کے حقیقی مطلب سے کیوں کر آگاہ ہو سکتے تھے؟

موضع شیوہ

موضع شیوہ رسالدار کا مرکز تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے وہ سواروں کو مختلف دیہات میں بھیج کر روانہ ہو گئے اور غازیوں کو صحیح حالات کی اطلاع دیے بغیر پنجتار پہنچنے کی تاکید کر کے چلے گئے۔ وہاں کے خوانین میں سے آنند خاں اور مشکار خاں سید صاحب کے سچے عقیدت مند تھے اور آخر تک عقیدت مند رہے۔ جو غازی شیوہ میں تھے، ان میں سے حافظ عبداللہ، شیخ ناصر الدین، مولوی محمد رمضان اور شیخ گلاب کے سوا کسی کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ سید امیر علی اور حافظ عبدالعلی پھلتی (ابن حافظ قطب الدین) عُشر کی تحریر پر مامور تھے اور اس سلسلے میں دیہات کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ وہ بھی اتفاقیہ شیوہ پہنچ گئے۔ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں خطرے کا کچھ نہ کچھ احساس تھا۔ نقارے کی آواز سنی تو بھانپ گئے کہ شرارت ہونے والی ہے۔

سید امیر علی کے پاس بیت المال کا پانچ ہزار روپیہ جمع تھا۔ انھیں سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ اس روپے کو پنجتار پہنچا دینا لازم ہے۔ چنانچہ فوراً گھوڑے پر سوار ہوئے اور حافظ عبدالعلی کو ساتھ لے کر گاؤں کے باہر پہنچ گئے۔ پھر حافظ صاحب یہ کہتے ہوئے لوٹ گئے کہ میں اس نازک وقت میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ آپ کے پاس بیت المال کی امانت ہے۔ گاؤں سے باہر آ چکے ہیں، آپ چلے جائیں۔

---

[1] منظورہ صفحہ ۹۸۰، ۹۸۱۔

سید امیر علی نے گھوڑا سرپٹ ڈال دیا۔ راستے میں انھیں ایک جانب ذرا فاصلے پر مفسدوں کا گروہ نظر آیا، لیکن ان میں سے کوئی بھی قریب نہیں پہنچ سکتا تھا۔

گاؤں کا محاصرہ

بقیہ غازی ہتھیار سنبھال کر مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔ اسی وقت آنند خاں اور مشکار خاں دوڑتے ہوئے مولوی محمد رمضان کے پاس پہنچے اور بمنت التماس کی کہ ہمارے ہاں چلے چلیے وہاں کسی کو آپ پر حملے کا حوصلہ نہ ہو گا۔ مولوی صاحب نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس وقت محافظ حقیقی کی حفاظت کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں۔ اگر یہ لوگ ہمیں ختم کر دینے ہی پر تلے بیٹھے ہیں تو ہم سے بھی اپنے بچاؤ کے لیے جو کچھ ہو سکے گا، اس میں توقف نہ کریں گے۔

گاؤں والوں نے پورے گاؤں کا محاصرہ کر لیا تھا اور باہر نکلنے کے تمام راستوں پر پہرے بٹھا دیے تھے۔ غازی باہم یہ طے کر کے بیٹھ گئے کہ رات بھر نگہبانی کا بندوبست جاری رہے، دن نکلے گا تو کسی نہ کسی تدبیر سے محاصرے کو توڑ کر پنجتار چلے جائیں گے۔

شیخ گلاب کا بیان

فیصلے کے مطابق صبح باہر نکلے اور جنگ کرتے ہوئے پنجتار کی طرف چلے؛ لیکن چند آدمی سیکڑوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ گاؤں کی ندی تک پہنچتے پہنچتے ایک ایک کر کے سب شہید ہو گئے۔ صرف شیخ گلاب زندہ بچے، جو پیش آمدہ حالات کے راوی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں بے طرح زخمی ہو کر گر پڑا۔ مفسدوں نے ہتھیار اتار لیے اور مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔ کچھ دیر کے بعد ایک ملا آیا۔ اس وقت میرے حواس بحال ہو چکے تھے، لیکن اٹھنے کی ہمت نہ تھی۔ ملا کو میرے حال پر رحم آیا۔ وہ بستی سے دو آدمیوں کو لایا اور چارپائی پر ڈال کر اپنے گھر لے گیا۔ ایک دن اور ایک رات میری تیمارداری کی، پھر دو آدمیوں سے میری چارپائی اٹھوا کر پنجتار پہنچا گیا۔

حافظ عبدالعلی

حافظ عبدالعلی کو سید امیر علی کے ساتھ نکل جانے کا موقع مل گیا تھا، لیکن اس سے فائدہ نہ اٹھایا اور واپس جا کر اپنے مصیبت زدہ بھائیوں میں شامل ہو گئے۔ شیوہ ہی میں گاؤں اور ندی کے درمیان کسی جگہ شہادت پائی۔ سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ حافظ صاحب جنگ پھولڑہ میں بھی شریک تھے۔ وہاں سے سلامت اسب پہنچے تو اپنے خاص رفیقوں کی مجلس میں بار بار حسرت سے کہا کرتے تھے کہ شہادت نصیب نہ ہوئی۔ کیا معلوم تھا کہ ان کی شہادت غیروں کے ہاتھ سے نہیں، بلکہ اپنوں کے ہاتھ سے مقدر تھی۔

غازی محمد حسین تنرگتی میں تھے، مولوی امیر الدین اور ریاست علی موہانی یار حسین میں۔ یہ بھی اسی ہنگامے میں شہید ہوئے لیکن شہادت کی تفصیل بیان کرنے والا کوئی نہ تھا، اس لیے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ

کیا حالات پیش آئے اور کس طور انھیں سعادت شہادت نصیب ہوئی۔

ترلانڈی

موضع ترلانڈی کے متعلق لکھمیر خاں کا بیان ہے کہ گاؤں والوں نے راتوں رات باہر جانے کے تمام راستوں پر پہرے بٹھا دیے تھے۔ غازیوں کو اس ناکہ بندی کا علم نہ تھا۔ خود لکھمیر خاں کو غسل کی حاجت تھی۔ بڑے تڑکے اٹھے اور ندی کا رُخ کیا۔ ایک آدمی نے پوچھا: کہاں جا رہے ہو؟ بتلایا: غسل کے لیے ندی پر جا رہا ہوں۔ دوسرے نے کہا: "جانے دو"۔ ان کا خیال غالباً یہ ہوگا کہ یہ غسل کے بعد واپس آئے گا تو خود بخود مارا جائے گا۔ ابھی تڑکے ہی ہنگامہ بپا ہُوا تو دوسرے غازی متنبہ ہو جائیں گے۔

غسل کرتے کرتے اُجالا ہو گیا۔ لکھمیر صرف پاجامہ پہن کر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اس اثنا میں دو آدمی آئے۔ ایک نے ان کی تلوار اٹھالی، دوسرے نے کپڑے سنبھال لیے۔ سلام پھیر کر دیکھا تو سمجھے کہ خوش طبعی کر رہے ہیں۔ اچانک ایک نے زور سے مکا مارا اور دھکا دیا۔ پھر دونوں نے ایک ایک ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچتے ہُوئے گاؤں کی طرف لے چلے۔

لکھمیر خاں کی صاف گوئی

ان آدمیوں میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ کیوں خواہ مخواہ تکلیف اٹھائیں؟ یہیں اس کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔ دوسرا بولا کہ نہیں، اسے بھی وہیں لے جا کر ماریں گے جہاں اس کے ساتھی مرے پڑے ہیں۔ یہ بات سُن کر لکھمیر کو اندازہ ہو گیا کہ گاؤں میں کیا کچھ پیش آچکا ہے اور ان کے ساتھیوں کا کیا انجام ہُوا ہے۔ صاف گوئی ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

> یہ بات سنتے ہی میرے دل پر خوف مستولی ہو گیا اور یقینی موت نظر آنے لگی۔
>
> اس وقت اللہ نے مجھے ہمت دی۔ پورا زور لگا کر ایک جھٹکا مارا اور ہاتھ چھڑا کر سر توڑ بھاگا۔ انھوں نے پیچھا کیا لیکن مجھے پکڑ نہ سکے۔ پھر سواروں سے جا کر کہا کہ وہ شخص بھاگ گیا ہے، اسے پکڑو۔ چنانچہ ایک سوار گھوڑا دوڑاتا ہُوا میرے پیچھے آیا۔ وہ ندی کے پاس پہنچا تو اتفاق سے اس کا گھوڑا دوسری سمت بھاگ نکلا۔ سوار میرا پیچھا چھوڑ کر گھوڑے کے تعاقب میں چلا گیا اور میں پنجتار چلا آیا۔ جن دیہات میں شور تھا ان سے دور دور ہی رہا۔

کچھ معلوم نہیں کہ ترلانڈی میں کتنے غازی تھے۔ "وقائع" میں ہے کہ پانچ سوار رہتے تھے، تین ایک حجرے میں، دو ایک حجرے میں[1]۔ پیادوں کے بارے میں علم نہ ہو سکا۔

مینٹی

مینٹی میں غازیوں کے لیے آٹا پستا تھا۔ وہاں غلے اور آٹے کے گودام قائم ہو گئے تھے۔ میر حامد علی جھنجھانوی اس کاروبار کے مہتمم تھے اور بیس پچیس غازی ان کے ساتھ رہتے تھے۔ مولوی خدا بخش

---

[1] وقائع جلد سوم صفحہ ۳۲۰

رام پوری بھی انھیں میں تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں بیمار تھا۔ ایک سوار آیا، حاجی فاضل پشاوری بھی اس کے ساتھ تھا۔ سوار نے مولوی مظہر علی اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کی خبر سنائی۔ ساتھ ہی میر حامد علی سے کہا کہ حضرت نے ہر جگہ کے غازیوں کو پنجتار بلا لیا ہے، آپ کو حکم ہے کہ جتنا آٹا موجود ہو وہ اور ہمراہیوں کو لے کر چلے آئیں۔ میں دوسرے دیہات کے غازیوں کو بھی خبر پہنچانے جا رہا ہوں۔

اتفاق یہ کہ میر حامد علی اپنے سارے اونٹ اور خچر غلّہ لانے کے لیے گندف بھیج چکے تھے۔ انھوں نے فوراً حاجی فاضل کو گندف بھیج دیا کہ اگر غلّہ لادا بھی جا چکا ہو تو اسے اتروا کر جانور جلد واپس لے آئیں۔ ظہر اور عصر کے درمیان حاجی صاحب جانور لے کر مینئی پہنچ گئے اور اپنے ساتھ کرایے کے گدھے اور خچر بھی لے آئے۔ شام تک آٹا بوریوں میں بھر لیا گیا۔ عشا تک تمام غازی کھانے سے فارغ ہو گئے۔

پنجتار میں ورود

روانگی کی تیاری مکمل ہو چکی تو میر حامد علی نے مینئی کے خان معز اللہ خاں کو بلایا۔ اس کا بھائی شاہ ولی خاں آیا اور بتایا کہ میرا بھائی پنجتار گیا ہوا ہے، میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ میر صاحب نے کہا کہ مجھے حکم آیا کہ آٹا پنجتار پہنچاؤں۔ جتنا لے جا سکتا ہوں لے جا رہا ہوں، باقی آٹے اور غلّے کی حفاظت آپ کے ذمّے ہے۔ ہمارے تین آدمی یہاں رہیں گے، ان کی حفاظت کیجیے۔

عشا کے بعد میر حامد علی روانہ ہوئے۔ جھنڈا بوکا اور توتالی ہوتے ہوئے پنجتار پہنچ گئے۔ سید صاحب نے ایک بڑی جماعت کے ساتھ پنجتار کے جنوبی دروازے پر استقبال کیا۔ اس قافلے میں کل ستائیس غازی تھے۔ اسی روز دوپہر کے وقت مولوی نصیر الدین منگلوری اپنے ساتھیوں کو لے کر ٹوپی سے آ گئے۔ وہ حکم کے مطابق چلے آئے تھے، اگرچہ ٹوپی میں کوئی خطرہ نہ تھا، اس لیے کہ یہ علاقہ سازش میں شریک نہ تھا۔

گودام اور اس کے نگہبان

میر حامد علی نے جن تین آدمیوں کو نگہبانی کے لیے چھوڑا تھا، ان میں سے صرف دو کے نام معلوم ہیں۔ ایک خدا بخش رام پوری، جو بیمار تھے، دوسرے داؤد خاں خورجوی۔ گودام کے دو بڑے کمرے تھے۔ ایک میں غلّہ اور آٹا رہتا تھا، دوسرے میں غازی مقیم تھے۔ اس کا احاطہ بہت وسیع تھا۔ اسی رات کھبل سے پیر خاں مع اپنے پینتیس غازیوں کے ساتھ پہنچ گئے اور شاہ ولی خاں کی مسجد میں اُترے۔ ان کی طرف سے رمضان یہ پیغام لے کر آیا کہ پینتیس آدمیوں کی رسد دے دی جائے۔ داؤد خاں نے رسد تول دی۔ غازیوں نے کھانے سے فارغ ہو کر وہیں رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

انتباہ اور حملہ

اس وقت تک غازیوں کے خلاف سازش کی خبر عام ہو چکی تھی۔ ایک نیک دل ملّا نے پیر خاں کو بصیغۂ راز یہ خبر پہنچائی اور مشورہ دیا کہ یہاں سے فوراً نکل جائیے۔ یہ غازی

لمبی منزل طے کر کے پہنچے تھے اور پیش آنے والے حالات کا انھیں قطعاً اندازہ نہ تھا۔ بولے: ذرا سستا لیں، پھر روانہ ہو جائیں گے۔ ملّا بیچارے نے دلسوزی سے کہا کہ میں نے سمجھا دیا، اب آپ مختار ہیں۔ غازیوں نے کچھ خیال نہ کیا اور اطمینان سے سو گئے۔

ان میں سے دو آدمی مسجد سے نکل کر گودام میں پہنچ گئے: ایک یوسف علی خاں فرزند حسن علی خاں ساکن دربند، دوسرے حبیب خاں بونیر وال۔ اس طرح گودام میں پانچ غازی جمع ہو گئے اور مسجد میں تینتیس غازی رہے۔ گودام والوں نے باہم فیصلہ کیا کہ چار سو جائیں اور ایک پہرہ دے۔ یکایک گولی چلی، خدا بخش ارام پوری نے پوچھا: پہرے پر کون ہے؟ معلوم ہوا داؤد خاں ہے۔ پوچھا: گولی کدھر سے آئی؟ جواب ملا: قبلے کی سمت سے۔ پھر دوسری گولی چلی۔ خدا بخش نے ساتھیوں کو ہوشیار کیا۔ باہر صحن میں نکل کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ نہ صرف گودام کا محاصرہ ہو چکا ہے، بلکہ پچھواڑے سے بعض لوگ چھت پر پہنچ چکے ہیں۔

گودام کے غازیوں کی کیفیت

گودام کے غازیوں میں سے یوسف علی خاں اور حبیب خاں کے پاس تلواریں بھی تھیں، بندوقیں بھی۔ مولوی خدا بخش کے پاس صرف تلوار تھی اور داؤد خاں کے پاس صرف نیزہ تھا[1]۔ پانچویں رفیق کے پاس صرف لاٹھی تھی۔

خدا بخش کا بیان ہے کہ چھت پر سے پتھر برسنے لگے۔ داؤد خاں نے ایک آدمی کی طرف نیزہ تانا، اس نے کوٹھے پر سے نیزہ پکڑ کر اوپر کھینچ لیا۔ سب غازی کمرے میں گھس گئے اور اندر سے کنڈا لگا لیا۔ بلوائی صحن کی دیواریں پھاند کر اندر آ گئے۔ گودام کے کمرے کا قفل توڑا اور رسد لوٹنے لگے۔ جس کمرے میں ہم تھے اس کے پچھواڑے سے دیوار میں نقب لگانے کی آوازیں آئیں۔ ہم نے طے کیا کہ باہر نکلیں۔ دروازہ کھولا۔ بلوائی لوٹ میں لگے ہوئے تھے۔ میرے چاروں ساتھی صحن کے دروازے کی طرف بڑھے۔ میں بیماری کے باعث کمزور ہو گیا تھا اور زیادہ چل نہ سکتا تھا۔ کھسکتا کھسکتا صحن کے اس حصے میں پہنچا، جہاں دیوار کے ساتھ لکڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ڈھیر پر سے ہوتا ہوا دیوار پر جا بیٹھا۔ دوسری طرف ایک ملّا کا گھر تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ ملّا، میرے ساتھی داؤد خاں کو لایا اور اپنی اندھی والدہ سے کہا کہ اسے کہیں چھپا دو۔ میں پھر باہر جاتا ہوں۔ شاید کوئی اور مظلوم مل جائے اور اسے بچا کر لے آؤں۔

ملّا کی نیک دلی

یہ سُن کر میری ڈھارس بندھی۔ تلوار میان میں کی، کالے کمبل میں لپٹا ہوا آہستہ آہستہ

---

[1] وقائع میں ہے کہ داؤد خاں کے پاس بندوق بھی تھی اور اس کا فتیلہ روشن دیکھ کر مفسد چھت پر چڑھ گئے تھے۔

ملا کے گھر میں اتر گیا اور صحن میں توت کے درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گیا۔ اس اثنا میں ملا کی بیوی باہر نکلی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس گاؤں کے لوگ کافر ہو گئے ہیں اور بیچارے غازیوں کو ناحق قتل کرتے ہیں۔ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ پوچھا: ہندوستانی ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ مجھے بھی اندر اس جگہ لے گئی جہاں داؤد خاں پہلے سے موجود تھا۔ پھر یوسف علی خاں کو ملا لے آیا۔

اس طرح رات کو تو بچ گئے لیکن یہ اندیشہ لگا رہا کہ صبح ہونے پر دیکھیے کیا پیش آئے۔ ملا نے داؤد خاں اور یوسف علی خاں کو صبح ہونے سے پہلے پہلے باہر بھیج دیا۔ خدا بخش بیمار ہونے کے باعث جا نہیں سکتے تھے۔ صبح ہوئی تو بلوائیوں نے خانہ تلاشی شروع کی۔ ملا کے گھر پہنچے تو اس نے صاف صاف بتا دیا کہ میرے پاس تین غازی تھے۔ دو چلے گئے، تیسرا بیمار ہے۔ اسے ہرگز نہ دوں گا۔ اگر زور سے کام لوگے تو میں بھی اپنے ساتھیوں کو بلا کر لڑائی کروں گا۔ اس طرح خدا بخش کی جان بچی۔

یوسف علی خاں

یوسف علی خاں آٹھ دس برس کا ہوگا، جب اس کا باپ، حسن علی خاں، سکھوں کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہوا۔ ماں نے شہید کی اکلوتی نشانی کو ناز و نعمت سے پالا۔ سن بلوغ کو پہنچا تو سید صاحب کی بیعت کر کے غازیان اسلام میں داخل ہو گیا۔ بے درد قاتلوں کے نزدیک انسانیت اور اسلامیت کے ایسے گراں بہا گوہروں کی بھی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ ان پر ایک جنون سوار تھا اور جنون کی حالت میں ہر فدا کارِ حق کو موت کے گھاٹ اتارنے پر تُل گئے تھے۔ فکر و نظر کی عجائب کاریاں ملاحظہ فرمائیے کہ جو تلواریں غیروں کے ظلم و تعدی کو روکنے کے لیے اُٹھیں، جو تلواریں مسلمانوں کی مظلومیت ختم کرنے کے لیے بلند ہوئیں، جو تلواریں امن، ناموس اور آزادی کے بچاؤ کے لیے بے نیام نہ ہوئیں، وہ ان لوگوں کی گردنوں پر بے دریغ چلنے لگیں، جو کلمۂ حق کی سربلندی کے لیے جانیں ہتھیلیوں پر لیے پھرتے تھے!

یوسف علی خاں نے ملا سے کہا کہ مجھے زیدہ کے راستے پر ڈال دیجیے۔ وہاں فتح خاں خانخیل میرا ہم قوم اور دوست ہے، اس کے پاس پہنچ جاؤں گا تو کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ داؤد خاں بوڑھے تھے، وہ اپنے ایک دوست مدد خاں کے پاس چلے گئے، جو حاجی خیل میں تھا۔

مسجد پر یورش

اب پیر خاں اور ان کے ساتھیوں کا حال سنیے جو تھکے ماندے آئے تھے اور تھوڑی دیر آرام کی غرض سے مسجد میں ٹھہر گئے تھے، راتوں رات اس مسجد کے گرد گھیرا ڈال لیا گیا۔ علی الصباح لڑائی شروع ہو گئی۔ خدا بخش رامپوری نے اپنی پناہ گاہ سے ملا کو بھیجا کہ ان کی خبر لائیے۔ اس نے واپس آکر بتایا کہ ابھی جنگ ہو رہی ہے۔ غازیوں کے بچ نکلنے کی کوئی راہ نہیں۔ بلوائی چھتوں پر بھی

بندوقیں اور پتھر لیے بیٹھے ہیں۔ غازیوں کی گولیاں ان تک نہیں پہنچتیں۔

غازیوں کے پاس مقابلے کے لیے سامان نہ رہا تو مسجد کے اندر چلے گئے۔ کسی کو ان کے قریب جانے کی جرأت نہ تھی۔ آخر بلوائیوں نے فیصلہ کیا کہ مسجد کو آگ لگا دی جائے یا اسے ڈھا دیا جائے۔ پھر چند علما اور سید آ گئے۔ انھوں نے بلوائیوں سے کہا کہ ان غازیوں کو کیوں مارتے ہو؟ یہ حاجی ہیں، مہاجر ہیں، تمھارا انھوں نے کیا بگاڑا ہے؟ بعض عورتوں نے بھی اس ظلم کے خلاف نفرت کا اظہار کیا۔ بستی میں جو ہندو رہتے تھے انھوں نے بھی کہا کہ تمھیں روپے چاہئیں تو ہم سے لے لو اور ان غازیوں کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہم انھیں سید بادشاہ کے پاس پہنچا دیں گے۔ شاہ ولی خاں (برادر معز اللہ خاں رئیس مینئی) بھی دوڑا آیا اور بولا میں اپنی مسجد کو نقصان نہ پہنچنے دوں گا۔ بلوائیوں نے کسی کی نہ سُنی اور مسجد کو آگ لگانے کا فیصلہ ہو گیا۔

کربلا زار

غازی یہ سب باتیں سُن رہے تھے۔ جب انھیں یقین ہو گیا کہ خانۂ خدا میں بھی امن سے بیٹھے رہنے کی کوئی صورت نہیں رہی تو تلواریں سونت کر باہر نکل آئے۔ پیر خاں غالباً سب سے آگے تھے۔ اتفاق سے انھوں نے ٹھوکر کھائی اور گر پڑے۔ ایک جوان نے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ پوری جماعت بجانب مشرق روانہ ہو گئی۔ ان کے پاس کوئی نہیں آتا تھا۔ بلوائی ان کا چھوڑا ہوا مال و اسباب لوٹنے لگے۔ غازی ندی پر پہنچ گئے۔ رات بھر کے پیاسے تھے، بے اختیار پانی پر لپکے۔ اس اثنا میں ایک ہجوم عظیم ان کے سر پر پہنچ گیا۔ غازی ندی کے بہاؤ میں تھے۔ ان پر پتھروں اور نیزوں اور تلواروں کی بارش شروع ہو گئی۔ صرف آٹھ آدمی بچ کر ادھر ادھر نکل سکے۔ پچیس یا چھبیس اسی ندی میں ابدی نیند سو گئے۔

حبیب خاں بونیروال

حبیب خاں بونیروال سولہ برس کا نوجوان تھا۔ وہ گودام سے نکلا تو سیدھا مسجد میں پہنچا اور اپنے ساتھیوں میں شامل ہو گیا۔ بلوائی اسے بار بار آوازیں دیتے تھے کہ تم ہمارے پاس چلے آؤ، کوئی گزند نہ پہنچائیں گے۔ لیکن اس جوانمرد کی زبان سے ہر مرتبہ یہی جواب نکلتا:

> مجھے تمھارے ساتھ جینا منظور نہیں، غازیوں کے ساتھ درجۂ شہادت پانا میرے لیے ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس طرح خدائے قدیر کی بارگاہ میں اعلیٰ مرتبہ ملے گا۔

جب غازی مسجد سے باہر نکلے تو ایک بلوائی نے حبیب خاں کے سر پر تلوار مارنی چاہی، دوسرے نے اسے روک دیا۔ بالاکوٹ کے معرکے تک یہ عالی قدر مجاہد غازیوں کے ساتھ رہا۔

خدا بخش رام پوری حبس ملا کے گھر میں تھے، اس نے بتایا کہ اصل شرارت معز اللہ خاں کی ہے جو خود تو تالی میں بیٹھا ہے اور جگہ جگہ آدمی بھیج کر بلوے کرائے۔ پیر خاں کے متعلق یہ افواہ مشہور کی کہ اس کے

پاس بہت بڑی رقم ہے۔ بلوا ہو چکا تو واپس آیا اور ریاکاری کے طور پر کہتا رہا کہ میں ہوتا تو کبھی کچھ نہ ہونے دیتا۔ بعد ازاں ندی کے پاس پہاڑ کے دامن میں بڑا گڑھا کھدوا کر غازیوں کی لاشیں دفن کرائیں۔ معلوم نہیں اس گنجِ شہیداں کا کوئی نشان اب تک باقی ہے یا نہیں۔

ظلم کی تیرگی میں نیکی کی کرنیں

ایک ملا کی نیک دلی کے واقعات ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ مینئی میں ایک اور صاحب بھی تھے، جنھوں نے دو غازیوں کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی: ایک سید حیدر علی کاکوری تھے دوسرے کا نام معلوم نہیں اور اسے "شاہ جی" کہہ کر پکارتے تھے۔ اس نیک دل بزرگ کا نام سید محمد تھا۔ خدا بخش رام پوری کا حال معلوم ہوا تو اسے بھی ملاّ کے گھر سے اپنے گھر لے گیا۔ سید حیدر علی کا پاؤں سخت زخمی تھا اور وہ چلنے سے معذور تھے۔ انھیں اپنے پاس رکھا۔ خدا بخش رام پوری اور "شاہ جی" کو ملا صاحب کوٹھا کے پاس پہنچا دیا جہاں چار اور غازی تھے۔ پھر ملا صاحب نے اپنے پانچ شاگردوں کی حفاظت میں انھیں پنجتار بھیج دیا۔

غازیوں کا داعیہ قربانی

آپ نے اہلِ سمہ کی شقاوت و سنگ دلی کے لرزہ خیز مناظر دیکھ لیے۔ اب غازیوں کی ہمت، للہیت اور داعیہ قربانی کا نقشہ بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔

مینئی کے سید محمد ایک روز مولوی خدا بخش سے باتیں کر رہے تھے۔ غازیوں کی مظلومیت کا ذکر چھڑ گیا تو بے اختیار اشکبار ہو گئے۔ خدا بخش نے کہا:

> ہم شوقِ شہادت ہی لے کر اس دور دست مقام پر آئے تھے۔ جو لوگ شہید ہوئے وہ مراد کو پہنچ گئے۔ جو باقی ہیں، ان کی آرزو بھی یہی ہے کہ راہِ حق میں جانیں دے دیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے امام کو سلامت رکھے ان شاء اللہ ان کی برکت سے پھر جہاد کا سامان ہو جائے گا۔

یعنی:

من و دل گر فنا شدیم چہ باک
غرض اندر میاں سلامت اوست

سید صاحب کی سعیِ جہاد

مولوی خدا بخش ملا صاحب کوٹھا کے پاس تھے کہ وہاں بھی ایک روز ایسی ہی گفتگو چھڑ گئی۔ مولوی صاحب نے کہا:

جو لوگ شہید ہوئے، وہ گھر سے یہی ارادہ لے کر آئے تھے لیکن ہر شخص کا

خیال تھا کہ کفار کا مقابلہ کرتے ہوئے جام شہادت نصیب ہوگا۔ یہ خیال نہ تھا کہ اسلام کے مدعی اس سلسلے میں کفار کی نیابت کریں گے۔

پھر مولوی صاحب نے مثال بیان کی کہ ایک عالی جاہ بادشاہ نے ایک شخص کو باغ کا داروغہ بنایا۔ وہ دل وجان سے باغ کی خدمت کرتا تھا۔ ہر درخت کو پانی دیتا۔ سارا باغ سرسبز و شاداب ہوکر بارآور ہوا اور سال بہ سال پھل دینے لگا۔ اچانک نمک حراموں نے موقع پاکر درخت کاٹ ڈالے اور باغ کو ویران کردیا۔ اس مثال میں سید صاحب کی سعی جہاد اور اس میں اہل سمہ کی خلل اندازی کی کتنی صحیح، عمدہ اور عبرت انگیز تصویر کھینچی گئی تھی۔

بتیسواں باب

مشہد اکبر

(۲)

سرمد گلہ اختصار مے باید کرد — یک کار ازیں دو کار مے باید کرد
یا سر برضائے دوست می باید داد — یا قطع نظر زیار مے باید کرد

مولوی خیرالدین شیرکوٹی

ہم بتا چکے ہیں کہ سلطان محمد خاں سے صلح کے بعد مولوی خیرالدین شیرکوٹی کو لونڈ خوڑ میں متعین کر دیا گیا تھا۔ کاٹ لنگ اور اس پاس کے دوسرے مواضع بھی انھیں کی تحویل میں تھے۔ مولوی صاحب کے ساتھ کم و بیش ستر ہندوستانی اور قندھاری غازی تھے۔ انھیں تین جماعتوں میں بانٹا۔ قندھاریوں کو گاؤں کی شمالی مسجد میں ٹھہرایا۔ دوسری جماعت کو میر عبدالرحمٰن کی سرداری میں وسطِ دہ کی مسجد میں بٹھایا۔ تیسری جماعت اپنے ساتھ رکھی اور جنوبی مسجد میں مقیم ہوئے۔ لونڈ خوڑ اس زمانے میں بہت بڑا گاؤں بلکہ قصبہ تھا۔ اس کے ارد گرد ندیاں بہ رہی تھیں جن کی وجہ سے حفاظت کا قدرتی سامان ہو گیا۔ قصبے میں کم و بیش ایک سو دکانیں بنیوں کی تھیں اور چھ ملک تھے۔

مولوی صاحب نے حسنِ تدبیر سے تمام لوگوں میں ہر دلعزیزی پیدا کر لی اور وعظ و تذکیر سے انھیں شریعت کے پابند بنا دیا۔ تمام ملکوں کو جمع کر کے کہا کہ خود اپنے اپنے حلقے میں اجراء احکام الٰہی کے لیے سبقت کرو۔ مجھے مداخلت پر مجبور کیا تو آپ لوگوں کی برتری زائل ہو جائے گی۔ جو کام ضروری ہیں، ان میں آپ ہی لوگوں کا فائدہ ہے، مثلاً نماز، روزے کی پابندی، عُشر کی ادائگی، بالغ لڑکیوں کا نکاح اور ان کی رخصتی میں عجلت۔ ملک مولوی صاحب کے طرزِ عمل سے اتنے خوش ہوئے کہ سب مخلص معتقد بن گئے۔

حادثہ پشاور کی اطلاع

اس اثنا میں نور محمد قندھاری گڑھی امان زئی سے ایک خط لایا جس میں حادثہ پشاور کی کیفیت درج تھی یعنی یہ کہ مولوی مظہر علی صاحب، ان کے ساتھی غازی اور ارباب فیض اللہ خاں کو شہید کر ڈالا گیا۔ مولوی صاحب سے درخواست کی گئی تھی کہ لونڈ خوڑ سے امان زئی پہنچ جائیں تاکہ دونوں مقامات کے غازی یکجا بیٹھ کر ناسازگار حالات کا مقابلہ کر سکیں۔ مولوی صاحب کو یہ تجویز پسند نہ آئی۔ اس لیے کہ فتنہ و ہنگامہ کے دوران میں گڑھی امان زئی تک پہنچنا دشوار تھا۔ راستے

میں قدم قدم پر لڑائی کا خطرہ تھا اور غازیوں کے پاس بقدر کفایت سامان جنگ نہ تھا۔ اسی روز دوپہر کے وقت سید صاحب کا فرمان پہنچ گیا کہ کار ضروری در پیش ہے، آپ قاضی موضع کو قائم مقام بنا کر اور ایک ملک کو ساتھ لے کر پنجتار پہنچ جائیں۔

رفیقوں سے مشورہ اور ہدایات

مولوی صاحب نے اپنے تمام رفیقوں کو جمع کر کے سارے حالات بے کم و کاست بتا دیے۔ پھر کہا کہ آپ مجھے اپنا سردار سمجھتے ہیں۔ وقت بے حد نازک ہے۔ اس میں استقامت کی اشد ضرورت ہے۔ میری صرف ایک درخواست ہے کہ جو کچھ کہوں، اس پر بے چون و چرا عمل کرتے جائیں اور عقل دینے کی کوشش نہ کریں، اس لیے کہ جن حالات سے ہمیں سابقہ پڑا ہے، اس میں مختلف مشوروں سے طبیعت پراگندہ ہوتی ہے اور استقامت میں ضعف آتا ہے۔ اگر مجھ سے خدانخواستہ کوئی فعل خلاف مصلحت سرزد ہو گا تو اس کے لیے عنداللہ جوابدہ ٹھہروں گا۔ آپ لوگ ہوشیار ہو جائیں۔ ہتھیاروں کو ایک لمحہ کے لیے بھی بدنوں سے الگ نہ کریں۔ ہمارے جو بھائی شہید ہوئے، غفلت میں شہید ہوئے۔ ہم ستر آدمی ہیں، جب تک سیکڑوں کو نہ مار لیں گے، اپنا خون زمین کے حوالے نہیں کریں گے۔

میں مصلے پر بیٹھ کر ملکوں کو بلاتا ہوں۔ دو بندوقچی بندوقیں بھر کر میرے پیچھے ٹھہر جائیں۔ چار قرابین دار صحن مسجد کے نیچے رہیں۔ اگر ملک اپنے آدمیوں کو لے کر یورش کریں اور لڑائی چھڑے تو سب سے پہلے ملکوں کو مارا جائے۔ اگر وہ مسجد میں آ جائیں تو حتی الامکان انھیں باہر نہ نکلنے دیا جائے۔

ملکوں کی آمد

مولوی صاحب خود مصلے پر بیٹھ گئے۔ کچھ آدمی تحصیل زر کے لیے بازار میں بھیج دیے۔ کچھ آدمی ملکوں کو بلانے کے لیے ارسال کر دیے۔ تحصیل زر کا حکم سن کر ایک غازی نے کہا: مولوی صاحب! یہ کیا غضب کر رہے ہیں! تحصیل زر کا یہ کون سا موقع ہے؟ مولوی صاحب بولے: میں نے کہا نہیں تھا کہ مجھے عقل دینے کی کوشش نہ کرنا، جو کچھ کہوں کرتے جانا؟[1]

ملک آئے تو مولوی صاحب انھیں مسجد کے اندر لے گئے اور سید صاحب کے فرمان سے مطلع کرتے ہوئے کہا کہ یقینی طور پر تو معلوم نہیں، کون سا ضروری کام درپیش ہے۔ میرا خیال ہے کہ مداخیلوں پر لشکر کشی کا فیصلہ ہو چکا ہے اور مجھے پنجتار ہوتے ہوئے گڑھی چھتربائی پہنچنا چاہیے، جو میرا اصل مقام ماموری ہے، تاکہ مجاہدین کے لیے رسد اور دوسری ضروری چیزوں کا انتظام کر سکوں۔ آپ لوگ جس ملک

---

[1] اس تدبیر کا مدعا یہ تھا کہ گاؤں والوں پر ثابت ہو جائے غازی نہ ہراساں ہوئے، نہ ان کے عام انتظامات میں کوئی فرق آیا۔

کو میرے ساتھ بھیجنا چاہیں، اس کا فیصلہ ابھی کرلیں۔

انتظامات

ملکوں نے فیصلہ کیا کہ ملک صدرالدین ساتھ جائے۔ مولوی صاحب نے اسے مسجد ہی میں روک لیا۔ عصر سے مغرب تک ایک سو پچیس روپے عُشر کے جمع ہُوئے۔ پھر مولوی صاحب نے سارے انتظامات قاضی کے حوالے کیے۔ روانگی سے پہلے:

۱ ۔ جمع شدہ غلّے کا بڑا حصّہ ملکوں میں بانٹ دیا۔ صدرالدین کو دوہرا حصّہ دیا۔ جو غلّہ باقی بچا وہ پورا قاضی کے حوالے کرتے ہُوئے کہہ دیا کہ اگر ہم زندہ رہے تو واپس لے لیں گے، مارے گئے تو سارا غلّہ آپ کا ہوگا۔

۲ ۔ اطلاع ملی کہ وسطِ دیہ کی مسجد کے سامنے کچھ لوگ بہ ارادۂ فساد جمع ہو رہے ہیں۔ مولوی صاحب دو آدمی لے کر اس مسجد میں پہنچے۔ دیکھا تو واقعی مسجد کے ایک جانب چالیس پچاس بندوقچی بیٹھے تھے۔ ان سے بے باکانہ کہا کہ یہ تماشے کی جگہ نہیں، یہاں کیوں آئے؟ لڑنے کی خواہش ہے تو یقین رکھو کہ بُری طرح مارے جاؤ گے، عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوں گے۔ خیر اسی میں ہے کہ چپ چاپ چلے جاؤ۔ اپنے غازیوں سے کہا کہ ہتھیار سنبھال لو، ان لوگوں کی نیت بُری معلوم ہوتی ہے۔ مولوی صاحب کی یہ بے باکی دیکھ کر وہ لوگ منتشر ہو گئے اور مولوی صاحب اپنے آدمیوں کو بہ اطمینان نکال کر اپنے پاس لے گئے۔

۳ ۔ ملّا لعل محمد قندھاری کی جماعت کو بھی لانا چاہتے تھے لیکن کسی نے آکر بتایا کہ وہ پشاور روانہ ہو گئے۔ یہ حقیقت میں ملّا لعل محمد کی ایک تدبیر تھی جس کی کیفیت آگے چل کر معلوم ہوگی۔

۴ ۔ قاضی کو پشاور کے حادثے اور غازیوں پر جا بجا مفسدوں کی یورش کا علم ہو چکا تھا۔ مولوی صاحب سے کہا کہ ٹھہر جائیے، حفاظت میرے ذمّے ہے۔ جب تک میں خود اور میرا بھائی نہ مارے جائیں گے، آپ کو خفیف سا آزار بھی نہ پہنچے گا۔ مولوی صاحب نے ان کے اخلاص کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ کو مروا کر ہمیں کیا حاصل ہوگا؟ آج نکل جانا جتنا آسان ہے، اتنا کل نہیں رہے گا۔

روانگی اور منزلِ مقصود

رات کے وقت مولوی صاحب ملک صدرالدین کو ساتھ لے کر روانہ ہُوئے۔ ابتدا میں رُخ پنجتار کی طرف رکھا، جب کچھ مسافت طے ہو گئی تو دفعتہً "پڑان غار" کا رُخ کر لیا، جہاں پہنچنا نسبتہً سہل تھا، نیز وہاں کے ملک پر پورا بھروسا تھا۔ پنجتار پہنچنے میں کم از کم تین روز لگتے اور غازیوں کے پاس تین روز کی جنگ کا سامان نہ تھا۔ مولوی صاحب نے پہلے

ہی سے پڑان غار جانے کا ارادہ کر رکھا تھا لیکن جب تک لوند خوڑ میں رہے، کسی کو اس راز سے آگاہ نہ کیا۔ ملک صدر الدین بھی مولوی صاحب کی دانائی اور احتیاط کوشی پر حیران رہ گیا۔

رات موضع جلالہ کی ندی پہ بسر کی۔ صبح کے وقت وہاں کے رئیس کو بلایا اور بات چیت کی۔ سید صاحب کو اطلاع بھیجنی ضروری تھی۔ ایک طالب علم سے کتاب لی اور اس کے اندر کسی جگہ یہ سطریں لکھ دیں:

تا ایں جا (جلالہ) از فضل و کرم خدا	ہم خدا کے فضل و کرم سے یہاں تک
آمدیم و در پڑان غار مے رویم۔ آنجناب	پہنچ گئے ہیں اور پڑان غار جا رہے ہیں
دعا فرمائید کہ باز زیر قدم آنجناب حاضر	دعا فرمائیں کہ پھر آپ کے قدموں میں
شویم۔	حاضری نصیب ہو۔

سفر کے شدائد

جلالہ سے بھو کے روانہ ہوئے۔ ایک گاؤں ویرانے میں ملا تو وہاں کھچڑی پکوانی چاہی۔ دکانداروں سے معلوم ہوا کہ چاول نہیں ملتے۔ گاؤں کے ملک کو روپے دیے۔ وہ انتظامات میں لگ گیا تو معلوم ہوا کہ اس ملک نے درگئی سے لشکر منگایا ہے، خدا جانے کب آ جائے، پھر کیا پیش آئے۔ لہذا پھر بھوکے نکل پڑے۔ رات کے وقت اگلے گاؤں میں پہنچے۔ معلوم ہوا کہ وہاں کوئی خطرہ نہیں۔ مولوی صاحب نے غازیوں سے کہا کہ آپ آرام کریں۔ خود کھچڑی پکوائی، پک چکی تو سب کو جگا کر کھلائی۔

وہیں اطلاع ملی کہ ملا لعل محمد قندھاری مع جماعت دو کوس پر ایک موضع میں اترے ہیں۔ مولوی خیر الدین نے آدمی بھیج کر انھیں بھی بلا لیا اور کھچڑی کھلائی۔

ملا صاحب نے جب لوند خوڑ میں دیکھا کہ حالات ابتر ہو رہے ہیں اور لوگ فساد پر آمادہ ہیں تو اپنی جماعت کو لے کر یہ اعلان کرتے ہوئے نکل پڑے کہ اب سید صاحب پشاور پہنچ کر سلطان محمد خاں کی ملازمت کر لوں گا۔ جب گاؤں سے باہر پہنچے تو سوات کا راستہ اختیار کر لیا۔ غرض یہ تھی کہ سوات سے بونیر ہوتے ہوئے پنجتار پہنچ جائیں۔ موضع ٹوٹئی میں ٹھہرنے لگے تو لوگ فساد پر آمادہ ہو گئے۔ ناچار اپنے بیس ساتھیوں سمیت اس گاؤں میں پہنچے، جہاں سے مولوی خیر الدین نے انھیں بلایا۔

پڑان غار میں قیام

تمام غازی کھانا کھا چکے تو پھر چل پڑے۔ پڑان غار کے پاس ندی پر پہنچ کر باقی رات گزاری۔ صبح ہوئی تو ملک کو بلایا[1]۔ وہ آیا تو بولا: مولوی صاحب! آپ نے

---

[1] اس کا نام لعل محمد تھا۔

کیوں مجھے غیر سمجھا؟ میں تو حضرت امیر المومنین کا سچا ارادت مند ہوں۔ راستے میں کیوں ٹھہرے اور سیدھے گھر کیوں نہ چلے آئے جو میری طرح آپ کا بھی گھر تھا؟ پھر ساتھ گاؤں میں لے گیا۔ تمام غازیوں کو تین وقت کا کھانا اپنے ہاں سے کھلایا۔ پھر مولوی صاحب نے بہ اصرار اسے روک دیا اور سب میں معمول کے مطابق رسد بٹنے لگی۔ پورا ایک مہینا پڑان غار میں بسر ہوا۔ پھر سید صاحب کا حکم پہنچا کہ محمود خاں (ساکن تنگی) کو بھیجا جا رہا ہے، جس راستے سے ممکن ہو، اس کے ساتھ آجائیے[1]۔

سفرِ پنجتار

محمود خاں دس بارہ آدمی لے کر پہنچ گیا۔ مولوی صاحب نے غازیوں کو حکم دے دیا کہ دو روز کے لیے روغنی روٹیاں تیار کر لو۔ روانہ ہوئے تو ملک لعل محمد نے اپنے بھانجے کو بھی ساتھ کر دیا۔ پڑان غار سے گڑھی اور رنگ شاہ میاں پہنچے[2] تو بارہ آدمی پاؤں میں چھالے پڑ جانے کے باعث چلنے سے معذور ہو چکے تھے۔ انھیں گڑھی کے سید کی تحویل میں چھوڑ کر گھڑیالہ پہنچے۔ منصور خاں گاؤں سے باہر منتظر تھا، اس نے کہا کہ پہاڑ پر دور رہبر بٹھا رکھے ہیں، مصلحت اسی میں ہے کہ سفر جاری رکھا جائے اور قیام نہ کیا جائے۔ مولوی صاحب کو یہ بات اچھی معلوم نہ ہوئی۔ منصور خاں نے ازراہِ خلوص کہا کہ خفگی نہ فرمائیں، آپ بے شک ٹھہر جائیں۔ صبح میں بھی اہل و عیال کو لے کر ساتھ ہو جاؤں گا۔ اس لیے کہ جب اہل سمہ کو معلوم ہوگا، آپ نے رات میرے ہاں گزاری ہے تو میرے لیے یہاں رہنا غیر ممکن ہو جائے گا۔

مولوی صاحب نے سفر جاری رکھا۔ مزید پندرہ آدمی معذور ہو چکے تھے، انھیں منصور خاں کے پاس چھوڑ دیا۔ ساری رات سفر میں گزری اور صبح کی نماز تیمّم سے ادا کی۔ شیوہ کے پاس سے گزر رہے تھے تو وہاں کا ایک آدمی ملا، مولوی صاحب نے تفنناً اس سے کہا: اپنے گاؤں والوں کو میرا یہ پیام پہنچا دینا کہ لوند خوڑ کے جس مولوی کے انتظار میں تم نے راتیں گزاریں، وہ صرف ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ حوصلہ ہے تو اٹھو اور اسے پکڑ لو، ورنہ عمر بھر حسرت میں مبتلا رہو گے۔

ایک گھڑی دن چڑھے فتح خاں پنجتاری کے گاؤں میں پہنچ گئے۔ سید صاحب نے پنجتار سے نکل کر درے میں استقبال کیا۔ مولوی خیر الدین اور ان کی جماعت کے لوگوں کو "زندہ شہید" کا لقب ملا۔

---

[1] محمود خاں سید صاحب کا مخلص مرید تھا۔ رنج و راحت میں برابر شریک رہا۔ بالاکوٹ کے معرکے میں شامل نہ ہو سکا۔ سید صاحب نے مولوی صاحب کو پڑان غار سے لانے کے لیے مولانا اسماعیل کے ساتھ مشورہ کیا تھا تو انھوں نے عرض کیا تھا کہ یہ سفر خالی از خطرہ نہیں۔ بہتر ہے مولوی صاحب کو ادھر ہی سے ہندوستان بھیج دیا جائے۔ محمود خاں نے حفاظت کا ذمہ اٹھا لیا تو سید صاحب نے انھیں پنجتار بلا لیا۔

[2] یہ لوند خوڑ سے دو کوس پر تھا۔ معلوم ہوا کہ اب وہاں کوئی گاؤں نہیں۔

مولوی صاحب کی دانشمندی، معاملہ فہمی، ہمّت اور استقامت کا اندازہ کیجیے۔ اتنے نادر اوصاف کا جامع کس جماعت اور قوم کے لیے زیادہ سے زیادہ عزّت و شرف کا باعث نہ ہوگا۔

سدم کے حالات

حاجی محمود خاں اور حاجی بہادر شاہ خاں کو سید صاحب نے جب تحصیل عُشر کے لیے مقرر فرمایا تھا تو یاد ہوگا کہ مولانا شاہ اسماعیل نے اس سے اختلاف کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ کام تدبیر و دانشمندی کا ہے، شجاعت کا نہیں۔ ایسے آدمیوں کو مقرر کرنا چاہیے جو صاحب تدبیر و دانش ہوں۔ حاجی بہادر شاہ خاں اسماعیلہ میں شہید ہو چکے تھے۔ حاجی محمود خاں پندرہ غازیوں کے ساتھ سدم میں مقیم تھے۔ بلوا ہُوا تو محمود خاں اپنی جماعت کو لے کر گاؤں سے باہر ندی پر جا ٹھہرے۔ گاؤں والے انھیں دور سے آوازیں دیتے تھے، قریب کوئی نہیں آتا تھا۔ اس اثنا میں مبین خاں رئیس سدم بھی پہنچ گیا۔ اسی نے اسماعیلہ میں حاجی بہادر شاہ خاں کو شہید کرایا تھا۔ حاجی محمود خاں کے پاس بیٹھ کر ریاکاروں کی طرح اظہار اخلاص کرنے لگا اور بولا: دن کو تو ممکن نہیں، ذرا ٹھہر جائیے، رات کو پنجتار پہنچا دوں گا۔ محمود خاں اس کے فریب میں آگئے اور جس دام بلا سے رہائی پا چکے تھے، اس میں خود دوبارہ جا پھنسے۔

سنگ دلی کی حد ہو گئی

غازی گاؤں میں پہنچ گئے تو مبین خاں نے چکنی چپڑی باتیں کر کرکے ان کے ہتھیار بھی لے لیے۔ سب نہتے ہوگئے تو ایک دم ان پر ہلّہ بول دیا۔

مولوی سیّد جعفر علی نقوی لکھتے ہیں:

ہر کسے را بہ بے رحمی تمام بزخمہائے	ہر شخص کو تلوار اور چھُری سے بے دردانہ
شمشیر و کارد تمام ساختند۔ بعضے را	شہید کر ڈالا۔ بعض کو بھیڑوں اور بکریوں
برزمیں غلطانیدہ چوں میش و بُز ذبح کردند	کی طرح زمین پر لٹا کر ذبح کر دیا گیا۔ مثلاً
چنانکہ عظیم اللہ خاں برادر حاجی محمود خاں	عظیم اللہ خاں برادر حاجی محمود خاں کو
را پدر زوجۂ شاں بر سینہ سوار شدہ ذبح نمود۔	اس کے خسر نے چھاتی پر بیٹھ کر ذبح کیا۔
ہمہ ایں گروہ قربان راہ مولائے حقیقی	اس طرح یہ گروہ اپنے مولائے حقیقی کی
شدند[1]	راہ میں قربان ہوگیا۔

حیرت اس بات پر ہے کہ حاجی محمود خاں سدم والوں کے ہم قوم تھے۔ اسی وجہ سے ان کے بھائی

---

[1] منظورہ صفحہ ۱:۴۴

نے سدم میں شادی کی تھی۔ لیکن سنگ دلی ملاحظہ ہو کہ خسر نے چھری لے کر اپنے داماد کو ذبح کیا اور بیٹی کو بیوہ بنایا۔ ستر آدمیوں میں سے صرف دو اس طرح بچے کہ بھاگ کر ایک بڑھیا کے گھر میں گھس گئے۔ اس نے از راہ خدا ترسی انھیں بھس میں چھپا دیا۔ بعد میں وہ راتوں رات پنجتار پہنچ گئے اور یہ خونچکاں داستان سنائی۔ سدم کے شہدا میں سے صرف مندرجہ ذیل کے نام معلوم ہو سکے:

حاجی محمود خاں، ان کا بیٹا یوسف خاں، بھائی عظیم اللہ خاں، دو بھتیجے برہان الدین اور عبد الوہاب، کریم بخش جراح، استاد خدا بخش پھکیت (ساکن منجھاؤں)۔

حافظ الٰہی بخش کی سرگزشت

مظلوم غازیوں میں سے ایک حافظ الٰہی بخش تھا۔ صرف تیرہ چودہ برس کی عمر، قرآن کا حافظ، اپنے ماموں انور خاں کے ساتھ کسی گاؤں میں ٹھہرا ہوا تھا، جس کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ دونوں آرام سے سو رہے تھے کہ دفعۃً نقارہ بجا۔ نوعمر بھانجے نے ماموں کو جگایا۔ نور خاں دریافت حالات کے لیے باہر نکلا۔ بلوائیوں کا شور سُن کر بھانجے کو آواز دی کہ میری تلوار دو۔ تلوار پہنچنے سے پیشتر شیر دل غازی کا جسم خاک و خون میں لوٹنے لگا۔ ایک شقی نے نوعمر حافظ کے سر پر تلوار ماری۔ دوسرے نے اسے روک دیا اور کہا کہ یہ حافظ قرآن ہے، میں اسے غلام بناؤں گا[1]

اس طرح الٰہی بخش کی جان بچ گئی۔ بچانے والا اسے اپنے گھر لے گیا اور بچوں کو قرآن پڑھانے پر مامور کر دیا۔ الٰہی بخش پشتو خوب سمجھتا تھا لیکن یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس کے سر پر زخم تھا۔ جس جراح کو علاج کے لیے مقرر کیا گیا، وہ بدبخت ایسا مرہم لگاتا رہا جس سے زخم اچھا ہونے کے بجائے بگڑتا جائے۔

سید صاحب کے پاس پہنچنے کی تدبیر

حافظ جس دن سے ان ظالموں کے قبضے میں آیا تھا، برابر تدبیریں سوچتا رہا کہ کس طرح نجات حاصل کروں۔ قرآن پڑھنے کے لیے ایک بالغ شاگرد بھی اس کے پاس آتا تھا۔ اس کے اخلاص کا اندازہ کرکے اپنا ہم راز بنایا۔ پانچ روپے اجرت طے کی۔ موقع پا کر اس کی رہنمائی میں سدم سے نکلا۔ سید صاحب اس زمانے میں پنجتار سے ہجرت کرکے راج دواری پہنچ چکے تھے۔ حافظ الٰہی بخش وہیں خدمت میں حاضر

---

[1] سید صاحب کے سامنے یہ واقعہ بیان ہو رہا تھا۔ راوی جب ان الفاظ پر پہنچا تو حضرت نے فرمایا: او را الٰہی بخش، غلام خدا است [illegible] (منظورہ صفحہ [illegible])

ہُوا اور اپنی اسیری کی کہانی سُنائی۔

سر کا زخم بدستور تھا۔ سید صاحب نے اسی وقت نور بخش جراح کو علاج کا حکم دیا۔ جراح نے زخم دیکھا تو کہا کہ پہلے معالج نے بدخواہی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ سر کی ایک ہڈی خراب ہو چکی ہے، اسے کاٹے بغیر زخم اچھا نہیں ہو سکتا۔ الٰہی بخش نے صبر و سکون کے ساتھ ہڈی کٹوائی اور پٹی بندھوائی۔ جب غازیوں نے اسے اٹھا کر بستر پر پہنچانا چاہا تو انکار کر دیا کہ میرے پاؤں زخمی نہیں، جو اٹھانے کی ضرورت ہو۔ تھوڑی دیر بستر پر لیٹا رہا۔ پھر خود چل کر ایک ایک غازی کے ڈیرے پر گیا اور سب سے ملا۔ تمام غازی اس نوعمر کی جرأت اور تحمّل شدائد پر حیران تھے۔

سیّد صاحب کی تربیت

یہ لوگ تھے جو سید صاحب کی صحبت میں تیار ہُوئے تھے۔ تیرہ چودہ برس کا لڑکا اس کی دانائی اور دُور اندیشی پر غور کیجیے کہ دشمنوں کے درمیان مہینے گزار دیے۔ ان سب کے راز معلوم کرتا رہا اور اپنا کوئی راز ان پر ظاہر نہ ہونے دیا، بلکہ انھیں یہ بھی پتا نہ لگ سکا کہ حافظ ان کی ساری باتیں سمجھتا ہے۔ ہمّت و استقامت کو سامنے لائیے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے اصل مرکز سے غافل نہ ہُوا۔ مشکلات کے باوجود اس ارادے پر قائم رہا کہ جلد سے جلد سید صاحب کے پاس پہنچ جائے۔ پھر خود ہی رہبر کا انتظام کیا۔ ایک نوعمر بچے کے لیے یہ اندازہ کر لینا سہل نہ تھا کہ جس شخص کو رہبری کے لیے چنا گیا ہے، ضبطِ راز کی صلاحیت میں اس کا پایہ کیا ہے؟ تحمّل شدائد کی ہمّت دیکھیے کہ سر پر گہرا زخم لگا اور اسے برداشت کر لیا۔ سدم سے راج دواری تک کٹھن سفر سے نہ گھبرایا۔ سر کی ہڈی کاٹی گئی اور اُف تک نہ کی۔ غازیوں نے اٹھا کر بستر پر لٹانا چاہا تو بولا اس کی ضرورت نہیں اور خود بستر پر گیا۔ پھر ذرا آرام کر کے سب سے ملا۔ مسلمانوں کی کتنی بدنصیبی تھی کہ ان اخلاق اور ان اوصاف کے مجاہد اہلِ سرحد کی جہالت، نادانی، تنگ نظری اور شقاوت کے باعث بے دردی سے موت کے گھاٹ اُترے:

آتش بہ دو دست خویش در خرمنِ خویش　　چوں خود زدہ ام چہ نالم از دشمنِ خویش
کس دشمنِ من نیست، منم دشمنِ خویش　　اے وائے من و دستِ من و دامنِ خویش

مرقعِ عبرت

المیہ مشہد اکبر کے یہ چند خونچکاں اوراق تھے جو محفوظ رہ گئے اور اس وجہ سے ہم تک پہنچ سکے کہ بعض غازی محض بر حسنِ اتفاق مقتل سے بچ گئے۔ دسیوں یا بیسیوں ایسے مقامات تھے، جہاں کا ایک غازی بھی زندہ نہ بچا اور ان پر جو قیامت گزری، وہ معرضِ بیان و تسوید ہی میں نہ آ سکی۔

مولوی سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں:

وقت عشا بعضے را در نماز و بعضے را در تہیہ آں مثل طہارت وغیرہ، گرداگرد شاں محیط شدہ قتل آغاز نہادند۔ و در بعضے دیہ وقت نیم شب و در بعض قبل از فجر یا در عین صلوۃ فجر قتل ساختند۔ کم کسے بود کہ فرصت یافتہ فرار نمود یا در جاے محفوظ خزید[1]

عشا کے وقت بعض نماز میں مشغول تھے، بعض نماز کی تیاری کے سلسلے میں طہارت وغیرہ کر رہے تھے کہ ان کے گرد گھیرا ڈال کر کشت و خون کا آغاز کر دیا۔ بعض دیہات میں آدھی رات کو، بعض میں نماز فجر سے پیشتر یا عین حالت ادائے نماز میں غازیوں کو قتل کر ڈالا گیا۔ کم لوگ تھے جو فرصت پا کر بھاگ سکے یا کسی محفوظ جگہ گھس سکے۔

شقاوت کی انتہا یہ ہے کہ شہیدوں کی لاشوں کو گھوڑوں کے پاؤں تلے روندتے اور کہتے کہ اٹھو نماز کی تاکید کرو یا عشر لو۔ سید صاحب نے یہ حالات سنے تو فرمایا:

نعوذ باللہ، اہل سمہ کلمہ گو ہستند۔ جز ایں دو کلمہ یعنی نماز و اخذ عشور وقت دوانیدن دواب بر جثہ ہاے ایشاں دیگر نمے گویند۔ معلوم شد کہ ہمیں امور شرعیہ بر دل ایشاں، شاق بود کہ از راہ دغا بر سر خفتگاں تاخت نمودہ کشتند۔

نعوذ باللہ اہل سمہ نمازیوں کے جثوں پر گھوڑے دوڑاتے وقت یہی دو باتیں کہتے تھے یعنی نماز اور عشر حالانکہ کلمہ گو تھے۔ معلوم ہوا یہی دو شرعی باتیں ان پر شاق تھیں کہ سوئے ہوئے غازیوں پہ حملہ کرکے انھیں مار ڈالا۔

شہدا کی تعداد کچھ معلوم نہیں کہ جو غازی اس ہنگامۂ جنون میں واصل بحق ہوئے، ان کی تعداد کیا تھی۔ میں نے ہر چند زیادہ سے زیادہ قرین صحت اندازے کی سعی کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا، اس لیے کہ پورے نام نہ مل سکے۔ تعداد سے کہیں بڑھ کر یہ امر دردناک ہے کہ جتنے مارے گئے، سید صاحب کے قول کے مطابق ان میں سے ہر ایک اپنے وطن کی انسانیت و اسلامیت کا "خلاصہ" اور "لب لباب" تھا۔

---

[1] منظورہ صفحہ ۱۰۰۳

تینتیسواں باب

عزمِ ہجرتِ ثانیہ

اہلِ سمہ سے بیزاری

سید صاحب صبر و حلم کے پیکر تھے۔ حالات کی ناسازگاری یا شدائد کے ہجوم سے کبھی متاثر نہ ہوئے، لیکن اہلِ سمہ کی شقاوت و بدعہدی نے ان کے قلب صافی پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ اُس ملک میں قیام سے بیزار ہو گئے۔ اگر وہ ملک و جاہ کے خواہاں ہوتے تو بقیۃ السیف غازی باغیوں سے سخت انتقام لینے کے لیے بالکل کافی تھے۔ خود اہل سمہ کی یہ حالت تھی کہ بلوے کے بعد جب انھیں یہ معلوم ہُوا کہ سید صاحب پنجتار میں سلامت ہیں تو ان پر سخت خوف طاری ہو گیا کہ خدا جانے اب کیسی سخت سزا ملے۔ ارباب بہرام خاں نے ایک روز عرض کیا کہ اجازت ہو تو لشکر اور توپ لے کر نکل جاتا ہُوں۔ سارے دیہات حسب سابق مطیع و فرمانبردار بن جائیں گے اور انشاء اللہ لڑائی کی بھی نوبت نہیں آئے گی۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ہم ابتدا میں یہاں آئے تھے تو ان لوگوں کے حالات سے پورے واقف نہ تھے۔ مدت تک وعظ و نصیحت کرتے رہے۔ جب اس طرح کوئی نتیجہ نہ نکلا تو حاکمانہ فہمایش کا طریقہ اختیار کیا۔ ہمارا مدعا اجراے احکام دین کے سوا کچھ نہ تھا، لیکن یہ طریقہ بھی بے اثر رہا:

> نیت ما ازیں سیاست، طلب ملک و جاہ نہ بود۔ غیر از تادیب عباد و تہذیب شاں مقصودے دیگر نہ داشتیم لہذا ایشاں را بہ انصاف منتقم حقیقی مے گذاریم و خود با بقیہ رفقا راہِ ملکِ دیگرے گیریم۔ زیرا کہ چوں از وطن خود ہجرت نمودیم ہر کجا کہ مردم صادق القول خواہم یافت، قیام خواہم نمود، انحصار بر ایں دیار نیست[1]

> اس سیاست سے ہماری غرض یہ نہ تھی کہ صاحب ملک و جاہ بن جائیں۔ محض اللہ کے بندوں کی تادیب و تہذیب چاہتے تھے۔ اب ہم انھیں منتقم حقیقی کے انصاف پر چھوڑتے ہیں اور بقیہ رفیقوں کے ساتھ دوسرے ملک کا راستہ لیتے ہیں۔ ہم اپنے وطن کو چھوڑ چکے ہیں، جہاں کہیں صادق القول لوگ مل جائیں گے مقیم ہو جائیں گے، اس ملک پر انحصار نہیں۔

---

[1] منظورہ صفحہ ۱۰۰۲۔

فتح خاں پنجتاری

فتح خاں پنجتاری بلوے کے دنوں میں باہر تھا۔ اس اثنا میں اس کے ہم قوموں کے غول پنجتار کے آس پاس آ بیٹھے۔ پوچھا کہ کیوں آئے ہو؟ جواب ملا: غازیوں کی حفاظت کے لیے۔ غازیوں کے دل میں طبعاً وسوسہ پیدا ہوا کہ ان کی نیت نیک نہیں۔ فصیل کی دیوار کہیں کہیں سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ غازیوں نے سید صاحب سے اجازت لے کر اس کی مرمت کر لی نیز پھلاہ کے درخت پنجتار کے آس پاس بہت زیادہ تھے، انھیں کاٹ کاٹ کر فصیل کے ساتھ ساتھ خار بندی کا انتظام کر لیا۔

فتح خاں واپس آیا اور سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو غازیوں نے اس سے ہتھیار رکھوا لینے چاہے لیکن آپ نے ارشاد فرمایا ہتھیاروں سمیت آنے دو۔ وہ سامنے آیا تو پوچھا کہ آپ کی قوم کے لوگ کیوں جمع ہوئے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ آپ کی حفاظت مقصود ہے۔ فرمایا: انھیں رخصت کر دیجیے۔ چنانچہ فتح خاں نے سب کو واپس بھیج دیا۔

مخلصین کا اجتماع

سید صاحب اگرچہ سمہ سے چلے جانے کا فیصلہ کر چکے تھے، لیکن چاہتے تھے کہ ایک مرتبہ ان لوگوں سے یہ تو پوچھ لیں کہ غازیوں کو کس گناہ میں بے دردانہ ذبح کیا گیا؟ چنانچہ آپ نے فتح خاں سے کہا کہ جو مخلص خوانین ورؤسا ہنگامۂ قتل سے الگ رہے، ان سب کو دعوت دے کر بلا لیجیے تاکہ ہم دریافت کر لیں، یہ کشت و خون کیوں روا رکھا گیا؟ اگر کوئی قصور ہمارا سرزد ہوا تو اس سے آگاہ ہو کر توبہ کر لیں۔ مندرجہ ذیل اصحاب کو دعوت نامے بھیجے گئے:

۱۔ سید اسعد میاں (تختہ بند)
۲۔ سید رسول (ناواگئی)
۳۔ سید اعظم (ناواگئی)
۴۔ سید شاہ رندان (منگل تھانہ)
۵۔ اخوندزادہ قابل (منگل تھانہ)
۶۔ قاضی سید امیر (کوٹھا)
۷۔ فتح خاں (زیدہ)
۸۔ ابراہیم خاں (کھلابٹ)
۹۔ منصور خاں (گھڑیالی)
۱۰۔ محمود خاں (تنگی)

سید اکبر شاہ ستھانوی کو بھی بلانے کی تجویز تھی لیکن سید صاحب نے فرمایا کہ وہ ہمارے ہی کام میں مصروف ہیں، انھیں تکلیف نہ دی جائے۔

بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلُوْا

تین چار روز میں یہ اصحاب آ گئے۔ سید صاحب نے تاکید فرما دی کہ مہمانداری میں کوتاہی نہ ہو، بلکہ حکم دے دیا کہ اگر بلوائیوں میں سے بھی کچھ لوگ آ جائیں تو ان سے تعرض نہ کیا جائے۔ پھر ایک مفصل تقریر فرمائی، جس کا مفاد یہ تھا:

جب ہم جہاد فی سبیل اللہ کی تدبیر کے لیے وطن سے آئے تھے، تو یہاں کے خوانین و رؤساء میں نااتفاقی اور فتنہ داری تھی۔ سب ایک دوسرے کے جانی دشمن بنے ہوئے تھے اور اتفاق کے بغیر جہاد ممکن نہ تھا۔ ہم نے ایک مدت تک للّٰہ فی اللہ ان کے درمیان میل ملاپ کی کوشش کی۔ ان سب نے برضا و رغبت ہمارے ہاتھ پر بیعت کی اور ہمیں امام بنایا۔ ہم سے عہد و پیمان کیے۔ شریعت کا حکم قبول کیا۔ ان کی خواہش کے مطابق قاضی مقرر کیے گئے۔ خود عُشر دینا قبول کیا۔ خود تحصیلدار مقرر کرائے۔ پھر اچانک دشمن بن گئے۔ نہ کوئی استغاثہ ہمارے پاس پہنچا، نہ کوئی شکایت گوش زد ہوئی۔ دفعۃً اُٹھ کر غازیوں کو قتل ڈالا۔

اس کا سبب اصلاً معلوم نہ ہوا۔ ہماری اس بات کا جواب آپ بھائی سوچ سمجھ کر دیں۔

سید میاں کا دورہ برائے تحقیق

یہ تمام اصحاب ایک روز باہم صلاح مشورے کرتے رہے۔ پھر عرض کیا کہ ہم سب متحیر ہیں اور کچھ خبر نہیں کہ کیوں یہ معاملہ پیش آیا؟ نہ ہم نے مفسدوں کا ساتھ دیا اور نہ ان کے مشوروں میں شریک تھے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ آپ ان لوگوں سے معلوم کر کے ہمیں آگاہ کریں۔ اس غرض کے لیے سید، سید میاں ساکن تختہ بند تجویز ہوئے، جو اس مجلس میں سب سے ممتاز اور پورے علاقے میں محترم سمجھے جاتے تھے۔ ان سے کہا گیا کہ رزڑوں کی بستیوں میں جا کر حقیقی حالات کی تحقیق فرمائیں گے۔

ارباب بہرام خاں کے اہل و عیال شیوہ میں تھے۔ آنند خاں اور مشکار خاں نے دورانِ بلوا میں انھیں اپنی حفاظت میں لے لیا تھا۔ سید صاحب نے اخوند قابل کو سید میاں کے ساتھ بھیج دیا کہ لوٹتے وقت ارباب کے اہل و عیال کو ساتھ لیتے آئیں۔

سید میاں نے رزڑوں کی بستیوں کے سرکردہ آدمیوں کو جمع کر کے پوچھا کہ سچ سچ بتاؤ کیا معاملہ ہوا؟ کیوں تم نے یہ ناشائستہ حرکت کی؟ یہ بھی بتا دیا کہ سید صاحب کا تم کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ انھوں نے بدھ سنگھ، یار محمد خاں اور سلطان محمد خاں کو شکستیں دیں۔ وہ توپخانہ اور لشکر لے کر نکلیں گے تو تم ان کا مقابلہ نہ کر سکو گے۔

مجرموں کے بیانات

وہ بڑے نادم و پریشان تھے۔ بعض نے کہا کہ ہم پر سختیاں ہوتی تھیں۔ معمولی قصوروں پر بے عزت کیا جاتا تھا۔ ہماری بہنوں اور بیٹیوں کے نکاح جبراً کرائے جاتے تھے [illegible] ان تمام عذروں

کو باطل قرار دیتے ہوئے کہا کہ نکاحوں کے معاملے میں اصرار کا مدعا یہ تھا کہ تم لوگ بہنوں اور بیٹیوں کو روپے کی خاطر بڑی عمروں تک بٹھا رکھتے تھے۔ یہ اصرار عین شریعت کے مطابق تھا اور تمام نکاح قوم میں ہوتے رہے۔ باقی رہا سزاؤں کا معاملہ تو ہر حاکم رعایا کے قصوروں کے مطابق جُرمانے بھی لیتا ہے، زد و کوب بھی کرتا ہے اور قید کی سزا بھی دیتا ہے۔ چند لوگوں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اقرار کر لیا کہ ہمارے پاس سلطان محمد خاں کی طرف سے خط آئے تھے کہ ہندوستان کے علما نے ہندوستانی غازیوں کو بدعقیدہ اور انگریزوں کے جاسوس قرار دیا ہے۔ یہ تمھارا ملک بھی چھنوا دیں گے اور دین و مذہب کو بھی خراب کریں گے۔

یہ خطوط اسی محضر کی نقل تھے جو سلطان محمد خاں نے پشاور میں سید صاحب کے ساتھ ملاقات کے موقع پر پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ مجھے اس محضر نے غلط فہمی میں ڈالا۔ گویا جس چیز کو وہ خود غلط اور بے سر و پا مان چکا تھا، اسی کو ایک مستند شے قرار دے کر اس نے سارے سمہ میں گمراہی کی آگ لگائی۔

قصدِ ہجرت

پانچ چھ روز کے بعد اخوند زادہ قابل، ارباب بہرام خاں کے اہل و عیال کو ساتھ لے کر واپس آیا اور سارے حالات سید صاحب کی خدمت میں عرض کیے تو آپ کے دل کو بڑا صدمہ ہوا۔ فرمایا: کچھ اُوپر چار برس ہم ان لوگوں کی اصلاح میں لگے رہے۔ وعظ و نصیحت کی۔ ان کے دین اور دنیا کی بھلائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، لیکن یہ لوگ اتنے سخت دل اور ہدایت سے بے بہرہ ہیں کہ کچھ اثر نہ ہوا۔ اب ہم کس کس سے بدلہ لیں؟ بہتر یہی ہے کہ ان کا معاملہ خدا کے سپرد کریں۔ وہ منتقمِ حقیقی جس طرح چاہے انتقام لے۔ سلطان محمد خاں پر حیف ہے کہ اس نے خود سب کچھ ہمیں بتایا اور عذر کیا کہ غلطی ہوئی، معاف کر دیجیے۔ بعد ازاں اسی بہتان نامے کو دستاویز بنا کر صدہا مسلمانوں کا ناحق خون کرایا۔ اس سے تو اس کا بھائی دوست محمد خاں ہی اب تک اچھا رہا کہ نہ ہم سے بھلائی کی اور نہ بُرائی۔ ایسے لوگوں میں رہنا اچھا نہیں، یہاں سے ہجرت کر کے جدھر اللہ چاہے گا چلے جائیں گے۔

ملا شیر اور مولوی خیر الدین

قصدِ ہجرت نے شہرت پائی تو قاضی سید محمد حبان شہیدِ مردان کے استاد ملا شیر سید صاحب کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میرے نزدیک یہاں سے ہجرت شرعاً جائز نہیں۔ اہلِ سمہ کا گناہ زیادہ سے زیادہ کبیرہ ہے، کفر کی حد تک نہیں پہنچتا۔ پھر ہجرت کے لیے کون سی وجہ جواز ہے؟ پہلے مولانا شاہ اسماعیل نے پھر سید صاحب نے ان سے گفتگو کر کے مطمئن کر دیا۔[1]

---

[1] منظورہ ۱۰۴۸-۱۰۵۱۔ اس سے ظاہر ہے کہ مولانا شاہ اسماعیل بھی ہجرت کے ارادے میں سید صاحب کے ہم نوا تھے لیکن گفتگو کی تفصیل کہیں نظر سے نہیں گزری۔

مولوی خیر الدین شیر کوٹی پڑان غار سے پنجتار پہنچے تو ہجرت کا عام چرچا تھا۔ ایک روز انھوں نے سید صاحب سے گفتگو کی۔ شیخ ولی محمد بھی پاس تھے۔ عرض کیا کہ میرے نزدیک موجودہ مقام کو چھوڑنا قرین مصلحت نہیں۔ اگر کسی دوسرے علاقے میں جائیں گے تو پہلے تو یہی امر مشتبہ ہے کہ وہاں کے لوگ ہمارے قیام پر راضی ہوں گے یا نہیں، پھر انھیں وعظ و نصیحت سے قیام جہاد پر آمادہ کرنے میں عمر بسر ہو جائے گی۔ اہل سمہ کو دوبارہ راہ راست پر لانا سہل ہے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ یہاں ٹھہرنے کی کوئی صورت نہیں۔ اہل سمہ کی مخالفت ظاہر ہو چکی۔ پشت پر سوات ہے، وہ لوگ بھی مخالف ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ فتح خاں پنجتاری کے متعلق بھی تو اطمینان نہیں۔

سید صاحب کا ارشاد

مولوی صاحب نے کہا کہ فتح خاں یا اس کے پنجتار کے ہم محتاج نہیں۔ اگر مجھے سدم کا غلہ عنایت فرمائیں تو اس سے لشکر کا سر و سامان کر کے اہل سمہ سے سمجھ لوں گا۔ سید صاحب نے فرمایا:

آنچہ شما می گوئید شدن مے تواند،	آپ جو کچھ کہتے ہیں، یہ ہو سکتا ہے
اما مرا ازیں مرداں چناں نفرت است	لیکن مجھے ان لوگوں سے ایسی نفرت ہے
کہ کسے را از قے خود نفرت مے باشد۔	جیسے کسی کو اپنی قے سے نفرت ہوتی
ہم چنیں از نشستن در ملک اینہا	ہے۔ میں ان کے ملک میں قیام سے
نفورم پس ایں را چہ علاج است؟	بھی اسی طرح نفور ہوں۔ اس کا کیا علاج
	ہو سکتا ہے؟

نیز فرمایا کہ یہاں مخلص کم ہیں اور مفسد زیادہ۔ ایک دفعہ دغا کھانے کے بعد متنبہ نہ ہونا ہوشیاری سے بعید ہے۔ لا یلدغ المومن من جحرٍ واحدٍ مرتین۔

یہ اس بزرگ ہستی کے الفاظ تھے جس کا وجود سراپا محبت تھا۔

بعض دوسرے لوگوں کی طرح مولوی خیر الدین کی رائے بھی یہ تھی کہ رضاکارانہ جہاد پر انحصار کے بجائے سپاہی ملازم رکھے جائیں۔ چنانچہ مولوی صاحب نے یہ بھی کہا کہ میں جانتا ہوں آپ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا عہد ہے۔ آپ للّٰہی جہاد چاہتے ہیں اور اسی کی تلقین فرماتے ہیں۔ اس طرح اگر ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہو جائیں تو البتہ بخوبی جہاد ہو سکے گا۔ نوکر رکھنے سے ہمیشہ آپ کو نفرت رہی۔ اگر رکھے بھی تو پھر موقوف کر دیے۔ کیا اب بھی آپ کو یہی امید ہے کہ نوکر رکھے بغیر جہاد ہو سکے گا؟ فرمایا میں تو یہی کروں گا خواہ تنہا رہ جاؤں۔[1]

---

[1] منظورہ صفحہ ۱۰۴۶

فتح خاں پنجتاری کو جواب

فتح خاں اس پورے زمانے میں بالکل متذبذب رہا؛ اسے یہ بھی پسند نہ تھا کہ سید صاحب پنجتار سے چلے جائیں، لیکن یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر سید صاحب بیٹھے رہے تو سارے اہل سمہ سے عداوت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ ایک روز اس نے بھی ہجرت کی مخالفت کی تو سید صاحب نے فرمایا: اپنی قوم سے پوچھیے کہ ہم کس بنا پر انھیں صادق القول تسلیم کر لیں؟ ہزاروں لوگ اپنے عہد و قرار سے پھر گئے اور غازیوں کی لاشوں کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا جس کی امید کفار سے بھی نہ تھی۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ آپ لوگ کلمۂ توحید بھی محض عادۃً پڑھتے ہیں:

پس مارا ضرور است کہ دوائے دل	پس ضروری ہے کہ ہم اپنے دل
خود بکنیم کہ شک از جانب کلمہ گویاں از	کی دوا کریں تا کہ کلمہ گویوں کی طرف سے
دل ما زائل شود[1]	شک زائل ہو جائے۔

راستے کا مسئلہ

اس اثنا میں زبردست خاں مظفر آبادی، ناصر خاں بھٹ گرامی، حبیب اللہ خاں سواتی، عبدالغفور خاں اگروری اور راجا نجف خاں خان پوری کی طرف سے پے در پے عرضیاں پہنچیں اور سید صاحب نے پکھلی جانے کا ارادہ فرما لیا۔ چونکہ توپیں اور بھاری ساز و سامان پہاڑی راستے سے نہ جا سکتا تھا، اس لیے مینئی اور کھبل کے راستے جانا چاہتے تھے۔ فتح خاں پنجتاری سے کہہ کر راستے کے تمام مواضع کو خط لکھوا دیے کہ محض گزرنے کی اجازت دے دی جائے۔ فتح خاں نے بطور خود بھی بڑی کوشش کی؛ لیکن وہ سب شامت اعمال سے خوفزدہ تھے۔ سمجھتے تھے کہ سید صاحب ساز و سامان اور لشکر لے کر آ گئے تو ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑیں گے؛ لہٰذا اجازت نہ دی۔ ناچار سید صاحب کو دشوار گزار کوہستانی راستہ اختیار کرنا پڑا۔

سید صاحب کا خطبہ

جب تمام مراتب طے ہو چکے تو ایک روز غازیوں کو جمع کر کے خطبہ ارشاد فرمایا جو آپ کی حیات طیبہ کے مقاصد کا ایک جامع مرقع ہے، اس لیے

---

[1] واضح رہے کہ سید صاحب کو تنخواہ دار سپاہی رکھنے سے اختلاف نہ تھا، لیکن اس غرض کے لیے جن وسائل کی ضرورت تھی وہ ملک و جاہ کے بغیر میسر نہ آ سکتے تھے۔ نیز سید صاحب مسلمانوں میں دینی جذبہ بیدار کرنا چاہتے تھے۔ جن حالات سے وہ گزر رہے تھے ان میں صحیح راہ عمل وہی تھی، جو اختیار کی۔ اہل سمہ کو بزور لشکر مطیع کیا جا سکتا تھا، لیکن نتیجہ یہ ہوتا کہ لامتناہی کشت و خون شروع ہو جاتا اور پوری قوت مسلمانوں کو زیر رکھنے میں خرچ ہو جاتی۔

اسے من و عن یہاں درج کیا جاتا ہے۔ فرمایا :

مسلمانو! اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس عبادت میں شریک کیا اور اپنی رضا کے راستے میں گرم و سرد اور فتح و شکست کو برداشت کر لینے کی توفیق بخشی۔ آپ نے سعی و نصرت اور شراکت کا حق ادا کیا۔ اب ہم اس ملک سے ایک دور دست علاقے کا قصد کر چکے ہیں، معلوم نہیں کہاں جائیں۔ سفر کو "قطعۃٌ من العذاب" کہا گیا ہے، خصوصاً پہاڑی علاقے کا سفر، جس میں آب و دانہ کی تکلیف اور مالوفات کا ترک لازماً پیش آئے گا۔ پس وہی شخص ہماری معیت اختیار کرے، جس میں صبر و استقامت کی ہمت ہو اور مالک حقیقی کے خلاف حرف شکایت زبان پر نہ لائے۔ میں سب کو آگاہ کرتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تکلیف پیش آنے پہ کوئی شخص کہے کہ سید نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا یا کہے کہ مجھے معلوم نہ تھا ایسی تکلیف پیش آئے گی۔ جس شخص میں صبر و استقامت کی قوت ہے، وہی ہمارا ساتھی بنے۔

ہم اپنی ساری عمر پروردگار کی رضا میں صرف کر دینے کا پختہ ارادہ کیے بیٹھے ہیں۔ جو بھائی جسمانی اور نفسانی تکالیف پر صبر نہ کر سکے، وہ ہم سے جدا ہو جائے۔ لیکن جدا ہونے والے بھائی کو خراسان یا ہندوستان یا کسی دوسرے ملک میں جا کر نہیں بسنا چاہیے، بلکہ وہ عرب کے سوا کہیں توطن اختیار نہ کرے۔ اس لیے کہ عرب کے سوا ہر جگہ ایمان کی حفاظت مشکل ہو جائے گی۔ بہتر یہ ہے کہ حرمین شریفین (زادہما اللہ شرفاً و تعظیماً) کی راہ لے اور وہاں کے حکام یا دوسرے اشخاص کی زیادتیوں پر صبر کرے۔ وہی سرزمین ہے، جہاں دین خلل سے محفوظ رہے گا، اگرچہ بدعات سے وہ ملک بھی خالی نہیں۔

پھر مولانا شاہ اسماعیل کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا :

میاں صاحب! آپ قرآن شریف کی تلاوت پر زیادہ توجہ فرمائیں، میں کثرت مراقبہ میں مشغول رہوں گا، یہاں تک کہ ہم ایسے مقام پر پہنچ جائیں، جہاں سے جہاد کا انتظام ہو سکے۔

اس خطبے کو سن کر تمام غازی زار قطار رونے لگے اور ان کے دل مرغ نیم بسمل

رباب بہرام خاں

کی طرح تڑپ اٹھے ۔ اس بات کا تو خدا کے فضل سے وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی غازی شدائدِ سفر کا ذکر سُن کر اپنے محبوب امام یا اہم ترین دینی مقاصد کا دامن چھوڑ دے گا ؛ لیکن ارباب بہرام خاں کا معاملہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے ۔ انھوں نے جب سے سید صاحب کی رفاقت اختیار کی ، پروانہ وار ساتھ رہے ۔ جب ہجرتِ ثانیہ کا فیصلہ ہو چکا تو ارباب نے اہل و عیال کو جمع کر کے فرمایا : میں تو حضرت کے ہم رکاب رہوں گا ۔ اب تم سب لوگ میرے بھائی جمعہ خاں کے پاس چلے جاؤ ۔ ارباب کے پانچ بیٹے تھے ، جن میں سے دو نابالغ تھے ۔ ایک بیٹی تھی اور ایک بیوی ۔ بھتیجا محمد خاں بھی تھا جس کی شادی غالباً ارباب کی بیٹی سے ہوئی تھی ۔ ان سب نے بھی بے توقف کہا کہ ہم ہر حال میں ساتھ رہیں گے خواہ کچھ پیش آئے[1]

اس زمانے میں بھی اکا دکا غازی پنجتار پہنچتے رہے ۔ مثلاً شیخ امجد علی غازی پوری بحالت مجروحیت آئے ۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں مجروح ہوئے ۔ پنجتار میں یا سفرِ ہجرت کی پہلی یا دوسری منزل میں سید صاحب سے آکر ملے ۔ بالاکوٹ میں ان کی شہادت یقینی اور متفق علیہ ہے[2]

احباب سندھ کو ہدایت

سید صاحب نے ہجرت سے پیشتر متعدد خطوط سندھ روانہ کیے ۔ مثلاً ایک خط ابو القاسم نام ایک شخص کو لکھا جو سندھ میں یا راستے کے کسی مقام میں رہتا تھا ۔ ایک خط امیرانِ سندھ کے نام تھا اور ایک پیر صبغۃ اللہ شاہ راشدی کے نام ۔ دونوں بی بیوں کے نام الگ الگ خط تحریر فرمائے ۔ پیر صاحب اور امیروں کو لکھا تھا آپ رضائے باری تعالیٰ کی نیت سے مہاجرات (ازواج اور متعلقات) کے حال پر توجہ فرماتے رہیں ، تاکہ ہم لوگ اطمینانِ خاطر سے جہاد کا کام انجام دے سکیں ۔

از حسن اخلاق شما توقع مے داریم کہ	آپ کے حسن اخلاق سے امید ہے
اگر سرنوشت تقدیر ما و رضائے مالک	کہ اگر ہماری تقدیر کا نوشتہ اور ہمارے
حقیقی در ہمیں منحصر است کہ زندگانی ما در	مالک حقیقی کی رضا یہی ہے کہ عمر اسی عبادت
ہمیں عبادت صرف شود ، پس دراں	میں صرف ہو جائے ، تو دینداری اور
صورت از راہ خیر خواہی و دینداری بر خود	خیر خواہی کے نقطۂ نگاہ سے اپنا فرض
لازم گردانید کہ ایں مہاجرات را تا حرمین	جانیں کہ یہ مہاجرات حرمین شریفین پہنچ
شریفین زادہما تشریفاً و تعظیماً رسانند[3]	جائیں ۔

---

[1] منظورہ صفحہ ۱۰۹۱ ۔ [2] منظورہ ص ۱۰۵۰ ۔ [3] منظورہ ص ۱۵۰۱

ازواج کو وصیت

ازواج کو دوسرے امور کے علاوہ تحریر فرمایا:

اگر پیمانۂ زندگانی ما درہمیں عبادت	اگر ہماری زندگانی کا پیمانہ اسی
پُر شود پس شمارا ضرور است کہ بسوے	عبادت میں لبریز ہو جائے تو تمھارے
حرمین شریفین بروند و بر مقام دیگر ہرگز	لیے ضروری ہوگا کہ حرمین شریفین پہنچ جاؤ
توطن نسازند؛ زیرا کہ ایں زمانِ فتن	اور دوسرے کسی ملک میں توطن اختیار
است۔ صیانت ایمان بجز آں دو مقام	نہ کرو، اس لیے کہ یہ فتنوں کا زمانہ ہے، اور
صورت نخواہد بست۔ بر ظلم و تکلیف آں	حرمین شریفین کے سوا ایمان کے محفوظ
بلاد صبر کردن و توطن ہمانجا نمودن بہتر	رہنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ ان
خواہد بود۔[1]	مقامات میں ظلم و تکلیف پر صبر کرتے
	ہوئے مقیم رہنا بہتر ہوگا۔

مسلمان کا موقف

اسی زمانے میں ایک روز شیخ محمد اسحاق گورکھ پوری نے اس نماز کا ذکر چھیڑا جو سید صاحب نے مولانا عبدالحی مرحوم کو دہلی میں پڑھائی تھی۔ بہت سے ارادت مند یہ نماز سیکھنے کے خواہاں تھے۔ فرمایا یہ ایسی چیز نہیں کہ پوری جماعت کو سکھائی جائے۔ ایک دو آدمیوں کو البتہ سکھائی جا سکتی ہے، لیکن آپ سب بھائی یکساں ہیں۔ کسے سکھائی جائے اور کسے نہ سکھائی جائے۔ ایک دوسرا معاملہ سوچا ہے۔ کل ان شاء اللہ بعد نماز عصر باہر چلیں گے تو اس کا انتظام کریں گے۔

دوسرے روز نمازِ عصر ادا کر کے غازیوں کی ایک جماعت کے ساتھ باہر تشریف لے گئے۔ دامنِ کوہ میں ایک میدان تھا۔ وہاں آپ نے وعظ فرمایا اور کہا:

مسلمان را مے باید کہ در مقام خواہش	مسلمان کو چاہیے کہ خواہش نفسانی
نفسانی و مشتہیات آں مثل طعام لذیذ و	اور اس کے مشتہیات مثلاً لذیذ کھانا، شیر

---

[1] منظورہ ۱۰۵۲ - مولوی سید جعفر علی نقوی نے منشی ہونے کی حیثیت میں یہ خط لکھے، تو میر منشی محمدی انصاری اور حکیم خیر الدین پھلتی سے کہا کہ یہ مضمون بالکل نیا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ امورِ معروف میں وصیت مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔ تمھیں اس پر تعجب کیوں ہوا؟ نقوی نے کہا کہ میں اسے بُرا نہیں کہتا۔ صرف یہ کہتا ہوں کہ مضمون نیا ہے۔ پہلے کبھی کوئی ایسی بات نہیں لکھوائی گئی۔ حقیقۃً یہ مضمون نیا تھا۔ خاص نظر و احساس رکھنے والے اصحاب کے دل میں یہ خیال پیدا کرنے کا موجب بنا کہ غالباً شہادت کی منزل بہت قریب آگئی ہے۔

شیرینی و انواع فواکہ دیگر برادران مسلمین را بر نفس تقدیم دہد و خود از انہا موخر شود و روا ندارد کہ زیادہ تر از ایشاں بہ حظوظ گردد بلکہ دریں امر کمی بر جانب خویش پسند نماید و در مقام رنج و تکلیف نفس خود را بہ دیگراں مقدم سازد و در آمدن بلا و تکلیف بر آنہا نہ پسندد۔

میوہ وغیرہ میں مسلمان بھائیوں کو اپنے اوپر مقدم رکھے اور خود پیچھے رہے۔ اس امر کا روادار نہ ہو کہ اپنے بھائیوں سے زیادہ حظوظ نفسانی سے محظوظ ہو، بلکہ دوسروں سے فروتر رہے، لیکن مقام رنج و تکلیف میں اپنے نفس کو دوسروں پر مقدم سمجھے اور پسند نہ کرے کہ انھیں کوئی بلا یا تکلیف پہنچے۔

نئی بیعت پھر مولانا اسماعیل سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ یہ اولیائے کرام کا مرتبہ ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ عوام کو اس کی تکلیف نہ دی جائے بلکہ یہ سب مسلمانوں کے لیے ضروری ہے اور اس پر بیعت کرنی چاہیے۔ چنانچہ منشی محمدی انصاری، شیخ محمد اسحاق گورکھپوری، مولوی عبدالوہاب لکھنوی، مولوی احمد اللہ ناگپوری، حبیب اللہ خاں گورکھپوری اور بہت سے دوسرے غازیوں نے بیعت کی۔ واپسی کے بعد پنجتار میں نو روز تک بیعت کا سلسلہ جاری رہا۔ مولانا شاہ اسماعیل نے بیعت نہ کی اور اپنے عجز و ضعف کا اظہار فرماتے ہوئے کہا کہ مجھے ڈر ہے، ایک عہد کر لوں، پھر اس کے ایفا میں تقصیر واقع ہو تو مواخذہ کا مستوجب ٹھہروں۔

چونتیسواں باب

پنجتار سے راج دواری

روانگی رجب[1] ۱۲۴۶ھ کا مہینا تھا۔ صحیح تاریخ معلوم نہ ہو سکی لیکن میرا اندازہ ہے کہ وسط ماہ میں سید صاحب نے پنجتار کو چھوڑا اور قاسم خیل کے راستے وادی چملہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جو بزرگ ہستی اپنے عزیز وطن کو اللہ کے لیے چھوڑ چکی تھی، جہاں زندگی کے چالیس برس گزرے تھے، جہاں آبا و اجداد کی عمریں بسر ہوئی تھیں، جہاں قرابت و عزیز داری کے بیسیوں سلسلے موجود تھے، جس کے چپے چپے پر خویشی کی مُہریں ثبت تھیں، اسے پنجتار چھوڑنے میں کیا تامل ہو سکتا تھا، جو بہرحال ایک اجنبی مقام تھا؛ تاہم پنجتار کے ساتھ چار برس کے قیام میں کئی وابستگیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ یہ مقام جہاد و اجرائے شریعت کا مرکز رہ چکا تھا۔ اس کی آغوش خاک میں سیکڑوں مجاہد محوِ خواب ابدی تھے، جنھوں نے اپنی جانیں راہِ خدا میں قربان کیں اور سید صاحب انھیں پدری شفقت کے ساتھ ہندوستان کے مختلف خطوں سے اٹھا کر لائے تھے۔ پنجتار سید صاحب کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے اوج و عروج کی بہاریں دیکھ چکا تھا۔ وہاں اعلاے کلمۃ الحق اور احیاے اسلامیت کے نقشے تیار ہوئے تھے۔ اگر ان نقشوں پر عمل پیرائی میں بالکل غیر متوقع موانع پیش نہ آجاتے تو ہندوستان کی تقدیر کا دھارا بالکل دوسرے رخ پر بہنے لگتا۔ سید صاحب کو اپنے دوسرے وطن سے بھی روگردانی کا مرحلہ پیش آگیا تو بے تکلف اُٹھے اور اس طرح باہر نکل پڑے، گویا ان کی سرگزشت حیات میں پنجتار کی حیثیت ایک کارواں سرائے سے زیادہ نہ تھی کہ رات بسر کی، پھر رختِ سفر باندھ کر روانہ ہو گئے۔

زائرین کا ہجوم ہجرت ثانیہ کی تیاری شروع ہو گئی تو علما و سادات اور مخلص خوانین جوق در جوق زیارت کے لیے حاضر ہونے لگے۔ ان میں سے ہمیں سید میاں ساکن تختہ بند، سید رسول ساکن نادہ گئی، قاضی سید امیر ساکن کوٹھا، اخوند زادہ قابل ساکن منگل تھانہ کے نام بالتعیین معلوم ہیں۔ اب فتح خاں کے ہم قوم آآکر قیام پر اصرار کرنے لگے۔ سید صاحب سب کے سامنے محبت آمیز

---

[1] دسمبر ۱۸۳۰ء

انداز میں معذرت کرتے رہے۔ فتح خاں سامنے آیا تو سید صاحب نے فرمایا: ساری دنیا مل کر کہے کہ یہاں سے چلے جاؤ، مگر آپ کہیں کہ نہ جاؤ تو میں آپ کا کہنا مان لوں گا۔ لیکن فتح خاں مخمصے میں مبتلا تھا۔ اس نے چار برس برکات و حسنات کی جن بہاروں میں گزارے تھے، ان کا تقاضا تھا کہ سید صاحب کو روک لے۔ جب نظر گرد و پیش کے حالات پر پڑتی اور سوچتا کہ سید صاحب کو ٹھہرا کر بونیر، سوات اور سمہ کے لوگوں کی عداوت کا ہدف بن جائے گا تو اس کی زبان بند ہو جاتی۔ وہ کھل کر روک نہ سکا اور سید صاحب جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ روانگی سے پیشتر فتح خاں کے تمام ہم قوموں کو نصیحت فرمائی کہ عمان تمھارا رئیس ہے، اسے عُشر دیتے رہنا۔ احکام شریعت کی پابندی کرنا۔ ہندوستان سے غازی آئیں تو انھیں مدارات سے ٹھہرانا اور حفاظت کے ساتھ ہمارے پاس پہنچا دینا۔

حرم محترم اور سید موسیٰ

سید صاحب نے حرم محترم کو دکھاڑا بھیج دیا تھا جہاں سید موسیٰ (ابن سید احمد علی شہید) سخت بیمار تھے۔ وہ جنگ مایار میں زخمی ہوئے تھے اور مہینے گزر جانے کے بعد بھی زخم بھرے نہ تھے بلکہ ان کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ شیخ حسن علی اپنے تمام عزیزوں کے ساتھ سید موسیٰ کی تیمارداری کر رہے تھے۔ روانگی سے پیشتر سید صاحب نے دکھاڑا پیغام بھیج دیا کہ شیخ حسن علی، بی بی صاحبہ، سید موسیٰ نیز مال و اسباب کو لے کر کن گلئی پہنچ جائیں جو چملہ میں سید صاحب کی پہلی منزل تھی۔ مولوی سید جعفر علی نقوی ایک روز پیشتر روانہ ہو چکے تھے۔ کن گلئی پہنچے تو دکھاڑے سے سب لوگ آ چکے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سید موسیٰ نے میرے پہنچنے کی خبر سنتے ہی آواز دے کر بلا لیا۔ میں پاس جا بیٹھا تو بار بار حضرت امیر المومنین کا پوچھتے رہے۔ میں نے عرض کیا کہ جلد آ جائیں گے۔ شیخ حسن علی میرا ہاتھ پکڑ کر کھانے کے لیے لے گئے۔ کھانے سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ سید موسیٰ نے پھر آواز دے کر بلا لیا۔ وہ بہت بے چین تھے۔ طبیعت زیادہ علیل معلوم ہوتی تھی۔ بار بار پوچھتے تھے کہ حضرت کب پہنچیں گے۔

سید صاحب کا سفر

سید صاحب کن گلئی پہنچے تو سب سے پہلے اپنے شہید بھانجے کے جگر بند کو دیکھا اور دیر تک پاس بیٹھے تسلی دیتے رہے۔ سید موسیٰ ہی کے پاس خاطر سے مزید ایک روز کن گلئی میں ٹھہرے۔ پنجتار سے توپیں بھی ساتھ آئی تھیں، لیکن اگلے پہاڑی راستے میں انھیں ساتھ لے جانا مشکل تھا۔ لہٰذا کن گلئی میں کسی محفوظ مقام پر دفن کرا دیا۔ شیخ حسن علی دکھاڑا سے جو سامان لائے تھے، اس میں بوجھل چیزیں بھی تھیں، جن کا لے جانا مشکل تھا اور ان کی فوری ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ سب سید حسن رسول ساکن تاواگئی کے حوالے کر دیں۔ اس خاندان سادات پر بعد میں کئی مرتبہ مصیبتیں آئیں اور گھر بار تباہ ہو گئے۔ معلوم نہیں وہ چیزیں کہاں گئیں[1]۔

تیسرے روز کن گلٹی سے روانہ ہو کر نگرئی پہنچے۔ تیسری منزل برڈھیری میں ہوئی۔ سید موسیٰ چونکہ بہت علیل تھے، اس لیے انھیں کن گلٹی میں چھوڑ دیا۔ شیخ حسن علی ان کی خدمت پر مامور ہوئے۔ سید صاحب برڈھیری میں تھے کہ سید موسیٰ کے انتقال کی اطلاع ملی۔ باپ پھولڑا میں شہید ہوا تھا۔ بیٹے نے مایار کی جنگ میں دادِ شجاعت دے کر مہلک زخم کھائے اور کئی ماہ کی علالت کے بعد کن گلٹی کی خاک میں آسودگی پائی۔ سادات بریلی نے احیائے اسلامیت کے لیے جو بے مثال قربانیاں کیں، ان کی نظیر یہاں کا کون سا خانوادہ پیش کر سکتا ہے؟

امب اور چھتربائی کے مجاہدین

جو مجاہدین امب اور چھتربائی میں تھے، انھیں پنجتار سے حکم بھیج دیا تھا کہ جیلہ پہنچ جاؤ۔ برڈھیری میں وہ بھی سید صاحب سے آملے۔ ہم سمہ کی جنگوں اور بلوائے عام کی داستان سناتے رہے اور ان غازیوں کا ذکر بالکل نظر انداز کیے رکھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کے حالات بھی اختصار سے پیش کر دیے جائیں۔

امب کا انتظام شیخ بلند بخت کے ذمے تھا۔ سید اکبر شاہ ستھانوی کے بھائی سید عمر شاہ ستھانوی ساٹھ آدمیوں کے ساتھ ان کی اعانت فرما رہے تھے۔ ادھر سمہ میں بلوائے عام ہوا تو پائندہ خاں نے شیخ بلند بخت کو پیغام بھیجا کہ ہمارے تمام مقامات خالی کر دو ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ شیخ نے کہلا بھیجا کہ امیر المومنین کے حکم کے بغیر ہم ایک انچ زمین بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ اگر تم جنگ کرنا چاہتے ہو تو شوق سے کر دیکھو۔ ہمیں قطعاً پروا نہیں۔ سید صاحب کو بھی اطلاع بھیج دی۔ آپ نے فرمایا کہ بالفعل وہیں رہو۔ چند روز کے بعد ہم اس ملک سے نکلیں گے۔ اگر ادھر کا قصد ہوا تو خیر ورنہ آپ بھائیوں کو بھی بلا لیں گے۔

امب کے انتظامات کی کیفیت یہ تھی کہ گڑھی کے کل چھ برج تھے: تین مشرق میں اور تین مغرب میں۔ مشرقی سمت میں جس برج کا نام پائندہ خاں والا برج تھا، اس میں میر امام علی پوری کا انتظام تھا اور ان کے ہمراہ ہزارے کے اسّی آدمی تھے۔ اس کے ساتھ کے برج میں مشوانیوں کی جماعت تھی جن کا جمعدار

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۰۸)

جو شیخ غلام علی الٰہ آبادی نے سید صاحب کے لیے تیار کرایا تھا۔ نیز خیمے، دیگیں، قالین، بندوقیں اور تلواریں تھیں۔ سید عبدالجبار شاہ ستھانوی نے، جو سید حسن رسول کے ہم خاندان ہیں، مجھ سے بیان کیا کہ خود ایک مرتبہ میں نے بھی دیکھا تھا، پھر معلوم نہیں کہاں گیا۔

[۱] کن گلٹی، نگرئی اور برڈھیری سب وادی چھارمیں ہیں۔ ڈھیری دو مقام ہیں: برڈھیری یعنی بالا ڈھیری اور زیریں ڈھیری یہ جب چلا گیا تھا تو گاؤں کے مغرب میں دو مقام تھے، دکھایا گیا جہاں سید صاحب کا ہاتھی بندھا تھا۔

صالح محمد ساکن گنگر تھا۔ تیسرے برج میں موضع خاں امان زئی ساکن ڈیگڑہ کا انتظام تھا۔ اس کے مقابل کے غربی برج میں موضع خاں کی رعایا کے آدمی تھے۔ غربی سمت کے باقی دو برجوں میں سید عمر شاہ ستھانوی کے آدمی مقیم تھے۔ شیخ بلند بخت خود گڑھی میں رہتے تھے۔ غازی بھی ان کے ساتھ تھے۔ گڑھی کے دروازے سے خاربندی تک گیارہ ہندوستانی غازیوں کا پہرہ تھا۔ الٰہی بخش رام پوری ان میں رسد اور گولی بارود تقسیم کیا کرتے تھے، احتیاط کے خیال سے خاربندی کے تین حلقے قائم کر لیے گئے تھے۔

پاینده خاں کے حملے کا اندیشہ

ایک روز شیخ بلند بخت کو اطلاع ملی کہ پاینده خاں کھبل باٹی کے گھاٹ سے اپنا لشکر دریا کے غربی کنارے پر پہنچا رہا ہے۔ کھبل باٹی اور امب کے درمیان گڑھی بلوچاں میں سید صاحب کی طرف سے دین محمد (باشندہ جانب عظیم آباد) تحصیل عُشر پر مامور تھا۔ وہ گاؤں کے لوگوں کے ساتھ ایک جگہ کھڑا تھا کہ ایک آدمی نے پیچھے سے نیزہ مار کر اسے شہید کر ڈالا۔ شیخ بلند بخت کو یقین ہو گیا کہ پاینده خاں گڑھی بلوچاں میں پہنچ گیا ہے اور وہ ضرور امب پر حملہ کرے گا۔ بستی ویران پڑی تھی۔ شیخ نے غازیوں کو حکم دے دیا کہ منہدم مکانوں سے لکڑیاں نکال کر گڑھی میں جمع کر لو۔ اس لیے کہ محاصرہ ہُوا تو لکڑی باہر سے لانے کا کوئی موقع نہ رہے گا۔ وہاں چار توپیں تھیں۔ شیخ نے دو شمالی سمت میں نصب کرا دیں، جدھر سے حملے کا اندیشہ تھا، ایک مشرقی سمت میں رکھی اور دوسری مغربی سمت میں۔

آخر پاینده خاں کے سواروں اور پیادوں نے یورش کی لیکن وہ قریب نہ پہنچ سکے۔ ایک روز مشرقی سمت کی خاربندی کے بیرونی حلقے میں آگ لگا دی۔ غازیوں نے فوراً اسے بجھا دیا۔ بیس پچیس روز کشمکش جاری رہی، لیکن پاینده خاں کے سوار اور پیادے کچھ نہ کر سکے۔

سکھوں کا پیغام

ایک روز کرپلیاں کی جانب سے، جو امب کے مقابل دریا کے مشرقی کنارے کی بستی تھی، آواز آئی کہ کسی معتبر آدمی کو دریا پر بھیجو، ایک ضروری پیغام پہنچانا ہے۔ شیخ بلند بخت نے الٰہی بخش رام پوری، حسن خاں ساکن زمانیہ اور ایک اور آدمی کو بھیجا۔ دریا پار سے سکھوں کا پیغام ملا کہ آپ لوگوں نے تنولیوں کے مقابلے میں خوب بہادری دکھائی۔ سپاہی کی قدر صرف سپاہی ہی پہچان سکتا ہے۔ ہم آپ کے خیر خواہ ہیں۔ ایک آدمی ہمارا خط لائے گا، سوچ سمجھ کر

---

[1] اسی مقام کو آج کل امب کہتے ہیں۔ اصلاً یہ امب جدید ہے جو ۱۸۴۱ء کی طغیانی کے بعد آباد ہوا۔ سید صاحب کے زمانے کا امب [illegible]

راج دواری سے آدھ کوس پر ایک نالہ تھا۔ سید صاحب وہاں ٹھہر گئے۔ پوشاک بدلی۔ وضو کر کے دوگانہ شکر ادا کیا۔ پھر بستی میں پہنچے۔ غازیوں کو مختلف مکانوں میں ٹھہرایا، جو پہلے سے ان کے لیے خالی کرائے جا چکے تھے۔ خود مسجد کے قریب ایک مکان میں اترے۔

بھوگڑمنگ روکنے کا فیصلہ

راج دواری پہنچے تو برف باری کا موسم شروع ہو چکا تھا اور اس موسم میں جہاد ممکن نہ تھا۔ لیکن سید صاحب نے خوانین کو جمع کر کے فرمایا کہ بیکار بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبراتی ہے، کچھ مشغولیت کا انتظام ہونا چاہیے۔ نیز جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ برف باری کے دنوں میں دور افتادہ علاقوں سے غلہ راج دواری لانا مشکل ہوگا تو مناسب یہ سمجھا گیا کہ پورے لشکر کو راج دواری میں رکھنے کے بجائے جا بجا مناسب مقامات پر پھیلا دیا جائے۔ دروں میں بھوگڑمنگ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ وہ شنکیاری کے سر پر تھا جہاں سکھوں نے ایک چھاؤنی سی بنا رکھی تھی اور وہاں سے اٹھ کر بھوگڑمنگ میں اقدامات کرتے رہتے تھے۔ سید صاحب نے مناسب سمجھا کہ اس درے پر لشکر بٹھا دیا جائے تاکہ سکھ حملہ نہ کر سکیں، نیز درے کے اندر کے سارے لوگ مطمئن ہو کر سکھوں کو خراج دینا بند کر دیں۔ اس حصے کے رئیس حسن علی خاں بیچوں والے پر شبہ کیا جاتا تھا کہ وہ سکھوں سے ساز باز کیے بیٹھا ہے۔ یہ شبہ اگر درست بھی ہوتا تو غازیوں کا لشکر درے پر بیٹھ جانے سے حسن علی خاں کے لیے دو دلا رہنا غیر ممکن ہو جاتا۔ ناصر خاں (بھٹ گرام)، سعادت خاں اور شاہی خاں (ٹیکری)، محمد خاں اور بارک خاں (کونش)، شہزاد خاں (چھپر گرام) نیز رئیس گج بوڑمی، اس مشورے میں شریک تھے اور سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔

مولانا اسماعیل اور مولوی خیر الدین

سید صاحب نے چار سو غازی مولانا شاہ اسماعیل کی سرکردگی میں بھوگڑمنگ بھیج دیے، مولوی خیر الدین شیرکوٹی کو نائب و مشیر بنایا اور معمول کے مطابق بعد دعا انھیں رخصت فرمایا۔ مولانا نے ایک منزل راستے میں کی۔ وہاں سے مولوی خیر الدین کو ساڑھے تین سو غازیوں کا امیر بنا کر موضع بھوگڑمنگ بھیج دیا جو درے کے اندر دہانے سے تھوڑے فاصلے پر ہے، خود پچاس غازیوں کے ساتھ بیچوں چلے گئے، جو بھوگڑمنگ سے چند میل شمال میں واقع ہے۔

مولوی خیر الدین نے بھوگڑمنگ پہنچ کر درے کے دہانے تک اتنا عمدہ انتظام کر لیا کہ سکھوں کو شنکیاری کی گڑھی سے باہر نکلنے کا حوصلہ نہ رہا۔ درے کے اندر کے تمام لوگ مطمئن ہو گئے اور خوشی خوشی مولوی صاحب کو عشر دینے لگے۔

ایک روز قندھاریوں کی ایک جماعت درے سے باہر میدان میں نکل گئی۔ اس میں زیادہ آدمی نہ تھے، اتفاق سے سکھ سامنے آگئے۔ اگرچہ وہ غازیوں سے دہ چند تھے لیکن جم کر لڑنے کی ہمت نہ پڑی اور عالم ہراس میں آس پاس کے ٹیلوں پر چڑھ گئے۔ قندھاریوں نے احتیاطاً مولوی خیر الدین کو خبر بھیج دی۔ عصر کا وقت تھا۔ مولوی صاحب فی الفور تیس چالیس غازیوں کو لے کر درے پر پہنچ گئے۔ سکھ چھپ چھپ کر گڑھی میں چلے گئے۔ اندھیرا ہو گیا تو مولوی صاحب واپس ہوئے۔

سچوں تین گاؤں تھے: ایک سچوں کلاں، دوسرا سچون خورد، تیسرا گمہار سچا۔ حسن علی خاں نے اپنے بھائی کی حویلی مولانا کے لیے خالی کرا دی اور تمام لوگوں کے نام پیغام بھیج دیا کہ جو مالیہ سکھوں کو دیتے ہو بند کر دو اور غازیوں کو عُشر پہنچاتے رہو۔ سکھ اقدام کریں گے تو غازی انھیں روکنے کے ذمہ دار ہوں گے۔

اس زمانے میں مولانا ایک مرتبہ مشورۂ خاص کے لیے راج دواری بھی گئے تھے۔

بیعت اہل صفہ

سید صاحب راج دواری ہی میں رہے۔ وہیں ۱۴۔ شعبان کو سیدہ ہاجرہ کا عقیقہ کیا۔ اس زمانے میں اکثر غازیوں نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت اہل صُفہ کی، جس کی خاص شرطیں یہ تھیں:

۱۔ کوئی حاجت چھوٹی ہو یا بڑی خدا کے سوا کسی سے طلب نہ کی جائے گی۔

۲۔ جس بات کو بیعت کنندہ اپنے حق میں معیوب و مکروہ سمجھے گا، اس کا حکم کسی مسلمان بھائی کو نہ دے گا۔ جو کچھ اپنے لیے پسند کرے گا، وہی ہر مسلمان بھائی کے لیے پسند کرے گا۔

۳۔ بیعت کنندہ اپنی حاجت و ضرورت پر مسلمان بھائیوں کی حاجات و ضروریات کو مقدم رکھے گا۔

۴۔ ہر کام صرف رضائے خدا کے لیے کیا جائے گا۔

مولوی الٰہی بخش رام پوری یہ بیعت کر چکے تو سید صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ دعا کیجیے خدا مجھے تا دم مرگ اس عہد پر قائم رکھے۔ سید صاحب نے فرمایا:

> بھائی، سچ کہتے ہو۔ میرا بھی یہی حال ہے۔ اپنے نفس پر اعتماد مشکل ہے۔ پروردگار کی تائید شامل حال رہنی چاہیے۔ میرے لیے بھی دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ اس طریق پر ثابت قدم رکھے۔

شیخ محمد اسحاق گورکھ پوری

شیخ محمد اسحاق گورکھ پوری نے ایک مرتبہ پنجتار میں مولانا شاہ اسماعیل کا وعظ سن کر کھانا پینا چھوڑ دیا تھا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ایک روز راج دواری میں اس قسم کا واقعہ پیش آیا۔ کھانا پینا چھوڑ دیا اور دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ رفیقوں نے سبب پوچھا تو

آگیا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ آپ نے آدمی بھیج کر ہم سے ہر الزام کی حقیقت کیوں معلوم نہ کر لی؟ بولا کہ مجھے باغی نہ سمجھیے اور خطا معاف کر دیجیے۔ سید صاحب نے فرمایا: آپ نے میری کوئی خطا نہیں کی۔ خداوند کریم کا گناہ کیا۔ سچے دل سے توبہ کرو گے تو عفو کی امید ہے۔ وہ رونے لگا کہ اہل سمہ نے میرا دین بھی تباہ کیا اور دنیا بھی

فتح خاں کی گزارش

خان ڈگر کی عاجزی دیکھ کر فتح خاں پنجتاری کی بھی ہمت بندھی۔ اس نے شہزادہ خاں ہی کو واسطہ بنا کر درخواست کی کہ سید صاحب نہ جائیں اور پنجتار ہی میں ٹھہریں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ وقت ہاتھ سے جاتا رہا۔ اب اس بات میں کوئی لطف نہیں:

وقتِ ہر کار نگہ دار کہ نافع نہ بود
نوشدارو کہ پس از مرگ بہ سہراب دہند

برڈھیری سے چلتے وقت شہزادہ خاں کو رخصت کیا تو معمول کے مطابق ایک نہایت عمدہ گھوڑا بطور تحفہ دیا۔

اگلی منزلیں

برڈھیری تک تین منزلیں ہوئی تھیں بعد کی منزلوں کا نقشہ یہ ہے:

۱ ۔ برڈھیری سے چلے تو برندو ندی کے کنارے اس جگہ ٹھہرے، جہاں سے مجاہدین کا موجودہ مرکز اسمست بہت قریب ہے۔

۲ ۔ برندو کو عبور کرنے کے بعد سیوار پہاڑ کی چڑھائی شروع ہو گئی۔ یہ بڑی کٹھن تھی۔ سید صاحب ہاتھی پر سوار تھے۔ گھوڑے اور اونٹ گر گر جاتے تھے۔ پیادے بہ مشکل راستہ طے کرتے تھے۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے تو وہاں چند مکان تھے۔ کچھ غازی ماندگی سے لاچار ہو کر وہیں ٹھہر گئے۔ سید صاحب لشکر کے ساتھ کرنا میں مقیم ہوئے۔ وہاں سے فتح خاں پنجتاری رخصت ہوا۔

۳ ۔ کرنا سے نکلے تو کابل گرام میں منزل ہوئی، جو دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر اخوند خیلوں کا موضع ہے۔ وہاں سے دریا کو عبور کرنا تھا، جس میں تین روز لگ گئے۔ ایک اونٹ کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ سید صاحب نے اسے ذبح کرا کے گوشت لشکر میں تقسیم کرا دیا۔

۴ ۔ عبور دریا کے بعد ایک منزل دریا کے مشرقی کنارے پر ہوئی۔ پھر تاکوٹ میں قیام کیا، جہاں ناصر خاں بھٹ گرامی، اور چھنی کے دوسرے خوانین استقبال کے لیے پہنچے ہوئے تھے۔ اس وقت تک سید صاحب کی قیامگاہ کا معاملہ طے نہیں ہوا تھا۔ تاکوٹ ہی میں خوانین نے باہمی مشورے سے راج دواری میں ٹھہرانے کا فیصلہ کیا۔

۵ ۔ بی بی صاحبہ کی زچگی کے دن قریب تھے۔ سید صاحب نے انھیں تاکوٹ میں چھوڑا۔ خود ایک

رات دبیشیوں کی بستی میں گزاری۔ اس کے بعد بھٹ گرام گئے، جہاں چار مقام کیے۔ ایک رات کاکڑ سنگ میں بسر کی، پھر راج دواری پہنچ گئے۔ شعبان کی تیسری یا چوتھی تاریخ تھی۔

مدت مسافت

میرے اندازے کے مطابق پنجتار سے نکل کر راج دواری پہنچنے میں انیس یا بیس دن صرف ہوئے۔ زیادہ تر مقامات میں ایک ایک رات ٹھہرے۔ کن گلئی اور برڈھیری اور تاکوٹ میں دو دو راتیں، کابل گرام میں تین راتیں اور بھٹ گرام میں چار راتیں۔ راج دواری چونکہ تیسری یا چوتھی شعبان کو پہنچے (۱۷- یا ۱۸- جنوری ۱۸۳۱ء کو) اس بنا پر قیاس یہ ہے کہ پنجتار سے ۱۵- یا ۱۶- رجب کو چلے ہوں گے (یعنی ۲۹- یا ۳۰- دسمبر کو)۔ ۷- شعبان (۲۱- جنوری ۱۸۳۱ء) کو آپ کے گھر بچی پیدا ہوئی جس کا نام ہاجرہ رکھا گیا، غالباً اس مناسبت سے کہ اس کی پیدائش دورانِ ہجرت میں ہوئی تھی نیز اس کی بڑی بہن کا نام سارہ تھا۔

شاہ اسماعیل کا واقعہ

تاکوٹ میں مولانا شاہ اسماعیل موت کے منہ سے بچے۔ انھیں غسل کی حاجت تھی، منہ اندھیرے دریا پر چلے گئے۔ سخت سردی کا موسم اور دریا کا پانی برفانی، سردی نے عاجز کر دیا۔ فوراً باہر نکل کر کپڑے پہنے، لیکن چلا نہ گیا بے بس ہو کر گرے اور گرتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ صبح صادق کے وقت محمد امیر خاں قصوری اور بعض دوسرے غازی وضو کے لیے دریا پر گئے تو سمجھے کہ کوئی آدمی مرا پڑا ہے۔ دیکھا تو مولانا تھے۔ دو آدمیوں نے انھیں اٹھایا، باقی بھاگ کر چارپائی لائے۔ قیامگاہ پر پہنچ کر کمبل اڑھائے، پاس آگ جلائی۔ سورج نکلنے پر مولانا کو ہوش آیا۔ سید صاحب کو معلوم ہوا تو دیکھنے کے لیے پہنچے اور فرمایا کہ خدا نے آپ کو اتنا بڑا عالم بنایا ہے۔ تعجب ہے کہ آپ سے ایسی حرکت سرزد ہوئی۔ نہانا تھا تو آدمیوں سے کہہ کر پانی گرم کرا لیتے۔

بھٹ گرام سے سید صاحب ایک بزرگ سے ملنے کے لیے چھپر گرام بھی گئے تھے۔

راج دواری کی تجویز کے وجوہ

راج دواری کو خوانین نے مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر سید صاحب کے قیام کے لیے منتخب کیا تھا:

۱ - یہ مقام پکھلی کے تمام دروں کے سر پر تھا، اس لیے اسے مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

۲ - وہاں کئی پن چکیاں تھیں اور غازیوں کو آٹا پسوانے میں دقت پیش نہیں آ سکتی تھی۔

۳ - پاس جنگل تھا جہاں سے حسب ضرورت ایندھن لایا جا سکتا تھا۔

۴ - راج دواری کی ملکیت میں متعدد خوانین شریک تھے اور وہاں کے قیام میں سب کو مہمانداری کا شرف حاصل ہوتا تھا نیز کسی ایک کے علاقے میں قیام کی بنا پر دوسروں کے دلوں میں رقابت پیدا ہونے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔

اس کا جواب دینا۔ خط آیا تو اس میں یہ لکھا تھا:

> خلیفہ صاحب کے غازی بہت بہادر، امانت دار اور نمک حلال ہیں، انھوں نے شجاعت کا حق ادا کر دیا۔ آپ کے پاس جو ساز و سامان پائندہ خاں کا ہے، اسے دے دیں اور خود ہمارے پاس چلے آئیں۔ ہم نوکر رکھ لیں گے اور خلیفہ صاحب کے پاس تمھاری جو عزت ہے، اس سے زیادہ عزت کے ساتھ رکھیں گے۔

شیخ نے جواب دیا:

> اپنے سردار سے کہو کہ ہم امیر المومنین کے تابع فرمان ہیں۔ حضرت کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ اپنے وطنوں سے اس لیے آئے ہیں کہ کافروں سے جنگ کریں۔ نہ ملک چاہتے ہیں، نہ مال۔ ہمیں نوکری سے کیا غرض؟ ہماری موت اور زندگی امیر المومنین کے ساتھ ہے اور قادر ذو الجلال کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ پائندہ خاں اور اس کے لشکر کی کیا حقیقت ہے؟ اگر رنجیت سنگھ بھی اپنا لشکر لے آئے تو نہ ڈریں گے۔ ڈر خوف مرگ سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم اپنی جانیں خدا کے راستے میں قربان کر چکے ہیں پس ہمیں کیا ڈر ہے؟ ہماری طرف سے کہہ دینا کہ پھر ہمیں ایسا پیام نہ بھیجا جائے[1]

گڑھی کا تخلیہ سینتیس روز کے بعد سید اکبر شاہ ستھانوی گڑھی کے دروازے پر آئے اور شیخ بلند بخت سے کہا کہ حضرت امیر المومنین کے پیغام کے مطابق گڑھی خالی کر دینی چاہیے۔ پائندہ خاں کا لشکر ہٹ گیا ہے۔ شیخ توپوں، غلے، اسلحہ اور مال اسباب کے ساتھ امب سے نکل کر عشرہ چلے گئے۔ وہاں سے توپیں کشتیوں پر سوار کرا کے ستھانے پہنچا دیں اور خود عشرہ میں رہے، جہاں چھتر بائی کے غازیوں کو بھی سید اکبر شاہ لے آئے۔ اس ساری مدت میں غازیوں میں سے صرف ایک آدمی شہید ہوا۔ تین کے خفیف زخم لگے۔ پائندہ کے ساٹھ آدمی مارے گئے اور پینتالیس زخمی ہوئے۔

چھتر بائی کے حالات چھتر بائی کے اصل قلعدار مولوی خیر الدین شیرکوٹی تھے۔ انھیں سید صاحب نے پنجتار بلا لیا تو حافظ مصطفیٰ کاندھلوی قلعدار بن گئے۔ پائندہ خاں نے اس

---

[1] منظورہ صفحہ ۱۰۶۸ و ۱۰۶۹۔ بے شک ڈر خوف مرگ سے پیدا ہوتا ہے۔ اقبالؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پہلی گزارش یہی پیش کی تھی:

اے کہ ما بے چارگاں را ساز و برگ
وارہاں ایں قوم را از ترس مرگ

گڑھی کا بھی محاصرہ کر لیا، جو چالیس روز جاری رہا، لیکن وہ گڑھی نہ لے سکا۔ اس دوران میں یہ پیغام بھی بھیجا کو میرے ہاں نوکری کر لو۔ حافظ مصطفیٰ نے جواب دیا کہ ہم امیر المومنین کے فرمانبردار ہیں اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے آئے ہیں۔ نوکری وہ کرے جو مال و دولت کا طلب گار ہو۔ ہم صرف خدا کے طلب گار ہیں۔

پائندہ خاں نے ایک تنولی عورت کو رشوت دے کر ساتھ ملایا، جس کا شوہر حافظ صاحب کے ماتحت جمعدار تھا۔ اس طرح لشکر اسلام میں خلل پیدا کرنا چاہا، لیکن بات چل نہ سکی۔ ایک مخلص نے، جس کا نام عبدالکریم تھا، سب کچھ بے کم و کاست حافظ صاحب کو سُنا دیا۔ حافظ صاحب نے حسن تدبیر سے اس جمعدار کو اپنے پاس بلا لیا جو سازش کا مرکز تھا۔ اس کے ساتھیوں کو دوسرے مقامات پر تبدیل کر دیا۔ اس طرح یہ سازش ناکام ہو گئی۔

ایک روز گڑھی کا دروازہ کھلا اور کچھ لوگ قضائے حوائج کے لیے باہر چلے گئے۔ ان میں سے ایک غازی، جس کا نام خدا بخش تھا، شہید ہوا۔ یہ پنجاب یا ہزارہ کا باشندہ تھا۔ آخر سید اکبر شاہ ہی نے سید صاحب کے فرمان کے مطابق چھتر بائی کو بھی خالی کرایا اور غازیوں کو عشرہ لے گئے، جہاں شیخ بلند بخت پہلے سے موجود تھے۔

عشرہ سے برڈھیری

یہ غازی عشرہ سے چملہ کی طرف روانہ ہوئے۔ سید اکبر شاہ نے دگیڑ کے موضع خان اور مدد خاں کو رہبری کے لیے ساتھ کر دیا تھا۔ قافلے میں تین عورتیں تھیں: ایک زوجہ الٰہی بخش مہاجر، دوسری زوجہ الٰہی بخش رام پوری، تیسری زوجہ حسن خاں ساکن زمانیہ۔ چار بچے تھے۔ شیخ بلند بخت نے انھیں اپنے ساتھ قافلے کے پیچھے رکھا۔ رات کا وقت، راستہ پہاڑی اور راہ سے قدم نا آشنا۔ ایک عورت غار میں گری لیکن درخت میں اٹک گئی۔ دو کمل باندھ کر اسے باہر نکالا۔ ایک رات پہاڑ پر سوئے، دوسری رات ایک بستی کے کنارے ٹھہرے، تیسرے روز سید صاحب کے پاس پہنچے۔

شہزاد خاں رئیس ڈگر

شہزاد خاں رئیس ڈگر، بونیر کا سب سے بڑا خان تھا۔ مشہور تھا کہ وہ مفسدین سمہ کے تمام مشوروں میں شریک رہا۔ سید صاحب کی ہجرت کی خبر مشہور ہوئی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بونیر و چملہ کے مختلف خوانین کو ساتھ لے کر تقصیر معاف کرانے کے لیے برڈھیری میں سید صاحب کے پاس پہنچا۔ آپ عادت شریف کے مطابق خندہ پیشانی سے ملے۔ شہزاد خاں نے عرض کیا کہ اہل سمہ نے غلط بیانیاں کر کے مجھے گمراہ کیا۔ وہ کہتے تھے کہ سید بادشاہ ہمارے ملک میں نئے نئے حکم جاری کر رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے قصوروں پر بے عزت کرتے ہیں۔ میں ان کے فریب میں

بولے: حضرت امام المسلمین نے تین موقعوں پر جن غازی بھائیوں کو مغفرت کی بشارت دی، میں ان میں سے کسی موقع پر موجود نہ تھا۔ یہ میری انتہائی بے نصیبی تھی۔ اب اس وقت تک کچھ نہ کھاؤں گا جب تک حضرت میرا ہاتھ پکڑ کر نہ فرمائیں گے کہ یہ شخص جنتی ہے۔

سید صاحب تک بات پہنچی تو شیخ اسحاق کو اپنے پاس بلایا۔ آپ محبت سے شیخ کو "دیوانے شاہ" فرمایا کرتے تھے۔ پوچھا: "دیوانے شاہ" کیا ہوا؟ مولوی جعفر علی نقوی پاس تھے۔ انھوں نے پوری کیفیت عرض کی۔ سید صاحب بولے:

> بھائی! آپ مجھ سے ایسی بات کہلوانا چاہتے ہیں کہ علماء اس پہ میرے قتل کا حکم دے دیں گے۔ ایسی بات کہی نہیں جا سکتی۔ لیکن اپنی حالت پر غور کیجیے۔ آپ نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں۔ کار زار جہاد میں مصروف ہیں، شر و فساد کا ازالہ کرتے ہیں۔ کیا یہ نیک کام نہیں ہیں؟ اہل جنت کے اعمال نہیں ہیں؟ اب اٹھیے کھانا کھائیے اور سو جائیے۔ جس کام میں مشغول ہیں، مشغول رہیے۔ ارحم الراحمین کے فضل و کرم پر بھروسا رکھیے۔ انشاء اللہ آپ کا انجام بخیر ہوگا۔[1]

خدائی انتقام

راج دواری ہی میں سید صاحب کو اطلاع ملی کہ پنجتار کو چھوڑ کر پکھلی کی جانب آنے کے بعد سکھوں کے دل سے ہر خوف دور ہو گیا اور انھوں نے اہل سمہ پہ ظلم و تعدی کا سیل بہا دیا۔ جہاں جاتے، دیہات کے مکانوں کو آگ لگا دیتے۔ جو چیز ہاتھ آتی اٹھا کر لے جاتے۔ سکھوں کی سپاہ میں مسلمان بھی شامل تھے۔ وہ اہل سمہ کو بار بار طعن کے انداز میں کہتے تھے کہ تم لوگوں نے اپنے مرشد و امام کے ساتھ جو سلوک روا رکھا، اس کے بعد کسی دوسرے کو تم سے بھلائی کی کیا امید ہو سکتی ہے؟ سرداران پشاور اور اہل سمہ نے اپنے خیال کے مطابق غازیوں کو خون شہادت میں تڑپا کر انفاذ شریعت سے نجات حاصل کی تھی اور رسوم جاہلیت کو محفوظ کیا تھا۔ درحقیقت انھوں نے وہ بند توڑ دیا تھا جس کی وجہ سے چار برس تک فتن و محن کا سیل رکا رہا۔ بند ٹوٹا تو اہل سمہ سیل تعدی میں تنکوں کی طرح بہنے لگے، سچ ہے:

تا دل صاحب دلے نامد بہ درد
ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد

---

[1] منظورہ صفحہ ۲۰۸

پینتیسواں باب

بالاکوٹ اور سچوں

امداد کی درخواستیں

سید صاحب کاروبارِ جہاد کے مستقل آغاز کے لیے موسمِ برف کے اختتام کا انتظار کر رہے تھے۔ اس اثنا میں مختلف خوانین کے حالات معلوم ہوئے تو عجیب نقشہ نظر آیا۔ سکھوں کی یورشوں نے محض عام مسلمانوں ہی پر عرصۂ اطمینان تنگ نہیں کیا تھا، خوانین و وڈیروں کو بھی خاصے خلجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان میں پہلے سے عداوتیں جاری تھیں۔ بعض فریق سکھوں کے ساتھ مل گئے اور ان کی امداد سے اپنی برادری کے آدمیوں کو ملک و ریاست سے بے دخل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مثلاً:

۱۔ زبردست خاں کو اس کے عم زاد بھائی نجف خاں نے سکھوں کی مدد لے کر مظفر آباد سے نکال دیا تھا۔

۲۔ نجف خاں گھوڑی والا، اپنی ریاست سے نکل کر کوہ درابہ میں بیٹھا تھا۔

۳۔ راجا منصور خاں والی ملک درابہ اپنے بھائی معز الدین کے خوف سے چھپتا پھر رہا تھا۔

۴۔ حبیب اللہ خاں مالک گڑھی (حبیب اللہ خاں) اس طرف کا بہت بڑا زمیندار تھا۔ وہ گڑھی کو چھوڑ کر بالاکوٹ سے بھی آگے درۂ کاغان میں مقیم تھا۔

ان سب نے سید صاحب سے دستگیری کی درخواستیں کیں اور یہ سب راہِ کشمیر کے خوانین و وڈیرے تھے۔ اگر ان کے لیے اطمینان سے بیٹھنے کی صورت پیدا ہو جاتی تو امید تھی کہ نہ محض کشمیر پہنچنا سہل ہو گا، بلکہ تسخیرِ کشمیر میں ان سے گراں قدر امداد ملے گی۔ سید صاحب نے مولانا شاہ اسماعیل کو یہ سارے حالات لکھ بھیجے اور حکم دیا کہ بہتر ہو آپ بالاکوٹ چلے جائیں۔ مولانا نے یہ حکم پہنچتے ہی مولوی خیر الدین کو لکھا کہ آپ فی الفور بالاکوٹ چلے جائیں، میں بھی دو تین روز میں پہنچ جاؤں گا۔

مولوی خیر الدین بالاکوٹ میں

چنانچہ مولوی صاحب ۲۷۔ شعبان ۱۲۴۶ھ (۱۰۔ فروری ۱۸۳۱ء) کو ظہر کے وقت بعجلت گڑھنگ سے روانہ ہوئے۔ پہاڑی راستے سے بالاکوٹ اگرچہ صرف تین کوس تھا، لیکن نشیب و فراز کے باعث منزل سخت کٹھن تھی اور برف باری نے سفر کی مشکلات

میں بہت اضافہ کر دیا تھا۔ بایں ہمہ مولوی صاحب چار گھڑی رات گئے تک بالاکوٹ پہنچ گئے۔

خوانین کو ان کے آنے کا حال معلوم ہوا تو پیغام بھیجا کہ نجف خاں سکھ افواج کے سپہ سالار شیر سنگھ کے ساتھ باہر چلا گیا ہے[1] اور مظفر آباد خالی پڑا ہے۔ گڑھی میں سات آٹھ سو آدمی ہوں گے۔ اگر اس موقع پر حملہ کیا جائے تو مظفر آباد قبضے میں آجائے گا۔ حضرت کو وہاں بٹھا دیں گے اور متفقہ قوت سے کشمیر پر چڑھائی کر دیں گے۔ مولوی صاحب نے کہلا بھیجا کہ مجھے صرف بالاکوٹ پہنچنے کا حکم ہوا ہے، آگے جا نہیں سکتا۔ مولانا شاہ اسماعیل دو تین روز میں آجائیں گے تو ان سے بات کر لینا۔ یہ بھی کہہ دینا کہ حضرت امیر المومنین اس ملک میں تازہ وارد ہیں۔ وہ نہ آپ لوگوں کے حالات سے واقف ہیں، نہ آپ نے انھیں دیکھا ہے، نہ ان کے ارادوں سے آگاہی حاصل کی ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ پہلے حضرت سے مل کر ان کے ارادوں سے پوری آگاہی حاصل کر لیجیے، پھر رفاقت کی درخواست کیجیے۔

خوانین نے اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر حضرت سے مل کر سب مراحل طے کرنے کا انتظار کیا گیا تو ممکن ہے نجف خاں اور شیر سنگھ واپس آجائیں۔ پھر مظفر آباد پر حملے کی کوئی صورت نہ رہے گی۔ خوانین نے مولوی صاحب سے ملاقاتیں بھی کیں جن میں مندرجہ ذیل باتوں پر زور دیا:

خوانین کی تجویز

۱ - نجف خاں اور شیر سنگھ کی مراجعت سے پہلے پہلے مظفر آباد کی تسخیر کا جو موقع ہے، اسے ضائع نہ کرنا چاہیے۔

۲ - ہمارے اہل و عیال بالاکوٹ سے آگے ہیں، انھیں تنہا چھوڑ کر حضرت کے پاس کیسے جائیں؟

۳ - ہمیں صرف بہ طور تبرک غازیوں کی امداد مطلوب ہے۔ لڑائی کی پوری ذمہ داری ہم قبول کرتے ہیں۔

مولوی صاحب نے پہلی بات کے جواب میں وہی کہا جو پہلے کہا تھا، یعنی یہ کہ میں مختار نہیں ہوں، مامور ہوں اور بطور خود کوئی اقدام نہیں کر سکتا۔ ان کے اہل و عیال کی پوری حفاظت کا ذمہ اٹھایا۔ تیسری بات کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا کہ اگر آپ میں لڑنے کی ہمت ہوتی تو گھر بار چھوڑ کر جلاوطن کیوں ہوتے؟

مولانا کا سفر بالاکوٹ

مولانا ۲۹ - شعبان ۱۲۴۶ھ کو سچوں سے نکلے۔ چونکہ قصد بالاکوٹ کو ملکی آدمیوں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے، اس لیے ساتھیوں سے فرمایا کہ بھوگڑمنگ جانا منظور ہے۔ برف اس وقت پڑ رہی تھی لیکن نہ رکے۔ بھوگڑمنگ کی آبادی کے قریب پہنچے تو درختوں

---

[1] روایتوں میں ہے کہ پشاور کی سمت چلا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ مانسہرہ کی طرف آیا ہوگا۔ اس زمانے میں شیر سنگھ یہ سوچ رہا تھا کہ سید صاحب کی قوت کو توڑنے کے لیے کہاں حملہ کرے، بالاکوٹ پہ یا بھوگڑمنگ پر؟

کے نیچے ٹھہر گئے۔ اس وقت کہا کہ بالاکوٹ پہنچنا ہے۔ چنانچہ وہاں سے بالاکوٹ کا رُخ کر لیا۔ راستے میں ایک گاؤں ملا جس کے باہر ایک مکان مسافروں کے لیے تھا، اس میں ٹھہر گئے اور کپڑوں سے برف جھاڑی۔ جب معلوم ہُوا کہ اس گاؤں میں اور کوئی مکان خالی نہیں مل سکے گا تو پھر چل پڑے۔ عصر کی نماز دامن کوہ میں ادا کی، پھر چڑھائی شروع ہو گئی۔ مغرب کی نماز بعض غازیوں نے پہاڑ کی چوٹی پر ادا کی، بعض نے چڑھائی کے دوران میں۔ اس سفر میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ ایک غازی کی بندوق کی نالی برف سے اٹ گئی۔ اس نے بندوق چلائی تو نالی پھٹ گئی اور ایک ٹکڑے سے اس کا رخسار زخمی ہو گیا۔ اخوند زعفران قندھاری ایک درخت پر چڑھنے لگے۔ ساتھیوں نے یہ کہہ کر روکا کہ برف کی سردی ہلاک کر ڈالے گی۔ کہنے لگے کہ چلنے میں بھی زندہ رہنے کی کوئی امید نہیں۔ سامان جنگ یابوؤں اور خچروں پہ سوار تھا۔ چڑھائی میں تو خیر وہ زیادہ نہ رُکے لیکن اترائی میں بالکل بے بس ہو گئے۔

مولانا کی بے بسی

خود مولانا بھی جسم کے کمزور تھے اور زیادہ تر علیل رہتے تھے۔ چلتے چلتے وہ بھی عاجز ہو کر ایک جگہ بیٹھ گئے اور فرمایا: بھائیو کچھ ہو، ہم تو یہاں سے اٹھتے نہیں۔ چند توانا غازی تیزی سے مٹی کوٹ پہنچے اور وہاں سے گوجروں کو چارپائی سمیت لائے۔ چنانچہ مولانا کو چارپائی پہ ڈال کر مٹی کوٹ پہنچایا گیا۔ مولوی سید جعفر علی نقوی پر بھی ایسی ہی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ انھوں نے اپنا سارا سامان یعنی قرابین، شمشیر اور لحاف ایک پنجابی غازی کے حوالے کیا، جس کا نام برکات تھا اور کہا کہ اگر میں زندہ بچا تو لے لوں گا ورنہ اسے بیت المال میں دے دینا۔ پھر ایک گوجر سے کہا کہ میری دستار لے لو اور کسی طرح مجھے گاؤں میں پہنچا دو۔ صرف دستار کی پیش کش اس لیے کی کہ جو سامان وہ گھر سے لائے تھے، اس میں سے محض دستار باقی رہ گئی تھی۔ باقی سب کپڑے بیت المال کے تھے اور انھیں کسی کے حوالے کرنا مولوی صاحب کے نزدیک تقویٰ کے خلاف تھا۔ مولانا کو گوجروں نے گاؤں میں پہنچا دیا تو مولوی جعفر علی کو بھی چارپائی ہی پہ ڈال کر لے گئے۔

جس مکان میں مولانا اور مولوی جعفر علی کو رکھا گیا، وہاں آگ جلا دی گئی لیکن تاکید کر دی کہ دیکھنا آگ کے قریب نہ آنا ورنہ ہاتھ پاؤں بیکار ہو جائیں گے۔ اسی شام کو مٹی کوٹ میں رمضان کا چاند دیکھا۔ مولانا دوسرے دن بالاکوٹ پہنچ گئے۔ مولوی جعفر علی نقوی ہاتھوں اور پاؤں پہ گھی اور نمک مل کر دھوپ میں لیٹے رہے۔ جب چلنے کے قابل ہوئے تو مٹی کوٹ سے گئے۔

لشکر مظفرآباد بھیجنے کا فیصلہ

خوانین مولانا سے ملے تو ان سے بھی مظفرآباد پہ حملے کی درخواست کی۔ مولانا نے غازیوں کو بھیجنے کا وعدہ کر لیا۔ مولوی خیرالدین کو

امیر لشکر بنانا چاہا تو انھوں نے معذرت کر دی اور کہا کہ ان خوانین کا کچھ اعتبار نہیں۔ خدا جانے ہمیں کہاں مصیبت میں الجھا کر الگ ہو جائیں۔ نیز میرا لشکر بے سامان ہے۔ یا تو زبردست خاں سے کہیے کہ پانچ ہزار روپے نقد دے تاکہ میں سامان درست کر لوں یا آپ دو ہزار روپے دے دیں۔ آخر مولانا نے تین سو غازیوں کو زبردست خاں کے ساتھ کر دیا۔ مولوی قطب الدین ننگرہاری، منصور خاں قندھاری اور منشی محی الدین امانی زئی کو مشترکاً اس لشکر کی سالاری کا کام سپرد کیا۔

ادھر یہ لشکر مظفر آباد روانہ ہوا، ادھر حبیب اللہ خاں (گڑھی والا)، نجف خاں (گھوڑی والا) اور منصور خاں (دمابہ والا) سید صاحب کی زیارت کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب یہ سنایا کہ مولوی خیر الدین مظفر آباد نہیں گئے تو سید صاحب نے مولوی صاحب موصوف کے نام فرمان بھیجا کہ بے شک آپ کا عذر معقول تھا، لیکن اب ضرور جانا چاہیے، اس لیے کہ جو لوگ گئے ہیں مبادا انھیں ناواقفی کے باعث نقصان پہنچے اور کاروبار جہاد میں خلل پڑے۔ چنانچہ مولوی خیر الدین بھی دس آدمی لے کر مظفر آباد چلے گئے۔

بالاکوٹ میں دینی مشغولیتیں

بالاکوٹ میں مولوی نصیر الدین منگلوری نے نماز تراویح کا انتظام کیا۔ شاہ اسماعیل بوجہ ضعف و نقاہت شریک نہیں ہوتے تھے، لیکن سب سے علی الاعلان فرماتے رہتے تھے کہ اس بارے میں میری پیروی کوئی نہ کرے۔ میں مجبور ہوں۔ ہاں جس شخص کی مجبوری میرے جیسی ہو، اس کا معاملہ دوسرا ہے۔

اس زمانے ملا محمود، مولانا سے سورۂ انفال کا ترجمہ پڑھتے تھے۔ مولوی جعفر علی نقوی نے بھی پڑھنے کی درخواست کی۔ مولانا نے فرمایا کہ فرصت بالکل نہیں۔

۲۷۔ رمضان کو مولانا نے فرمایا: آج جی چاہتا ہے کہ دو رکعت تراویح میں بھی پڑھ لوں، لیکن شرط یہ ہے کہ امام مجھے بنایا جائے۔ سب نے عرض کیا کہ آپ کے ہوتے ہوئے امامت کا حقدار کون ہے؟ مولوی سید جعفر علی نقوی کہتے ہیں کہ ان دو رکعتوں میں پوری سورۂ بنی اسرائیل پڑھی اور:

بآں لطف خواندند کہ ہیچ نمازے
باحظ و لذت آں نماز از ابتدائے عمر تا الیوم
پس ہیچ کدام امام نگزاردہ ام کہ تمام عمر از
یاد نخواہد رفت[1]

اور اس کیف میں پڑھی کہ ابتدائے عمر
سے آج تک (یعنی تا دم تحریر) کسی امام
کے پیچھے کسی نماز میں وہ لذت نصیب نہ
ہوئی۔ یہ نماز عمر بھر نہ بھولے گی۔

---

[1] منظورہ ۱۱۴۳

سید صاحب سچوں پہنچ گئے

غالباً ۱۷- یا ۱۸- رمضان کو سید صاحب کی بی بی تا کوٹ سے راج دواری پہنچیں۔ اس اثنا میں خوانین نے عرض کیا کہ اب برف کم ہو رہی ہے اور سکھوں کی یورشیں شروع ہونے والی ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ راج دواری سے سچوں تشریف لے چلیں۔ علاوہ بریں ایسی خبریں آئی تھیں کہ سکھوں کا لشکر بھوگڑمنگ پر حملے کے لیے درے کے باہر جمع ہو رہا ہے۔ چنانچہ سید صاحب ۲۲- رمضان (۶- مارچ ۱۸۳۱ء) کو بہ قصد سچوں راج دواری سے روانہ ہو گئے۔ شیخ حسن علی اور ان کے اقربا[1]، نیز حاجی ننھے خاں بنارسی، الٰہی بخش مہاجر، ان کے بھائی، حاجی قاسم پانی پتی، احمد خاں ساکن عیسٰی خیل، رحیم بخش اور بعض دوسرے غازیوں کو راج دواری میں چھوڑا، کچھ خواتین بھی تھیں۔ ساڑھے تین سو غازی آپ کے ساتھ گئے۔ ۲۲- رمضان کی رات شار کول میں بسر کی، جہاں ارباب بہرام خاں مقیم تھے۔ ۲۳- کی رات ایک اور گاؤں میں گزاری، جس کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ ۲۴- رمضان المبارک کو سچوں پہنچ گئے۔ بی بی صاحبہ اور بچی سے یہ آخری مفارقت تھی۔ پھر اس دنیا میں ملاقات مقدر نہ تھی۔

خُطبہ

سید صاحب نے سچوں پہنچ کر ۲۷- رمضان کو جمعے کے موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا، اس میں یہ بھی کہا:

> جب کسی گھر کی کوئی دیوار گر جاتی ہے تو سارے اہل خانہ کو تکلیف پہنچتی ہے۔ زن و مرد و اطفال سب اس کی درستی میں لگ جاتے ہیں۔ کوئی گارا لاتا ہے، کوئی اینٹیں جمع کرتا ہے، کوئی چھت ڈالتا ہے۔ جب رات دن کی محنت سے گھر درست ہو جاتا ہے تو پھر مدت دراز تک لوگ اس میں آرام سے رہتے ہیں۔ اسی طرح اب مسلمانوں کا خانۂ دین معرض انہدام میں ہے۔ کفار نے رہزنوں کی طرح گھر کے مال و متاع پر دست تاراج دراز کر رکھا ہے۔ انھیں کوئی دغدغہ نہیں، اس لیے کہ گھر کے پاسبان اور محافظ کہیں نظر نہیں آتے۔ لازم ہے کہ غفلت سے ماتے آنکھیں کھولیں اور اپنے ویران گھر کی نگہبانی کریں۔ اسے نئے سرے سے محفوظ بنائیں۔ رہزنوں اور چوروں کو گرفتار کر کے کیفر کردار تک پہنچائیں۔ گھر درست ہو جائے، چوری اور رہزنی کا کھٹکا نہ رہے تو پھر بے شک آرام کریں۔

یہ خطبہ ایسے پُر تاثیر انداز میں بیان ہوا تھا کہ اکثر سامعین پر گریہ طاری ہو گیا۔ حسن علی خاں رئیس

---

[1] یعنی شیخ کے دو بھائی، عبدالرحمٰن اور عبدالعزیز اور ایک بھتیجا، عبدالقادر۔

سچوں کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ اس نے اعتراف کیا:

> میں اب تک غازیوں کے کاروبار جہاد کو بچوں کا کھیل سمجھتا تھا، لیکن حضرت کا جمال جہاں آرا دیکھ کر یقین ہو گیا کہ اس عظیم الشان عزم کا انسان اگر ہفت اقلیم کی تسخیر کا ارادہ بھی کر لے تو کچھ عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے تمام ممالک کی فتح آسان کر دے[1]

ضامن شاہ کاغانی

سید صاحب سچوں ہی میں تھے کہ سید ضامن شاہ ساکن کوائی (کاغان) بیس بائیس آدمیوں کے ساتھ زیارت کے لیے پہنچا۔ ان میں آٹھ افراد اس کے اقربا میں سے تھے۔ ضامن شاہ کے ساتھ نامہ و پیام تو پہلے سے جاری تھا لیکن ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سچوں پہنچ کر اس نے اقربا سمیت بیعت کی اور کارو جہاد میں جان و مال سے شرکت کا پیمان باندھا۔ جنگ بالاکوٹ میں بھی چالیس پچاس آدمیوں کے ساتھ شریک تھا۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد بھی مجاہدین کی اعانت میں برابر سرگرم رہا۔ ایک زمانے تک اس کا وطن، کوائی، مجاہدین کا مرکز بنا رہا۔ ضامن شاہ اور جو تحفے لایا، ان کی تفصیل معلوم نہیں لیکن روایتوں میں ایک تحفے کا ذکر تفصیل سے آیا ہے۔ یہ مُرغ زریں کا جوڑا تھا جو سوات اور کاغان کے برفانی علاقوں میں پایا جاتا ہے اور بے حد خوبصورت ہوتا ہے۔ جثہ بھاری کلنگ سا، پروں پر کئی رنگ: کوئی خط سبز، کوئی لاجوردی، کوئی سنہرا؛ کلغی سنہری مائل بہ سبز، چونچ غایت درجہ سُرخ، آنکھیں بھی سُرخ۔ سید صاحب اور ہندوستانی غازیوں نے یہ مُرغ کبھی دیکھا نہ تھا۔ سب کو قدرت کی یہ نادر عجائب کاری سراپا حیرت بنا گئی[2]

تجویز شبخون

ادھر مولانا کو خبر ملی کہ شیر سنگھ اور نجف خاں گڑھی حبیب اللہ واپس آ گئے ہیں اور جگہ جگہ سے فوج جمع کرنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ یہ جنگ کی تیاری تھی۔ بالاکوٹ کا راستہ بہت دشوار گزار تھا اور بہ ظاہر اس قصبے پر براہ راست حملہ مشکل تھا۔ فوج دریائے کنہار کے مغربی کنارے پر جمع ہونے لگی[3] خیال ہوا کہ شاید بالاکوٹ کے بجائے بھوگڑ منگ پر حملہ ہو۔ مولانا نے یہ حالات سید صاحب کو

---

[1] منظورہ صفحہ ۱۱۶۴۔ [2] اس مرغ کی کلغی اور گردن کے سنہرے پروں کو عموماً بچوں کی ٹوپیوں میں بطور کلغی لگاتے ہیں۔ یہ عموماً پانچ ہزار فٹ بلند پہاڑوں میں ہوتا ہے۔ والی سوات کی محافظ فوج کی ٹوپیوں میں مرغ زریں کے پروں کی کلغی ایک امتیازی نشان کے طور پر لگائی جاتی ہے۔

[3] میں نے ہر چند کوشش کی لیکن مقام اجتماع کا تعین نہ کر سکا۔ روایتوں میں کوئی اشارہ تک نہ مل سکا، جسے دلیل راہ بنا سکتا۔ سرسری اندازہ یہ ہے کہ یہ فوج بہ ظاہر دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر کسی کھلی جگہ جمع ہوئی ہو گی۔ ایسی جگہ صرف وہ زمین ہے جسے میدان کہتے ہیں اور بہ قلعہ سے ذرا آگے ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ گڑھی حبیب اللہ خاں سے قریب کوئی اور مقام تجویز کر لیا گیا ہو۔ یقینی طور پر کچھ کہنا

لکھ بھیجے تاکہ وہ دفاع کی مناسب تیاری کر رکھیں۔

ایک روز مولانا نے فرمایا کہ کیوں نہ سکھوں کی لشکر گاہ پر شبخون مارا جائے؟ اسے سب نے پسند کیا۔ چنانچہ غازیوں کا ایک جیش تیار کر دیا گیا اور انھیں حکم مل گیا کہ دوسرے دن عصر کے وقت بالاکوٹ سے روانہ ہو جائیں۔ ایک ایک کرکے اس پہاڑ پر چڑھ جائیں، جس کے نیچے سکھوں کا لشکر تھا۔ دو تین آدمی کمل سر پہ اوڑھ کر چرواہوں کی سی شکل بنا لیں اور لشکر کے احوال پر نگاہ رکھیں۔ باقی پیچھے رہیں۔

ایک غازی نے کہا کہ جہاں سکھ ٹھہرے ہوئے ہیں، وہاں تین طرف پہاڑ ہیں، صرف لاہور کی جانب کا راستہ کھلا ہوا ہے، اسے پہلے سے روک لینا چاہیے۔ مولانا نے اس رائے کی تغلیط کرتے ہوئے فرمایا شبخون کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دشمن کو بے خبری میں نقصان پہنچایا جائے۔ یہ نہیں کہ مستقل صف بندی سے جنگ کی جائے۔ راستہ روکنا بالکل غیر مناسب ہے۔ اس کا نتیجہ تو یہ ہوگا کہ سکھ بالکل عاجز آ کر باقاعدہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیں گے۔

سیّد صاحب کا فرمان

جس روز شبخون مارنے کا فیصلہ ہو چکا تھا، غازی ظہر کے وقت سے مولانا کے پاس پہنچنے لگے۔ آپ مناسب ہدایات دیتے رہے۔ دعا کرکے جیش کو رخصت کرنے کا انتظام کر رہے تھے کہ سید صاحب کا ایک خاص قاصد سچوں سے ایک فرمان لایا۔ اس میں درج تھا:

مدت است کہ آں برگزیدہ بارگاہ
از ما جدا ہستند و اشتیاق از بس داریم۔
نامہ بہ طلب مے رسد و از عقب سردار
حبیب اللہ خاں ہم مے رود۔ حکم قطعی برائے
خود ہمیں دانند کہ زود از زود روانہ نزد ایں
جانب شوند۔ سردار حبیب اللہ خاں در
بالاکوٹ حفاظت جاے خود خواہد نمود[1]

مدت سے آپ ہم سے جدا ہیں
ملاقات کا بے حد اشتیاق ہے، لہٰذا آپ
کو بلایا جاتا ہے۔ سردار حبیب اللہ خاں
بھی آ رہا ہے۔ اپنے لیے قطعی حکم یہ سمجھیں
کہ جلد سے جلد ہمارے پاس آ جائیں۔
سردار حبیب اللہ خاں خود بالاکوٹ میں
بیٹھ کر اپنی اس بستی کی حفاظت کرے گا۔

اس خط کے خاتمے پر مُہر تھی اور پیشانی پر ”کلمۃ اللہ کافی“ سید صاحب نے اپنے دست مبارک سے لکھا تھا اور سید صاحب کی اصطلاح میں اس کلمے سے مراد انتہائی تاکید تھی۔ مولانا نے یہ فرمان پاتے ہی

---

[1] منظورہ صفحہ ۱۱۵۹

فرمایا کہ بھائیو، ہم تو اب جاتے ہیں، اس لیے شبخون کو ملتوی کر دو۔ بعض اصحاب نے عرض کیا کہ حضرت کو مفصل حالات لکھ بھیجیے اور شبخون کو نہ روکیے، بلکہ ٹھہر جائیے۔ مولانا نے جواب دیا کہ فرمان تاکیدی ہے اور میرے لیے عذر کی گنجائش نہیں رہی۔

مولانا کی رائے

مولانا نے سید صاحب کے فرمان سے جو کچھ سمجھا، اس کا خلاصہ یہ تھا: سردار حبیب اللہ خاں کو پہلے بھی یہ خیال تھا کہ سکھوں کا کوئی لشکر دشواری طریق کے باعث بالاکوٹ پر حملہ نہیں کر سکا اور اب بھی حملہ نہیں ہو گا۔ جب اس نے دیکھا کہ درۂ بھوگڑمنگ پر حملے کا خطرہ بڑھ گیا ہے تو سید صاحب سے عرض کیا کہ لڑائی کا زیادہ اندیشہ بھوگڑمنگ میں ہے، لہٰذا اس کی حفاظت اور مدافعت کا بندوبست فرمائیے۔ بالاکوٹ کی حفاظت میں کروں گا۔ اگر سکھوں نے ادھر توجہ کی تو مقابلے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھوں گا۔ سید صاحب نے یہ حالات سُنے تو حبیب اللہ خاں کو بالاکوٹ بھیج دیا اور مولانا کو اپنے پاس بلا لیا، ساتھ ہی مولانا نے ایک بالغ نظر مبصر کی حیثیت میں پیش گوئی کر دی کہ ان شاء اللہ تھوڑے ہی دنوں میں حبیب اللہ خاں ہمیں پھر بالاکوٹ بلائے گا۔

اہل کشمیر کا وفد

مولانا نے اپنی جگہ شیخ بلند بخت دیوبندی کو امیر بنایا۔ سارا انتظام انھیں سونپا، خود ست بنے کے راستے جبوڑی پہنچے جو درۂ بھوگڑمنگ کا ایک گاؤں ہے۔ رات وہاں بسر کی۔ اگلے روز ڈیڑھ پہر دن چڑھے سچوں پہنچ گئے۔ سید صاحب نے بستی سے باہر نکل کر استقبال کیا۔

مولانا بالاکوٹ میں تھے تو اہل کشمیر کا ایک وفد ان کی خدمت میں حاضر ہُوا تھا کہ ہمارا وطن اب صرف تین منزل پر (یعنی ۳۲ ، ۳۳ میل) رہ گیا ہے اور ہم دعائیں مانگ رہے ہیں کہ آپ پہنچیں تو ہمیں سکھوں کے تسلط سے نجات ملے۔ مولانا نے یہ درخواست بھی سید صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ ساتھ ہی عرض کیا کہ جب آپ امب میں تھے تو کئی مرتبہ کشمیر کا ارادہ فرمایا تھا۔ اب ہمارے لشکر کا مقدمۃ الجیش مظفرآباد پہنچا ہُوا ہے۔ وہاں سے وادی کشمیر صرف دو دن کی مسافت پر ہے۔ اگر ملکی لوگ موافقت کریں تو ہم دوسرے روز کشمیر پہنچ سکتے ہیں۔ وہاں کے لوگ سکھوں کی تعدیوں سے بہت متالم ہیں۔ آبادی میں بہت بڑی اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ وہ بہ دل و جاں ہمارا ساتھ دیں گے۔ سید صاحب نے خوانین سے مشورہ کیا۔ انھوں نے تجویز سے اتفاق کیا لیکن کہا کہ سکھوں سے فیصلہ کن جنگ کیے بغیر آپ آگے بڑھے تو سکھ ہم سے ضرور بدلہ لیں گے اور کہیں گے کہ تمھیں لوگوں نے خلیفہ صاحب کو آگے پہنچایا ہے۔ اگر سکھوں کو شکست ہوئی تو ہم لوگ بھی بہ اطمینان قلب آپ کے ساتھ کشمیر جائیں گے۔ یہ سن کر سید صاحب توقف میں پڑ گئے۔

غربا پر شفقت مولانا چاہتے تھے کہ راستے میں لڑے بھڑے بغیر کشمیر پہنچیں تاکہ وہاں کے مسلمانوں کو سکھوں کے خلاف اٹھنے کا موقع مل سکے۔ اس طرح کشمیر سکھوں کے تسلط سے پاک ہو جائے لیکن سید صاحب کا خیال تھا کہ اس طرح بالاکوٹ اور آس پاس کے مسلمان رؤسا و عوام سخت تکلیفوں میں مبتلا ہو جائیں گے، آخر مولانا یہ فرما کر خاموش ہو گئے کہ:

جناب حضرت امیر المومنین را بہ تاسی خیر الانبیاء رحمت بر غربا بسیار است حالانکہ مسئلہ فقہ است کہ اگر کفار مسلمانان را گرفتار نمودہ آنہا را سپر سازند یا در دیوار ہائے قلعہ خود آویزند۔ آں وقت ہم ترک جہاد و قتال و تسخیر آں قلعہ غازیاں را مناسب نیست بلکہ قصد کشتن کفار نمایند وحتی الوسع والامکان اہل اسلام را از اسلحہ خود محفوظ دارند اگر بالفرض والتقدیر از دست ایشاں آسیبے بہ مسلمانان برسد یا آنہا کشتہ شوند در آں نہ دیت است، و قصاص و نہ گناہے[1]

حضرت امیر المومنین، حضور رحمۃ للعالمین کے اسوۂ مبارکہ کی پیروی میں غریبوں پر بہت شفیق ہیں، حالانکہ فقہ کا مسئلہ ہے کہ کافر اگر مسلمانوں کو گرفتار کر کے اپنے لیے ڈھال کے طور پر استعمال کریں یا انھیں قلعے کی دیواروں کے ساتھ لٹکا دیں۔ (تاکہ مسلمان قلعے پر گولے گولیاں نہ برسائیں) تو اس حالت میں بھی جہاد و قتال یا تسخیر قلعہ کی تدابیر سے دست کش ہونا مناسب نہیں، بلکہ غازیوں کو چاہیے کہ کافروں کو مارنے کے لیے قدم بڑھائیں اور حتی الوسع مسلمانوں کو اپنے واروں سے بچائیں۔ اگر ان مسلمانوں کو غازیوں کے ہاتھ سے گزند پہنچے یا وہ مارے بھی جائیں تو نہ ان کے لیے خوں بہا مانگا جائے گا، نہ قصاص لیا جائے گا اور نہ کوئی گناہ ہو گا۔

غرض کشمیر پر پیش قدمی کی تجویز اس وجہ سے ملتوی کرنی پڑی کہ سکھوں کے حملے کا انتظار کر لیا جائے اور ضرورت ہو تو ان سے جنگ کی جائے پھر قدم آگے بڑھایا جائے۔

درس مشکوٰۃ مولانا سچوں پہنچے تو سید صاحب کے حکم کے مطابق مشکوٰۃ کا درس شروع کر دیا۔ صبح ایک

---

[1] منظورہ صفحہ ۱۱۴۰

مجلس خاص میں، جس میں سید صاحب بھی موجود ہوتے، مولانا چند حدیثوں کا ترجمہ سناتے اور ان کی شرح کرتے۔ عصر کے بعد مجمع عام میں مشکوٰۃ کی قریباً ایک فصل پیش نظر رکھ کر وعظ فرماتے۔

سید صاحب خود بھی ان دنوں مشکوٰۃ کا مطالعہ فرماتے رہتے۔ اکثر اوقات فراغت میں کتاب لے کر چارپائی پر لیٹ جاتے اور مطالعہ شروع کر دیتے۔ اگر کوئی لفظ سمجھ میں نہ آتا اور رفیقوں میں سے کوئی عالم پاس سے گزرتا تو اس سے معنی پوچھ لیتے[1] بعض اوقات خود بعض احادیث کے اسرار و رموز بیان فرماتے۔

سیچوں کے مکان بھی عام پہاڑی بستیوں کی طرح اوپر تلے تھے۔ ایک روز مکانوں پر چڑھے تو فرمایا کہ آؤ ذرا تیر اندازی کی مشق کر لیں۔ پچیس تیس قدم پر بھینس کا گوبر پڑا تھا، اسی کو نشانہ ٹھہرا کر تیر اندازی ہونے لگی۔ کسی کا تیر نشانے پر نہ بیٹھا۔ سید صاحب نے جتنے تیر پھینکے سب اس میں پیوست ہوئے۔ پھر گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکلے اور ایک درخت کو نشانہ ٹھہرا کر تیر چلاتے رہے۔

فارغ ہوئے تو سب کے ساتھ زمین پر بیٹھ گئے۔ لوگ چارپائی لے آئے۔ آپ نے اس پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ نیازمندوں نے عرض کیا کہ آپ ہمارے مرشد و امام ہیں۔ فرمایا:

> جیسے آپ سب ہیں، ویسا ہی ایک میں بھی ہوں۔ مجھ کو کب مناسب ہے کہ چارپائی پر بیٹھوں اور آپ سب زمین پر بیٹھیں۔

مقصد و نصب العین

پھر فرمایا:

> بھائیو! میں جو اپنے وطن سے اتنے بندگانِ خدا کو جا بجا لے کر اور طرح طرح کی سختی اور مصیبت اٹھا کر آپ کے اس ملک کوہستان میں آیا، فقط اس واسطے کہ آپ کے ملک پر کفار غالب ہو گئے اور طرح طرح کی آپ کو تکلیف اور ذلت دیتے ہیں، ان کو مددِ الٰہی سے مغلوب کروں تاکہ آپ اپنی ریاستوں پر قابض و متصرف ہوں اور دینِ اسلام قوت پکڑے۔ اگر میں طالبِ عیش و آرام ہوتا تو میرے واسطے ملک ہندوستان میں طرح طرح کے عیش و آرام تھے۔ اس کوہستان میں کبھی نہ آتا۔ سو مراد اس گفتگو سے یہ ہے کہ آپ سب بھائی حکومتِ کفار سے غیرت کریں اور جان و مال سے میرے ساتھ شریک ہوں۔ اور شرکت نہ کرو گے تو چند روز میں ایسا

---

[1] اس سے ظاہر ہے کہ سید صاحب عربی بخوبی جانتے تھے، ورنہ مشکوٰۃ کا مطالعہ کیوں کر فرماتے تھے۔

> افسوس اور غم کرو گے کہ بیان اس کا تقریر سے باہر ہے۔ پھر وہ افسوس اور غم کچھ کام نہ آئے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ میرے ہاتھوں سے اپنا کام لینا چاہے گا تو اپنے اور بندوں کو میرے ساتھ کر دے گا اور ان کے ہاتھوں سے اپنے دین اسلام کو غالب کرے گا۔[1]

آس پاس کے گوجر اکثر ملنے کے لیے آتے تھے۔ سید صاحب ان کی بہت مدارات فرماتے تھے۔ ایک ولایتی ملّا کئی روز آپ کے پاس رہا۔ ایک روز اس نے محمد امیر خاں قصوری کو، جو نوجوان تھے۔ دیکھ کر کہا کہ حضرت! آپ کے لشکر میں زیادہ تر نوعمر لڑکے ہیں۔ ہتھیار بھی درست نہیں اور ارادہ والیِ لاہور سے لڑنے کا ہے۔ یہ بات میرے خیال میں محال نظر آتی ہے۔ سید صاحب نے فرمایا:

> اخوند صاحب! لڑائی کی فتح اور شکست اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ کثرت فوج اور درستی اسلحہ پر موقوف نہیں۔ اللہ تعالیٰ تھوڑوں کو بہتوں پر کامیاب کرتا ہے اور بہتوں کو تھوڑوں پر۔ دوسری بات یہ ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کارِ خیر ہے۔ جو کوئی خلوص دل اور اعتقاد درست سے شریک ہوگا، لڑکا ہو یا جوان یا بڈھا، اس کی بہرطور فتح ہے اور جس کی نیت میں خلل ہے اگر اسلام کی جہاں بھر پہ فتح ہوئی، مگر اس کی شکست ہوئی اور میں تو جب تک زندہ رہوں گا، انشاء اللہ اس کام کو نہ چھوڑوں گا۔ بعد میرے جب تک پروردگار چاہے گا، اس سلسلے کو جاری رکھے گا۔[2]

پھر امیر خاں سے فرمایا کہ ذرا اپنے یہاں آنے کا حال تو سناؤ۔ اس جانباز نے جو داستان سنائی، وہ تفصیلاً اس کے حالات میں بیان ہوگی۔ یہاں اسے چھیڑنا مناسب نہیں۔ بہرحال پورے حالات سن کر ملّا کو یقین ہوگیا کہ سید صاحب نے مختلف اصحاب میں کس درجہ عزیمت پیدا کر دی تھی۔

دُعائیں ایک روز مولانا سے فرمایا: میاں صاحب دل میں آتا ہے کہ جناب الٰہی میں خوب دُعا کریں، میں گوشۂ تنہائی میں بیٹھ جایا کروں گا۔ آپ سب بھائیوں کو لے کر جنگل میں نکل جایا کریں۔ چنانچہ پانچ سات روز تک اسی طرح دعاؤں کا سلسلہ جاری رہا۔ سید صاحب بعد نماز عصر ایک حجرے میں الگ تھلگ بیٹھ جاتے اور مغرب تک دعا میں لگے رہتے۔ مولانا غازیوں کو لے کر بستی سے باہر ٹالے پر چلے جاتے۔ وہاں ایک بھاری پتھر تھا۔ اس پر تشریف فرما ہوتے، غازی اردگرد بیٹھ جاتے۔ کچھ دیر تک مولانا وعظ فرماتے، پھر ننگے سر ہو کر کمال عجز و انکسار سے دیر تک دُعا

---

[1] وقائع جلد سوم صفحہ ۴۱ و ۲۲۲ — [2] وقائع جلد سوم صفحہ ۴۶، ۴۷

کرتے تھے۔

ماہ شوال[1] میں مولوی خیر الدین شیرکوٹیؒ کا عریضہ آیا، جس میں جنگ مظفر آباد کے حالات تفصیلاً درج تھے۔ اس جنگ کی کیفیت اگلے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ کشمیر سے عرضی رنجیت سنگھ کے پاس پہنچی، سید صاحب اور زبردست خاں نے علاقہ مظفر آباد و کشمیر کے چند گاؤں تاراج کر ڈالے ہیں۔ رنجیت سنگھ نے کھڑک سنگھ کو حکم بھیجا کہ خود حسن ابدال یا سرائے کالا میں ٹھہرے رہو اور فوج مظفر آباد بھیج دو۔

---

[1] مطابق ۱۸۳۱ء

چھتیسواں باب

جنگ مظفر آباد

زبردست خاں کی عہد شکنی

ہم بتا چکے ہیں کہ مولانا نے بالاکوٹ سے جن غازیوں کو زبردست خاں کے ساتھ مظفر آباد بھیجا تھا، ان کے تین جیش تھے اور تینوں کے سالار الگ الگ تھے۔ انھیں باہم مشورے سے حسب ضرورت جنگی اقدامات کی ہدایت کی گئی تھی۔ غازیوں نے مظفر آباد پہنچتے ہی بازار اور زبردست خاں کے محل پر قبضہ کر لیا۔ سکھوں کے ہاتھ میں صرف چھاؤنی اور گڑھی رہ گئی۔ اس اثنا میں سید صاحب کے فرمان کے مطابق مولوی خیرالدین شیرکوٹی محاذ مظفر آباد کے سالار اعظم بن گئے۔

زبردست خاں کو اطمینان سے بیٹھنے کا موقع مل گیا تو اس نے خفیہ خفیہ سکھوں سے نامہ و پیام شروع کر دیا۔ عام روایت کے مطابق خاں کا مطالبہ یہ تھا کہ سکھ لوٹا ہوا سامان واپس کر دیں اور فرمانبرداری کا پختہ عہد لے لیں۔ اس نامہ و پیام کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ غازیوں کے ساتھ امداد کا جو وعدہ اس نے کیا تھا اس میں لیت و لعل شروع ہو جاتی۔ مولوی خیرالدین بار بار فرماتے کہ ساز و سامان جنگ مہیا کرو تاکہ ہم آگے بڑھیں۔ خاں ٹالم ٹول کرنے لگا یہاں تک کہ غازیوں کو خفیہ نامہ و پیام کا حال معلوم ہو گیا۔

اچانک یورش

عبدالصمد خاں خیبری اور قطب الدین ننگرہاری کو اس بات پر اتنا غصہ آیا کہ سالار اعظم کو اطلاع دیے بغیر مظفر آباد چھاؤنی پر حملہ بول دیا۔ زبردست خاں کے بھائی بھی اس میں شریک تھے۔ غازیوں کا فوری مدعا غالباً یہ تھا کہ زبردست خاں کے خفیہ نامہ و پیام کو ناکام بنا دیں۔ سخت جنگ ہوئی، جس میں سکھوں کا بڑا جمعدار اور اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے۔ چھاؤنی غازیوں کے قبضے میں آگئی۔ اس جنگ میں ملا قطب الدین کا بازو زخمی ہوا۔ عبدالصمد خاں خیبری کے سات گولیاں لگیں، لیکن ان میں سے صرف ران کا زخم گہرا تھا۔ باقی بالکل معمولی تھے۔ اور غازی بھی مجروح ہوئے۔ مولوی خیرالدین اس بات پر بہت خفا ہوئے کہ اجازت کے بغیر حملہ کر دیا گیا، لیکن چونکہ چھاؤنی پر قبضہ ہو گیا تھا، اس لیے خطا معاف کر دی۔ زخمیوں کو بالاکوٹ کے راستے بیچوں بھجوا دیا تاکہ وہاں اطمینان سے ان کا علاج ہو سکے۔

گومگو کی حالت

اب مولوی خیر الدین نے زیادہ زور دار طریق پر ساز و سامان کا مطالبہ کیا تاکہ گڑھی کو بھی سکھوں سے خالی کرالیں، اس لیے کہ گڑھی کو خالی نہ کرایا جاتا تو مظفر آباد کے جتنے حصّے پر قبضہ ہو چکا تھا، وہ بھی خطرے میں پڑا رہتا۔ زبردست خاں کو اوّل تو یہ امید تھی کہ سکھوں کے ساتھ معاملہ روبراہ ہو جائے گا۔ دوسرے وہ طبعاً بخیل تھا اور اس کی آرزو تھی کہ کچھ خرچ کیے بغیر ہی سب مقاصد پورے ہو جائیں۔ وہ وعدے کرتا رہا لیکن کچھ دینے پر آمادہ نہ ہُوا[1]۔ مولوی صاحب نے یہ حالات مولانا کو لکھ بھیجے۔

مظفر آباد کشمیر کے راستے کا نہایت اہم مقام تھا۔ یہ گوارا نہ تھا کہ وہ سکھوں کے قبضے میں چلا جائے۔ لیکن زبردست خاں نے جو ڈھنگ اختیار کر لیا تھا، اسے پیش نظر رکھتے ہُوئے غازیوں کی بڑی جماعت کو مظفر آباد میں بٹھائے رکھنا بالکل بے سود معلوم ہوتا تھا، لہٰذا مولوی خیر الدین کو لکھا کہ قندھاری اور ننگرہاری غازیوں کو واپس بھیج دیا جائے۔ اگر زبردست خاں آپ کی مراجعت پر ناخوش ہو تو آپ ٹھہر جائیں۔ مولوی صاحب نے غازیوں کو حکم سُنایا تو اُنھوں نے کہا کہ ہم آپ کو ساتھ لے کر جائیں گے اور زبردست خاں کے پاس نہ چھوڑیں گے۔ خدا جانے وہ کیسا سلوک کرے۔

دشمن کی آمد

زبردست نے تذبذب کے باعث فیصلہ کن اقدام کے بہترین مواقع ضائع کر دیے۔ دفعۃً خبر ملی کہ شیر سنگھ اور نجف خاں مختلف علاقوں میں پھر پھرا کر گڑھی حبیب اللہ خان پہنچ گئے ہیں[2]۔ یہ سنتے ہی زبردست خاں اضطراب کا ہدف بن گیا۔ اب اس نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ مجھے پہلے ہی سے ان خطرات کا اندیشہ تھا۔ اگر سامان دے دیتے تو دفاع کے پورے انتظامات کر لیتا۔ اب بھی ہر خطرے کی روک تھام ممکن ہے، بہ شرطیکہ میرے لشکر کے لیے ضروری سامان فراہم کر دیں اور جو مقامات آپ کے نزدیک سخت خطرے کے ہوں، ان کی حفاظت میرے حوالے کر دیں۔ اپنے آدمی ان مقامات پر بٹھا دیں، جہاں چنداں خطرہ نہ ہو۔ زبردست خاں نے اس تجویز کا خیر مقدم کرتے ہُوئے کہا کہ اب رات ہو گئی ہے، صبح ہوتے ہی پورا سامان غازیوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔

---

[1] منظورہ میں ہے کہ زبردست خاں بالاکوٹ میں پہلی مرتبہ مولانا سے ملا تو آپ نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہُوئے بعض ساتھیوں سے یہ بھی کہا تھا کہ اس کی روِش کلام سے نفاق مترشح ہوتا ہے (صفحہ ۱۱۳۰)۔ [2] بعض روایتوں میں ہے کہ غازیوں نے گڑھی کا محاصرہ کر رکھا تھا، سکھوں نے ایک سوار کے لیے لڑائی بند کر دینے کی درخواست کی۔ مولوی خیر الدین اس پر راضی نہ تھے۔ زبردست خاں نے سکھوں کی درخواست مان لی۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر سکھوں نے کمک کے لیے درخواست شیر سنگھ کے پاس بھیج دی۔

فرار

مظفر آباد کے ایک کنارے چھوٹی سی مسجد تھی۔ اس کے پاس سے پہاڑوں جانے کا راستہ تھا۔ مولوی صاحب صبح کی نماز سے فارغ ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ زبردست خاں کا سارا سامان گٹھوں میں بندھا ہوا مسجد کے قریب دھرا ہے۔ یہ فرار کی تیاری تھی۔ مولوی صاحب حیران رہ گئے۔ اس اثنا میں زبردست خاں آگیا اور بولا:

"چلیے"

مولوی صاحب: کہاں؟

زبردست خاں: پہاڑوں میں!

مولوی صاحب: کیا ہوا؟ کون سی نئی بات پیش آگئی کہ رات کی تجویز نظر انداز کرنی پڑی؟

زبردست خاں بتاتا کچھ نہیں تھا، بار بار یہی کہتا تھا کہ "چلیے"۔ اس کے آدمی ہراس زدگی کے عالم میں پہاڑوں پر چڑھے جا رہے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر سکھ لشکری گڑھی سے باہر نکل آئے اور زبردست خاں کے آدمیوں پر گولیاں برسنے لگیں۔ وہ ادھر ادھر پتھروں کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب نے غازیوں کو مقابلے کا حکم دے دیا۔ سکھ پیچھے ہٹے تو گڑھی میں جانے کے بجائے انھوں نے بستی کے چند مکانوں میں آگ لگادی۔ عین اس وقت زبردست خاں کا داماد قطب الدین خاں آیا اور اپنے خسر کا ہاتھ پکڑ کر مولوی صاحب کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا: اس شخص کی شرم آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آج اس کا کوئی ہمدرد اور ساتھی نہیں۔ صرف آپ اسے بچا سکتے ہیں۔"

مولوی صاحب بولے: "بے فکر رہیے جب تک میں زندہ ہوں، زبردست خاں کو ان شاء اللہ کوئی آزار نہ پہنچے گا۔"

سفرِ مراجعت

مظفر آباد سے بالاکوٹ آنے کے دو راستے تھے: ایک گڑھی حبیب اللہ خاں کے پاس سے جسے ایک روز میں طے کیا جا سکتا تھا، اس لیے کہ پورا فاصلہ بیس میل سے زیادہ نہ تھا: لیکن اس راستے میں سکھوں کا لشکر ڈیرے ڈالے پڑا تھا۔ اگر سکھوں کو خبر ہو جاتی تو سخت مقابلہ پیش آتا۔ دوسرا راستہ بہت دشوار گزار پہاڑوں میں سے تھا۔ یہ پُرپیچ ہونے کے باعث چالیس میل سے کم نہ تھا اور اس راستے سے بالاکوٹ پہنچنے میں چار دن لگتے تھے۔ چونکہ اس میں دشمن سے مقابلے کا کوئی خطرہ نہ تھا، لہٰذا مولوی خیر الدین نے یہی راستہ اختیار کیا اور سید صاحب کو اس بارے میں اطلاع بھی بھیج دی۔ البتہ اس راستے میں برف کا خطرہ تھا، اس لیے سید صاحب نے راستے کے گوجروں کو کہلا بھیجا کہ دس دس بیس بیس آدمی جگہ جگہ سے برف ہٹانے کے لیے مقرر کر دیے جائیں۔

اب اس راستے کی کیفیت ملاحظہ فرما لیجیے :

۱ - مولوی خیرالدین مظفرآباد کے پاس سے پہاڑ پر چڑھے تھے۔ گجو سیداں اور کنڈا ہوتے ہُوئے نورسیری پہنچے، جس کا فاصلہ مظفرآباد سے بارہ میل ہے۔ یہیں قطب الدین اور منصور خاں ٹھہرے ہُوئے تھے۔

۲ - نورسیری اس لیے گئے کہ یہیں سے دریائے کشن گنگا عبور کیا جا سکتا تھا۔ وہاں کشتی بھی تھی جسے مقامی اصطلاح میں "ڈونڈا" کہتے ہیں اور چمڑے کے رسّوں کا پُل بھی بنا ہُوا تھا۔ دریا کے بائیں کنارے پر گھنڈی بیراں، پڑسچا اور گھوڑی قریب قریب واقع ہیں۔ گھوڑی وہی مقام ہے جس کی بنا پر بمن خاں کو "گھوڑی والا" کہتے ہیں اور پڑسچا میں اس کے اخلاف اب بھی موجود ہیں۔

۳ - عبورِ دریا کے بعد مولوی صاحب سید پور گئے، جو پڑسچا سے سات میل ہے۔

۴ - سید پور سے نورگلی پہنچے، جہاں برف کے ہونے کا امکان تھا، اس لیے سید صاحب نے برف ہٹانے کے لیے گوجروں کو پیغام بھیجا تھا۔

۵ - نورگلی سے بالاکوٹ کا راستہ گیارہ بارہ میل سے کم نہ ہوگا۔

وقت گزر گیا

ایک مصیبت یہ پیش آئی کہ مولوی خیرالدین کو سخت بخار آگیا۔ ساتھ ہی خبر ملی کہ بالاکوٹ میں جنگ ہونے والی ہے۔ اب ہر غازی کی یہ خواہش تھی کہ جس طور بھی ممکن ہو، جلد سے جلد بالاکوٹ پہنچ جائے۔ مولوی صاحب چل نہیں سکتے تھے اور انھیں چارپائی پر لٹا کر چار آدمیوں نے اٹھا لیا۔ ۲۴ - ذی قعدہ کو وہ دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر بالاکوٹ کے سامنے پہنچ گئے۔ اس وقت تک دریا کا پل توڑا جا چکا تھا۔ وہ درہ کاغان کی طرف پلٹے تاکہ کسی دوسرے گھاٹ سے دریا کو عبور کریں۔ جب وہ چکر کاٹ کر ان پہاڑوں پر پہنچے جو بالاکوٹ کے شمال میں ہیں تو معلوم ہُوا کہ جنگ ختم ہو گئی اور اکثر غازی شہادت پا گئے۔ جو باقی بچے وہ میدانِ جنگ سے باہر جا رہے تھے۔

سیّد صاحبؒ کے حالات

ہم نے سید صاحب کو سچوں میں چھوڑا تھا اور آپ نے مولانا کو بھی اپنے پاس بلا لیا تھا۔ اس وقت خیال تھا کہ غالباً سکھ درہ بھوگڑمنگ پر حملہ کریں۔ مظفرآباد سے مولوی خیرالدین نے جب یہ اطلاع بھیجی تھی کہ سکھوں نے شیر سنگھ سے کمک مانگی ہے تو سید صاحب نے خوانین کو جمع کر کے مشورہ لیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ یہ بھی فرمایا کہ ہمارے غازی جابجا بکھرے پڑے ہیں، کچھ راج دواری میں ہیں، کچھ بالاکوٹ اور مظفرآباد میں، کچھ ہمارے پاس ہیں، کچھ بھوگڑمنگ میں۔ طریق کار کے باب میں کوئی فیصلہ نہ ہُوا تھا کہ بالاکوٹ سے حبیب اللہ خاں کی عرضی پہنچی۔ اس میں مرقوم تھا کہ شیر سنگھ بالاکوٹ پر پیش قدمی کرنے والا ہے، اس لیے آپ بالاکوٹ آ جائیں۔ اس طرح

مظفر آباد کے غازیوں کو بھی تقویت پہنچے گی۔ سید صاحب نے یہ تجویز منظور فرمالی۔

بی بی صاحبہ کو آخری پیغام

بالاکوٹ کے لیے تیار ہوئے تو ارادہ فرمایا کہ بی بی صاحبہ اور دوسری خواتین کو بھی ساتھ لے لیں۔ چنانچہ مولوی عبدالقیوم کو سچوں سے راج دواری بھیج دیا کہ خواتین کو لے آئیں۔ پھر خیال آیا کہ اغلب ہے جنگ پیش آجائے۔ اس صورت میں خواتین کو ساتھ لینا مناسب نہ ہوگا۔ چنانچہ مولوی عبدالقیوم کو راستے سے واپس بلا لیا۔ مولوی الٰہی بخش اور میاں جی نظام الدین کو مندرجہ ذیل پیغام بی بی صاحبہ کے نام دے کر راج دواری بھیج دیا۔

> اوّل اپنے پاس بلا لینے کا ارادہ تھا، پھر سکھوں کے آنے کی خبر گرم ہوئی۔ ہم ادھر جا رہے ہیں۔ عجب نہیں، ان سے مقابلہ ہو جائے۔ دیکھا چاہیے انجام کیا ہو۔ اس سبب سے بلانا مناسب نہ جانا۔ کسی بات کا اندیشہ نہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے اور ہم سب کے لیے دعا کرنا۔

معیت کا اضطراب

یہ دونوں قاصد راج دواری جاتے اور وہاں سے لوٹتے وقت شارکول بھی ٹھہرے جہاں ارباب بہرام خاں مقیم تھے۔ ارباب کو جب بالاکوٹ کے قصد کا علم ہوا تو پیغام دیا کہ میری طبیعت یہاں بہت گھبراتی ہے۔ حضرت سے عرض کرنا کہ اجازت ہو تو میں بھی حاضر ہو جاؤں۔ تیسرے روز انھیں بھی سچوں بلا لیا۔ قریباً بیس آدمی ان کے ہمراہ تھے۔

ارباب کی طرح ہر شخص معیت کے لیے مضطرب تھا۔ مولوی نصیرالدین منگلوری پہلے سے درۂ بھوگڑمنگ کی حفاظت پر مامور تھے۔ بالاکوٹ روانہ ہونے سے پہلے میاں ضیاء الدین پھلتی اور خضر خاں قندھاری کو بھی تھوڑے آدمیوں کے ساتھ مولوی نصیرالدین کے پاس جانے کا حکم دے دیا۔ خضر خاں بار بار عذر پیش کرتا رہا کہ جنگ درپیش ہے۔ مجھے ہم رکابی کے شرف سے محروم نہ رکھیے۔ سید صاحب نے عادت شریف کے مطابق نرمی اور ملائمت سے سمجھا کر اسے راضی کیا۔

سچوں سے روانگی

ذی قعدہ کی پانچویں تاریخ تھی (۱۷- اپریل ۱۸۳۱ء)، اتوار کا دن تھا کہ سید صاحب سچوں سے بالاکوٹ روانہ ہوئے یا کہنا چاہیے کہ حیات مستعار کی آخری منزل میں انھوں نے قدم رکھا۔[1] سچوں سے اڑھائی کوس پر جبوڑی[2] ہے۔ وہاں کے لوگوں نے بہ اصرار روک لیا، رات

---

[1] منظورہ میں ہے ماہ ذی القعدہ بہ نصف رسیدہ بود۔ (صفحہ ۱۱۴۵)۔ میرے نزدیک "وقائع" ہی کا بیان صحیح ہے کہ سچوں سے ذی قعدہ کی پانچویں کو نکلے۔

[2] روایتوں میں اس مقام کا نام گج بوڑی لکھا ہے۔ میں نے موقع پر پہنچ کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ گج بوڑی سچوں

جیوڑی میں گزاری۔ صبح کھانا کھا کر روانہ ہوئے۔ وہیں سے پہاڑ کی چڑھائی شروع ہو گئی۔ آپ ہاتھی پر سوار تھے اور جلد پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ جب راستہ اتنا خراب آ گیا کہ سواری میں اسے طے کرنا قرین احتیاط نہ رہا تو اتر کر پیدل چلنے لگے۔ اس اثنا میں معلوم ہوا کہ گوجروں کی عورتیں دہی کے مٹکے اور ہانڈیاں لیے راستے سے ہٹ کر بیٹھی ہوئی انتظار کر رہی ہیں تاکہ خود یہ ہدیہ آپ کی خدمت میں پیش کریں۔ آپ نے ہر مٹکے میں سے تھوڑا تھوڑا ہی چکھا اور ان کے لیے دعا کی، شاید کچھ رقم بھی دی۔

مولانا کا وعظ

مولانا کمزور تھے۔ پہاڑ کی چڑھائی میں چند قدم پر سانس پھول جاتا اور تھک جاتے تو پتھر پر بیٹھ کر وعظ فرمانے لگتے۔ سانس اعتدال پر آ جاتا تو چل پڑتے۔ ایک موقع پر فرمایا:

> بھائیو! خیال کرو۔ اگر ہم کسی امیر یا رئیس کے نوکر چاکر ہوتے اور وہ اپنے کسی کام کے لیے ایسے دشوار گزار راستے پر بھیجتا تو بلا عذر جاتا اور رنج راہ اٹھانا پڑتا۔ لیکن وہ نوکری صرف گزران دنیا کے لیے ہوتی۔ الحمد للہ آج ہم کسی کے نوکر نہیں ہیں بلکہ محض اپنے پروردگار کی خوشنودی و رضامندی کے لیے یہاں آئے ہیں اور خوشی خوشی یہ سب محنتیں اور مشقتیں اٹھاتے ہیں۔ اگر ہماری نیتیں خالص ہیں تو اللہ تعالیٰ آخرت میں بڑا درجہ دے گا۔[1]

پہاڑ پر مقام

پہاڑ کی چوٹی پر کئی چشمے جاری تھے۔ سید صاحب وہاں ٹھہر گئے اور ظہر کی نماز ادا کی۔ پھر اترائی شروع ہو گئی۔ تھوڑی دور گئے تھے کہ ایک وسیع میدان ملا۔ اس میں بھی چشمہ بہتا تھا۔ سید صاحب نے مولانا سے فرمایا کہ آپ بالاکوٹ چل کر ہمارے لیے کھانے پینے کا انتظام کریں، عصر کے وقت ہم یہاں سے چلیں گے۔ قریباً ایک سو غازی آپ کے ساتھ ٹھہر گئے۔ مولانا جا چکے تو سید صاحب نے پیچھے پیغام بھیج دیا کہ ہمارا انتظار نہ کیا جائے۔ ہم رات پہاڑی ہی پہ بسر کریں گے اور صبح کو آئیں گے۔

تمام غازیوں کا سامان بالاکوٹ جا چکا تھا اور کسی کے پاس رات کو اوڑھنے کے لیے بھاری کپڑا نہ تھا۔ وہ پریشان ہو کر ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ پہاڑ پر رات کیوں کر بسر ہو گی۔ سید صاحب کے کان میں یہ بات پہنچی تو فرمایا: پروردگار نے میرے ساتھ بڑی مہمانیوں کا وعدہ فرمایا ہے۔ ان میں سے ایک مہمانی آج کی رات سہی۔

---

[1] وقائع جلد سوم صفحہ ۸۳، ۸۴۔

نمازِ مغرب کے بعد آپ چشمے کے کنارے بیٹھ گئے اور رب العالمین کی رزّاقی و ربوبیت کا ذکر چھیڑ دیا۔ اسی ذکر میں عشا کا وقت ہو گیا۔ ساتھیوں پر رقت طاری تھی۔ پھر آپ نے برہنہ سر ہو کر دعا کی۔ عشا کی نماز پڑھنے کے بعد آپ قضائے حاجت کے لیے نکلے۔

یادِ خدا

جس جگہ ٹھہرے تھے، اس کے ایک جانب موضع ست بنے اور دوسری جانب کچھ فاصلے پر جنگلی درختوں کا جھنڈ تھا۔ آپ ان درختوں کی طرف چلے گئے۔ پندرہ سولہ غازی ساتھ تھے۔ آپ کے خادمِ خاص میاں فرجام کے ہاتھ میں پانی کا لوٹا تھا۔ تھوڑی دُور جا کر حافظ صابر تھانوی اور پھلت کے ایک صاحب[1] کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے اور ساتھیوں سے فرمایا:

> بھائیو! اگر چند روز کی مہلت ہو تو جی چاہتا ہے کہ کسی پہاڑ پر تنہا بیٹھ کر اپنے پروردگار کو خوب راضی کر لوں۔ آپ لوگ بھی عبادت میں لگ جائیں۔

ساتھیوں نے عرض کیا کہ ہم لوگ جب تک آپ کو دیکھتے رہتے ہیں، تسکین رہتی ہے۔ عبادت بھی اپنے حوصلے کے مطابق کر لیتے ہیں۔ جب آپ نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں تو دلوں پر پریشانی طاری ہو جاتی ہے۔ ہمارے لیے تو دو چار گھڑی کی مفارقت بھی ناقابلِ برداشت ہے۔

درخت قریب تھے، آدمیوں کی آہٹ پا کر پرندے بولنے لگے۔ سید صاحب نے ان کی آواز سُن کر فرمایا:

> یہ پرندے جا بجا سے دانہ دانہ چُن کر پیٹ بھرتے ہیں، مگر اپنے پروردگار کی یاد سے غافل نہیں رہتے۔ انسانوں کو دیکھو کہ طرح طرح کی نعمتیں بے رنج و مشقت اللہ تعالیٰ کھلاتا پلاتا ہے، پھر بھی ہم سے اس کی یاد نہیں ہو سکتی۔

طبیعت میں تغیر

پھر آپ تنہا درختوں کی طرف چلے گئے اور اتنی دیر وہاں لگائی کہ ساتھی گھبرا گئے[2] ان پہاڑوں میں درندے بھی رہتے تھے۔ دلوں میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو جانا غیر اغلب نہ تھا۔ واپس آئے تو صرف اتنا فرمایا کہ بڑی دیر ہو گئی۔ راویوں کا بیان ہے کہ اس وقت سے آپ کی طبیعت میں نمایاں تغیر پیدا ہو گیا۔ اس سے بیشتر جہاد کی مختلف تدبیروں سے اتنی دل بستگی تھی کہ ایک ایک امر کے متعلق مشورے فرماتے تھے اور جب تک پورا اطمینان نہ ہو جاتا، کوئی حکم صادر نہ کرتے۔ درختوں کے جھنڈ سے واپس آئے تو بات بات میں تفویض و توکل کا رنگ غالب تھا اور تدبیریں

---

[1] ان کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ [2] ایک روایت یہ ہے کہ چار گھڑی وہاں رہے، یعنی ڈیڑھ گھنٹہ

کی تفصیلات سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔

ایک کپڑا بچھا دیا گیا۔ آپ لیٹ گئے اور ساتھی پاؤں دبانے لگے، لیٹے لیٹے فرمایا:

> بھائیو! خیال کرو کہ پروردگار نے ہم لوگوں کے واسطے کہاں کہاں روزی مقرر کی ہے۔ جس طرح چڑیاں اپنی روزی کے دانے، جہاں جہاں پروردگار نے مقرر کیے ہیں، وہاں چلتی پھرتی ہیں، اسی طرح ہم لوگ بھی مقدر کی روزی کھاتے پھرتے ہیں اور اپنے پروردگار کا کام بھی اپنی طاقت کے موافق کرتے ہیں۔[1]

مہمانی کا خدا ساز بندوبست

اس اثنا میں دُور سے دو تین مشعلیں نظر آئیں۔ تھوڑی دیر میں مشعلیں قریب آگئیں تو معلوم ہُوا کہ چند آدمی ملاقات کے لیے آئے ہیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ کچھ رات گئے ہمیں آپ کی تشریف فرمائی کی خبر ملی، اس وجہ سے حاضری میں دیری ہو گئی۔ وہ اپنے ساتھ ایک چارپائی، ایک بستر، کملوں کا ایک بڑا گٹھا، روٹیوں کی ایک ٹوکری اور دودھ کے دو گھڑے لائے۔ سید صاحب نے کچھ دیر اُن سے باتیں کیں، پھر وہ چلے گئے۔ سب نے کھانا کھایا۔ سید صاحب کے لیے چارپائی بچھا دی گئی۔ باقی غازی ایک کمل لے کر لیٹ گئے۔ صبح کی نماز کے بعد روانہ ہونے والے تھے تو پوچھا: سامان کس کے حوالے کریں؟ سید صاحب نے فرمایا: یہیں چھوڑ دو، مالک خود لے جائیں گے۔

بالاکوٹ پہنچے تو مولانا شاہ اسماعیل نے ست بنے کے نالے پر استقبال کیا۔ سید صاحب ناصل خاں کی حویلی میں فروکش ہُوئے جو مسجد بالا سے قریب تھی اور پہلے سے آپ کے لیے خالی کرالی گئی تھی۔

---

[1] وقائع جلد سوم ص ۹۲

سینتیسواں باب

رزمگاہ بالاکوٹ کا نقشہ

بالاکوٹ اب ہم سید صاحب کے آخری معرکے پر پہنچ گئے ہیں، جس میں اس پاک باطن مجاہد حق نے اپنے عزیز ترین مقاصدِ حیات پر خونِ شہادت سے مُہر لگائی۔ اس خونچکاں داستان کو شروع کرنے سے پہلے رزمگاہ کا پورا نقشہ پیش کر دینا ضروری ہے جسے سامنے رکھے بغیر جنگ کے احوال و وقائع کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔

بالاکوٹ ضلع ہزارہ کی تحصیل مانسہرہ کا مشہور قصبہ ہے اور تحصیل کے شمالی و مشرقی گوشے میں وادی کاغان کے جنوبی دہانے پر پاسبان کی حیثیت میں کھڑا ہے۔ اردگرد کے پہاڑی سلسلوں کو پیش نظر رکھا جائے تو بالاکوٹ وادی کاغان کا ایک حصہ معلوم ہوگا۔ چونکہ اس کے سر پہ پہنچ کر وادی کو پہاڑی دیوار نے بند کر دیا ہے اور دریائے کنہار (جس کا اصل نام دریائے کاغان ہے) کے منفذ کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہا، اس لیے بالاکوٹ وادی کاغان سے منفک ہو گیا۔

مانسہرہ سے جو سڑک پہاڑوں کے نشیب و فراز سے گزرتی اور پیچ و خم کھاتی ہوئی مظفر آباد اور سری نگر جاتی ہے، وہ پندرھویں یا سولھویں میل پر وادی کنہار میں داخل ہوتی ہے۔ وہاں اس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ایک شاخ دریا کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ جنوب کو گئی ہے۔ قریباً ڈیڑھ میل پر ایک پل ملتا ہے۔ اس سے گزر کر مشرقی کنارے پر جائیں تو تھوڑی دور گڑھی حبیب اللہ خاں کی آبادی ہے۔ یہی سڑک مظفر آباد اور سری نگر جاتی ہے۔ دوسری شاخ کنہار کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ شمال کو گئی ہے۔ اس کے دسویں میل پر بالاکوٹ واقع ہے۔ اس سے آگے بڑھتے ہی وادی کاغان میں داخل ہو جاتے ہیں۔

راستے کی کیفیت دس میل کی اس مسافت میں سڑک کی حالت یکساں نہیں۔ ابتدا میں یہ صاف اور ہموار ہے۔ اس کے بعد خطرناک چڑھائی آ جاتی ہے، جس میں بہت سے پیچ و خم ہیں۔ پھر سڑک مستقیم اور ہموار ہو جاتی ہے۔ بیچ میں ایک اور چڑھائی آتی ہے۔ آخری حصہ پھر ہموار ہے[1]

---

[1] یہ اس وقت کی کیفیت ہے، جب کتاب مرتب ہوئی تھی۔ اب یہ سڑک اول سے آخر تک درست ہو گئی ہے۔ سابقہ سڑک کے پیچ و خم اور نشیب و فراز بھی کم ہو گئے ہیں۔

سڑک کے آغاز سے بالاکوٹ کے قریب تک پہاڑ کی دو دیواریں قریباً متوازی چلی گئی ہیں، بیچ میں خلا ہے، جس کا عرض زیادہ سے زیادہ آدھ میل ہوگا۔ اسی خلا میں سے دریائے کنہار پیچ و خم کھاتا ہوا گزرا ہے، کہیں مشرقی سمت کی دیوار سے جا ٹکرایا ہے، کہیں مغربی سمت کی دیوار سے آ ملا ہے، دونوں جانب کے پہاڑوں سے نالے اُتر اُتر کر دریا میں ملتے گئے ہیں۔ چونکہ پانی کی افراط ہے، اس لیے دونوں جانب کھیتی باڑی خوب ہوتی ہے۔ بالاکوٹ تک سڑک کے آس پاس کئی آبادیاں ہیں، جن میں قابلِ ذکر یہ ہیں: بانڈہ، برولہ، بستیاں (دو گاؤں)، شوہال نجف خاں، ترقہ، بال پھوٹا (بم پھولہ)، باولی، سنگل بھوتی، ٹھنڈا کٹھہ اور پوڑیاں (دو گاؤں)۔

سید صاحب کے زمانے میں یہ سڑک موجود نہ تھی، نیز ترقہ اور بالاکوٹ کے درمیان کھڑیاں تھیں یعنی پہاڑ کے بعض حصے آگے نکل کر عین دریا کے کنارے تک پہنچ گئے تھے۔ اس وجہ سے آمد و رفت آسان نہ تھی۔ انھیں کاٹ کر موجودہ راستہ نکالا گیا اور اب سید صاحب کے زمانے کی حالت کا صحیح اندازہ مشکل ہے۔ میں جہاں تک تحقیق کر سکا ہوں، سید صاحب کے وقت میں موجودہ راستے کا وجود ہی نہ تھا، بلکہ مختلف پہاڑی راستے جا بجا بنے ہوئے تھے، وہی آمد و رفت کا ذریعہ تھے۔

گڑھی سے بالاکوٹ تک

گڑھی حبیب اللہ خاں سے بالاکوٹ تک دریائے کنہار کے دونوں کناروں کے مقامات کا ذرا مفصل ذکر اس وجہ سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض کے نام جنگ کے سلسلے میں آئے ہیں اور جو اصحاب بہ طورِ خاص اس حصے کی سیر کے خواہاں ہوں ان کے لیے یہ بیان ایک مفید رہنما کا کام دے گا۔

پہلے مغربی کنارے کی کیفیت ملاحظہ ہو: گڑھی حبیب اللہ خاں کے سامنے سے بالاکوٹ کا رُخ کریں تو ابتدا میں "بلیہ" نام ایک مقام آتا ہے۔ اس سے آگے قریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر "گل ڈھیری" ہے۔ اس مقام اور دریا کے درمیان ایک ٹیلہ حائل ہے، جسے "ڈوگہ" کہتے ہیں۔ وہاں سے پونے میل پر "بانڈہ" ہے۔ بانڈہ میں ڈاک بنگلہ موجود ہے۔ آگے بڑھیں تو پہلے "برولہ" آئے گا۔ پھر "جاگیر" پھر "بستیاں زیریں"، ساتھ ہی "شوہال نجف خاں"، جہاں حال ہی میں عبورِ دریا کے لیے پُل بنایا گیا ہے۔ شوہال گڑھی اور بالاکوٹ کے وسط میں واقع ہے۔

اس سے آگے ترقہ ہے، جس کا فاصلہ شوہال سے کوئی دو میل ہوگا۔ اس نام کا نالہ بھی پہاڑ سے اُتر کر دریا میں شامل ہوتا ہے اور نالے پر سے گزرنے کے لیے پُل بنا ہوا ہے۔ ترقہ سے تھوڑی دور آگے "باولی کٹھہ" نام ایک نالہ آتا ہے۔ بالاکوٹ کی طرف جانے والے آدمی کے دائیں ہاتھ سڑک سے ذرا ہٹ کر وہ مشہور

پہاڑ ہے جس کا نام ماسٹر ڈھاکہ ہے۔ اس کے ایک کم بلند حصے کو بسوت تکہ کہتے ہیں۔ باولی کٹھہ سے آگے بال پھوڑا (بم پھولہ) کٹھہ آتا ہے اور دونوں کے درمیان بال پھوڑا تکہ نام پہاڑ ہے جس کے ڈھلوان کو پرانے زمانے میں "کھڑیاں" کہتے تھے اور اب تک یہ نام بدستور چلا آتا ہے۔ اس جگہ "بندوقاں والی" نام ایک مقام ہے۔ بالاکوٹ کی جنوبی سمت میں سید صاحب کا سب سے اگلا مورچہ یہیں تھا۔

"بال پھوڑا کٹھہ" سے آگے "سنگل بھوئی کٹھہ" ہے اور آگے "ٹھنڈا کٹھہ" جس کے پاس ہی سے بالاکوٹ کا حلقہ شروع ہو جاتا ہے۔ سنگل بھوئی اور ٹھنڈا کٹھہ کے درمیانی مقام کو "پوڑیاں" کہتے ہیں۔ ٹھنڈا کٹھہ اوپر جا کر دو شاخوں میں بٹ جاتا ہے ان شاخوں کے درمیانی پہاڑ کا نام لمبی تکہ ہے جو شہید گلی تک جاتا ہے۔ اس کٹھہ کی بالاکوٹ والی سمت میں "مٹی کوٹ" نام ٹیلہ واقع ہے۔ جس کے ڈھلوان پر "کالی مٹی" نام ایک موضع ہے اور چوٹی پر مٹی کوٹ۔

اب مشرقی کنارے کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے: گڑھی حبیب اللہ خاں سے آگے "سیری" ہے، اس سے آگے "حصاری" "پھر جبٹ" اور "کشتڑہ" اس سے آگے "تلہٹہ" ہے، جہاں عام شہرت کے مطابق سید صاحب کا دھڑ دفن ہے اور قبر کا نشان اب تک قائم ہے۔ "تلہٹہ" سے آگے "بھلے کوٹ" اس کے شمال میں میدان شروع ہو جاتا ہے جو دریا کے ساتھ ساتھ شوہال معزاللہ خاں تک جاتا ہے۔ اس سے آگے کے مقامات یہ ہیں: ہستہ، بٹ کنڈہ، ڈھیریاں، بیلہ، منڈی اور بالا پیر کی خانقاہ جو بالاکوٹ کے عین سامنے واقع ہے۔[1][2]

بالاکوٹ کا حلقہ

مٹی کوٹ ٹیلے کے دامن سے وادی کنہار کی مغربی سمت کی پہاڑی دیوار دریا سے پیچھے ہٹ گئی ہے اور اس کا رخ شمال مغرب کے بجائے بالکل شمال میں ہو گیا ہے۔ اس طرح وادی کاغان کے جنوبی دہانے کے باہر پہاڑوں کے درمیان سطح مرتفع کا ایک خاصا وسیع حلقہ پیدا ہو گیا ہے، اس کے حدود اربعہ یہ ہیں:

---

[1] جب، جابر، جبڑ اور جبوڑی چاروں لفظ دلدلی زمین کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مطلب یہ نہیں کہ زمین اب بھی دلدلی ہے، یہ سمجھنا چاہیے کہ ابتدا میں دلدلی تھی، اس لیے یہ نام رکھے گئے۔

[2] مقامی لوگوں نے پہاڑ کے لیے بلندی کے اعتبار سے مختلف نام تجویز کر لیے ہیں مثلاً سب سے اونچا "ڈھاکہ" اس سے نیچا "ڈنہ" اس سے نیچا "تکہ"۔ اس طرح سب سے کم بلند ٹیلے کو ڈھیری کہتے ہیں۔ آپ بعض اسما کے آگے ڈھاکہ یا ڈنہ یا تکہ یا ڈھیری دیکھیں تو سمجھ لیں یہ مختلف بلندیوں کے پہاڑ ہیں۔ اسی طرح کٹھہ نالے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۱ - مشرق میں مکڑا پہاڑ کا وہ حصہ جس کا نام کالوخاں کا ٹیلہ ہے۔ یہ بہت بلند ہے اور اس کی چوٹی پر کالوخاں نام کا گاؤں ہے جسے کالوخاں گوجر نے آباد کیا تھا۔

۲ - مغرب میں مٹی کوٹ کا ٹیلہ ہے۔ یہ بھی بلندی میں کالوخاں کا ہمسر معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا شمالی حصہ ذرا ڈھالو ہے اور جنوبی حصے کی اونچائی کم ہوتے ہوتے پوڑیاں کے قریب پہنچ کر معمولی سی رہ گئی ہے۔ ٹیلے کے شمالی حصے میں چوٹی پر مٹی کوٹ گاؤں ہے، جس کے بارے میں مثل مشہور ہے:
"جس کا مٹی کوٹ، اسی کا بالاکوٹ"۔ ٹیلے کا نام مٹی کوٹ شاید اس لیے پڑا کہ اس عظیم الشان تودے میں بظاہر مٹی زیادہ ہے اور پتھر کم۔ اس کے شمالی ڈھلوان کو ڈھیری گٹیاں کہتے ہیں۔ جنگ بالاکوٹ میں گھمسان کا رن اسی نالے پر پڑا تھا جو مٹی کوٹ کے ٹیلے اور ڈھیری گٹیاں کے بیچ میں اترتا ہے اور مقام نزول پہ اس نے ٹیلے اور گٹیاں کے درمیان تھوڑا سا خلا پیدا کر دیا ہے۔

۳ - حلقے کے شمالی حصے میں تین ٹیلے ہیں جنھوں نے مل کر ایک دیوار بنا دی ہے، یہ دیوار بالاکوٹ کے شمالی ومغربی گوشے سے شروع ہو کر شمالی ومشرقی گوشے تک چلی گئی ہے۔ مغرب کی سمت میں ست بنے کا ٹیلہ ہے، جس پر اسی نام کا گاؤں آباد ہے۔ بیچ میں ورنا کا ٹیلہ، مشرق میں سارنگ کا ٹیلہ۔

۴ - حلقے کی جنوبی سمت میں کوئی ٹیلہ نہیں بلکہ کنہار کی وادی ہے، جس نے کاغان سے باہر نکلتے ہی بالاکوٹ کے پاس جنوبی ومغربی رخ اختیار کر لیا ہے۔ توڑ کی طرف سے بالاکوٹ جائیں تو جب تک پوڑیاں سے آگے نہ بڑھیں بالاکوٹ نظر نہیں آتا۔ اس لیے کہ مٹی کوٹ کے ٹیلے کا جنوبی حصہ بیچ میں حائل رہتا ہے۔ اس حلقے کی زمین پہاڑوں کے دامن کے ساتھ ساتھ ذرا اونچی ہے۔ جیسے جیسے جنوبی اور جنوبی ومغربی سمت میں آئیں اس میں نشیب پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح انتہائی حصوں کی سطح میں کم وبیش پانچ چھ سو فٹ کا فرق پیدا ہو گیا ہے۔

قصبہ حلقے کے عین بیچ میں ایک ٹیکرا یا قدرتی پشتہ ہے، جس پر بالاکوٹ آباد ہے۔ پشتے کی جنوبی سمت، پاس کی زمین سے چھ سات سو فٹ بلند ہوگی۔ مشرقی سمت اس سے بھی زیادہ بلند ہے۔ شمالی سمت میں ٹیکرا ڈھلواں ہے۔ یہاں تک کہ اس کا آخری گوشہ زمین کے برابر ہو گیا ہے۔ مغربی سمت بھی ڈھالو ہے۔

قصبے کی آبادی گنجان ہے، مکان چھوٹے چھوٹے، گلیاں تنگ اور پیچدار۔ ان گھڑ پتھر آس پاس کے نالوں اور دریاے کنہار میں بے شمار ہیں، انھیں کو گارے سے جوڑ جوڑ کر دیواریں کھڑی کر لی گئی ہیں۔ اکثر مکان معمولی حیثیت کے ہیں۔ پشتے کی مشرقی سمت چونکہ بالکل سیدھی کھڑی ہے، اس لیے ادھر چڑھ

سے نیچے تک کوئی مکان نہیں۔ یہی صورت جنوبی سمت کی ہے۔ لیکن شمالی و مغربی سمت میں زمین کی سطح تک مکان چلے گئے ہیں اور عام پہاڑی آبادی پھیلتے پھیلتے شمالی و مغربی سمت کے کھیتوں میں بھی چلی گئی ہے۔

پہلی آبادی غالباً یہی تھی۔ ممکن ہے، میدان میں بھی جا بجا چھوٹے چھوٹے گاؤں یا دو دو چار چار گھر زمینداروں نے بنا لیے ہوں۔ اب بھی ان کے نشان ملتے ہیں۔ لیکن بالاکوٹ چونکہ کاغان، چیلاس، گلگت اور دوسرے شمالی کوہستانی علاقوں کی تجارت کا مرکز تھا، اس لیے انگریزوں کے زمانے میں آبادی بہت پھیل گئی۔ میرا خیال ہے کہ پہلے قصبے کے جنوب مشرق میں دریائے کنہار کے پُل کے پاس دکانیں بنیں۔ پھر پُل کی دوسری طرف ایک منڈی بن گئی۔ جس کی وجہ سے لوگوں نے مکان بنا لیے۔ تھوک مال کے زیادہ تر تاجر انھیں آبادیوں میں رہتے ہیں اور عام کاروبار بھی یہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح بالاکوٹ سے نیچے سڑک کے قریب سکول، شفاخانہ، ڈاک بنگلہ اور تھانہ وغیرہ بن گئے[1]

مساجد قصبے میں اب کئی مسجدیں ہیں۔ دو حال ہی میں بنی ہیں، جو خاصی شاندار ہیں: ایک قصبے کے جنوبی حصے میں، دوسری قصبے سے نیچے شمال مغرب میں۔ آخری مسجد کو آج کل بالاکوٹ کی مسجد جامع کہا جاتا ہے۔ یہ وسیع اور کشادہ ہے۔ اس کے پاس چشمے ہیں، ان میں سے ایک کا پانی ٹھنڈک میں ضرب المثل بنا ہوا ہے۔

سید صاحب کے زمانے میں غالباً تین مسجدیں تھیں: مسجد بالا یا مسجد کلاں، مسجد متوسط اور مسجد زیریں۔ مسجد بالا یا کلاں قصبے کے جنوبی و مغربی حصے میں تھی۔ اب بھی موجود ہے اگرچہ اس کے حدود پہلے سے کسی قدر کم ہو گئے ہیں۔ مسجد متوسط شمالی حصے میں ہے اور مسجد زیریں قصبے سے نیچے اُتر کر مغربی سمت میں۔ ان مسجدوں کو نہ محض یہ کہ وسیع ہی نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ خاصی تنگ اور بے رو ہیں۔ مثلاً میرے اندازے کے مطابق مسجد کلاں (بالا) میں زیادہ سے زیادہ پچاس ساٹھ آدمی ایک وقت میں نماز ادا کر سکتے ہیں۔ دوسری مسجدیں اس سے بھی چھوٹی ہیں۔

ان کی ایک خصوصیت کا ذکر ضروری ہے اور وہ یہ کہ عام مساجد کے برعکس ان کا مسقف حصہ مغربی سمت میں نہیں، بلکہ مشرق میں ہے، یعنی قبلہ رُخ کے برعکس۔ مثال کے طور پر مسجد

---

[1] پاکستان بن جانے کے بعد قصبے سے نیچے کی آبادی بہت پھیل گئی۔ بڑے بارونق بازار بن گئے۔ ڈاک بنگلے، پولیس کے تھانے وغیرہ کے علاوہ بھی عالی شان عمارتیں [illegible]

کلاں کا خاکہ ملاحظہ فرمائیے:

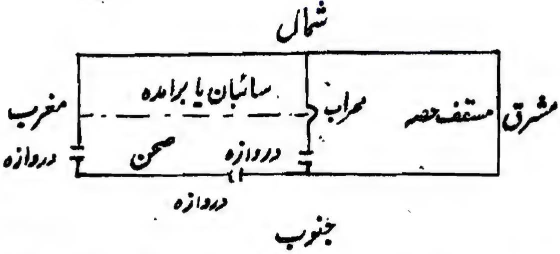

میں نے متفرق لوگوں کو سائبان میں نماز پڑھتے دیکھا۔ معلوم نہیں، مسقف حصے کو وہ کس موقع پر استعمال کرتے ہیں۔ پرانی روایات کا علم رکھنے والے مقامی لوگ بتاتے ہیں کہ اس مسجد کے مسقف حصے کی محراب میں سید صاحب نے مراقبہ کیا تھا۔ مسجد بالا یا کلاں اور مسجد زیریں کے درمیان سو گز کا فاصلہ ہو گا۔

مسجد بالا سید صاحب کے زمانے میں

یقینی طور پر بتانا مشکل ہے کہ سید صاحب کے زمانے میں مسجد بالا کا نقشہ کیا تھا۔ میں مختلف روایتوں سے جو معلومات حاصل کر سکا، ان کی کیفیت یہ ہے:

۱- اس میں نمازیوں کی دو صفیں کھلی کھڑی ہو جاتی تھیں۔

۲- اس کے سائبان کا عرض قریباً چھ ہاتھ یعنی نو فٹ تھا۔

۳- مسجد خام تھی اور اس پر لکڑی کی چھت تھی، جسے مٹی سے پاٹ دیا گیا تھا۔

۴- قبلہ رُخ ایک کھڑکی تھی اور جنوبی سمت میں بڑا دروازہ تھا۔

۵- بڑے دروازے کے سامنے تیس ہاتھ (۴۵ فٹ) لمبا اور نو ہاتھ (۱۳½ فٹ) چوڑا میدان تھا۔

اگر سائبان اسی جگہ تھا جہاں اب ہے، تو سمجھنا چاہیے کہ مسقف حصے کی کھڑکی سائبان میں کھلتی تھی۔ بڑا دروازہ اب بھی جنوبی سمت ہی میں ہے۔ اس کے باہر جو میدان تھا وہ اب باقی نہیں رہا اور اس میں مکان بن گئے ہیں۔ ایک دروازہ مغربی سمت میں بھی ہے، جو غالباً پہلے بھی موجود تھا، اس لیے کہ روایتوں میں "بڑے" دروازے کا رُخ جنوبی سمت میں بتایا گیا ہے۔ "چھوٹا" دروازہ نظر بظاہر مغربی سمت ہی میں ہو سکتا تھا۔

مکانات

کچھ معلوم نہیں کہ سید صاحب اور ان کے غازیوں کے لیے قصبے کے کتنے مکانات خالی کرائے گئے تھے۔ سید صاحب کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ واصل خان کی حویلی میں ٹھہرے تھے۔ مسجد بالا کے مشرق میں تین فٹ چوڑی ایک گلی ہے اس کے دوسری جانب

مسجد کے سامنے واصل خاں کی حویلی[1] تھی۔ مسجد کلاں کے نیچے شمالی سمت میں ایک دالان تھا جو اب باقی نہیں رہا۔ اس میں مولانا شاہ اسماعیل اپنی جماعت کے ساتھ مقیم ہوئے تھے۔ غالباً توشہ خانہ اور منشی خانہ قریب قریب تھے۔ توشہ خانے کے مہتمم شیخ ولی محمد تھے اور منشی خانے کے افسر اعلیٰ منشی محمدی انصاری۔ سب غازی بالاکوٹ کے قصبے میں نہ تھے۔ مختلف جماعتوں کو سید صاحب نے ضروری مورچوں پر بھیج دیا تھا جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

نالے دریائے کنہار بالاکوٹ کے پاس سے گزرتا ہے، اس کے علاوہ شمالی و مغربی سمت کی پہاڑیوں سے کئی نالے اُتر کر حلقہ بالاکوٹ میں سے بہتے ہوئے دریائے کنہار میں ملے ہیں۔ ان میں خاص طور پہ قابلِ ذکر نالے یہ ہیں:

۱۔ ست بنے کا نالہ، جو شمالی و مغربی گوشے سے آیا ہے، اس کا پاٹ خاصا چوڑا ہے اور قصبے کے شمالی گوشے میں پہنچتے پہنچتے یہ بہت گہرا ہو گیا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق گہرائی ایک سو فٹ سے کم نہ ہو گی۔

۲۔ برنا نالہ: یہ عین شمالی سمت سے آیا ہے اور بالاکوٹ کے شمال میں ست بنے سے ملا ہے۔ مقامِ اتصال پر قلندر کی خانقاہ ہے۔ پھر یہ دونوں نالے بہم ہو کر بالاکوٹ کے پشتے کی مشرقی سمت سے ملے ہوئے نیچے چلے گئے ہیں اور پُل کے قریب کنہار میں شامل ہوئے ہیں۔

۳۔ مٹی کوٹ کا نالہ: یہ نالہ مٹی کوٹ ٹیلے کی شمالی سمت سے نیچے اُترا ہے۔ دامن میں پہنچتے ہی اس نے جنوبی رُخ اختیار کر لیا ہے۔ ڈاک بنگلے اور سکول کی عمارتوں کے بیچ میں سے بہتا ہوا یہ دریا میں شامل ہو گیا ہے اور نالے بھی ہیں لیکن ان کا ذکر غیر ضروری ہے۔

---

[1] میں نے اس حویلی کی سرگزشت اور کیفیت کے باب میں کئی مرتبہ پرسشیں کیں۔ یہی معلوم ہو سکا کہ اس کی پہلی حالت باقی نہیں رہی اور حدود بھی کم ہو گئے۔ واصل خاں کا بیٹا لال خاں تھا۔ لال خاں کا بیٹا دوست محمد خاں۔ آخر الذکر کے تین بیٹے تھے: گل زماں خاں، فقیر خاں اور تاج محمد خاں۔ ۱۹۴۶ء میں فقیر خاں کا بیٹا محمد اشرف خاں موجود تھا۔ بعد کا حال معلوم نہیں۔ سُنا تھا کہ حویلی تقسیم ہو گئی تھی اور اس کے بعض حصے بک بھی گئے تھے۔ یہ مقام بھی یادگار کے طور پر محفوظ رہنا چاہیے۔ "منظورہ" میں مسجد بالا کو سید صاحب کی اقامت گاہ اور مسکن قرار دیا گیا ہے (صفحہ ۱۱۶ و ۱۱۷)۔ اس کا مطلب یہ سمجھنا چاہیے کہ اگرچہ رہتے واصل خاں کی حویلی میں تھے، لیکن زیادہ وقت اسی مسجد میں گزارتے تھے۔ دونوں کے درمیان قریباً تین فٹ کی ایک گلی کا فصل تھا۔

گرد و پیش

بالاکوٹ کی مغربی جانب میں پشتے سے متصل جو کھیت ہیں، وہ خاصے نشیب میں ہیں۔ پھر مٹی کوٹ کے ٹیلے کی طرف زمین کی سطح بہ تدریج بلند ہوتی جا رہی ہے۔ اس وجہ سے کھیت درجہ بہ درجہ بنے ہُوئے ہیں۔ قصبے کے پاس کی زمین میں دھان بہ کثرت ہوتے ہیں۔ جو زمینیں ذرا فاصلے پر ہیں، ان میں گندم اور مکئی بوئی جاتی ہے۔ شمالی، شمالی و مشرقی اور جنوبی سمت کی زمینیں بھی خوب سیراب ہیں اور فصل اچھی ہوتی ہے۔ دھان کی زمینوں کو مقامی اصطلاح میں "ہوتر" کہتے ہیں۔

دریا کے پار کالوخاں کے دامن میں کئی گاؤں ہیں: مثلاً گھرلاٹ، بالاپیر، نڑا، ڈھیریاں۔

ست بنے کے نالے پر کھڑے ہو کر مغربی سمت دیکھیں تو پیچھے ایک اونچا پہاڑ نظر آئے گا، جس کا بالائی حصہ چیڑ کے درختوں سے لدا ہُوا ہے۔ یہ بالاکوٹ کے حلقے کے مغربی ٹیلوں سے پیچھے ہلال کی صورت میں شمال سے لے کر جنوب تک پھیلا ہُوا ہے، اسے "رکھ ماسٹر" یا "ماسٹر کا ڈھاکہ" کہتے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق سکھ ترنہ کے نالے سے اوپر چڑھ کر پہلے اسی پر پہنچے تھے۔ وہاں اب تک ایک مقام "شہید گلی" کے نام سے موسوم ہے، جہاں غازیوں نے سب سے پہلے سکھوں سے جنگ کی تھی۔ مٹی کوٹ ٹیلے کے دوسری طرف جنوبی سمت میں ٹھنڈا کٹھہ اور سنگل بھوٹی کے نالے ہیں، یہ نالے اوپر جا کر مل جاتے ہیں یعنی اوپر سے ایک نالہ آیا تھا، ایک ٹیلے نے اسے دو حصوں میں بانٹ دیا۔ ترنہ کا نالہ ترنہ کے پاس ہے۔

مشاہد

بالاکوٹ کے اردگرد کئی مقامات ہیں، جہاں شہیدوں کی قبریں بتائی جاتی ہیں۔ ان کی بھی سرسری کیفیت ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ جس قبر میں عام روایت کے مطابق سید صاحب کو دفن کیا گیا تھا، وہ پُل کے قریب دریا کے کنارے ایک احاطے میں ہے اور کاغان جانے والی سڑک اس احاطے کی دیوار کے پاس سے گزری ہے، اگر یہ قبر صحیح بھی ہو تو میری تحقیق کے مطابق سید صاحب کی میت تین دن سے زیادہ اس میں نہ رہی اور اب وہ خالی ہے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

۲۔ شاہ اسماعیل اور ارباب بہرام خاں کی قبریں بالاکوٹ کے شمال مشرق میں ست بنے نالے کے پار ہیں۔

۳۔ بعض شہیدوں کی قبریں شاہ اسماعیل کے مرقد سے بھی شمال مشرق میں ہیں۔

۴۔ کچھ قبریں دریائے کنہار کے پار کالوخاں پہاڑ کے دامن میں ہیں۔

۵۔ زیادہ تر شہیدوں کی قبریں مٹی کوٹ کے ٹیلے کے دامن میں مٹی کوٹ نالے کے کنارے

دو جگہ ہیں۔

۶۔ ایک شہید کی قبر گاؤں کے قریب مغربی سمت میں ہے۔

پُل

جس مقام پر آج کل پختہ پل بنا ہوا ہے[۱]، یہاں سید صاحب کے زمانے میں بھی لکڑی کا معمولی پُل تھا اور غازیوں کی ایک جماعت اس کی حفاظت پر مامور تھی، لیکن وہ لوگ پل کے پاس نہیں رہتے تھے؛ بلکہ اس سے کسی قدر جنوب میں مقیم تھے۔ سکھوں نے بالاکوٹ سے قریباً چار میل جنوب میں لکڑی کا ایک اور پُل بنا لیا تھا۔ اسی پُل پر سے وہ اپنے جانور چرانے کے لیے دوسرے کنارے پر لاتے تھے[۲]۔ غازی وقتاً فوقتاً ان پر حملے بھی کرتے رہتے تھے۔

آپ بالاکوٹ کا نقشہ سامنے رکھ کر بقیہ تفصیلات پر غائر نظر ڈالیں گے تو امید ہے وہ سمجھ میں آجائیں گی۔ اس کے بعد آیندہ ابواب کے سمجھنے میں انشاء اللہ کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔

---

[۱] اب ایک کے بجائے دو پل بن گئے ہیں، یہاں مراد پرانا پل ہے۔ [۲] یعنی مشرقی جانب سے مغربی جانب، کیونکہ لشکرگاہ دریا کے مشرقی جانب تھی۔

اڑتیسواں باب

دفاعی انتظامات

شیر سنگھ کی نقل و حرکت شیر سنگھ اوائل شوال میں گڑھی حبیب اللہ خاں کے پاس تھا۔ سید صاحب بالاکوٹ پہنچے تو سکھوں کا لشکر دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر بالاکوٹ سے دو اڑھائی کوس جنوب میں نیچے ہوگا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے شیر سنگھ کے لیے بالاکوٹ پر حملے کی دو ہی صورتیں تھیں: یا وہ پکھلی کی جانب سے پہاڑ پر چڑھتا اور مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچ کر نیچے اُترتا۔ اس راستے سے بھاری سامان اور توپیں لے جانا ممکن نہ تھا۔ یا کنہار کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ بالاکوٹ کے سامنے پہنچتا۔ اس نے دوسری صورت اختیار کی۔ راویوں کا بیان ہے کہ اس کے ڈیرے اور خیمے بالاکوٹ سے نظر آ رہے تھے۔

سید صاحب کے لیے بالاکوٹ پہنچتے ہی پہلا کام یہ تھا کہ مختلف ناکوں اور گزرگاہوں کی حفاظت کا پورا بندوبست ہو جائے۔ میں بتا ہی چکا ہوں کہ جس سڑک سے آج کل بالاکوٹ آتے جاتے ہیں، یہ پہلے موجود نہ تھی۔ ترند اور بالاکوٹ کے درمیان "کھڑیاں" تھیں، جن پر سے اکا دکا آدمی آ سکتے تھے، بڑا لشکر نہیں آ سکتا تھا، تاہم اس حصے کی حفاظت بھی ضروری تھی۔

دفاعی مورچے اب سید صاحب کے دفاعی انتظامات کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ جنوبی سمت کی کھڑیوں پر امان اللہ خاں لکھنوی کو بیس پچیس غازیوں کے ساتھ متعین کیا اور دو شاہینیں انھیں دے دیں۔ اس حصے میں اتنے ہی غازی خاصے بڑے لشکر کو روکنے کے لیے کافی تھے۔

۲۔ سردار حبیب اللہ خاں نے بتایا تھا کہ ایک پرانی پگ ڈنڈی جنوبی و مغربی سمت کے پہاڑوں میں سے مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچتی ہے، اس حصے کی حفاظت کے لیے ملا لعل محمد قندھاری کو ایک سو غازیوں کے ساتھ مقرر کر دیا گیا۔

۳۔ ملا لعل محمد قندھاری کی پشتیبانی کے لیے قندھاری غازیوں کی ایک جماعت مٹی کوٹ میں بٹھا دی۔

۴۔ بالاکوٹ کے جنوب مشرق میں جو پُل تھا، اس کی حفاظت اس وجہ سے بے حد ضروری ہو گئی تھی کہ

خیال تھا شاید شیر سنگھ دریا کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کرکے بالاکوٹ کے سامنے پہنچ جائے اور پُل پر سے فوج گزار کر قصبے میں آ جائے۔ اس کی حفاظت کے لیے ایک جماعت مقرر کر دی۔ میری معلومات کے مطابق اس جماعت نے پُل کے پاس نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر جنوبی سمت میں دریا کے مغربی کنارے پر دفاعی مورچے بنا لیے تھے جہاں پُل کی حفاظت بھی ہو سکتی تھی اور سکھ فوج کو مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ پیش قدمی سے بھی روکا جا سکتا تھا۔

سکھ لشکرگاہ

سکھ لشکرگاہ دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر اس جگہ تھی جسے مقامی اصطلاح میں میدان کہا جاتا ہے۔ یہ مقام گڑھی حبیب اللہ خاں سے قریباً پانچ چھ میل شمال میں واقع ہے اور وہاں سے بالاکوٹ بھی کم و بیش اتنے ہی فاصلے پر ہوگا۔ اس "میدان" کے جنوب میں "بھلے کوٹ" اور شمال میں شوہال معز اللہ خاں ہے۔ ہموار زمین کا یہ ٹکڑا رقبے میں میل سوا میل مربع ہوگا۔ اس حصے میں بڑے لشکر کے قیام کے لیے اس سے موزوں تر مقام کوئی نہیں۔

غازیوں کی روایتوں سے واضح ہوتا ہے کہ آس پاس جانور چرانے کے لیے کافی جگہ نہ تھی۔ اس لیے سکھوں نے دریا پر لکڑی کا پُل بنا لیا تھا تاکہ جانوروں کو مغربی کنارے پر لا کر چرا سکیں۔ مجاہدین جب موقع پاتے چھاپے مار کر جانور پکڑ لے جاتے۔

غالباً ابتدا میں شیر سنگھ کا ارادہ یہ تھا کہ دریا کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کرتا ہُوا بالاکوٹ کے عین سامنے پہنچ جائے اور وہاں سے دریا عبور کرکے جنگ کرے، لیکن بعض بدیہی مشکلات کے پیشِ نظر اس تدبیر پر عمل نہ ہُوا۔

پہاڑی پگ ڈنڈی

شیر سنگھ نے غور و مشورہ کے بعد طے کیا کہ پہاڑوں میں سے گزر کر لشکر کو مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچایا جائے۔ وہاں سے بالاکوٹ پر حملہ بہت آسان تھا اور اسی آسانی کے پیشِ نظر یہ مثل بنی تھی کہ جس کا مٹی کوٹ، اسی کا بالاکوٹ۔ اس راستے کا علم تمام مقامی اصحاب کو تھا۔ سید صاحب کے جن سوانح نگاروں نے اسے غیر معروف یا غیر مستقل پگ ڈنڈی قرار دینے میں مبالغے سے کام لیا ہے؛ ان کے تمام تصوّرات سُنی سُنائی غیر مستند باتوں پر مبنی ہیں۔ حقیقت حال سے وہ آگاہ نہ تھے۔ آج کل بھی گھوڑے پر سوار ہو کر یہ راستہ بے تکلّف طے کیا جا سکتا ہے؛ حالانکہ پختہ سڑک بن جانے کے باعث اب اس سے کام لینے کی چنداں ضرورت نہیں رہی۔ اب راستے کی عام کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔ یہ پوری کیفیت برادر عزیز عبدالرشید صاحب علوی بی اے کی تحقیق پر مبنی ہے، جنہوں نے خود اس راستے کا چپہ چپہ پیدل پھر کر دیکھا اور یہ زحمت اس لیے اٹھائی کہ میں صحیح کیفیت قلمبند

کر سکوں :

۱ ۔ سکھ لشکر "میدان" سے اٹھ کر بذریعہ پل "جا گیر" میں پہنچا جو "میدان" کے بالمقابل مغربی کنارے پر واقع ہے ۔ وہاں سے بستیاں زیریں گیا ، جو "جاگیر" کے شمال میں زیادہ سے زیادہ ایک میل ہوگا۔

۲ ۔ بسیاں زیریں سے یہ لشکر شوہال کٹھہ کے ساتھ ساتھ درہ شوہال میں سے ہو کر ڈمگلہ پہنچا ۔ یہ فاصلہ چار میل ہو گا ۔ ڈمگلہ ہی وہ مقام ہے جہاں اوائل جہاد میں مجاہدین کی ایک جماعت نے سید محمد مقیم رام پوری کے زیر قیادت سکھوں پر شبخون مارا تھا ۔

۳ ۔ ڈمگلہ سے سکھ لشکر نے شمال کا رُخ اختیار کر لیا اور وہ جابہ" اور الکھڑیلہ ہوتا ہُوا "چنڈوال" پہنچا۔ یہ فاصلہ $6\frac{1}{2}$ میل کے قریب ہے ۔

۴ ۔ "چنڈوال" سے ساڑھے تین میل شمال میں ایک مقام ہے جس کا پہلا نام معلوم نہیں ، آج کل اسے "شہید گلی[1] کہتے ہیں ۔ مقامی روایت بھی یہی ہے کہ یہاں سید صاحب کا ایک دفاعی مورچہ تھا ۔ اس مورچے کے مجاہدین نے حملہ آور سکھوں کو روکنا چاہا لیکن قلت تعداد کے باعث روک نہ سکے ۔ کچھ مجاہدین یہاں شہید ہُوئے ۔ ان کی قبریں تین دائروں کی شکل میں موجود ہیں ۔ اسی وجہ سے اس مقام کا نام "شہید گلی" مشہور ہُوا ۔ اس مقام پر سروے کے محکمے کی ایک برجی بھی ہے ۔ یہاں دفاعی مورچہ قائم کرنے سے روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اس راستے سے بھی یورش کا خطرہ موجود تھا یعنی راستہ نہ غیر معروف تھا ، نہ غیر مستعمل ۔ چونکہ سوانح نگاروں کے سامنے جنگ کی پوری کیفیت نہ تھی اس لیے وہ غلط قیاسات کی بناء پر غلط فہمی میں مبتلا ہُوئے ۔

۵ ۔ سکھ لشکر شہید گلی سے آگے بڑھا تو کیمی نکہ کے ساتھ ساتھ ٹھنڈا کٹھہ کو عبور کر کے مٹی کوٹ پہنچ گیا ۔ یہ فاصلہ چھ میل کے قریب ہے ۔ گویا میدان سے اُٹھ کر مٹی کوٹ پہنچنے تک سکھ لشکر نے قریباً اکیس میل کی مسافت طے کی ۔

ضروری تصریحات

غازیوں کی روایات میں بعض ایسے اشارے ملتے ہیں جن کی بناء پر قیاساً صورت حال کا زیادہ سے زیادہ صحیح نقشہ تیار کیا جا سکتا ہے ۔ غور فرمائیے :

۱ ۔ سکھ لشکر گاہ بدستور قائم رہی یعنی سکھوں نے "میدان" سے خیمے یا دوسرا بھاری سامان نہ اٹھایا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فوج کا ایک حصہ وہاں موجود تھا اور اس کی تعداد خاصی ہو گی ۔

---

[1] "گلہ" اور "گلی" (ڈمگلہ اور شہید گلی) بڑے اور چھوٹے درے کے لیے استعمال ہوتے ہیں ۔

یہی حصہ تھا جو مٹی کوٹ کے ٹیلے سے سکھوں کی یورش کے موقع پر توپیں لے کر دریا کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کرتا ہوا بالاکوٹ کے سامنے پہنچا اور جنوبی و مشرقی سمت سے قصبے پر گولہ باری شروع کی۔

۲ - غازیوں نے سکھوں کے لشکر کو دریا عبور کر کے مغربی کنارے پر آتے دیکھا تو سمجھے کہ لشکر لاہور واپس جا رہا ہے۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ پہاڑی علاقے میں مجاہدین کو اس نقل و حرکت کا علم کیوں کر ہوا؟ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ سید صاحب کا نسب سے اگلا یعنی جنوبی مورچہ بندوقاں والی میں تھا اور وہاں سے سکھوں کی ہر حرکت دیکھی جا سکتی تھی۔ ایک مقام اور بھی ہے، جہاں سے گڑھی حبیب اللہ خاں تک پوری وادی کا گوشہ گوشہ نظر آ سکتا ہے یعنی موضع جنگیاں کی مسجد جو بالاکوٹ کے سامنے دریائے کنہار کے بائیں کنارے ملحقہ پہاڑ پر واقع ہے۔ غالباً سید صاحب نے اس مقام پر بھی چوکی مقرر فرما دی تھی۔ چونکہ مسجد بستی سے خاصے فاصلے پر واقع ہے، اس لیے خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ مسجد مجاہدین کی چوکی کے مقام پر بعد میں بہ طور یادگار بنا دی گئی ہو۔ وہاں قرآن مجید کے پانچ قلمی نسخے بھی موجود ہیں۔ بالاکوٹ سے اس مسجد کا فاصلہ کوئی چار میل ہوگا۔ ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ مقامی باشندوں نے نقل و حرکت کی خبر پہنچا دی ہو۔ ان میں اکثر کے جسم بلاشبہ سکھوں کے فرماں بردار تھے، لیکن دل یقینی طور پر سید صاحب کے ساتھ تھے۔

سید صاحبؒ کا آخری خط

سید صاحب نے ۱۳- ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ (۲۵- اپریل ۱۸۳۱ء) کو یعنی شہادت سے صرف گیارہ روز پیشتر نواب وزیر الدولہ کو، جو اس زمانے میں ولی عہد تھے، ایک خط ٹونک بھیجا تھا جسے ہندوستان کی طرف ان کا آخری سمجھنا چاہیے۔ اس میں اہل سمہ کے ظلم و ستم اور ہجرت ثانیہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> میں پکھلی کے پہاڑوں میں آ گیا ہوں۔ یہاں کے باشندے حسن اخلاق سے پیش آئے اور انھوں نے کاروبار جہاد میں اعانت کے پختہ وعدے کیے۔ ہمیں قیام کے لیے جگہ دی۔ چنانچہ فی الحال قصبہ بالاکوٹ میں، جو درہ کنہار میں ہے، دل جمعی سے ٹھہرا ہوا ہوں۔ کفار کا لشکر بھی مجاہدین کے مقابلے کی غرض سے تین چار کوس پر ڈیرے ڈالے پڑا ہے۔ چونکہ یہ مقام (بالاکوٹ) نہایت محفوظ ہے، لشکر خدا کے فضل سے یہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ ہاں اگر مجاہدین خود پیش قدمی کریں اور نکل کر لڑیں تو جنگ ہو سکتی ہے۔ مجاہدین کا ارادہ ہے کہ دو تین روز میں جنگ کی جائے

بارگاہ واہب العطایا سے امید ہے کہ فتح و نصرت کے دروازے کھل جائیں۔ اگر تائید ربانی شامل حال رہی اور ہم اس جنگ میں کامیاب ہوئے تو انشاء اللہ دریائے جہلم پر ملک کشمیر تک مجاہدین کا قبضہ ہو جائے گا۔ دن رات دین کی ترقی اور لشکر مجاہدین کی کامرانی کے لیے دعائیں مانگتے رہیں۔

پہاڑی مورچے ہم بتا چکے ہیں کہ پہاڑی پگ ڈنڈی کے مورچے کی حفاظت کے لیے ملا لعل محمد قندھاری کو مقرر کیا گیا تھا۔ ایک روز بعض اصحاب نے عرض کیا کہ ملا لعل محمد صاحب کے مورچے پر سردی بہت ہے۔ مناسب ہوگا کہ تھوڑے دنوں کے لیے ان کی جگہ کوئی دوسرا جلیش بھیج دیا جائے۔ ملا صاحب دوسرے تیسرے روز سید صاحب کی زیارت کے لیے بالاکوٹ آتے رہتے تھے۔ انھیں جب پہرہ بدلنے کی تجویز کا علم ہوا تو عرض کیا کہ میری اور میرے ساتھیوں کی تکلیف کا خیال نہ کیا جائے اور مجھے وہیں رہنے دیا جائے۔ سید صاحب نے ملا صاحب کی تکلیف ہی کے خیال سے میرزا احمد بیگ کو ان کی جگہ متعین کر دیا۔ ساٹھ یا ستر غازی میرزا کے ساتھ تھے۔ کچھ ملکی لوگ بھی بھیج دیے گئے[1]

اس تبدیلی سے دوسرے یا تیسرے دن ظہر کے وقت میرزا احمد بیگ والے مورچے کی طرف سے گولیوں کی آواز آئی۔ تمام پہرہ داروں نے اپنے اپنے لشکروں کے سالاروں کو متنبہ کر دیا۔ عصر کے قریب میرزا کی طرف سے قاصد آیا اور بتایا کہ سکھوں نے پگ ڈنڈی سے پہاڑ پر چڑھ کر میرے (میرزا کے) مورچے پر حملہ کر دیا[2]

---

[1] منظورہ میں ہے کہ یہ تبدیلی خود ملا لعل محمد کی درخواست پر عمل میں آئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ چپل کی حفاظت پر مامور ہوں تاکہ سکھوں کو لوٹتے رہیں (صفحہ ۱۱۷)۔ میرے نزدیک "وقائع" کا بیان درست ہے۔ [2] منظورہ میں ہے کہ میرزا احمد بیگ کے ہمراہیوں میں سے کسی نے یا کسی کاذب کلمہ گو ملی نے سکھوں کو اس راستے سے آگاہ کیا (صفحہ ۱۱۷)۔ "تواریخ عجیبہ" میں ہے کہ کسی پنجابی یا ولایتی اہل گار دنے بہ طمع دنیا مخفی طور پر راجا شیر سنگھ کے پاس جا کر اس کو ہی راستے کے مفصل حال سے اس کو مطلع کر دیا (صفحہ ۱۴۴)۔ بعض سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ یہ راستہ سابق بادشاہوں نے بنایا تھا۔ پھر مدت تک استعمال نہ ہونے کے باعث اس پر درخت اور گھاس اُگ آئی تھی۔ یہ بیانات غلط فہمیاں پیدا کر سکتے ہیں یا غلط فہمیوں پر مبنی ہیں۔ یہ راستہ نہ بادشاہوں نے بنایا تھا اور نہ غیر مستعمل ہونے کے باعث اس پر گھاس یا درخت اُگ آئے تھے، بلکہ عام راستہ تھا جس سے لوگ آتے جاتے تھے۔ پکھلی کے عام لوگوں میں سے شاید ایک بھی نہ ہوگا، جسے اس کا علم نہ تھا (باقی اگلے صفحہ پر)

جب سکھوں نے میرزا کے مورچے پر حملہ کر دیا تو ان کی کثرت تعداد سے بالکل بے پروا ہو کر بہادر میرزا نے مقابلہ شروع کر دیا اور ایک قاصد کے ہاتھ حملے کی خبر سید صاحب کے پاس بھیج دی۔ اس مقابلے میں میرزا کی جماعت کے آٹھ آدمی شہید ہوئے[1]۔ لیکن وہ چار سو کو روک سکتے تھے، ہزاروں کو کیوں کر روکتے، جو پہاڑ پر چڑھ آنے کے بعد جس طرف سے چاہتے آگے بڑھ سکتے تھے؛ نتیجہ یہ نکلا کہ میرزا اور ان کے بقیۃ السیف ساتھی اس سیل میں تنکوں کی طرح بہتے بہتے پیچھے ہٹتے گئے۔

میرزا کے لیے کمک

سید صاحب نے اطلاع پاتے ہی پہلے ایک جیش ابراہیم خاں اور فرج اللہ عرب کی ماتحتی میں بھیجا۔ اس جیش میں منگا خاں بارود ساز، قاضی عبدالعزیز دکھنی، میاں جی حسین علی بڑھانوی اور محمد امیر خاں قصوری بھی شامل تھے۔ ان کے بعد سید نور اللہ شاہ کو ایک گروہ کے ساتھ دوڑایا، پھر ارباب بہرام خاں کو حکم دیا کہ آپ بھی کچھ آدمی لے کر جائیں۔ آخر میں سید جعفر علی نقوی کو تھوڑے سے آدمی دے کر بھیج دیا۔ اس طرح تھوڑی ہی دیر میں دو سو غازی ٹیلے پر پہنچ گئے۔ میرزا احمد بیگ ملے تو انھوں نے بتایا کہ اب مورچے پر پیش قدمی سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اس لیے کہ سکھ بڑی تعداد میں پہاڑ پر آگئے ہیں دو تین سو آدمی انھیں روک بھی نہیں سکتے، چہ جائیکہ پیچھے ہٹا دیں۔ ارباب بہرام خاں نے میرزا کے بیان کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ دو چار راستے ہوں تو انھیں روکا جا سکتا ہے، پہاڑ پر چڑھنے کے بعد سکھوں کے لیے بیسیوں راستے پیدا ہو گئے ہیں۔ ہم ایک دو یا تین چار کو روکیں گے، سکھ انھیں چھوڑ کر

(بقیہ نوٹ صفحہ ۷۵۱) خود سید صاحب نے اسی لیے بغرض حفاظت اس پر پہرے بٹھائے تھے کہ اندیشہ تھا شاید دشمن اس سے کام لے۔ سکھوں کے ساتھ اور ان کے زیر اثر ہزاروں مقامی مسلمان تھے۔ ایک دو نہیں بلکہ بیسیوں آدمیوں سے اس کا حال معلوم ہو گیا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں سیکڑوں سکھوں کو بھی اس راستے کا حال معلوم ہوگا جو ضلع ہزارہ میں آباد تھے۔ البتہ یہ امر قرین قیاس ہے کہ بڑی فوج کے لیے بھاری سامان کے ساتھ یہ راستہ اختیار کرنا بظاہر مشکل تھا۔ اس باب میں پنجابی ولایتی کی تخصیص غیر ضروری ہے۔ اگر اس قسم کا واقعہ ہندوستان کے کسی دوسرے حصے میں پیش آتا تو وہاں کے مقامی آدمیوں کو بھی ایسے ہی حالات سے سابقہ پڑتا۔ میرزا احمد بیگ اور ان کے ساتھی بے حد مخلص تھے۔ انھوں نے بے دریغ جانیں راہ حق میں قربان کیں اور ان پر خفیف سا شک بھی سراسر بے جا ہے۔ ایک روایت میں بتایا گیا ہے جس روز سکھوں نے لشکرگاہ سے اٹھ کر دریا عبور کیا، اس روز کچھ معلوم نہ ہوا۔ اگلے روز اخیر ظہر کے وقت مرزا احمد بیگ والے مورچے سے بندوقوں کی آواز آئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ لشکرگاہ سے اٹھ کر سکھوں نے پورا دن، پوری رات اور اگلے دن اخیر ظہر تک کا وقت راستے میں گزارا۔ [illegible] یہی مقام ہے جسے آج کل [illegible] کہتے ہیں۔

اور راستہ اختیار کر لیں گے۔

سید جعفر علی سے ارباب نے کہا: حضرت امیر المومنین کو لکھ بھیجیے کہ اب بہتر یہ ہے سکھوں کی لشکر گاہ پر، جو دریاے کنہار کے مشرقی کنارے پر ہے، ہلہ کیا جائے۔ وہاں کم آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اگر ہمارے پہنچتے پہنچتے وہ لوگ دو چار مرتبہ توپیں سر بھی کریں گے تو مضائقہ نہیں۔ ہم لشکر گاہ پر قابض ہو کر سکھوں کو بالاکوٹ میں بند کر دیں گے۔ ہمارا لشکر اگرچہ زیادہ نہیں، پھر بھی اشیاے خوردنی فراہم کرنے میں دقتیں پیش آ رہی ہیں۔ سکھ اتنے بڑے لشکر کو کہاں سے کھلائیں گے؟ یا بھوکے مریں گے یا واپس چلے جائیں گے۔

سید جعفر علی کے پاس قلمدان نہ تھا، اس لیے ایک آدمی کے ہاتھ زبانی پیغام بھیجا گیا۔ سید صاحب کی طرف سے جواب آیا کہ ارباب خود بالاکوٹ پہنچ کر گفتگو کریں۔

نجف خاں کا خط

غرض سکھ منفذ پر قابض ہو کر بھاری تعداد میں مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچ گئے، لیکن آگے نہ بڑھے، اس لیے کہ رات ہو گئی تھی اور رات کے وقت بالاکوٹ کی طرف اُترنا شدید خطرات سے لبریز تھا۔ جو غازی مٹی کوٹ گاؤں میں متعین تھے، وہ وہیں رہے۔

عین اس وقت نجف خاں کی طرف سے خفیہ خط آیا کہ میں سکھوں کو مظفر آباد کے لیے لایا تھا۔ یہ خیال نہ تھا کہ بالاکوٹ میں آپ سے مڈبھیڑ ہو جائے گی۔ شیر سنگھ کے ساتھ بارہ ہزار بندوقچی ہیں۔ اگر آپ مقابلہ کر سکیں تو ٹھہریں، ورنہ بہتر یہ ہو گا کہ پیچھے کے پہاڑ پر چلے جائیں۔ لشکر خود بخود واپس چلا جائے گا یا راتوں رات دریا کے مشرقی کنارے پر آ جائیں اور سکھ لشکر گاہ پر چھاپا ماریں۔

سید صاحب نے ناصر خاں (بھٹ گرامی) اور حبیب اللہ خاں (ساکن گڑھی) سے مشورہ کیا۔ ناصر خاں کی رائے تھی کہ خط فریب پر مبنی ہے۔ حبیب اللہ خاں نے کہا کہ نجف خاں کے خلوص یا فریب کے باب میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن اس کا مشورہ درست ہے۔ پچھلے پہاڑ پر چلے جانا بہتر ہے۔ سکھ لشکر گاہ پہ چھاپا مارا جائے تو عجب نہیں، مال و اسباب اور توپ خانہ ہاتھ لگے۔

حسن خاں عظیم آبادی کہتے ہیں کہ حبیب اللہ خاں کی بات سُن کر حضرت نے فرمایا:

> خان بھائی! آپ کہتے تو سچ ہیں، لیکن اب کفار کے ساتھ یہیں لڑیں گے۔ اسی میدان میں لاہور ہے اور اسی میں جنت۔ جنت کے سامنے ساری دنیا کی ریاست بے حقیقت ہے۔ اگر کُل دنیا کی عزیز ترین چیزیں دے کر پروردگار کی رضامندی حاصل ہو جائے، یہاں تک کہ میری جان بھی اسی راہ میں قربان ہو جائے تو ایسا ہی ہے جیسے

تنکا توڑ کر پھینک دیا۔

پُل توڑ دیا

پھر خیال آیا کہ پُل توڑ دیا جائے اور جو غازی اس کی حفاظت پر مامور ہیں انھیں واپس بُلا لیا جائے۔ اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی۔ میرا خیال ہے کہ پُل کی شکست اس وجہ سے ضروری سمجھی گئی کہ سکھوں کو بالاکوٹ کی مغربی سمت میں قدم جمانے کا موقع مل گیا ہے۔ اغلب ہے اب وہ پُل کے راستے بالاکوٹ پر مشرقی سمت سے بھی یورش کر دیں۔

چنانچہ شیخ نصراللہ خورجوی اور سلو خاں دیوبندی کو بھیج کر پُل تڑوا دیا گیا۔ اس وقت الٰہی بخش رام پوری اور میاں جی نظام الدین چشتی بھی پُل پر موجود تھے۔ میاں جی چشتی نے کہا کہ جب کبھی لڑائی کی نوبت آئی اور میں نے جناب الٰہی میں دُعا کی تو اک گونہ تسکین ہو جاتی تھی۔ میں سمجھ لیتا کہ انجام بخیر ہو گا۔ موجودہ حادثے کے سلسلے میں کئی مرتبہ مراقبہ بھی کیا، دعا بھی کی، لیکن تسکین قلب کی کوئی صورت نہ بنی۔ خدا جانے کیا پیش آنے والا ہے؟

ارباب بہرام خاں

ارباب بہرام خاں کو غروب آفتاب کے بعد مٹی کوٹ میں حکم ملا تھا کہ بالاکوٹ پہنچ کر اپنی تجویز خود سُنا دیجیے۔ انھیں پہنچتے پہنچتے خاصی دیر ہو گئی، انھوں نے جو تجویز قاصد کے ذریعے سے پیش کی تھی، خود حاضر ہو کر تفصیلاً عرض کی۔ سید جعفر علی نقوی بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ لشکرگاہ پر چھاپے کی تجویز کا جواب سید صاحب نے یہ دیا کہ ہم نے پُل تڑوا دیا ہے اور اب مشرقی کنارے پر جانے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ارباب نے عرض کیا کہ مضائقہ نہیں، پُل راتوں رات درست ہو سکتا ہے۔ سید صاحب نے فرمایا: اس بات کو چھوڑیے: جو کچھ ہونے والا ہے یہیں ہو رہے گا۔ ۱؎ جاں نثار ارباب نے انگشت شہادت سے اپنی گردن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا:

ایں سر در راہ خدائے تعالیٰ حاضر است   یہ سر خدائے تعالیٰ کی راہ میں حاضر ہے۔

لاہور یا جنت الفردوس

ایک روایت ہے کہ سید صاحب نے ملا لعل محمد قندھاری سے پوچھا: آیا یہ ممکن ہے کہ آپ ست بنے کے نالے سے ہو کر پہاڑ پر جائیں اور سکھوں پر شبخون ماریں؟ ملا نے عرض کیا: کیوں نہیں لیکن آپ کو یہاں چھوڑ کر نہ جاؤں گا۔ اپنی جان کے ساتھ رکھوں گا۔ مدت سے اس ملک میں رہ کر لوگوں کا حال خوب دیکھ لیا۔ ان سے نفاق دور ہونا مشکل ہے۔ یہی لوگ سکھوں کو لائے ہیں۔ سید صاحب نے یہ سُن کر فرمایا:

۱؎ منظومہ میں [illegible]

اتنے برسوں ہم نے واسطے اس کار خیر کے طرح طرح کی کوشش اور جانفشانی کی اپنی دانست میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ ہندوستان، خراسان اور ترکستان میں اپنے خلفا روانہ کیے۔ انھوں نے بھی حتی الامکان دعوت فی سبیل اللہ میں کوتاہی نہ کی اور ہم بھی جہاں جہاں گئے وہاں کے لوگوں کو بطور وعظ و نصیحت کے سمجھاتے رہے، مگر کسی نے ہمارا ساتھ نہ دیا، جو دیا تو غربا لوگوں نے بلکہ طرح طرح کا ہم پر افترا کیا۔ شاید مشیت الٰہی میں یونہی تھا۔ سو اب ہمارے کاتب خطوط لکھتے لکھتے تھک گئے اور ہم بھیجتے بھیجتے تنگ آ گئے۔ کچھ ظہور میں نہ آیا۔ اب یہی خوب ہے کہ اپنے غازی بھائیوں کو پہروں پہ سے اپنے پاس بلوا لیں۔

بچاؤ کے وسائل

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ سید صاحب بہ آسانی بچ کر نکل سکتے تھے۔ مثلاً راتوں رات براہ ریاست بنے کے راستے عقب کے پہاڑوں پر جا سکتے تھے اور سکھ ان کا تعاقب نہیں کر سکتے تھے۔ وہ خوانین بھی اس تجویز کے حامی تھے جو سکھوں کو اپنی امداد کے لیے بالاکوٹ لائے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ پل پر سے گزر کر مشرقی کنارے پر پہنچ جاتے یا وادی کاغان میں چلے جاتے، جہاں کے سادات حمایت کے لیے تیار بیٹھے تھے اور ضامن شاہ کوائی والا اس وقت خود بالاکوٹ میں موجود تھا، راتوں رات دس بارہ میل کا فاصلہ طے کر کے کوائی پہنچ جانا مشکل نہ تھا۔ پھر سید صاحب نے کیوں ان وسائل سے فائدہ نہ اٹھایا؟ ارادت مندوں کا خیال ہے کہ قرب شہادت کا اشارہ ہو گیا تھا اور اس پر بدل و جان مطمئن تھے۔ ایک جماعت کی رائے تھی کہ جب بالاکوٹ آتے ہوئے پہاڑ پر ٹھہر گئے تھے اور رات کے وقت دیر تک درختوں کے جھنڈ میں رہے تھے تو اسی ساعت سے طبیعت میں ایک غیر معمولی تغیر پیدا ہو گیا تھا۔ تدابیر پر بہت کم متوجہ ہوتے تھے، زیادہ تر تقدیر پر توکل و اعتماد کے کلمات زبان پر جاری رہتے تھے۔

شجاعت و تدبیر میں تصادم

مجھے اس تعبیر سے اختلاف کی ضرورت نہیں۔ جس مرد خدا نے زندگی کی ہر عزیز متاع راہ خدا میں بے دریغ قربان کر دی تھی اور مسلک رضا کی پابندی میں جان دے دینے کو اس درجہ بے حقیقت جانتا تھا گویا ایک تنکا توڑ کر پھینک دیا، اسے یقیناً بارگاہ باری تعالیٰ سے ہر ایما و اشارہ ہو سکتا تھا، لیکن اس معاملے کا ایک عقلی پہلو بھی ہے، جسے سامنے رکھ لینا غیر مناسب نہیں اور نہ اسے سید صاحب کی ذات بابرکات کے لیے غیر شایاں سمجھا جا سکتا ہے۔ یاد ہو گا، مولانا شاہ اسماعیل نے امام خاں خیر آبادی کی شہادت کے موقع پر

فرمایا تھا کہ میدان جنگ میں انسانوں کی قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض ارباب تدبیر ہوتے ہیں، بعض ارباب شجاعت اور بعض جامع ہر دو۔ نرے ارباب تدبیر ہمارے کام کے نہیں ہیں، اس لیے کہ یہ مقام تدبیر کا نہیں شجاعت کا ہے۔

بلاشبہ وہ مقام شجاعت کا تھا۔ تدبیر بھی یقیناً ضروری تھی اور سید صاحب نے کبھی اس میں تامل نہ کیا، لیکن بالاکوٹ میں ایسے حالات پیش آگئے تھے کہ شجاعت و تدبیر میں تصادم ہو گیا تھا۔ اس موقع پر یہی مناسب تھا کہ تدبیر کا پہلو اختیار کرنے کے بجائے شجاعت کے تقاضوں کو مقدم رکھا جاتا۔ سید صاحب نے یہی کیا۔

موازنۂ مضار و منافع

فرض کر لیجیے کہ سید صاحب غازیوں کو لے کر عقبی پہاڑوں میں جا بیٹھتے یا کوائی چلے جاتے اور سکھ بالاکوٹ پہنچ کر حسب عادت عوام پر سختیاں کرتے یعنی قصبے کو لوٹتے اور مکانوں کو جلاتے۔ پھر سید صاحب کے لیے اجراءِ کاروبارِ جہاد کی کون سی خوشگوار شکل باقی رہ جاتی؟ بالاکوٹ کا حشر سامنے رکھتے ہوئے کون بطیبِ خاطر ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو سکتا؟ موقع ایسا آگیا تھا کہ ذاتی شجاعت و مردانگی کی نمایش کے لیے نہیں بلکہ کاروبارِ جہاد کے ناموس کو بچانے کے لیے، مرنے کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کو رضائے باری تعالیٰ کی خاطر بے دریغ جانیں دے دینے کا سبق پڑھانے کے لیے ایک قدم بھی ادھر ادھر نہ ہٹتے اور جس مقام پر بیٹھے تھے، وہیں ہر افتاد ہر آفت اور ہر بلا کا مقابلہ عاشقانہ کرتے۔ یہ منزل بڑی کٹھن اور دشوار تھی لیکن سید صاحب کے لیے اس میں گامزن ہونا اتنا ہی سہل تھا، جتنا دوسروں کے لیے کامرانی و فیروزمندی کا تاج پہن لینا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ بچ نکلنے میں سیکڑوں آفتیں تھیں یا کم از کم آیندہ کے لیے اعانت و رفاقت کے مواقع یقینی طور پر ضعف میں تھے۔ مردانِ حق کی طرح لڑنے میں فتح مندی کا بھی امکان تھا۔ پہلے راستے کی مضرتیں روزِ روشن کی طرح مبرہن تھیں۔ دوسرے راستے میں مضرتوں کے احتمال کے ساتھ ساتھ منافع بھی دسترسِ امکان میں نظر آتے تھے۔ سید صاحب نے وہی راستہ اختیار کیا، جو عقلِ سلیم، ایمانی حمیت اور دینی غیرت کے عین مطابق تھا۔ باقی رہا انجام کا معاملہ تو:

سودا قمارِ عشق میں خسرو سے کوہکن　　بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز؟　　اے روسیاہ! تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

انتالیسواں باب

زندگی کی آخری رات اور آخری صُبح

لڑائی کی سکیم

سکھ مٹی کوٹ کے ٹیلے پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے تو صاف واضح ہو گیا تھا کہ اب قصبے اور ٹیلے کے درمیانی میدان میں لڑائی ہو گی، اس لیے سید صاحب نے جو مورچے جا بجا بغرضِ دفاع قائم کیے تھے، ان پر غازیوں کو بٹھائے رکھنا بے سود تھا۔ چنانچہ آپ نے مورچوں اور چوکیوں سے غازیوں کو بلا لیا اور فرمایا کہ رات کو خوب دعائیں مانگو، پروردگار کی بارگاہ میں آمرزش و استغفار کرو، صبح مقابلہ ہے، خدا جانے کس کی شہادت ہو اور کون زندہ رہے۔

اس وقت تک لڑائی کی سکیم تیار کر لی گئی تھی اور وہ یہ تھی کہ سکھ مٹی کوٹ سے اُتر کر ٹیلے اور قصبے کے درمیانی نشیب میں پہنچیں تو ان پر حملہ کیا جائے۔ اس نشیب میں زیادہ تر شالی کے کھیت تھے، ان میں رات کو پانی چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ زمین دلدلی بن کر زیادہ سے زیادہ ناقابلِ گزر ہو جائے۔ ماحول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ بہترین سکیم تھی، اس لیے کہ سکھ جب اوپر سے اُتر کر نشیب میں پہنچ جاتے تو پہلے انھیں دلدل سے سابقہ پڑتا۔ اسے عبور کر لیتے تو قصبے کی سمت میں ان کے سامنے چڑھائی تھی۔ دونوں صورتیں ان کے لیے خطرناک تھیں۔ دلدل میں آگے پیچھے یا دائیں بائیں نقل و حرکت مشکل تھی۔ اس سے گزر کر چڑھائی میں ان کے سانس پھول جاتے اور تیزی سے پیش قدمی نہ کر سکتے، غازی دلدل سے باہر کھڑے کھڑے ان پر گولیاں برسا سکتے تھے۔ جو سکھ دلدل سے گزر آتے، ان پر چڑھائی کے وقت حملہ کر سکتے تھے۔

مورچہ بندی

اسی اسکیم کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مختلف جماعتوں کو مناسب مقامات پر مورچہ بندی کا حکم دیا گیا۔ زیادہ تر مورچے ست بنے کے نالے پر تھے، جو شمالی و مغربی گوشے سے بالاکوٹ کے حلقے میں داخل ہوتا ہے اور جنوبی و مغربی رُخ پر بہتا ہُوا قصبے کے پشتے کی مشرقی جانب کے ساتھ سے گزرا ہے۔

پوری تفصیلات نہیں مل سکیں لیکن میں مختلف روایتوں سے جو کچھ اخذ کر سکا، اس کا مرقع یہ ہے:

- جہاں سے ست بنے نالہ بالاکوٹ کے حلقے میں داخل ہوتا ہے، وہاں سب سے پہلے ملّا لعل محمد قندھاری کا مورچہ تجویز ہُوا۔ یہ مورچہ اس ٹیلے کے دامن سے شروع ہوتا تھا، جو ست بنے نالے

اور مٹی کوٹ کے ٹیلے کے درمیان ہے۔

۲ — ملا لعل محمد کے مورچے کے بائیں جانب یعنی قصبے کی سمت میں مولانا شاہ اسماعیل کی جماعت کو بٹھانے کا فیصلہ ہوا، لیکن خود مولانا جماعت کے ساتھ نہ تھے۔

۳ — مولانا کی جماعت کے بائیں ہاتھ شیخ ولی محمد کی جماعت کا مورچہ تھا۔ شیخ بھی جماعت کے ساتھ نہ تھے۔

۴ — شیخ کی جماعت کے بائیں ہاتھ ناصر خاں بھٹ رامی اور حبیب اللہ خاں (گڑھی والا) کے جیش متعین ہوئے۔ اس طرح مختلف جماعات و جیوش کے مورچے ہلالی شکل میں قصبے تک آتے تھے۔ بعض جماعتوں کے مورچے مسجد زیریں میں یا اس کے آس پاس رکھے گئے۔ مولانا شاہ اسماعیل غازیوں کے ایک گروہ کے ساتھ مسجد بالا کے پاس شمالی جانب میں قیام فرما ہوئے ان کے سامنے مسجد کی غربی سمت میں مولوی احمد اللہ ناگپوری کی جماعت کو بٹھایا گیا۔ اس مسجد سے دس پندرہ قدم نیچے اتر کر ایک نشیب میں شاہینچیوں کا مورچہ تجویز ہوا۔ خود سید صاحب نے طے کیا کہ صبح کی نماز کے بعد مسجد بالا میں بیٹھیں گے اور وہیں سے جب مناسب سمجھیں گے، سکھوں پر حملہ کریں گے۔

رزمگاہ کے نقشے پر ایک نظر ڈال لی جائے تو واضح ہو جائے گا کہ سکھ مٹی کوٹ سے اتر کر قصبے میں پہنچنے تک برابر تمام مورچوں کے ہدف بنے رہتے۔ اوّل تو سو میں سے دس بھی قصبے کے قریب تک سلامت نہ پہنچ سکتے۔ جو پہنچ جاتے، ان پر قصبے کی سمت سے یورش ہوتی۔

لباس اور استراحت

مختلف جماعتوں نے رات رات میں مورچہ بندی مکمل کر لی۔ اس غرض کے لیے زیادہ تر پتھر استعمال کیے گئے اور بالاکوٹ میں اس جنس کی کمی نہ تھی۔ تختوں اور کواڑوں سے بھی کام لیا گیا۔ سید صاحب نے عشا کی نماز کے بعد کھانا کھایا، پھر اپنے پارچوں میں سے کچھ جوڑے منگائے۔ ان میں سے ایک الخالق، سفید پاجامہ، دستار اور لپشاوری لنگی منشی خواجہ محمد (حسن پوری) کو دی کہ صبح یہی پہننا۔ ایک الخالق، سفید پاجامہ اور دستار حکیم قمر الدین پھلتی کو دی، ایک سرمئی الخالق، سفید پاجامہ، کانگریزی دستار، کشمیری پٹکا وغیرہ چیزیں اپنے پہننے کے لیے الگ کر لیں۔ پھر ساتھیوں سے فرمایا کہ اب آرام کرو۔ خود بھی بہ اطمینان خاطر سو گئے۔ حسب معمول پچھلی رات اٹھ کر تہجد پڑھی، پھر ذکر و فکر میں مشغول ہو گئے۔

صبح شہادت

صبح کی نماز کے لیے مسجد بالا میں پہنچے جہاں بہت سے غازی پہلے سے موجود تھے۔ سب نے

آپ کی امامت میں نماز ادا کی۔ ان فدا کارانِ حق میں سے اکثر کی یہ آخری نماز تھی اور خود امام کے لیے بھی اس کے بعد مصلّے پر بطور امام یا بطور مقتدی کھڑے ہونا مقدر نہ تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ قیام گاہ پر تشریف لے گئے اور دیر تک وظائف میں لگے رہے، سورج نکل آیا تو اشراق کی نماز پڑھی۔ پھر نور محمد جراح کسبت لے کر آیا۔ آپ نے لبیں ترشوائیں، ریش مبارک میں کنگھی کی، سرمہ لگایا اور رات کے وقت جو لباس الگ کر رکھا تھا اسے پہن کر تیار ہو گئے۔ ایک پستول، ایک ولایتی چھری اور ایک کٹار لی۔ چھری شیخ غلام علی الٰہ آبادی نے دی تھی اور کٹار جنگ مردان کے مال غنیمت میں ہاتھ آئی تھی۔ ان دونوں کے دوال سابری ایک ایک انگل چوڑے تھے۔ ایک تلوار باندھی جو ارباب بہرام خاں نے نذر کی تھی۔ اس کا پرتلہ سابری انگل چوڑا تھا۔ جنگ میں دو رائفلیں استعمال کرتے تھے۔ یہ دو رفیقوں کے پاس رہتی تھیں جو باری باری بھر بھر کر دیتے جاتے تھے۔ لباس پہن کر اور ہتھیار سجا کر آپ مسجد بالا میں پہنچ گئے۔ اس وقت دن چڑھے ہوئے قریباً ڈیڑھ گھنٹہ گزرا تھا۔

دندانہ دار گنڈاسے

غازیوں کو گولی بارود وغیرہ ضروری چیزیں دے دی گئیں۔ اسلامی لشکر کا ایک خاص ہتھیار دندانہ دار گنڈاسہ تھا۔ جس میں لمبا دستہ لگا دیا جاتا تھا اور عام لوہار اسے کثیر مقدار میں تیار کر لیتے تھے۔ بالاکوٹ میں بھی کئی لوہار گولیوں، گولوں اور گنڈاسوں کی تیاری کے لیے بُلا لیے گئے تھے اور انھوں نے کئی روز کی محنت سے یہ چیزیں خاصی بڑی مقدار میں بنا لی تھیں۔ گنڈاسے ان لوگوں کو بھی دیے جاتے تھے، جن کے لیے کوئی دوسرا ہتھیار نہ ہوتا تھا یا جو بندوق اور تلوار سے کام لینے میں مشاق نہ ہوتے تھے۔ ان لوگوں کو بھی گنڈاسے دے دیے جاتے تھے، جن کا ایک ایک ہاتھ کسی جنگ میں بیکار ہو گیا تھا اور جہاد کو کارِ ثواب و عبادت سمجھ کر انجام دینے کے مشتاق ہوتے تھے، اس آخر الذکر گروہ میں سے ایک صاحب شیخ محمد اسحاق گورکھپوری بھی تھے۔ جن کے شانے میں جنگ مایار میں نیزے کی انی چُبھ گئی تھی اور اس کی وجہ سے بایاں ہاتھ اس درجہ بیکار ہو چکا تھا کہ بندوق نہیں چلا سکتے تھے۔ مولوی سید جعفر علی نقوی نے انھیں بھی ایک گنڈاسہ دلا دیا۔

مولوی احمد اللہ ناگپوری کی دعوت

مولوی احمد اللہ ناگپوری نے رات کے وقت اپنی پوری جماعت کو کھانے کی دعوت دی۔ حافظ مصطفیٰ کاندھلوی، شیخ محمد اسحاق گورکھپوری اور مولوی سید جعفر علی نقوی اسی جماعت میں تھے۔ کھانے کے بعد مولوی احمد اللہ نے مولوی جعفر علی سے کہا کہ میں تو حضرت امیر المومنین کے ساتھ رہوں گا؛ جماعت کی امارت و قیادت کے فرائض آپ کو انجام دینے ہوں گے۔ مولوی صاحب نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ مجھے افسری کا تجربہ نہیں، بہتر یہ

ہو گا کہ حافظ مصطفیٰ کو یہ منصب سونپا جائے۔

مولوی احمد اللہ: مصطفیٰ بھی میرے ساتھ ہوں گے۔

مولوی جعفر علی: پھر شیخ محمد اسحاق کو امیر بنا دیجیے۔

مولوی احمد اللہ: وہ ذرا غصہ ور آدمی ہیں اور امارت کے لیے متین آدمی کی ضرورت ہے۔

مولوی جعفر علی: پھر میں حسن خاں بنارسی کا نام پیش کرتا ہوں۔

مولوی احمد اللہ: بھائی! کیا آپ طے کر چکے ہیں کہ میرا حکم نہ مانیں گے؟

مولوی جعفر علی: میں معافی مانگتا ہوں، محض اپنی ناتجربہ کاری اور ناتوانی کو آپ پر واضح کر رہا تھا۔

مولوی احمد اللہ یہ سن کر مسکرا دیے اور جماعت کو حکم دیا کہ سب لوگ مولوی جعفر علی کے احکام کی تعمیل کریں۔

توشہ خانہ اور مُہر

معمول یہ تھا کہ جنگ کے موقع پر توشہ خانے کا سارا اسباب کسی محفوظ مقام پر رکھوا دیا جاتا۔ جنگ سے ذرا پہلے شیخ ولی محمد مہتمم توشہ خانہ نے ایک آدمی بھیج کر پچھوایا کہ اسباب کہاں رکھوا دیا جائے۔ فرمایا: جہاں پڑا ہے وہیں رہنے دیجیے۔

راویوں نے اس واقعہ کو ایسے رنگ میں پیش کیا کہ گویا سید صاحب کو قرب شہادت کا یقین ہو چکا تھا اور مال و اسباب کی جانب سے طبیعت مستغنی ہو چکی تھی۔ گویا اس سے پہلے انھیں مال و اسباب سے دل بستگی تھی۔ حاشا و کلا۔ سید صاحب عمر بھر مستغنی رہے۔ نہ کبھی کسی دنیوی چیز کی آرزو کی اور نہ کسی سے دل لگایا۔ مال و دولت اور اعزازات ہمیشہ ان کے قدموں پر گرتے رہے لیکن وہ برابر ان چیزوں کو اپنے رفیقوں اور دوسرے لوگوں میں بانٹتے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت توشہ خانے کے اسباب کو کسی دوسری جگہ بھیجنے کا موقع باقی نہیں رہا تھا۔ نیز بھیجا جاتا تو ساتھیوں اور عوام پر عین آغاز جنگ کے وقت نہایت بُرا اثر پڑتا۔

سید صاحب کی مُہر منشی محمدی انصاری میر منشی کے پاس رہتی تھی۔ مولانا شاہ اسماعیل نے کہا کہ جنگ

---

[1] روایتوں میں ہے کہ چار پانچ غازی بیمار تھے۔ ان کے بارے میں پوچھا کہ کہاں بھیجا جائے۔ فرمایا: جہاں ہیں، وہیں رہیں۔ ہاتھی کے متعلق بھی یہی فرمایا۔ تاکوٹ سے ساٹھ آدمی آئے تھے اور گولی بارود مانگ رہے تھے، مقامی آدمیوں کا مطالبہ بھی یہی تھا۔ جن لوہاروں سے گنڈاسے وغیرہ بنوائے گئے تھے، وہ بھی لڑنے کے لیے تیار تھے۔ صرف اسلحہ چاہتے تھے۔ سید صاحب نے فرمایا: کچھ ضرورت نہیں۔ میرے نزدیک یہ سب باتیں قیاس میں نہیں آتیں۔ یا تو راویوں کو غلط فہمی ہوئی یا سید صاحب کے پاس اس وقت فالتو اسلحہ تھے ہی نہیں۔

درپیش ہے، خدا جانے کیا صورت پیش آئے۔ مُہر حضرت کے حوالے کر دیجیے تاکہ امانت مالک کے پاس پہنچ جائے۔ منشی صاحب نے مُہر حضرت کے خریطے میں ڈال دی۔ خود مولانا کی مُہر سید جعفر علی نقوی کے پاس تھی، انھوں نے یہ مُہر مولانا کو دے دی۔

سِکھوں کا ظہور

سکھ ایک دن پہلے ہی پہاڑ پر پہنچ گئے تھے، لیکن انھوں نے رات ہو جانے کے باعث پیش قدمی نہیں کی تھی۔ سورج نکل آیا تو مٹی کوٹ کے شمالی گوشے میں نمودار ہوئے۔ آہستہ آہستہ ان کی تعداد بڑھنے لگی۔ ان کی گولیاں قصبے اور مسجد بالا میں آ رہی تھیں۔ شاہینوں کے گولے قصبے کے اوپر سے نکل رہے تھے۔ غازیوں کے لشکر میں دو لڑکے ذرا سیانے تھے: ایک حافظ الٰہی بخش، دوسرا علیم الدین۔ یہ دونوں چلے ہوئے گولے اور گولیاں اٹھا اٹھا کر غازیوں کو دینے لگے۔

سید صاحب مسجد میں پہنچ کر سائبان کے نیچے بیٹھ گئے، جو سکھوں کے گولوں اور گولیوں کی زد میں تھا۔ ساتھیوں نے عرض کیا کہ آڑ میں ہو جائیں۔ فرمایا: ہر جگہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت چاہیے۔ ارباب بہرام خاں ساتھ تھے۔ اسی جگہ بیٹھے بیٹھے ایک گولی ان کے ٹخنے سے چھوتی ہوئی نکل گئی اور خفیف سا زخم آیا۔ اس اثنا میں غازی ادھر ادھر سے کواڑ اٹھا کر لے آئے اور مسجد کی مغربی سمت میں، جو مٹی کوٹ کے سامنے تھی، کواڑ کھڑے کر کے حفاظت کا بندوبست کر لیا۔ قصبے کے بیشتر باشندے ایک دن پہلے ہی گھر بار چھوڑ کر باہر جا چکے تھے۔ صرف غازی باقی رہ گئے تھے یا ممکن ہے چند مقامی آدمی ہوں۔

یوم بالاکوٹ کا پہلا شہید

سید صاحب نے ایک روز پہلے تاکید فرما دی تھی کہ تمام غازی بھائی صبح کی نماز کے ساتھ ہی کھانے سے فارغ ہو جائیں۔ اکثر کھانا کھا چکے تھے، بعض کھا رہے تھے۔ پٹیالہ کے سید چراغ علی صاحب نے کھیر پکانے کا ارادہ کیا۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ اس کام میں لگ گئے۔ سکھ مٹی کوٹ کے ٹیلے سے نیچے اترنے لگے تو سید چراغ علی دیگچی میں کفگیر ہلاتے جاتے تھے اور وقتاً فوقتاً سکھوں کو دیکھ لیتے تھے۔ اچانک ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی۔ آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور بولے: بھائیو، دیکھو وہ حور سُرخ کپڑے پہنے چلی آ رہی ہے۔ یہ کہتے ہی کفگیر اٹھا کر دیگچی پر مارتے ہوئے کہا: بس اب حور ہی کے ہاتھ سے کھانا کھائیں گے۔ پھر اُٹھے اور تیزی سے مٹی کوٹ کے ٹیلے کی طرف دوڑے، جدھر سے سکھ نیچے آ رہے تھے۔ یہ سب کچھ آناً فاناً ہوا اور ساتھیوں کو انھیں روکنے کا موقع نہ مل سکا۔ جب ان کی توجہ سید چراغ علی کی طرف ہوئی تو وہ اتنی دور آگے جا چکے تھے کہ ان کے پیچھے جانا بے سود تھا۔ اسی حالت میں ان کے گولی لگی اور شہید ہو گئے۔ یوم بالاکوٹ کے یہ پہلے شہید تھے۔

صرف رضائے خدا

سردار حبیب اللہ خاں بھی مسجد بالا ہی میں تھا۔ اس نے اپنے پاس کے کسی شخص

سے بات کرتے ہوئے کہا کہ سکھوں کا لشکر بہت بڑا ہے اور ہم تھوڑے ہیں ۔ مقابلے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی ۔ یہ بات سید صاحب نے بھی سُن لی اور فرمایا :

> خان بھائی ! فتح اور شکست اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے ۔ جس کو چاہے ، دیوے ۔ بہت لوگوں یا تھوڑوں پر موقوف نہیں ۔ کبھی اللہ تعالیٰ تھوڑوں کو بہتوں پہ غالب کر دیتا ہے ، کبھی بہتوں کو تھوڑوں پہ اور ہم کو تو اپنے پروردگار کی رضامندی درکار ہے ، فتح اور شکست سے کچھ غرض نہیں ۔ پروردگار کی خوشنودی میں بہر صورت ہماری فتح مندی ہے ۔

یعنی اگر خدائے بزرگ و برتر کی رضامندی و خوشنودی حاصل ہو جائے اور ہمارا ہر عمل رضا کے عین مطابق ہو تو باعتبار ظواہر ہماری شکست بھی دراصل فتح مندی ہو گی ۔

نجف خاں کو جواب

نجف خاں مظفر آبادی کا ایک خط خفیہ خفیہ پہلے آیا تھا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے ، سید صاحب مسجد بالا میں تھے کہ اس کا دوسرا خط آیا ۔ اس میں بھی پہلے خط کے مضمون کو دُہرایا گیا تھا ، یعنی یہ کہ اگر سکھ لشکر کا مقابلہ کر سکیں تو بیٹھیں ورنہ پچھلے پہاڑ پر چلے جائیں یا دریا کے مشرقی کنارے پر جا بیٹھیں ۔

اس وقت تک بھی سید صاحب تمام غازیوں سمیت برتایا ست بنے کے نالے سے ہوتے ہوئے پہاڑوں پر جا سکتے تھے لیکن ان کا فیصلۂ استقامت غیر متزلزل تھا اور اس کی مصلحتیں ہم پہلے باب میں تفصیلاً عرض کر چکے ہیں ۔ نجف خاں کو آپ نے لکھا :

> دو خط آپ کے دربار کے ہمارے پاس آئے ۔ مضمون ان کا معلوم ہوا ۔ فی الحقیقت آپ نے ہماری خیر خواہی کا جو حق تھا ، ادا کیا ۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا کرے ۔ مگر ادھر خلاصہ ہمارے مطالب کا یوں ہے کہ ہم کو اپنے پروردگار کی رضامندی منظور ہے ۔ تھوڑے ، بہت لوگوں کا اصلا خیال نہیں اور نہ غیرت اسلام اس بات کو چاہتی ہے کہ مقابلۂ کفار سے ہٹ جائیں ۔ اب اسی بالاکوٹ کے میدان میں ہم لوگوں کے واسطے جو کچھ منظورِ الٰہی ہے ، وہ ہو گا ۔

اجتماعی حملے کا فیصلہ

سید صاحب نے تمام جماعتوں کے سرداروں کو تاکید فرما دی تھی کہ سب بھائی مورچوں میں بیٹھے ہوئے گولیاں چلاتے رہیں ، لیکن باہر نکل کر اس وقت تک کوئی حملہ نہ کرے ، جب تک ہمارا نشان آگے بڑھتا ہوا نظر نہ آئے ۔ یعنی جب تک خود سید صاحب حملہ

نہ کریں۔ یہ تاکید اس مصلحت پر مبنی تھی کہ سکھوں کی جماعت بہت بڑی ہے۔ غازیوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں نے متفرق حملے کیے تو سب غیر موثر رہیں گے۔ سکھ پہاڑ سے اتر کر میدان خصوصاً اس کے نشیبی حصے میں پہنچ جائیں گے تو اس وقت ان پر شمال، شمال مشرق اور مشرق کی جانب سے ایک دم اجتماعی یورش ہوگی اور انھیں زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جا سکے گا۔

کسی غازی نے عرض کیا کہ پہاڑ پر سکھوں کی جمعیت بہت بڑی تعداد میں فراہم ہو گئی ہے۔ فرمایا: مٹی کوٹ سے اتر کر انھیں نیچے کے کھیتوں میں آ لینے دو۔ ملا لعل محمد قندھاری اپنے مورچے سے دوڑے آئے اور عرض کیا کہ سکھ ہم سے بہت تھوڑے فاصلے پر رہ گئے ہیں۔ کیا حکم ہے؟ پوچھا: "کتنی دور ہوں گے؟" ملا صاحب نے کہا: "گولی کی زد پر۔" فرمایا: مورچوں سے بندوقیں چلاتے جاؤ؛ جب تک ہم نہ نکلیں ان پر حملہ نہ کرو۔[1]

سکھ لشکر کے جو دستے نیچے اتر چکے تھے انھوں نے تیزی سے قصبے کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔ باقی لوگ سیل کی طرح اُتر رہے تھے۔ سید صاحب سائبان کے نیچے لیٹ گئے۔ شیخ لکھمیرا پاؤں دابنے لگے۔ اس اثنا میں محمود خاں لکھنوی نے عرض کیا: حضرت! آرزو ہے کہ آپ دست مبارک میرے چہرے پر پھیر دیں۔ سید صاحب اٹھ بیٹھے اور داہنا ہاتھ محمود خاں کے چہرے پر پھیر کر ان کے لیے دعا کی۔ وہ خوش خوش اپنے مورچے میں چلے گئے۔

پھر آپ نے غازیوں سے فرمایا: "بھائیو! ہم اندر جا کر اکیلے دعا کریں گے۔ کوئی بھائی ہمارے ساتھ نہ آئے۔" چنانچہ آپ اندر چلے گئے[2] اور دروازہ بند کر لیا۔ تھوڑی دیر دعا میں مشغول رہے، پھر دروازہ کھول کر پوچھا کہ مجھے کس نے آواز دی؟ عرض کیا گیا کسی نے نہیں۔ یہ سن کر دروازہ بند کر لیا۔ اسی طرح دو مرتبہ دروازہ کھول کر استفسار فرمایا۔ محمد امیر خاں قصوری کہتے ہیں کہ میں مسجد سے باہر کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔[3] اسی طرح تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کھڑکی کھول کر مجھ سے بھی پوچھا کہ کس نے آواز دی؟

---

[1] ملا صاحب کا مورچہ شمالی و مغربی سمت میں سب سے پہلے تھا۔ مٹی کوٹ سے اتر کر سکھ سب سے پہلے ملا صاحب ہی کے مورچے کی زد میں آئے تھے۔ روایتوں میں ہے کہ ملا صاحب ایک مرتبہ نہیں تین مرتبہ پوچھنے کے لیے آئے۔ میرے نزدیک یہ راویوں کی غلط فہمی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق ملا صاحب کا مورچہ مسجد بالا سے کم از کم پونے میل پر ہوگا۔ طلوع آفتاب سے سید صاحب کے حملہ آور ہونے اور گھمسان کا رن پڑنے تک، ملا صاحب کا اپنے مورچے سے تین مرتبہ آنا جانا قیاس میں نہیں آتا۔

[2] مسجد سے مراد مسجد کا مسقف حصہ ہے جو آج کل کی طرح پہلے بھی مشرقی سمت میں تھا۔

[3] یہ کھڑکی غالباً شمالی سمت میں تھی۔

اس آواز و ندا کی حقیقت کے باب میں کچھ عرض کرنا مشکل ہے، نہ کسی نے آپ سے سوال کیا، نہ سوال کا موقع تھا اور نہ آپ نے خود کچھ بیان فرمایا۔

مسجد بالا کے پاس کا مورچہ

یہ بتایا جا چکا ہے کہ مولوی احمد اللہ کی جماعت کا مورچہ مسجد بالا کی غربی سمت میں قریب ہی تھا اور مولوی صاحب اپنی جماعت کی امارت مولوی سید جعفر علی کو سونپ کر خود سید صاحب کے ساتھ ہو گئے تھے۔ سید جعفر علی فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس چارپائیاں کافی تھیں۔ ان پر بیٹھ کر اسلحہ صاف کر رہے تھے اور ایک دوسرے سے خطائیں معاف کرا رہے تھے۔ کراڑوں کی آڑ میں ہونے کے باعث گولیوں سے محفوظ تھے۔ ہمیں حکم یہ تھا کہ وہاں سے نہ ہلیں۔ جب سکھ شالی کے کھیتوں میں پہنچ جائیں تو ان پر گولیاں چلائی جائیں۔ جو لوگ کھیتوں سے گزر کر قصبے کی سمت میں چڑھائی پر پہنچیں، ان پر تلواروں سے وار کیے جائیں۔

اس جماعت کے بعض آدمیوں نے کہا کہ بندوقیں دیر سے بھری ہوئی ہیں۔ اگر اجازت ہو تو انھیں سر کر کے نئے سرے سے بھر لیں۔ مولوی جعفر علی نے کہا کہ آپ لوگ چپ چاپ بیٹھے رہیں۔ وقت آنے پر اگر ایک مرتبہ فائر خالی بھی جائیں گے تو مضائقہ نہیں۔ اس وقت شیخ محمد اسحاق گورکھ پوری بولے: اب تک دل میں وطن اور اہل و عیال کی محبت جاگزیں تھی۔ اب شہادت اور لقائے باری تعالیٰ کے سوا کوئی آرزو نہیں رہی۔

مسجد بالا سے مسجد زیریں میں

سید صاحب اندر دعا میں مشغول تھے۔ غازی سائبان میں بیٹھے تھے۔ مسجد میں اس وقت تین نشان تھے۔ ایک داود ابو الحسن کا، دوسرا ابراہیم خاں خیر آبادی کا۔ یہ دونوں سیاہ تھے۔ تیسرا نشان سرخ و سپید ملکیوں کا تھا۔ یکایک اندر کا دروازہ کھلا اور سید صاحب مسجد سے باہر نکل گئے۔ تمام غازی بھی اٹھ کر ساتھ ہو گئے۔ جب معلوم ہوا کہ آپ میدان کی طرف جا رہے ہیں تو بعض غازیوں نے عرض کیا کہ حکم ہو تو نشان ساتھ لے لیں، فرمایا: داود ابو الحسن کا نشان ہمارے آگے آگے چلے۔

مولانا شاہ اسماعیل مسجد بالا کے شمالی دالان میں تھے۔ وہ بھی ساتھ ہو گئے۔ مسجد سے سید صاحب تشریف لے گئے تو مولوی احمد اللہ کی جماعت کے لیے بھی وہاں بیٹھے رہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ مولوی جعفر علی نقوی بھی مع جماعت ہمراہ ہو گئے۔ اس طرح سید صاحب غازیوں کے جھرمٹ میں مسجد زیریں تک پہنچ گئے، جہاں سے مٹی کوٹ کے ٹیلے کی طرف ایک پگ ڈنڈی جاتی تھی۔

چالیسواں باب

آغازِ جنگ

صدائے تیغِ تو آمد بہ بزمِ زندہ دلاں
کدام سر کہ درو ذوقِ ایں سرود نہ ماند

مسجد زیریں سے حملہ

سید صاحب مسجد زیریں میں پہنچے تو صحن غازیوں سے بھرا ہُوا تھا۔ بعض باہر کھڑے تھے، بعض دائیں جانب کی گلی میں تھے۔ سید صاحب وہاں کچھ دیر ٹھہرے رہے۔ اس وقت سکھوں کی گولیاں اولوں کی طرح برس رہی تھیں۔ بعض غازی زخمی ہو گئے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ کھاڑوں کی اوٹ بنالی جائے۔ چنانچہ کچھ غازی کواڑ اٹھا لائے اور اوٹ بنانے میں لگ گئے۔ عام خیال یہی تھا کہ مسجد میں ٹھہر کر ان سکھوں کے نیچے پہنچ جانے کا انتظار کریں گے، جو پہاڑ پر سے اُتر رہے تھے۔ اس اثنا میں آپ نے مسجد کے کونے کی آڑ سے سکھوں کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ قرابین دار اور لمبی مار کی بندوق والے ہمارے آگے چلیں۔ یہ فرماتے ہی تکبیر کہتے ہوئے تیزی سے باہر نکلے اور مٹی کوٹ کے ٹیلے کی طرف چل پڑے۔ اس پر سب کو تعجب ہوا[1]، اس لیے کہ لڑائی کی جو سکیم پہلے طے ہو چکی تھی، وہ یہ تھی کہ جب تک سکھ نشیب میں نہ پہنچ جائیں، ان پر حملہ نہ کیا جائے۔ وہ ابھی نشیب سے دور تھے کہ خود سید صاحب نے حملہ کر دیا۔ مولوی جعفر علی نقوی بھی قرابین دار تھے، اس لیے سید صاحب کے حکم کے مطابق ساتھ ہو گئے۔ مولوی احمد اللہ سے انھوں نے کہہ دیا کہ اب آپ اپنی جماعت کو سنبھال لیں۔

منظورہ کا بیان

یہاں تک تمام راوی فی الجملہ متفق ہیں۔ اس کے بعد بیانات میں کم و بیش اختلافات ہیں۔ مسلسل بیان صرف مولوی سید جعفر علی نقوی کا ہے۔ اس کا ملخص یہ ہے کہ سید صاحب نے مسجد سے نکل کر دلدل کا قصد کیا۔ عرض کیا گیا کہ لوگ مجروح ہو رہے ہیں، انھیں بھی جواب میں بندوقیں چلانے کی اجازت مرحمت ہو۔ فرمایا: جن کے پاس لمبی مار کی بندوقیں ہیں، وہ سر کریں اور جہاں جہاں ممکن ہو مورچے بنا لیے جائیں۔ دلدل کی زمین ہموار تھی اور اسے عبور کیے بغیر مورچے بنانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ مولانا اسماعیل نے فرمایا کہ قرابین دار سید صاحب کے گرد و پیش رہیں۔ آپ آہستہ آہستہ تکبیر کہتے ہوئے جا رہے تھے۔ دلدل پر پہنچے تو اس کے کنارے ایک بھاری پتھر تھا، اس پر وضو

---

[1] اس کی کیفیت ابواب ضمیمہ سے واضح ہو گی۔

ہاتھوں کا سہارا لے کر بیٹھ گئے۔ ارباب بہرام خاں آپ کے بائیں جانب تھے۔ شیخ ولی محمد کو قصبے سے شاہین لانے کا حکم دیا۔ عرض کیا گیا کہ قندھاریوں کی طرف سکھوں کا زور معلوم ہوتا ہے۔ مناسب ہوگا کہ ادھر کمک بھیجی جائے۔ فرمایا: جتنے لوگ وہاں ہیں، وہی کافی ہیں۔ ایک شخص نے تلوار لے کر دلدل میں اترنا چاہا۔ لوگوں نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ حضرت کے حکم کی خلاف ورزی کیوں کرتا ہے؟ سید صاحب نے بیٹھے بیٹھے ارباب بہرام خاں سے فرمایا: دل چاہتا ہے کہ سکھوں کا جو گروہ نیچے اُتر آیا ہے، اس پر حملہ کر دیا جائے۔ ارباب نے عرض کیا: جو لوگ نیچے آچکے ہیں، انھیں مار لینا مشکل نہیں، لیکن جو ابھی تک پہاڑ پر ہیں یا پہاڑ سے اُتر رہے ہیں، ان پر یورش کی کیا صورت ہے؟ فرمایا: بہتر ہے، بڑے گروہ کو نیچے آلینے دیں:

پس آنجناب یک لحظہ توقف نمودند، بعد ازاں ہیچ کس را اطلاع بہ یورش ناداده، خود بسم اللہ، اللہ اکبر بہ زبان آورده داخل خلاب شدند۔ چوں طاقت روحی و جسمانی خداداد وے داشتند، و دراں خلاب کہ تا زانو مے رفت و پاے را بوقت بالا کشیدن بہ مشکل می گزاشت، بہ سرعت و چستی و چالاکی مثل شیر ژیاں حملہ کناں می رفتند و بطرز اہل ورزش جست مے نمودند کہ آنجناب دراں مہارت تام مے داشتند۔ پس ارباب بہرام خاں و دیگر کسانیکہ نگاہ شاں بہ جانب آنجناب بود ہمراہ شدند حتی کہ دادا ابوالحسن نصیر آبادی کہ نشان بردار بودند؟ غافل محض بودند۔ کسے دادا موصوف را آگاہ ساخت و راقم الحروف ہم بعد بالا کشیدن زیر جامہ داخل آں خلاب گردید۔ چوں عافیت بدنی نہ داشت بلکہ رنجور بود

سید صاحب نے ایک لحظہ توقف فرمایا، پھر کسی کو یورش کی اطلاع دیے بغیر بسم اللہ، اللہ اکبر کہہ کر دلدل میں داخل ہو گئے۔ چونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے خاص روحانی وجسمانی قوت عطا کر رکھی تھی، اس لیے تیزی، چستی اور چالاکی سے شیر ژیاں کی طرح حملہ کرتے ہوئے بڑھے حالانکہ دلدل میں پاؤں گھٹنوں تک دھنس رہا تھا اور اسے باہر کھینچنا مشکل تھا۔ آپ اہلِ ورزش کی طرح چھلانگیں مارتے ہوئے جا رہے تھے۔ اس میں آپ کو پوری مہارت حاصل تھی۔ آپ کے ساتھ ہی ارباب بہرام خاں اور وہ لوگ چلے جن کی نگاہیں آپ پر جمی ہوئی تھیں۔ دادا ابوالحسن نصیر آبادی جو آپ کے نشان بردار تھے، بالکل غافل تھے (یعنی ان کا دھیان سید صاحب کی طرف نہیں، بلکہ سکھ لشکر کی طرف تھا) کسی نے انھیں آگاہ کیا۔

ہمراہ آنجناب نہ رسید ۵	راقم الحروف نے بھی پاجامے کے پائنچے اوپر چڑھائے اور دلدل میں داخل ہو گیا۔ چونکہ بیمار تھا، اس لیے حضرت کے ساتھ نہ جا سکا۔

ضروری تصریحات

یہ ایک مستند چشم دید بیان ہے اور فی الجملہ اس کی درستی میں کلام کی گنجائش نہیں، لیکن اس کے بعض حصے یا تو غلط فہمی پر مبنی ہیں یا سمجھنا چاہیے کہ انھیں واضح کرنے کے لیے جو تفصیل درکار تھی، وہ سید جعفر علی نے پیش نہ کی۔ مثلاً:

۱ — سکھ لشکر پر حملے کے لیے ہموار میدان سے گزر کر آگے بڑھنا سمجھ میں آ سکتا ہے، لیکن ایک پتھر کی اوٹ کے بغیر بیٹھ جانا سمجھ میں نہیں آتا جبکہ سکھوں کی طرف سے گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔

۲ — میں نے قصبے اور مٹی کوٹ کے ٹیلے کے درمیان چپہ چپہ زمین دیکھی۔ وہاں کوئی ایسی جگہ نہ ملی جو مخصوصاً دلدل بن گئی ہو۔ اس حصے میں یقیناً نشیبی زمین موجود ہے، جس میں آج کل بھی کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ جنگ بالاکوٹ کے وقت اس میں دھان بوئے ہوئے تھے۔ یہ زمین چھوٹے بڑے کھیتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ہر کھیت کی مینڈ تھی۔ پگڈنڈی مینڈوں پر سے تھی۔ یقیناً کھیتوں میں پانی بھر دیا گیا تھا لیکن مینڈوں پر سے گزرا جا سکتا تھا۔

۳ — "وقائع" میں میاں عبدالقیوم کا بیان ہے کہ سید صاحب آدھی گھڑی (دس بارہ منٹ) مسجد زیریں میں ٹھہر کر بلند آواز سے تکبیر کہتے ہوئے حملہ آور ہوئے۔ دادا ابوالحسن سے فرمایا کہ نشان لے کر ہمارے آگے آگے چلو۔ اس وقت ارباب بہرام خاں آپ کے سامنے سپر بنے ہوئے چل رہے تھے۔ پچیس تیس قدم پر کھیت میں ایک بڑا پتھر زمین سے نکلا ہوا تھا، اس کی آڑ میں جا کر آپ ٹھہر گئے۔ یہ پتھر اب کہیں نظر نہیں آتا۔

۴ — دوسری روایتوں میں ہے کہ سید صاحب مینڈ پر سے گزرے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا۔ مولوی سید جعفر علی آخر تک سید صاحب کے ساتھ نہیں رہے تھے، اس لیے ان کی روایت، ان اصحاب کی روایتوں کے مقابلے میں ترجیح نہیں پا سکتی، جو سید صاحب کے ساتھ تھے۔

اب آپ تمام بیانات ملاحظہ فرمالیں، جنھیں سامنے رکھنے کے بعد جنگ کے مختلف مدارج کا اندازہ

ع منظورہ صفحہ ۱۱۲۹۔ ۲ وقائع جلد سوم صفحہ ۲۴

ہو سکے گا۔

لعل محمد جگدیش پوری

لعل محمد جگدیش پوری کہتے ہیں کہ سید صاحب :

اُوپر کی مسجد سے نیچے کی چھوٹی مسجد میں تشریف لائے۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر حملہ کیا اور تکبیر کہتے ہُوئے آگے بڑھے۔ جن کھیتوں میں رات کو چشمے کا پانی چھوڑا گیا تھا، ان میں جا کر پہنچے۔ ایک جگہ مینڈ سے آپ کا پاؤں پھسل کر کیچڑ میں جاتا رہا اور اس پاؤں کا جوتا اسی کیچڑ میں رہ گیا۔ میں نے جلد اس کو کیچڑ سے نکال کر حضرت کے پاؤں میں پہنا دیا۔ آپ تو آگے چلے گئے، کچھ قدر چل کر میرا بھی پاؤں پھسل گیا۔ جب تک کیچڑ سے نکلوں، تب تک سات آٹھ آدمی پیچھے کے آگے ہو گئے۔ میں ان کے پیچھے ہو لیا اور حضرت علیہ الرحمۃ جا کر نالے پر پہنچے، جہاں سکھوں کا بڑا ہجوم تھا اور تلوار اور بندوق جانبین سے چلنے لگی۔ پھر سکھ منہزم ہو کر طرف پہاڑ کے بھاگنے لگے اور پہاڑ پر چڑھنے لگے[1]۔

کریم اللہ خاں میواتی

کریم اللہ خاں میواتی مولانا شاہ اسماعیل کی جماعت میں تھے۔ اس جماعت کو ملا لعل محمد قندھاری کے مورچے کے قریب متعین کیا گیا تھا۔ سب لوگ صبح ہوتے ہی مورچوں میں جا بیٹھے۔ کریم اللہ خاں کو سید صاحب کی زیارت کے شوق نے روکے رکھا۔ وہ کہتے ہیں کہ مسجد بالا میں پہنچا تو آپ دُعا و مناجات میں مشغول تھے۔ سکھوں کے گولے ان کی طرف آتے تھے، لیکن کوئی گولہ کسی کو لگتا نہ تھا۔ میں چلے ہُوئے گولے اٹھا اٹھا کر شاہینچیوں کو دینے لگا۔ اس وقت مسجد (یعنی مسجد بالا) میں بڑا ہجوم تھا :

> پھر حضرت کواڑ مسجد کے کھول کر باہر نکلے اور بالا کوٹ کے نیچے کو روانہ ہُوئے اور سب لوگ آپ کے پیچھے آپ کے ہمراہ چلے۔ جب نیچے کی مسجد کے قریب پہنچے، گلی تنگ تھی۔ تمام آدمی اس میں ٹھس گئے اور ایک گلی مسجد کے سامنے طرف اور تھی۔ پھر حضرت تو مسجد مذکور میں تشریف لے گئے اور کچھ لوگ اس گلی میں گئے۔ انھیں کے ساتھ میں بھی چلا گیا اور دھانوں کے کھیت میں پہنچ کر بندوق سکھوں پر لگانے لگا۔ اس (اثنا) میں حضرت امیر المومنین اس مسجد سے ہٹ کر کے آئے اور ہم لوگوں کے بائیں طرف جہاں سکھوں

---

[1] وقائع جلد سوم صفحہ ۷۲۷۔ اس روایت میں نالے سے مراد مٹی کوٹ کا نالہ ہے۔

> کا بڑا ہجوم تھا ادھر چلے گئے اور جانبین سے بندوق کی باڑھ بھی چلتی تھی اور تلوار بھی چلتی تھی اور دھوئیں کی ایسی تاریکی تھی کہ دس قدم کا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ہوا مخالف تھی۔ تمام دھواں ان کا ہماری طرف آتا تھا۔[۱]

حافظ وجیہہ الدین باغپتی

حافظ وجیہہ الدین باغپتی کہتے ہیں:

> مسجد زیریں میں سکھوں کی گولیاں مانند اولوں کے برستی تھیں اور کئی آدمی وہاں زخمی بھی ہوئے اور شہید بھی ہوئے . . . . . پھر حضرت امیر المومنین علیہ الرحمۃ یکبارگی مسجد سے بآواز بلند تکبیر کہتے ہوئے حملہ آور ہوئے۔ اس سرعت سے اس وقت جاتے تھے، جیسے شکار پر شیر جاتا ہے اور تمام مجاہدین پاک دین آگے پیچھے آپ کے ہمراہ چلے جاتے تھے۔ پھر لڑائی کے کھیت میں جاکر دو دو چار چار جابجا متفرق ہوکر لڑنے لگے . . . . . جو سکھ پہاڑ سے اتر کر دھان کے کھیتوں کی کیاریوں میں آئے تھے، وہ پھر بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گئے اور غازیوں نے مارتے مارتے پہاڑ کی جڑ پکڑی۔[۲]

شیخ حفیظ اللہ دیو بندی

شیخ حفیظ اللہ دیو بندی، شیخ ولی محمد کی جماعت میں تھے، جس کا مورچہ مولانا شاہ اسماعیل کی جماعت کے بائیں جانب ست بنے کے کنارے پر تھا۔ شیخ موصوف کہتے ہیں کہ سوا پہر دن چڑھا ہوگا۔ ہمیں خیال بھی نہ تھا کہ حضرت خود حملہ کریں گے۔ ہماری جماعت کے بعض آدمیوں نے کہا کہ سکھوں پہ حملہ کرنا چاہیے۔ وہ اگرچہ تعداد میں زیادہ ہیں، لیکن ابھی سب پہاڑ سے اُترے نہیں۔ دوسرے بھائیوں نے کہا کہ حضرت کے حکم کے بغیر حملہ مناسب نہیں۔ اس اثنا میں:

> ہم لوگوں کے پیچھے سے یکبارگی ایک آواز بلند "اللہ اکبر"، "اللہ اکبر" کی سُنائی دی۔ ہم سب نے پیچھے پھر کر دیکھا کہ ایک غول غازیوں کا چلا آتا ہے۔ معلوم ہوا کہ خود حضرت امیر المومنین نے ہلہ کر دیا۔ پھر ہمارے سب لوگ ہلہ کرکے حضرت کی طرف چلے مجھ کو چند روز پہلے سے بخار آتا تھا۔ اس سبب سے پیچھے رہ گیا اور میری جماعت کے سب لوگ آگے بڑھ گئے۔[۳]

---

[۱] وقائع صفحہ ۲۲۱۔ نیچے کی مسجد سے مراد "مسجد زیریں" ہے۔ [۲] منظورہ ۳/۱۹۲۔ [۳] وقائع ۳/۲۰۸ اس روایت میں "پیچھے" کے لفظ سے غلط فہمی نہ ہونی چاہیے۔ ست بنے کا نالہ بالاکوٹ کے حلقے میں جنوب مشرق کے رخ بہتا ہے۔ اس کے کنارے مورچوں کا رخ جنوب مغرب میں تھا، اس وجہ سے قصبہ مورچوں کے عقب میں تقریباً عقب میں آگیا۔

شیر محمد خاں رام پوری

شیر محمد خاں رام پوری کہتے ہیں :

> حضرت امیر المومنین علیہ الرحمۃ مسجد زیریں) سے بہ آواز بلند تکبیر کہتے ہوئے نکلے اور مانند شیر کے، طرف سکھوں کی روانہ ہوئے اور کھیتوں کے پٹوں پر جاکر چڑھنے لگے ۔ میں بھی آپ کے پیچھے تھا ۔ چار یا پانچ پٹوں پر بہت مشقت سے چڑھا، پھر آگے نہ چڑھا گیا اور حضرت علیہ الرحمۃ اپنے لوگوں سے آگے بڑھ گئے ۔ پھر جب کثرت لوگوں کی کم ہوئی، تب میں دم لے کر اور کئی پٹوں پر چڑھا ۔ کوئی پٹ کمر تک بلند تھا، کوئی سینے تک اور جانبین سے بندوقیں بہ کثرت چلتی تھیں اور جہاں میں تھا وہاں سے قرابین چلانے کا موقع نہ تھا ۔ میں متردد تھا کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں ۔ پھر کھیت کی مینڈ پر ہو کر میں داہنے طرف چلا[1]

رحیم بخش بنارسی

رحیم بخش بنارسی بھی کہتے ہیں کہ زیریں مسجد پوری کی پوری غازیوں سے بھری ہوئی تھی ۔ سکھوں کی گولیاں بہ کثرت آ رہی تھیں ۔ کئی آدمی زخمی اور شہید ہوئے ۔ جب حضرت سے یہ عرض کیا گیا تو :

> بہ آواز بلند تکبیر کہتے ہوئے مسجد کی طرف سے سکھوں پر حملہ آور ہوئے اور تمام مجاہدین آپ کے ہمراہ تھے ۔ جب مسجد سے نکل کر دھانوں کی کیاریوں میں پہنچے تو وہاں جا بجا لوگ متفرق ہو گئے اور کیاریوں کی آڑ میں مورچے پکڑ کر سکھوں پر گولیاں مارنے لگے . . . . .
>
> ہمارے آگے بائیں طرف، کوئی سو سوا سو قدم کے فاصلے سے ایک جگہ غازیوں اور سکھوں کا بڑا ہجوم تھا اور اپنے لوگ اکثر کہتے تھے کہ حضرت علیہ الرحمۃ اسی ہجوم کے اندر ہیں[2]

میاں لکھمیر

میاں لکھمیر فرماتے ہیں کہ جب سکھ بڑھتے بڑھتے قندھاری جماعت کے مورچوں سے تیس چالیس قدم کے فاصلے پر رہ گئے تو ملا لعل محمد نے ہلہ کر دیا ۔ حضرت کو خبر ملی تو اگرچہ اتنے فاصلے سے حملے کا ارادہ نہ تھا لیکن قندھاریوں کو دیکھ کر دیر کرنا مناسب نہ جانا ۔ چنانچہ آپ بھی بہ آواز بلند تکبیر کہتے ہوئے مسجد زیریں سے نکل کر حملہ آور ہوئے :

> دھان کی کیاریوں میں پہنچے اور تلوار چلنی شروع ہو گئی ۔ اس وقت یہ حال تھا کہ جو سکھ غازیوں کے مقابلے پر تھے، ان کے ہاتھوں اور بدنوں پر رعشہ پڑ گیا ۔ بندوقیں نہ چلا

---

[1] وقائع ۲۳۰-۲۳۵ [2] منظورہ [illegible]

> سکے۔ غازی لوگ ایک ہاتھ سے ان کی بندوق پکڑتے، دوسرے ہاتھ سے تلوار مارتے اور قرابین والے قرابین مارتے تھے اور سکھ پیچھے ہٹتے ہٹتے پہاڑ کی طرف چلے جاتے تھے بے شمار سکھ اس وقت مارے گئے[1]

سکھوں کے افسر نے اپنے آدمیوں کو للکارا تو وہ لوٹے اور میاں لکھمیر وغیرہ کے بائیں جانب سے آنے لگے، اس وقت لکھمیر کے ساتھ کل سات آدمی تھے:

> حضرت علیہ الرحمۃ نے ہم آٹھوں سے فرمایا کہ ان سکھوں کو مارو۔ ہمارے پیچھے کی طرف نہ آنے پائیں۔ پھر ہم آٹھ آدمی کھیت کی مینڈ کی آڑ میں ہو کر بندوقیں مارنے لگے۔ وہ تمام سکھ اپنی جگہ پڑے رہے اور حضرت امیر المومنین علیہ الرحمۃ قدم مارتے ہوئے ہم لوگوں سے آگے بڑھ گئے۔[2]

یہ تمام بیانات موقع اور محل کے ساتھ پوری مطابقت رکھتے ہیں اور انھیں پڑھ کر بالاکوٹ کی رزمگاہ کو دیکھا جائے تو طبیعت میں کوئی خلجان پیدا نہیں ہوتا، جس طرح مولوی سید جعفر علی نقوی کے بیان سے پیدا ہوا۔

بہرحال لڑائی کی سرسری کیفیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ سید صاحب جس طرح مسجد بالا سے نکل کر اچانک مسجد زیریں میں گئے تھے، اسی طرح مسجد زیریں سے نکلے اور اچانک حملہ کر دیا۔ ممکن ہے کسی جگہ اوٹ میں ذرا سی دیر کے لیے توقف بھی فرمایا ہو، لیکن یہ صحیح نہیں کہ ایک پتھر پر بازوؤں کا سہارا لے کر بیٹھ گئے، نہ یہ کہ آپ دلدل میں کود پڑے۔ قرین قیاس صورت یہی ہے کہ نشیب کے کھیتوں کی مینڈوں پر سے گزرے، پھر درجہ بدرجہ کھیتوں پر پہنچے اور کود کود کر درجہ بدرجہ چڑھتے ہوئے تیزی کے ساتھ اس مقام پر پہنچ گئے، جو مٹی کوٹ کے دامن میں سکھوں کی نزول گاہ سے قریب تھا اور جہاں بڑے بڑے پتھروں کی آڑ مل سکتی تھی۔ وہیں سکھوں کا زیادہ اجتماع تھا اور انھیں پر حملہ مقصود تھا۔ جو غازی آپ کے ساتھ

---

[1] وقائع ۳/ ۲۴۶-۲۴۸ یہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ شیخ ولی محمد پھلتی، خدا بخش، الٰہی بخش، شیر محمد خاں، ملا امیر خاں قصوری، میاں عبدالقیوم، لعل محمد جگدیش پوری، حمید اللہ، امام الدین بڈھانوی، حسن خاں عظیم آبادی، رحیم بخش بنارسی، پیر محمد قاصد، کریم اللہ خاں میواتی، حاجی امان اللہ اور سید جعفر علی کہتے ہیں کہ میاں لکھمیر اگرچہ بڑے معتبر راوی ہیں، لیکن ملا لعل محمد قندھاری کی جانب سے بلا اذن حملے کا بیان صحیح نہیں۔ اس بارے میں میاں صاحب کو غلط فہمی ہوئی۔ غلط فہمی کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ملا صاحب کا مورچہ چونکہ سکھوں کے بہت قریب تھا، حملہ سید صاحب کے حکم سے ہوا۔ ملا صاحب قرب کی وجہ سے سکھوں پر پہلے پہنچ گئے۔ میاں لکھمیر نے سمجھ لیا کہ وہ بلا اذن حملہ آور ہوئے۔ [2] وقائع ۳/ ۲۰۳

مسجد سے نکلے تھے، وہ سارے ساتھ نہ رہے بلکہ دو دو چار چار، دس دس ہو کر بکھر گئے۔ ہر گروہ نے اپنے لیے اوٹ کی مناسب جگہ تلاش کر کے لڑائی شروع کر دی ہو گی۔ سید صاحب غالباً اس مقام سے قریب تھے، جہاں سے مٹی کوٹ کا نالہ پہاڑ پر سے اترتا ہے۔ یہ حملہ اتنا زوردار تھا کہ جتنے سکھ نیچے آ چکے تھے ان میں سے اکثر مارے گئے۔ باقی پیچھے پلٹ کر پہاڑ کی جڑ میں پہنچ گئے۔ کچھ اُوپر چڑھنے لگے۔ جنگ سے ایک روز پیشتر بارش ہوئی تھی، لیکن لڑائی کے وقت مطلع صاف تھا اور دھوپ نکل آئی تھی تاہم بارود کا دھواں اتنا زیادہ تھا کہ تھوڑے سے فاصلے پر بھی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ کارتوسوں کے کاغذ ہوا میں اس طرح اڑتے تھے، جیسے تیتریاں اڑا کرتی ہیں۔

میاں عبدالقیوم اور محمد امیر خاں قصوری

میاں عبدالقیوم داروغۂ باورچی خانہ کہتے ہیں:

> مٹی کوٹ کے پہاڑ کی جڑ سے سکھوں نے ہم سے پہلے حملہ کیا اور ان کمر کوہ کے کھیتوں کی یہ کیفیت تھی جیسے پختہ تالاب کی سیڑھیاں۔ کوئی اونچا چھاتی تک بلند تھا اور کوئی کمر تک اور کوئی اس سے بھی کم اور اوپر سے نیچے تک وہ البتہ چالیس پچاس چبوترے ہوں گے۔ ہم لوگ وقت حملے کے ان پر چڑھ کر جاتے تھے اور سکھ اُتر کر ہماری طرف آتے تھے اور حضرت امیر المومنین اس پتھر مذکور کی آڑ میں اس نیت سے ٹھہرے تھے کہ جب سکھوں کا حملہ بہت نزدیک آوے، تب ایک باڑھ قرابینوں کی مار کر تلوار سے لڑیں۔ پھر حکمت الٰہی سے یونہی معاملہ ہوا کہ جب ان کا حملہ اُوپر سے اُترتے اُترتے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر آیا، تب ایک بارگی تکبیر کہہ کر ایک باڑھ بندوقوں والوں نے ماری اور بعد ان کے دوسری باڑھ قرابین والوں نے ماری۔ ان دونوں باڑھوں میں بے شمار کفار واصل دارالبوار ہوئے اور باقی منہزم ہو کر اوپر کی طرف بھاگے۔ ادھر سے غازیوں نے اپنے ہتھیار لے کر ان کا تعاقب کیا۔ کوئی تو تلوار سے، کوئی گنڈاسے سے اور پتھروں سے، کوئی بندوق وغیرہ سے ان کو مارنے لگا . . . . باقی بھاگتے بھاگتے پہاڑ کی جڑ میں جا پہنچے [1]

آگے چل کر بتاتے ہیں کہ سکھ افسر نے یہ حالت دیکھ کر ترم بجایا اور اس آواز میں کچھ کہا۔ سکھ پھر پلٹے اور غازیوں پہ باڑھیں مارنے لگے۔ محمد امیر خاں قصوری کے بیان کے مطابق سید صاحب کے حملے نے

---

[1] وقائع ۳

بقیۃ السیف سکھوں کو پہاڑ کی جڑ میں پہنچا دیا تھا۔ وہ پہاڑ پر چڑھ رہے تھے۔ غازی ان کی ٹانگیں پکڑ پکڑ کر کھینچتے اور تلواریں مار مار کر ختم کرتے جاتے تھے[۱]

یہ تمام روایتیں فی الجملہ ایک دوسری کی مصدق ہیں۔ بعض اور روایتیں بھی ہیں۔ کسی میں تفصیلات زیادہ ہیں، کسی میں کم۔ صرف میاں نجم الدین شکارپوری کی روایت میں ایک بات ایسی ہے، جس میں وہ منفرد ہیں اور وہ یہ کہ سید صاحب نے جب مسجد زیریں میں دیکھا کہ بعض غازی سکھوں کی گولیوں سے زخمی یا شہید ہوئے تو فرمایا:

> جن غازیوں کے پاس پلّہ دار بندوقیں ہوں، وہ آگے چل کر سکھوں کے مقابلے میں مورچے لگا دیں ...... پھر اس وقت حضرت تو مسجد ہی میں رہے اور پلّہ دار بندوقوں والے سکھوں کے مقابلے کو گئے۔ ان کے ساتھ میں بھی گیا۔ اور مورچوں سے تو پہلے ہی بندوقیں چل رہی تھیں۔ پھر ہم لوگ دھانوں کی کیاریوں میں جا کر پانچ پانچ سات سات آدمی متفرق ہو گئے اور کیاریوں کی آڑ لے کر سکھوں پر گولیاں مارنے لگے اور میں سب کے کنارے پر تھا[۲]

مولوی سیّد جعفر علی

آخر میں پھر مولوی سیّد جعفر علی نقوی کا بیان سن لینا چاہیے۔ فرماتے ہیں:

آنجناب وہمراہیان آنجناب	سید صاحب اور آپ کے ساتھی بجلی
تیز تر از برق و باد بر سر آں کافراں رسیدند۔	اور آندھی سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ
بعضے از نیزہ و شمشیر جرأتے کردند والا تمامی	سکھوں کے سر پر پہنچے۔ ان میں سے بعض
بگریختند و راہ گریز ہم نبود چہ از کوہ فرود آمدہ	نے نیزہ و شمشیر اٹھانے کا حوصلہ کیا، باقی
بودند و دویدہ بالائے کوہ چگونہ روند۔ پس	بھاگ نکلے، لیکن راہ گریز کہاں تھی؟
ہمہ آنہا کہ زیر آمدہ بودند، مردار شدند و	وہ پہاڑ سے نیچے اتر چکے تھے اور دوڑ کر
کافرانے کہ بالا بودند از گلولہ ہائے بندوق	پہاڑ پر چڑھ نہیں سکتے تھے۔ پس جتنے نیچے
نہ خویش را گزاشتند و نہ بیگانہ را۔ آنجا گلولہ	اترے تھے، مارے گئے۔ جو سکھ اوپر

---

[۱] وقائع ۳۱ / ۱۹۱ ۔

[۲] وقائع ۳ / ۲۳۸ - ۲۳۹ میاں نجم الدین کے پاس ایک چھوٹی رومی بندوق تھی جو سید صاحب نے سفر حج میں عرب سے خریدی تھی۔ یہ پہلے شیخ صلاح الدین پھلتی کو دی گئی، ان سے میاں نجم الدین کو ملی۔ اس کی گولی بڑی بڑی پلّہ دار بندوقوں کے برابر جاتی تھی۔

تفنگ چوں ژالہ مے بارید و کاغذہائے
کارتوس در ہوا مے پرید و زدن سنگہا
از جانبین بود۔ پس راقم الحروف و منشی
انصاری وقتے رسیدیم کہ قلیلے ازاں
کافرانِ زیر کوہ زندہ بودند و بہ طرفۃ العین
چوں شکار کشتہ شدند[1]

تھے، وہ گولیاں چلا رہے تھے ان کی گولیاں نہ اپنوں کو چھوڑتی تھیں، نہ بیگانوں کو۔ گولیاں اولوں کی طرح برس رہی تھیں۔ کارتوس کے کاغذ ہوا میں اڑ رہے تھے۔ دونوں طرف سے ایک دوسرے پر پتھر بھی پھینکے جا رہے تھے۔ میں (سید جعفر علی) اور منشی محمدی انصاری اس وقت موقع پر پہنچے جب تھوڑے سے سکھ زندہ تھے۔ وہ بھی طرفۃ العین میں مارے گئے۔

بیانات کا خلاصہ

تمام بیانات کا خلاصہ یہ ہے:

۱ ۔ سید صاحب اچانک مسجد بالا سے نکل کر مسجد زیریں میں پہنچے اور وہاں سے اچانک حملہ کر دیا۔

۲ ۔ دھانوں کے کھیتوں کی مینڈھوں سے گزرے۔ ایک جگہ پاؤں پھسل کر کھیت کے کیچڑ میں پھنسا اور جوتا اس میں رہ گیا جو لعل محمد جگدیش پوری نے نکال کر پہنایا۔

۳ ۔ پھر پا پیادہ کھیتوں سے جست کرتے کرتے گزرے اور پہاڑ کے پاس اس جگہ کے قریب پہنچے، جہاں سکھوں کا ہجوم تھا۔

۴ ۔ نیچے اُترے ہوئے سکھوں میں سے بہت سے مارے گئے۔ باقی پیچھے ہٹ گئے یا پہاڑ پر چڑھ گئے۔ مولوی جعفر علی کے بیان کے مطابق نیچے اُترے ہوئے سب مارے گئے۔

۵ ۔ غازی ایک جگہ نہیں رہے تھے، بلکہ مختلف اوٹوں میں جا بجا بکھر گئے تھے۔

۶ ۔ دھواں اتنا پھیلا ہوا تھا کہ دس قدم سے آگے کی کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔

۷ ۔ ہوا مٹی کوٹ کی طرف سے بالاکوٹ کی طرف چل رہی تھی اور سکھوں کی بندوقوں کا دھواں غازیوں کی طرف آ رہا تھا۔

۸ ۔ سید صاحب اکثر غازیوں سے آگے تھے، پھر کسی نے انھیں پیچھے آتے نہ دیکھا۔

---

[1] منظورہ ۱۱۸۶-۱۱۸۷

۹ - پہاڑ پر جو سکھ بندوقیں چلا رہے تھے، ان کی گولیاں بے امتیاز برس رہی تھیں۔ غازیوں کے علاوہ سکھ بھی ان سے مارے گئے ۔

۱۰ - بندوقوں، تلواروں اور نیزوں کے علاوہ پتھر بھی اس لڑائی میں استعمال کیے گئے ۔

۱۱ - میاں نجم الدین شکارپوری کا بیان درست سمجھا جائے تو سید صاحب نے مسجد زیریں سے حملے کے لیے نکلنے سے پیشتر غازیوں کی ایک جماعت کو بھیج کر دھانوں کے کھیتوں میں مورچے بنوا دیے تھے ۔

۱۲ - میاں لکھمیر کے بیان کے مطابق سید صاحب کو حملے میں عجلت اس وجہ سے کرنی پڑی کہ ملا لعل محمد قندھاری نے اچانک بے اذن ہلّہ بول دیا تھا، لیکن تمام دوسرے راوی اس بیان کو میاں لکھمیر کی غلط فہمی پر محمول کرتے ہیں۔

اکتالیسواں باب

شہادت

چوں شہید عشق در دنیا و عقبیٰ سرخروست
اے خوش آں ساعت کہ مارا کشتہ زیں میداں برند

روایات میں اضطراب کی وجہ اس بات پر تمام راویوں کا اتفاق ہے کہ سید صاحب مسجد زیریں سے بہ نیت یورش نکلے تو سکھوں کو مارتے اور ان کا تعاقب کرتے ہوئے مٹی کوٹ کے دامن میں پہنچ گئے، اگرچہ تفصیلات میں کم و بیش اختلاف ہے۔ لیکن بعد کی روایتوں میں سخت اضطراب کی وجہ بالکل عیاں ہے، مثلاً:

۱ — غازیوں کا بڑا گروہ صرف مٹی کوٹ کی جانب اقدام شروع ہونے تک آپ کے ساتھ رہا۔ پھر جنگی مصلحتوں کی بنا پر اکثر کو ادھر ادھر منتشر ہو جانا پڑا۔ وہ لوگ کچھ بتا ہی نہیں سکتے تھے، اس لیے کہ بے خبر تھے۔

۲ — جن اصحاب نے کسی قدر حالات بتائے، وہ صرف تھوڑی دیر تک سید صاحب کے ساتھ رہے۔ پھر انھیں بھی زد و کشت کے ہنگامے میں الگ ہونا پڑا۔

۳ — جو خوش نصیب آخری دم تک سید صاحب کے دامن سے وابستہ رہے، ان میں سے غالباً ایک بھی زندہ نہ بچا۔ اس وجہ سے ان کا کوئی بیان محفوظ ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

ان حالات میں ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ روایتوں کے پورے ذخیرے میں سے وہ مطالب فراہم کر کے بہ صورت مرتب پیش کر دیں، جن میں سید صاحب کے متعلق کچھ نہ کچھ ذکر آیا ہے، پھر غور و فکر سے پیش آمدہ حالات کا ایک قیاسی نقشہ مرتب کریں۔

"منظورہ" کا بیان سب سے پہلے سید جعفر علی نقوی مولف "منظورہ" کا بیان ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں:

لشکر غازیاں ہمراہ حضرت	غازیوں کا لشکر حضرت امیر المومنین کے
امیر المومنین تا بیخ آں کوہ (مٹی کوٹ)	ہمراہ پہاڑ کی جڑ تک پہنچا۔ دھان کے
رسید۔ کشتہائے شالی منتہی شدہ بودہ	کھیت ختم ہو چکے تھے۔ سامنے پہاڑ

کوہ دشوار گزار بود۔ بعد فراغ از کشتن آں کافراں پائیں، گلولہ ہائے تفنگ و سنگ، باراں صفت از بالائے کوہ می افتاد و جناب حضرت امیر المومنین در ہماں جماعت از نظر من غائب شدند۔ از منشی موصوف (منشی محمدی انصاری) پرسیدم کہ حضرت امیر المومنین کجا ہستند؟ ایشاں فرمودند کہ عقب ما بہ سمت چپ ہستند۔ گفتم کہ الحمد للہ، پیش آنجناب دریں مقام ہستیم۔ پس ہر دو کساں نشستہ بندوق را پُر مے کردیم و استادہ گز امے نمودیم۔ زیرا کہ بلندی کشتہائے شالی کہ چوں زینہ بان بود بوقت نشستن از گلولہ و سنگِ دشمناں محفوظ مے شدیم۔ و وقتیکہ مے استادیم، کافرے را نشانہ کردہ زود سرے دادیم و باز می نشستیم[1]

دشوار گزار تھا۔ نیچے اُترے ہُوئے سکھوں کو مار چکے تو پہاڑ پر سے دسکھوں کی گولیاں اور پتھر بارش کی طرح آ رہے تھے۔ حضرت امیر المومنین اسی حالت میں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے منشی محمدی انصاری سے پوچھا: امیر المومنین کہاں ہیں؟ فرمایا: ہمارے پیچھے بائیں جانب۔ میں نے کہا: الحمد للہ کہ اس مقام میں ہم حضرت سے آگے ہیں۔ ہم دونوں بیٹھ کر بندوق بھرتے، اس لیے کہ دھان کے کھیت جو سیڑھی کی طرح پایہ بہ پایہ تھے، دشمنوں کی گولیوں اور پتھروں سے ہمیں محفوظ رکھتے تھے۔ اٹھتے تو کسی ایک دشمن کو نشانہ بنا کر بندوق تیزی سے سر کر کے پھر بیٹھ جاتے۔

گویا سید صاحب مٹی کوٹ کے دامن میں سید جعفر علی اور منشی محمدی انصاری کے بائیں ہاتھ تھے اور ان کا مقام دونوں منشیوں کے جنوب مشرق میں تھا۔ یہ ممکن مٹی کوٹ کی جڑ ہو سکتی ہے اور دونوں منشی اس مقام کے شمالی ٹیلے کے آس پاس تھے۔

متفرق بیانات

متفرق بیانات یہ ہیں:

۱ ۔ محمد امیر خاں قصوری: لڑتے لڑتے ہم لوگوں نے پیچھے پھر کر دیکھا تو نہ امیر المومنین کا نشان نظر آیا، نہ آپ دکھائی دیے[2]

---

[1] منظورہ صفحہ ۱۱۸۸ ۔ ۱۱۹۱۔ اس اقتباس میں "در ہماں جماعت از نظر من غائب شدند" والے فقرے کا غلط مفہوم سامنے رکھ کر جو غلط فہمیاں پیدا کی گئیں، ان پر مفصل بحث آگے آئے گی۔ [2] وقائع ۱۳/۱۹۱

۲ ـ میاں عبدالقیوم داروغہ باورچی خانہ : جب سکھوں نے پہلی مرتبہ منہزم ہونے کے بعد دوبارہ حملہ کیا تو اس وقت کچھ غازی ان کے مقابلے میں رہے، باقی سب میدان میں حضرت امیرالمومنین کو تلاش کرنے لگے۔ جس پتھر کی آڑ میں آپ چند آدمیوں کو لے کر بیٹھے تھے، وہاں آپ کا کوئی سُراغ نہ ملا۔[1]

۳ ـ الٰہی بخش رام پوری : ہم لوگوں نے جاکر پہاڑ کی جڑ پکڑی۔ اس اثنا میں حضرت کے مورچے کی طرف سے قصبہ ٹانوتہ کے حافظ عبداللطیف صاحب آبدیدہ یہ کہتے ہُوئے ہم لوگوں کے قریب آئے:

"امیرالمومنین کہاں ہیں؟" امیرالمومنین کہاں ہیں؟" میں نے کہا مجھ کو نہیں معلوم۔ وہ یہی کہتے ہُوئے ست بنے کے نالے کی طرف چلے گئے۔ پھر میں نے دیکھا کہ حضرت امیرالمومنین کے مورچے کی طرف بڑا ہجوم ہے اور تلوار چل رہی ہے۔

۴ ـ میاں امام الدین بڑھانوی : ہم پہاڑ کی جڑ میں پہنچ گئے۔ سکھ ہم پر بندوقیں چلا رہے تھے اور ہم سکھوں پر۔ میں بیٹھا تھا کہ میرے سینگڑے کا ڈاٹ کھل گیا اور بارود میرے انگرکھے کے دامن پر گر پڑی۔ میں اسے اٹھا کر بھرنے لگا تو حافظ عبداللہ ملیا والے حضرت کا پوچھتے ہُوئے آئے اور روتے ہُوئے پیچھے کو چلے گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے چلا۔ مولانا شاہ اسماعیل ملے۔ وہ کچھ نہ بولے۔ پھر شیخ ولی محمد سے ملاقات ہُوئی۔ ان سے حضرت کا پوچھا تو ست بنے کے نالے کی جانب ایک ہجوم کو مشارٌالیہ بنا کر فرمایا: اس ہجوم میں جاتے ہیں، تم بھی اسی طرف چلو۔

کریم اللہ خاں میواتی اور نجم الدین شکارپوری

کریم اللہ خاں کہتے ہیں اس وقت کسی کو معلوم نہ تھا کہ کون کہاں ہے:

> مولانا اسماعیل نے ہم لوگوں سے پوچھا کہ حضرت امیرالمومنین کہاں ہیں؟ لوگوں نے کہا اس ہجوم میں، جہاں تلوار چل رہی ہے، وہاں ہوں گے۔ پھر مولانا تو ادھر چلے گئے . . . . . جو غازی حضرت امیرالمومنین کے مورچے سے آتا، یہی پوچھتا کہ حضرت امیرالمومنین کہاں ہیں؟

نجم الدین شکارپوری فرماتے ہیں کہ میرزا احمد بیگ پنجابی پراگندہ حواس سر پیٹتے ہُوئے آئے اور پوچھنے لگے: "امیرالمومنین کہاں ہیں؟ میں تو آپ کو مسجد زیریں میں چھوڑ کر آیا تھا اور معلوم نہ تھا کہ آپ نے حملہ کیا۔" میں نے میرزا سے کہا کہ حضرت بالاکوٹ میں ہوں گے۔

---

[1] وقائع ص ۲۰۳

رحیم بخش بنارسی اور میاں لکھمیر

رحیم بخش بنارسی :

ہمارے آگے سو سوا سو قدم پر ایک جگہ سکھوں اور غازیوں کا ہجوم تھا اور اپنے اکثر لوگ کہتے تھے کہ حضرت امیر المومنین اسی ہجوم کے اندر ہیں، پھر ہم تینوں (اللہ بخش بانپتی، رسول خاں جلالہ والا اور خود راوی) نے آپس میں صلاح کی کہ آؤ ہم بھی وہیں چلیں، جہاں حضرت امیر المومنین ہیں اور اس وقت گولیوں کا مینہ برستا تھا۔ پھر ہم تینوں وہاں سے اس طرف دوڑے . . . . . اس عرصے میں لڑائی شکست ہو گئی۔

میاں لکھمیر :

حضرت امیر المومنین سکھوں کو مارتے ہوئے ہم لوگوں سے آگے بڑھ گئے۔ ہمارے دہنے طرف نالہ تھا۔ چھ آدمی ہمارے اس نالے میں ہو کر حضرت امیر المومنین کے پاس چلے گئے . . . . . اس عرصے میں حضرت علیہ الرحمۃ کی طرف سے زخمی ہو کر ناصر خاں بھٹ گرام کے آئے۔ انھوں نے ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا کہ اس ہجوم میں تشریف رکھتے ہیں۔

بعد میں میاں لکھمیر کو امان اللہ خاں لکھنوی اور شیخ ولی محمد یکے بعد دیگرے ملے۔ ان سے سید صاحب کے متعلق پوچھا تو اول نے کوئی جواب نہ دیا، شیخ ولی محمد نے کہا کہ ان کو تو گوجر پہاڑ پر لے گئے[1]۔

روایات کی کیفیت

ان میں سے ایک روایت بھی ایسی نہیں جس سے تعین کے ساتھ کوئی بات معلوم ہو سکے۔ بعض نے سید صاحب سے بالکل بے خبری ظاہر کی۔ بعض ان کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ بعض نے ایک ہجوم کی طرف اشارہ کیا لیکن یہ کسی نے نہ بتایا کہ ہجوم کہاں تھا؟ مٹی کوٹ کے دامن میں یا کسی اور جگہ؟ شیخ ولی محمد کی زبان سے ایک راوی (نجم الدین شکار پوری) نے سنا کہ سید صاحب ست بنے کے نالے کی طرف ہجوم میں جا رہے ہیں۔ دوسرے راوی (میاں لکھمیر) نے سنا کہ سید صاحب کو گوجر اٹھا کر لے گئے۔ لیکن شیخ نے یہ بات کسی سے سن لی ہوگی۔ وہ خود نہ اس بات کے شاہد تھے کہ سید صاحب ست بنے کی طرف گئے، نہ اس بات کے شاہد تھے کہ انھیں گوجر اٹھا کر لے گئے۔ تعجب ہے کہ شیخ نے یہ بات

---

[1] یہ تمام بیانات وقائع کی جلد سوم سے ماخوذ ہیں۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۲۲۰، ۲۲۶، ۲۳۳، ۲۴۱، ۲۴۴، ۲۴۸، ۲۴۹۔

سُنتے ہی مان لی اور اس حقیقت پر غور نہ کیا کہ اگر سید صاحب ست بنے کے نالے کی طرف گئے تو خود شیخ صاحب کیوں میدان میں ٹھہرے رہے؟ یا گوجر گھمسان کے رن میں، جہاں مینہ کی طرح گولیاں برس رہی تھیں، کیوں کر آئے اور کس ترکیب سے سید کو محفوظ اٹھا کر لے گئے؟ پھر شیخ صاحب نے میدان جنگ سے باہر نکل کر پورے حالات پر غور کیا تو ان کی رائے بھی یہی تھی کہ سید صاحب کو اسی جگہ جا کر تلاش کرنا چاہیے، جہاں وہ میدان میں اکثر غازیوں سے الگ ہوئے تھے۔

الٰہی بخش رام پوری

الٰہی بخش رام پوری کی روایت میں بھی گوجروں کا ذکر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب لڑائی ہو رہی تھی تو حضرت بالاکوٹ سے اُتر کر ہم سے سو سوا سو قدم کے فاصلے پر ٹھہرے:

> اس اثنا میں جانب شمال سے دس بارہ گوجر کمل پوش آئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ سید بادشاہ کہاں ہیں؟ میں نے کہا کیا کام ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہم ملاقات کو آئے ہیں۔ میں نے ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا کہ حضرت ان لوگوں میں ہیں۔ پھر وہ سب حضرت کی طرف چلے گئے۔ نظام الدین اولیا نے مجھ سے کہا کہ یہ گوجر تو وے معلوم ہوتے ہیں، جو اس دن بچوں میں آتے ہوئے رات کو پہاڑ پر حضرت کے پاس اسی لباس سے دعوت کا کھانا لے کر آئے تھے۔ میں نے کہا، کیا عجب ہے وہی ہوں۔ پھر اس کے تھوڑی دیر بعد ایک شور ہوا کہ حضرت امیر المومنین نے ہلہ کر دیا۔[1]

تعجب ہے کہ گوجر سید صاحب سے اس موقع پر ملنے کے لیے آئے، جب لڑائی پورے زور شور سے جاری تھی اور سید صاحب مسجد بالا سے مسجد زیریں میں پہنچ چکے تھے۔ عام روایات کے مطابق مسجد زیریں میں ان کا قیام دس پندرہ منٹ سے زیادہ کا نہ تھا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ حملے میں گوجر سید صاحب کے ساتھ نہ تھے۔ پھر وہ مٹی کوٹ کے دامن میں کب پہنچے؟ نیز کس ذریعے سے اور کس راستے سے سید صاحب کو اٹھا کر لے گئے؟ وہ بستی میں نہیں آ سکتے تھے۔ مٹی کوٹ کے ٹیلے یا اس کے شمال والے ٹیلے پر نہیں جا سکتے تھے۔ مٹی کوٹ کے دامن سے ست بنے کی طرف جاتے تو راستے میں قندھاریوں کا مورچہ تھا۔ وہ بھی اس واقعہ سے بالکل بے خبر رہے۔

میدان میں سید صاحب کا مقام

اب وہ روایتیں ملاحظہ فرمائیے، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے آخری اوقات میں سید صاحب کس جگہ تشریف فرما تھے؟ نیز

---

[1] وقائع، ص ۲۱۰، ۲۱۱

ان اصحاب کے بیانات پر نظر ڈالیے، جو شہادت کے قریب تک آپ کے ساتھ رہے۔

لعل محمد جگدیش پوری کہتے ہیں:

> حضرت علیہ الرحمہ نالے میں پہنچے جہاں سکھوں کا بڑا ہجوم تھا اور تلوار، بندوق جانبین سے چلنے لگی۔"

نالے سے مقصود یقینی طور پر مٹی کوٹ کا نالہ ہے اور ہجوم اسی مقام پر تھا جہاں نالہ پہاڑ سے اُتر کر نیچے کی طرف آیا ہے۔ وہی مقام تھا جہاں سکھ پہاڑ سے اُتر کر آگے بڑھ رہے تھے۔

شیر محمد خاں رام پوری کہتے ہیں کہ میں اپنے بھیلے کے افسر شیخ وزیر پھلتی سے ملا تو پوچھا کہ حضرت کا معلوم ہے، کہاں ہیں؟ انھوں نے کہا:

> "میں نے نہیں دیکھا لیکن لوگوں سے سُنا ہے کہ کہیں اس نالے میں ہیں ..... پھر میں نے شیخ وزیر سے کہا کہ تمام غازی تو یہاں سے نکلے جا رہے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین کو میں نے سُنا ہے کہ اس نالے میں ہیں۔ اگر ہوں تو آؤ چل کر دیکھیں۔"

چنانچہ دونوں نالے کی طرف چلے۔ رستے میں ناصر خاں بھٹ گرامی ملے۔ وہ زخمی تھے۔ پوچھا کدھر جا رہے ہو؟ عرض کیا نالے میں حضرت کو دیکھنے جا رہے ہیں؟ بولے:

> "پھر چلو، حضرت وہاں کہاں؟ اور ہاتھ سے اشارہ کرکے کہا کہ وہ تو ان لوگوں کے ساتھ جاتے ہیں جو پہاڑ پر چڑھتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔"

شیر محمد خاں اور شیخ وزیر دونوں نالے کے پاس تک گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ جو لوگ وہاں تھے، وہ بھی پہاڑ پر چڑھے چلے جاتے ہیں۔[1]

نالے سے یقیناً مٹی کوٹ کا نالہ مقصود ہے، پھر وہ پہاڑ کون سا تھا جس پہ لوگ نالے سے نکل کر چڑھے جا رہے تھے؟ مٹی کوٹ کا پہاڑ ہو نہیں سکتا۔ اس لیے کہ اس پر تو سکھ قابض تھے۔ اس کے ساتھ شمالی جانب کا پہاڑ ہو سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ شیر محمد خاں اور شیخ وزیر نالے تک نہیں گئے اور نہ جا سکتے تھے۔ قریب پہنچ کر لوگوں کو مٹی کوٹ کے ساتھ کے ٹیلے پر چڑھتے دیکھا تو وہیں سے لوٹ آئے۔

شیخ حفیظ اللہ دیو بندی شیخ حفیظ اللہ دیو بندی کی روایت سے محض مقام ہی کا تعین نہیں ہوتا، بلکہ

---

[1] "پھر چلو" کا مطلب ہے لوٹ چلو۔ لعل محمد جگدیش پوری اور شیر محمد خاں دونوں کے بیانات وقائع جلد سوم سے ماخوذ ہیں دیکھو صفحات ۲۲۷، ۲۳۵، ۲۳۶۔

مزید تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

> دھانوں کے کھیت میں میں نے دیکھا کہ مولانا اسماعیل صاحب کھڑے بندوق لگا رہے ہیں۔ میں نے دور ہی سے پکار کر پوچھا: مولانا صاحب! حضرت امیر المومنین کہاں ہیں؟ انھوں نے کہا کہ شور نہ کرو، سکھ سنتے ہیں۔ حضرت آگے نالے میں ہیں۔ وہیں چلے جاؤ۔ پھر میں وہاں گیا تو دیکھا حضرت علیہ الرحمۃ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں بندوق پکڑے قبلہ رُخ نالے میں بیٹھے ہیں اور ایک طرف آپ کے قریب، بیس پچیس غازی صف باندھے آڑ میں بیٹھے بندوقیں لگا رہے ہیں۔ میں بھی ان میں جا بیٹھا اور بندوق بھر بھر کر مارنے لگا . . . . . میں نے اپنی بندوق بھری اور سر اٹھا کر چاہا کہ نشانہ باندھ کر بندوق ماروں۔ اس اثنا میں سکھوں کی طرف سے ایک تیر آ کر میری بائیں آنکھ کے تلے لگا اور بھال اس کی دوسری طرف پار ہو گئی۔ میں سر جھکا کر بیٹھ گیا اور اس تیر کو کھینچ کر ڈال دیا۔ میرے داہنے طرف میاں جی چشتی بیٹھے تھے۔ ان کے پاس نور بخش جراح شاملی والے تھے۔ میں نے میاں جی چشتی سے کہا: میری تو آنکھ کے نیچے تیر لگا۔ نور بخش سے کہو میرا زخم باندھ دے۔ میاں صاحب نے کہا کہ یہ وقت زخم باندھنے کا نہیں پیچھے پن چکیوں پر سایہ دار درخت ہیں، تم وہاں جا کر بیٹھو۔

حافظ وجیہ الدین باغپتی

اس سے بھی زیادہ تفصیلات حافظ وجیہ الدین باغپتی کی روایت میں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب غازی سکھوں کا تعاقب کرتے ہوئے مٹی کوٹ کی جڑ تک پہنچ گئے تو میں بھی:

> بندوق لگاتے لگاتے ایک نالے پر جا پہنچا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ چند آدمیوں میں حضرت امیر المومنین بیٹھے ہوئے بندوقیں چلا رہے ہیں اور آپ کے قریب کئی لاشیں شہیدوں کی پڑی ہیں . . . . . . اس وقت حضرت نے میرے روبرو داہنی چھاتی پر بندوق جما کر فیر کی تو مجھ کو آپ کے داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی یا اس کے پاس والی انگلی میں خون تازہ نظر آیا۔ میں نے اپنے قیاس سے معلوم کیا کہ شاید آپ کے مونڈھے میں گولی لگی ہے، اسی کا خون آپ کی انگلی میں، بندوق چھاتی پر رکھنے کے وقت، لگ گیا ہے، مگر یقینی اپنی آنکھ سے زخم میں نے نہیں دیکھا اور آپ کی جانب جب اس نالے میں نشیب کی طرف چند قدم کے فاصلے پر سلو خاں وہبنی قرابین داروں کی جماعت لیے بیٹھے ہیں اور آپ کے

جانب راست سو قدم کے فاصلے سے لعل محمد قندھاری کا نشان تھا۔ اس وقت اس طرف سکھوں کا غلبہ زیادہ تھا اور اس نشان کو نشان بردار نیچے لیے آتا تھا۔

امیر المومنین علیہ الرحمۃ نے میری طرف دیکھ کر فرمایا کہ ہلّہ کرو۔ میں نے چند قدم نیچے اُتر کر سلو خاں سے کہا کہ حضرت فرماتے ہیں ہلّہ کرو۔ انھوں نے کہا کہ لعل محمد قندھاری کا نشان سکھوں کے غلبے سے نیچے اُترا آتا ہے، یہاں سے کیوں کر ہلّہ کروں؟

خیر وہ تو وہاں بیٹھے رہے۔ میں وہاں سے اُوپر چڑھنے لگا اور میری بندوق فیر کرتے کرتے آگ سی گرم ہو رہی تھی اور اس وقت خالی بھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ تین سکھ میری طرف آتے ہیں۔ میں نے خالی بندوق ان کی طرف اٹھائی۔ وہ مارے ڈر کے وہیں ٹھہر گئے۔ پھر میں آگے بڑھا۔ اس اثنا میں ایک اور سکھ نے میرے اوپر نیزہ اٹھایا۔ میں نے اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھا۔ وہ سکھ بھی وہیں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اس عرصے میں میرے بائیں پہلو میں کمر کے اوپر گولی لگی اور دوسری طرف نکل گئی۔ ادھر سکھ ہلّہ کرکے پھر پہاڑ سے نیچے کھیت کی کیاریوں میں آ پہنچے۔ پھر میں اور زخمیوں کے ساتھ اس لڑائی کے کھیت سے باہر نکلا۔ بعد اس کے وہاں کا مفصل حال معلوم نہ ہوا۔[1]

بابا بہرام خاں تنولی اور سید جعفر علی نقوی

شرکائے جنگ بالاکوٹ میں سے ایک بابا بہرام خاں تنولی بھی تھے، جو لمبی عمر پا کر ۱۹۲۱ء میں فوت ہوئے۔ یہ تنول کے رؤسا میں سے تھے۔ نوجوانی کے عالم میں سید صاحب کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ حملہ اٹک میں بھی شریک تھے۔ ان کا بیان ہے کہ غازیوں نے دشمن کو مار مار کر دامن کوہ تک میدان صاف کر دیا۔ پہاڑ پر چڑھنا دشوار تھا۔ سید صاحب دامن کوہ میں اپنی جماعت میں ایک پتھر پر کھڑے تھے۔ دشمن کی گولیوں کی بوچھاڑ آئی۔ پھر دیکھا تو سید صاحب پتھر پر نہ تھے۔ سب ساتھی بھی شہید ہو گئے، مگر میں نے اپنی آنکھ سے انھیں گرتے نہ دیکھا اور نہ ان کی نعش دیکھی۔ نہ ساتھیوں میں سے کسی نے آپ کو گرتے ہوئے یا بے جان پڑے ہوئے دیکھا۔[2]

مولوی سید جعفر علی نقوی مصنف "منظورہ" نے بالاکوٹ کے میدان سے نکل کر مختلف ساتھیوں سے سید صاحب کے حالات پوچھے تو معلوم ہوا کہ آپ کی ران میں گولی لگی تھی۔ سر مبارک پر پتھر کا زخم تھا۔ قبلہ رو بیٹھے ہوئے تھے۔ وہیں نور بخش جراح آپ کی مرہم پٹی کے لیے حاضر ہوا۔[3]

---

[1] وقائع جلد سوم صفحہ ۱۹۲ - ۱۹۶ - [2] کتاب العبرۃ مرتبہ سید عبدالجبار شاہ ستھانوی صفحہ ۲۶۳ - [3] منظورہ صفحہ ۱۱۹۳ -

خلاصۂ مطالب

بس یہ سید صاحب کے متعلق آخری روایات ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ سید صاحب دامن کوہ کے سکھوں کو مار کر مٹی کوٹ کے نالے میں بیٹھ گئے۔ وہاں پتھر بھی برس رہے تھے، گولیاں بھی آتی تھیں۔

۲۔ نالے میں اس طرح بیٹھے تھے، منہ قبلے کی طرف تھا یعنی جانب مغرب۔ بائیں ہاتھ نالے کے نیچے کی طرف یعنی جانب جنوب تھوڑے فاصلے پر سلطان خاں دیوبندی قرابین داروں کی جماعت کے ساتھ بیٹھے تھے یہ بیس پچیس آدمی ہوں گے۔ ان میں میاں جی چشتی اور نور بخش جراح بھی تھے۔

۳۔ سید صاحب کے ایک ہاتھ تلوار تھی، دوسرے میں بندوق۔ آپ نے داہنی چھاتی پہ رکھ کر بندوق چلائی تو آپ کے داہنے ہاتھ کی چھنگلی یا ساتھ کی انگلی پر تازہ خون نظر آیا۔ راوی نے قیاس کیا کہ آپ کے مونڈھے میں گولی لگی۔ آپ کے قریب غازیوں کی کئی لاشیں تھیں۔

۴۔ سید جعفر علی نقوی کی تحقیق کے مطابق آپ کی ران میں گولی لگی تھی اور سر پر پتھر کا زخم تھا۔

۵۔ بابا بہرام خاں کے بیان کے مطابق آپ کھڑے تھے کہ گولیوں کی بوچھاڑ آئی۔ پھر نظر نہ آئے۔ گویا وہیں گر گئے لیکن آپ کی لاش کسی نے نہ دیکھی۔

کیفیت شہادت

اس کے بعد شہادت کے بارے میں کوئی روایت نہیں مل سکی، اس لیے کہ جو غازی ساتھ تھے، ان میں سے صرف وہ زندہ بچے جو زخموں سے ناچار ہو کر شہادت سے پیشتر علیحدہ ہو چکے تھے۔ جو آخر وقت تک ساتھ رہے اور جن کے سامنے شہادت ہوئی، وہ خود بھی شہید ہو گئے اور جو کیفیت دیکھی تھی، اسے بیان کیے اور سنائے بغیر عالم بقا میں پہنچ گئے۔ لیکن اس حقیقت کو بے چون وچرا تسلیم کر لینا چاہیے کہ سید صاحب مٹی کوٹ کے نالے میں دامن کوہ کے قریب زندگی کے آخری سانس تک لڑتے رہے اور اسی حالت میں شہید ہو گئے۔ "متحرفاً للقتال" اور "متحیزاً الی فئۃ" کی اگرچہ اجازت تھی، لیکن آپ کی عزیمت اس کی بھی روادار نہ ہوئی اور إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ ہی پر عمل پیرا رہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ جس مقام پر آپ کھڑے تھے، وہ شجاعت کا مقام تھا نہ کہ تدبیر کا۔ زخمی ہو کر باہر نکلنے یا نکالے جانے کی ایک بھی شہادت موجود نہیں۔ جن روایتوں کو بعض ساتھیوں نے قابل اعتماد سمجھا وہ سراسر مضطرب تھیں، اس لیے شایان اعتماد نہ تھیں۔ شہادت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں، اگرچہ اس کی کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ کی چوبیسویں تاریخ (۶۔ مئی ۱۸۳۱ء) جمعہ کا دن اور گیارہ بارہ بجے کا عمل تھا[1]

---

[1] میں پہلے بتا چکا ہوں کہ گارڈنر نے جنگ بالاکوٹ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ سراسر افسانہ ہے۔ اسی قسم کا ایک افسانہ دیوان امرناتھ نے (بقیہ صفحہ [illegible] پر)

فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ

اس طرح غیرت وحمیت دین کا وہ شہسوار اور رضائے باری تعالیٰ کا وہ علمدار اس دنیا سے رخصت ہُوا جس نے ہندوستان کے اندھیرے میں عشق حق کا چراغ روشن کیا۔ جس نے حصار اسلامیت کی تشئید و استحکام کے لیے اپنا اور اپنے رفیقوں کا خونِ حیات بے دریغ پیش کر دیا۔ تاریخ کا ایوان ان شخصیتوں کی مدح سرائی کے غلغلوں سے گونج رہا ہے، جنھوں نے تاج و تخت اور سلطنت و ثروت کے لیے تلواریں چلا کر انسانی خون کی ندیاں بہائیں اور اس آرزو میں مدت العمر جدال و قتال اور تاراج و غارت کا ہنگامہ بپا رکھا کہ ان کے مقبوضات کی پہنائی مساحت کے عام پیمانوں کی دسترس سے باہر ہو جائے۔ سید احمد شہید نے صرف اس غرض سے جہاد کے لیے قدم اٹھایا کہ کلمۂ حق کا پرچم سربلند ہو، اسلام کا غلبہ اوجِ کمال پر پہنچ جائے، شریعت غرائے مصطفوی کا سکہ ہر جگہ رواں ہو، بندوں کا پیمانِ عبودیت معبود حقیقی کے ساتھ از سرِ نو استوار ہو جائے۔ مخلوق کا رشتۂ نیاز خالق کے ساتھ جُڑ جائے۔ ان کے جہاد کا دامن نہ حکومت کی خواہش سے ملوث ہُوا، نہ اس پر طلب جاہ و ثروت کا کوئی دھبا لگا۔ صرف ایک تڑپ تھی اور صرف ایک اشتیاق تھا کہ خدائے بزرگ و برتر کی خوشنودی حاصل ہو۔ آپ اس ترازو میں ان مشاہیر کے کارنامے رکھ کر تولیے، جن کی ناموری کے روبرو دنیا قرنہا قرن سے خراج تحسین پیش کرتی ہوئی نہیں تھکتی، حالانکہ ان میں سے بہت ہی کم افراد نکلیں گے جنھوں نے للہیت کے اس مقام پر چند لمحوں کے لیے بھی کھڑے ہونا پسند کیا ہو، جس پر سید احمد شہید کی حیات طیبہ کا ایک ایک ثانیہ بسر ہُوا اور جس پر ثبات و استقامت میں سید موصوف نے شہادت کو اس خندہ پیشانی سے قبول کیا کہ دوسروں نے شاید زندگی کا خیر مقدم بھی اس رنگ میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۸۴)

ظفر نامہ میں بھی لکھا ہے۔ مثلاً یہ کہ پہلے مولانا اسماعیل شہید ہوئے، پھر مولانا عبدالحی۔ حالانکہ مولانا عبدالحی جنگ بالاکوٹ سے بہت پہلے جبر میں فوت ہو چکے تھے۔ سید صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر میدان میں آئے، تین گولیاں کھا کر گھوڑے سے گرے اور جان بحق ہو گئے (ظفر نامہ صفحہ ۱۹۴) حالانکہ بالاکوٹ میں کسی نے بھی گھوڑا استعمال نہیں کیا تھا۔

اسی طرح میرزا حیرت نے حیات طیبہ میں سید صاحب اور مولانا اسماعیل کی شہادت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے تخیل طرازی اور افسانہ بافی کا کرشمہ ہے۔ میرزا حیرت نے یہ بھی لکھا ہے کہ سید صاحب کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ آپ جھک گئے اس اثنا میں ایک گولا آپ کو باڑی کا نڈ میں سے اٹھا کر لے گیا۔ ٹانگ میں گولی لگنے کا واقعہ بے شک درست ہو سکتا ہے، لیکن جہاں سید صاحب شہید ہوئے، وہاں توپ استعمال ہی نہ ہوئی۔ پھر گولا کہاں سے آیا؟

نہ کیا ہو۔ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے مشاہیر میں سے کتنے ہیں، جنھیں موقف رضا میں سید صاحب کے برابر کھڑا کیا جا سکتا ہے یا قریب لایا جا سکتا ہے؟ آپ کی جماعت کے سوا کون سی جماعت ہے، جس نے صرف صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی زندگیوں کو نصب العین بنایا اور ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ اتصال و مماثلت پیدا کرنے میں اپنی ساری کوششیں صرف کر دیں؟ لیکن خیرہ فروتی کی نیرنگیاں اور حق ناشناسی کی بوقلمونیاں ملاحظہ ہوں کہ یہی فنا فی اللہ شخصیت اور یہی فنا فی اللہ جماعت سوا سو سال تک ہر قسم کے مطاعن کا ہدف بنی رہی۔

بیالیسواں باب

مشہد بالاکوٹ

سر را اگر نہ بہر نثار آفریدہ اند
بارے بگرد نم بہ چہ کار آفریدہ اند

غازیوں کی بے قراری سکھ فوج اگرچہ غازیوں کے مقابلے میں بارہ گنا تھی لیکن جس عزیمت و استقامت کے ساتھ سید صاحب نے جنگ شروع کی تھی، اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے سکھوں کا فتح یاب ہونا آسان نہ تھا۔ جب غازیوں کو یہ معلوم ہوا کہ سید صاحب کا کچھ پتا نہیں ملتا تو اکثر اصحاب بے خود و بے اختیار ہو کر اس میدان میں سرگرداں پھرنے لگے جہاں اولوں کی طرح گولیاں اور پتھر برس رہے تھے۔ ہر ایک کی زبان پر صرف یہ کلمہ تھا کہ "حضرت کہاں ہیں؟" سید جعفر علی نقوی فرماتے ہیں:

از گم شدن آنجناب در خلال جنگ محبان جاں فدا، دست از جنگ کشیدہ بے قرار در تلاش آنجناب سو بسو دویدند و ضربت گلولۂ بندوق کفار کہ پالودہ شربت شہادت بود چشیدہ بہ رحمت الٰہی پیوستند۔

دورانِ جنگ میں سید صاحب کی گم شدگی کا سُن کر جاں نثار ارادت مندوں نے لڑائی سے ہاتھ کھینچ لیا اور بے قرار ہو کر آپ کی تلاش میں سو بسو پھرنے لگے۔ سکھوں کی گولیاں، جو شربت شہادت سے لبریز تھیں، کھا کھا کر رحمت الٰہی کی آغوش میں پہنچتے رہے۔

تدبیرِ دفاع سید جعفر علی لکھتے ہیں کہ میدان میں تھوڑے سے غازی رہ گئے۔ بائیں جانب سے امان اللہ خاں لکھنوی آئے۔ میں نے پوچھا: خاں صاحب! یہ کیا ہوا؟ میدان غازیوں سے خالی ہو گیا۔ وہ بولے: افسوس ہمیں شکست ہوئی۔ اس اثنا میں شیخ ولی محمد آ گئے۔ باہم مشورے کے بعد طے ہوا کہ جو چھوٹی سی جماعت مٹی کوٹ کے دامن میں سکھوں کے مقابلے پر رہ گئی ہے، اسے ہٹا کر بالاکوٹ لے چلیں۔ اس طرف اور غازی بھی ہوں گے۔ سب جمع کر لڑیں گے تو ممکن ہے سکھ جان کے خوف سے قصبے میں داخل نہ ہوں۔ چنانچہ یہ غازی قصبے کی طرف لوٹے۔ چونکہ یہ صورت بہ ظاہر پسپائی کی تھی، اس لیے سید جعفر علی

لکھتے ہیں: میں بار بار کہہ رہا تھا کہ الٰہی تو جانتا ہے کہ ہم دشمن کے خوف کے باعث پیچھے نہیں ہٹ رہے، بلکہ اصلاحِ احوال کی غرض سے مورچا بدل رہے ہیں۔ سکھوں کی گولیاں اس شدت سے آ رہی تھیں کہ مولوی جعفر علی کے سارے کپڑے چھلنی ہو گئے۔ دوسرے غازیوں کی حالت بھی یہی تھی۔ کھیت پایہ بہ پایہ تھے، یا اوپر کے کھیت سے نیچے کے کھیت میں کودتے۔ گولیاں اوپر کے کھیتوں کے پشتوں پر پڑتیں اور ان سے جو مٹی اڑتی وہ ان کے سروں پر گرتی۔ اسی حالت میں یہ دائیں بائیں اور آگے پیچھے کے غازیوں کو آوازیں دیتے جا رہے تھے کہ قصبے کا رخ کرو۔ جب مسجد زیریں سے آگے بڑھے تو معلوم ہوا کہ سکھوں کا ایک جیش جنوبی سمت سے پیش قدمی کرتا ہوا بالاکوٹ میں داخل ہو چکا ہے، گویا قصبے میں مورچا بنانے کی جو سکیم طے ہوئی تھی، اس پر بھی عمل کی کوئی صورت نہ رہی۔

پن چکیوں میں مورچے کا قصد

یہ حالت دیکھ کر غازی بائیں ہاتھ ست بنے کے نالے کی طرف پلٹے اور سب کو آواز دی کہ ست بنے کے نالے سے گزر کر پن چکیوں کے پیچھے مورچے بناؤ[1]۔ وہاں بھی قدم جمانے کی کوئی شکل نہ بنی تو شیخ ولی محمد اور سید جعفر علی قصبے کے شمالی پہاڑ پر چلے گئے۔ ٹیلے پر کھڑے ہو کر میدان کا جائزہ لیا تو سکھ ست بنے کے نالے سے گزر کر پن چکیوں سے بھی آگے بڑھ چکے تھے۔ اس اثنا میں دو غازی پن چکیوں سے باہر نکلے۔ انھوں نے تلواریں سونت رکھی تھیں۔ سکھوں نے ان پر حملہ کیا۔ شیخ ولی محمد نے کہا: چلو ان بھائیوں کی مدد کریں۔ چند ہی قدم گئے ہوں گے کہ دونوں غازی شہید ہو گئے۔ اس وقت سید جعفر علی نے کہا:

> اگر حضرت امیر المومنین کی گم شدگی کے بعد جانیں دینا ضروری ہے تو بہتر یہ ہے کہ ڈھالوں اور قرابینوں وغیرہ کو پھینک دیں۔ تلواریں لے کر حملہ آور ہوں اور (پن چکیوں والے) رفیقوں کی طرح دادِ شجاعت دیں۔ لیکن ہمارے اس طرح جانیں دے دینے سے اللہ تعالیٰ کے کام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اگر حضرت امیر المومنین زندہ مل گئے تو شکست شکست نہیں رہے گی، بلکہ ہماری فتح ہو گی۔ حضرت کے لیے بھی ہمارا زندہ رہنا غنیمتِ کبریٰ ہو گا۔ پس اس صورت میں جان کی حفاظت مناسب معلوم ہوتی ہے[2]۔

اس رائے سے سب نے اتفاق کیا۔ اس اثنا میں قصبے سے دھوئیں کے بادل بلند ہوئے۔ معلوم ہوا

---

[1] پن چکیاں بالاکوٹ کے شمال میں برنا اور ست بنے کے درمیان اول کے مغربی اور دوم کے مشرقی کنارے پر تھیں اور اب بھی ہیں۔

[2] منظورہ صفحہ ۱۱۸۶ - ۱۱۹۳۔

کہ سکھوں نے حسب عادت مکانوں کو آگ لگا دی۔

میاں عبدالقیوم یہ صرف ایک جماعت کی سرگزشت تھی جو غالباً آٹھ دس غازیوں پر مشتمل تھی زیادہ تر افراد اس وجہ سے میدان چھوڑ کر ست بنے کے نالے کی طرف چلے گئے کہ عام شہرت ہو گئی تھی، گوجر سید صاحب کو ست بنے کے راستے لیے جا رہے ہیں۔ میاں عبدالقیوم کہتے ہیں کہ حضرت جس پتھر کی آڑ میں چند آدمیوں کے ساتھ بیٹھے تھے، وہاں نہ ملے تو غازی آپ کی تلاش میں متردد ادھر ادھر پھرنے لگے۔ سکھ بندوقوں کی باڑھیں مار رہے تھے، اس میں بہت سے مجاہدین شہید ہوئے:

> اس اثنا میں ایک آواز لوگوں نے سنی: "غازیو! تم یہاں کیا کرتے ہو؟ حضرت امیرالمومنین کو گوجر ست بنے کے نالے میں ہو کر لیے جاتے ہیں۔" یہ آواز سنتے ہی، غازی اس کھیت سے باہر نکلنے لگے۔ جو حضرت امیرالمومنین کے ساتھ ٹیلے میں تھے، ان میں سے شاید کوئی بچے ہوں، باقی سب شہید ہوئے۔ اور غازی ادھر ادھر دور دور تھے، ان میں سے اکثر بچ کر سلامت نکل گئے۔ . . . . . اس وقت سکھوں نے بالاکوٹ کو آگھیرا اور وہاں کے گھروں میں آگ لگا دی اور جو غازی بیمار اپنے ڈیروں پر رہ گئے تھے، ان کو جا کر شہید کیا۔ ان میں سے بعض غازی سکھوں سے مقابلہ کر کے اور ایک دو کو مار کر شہید ہوئے اور بعض غازی، جو بہت بیمار تھے، وہ اپنے بستر پر شہید کیے گئے[۱]۔

اسی روایت میں آگے چل کر بیان کرتے ہیں کہ شمالی سمت کے پہاڑ[۲] کی کمر پر تین راستے تھے۔ ایک دائیں جانب جہاں ہم تھے، دوسرا بائیں جانب، تیسرا راستہ بیچ میں پگ ڈنڈی جیسا تھا۔ اس پہاڑ کے سر پر دو گوجر کھڑے تھے۔ انھوں نے آواز دے کر کہا:

> غازیو! ہراساں نہ ہونا۔ تمھارے سید بادشاہ کو لڑائی کے کھیت سے سلامت نکال کر گوجر لوگ اس پہاڑ کے دائیں راستے سے لے گئے (یعنی ست بنے کی طرف سے) جدھر تم جاتے ہو ادھر ہی چلے جاؤ۔ آگے وہ بھی راستہ اسی میں ملا ہے۔ وہاں سید بادشاہ تم کو مل جاویں گے . . . . . . آواز گوجروں کی سن کر ہم تمام بشاش اور مطمئن ہو گئے کہ الحمدللہ ہمارے حضرت سلامت ہیں۔

دوسری روایات اس روایت کی تصدیق دوسری روایتوں سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً:

---

[۱] وقائع جلد سوم ص ۲۰۴، ۲۰۵۔ [۲] اس سے مراد وہ ٹیلہ ہے جو مٹی کوٹ اور ست بنے ٹیلے کے بیچ میں ہے۔

۱۔ الٰہی بخش رام پوری: بالاکوٹ کو آگ لگی ہوئی تھی، اور لوٹ مچ رہی تھی۔ میں شمال کی طرف چلا (یعنی مٹی کوٹ کے دامن سے) درے کے منہ پر پہنچا تو گوجروں کی آواز سنی: ہندوستانیو! ادھر آؤ، سید بادشاہ زخمی ہیں۔ انھیں لوگ اس درے میں لیے جاتے ہیں۔ کوئی خچر ملے تو لاؤ کہ اس پر سید بادشاہ کو سوار کر کے لے چلیں۔[1]

۲۔ لعل محمد جگدیش پوری: سکھوں نے جا کر بالاکوٹ کو گھیر لیا اور لوٹنے اور گھر جلانے میں مصروف ہو گئے۔ اسی وقت ایک آواز سنی کہ گوجر لوگ حضرت امیر المومنین کو ست بنے کے نالے کی طرف لیے جاتے ہیں۔[2]

۳۔ شیر محمد خاں رام پوری: مٹی کوٹ سے ست بنے کی طرف پہاڑ کے دامن کے ساتھ ساتھ چلے۔ کچھ دور آگے ایک شخص نوجوان دونوں ہاتھوں میں دستانے پہنے ہوئے مظفر آباد کے نواح کا، اس کو لوگ "راجا"، "راجا" کہتے تھے، ملا۔ اس نے بھی کہا کہ حضرت امیر المومنین لڑائی کے کھیت میں نہیں ہیں، وہ تو یہاں سے ہمراہ لوگوں کے نکل گئے۔ تم بھی یہاں نہ ٹھہرو، جلد نکل جاؤ۔ یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں اور اسی پہاڑ کے نیچے کے راستے چلے جاؤ۔[3]

آواز کس نے دی؟

غرض پہلے سید صاحب کی گم شدگی کے شہرے نے غازیوں میں انتشار پیدا کیا اور اکثر آپ کی تلاش میں شہید ہوئے۔ پھر یہ آواز سنی گئی کہ سید صاحب کو گوجر ست بنے کے راستے لے گئے۔ یہ آخری بات بالکل غلط تھی۔ سوال یہ ہے کہ آواز کس نے دی؟ اس امر کی تشہیر کا ذمہ دار کون تھا، جس کی وجہ سے غازیوں نے میدان چھوڑ کر ست بنے کے نالے کا رخ کر لیا؟ آیا یہ آوازہ سکھوں نے ملکیوں کے ذریعے سے بدیں غرض بلند کرایا تھا کہ غازی میدان سے نکل جائیں اور مقابلہ ختم ہو جائے؟ یا کیا سمجھا جائے کہ غازیوں کے کسی خیر خواہ نے یہ تدبیر اختیار کی؟ یہ یقین تھا کہ اگر غازیوں کو سید صاحب کا نام لے کر میدان سے ہٹایا نہ جاتا تو وہ سب وہیں جانیں دے دیتے۔ دونوں صورتیں ممکن ہیں، بلکہ آخری صورت زیادہ قرین قیاس ہے، لیکن اس بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔

ابتدائی سکیم کے ترک کا مسئلہ

بعض اصحاب کے نزدیک بالاکوٹ میں غازیوں کو اس وجہ سے شکست ہوئی کہ سید صاحب نے قصبے میں بیٹھ کر دفاع کی جو سکیم ابتدا میں طے کی تھی، اسے دفعۃً چھوڑ کر خود حملہ کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ خیال مزید غور و فکر کا محتاج ہے۔

---

[1] وقائع جلد سوم صفحہ ۲۲۲ ۔ [2] ایضاً صفحہ ۲۲۹ ۔ [3] ایضاً صفحہ ۲۲۷

بلاشبہ ابتدائی سکیم بہت اچھی تھی لیکن اسے ترک کیوں کیا گیا؟ میں مدت تک سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سید صاحب نے بلاوجہ یہ سکیم ترک نہ کی ہوگی بلکہ جن حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ابتدائی سکیم تیار کی گئی تھی، وہ حالات بدل گئے ہوں گے۔ مثلاً ابتدا میں صرف یہ اندیشہ تھا کہ سکھ مٹی کوٹ کی طرف سے بالاکوٹ پر بڑھیں گے۔ بعد میں جنوبی سمت سے بھی ان کی پیش قدمی شروع ہو گئی ہو گی اور دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر توپیں لگا کر انھوں نے قصبے پر گولہ باری بھی شروع کر دی تھی۔ تین طرف سے یورش کی حالت میں قصبے کے اندر بیٹھ کر دفاع خاصا خطرناک بن گیا تھا اور اس کے سوا چارہ نہ رہا تھا کہ سکھوں کے بڑے جیش کو فیصلہ کن جنگ کر کے پیچھے ہٹایا جائے، پھر دوسری سمتوں کی یورشوں کا مداوا کیا جائے۔ اس رائے کے حق میں کوئی روایت موجود نہیں، لیکن تمام قرائن اس کے مؤید ہیں[1]۔

مولانا شاہ اسماعیل

اب مختلف غازیوں کے شہید یا زخمی ہونے کا حال سن لینا چاہیے۔ ان میں سب سے پہلے مولانا شاہ اسماعیل شہید آتے ہیں۔ "منظورہ" میں ہے کہ ان کی پیشانی پر گولی لگی[2]۔ سید عبدالرحمن (خواہر زادہ سید صاحب) نے شیخ ولی محمد اور امان اللہ خاں لکھنوی کی زبانی سنا کہ مولانا کے سر پر ایک گولی لگی تھی۔ اس سے اگرچہ خفیف زخم آیا لیکن داڑھی خون سے رنگی گئی۔ پھر آپ ننگے سر امان اللہ خاں کو ملے۔ بندوق بھری ہوئی تھی اور لبلبی چڑھی ہوئی تھی۔ پوچھا: امیر المومنین کہاں ہیں؟ امان اللہ خاں نے مٹی کوٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ادھر سے بکثرت گولیاں آ رہی تھیں لیکن یہ کہتے ہوئے چلے گئے: بھائی! میں تو وہیں جاتا ہوں۔ پھر معلوم نہ ہو سکا کہ کس حربے سے شہادت پائی[3]۔ میاں حفیظ اللہ دیوبندی نے انھیں دھانوں کے کھیتوں میں مٹی کوٹ کے نالے سے قریب بندوق چلاتے دیکھا تھا[4]۔ میاں امام الدین بڈھانوی کا بیان ہے کہ جب غازی حضرت امیر المومنین کی تلاش میں تھے تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا رفل کندھے پر رکھے ہوئے چہل قدمی کر رہے ہیں۔ پیشانی سے خون جاری ہے[5]۔ لعل محمد جگدیش پوری مٹی کوٹ کے دامن کے حالات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے بائیں طرف سے مولانا اسماعیل رفل کندھے پر ڈالے اور ننگی تلوار ہاتھ میں لیے میرے پاس آئے۔ پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ پوچھا: امیر المومنین کہاں ہیں؟ میں نے اپنے داہنے طرف ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اس ہجوم میں ہیں۔ یہ سن کر وہ اس طرف جھپٹتے ہوئے چلے گئے[6]۔ کریم اللہ خاں میرانی کا بیان بھی یہی ہے کہ مولانا اس ہجوم کی طرف چلے گئے جہاں تلوار

---

[1] ایک صورت اور سامنے آتی ہے، جس کی تفصیل ابواب ضمیمہ میں ملے گی۔

[2] منظورہ صفحہ ۱۱۹۳ ۔ [3] منظورہ حاشیہ ۱۱۹۴ ۔ [4] وقائع جلد سوم صفحہ ۲۰۹ ۔ [5] وقائع جلد سوم صفحہ ۲۲۵

[6] وقائع جلد سوم صفحہ ۲۳۰ ۔

چل رہی تھی۔ وقائع میں ہے کہ سر سے خون جاری تھا، یہ معلوم نہیں کہ گولی پیشانی پر لگی تھی یا کنپٹی پر۔ ہجوم میں جا کر دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے[1]

شہادت کہاں ہوئی؟ آخری بیان کسی عینی شہادت پر مبنی نہیں۔ صرف ہجوم میں گھس جانے کی بنا پر قیاس کر لیا گیا کہ وہاں شہید ہوئے۔ یہ ہجوم بالاکوٹ کی غربی جانب مٹی کوٹ کے دامن میں تھا اور مولانا کی قبر اس جگہ سے قریباً ایک میل کے فاصلے پر قصبے کے شمال مشرق میں ست بنے کے نالے کے پار بنی۔ اگر مولانا مٹی کوٹ کے دامن میں شہید ہوئے تو ان کی میّت کو اٹھا کر اتنی دور ایک الگ تھلگ مقام پر کیوں لے گئے جبکہ وہاں کوئی قبرستان بھی نہ تھا بلکہ کھیت ہی کھیت تھے؟ میرا خیال ہے کہ مولانا لڑتے لڑتے اور دشمن کے دباؤ کے باعث مٹی کوٹ کے دامن سے پیچھے ہٹتے ہٹتے ست بنے کے پار پہنچ گئے اور وہاں شہید ہوئے۔ یہ معلوم نہیں کہ شہادت گولی سے ہوئی یا تلوار سے[2]۔ وہیں ان کی قبر بنی۔

ارباب بہرام خاں ارباب بہرام خاں کے متعلق صرف اتنا ذکر ہے کہ سید صاحب مسجد زیریں سے حملے کے لیے نکلے تھے تو ارباب سپر بن کر آگے آگے جا رہے تھے۔ "منظورہ" میں ہے کہ شالی کے کھیتوں کے کنارے سید صاحب بیٹھ گئے تو ارباب ان کے پاس دائیں جانب تھے۔ پھر معلوم نہیں وہ کہاں کہاں لڑے اور کس جگہ شہید ہوئے۔ ان کی قبر شاہ اسماعیل کی قبر کے پاس بنی تھی۔ اغلب ہے وہ بھی مولانا کے ساتھ پیچھے ہٹتے ہٹتے ست بنے کے مشرق میں پہنچ گئے ہوں اور وہیں شہید ہوئے ہوں۔ ارباب اور مولانا کی لاشیں خضر خاں قندھاری اور اللہ دین پھلیلی والے نے پہچانی تھیں، جنھیں جنگ سے دوسرے دن تحقیقِ احوال کی غرض سے بالاکوٹ بھیجا گیا تھا[3]۔ ارباب کی لاش چھ ماہ بعد اس قبر سے نکال کر تہکال لے گئے، جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔

علاؤ الدین، محمدی اور بلند بخت مولوی سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ میں اور منشی محمدی انصاری

---

[1] وقائع جلد سوم صفحہ ۲۵۷، ۲۵۳۔ [2] قائع عجیبہ میں ہے کہ گھوڑے سے جدا ہونے سے پہلے آپ کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو گیا تھا (۱۴۹)۔ یہ صحیح نہیں۔ مولانا یا سید صاحب بالاکوٹ میں گھوڑے پر سوار ہی نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح میرزا حیرت کا یہ بیان بھی صحیح نہیں کہ شاہ اسماعیل نے نشیب میں سے ہو کر سکھوں کے عقب میں حملہ کیا اور چار توپیں لے لیں۔ پھر معلوم ہوا کہ سید صاحب خطرے میں ہیں اور انھیں بچاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ نہ توپیں چھیننے کا کوئی قصہ پیش آیا، نہ اس میدان میں سکھوں کے پاس توپیں تھیں، نہ مولانا نے عقب میں حملہ کیا، نہ ایسے حملے کی گنجائش تھی اور نہ وہ سید صاحب کو بچاتے ہوئے شہید ہوئے۔ [3] وقائع جلد سوم صفحہ ۲۶۵۔

پاس پاس کھڑے لڑ رہے تھے۔ اچانک قاضی علاء الدین بگھروی لڑائی سے دست کش ہو کر حضرت کا پوچھتے ہوئے آئے۔ منشی انصاری نے بھی لڑنا چھوڑ دیا اور حضرت کی تلاش میں بائیں جانب چلے گئے۔ اسی حالت میں یہ دونوں بندوق گولیاں کھا کر شہید ہو گئے۔ میں نے پیچھے پھر کر دیکھا تو کوئی آٹھ قدم کے فاصلے پر ابراہیم خاں تھے۔ میں ان کی طرف جانے لگا تو دائیں جانب سے شیخ بلند بخت آتے ہوئے ملے۔ مجھ سے پوچھا: کہاں جاتے ہو؟ میں نے عرض کیا: "ابراہیم خاں کے پاس" وہ چپ چاپ بائیں طرف چلے گئے اور وہیں گولی کھا کر شہادت سے سرفرازی پائی۔

نور احمد نگرامی

نور احمد نگرامی غازیوں میں "مورخ اسلام" کے لقب سے مشہور تھے۔ انھوں نے "نور احمدی" کے نام سے سید صاحب کے حالات میں ایک ایسی کتاب مرتب کی تھی جس کی ہر روایت کی تصدیق خود سید صاحب سے کرا لی تھی۔ محمد امیر خاں قصوری کہتے ہیں کہ شالی کے کھیتوں سے آگے بڑھ کر میں ایک پتھر کی آڑ میں کھڑا بندوق چلا رہا تھا۔ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر نور احمد تھے۔ ایک گولی ان کے بازو پر لگی تو بولے: بھائی میں معذور ہو گیا۔ میری چیزوں میں سے جو درکار ہو لے لو۔ میں نے گولیاں لے لیں اور وہ پیچھے کو چلے۔ پھر ان کے ایک اور گولی لگی اور وہ زمین پر بیٹھ گئے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اسی جگہ شہید ہوئے یا اور جگہ۔[1]

حفیظ اللہ دیوبندی

حفیظ اللہ دیوبندی سید صاحب کے پاس ٹیلے میں پہنچ گئے تھے۔ وہاں ان کی بائیں آنکھ کے نیچے تیر لگا اور اس کا پیکان پار ہو گیا۔ میاں جی چشتی نے انھیں پن چکیوں کے پاس سایہ دار درختوں میں بھیج دیا۔ راستے میں انھیں امان اللہ خاں لکھنوی اور چند اور غازی مل گئے۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ حضرت امیر المومنین جہاں تھے، وہیں ہیں، لہٰذا ادھر چلنا چاہیے۔ حفیظ اللہ بھی ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ دوسرے غازیوں نے یہ کہہ کر انھیں روک دیا کہ آپ زخم کی وجہ سے معذور ہیں۔ پھر وہ پن چکیوں کے پاس پہنچے اور ایک درخت کے سایے میں بیٹھے رہے۔ بعد میں سید صاحب کا پشاوری فیل بان ان کا ہاتھ پکڑ کر میدان سے باہر لے گیا۔[2]

الٰہی بخش رام پوری

الٰہی بخش رام پوری سید صاحب کے ساتھ مسجد زیریں سے نکلے تھے لیکن برابر نہ دوڑ سکے اور پیچھے رہ گئے۔ تیس پینتیس سکھ ننگی تلواریں لے کر ان کی طرف بڑھے۔ ان کی بندوق میں چھ گولیاں اور قرابین کی بیس گرابیں تھیں۔ فوراً آتش باری شروع کر دی اور سکھ پراگندہ ہو کر

---

[1] وقائع جلد سوم صفحہ ۱۹۵۔ [2] وقائع جلد سوم صفحہ ۲۱۰، ۲۱۱

پہاڑ پر چڑھ گئے۔ پھر ایک سفید ریش سکھ سبزہ رنگ گھوڑے پر سوار آیا۔ اس پر بھی کئی مرتبہ آگ برسائی، لیکن وہ بچ کر پہاڑ کی آڑ میں چلا گیا۔ یہ شیخ ولی محمد سے بات کرنے لگے۔ اس اثنا میں ایک گولی دائیں بازو پہ لگی۔ شیخ نے اپنی پگڑی پھاڑ کر ان کا بازو گلے سے باندھا اور پیچھے بھیج دیا۔

امام الدین بڑھانوی

امام الدین بڑھانوی ساٹھ ستر غازیوں کے اس جیش میں تھے، جو سید صاحب سے پہلے میدان میں بھیجا گیا تھا۔ یہ سولہ سترہ برس کے نوجوان تھے۔ ایک قوی ہیکل اور دبازریش سکھ تلوار لے کر ان کی طرف بڑھا تو خالی بندوق سکھ کی جانب کر دی۔ پیچھے سے ایک سفید پوش عمامہ باندھے آیا، خدا جانے اس نے سکھ کے کیا مارا کہ وہ پیچھے کی طرف پلٹا اور ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرا۔ امام الدین نے لپک کر تلوار ماری۔ سکھ کا گلا نہ کٹ سکا۔ پھر ایک اور غازی نے پتھر سے اس کا کام تمام کیا۔ جب غازی ست بنے کے نالے کی طرف جانے لگے تو امام الدین بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔

محمود خاں لکھنوی

محمود خاں لکھنوی نے مسجد بالا میں سید صاحب سے التجا کی تھی کہ میرے چہرے پر ہاتھ پھیر دیجیے۔ سید صاحب نے ہاتھ بھی پھیرا تھا اور دُعا بھی کی تھی۔ لعل محمد جگدیش پوری کا بیان ہے کہ جب سکھ منہزم ہو کر پہاڑ پر چڑھے اور غازی تعاقب میں گئے تو محمود خاں نے اپنی تلوار دانتوں میں دبا رکھی تھی اور ایک سکھ کی ٹانگ نرد میں پکڑے دونوں ہاتھوں سے اسے نیچے کھینچ رہے تھے۔ ایک اور سکھ اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑے ہوئے اسے اُوپر کھینچ رہا تھا۔ آخر محمود خاں نے ایسا زور مارا کہ سکھ کو نیچے کھینچ لائے۔ دونوں لوٹتے پوٹتے نالے میں گرے اور دونوں ختم ہو گئے۔

کریم اللہ خاں میواتی

کریم اللہ خاں میواتی کی دائیں ہتھیلی پر گولی لگی تھی۔ ایک گولی سے ان کی تلوار کا کندا ٹوٹ گیا تھا۔ ایک زرہ پوش سکھ نے ان پر تلوار کا وار کرنا چاہا لیکن گولی کھا کر زمین پر گر گیا۔ کریم اللہ خاں نے بڑھ کر تلوار ماری جو زرہ سے ٹکرا کر ٹیڑھی ہو گئی۔ غازی کا ہاتھ بیکار ہو چکا تھا، جوتی کے نیچے تلوار کا سرا دبا کر سیدھا کیا۔ دو اور سکھ ان کی طرف بڑھے تو کریم اللہ خاں نے بندوق اٹھا لی۔ وہ دُور ہی رُک گئے۔ دوسرے غازیوں کے ساتھ یہ بھی میدان سے باہر نکل گئے۔

مہربان خاں

میاں نجم الدین شکارپوری میدانِ جنگ سے باہر نکل رہے تھے تو دیکھا کہ بانگرمئو کے غازی مہربان خاں چت پڑے ہیں۔ میاں نجم الدین سے فرمایا: مجھے پانی پلاؤ۔ انھوں نے جواب دیا کہ پانی کہاں سے لاؤں۔ چلیں، تو میں آپ کو آہستہ آہستہ سہارا دے کر لے چلتا ہوں۔ بولے: مجھے یہی جگہ پسند ہے، یہاں سے نہ جاؤں گا۔ پھر فرمایا: اگر پانی نہیں لا سکتے تو میری گردن میں

روپوں کی حائل ہے، اسے کھول کر لے جاؤ۔ میاں صاحب نے سوچا کہ شاید اس میں دیر ہو جائے۔ مہربان خاں کہنے لگے: خیر، یہاں سے جلد نکل جاؤ۔ یہ پیر خاں مودائیں کی جماعت میں تھے۔ چالیس برس کی عمر ہوگی۔ تکیہ شریف میں سید صاحب سے وابستہ ہوئے تھے۔ گویا جہاد میں برابر ساتھ رہے۔

جماعت خاص

حافظ وجیہ الدین نے سید صاحب کے پاس جو لاشیں دیکھی تھیں، ان میں سے شیخ عبدالرؤف پھلتی اور شاہ محمد کی لاشیں پہچانی تھیں۔ سلو خاں دیوبندی، دوسرے قرابین دار اور میاں جی چشتی بھی وہیں تھے۔ وہ اسی جگہ شہید ہوئے ہوں گے۔ مرزا ابوالحسن نصیر آبادی جماعت خاص کے نشان بردار تھے۔ وہ مسجد زیریں سے مٹی کوٹ جاتے ہوئے یا وہاں پہنچ کر شہید ہوئے۔ اکثر اصحاب پھلت جماعت خاص میں تھے۔ انھوں نے بھی سید صاحب کے ساتھ شہادت پائی۔ نور بخش جرّاح بھی وہیں جاں بحق ہوئے۔ خود حافظ وجیہ الدین صاحب نالے سے آگے بڑھے تھے۔ تین سکھوں نے ان پر حملہ کیا۔ حافظ صاحب نے بندوق اٹھائی تو وہ رُک گئے۔ ایک سکھ نے نیزہ تانا۔ حافظ صاحب نے تلوار سنبھال لی۔ پھر ان کے بائیں پہلو پر گولی لگی تو معذوری کی حالت میں میدان سے باہر نکل گئے۔

ایک پانی پتی نوجوان

میاں نجم الدین کا بیان ہے کہ جب حضرت امیر المومنین نے سکھوں پر یورش کی تو میدان جنگ میں مقدمے میں نے پانی پت کے ایک نوجوان غازی کو دیکھا، جس کا نام یاد نہیں رہا۔ وہ ننگی تلوار لیے کھڑا تھا۔ ایک طویل القامت سکھ افسر تلوار لے کر اس کے مقابلے پر آیا اور دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ اگرچہ دونوں ایک دوسرے پر تلواریں چلاتے تھے لیکن چونکہ باہم لپٹے ہوئے تھے، اس لیے کسی پر کاری ضرب نہیں پڑتی تھی۔ معمولی زخموں سے بہتے بہتے دونوں کمزور ہو کر گر پڑے۔ ایک اور سکھ نے آگے بڑھ کر غازی کا سر قلم کر ڈالا۔

شیخ محمد اسحاق گورکھپوری

شیخ محمد اسحاق گورکھپوری کا بایاں ہاتھ جنگ مایار میں بیکار ہو چکا تھا۔ وہ بندوق نہیں چلا سکتے تھے۔ تلوار سے بھی حسب دلخواہ کام نہیں لے سکتے تھے۔ جنگ بالاکوٹ میں انھیں گنڈاسا دے دیا گیا۔ یورش کے آغاز ہی میں ان کے دائیں ہاتھ پر گولی لگی اور وہ بھی بیکار ہو گیا۔ اس وجہ سے وہ یہ کہتے ہوئے قصبے کی جانب لوٹ پڑے کہ میں تو اب دُعا کے قابل رہ گیا ہوں۔

آہستہ آہستہ قصبے میں پہنچے تو زیادہ خون بہنے سے ان پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ جب سکھ جنوبی سمت سے بالاکوٹ میں داخل ہوئے تو شیخ غریب اللہ گورکھپوری نے انھیں ساتھ لے جانا چاہا۔ انھیں ہوش نہ آیا۔ اٹھا کر لے جانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ شیخ غریب اللہ ست بنے کے نالے سے ہو کر

باہر نکل گئے۔ شیخ محمد اسحاق وہیں بے ہوش پڑے رہے اور اسی حالت میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔

کریم بخش کا بیان

کریم بخش کہتے ہیں کہ یورش کے بعد جب غازی کھیتوں میں بکھر کر جنگ کر رہے تھے تو میں نے مندرجہ ذیل اصحاب کو زخمی یا شہید دیکھا:

۱ ۔ مولوی محمد قاسم کے چھوٹے بھائی محمد حسن زخمی ہو کر قبلہ رو بیٹھے تھے۔

۲ ۔ قاضی الدین، جن کا وطن معلوم نہ ہو سکا، شہید پڑے تھے۔ ان کے پاس ایک سکھ کی لاش تھی۔

۳ ۔ عبدالقادر غازی پوری کے سر میں گولی لگی تھی، منہ اور ناک سے خون جاری تھا۔

خود کریم بخش، اللہ بخش باغپتی اور رسول خاں جلالہ والے سید صاحب کے پاس نالے میں پہنچنا چاہتے تھے۔ کریم بخش کی ران میں گولی لگی اور وہ آگے بڑھنے سے معذور ہو گئے۔ اللہ بخش نے ہجوم میں گھس کر شہادت پائی۔ رسول خاں بالکل سلامت رہے۔

متفرق اصحاب

میاں مکھمیر کے ساتھ مٹی کوٹ کے دامن میں آٹھ آدمی تھے، جن میں سے صرف ابراہیم خاں خیر آبادی اور عبداللہ نو مسلم دہلوی کے نام یاد رہے۔ ان میں سے چھ نالے میں ہو کر سید صاحب کے پاس پہنچ گئے اور غالباً یہ سب شہید ہو گئے۔ ناصر خاں بھٹ گرامی کا ہاتھ زخمی ہو گیا۔ ساتھیوں نے انھیں میدان سے باہر لے جانا چاہا تو انکار کر دیا۔ اس اثنا میں دوسرے ہاتھ پر بھی گولی لگی اور وہ باہر جانے پر مجبور ہو گئے۔ میرزا احمد بیگ پنجابی نے جب سنا کہ سید صاحب کا کچھ پتا نہیں ملتا تو وہ سر پیٹتے ہوئے دیوانہ وار میدان میں پھرنے لگے۔ ہر ایک سے پوچھتے: حضرت کہاں ہیں؟ اسی حالت میں شہید ہو گئے۔ حسن خاں بنارسی بھی زخموں سے چور ہو کر قصبے میں پہنچ گئے تھے اور زیادہ خون بہنے سے ان پر بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ ایک سکھ نے ان کا تفنگچہ اتارنا چاہا۔ اچانک انھیں ہوش آگیا، تلوار اٹھا کر لیٹے لیٹے سکھ کو قتل کر دیا۔ پھر دوسرے سکھ نے آگے بڑھ کر انھیں شہید کیا۔ شیخ وزیر پھلتی کے دائیں ہاتھ میں گولی لگی، جس کی وجہ سے وہ معذور ہو گئے۔

غازیوں کا نقصانِ جان

جنگ بالاکوٹ میں غازیوں کے نقصانِ جان کے متعلق روایات مختلف ہیں۔ مثلاً:

۱ ۔ ہیبٹ اور میسن کی کتاب میں ہے کہ ہندوستانی غازیوں کے مختصر سے گروہ نے تین مرتبہ سکھ جھنڈوں کو پیچھے ہٹایا۔ آخر کار محض دشمن کی کثرت تعداد کے باعث شکست کھائی اور تباہ ہوئے۔ صرف تین سو زندہ بچے[1]

---

[1] ہیبٹ اینڈ میسن صفحہ ۸۲۔

۲ - بیلیو کا بیان ہے کہ سید صاحب اور مولانا شاہ اسماعیل کے علاوہ تیرہ سو ہندوستانی شہید ہوئے۔

ان میں سے بیلیو کا بیان یقینی طور پر غلط ہے، اس لیے کہ تیرہ سو ہندوستانی تو بالاکوٹ میں موجود بھی نہیں تھے، پھر ان کی شہادت کیوں کر تسلیم کی جا سکتی ہے؟ اول الذکر بیان میں شہدا کی تعداد نہیں بتائی گئی لیکن یہ معلوم ہے کہ جنگ بالاکوٹ کے بعد تمام غازی جمع ہوئے تو ان کی تعداد سات سو کے لگ بھگ تھی۔ غازیوں میں سے خدا بخش، الٰہی بخش، شیر محمد خاں، شیخ محب اللہ، محمد امیر خاں، نجم الدین شکارپوری اور سید جعفر علی نقوی وغیرہم کا بیان ہے کہ بالاکوٹ کے شہدا تین سو سے زیادہ نہ تھے۔ ان میں سے جن کے نام معلوم ہو سکے یا محض شہادت کا علم ہو سکا، ان کی فہرست ہم نے اس باب کے ساتھ بطور ضمیمہ لگا دی ہے۔ سکھ مقتولین کی تعداد سات سو بتائی گئی ہے۔

غازیوں کی تدفین

سکھ تیسرے دن بالاکوٹ سے چلے گئے تو اہل قصبہ آبادی میں واپس آئے۔ اس وقت تک میدان جنگ ہی نہیں بلکہ بالاکوٹ کا شمالی و شمال مشرقی میدان بھی لاشوں سے اٹا پڑا تھا۔ "منظورہ" کا بیان ہے کہ اہل قصبہ نے غازیوں کی لاشوں کو اٹھا کر مٹی کوٹ کے نالے میں جمع کیا۔ ابھی ان پر مٹی نہیں ڈالنے پائے تھے کہ زور کی بارش آ گئی۔ کھیتوں کی مٹی بہ کر نالے میں بھر گئی۔ نالے کے کرارے بھی دونوں طرف سے بیٹھ گئے اس طرح لاشوں کے لیے قدرتی تدفین کا سامان ہو گیا۔ مولانا شاہ اسماعیل اور ارباب بہرام خاں کو الگ دفن کیا گیا۔ میرے نزدیک یہ بیان نظر ثانی کا محتاج ہے اور سید جعفر علی نقوی نے جو کچھ لکھا ہے، محض شنید کی بنا پر لکھا ہے۔ وجوہ سن لیجیے:

۱ - مٹی کوٹ کے دامن میں نالے کے دونوں کناروں پر شہدا کے دو قبرستان اب تک موجود ہیں۔ ایک نالے کے مغربی کنارے پر مٹی کوٹ کی سمت میں، دوسرا نالے سے ذرا ہٹ کر اس کی شمالی سمت میں۔ ان قبرستانوں کی حالت یقیناً اچھی نہیں لیکن ان کے محفوظ رہنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لاشیں نالے میں نہیں ڈالی گئی تھیں بلکہ اس کے کناروں پر دفن کی گئی تھیں۔

۲ - جس جگہ لاشیں زیادہ تھیں، وہ اس حصے میں ہو گی جہاں سے نالہ پہاڑ پر سے اتر کر نیچے آیا ہے اگر بارش زور کی ہوئی اور نالے میں بکثرت پانی آیا تو لاشوں کا اس جگہ پڑے رہنا یا ان پر مٹی پڑ جانا ممکن نہ تھا، بلکہ وہاں سے لاشیں بہ کر نیچے آ جاتیں۔ اس لیے کہ نالہ پورے کا پورا ڈھلوان ہے، خصوصاً پہاڑ کے دامن سے قریب تو کسی چیز کا اٹکے رہنا بظاہر مشکل تھا۔

۱؎ اے رپورٹ آن یوسف زئی (A REPORT ON YUSAF ZAI) صفحہ ۹۳

۳- اگر لاشیں واقعی دب گئی تھیں تو بعد میں ان کی ہڈیاں نکل آتیں، اس لیے کہ جس مقام پر ان کے دفن ہونے کا امکان تھا، وہاں پانی زور سے گرتا اور بہتا ہے اور اب بھی نالہ خاصا گہرا ہے لیکن اب تک ہڈیوں کے نکلنے کا کوئی بیان سامنے نہیں آیا۔

۴- شہدا کی اور قبریں بھی ہیں۔ مثلاً ایک قصبہ کے قریب ہے۔ کچھ قبریں پن چکیوں کے پاس بتائی جاتی ہیں۔ کچھ ست بنے کے نالے کے پار قصبے کے شمالی و مشرقی کھیتوں میں ہیں۔ کچھ قبریں شاید دریائے کنہار کے پار کالو خاں کے دامن میں بھی ہیں، جیسا کہ بعض مقامی لوگوں سے معلوم ہوا۔ جب ان سب کو جا بجا دفن کیا گیا تو مٹی کوٹ کے دامن کے شہیدوں کو دفن نہ کرنے کی روایت کیوں کر صحیح سمجھی جا سکتی ہے؟

۵- سکھوں کی لاشیں خود سکھوں نے اٹھا کر جلتے ہوئے مکانوں میں ڈال دی تھیں یا سمجھ لیجیے کہ قصبے کو آگ لگانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سکھوں کی لاشیں جلائی جا سکیں۔ ممکن ہے ان میں سے کچھ لاشیں ادھر ادھر بکھری رہ گئی ہوں اور اہل قصبہ نے انھیں نالے میں ڈال دیا ہو۔

شاہ اسماعیل اور ارباب بہرام خاں

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، شاہ اسماعیل اور ارباب بہرام خاں کی لاشوں کو ست بنے کے پار قصبے کے شمال مشرق دفن کیا گیا۔ ان کی لاشیں غالباً اسی حصے میں پڑی تھیں۔ واقعہ بالاکوٹ سے چھ ماہ بعد ارباب شہید کے بھتیجے اور داماد محمد خاں نے اپنے ہم قوموں کو جمع کر کے کہا کہ میں ارباب کی لاش کو بالاکوٹ سے تہکال لانا چاہتا ہوں۔ ان لوگوں نے کہا کہ اب ہڈیاں کھود کر لانے سے کیا حاصل ہوگا لیکن محمد خاں نے کہا کہ میرے چچا نے خلوص نیت سے سید بادشاہ کا ساتھ دیا تھا۔ اپنا پورا مال و اسباب راہ خدا میں لٹا دیا۔ آخر جان بھی دے دی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی لاش قبر میں سلامت ہوگی۔

چنانچہ محمد خاں نے ایک صندوق بنوایا اور چالیس آدمیوں کے ساتھ بالاکوٹ گیا۔ وہاں کے لوگوں نے بھی قبر کھودنے سے منع کیا لیکن محمد خاں اپنے ارادے پر قائم رہا۔ لاش نکالی گئی تو بالکل تر و تازہ تھی، جسم کا کوئی حصہ بگڑا تھا، نہ اس میں بدبو پیدا ہوئی تھی۔ صرف پاؤں کے ناخنوں میں خفیف سا تغیر نظر آتا تھا۔

غرض لاش کو صندوق میں رکھ کر تہکال لائے۔ قوم نے پورے احترام کے ساتھ اسے دفن کیا۔ یہ قبر آج بھی دعا گاہ خاص و عام ہے۔ تہکال کا بچہ بچہ ارباب شہید اور ان کی قبر سے واقف ہے۔

ان دونوں قبروں کے گرد پہلے خستہ سی چار دیواری تھی۔ چند برس ہوئے مولانا اسلم جیراج پوری اور

چودھری غلام احمد پرویز نے شاہ اسماعیل کی قبر کے ارد گرد نئی چار دیواری بنوا دی۔ ۱۹۵۱ء میں بالاکوٹ گیا تو دیکھا کہ یہ چار دیواری بھی جگہ جگہ سے پھٹ گئی ہے۔[1]

بیش بہا چیزیں غازیوں کا بیشتر سامان اور توشہ خانہ ہدفِ غارت بنے لیکن یہ چیزیں بہرحال سینکڑوں نہیں ہزاروں کی ہوں گی۔ بعض نہایت بیش بہا چیزیں بھی تباہ ہوئیں جو لاکھوں روپے دے کر بھی نہیں مل سکتیں اور نہ دنیا میں ان کا کوئی بدل موجود ہے۔ مثلاً:

۱۔ سید صاحب اور مولانا اسماعیل کی بہت سی تحریرات۔

۲۔ مختلف مکاتیب کے اصل مسودے اور ان کے جواب میں وقت کے اکثر سلاطین و رؤسا اور خوانین و علماء کے خطوط۔

۳۔ سید صاحب کا روزنامچہ: منشی محمدی انصاری میر منشی حضور کا طریقہ تھا کہ ہر مہینے کے آغاز میں سادہ کاغذوں پر جدولیں تیار کر لیتے تھے۔ ان میں مختلف خانے ہوتے تھے، جن میں مختلف چیزیں تفصیل کے ساتھ روز بروز درج ہوتی تھیں۔ ایک بڑے خانے میں روزمرہ کے کام کاج اور واقعاتِ جنگ بہ تعیینِ تاریخ لکھتے تھے۔ اسی روزنامچے کی بنا پر وقتاً فوقتاً مختلف حصوں میں خطوط بھیجے جاتے تھے۔

۴۔ ہر مہینے کے ضروری کاغذات بستوں میں باندھ کر ایک بڑے صندوق میں رکھے جاتے تھے۔ یہ صندوق بھی بالاکوٹ میں بستوں سمیت برباد ہو گیا۔

۵۔ مولوی سید نور احمد نگرامی کی تاریخ "نورِ احمدی" جس میں سید صاحب کے مفصل حالات درج تھے۔

۶۔ بعض رسائل اور مولانا اسماعیل کے بعض خطبات جو جمعہ یا عیدین کی نمازوں میں دیے گئے۔

سید جعفر علی نقوی کے قلمدان میں مولانا اسماعیل کے بعض مُہری اور دستخطی خطوط محفوظ رہ گئے تھے۔ سید موصوف بالاکوٹ کے بعد وطن لوٹے تو ان خطوط و تحریرات کو شیخ ولی محمد کی اجازت سے بطور تبرک ساتھ لے آئے۔ ستھانہ پہنچنے سے پہلے راستے میں قلمدان کسی نے چرا لیا۔ ہر چند اسے تلاش کیا۔ یہ اعلان بھی کرا دیا کہ کاغذات واپس کر دیے جائیں، باقی جتنی چیزیں ہیں، وہ سب بہ صدقِ دل چھوڑتا ہوں اور چرانے والے سے کوئی پرسش نہ ہوگی، لیکن کاغذات نہ ملے۔

---

[1] تواریخ عجیبہ میں ہے کہ لوگ اس قبر پر حلوہ چڑھاتے ہیں۔ میں آٹھ دس برس میں کئی مرتبہ بالاکوٹ جا چکا ہوں لیکن کبھی نہیں دیکھا کہ کسی نے شاہ صاحب کی قبر پر حلوا رکھا یا اور کوئی چیز چڑھائی یا باندھی ہو۔

ضمیمہ

شہدا کی فہرست

خیزند چوں ز خاک شہیدانِ ما بہ حشر
در محشر آوریم دو عالم سپاہ ما

(۱) امیر المومنین سید احمد بریلوی (۲) مولانا شاہ اسماعیل دہلوی (۳) میرزا مغلی بیگ (۴) عبید اللہ نو مسلم (۵) عبد اللہ دہلوی خادم خاص امیر المومنین (۶) ملا ابو الحسن نصیر آبادی (۷) سید امیر علی جائسی (۸) شیخ عبد الرؤف پھلتی (۹) شیخ ضیاء الدین پھلتی (۱۰) حکیم قمر الدین پھلتی (۱۱) شیخ بہادر علی پھلتی (۱۲) شیخ حامد پھلتی (۱۳) شیخ توکل پھلتی (۱۴) نبی حسین عظیم آبادی (۱۵) راحت حسین عظیم آبادی (۱۶) اللہ بخش عظیم آبادی (۱۷) الہ داد عظیم آبادی (۱۸) محمد معصوم عظیم آبادی (۱۹) اشرف خاں گنہ کھیوری (۲۰) حاجی برکات عظیم آبادی (۲۱) علیم الدین بنگالی (۲۲) فیض الدین بنگالی (۲۳) لطف اللہ بنگالی (۲۴) منشی محمدی انصاری میر منشی حضور (۲۵) شرف الدین بنگالی (۲۶) سید مظفر حسین بنگالی (۲۷) متو خیاط لکھنوی (۲۸) کریم بخش خیاط لکھنوی (۲۹) مرزا مرتضیٰ بیگ لکھنوی (۳۰) نور علی لکھنوی (۳۱) حافظ عبد الوہاب لکھنوی قاسم غلہ (۳۲) خدا بخش لکھنوی (۳۳) محمود خاں لکھنوی (۳۴) شیخ امجد علی غازی پوری فرزند شیخ فرزند علی رئیس غازی پور (۳۵) شیخ محمد علی غازی پوری (۳۶) شیخ اصغر علی غازی پوری (۳۷) شیخ درگاہی غازی پوری (۳۸) خدا بخش فرزند شیخ درگاہی (۳۹) عبد القادر غازی پوری (۴۰) عبد المنان بنارسی (۴۱) حسن خاں بنارسی (۴۲) میانجی چشتی بڑھانوی (۴۳) حیات خاں خیر آبادی (۴۴) نور بخش جراح شاملی والے (۴۵) شیخ شجاعت علی فیض آبادی (۴۶) حافظ امیر الدین گڑھ مکتیشری (۴۷) بخش اللہ خان پوری (۴۸) امام الدین بمبئی (۴۹) مولوی سید نور احمد نگرامی مورخ اسلام (۵۰) چاند خاں ناگوری (۵۱) نور محمد ناگوری (۵۲) میانجی عبد الکریم امیٹھوی (۵۳) عبد الجبار خاں شاہجہان پوری (۵۴) عبد القادر جھنجھانوی (۵۵) حافظ مصطفیٰ جھنجھانوی (۵۶) حسن خاں ساکن زمانیہ (۵۷) مولوی محمد اللہ نانگ پوری برادر عم زاد مولانا عبد الحی (۵۸) عبد الرحمن ناگپوری (۵۹) نواب خاں گنگنوی (۶۰) قلندر خاں قندھاری (۶۱) بادل خاں بانس بریلوی (۶۲) محمد حسن پانی پتی (۶۳) غلام محمد والد محمد حسن (۶۴) میرزا حسین بیگ بانس بریلوی (۶۵) شیخ نصرت بانس بریلوی (۶۶) میر امانت علی ساڈھورہ (۶۷) کریم بخش

ساڈھورہ (۷۱) رحیم اللہ سہارن پوری (۷۲) فرجام (خادم خاص امیر المومنین) سہارن پوری (۷۳) علی خاں سہارن پوری (۷۴) منشی خواجہ محمد حسن پوری (۷۵) قاضی احمد اللہ میرٹھی (۷۶) شیخ بلند بخت دیوبندی، (۷۷) عبدالعزیز دیوبندی (۷۸) سلو خاں دیوبندی (۷۹) داؤد خاں خورجوی (۸۰) ولی داد خاں خورجوی (۸۱) مراد خاں خورجوی (۸۲) شیخ نصراللہ خورجوی (۸۳) مولا بخش میواتی ساکن نوح (ضلع گوڑگانواں) (۸۴) وزیر خاں میواتی (۸۵) قادر بخش کنج پوری (۸۶) ننھے خاں ساکن ہزارہ (۸۷) سید چراغ علی ساکن پٹیالہ (۸۸) عظیم اللہ خاں ساکن اکوڑہ (۸۹) ارباب بہرام خاں ساکن تہکال (۹۰) شیخ محمد رضا ساکن ضلع میرٹھ (۹۱) قادر بخش ساکن لہاری (۹۲) حافظ الٰہی بخش کیرانوی (۹۳) سرانداز خاں ساکن پکھلی (۹۴) شیخ محمد اسحاق گورکھ پوری (۹۵) دلاور خاں گورکھ پوری (۹۶) عبدالسبحان خاں گورکھ پوری، (۹۷) منصور خاں گورکھ پوری (۹۸) عبداللہ خاں گورکھ پوری (۹۹) مشرف خاں گورکھ پوری (۱۰۰) روشن سقا ساکن کوٹل (۱۰۱) سخاوت رام پوری (۱۰۲) خیر اللہ ساکن امروہہ (۱۰۳) خیر اللہ کے والد (جن کا نام معلوم نہ ہو سکا) (۱۰۴) میرزا جان جھنگی (۱۰۵) میرزا جان کا بیٹا (نام معلوم نہ ہو سکا) (۱۰۶) حافظ عبدالقادر ساکن میاں دوآب (۱۰۷) اللہ بخش انبالوی (۱۰۸) بخش اللہ بہادر گڑھی (۱۰۹) لعل محمد مہاجر (ٹیاں نظام (۱۱۰) شیخ امام علی، محی الدین پوری (الہ آباد) (۱۱۱) اللہ بخش پانپتی (۱۱۲) قاضی علاؤ الدین بگھرا (۱۱۳) سید امیر الدین بگھرا (۱۱۴) رحیم بخش الہ آبادی (۱۱۵) بھیکن (شاہ پوری) (۱۱۶) شمس الدین ہریانوی (۱۱۷) سید مردان علی میراں پوری (۱۱۸) محمد عرب (۱۱۹) فیض اللہ شیدی (۱۲۰) اللہ دلو (وطن معلوم نہ ہو سکا) (۱۲۱) قادر بخش، وطن معلوم نہ ہو سکا) (۱۲۲) عبدالقادر وطن معلوم معلوم نہ ہو سکا) (۱۲۳) راجا (یہ غالباً سید صاحب کا ہم وطن تھا) (۱۲۴) سید زین العابدین (پشاور) (۱۲۵) ایک پٹھان (نام معلوم نہ ہو سکا)، (۱۲۶) پٹھان، اس کا ہمراہی تھا، اس کا نام بھی معلوم نہ ہو سکا (۱۲۷) سید امام علی الہ آبادی (۱۲۸) صندل خاں پنجابی (۱۲۹) میرزا احمد بیگ پنجابی (۱۳۰) شیر جنگ خاں خالص پوری (۱۳۱) فیض اللہ تخت ہزارہ، (۱۳۲) بخش اللہ خاں (بارہ بنکی) (۱۳۳) حافظ مصطفیٰ کاندھلوی (۱۳۴) غازی الدین (وطن معلوم نہ ہو سکا) (۱۳۵) پانی پتی نوجوان (نام معلوم نہ ہو سکا) (۱۳۶) مہربان خاں (بانگرمئو) (۱۳۷) بخش اللہ (ان کا وطن معلوم نہ ہو سکا۔ روایت میں ہے برادر مہر علی)۔

تینتالیسواں باب

سیّد صاحب کا مدفن

تا بر راہ طلبت بے خبراں پے نہ نہند
کعبۂ وصل تو بے نام ونشاں ساختہ اند

غازیوں کا رنج و غم

غازی بالاکوٹ کے میدان سے نکل کر شمالی سمت کے پہاڑ پر پہنچے۔ ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔ وہیں ایک چشمے پر وضو کر کے نماز پڑھی، اس اثنا میں مظفر آباد کے چند غازی بھی پہنچ گئے، جو ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ کر دوڑے دوڑے آئے تھے کہ جلد لڑائی میں شریک ہوں۔ شکست کا حال معلوم ہوا تو دم بخود رہ گئے۔ انھیں سے پتہ چلا کہ مولوی خیر الدین سخت بیمار ہیں اور انھیں چارپائی پر ڈال کر لا رہے ہیں۔ سیّد صاحب کے متعلق بعض کا خیال تھا کہ انھیں گوجر لے گئے۔ بعض تذبذب میں تھے۔ وقائع میں ہے:

> ہم لوگوں میں سے ہر ایک حضرت علیہ الرحمۃ کے غم فراق میں اس قدر پراگندہ خاطر اور باختہ حواس تھا کہ جیسے مجنون اور سودائی ہوتا ہے۔ کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا۔[۱]

سب بھوکے تھے۔ ایک گاؤں ملا، وہاں سے شیخ ولی محمد نے ایک روپے کی جوار خرید کر بھنوائی اور غازیوں میں بانٹ دی۔ بالاکوٹ سے ڈھائی کوس پر ناصر خاں کا ایک گاؤں انگرائی نام تھا، شام کے وقت وہاں پہنچے۔ کھانے کا کوئی انتظام نہ تھا، راستے میں جو جوار ملی تھی، وہی کھا کر پانی پی لیا۔ وہیں مظفر آباد کے اکثر غازی آگئے لیکن مولوی خیر الدین نہ پہنچ سکے۔

ایک غلط اطلاع

نماز عشا کے بعد جان محمد جراح رام پوری اور عبد الرحیم جراح جانسٹھی نے زخمیوں کی مرہم پٹی کی۔ اس وقت دو گوجروں نے خبر پہنچائی کہ سید بادشاہ تھوڑی دور پہاڑ کے ایک درے میں سلامت موجود ہیں اور ہمیں بھیجا ہے کہ غازیوں کو لے آؤ۔ ناصر خاں نے کہا کہ یہ لوگ دن بھر کے بھوکے پیاسے اور تھکے ماندے ہیں۔ اب رات کے وقت کہاں جائیں گے۔ صبح کو آنا، ہم سب چلیں گے۔ سید بادشاہ کو اللہ تعالیٰ نے سلامت رکھا ہے تو وہ کہیں چھپے نہیں رہیں گے۔

---

[۱] جلد سوم صفحہ ۲۵۴، ۲۵۵

دوسرے دن صبح کو کوئی نہ آیا۔ غازیوں نے اس درے کو بھی دیکھا لیکن کوئی نہ ملا۔ یہ دراصل دھوکا تھا لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ گوجروں نے ایسی حرکت کس غرض سے کی۔

شیخ ولی محمد نے پہلے راستے ہی سے گوجروں کو تحقیق احوال کے لیے بالاکوٹ بھیجنا چاہا، لیکن اس وقت قصبے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ سکھ فوج پورے میدان میں پھیلی پڑی تھی۔ ان حالات میں کون جا سکتا تھا اور جاتا بھی تو کیا معلوم ہوتا؟

شیخ وزیر کے صاحبزادے کا بیان

دوسرے روز شیخ وزیر کا صاحبزادہ آگیا۔ تمام غازی حالات معلوم کرنے کے شوق میں اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ اس نے بتایا کہ جنگ کے بعد مجھے سکھ اس جگہ لے گئے جہاں زیادہ تر شہید پڑے تھے اور پوچھا کہ ان میں سے خلیفہ صاحب (یعنی سید صاحب) کی لاش کون سی ہے۔ میں نے پہچان کر بتا دیا۔ پھر انھوں نے مجھے ایک مسلمان کے حوالے کر دیا۔ اس نے میرے حالات پوچھے۔ پھر کہا کہ جا اپنے والد کے پاس چلا جا۔ میں ست بنے کے راستے چلا آیا۔

غازیوں میں سے بعض نے یہ بیان سن کر کہا کہ مجروح یا شہید کو تو ہوشیار آدمی بھی مشکل سے پہچانتا ہے، اس لڑکے نے کیا پہچانا ہوگا۔ دوسروں کو یقین تھا کہ بچے نے سید صاحب کو ضرور پہچان لیا ہوگا اس لیے کہ آپ اسے بہت پیار کرتے تھے اور یہ اکثر آپ ہی کے پاس رہتا تھا۔

تحقیق کا نتیجہ

اگرائی سے چلتے وقت شیخ ولی محمد نے خضر خاں قندھاری اور الہ دین پھلی والے کو بالاکوٹ بھیج دیا کہ تمام حالات کی خوب چھان بین کریں۔ وہ واپس ہوئے تو غازی شملئی پہنچ گئے تھے، جو راج دواری سے ڈیڑھ دو کوس شمال میں ہے۔ انھوں نے بتایا کہ بعض غازی سکھوں کے ہاتھ زندہ گرفتار ہو گئے تھے:

> شیر سنگھ نے ان گرفتاروں سے کہا کہ لاشوں میں سے ہم کو بتاؤ خلیفہ صاحب کی لاش کون سی ہے۔ اگر تم سچ سچ بتا دو گے تو تم کو چھوڑ دیں گے۔ پھر انھوں نے کھیت میں جا بجا پھر کر لاشوں کو دیکھا۔ ایک لاش بے سر کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ یہ لاش خلیفہ صاحب کی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کا سر بھی ہو تو ہم بتا دیں۔ پھر شیر سنگھ نے اس کا سر تلاش کروا کر منگایا اور اس لاش میں ملوایا۔ تب انھوں نے (گرفتار شدہ غازیوں نے) کہا: ہاں خلیفہ صاحب کی لاش یہی ہے۔
>
> پھر شیر سنگھ نے ایک دو شالہ اس لاش پر ڈلوایا۔ دو تھان خاصے کے اور پچیس

روپے نقد دیے اور کہا جس طرح تم مسلمانوں کا دستور ہے کفن دے کر اس کو دفن کر دو۔ پھر ادھر ادھر سے ملکی مسلمان بھی اکٹھے جمع ہوئے اور کفن دے کر اس لاش کو دفن کیا اور وہ روپے نقد خیرات کیے گئے اور جو لاشیں سکھوں کی تھیں، ان کو بالاکوٹ کے کوٹھوں میں ڈال کر جلا دیا اور باقی لاشیں غازیوں کی سب وہیں جہاں کی تہاں پڑی رہیں[۱]

مدفن

جس قبر کو آج کل سید صاحب کی قبر قرار دیا جاتا ہے، یہ بالاکوٹ کے پشتے سے نیچے جنوبی و مشرقی سمت میں دریا کے کنارے پر ہے۔ کاغان جانے والی سڑک اس کے پاس سے گزرتی ہے۔ پہلے یہاں صرف سید صاحب کی قبر تھی، اب کچھ اور قبریں بھی بن گئی ہیں۔ ان میں سے ایک قبر مولوی فضل الٰہی مرحوم وزیر آبادی کی ہے، جو مدت تک جماعت مجاہدین میں رہے۔ یہ قبر سید صاحب کی شہادت گاہ سے قریباً ڈیڑھ میل پر ہوگی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ میت کو یہاں کیوں لائے جبکہ یہاں قبرستان بھی نہ تھا؟ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگ بالاکوٹ کے بعد شیر سنگھ کا کیمپ دریا کے کنارے اس جگہ لگا ہوگا جہاں آج کل تھانہ اور ڈاک بنگلہ ہیں۔ اسے سید صاحب کی لاش دکھانے کے لیے میدان جنگ سے لائے ہوں گے۔ پھر قریب ہی ایک موزوں مقام پر میت کو دفن کر دیا گیا۔

اختلاف

جس روایت کا ایک حصہ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں، اس کے آخر میں ہے کہ دوسرے روز شیر سنگھ ندی سے پار چلا گیا؛ اس کی فوج کا بڑا حصہ بھی رخصت ہو گیا۔ صرف اکالیوں یا نہنگ سکھوں کی ایک جماعت باقی رہ گئی۔ بالاکوٹ کے جو باشندے سکھوں کے خوف سے اِدھر اُدھر بھاگ گئے تھے، وہ بھی واپس آ گئے:

> جو لوگ وقت دفن کرنے اس لاش مذکورہ (سید صاحب کی لاش) کے موجود تھے، ان میں اختلاف ہونے لگا۔ اکثر تو یہ کہتے تھے کہ وہ لاش سید بادشاہ کی نہ تھی؛ ان کو تو گوجر لوگ لڑائی کے کھیت سے زندہ نکال لے گئے اور چند لوگ کہتے تھے کہ وہ لاش سید بادشاہ کی تھی، مگر تحقیقی حال معلوم نہ ہوا کہ وہ سچے ہیں یا یہ سچے ہیں۔

اس روایت کے باب میں وثوق کے ساتھ عرض کرنا مشکل ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ جن لوگوں

---

[۱] وقائع جلد سوم صفحہ ۲۶۴، ۲۶۵ و منظورہ صفحہ ۱۲۰۱۔ ایک اور بیان مظہر ہے کہ دیوان وساکھا سنگھ نے ایک عرضداشت بھیجی، جس میں سید صاحب کی وفات کی خبر تھی: بر انداختن دوشالہ بر لاش او تکفین و تدفین آں رہ گرائے عالم جاودانی بنظر مبارک گزشت۔ (یہ عرضی وساکھا سنگھ کی طرف سے رنجیت سنگھ کو پہنچی)

نے کہا کہ وہ لاش سید صاحب کی نہ تھی، انھوں نے صرف اس بنا پر یہ دعویٰ کیا کہ سید صاحب کو میدان جنگ سے زندہ لے جانے کا افسانہ خاصی شہرت پا چکا تھا حالانکہ اس کے لیے کوئی قطعی اور موثق شہادت موجود نہ تھی۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ انھوں نے لاش دیکھ کر تحقیقاً کہا۔ یہ سید صاحب کی نہیں بلکہ مذکورہ افسانے کے پیشِ نظر اسے سید صاحب کی لاش ماننے میں تکلفاً شبہ پیدا کر لیا۔

اکالیوں کی وحشت بہرحال حقیقت خواہ کچھ ہو لیکن کوئی شبہ نہیں کہ میدان جنگ میں دیکھ بھال کر ایک لاش کے متعلق بتایا گیا، یہ سید صاحب کی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا سر نہ تھا۔ سر بھی تلاش کر کے ساتھ ملایا گیا تو جاننے والوں نے اقرار کیا کہ واقعی سید صاحب کی ہے۔ اسے اعزاز کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ شیر سنگھ فوج لے کر چلا گیا اور نہنگ سکھوں کی ایک جماعت پیچھے رہ گئی:

> پھر جب رات ہوئی تب ان اکالیوں نے ...... اس لاش مذکورہ کو قبر سے نکلوا کر ندی میں ڈلوا دیا اور اپنے لشکر کو چلے گئے[1]

ہزارہ گزٹیئر میں بھی ہے:

> سید صاحب کی لاش دریا میں پھینک دی گئی۔ لیکن بالاکوٹ سے نیچے کے ایک گاؤں تلہٹہ کے لوگوں نے اسے نکال کر دفن کرایا[2]

وحشت کا سبب ہو سکتا ہے کہ نہنگوں یا اکالیوں کو سید صاحب سے خاص عناد ہو۔ ان کے نزدیک جذبۂ عناد کی تسکین اسی طرح ہو سکتی تھی کہ لاش قبر میں نہ رہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ سید صاحب سے سخت کاوش کی ایک اور وجہ بھی اکالیوں کے ذہنوں میں بیٹھی ہوئی تھی اور وہ یہ کہ ان کا محبوب لیڈر پھولا سنگھ اکالی ۱۸۲۳ء کی جنگ نوشہرہ میں مارا گیا تھا۔ یہ جنگ سید صاحب کی آمد سرحد سے تین برس پہلے سردار عظیم خاں بارک زئی اور رنجیت سنگھ کے درمیان ہوئی تھی۔ اکالیوں کو یہ تو معلوم نہ تھا کہ وہ جنگ کب ہوئی اور کس کس کے درمیان ہوئی۔ صرف اتنا یاد رہ گیا کہ ان کا لیڈر سرحد کی جنگ میں مارا گیا تھا۔ بس اسی بنا پر سمجھ لیا کہ سید صاحب ہی کے آدمیوں نے اسے مارا ہوگا۔ انتقام کی خاطر وہ لشکر سے پیچھے رہ گئے اور رات کی تاریکی میں وہ حرکت کی جو اخلاق و انسانیت کے ضابطے کے مطابق ہر انسان کے نزدیک حد درجہ مکروہ تھی۔

سر اور تن کی جدائی لاش دریا میں گرتے ہی تیرتی تیرتی تلہٹہ پہنچی جو بالاکوٹ سے قریباً نو میل جنوب

---

[1] وقائع جلد سوم صفحہ ۲۶۸ - [2] ہزارہ گزٹیئر طبع ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۳۰

میں کنہار کے مشرقی کنارے کا ایک گاؤں ہے۔ سر اور تن پہلے ہی الگ الگ تھے۔ دریا میں گرے تو الگ الگ ہی رہے۔ تلہٹہ والوں نے صبح کے وقت تن کو دیکھا تو اسے پکڑ کر پاس کے کسی کھیت میں نامعلوم مقام پر دفن کر دیا۔ میں جس حد تک مختلف اصحاب سے دریافت کر سکا ہوں، اس مدفن کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ سر بہتا بہتا گڑھی حبیب اللہ خاں کے پاس اس جگہ کے قریب پہنچ گیا، جہاں آج کل پل بنا ہوا ہے۔ گڑھی والوں میں ایک قصہ مشہور ہے، جسے عجائب پسندیوں کی رنگ آمیزی سے الگ کیا جائے تو اتنا رہ جاتا ہے کہ سر گڑھی کے سامنے پہنچ کر مشرقی کنارے پر اٹک گیا۔ ایک بڑھیا پانی بھرنے کے لیے آئی۔ اس نے دیکھ کر خان کو خبر پہنچائی۔ وہ دوڑا ہوا آیا اور سر کو دریا سے نکال کر کنارے ہی پر دفن کر دیا۔ یہ مدفن پل سے گزرتے ہی کنہار کے مشرقی کنارے پر بائیں ہاتھ ملتا ہے۔ پہلے اس کی قبر چھوٹی سی تھی اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ صرف سر کی قبر ہے اور اس پر سرخ رنگ کا کپڑا پڑا رہتا تھا۔ گڑھی کے اکثر لوگ صبح کے وقت وہاں فاتحہ و دعا کے لیے آتے تھے۔ اب سیمنٹ سے پوری قبر بنا دی گئی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ قطب بابا غازی کی قبر ہے[1]

موجودہ قبر غرض بالاکوٹ میں جس قبر کو اب سید صاحب کی قبر بتایا جاتا ہے، اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں یا اس کے آس پاس سید صاحب دفن ہوئے۔ ایک دن ایک رات یا دو دن دو راتیں وہاں دفن رہے۔ پھر آپ کی لاش اس میں سے نکال کر دریا میں پھینک دی گئی اور قبر بے نشان ہو گئی۔ نواب وزیر الدولہ مرحوم نے جس زمانے میں اپنی کتاب "وصایا الوزیر" تصنیف فرمائی، سید صاحب کی قبر بے نشان تھی، فرماتے ہیں:

بعد از حدوث حادثہ شہادت و	شہادت کا حادثہ پیش آ جانے
وقوع واقعہ انقطاع رشتہ حیات آں	اور اس کثافت بھرے خاکدان سے
سید با لطافت ازیں خاکدان پر کثافت	اس پاک نفس سید کا رشتۂ حیات
باوصف فرط تفحص مریدین و افراط تجسس	منقطع ہو جانے کے بعد مریدوں اور
معتقدین کہ در کار تلاش مرقد مطہر و منور و	معتقدوں نے ہر چند قبر منور اور نعش
نعش اطہر انور مساعی بے کراں و کوشش	مطہر کو تلاش کیا، لیکن اس کا نشان
فراواں بہ تقدیم رسانیدند، نامے و نشانے	بھی نہ پا سکے۔
از مطلوب و مقصود در نیافتند[2]	

---

[1] یہ تغیر ۱۹۴۷ء کے بعد ہوا۔ [2] وصایا الوزیر علی طریق البشیر والنذیر نصف اول صفحہ ۱۸

شاہ اسماعیل کی قبر بھی غالباً بے نشان ہو چکی تھی۔

۱۸۹۳ء میں خان عجب خاں برادر زادہ خان ارسلا خاں (زیدہ) مانسہرہ میں نائب تحصیلدار مقرر ہو کر گئے تو انھوں نے سید صاحب اور شاہ صاحب دونوں کی قبروں کا سُراغ لگانا چاہا۔ وہ اس خاندان کے فرد تھے، جو سید صاحب کی عقیدت میں برابر ثابت قدم رہا تھا۔ سن رسیدہ اور واقف کار آدمیوں کو جمع کر کے پوری چھان بین کرائی۔ پھر کم و بیش باسٹھ برس کے بعد ان قبروں کے نشان قائم کیے۔ عجب خاں کے زمانے کے کندہ کرائے ہُوئے پتھر میں نے دونوں قبروں پر دیکھے تھے۔ سید صاحب کی قبر کے ارد گرد چار دیواری بھی غالباً عجب خاں ہی نے بنوائی تھی۔ وہ بہت خستہ ہو گئی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد چار دیواری اور قبر پر سیمنٹ کا پلستر ہو گیا اور ایک دروازہ لگ گیا۔ پشاور کے ایک صاحب نے سرہانے سنگ مرمر کی ایک لوح لگا دی۔

غرض موجودہ قبر باسٹھ برس تک بے نشان رہنے کے بعد بنی اور یقین کے ساتھ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ٹھیک اسی جگہ بنی جہاں پہلی قبر تھی۔ اگر یہ اسی جگہ بنی تو اسے اس قبر کا مقام سمجھنا چاہیے جہاں سید صاحب کی لاش ایک یا دو راتیں دفن رہی۔ بعد میں آپ کا تن تلہٹہ میں غیر معلوم مقام پر دفن ہُوا، سر گڑھی حبیب اللہ خاں کے پُل کے پاس ہے۔

سید صاحب کی پیشگوئیاں

وصایا" میں ہے: ایک شخص نے حضرت سید صاحب سے عرض کیا کہ لوگوں کو آپ گور پرستی کی بدعت سے بہت منع کرتے ہیں۔ آپ کے مُرید بھی تو بے شمار ہیں، جو ملک میں پھیلے ہُوئے ہیں۔ کیا یہ اندیشہ نہیں کہ آپ کی وفات کے بعد وہ قبر پر جمع ہو ہو کر اس بدعت کو رواج دیں گے؟ سید صاحب نے جواب دیا کہ میں کارساز حقیقی جل شانہٗ کی بارگاہ میں التجا کروں گا کہ میری قبر کو معدوم اور میرے مدفن کو بے نشان بنا دیا جائے[1]۔

وقائع میں ہے کہ مولوی محمد یوسف پھلتی، میانجی محی الدین پھلتی، میانجی نظام الدین چشتی اور مولوی امام الدین بنگالی نے کئی مرتبہ بے تکلف عرض کیا کہ ہندوستان میں لوگ ادنیٰ ادنیٰ پیروں کی قبریں پُوجتے ہیں، آپ تو پیروں کے پیر ہیں۔ لہٰذا آپ کے مزار کی تو خوب پوجا ہو گی اور اس پر چڑھاوے چڑھائے جائیں گے۔

سید صاحب نے فرمایا: بے فکر رہو، مجھے جناب الٰہی سے کئی مرتبہ اشارہ ہُوا ہے کہ کوئی شخص

---

[1] وصایا صفحہ ۵۲

تجھ پر جادو کرے یا زہر دے، ان صدموں سے تو نہیں مرے گا اور جب تیری موت کا وقت آئے گا، کوئی تیری لاش نہ پا سکے گا۔ جب لاش نہیں ملے گی تو قبر کیوں کر بنے گی اور اس کی پوجا کس طرح کی جائے گی؟

کچھ معلوم نہیں کہ سید صاحب کے اصل الفاظ کیا تھے لیکن جس حد تک ان کے مفہوم کا تعلق ہے، اس کے درست ہونے میں کیسے کلام ہو سکتا ہے؟ لاش یقیناً ملی لیکن اس کا معاملہ آخری وقت تک مشتبہ رہا۔ یعنی یہ کہ آیا یہ سید صاحب کی تھی یا نہیں؟ پھر جہاں اسے دفن کیا گیا وہاں سے اکالیوں نے نکال کر دریا میں پھینکا۔ سر کہیں چلا گیا، دھڑ کہیں اور قبر بے نشان ہو گئی۔ جو نشان اب موجود ہے اس کی پوجا نہیں ہوتی۔ سید صاحب کو زہر دیا گیا لیکن خدا نے انھیں بچا لیا۔ جادو کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔

سید صاحب کی تصویر

دیوان امرناتھ نے ظفر نامہ میں لکھا ہے کہ شیر سنگھ نے سید صاحب کی تصویر بھی بنوائی تھی۔ اس ذکر میں بعض الفاظ غیر شایاں استعمال ہوئے ہیں لیکن میرے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ان الفاظ پر صبر کرتے ہوئے اصل عبارت نقل کر دوں۔ عبارت یہ ہے:

شہزادہ شیر سنگھ خود بہ نفس نفیس	شیر سنگھ سید صاحب کی نعش
متوجہ نعش خلیفہ گشتہ مصورِ سحر کارے	کی طرف متوجہ ہوا اور ایک سحر کار مصور
برگماشت تا از سکنات و حرکاتش	کو مقرر کیا تاکہ ان کی تصویر ہو بہو کھینچے
آں کما کان برگمارد و خود بعد از نظم و نسق	جب اس علاقے کے نظم نسق سے
آں سواد روانہ حضورِ اقدس شدہ سعادت	فارغ ہو کر دربار میں پہنچا، رنجیت سنگھ
ملازمت والا دریافتند۔ سرکارِ والا	بہت خوش ہوا۔ شیر سنگھ کو کلغی اور
نہایت خوشنود شدہ بہ جیغہ و خلعت	خلعت کے علاوہ بہت انعام دیے
سرفرازی دادہ بہ انعامات فراواں	اور زیادہ سے زیادہ مہربانیاں کیں۔
و اشفاق نمایاں فروختند و از تصویرِ خلیفہ	خلیفہ صاحب کی تصویر سے جوانمردی کی
استشمام داشتہ جوانمردی نمودہ بلفظ آفریں	بو سونگھ کر کہا "آفریں" اور منصفانہ
منصفانہ تعریف فرمودند۔ چوں آں تصویر	تعریف کی۔ میں نے بھی وہ تصویر دیکھی
از نظرِ راقم گزشت، بوالعجب تشکیلے	لیکن اس بات پر حیران ہوا کہ صورت
رخ نمود کہ بایں درویش صورتی خواہان	کے درویش ہونے کے باوجود سلطانی و

دولت سلطانی گشتن، ہمانا کہ خالی از تکلیف نفس شریر نخواہد بود واگر تا این مذہب بریں آوردہ از صفوت و صفا خبرے نداشت[1]

حکمرانی کی خواہش نفسانیت نے پیدا کی اور اگر مذہبی اختلاف کی بنا پر یہ سب کچھ عمل میں آیا تو سمجھنا چاہیے کہ خلیفہ صاحب صفوت و صفا سے بے خبر تھے۔

اگر یہ بیان درست ہے تو کچھ معلوم نہیں وہ تصویر کیا ہوئی اور کہاں گئی؟ ممکن ہے پرانے ریکارڈوں میں اس کا کچھ سراغ مل جائے۔

---

[1] ظفرنامہ صفحہ ۱۹۴، ۱۹۵

چالیسواں باب

عقیدۂ غیبوبت

شہادت کے متعلق اشتباہ

سید صاحب کی شہادت کے بعد نیازمندوں کے ایک گروہ نے ان کی غیبوبت کا مسئلہ کھڑا کر دیا اور مدت تک اس عقیدے کی اشاعت پورے اہتمام سے جاری رکھی۔ عوام کے ایسے معتقدات بحث و نظر کے محتاج نہیں ہوتے۔ ان کے دل و دماغ ہر وقت عجائب کاریوں کی تلاش و جستجو میں سرگرم رہتے ہیں اور وہ کسی واقعے کے قبول و پذیرائی میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں کرتے جب تک اسے بہ اعتبار وقوع، مروجہ اسلوب و ہنجار سے صریح منحرف نہ پائیں، لیکن حیرت ہے کہ سید صاحب کے بعض اکابر خلفا نے بھی اسے قبول کیا۔ نہ محض قبول کیا بلکہ اسے مدت تک دعوت اتحاد کا مرکز بنائے رکھا۔

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ شہادت کے سلسلے میں پہلے دن سے اشتباہ کے بعض وجوہ موجود تھے۔ مثلاً کسی معتبر آدمی نے سید صاحب کو بہ حالت شہادت نہیں دیکھا تھا[1]۔ پھر میدان بالاکوٹ میں یہ افواہ مشہور ہو گئی تھی کہ سید صاحب زخمی ہوئے اور گوجر انھیں اٹھا کر ست بنے کے نالے کے راستے میدان سے باہر لے گئے۔ ان حالات نے امید حیات کے لیے یقیناً ایک معقول سہارا مہیا کر دیا تھا۔ اگر ابتدا میں بعض اصحاب نے یہ سمجھا کہ سید صاحب واقعی زندہ ہیں تو اس پر تعجب کی کوئی وجہ نہیں۔

امید حیات کے اسباب

پھر ارادت مندوں کے سامنے سید صاحب کی پاک نفسی، للہیت، عشق حق اور بے مثال عزیمت تھی۔ وہ مقدس چہرہ تھا جسے دیکھتے ہی سکھوں کا رئیس حسن علی پکار اٹھا تھا کہ ایسا صاحب ارادہ ہفت اقلیم کی تسخیر کے لیے بھی کھڑا ہو جائے تو آج

---

[1] میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ بعض غازیوں نے سکھوں کے ہاتھ گرفتار ہونے کے بعد سید صاحب کی لاش پہچانی۔ بعض مقامی باشندوں نے شیر سنگھ کے کہنے کے مطابق اس لاش کو دفن کیا، لیکن ان میں سے کسی کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ اس لیے معاملہ مشتبہ رہا۔ بعد ازاں خود مقامی باشندوں میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ بعض کہتے تھے کہ لاش سید صاحب کی تھی، بعض اس سے انکار کرتے تھے۔ شیخ وزیر کے نوعمر بچے نے بھی سید صاحب کی لاش دیکھی تھی۔ اس کے بیان کو بوجہ حداثت سن چنداں وقعت نہ دی گئی۔

حیرت نہ ہونی چاہیے۔ غازیوں کو تو چھوڑ دیجیے، ہندوستان میں ایک دو نہیں سیکڑوں اصحاب تھے جنھیں یقین تھا کہ سید صاحب کی تحریک ضرور کامیابی کی آخری منزل پر پہنچے گی۔ کسی کو یہ خیال بھی نہیں تھا کہ یہ تحریک اچانک طور پر سرحد کے ایک دور افتادہ گوشے میں بظاہر درہم برہم ہو جائے گی اور سید صاحب شہادت پائیں گے۔ چونکہ شہادت میں اشتباہ کے خاصے قوی پہلو موجود تھے، اس لیے ابتدا میں طبیعتیں خبر شہادت کو قبول کرنے میں متامل رہیں تو اس تامل کو غیر معقول نہیں سمجھا جا سکتا۔ ویسے بھی انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ وہ خوشگوار امیدوں کی شکست بمشکل قبول کرتی ہے اور معمولی سے معمولی سہارا بھی مل جائے تو اس کے خیر مقدم کے لیے آمادہ رہتی ہے۔

پھر سرحد کے بعض اکابر کہہ رہے تھے کہ انھوں نے واقعہ بالاکوٹ کے بعد سید صاحب کو زندہ دیکھا ہے مثلاً بھٹکول کے اخوند محمد ارم، جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ مولوی خیر الدین شیر کوٹی اور مولوی محمد قاسم پانی پتی چند افراد کے ہمراہ اسی بنا پر بھٹکول میں ٹھہر گئے کہ انھیں سید صاحب کے زندہ ہونے کا یقین تھا۔

زندگی اور اس کا نصب العین جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، ابتدا میں اس قسم کی امید کے لیے گنجایش ضرور موجود تھی، اگر ارادت مندوں کو اس میں قلب و جگر کی تسکین کا سامان نظر آیا تو محل اعتراض نہیں، لیکن ظاہر ہے کہ حجاب و خفا کی ایک حد تھی۔ سید صاحب اگر زندہ تھے تو چند روز یا چند ہفتوں سے زیادہ چھپے نہ رہ سکتے تھے۔ ان کی زندگی کا ایک معین نصب العین تھا، جس کے عشق میں زمانۂ ہوشمندی کے پورے لیل و نہار گزرے۔ اس نصب العین کے لیے سعی و جہد کے بغیر ان کے جیتے رہنے اور مر جانے میں کوئی فرق نہ تھا۔ سید احمد بریلوی ہمارے اور تمام محبانِ احیاءِ ملت اسلام کے نزدیک اس وجہ سے عزیز و محترم تھے کہ وہ ایک پاک و مقدس تحریک کے علمبردار تھے۔ اس وجہ سے عزیز و محترم نہ تھے کہ ایک خاص میدان میں شکست کھا کر انھوں نے چھپ جانا پسند فرمایا۔ ان کے سات سو مجاہد، جنھیں بچوں کے برابر پیار کرتے تھے، ایک اجنبی سرزمین میں سرگردان و پریشان تھے۔ وہ جماعت ٹوٹ رہی تھی، جس کی تاسیس و تقویت کے لیے انھوں نے زندگی کی ہر متاع بلے دریغ قربان کی تھی۔ وہ داعیہ جہاد مضمحل ہو رہا تھا، جس کا چراغ روشن رکھنے کی خاطر انھوں نے اسلامیانِ ہند کا بہترین اور گرم ترین خون جا بجا بہایا تھا۔ اگر وہ زندہ تھے تو ان مقاصد کے لیے، زندہ ہوتے تو سب سے پہلے ان مقاصد کو اختلال سے بچاتے۔ اخوند محمد ارم یا کسی دوسرے عقیدت مند کو اپنا جمالِ مقدس دکھا کر تسکین قلب و نظر کا سامان بہم پہنچا دینا، کسی دینی اور ملی کام کے لیے کسی بھی درجے میں مفید و سود مند نہیں ہو سکتا تھا۔

سید صاحب کا ارشاد کہا جاتا ہے کہ سید صاحب نے اپنی ہمشیر سے فرمایا تھا:

> لوگ کہیں گے کہ سید احمد کا انتقال ہو گیا یا شہادت ہو گئی لیکن جب تک
> ہندوستان کا شرک، ایران کا رفض اور سرحد کا غدر رد جائے گا، میرا کام ختم نہیں ہو گا۔

ہمیں اس روایت کی حیثیت معلوم نہیں اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ سید صاحب نے اگر کچھ فرمایا تو کن الفاظ میں فرمایا، لیکن اگر اس روایت کو حرفاً حرفاً درست بھی مان لیا جائے تو اول کوئی شخص سید صاحب کے لیے معصومیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ معصومیت اس آسمان کے نیچے انبیاء کرام کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ دوم اس بیان میں اصلاً کوئی قباحت نہیں، اس لیے کہ اہل حق جو دعوت لے کر کھڑے ہوتے ہیں، وہ ضرور پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے، اگرچہ لازم نہیں کہ صاحب دعوت کی زندگی ہی میں تکمیل کے تمام مراتب طے ہو جائیں۔ سوم اس معاملے کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے۔ صاحب دعوت کا دل اگر کامیابی و فائز المرامی کے یقین واثق سے لبریز نہ ہو تو اس کی دعوت میں زندگی کی رُوح کیوں کر پیدا ہو گی؟ جو کچھ وہ کہتا ہے، اگر اس کی زندگی میں پورا نہ ہو تو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس نے، معاذ اللہ، غلط کہا، بلکہ وہ زود یا بدیر ضرور پورا ہو گا۔ تکمیل مقاصد کی اہمیت کے بیان و اظہار کا یہ نہایت ہی مؤثر و دل آویز اسلوب ہے اور اسی ذریعے سے دعوت پر لبیک کہنے والوں کے عزم و ارادہ میں پہاڑوں کی سی پختگی پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ کہیں کہ "یہ کام ہونا چاہیے" تو اس طرح کام کی اہمیّت تو واضح ہو گئی لیکن بے پناہ عزم و یقین کی وہ کیفیت پیدا نہ ہوئی، جو اس پیرایۂ بیان کے رگ و پے میں ساری ہے کہ "یہ کام ہو کر رہے گا"۔ سید صاحب کا کام یقیناً ختم نہیں ہو سکتا جب تک وہ سب کچھ پورا نہ ہو جائے جس کے لیے انھوں نے جان دی۔ لیکن اس کی تکمیل کو سید صاحب کی زندگی سے وابستہ کرنا یا اس بنا پر ان کے زندہ ہونے کا عقیدہ اختیار کر لینا ایک ایسی تاویل ہے، جس کے لیے کوئی عقلی یا شرعی دلیل قطعاً پیش نہیں کی جا سکتی۔

"تواریخ عجیبہ" میں ہے کہ سید صاحب نے جنگ بالاکوٹ سے قبل اپنی چھوٹی بی بی صاحبہ سے غیبوبت کی پیشگوئی کی تھی[1] مجھے اب تک اس کی کوئی شہادت نہیں مل سکی۔

اکابر صادق پور کا عقیدہ حد درجہ تعجب اس پر ہے کہ ارادت مندوں کے حلقۂ خاص میں سے اہل صادق پور نے عقیدۂ غیبوبت کو پورے کاروبار جہاد کا مدار و محور بنایا۔ مولانا ولایت علی مرحوم نے "دعوت" کے نام سے ایک رسالہ مرتب کیا تھا۔ اس میں لکھتے ہیں کہ بالاکوٹ میں شکست اس لیے ہوئی کہ ایمان والوں کے دل میں غرور کا میل جمنے نہ پائے۔ شکست کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت کو

---

[1] "تواریخ عجیبہ" صفحہ ۱۳۔

چلہ گزاری اور دعا و زاری کے لیے پہاڑوں پر جایا۔ سچ ہے خلوت بھی انبیا علیہم السلام کی سنت ہے۔ حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ میں رہے، حضرت موسیٰؑ کوہ طور پر، حضرت عیسیٰؑ کو آسمان پہ اٹھایا، ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی روز غار ثور میں چھپایا۔ سید صاحب کی:

> شہادت کی خبر شیطان نے جھوٹی مشہور کی۔ کیوں نہ ہو؟ یہ (یعنی سید صاحب) بھی تو ان لوگوں (انبیائے کرامؑ) کے پیرو ہیں، ان کی سنتوں سے کیوں کر محروم رہیں؟
>
> . . . اور ہمارے حضرت کی خلوت کوئی عیسیٰ علیہ السلام کی سی نہ سمجھیے کہ کسی سے ملاقات نہیں ہوتی یا ظہور میں ان کے عرصۂ بعید گزرے گا۔ یہاں تو اکثر لوگ جب چاہتے ہیں، تھوڑی سی کوشش سے حضرت کی زیارت سے مشرف ہو جاتے ہیں اور ان شاء اللہ عرصۂ قریب میں مثل خورشید درخشاں کے ظاہر ہو کر عالم کو اپنے انوار ہدایت سے منور فرمائیں گے۔[1]

مولانا ولایت علی بڑے ہی واجب الاحترام بزرگ تھے۔ آپ نے اور آپ کے اقربا نے دعوت حق اور جہاد فی سبیل اللہ کی راہ میں جو قربانیاں کیں، ان کی برابری سہل نہیں۔ وہ تمام اصحاب بہ اعتبار وجاہت و معیشت، امرا میں محسوب ہوتے تھے۔ پھر عشق دین و اسلامیت میں سب کچھ چھوڑ کر آلام و محن کے اس ہجوم میں اپنی جانیں پورے صبر و شکر کے ساتھ جان آفریں کے حوالے کیں کہ ان کا پرتو بھی کسی پہ پڑ جائے تو عمر بھر نالہ و فغاں سے فراغت نہ ملے، لیکن محولہ ارشاد کے باب میں صرف دو صورتیں ہو سکتی ہیں: اوّل یہ کہ مولانا ولایت علی نے خود یہ نہیں لکھا، دوسروں نے خطاءً ان سے منسوب کر دیا۔ دوم یہ کہ مولانا بہ حسن نیت خطا کے مرتکب ہوئے اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے بعد اس دنیا میں کوئی شخصیت نہیں آئی جس کا ہر قول خطا سے پاک ہو، اس لیے حجت بن سکے۔

دو سوال

پہلا سوال یہ ہے کہ آیا حضرت یونسؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض احوال کو بلالحاظ کیفیت و نوعیت مشبہ بہ قرار دے کر سید صاحب کی غیبت کے لیے مبنیٰ تلاش کرنا مناسب تھا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ مولانا ولایت علی کے انتقال کے وقت سید صاحب کی مزعومہ غیبت پر بیس برس گزر چکے تھے، لیکن کیا پردہ حجاب و خفا کے چاک ہونے کی نوبت آئی اور سید صاحب کے ظہور کی صورت بنی؟ حالانکہ ظہور کے بیسیوں اہم مواقع پے در پے پیش

---

[1] رسائل تسعہ صفحہ ۶۶، ۶۷

آتے رہے۔ اگر امت کی بے چارگی کے نازک ترین اوقات میں سید صاحب ہدایت و رہنمائی کے لیے ظاہر نہ ہوئے تو اس ہادی و مرشد کے وجود پر کسی کو کیا خوشی ہو سکتی ہے جو ظہور کے بعد اچانک غائب ہو جائے اور مصیبت زدہ دنیا غیبت کی ظلمت زائل ہونے کے انتظار میں لامتناہی مدت تک ضلالت و نامرادی کی ٹھوکریں کھاتی رہے۔

قائلین غیبت کی رائیں

سید صاحب کی جماعت کو امداد دینے والوں کے خلاف ایک مقدمہ ۱۸۶۴ء میں انبالہ میں چلا تھا، جسے انگریزوں کی اصطلاح میں "وہابیوں کا بڑا مقدمہ"[1] کہا جاتا ہے۔ اس میں مولانا یحییٰ علی صادق پوری، مولانا عبدالرحیم صادق پوری، مولوی جعفر تھانیسری اور بعض دوسرے اصحاب ماخوذ تھے۔ اس مقدمے میں کئی اصحاب نے گواہیاں دی تھیں کہ صادق پور کے مرکز میں جتنے لوگ پہنچتے تھے، انھیں باقاعدہ تلقین کی جاتی تھی کہ سید صاحب کا ظہور قریب ہے، وہ امام وقت ہیں، ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان کے ظہور سے پہلے مقام ظہور (یعنی سرحد) پر پہنچ جائے۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری، صاحب "تواریخ عجیبہ" بھی سید صاحب کو زندہ مانتے تھے بلکہ ان کا دعویٰ تھا کہ دو مرتبہ زیارت جسمانی کا شرف حاصل ہو چکا ہے اور حضرت کے زندہ ہونے کا مجھے ایسا یقین ہے جیسا کہ اپنی موت کا۔ مولانا مظفر حسین کاندھلوی فرمایا کرتے تھے کہ سید صاحب سے دس باتیں سنی تھیں، نو پوری ہو چکی ہیں، ایک باقی ہے یعنی غیبت کے بعد ظہور۔

---

[1] ایک کہانی بیان کی جاتی ہے کہ مولوی محمد قاسم پانی پتی نے وادی کاغان کے کسی تاریک غار میں تین پیکر بنا کر کھڑے کر دیے تھے۔ ان میں سے بیچ کے پیکر کو سید صاحب اور ساتھ کے دو پیکروں میں سے ایک کو عبداللہ خادم اور دوسرے کو میاں جی چشتی بتایا کرتے تھے۔ وقتاً فوقتاً غازیوں کو غار کے دہانے پر لے جا کر دور سے دکھا دیا جاتا تھا اور وہ مطمئن ہو کر لوٹ آتے تھے۔ میاں زین العابدین سرحد پہنچے اور انھوں نے پیکروں کو قریب پہنچ کر دیکھ لیا تو جعل کا راز فاش ہو گیا۔ وہ سرحد سے لوٹ آئے اور عمر بھر مولوی محمد قاسم کو "قاسم کذاب" کہتے رہے۔

میں اس کہانی کے صدق و کذب کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ مولوی محمد قاسم سید صاحب کے مخلص مرید تھے۔ ان کے بھائی اور والد میدان جنگ میں شہید ہوئے۔ خود مولوی قاسم کی زندگی کا آخری سانس غیر مسلم قوتوں کے خلاف جہاد میں پورا ہوا۔ ۱۸۵۲ء میں وہ انگریزوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے اور غالباً سیالکوٹ جیل میں وفات پائی۔ یقین نہیں آتا کہ انھوں نے سید صاحب کے نام پر اس قسم کا جعل کھڑا کیا ہو۔ اگر یہ کہانی سچی ہے تو ہم اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللّٰھم اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان۔

ان تصورات یا معتقدات پر بحث کی ضرورت ہے اور نہ بحث مناسب معلوم ہوتی ہے ، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ مجاہدِ کبیر و غازیِ شہیر سید احمد بریلوی ۶۔ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ کے میدان میں شہید ہو گئے اور جس دعوت کو لے کر کھڑے ہوئے تھے ، اس پر اپنے خون سے سچائی کی مُہر لگا دی۔ نہ وہ غائب ہوئے تھے اور نہ ان کے ظہور کا انتظار کرنے کی کوئی عقلی یا شرعی وجہ موجود تھی[1]

ممکن ہے کہا جائے ، اہلِ صادق پور نے غیبت کا نظریہ اس غرض سے تراشا کر گرے ہوئے دلوں کو سہارا دے کر کھڑا کریں۔ عام لوگ چونکہ ظہورِ مہدی کے منتظر تھے ، اس وجہ سے زیرِ غور نظریے کی اشاعت کے لیے فضا سازگار تھی ، لیکن میرے دل میں وہم بھی نہیں گزر سکتا کہ مولانا ولایت علی ، مولانا عنایت علی ، مولانا احمد اللہ ، مولانا یحییٰ علی اور مولانا عبدالرحیم جیسے بلند پایہ بزرگ اس قسم کی گھڑی ہوئی تدبیروں سے کام لینے پر آمادہ ہو سکتے تھے۔ اگر وہ حیات کے قائل تھے تو سمجھنا چاہیے کہ خلوص کے ساتھ سید صاحب کو زندہ مانتے تھے ، البتہ ان کا یہ عقیدہ سراسر غلط اور بے بنیاد تھا۔

مولوی محمد جعفر تھانیسری کا بیان

مولوی محمد جعفر مرحوم نے تواریخ عجیبہ میں لکھا ہے :

> بعد صاف کرنے میدان کے سید صاحب قتل شیر کے اپنی جماعت میں کھڑے تھے کہ اس وقت آپ یک بہ یک نظروں سے غائب ہو گئے۔
>
> مولوی جعفر علی ، جو آپ کا باڈی گارڈ تھا اور کندھے سے کندھا ملائے ہوئے کھڑا تھا ، لکھتا ہے کہ " جناب حضرت امیر المومنین در ہماں جماعت از نظرِ من غائب شدند"[2]

پھر فرماتے ہیں کہ مولوی نظام الدین چشتی اور مولوی عبداللہ بھی میدانِ جنگ سے غائب ہو کر آپ کے رفیقِ غیبت بن گئے[3]

میاں جی چشتی اور مولوی عبداللہ کے غائب ہونے کی کوئی روایت آج تک میری نظر سے نہیں گزری صرف میاں زین العابدین کی وہ کہانی مشہور ہے جس کا ذکر میں حاشیے میں کر چکا ہوں۔ خود سید صاحب کے متعلق مولوی سید جعفر علی نقوی کے الفاظ (از نظرِ من غائب شدند) کو سراسر غلط اور خلافِ واقعہ معنی پہنانے

---

[1] مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم نے اس عقیدہ غیبت کی بنا پر ایک عجیب طومار تیار کر دیا اور وہ یہ کہ مولانا ولایت علی نے قاضی شوکانی سے حدیث کی سند لی تھی۔ قاضی شوکانی زیدی تھے۔ اس طرح غیبت کا عقیدہ زیدیت سے اہلِ صادق پور تک پہنچا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ قاضی شوکانی کو کسی صاحبِ علم کا زیدی قرار دینا یقیناً اس دنیا کے عجائبات میں سے ہے۔

[2] تواریخ عجیبہ صفحہ ۱۳۶۔ [3] ایضاً صفحہ ۱۳۷

کی کوشش حد درجہ حیرت انگیز ہے۔ چونکہ "منظورہ" سامنے نہ تھی اور اس کا ایک فقرہ "تواریخ عجیبہ" میں سیاق و سباق سے الگ کر کے چھاپ دیا گیا، اس لیے اکثر لوگ دھوکا کھا گئے اور مغالطے میں پڑ گئے۔

اب "تواریخ عجیبہ" کے بیان کی حقیقت ملاحظہ فرمائیے:

۱ - مولوی سید جعفر علی نقوی، سید صاحب کے باڈی گارڈ نہ تھے بلکہ مولوی احمد اللہ ناگپوری کی جماعت میں شامل تھے اور ان سے زیادہ تر منشی جانے میں کام لیا جاتا تھا۔ سید صاحب کی محافظت کے فرائض اصلاً اس جماعت سے متعلق تھے جو جماعت خاص کہلاتی تھی، یعنی خود سید صاحب کی جماعت۔

۲ - بلاشبہ بالاکوٹ میں سکھوں پر حملے کے لیے سید صاحب مسجد زیریں سے باہر نکلے تو مولانا شاہ اسماعیل نے اعلان کر دیا تھا کہ قرابین دار سید صاحب کے ساتھ ہو جائیں۔ اس وجہ سے مولوی سید جعفر علی نقوی بھی ساتھ ہو گئے تھے لیکن وہ تو سید صاحب کے ساتھ رہ سکے اس لیے کہ ضعف و بیماری کے باعث تیز نہیں چل سکتے تھے جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں اور نہ گھمسان کے رن میں سید صاحب سے قریب تھے چہ جائیکہ مانا جائے۔ وہ کندھے سے کندھا ملائے ہوئے "کھڑے تھے۔

۳ - سید جعفر علی نقوی خود لکھتے ہیں کہ میں منشی محمدی انصاری کے پاس تھا:

از منشی موصوف پرسیدم کہ	میں نے منشی صاحب سے پوچھا کہ
حضرت امیر المومنین کجا ہستند؟ ایشاں	حضرت امیر المومنین کہاں ہیں؟ وہ بولے
فرمودند عقب ما بسمت چپ ہستند۔	ہمارے پیچھے بائیں جانب ہیں۔

اگر کندھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے تو سید صاحب کے بارے میں کسی سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟

۴ ان حالات میں "از نظر من غائب شدند" کا صاف اور واضح مطلب یہ تھا کہ سید صاحب سید جعفر علی کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے اور نظر نہ آتے تھے۔ یہ مطلب قطعاً نہ تھا کہ جسد عنصری کے ساتھ پردۂ خفا میں چلے گئے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو منشی محمدی انصاری کیوں یہ کہتے، کہ سید صاحب ہمارے پیچھے بائیں جانب ہیں؟

شہادت کے حق میں شہادتیں

پھر عجیب بات یہ ہے کہ جس "منظورہ" کے ایک فقرے کو سیاق و سباق سے الگ کر کے اور اس کے ساتھ غلط مقدمات

---

[1] منظورہ صفحہ

لگا کر سراسر غلط معنی پہنائے گئے، اس میں ایک دو نہیں، میرے سرسری اندازے کے مطابق کم و بیش پندرہ موثق، قطعی اور یقینی شہادتیں موجود تھیں، جن سے سید صاحب کی شہادت کا اثبات ہوتا تھا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ غیبت کا معتقد شخص خود اپنے قلم سے شہادت کی گواہیاں فراہم کرتا؟ یا کیا مولوی محمد جعفر مرحوم کے لیے زیبا تھا کہ وہ ان روشن شہادتوں کو چھوڑ کر ایک ایسے فقرے کو ثبوت غیبت بتاتے جسے کسی بعید سے بعید تاویل کی بنا پر بھی غیبت سے کوئی تعلق نہ تھا؟ آپ غیبت کے خلاف شہادتیں ملاحظہ فرمائیے:

١ - شیخ وزیر کے صاحبزادے نے گواہی دی کہ میں نے امیر المومنین کی نعش پہچانی۔[1]

٢ - خضر خاں قندھاری اور الہ دین پھلتی والا بالاکوٹ گئے۔ وہاں کے لوگوں سے مل کر اور حالات معلوم کرکے واپس آئے تو بیان کیا کہ امیر المومنین کی نعش اسیر شدہ غازیوں نے پہچانی اور شیر سنگھ کے حکم سے مسلمانوں نے اسے دفن کیا۔[2]

٣ - غازی شملئی پہنچے تو بی بی صاحبہ نے بچی کو، جو ساڑھے تین ماہ کی تھی، ملازمہ کے ہاتھ غازیوں کے پاس بھیج دیا۔ سید جعفر علی نقوی کے بیان کے مطابق اس معصوم بچی کو دیکھ کر حضرت کی شکل و صورت یاد آگئی:

ما ہمہ گریاں شدیم۔ کسے از ما نہ بود	ہم سب رو پڑے، کوئی نہ تھا جس کا
کہ دامان او از اشک تر نگردید[3]	دامن آنسوؤں سے تر نہ ہُوا۔

یہ گریہ اسی یقین کا نتیجہ تھا کہ سید صاحب دنیا میں نہیں رہے تھے۔ اگر وہ محض غائب ہوئے تھے تو رونے کا کون سا محل تھا؟ بی بی صاحبہ کو تسلی دیتے کہ تھوڑی مدت میں ظاہر ہو جائیں گے۔

٤ - شیخ ولی محمد نے اسی موقع پر بی بی صاحبہ سے پوچھا کہ اگر اپنے وطن چترال جانا چاہیں تو اس کی ہر ممکن تدبیر کی جائے، اگر سندھ میں حضرت کے اہل و عیال کے پاس جانا منظور ہو تو اس سمت کے لیے سفر کا بندوبست کیا جائے۔[4] اگر سید صاحب زندہ تھے اور محض عارضی طور پر غائب ہوئے تھے تو بی بی صاحبہ کو چترال یا سندھ پہنچانا کس بنا پر مناسب تھا؟

٥ - حاجی غریب اللہ گورکھپوری نے واقعہ بالاکوٹ کے بعد وطن کا قصد کیا تو سید جعفر علی نقوی نے اپنے والد کے نام ایک خط حاجی صاحب کے حوالے کیا، اس کا مضمون یہ تھا:

حال شکست و شہادت حضرت	اس میں شکست کا حال، سید صاحب
امیر المومنین و مولانا اسماعیل علیہما الرضوان	اور مولانا اسماعیل کی شہادت کے ساتھ ساتھ

---

[1] منظورہ صفحہ ١٢٠٠۔ [2] منظورہ صفحہ ١٢٠١۔ [3] منظورہ صفحہ ١١٩٦۔ [4] ایضاً ایضاً

ونام رفقاے خود کہ شہادت نصیب شان	اپنے شہید اور زندہ رفیقوں کے
شدہ ونام باقی ماندگان نوشتہ بودیم[1]	نام لکھے تھے۔

۶ - سید جعفر علی نقوی جب حاجی غریب اللہ سے کچھ مدت بعد وطن پہنچے تو ان کے والد اور بھائی نے بیان کیا کہ خط پا کر ہم بہت روئے اور بار بار کہتے تھے:

اگر عزیز ما داخل راہ شہداے شدے	اگر ہمارا عزیز (یعنی جعفر علی نقوی)
ذات بابرکات حضرت امیر المومنین	شہید ہو جاتا اور حضرت امیر المومنین زندہ
باقی مے ماند، ایں قدر رنج و ملال بر ما	رہتے تو ہمیں اتنا رنج نہ ہوتا۔
نمے رسید[2]	

مزید شہادتیں

۷ - غازی بالاکوٹ سے سچ بہار میں صاحبزادہ محمد نصیر کے پاس پہنچے تو یہ تجویز پیش ہوئی کہ صاحبزادے کو امیر بنا لیا جائے۔ بعض غازی اس تجویز کے حق میں اور بعض خلاف تھے۔ اختلاف رکھنے والوں نے صرف دو باتیں پیش کیں: ایک یہ کہ صاحبزادے میں شرائط امامت موجود نہیں، دوسری یہ کہ باوجود قرب مکان وہ جنگ بالاکوٹ میں شریک نہ ہوا۔ اگر سید صاحب زندہ ہوتے تو نئی امامت کا سوال کیوں سامنے آتا؟

۸ - سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں:

وقتیکہ یقین بر شہادت آنجناب و	جب یقین ہو گیا کہ سید صاحب
یاس از حیات دنیاوی و فوز بمدارج	شہید ہو کر شہدا کے مدارج علیا پر پہنچ گئے
علیاے شہدا حاصل شد، پس احقر از	اور حیات دنیاوی سے مایوسی ہو گئی تو
تمامی جماعت خود پرسید کہ کدام از شما	احقر نے جماعت کے تمام لوگوں سے پوچھا
ارادہ اقامت دارد و کدام عزم مشارکت	کہ کون یہاں ٹھہرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور
خاکسار در نہضت بسوے وطن[3]	کون میرے ساتھ وطن چلنے کا خواہاں ہے

۹ - شیخ حسن علی نے سید جعفر علی سے کہا میں تو خدا کے ساتھ عہد کر چکا ہوں کہ ساری عمر جہاد میں بسر کروں گا۔ جہاد امام کے بغیر ہو نہیں سکتا۔ لہذا کابل، قندھار، سندھ اور عرب میں امام کو تلاش کروں گا۔ جب امام مل جائے گا تو کسی مناسب مقام پر بیٹھ کر جہاد شروع کر دوں گا[4]۔ اگر انھیں

---

[1] منظورہ صفحہ ۱۱۹۹ - [2] ایضاً [3] منظورہ صفحہ ۱۲۱۲ - [4] منظورہ صفحہ ۱۲۱۰

سید صاحب کی حیات کا یقین ہوتا تو تلاش امام میں ملک بہ ملک پھرنے کی سرگردانی کیوں ضروری سمجھتے؟

۱۰ - مولوی سید جعفر علی وطن واپس ہوئے تو چینٹی میں اخوند محتشم سے ملاقات کی۔ وہ بھی سید صاحب کے معتقدین میں سے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ رسول خاں ترنگ زئی سے شہادت کا حال معلوم ہوا تھا۔ وہ سید صاحب کے ہتھیار بھی لایا تھا جو امانۃً موجود ہیں۔ انھیں شیخ ولی محمد کے پاس بھیج دوں گا۔ اگر سید صاحب زندہ ہوتے تو ہتھیار شیخ ولی محمد کے پاس بھیجنے کا کیا مطلب تھا؟ نیز سید جعفر علی نے اخوند محتشم کے بیان سے اختلاف نہیں کیا۔

۱۱ - سفر مراجعت میں لدھیانہ اور دہلی کے درمیان سید جعفر علی کی ملاقات محمد سعید خاں کنج پوری سے ہوئی جو بیس سواروں کے ساتھ سید صاحب کے پاس جا رہا تھا۔ اس نے حال پوچھا۔ منظورہ میں سید جعفر علی لکھتے ہیں:

آنچہ راست مے دانستم از حال	زخمی ہونے اور شہادت پانے کا
چشم زخم و شہادت بعرض بیان آوردم۔	جو حال مجھے معلوم تھا، ٹھیک ٹھیک
	بیان کر دیا۔

محمد سعید خاں بولا کہ تم بھاگ کر آئے ہو، ہم ضرور سرحد پہنچیں گے۔ سید جعفر علی نے جواب دیا:

خدائے تعالیٰ ہم چنیں کناد کہ شما	خدا کرے کہ آپ اس بات میں سچے
دریں قول صادق شوید و ما کاذب۔	ثابت ہوں اور میں جھوٹا۔ لیکن کیا کروں
اما چہ کنیم بوقت استفسار کسے جز راستی	جب کوئی پوچھتا ہے تو سچی بات کے سوا
دگر ہیچ گفتن نمی توانیم [2]	کچھ کہہ نہیں سکتا۔

گویا سید جعفر علی کے نزدیک سچائی یہی تھی کہ سید صاحب شہید ہو چکے تھے۔

۱ - سید جعفر علی دہلی پہنچے تو سید محمد علی رام پوری ان دنوں اکبر آبادی مسجد میں مقیم تھے۔ صبح ان کا آدمی بلانے کے لیے آیا۔ سید جعفر علی خدمت میں حاضر ہوئے:

بہ محبت و مدارات پیش آمدند	بڑی محبت و مدارات سے پیش
اما در باب شہادت حضرت امیر المومنین	آئے لیکن حضرت امیر المومنین کی شہادت
تصدیق ما نہ نمودند [3]	کے باب میں میری تصدیق نہ کی۔

---

[1] منظورہ صفحہ ۱۲۱۶ - [2] منظورہ صفحہ ۱۲۲۹ - [3] منظورہ صفحہ ۱۲۳۶

گویا سید جعفر علی معتقد شہادت تھے اگرچہ سید محمد علی نے اسے قبول نہ کیا۔

۱۳۔ لکھنؤ چھاؤنی میں سید صاحب کے اقربا میں سے سید محمد موجود تھے۔ سید جعفر علی ان سے بھی ملے:

تمام احوال لشکر اسلام و یقین شہادت حضرت امیر المومنین بیان نمودم وہمیں کہ کسے از چشم خود شہید نہ دید[1]	میں نے لشکر اسلام کے پورے حالات سید صاحب کی شہادت کے یقین کا اظہار بھی کیا ساتھ ہی کہا کہ کسی نے آپ کو اپنی آنکھوں سے بہ حالت شہادت نہ دیکھا۔

۱۴۔ لکھنؤ میں سید جعفر علی نقوی اپنے استاد مولوی حیدر علی سے بھی ملے۔ وہ رسالدار فقیر محمد خاں کی سرکار میں ملازم تھے، سید صاحب کو یاد کرکے بہت روئے۔ سید جعفر علی لکھتے ہیں کہ انھیں نے شہادت کی تفصیلات مجھ سے سن کر رسالدار کو سنائیں:

حال شہادت امیر المومنین زبانی راقم الحروف رسانیدند و خان موصوف را یقین شہادت از ہمیں وقت شد[2]	انھوں نے میری زبانی رسالدار فقیر محمد خاں تک امیر المومنین کی شہادت کا حال بیان کیا۔ خان موصوف کو اسی وقت سے شہادت کا یقین ہوا۔

۱۵۔ سید جعفر علی وطن پہنچے۔ والد سے ملے تو انھوں نے لخت جگر کو پا کر کہا کہ دنیا میں اس سے بڑی آرزو کوئی نہ تھی جو خدا نے پوری کر دی۔ اب موت کا غم نہیں۔ ایک آرزو تھی کہ خدا حضرت امیر المومنین کے ہاتھ سے اس سرزمین کی تطہیر کا سامان کر دیتا اور شوکت اسلام دیکھ لیتا:

چوں جناب ممدوح در دنیا نماندند ماہم اگر بمیریم چہ غم است[3]	جب حضرت امیر المومنین دنیا میں نہ رہے تو ہمارے رخصت ہو جانے پر غم و رنج کی کون سی وجہ ہے؟

دعوت غور و فکر یہ چند اقتباسات میں نے سرسری طور پر "منظورہ" سے جمع کر دیے ہیں۔ ان کے پیش نظر کون کہہ سکتا ہے کہ "از نظر من غائب شدند" سے سید جعفر علی کا مدعا وہی تھا جو مولوی محمد جعفر نے "تاریخ عجیبہ" میں پیش کیا یعنی یہ کہ سید صاحب نظروں سے اوجھل نہ ہوئے بلکہ

---

[1] منظورہ صفحہ ۱۲۳۳۔ [2] منظورہ صفحہ ۱۲۳۵، ۱۲۳۶۔ [3] منظورہ ۱۲۳۹۔

بہ جسد عنصری غائب ہو گئے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ مولوی محمد جعفر مرحوم نے کس بنا پر شہادت کی یہ قطعی شہادتیں نظر انداز کر دیں اور "منظورہ" کے ایک فقرے کو اصل عبارت سے الگ کر کے بالکل خلاف حقیقت مطلب کیوں پیدا کیا؟ اگر ان کا عقیدہ یہ تھا کہ سید صاحب غائب ہو گئے تو بہ طور خود اسے ظاہر کر دیتے۔ سید جعفر علی نقوی کے بیانات میں حذف و تحریف کی کیا ضرورت تھی؟

غرض غیبت کا عقیدہ اصلاً بھی غلط تھا اور جن سہاروں کی بنا پر اسے مستحکم بنانے کی سعی کی گئی، وہ سہارے بھی بے بنیاد تھے۔ سید صاحب کے ارادت مندوں میں سے نواب وزیر الدولہ والیِ ٹونک نے فراہمی معلومات کی سعی سب سے بڑھ کر فرمائی۔ انھیں کے اہتمام میں "وقائع احمدی" مرتب ہوئی، جس کی ترتیب کا حال میں مآخذ میں بیان کر چکا ہوں، انھیں کے اہتمام میں "منظورہ" لکھی گئی۔ انھوں نے اپنی کتاب میں بیسیوں مقامات پر سید صاحب کو شہید ہی لکھا ہے، غائب نہیں لکھا۔ بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ سید صاحب کی قبر کا نشان نہیں مل سکا۔ نواب صدیق حسن خاں نے بھی "تقصار" میں عقیدہ غیبت کو عقلاً اور شرعاً غلط قرار دیا ہے[1]

مولوی محمد جعفر کا آخری بیان

مولوی محمد جعفر مرحوم کا تعلق جماعت صادق پور سے تھا۔ غالباً انھیں سے عقیدہ غیبت لیا اور شنید کی بنا پر "منظورہ" کے اس فقرے کو غیبت کا مبنیٰ بنایا جسے میں اوپر نقل کر چکا ہوں۔ منظورہ کو خود انھوں نے غالباً نہیں دیکھا تھا۔ پایان عمر وہ بھی غیبت کے متعلق متوقف ہو گئے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> اب بہ سبب بُعد زمانہ کے جو ساٹھ برس سے بھی زیادہ ہو گئے، خیال غیبوبت خود بخود لوگوں کے دلوں سے محو ہوتا جاتا ہے[2]

---

[1] تقصار جیود الاحرار صفحہ ۱۰۸ - [2] تواریخ عجیبہ صفحہ ۱۲۷

پنتالیسواں باب

ازواج و اولاد

سیّدہ زہرہ سید صاحب نے تین شادیاں کیں۔ آپ کی پہلی بیوی سیدہ زہرہ (بنت سید محمد روشن نصیر آبادی) تھیں۔ یہ شادی اس زمانے میں ہوئی تھی، جب سیّد صاحب دہلی سے تعلیم پا کر وطن گئے تھے۔ ان سے صرف ایک صاحبزادی، سیدہ سائرہ، پیدا ہوئیں۔ صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں، صرف یہ معلوم ہے کہ سیدہ سائرہ کی پیدائش کے بعد سید صاحب نواب امیر خاں کے لشکر میں شامل ہوئے تھے۔

سید صاحب نے ۷۔ جمادی الاخریٰ، ۱۲۴۱ھ کو راہِ ہجرت میں قدم رکھا تھا۔ اہل و عیال اوائل ذی حجہ ۱۲۴۱ھ میں رائے بریلی سے روانہ ہوئے اور راستے میں ٹھہرتے ٹھہرتے صفر ۱۲۴۲ھ میں سندھ پہنچے تھے اس وقت سے اہل و عیال نے ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) تک تیرہ سال پیر کوٹ (پیر جھنڈو گوٹھ) ہی میں بسر کیے۔

سیدہ سائرہ کی شادی، سید صاحب کے بھتیجے سید اسماعیل (بن سید محمد اسحاق) سے ہوئی۔ نواب وزیر الدولہ والیِ ٹونک نے سید صاحب کے ازواج و متعلقین کو ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) میں سندھ سے ٹونک بُلا لیا تھا۔ غالباً ہر ایک کے گزارے کے لیے تنخواہیں مقرر کر دی تھیں۔ بعض کو ذمہ داری کے عہدے دیے تھے۔ سیّدہ سائرہ کے لیے گیارہ ہزار سالانہ کی جاگیر مقرر فرما دی تھی، جس کی آمدنی سید اسماعیل کے حسنِ انتظام سے اٹھارہ ہزار پر پہنچ گئی تھی۔ بعد میں سید اسماعیل نے نواب کے ماموں میر عالم خاں کی لڑکی سے دوسرا نکاح کر لیا۔ یہ امر اتنی خفگی کا موجب بنا کہ سید اسماعیل کو جاگیر سے بالکل بے دخل کر دیا گیا۔ صرف سو روپے ماہوار گزارے کے لیے ملتے تھے۔

سیدہ زہرہ کا انتقال ۴۔ شوال ۱۲۷۹ھ (۲۵۔ مارچ ۱۸۶۳ء) کو ہوا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ٹونک ہی میں رہیں اور وہیں دفن ہوئیں۔

سیّدہ ولیہ سید صاحب نے دوسری شادی اپنے منجھلے بھائی سید اسحاق کی بیوہ سیدہ ولیہ سے کی تھی، جو آپ کے حقیقی ماموں کی بیٹی تھیں۔ وہ بڑی ہی عقلمند اور منتظم خاتون تھیں،

اس لیے شادی کے بعد سارے گھر میں انھیں کو بلند ترین مرتبہ حاصل ہوا۔ سندھ سے ٹونک گئیں تو نواب وزیر الدولہ مرحوم از راہِ عقیدت دُور تک پیشوائی کے لیے گئے اور غالباً ایک میل تک سیدہ کی پالکی کو خود کندھا دیا۔ ٹونک پہنچیں تو سیدہ سائرہ کی جاگیر گویا انھیں کی جاگیر تھی، اس لیے کہ سیدہ سائرہ ایک اعتبار سے ان کی علاتی بہن اور ایک اعتبار سے بہو تھیں، سید محمد علی، صاحبِ "مخزنِ احمدی" نے لکھا ہے:

آں وزیرِ اعظم دریائے جود   دائما غمخوارِ ایشاں خویش مے نمود
رشکِ ابرِ بہمن آمد چوں کفش   داد جاگیرش مزید از مصرفش[1]

یہ غالباً اسی جاگیر کی طرف اشارہ ہے جو سیدہ سائرہ کو ملی تھی۔ نیز:

ہم بہ نقد و جنس شادش داشتے   ہم چو سید مرشدش پنداشتے
نذر در عیدین مے دادش مدام   روز و شب مے داشتے شادش مدام[2]

سید عبد العلی نے لکھا ہے کہ بتاریخ ۱۸۔ رجب ۱۲۶۲ھ (۱۲۔ جولائی ۱۸۴۶ء) بروز دوشنبہ وفات پائی۔[3] سید محمد علی فرماتے ہیں کہ ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی تھی۔ یکایک بیمار ہوئیں۔ ایک رات اور دن بیمار رہ کر کلمہ پڑھتی ہوئی آدھی رات کے وقت جاں بحق ہوئیں۔ بیماری میں بھی نماز کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ جب وقت معلوم ہوتا، تکیے پر تیمم کر کے نیت باندھ لیتیں:

گاہ بے ہوش و گہے باہوش بود   لیک ذکرِ قلبی اش در جوش بود
دم بدم تفتیشِ اوقاتِ صلوٰۃ   می نمود آں مقتدائے محسنات
گر کسے گفتے کہ ہاں وقتِ نماز   آمد اینک زود تر تحریمہ ساز
او تیمم ساختے از تکیہ گاہ   آمدے اندر نماز آں دیں پناہ
استقامت را ہمے نازم کہ بود   تا دمِ آخر سریش وقفِ سجود
کلمہ گویاں وقتِ نصفِ لیل بود   کاں عفیفہ از جہاں رحلت نمود
چوں بخیر و خوبیش شد خاتمہ   شد بجنت ہم نشین فاطمہ
قصہ کوتہ بعد صد رنج و ملال   خواستم از طبع خود تاریخ سال
داد ہاتف از سماواتم ندا   "رفت زیں عالم سوے دارِ بقا"[4]

گویا سید صاحب کے بعد قریباً سولہ برس زندہ رہیں اور ٹونک میں دفن ہوئیں۔ جب تک زندہ

---

[1] مخزن احمدی صفحہ ۴۶۔ [2] ایضاً نیز نسب نامہ قلمی مرتبہ سید عبد العلی صفحہ ۴۳۔ [3] مخزن احمدی صفحہ ۴۶

رہیں نواب وزیرالدولہ کبھی کبھی عقیدت مندانہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ سید صاحب کا "خرقہ" ملا تو اسے اپنے سر پر رکھ کر پیدل سیدہ کے گھر گئے۔ سیّدہ نے دعاؤں کے علاوہ تواضعاً نواب کو اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھلایا۔

یہاں یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ حج کے دنوں میں سید صاحب کی کسی بی بی کی گود میں ایک بچہ ضرور تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ سیدہ زہرہ کا تھا یا سیدہ ولیہ کا۔ میرا خیال ہے کہ اس کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا۔

سیّدہ فاطمہ

تیسری شادی سید صاحب نے اطباؔ کی تجویز کے مطابق سرحد میں سیدہ فاطمہ سے کی تھی، جو چترال کے سادات میں سے تھیں، مگر جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، ان کا خاندان اسماعیلی تھا۔ ان سے صرف ایک بچی پیدا ہوئی جو سید صاحب کی شہادت کے وقت صرف ساڑھے تین مہینے کی تھی۔ سیدہ فاطمہ نے سید صاحب کی شہادت کے بعد چھ یا سات برس سرحد میں گزارے۔ وہ کئی جگہ رہیں مثلاً راج دواری، شمشتی (دریہ نندھیاڑ)، تختہ بند (بونیر)، ناخونو (سوات) اور ستھانہ۔ پھر شیخ ولی محمد نے انھیں دوسری ازواج کے پاس سندھ پہنچایا۔ وہاں سے ٹونک پہنچیں، باقی عمر وہیں گزاری۔ سُنا ہے کہ کبھی کبھی رائے بریلی بھی جاتی تھیں۔ ۱۹۰۰ء کے آس پاس وفات پائی۔

دختری اولاد

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، سیدہ سائرہ کی شادی سید اسماعیل بن سید اسحاق سے ہوئی تھی۔ ان کے ایک فرزند تھے: سید اسحاق عرف کلو میاں۔ وہ ۱۳۰۹ھ (۹۲-۱۸۹۱ء) میں فوت ہوئے۔ دو بیٹیاں تھیں: سیدہ مریم اور سیدہ ولیہ۔ ان کی اولاد کا حال ملحقہ شجرے سے معلوم ہو سکے گا۔ سید اسماعیل ۷۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۰ھ (۲۰۔ اکتوبر ۱۸۶۲ء) کو چہار شنبہ کے دن فوت ہوئے۔ سیدہ سائرہ نے ان کے بعد ۲۸۔ رجب ۱۳۰۱ھ (۲۶۔ مئی ۱۸۸۴ء) کو بروز دوشنبہ وفات پائی۔

سیّدہ ہاجرہ کی شادی سید صاحب کے بھتیجے سید محمد یعقوب کے فرزند سیّد محمد یوسف سے ہوئی تھی۔ سید محمد یوسف نے حج سے معاودت کے بعد ۱۶۔ شوال ۱۲۶۶ھ (۲۵۔ اگست ۱۸۵۰ء) کو بعارضہ ہیضہ وفات پائی۔ سیّدہ ہاجرہ ۶۔ ربیع الثانی ۱۲۷۶ھ (۲۔ نومبر ۱۸۵۹ء) کو فوت ہوئیں۔ ان کی اولاد کا نقشہ بھی ملحقہ شجرے سے معلوم ہوگا:

اولاد سیدہ سائرہ

(زوجہ سید اسماعیل بن سید اسحاق)

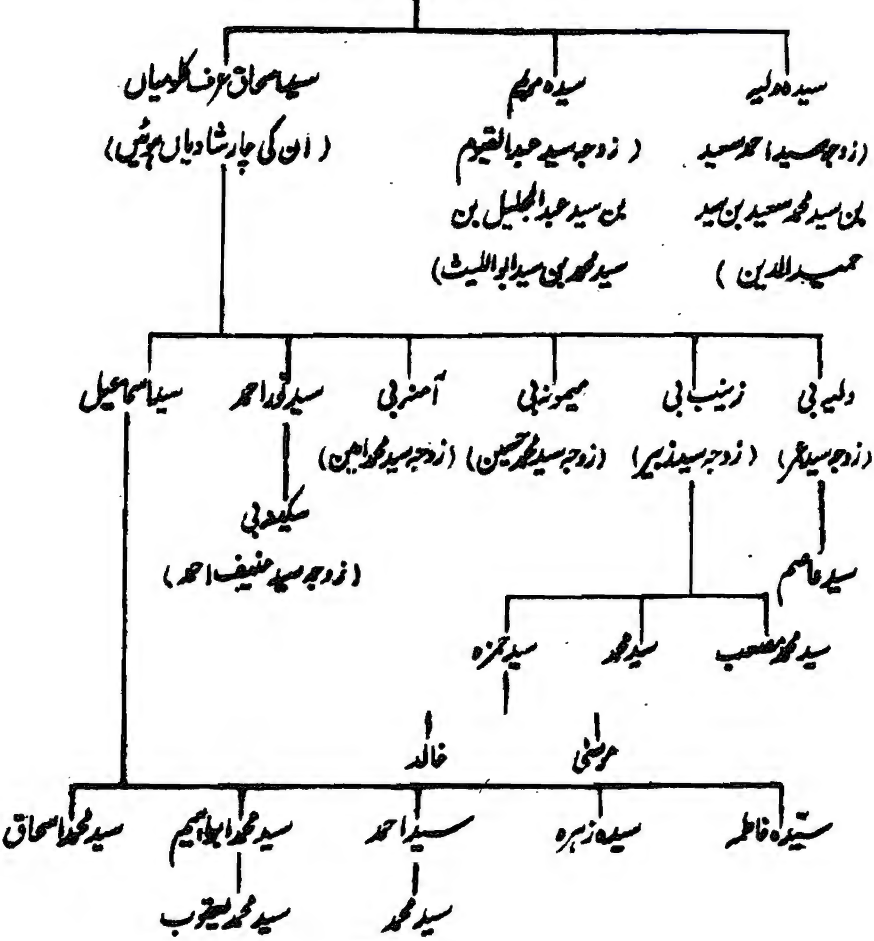
سیدہ ولیہ
(زوجہ سید احمد سعید
بن سید محمد سعید بن سید
حمید الدین)
سیدہ مریم
(زوجہ سید عبدالقیوم
بن سید عبدالجلیل بن
سید محمد بن سید ابو اللیث)
سید اسحاق عرف کلو میاں
(ان کی چار شادیاں ہوئیں)
ولیہ بی
(زوجہ سید عمر)
زینب بی
(زوجہ سید نذیر)
میمونہ بی
(زوجہ سید محمد حسین)
آمنہ بی
(زوجہ سید محمد امین)
سید نور احمد
سید اسماعیل
سکینہ بی
(زوجہ سید حنیف احمد)
سید عاصم
سید محمد مصعب
سید محمد
سید حمزہ
خالد
مرتضیٰ
سیدہ فاطمہ
سیدہ زہرہ
سید احمد
سید محمد ابراہیم
سید محمد اسحاق
سید محمد یعقوب
سید محمد

اولاد سیدہ ہاجرہ

(زوجہ سید محمد یوسف بن سید یعقوب)

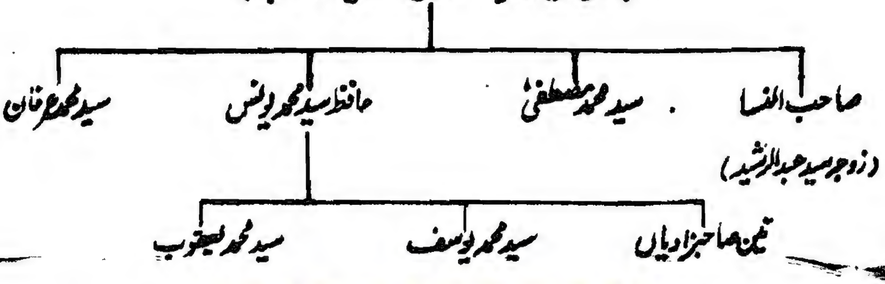
صاحب النسا
(زوجہ سید عبدالرشید)
سید محمد مصطفیٰ
حافظ سید محمد یونس
سید محمد عرفان
تین صاحبزادیاں
سید محمد یوسف
سید محمد یعقوب

چھیالیسواں باب

اخلاق و عادات

در صد ہزار قرن سپہر پیادہ رو
نارد چو او سوار بہ میدان روزگار

ضروری گزارش

سید صاحب کی سیرت ازدواج و اولاد پر تمام ہو گئی۔ میں نے اپنے خیال کے مطابق کتاب کی ترتیب میں ایسا انداز اختیار کیا تھا کہ سید صاحب حیات مستعار کے ہر دائرے میں زندہ چلتے پھرتے نظر آئیں اور پوری کتاب ان کے اخلاق و عادات کا مرقع بن جائے۔ نہیں کہہ سکتا کہ اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا لیکن میں اخلاق و عادات کا باب الگ مرتب کرنے کا خواہاں نہ تھا۔ اسی وجہ سے بیسیوں حکایات مناسب مقامات پر درج کرتا رہا، جو اصلاً اخلاق و عادات کے باب میں آنی چاہئیں تھیں۔ کتاب طباعت کے لیے تیار ہو گئی تو احساس ہوا کہ ممکن ہے سوانح نگاری کے متداول قاعدوں کے عادی حضرات سمجھیں کہ میں نے اس سیرت کو نامکمل چھوڑ دیا اور اخلاق و عادات پر الگ کچھ نہ لکھا۔ اس وجہ سے زیر نظر باب مرتب کرنا پڑا، لیکن میں نے حتی الامکان کسی واقعہ کو دہرایا نہیں۔ صرف وہی باتیں لکھیں جو پہلے کسی شکل میں درج نہیں ہو سکی تھیں۔ درج شدہ حکایات کی طرف محض اشارہ کر دینے پر اکتفا کیا۔

نواب وزیرالدولہ کا بیان

نواب وزیرالدولہ مرحوم نے "وصایا" میں لکھا ہے کہ سید صاحب "خَلق" میں "اکمل" اور "خُلق" میں "افضل" تھے۔ اوصاف ظاہری و باطنی کے لحاظ سے وہ قدرت کے نشانوں میں سے ایک نشان تھے۔ ایمان و عرفان میں ان کا رتبہ بہت اونچا تھا۔ ان کا جسم قوی تھا اور قامت معتدل، حواس صحیح تھے اور زبان فصیح، ذہن رسا تھا اور طبع ذکی۔ وہ ہمت میں بلند پایہ تھے اور عفت میں صاحب امتیاز۔ عقل میں کامل تھے اور فراست میں باکمال، شجاعت، مروّت، فتوت، حلم و حیا، صبر و تواضع اور اتباع شریعت میں یگانہ تھے:

ایں نہ بالا ست نہالیست کہ از روضۂ قدس
بہ تماشا گہ عشاق رواں ساختہ اند
ہر لطافت کہ نہاں بود پس پردۂ غیب
ہمہ در صورت خوب تو عیاں ساختہ اند
ہر چہ بر صفحہ اندیشہ کشد کلک خیال
شکل مطبوع تو زیبا تر ازاں ساختہ اند[1]

---

[1] وصایا حصہ اول صفحہ ۲۵

نواب صدیق حسن خاں نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں کہ اگرچہ سید صاحب نے علم ظاہر میں پوری دستگاہ حاصل نہیں کی تھی لیکن علم باطن میں وہ درجہ کمال پر پہنچ چکے تھے۔ خلق خدا کو راہ ہدایت پر لگانے میں انھیں خدا کا ایک نشان سمجھنا چاہیے۔ ان کے خلفا نے وعظ و نصیحت کے ذریعے سرزمین ہند کو شرک و بدعت کے خس و خاشاک سے پاک کر دیا اور لوگ شاہراہِ کتاب و سنّت پر چلنے لگے۔ ان مواعظ و نصائح کی برکات اب تک جاری ہیں۔ حضرت سید کا پایہ سلوک ظاہر و باطن میں اتنا بلند تھا کہ انھیں دوسروں سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی:

حاصل کلام آنکہ دریں قرب زماں ایں چنیں	خلاصہ یہ کہ ماضی قریب میں سید صاحب
صاحب کمالے در قطرے از اقطار جہاں	جیسے صاحب کمال کا نشان کسی خطے میں نہیں ملتا
نشاں نہ دادہ اند و چنداں فیوض کہ ازیں	اور ان کی جماعت منصورہ سے خلق خدا کو فیض
جماعۃ منصورہ بخلق رسید، عشر عشیر آں از	کی جو دولت ملی اس کے عشر عشیر کا سراغ بھی دنیا
دیگر مشائخ ارض معلوم نیست[۱]	کے دوسرے مشائخ و علما کے ہاں نہیں مل سکتا۔

حکیم مہدی علی منتظم الدولہ حکیم مہدی علی، سلطنت اودھ کے عقیل تریں اور منتظم تریں مدبروں میں سے تھا۔ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں نائب السلطنت کے عہدے پر مامور رہا۔ صاحب "منظورہ" کے بیان کے مطابق وہ فہم و فراست امور دنیا میں اور اہل فضل و کمال کی قدر شناسی میں یگانۂ روزگار تھا۔ اس نے سید صاحب کی بعض جنگوں کے حالات سُنے تو بے تکلف اعتراف کیا:

آنچہ وسعت حوصلہ و ہمت عالی ایں سید است	اس سید نے جس وسعت حوصلہ اور جس ہمت عالی
از ما و از سلطان ما صورت امکان ندارد باآنکہ	سے کام لیا، وہ میں یا ہمارا بادشاہ نہیں دکھا سکتے،
ما مالک ملک عظیم ایم و او زمیں یک دہ ہم نیست[۲]۔	اگرچہ ہم ایک وسیع ملک کے مالک ہیں اور
	سید کو ایک گاؤں کی بھی ملکیت حاصل نہیں۔

اعتراف فضائل کی یہ نہایت قابل فخر دستاویزیں ہیں، لیکن آپ گزشتہ صفحات میں اس شخصیت نادرہ کے متعلق جو کچھ پڑھ چکے ہیں، اسے پیش نظر رکھتے ہوئے یقیناً تسلیم کریں گے کہ سید صاحب نے جو کارنامے انجام دیے، اُن کی حقیقی اہمیت نواب وزیر الدولہ یا نواب صدیق حسن خاں یا منتظم الدولہ حکیم مہدی علی کے سامنے نہ تھی ورنہ ان کے اعترافات کا دائرہ بدرجہا زیادہ وسیع اور ولولہ افزا ہوتا۔

جسمانی قوت سید صاحب کو خدا نے غیر معمولی جسمانی قوت عطا کی تھی، جس کے بعض واقعات میں پہلی جلد کے چوتھے باب میں لکھ چکا ہوں۔ مثلاً معین خاں کے مقبرے کے سنگین چراغ دان کا واقعہ یعنی جس پتھر کو بڑے بڑے زور آور صرف گھٹنوں یا کمر تک بہ مشکل اٹھا سکتے تھے، سید صاحب نے بے تکلف اٹھا کر

---

[۱] تقصار جیود الاحرار صفحہ ۱۰۹، ۱۱۰ – [۲] منظورہ صفحہ ۹۲ –

کندھے پر رکھا اور بیس قدم پرے جا کر پھینکا۔ وہ اتنا بھاری تھا کہ جہاں گرا ہاتھ بھر زمین کھد گئی۔ عام لوگ سمجھتے رہے کہ یہ انسان کا کام نہیں بلکہ کسی جن یا دیو کا کام ہے۔ پھر نصیر آباد کے پہلوان کا واقعہ جو شہ زوروں میں یکتا مانا جاتا تھا۔ وہ خواہ مخواہ سید صاحب سے معارض ہوا۔ آپ نے اس کے ہاتھ پکڑ کر مسجد کی دیوار سے اس بری طرح رگڑا کہ سارا زعم قوت پسینہ بن کر بہ گیا۔ درخت کے بھاری تنے کا واقعہ جسے چالیس آدمی جگہ سے نہ ہلا سکے۔ سید صاحب نے بسم اللہ پڑھ کر اسے لڑھکایا۔ دس پندرہ نیازمند ساتھ ہو گئے اور تنے کو ندی میں ڈال کر تکیے میں پہنچا دیا[1]

میں یہ بھی بتا چکا ہوں کہ اس خداداد قوت کے ساتھ سید صاحب نے ابتدا ہی میں ورزش بھی کمال پر پہنچا دی تھی۔ آپ کے بھانجے سید عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ مجھے پاؤں پر کھڑا کر کے لگاتار پانسو ڈنٹر لگاتے۔ پھر تھوڑی دیر کے لیے گھٹنے زمین پر ٹیک لیتے۔ ذرا سستا کر پانسو اور لگاتے[2] بھاری مگدر ہلاتے اور گنتی نہ کرتے کہ کتنی مرتبہ ہلایا۔ گھڑیوں تک یہی مشغلہ جاری رہتا۔ سید عبدالرحمٰن ہی کی روایت ہے کہ برابر چھ چھ گھڑی تک ورزش جاری رہتی۔ میں بدن مبارک کو مٹی ملا کرتا تھا۔ اتنا پسینہ آتا کہ مٹی تر ہو کر گر جاتی۔ ایک مرتبہ ایک دیوار میں باہر کی طرف چند مکے مارے اور اس کی اینٹیں نکال کر رکھ دیں۔ اسی طرح تیراکی اور غواصی میں کمال بہم پہنچایا تھا۔ اس کے حالات بھی میں جلد اول کے چوتھے باب میں لکھ چکا ہوں۔

فنونِ حرب

حرب و ضرب اور سپہ گری کے فنون میں حیرت انگیز دستگاہ حاصل کر لی تھی۔ مثلاً گھوڑا دوڑانے، تلوار، خنجر، نیزہ، تیر، بندوق اور توپ چلانے میں کوئی ان کی ہمتائی کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ قلعوں کو توڑنے اور دشمن کو شکست دینے کی تدبیروں میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی[3]

مولوی محمد علی رام پوری کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ تیر اندازی کا ایک ماہر استاد اپنے ایک مشاق شاگرد کے ساتھ تکیہ شریف میں آیا۔ سید صاحب نے اسے سئی ندی کے پار ایک بڑا درخت دکھا کر فرمایا کہ اس پر تیر پھینکیے۔ اس نے ہر چند کوشش کی لیکن فاصلہ زیادہ تھا، اس لیے کوئی تیر درخت تک نہ پہنچ سکا۔ پھر سید صاحب نے خود کمان اٹھائی اور اس زور سے تیر پھینکا کہ وہ درخت سے بھی آگے جا کر گرا۔ استاد نے بے اختیار ہو کر آپ کے ہاتھ چوم لیے۔

شیخ ولی محمد پھلتی اور محسن خاں بریلوی کہتے ہیں فتیلہ دار بندوق کے چلانے کا ایسا ڈھنگ نکالا تھا کہ ایک مرتبہ فتیلہ رکھنے کے بعد دوبارہ اس کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ میدان جنگ میں دو مشاق آدمی آپ کے دائیں بائیں صرف بندوقیں بھرتے رہتے تھے اور آپ دائیں جانب کی بندوق دائیں کندھے پر اور بائیں جانب کی بائیں کندھے پر رکھ کر اس تیزی سے چلاتے رہتے تھے کہ کلدار توپ کا سا سماں پیدا ہو جاتا تھا۔

---

[1] وصایا [illegible]

نواب وزیر الدولہ فرماتے ہیں کہ گھوڑے کی سواری میں عجیب کمال بہم پہنچایا تھا۔ کیسا ہی سرکش گھوڑا ہوتا، آپ اس پر سوار ہوتے ہی قابو کر لیتے۔

مقصود و نصب العین اس سلسلے میں تمام محنتیں اور مشقتیں اس لیے نہیں اٹھائی تھیں کہ دنیا ان کے کمالات کا اعتراف کرے اور اس طرح انھیں شہرت عام حاصل ہو جائے۔ حاشا و کلا۔ ہر فن صرف اس غرض سے سیکھا کہ جہاد فی سبیل اللہ میں کام دے اور خدا کے دین کی خدمت کا حق بوجہ احسن ادا ہو سکے۔ اسی غرض سے ورزشیں کیں، اسی غرض سے فنون حرب میں درجۂ اختصاص بہم پہنچایا۔ خالصۃً للہ کے دعوے بہت سُنے ہیں لیکن اس کا مکمل عملی نقشہ صرف سید احمد بریلوی کے ہاں ملتا ہے۔ چنانچہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے سب کام محض للہ اور لوجہ اللہ کیے۔ رضائے حق کے سوا کبھی کوئی شے کسی عمل کی محرک نہ ہوئی:

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب ٭ کہ حیف باشد ازو غیر ازیں تمنائے

خدمتِ خلق خدمت خلق کا جذبہ عہد طفلی ہی میں اس درجہ بے پناہ تھا کہ محلّے والوں، خصوصاً بیوہ اور بے وسیلہ عورتوں کو بازار سے سودا سلف لا دیتے، پانی بھر لاتے۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لا دیتے۔ وہ لوگ خدمت لینے میں تامل کرتے اس لیے کہ سید صاحب بزرگ خاندان کے فرد تھے جس کے ہر شخص کی خدمت بجا لانے کو سب لوگ اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ اہل خاندان سید صاحب کی ان حرکتوں کو بہت نازیبا سمجھتے لیکن آپ نے دنیا اہل خاندان کے تصورات کو کبھی مستحق اعتنا نہ سمجھا۔ نواب امیر خاں کے لشکر میں تھے تو جب اپنے کپڑے دھونے کے لیے اٹھتے ساتھیوں کے کپڑے بھی ساتھ لے جاتے اور دھو کر لاتے۔ کسی جائز کام کو اپنے ہاتھ کرنے میں عار نہیں سمجھتے تھے بلکہ دلی شوق سے کرتے تھے۔ سرحد پہنچنے کے بعد اگرچہ امام جہاد بن گئے تھے، لیکن اپنے باورچی خانے کے لیے جب ایندھن کی ضرورت پڑتی تو جماعت خاص کے غازیوں کے ساتھ خود جنگل میں جاتے اور سب سے زیادہ لکڑیاں کاٹتے۔

اپنے ہاتھ سے کام قیام امب میں ایک مرتبہ رات کے وقت مہمان آ گئے۔ ان کے لیے کھانا تیار کرنے کا حکم دیا۔ اتفاق سے باورچی خانے میں پانی ختم ہو چکا تھا۔ داروغہ نے پانی کے لیے کہا لیکن جن غازیوں نے یہ صدا سُنی، ان سب نے سمجھ لیا کہ کوئی دوسرا لے آیا ہوگا۔ سید صاحب کو یہ بات معلوم ہوئی تو مشکیزہ اٹھا کر خود دریا پر پہنچ گئے اور پانی بھر لائے۔ یہ دیکھ کر سارے غازی پیچھے دوڑے۔ فتح ہنڈ کے بعد دیکھا کہ مسجد میں قیام کی گنجائش نہیں، پاس ہاتھی بندھا کرتا تھا، اس کی وجہ سے جگہ صاف نہیں رہی تھی۔ صبح اُٹھے تو خود جگہ صاف کی۔

امب کے ایک بُرج کا کچھ حصہ بارش میں گر گیا اور دو آدمی نیچے دب گئے۔ سید صاحب فوراً کدال لے کر ملبہ ہٹانے میں لگ گئے۔ باقی برج بھی گرنے والا تھا، اس لیے لوگوں نے آپ کو روکنا چاہا لیکن آپ کام میں لگے رہے اور ایک آدمی کو زندہ نکال لیا۔ پھر فرمایا: بھائیو! اگر میں تمھارے منع کرنے سے رک جاتا تو ایک مسلمان کو موت کے پنجے سے بچا لینے کا ثواب کیونکر ملتا۔

فرمایا کرتے تھے :

> جو بھائی خدا کے واسطے نیت خالص سے چکی پیستے ہیں یا گھاس چھیلتے ہیں یا گھوڑا مَلتے ہیں یا کپڑا سیتے ہیں یا دھوتے ہیں، تو یہ سب کام داخل عبادت ہیں اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام ؓ سے ثابت ہیں۔

ایک مرتبہ غلّہ باہر پڑا تھا کہ بارش آگئی۔ سید صاحب نے خود تمام غازیوں کے ساتھ ہو کر غلّہ ڈھویا۔ ایک دفعہ باہر نکلے تو دیکھا کہ ایک غازی چکّی پیس رہا ہے۔ بے تکلف سامنے بیٹھ گئے اور دیر تک چکی پیستے رہے۔ پنجتار میں مسجد کی توسیع مطلوب تھی فرمایا ہر غازی پانچ پانچ پتھر باہر سے اٹھا کر لائے۔ خود سید صاحب نے ایک بھاری پتھر اُٹھایا۔ غازیوں نے عرض کیا کہ آپ رہنے دیں، ہم اٹھا لیتے ہیں، فرمایا: مجھے کارِ خیر سے کیوں روکتے ہو؟

اسی شان تربیت نے غازیوں میں اپنے ہاتھ سے کام کرنے کا عجیب جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ مثالیں ان کے حالات میں پیش ہوں گی :

اتباعِ سُنّت نواب وزیرالدولہ لکھتے ہیں کہ خدائے بزرگ و برتر نے سید صاحب کو سنّت کی پیروی اور بدعت سے پرہیز میں نہایت بلند درجہ عطا کیا تھا۔ اگر کہا جائے کہ آپ کا وجود صرف اتباعِ سنّت کی نفاستوں کا مجموعہ تھا تو یہ مبالغہ نہ ہوگا[۱]۔ آپ خود فرمایا کرتے تھے کہ خدا نے مجھے جو ظاہری اور باطنی فضائل و مکارم عطا فرمائے، وہ سب شریعت کی پابندی اور سنّت کے اقتدا کی برکت سے حاصل ہوئے :

مولوی ازخود نہ شد مولائے روم تا غلامِ شمسِ تبریزی نہ شُد

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ بنگال سے منتہائے گجرات تک اور اقصائے دکن سے منتہائے سرحد تک، پھر افغانستان اور دوسرے علاقوں میں جہاں جہاں سید صاحب یا ان کے خلفا کے قدم پہنچے، بدعتیں مٹ گئیں اور سنّت کی پیروی کرنے والے حضرات جا بجا پیدا ہو گئے۔

مساوات سید صاحب زندگی بھر مساوات پر عمل پیرا رہے۔ لشکر میں تقسیم غلّہ کے[۲] لیے ایک پیمانہ مقرر کر لیا تھا۔ جتنا غازی بھائیوں کو ملتا، اتنا ہی آپ لیتے، البتہ مہمانوں کی خاطر داری کے سلسلے میں آپ کو الگ کھانا پکوانا پڑتا اور بعض اوقات ضرورۃً تکلف بھی کرتے تاہم اس کا بوجھ کبھی بیت المال پر نہ ڈالا۔ اہل سرحد میں سے جو لوگ ملنے کے لیے آتے، وہ اکثر تحائف لے کر آتے۔ یہ تحائف الگ رہتے اور انھیں لوگوں کی مہمانداری میں صرف ہوتے۔ مہمان اگر کھانا پکنے سے پیشتر آ جاتے تو ان کے لیے رسد لے لی جاتی۔ اگر کھانا پکنے کے بعد اور کھانے سے پہلے آتے تو سید صاحب اپنی جماعت میں سے کچھ کھانا منگا لیتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔ کبھی پورا کھانا مہمانوں کو دے دیتے اور خود اپنی جماعت والوں کے ساتھ بیٹھ کر جو کچھ پکا ہوتا، تناول فرما لیتے۔

---

[۱] وصایا حصہ اول صفحہ ۱۸۔ [۲] وصایا حصہ اول صفحہ ۳۱

ہجرت ثانیہ کے سفر کے وقت سید صاحب کی اہلیہ امیدواری سے تھیں اور وضع کا وقت قریب تھا، لہذا آپ نے ان کے لیے پالکی کا انتظام کر دیا۔ ارباب بہرام خاں کی مستورات کے لیے حسب دستور یابو مہیا کیے گئے۔ انھوں نے سوار ہونے سے انکار کر دیا۔ سید صاحب دو تین میل جا چکے تھے۔ یہ خبر ملی تو ارباب کو پیغام بھیجا :

> مَیں آپ کو مومن سمجھتا ہوں اور مومن کی خوشامد و خاطرداری اپنے لیے ضروری نہیں سمجھتا، اس لیے کہ یقین ہے کوئی مومن جہاد فی سبیل اللہ کی عبادت عظمیٰ کے عشق و محبت کے باعث میرا ساتھ نہیں چھوڑے گا ...... میں اپنی بیوی کو دوسری عورتوں پر ترجیح نہیں دیتا۔ لیکن اب وہ امیدواری سے ہے اور خاص اس حالت میں اسے رعایت کا حق پہنچتا ہے۔ اگر یہ عذر نہ ہوتا تو وہ بھی عام مستورات کی طرح یابو پر سوار ہوتی۔

کئی مرتبہ ایسی حالت پیش آئی کہ آپ کے لیے کھانا تیار ہو گیا اور غازیوں کے لیے غلہ نہ مل سکا۔ آپ نے کھانے سے انکار کر دیا اور جب تک سب غازیوں کے لیے وہی کچھ مہیا نہ ہوا جو آپ کے لیے تھا، نہ کھایا۔

عبادت و ریاضت نواب وزیر الدولہ لکھتے ہیں: عبادت و ریاضت کا ایسا ذوق تھا کہ سالہا سال تک عشاء و فجر کی نمازیں ایک وضو سے ادا فرماتے رہے[1]۔ یہاں تک کہ عبادت کرتے کرتے صبح کی نماز کا وقت ہو جاتا۔ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں: مدت تک یہ دستور رہا کہ رات کا آخری نصف حصہ صرف دو نفلوں میں بسر ہو جاتا[2]۔ ارادت مندوں کو بار بار تاکید کرتے کہ رات کے قیام کا خاص خیال رکھو۔ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے خدا کے فضل و کرم سے جو برکات حاصل ہوئیں، وہ شب بیداری اور وقت سحر کے عجز و نیاز کا ثمرہ ہیں۔

رضا بہ قضا رضا بہ قضا کا مطلب یہ ہے کہ جو حالت پیش آ جائے، اسے خوشدلی سے قبول کر لینا اور دل میں خفیف سا رنج بھی پیدا نہ ہونے دینا۔ یہ مقام صرف کامل مومنوں کو حاصل ہوتا ہے۔ قرآن میں اسی مقام کو "رَضُوا عَنْهُ" سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی صحابہ کرامؓ خدائے پاک سے راضی رہے۔ کوئی سختی، کوئی تنگی اور کوئی مصیبت ان کی رضا و خوشنودی کو مکدر نہ کر سکی۔ نواب وزیر الدولہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ سید صاحب کو طرح طرح کے رنج پہنچے، قسم قسم کی تکلیفیں اور سختیاں پیش آئیں لیکن ان کی زبان ہمیشہ خدا کی حمد میں سرگرم رہی اور لبوں پر پروردگار کے شکر کے سوا کبھی کوئی کلمہ نہ آیا۔ اس کی مثالیں کتاب میں جا بجا پیش ہو چکی ہیں۔ ہر بڑے حادثے اور ہر شدید آفت کے بعد برہنہ سر ہو کر دعا کرتے اور فرماتے کہ بھائیو! جو مصیبت ہم پر آئی یہ ہماری کسی غلطی اور خطا کا نتیجہ ہو گی :

ور کوے مراد خود پسنداں دگر اند — در وادیِ عشق مستمنداں دگر اند
آناں کہ بجز رضاے جاناں طلبند — آناں دگر اند و دردمنداں دگر اند

---

[1] وصایا حصہ اول ۲۵۶ [2] وصایا حصہ اول ۲۹۵

عفو و درگزر عفو و درگزر کی بے شمار مثالیں عرض کی جا چکی ہیں۔ مثلاً جن لوگوں نے جنگ شیدو کے موقع پر زہر دیا تھا، انھیں بھی نہ محض معاف کیا بلکہ ارادت مندوں کے غیظ سے دو مرتبہ بچایا۔ جنگ اکوڑہ سے پیشتر ایک جاسوس پکڑا آیا تھا، اسے معاف کر کے لشکر سے باہر نکال دیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ میری فطرت ابتدا سے یہی ہے کہ دوسروں کی بدی کے عوض بھی ان کے ساتھ نیک سلوک کروں۔

حلم و حیا و مروت حلم کا ایک نہایت سبق آموز واقعہ اس زمانے کا ہے جب آپ نواب امیر خاں کے لشکر میں تھے۔ یعنی ایک پٹھان نے آپ کو غلط فہمی میں چور سمجھ کر پکڑ لیا اور آپ اسے نرمی سے سمجھاتے رہے کہ بھائی تجھے دھوکا ہوا ہے۔ پٹھان کا جوش بڑھتا گیا۔ آپ کے رفیقوں کو خبر ملی تو وہ تلواریں اور بندوقیں لے کر دوڑے ہوئے آئے۔ یہ صورت دیکھ کر پٹھان کا رنگ فق ہو گیا۔ آپ نے فرمایا، فصل میں چھپ جاؤ اور ساتھیوں کو واپس لے گئے۔ ایک عجیب واقعہ سدو خاں کا ہے۔ یہ شخص پہلے درانیوں کے پاس تھا، پھر سید صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ جب پائندہ خاں تنولی سے جنگ ہوئی تو سید صاحب کا دیا ہوا سامان لے کر تنولیوں سے جا ملا۔ وہاں بدسلوکی ہوئی تو بے تکلف سید صاحب کے پاس لوٹ آیا۔ ایک موقع پر اس نے مال غنیمت کی کچھ چیزیں اپنے پاس رکھ لیں۔ غازیوں نے ان چیزوں کا مطالبہ کیا تو اس نے سید صاحب کی شان میں گستاخی کا کلمہ کہہ دیا۔ آپ تک یہ بات پہنچی تو اسے خلوت میں بلایا اور فرمایا کہ میں تمھیں اپنے سے زیادہ بہادر نہیں سمجھتا لیکن لشکر اسلام میں [illegible] ایسی بات زبان پر لانی مناسب نہ تھی۔ پائندہ خاں کے پاس سے آیا تو بولا کہ اس نے میرا سارا سامان چھین لیا، اب آپ کچھ دلائیں۔ سید صاحب نے پوچھا تم اس کے پاس کیوں گئے تھے؟ بولا: تقدیر لے گئی۔ آپ نے حکم دے دیا کہ اسے سارا سامان دلا دیا جائے۔ پھر فرمایا: میری یہ [illegible] غایت شرم سے اس کے چہرے پر نظر نہیں ڈالتا، اس کی بے باکی دیکھو کر سب کچھ کر چکنے کے باوجود [illegible] پیسے مانگتے ہوئے بالکل تامل نہیں ہوا۔

[illegible] کا واقعہ کتاب میں تفصیلاً مرقوم ہے۔ حلم و مروت کی ایسی مثال آسانی سے نہیں مل سکتی۔

عفت [illegible] زین العابدین فرماتے ہیں کہ ہزاروں عورتوں نے بیعت کی، ان میں سے پردہ نشین بھی تھیں اور بعض بے پردہ [illegible]:

[illegible] جناب گاہے بروئے ہیچ کس از زناں نیفتاد۔ لیکن آنجناب کی نظر کبھی کسی کے چہرے پر نہ پڑی۔

[illegible] عصمت کی آغوش میں غازیوں نے تربیت پائی تھی۔ ایک مرتبہ سرحد کی مستورات نے کہا سید صاحب کے [illegible] یا تو احساسات جنسی سے فطرۃً محروم ہیں یا پھر اولیاء اللہ ہیں، اس لیے کہ غلہ پسوانے کی غرض سے [illegible] لیکن کبھی کسی نے نگاہ اٹھا کر کسی عورت کو نہیں دیکھا۔

شجاعت سید صاحب شجاعت میں واقعی بے مثال تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ میرے لیے جان دے دینا ایسا ہی ہے جیسا تنکا توڑ کر پھینک دینا۔ نواب وزیر الدولہ فرماتے ہیں کہ گھمسان کے رن میں جب گولوں اور گولیوں کا مینہ برسا کرتا تھا تو آپ اپنے غازیوں کو انتہائی اطمینان کے ساتھ مفید نصیحتیں فرمایا کرتے تھے۔ لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی اور چہرے پر شادمانی کی بہار جلوہ گر ہوتی۔ جن معرکوں میں شیروں کا پتا پانی پانی ہو جاتا، ان میں آپ کی پیشانی یا آپ کے چہرے پر کبھی خفیف سا تغیر بھی رونما نہ ہوا[1]۔

فراست آپ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے خدا نے تین چیزوں کی پہچان عطا کی ہے: ایک گھوڑا، دوسرے تلوار، تیسرے آدمی۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں چہرہ دیکھ کر پہچان لیتا ہوں کہ یہ مومن ہے بلکہ جوتا بھی دیکھ لوں تو بتا دوں کہ یہ مومن کا جوتا ہے۔ مولوی امام الدین بنگالی نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ کیا کبھی خطا بھی ہو جاتی ہے؟ فرمایا: ہاں کبھی خطا بھی ہو جاتی ہے۔ یہ وحی کا معاملہ نہیں کہ خطا کا امکان بالکلیہ زائل ہو جائے۔ پھر خود ہی اعتراف کیا کہ بعض لوگوں کے متعلق ایمان کا گمان ہوا لیکن وہ منافق نکلے۔ ایمان و نفاق بدلتے بھی رہتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ جب میں نے ان کو مومن سمجھا تو وہ مومن تھے، بعد ازاں ان کے دلوں میں نفاق پیدا ہو گیا۔

سخاوت سخاوت کے باب میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ خدا نے سید صاحب کو ہر دور میں دنیوی مال و ثروت کے وسیع ذخائر عطا کیے لیکن آپ نے کبھی کوئی چیز اپنے پاس نہ رکھی۔ کسی دنیوی چیز سے دل نہ لگایا جو کچھ ہاتھ آیا ضرورت مند بھائیوں کی ضرورتیں پوری کرنے میں خرچ کر دیا۔ دنیا سے اٹھے تو کوئی شے ایسی نہ تھی جسے ان کا ترکہ کہا جا سکتا۔ جتنی جائداد انھیں میراث میں ملی تھی وہ بھی اپنے پاس نہ رکھی بلکہ چھوڑ کر راہ ہجرت میں قدم اٹھا لیا۔ اپنے عزیزوں کے ساتھ بھی حسن سلوک میں تامل نہ کیا لیکن فرمایا کرتے تھے کہ یہ حسن سلوک صرف معاش کے معاملات میں جائز ہے۔ باقی رہے معاملات معاد و دین تو ان میں کسی کے ساتھ نرمی، ملائمت یا رعایت نہیں برتی جا سکتی۔

صبر و استقامت صبر و استقامت کا جو نمونہ سید صاحب نے پیش کیا، اس کی مثال قرنوں میں بھی ملنی مشکل ہے۔ صورت حال یہ نہ تھی کہ تلخ و ناگوار حالات پیش آ گئے تھے اور انھیں جھیل لیا۔ صورت یہ تھی کہ بظاہر نہایت خوشگوار حالات موجود تھے۔ اکرام و اعزاز کی زندگی کے سیکڑوں وسائل مہیا تھے۔ لیکن انھیں دین حق اور رضائے باری تعالیٰ کی خاطر چھوڑ کر تکالیف و شدائد کی راہ اختیار کی۔ جن لوگوں کو ان کی ذات گرامی سے معاً بہترین دنیوی فوائد حاصل ہونے کے امکانات تھے وہ بھی دشمن بن گئے اور جتنی تکلیفیں ان کے بس میں تھیں، بے دریغ پہنچائیں، لیکن آپ نے ان کی خیر خواہی نہ چھوڑی۔ دین کی سربلندی کے خواہاں تھے،

---

[1] وصایا حصہ دوم صفحہ

ذاتی غرض کوئی نہ تھی۔ بایں ہمہ جن مصیبتوں سے سابقہ پڑا انھیں حیرت انگیز اور بے مثال صبر و استقامت سے یوں برداشت کر لیا، گویا اس راہ کے کانٹے بھی ان کے نزدیک پھولوں سے کم نہ تھے، سچ ہے:

مخمور مکافات بر خلد و سقر آویخت
مشتاق عطا شعلہ ز گل باز نہ دانست

توکل سید صاحب کا سارا کاروبار ابتدا ہی سے توکل پر تھا۔ ارادت مندوں کی ایک بڑی جماعت اسی وقت سے ساتھ ہو گئی تھی، جب آپ کے وسائل معاش لاشی محض تھے، لیکن نہ کبھی خیال آیا کہ ان کے لیے روٹی کہاں سے میسر آئے گی اور نہ ارادت مندوں کے لیے معاش کی قلت کبھی عنان گیر شوق بن سکی۔ آپ کے انتظامات ابتدا سے مولانا محمد یوسف پھلتی کے ہاتھ میں تھے وہ کبھی پریشان ہو کر بے سامانی کا ذکر چھیڑتے تو آپ فرماتے: چپ رہیے اور دیکھیے خدا کا مقرر کیا ہوا رزق کیوں کر پہنچتا ہے چنانچہ رزق برابر پہنچتا رہا اگرچہ غازیوں کی تعداد خاصی بڑی بھی ہو گئی اور نہ پہنچا تو سید صاحب سمیت سب نے ذکر الٰہی سے اطمینان قلب کا انتظام کر لیا۔

آپ کے لشکر میں پشاور کا ایک شخص آ گیا تھا جس کا نام عبدالغفار تھا۔ اسے جعلی سکے بنانے میں کمال حاصل تھا۔ لوگ اس کے روپے کو غفار خانی کہا کرتے تھے۔ اس کی خواہش تھی کہ سید صاحب کو بے شمار روپے بنا دے، لیکن آپ نے فرمایا کہ ہمارے ہاں روپے نہ بنائیے۔ سکھوں کے علاقے میں جا کر جو جی میں آئے کیجیے اور اگر کچھ رقم ہاتھ آئے تو اس سے سامان جنگ خرید کر بھیج دیجیے۔ ہمارے ساتھ رہنا منظور ہے تو قلب سازی کا کام چھوڑ دیجیے۔

جب آپ نواب امیر خاں کے لشکر میں تھے تو ایک کیمیاگر آپ کا بہت معتقد ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ اپنے گھر میں دعوت کی اور اسی وقت سونا بنا کر دکھایا۔ چونکہ اس زمانے سے جہاد فی سبیل اللہ کے انتظامات پیش نظر تھے اس لیے کیمیاگر چاہتا تھا کہ آپ نسخہ بھی لے لیں اور ترکیب بھی سیکھ لیں۔ آپ نے پوچھا یہ سونا آگ کی تپش سے متغیر بھی ہو سکتا ہے؟ اس نے بتایا کہ ہزار مرتبہ بھی آگ میں ڈالیے اس کی صورت نہیں بدلے گی اور قلب ظاہر نہ ہو گا۔ یہ سُن کر فرمایا: اگر آپ کا دعویٰ سچا ہے تو یہ آپ کے لیے حلال ہے، مگر میرے لیے سخت نقصان کا باعث ہو گا اس لیے کہ میرے دل کو مالک حقیقی کے فضل و رحمت سے ہٹا کر اس شے پر لگا دے گا۔ میں اس کا روادار نہیں ہو سکتا۔

غازیوں پر شفقت غازیوں پر شفقت کا یہ حال تھا کہ ہر غازی آپ کو ماں اور باپ دونوں سے بڑھ کر سمجھتا تھا اور آپ انھیں بچوں سے بڑھ کر پیار کرتے تھے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے جو بھائی جہاد فی سبیل اللہ کے کار خیر میں شرکت کے لیے آئے" ان کی قدر و قیمت ہمیں پہچانتے ہیں۔ عبدالصمد خاں خیبری کا بیان

ہے کہ میں نے سردارانِ پشاور کی بھی نوکری کی، سکھوں کے پاس بھی ملازم رہا، لیکن جو قدر دانی سید صاحب کے پاس دیکھی کہیں نہ دیکھی اور یقین ہے کہ ایسی قدر دانی روئے زمین پر کہیں نہ ہوگی۔ سید صاحب کی زندگی میں کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی غازی نے آپ کی کسی بات کو دلی محبت کے خلاف سمجھا ہو یا آپ کی شفقت کسی غازی پر کم ہوئی ہو۔ بالاکوٹ کے میدان میں بہت سے غازی صرف اس لیے شہید ہوئے کہ ان کے کانوں میں آواز پڑ گئی تھی، سید صاحب نہیں ملتے۔ یہ سنتے ہی وہ گولیوں کی بارش سے بے پروا ہو کر میدان میں ایلنا کا آپ کو تلاش کرنے لگے اور جا بجا شہید ہو گئے۔ تاریخ میں بڑے بڑے سلطانوں کے ساتھ بھی ذاتی محبت کی ایسی جھلک شاید ہی مل سکے، جن سے وابستگانِ دامن کو ہر قسم کے منافع کی امید تھی۔ سید صاحب کے ساتھ غازیوں کا صرف دینی رشتہ تھا، لیکن آپ کی محبت نے سب کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔

عام مسلمانوں کو بھی تکلیفوں سے بچانے کا بڑا ہی خیال رکھتے تھے۔ مثلاً اگر مولانا شاہ اسماعیل کی تجویز کے مطابق بالاکوٹ سے آگے بڑھ کر کشمیر میں داخل ہو جاتے تو کامیابی کے روشن مواقع نظر آ رہے تھے، لیکن جب پکھلی کے اُمرا سے سُنا کہ اس حالت میں سکھ مسلمانوں کو گزند پہنچائیں گے اور ان کے ساتھ لڑے بغیر قدم آگے نہیں بڑھانا چاہیے، تو لڑائی کے لیے تیار ہو گئے، یہی دیکھ کر مولانا شاہ اسماعیل نے کہا کہ آپ کے دل میں رسول پاکؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی میں غربا کے لیے رحم بہت زیادہ ہے، ورنہ فقہ کا مسئلہ ہے کہ اگر کافر مسلمانوں کو گرفتار کرکے سپر بنا لیں تو اس حالت میں بھی ان کے خلاف قتال جاری رکھنا چاہیے۔

جانوروں پر رحم جانوروں پر بھی بے حد رحیم و شفیق تھے۔ سرحد ہی کا واقعہ ہے کہ شاہ زمان درانی کے وکیل جمال الدین نے ایک مرتبہ ایک کتے پر تیر چلایا۔ وہ بیچارا چیختا چلاتا ہُوا بھاگا۔ سید صاحب بہت خفا ہُوئے۔ فرمایا کتا دیوانہ نہیں تھا کہ اسے مارنا ضروری ہوتا۔ پھر اس پر تیر کیوں چلایا؟ آپ خدا سے نہ ڈرے کہ اُس کی مخلوق کو ناحق اذیت پہنچائی؟① قاضی مدنی نے یہ سُنا تو کتے کے پیچھے بھاگے اور اس کے سر سے تیر نکال کر دم لیا۔

راج دواری میں شہد کی مکھیاں بہت ہوتی ہیں اور لوگ گھروں میں پالتے ہیں۔ چھتہ شہد سے بھر جاتا ہے تو شہد نکال کر مکھیوں کو دوسری جگہ بٹھا دیتے ہیں۔ سید صاحب نے ایک دن شہد کی ایک مکھی کو تنہا اُڑتے دیکھا۔ فرمایا اس بیچاری کے لیے تھوڑے سے شہد کا انتظام کر دو تاکہ بھوکی نہ رہے۔

دُعائے ہدایت اگرچہ سکھوں کے ساتھ لڑائیاں جاری تھیں، لیکن ان کے لیے بھی دل میں شفقت کا دریا موجزن تھا۔ راویوں نے لکھا ہے کہ ہر نماز فرض کے بعد دعا فرمایا کرتے تھے: خدایا ان لوگوں کو ہدایت [illegible] ایمان و اسلام کی دولت دے کہ ہمارے بھائی بنا دے۔②

[illegible] صفحہ ۳۰ [illegible]

یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کی سیاست ایمانی اور مربیانہ تھی، سلطانی نہ تھی۔ یعنی ہر معاملے میں صرف اصلاح منظور تھی اور افراد و جماعات کی بہتری اور بھلائی کے سوا کچھ مدنظر نہ تھا۔

بدن بہت پاکیزہ تھا۔ نواب وزیرالدولہ فرماتے ہیں کہ اگر آپ میلا لباس بھی پہنے ہوئے ہوتے تو بدن سے ایسی خوشبو آتی کہ عطر اس کے سامنے ہیچ معلوم ہوتے[1]

صحبت کی تاثیر کئی واقعات کتاب میں لکھے جا چکے ہیں، جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نیک بخت اصحاب ایک ہی نظر میں باطل سے تائب ہو کر حق کی طرف آئے اور کم سے کم وقت میں درجات عالیہ پر پہنچ گئے۔ روایتوں میں آیا ہے کہ لوگ آپ کے پیچھے نماز پڑھتے تو محبت و رغبت کے جذبات دلوں پر غالب رہتے اور جب شاہ اسماعیل کے پیچھے نماز پڑھتے تو خوف و خشیت الٰہی کا غلبہ ہوتا۔

طریق نصیحت سید صاحب کا طریق نصیحت نہایت دلکش اور مربیانہ تھا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بالتعیین کسی کو مخاطب نہ فرماتے تھے بلکہ مجموعی انداز میں وعظ فرماتے۔ سمجھنے والا خود بخود سمجھ جاتا۔ اسی طرح کوئی کام ہوتا تو جب بھی کسی کو تعین کے ساتھ بہت کم فرماتے۔ کہہ دیتے کہ بھائیو! یہ کام ہے۔ مقصود یہ تھا کہ ہر ایک سبقت بالخیرات کا ثواب حاصل کرے اور سب کے دلوں میں زیادہ سے زیادہ نیکی کا جذبہ تازہ رہے۔ کالے خاں کا واقعہ لکھ چکا ہوں۔ وہ ٹھوڑی منڈاتے تھے۔ سید صاحب نے انھیں کبھی منع نہ کیا۔ ایک روز خاں صاحب ٹھوڑی منڈا کر بیٹھے ہی تھے کہ سید صاحب پہنچ گئے۔ ٹھوڑی کو دست مبارک سے پکڑ کر فرمایا: خان بھائی! آپ کی ٹھوڑی کیا چکنی چکنی ہے۔ بس اس کے بعد کالے خاں نے ٹھوڑی نہ منڈائی۔

طریق خطاب طریق خطاب نہایت دل آویز تھا۔ غازیوں کو ہمیشہ بھائی کہہ کر پکارتے۔ اُمرا اور اکابر ملنے کے لیے آتے تو کسی کو شیخ بھائی، کسی کو خان بھائی، کسی کو سید بھائی کہتے۔ جس زمانے میں پیر خاں مورانوی کھیل میں تھے، منشی محمدی انصاری نے سید صاحب کی طرف سے انھیں خط لکھا تو اس کا آغاز یوں تھا:

"از امیرالمومنین بمطالعہ اخلاص نشان پیر خان" دیکھتے ہی سید صاحب پریشان ہو گئے۔ فرمایا: انصاری بھائی! "اخلاص نشان" تو بادشاہ لوگ نوکروں کو لکھا کرتے ہیں، مجھے اس سے سخت کراہت ہے۔ منشی صاحب نے عرض کیا کہ اخلاص نشان ہونا سعادت کا نشان ہے، لیکن میں آیندہ براہ راخلاص نشان" لکھا کروں گا۔

پاس شریعت کا ایک عجیب واقعہ پائندہ خاں تنولی کا بھائی مدد خاں سید صاحب کا بڑا معتقد تھا۔ چونکہ اسے جدی املاک سے نکال دیا گیا تھا، اس لیے سید صاحب ہی کے پاس رہنے لگا۔ خان تنول سے مصالحت کی گفتگو ہوئی تو اس میں یہ بھی طے ہو گیا کہ مدد خاں کی جایداد اسے مل جائے۔ لیکن مدد خاں بھائی کے پاس جانے سے کتراتا تھا۔ کہتا تھا کہ وہ مجھے قتل کرا دے گا۔ اس بنا پر ایک روز مدد خاں نے تجویز پیش کی پائندہ خاں

---

[1] [illegible] ۱۸۲

کے بیٹے جہاں داد کو بہ طور یرغمال بلا لیجیے، پایندہ خاں مجھے مار دے تو آپ جہاں داد کو مروا ڈالیں۔ سید صاحب نے یہ سُنا تو مسکرا کر فرمایا:

ایں امر خلاف شرع از من بوجود آمدنی	مجھ سے یہ خلاف شرع بات کبھی نہ ہوگی
نیست کہ پایندہ خاں ترا بکشد و من	کہ اگر پایندہ خاں تجھے مار ڈالے تو میں
بقصاص تو پسر او را کہ بے گناہ محض است	بدلے میں اس کے بیٹے کو، جس غریب کا کوئی گناہ
بکشم۔ اگر قدرت یابم قاتل ترا البتہ خواہم	نہیں، قتل کر دوں۔ ہاں اگر مجھے قابو حاصل
کُشت۔	ہوگا تو تمھارے قاتل سے ضرور قصاص لوں گا۔

اعتراف خطا انسان کو جب قبول عام کا منصب حاصل ہو جائے تو اپنی غلطیوں اور خطاؤں کے اعتراف میں اکثر بخل سے کام لیتا ہے۔ سید صاحب اس خصوصیت میں بھی سب سے الگ تھے۔ میرے علم کے مطابق ان سے دو مرتبہ خطائیں سرزد ہوئیں۔ ایک مرتبہ مکہ میں بچی کو دودھ پلانے پر اصرار کے ضمن میں اپنے ایک ارادت مند کے بچے کا پورا خیال نہ رکھا۔ جب اس خطا کا احساس ہُوا تو نہ محض اسی شخص سے معافی مانگی بلکہ اپنے ارادت مندوں کو جمع کر کے سب کے سامنے غلطی کا اعتراف کیا اور دوبارہ عفو کے خواستگار ہُوئے۔ یہ واقعہ میں بہ سلسلہ حج لکھ چکا ہوں۔ دوسری مرتبہ جنگ مایار سے صرف ایک دن پیشتر تورو میں ایک ارادت مند کو بے ساختہ "مردود" کہہ دیا۔ جب آپ کو یہ واقعہ یاد دلایا گیا تو سب کے سامنے اس شخص سے معافی طلب کی۔ حق پرستی اور حق شناسی کی ایسی مثالیں ہمارے زمانے ہی میں نہیں بلکہ اکثر ادوار و اقطار میں بہت ہی کم پائی گئی ہیں۔

کارگیری اور احترام سید صاحب بزرگی کے باوجود چھوٹوں بڑوں کا بہت احترام کرتے تھے، میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ ہر شخص کو ہمیشہ عزت کے خطاب سے مخاطب فرماتے تھے اور ہر آدمی سے اس کی طبیعت و صلاحیت کے مطابق دینی کام لیتے تھے۔ ان کے پاس ایسے لوگ بھی پہنچتے رہے جن کی طبیعت موزوں تھی۔ ان سے فرمایا کہ اہم دینی مسائل کو سادہ الفاظ میں نظم کر دو تاکہ لوگ انھیں یاد کر لیں۔ مثال کے طور پر مولوی محمد قاسم پانی پتی کے والد غلام محمد بہت کبیر السن تھے۔ اپنے بیٹے کو واپس لے جانے کے لیے سرحد پہنچے تھے۔ سید صاحب کا کارخانہ دیکھ کر خود وہیں مقیم ہو گئے۔ آپ اس کبیر السن کا اتنا احترام کرتے تھے کہ شاید ان کے بچوں نے بھی کبھی نہیں کیا ہوگا۔ وہ جہاد میں شریک نہ ہو سکتے تھے، اس لیے قرآن پڑھانے پر لگا دیا۔

مُہر اور تاکیدی علامات پہلے سید صاحب کے پاس مُہر نہ تھی۔ جب مختلف اکابر کے نام خط بھیجے

تو چاندی کی ایک مُہر بنوائی جس پر "اسمہ احمد" کندہ کرایا، ارادت مندوں کے لیے خاص نشان تجویز کیے تھے۔ مثلاً جب کسی کو خاص تاکید کرنی مقصود ہوتی تو خط پر اپنے دستِ مبارک سے "کلمۃ اللہ کافی" تحریر فرما دیتے تھے۔

عادات | جب آپ کے لیے کوئی پر تکلف کھانا پکا کر لاتا تو عادت تھی کہ یا تو سب ارادت مندوں کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے یا سب میں تھوڑا تھوڑا تقسیم کر دیتے۔ اسی طرح عادت تھی کہ عشا کی نماز کے بعد لیٹ جاتے تو فرماتے: بھائیو ہم سے کچھ پوچھو۔ جو کچھ پوچھا جاتا، بتا دیتے۔ بعض سوالات کے متعلق فرما دیتے کہ یہ کل پوچھنا۔ بعض اوقات خود ہی باتیں شروع کر دیتے۔ اکثر غازی آپ کے پلنگ کے ارد گرد زمین پر لیٹ جاتے اور باتیں سنتے سنتے سو جاتے۔

مرغوب کھانا | سید صاحب نے ہر قسم کے کھانے بھی کھائے اور فاقے بھی کیے۔ جو کچھ مل جاتا کھا لیتے کبھی نہ کہا کہ فلاں کھانا نہیں کھاؤں گا، لیکن ویسے آپ کو کھچڑی بہت پسند تھی۔ ایک دفعہ نصیر آباد گئے کریم الدین خادم ساتھ تھا۔ وہاں کھچڑی زیادہ کھالی اور پیٹ میں گرانی محسوس ہوئی۔ خادم نے عرض کیا کہ چورن کھا لیجیے، فرمایا: دیکھو ابھی اس کا علاج کرتا ہوں۔ نصیر آباد سے چلے اور کھیتوں میں پہنچے تو جوتا اتار کر تیزی سے دوڑے بہت دُور نکل گئے۔ پھر سائے میں کپڑا بچھا کر لیٹ گئے۔ اس طرح گرانی دُور ہو گئی۔

معمولات | سید صاحب سے کچھ معمولات بھی منقول ہیں۔ مثلاً:

۱۔ میدانِ جنگ میں ہر شخص کو ہدایت فرماتے کہ سورۂ قریش گیارہ مرتبہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لیا اور لوگوں سے بھی سُنا کر خطرے کے اوقات میں اس سورت کا پڑھنا باعثِ برکت ہوتا ہے۔

۲۔ توسیعِ رزق کے لیے مختلف شخصوں کو کئی چیزیں بتائیں:

ا۔ سورۂ مزمل اس طرح پڑھنا کہ اوّل و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف اور سورۂ فاتحہ پڑھی جائے، یہاں تک کہ سورۂ مزمل آہستہ آہستہ سوا لاکھ مرتبہ پوری ہو جائے۔

ب۔ اوّل و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف اور سورۂ فاتحہ پھر گیارہ ہزار مرتبہ یَا مُغْنِیْ یَا بَاسِطُ۔ یہ چالیس روز کیا جائے۔

ج۔ اوّل و آخر درود شریف اور گیارہ سو بار اَللّٰہُ الصَّمَدُ۔

د۔ اوّل و آخر درود شریف اور گیارہ سو بار اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ۔

۳۔ تقویتِ حافظہ کے لیے نواب وزیر الدولہ کی درخواست پر تحریر فرمایا کہ نمازِ فجر اور نمازِ مغرب کے بعد سات مرتبہ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا پڑھا جائے۔

اشعار جب محبت الٰہی جوش مارتی تو اکثر مندرجہ ذیل اشعار پڑھا کرتے تھے:

اے آنکہ زنی دم از محبت   از ہستی خویشتن بپرہیز
برخیز و بہ تیغ تیز بنشیں   یا از سر راہ دوست برخیز

در مسلخ عشق جز نکو را نکشند   لاغر صفتان زشت خُو را نکشند
گر عاشق صادقی ز کُشتن مگریز   مُردار بود ہر آنکہ اُو را نہ کُشند

دلم بہ راہ تو صد پارہ باد و ہر پارہ   ہزار ذرہ و ہر ذرہ در ہوائے تو باد[1]

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب   کہ حیف باشد ازو غیر ازیں تمنائے

گر نثار قدم یار گرامی نہ کنم   گوہر جاں بچہ کارے دگرم باز آید[2]

تہجد کے وقت عموماً یہ شعر آپ کی زبان سے سُنا گیا:

تو کریم مطلق و من گدا چہ کنی جز اینکہ بخوانیم
در دیگرے بنما کہ من بکجا روم چو برانیم

تصانیف سید صاحب کی بعض تصانیف بھی ہیں، مثلاً "صراط مستقیم" اس کی عبارتیں اگرچہ مولانا شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی کی ہیں لیکن مطالب تمام تر سید صاحب کے ہیں۔ حالت یہ تھی کہ سید صاحب پیش نظر مدعا بیان فرماتے، شاہ اسماعیل یا مولانا عبدالحی اسے لکھ کر لاتے۔ اگر ان کی عبارت اظہار مدعا کے لیے کفایت نہ کرتی تو فرماتے کہ پھر لکھیے۔ بعض مطالب کو پانچ پانچ مرتبہ لکھوایا۔ پھر مکاتیب کا مجموعہ خاصا بڑا ہے۔ اگرچہ اکثر مولانا شاہ اسماعیل، منشی محمدی انصاری یا بعض دوسرے منشیوں کے لکھے ہوئے تھے لیکن جو کچھ لکھنا ہوتا تھا سید صاحب ہی اس کا مضمون عموماً بتایا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ تین رسالوں کا مجھے علم ہو سکا:

۱۔ **تنبیہ الغافلین**: یہ رسالہ فارسی میں تھا۔ پہلے ٹائپ میں بمقام کلکتہ چھپا۔ پھر لیتھو میں اسے بمقام لاہور چھاپا گیا اور مولانا ولایت کا رسالہ "عمل بالحدیث" بھی ساتھ شامل کر دیا گیا۔ اردو ترجمہ ایک سے زیادہ مرتبہ چھپ چکا ہے۔

۲۔ **رسالہ در نماز و عبادات**: میں نے پہلے لکھا تھا کہ یہ میرے علم کے مطابق کبھی نہیں چھپا۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ ٹونک کے ایک مجموعے میں دیکھا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ غالباً یہی رسالہ تھا جو "حقیقۃ الصلوٰۃ" کے نام سے ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ - ۱۸۲۲ء) میں کلکتہ کے اندر چھپا تھا۔ اس کے ساتھ سورۂ فاتحہ کی تفسیر بھی شائع ہوئی تھی، جسے مولانا عبدالحلیم صاحب چشتی نے ستمبر ۱۹۶۵ء کے "الرحیم" (حیدرآباد سندھ) میں شائع فرما دیا

---

[1] وصایا حصہ دوم صفحہ ۵۔ [2] تقصار جیود الاحرار صفحہ ۱۰۔

ہے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ سید صاحبؒ نے یہ تفسیر ۱۲۳۵ھ میں لکھنؤ کے چند جید علما کے سامنے بھی کی۔ مولانا محمد اشرف صاحب لکھنوی سے سید صاحبؒ کی بیعت کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ اس سے مجھے دو فائدے ہوئے :

ا ۔ انھوں نے (سید صاحبؒ نے) سورۂ فاتحہ کی تفسیر ایسی بیان کی کہ میں نے باوجود کئی تفسیروں کے مضمون یاد رہنے کے کبھی نہ سنی تھی۔

ب۔ اسی شب کو (یعنی بیعت کی شب کو) حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت شریف سے مشرف کیا گیا اور جو جو فیض برکت مجھ کو حاصل ہوا، اس کا کیا بیان کروں؟[1]

۳ ۔ **رسالہ در نکاح بیوگان** : یہ غالباً اس زمانے میں لکھا گیا تھا جب سید صاحب نے نکاح بیوگان کی سنت کے احیا کی غرض سے اپنی بھاوج سے نکاح کیا تھا۔ یہ بھی فارسی میں ہے اور اب تک نہیں چھپا۔

شخصیت

سچوں کے رئیس حسن علی خاں نے غازیوں کو دیکھا تو کہا کہ یہ تو بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھیلتے کھیلتے ایک کو بادشاہ بنا لیتے ہیں اور دوسرے بچے اس کے لشکری بن جاتے ہیں۔ لیکن جب سید صاحب کو دیکھا اور ان کا وعظ سنا تو کہا :

> امام ہمام کی پیشانی سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہفت اقلیم کی تسخیر کا ارادہ بھی فرمالیں تو کچھ عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام ممالک ان کے قبضے میں دے دے۔

میں نے سرسری طور پر چند نمایاں باتیں بیان کر دیں، آخر میں اعتراف کرنا پڑتا ہے :

حق این ست کہ بر تمامی کمالات و کرامات امیر المومنین و امام المسلمین کسے را اترما مقدورے حاصل نیست کہ در حیطہ حافظہ خود محفوظ دارد۔	سچ یہ ہے کہ خدا نے سید صاحب کو جن کمالات اور جن کرامات سے شرف بخشا تھا، ان کو حافظے میں محفوظ رکھنے کی مقدرت ہم میں سے کسی کو حاصل نہیں۔

---

[1] الرحیم ستمبر ۱۹۶۵ء صفحہ ۲۶۳ - ۲۶۶ ماخوذ از "مقالات طریقت" معروف "بفضائل عزیزیہ" مطبع متین حیدرآباد دکن ۱۲۹۲ھ صفحہ ۲۱۴ - ۲۱۷

ضمیمہ

سینتالیسواں باب

جنگ بالاکوٹ پر نئی روشنی

(۱)

تمہید میں سید صاحبؒ کی شہادت کے متعلق وہ تمام مآخذ دیکھ چکا تھا، جن کا علم ہو سکا اور نہ میری دسترس میں آ سکے۔ خیال نہ تھا کہ کوئی ضروری کتاب یا بیان باقی رہ گیا ہو گا۔ میرے عزیز اور ہم مشرب دوست ڈاکٹر شیر بہادر خاں صاحب پنی (دار الشفاء ایبٹ آباد) نے ایک نیا ماخذ ڈھونڈ نکالا، جس کا نام ہے "تواریخ ہزارہ بہ عہد سرکار دولت مدار"۔ یہ سکھوں کے دورِ حکومت کے متعلق ضلع ہزارہ کی تاریخ ہے، جو غالباً ۱۸۴۹ء میں لکھی گئی۔ ڈاکٹر شیر بہادر خاں نے پہلے اس میں سے بالاکوٹ کی سرگزشت کا خلاصہ مرتب کر کے بھیج دیا تھا۔ پھر اصل مخطوطہ ارسال فرما دیا۔ یہ اصل کی نقل ہے، جو ۱۹۲۹ء میں کی گئی اور سوا سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحے میں بالاوسط سترہ سطریں اور ہر سطر میں بالاوسط اٹھارہ الفاظ ہیں۔ ناقل کا خط پختہ معلوم ہوتا ہے، مگر نقل اس تیزی سے کی گئی کہ بعض الفاظ ٹھیک پڑھے نہیں جاتے۔ خصوصاً مقامات و افراد کے اسماء میں قدم قدم پر اشتباہ ہوتا ہے۔ چونکہ دوسرے مآخذ کی بناء پر اس جنگ کی کیفیت میرے سامنے تھی اور بیشتر اسماء سے میں آشنا تھا، اس لیے پوری کیفیت سمجھنے میں زیادہ دقت پیش نہ آئی۔ جنگ بالاکوٹ کی سرگزشت اس قلمی نسخے میں صفحہ ۷۹ سے صفحہ ۸۹ تک ہے۔ میں ڈاکٹر شیر بہادر خاں کی اجازت سے اور ان کے دلی شکریے کے ساتھ اسے یہاں بیان کرتا ہوں۔

اس سے اول فی الجملہ ان تمام نتائج کی توثیق ہوتی ہے، جو میں دوسرے مآخذ کی بنا پر پیش کر چکا ہوں، دوم بعض پہلوؤں پر نئی روشنی پڑتی ہے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا۔

مصنف اور وجہِ تصنیف کتاب کے مصنف کا نام مہتاب سنگھ ہے، ذات کائستھ، ساکن مرلی پورہ پرگنہ موہنی نگر، ضلع کان پور (یو پی)۔ یہ شخص تلاش معاش میں وطن سے لاہور پہنچا۔ پانچ برس کنور کھڑک سنگھ (ولی عہد رنجیت سنگھ) کی سرکار میں ملازم رہا۔ یہ مدت اس نے پرگنہ ساہیوال میں گزاری، جو دیوان ٹوڈرمل کی عملداری

میں تھا۔ پھر دس مہینے فتح سنگھ کے ساتھ منکیو میں رہا۔ ۱۸۸۱ بکرمی (۱۸۲۴ء) میں ہری سنگھ نلوہ کے پاس ہزارہ پہنچا اور دفتر میں مامور ہوا۔ پھر پچیس سال اس نے ہزارہ ہی میں گزار دیے۔ جب پنجاب پر انگریز قابض ہوئے اور میجر چیمبرلین ہزارہ پہنچا تو اس نے مہتاب سنگھ سے کہا کہ تیس برس اس ملک میں گزار چکے ہو، اگر اس عہد کے چشم دید حالات کتاب کی شکل میں مرتب کر دو تو وہ کتاب تمہاری یادگار رہے گی اور یہ امر ہماری خوشنودی کا باعث ہوگا۔ اگرچہ مہتاب سنگھ کو تصنیف و تالیف کا کوئی تجربہ نہ تھا، تاہم اس نے چیمبرلین کی خوشنودی کے پیش نظر کتاب مرتب کر دی[1]۔ عبارت اچھی نہیں، تاہم واقعات میں کوئی رنگ آمیزی نہیں کی گئی۔ ممکن ہے بعض حالات صحیح صورت میں اس تک پہنچے ہی نہ ہوں۔ بیان وقائع میں بعض مقامات پر ترتیب زمانی کا خیال نہیں رکھا گیا، لیکن جنگ بالاکوٹ کے حالات عمومی اعتبار سے بڑی حد تک درست معلوم ہوتے ہیں۔

پاینده خاں تنولی اور سید صاحبؒ

پاینده خاں تنولی والیٔ امب اور سید صاحبؒ کے روابط پر مفصل بحث کی جا چکی ہے۔ چونکہ وہ مسلسل سکھوں کے خلاف لڑتا رہا تھا، اس لیے سید صاحبؒ کے قلب صافی میں اس کے متعلق ہمیشہ اچھا خیال تھا، پھر اس نے خود سید صاحبؒ سے ملاقات کی۔ بعد ازاں اچانک مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔ "تواریخ ہزارہ" میں بتایا گیا ہے کہ جب پاینده خاں نے دیکھا، اس کے بھائی بند مصاحب اور ملازم سید صاحبؒ کا انتہائی احترام کرتے ہیں تو دل میں وسوسہ پیدا ہو گیا کہ اغلب ہے یہ لوگ کسی وقت خود اسے گرفتار کر کے ریاست سید صاحبؒ کے حوالے کر دیں[2]۔ چونکہ اس کی پوری تربیت شکوک و شبہات کی فضا میں ہوئی تھی۔ اس لیے یہ وسوسہ اس حد تک پریشان کن بن گیا کہ اس نے مخالفت کا راستہ اختیار کر لینے میں تامل نہ کیا۔ پھر جنگ کی نوبت آئی اور پاینده خاں صرف بارہ سواروں کے ساتھ جن کی خیر خواہی پر اسے پورا اعتماد تھا، امب سے نکل کر چھتر بائی پہنچا جو امب کے شمال میں دریا کے کنارے ایک چٹان پر چھوٹی سی گڑھی تھی۔ وہاں بھی نہ ٹھہرا اور دریا عبور کر کے شیر گڑھ ہوتا ہوا اگرور چلا گیا۔ وہاں سے اپنے بیٹے جہاں داد خاں کو چند معتبر اصحاب کے ساتھ ہری سنگھ کے پاس بھیج دیا اور کہا:

حالا نوبت مامی رسد بہر طور کہ دانند امداد کنند[3]	اب ہماری نوبت آ رہی ہے، جس طرح بھی مناسب سمجھیں ہماری امداد کریں۔

---

[1] "تواریخ ہزارہ" صفحہ ۳۔ [2] ایضاً صفحہ ۷۸، ۷۹۔ [3] ایضاً صفحہ ۸۰

ہری سنگھ نے فوراً مہاں سنگھ کو فوج دے کر پایندہ خاں کی امداد کے لیے بھیج دیا۔ یوں پایندہ خاں کا جو علاقہ دریا کے مشرقی کنارے پر تھا، اسے واپس مل گیا۔ چونکہ دریا میں طغیانی آگئی تھی، اس لیے مغربی جانب کے علاقے کی بازیافت پانی اُتر جانے پر موقوف رہی۔[۱]

شیر سنگھ کا تقرر

سید صاحبؒ مجاہدین پر اجتماعی قاتلانہ حملوں کے بعد پنجتار سے اٹھ کر راج دواری پہنچے تو افواہ پھیل گئی کہ وہ کشمیر کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں۔ یقیناً سید صاحب کا قصد یہی تھا اور مجاہدین، بھوگڑمنگ و بالاکوٹ کے علاوہ مظفر آباد بھی جا پہنچے تھے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کشمیر پر اقدام کا عزم پختہ ہے۔ اس حالت میں رنجیت سنگھ نے ایک فوج ہزارہ بھیجنے کا فیصلہ کیا جس کا سالارِ اعظم اپنے بیٹے شیر سنگھ کو بنایا۔ یہ آٹھ ہزار بندوقچیوں پر مشتمل تھی۔ شام سنگھ اٹاری والا، عطر سنگھ، سادھو سنگھ نہنگ، رتن سنگھ، وزیر سنگھ، گوردکھ سنگھ، مکھی سنگھ اور جوالا سنگھ بھی ساتھ بھیجے گئے، جو سکھ دربار کے ممتاز سردار تھے۔ ان کا اصل کام یہ قرار پایا کہ سید صاحبؒ کو (جنھیں سکھوں کی سرکاری اصطلاح میں "خلیفہ صاحب" کہا جاتا تھا) کشمیر جانے سے روکیں۔ ضمناً یہ حکم بھی دے دیا گیا تھا کہ یوسف زئی (میدانی علاقہ) سرحد سے معاملہ وصول کیا جائے۔[۲]

مشورہ اور فیصلہ

شیر سنگھ لشکر کے ساتھ منزل بہ منزل شنکیاری پہنچ گیا، جو درۂ بھوگڑمنگ سے باہر ہزارہ کا مشہور مقام ہے۔ اس وقت تک سید صاحب راج دواری سے بیچوں اندرون درۂ بھوگڑمنگ) آگئے تھے۔ "تواریخ" مظہر ہے:

خلیفہ آں زماں در درۂ بھوگڑمنگ بود	سید صاحبؒ اس وقت درۂ بھوگڑمنگ
کہ از شنکیاری ہشت کروہ یا دہ کروہ	میں تھے، جو شنکیاری سے آٹھ یا دس
خواہد بود۔[۳]	کوس ہوگا۔

شیر سنگھ نے ساتھیوں سے طریق کار کے متعلق مشورہ کیا تو انھوں نے کہا، بے شک خلیفہ صاحبؒ سرکار کے ملک میں ہنگامہ بپا کریں گے تو ان کا مقابلہ ضرور کیا جائے گا، لیکن اب وہ درۂ بھوگڑمنگ میں ہیں۔ اور یہ علاقہ ہری سنگھ نلوہ کی جاگیر میں ہے، لہٰذا وہاں خلیفہ صاحب کا تدارک ہری سنگھ ہی کو کرنا چاہیے۔ ہمارے لیے بہتر یہ ہے کہ اوّل مظفر آباد جائیں اور وہاں بندوبست کریں۔ پھر دیکھیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ شیر سنگھ نے یہ مشورہ منظور کر لیا۔ مہاں سنگھ برابر کہتا رہا کہ خلیفہ صاحب جمعیت کے ساتھ بھوگڑمنگ میں ہیں، ان کا مقابلہ

---

[۱] تواریخ ہزارہ صفحہ ۸۰۔ [۲] ایضاً صفحہ ۸۱۔ [۳] ایضاً صفحہ ۸۲۔ درۂ بھوگڑمنگ شنکیاری سے اتنی دور نہیں، البتہ بیچوں درے سے کلانہ [illegible] ہو کر درے کا نہیں بلکہ بلندی کے مقام کا ہے، جہاں سید صاحبؒ ٹھہرے ہوئے تھے۔

چھوڑ کر مظفر آباد جانے میں کون سی مصلحت ہے؟ لیکن سکھ سرداروں نے اس رائے پر عمل نہ کیا۔ سب کو مظفر آباد کی طرف کوچ کرنا پڑا اور یہ لوگ گوجرہ جا ٹھہرے، جو مظفر آباد سے نیچے دریائے کشن گنگا کے کنارے واقع تھا۔[1]

مظفر آباد کا محاصرہ

مقامی لوگوں نے مظفر آباد کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ سکھوں کا لشکر گوجرہ پہنچا تو محاصرین منتشر ہو گئے اور محاصرہ اٹھ گیا۔ پھر سلطان نجف خاں مظفر آبادی، شیر سنگھ کے پاس (گوجرہ) پہنچا۔ اس کے استقبال میں توپیں سر کی گئیں۔ شیر سنگھ نے ایک عہد نامہ زعفران سے لکھ کر نجف خاں کے حوالے کر دیا[2] جس کا مفاد یہ تھا کہ مظفر آباد کے علاقے کی سلطانی نجف خاں کو دی جا چکی ہے۔ کوئی دوسرا شخص اس میں شریک نہ ہوگا۔

بعد ازاں چند روز ڈیرہ بر گوجرہ بجہت	پھر چند روز ڈیرہ لشکر کے ساتھ گوجرہ
درستی انتظام ملک مظفر آباد بہ عمل آمدہ۔[3]	ہی میں رہا اور مظفر آباد کے علاقے کا انتظام
	درست کر دیا گیا۔

ہم پہلے جو کچھ بیان کر چکے ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے مظفر آباد کا والی نجف خاں نہیں، زبردست خاں تھا۔ وہ بالاکوٹ سے مجاہدین کے جیش ساتھ لایا تھا اور عہد یہ تھا کہ مظفر آباد پہنچتے ہی دفاعی انتظامات کے لیے خاصی بڑی رقم مجاہدین کے حوالے کر دے گا۔ سید صاحبؒ نے مولوی خیر الدین شیرکوٹی کو مجاہدین کے تینوں لشکروں کا سردار بنا کر بھیج دیا تھا۔ زبردست خاں نے مظفر آباد پہنچتے ہی وہ رقم دینے میں لیت و لعل شروع کر دی اور خفیہ خفیہ سکھوں سے نامہ و پیام کا انتظام کر لیا۔ مقصد یہ تھا کہ پیسہ خرچ نہ ہو اور مظفر آباد مل جائے۔ باقی رہی عزیمت تو اس کے پرتو سے نہ محض اس علاقے بلکہ وقت کے اکثر دوسرے رئیسوں کی طرح زبردست خاں کا دل بھی بالکل خالی تھا۔ جب سکھوں کا لشکر گوجرہ پہنچ گیا تو زبردست خاں کو سب کچھ چھوڑ کر شمالی جانب کے بلند پہاڑوں میں جا چھپنا ہی قرینِ مصلحت نظر آیا۔ اس لیے مجاہدین بھی مظفر آباد کے تخلیے پر مجبور ہو گئے۔

باقی رہا نجف خاں مظفر آبادی تو وہ شیر سنگھ کے گوجرہ پہنچنے پر اس کے پاس نہیں گیا تھا بلکہ پہلے سے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ زبردست خاں بھاگ نکلا تو ظاہر ہے کہ مظفر آباد کی سلطانی نجف خاں ہی کو مل سکتی تھی، جو سکھوں کی اعانت پر آمادہ تھا، لیکن سید صاحبؒ کے ساتھ بھی نامہ و پیام جاری تھا، بلکہ اس نے

---

[1] تواریخ ہزارہ صفحہ ۸۲۔ معلوم ہوا کہ یہ مقام مظفر آباد میں شامل ہے۔ [2] غالباً سکھوں کے زمانے میں خاص عہدنامے عام سیاہی سے نہیں بلکہ زعفران سے لکھے جاتے تھے۔ [3] تواریخ ہزارہ صفحہ ۸۴

جنگ سے کچھ ہی عرصہ پہلے سید صاحبؒ کو لکھا تھا کہ میں تو شیر سنگھ کو مظفرآباد کے لیے لایا تھا، یہ خیال نہ تھا کہ آپ سے تصادم ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ بارہ ہزار بندوقچی ہیں، آپ مقابلہ کر سکیں تو ٹھہریں ورنہ چھوڑ پیچھے چلے جائیں۔

سیّد صاحبؒ سے مقابلے کی تدبیریں

انھیں اس موقع پر اطلاع ملی کہ سید صاحب درۂ بھوگڑمنگ (سچوں) سے بالاکوٹ پہنچ گئے ہیں۔ زمیندار اور عام لوگ ان کے پاس حاضر ہو رہے ہیں۔ اس پر مہاں سنگھ نے شیر سنگھ سے کہا اگر سرکاری معاملہ خلیفہ صاحب نے وصول کر لیا تو ہم قلعہ نشین فوجوں کو تنخواہیں کہاں سے دیں گے؟ اس پر پہلی رائے بدلنی پڑی۔ شیر سنگھ نے حکم دے دیا کہ مہاں سنگھ، وزیر سنگھ، سادھو سنگھ اور رتن سنگھ اپنی اپنی جمعیت کے ساتھ روانہ ہو جائیں اور گڑھی (حبیب اللہ خاں) میں ڈیرہ جمائیں۔ مہاں سنگھ جو کچھ ضروری سمجھے، اس میں پوری امداد دیں۔

چنانچہ یہ لوگ گڑھی میں پہنچے اور دریائے کنہار کے کنارے ٹھہرے۔ جہاں گڑھی کی مرمت شروع کر دی۔ دو تین روز میں کسی جگہ سے ایک گز اور کسی جگہ سے ڈیڑھ گز تک مرمت ہوئی[1]۔ اس اقدام کا بدیہی مقصد یہ تھا کہ سید صاحب سے جنگ کی جائے۔

شبخون کی اطلاع

دوسرے تیسرے روز سکھوں کو خبر ملی کہ سید صاحبؒ بالاکوٹ سے دریائے کنہار کے کنارے آ گئے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ رات کو دریا سے گزر کر سکھوں پر شبخون مارا جائے:

بہ مجرد شنیدن این خبر افسران ڈیرہ کہ
جمعیت قلیل بود، غمگیں چوں بید از باد
لرزیدند[2]

یہ خبر سنتے ہی ڈیرے کے افسر بہت
غمگین ہوئے، کیونکہ ان کے پاس جمعیت
کم تھی۔ وہ اس طرح کانپ رہے تھے،
جس طرح ہوا چلنے سے بید کا درخت
لرزتا ہے۔

---

[1] تواریخ صفحہ ۸۴، ۸۵ - آخری فقرے میں خلا محسوس ہوتا ہے۔ گڑھی تو مرکز تھا ہی، لیکن دریا کے کنارے کہاں ڈیرہ تھا؟ نظر بظاہر یہ ڈیرہ اس جگہ ہو سکتا تھا جسے "میدان" کہتے ہیں اور یہ تلہٹہ سے آگے بھلے کوٹ کے شمال سے شروع ہو کر شوال معز اللہ خاں تک جاتا ہے۔ اصل کتاب میں اس کی تصریح نہیں۔ لیکن گڑھی سے میدان تک دریا کے کنارے کوئی ایسا مقام نہیں جہاں فوج ٹھہر سکے، اگرچہ اس کی تعداد زیادہ نہ ہو۔

[2] ایضاً صفحہ ۸۴

پہلے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ پھر کیمپ کے اردگرد خندق کھودی۔ کانٹوں کی باڑ لگا دی، لکڑیاں اور پتھر فراہم کر کے کیمپ کے دو دروازوں میں سے صرف ایک بند کر دیا:

بعد گزشتن چار گھڑی شب ہر کس کہ سوار	چار گھڑی رات گزر گئی تو جو گھڑ سوار تھا،
بود بہ اسپ سوار شدہ و ہر کس کہ پیادہ بود	وہ سوار ہو گیا، جو پیادہ تھا، اس نے ہتھیار
مسلح گردید گاہے بطرف مشرق و گاہے	لگا لیے۔ کبھی وہ مشرق کی طرف جاتے اور
بطرف شمال مے رفتند و ڈھول و نقارہ	کبھی شمال کی طرف۔ ڈھول اور نقارہ بجاتے
مے نواختند تا طلوع شدن آفتاب ہمیں	سورج نکلنے تک ڈیرے میں یہی زلزلہ
زلزلہ و شور در دیرہ ماندہ۔ کسے مے گفت	و ہنگامہ بپا رہا۔ کوئی کہتا یہ آ گئے، کوئی
ایں آمدند و کسے مے گفت از ایں راہ	کہتا اس راستے سے آ گئے۔ کسی نے ایک
آمدند و حتیٰ کہ چار پہر شب گزشت کسے	ساعت بھی آرام و اطمینان کا سانس نہ لیا۔
یک ساعت آرام نیافت، اما خوف	خوف اس وقت دور ہوا جب اندھیرے
گزشت چوں پردۂ ظلمانی برداشتہ شد و	کا پردہ اٹھا اور سورج کی کرنوں سے جہان
شعاع آفتاب جہاں را منور ساخت[1]۔	روشن ہو گیا۔

یہ غالباً وہی شبخون ہے، جس کی تیاری کا ذکر چھتیسویں باب میں آ چکا ہے۔ میں نے نوٹ میں لکھا تھا کہ اس وقت سکھوں کا لشکر شاید اس مقام پر تھا، جہاں مانسہرہ کی سڑک دریائے کنہار سے آ ملی ہے، لیکن اگر سکھوں کا لشکر میدان میں تھا تو مقام اجتماع وہ نہیں ہو سکتا۔

شیر سنگھ کی نقل و حرکت

شیر سنگھ اس وقت تک گوجرہ ہی میں تھا۔ ڈیرے کے فوجی افسروں میں شبخون کے خوف سے اضطراب و بے قراری کمال پر پہنچی ہوئی تھی۔ آخر انھوں نے ایک عرضی لکھی، جس میں بتایا کہ شبخون کا خطرہ ہے اور ہم سب مل جل کر زیادہ سے زیادہ آٹھ سو نفر ہوں گے اور خلیفہ ہم میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑے گا، لہٰذا ضروری ہے کہ ہماری امداد فرمائی جائے۔ چنانچہ شیر سنگھ پوری فوج کے ساتھ آخر شب گوجرہ سے نکلا اور طلوع آفتاب کے وقت گڑھی حبیب اللہ خاں پہنچ گیا۔ اس پر کیمپ والوں کو اطمینان ہو گیا۔ سولہ روز میں گڑھی کی مرمت ہو گئی۔ پھر ڈیرہ اٹھا کر کوٹ بیلہ[2] بڑھا لے گئے، جو بالاکوٹ سے تین کوس جانب جنوب دریائے کنہار کے مشرق

---

[1] تواریخ ہزارہ صفحہ ۳۴۵۔ [2] کوٹ بیلہ غالباً وہی مقام ہے، جسے قلمی کتاب میں محض بیلہ لکھا ہے۔

کنارے پر ہے[1]

جاسوسوں کا انجام

ایک روز شیر سنگھ سوار ہو کر دریا کے کنارے کنارے بالاکوٹ کی طرف گیا۔ پھر دوربین سے آس پاس کے علاقے پر گہری نظر ڈالی۔ اندازہ ہو گیا کہ مشرقی کنارے سے سید صاحب کے کیمپ پر قابو پالینے کی کوئی صورت نہیں[2]۔ ادھر سید صاحبؒ نے چار پانچ سو بندوقچیوں کو دریا سے گزار کر سروٹ کے جنگل میں چھپ جانے کا حکم دے دیا تھا، جو سکھوں کے کیمپ سے ڈیڑھ کوس شمالی جانب تھا اور اپنے کیمپ میں بہت سے چاول پکا کر ادھر ادھر بکھیر دیے، جنھیں چرنے کے لیے بے شمار پرندے جمع ہو گئے۔ اس وقت دن نکلے دو تین گھڑیاں ہوئی ہوں گی۔ شیر سنگھ نے سمجھا کہ سید صاحب بالاکوٹ سے چلے گئے، بلکہ آواز سے اس امر کا اعلان بھی کر دیا[3]۔

پھر پانچ سوار اور پانچ پیادے اس غرض سے بالاکوٹ بھیج دیے کہ خبر لائیں۔ یہ لوگ سروٹ کے جنگل سے گزر کر بالاکوٹ کی طرف گئے۔ سید صاحب کے بھیجے ہوئے آدمی ایک دم گھات سے اٹھے اور ان پر حملہ کر دیا۔ پانچوں سوار مارے گئے۔ پیادوں میں سے بھی تین قتل ہو گئے۔ دو نے دریا میں چھلانگ لگا دی اور ڈبکی لگا کر دور نکل گئے۔ پھر تیرتے ہوئے سکھوں کے کیمپ میں پہنچ گئے اور حقیقت حال سے سب کو آگاہ کیا[4]۔

---

[1] تواریخ ہزارہ صفحہ ۸۵ - [2] ایضاً ایضاً [3] ایضاً ایضاً [4] ایضاً ۸۵، ۸۶

ضمیمہ

اڑتالیسواں باب

جنگِ بالاکوٹ پر نئی روشنی

(۲)

بالاکوٹ پہنچنے کا فیصلہ

اب ہم جنگ بالاکوٹ پر پہنچ گئے ہیں۔ ابتدا میں سکھوں کی کوشش یہ تھی کہ دریائے کنہار کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھیں۔ پھر دریا عبور کرکے بالاکوٹ پر حملہ کر دیں۔ موقع کا معائنہ کر چکنے کے بعد ان پر واضح ہو گیا کہ اس منصوبے پر عمل نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ دریائے کنہار کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کر سکتے تھے، لیکن ہم بتا چکے ہیں کہ اس راستے میں آگے چل کر کھڑیاں تھیں یعنی پہاڑ کے کچھ حصے پھیل کر دریا کے اندر تک پہنچے ہوئے تھے[1]، لہٰذا ادھر سے فوج گزارنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ سکھ سالاروں میں مشورے شروع ہو گئے کہ بالاکوٹ تک فوج لے جانے کی مناسب صورت کیا ہے۔ متعدد تجویزیں پیش ہوئیں۔ آخر قرار پایا کہ کشمیر سے ایک ہزار بندوقچی آئے ہیں، انھیں کیمپ کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیا جائے، باقی پوری سکھ فوج دریا کے مغربی کنارے پر پہنچ کر سید صاحب سے جنگ کرے[2]۔ کیمپ میرے اندازے کے مطابق "میدان" میں تھا اور بعض مقامی روایات بھی اسی کی مؤید تھیں۔ "تواریخ ہزارہ" کا بیان درست مانا جائے تو وہ کوٹ بیلہ میں تھا جو چند میل شمال میں ہے۔

اختیار کردہ راستہ

چنانچہ اسی تجویز پر عمل ہوا۔ ایک گوجر کو رہبری کی غرض سے ساتھ لے لیا گیا۔ وہ فوج کو بسیاں اور ڈمگلہ کے راستے کوہ ڈنہ مٹی کوٹ پر لے گیا[3]۔ جو فوج شنکیاری میں تھی،

---

[1] "کھڑیاں" کاٹ کر موجودہ راستہ نکالا گیا، جس پر بعد میں سڑک بنی۔ [2] تواریخ ہزارہ صفحہ ۸۶۔ [3] پورا راستہ نہیں بتایا گیا۔ میں اس سے بیشتر راستہ تفصیلاً بتا چکا ہوں، بلکہ اس کا نقشہ بھی پیش کر چکا ہوں۔ سکھ فوج مشرقی کنارہ کنہار سے مغربی کنارے پر پہنچ کر شہ بال نجف خاں کے جنوب میں بسیاں اور ڈمگلہ ہوتی ہوئی ماسٹر ڈھاکہ کے عقب میں جابہ، اکھڑیلہ، چنڈ ھال کے راستے ربانی کے

وہ بھی تمری بالا کے راستے مٹی کوٹ پہنچ گئی[1]۔ سید صاحبؒ کی فوج کے چند آدمی بطور جاسوس نکہ پانی میں بیٹھے[2] تھے۔ ان سے سکھوں کی جنگ ہوئی۔ تین چار مارے گئے باقی بھاگ نکلے۔ اگرچہ بالاکوٹ سے ایک ہزار بندوقچی روانہ کر دیے گئے تاہم اس وقت تک سکھ ڈنہ مٹی کوٹ پر پہنچ چکے تھے، لہٰذا سید صاحب کی مرسلہ کمک راستے ہی سے لوٹ گئی[3]۔

یہاں سید صاحبؒ کے مجاہدین میں سے "تین چار" آدمی مارے گئے اسی کا نام آج کل "شہید گلی" ہے۔ گویا سکھوں سے مجاہدین کا پہلا تصادم اسی مقام پر ہوا۔ اس سے آگے "ٹھنڈا کٹھہ" نام نالہ ہے جو پہاڑوں میں سے بہتا ہوا بالاکوٹ جانے والی سڑک سے گزر کر کنہار میں شامل ہو گیا ہے، پھر مٹی کوٹ آتا ہے۔

پانی کا مسئلہ

مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچنے کے بعد سکھوں کو سب سے بڑی مشکل پانی کے متعلق پیش آئی:

دیدند کہ یک قطرۂ آب بر ڈنہ	دیکھا کہ پانی کا ایک قطرہ بھی موجود نہیں
نہ بود۔ حیران شدند کہ اگرچہ یک دو روز	حیران ہوئے کہ اگرچہ کھانے بغیر ایک دو
سوائے خوردن بسر مے تواند شد۔ لیکن	دن گزارے جا سکتے ہیں، لیکن پانی کے
بدون آب چگونہ گزارہ خواہد شد۔ ہر کس	بغیر کیوں کر گزارا ہوگا۔ ہر شخص اسی فکر میں

(دیکھیے ۸۲۸) اس جگہ پہنچی، جسے آج کل "شہید گلی" کہتے ہیں۔ "ڈمگلہ" کو متن کتاب میں "ڈمولہ" لکھا ہے۔ یہ راستہ نیا نہ تھا۔ لوگ عموماً اس سے آتے جاتے تھے۔ گوجروں کو بخوبی معلوم تھا کیونکہ وہ پہاڑوں پر بکریاں چراتے رہتے تھے۔ سید صاحبؒ کو بھی اس کا علم تھا اسی لیے حفاظت کی غرض سے وہاں چوکیاں بٹھائیں۔

[1] تواریخ ہزارہ صفحہ ۸۶۔ اس سے واضح ہے کہ سکھوں کی فوج خاصی بڑھ گئی تھی۔ نجف خاں مظفرآبادی نے جو سید صاحبؒ کو لکھا تھا کہ شیر سنگھ کے ساتھ بارہ ہزار بندوقچی ہیں، یہ غلط نہ تھا۔ آٹھ ہزار بندوقچی ہزارہ سنگھ لایا تھا۔ ایک ہزار کشمیر سے آئے شنکیاری کی فوج شامل ہوئی تو یقیناً گیارہ بارہ ہزار ہو گئے ہوں گے۔

[2] ظاہر ہے کہ یہاں "جاسوس" محض خبر رساں کے معنی میں استعمال ہوا ہے، نیز "نکہ پانی" یہاں کوئی مقام نہیں۔ اس نام کا ایک مقام ریاست امب میں دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر تھا۔ یہاں جس مقام کا ذکر ہے، اس کا نام "لیدی نکہ" ہے۔ اس ملک میں پہاڑوں کے لیے درجات رفعت کے اعتبار سے مختلف نام تجویز کر لیے گئے ہیں۔ مثلاً سب سے بلند "ڈھاکہ" اس سے نیچا "ٹھ" اس سے نیچا "نکہ" اس سے نیچا "ڈھیری"۔

[3] تواریخ ہزارہ صفحہ ۸۸۔ یہاں اتنا اور بتا دینا چاہیے کہ مجاہدین کی روایات کے مطابق شہید گلی کے مقام پر میرزا احمد بیگ پنجابی کا مورچہ تھا اور تصادم میں اس کے آٹھ رفیق شہید ہوئے۔ اس نے فوراً سید صاحب کو خبر بھیج دی، وہاں سے ایک جیش ابراہیم خاں اور فرج اللہ حرب کی سرکردگی میں بھیجا گیا۔ پھر سید نور اللہ شاہ کو ایک جمعیت کے ساتھ دوڑایا۔ ارباب بہرام خاں سے سید صاحبؒ نے فرمایا کہ آپ بھی جائیں۔ آخر میں سید جعفر نقوی کو بھیجا لیکن میرزا احمد بیگ نے کہا کہ اب سکھوں کی یلغار کو روکنا ممکن نہیں [illegible] نہیں روکا جاتا تو وہ

دریں فکر بود کہ از امداد قضا و قدر یک تیرہ سحاب از طرف شمال برخاستہ بر کوہ ڈنہ آمدہ آں قدر ژالہ خرد بارید کہ کسے را از آدم و جانور ہیچ گونہ آسیب نہ داد و آب برائے نوشیدن و نان پختن آں قدر وافر شد کہ ظروف نزد کسے کہ تمام از اں ژالہ پر کردند، بعد یک ساعت تمام آب شیریں و خوشگوار گشت و ایام ماہ بیساکھ بود کہ آب شیریں و خوشگوار و سرد بکار بود ہر گاہ کہ بامداد فلکی تمام فوج سنگھاں از آب و نان آسودہ شد، شب را بہ آرام و آسایش بسر کردند[1]

تھا کہ قضا و قدر کی مہربانی سے ایک سیاہ بادل سمت شمال سے اٹھا، ڈنہ پر پہنچا۔ اس میں سے چھوٹے چھوٹے اولے برسے اور کسی آدمی یا جانور کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ پینے اور کھانا پکانے کے لیے بکثرت پانی مہیا ہو گیا۔ جن لوگوں نے اولوں سے برتن بھر لیے تھے انھوں نے دیکھا کہ اولوں نے پگھل کر ایک گھڑی کے بعد خوشگوار میٹھے پانی کی شکل اختیار کر لی۔ بیساکھ کا مہینا تھا جس میں میٹھا، خوشگوار اور ٹھنڈا پانی درکار ہوتا ہے۔ جب آسمانی امداد سے سکھوں کی فوج پانی روٹی کی طرف سے فارغ ہو گئی تو رات بڑے آرام و آسایش سے گزری۔

سکھوں کی مجلسِ شوریٰ

صبح ہوئی تو سکھ پھر شیر سنگھ کے پاس جمع ہوئے۔ یہ تو طے ہو گیا کہ مٹی کوٹ کے ٹیلے پر قابض رہنا ضروری ہے، لیکن مسئلہ جنگ میں ان کے درمیان اختلاف رہا۔ پہلے یہ فیصلہ ہوا کہ دھان سنگھ اور لکھمی سنگھ پیش قدمی کریں، باقی فوج ان کی کمک کے لیے تیار رہے۔ دونوں سالار فوج کے ساتھ دو گولی کے فاصلے پر پہنچے تو شام سنگھ اٹاری والے نے کہا کہ یہ فیصلہ اچھا نہیں:

اگر آں ہر دو کساں جنگ کردند و فتح یافتند، ما دیگراں بہ کدامی نوشتہ خواہیم شد؟ و اگر خدا نخواستہ باشد آں ہر دو کساں را شکست آمد ما بہ کدامی نوشتہ خواہیم شد؟

اگر ان دونوں سالاروں نے جنگ کی اور فتح حاصل کر لی تو ہمیں کس شمار میں رکھا جائے گا؟ اگر خدا نخواستہ ان دونوں کو شکست ہوئی تو ہمیں کس زمرے میں

---

[1] تواریخ ہزارہ صفحہ ۸۶ ۔

بہ شنیدن ایں سخن ہمہ افسراں را فکر زیاد
افتاد۔ ہمہ یکساں برخاستہ کہ ہمہ مے رویم
یا فتح کردیم حاجت داشتن کوہ نیست و
اگر خدا نخواہد شکست خوردیم ما را بہ لاہور
رفتن کس نخواہد داد۔ در راہ کہ ملکیہ مردم
مسلمان ہستند ما را کے رسیدن مے دہند؟
دریں صورت ما حملہ یک بارگی حملہ کنیم ۱؎

شامل کیا جائے گا؟ یہ سنتے ہی سب
افسر حد درجہ متفکر ہو گئے۔ سب اٹھ کھڑے
ہوئے اور کہا کہ ہم چلتے ہیں۔ یا فتح حاصل
کریں گے، اس صورت میں پہاڑ پر قبضہ قائم
رکھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ اگر خدانخواستہ
شکست ہوئی تو کوئی ہمیں لاہور نہ جانے
دے گا۔ یہ راستے میں جو ملکی مسلمان ہیں، یہ
ہمیں کب پہنچنے دیں گے؟ اس صورت
میں ہم سب کو بہ یک وقت حملہ کرنا چاہیے۔

جنگ غرض پوری سکھ فوج مٹی کوٹ کے ٹیلے سے بالاکوٹ کی جانب نیچے اتر گئی۔ "تواریخ ہزارہ" مظہر ہے کہ نیچے سب سے پہلے وہ زمین تھی جسے مقامی اصطلاح میں "ہوتر" کہتے ہیں، یعنی دھان بونے کی زمین، جس میں پانی رہتا ہے۔ پھر بالاکوٹ کا ٹیلہ تھا، جہاں سید صاحبؒ اور ان کے ساتھی تیر و تفنگ اور زنبورک سے لیس تیار تھے۔ فریقین نے بندوقیں اور زنبورکیں سر کرنی شروع کر دی تھیں۔ سکھوں کے پاس ایک توپ تھی جو کشمیر کی فوج ساتھ لائی تھی، اس سے گولے پھینکے جاتے رہے۔ جب پیش قدمی کرنے والی سکھ فوجوں کے نشانچی آگے بڑھے تو دونوں کے سینوں میں گولیاں لگیں۔ وہ ختم ہو گئے اور نشان ان کے ہاتھ سے زمین پر گر گئے۔ اگرچہ دوسرے سکھوں نے وہ نشان اٹھا لیے:

لیکن مردم خلیفہ ہر قدر کہ در بالاکوٹ بودند
آں نشانہا را اسلامی دیدہ فوراً و عجالتاً حملہ
کردند بل خلیفہ سید احمد شاہ و مولوی اسمٰعیل
کہ ہر دو افسران کلاں تران فوج بودند
بہ ذات خود حملہ کناں و اللہ اکبر گویاں
. . . . در زمین ہوتر کہ درمیان ہر دو
بودہ آمدند و بہ آواز بلند گفتند کہ کافراں فتند

لیکن سید صاحب کے ساتھ جتنے مجاہدین
بالاکوٹ میں تھے، انھوں نے نشانوں کو
گرا ہوا دیکھتے ہی فوراً اور عاجلاً حملہ کر دیا
بلکہ خلیفہ سید احمد شاہ اور مولوی اسماعیل
بھی جو فوج کے سب سے بڑے سردار
تھے، بہ ذات خود حملے میں شریک ہو گئے
وہ . . . . . . اللہ اکبر کہتے ہوئے

۱؎ تواریخ ہزارہ صفحہ ۸۵

حملہ بر کنید۔ چوں خواہش قضا و قدر ہمیں بود کہ ساتگین حیات خلیفہ احمد شاہ و مولوی اسماعیل بلکہ تمام ہمراہیانش از رحیق زندگی لبلب شدہ بود ہمہ یک بارگی از زمین ہوتر گزشتہ دامن کوہ کہ یک طرف فوج سردار شام سنگھ و پرتاب سنگھ اٹاری والا بود و یک طرف سردار عطر سنگھ کالیانوالہ و گورمکھ سنگھ وغیرہ بودند، آمدند[1]

ہوتر کی زمین میں پہنچ گئے۔ زور زور سے کہہ رہے تھے، دیکھو کافر شکست کھا کر جا رہے ہیں، ان پر ہلّہ بول دو۔ قضا و قدر کی خواہش یہی تھی کہ خلیفہ احمد شاہ، مولوی اسماعیل بلکہ ان کے تمام ساتھیوں کا پیمانہ حیات زندگی کی شراب سے پُر ہو جائے۔ اس لیے کہ ایک دم ہوتر کی زمین سے گزرتے ہُوئے دامن کوہ میں پہنچ گئے، جہاں سے ایک طرف شام سنگھ اور پرتاب سنگھ اٹاری والے کی فوج تھی، دوسری طرف سردار عطر سنگھ، گورمکھ سنگھ وغیرہ کی۔

ایک عقدے کا حل

جنگ بالاکوٹ کے وقت سے یہ معاملہ عقدے کی صورت اختیار کیے ہُوئے ہے کہ جب سید صاحب فیصلہ فرما چکے تھے، سکھوں پر اس وقت حملہ کیا جائے گا۔ جب وہ مٹی کوٹ سے اتر کر محض نیچے آئیں گے بلکہ ہوتر کی زمین یعنی نشیب سے گزر کر بالاکوٹ کی طرف اوپر چڑھنے لگیں گے۔ پھر یکایک یہ فیصلہ کیوں بدلا گیا اور کس وجہ سے اچانک سکھوں پر اس وقت حملہ کیا گیا، جب وہ پہاڑ سے نیچے بھی نہیں اُترے تھے؟ اس کی کوئی معقول توجیہ گزشتہ ایک سو چھتیس برس میں سامنے نہیں آئی تھی۔ محولہ بالا عبارت نے اس راز سے پہلی مرتبہ پردہ اٹھایا کہ سکھ فوج کے نشان بردار مجاہدین کی گولیوں سے گر گئے اور سکھوں میں سراسیمگی پیدا ہوئی تو سمجھ لیا گیا کہ حملے کا مناسب وقت یہی ہے۔ قرائن کی بنا پر یقین ہے سکھ فوج کی پیش قدمی نشانچیوں کے گرتے ہی رک گئی ہو گی۔ یہ بھی یقین ہے کہ انھوں نے کچھ تاخیر اس وجہ سے کی ہو گی کہ حفاظت کے بہتر انتظامات کر کے قدم آگے بڑھائیں۔ اس موقع کو جوابی حملے کے لیے موزوں و مناسب سمجھ لینا ہر نقطہ نگاہ سے قرین قیاس تھا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ چھوٹی جمعیت، بڑی فوج کے مقابلے میں یورش کے مناسب مواقع کا خیال بطورِ خاص رکھتی ہے، اس انتظار میں نہیں رہتی کہ بڑی فوج کو سراسیمگی سے سنبھلنے کی مہلت دے دے اور مزید انتظار میں

---

[1] تواریخ ہزارہ صفحہ ۸۷

اپنے مقام پر جمی رہے۔ یہ عقدہ تواریخ ہزارہ کے بیان سے حل ہو گیا۔

سراسیمگی کا روشن ثبوت

سید صاحبؒ اور ان کے غازی بپھرے ہوئے شیروں کی طرح حملہ کر کے دامن کوہ میں پہنچ گئے اور سکھوں پر گولیوں کی بارش شروع کر دی۔ تواریخ مظہر ہے:

اوّل پاے سنگھاں از میدان پس شدہ، آخر کنور شیر سنگھ شمشیر از نیام برآوردہ پیشتر شد۔ مگر سردار رہاں سنگھ مع ہمراہیان خود مانع شد کہ تنہا پیشتر رفتن مناسب نیست لیکن کنور شیر سنگھ آں وقت ہیچ نشنود و شمشیر برہنہ در دست دہ دوازدہ قدم پیشتر شدہ، کسانیکہ از مقابلہ واپس مے آمدند آنہا را سنگ زدہ و دشنام ہا دادہ واپس ایستادہ بود و یک فراش خود بطرف شام سنگھ و پرتاب سنگھ اٹاری والا فرستادہ کہ ہوشیار بودہ بندوق ہا بزنید و یک آدم طرف عطر سنگھ کالیا نوالہ کہ آنہا نیز بندوقہا زدند[1]

سکھ اولاً پسپا ہو گئے۔ آخر کنور شیر سنگھ نے خود تلوار میان سے نکالی اور آگے بڑھا۔ رہاں سنگھ اسے روکتا تھا کہ تنہا آگے جانا مناسب نہیں۔ کنور شیر سنگھ اس وقت کچھ نہیں سنتا تھا اور ننگی تلوار ہاتھ میں لیے دس بارہ قدم آگے بڑھ گیا۔ جو سکھ مقابلے سے واپس آ رہے تھے، انھیں پتھر مار کر اور گالیاں دے کر ٹھہراتا تھا، پھر اس نے ایک خادم کو شام سنگھ اور پرتاب سنگھ کی طرف بھیجا کہ ہوشیاری سے بندوقیں سر کرو۔ ایک آدمی عطر سنگھ کالیا نوالہ کی طرف بھی بھیجا۔ اس کے آدمیوں نے بھی خوب بندوقیں چلائیں۔

شہادت گاہ بالاکوٹ

غرض فریقین کی طرف سے آتشباری بڑے زور سے جاری رہی:

یک صد ہفتاد و ہفت نفر مع خلیفہ سید احمد شاہ در ہماں زمین ہوتر ہا لاشہ بر لاشہ مردہ شدند و ہمیں قسم در زمین ہوتر چہار صد آدم ہندوستانی

ایک سو ستہتر غازی مع خلیفہ احمد شاہ زمین ہوتر ہی میں شہید ہو گئے اور لاش پر لاش گرتی رہی۔ اسی طرح اسی زمین ہوتر میں چار سو ہندوستانی جو خلیفہ پر

---

[1] تواریخ ہزارہ صفحہ ۸۶ و ۸۷ الف۔

کہ بہ دل و جاں بہ قبضہ خلیفہ بودند ہمہ
جاں دادند۔ لاشۂ خلیفہ ہم بزخم بندوق
۱ کہ یک گولی بر بازوے راست و دیگر
گولی بر سینہ متصل پستان چپ
چسپیدہ بود ہماں جا افتادہ اند از
ہمراہیانش کہ بقدر ہشتاد یا چندیں دیگر
مردم بودند سہ مراتب حملہ کردند کہ
لاشہ را ببرند لیکن از کثرت بندوقہا
کہ ہمچو ابر مدرار گولی مے بارید میسر نشد
لاچار سر خلیفہ سید احمد شاہ از لاشہ جدا
ساختہ خواستند کہ ببرند چوں چندیں
رفتہ بودند کہ آں شخص را کہ سر خلیفہ
برداشتہ بود زخم گولی کارگر و وقت
مردن سر خلیفہ در یک خرمن سرشف
کہ درآں افتادہ بود پنہاں نمود[۱]

جان و دل سے نثار تھے، جاں بحق ہوئے۔
خلیفہ صاحب کی موت بھی گولی سے
ہوئی۔ ایک گولی داہنے ہاتھ پر لگی۔
دوسری گولی سینے پر بائیں پستان کے
مقام پر بیٹھی۔ چنانچہ وہ وہیں گر گئے۔
ان کے ہمراہیوں کی تعداد اسّی یا اس
سے بھی زیادہ تھی۔ انھوں نے خلیفہ
کی لاش اٹھا لے جانے کی غرض سے
تین مرتبہ حملہ کیا، لیکن انھیں موقع نہ
مل سکا۔ آخر خلیفہ کا سر تن سے جدا
کر لیا گیا تاکہ اسی کو اٹھا لے جائیں۔
وہ چلے لیکن جس شخص کے پاس سر تھا،
اسے گولی سے کاری زخم لگا اور مرنے
سے پیشتر اس نے سرسوں کے ایک خرمن
میں چھپا دیا، جو اس جگہ موجود تھا۔

ضروری تصریحات

اس بیان میں سے، جو یقیناً سکھ سالاروں یا سپاہیوں کی روایات پر مبنی ہے، بعض باتیں درست معلوم ہوتی ہیں، بعض ایسی ہیں کہ انھیں کسی بھی صورت میں صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً:

۱ - یہ بالکل درست کہ سید صاحبؒ کے داہنے بازو یا ہاتھ پر زخم لگا تھا۔ اس کی توثیق مجاہدین کے بیانات سے بھی ہوتی ہے۔

۲ - کہا گیا ہے کہ دوسری گولی سینے پر" متصل پستان چپ" پڑی۔ گویا عین مقام قلب پر لگی۔ اس سے ظاہر ہے شہادت کا اصل سبب یہی گولی تھی۔

۳ - یہ صحیح نہیں کہ آپ کے ساتھ اسّی آدمی تھے، کیونکہ مجاہدین جس صورت میں حملے کے لیے نکلے تھے۔

---

[۱] تواریخ ہزارہ صفحہ ۸۰ الف

اس سے کسی بڑے گروہ کا ایک جگہ جمع رہنا یا جمع ہونا ممکن ہی نہ تھا، وہ سب بکھر گئے تھے۔ سید صاحب کے ساتھ بہت تھوڑے آدمی ہوں گے۔

۴ - یہ بھی قابل تسلیم نہیں کہ غازیوں کو جب سید شہید کی میت اٹھانے جانے کا موقع نہ ملا تو ان میں سے ایک نے سید صاحب کا سر مبارک بدن سے الگ کر لیا۔ غازیوں میں سے کوئی بھی اس نوع کی کسی حرکت کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا اور اس سے کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔ ایسی کوئی مثال بھی نہیں ملتی کہ کسی غازی کا سر بعد شہادت بدن سے الگ کیا گیا ہو۔ ہاں جنگ کے بعد شہیدوں کو پورے احترام سے دفن ضرور کیا جاتا تھا۔

۵ - یہ بھی صحیح نہیں کہ ایک سو ستہتر غازی دامن کوہ میں اور چار سو آس پاس شہید ہوئے، کل شہدا کی تعداد تین سو سے زیادہ نہ تھی اور اس کی توثیق ان غازیوں کی تعداد سے بھی ہوتی ہے، جو جنگ بالاکوٹ کے بعد زندہ رہے۔

سکھوں کی آخری افسوسناک حرکت

سکھوں کے اقتدار کی ابتدا غارت گرانہ اور وحشیانہ چھاپوں سے ہوئی تھی۔ رنجیت سنگھ نے بھی اپنے مقاصد توسیع اقتدار کے پیش نظر غارت گری اور وحشیانہ اقدامات کی حوصلہ افزائی جاری رکھی۔ تواریخ ہزارہ مظہر ہے کہ جب غازیوں سے میدان خالی ہو گیا تو سکھ ان کے تعاقب میں بالاکوٹ پہنچ گئے:

ڈیرۂ خلیفہ و خانہ ہائے ساکنان
بالاکوٹ غارت نمودند و کوٹھہ ہائے
بالاکوٹ را آتش دادند و سوختند۔
ہشت زنبورک، یک فیل،
دوازدہ راس اسپاں و چند راس
قاطراں غارت ڈیرۂ خلیفہ بدست
سپاہیان لشکر سکھاں آمدہ[1]

سید صاحب کے ڈیرے اور
باشندگان بالاکوٹ کے مکان لوٹے گئے۔
ان کے کوٹھوں کو آگ لگا دی گئی۔ سید صاحب
کے مال میں سے آٹھ زنبورکیں، ایک
ہاتھی، بارہ گھوڑے چند خچر سکھ
سپاہیوں کے ہاتھ آئے۔

---

[1] تواریخ ہزارہ صفحہ

اس مختصر سے بیان میں ان ریکارڈوں، دستاویزوں، خطوں، رجسٹروں، یادداشتوں، کتابوں، عیدین و جمعہ کے خطبوں وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں، جن میں سے ایک ایک شئے کی قیمت سکھوں کی پوری ریاست دے کر بھی ادا نہیں ہو سکتی تھی۔ سکھوں کو ایسی گراں بہا چیزوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی!

جنگ بالاکوٹ یہاں پہنچ کر ختم ہو گئی۔ سید صاحبؒ کی میت سے جو سلوک روا رکھا گیا، اس کی کیفیت اگلے باب میں ملاحظہ فرمائیے۔

ضمیمہ

انچاسواں باب

مدفن اور بعد کی کیفیت

شہادت یا غیبوبت؟

شہادت کے بعد یہ مسئلہ باقی رہ گیا کہ سید صاحبؒ کہاں دفن ہوئے اور ان کی میت کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا گیا؟ اس سلسلے میں "تواریخ ہزارہ" کا بیان سکھ فوجیوں کی بیان کردہ حکایات پر مبنی ہوگا اور وہ فی الجملہ ان بیانات کا موید ہے، جو ہم اوپر پیش کر چکے ہیں۔ بعض جزئیات میں اختلاف ہے یا کہنا چاہیے کہ اجمال و تفصیل کا فرق ہے۔ اس طرح ثابت ہو گیا کہ سید صاحبؒ یقیناً شہید ہوئے۔ جن اصحاب نے مدت دراز تک عقیدۂ غیبوبت کو مدارِ کار بنائے رکھا، وہ غلطی پر تھے۔ حقیقۃً اس عقیدے کے لیے کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔ سید احمد شہیدؒ نے احیاءِ اسلام، تطہیرِ ہند اور بحالی حکومت اسلامیہ کے لیے نہایت پرخلوص اور ہر اعتبار سے غیر معمولی کوششیں کیں، جن کی داستان کا ایک حصہ زیرِ مطالعہ کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ سیدؒ کی عظمت ان کے عزیمت آموز اور ایمان افروز کارناموں پر قائم ہے۔ انھیں کارناموں کے لیے انھوں نے جذبۂ اسلامیت کی سرشاری میں زندگی کی ہر متاع بے دریغ قربان کر دی۔ یہ توفیق وقت کے کسی عظیم القدر اور ذی وسائل مسلمان فرمانروا یا حاکم کے حصے میں نہ آئی۔ ان سب کے دل مردہ، سب کے حوصلے افسردہ اور سب کی ہمتیں بے روح تھیں۔ سید شہیدؒ نے ظاہری اسباب کے فقدان سے بے پروا ہو کر وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ کی دعوت عام عملاً اس یگانہ شان سے دے دی کہ اس کی صدائے بازگشت سے عرصۂ روزگار ہمیشہ گونجتا رہے گا۔ یہی ان کی سب سے بڑی کرامت تھی۔ یہی ان کا شرف خاص تھا۔ اصل کام کے وقت غائب ہو جانے اور کسی نامعلوم ساعت میں نمود و ظہور کے انتظار کے لیے کون سی مصلحت پیش کی جا سکتی ہے؟

معائنۂ میدانِ جنگ اور میتِ سیدؒ

جنگ ختم ہو گئی تو شیر سنگھ نے بالاکوٹ کے ٹیکرے سے نیچے دریائے کنہار کے کنارے کیمپ لگایا پھر وہ اور دوسرے سکھ سالار سوار ہو کر میدانِ جنگ کے معائنے کی غرض سے نکلے۔ ایک جگہ انھیں ایک ایسی میت

نظر آئی، جو بظاہر کسی رئیس کی معلوم ہوتی تھی، سمجھا گیا کہ یہی سید صاحب کی میت ہے۔ چنانچہ اسے اٹھوا کر کیمپ میں لائے اور ایک سائبان کے نیچے رکھ دیا۔ شیر سنگھ نے حکم دے دیا کہ کسی ایسے شخص کو لاؤ جو خلیفہ صاحب کو پہچانتا ہو۔ نواب خاں تنولی کو حاضر کیا گیا، جو دو تین سال سید صاحبؒ کے ساتھ رہا تھا۔ شیر سنگھ نے اس سے پوچھا کہ پہچانو آیا یہ خلیفہ صاحب کی لاش ہے؟ نواب خاں نے جواب دیا:

صاحب! اگر سرے بودے می شناختم	صاحب! اگر سر ہوتا تو میں پہچان لیتا،
حالا مردۂ بے سر را شناختن دشوار است	لیکن سر کے بغیر مردہ لاش کو پہچاننا دشوار
لیکن خلیفہ سید احمد شاہ را یک نشانی	ہے۔ البتہ خلیفہ سید احمد شاہ کی ایک
است کہ ناخن انگشتہائے (پا) ہمہ	نشانی ہے یعنی آپ کے پاؤں کی انگلیوں
ناقص و خراب ہستند۔ چنانچہ پارچہ	کے ناخن خراب و نادرست تھے۔ چنانچہ
برداشتہ ملاحظہ کردند کہ ہر دہ ناخن ہر	کپڑا اٹھا کر دیکھا گیا تو واقعی پاؤں کی دس
دہ انگشتہائے پائے کہ بودند ہمہ ہا خراب	انگلیوں کے ناخن خراب نظر آئے،
و نادرست بودند۔ اگرچہ ہر کس گفت	اگرچہ ہر شخص کہتا تھا کہ خلیفہ صاحب کی
لاشہ خلیفہ ہمین است، لیکن یقین کافی	لاش یہی ہے، تاہم پورا یقین نہ ہوا۔
نہ شد[1]	

واضح رہے کہ سکھوں کے لیے اس باب میں یقین کامل حاصل کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ سید صاحبؒ کی میت سے مناسب سلوک ضروری سمجھتے تھے۔ اصل وجہ یہ تھی کہ سید صاحب کی شہادت کا یقین حاصل کیے بغیر وہ کام ادھورا رہتا تھا، جس کے لیے شیر سنگھ کو آٹھ ہزار بندوقچیوں کے ساتھ لاہور سے بھیجا گیا۔ پھر اس نے کشمیر اور ہزارہ کی فوج سے کمک بھی حاصل کی تھی۔

سر کی تلاش

سب اسی فکر میں تھے کہ یقین کیوں کر حاصل کیا جائے۔ اس اثنا میں فیروز خاں تنولی کے باپ کالا خاں تنولی کے ایک سپاہی نے کہا کہ اگر مجھے انعام دیا جائے تو سید صاحب کے سر کی نشان دہی کے لیے تیار ہوں۔ اس وقت دن ایک گھڑی باقی رہ گیا تھا۔ شیر سنگھ نے پچیس روپے اس سپاہی کو دیے۔ پچیس سوار اور پچاس پیادے اس کے ساتھ کر دیے کہ جہاں ہو، وہاں سے لے آؤ۔ سپاہی ان سواروں اور پیادوں کے ساتھ میدان جنگ میں گیا۔ سروں کے اس خرمن کے پاس

---

[1] تواریخ ہزارہ صفحہ ۸۷، ۸۸

پہنچا، جہاں سید صاحب کے ایک غازی کو گولی کھا کر مرنے سے پیشتر سر چھپاتے ہوئے دیکھا تھا اور خرمن سے نکال کر پیش کر دیا۔ سوار اور پیادے سر کیمپ کی طرف لے آئے۔ تواریخ مظہر ہے:

بے وقت شدہ بود در ڈیرہ شور و غوغا افتاد کہ سوار و پیادۂ معانداں آمدند۔ چنانچہ ہمگساں فوج بہ سلاح بندی و زین نمودن اسپاں چابک دستی کردند . . . کسے دل جمع نمود کہ ہمیں سوار و پیادہ ہستند کہ برائے گرفتن سر خلیفہ سید احمد شاہ رفتہ بودند۔ آں زماں ہر کسے بہ تسلی پرداختہ بر ڈیرہ بہ دل جمعی نشستند[1]

اندھیرا ہو گیا تھا۔ سکھوں کے کیمپ میں شور مچ گیا کہ دشمنوں کے سوار اور پیادے آگئے۔ فوج میں سے ہر شخص نے ہتھیار سنبھالے اور گھوڑوں پر زین ڈالنے میں بڑی تیزی دکھائی۔ پھر کسی نے بتایا کہ یہ تو وہی سوار اور پیادے ہیں، جو خلیفہ سید احمد شاہ کا سر لانے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ اس وقت سب کی تسلی ہوئی اور تمام لوگ دل جمعی سے بیٹھ گئے۔

سرمۂ بصیرت

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ فوج اور سر و سامان جنگ کی قلت کے باوصف سید شہید کی عزیمت نے سکھوں کے دل میں کتنا ہراس پیدا کر رکھا تھا۔ چند سو غازیوں کے مقابلے کے لیے بارہ ہزار فوج جمع کی گئی۔ دوپہر تک جنگ ختم ہو چکی تھی۔ تین سو کے قریب غازی شہادت پا چکے تھے اور باقی میدان جنگ سے نکل گئے تھے۔ سکھوں کو یقین ہو چکا تھا کہ اب فوری مقابلے کا کوئی امکان نہیں۔ خود پچیس سوار اور پچاس پیادے سید صاحبؒ کا سر لانے کے لیے بھیجے، ذرا اندھیرا ہو جانے پر وہ لوٹے تو سراسیمگی پھیل گئی کہ دشمن کے سوار اور پیادے آگئے۔ اگر سرحد کے مختلف مسلمان رؤسا کی بدعہدی اور غداری کے باعث حالات ناسازگار نہ ہو جاتے تو کیا سیّد شہید کے کامیاب ہو جانے کی قوی امید نہ تھی؟ پھر کیا ۱۸۳۱ء میں پنجاب کا فیصلہ کر چکنے کے بعد ہندوستان کو انگریزی اقتدار سے پاک کر لینے کے بہترین ممکنات سامنے نہ آجاتے اور اس ملک کی تاریخ کا دھارا سوا سو سال پیشتر دوسرا رُخ اختیار نہ کر لیتا؟ لیکن اپنی کم نصیبی اور سیاہ بختی کا ماتم کہاں تک کیا جائے؟:

یک کاشکے بود کہ بصد جا نوشتہ ایم!

تجہیز و تدفین

بہرحال سر مبارک لا کر دھڑ کے ساتھ ملایا گیا تو نواب خاں تنولی نے یقین دلا دیا

---

[1] تواریخ ہزارہ صفحہ ۸۸

کہ یہ میّت سید صاحب ہی کی ہے۔ چنانچہ میّت اسی کے سپرد کر دی گئی۔ رات کو سکھ کیمپ کے مسلمان ملازم بھی میت کے پاس بیٹھے مرثیہ خوانی کرتے رہے۔[1]

سید صاحبؒ کی شہادت ۲۴ - ذی قعدہ ۱۲۴۶ / ۶ - مئی ۱۸۳۱ کو گیارہ بجے کے قریب ہوئی۔ ۲۵ - ذی قعدہ / ۷ - مئی کو شیر سنگھ کے حکم کے مطابق سید صاحب کی میت دریائے کنہار سے متصل دفن کر دی گئی۔ تیسرے روز یعنی ۲۶ - ذی قعدہ / ۸ - مئی کو شیر سنگھ فوج کے ساتھ گڑھی حبیب اللہ خاں کی جانب روانہ ہوا۔ مہاں سنگھ اور لکھی سنگھ کو حکم دے گیا کہ وہ اپنی جمعیتوں کے ساتھ وہیں ٹھہرے رہیں۔ کیمپ کا اسباب روانہ کر دیں اور جب فوج گڑھی سے آگے نکل جائے تو خود روانہ ہوں۔[2]

اس بیان سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ سید صاحبؒ کی میّت میدان جنگ سے اٹھا کر شیر سنگھ کے کیمپ میں لانے کا مقصد یہ تھا کہ تصدیق ہو جائے میّت سید صاحب ہی کی ہے۔ پھر اسے وہاں دفن کیا گیا، جہاں اب قبر کا نشان ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ٹھیک اسی جگہ دفن کیا گیا تھا یا اصل مدفن اور موجودہ قبر میں تفاوت تھا، اگرچہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو۔

میّت کا اخراج

شیر سنگھ کے چلے جانے کے بعد مہاں سنگھ اور لکھی سنگھ نے باہم صلاح کی۔ غالباً مہاں سنگھ نے کہا:

در زندگی ہمہ شور و فساد خلیفہ دریں
ملک بود۔ حالا اگر قبر مردہ دریں جا ماند
بسیارے مسلماناں پرستش خواہند کرد
و کرامات ظاہر خواہند نمود۔ بہتر آں
است کہ لاشہ خلیفہ سید احمد شاہ از
قبر بیروں نمودہ در دریائے کنہار بیندازیم۔[3]

جب تک سید صاحب زندہ رہے اس
ملک میں شور و فساد برپا رہا۔ اب اگر
یہ قبر باقی رہی تو بہت سے مسلمان اس کی
پرستش شروع کر دیں گے اور ان کی کرامتیں
نمایاں کریں گے بہتر یہ ہے کہ ان کی میت قبر سے نکال کر
دریائے کنہار میں ڈال دی جائے۔

وہاں اس وقت آٹھ نہنگ سکھ کھڑے تھے۔ مہاں سنگھ اور لکھی سنگھ نے انھیں پچیس پچیس روپے دے کر کہا کہ ثواب کا کام ہے، خلیفہ صاحب کی لاش قبر سے نکال کر دریا میں ڈال دو جو پاس ہی ہے:

---

[1] تواریخ ہزارہ صفحہ ۸۰ - مرثیہ خوانی کا کون سا موقع تھا؟ لوگ قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہے ہوں گے۔ [2] ایضاً ایضاً

[3] ایضاً صفحہ ۸۸

چنانچہ نہنگاں فی الفور لاشہ را از قبر برآوردہ از شمشیر اعضا اعضا جدا کردہ در نالہ کنہار انداختند[1]	چنانچہ نہنگوں نے فوراً سید صاحبؒ کی میت قبر سے نکالی، تلوار سے جوڑ الگ الگ کیے اور دریا میں ڈال دیے۔

دو نئی باتیں

قبر سے میت کا نکالنا اور دریا میں ڈالنا تو پہلے سے مسلم تھا۔ اس بیان میں دو باتیں نئی ہیں: اوّل میں سمجھتا تھا کہ نہنگ انتقاماً اس فعل شنیع کے مرتکب ہوئے۔ کیونکہ ان کا سردار پھولا سنگھ اکالی جنگ نوشہرہ (۱۸۲۳ء) میں مارا گیا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ اسے مارنے کے ذمہ دار سید صاحب تھے، حالانکہ سید صاحب اس وقت تک سرحد آئے بھی نہیں تھے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ کام سکھ سالاروں نے خود کرایا، انھیں یہ اندیشہ تھا کہ سید صاحب کی قبر سلامت رہی تو وہ مسلمانوں کے لیے مسلسل عزیمت کا ولولہ افروز پیغام بنی رہے گی۔ گویا سید شہید کی ذات گرامی سے سکھ اس درجہ خوفزدہ تھے کہ ان کی قبر سلامت رہنے سے بھی سکھوں کے اوسان خطا ہوتے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرے سامنے جو بیانات تھے ان سے واضح ہوتا تھا، نہنگوں نے میت قبر سے نکال کر دریا میں ڈال دی۔ سر دھڑ سے الگ ہو گیا۔ سر گڑھی حبیب اللہ خاں پہنچ گیا، جہاں خان گڑھی نے اسے دریا سے نکلوا کر کنارے پر دفن کر دیا۔ دھڑ بعد میں تلہٹہ پہنچا اور وہاں کے مسلمانوں نے اسے ایک قبرستان میں دفن کر کے نشان مٹا دیا۔ اگر یہ درست ہے کہ میت کے جوڑ الگ کیے گئے تھے تو ظاہر ہے کہ دھڑ کا تلہٹہ میں دفن ہونا قرین قیاس نہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ بعض اعضا وہاں دفن ہوئے ہیں۔

جنگ بالاکوٹ کی تاریخ

آخر میں مہتاب سنگھ نے لکھا ہے کہ جب سکھوں کی فوج گڑھی حبیب اللہ سے کوچ کر گئی تو مہاں سنگھ اور لکھمی سنگھ اس کے پیچھے پیچھے ہزارہ پہنچے۔ اسی طرح کنور شیر سنگھ اور دوسرے سردار منزل بہ منزل لاہور پہنچ گئے اور ہزارہ کی فوج سردار مہاں سنگھ کے زیر سرکردگی انتظام علاقہ میں مشغول ہو گئی:

بست و ہفتم ماہ بیساکھ سنہ ۱۸۸۸ بود مطابق ہفتم ماہ مئی سنہ ۱۸۳۱ کہ جنگ عظیم خلیفہ سید احمد شاہ و کنور شیر سنگھ در موضع بالاکوٹ تعلقہ درۂ کنہار واقع شدہ و از قفس عنصری	بیساکھ سنہ ۱۸۸۸ کی ستائیسویں تاریخ تھی، مطابق ۷۔ مئی سنہ ۱۸۳۱ کہ خلیفہ سید احمد شاہ اور شیر سنگھ کے درمیان سخت لڑائی موضع بالاکوٹ میں ہوئی، جو تعلقہ درۂ کنہا

---

[1] تواریخ ہزارہ صفحہ ۸۸

خلیفہ سید احمد شاہ بہ زخم گولی ہائے بندوق
روحش متوجہ عالم بالا گردید۔

میں ہے اور خلیفہ صاحب کی رُوح
گولی کے زخموں سے قفس عنصری چھوڑ کر
عالم بالا کی طرف متوجہ ہوُئی۔

گویا مہتاب سنگھ کے بیان اور دوسرے بیانات میں ایک دن کا تفاوت ہے۔ میرے نزدیک سابقہ بیانات ہی درست ہیں۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ بکرمی اور عیسوی سن لکھنے میں غالباً ناقل سے غلطی ہوئی۔ کیونکہ بکرمی ۱۸۵۷ء لکھا گیا ہے اور عیسوی ۱۸۳۶ء دونوں غلط ہیں اور ان میں مطابقت بھی نہیں ہو سکتی۔ صحیح سنین وہی ہیں، جو میں نے درج کر دیے۔ یعنی ۱۸۳۱ء جس کا بکرمی ۱۸۸۸ء ہونا چاہیے۔

LIBRARY
Lahore
Islamic
University
Book No.
Garden Town, Lahore

عمادُ الدین

مولانا ابوالقاسم دلاوری

تقطیع ۷½″ × ۱۰″ ضخامت ۴۹۶ صفحات

پاکستان کا سوادِ اعظم حنفی فقہ کا پیرو ہے اور سوادِ اعظم کے دین دار طبقے کی سب سے اہم ضرورت حنفی فقہ کے مطابق مسائل نماز کا جاننا ہے۔ نماز جو حیاتِ ایمانی کے لئے روح کا حکم رکھتی ہے۔ اس موضوع پر آج تک اُردو زبان میں سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں۔ اسلام کے فریضہ نماز سے لے کر دیگر عقائد اسلام پر اس قدر جامع کتاب شاید ہی کہیں دیکھنے میں آئی ہو اس کتاب کی ترتیب میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ ایک مسلمان کو مذہبی اُمور میں جن معلومات کی اکثر ضرورت پڑتی ہے اہم اور ضروری مسائل کے پیش نظر مولانا ابوالقاسم صاحب دلاوری نے اپنی علمی و تحقیقی کاوش کو بروئے کار لاکر اسے مرتب کیا جس میں نماز کے ضروری مسائل کو ہر پہلو سے حل کیا ہے اُردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس قدر جامع اور مستند ہے۔

قیمت -/۳۵ روپے

حُجّۃ اللہ البالغہ

شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

ترجمہ:۔ مولانا محمد منظور وجیدی

تقطیع ۷½″ × ۱۰″ صفحات ۱۱۰۰

قیمت -/۹۰ روپے

امام المفسرین رئیس المحدثین شیخ الاسلام حجۃ اللہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حجۃ اللہ البالغہ عربی کی اصل کتاب ہے اور اس سے صرف عربی جاننے والے ہی استفادہ کر سکتے تھے۔ اب مولانا محمد منظور وجیدی نے بڑی محنت سے اس کا ترجمہ اردو زبان میں نہایت سلیس اور شستہ اور بامحاورہ کیا ہے احکامات الٰہی اور وحدت الوجود کا انمول خزینہ۔ تصوف کے ساتھ ساتھ الٰہیات۔ مسائل سلوک، دینیات، شرعی احکامات گویا کہ سب ہی کچھ تحریر فرما دیے ہیں۔

شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ پبلشرز ادبی مارکیٹ چوک انارکلی۔ لاہور

سرگزشتِ مجاہدین

مولینا غلام رسول مہر

تقطیع ۶½" × ۱۰" - ضخامت ۶۸۰ صفحات

مجاہدانِ وطن کے گروہ مجاہدین کے حالات اور واقعات کی مکمل تاریخ۔ بہادر اور نڈر مجاہدین اسلام کی جاں نثاری کی داستان؛ سید احمد شہیدؒ کے سلسلے کی تیسری اور آخری کڑی۔ اسلوب نگارش ناول سے بھی زیادہ دلچسپ

قیمت ۔/۴۰ روپے

جماعتِ مجاہدین

مولینا غلام رسول مہر

تقطیع ۶½" × ۱۰" - ضخامت ۳۲۵ صفحات

غدر کے بعد آزادی کی رُوح، برصغیر کے ہر شخص کی رگ و پے میں سرایت کی ہوئی تھی۔ چنانچہ سید احمد شہیدؒ اور آپ کے مجاہدین کی جماعت نے جو قربانیاں پیش کیں وہ سب کی سب موجودہ کتاب میں سمو دی گئی ہیں۔ سید احمد شہید کی جماعت کے تنظیمی حالات اور ان کے اکابرین اسلام کے مکمل و جامع حالات کا گراں بہا مجموعہ۔ طباعت و کتابت نہایت ہی خوبصورت

قیمت ۔/۲۰ روپے

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز ادبی مارکیٹ چوک انارکلی لاہور

اُردو میں پہلا ترجمہ — ضخیم اور معروف و مقبول عربی کتاب کا مستند اور مکمل ترجمہ

سیرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے اہم اور قدیم ترین مآخذ

جسے دنیائے اسلام میں

بارہ صدیوں سے سیرۃ طیبہ کا سب سے بڑا ذخیرہ تسلیم کیا جا رہا ہے!

سیرت ابن ہشام

ترجمہ مولانا عبدالجلیل صدیقی ○ نظرثانی و تہذیب: مولانا غلام رسول مہر

جس خوب صورتی اور جامعیت کے ساتھ

حضورؐ کی سیرت مقدسہ کا نقشہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے،

کسی دوسری کتاب میں نظر نہیں آتا

اس لئے کہ

- سیرت نبویؐ پر تمام دوسری کتابوں کا مآخذ ابن ہشام کی یہی معرکہ آرا تصنیف ہے۔
- مصنف کا مخصوص اور دلکش اسلوب نگارش ہر بنیادی اور جزوی واقعہ کی ہو بہو تصویر سامنے لے آتا ہے۔
- جامعیت کا یہ عالم ہے کہ غزوات تک کے متعلق حتی الامکان کوئی بھی جزئیہ نظر انداز نہیں ہوا۔

اردو ترجمہ میں بھی

- جامعیت کے پیش نظر تمام عربی اشعار مع ترجمہ شامل کیے گئے ہیں۔
- ابواب اور فصول اس انداز سے ترتیب دیے گئے ہیں کہ کوئی بھی چھوٹا یا بڑا واقعہ معلوم کرنے کے لیے فہرست دیکھتے ہی اس کے مقام کا پتہ چل جائے۔
- اشخاص اور مقامات کے ناموں کے صحیح تلفظ کی خاطر ان پر اعراب لگا دیے گئے ہیں۔
- حواشی میں ہر ضروری امر کی تشریح کر دی گئی ہے، نیز ہر مقام کا صحیح موقع اور محل بھی حواشی کے ذریعہ واضح کر دیا گیا ہے۔
- واقعات اور حالات کو پوری طرح واضح اور ذہن نشین کرانے کے لیے غزوات کے نقشے بھی جزو کتاب ہیں۔

تیسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

- آپ اپنی فرمائش ۵/۰۰ منی آرڈر کے ساتھ جلد بھیج دیں۔

بڑا سائز، ضخامت ۱۲۰۰ صفحات، دو جلدیں، کامل مجلد قیمت 190 روپے

کتاب منزل لاہور

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

چوک انارکلی، لاہور